GREEN FORCE
1
گرین فورس
ایم اے راحت

لیفٹیننٹ کرنل رحیم احمد شاہ کی پوری زندگی ایسے شان دار کارناموں سے بھری ہوئی تھی جن پر پوری قوم فخر کرتی تھی۔ لا تعداد تمغے سینے پر سجائے جب وہ کسی نئے تمغے کے حصول کی تقریب میں جاتا تو تالیاں بند ہونے کو نہ آتی تھیں۔ ملٹری انٹیلی جنس کے ایک اہم شعبے سے متعلق رہا تھا اور شاید ابھی برسوں اس کی فوجی خدمات جاری رہتیں کہ قدرت کی طرف سے اس کی چھٹی کا وقت آ گیا۔ ایک مہم کے دوران اس کی ایک ٹانگ چور چور ہو گئی۔ ہڈیاں کرچی کرچی ہو گئی تھیں۔ کوئی علاج نہیں ہو سکا تھا۔ زندگی بچانے کے لئے ٹانگ کاٹنی پڑی۔ اس کے بعد ظاہر ہے فوج سے ریٹائر ہو گیا۔

ہنستا بولتا رحیم احمد شاہ بجھ گیا۔

"یہ تو مناسب نہیں ہے شاہ جی۔ آپ اپنا فرض تو اچھی طرح پورا کر چکے ہیں۔ اللہ نے زندگی دی ہے تو اسے خوشی سے گزار دو......" ایک دوست نے کہا۔

"یار بس ایک دکھ ہے۔"

"کیا شاہ جی؟"

"ابھی تو دشمن پر بڑی ضربیں لگانی تھیں۔ یہ ساری آرزوئیں دل میں رہ گئیں۔"

"اللہ مالک ہے۔ اب یہ کام دوسروں کو کرنے دو۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔" رحیم شاہ بے دلی سے کہتا۔ کافی دن وہ بجھا بجھا رہا۔ لیکن بھرا پرا خاندان تھا۔ بچے بچیاں، محبت کرنے والے رشتے ناتے دار آخر کار بہل گیا۔ لیکن دل کی کسک دور نہیں کر سکا تھا۔ دوسری دلچسپیوں میں وقت گزارنے لگا۔ خاندانی زمین دار تھا۔ حکومت سے بھی بہت کچھ ملا تھا۔ خاندان کے نادار لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیا اور طویل و عریض کوٹھی میں خوب رونق ہو گئی۔

بہت سی دوسری دلچسپیوں کے ساتھ طبیعت میں پرستی بھی تھی۔ ولیوں اور درویشیوں سے دلی رغبت رکھتا تھا۔

چنانچہ یہ بھی کچھ مشاغل زندگی میں شامل کر لیے تھے۔ جب فوجی زندگی میں تھا تو ان کا موقع نہیں ملتا تھا۔ لیکن وقت سے پہلے ریٹائر ہونے کے بعد اس طرف بھی رغبت کچھ زیادہ بڑھ گئی تھی۔ زمینیں بہت

زیادہ تھیں جو سردار پور کے علاقے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ آبائی زمینیں تھیں۔ اور تقریباً تین پشتوں سے کرنل رحیم شاہ کے خاندان کی ملکیت تھیں۔ جانے پہنچانے لوگ تھے۔ سردار پور دارالحکومت سے قریب ترین آبادی تھی۔ بلکہ اگر اسے دارالحکومت کا نواحی علاقہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ لیکن دارالحکومت کی نسبت نہایت ہی پُر فضا جگہ تھی۔ خاص طور سے اس کے مشرقی علاقے میں پھیلے ہوئے پہاڑی میدان تو ایک طرح سے ایک پکنک پوائنٹ ہی بن گئے تھے۔ وہاں لاتعداد پہاڑی ٹیلے بکھرے ہوئے تھے اور ایک جگہ بلندی سے ایک آبشار گرتا تھا۔ جس نے علاقے کی زمین کو اس قدر پرفضا بنا دیا تھا کہ شہری آبادی سے لاتعداد افراد اس طرف آ جاتے تھے۔ اور جنگل میں منگل منا لیا کرتے تھے۔ آبشار کا یہ علاقہ بھی کرنل رحیم شاہ کی ملکیت ہی تھا۔ جب عملی زندگی میں تھے تو کوئی دوسرا مشغلہ نہیں دریافت ہوا تھا۔ لیکن اب سردار پور میں ایک ایسی جدید و قدیم کوٹھی بنوائی گئی تھی جو سردار پور جیسی جگہ کے لیے بڑی نادر و نایاب تھی۔ رحیم شاہ اب اس کوٹھی میں رہتا تھا۔ لیکن شہری آبادی سے چولی دامن کا ساتھ تھا۔ کوٹھی میں رہنے والے شہری اور دیہاتی زندگی کا بھرپور مزہ لیتے تھے۔ سردار پور ہی کے ایک نواحی علاقے میں ایک مزار تھا جسے نامعلوم پیر کے نام کا درجہ دیا جاتا تھا۔ پتا نہیں کب اس مزار کی تکمیل ہوئی تھی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد یہ بڑی نمایاں حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ بس وہی مسئلہ ہوتا ہے کہ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری ہو جائے۔ تو بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ جمعرات کی جمعرات مزار پر قوالیاں ہوا کرتی تھیں۔ کافی زائرین آ جایا کرتے تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد رحیم شاہ کو بھی اس کے بارے میں علم ہوا تو وہ خاص طور سے وہاں جانے لگا۔ اور باقاعدگی سے قوالیوں میں شرکت کرنے لگا۔ یہ بھی ایک اچھا مشغلہ تھا اس کے لیے اس دن بھی وہ مزار پر چھٹن میاں جمن میاں قوال کی قوالی سن رہا تھا۔ یہ بس روایتی قوال تھے اور لوگ انہیں پسند کرتے تھے۔ کرنل رحیم شاہ اپنے حواریوں کے ساتھ قوالیوں کی طرف متوجہ تھا کہ اس نے ایک شخص کو دیکھا۔ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی والی مثل غالباً اس شخص پر صادق آتی تھی۔ دبلا پتلا پچکا ہوا چہرہ غیر ضروری ہاتھ پاؤں جو بس یوں لگتا تھا جیسے کسی انسان کی تشکیل کرنے کے لیے بدن سے جوڑ دیے گئے ہوں۔ لمڈھینگ کا لفظ بھی اس پر صادق آتا تھا۔ لیکن رحیم شاہ اسے دیکھ کر بری طرح چونک پڑا تھا۔

''ارے صوفی صاحب!'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ یہ شخص تو کسی طور بھلایا نہیں جا سکتا تھا۔ کرنل رحیم شاہ اس شخص سے جس قدر متاثر ہوا تھا۔ وہی جانتا تھا۔ ایک بہت ہی اہم سلسلے میں دشمن ملک کے خلاف کام کر رہا تھا۔ صورت حال کچھ ایسی درپیش ہوگئی تھی کہ فوجی حکام کو محکمہ پولیس سے بھی رجوع کرنا پڑا۔ کرنل رحیم شاہ کا خیال تھا کہ بہت بڑی غلطی کی گئی ہے۔ معاملہ جس پائے کے لوگوں کا تھا وہ پولیس کے بس کی چیز نہیں تھی۔ لیکن پھر صوفی کو اس مشن پر بھیجا گیا اور کرنل رحیم شاہ کو تقریباً ایک ماہ تک صوفی کے ساتھ مل کر کام کرنا پڑا۔ کرنل رحیم شاہ اس سے زیادہ جھلاہٹ کا شکار پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ملٹری انٹیلی جنس میں رہ کر اس نے جو بیش بہا کارنامے سرانجام دیے تھے۔ انہیں اس کے خیال کے مطابق ملیامیٹ کرنے کے لیے یہ ریگستان کا جانور اس کے پاس بھیجا گیا تھا۔ لیکن اس ریگستان کے جانور نے جب اپنی عقل کے گل کھلائے تو کرنل رحیم شاہ کو اس کے سامنے کان پکڑنا پڑے ہر چیز ہی تو تھی اس کے اندر۔ گیارہ افراد کو تنہا رسیوں سے

باندھ کر لے آنا فلمی کہانی میں تو چل سکتا ہے، عملی طور پر یہ ایک ناممکن کام ہے۔ لیکن صوفی نے ان کی ہڈیاں
پسلیاں توڑ دی تھیں اور پھر وہ جو کچھ بچے تھے۔ انہیں رسیوں میں باندھ کر اس نے کرنل رحیم شاہ کے سامنے
پیش کر دیا تھا۔ یہ وہ گیارہ افراد تھے جو پڑوسی ملک کی سکیورٹی سروس کی ناک کے بال سمجھے جاتے تھے اور رحیم
شاہ کے ملک میں ایک بدترین سازش کر رہے تھے۔ رحیم شاہ شدت حیرت سے دیوانہ ہو گیا تھا۔ صوفی نے
جس طرح ان سب کو اپنے جال میں پھانسا تھا اس کی تفصیل نے رحیم شاہ کے ہوش و حواس چھین لیے تھے۔
واقعی اس کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ رحیم شاہ کا سارا نظریہ ختم ہو گیا تھا۔ اور وہ پاگلوں کی طرح یہ
سوچتا رہ گیا تھا کہ جو کچھ اس کے دماغ میں نہیں آیا، صوفی نے اس بارے میں کہاں سے سوچ لیا؟ اور یہ صوفی
آخر ہے کیا چیز؟ پھر اس کے بعد جب کیس ختم ہو گیا تو رحیم شاہ نے تھوڑا سا وقت نکال کر صوفی کی صحبت میں
گزارا اور درحقیقت وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ صوفی بھی کوئی درویش ہی ہے۔ جو اپنی عالمانہ قوتوں سے اس
طرح کے کارنامے سرانجام دے لیا کرتا ہے۔ لیکن صوفی نے اسے اپنے مخصوص سادہ انداز میں بتایا تھا۔
''درویش رحم کریں جناب! ولی؟ درویش اور عالم بننا تو دنیا کا سب سے مشکل کام ہے اور انسان
ہر طرح کے مشکل کاموں کا بیڑا اٹھا لے لیکن بہتر تو یہ ہے کہ وہ کبھی عالم اور درویش بننے کی کوشش نہ کرے۔
اس سے سب کچھ خراب ہو جاتا ہے۔ اور وہ جو کہتے ہیں نا کہ گھر کے رہے نا گھاٹ کے، دین بھی گیا دنیا بھی
گئی۔ یہ تو بہت بڑا درجہ ہے میں آپ سے اپنے تجربات کا ایک حصہ عرض کروں جناب! انسان کی اپنی ایک
پہنچ اور گنجائش ہوتی ہے۔ اگر وہ بہت زیادہ دین دار بننے کی کوشش کرے تو سیدھی سی بات ہے کہ درویشیت
کی منزل میں شامل ہو جاتا ہے۔ پھر وہاں سے امتحانات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور یہ امتحان معمولی نہیں
تھے۔ آپ یہ سمجھ لیجیے گا کہ ان امتحانات سے دوچار ہو کر درویشوں کے کرم سے کھاٹ کھڑی ہو جاتی ہے۔
بات بڑی جان دار تھی۔ کرنل رحیم شاہ خود بھی اس سے متفق تھا۔ چنانچہ خاموش ہو گیا اور واقعی یہ سوچنے لگا کہ
بس ایک حد ہی مناسب ہوتی ہے۔ کیونکہ خود بھی اسی زندگی کا عادی تھا اس کے بعد وہ دوسری مصروفیات میں
لگ گیا۔ لیکن صوفی کبھی اس کے ذہن سے نہیں نکل سکا تھا۔ بعد میں بہت سے دوسرے معاملات سامنے آ
گئے۔ بیمار ہوئے ٹانگ کٹ گئی۔ اور صوفی بھی ذہن سے اوجھل ہو گیا لیکن اس وقت ایک نگاہ دیکھ کر اس نے
صوفی کو پہچان لیا تھا۔ چنانچہ شدت جوش سے اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور صوفی کے قریب پہنچ گیا۔

''صوفی صاحب۔''

''حق اللہ۔'' صوفی نے نعرۂ مستانہ بلند کیا۔

''ذرا ادھر تو دیکھیے جناب۔''

''سبحان اللہ۔ واہ۔ واہ۔ واہ واہ...... واہ واہ۔'' صوفی نے بہ دستور گردن پٹختے ہوئے کہا۔ بہ مشکل
تمام کرنل رحیم شاہ اسے اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہوا تھا وہی مدقوق چہرہ پانوں کی دھڑی ہونٹوں پر
جمی ہوئی لیکن اس وقت یہ پان دان خالی تھا۔ ظاہر ہے وِرد ہو رہا تھا۔ جو منہ میں پان لے کر نہیں کیا جا سکتا
تھا۔ میلی کچیلی شیروانی، کھلے پائنچوں کا پائجامہ، وہی انداز مستانہ جو صوفی کی شان تھی۔ بمشکل زرتن رحیم شاہ کی
طرف دیکھا اور کرنل نے کہا۔

''مجھے پہچانے صوفی صاحب۔''

''پہچان لیا درویشیوں کے کرم سے۔''

''اتنی جلدی۔''

''حق اللہ......اللہ ہو......اللہ ہو......اللہ ہو۔'' صوفی اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور رحیم شاہ نے سمجھ لیا کہ اس وقت وہ جذب کے عالم میں ہے۔ چنانچہ وہ الگ ہو کر بیٹھ گیا۔ رات کو تقریباً پونے دو بجے رحیم شاہ کے ساتھیوں نے کہا کہ اب اٹھا جائے بہت وقت ہو گیا ہے ویران فاصلہ طے کر کے کوٹھی میں پہنچنا ہو گا۔

''ممکن نہیں ہے دوستو! تم میں سے جو جانا چاہے چلا جائے۔ میں آ جاؤں گا۔ قوالی ختم ہوئی تو صوفی صاحب سے ذرا رابطہ کرنا ہے۔'' لیکن شکر تھا کہ دو بجے قوال تھک گئے اور محفل قوالی کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔ تب کہیں جا کر صوفی کی حالت بہتر ہو سکی کرنل رحیم شاہ اپنی بیساکھی ٹیکتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گیا۔

''صوفی صاحب۔''

''سلام عرض کرتا ہوں جناب۔ سلیوٹ نہیں مار سکتا۔''

''آپ یہ بتائیے آپ نے مجھے پہچان لیا۔''

''پہلے بھی عرض کیا تھا درویشیوں کی دعا سے۔''

''مجھے تعجب ہوا۔ آپ کے حلیے میں تو خیر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لیکن میں اپنی ایک ٹانگ کھو بیٹھا ہوں۔''

''درویش رحم کریں۔'' صوفی بے تاثر لہجے میں بولا۔ اس کے انداز میں کوئی خاص تپاک نہیں تھا۔ لیکن کرنل رحیم شاہ اس سے بہت متاثر تھا کہنے لگا۔

''صوفی صاحب! کہاں قیام ہے آپ کا۔''

''جناب من! اس سامنے والے درخت کے نیچے۔'' صوفی نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''بس مزار اقدس پر حاضری دینی تھی۔ قیام بھلا کون سی بڑی چیز ہے۔ سرہانے اینٹ رکھ کر آرام سے سو جاتا ہوں جو نیند آتی ہے۔ اس کا کوئی ثانی نہیں ہوتا۔''

''ارے واہ! کوئی اور ہے آپ کے ساتھ۔''

''جی ہاں۔''

''کون ہے۔''

''اینٹ۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''نہیں میرا مطلب ہے اہلیہ وغیرہ۔''

''اس سلسلے میں نااہل ہیں درویشوں کے کرم سے۔''

''واہ۔ اہلیہ کے ساتھ نااہل۔''

''جی ہاں۔ وہ جو عرض کیا ہے نا کہ۔

جو اہل ہوتے ہیں انہیں ملتی ہے اہلیہ
ہر شخص کے نصیب میں منے کی ماں کہاں

کرنل رحیم قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ پھر کہا۔

''صوفی صاحب! آپ نے ایک لفظ کہا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے مجھے پہچان لیا۔ میں وہ لفظ نہیں دہراؤں گا۔ آپ یہ بتائیے کہ آپ مجھے کس طرح پہچانتے ہیں۔''

''آپ کرنل رحیم شاہ صاحب ہیں۔ ملٹری انٹیلی جنس سے آپ کا تعلق رہا ہے۔''

''اوہ۔ واقعی باکمال شخصیت ہے آپ کی صوفی صاحب! آپ نے ایک لفظ اور استعمال کیا کہ میرا تعلق ملٹری انٹیلی جنس سے رہا ہے۔ مطلب یہ کہ ہے نہیں۔''

''معذرت خواہ ہوں کسی پر نکتہ چینی کرنا میرا مزاج نہیں رہا۔ درویشوں کی دعا سے اللہ تعالیٰ آپ سب پر رحم کرے۔ ہم پر بھی۔ ایک ٹانگ ضائع ہونے کے بعد لازمی امر ہے کہ آپ ملٹری میں نہیں رہے ہوں گے۔ میرا مطلب ہے کہ ریٹائر کر دیے گئے ہوں گے۔'' صوفی نے کہا۔

''ماشاء اللہ ذہنی رسائی اس قدر بے مثال ہے آپ کی۔ اچھا خیر چھوڑیے ان باتوں کو میں آپ کو اپنے ساتھ لے چلنا چاہتا ہوں۔ یہیں سردار پور میں میرا چھوٹا سا گھر ہے۔ آپ سے بہت ہی اہم گفتگو کرنی ہے۔''

''ہم مزار پر آئے ہیں اور بزرگوں کی قربت سے دور نہیں رہنا چاہتے۔ آپ براہ کرم زحمت نہ کریں۔ ہم یہیں بہت خوش ہیں۔''

''مجھے آپ سے بہت ضروری کام ہے صوفی! بے شک آپ کل صبح آ جائیے۔ ویسے بھی رات کو اب آپ کو سونا ہی ہے۔ تھوڑی دیر باتیں کریں گے۔'' اس کے بعد صوفی نے ایک لمحے تک کچھ سوچا پھر بولا۔

''ٹھیک ہے جیسا آپ کا حکم۔'' اور اس کے بعد کرنل رحیم شاہ اس کو ساتھ لے کر اپنی قیام گاہ پر چل پڑا تھا۔ اہل خاندان سو چکے تھے۔ گھر میں خوب رونق رہا کرتی تھی۔ بہت سے افراد تھے۔ لیکن اس وقت سب سو چکے تھے۔ چنانچہ رحیم شاہ نے صوفی سے کہا۔

''صبح ہی صبح مزار کی تقریبات نہیں شروع ہو جاتیں۔ آپ آرام سے رات گزاریں، صبح کو ہمارے ساتھ ناشتا کریں اس کے بعد مشاغل طے کر لیے جائیں گے۔ میں بھی آپ کو بتاؤں کہ مجھے ولیوں اور درویشوں سے بڑی عقیدت ہے اور میں اکثر مزارات پر جاتا رہتا ہوں۔''

''واہ'' اچانک ہی صوفی کا چہرہ کھل گیا۔

''اگر یہ بات ہے تو پھر تو ٹھیک ہے۔''

''آئیے میں آپ کو آپ کا کمرا دکھا دوں۔'' صوفی کو ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا اور کرنل رحیم شاہ اس کے بارے میں سوچتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دوسرے دن صبح کرنل رحیم شاہ نے اپنے اہل خاندان کو اس کے بارے میں بتایا کہ وہ ایک معزز دوست کو لے کر آیا ہے ناشتے پر ان سے تعارف کرائے گا۔

نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے لیے صوفی ایک نایاب چیز تھا۔ میلا کچیلا لباس جو اس نے چہرہ دھو کر پہن ڈالا تھا۔ غالباً نہایا نہیں تھا۔ چونکہ چہرہ تو بے شک صاف نظر آ رہا تھا۔ لیکن گردن پر گردوغبار کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ سب نے حیرانی سے کرنل رحیم شاہ کے اس مہمان کو دیکھا۔ کرنل رحیم شاہ بڑی نفیس طبیعت کا انسان تھا۔ اس کے شناساؤں اور دوستوں میں بھی بڑے سلیقے کے لوگ نظر آیا کرتے تھے۔ یہ عجیب وغریب مہمان سب کے لیے باعث دلچسپی تھا بلکہ جب وہ اندر داخل ہوا تو کرنل کے بھتیجے نے پاس بیٹھی ہوئی کزن کے کان میں کہا۔

''اب یہ بھی ہوگا یہاں۔ میرا خیال ہے چچا جان کوئی عجائب گھر بنانا چاہتے ہیں۔'' کزن نے پاؤں دبا کر اسے خاموش کر دیا تھا۔ کیونکہ کرنل کے کان بہت تیز تھے سرگوشیاں بھی آسانی سے سن لیتا تھا۔ بہر حال صوفی کا سب سے تعارف کرایا گیا۔ باقی کوئی تفصیل نہیں بتائی گئی تھی۔ ناشتے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد کرنل نے کہا۔

''صوفی صاحب! شاید آپ نے غسل نہیں کیا۔''

''جی۔ صرف منہ دھو لیا تھا۔''

''کیوں غسل کرنے میں کوئی دقت تھی۔''

''جی ہاں۔''

''ارے کیا۔''

'وہ اصل میں سامان کا تھیلا کوئی حضرت چوری کر کے لے گئے۔ پہلے تھیلے ہی کو تکیہ بنایا تھا۔ ایک دن کی تو بچت ہو گئی تھی درویشیوں کے کرم سے، اس میں کچھ کپڑے تھے۔ ہم انتظار کر رہے تھے کہ ایک معذرت نامے کے ساتھ تھیلا واپس آ جائے گا چونکہ لباس ہمارا تھا اور ہم لباس صرف اس چیز کو سمجھتے ہیں جو بدن پر پہن لی جائے۔ اب ہمارا یہ لباس اس کے کس کام کا؟ لیکن بد بخت واپس نہیں آیا درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے سنایا اور کرنل رحیم شاہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

''خیر اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے لیے کپڑے کا بندوبست کر دوں۔''

''نہیں کپڑے ہیں ہمارے پاس بہت سے۔''

''اب یہ بتائیے کہاں تعیناتی ہے آج کل۔''

''لال پل پر۔ ہر مال دس روپے کا تھیلا لگاتے ہیں۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''کیا۔'' کرنل رحیم شاہ نے حیرانی سے صوفی کو دیکھا۔

''جی ہاں۔ بہ فضل تعالیٰ سوڈیڑھ سو کی روز کی بچت ہو جاتی ہے کچھ ہمارے کام آ جاتے ہیں اور کچھ ان لوگوں کے جو ہم سے کسی نہ کسی شکل میں متعلق ہیں۔ مثلاً بدرو، کبابیہ، کباب بنانا آتے نہیں ہیں بس خواہ مخواہ سیخ پر طبع آزمائی کرتا رہتا ہے۔ احمق کہیں کا اور بھی کچھ افراد ہیں۔''

''آپ کی بات میرے بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔'' کیا آپ تھانا لال پور پر ہیں۔''

''جی نہیں۔ تھانوں سے ہمارا تعلق ختم ہو چکا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''بس جناب! تغیرات زمانہ تو انسان کی زندگی سے منسلک ہوتے ہی ہیں۔ نئے آئی جی صاحب کے کان بھر دیے گئے کہ ہم محکمے کے قوانین سے بغاوت کرتے ہیں۔ اب دیکھیے نا ذمے داری تو ذمے داری ہوتی ہے۔ لباس اور انسان کی اپنی ضروریات و مشغولیات ذاتی مسئلہ ہوتی ہیں۔ مگر آئی جی صاحب نے دشمنوں کی بات پر یقین کر لیا ہمیں طلب کیا گیا، کہا گیا استعفا لکھیں۔ لکھ دیا۔ دوسرا حکم ملا کہ اس کے بعد پولیس ایریا کی حدود میں نہ آئیں۔ ہم نے سوچا کہ اپنے سے اعلا عہدے داروں سے جھگڑا مول نہیں لینا چاہیے۔ چنانچہ اب کسی بھی علاقے کے تھانے سے کوئی سو گز دور سے نکلتے ہیں۔ زندگی گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ اب ہر مال دس روپے بیچا کرتے ہیں۔'' کرنل رحیم شاہ حیران رہ گیا۔ صوفی جیسی اعلا شخصیت اس قدر ذہین اور قابل انسان کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا ہے۔ صوفی کی مرنجان مرنج فطرت سے بھی واقف تھے۔ ظاہر ہے وہ اس طرح کا انسان تھا۔ اس سے جو کچھ کہا گیا اس نے کر ڈالا لیکن کرنل رحیم شاہ کو اس سے خوشی ہوئی تھی۔ اس کے اپنے ذہن میں طویل عرصے سے جو کھچڑی پک رہی تھی۔ صوفی کو دیکھ کر وہ کھچڑی ایک دم تیار ہونے لگی تھی۔ کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

''قیام آپ کا وہیں دارالحکومت میں ہے۔''

''جی ہاں۔ ایک حلقہ ہے ہمارا۔ بمن خان تندور والے نیاز اللہ بیگ اور دوسرے تمام افراد جو کہتے ہیں نا کہ مردم کے ساتھ وہ ہمارے لیے ایسی ہی حیثیت رکھتے ہیں۔''

''ہاں آپ روایتی لوگ ہیں۔ آپ جیسے لوگوں کی دوستی کسی کو حاصل ہو جائے تو وہ ایک خوش نصیب انسان ہوگا۔'' کرنل رحیم شاہ نے کہا۔ اور صوفی جھک جھک کر اسے آداب کرنے لگا۔

''کرم نوازی ہے آپ کی ورنہ ہم کہاں اور آپ کہاں۔'' تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

''ایک بات بتائیے صوفی صاحب! ظاہر ہے آپ یہاں مزار پر آئے ہیں۔ ابھی تو اس مزار کی تقریبات مزید تین دن چلیں گی کیا تینوں دن یہاں قیام رہے گا آپ کا۔''

''جی پہلے ہمارے ساتھ حکیم سرفراز حسین آنے والے تھے لیکن بعد میں ان کا کچھ ارادہ ملتوی ہو گیا تو ہم تنہا ہی آ گئے۔ عرس کی تمام تقریبات میں شرکت کریں گے۔''

''تو ایک پیشکش اگر آپ میری قبول کر لیں تو آپ کا شکر گزار رہوں گا۔''

''آپ حکم فرمائیے بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔''

''اگر ان دنوں میں آپ میرے ہی ساتھ قیام کریں تو کیا حرج ہے۔ عرس کی تقریبات تو شام کو چھ بجے کے بعد شروع ہوتی ہیں اسی وقت قوالیاں وغیرہ بھی ہوتی ہیں۔ سارا دن آپ وہاں کیا کریں گے۔ گرمی اور دھوپ سے تپیں گے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے حضور من لیکن اس مہذب ماحول میں ہم جیسے بے تکے شخص کی مداخلت کچھ غیر مہذب سی نہیں ہو جائے گی۔''

''بالکل نہیں ہوگی۔ آپ یہ سمجھ لیجیے کہ میں آپ کے پرستاروں میں سے ہوں۔ آپ نے مجھے

پہچان لیا ہے۔ تو ماضی کے وہ لمحات بھی آپ کو یقیناً یاد آ گئے ہوں گے جن میں میری اور آپ کی قربت رہی۔ اور آپ نے بے مثال کارنامے سرانجام دے کر مجھے اپنا گرویدہ بنالیا۔ صوفی صاحب میں آپ سے اتنی اہم گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ آپ تصور نہیں کر سکتے۔ آپ یقین کریں آپ کا مل جانا میرے لیے اس قدر دلکش اور دلچسپی کی بات ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ یوں سمجھ لیں کہ آپ میری ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل ہیں۔''

''شرمندہ کر رہے ہیں آپ ہمیں درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی نے شرمائے ہوئے انداز میں گردن جھکا کر کہا پھر بولا۔

''اب اگر ایسا ہی ہے اور آپ سچے دل سے یہ بات کہہ رہے ہیں تو بھلا انکار کی کیا گنجائش ہے ایک ہم ذوق مل جائے تو زندگی کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ ہم آپ سے دست بستہ التجا کرتے ہیں کہ ہماری ایک خواہش پوری کر دیجیے۔''

''ہاں ہاں حکم، حکم، حکم۔''

''وہ دراصل مزار شریف پر تو پان کھانا مزار کی بے حرمتی ہے یہاں کوئی پر ذوق انسان نہیں ملا جو پان کا شوقین ہو ہم ترسے ہوئے ہیں اگر اس کا......''

''ارے آپ فکر ہی نہ کریں میری خالہ جان میرے ساتھ رہتی ہیں اور صوفیہ خالہ کو ہم پان خالہ کہتے ہیں۔ سارے دانت جھڑ چکے ہیں لیکن پان پنکٹی میں ڈال کر کچلتی ہیں اور پھر کھاتی ہیں اعلا درجے کا قوام، زبردست تمباکو میں پہلے اس کا انتظام کرتا ہوں۔''

''اے سبحان اللہ۔ اس کا مطلب ہے کہ ماشاء اللہ باذوق ہیں اور اعلا مزاج رکھتے ہیں حضور کچھ زحمت ہو جائے۔''

''بس ابھی لیجیے۔ کرنل رحیم شاہ خود اپنی جگہ سے اٹھ گئے تھے ملازموں کو مزید ہدایات دینی تھیں۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد پانوں سے لدے پھندے داخل ہوئے۔ بہت سی کلوریاں بنوائی تھیں۔ چھالی، زادہ قوام غرض ہر چیز وافر مقدار میں۔ صوفی تو جیسے ان پر عاشق ہو گیا تھا۔ بڑی محبت اور خوشی کے ساتھ اس تو نے دو تین کلوریاں منہ میں رکھیں اور پھر جگالی کرنے لگا۔ بہت دیر تک کرنل رحیم شاہ نے اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ پر جب کرنل رحیم شاہ نے یہ دیکھا کہ منہ تو اگال دان ہی بنا ہوا ہے تو اس نے خود ہی سلسلہ شروع کیا۔

''قمیص، پائجامہ مہیا کر دیے جائیں گے مگر شیروانی کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔''

''غم غم...... غم غم...... غم غم۔'' صوفی نے آخری غم غم چھت کی طرف ہاتھ کر کے کہا تھا اس کا مطلب تھا کہ وہ شکریہ ادا کر رہا ہے۔ بہر حال کرنل رحیم شاہ نے خود خاطر مدارات کی تھی صوفی کی اور صوفی نہال ہو گیا تھا۔ شام کو چھ بجے کرنل رحیم شاہ صوفی کو ساتھ لے کر اپنی جیپ میں بیٹھ کر مزار چل پڑا اور پھر تقریباً ساڑھے بارہ بجے تک قوالیوں کی محفل میں ہنگامہ آرائی ہوتی رہی۔ رحیم شاہ نے صوفی کے ہاتھوں قوالوں کو نوٹ دلوائے تھے اور یہ بھی ایک دلچسپ طریقہ کار ہوتا ہے۔ ایک کے ہاتھ میں نوٹ رکھے جاتے ہیں اور نوٹ رکھنے والا اس کے ساتھ پھدکتا ہوا قوالوں تک پہنچتا ہے۔ اور قوالوں کو یہ نوٹ پیش کیا جاتا ہے۔ قوال اپنی جگہ سے اٹھ کر خود بھی پھدک پھدک کر یہ نوٹ قبول کرتا ہے۔ اور نوٹ پیش کرنے والے واپس آ

جاتے ہیں لیکن بعض اوقات قرب و جوار کے حضرات کو بھی شرارت سوجھتی ہے تو وہ کسی ایک شخص کو ٹارگٹ بنا لیتے ہیں۔ اور وہ بیٹھنے بھی نہیں پاتا کہ دوسرا کوئی شخص نوٹ لے کر اس کے پاس پہنچ جاتا ہے اور اس کے ہاتھوں پر رکھ کر اسے پھر اسی طرح پھدکاتا ہوا قوالوں کی طرف لے جاتا ہے۔ صوفی کی شخصیت ایسی لمڈھینگ تھی کہ لوگوں نے اسے تاڑ لیا اور ساڑھے بارہ بجے تک صوفی کو تھکا تھکا کر رکھ دیا۔ وہ تو شکر ہے کہ اس کے بعد قوالی کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا اور عرس کی محفل آج ذرا جلدی ختم ہو گئی تھی۔ چنانچہ صوفی کو نجات ملی۔ کرنل رحیم شاہ اس کو اپنے ساتھ لے کر چل پڑا تھا۔

''آپ تھک گئے ہوں گے صوفی صاحب۔''

''نہیں نہیں۔ بھلا ایسی کیا بات ہے یہ تو محفل ادب ہوتی ہے۔ اور ادب کی ان محفلوں میں تھکن کی گنجائش نہیں ہوتی۔''

''آپ باکمال ہیں کل ہماری اور آپ کی نشست ہو گی۔'' پھر دوسرے دن ناشتے کے بعد کرنل رحیم شاہ صوفی کو لے کر اپنے کمرے میں گھس گیا تھا جب کہ اس کے اہل خاندان ناشتے کی میز سے اٹھ کر قہقہے لگاتے ہوئے صوفی پر تبصرہ آرائیاں کر رہے تھے۔ نوجوان لڑکوں کا خیال تھا کہ صوفی کوئی خلائی مخلوق ہے۔ جو کرنل رحیم شاہ کو مل گئی ہے۔ کوئی کچھ کہتا تھا اور کوئی کچھ۔ لیکن کرنل رحیم شاہ صوفی سے اپنے دل کی بات کرنا چاہتا تھا۔ تنہا کمرے میں اس نے صوفی کو بلایا اور کہا۔

''صوفی صاحب! جس مہم میں میرا اور آپ کا ساتھ ہوا تھا وہ ملک کی بہتری کے سلسلے میں ایک ایسی خطرناک مہم تھی کہ اگر آپ بڑی زبردست ذہانت کے ساتھ ان دشمنوں کی کاوشوں کو ناکام نہ بناتے تو بے شمار انسانی زندگیاں تو ضائع ہوتیں ہی لیکن ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا۔ اس بڑی مہم میں آپ نے جو کارنامہ سرانجام دیا تھا میں اسے مرتے وقت تک نہیں بھول سکوں گا۔''

''دعائیں ہیں بس درویشوں کی جناب! بھلا ہم کیا کر سکتے ہیں یہ پیروں، فقیروں اور درویشوں ہی کی دین ہے کہ عقل بروقت کام کر جاتی ہے۔ حق اللہ...... حق اللہ۔''

''بے شک صوفی صاحب! اس سلسلے میں میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔ اچھا مجھے ایک بات بتائیے۔ طویل عرصہ آپ نے محکمہ پولیس اور محکمہ سراغ رسانی میں کام کیا ہے اور بیش بہا کارنامے سرانجام دیے ہیں جن کی تفصیل اس وقت مجھے ملی تھی جب آپ کو اس مہم میں شامل کیا جا رہا تھا۔ صوفی صاحب وطن کی محبت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔''

''حضور من! جس طرح انسان کو ماں کے سائے سے پیار ہوتا ہے۔ جس طرح وہ ماں کی چھاتی سے چمٹ کر زندگی حاصل کرتا ہے۔ اور ماں کا وہ سینہ اور دوپٹے کا پلو جو اس کے وجود پر ڈھکا ہوتا ہے۔ اگر اس کے لیے نہ ہو تو تیز دھوپ گرد و غبار زندگی کو داغ دار کر دے۔ وطن بھی ہماری ماں ہے اس کا آسمان ہماری ماں کے دوپٹے کا پلو ہے۔ میں اپنے وطن عزیز کو ماں کی طرح ہی پیار کرتا ہوں۔''

''سبحان اللہ صوفی صاحب! کیا عظیم بات کہی ہے آپ نے۔ آئی جی صاحب نے آپ سے استعفا لے لیا۔ اس کے بعد آپ کے دل میں یہ خیال نہیں ابھرا کہ آپ کچھ کریں میرا مطلب ہے کہ وطن کے

لیے وطن کے معاملات سے پیچھے نہ ہٹیں۔"

"بات اصل میں یہ ہے جناب کہ محکماتی طور پر تو مجھے کتنی ہی بار سرزنش کی گئی ہے معطل کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ برخاست تک کر دیا گیا ہے۔ پھر بلا لیا گیا ہے یہ نوکری تو آنی جانی چیز ہے۔ اس کے بعد میں نے چند افراد کے ساتھ مل کر ڈی ٹی لمیٹڈ کی بنیاد رکھی تھی۔ وہاں سے بھی یاران طریقت مجھے اٹھا لے گئے۔ اور پھر پولیس میں گھسیٹ لیا گیا۔ محکمہ سراغ رسانی کے کچھ اعلا افسران بھی مجھ سے پرخاش رکھتے ہیں۔ بس یہ ہے ساری صورت حال کیا عرض کر سکتا ہوں۔"

"اور اس کے بعد آپ نے وطن دشمنوں کو معاف کر دیا۔"

"نہیں کوئی وطن دشمن میرے سامنے ہی نہیں آیا۔"

"صوفی صاحب! ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں اور ہمارا ملک جس طرح بڑی طاقتوں کا آلہ کار بن گیا ہے اور ان کے بوجھ تلے دب گیا ہے اور جس طرح وہ بڑی طاقتیں ہمارے دشمنوں کی پذیرائیاں کر رہی ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان بدترین حالات میں میری یا آپ کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی ہے۔"

"ہرگز نہیں جناب! لیکن ایک مسئلہ یہ ہوتا ہے درویشوں کے کرم سے کہ ہم اپنے طور پر کیا کر سکتے ہیں اگر ذاتی طور پر کاوش کریں تو غدار وطن کہلا دیے جائیں گے۔ ملکوں کے قوانین ہمیں اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ آپ بتائیے ان حالات میں کیا کیا جا سکتا ہے۔"

"ہاں صوفی صاحب! اصل بات یہی ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اس کا ایک حل سوچا ہے کہ اگر مجھے اس جسمانی نقص کا شکار نہ ہونا پڑتا تو آپ یقین کریں کہ میں اپنی زندگی کے حالات آپ کو بتاؤں میں نے اپنے اعلا حکام کے حکم پر بہت کچھ تو کیا ہی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی میں ہر اس موقع کو ہاتھ سے نہیں گنواتا تھا۔ جو وطن دشمن افراد کی سرکوبی کے لیے ہوتا تھا۔ دیکھیے...... وطن دشمن صرف سرحد پار کے لوگ ہی نہیں ہیں۔ یا وہ نہیں ہیں جنھوں نے ہماری حقیقت کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ بلکہ وطن دشمن ہر وہ شخص ہے جو وطن میں رہنے والے کسی بھی اہل وطن کو کوئی ذہنی مالی یا جسمانی نقصان پہنچائے۔ منشیات فروش یا قومی راز بیچنے والے ہر اسمگلر، چور، یا ڈاکو ان میں سے ہر شخص وطن دشمن ہے۔ آپ یہ سمجھ لیجیے کہ ہر شخص وطن کا مقروض ہے اور وہ ایسے وطن دشمنوں کو جو کسی بھی ایک فرد کے لیے نقصان کا باعث بنے گرفتار کرائے تو گویا اپنا فرض پورا کرتا ہے۔"

"صحیح فرمایا آپ نے درویشوں کے کرم سے۔"

"صوفی صاحب! وقت نے مجھے میرے منصب سے ہٹا دیا مگر میرا دل ہر وقت اس احساس سے تڑپتا رہتا ہے کہ کاش! میں وطن کی خدمت کر سکتا۔ صوفی صاحب! تھوڑا سا معذور ہو گیا ہوں تنہا ذہن سب کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ سے ملاقات ہوئی تو حوصلہ بڑھ گیا۔ میں کچھ تجاویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

"ارشاد...... ارشاد......" صوفی نے دلچسپی سے کہا اور پان کی ایک گلوری نکال کر منہ میں رکھ لی۔

"میں ایک ایسی آرگنائزیشن بنانا چاہتا ہوں جو خفیہ طور پر وطن دشمنوں کے خلاف کام کرے۔ وزارت داخلہ کے فرسٹ سیکرٹری سر سلطان میرے گہرے دوست ہیں۔ اس کے علاوہ بھی میرے بہترین

کرنل رحیم شاہ کو صوفی اور صوفی کو کرنل رحیم شاہ اس طرح سوٹ کر گئے تھے کہ دونوں لازم وملزوم ہو گئے۔ دونوں کے نظریات ملتے تھے۔ کرنل رحیم شاہ وطن کی محبت سے سرشار تھا اور ایک جانباز فوجی ہونے کی حیثیت سے اس بات پر افسردہ تھا کہ وہ جو وطن دشمنوں کو بھرپور طریقے سے جواب دے سکتا تھا وہ معذور ہو کر رہ گیا تھا۔

"لیکن میرے ذہن میں ہمیشہ یہ احساس پلتا رہتا تھا صوفی صاحب کہ اگر خداوند عالم مجھے موقع دے تو میں جس طرح بھی بن پڑے اپنے وطن کی خدمت کروں۔ آپ یقین کیجیے میری نگاہیں کسی ایسے محب وطن کی تلاش میں بھٹکتی رہتی تھیں جو میرے ہی انداز فکر کا ہم خیال ہو اور قدرت نے کیا ملایا مجھے آپ کو۔ یہ بھی میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں کہ پہلے آپ میرے ذہن میں نہیں آئے تھے ورنہ میں آپ کو کہیں نہ کہیں تلاش کر لیتا اسے کہتے ہیں قدرت کی رہنمائی۔ اگر میں اس مزار پر نہ جاتا تو میری ان ناآسودہ خواہشوں کی تکمیل کبھی نہ ہوتی۔"

"ہم بھی آپ کے حکم سے پیچھے نہیں ہیں درویشوں کے کرم سے۔" صوفی نے کہا۔

جب تک صوفی کرنل رحیم شاہ کی اس دیہی کوٹھی میں رہا۔ جو سردار پور میں واقع تھی تو وہاں رہنے والے لڑکے لڑکیوں کے لیے بڑی دلچسپی کا باعث بنا رہا۔ کرنل رحیم شاہ نے وہاں تقریباً اپنا پورا خاندان ہی آباد کر لیا تھا۔ بہت سے نوجوان لڑکے لڑکیاں عمر رسیدہ اشخاص کرنل رحیم شاہ کے ٹکڑوں پر پلنے والے۔ لیکن کرنل کی فطرت کچھ اس طرح کی تھی۔ وہ دوسروں کی خوشی سے خوش رہتا تھا۔ کوٹھی میں رہنے والے بہت سے لوگ کرنل کی اس فطرت سے فائدہ اٹھاتے تھے اور بہت سے ایسے تھے جو کرنل کی شخصیت سے محبت کرتے تھے اور یہ سچ تھا کہ اس پرآشوب دور میں بھی کرنل محبتوں سے محروم نہیں تھا۔ خاص طور سے گھر کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اس سے بہت متاثر تھے۔ پہلی بات تو کرنل کی حب الوطنی تھی۔ وطن کے نام پر کرنل کی آنکھوں میں محبت کا نور ابھر آتا تھا اور یہ بات سب ہی جانتے تھے کہ کرنل وطن سے کتنی محبت کرتا ہے۔ نوجوان نسل اگر وطن کی محبت سے سرشار نہ ہو تو یہ ملکوں کی بدنصیبی ہوتی ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے اس ملک کو نوجوانوں کا پیار حاصل تھا اور نوجوان رشتوں ناتوں کے جھگڑوں سے بہت دور ہٹ کر وطن کی محبت سے سرشار افواج سے بے پناہ پیار کرتے تھے۔ کرنل کے گھر میں بھی ایسے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں موجود تھے۔ جن پر کرنل کو مکمل اعتماد تھا۔ البتہ یہ ذہنی طور پر اس قدر پختہ نہیں تھے کہ کرنل ان سے اپنا کوئی مقصد براری کرتا۔ حالانکہ ان میں سے چند لڑکے اس کے ذہن میں ضرور تھے۔ جو تعلیم یافتہ بھی تھے اور قابل اعتماد بھی لیکن بس کرنل تنہا ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی ایسی شخصیت اسے مل جائے۔ جسے اپنا دست راست بنا کر وہ کام کا آغاز کر سکے اور پھر اسے صوفی نظر آ گیا تھا۔ جو اپنی مثال آپ تھا۔ البتہ لڑکے لڑکیاں اسے دیکھ کر بڑی حیرت کا شکار ہوئے تھے۔ قدوس نے رابعہ سے کہا تھا۔

"یار رابعہ! یہ چچا میاں کو کیا ہو گیا۔ کیا چیز پکڑ لائے ہیں وہ۔ یوں لگتا ہے جیسے فرشتوں کے پاس انسانوں کو بناتے بناتے کچھ میٹریل بچ گئی ہو تو انہوں نے ادھر ادھر سے سب کچھ جوڑ جاڑ کر ایک آدمی بنا دیا ہو۔ لمڈھینگ بے تکا کم بخت کا منہ تو اگالدان بنا رہتا ہے۔ کتنے پان کھاتا ہے وہ اور حیرت کی بات یہ ہے

کہ چچا جان نے اسے خود پان مہیا کیے ہیں۔ دادی اماں سے پاندانی رشتہ قائم ہو گیا ہے اس کا۔'' پاندانی رشتے پر رابعہ ہنس پڑی۔

''بس تمہیں تو لفاظی چاہیے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں واقعی۔''

''باقی لوگوں کا بھی یہی حال ہے سارے کے سارے حیرانی کا اظہار کر رہے ہیں۔''

''یار! پھر ایک کام کیوں نہ کریں۔ چچا جان نے ہمیں کبھی کسی معاملے میں نظر انداز تو نہیں کیا ہے۔ پوچھ ڈالتے ہیں کہ بھائی یہ پیر صاحب کہاں سے پکڑے۔ چچا جان کے مرشد ہیں یا کوئی اور چکر ہے۔''

لڑکے لڑکیوں نے پورا گروپ بنا کر ایک شام کرنل رحیم شاہ کو گھیر ہی لیا۔ ''واہ، واہ، واہ واہ تم سب کے چہروں سے پتا چل رہا ہے کہ کوئی تجسس ذہن میں لے کر آئے ہو۔''

''بالکل ٹھیک چچا جان! یہ صوفی صاحب کون ہیں۔''

''تعجب ہے تم نے اتنی دیر میں ان کے بارے میں کیوں پوچھا۔''

''بس ہمت کر رہے تھے سوچ رہے تھے کہ آپ کا ان سے کوئی جذباتی رشتہ نہ ہو اور ہمارے کسی سوال پر آپ ناراض نہ ہو جائیں۔''

''نہیں خیر اب ایسی بات نہیں ہے۔ تمہارے کسی سوال پر میں تم سے ناراض کہاں ہوتا ہوں۔''

''تو پھر بتائیے نا۔ کیا یہ آپ کے پیر بھائی ہیں۔ پیر ہیں یا آپ کے مرید ہیں کیا ہیں۔''

''نہ یہ پیر بھائی ہیں، نہ پیر ہیں اور نہ میرے مرید ہیں۔ میں تم لوگوں کو ان کے بارے میں بتاؤں گا۔ تو تم یقین نہیں کرو گے۔''

''نہیں چچا جان! آپ کی بات پر کیوں نہیں یقین کریں گے۔ کبھی ہمارے اور آپ کے درمیان جھوٹ کا رشتہ رہا ہے۔''

''نہیں میرے بچو! میں نے کوشش یہی کی ہے کہ تمہارا دوست رہوں اور تمہیں اپنے آپ سے دور نہ ہونے دوں۔ تم ہی نے تو میری زندگی قائم رکھی ہوئی ہے۔''

''چچا جان! ہم کبھی آپ کے اعتماد کو دھوکا نہیں دیں گے۔''

''صوفی کا تعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ سے تھا۔ یہ محکمہ سراغ رسانی میں بھی رہ چکے ہیں اور پولیس کے مختلف محکموں میں کام کرتے رہے ہیں۔ سب سے بڑی بات میں تمہیں یہ بتاؤں کہ کتنی ہی بار انہوں نے اپنی اعلا ذہانت سے کام لے کر کچھ ایسے فوجی مقاصد کی تکمیل کی ہے۔ جن میں اگر ان کی شمولیت نہ ہوتی تو دشمن ہمیں بدترین نقصان پہنچا سکتا تھا۔ صوفی صاحب نے دشمن کے دانت کھٹے کر دیے۔ یقین کرو دوسرے پاؤں تک دماغ ہے۔ مجسم دماغ، وہ سر سے پاؤں تک مشین ہے۔ وہ انتہائی طاقت ور انسان ہے۔ ذہنی اور جسمانی طور پر اور جب وہ اپنی ذہانت کے گل کھلاتا ہے تو تم یقین نہیں کرو گے کہ لگتا ہے ہزار دماغ اس کے ذہن میں بیٹھے سوچ رہے ہوں۔ یہ ہے صوفی چونکہ اپنی مخصوص فطرت رکھتا ہے۔ اس لیے اعلا پولیس افسران اور اعلا حکام اسے برداشت نہیں کر پاتے۔ پیری، فقیری کا قائل ہے۔ بزرگوں سے رہنمائی مانگتا ہے۔ بہر

حال اعلا افسران اسے معطل کرتے رہے ہیں کہ ایسے مسئلے میں کوئی گڑبڑ ہوئی تو اس نے استعفیٰ دے دیا اور بس مجھے مل گیا۔ میں اسے ساتھ لے آیا۔ اسے میں اپنے ساتھ شامل کر کے اپنے اس مقصد کی تکمیل کروں گا۔ جس کے لیے میں نے تم سے ایک دو بار کہا بھی ہے۔''

''آپ نے تو اتنی تعریفیں کر دی ہیں اس شخص کی کہ ہم حیران رہ گئے ہیں۔''

''تم یقین کرو کہ اتنا بے مثال ہے وہ کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''مگر ماموں میاں آپ نے ایک بڑی عجیب بات کہی ہے۔''

''کیا؟''

''آپ کہتے ہیں وہ سر سے پاؤں تک دماغ ہے۔''

''یہ میں ذہانت کی اعلا ترین مثال کے لیے کہہ رہا ہوں۔''

''آپ کہتے ہیں کہ وہ سر سے پاؤں تک ایک طاقت ور مشین ہے۔ کیا جسمانی طور پر بھی۔'' یہ سوال ایک ایسے نوجوان نے کیا تھا جو بڑا طاقت ور تھا۔ بے پناہ ورزش کرتا تھا۔ اس نے اپنا ایک با قاعدہ اکھاڑہ بنا رکھا تھا اس کوٹھی میں۔ اس کا نام اعجاز تھا لیکن اسے کوئی سینڈو کہتا تھا کوئی ہرکولس ویسے بھی بہت خوب صورت بدن کا مالک تھا۔

''ہاں۔ میں جانتا تھا کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے۔ وہ ایک انتہائی طاقت ور مشینی قسم کا انسان ہے۔''

''دیکھنے میں تو وہ معاف کیجیے گا ماموں میاں! ایکسرے نظر آتا ہے۔ ہڈیاں ہی ہڈیاں ہیں اس کے وجود میں۔''

''بیٹے! گوشت میں طاقت بے شک ہوتی ہے لیکن اصل طاقت ہڈیوں میں ہی ہوتی ہے کشتی لڑو گے اس سے۔''

''ارے نہیں ماموں میاں! آپ کی کسی پسندیدہ شخصیت کو توڑنا پھوڑنا میرے لیے ایک انتہائی شرم ناک عمل ہوگا۔'' جواب میں کرنل ہنس پڑا تھا اس نے کہا۔

''ویسے بھی میں یہ نہیں چاہوں گا کہ میری کوئی پسندیدہ شخصیت میرے بھانجے کو توڑ پھوڑ دے۔''

اعجاز کو یہ چیلنج بہت برا لگا تھا۔ تاہم، معاملہ کرنل کا تھا کہنے لگا۔

''یہی تو دکھ کی بات ہے۔ ماموں میاں کہ آج تک آپ نے کبھی اعجاز کا امتحان نہیں لیا۔''

''کیسا امتحان بیٹے۔''

''ماموں میاں! بس آپ کا کھا رہا ہوں بے شک۔ لیکن دل میں یہ خواہش ہے کہ کبھی آپ کو یہ بتا سکوں کہ آپ کی عنایت نے آپ کے لیے ایسا ایک محافظ تیار کر دیا ہے۔ ماموں میاں ایک درخواست کروں آپ سے۔''

''ہاں۔''

''تجربہ کرا دیجیے مجھے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ہڈیوں میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔''

''ارے بیٹا صوفی ایک پر وقار شخصیت ہے۔ جو کچھ ظاہری طور پر تم اسے دیکھتے ہو وہ نہیں ہے۔''

"پھر بھی ماموں میاں! میری آرزو ہے یہ۔"

"ہاں ماموں میاں کیا ہرج ہے۔ ہم بھی تائید کرتے ہیں اس بات کی۔" دوسرے لڑکے لڑکیوں نے اتنا شور مچایا کہ کرنل رحیم شاہ نے ہنستے ہوئے ہاتھ اٹھایا۔

"اچھا بھئی اچھا میں پوری پوری کوشش کروں گا کہ تم لوگوں کی تھوڑی سی تفریح ہو جائے۔" پھر کرنل رحیم شاہ نے صوفی سے کہا۔

"بھئی صوفی صاحب! میرے گھر میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں دیکھ رہے ہیں آپ۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے، درویش ان کی تعداد میں اضافہ فرمائے۔ یہ پھلیں پھولیں۔"

"بہت شکریہ۔ مجھے ان سب سے دلی محبت، دلی لگاؤ ہے۔"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں، ایسی پھلواریاں تو انسان کو زندگی دیتی ہیں۔"

"بڑا اچھا جملہ کہا آپ نے صوفی صاحب! آپ کے سلسلے میں یہ متجسس ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ صوفی صاحب کیا چیز ہیں۔ ان میں ایک لڑکا ہے۔ اعجاز نام ہے اس کا۔ ماشاءاللہ بڑا اچھا بدن بنایا ہوا ہے اس نے۔ ورزش کرتا ہے کشتی لڑنے کا شوقین ہے۔ مم...... میں نے کہیں غلطی سے کہہ دیا کہ صوفی صاحب بہت طاقتور آدمی ہیں۔ پیچھے لگ گیا کہ میرا ان کا مقابلہ کرا دیا جائے۔"

"دد...... درویش رحم کریں۔ جج...... جناب! ہم تو اس کے اہل نہیں ہیں۔"

"اگر آپ مناسب سمجھیں صوفی صاحب! بس ایسے ہی میرا دل چاہتا ہے۔"

"آپ کا دل چاہتا ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"یہی سمجھ لیجیے کہ درویشوں کی دعاؤں سے میرا دل چاہتا ہے۔" کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"ہم آپ کے ہر حکم کی تعمیل کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں آپ سے۔"

"تو پھر کل صبح ویسے یہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ کل شام کو ہم دارالحکومت روانہ ہو رہے ہیں۔ میں نے ... لیا ہے۔"

"بہت بہتر۔"

"تو میں کہہ دوں ان سے۔"

"ہم نے عرض کیا نا۔ آپ ہمیں ... چاہتے ہیں تو پٹ لیں گے۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ویسے آ... طمینان رکھیں اگر وہ آپ پر بھاری پڑے تو آپ فوراً ہی مجھے بتا دیں یہ مقابلہ روک دیا جائے گا۔"

"دد...... درویش کرم کریں گے ... فی نے کپکپاتی آواز میں کہا لڑکے لڑکیوں میں دلچسپی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ فوراً ہی کرنل رحیم شاہ سے ... یا گیا۔

"کیا ہوا کیا صوفی صاحب نے ... ے سینڈ کا چیلنج ... ل کر لیا۔"

"وہ تم لوگوں کی ذہنی پہنچ سے بہت آ... صرف میرے حکم کی تعمیل کی ہے۔"

"آپ اطمینان رکھیے میں اسے بڑے پیار سے ماروں گا۔ ویسے چچا جان ایک بات ہے جب دو

افراد اکھاڑے میں اتر آتے ہیں تو پھر تھوڑی دیر کے لیے ان کی دوستی ختم ہو جاتی ہے اور صرف اپنی عزت کا سوال رہ جاتا ہے۔" کرنل رحیم شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اعجاز سے بہت متاثر تھا۔ اعجاز نے بہترین بدن بنایا ہوا تھا اور ویسے بھی بے پناہ مواقع ایسے آئے تھے جب اعجاز کی طاقت کا خاطر خواہ فائدہ ہوا تھا۔ کم از کم اس بارے میں کرنل رحیم شاہ کو کوئی خاص بات معلوم نہیں تھی کہ صوفی کی جسمانی قوت کا کیا حال ہے۔ جہاں تک ذہنی قوت کا تعلق تھا تو اس کا تو کرنل رحیم شاہ کو تجربہ اور تجربہ ہو چکا تھا۔ غرض یہ کہ دوسرا دن آ گیا اور صبح کو تمام لڑکے اور لڑکیاں تیار ہو کر اکھاڑے میں پہنچ گئے۔ کرنل رحیم شاہ خود بھی پوری پوری دلچسپی لے رہا تھا۔ صوفی سے ساڑھے چھ بجے پہنچنے کے لیے کہا گیا تھا۔ تمام لڑکے لڑکیاں اور خود کرنل رحیم شاہ سوا چھ بجے ہی وہاں جمع ہو گئے۔ صوفی کا انتظار کیا جانے لگا۔ وقت سست روی سے گزر رہا تھا۔ فیصل نے کہا۔

"چچا جان! ذرا ملازم کو بھیج کر معلوم کرا لیجیے۔ صوفی صاحب گھر چھوڑ کر تو نہیں بھاگ گئے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے اعجاز کو دیکھ لیا ہو۔"

"بدتمیزی کی اجازت بالکل نہیں دی جائے گی۔ خیال رکھا جائے۔" کرنل رحیم شاہ نے فوجی انداز میں کہا اور جب اس انداز میں کوئی بات کہی جاتی تھی تو ان کے ہوش اڑ جاتے تھے۔ کیونکہ یہ ایک فوجی بول رہا ہوتا تھا۔ جس کے لہجے کا ایک وزن ہوتا ہے۔ ساڑھے سات بجنے میں تیس سیکنڈ باقی تھے کہ صوفی آتا ہوا نظر آیا لیکن اسے دیکھ کر سب کے قہقہے نکل گئے تھے۔ ڈھیلے پائنچوں والا پاجامہ اوپر سے شیروانی۔ پان کھاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ راضیہ ہنس کر بولی۔

"آپ نے صوفی صاحب کو بتایا نہیں تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ چچا جان!" کرنل رحیم شاہ خود حیران نگاہوں سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ صوفی کشتی لڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اس کا ارادہ شاید بدل گیا تھا قریب پہنچا تو لڑکے لڑکیوں کے قہقہے فضا میں بلند ہو گئے۔ کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"صوفی صاحب آپ کے پاس کوئی ایسا لباس نہیں جسے پہن کر کشتی لڑی جا سکے۔"

"یہ ایک مکمل لباس ہے جناب! درویشوں کے کرم سے۔" صوفی نے جواب دیا اور لڑکے لڑکیاں پھر ہنس پڑے۔

"یعنی آپ شیروانی پہنچ کر لڑیں گے۔"

"کک...... کیا ہرج ہے کوئی پریشانی کی بات ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ صوفی صاحب! پہلے کشتی لڑی ہے کبھی آپ نے۔"

"نہیں حضور والا۔ کشتی تو بے شک کبھی نہیں لڑی ہے ہم نے مگر دیکھیے نا اب اتنی بے شرمی تو مناسب نہیں ہے۔ یہ بچے بچیاں ہمارے گرد جمع ہیں اور ہم توبہ توبہ تصور بھی نہیں کر سکتے ایسے کسی احمقانہ عمل کا۔ ہمیں ایسا ہی رہنے دیجیے آپ اور پھر ایک بات بتائیں آپ کو یہ تو بس تعمیل حکم ہے۔ آپ کے ارشاد کی تکمیل ورنہ ان بچوں کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا سکتے ہم اگر جذباتی ہو گئے تو پھر یوں سمجھ لیجیے کہ اس کشتی کے بعد آپ ہمیں اپنی کوٹھی پر رکھنے پر آمادہ نہیں ہوں گے اور سارے رابطے توڑ لیں گے۔"

''کیوں؟'' کرنل نے دلچسپی سے پوچھا۔

''اس لیے کہ ہم ان کے پورے بدن کی ہڈیاں توڑ چکے ہوں گے۔ مناسب تو نہیں لگے گا نا بر ایک آدھ ہاتھ رسید کر دیں گے انہیں شیروانی پہنے پہنے درویشوں کی دعاؤں سے ان کی طبیعت سیر ہو جائے گی۔'' صوفی کے الفاظ پھر قہقہہ آور تھے۔ لیکن اعجاز کو یہ الفاظ بہت برے لگے تھے اور اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی تھی۔ اس نے پھنکارتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اور جب کوئی اپنے مدمقابل کے لیے ایسے الفاظ کہہ دیتا ہے تو پھر رعایت کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔''

''آیئے عزیزی آیئے۔ ہمارے لیے تردد نہ کیجیے گا درویشوں کی دعاؤں سے جلدی کیجیے ہم نے صرف آپ کی خوشی پوری کرنے کے لیے ابھی تک پان نہیں کھایا ہے۔'' صوفی نے کہا اور جوتے اتار کر اکھاڑے میں اتر گیا۔ کرنل رحیم شاہ ارے ارے ہی کرتا رہ گیا تھا۔ لڑکیاں لڑکے قہقہے لگا رہے تھے اس وقت دو مدمقابل تھے۔ جو بڑے عجیب و غریب نظر آ رہے تھے۔ رحیم شاہ عجیب سے انداز میں ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ ایک بنائے ہوئے بہترین صحت مند جسم کا مالک جس کے بدن کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی اور دوسرا ایک عجیب و غریب خلائی مخلوق شیروانی اور ڈھیلے پائجامے میں۔ ہوا ذرا تیز چل رہی تھی اور ڈھیلا پائجامہ پھڑ پھڑا رہا تھا۔ بہر حال صوفی نے اعجاز کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آیئے آیئے حملہ فرمایئے درویشوں کی دعاؤں سے۔'' اور اعجاز نے بھڑک کر صوفی سے لپٹ جانے کی کوشش کی صوفی نے اپنے بدن کو لچکایا اعجاز کی پتلی اور چیتے جیسی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے اور پھر اسے اٹھا کر اپنے اوپر سے دوسری جانب اچھال دیا۔ چونکہ یہ مدافعت غیر متوقع تھی۔ چنانچہ اعجاز اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا اور زمین پر گر پڑا لیکن اس نے اٹھنے میں پھرتی دکھائی تھی اور پھر پلٹ کر اس نے صوفی کے پیروں پر دولتی مارنے کی کوشش کی۔ لیکن صوفی اچھل کر اس کے سرہانے پہنچ گیا۔ اعجاز نے الٹی قلابازی کھائی اور ہاتھوں کو زمین پر ٹکا کر ایک بار پھر صوفی کے سینے پر دولتی جھاڑنا چاہی لیکن صوفی بڑے اطمینان سے کوئی ایک فٹ ادھر ہٹ گیا تھا کہ جیسے کوئی مشین چلتے چلتے اچانک رُک گئی ہو۔ فضا میں ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ کرنل رحیم شاہ کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک ابھر آئی تھی۔ اعجاز شدید غصے کے عالم میں پھر کھڑا ہو گیا۔ وہی بات ہوئی تھی۔ جوش جذبات میں، جذبات پر قابو نہیں پا سکا تھا ایک بار پھر صوفی سے لپٹنے کی کوشش کی لیکن اس بار صوفی نے اس کے پیروں میں ٹنگوی ماری اور وہ دھپ سے زمین پر جا گرا صوفی نے اس کے دونوں ہاتھ پیچھے سے پکڑے اور اس کے بعد اس کی کمر پر بیٹھ گیا۔

''کوڑا جمالی شاہی، پیچھے دیکھو مار کھائی...... کوڑا جمالی شاہی، پیچھے دیکھو مار کھائی۔'' صوفی گنگنانے لگا اور ایک دم پھر قہقہوں کی مشین اسٹارٹ ہو گئی لیکن صرف ایک لمحے کے لیے وہ دیکھ رہے تھے کہ صوفی سے کوئی چار گنا نظر آنے والا اعجاز اکھاڑے کی مٹی میں پاؤں جما کر صوفی کو خود پر سے اکھاڑنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ لیکن صوفی نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیے تھے اور بہ دستور کوڑا جمال شاہی کی گردان کیے جا رہا تھا۔ وقعتاً ہی کرنل رحیم شاہ کے حلق سے بھی قہقہہ آزاد ہو گیا۔ لیکن وہ بھی بس ایک لمحے کے لیے اور اس کے بعد اس نے کہا

''صوفی صاحب! چھوڑ دیجیے اس نامعقول کو۔''

''جو حکم جناب عالیٰ!'' صوفی پیچھے ہٹ گیا لیکن اعجاز اب اپنے آپ میں نہیں رہا تھا۔ جیسے ہی اسے صوفی کے بدن سے آزادی ملی۔ اس نے پھرتی سے بل کھا کر صوفی کے دونوں پاؤں پکڑ لیے اور ان پر اپنی بھرپور قوت آزمانے لگا۔ لیکن دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ صوفی ستون کی طرح اپنی جگہ جما ہوا تھا اور اس کے منہ سے آواز نکل رہی تھی۔

''نہیں نہیں کوئی بات نہیں ہے آپ ہمارے بچے ہو پاؤں پکڑ کر معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب ہم تمہیں کچھ کہہ تو نہیں رہے۔'' اعجاز اپنی تمام تر کوششیں کر کے ہار گیا لیکن صوفی کو ایک انچ زمین سے نہیں ہلا سکا تھا۔ دفعتاً ہی کرنل رحیم شاہ خود اکھاڑے میں اتر آیا اور ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے اعجاز کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

''اعجاز بس پاؤں چھوڑ دو اور خبردار! اس کے بعد ایک انچ بھی ہلے۔ خبردار! جو میں کہہ رہا ہوں وہ بات سمجھ آ رہی ہے تمہارے۔'' اعجاز کو ہوش آ گیا تھا۔ کرنل اس وقت اپنے فوجی لہجے میں ہی بولا تھا اور اس فوجی لہجے کے بارے میں گھر کا ایک ایک فرد جانتا تھا۔ اول تو کرنل رحیم شاہ کسی کو ایسا حکم نہیں دیتا تھا۔ جو اس کے لیے ناقابل قبول ہو۔ لیکن جب حکم دیتا تھا اور اس کی تعمیل نہیں ہوتی تھی۔ تو وہ فوراً ہی حکم عدولی کرنے والے کو دشمن کا سپاہی سمجھ لیتا تھا اور دشمن کے سپاہی کو صرف گولی سے اڑا دیا جاتا ہے۔ یہ بات سبھی کرنل کے بارے میں جانتے تھے۔ لیکن وہ اس کی عزت بھی کرتے تھے۔ جب وہ حکم دے رہا ہے تو اب کوئی کاوش بالکل بے مقصد ہے۔ اعجاز پیچھے ہٹا اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ کرنل نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''شاباش! یہ تجربہ ہے اعجاز بیٹے تمہاری زندگی کا کبھی کسی کو دیکھ کر قہقہے نہ لگاؤ اور کبھی کسی کے بارے میں غلط تسلی نہ کر لو۔ جب تک کہ وہ تمہارے تجربے میں نہ آ جائے۔ تم کیا سمجھتے ہو صوفی صاحب کو میں اپنے ساتھ مذاق میں لے کر آیا ہوں۔''

''بچے ہیں حضور یہ ہمارے اگر آپ کہیں تو ہم زمین پر لیٹ جائیں۔ بس شیروانی خراب ہو جائے گی۔ دوسری نہیں ہے ہمارے پاس درویشوں کے کرم سے۔'' ایک بار پھر ہنسی کھنکی تھی۔ کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

''بس ہم لوگ جا رہے ہیں تم لوگ کھیلتے رہو۔'' اور اس کے بعد صوفی نے جوتے پہنے مٹی میں لتھڑے ہوئے پاؤں بڑے آرام سے جوتوں میں ڈال کر وہ کرنل رحیم شاہ کے ساتھ چل پڑا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر جا کر کرنل نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ لڑکے لڑکیاں اعجاز سے باتیں کر رہے تھے۔ رحیم شاہ نے کہا۔

''مجھے خوشی ہوئی صوفی صاحب! آپ اس وقت بھی اپنی فارم میں ہیں۔''

''صرف فارم میں ہیں جناب! اور فارم میں ہی رہنا چاہتے ہیں۔ یونیفارم ہمیں راس نہیں آتی۔''

صوفی نے کہا اور کرنل ہنس پڑا اور بولا۔''

''لیکن اب آپ کہ بہت ساری ذمے داریوں سے نبرد آزما ہونا ہوگا۔ ویسے میں آپ کو بتا چکا ہوں صوفی صاحب کو میری پشت تنہا نہیں ہے۔ اعلا حکام فوجی افسران پولیس کے بڑے بڑے لوگ ہماری

پشت پناہی کریں گے جب میں اپنا موقف فوجی پیمانے پر سامنے لے کر آؤں گا۔ جیسا کہ میں نے آپ سے عرض کیا۔ کچھ ایسے افراد میرے علم میں ہیں جو وطن سے مخلص ہیں اور وطن کے مفاد کے لیے ہر طرح کی آسانیاں دینے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ ایسی ہی صورت حال اس وقت بھی ہے۔ بس اب ہم یہاں زیادہ وقت نہیں ضائع کریں گے بلکہ ہمیں چلنا ہے۔ دارالحکومت میں کچھ تیاریاں کرنا ہوں گی۔ وہاں جا کر ہمیں تمام انتظامات کرنے ہیں اور اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کرنا ہے۔'' صوفی نے گردن جھکا دی تھی۔ بس اس کے بعد وہ کرنل رحیم شاہ کے ساتھ دارالحکومت آ گیا تھا۔ لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ کرنل اس قدر اخراجات کرنے کے مو[ڈ] میں ہوگا ایک شاندار عمارت خریدی گئی جسے ہیڈ کوارٹر بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد اسی عمارت سے ملحق ایک او[ر] عمارت خریدی گئی۔ جس کے بارے میں یہ پروگرام بنایا گیا تھا کہ اس میں وہ تمام افراد رہائش اختیار کریں گے۔ جو اس سلسلے میں کام کریں گے۔ ان میں پہلا شخص دلاور تھا جسے اس شاندار عمارت میں جس میں چوبیس کمرے تھے۔ ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کی بیوی اور اس کا بچہ بھی وہیں آ گئے تھے اور کرنل کے تجویز کردہ نام گرین فورس کے پہلے فرد کو یہاں مقیم کرنے کی خوشی میں ایک باقاعدہ تقریب کا انتظام کیا گیا تھا جس میں صرف تین افراد شریک تھے۔ صوفی، کرنل رحیم شاہ اور خود دلاور، کرنل رحیم نے دلاور کو مبارک باد دی تھی اور کہا تھا کہ گرین فورس کا نام تجویز کیا گیا ہے اور وہ گرین فورس کا پہلا ممبر ہے۔ دلاور نے گردن خم کر دی تھی اور کہا تھا۔

''جناب عالی! بس آپ یہ سمجھ لیجیے کہ آپ کا غلام زندگی بھر آپ کے احکامات کی تعمیل کرتا رہے گا۔''

''بات اتنی ہی نہیں ہے دلاور! تمہیں باقاعدہ تربیت دی جائے گی۔''

''جی۔ آپ مطمئن رہیں۔''

''اور اب صوفی صاحب! ہمیں اپنی فورس کے مزید ممبران کو تلاش کرنا ہے۔ ویسے میں خاص طور سے آپ سے اپنے خاندان کے دو لڑکوں کی سفارش کروں گا اور یہ لڑکے آپ یقین کریں کہ میرے اور آپ کے معیار پر بھرپور طریقے سے پورے اتریں گے۔''

''ہمیں اعتراض نہیں ہوگا۔''

''پڑھے لکھے ہیں اور میری تعلیمات سے متاثر ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام عادل ہے اور دوسرا فیضان ہے۔ فیضان کمپیوٹر انجینئر ہے۔ عادل ڈاکٹر ہے۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ڈاکٹر ایک اسپتال میں جاب کر رہا ہے۔ آپ یوں سمجھ لیجیے۔ یہ دونوں ہمارے لیے بہترین ثابت ہوں گے آپ انہیں اپنی پسند کے مطابق تربیت دے لیں یہ ملک میں اور باہر کے ممالک میں جا کر آپ کے احکامات کی تعمیل کریں گے۔'' صوفی نے کرنل رحیم شاہ کی طرف دیکھا تو کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

''ہاں۔ ہم لوگ محدود نہیں رہیں گے صوفی صاحب! ہمیں بہت ہی اعلا پیمانے پر کام کرنا ہوگا۔ کیا سمجھتے ہیں یہ لوگ اپنے آپ کو کوئی ''را'' بنا لیتا ہے کوئی ''موساد'' بنا لیتا ہے، کوئی ''کے جی بی'' اور کوئی ''سی آئی اے'' کے نام سے دنیا بھر کے ملکوں میں فساد برپا کرتا رہتا ہے۔ ہماری گرین فورس ہر اس دشمن کے خلاف کام کرے گی۔ جو انسانیت کا دشمن ہوگا۔ صوفی صاحب! میں نہیں جانتا کہ آپ نے دوران ملازمت کس کس طرح

کام کیا ہے۔ لیکن میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اب گرین فورس انٹرنیشنل ہوگی اور آپ دیکھ لیجیے ایک وقت وہ آئے گا جب لوگ گرین فورس کے بارے میں میرا مطلب ہے دنیا کے ان تمام بڑے بڑے ممالک کے لوگ جو دنیا کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں۔ گرین فورس کے نام پر لرز جایا کریں گے۔''

''درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی نے لقمہ دیا اور کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

''بڑا فیض ہوتا ہے درویشوں کا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔''

''بس یہی چیز ہمیں آپ کی غلامی قبول کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جو شخص فیضان بزرگان کا قائل ہوتا ہے۔ بزرگوں کا فیض اسے ضرور حاصل ہوتا ہے۔''

''ان شاء اللہ۔'' اور پھر گرین فورس کے نئے ممبران کی تلاش شروع ہو گئی۔ ایک دن کرنل رحیم شاہ اور صوفی ایک سنسان سے راستے سے گزر رہے تھے کہ انہوں نے تھوڑے فاصلے پر کچھ ہنگامہ آرائی دیکھی اور گاڑی کی رفتار سست کر لی وہ دیکھ رہے تھے کہ چار افراد جو ایک پرانی فورڈ ویگن سے نیچے اترے تھے۔ ایک لڑکی پر حملہ آور ہوئے تھے۔ یہ لڑکی بھکارن تھی اور پتا نہیں کیوں اس سنسان راستے سے گزر رہی تھی۔ نوجوان بھکارن کو دیکھ کر شاید ان بدمعاش عناصر کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ اسے اٹھا کر ویگن میں ڈالنا چاہتے تھے لیکن کچھ ہی لمحوں کے بعد انہیں مزہ آ گیا۔ لڑکی مارشل آرٹ کا مظاہرہ کر رہی تھی اور ان چاروں کی سٹی گم ہو گئی تھی۔ پہلے تو انہوں نے لڑکی کو اٹھا کر ویگن میں ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اب اس کے بعد خود ویگن تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے تا کہ وہاں سے دوڑ لگا دیں لیکن ایسا ممکن نہیں ہو پا رہا تھا۔ جونہی کوئی زمین سے اٹھتا لڑکی کی بھرپور لات اس کے منہ سر گردن یا سینے پر پڑتی اور وہ قلابازی کھا جاتا۔ دیکھنے میں تو بھکارن لڑکی چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی تھی لیکن اس کا یہ رنگ بڑا سنسنی خیز تھا۔ صوفی کے منہ سے نکلا۔

''درویش رحم کریں۔''

''صوفی صاحب! معمولی بات نہیں ہے او ہو دیکھیے۔ وہ چاروں لمبے ہو گئے ہیں۔''

''ہاں درویشوں کی مہربانی ہے۔ دفعتاً انہوں نے لڑکی کو اسٹیشن ویگن کی ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا اور اس کے بعد ایک لمحے کے اندر اندر اسٹیشن ویگن اسٹارٹ ہوئی اور برق رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔ صوفی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا۔ کرنل نے کہا۔

''چلو اس کا پیچھا کرو۔'' کرنل سنجیدہ لہجے میں بولا اور صوفی نے گاڑی ویگن کے پیچھے لگا دی۔

''ماں سے بھی یہی پوچھے گا حرامی۔'' لڑکی بولی۔

''گالی مت بک...... گالی مت بک۔ ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔ بھیک مانگنے کو بھی دھندا کہہ سکتے ہیں۔''

''باپ ہے تو میرا۔'' لڑکی بولی۔

''نہیں...... کیوں!''

''اپنی گاڑی چلا...... پیسے لے چکا ہے۔ فالتو بک بک مت کرو۔''

''بڑی تیکھی ہے بھئی۔'' ڈرائیور اس سے زیادہ گالیاں نہیں کھانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد اس نے خاموشی ہی اختیار کی تھی۔

ٹیکسی مطلوبہ جگہ پہنچی تو لڑکی نیچے اتری اور پھر اس نے بل کی رقم ڈرائیور کو دی اور پانچ روپے زیادہ چھوڑ کر آگے بڑھ گئی ڈرائیور نے گاڑی گیئر میں ڈال کر کہا۔ ''تجھ جیسی بھکارن کو تو ویسے ہی سو پچاس روپے دیتے ہوئے کسی کا دل نہیں دکھتا ہوگا۔''

بھکارن نے حقارت بھری نگاہ اس پر ڈالی۔ ڈرائیور نے گالیوں سے بچنے کے لیے جلدی سے ٹیکسی آگے بڑھادی تھی۔

صوفی نے بھی گاڑی روک دی تھی۔ کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

'' کچی آبادی ہے صوفی صاحب۔ گاڑی نہیں جاسکتی آپ ذرا اس کے پیچھے چلے جایئے۔''

''آپ کو ہمارا سلسلہ نسب معلوم ہے محترم و معظم۔''

''جی......!'' کرنل نے حیرت سے کہا۔

''قبلہ واعلا شاہ نسیب دلدلی ولد سید جلال الحسیب اختراتی جنت مکانی کی تیسری پیڑھی کے چشم و چراغ ہیں درویشوں کی دعا سے۔''

''تو پھر......''

''ہم سے ایسے کام کرا رہے ہیں آپ......''

''کیسے کام۔''

''اس نوجوان بھکارن سے آپ کو دلچسپی ہوگی ہمیں نہیں ہے اور پھر چاہتے کیا ہیں آپ درویشوں کے کرم سے۔''

''اما کیا کھسک گئے ہو صوفی۔''

''جی قطعی نہیں۔ نجیب الطرفین ہیں بہ فضل کریم۔ ایسے کام سرانجام نہیں دیں گے۔''

''وہ نکل جائے گی صوفی صاحب۔''

''ہم نے تو بھول کر بھی نہیں سوچا تھا۔''

''یار بے توفی مت کرو۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں۔'' کرنل پریشانی سے بولا۔

''آخر اس کے بارے میں کیوں معلوم کرنا چاہتے ہیں آپ۔''

''میں اس کے اندر گرین فورس کی ایک رکن کو دیکھ رہا ہوں۔''

''ایں......'' صوفی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''نکال دیا نا آپ نے اسے، اوجھل ہوگئی نگاہوں سے ویسے صوفی صاحب حیرت ہے واقعی مجھے شدید حیرت ہے۔ اچھی خاصی سوجھ بوجھ کے آدمی ہیں آپ۔ لیکن وہ کون سے لمحات ہوتے ہیں۔ جب حماقت آپ کے معدے میں اتر جاتی ہے۔''

''مم...... معافی چاہتے ہیں جناب قبلہ درویشوں کی دعاؤں سے ہم خود شدید حیران تھے۔ آپ کے بارے میں ایسی بری بات سوچ [illegible] ہوئے۔''

''تو آپ کا کیا خیال تھا مجھ [illegible] نوجوان بھکارن کے ساتھ عیاشی کرنا تھی۔''

''تت...... توبہ...... توبہ...... توبہ درویشوں کی دعاؤں سے ویسے پیر جھا بجھن بخاری نے ایک مثال کہی تھی۔''

''لعنت ہے آپ پر ایک بات ذہن نشین کر لیجئے۔ آپ ہی کو اس کا کھوج نکالنا ہے ورنہ میرے آپ کے اختلافات شدید ہوجائیں گے میں جو کچھ کرتا پھر رہا ہوں وہ میری بساط سے آگے کی چیز ہے میں نے تو مکمل طور پر یہ سوچا تھا کہ آپ جیسے شخص کو مکمل ذمے داریاں سونپ دوں گا۔ لیکن کیا ہی احمقانہ بات سوچی آپ نے میرے بارے میں۔''

''دو...... درویش رحم کریں۔''

''درویش تو خیر رحم کریں گے ہی۔ مگر مجھے یہ بتایئے کہ میں کیا کروں ارے آپ نے دیکھا نہیں ایک بھکارن لڑکی نے کس طرح ان غنڈوں کی پٹائی کی ظاہر ہے اس کے اندر کچھ صلاحیتیں ہی پوشیدہ ہوں گی۔ ہم اسے اپنی تحویل میں لے کر اگر اس کی ان صلاحیتوں کو جلا دیں تو کیا گرین فورس کے لیے ایک شاندار ممبر پیدا نہیں ہوجائیں گی۔''

''درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''جایئے پتا لگایئے وہ کہاں رہتی ہے۔''

''جج...... جی۔'' صوفی گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ تک وہ گلی گلی چکراتا رہا۔ کچی آبادیوں میں بس کبھی کبھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ پیچ در پیچ راستے اب ظاہر ہے کسی سے یہ پوچھنا تو مناسب نہیں تھا کہ وہ لڑکی کہاں چلی گئی۔ عزت بچا کر واپس گاڑی تک پہنچ گئے۔

''نہیں پتا چل سکا جناب عالی! جوان لڑکی تھی کسی سے کچھ کہتے تو ان محلوں میں غیرت مند کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ ہمارے کپڑے تک اتار لیتے۔''

''نہیں صوفی صاحب! یہ آپ نے اس وقت غلط کاری کی ہے۔''

''صحیح کاری کر رہے تھے درویشوں کے کرم سے، ہر مال دس روپے آسانی سے بک جاتا ہے۔ عیش سے شام کو مصاحبین کے درمیان بیٹھ کر شعر و شاعری ہوا کرتی تھی۔''

''اچھا اچھا بیٹھیے آپ گاڑی کے اسٹیئرنگ پر۔ پتا تو خیر چل ہی جائے گا۔ کل منہ اندھیرے یہاں آجائیں گے۔ اگر اس کا گھر اسی علاقے میں ہے تو بھیک مانگنے کے لیے نکلے گی تو سہی۔''

''بہ خدا نہایت موزوں عمل رہے گا۔''

''گاڑی اسٹارٹ کیجئے۔'' کرنل رحیم شاہ نے کہا اور صوفی نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھادی۔

♥......♥......♥

صائمہ جیلانی فوزی کی بہت اچھی دوست تھی اس کے والد ایک بہت بڑے سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ صائمہ اور فوزی ساتھ ساتھ ہی کالج میں پڑھتی تھیں اور اکثر دونوں ایک دوسرے کے گھر آیا جایا کرتی تھیں۔ چنانچہ فوزی کو جب وہ ہدایت ملی تو فوزی حیران رہ گئی۔ اور یہ ہدایت بھی بڑے عجیب و غریب انداز میں ملی تھی۔ اچانک ہی فوزی کو بیٹھے بیٹھے ان لمحات کا خیال آیا تھا جب وہ پکنک پر گئے تھے اور وہاں انکل

زیرو سے ملاقات ہوئی تھی اور پھر انکل زیرو کی آواز اسے اپنے دماغ میں سنائی دی۔

''فوزی ہے تمہارا نام۔''

''ہاں۔'' فوزی نے بے آواز کہا۔

''اور صائمہ جیلانی تمہاری دوست ہے۔ احتشام جیلانی کی بیٹی۔''

''ہاں وہ میری دوست ہے۔''

''احتشام جیلانی بھی تم سے محبت کرتے ہوں گے۔''

''جی۔''

''فوزی! میں نے جو انجکشن تمہیں دیا ہے۔ ان میں سے ایک انجکشن تمہیں احتشام جیلانی کو دینا ہوگا۔ یہ کام تمہیں نہایت ہوشیاری سے کرنا ہے۔ ہر پہلو کو سامنے رکھنا ہے اور کہیں بھی کوئی غلطی نہ ہونے پائے۔ فوزی! اس کام کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا عضو عضو اس حکم کی تکمیل کے لیے تیار ہو۔ پھر وہ صائمہ جیلانی کی کوٹھی پہنچ گئی۔

ساڑھے پانچ بجے احتشام جیلانی اپنے معمولات سے فراغت حاصل کر کے آجایا کرتے تھے۔ ان کی بیگم کا انتقال ہو چکا تھا۔ باپ بیٹی بہت سے ملازموں کے ساتھ اس عالی شان کوٹھی میں رہا کرتے تھے احتشام جیلانی نے دونوں کو دیکھا تو محبت سے گردن ہلا کر بولے۔ ''ارے فوزی بیٹی آئی ہے۔ بیٹا خیریت تو ہے۔''

''جی انکل! آپ کی دعائیں ہیں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ کچھ دفتری کام کرنے ہیں۔ تم لوگ اپنی مصروفیات میں رہو۔'' احتشام جیلانی اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد فوزی نے موقع غنیمت دیکھا۔ تیاریاں تو کر کے آئی تھی۔ احتشام جیلانی کی پشت پر پہنچ گئی۔ یہ کوٹھی اس کی دیکھی بھالی تھی۔ احتشام جیلانی کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے فائلیں پھیلائے مصروف تھے۔ گراؤنڈ فلور پر اس خواب گاہ کے پچھلے حصے میں خاصی جگہ موجود تھی۔ احتشام جیلانی کھلی ہوا میں بیٹھنے کے عادی تھے۔ لیکن سوئی کی تیز چبھن نے انہیں ایک لمحے کے لیے بدحواس کر دیا۔ وہ تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھے لیکن انجکشن لگانے والا ہاتھ غائب ہو چکا تھا۔ پھرتی سے اٹھ کر انہوں نے کھڑکی کے ساتھ ہی بنی راہداری میں جھانکا جو دو چار سیڑھیاں نیچے اتر کر ختم ہو جاتی تھی۔ جو کوئی بھی تھا اسی راہداری میں گیا تھا۔ احتشام جیلانی کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ دروازے سے باہر جا کر چھان بین کرتے ایک عجیب سی کیفیت ان پر طاری ہوگئی اور چند ہی لمحوں کے اندر اس سحر میں گرفتار ہو کر وہ کرسی پر واپس بیٹھ گئے تھے۔ بہت عجیب سی ہلچل تھی ان کے دماغ میں۔ دوسرے دن انہیں ایک قومی جلسے میں شریک ہونا تھا۔ انجکشن کی چبھن تھوڑی دیر کے بعد ختم ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کا ذہن بھی کسی ٹرانس میں تھا۔ اور ان کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ ان کے ساتھ کوئی عمل ہوا ہے۔ جس میٹنگ میں یا جس جلسے میں انہیں شریک ہونا تھا۔ اس میں کئی ملکوں کے مندوبین مدعو تھے جو ایک خاص مقصد ایک خاص مشن پر آئے ہوئے تھے۔ احتشام جیلانی دوسرے دن شام کو دفتر سے فارغ ہونے کے بعد اس تقریب میں شریک ہوئے تھے۔ تقریب میں ملک کی پالیسی سے متعلق متعلقہ حکام کو بہت سی ایسی اہم باتیں غیر ملکی مندوبین کے سامنے بیان کرنی تھیں۔ جو ملک کی پالیسی کا

ایک حصہ تھیں۔ مقررین مندوبین کے سامنے اپنا موقف بیان کرنے لگے۔ پھر احتشام جیلانی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے اور ان کی آواز ابھری۔

''تمام غیر ملکی معززین سے معذرت کرتے ہوئے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ابھی ہمارے پروٹوکول سیکرٹری نے ہماری جس پالیسی کا تذکرہ کیا وہ ایک جعلی پالیسی ہے۔ ہماری اصل پالیسی اس سے بالکل مختلف ہے اور میں آپ کو اس کی تفصیل بتاتا ہوں اور اس کے بعد احتشام جیلانی نے ملکی راز کھولنے شروع کر دیے۔ وہ راز جو ملکوں کی امانت ہوتے ہیں اور امانت داروں کو زندگی کی قیمت پر انہیں چھپانا ہوتا ہے وہاں موجود تمام افراد ششدر رہ گئے تھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان غیر ملکی مندوبین کے سامنے احتشام جیلانی کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ بہت سے سوالات احتشام جیلانی سے کیے گئے اور وہ اپنے ملک کی خفیہ پالیسیوں کے بارے میں بتاتے رہے۔ میٹنگ کے مقامی شرکا سر پکڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ بہر حال میٹنگ برخاست ہوگئی اور اس دوران متعلقہ حکام نے سکیورٹی حکام اور اعلا عہدے داروں کو احتشام جیلانی کے بارے میں رپورٹ دے دی تھی۔ باہر ملٹری انٹیلی جنس کے افراد ان کی گرفتاری کے لیے موجود تھے۔ احتشام جیلانی کو گرفتار کر لیا گیا اور اعلا حکام کی ہدایت پر انہیں انتہائی سخت روی کے ساتھ ملٹری جیل پہنچا دیا گیا۔

دوسرا واقعہ وزیر دفاع کی ایک میٹنگ میں پیش آیا۔ جب وزارت دفاع کے فرسٹ سیکرٹری نے ملکی روز کھولنا شروع کر دیے۔ بے شک یہاں اس میٹنگ میں بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جن کا تعلق وزارت دفاع سے ہی تھا لیکن فرسٹ سیکرٹری نے جس انداز میں وہ تمام خفیہ راز کھولنا شروع کر دیے تھے وہ بڑی حیرت ناک بات تھی۔

تیسرا واقعہ سب سے زیادہ سنگین اور حیرت ناک تھا۔ کسی ایک نجی تقریب میں ملک کا مایہ ناز سائنسدان شرکت کے لیے گیا ہوا تھا۔ اخباری نمائندوں نے اسے گھیر لیا اور اس سے اس کی کاوشوں کے بارے میں سوالات کرنے لگے اس سائنسدان نے ایسے فارمولوں کے بارے میں انکشافات شروع کر دیے جو انتہائی صیغہ راز میں رکھے گئے تھے اور ان کے افشا کرنے کا جرم نا قابل معافی تھا اور اس پر سزائے موت بھی دی جا سکتی تھی۔ اخبارات میں بڑھا چڑھا کر ملک کی سائنسی تیاریوں کی یہ رپورٹیں شائع کیں اور حکومت ہل کر رہ گئی۔ ایسے پانچ واقعات ہوئے تھے۔ جن میں ملک کے انتہائی مقتدر اور پر اعتماد افراد نے اپنے منصب کی ذمے داریوں اور تمام تر احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ملک کے رازوں کے بارے میں انکشافات کر دیے تھے وزارت داخلہ، وزارت خارجہ وزارت دفاع کے لیے انتہائی خوف ناک صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ صدر مملکت اور وزیر اعظم نے ہنگامی بنیادوں پر یہ کارروائی محفوظ رکھنے کے لیے ہدایت جاری کی اور فوراً ہی ایسے تمام افراد کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ جو ملکی امور میں انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔ ملٹری انٹیلی جنس اور آرمی سیکورٹی ان کے گرد پھیلا دی گئی۔ ان پانچوں افراد کی ذہنی حالت بہ ظاہر ٹھیک تھی اور جب انہیں یہ بتایا گیا یا ان سے یہ پوچھا گیا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا تو وہ ششدر رہ گئے۔ انہوں نے پورے یقین کے ساتھ کہا انہوں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی ہے۔ لہٰذا فوراً ہی کسی ایسے عمل کا شبہ ظاہر کیا گیا۔ جو دشمن کی جانب سے کیا گیا ہو۔ اور آہستہ آہستہ یہ بات منظر عام پر آتی چلی گئی کہ ان لوگوں کو خفیہ طریقے سے انجکشن

لگائے گئے تھے اور اس کے بعد انہیں یوں لگا تھا جیسے ان کے ذہن کسی پراسرار طاقت کے زیر اثر آ گئے ہوں۔ بہر حال انہیں انتہائی سخت پہرے میں رکھ لیا گیا تھا۔ اور سیکورٹی کے اعلا ترین دماغ اس سلسلے میں کارروائیاں کرنے لگے تھے۔ ایک باقاعدہ کمیٹی بنائی گئی جو ڈیفنس منسٹر شاہ میر خان کی سربراہی میں کام کرنے لگی۔ اور ایک طرح سے ہنگامی بنیادوں پر ایسے ایجنٹوں کی تلاش شروع ہو گئی جو ملک میں آ کر اس انداز میں خفیہ کارروائی کر رہے ہوں۔ اس کارروائی کی تشہیر بھی نہیں کی جا سکتی تھی کیونکہ اس طرح ملک میں شدید ہیجان پیدا ہو جانے کے امکانات تھے۔ لیکن حکومت صحیح معنوں میں ہل کر رہ گئی تھی۔ اور تقریباً تمام ہی قوتیں اور ایجنسیاں ایسے ایجنٹوں کی تلاش میں لگ گئی تھیں جو ملک میں داخل ہو کر یہ تمام کارروائی کر رہے تھے۔ جن لوگوں نے اس شبہے کا اظہار کیا تھا۔ کہ انہیں انجکشن کے ذریعے کسی طرح ٹرانس میں لیا گیا ہے۔ ان کا جسمانی معائنہ بھی کیا گیا تھا اور انجکشن کے وہ نشانات تلاش کر لیے گئے تھے۔ ان کے خون کے ٹیسٹ وغیرہ بھی ہو رہے تھے۔ غرض ہر وہ کارروائی کی جا رہی تھی۔ جس سے ان حقیقتوں کا انکشاف ہو سکے۔

♥......♥......♥

کرنل رحیم شاہ ظاہر ہے ایک ریٹائرڈ فوجی تھا۔ اس کی اپنی اہمیت اور حیثیت بے شک مسلم تھی اور ایک اعلا شخصیت ہونے کے باعث سرکاری حلقوں میں بھی بڑی مقبولیت رکھتا تھا۔ خود اس کے اپنے خاندان کے کئی ایسے اہم افراد بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر تھے۔ جن سے اس کی رشتے داری ہی نہیں بلکہ گہری دوستی بھی تھی۔ چونکہ وہ خود انتہائی اعلا کارکردگی کا مالک اور نمایاں حیثیت والا شخص رہا تھا۔ وہ اپنی کارروائیوں میں معروف تھا اور اس کے دل میں ایک ہی خیال تھا کہ مادر وطن کے لیے اس وقت تک اپنی خدمات انجام دیتا رہے جب تک سانس میں سانس ہے۔ ایک ٹانگ ضائع ہونے کے بعد اس کا دل بجھ گیا تھا لیکن جب سے اسے صوفی ملا تھا۔ اس کے دل میں نئی امنگیں بیدار ہو گئی تھیں۔ کچھ اسی طرح متاثر تھا وہ صوفی سے اور ایک فوجی کرنل ہی جانتا ہے کہ کون شخص کس حیثیت کا حامل ہو سکتا ہے صوفی نے جو خدمات سرانجام دیں تھیں۔ انہیں کرنل رحیم شاہ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ صوفی کے بارے میں وہ مسلسل اس تجسس کا شکار رہتا تھا کہ صوفی کی اصلیت کیا ہے۔ وہ ایک انتہائی ذہین انتہائی پھرتیلا، انتہائی طاقت ور اور انتہائی اعلا کارکردگی کا مالک تھا۔ لیکن پتا نہیں اس نے اپنے اوپر یہ ایک حماقت آمیز سادگی کیوں طاری کر رکھی تھی۔ پیر پرستی، پانوں کا استعمال، اپنی ذات سے لاپروائی کا یقینی طور پر کوئی پس منظر بھی ہوگا۔ لیکن یہ پس منظر کبھی منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ اور شاید خود صوفی نے بھی اپنے ماضی کو بھلا دیا تھا۔ کیونکہ کتنے ہی لوگوں نے اس کی قربت حاصل کر کے اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس میں ناکام رہے۔ اس کی اپنی پسندیدہ جگہ وہی بے تکا گھروندا تھا جو ایک پسماندہ محلے کی ایک گلی میں واقع تھا۔ حالانکہ کرنل رحیم شاہ نے دارالحکومت ہی میں ایک شاندار عمارت خرید لی تھی اور اسے ہر طرح سے جدید سہولتوں سے آراستہ کر دیا تھا۔ فی الحال ولا اور اس کی فیملی وہاں مقیم تھی۔ اس کے علاوہ کچھ اور افراد جنہیں کرنل رحیم شاہ نے وہاں فروکش کر دیا تھا اور ایک طرح سے وہ اس جگہ کو ایک مضبوط قلعہ بنا رہا تھا۔ لیکن صوفی کو جب بھی موقع ملتا وہ اپنے اس گھروندے میں پہنچ جاتا جو من خان کے ہوٹل کے برابر تھا اور اس وقت یوں لگتا جیسے صوفی میں نئی زندگی بیدار

ہو گئی ہو۔ کرنل رحیم شاہ نے اس سے ایک بار پوچھا بھی تھا۔

"صوفی صاحب! آخر وہاں ایسی کیا چیز ہے جس کے لیے آپ اتنے دیوانے رہتے ہیں۔"

"حضور من! جناب عالی انسان کی اصل ہی اس کا سب کچھ ہوتی ہے۔ جو لوگ اپنی اصل سے دور ہٹ جاتے ہیں آپ یوں سمجھ لیجیے نہ تیتر رہتے ہیں اور نہ بٹیر، درویشوں کی دعاؤں سے وہاں مجھے اپنے دل و دماغ کے تمام دریچے کھلے ہوئے ملتے ہیں۔ وہ لوگ سادگی کا پیکر ہیں اور ہر کام پورے خلوص سے کرتے ہیں۔" کرنل رحیم شاہ نے ٹھنڈی سانس لے کر گردن ہلا دی تھی۔

♥......♥......♥

نام شازیہ تھا باپ ریلوے ورکشاپ میں فورمین تھا۔ ایک چھوٹی بہن اور ایک ماں تھی باپ کے دل میں بڑے بڑے منصوبے تھے بیٹی کے لیے، وہ اسے اچھی تعلیم دلا کر کسی اچھے گھرانے میں بھیج دینا چاہتا تھا اکثر کہتا تھا۔

"بیٹا! اب ہم اتنے غریب بھی نہیں ہیں کہ تجھے کسی اچھے گھرانے کے معیار کے مطابق جہیز نہ دے سکیں تو ہے اور نازیہ ہے۔ نازیہ کو تو ابھی بہت لمبا عرصہ چاہیے۔ تیری تعلیم مکمل ہو جائے تو بس پھر تیرے ہاتھ پیلے کر دیں گے۔"

"یہ کیا بات ہوئی بابا جان! پڑھ لکھ کر بھی وہی روٹیاں پکائی جائیں۔"

"ارے تو پھر اور کیا کرے گی۔"

"نوکری کروں گی نوکری۔ لاکھوں کما کر دوں گی آپ کو ساری زندگی آپ ایک گھر کے لیے ترستے رہے ہیں نا۔ میں بنا کر دوں گی آپ کو گھر۔"

"ارے تیری ایسی تیسی تو گھر بنائے گی اور میں تجھے بنانے دوں گا۔ ارے بیٹا ایک باپ کے لیے اس سے بڑی گالی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ بیٹی کی کمائی کھائے۔ بیٹی کی دی ہوئی چیزوں کو استعمال کرے۔"

"واہ۔ یہ کیا بات ہوئی آپ کا خون نہیں ہوں میں۔"

"دیکھ بیٹا! ہمیں اب کون سی کوٹھیوں کی ضرورت ہے۔ یہ سرکاری گھر کافی ہے ہماری زندگی کے لیے تو اپنے گھر چلی جائے گی۔ نازیہ اس قابل ہو گی تو اللہ اس کا بھی ٹھکانا کر دے گا اور بس ہم دونوں میاں بیوی کا تو حج ہو جائے گا۔ کیوں بھئی رشیدہ۔" اور وہ سب ہنسنے لگے تھے۔ لیکن شازیہ کے دل میں یہی تھا کہ اور تعلیم حاصل کر لے اور پھر باپ کا بازو بن جائے باقی تمام چیزوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن وقت اپنی کہانی خود تحریر کرتا ہے۔ انسان کے اپنے ذہن میں کچھ بھی ہو وقت سے بھلا کون جھگڑا کر سکتا ہے۔ رحمان علی ورکشاپ میں حادثے کا شکار ہو گیا۔ آدھا دھڑ کٹ گیا تھا اور حیران کن بات یہ تھی کہ وہ زندہ تھا۔ جسم دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ اسپتال والوں کے لیے بھی یہ ایک انوکھی کہانی تھی۔ بہر حال تقریباً ڈیڑھ سال تک جیا اور اس کے بعد دنیا چھوڑ گیا لیکن اس ڈیڑھ سال میں جو کچھ گھر میں جمع تھا وہ سب بڑی تیزی سے ختم ہو گیا تھا۔ رحمان علی گھر والوں سے کہا کرتا تھا۔

"بابا! آدھا تو رہ گیا ہوں میں، کسی کام کا نہ کاج کا، کیا کرو گے تم لوگ میرا؟ باقی آدھے کو بھی

جانے دو۔ اس دنیا میں میرا کیا مقام ہوگا سوائے اس کے کہ تم لوگوں کے کندھوں پر بوجھ بنا رہوں۔ بے وقوف ہو تم لوگ۔'' جواب میں سب رونے لگتے تھے تو وہ خاموش ہو جاتا تھا۔

''ٹھیک ہے بھائی ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔ جو دل چاہے کرو خرچ کرو اس آدھے باپ پر اور آدھے شوہر پر نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلے گا۔ کہے دیتا ہوں تم سے۔'' پھر یہ آدھا انسان اس دنیا سے چلا گیا اور اس کے بعد گھر میں فاقے اور مفلسی رہ گئی۔ رحمان علی ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ پیسہ تو بہت بڑی ضرورت ہے اس دور کی۔ ساری محبتیں خاک میں مل جاتی ہیں۔ جب گھر کے حالات خراب ہوتے ہیں لیکن یہاں محبتیں خاک میں نہ ملیں۔ شازیہ نے باہر کی دنیا میں قدم رکھ دیا۔ باپ نے جو کچھ دیا تھا اب وہ باپ کے گھر کو لوٹانا چاہتی تھی۔ بہت کچھ یاد آتا تھا اسے۔ رحمان علی کہتا۔ ''بیٹا! میں تجھے تعلیم اس لیے نہیں دلا رہا کہ تیری کمائی کھاؤں۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ جس گھر میں تو جائے۔ وہاں تیرا ایک باعزت مقام ہو اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔'' لیکن وقت نے رحمان علی کے الفاظ کی تردید کی تھی۔ اور کہا تھا کہ بیٹا! اصل فیصلے کرنے والا تو میں ہوں تو کون ہوتا ہے۔ بہر حال شازیہ در در ماری ماری بھٹکتی پھری۔ لیکن اب اسے دنیا کا ایک اور نیا تجربہ ہو رہا تھا۔ یہ دنیا اتنی عجیب ہے اس سے پہلے اس نے نہیں سوچا تھا۔ کئی جگہ اس نے ملازمت کی کوشش کی۔ جہاں کوئی نیک اور شریف انسان ہوا کرتا تھا۔ وہاں ملازمت نہیں ہوا کرتی تھی اور جہاں ملازمت ہوتی تھی وہاں آنکھوں میں کچھ اور ہی چمک پائی جاتی تھی۔

''یہ آپ کے سرٹیفکیٹ ہیں۔''

''جی۔ میں نے بی اے کیا ہے۔''

''صرف۔''

''جی۔''

''کوئی تجربہ۔''

''جی نہیں پہلی ملازمت کے لیے نکلی ہوں۔''

''تب تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔''

''نہیں جناب! جو کام مجھے بتایا جائے گا میں اسے بہ خوبی سرانجام دے لوں گی۔''

''کیا واقعی۔''

''جی بالکل۔''

''آگے آیئے۔'' وہ آگے بڑھ گئی۔ ''میری گردن میں دونوں ہاتھ ڈالیے۔''

''جی!''

''جی۔ آپ نے کہا تھا کہ جو کام آپ کو بتایا جائے گا وہ آپ کر لیں گی۔''

''میں تھوڑی سی ترمیم کر سکتی ہوں اس میں۔''

''ترمیم۔''

''جی ہاں۔ آپ نے گردن میں دونوں ہاتھ ڈالنے کے لیے کہا ہے نا۔''

''جی بالکل۔''

''اگر میں یہ دونوں ہاتھ آپ کے حلق پر ڈال دوں۔'' اس نے آگے بڑھ کر گردن پر اپنے ہاتھ رکھ دیے اور اسے ہدایت دینے والے صاحب گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔

''آپ انسان ہیں یا جانور۔''

''بہت خطرناک جانور ہیں۔ خاؤں۔'' اس نے حلق پھاڑ کر منہ آگے کیا اور اس کے بعد دانت پیستے ہوئے وہاں سے باہر نکل آئی۔

لیکن بات ایک جگہ ہی کی تو نہیں تھی۔ دوسری، تیسری اور چوتھی جگہ وہ سڑکوں پر ماری ماری پھرتی رہی۔ نوکری تلاش کرتی رہی۔ پتا نہیں کس طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ اب تو بات بالکل کھل کر سامنے آگئی ہے کہا جاتا ہے۔

''بی بی نوکری تمہاری مرضی کے مطابق ملے گی۔ لیکن صرف نوکری ہی نہیں دوست بنا پڑے گا تمہیں ہمارا۔'' پھر ایک جگہ اس نے ایک صاحب کی پٹائی کر دی۔ میز پر کوئی چیز رکھی ہوئی تھی اٹھا کر مار دی۔ بری طرح دھکے دے کر نکالا گیا تھا اور جب گھر کے بدترین حالات سے دل برداشتہ ہو کر آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آنے لگی تھی۔ تو بالکل اتفاقیہ طور پر اس کی نگاہ سامنے پڑی اور وہاں اس نے ایک بھکارن کو دیکھا۔ جوان لڑکی تھی۔ بھیک مانگ رہی تھی۔ وہ اس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

''دے دے بی بی! کچھ اللہ کے نام پر، اللہ تجھے حج کرائے۔ دل کی ساری مرادیں پوری ہوں۔''

''کتنے پیسے لے گی۔'' اس نے پوچھا۔

''کیا۔''

''میرے دل کی مراد پوری کرنے کے کتنے پیسے لے گی۔''

''مخول مت کر بی بی۔ جو دینا ہو دے دے۔''

''یار! تو میری دوست کیوں نہیں بن جاتی۔'' شازیہ نے کہا اور بھکارن اسے دیکھنے لگی۔

''مذاق کر رہی ہے شرم نہیں آتی تجھے مذاق کرتے ہوئے۔''

''نام کیا ہے تیرا۔''

''حمیدہ۔''

''حمیدہ تیری قسم! میں تجھ سے مذاق نہیں کر رہی۔ تیری دوست بنا چاہتی ہوں میں۔''

''نئی بات ہے میرے لیے۔ تم جیسے صاف ستھرے کپڑے پہننے والے لوگ بھلا ہم جیسے لوگوں کے دوست کہاں بن سکتے ہیں۔'' حمیدہ کے لہجے میں بھی عجیب سی کیفیت محسوس ہوئی۔

''کیا مطلب۔''

''ارے بابا دوستی تو برابر کے لوگوں سے کی جاتی ہے۔ میرے میلے کچیلے کپڑے نہیں دیکھ رہیں اپنے آپ کو دیکھو اور مجھے دیکھو۔''

''اور اگر میں تجھ سے یہ کہوں حمیدہ کہ میرے پاس صرف بھی اجلے کپڑے ہیں باقی تیرے جیسے

میلے کپڑے بھی نہیں ہیں۔ تو اس بات کا یقین کرے گی۔'' حمیدہ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی پھر بولی۔

''کیا واقعی؟''

''ہاں۔ نوکری تلاش کرتی پھر رہی ہوں جگہ جگہ۔ نہیں مل رہی آنکھیں سینکنے والے بہت سے مل جاتے ہیں۔ کہانیاں سنانے والے بہت سے مل جاتے ہیں۔ عجیب تجربہ ہو رہا ہے زندگی کا۔ لیکن وہ نہیں ملے جو ہمدردی اور محبت سے سر پر ہاتھ رکھیں۔''

''کبھی نہیں ملیں گے چاہے انہیں تلاش کرتے کرتے تیری زندگی گزر جائے اور پھر کہیں نہ کہیں چوٹ کھا جائے گی۔''

''تو کیا کروں حمیدہ۔''

''برا تو نہیں مانے گی میری بات کا، نام کیا ہے تیرا۔''

''شازیہ۔''

''جو میں کر رہی ہوں وہ کر۔''

''بھیک مانگوں۔''

''ہاں تو کیا سمجھتی ہے میں بھی میٹرک پاس ہوں۔ میرا بھی ایک ماضی تھا۔ مگر سب کچھ بھول گئی ہوں میں۔ زبان ٹیڑھی کر لی ہے بازاری زبان بنا لی ہے۔ بھتا دینا پڑتا ہے ٹھیکیدار کو اور باقی سب خیریت ہے۔''

''ٹھیکیدار۔''

''ہاں۔''

''یہ کون ہے۔''

''کیا سمجھتی ہے تو ہر جگہ آج کل ٹھیکے چل رہے ہیں۔ ہر جگہ...... ہر جگہ ہم لوگوں کے بھی ٹھیکیدار ہوتے ہیں۔ میرا ٹھیکیدار بے چارہ بڑا معصوم سا آدمی ہے مطلب یہ کہ برا نہیں ہے خود بھی چھ بیٹیوں کا باپ ہے۔ ٹھیکا خریدا جاتا ہے۔ اس نے یہ ٹھیکا خریدا ہے اس علاقے میں بھیک مانگ سکتی ہوں میں دوسرے علاقے میں نہیں جا سکتی۔ کیونکہ ادھر کا ٹھیکے دار الگ ہے۔''

''بڑی عجیب کہانی سنائی ہے تو نے۔''

''دنیا میں ایسی ایسی ہزاروں عجیب کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔''

''ہوں۔ حمیدہ! واقعی تو نے میرے ذہن میں ایک نئی سوچ بیدار کر دی ہے۔ اچھا یہ بتا کیا تو مجھے تربیت دے گی۔''

''آج ہی سے۔ ایک منٹ رک جا۔'' یہ کہہ کر حمیدہ نے اوڑھنی سے کچھ نوٹ نکالے اور انہیں گننے لگی۔

''تین سو چھتیس ہیں۔ سو روپے ٹھیکیدار کو دینے پڑیں گے۔ دو سو چھتیس پھر بھی بچ جائیں گے چل آج کا کام پورا۔ چلے گی میرے ساتھ، اور شازیہ حمیدہ کے ساتھ اس کے ڈیرے پر پہنچ گئی۔ کچے علاقے میں، کچی آبادی میں، خیمے لگے ہوئے تھے۔ انہی خیموں میں سے ایک خیمہ حمیدہ کا تھا۔ حمیدہ نے اسے خیمے میں

بٹھایا اور خود باہر نکل آئی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کھانے پینے کی بے شمار اشیاء لے کر اندر داخل ہو گئی۔

''چل کھا نئی نئی دوست بنی ہے میری۔'' اور پھر جب اس نے ایک گندے سے پیالے میں شازیہ کو چائے پیش کی تو شازیہ نے عجیب سے انداز میں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''دیکھ رہی ہوں تیری ایک ایک حرکت دیکھ رہی ہوں۔ اس سے بھی زیادہ گندے پیالوں میں تجھے چائے پینا پڑے گی۔ ہماری تربیت اسی طرح ہوتی ہے۔ اگر واقعی یہ کام کرنا ہے تو عادت ڈال۔''

''مگر یار حمیدہ! ایک بات تو بتاؤ۔ اپنے حلیے کا کیا کروں گی۔''

''بتاؤں تجھے۔ پھر رک جا ایک پانچ منٹ۔'' حمیدہ نے کہا اور اس کے بعد پھر باہر نکل گئی۔ شازیہ وہاں بیٹھی ہوئی ان عجیب و غریب حالات پر غور کرتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک اچھی خاصی شکل و صورت کی لڑکی عمدہ لباس میں اندر داخل ہوئی اور شازیہ واقعی سے ایک لمحے کے لیے نہ پہچان سکی۔ لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر اس نے اس کے نقوش پر غور کیا تو بُری طرح اچھل پڑی۔ یہ حمیدہ ہی تھی۔

''بول کیا کہتی ہے۔''

''اے باپ رے باپ یہ تو نے اپنے چہرے پر کون سی نقاب چڑھائی۔''

''نقاب تو پہلے تھی میرے چہرے پر یہ تو میرا اصل چہرہ ہے۔''

''میرے خدا۔ تو تو اچھی خاصی خوبصورت لڑکی ہے حمیدہ۔''

''بھول کر بھی یہ بات مت کہنا یہ خوبصورتی جو ہوتی ہے نا۔

بڑی عجیب چیز ہوتی ہے کسی دھن راج کے پاس ہو تو وہ مہاراج بن جاتا ہے۔ اور ہم جیسی لڑکیوں کے پاس ہو تو یہ سمجھ لو کہ ہماری زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ ہر شخص ہمیں کوٹھے تک لے جانا پسند کرتا ہے۔ کوٹھے تک لے جانا چاہتا ہے۔ سمجھیں۔ زمین پر ہمارے لیے جگہ نہیں ہوتی ذرا بلندیوں پر پہنچنا پڑتا ہے ہمیں۔''

''حمیدہ واقعی مجھے بڑا تعجب ہو رہا ہے۔ تجھ پر۔ کیا تیرے جیسی اور بھی ان سڑکوں پر بکھری نظر آتی ہیں۔''

''میں نے کہا نا دُنیا کی کہانیاں بڑی عجیب ہیں۔ پتا نہیں کیسے کیسے لوگ اس دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں۔'' شازیہ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لینے لگی۔ پھر حمیدہ نے کہا۔

''کچھ عرصے ٹریننگ لے لے مجھ سے۔ دوست بننا پڑے گا ٹھیکیدار سے بات کرا دوں گی تیری۔''

حمیدہ نے اسے جاتے ہوئے کچھ رقم بھی دی اور شازیہ بری طرح الجھ گئی رات بھر الجھتی رہی۔ ایک پل نیند نہیں آئی تھی اسے۔ لیکن صبح کو اس نے آخری فیصلہ یہی کیا تھا کہ جب دنیا اس رنگ میں رنگی ہوئی ہے تو کیا کیا جائے۔ عزت گنوانے سے بہتر تو یہ ہے کہ اس طرح زندگی گزاری جائے۔ حمیدہ نے اسے اور بھی بہت سی باتیں بتائیں اس نے کہا۔

''نظر باز ان حالات میں بھی نہیں چھوڑتے اور اسے بہت زیادہ محتاط رہنا پڑے گا۔'' بہر حال حمیدہ سے اس کی خوب گہری دوستی ہو گئی۔ یہاں فقیروں کے ڈیرے میں کوئی اہم بات نہیں تھی۔ کہ کچھ بن کر آؤ اور کچھ بن کر جاؤ۔ کسی نے توجہ بھی نہیں دی تھی اور حمیدہ نے شازیہ کو میلے کچیلے کپڑے پہنا کر چہرے پر خاص قسم کا تیل جو ایسے لوگوں کے لیے مخصوص ہوا کرتا تھا مل کر اسے بھکارن بنا دیا اور پھر ٹھیکیدار سے بات کر

کے اس نے ٹیلی ویژن اور وی سی آر کھول کر دے دیا۔

’’ارے۔ یہاں تم نے یہ سب کچھ بھی رکھا ہوا ہے۔‘‘

’’یہاں کیا نہیں ہے شازیہ! بہت کچھ ہے یہاں مگر میں اس سے ایک خاص کام کرتی ہوں۔‘‘

’’کیا۔‘‘ شازیہ نے سوال کیا اور حمیدہ نے وی سی آر پر ایک فلم لگا دی۔ یہ جوڑو کراٹے سے متعلق تھ
اور اس میں باقاعدہ جوڈو کراٹے کے فن کے متعلق معلومات دی گئی تھیں۔

’’یہ بھی ضروری ہے۔‘‘

’’کیا مطلب۔ یہ ہو...... یا...... ہی...... ہے...... کر کے ہاتھ اور لات چلانا اور سا
موجود ایک درجن افراد کی پٹائی کر دینا۔ اس سے فن گداگری کا کیا تعلق۔‘‘

’’کتنی عمر ہے تمہاری۔‘‘

’’عمر جتنی بھی ہے تمہارے سامنے ہے۔‘‘

’’میں سمجھتی ہوں کہ ابھی تمہیں زندگی کے پندرہ سے لے کر بیس سال تک بڑے محتاط گزار
ہیں سڑکوں پر کوئی بھی شکل بنا کر گھومو تمہارا نوجوان ہونا سب سے سنگین بات ہے۔ اس طرح کے لوگوں
واسطہ پڑ سکتا ہے تمہارا۔ جو کہیں بھی کسی سنسان جگہ تم پر ہاتھ ڈال دیں گے۔‘‘

’’ارے باپ رے کیوں ڈرا رہی ہو۔‘‘

’’ڈرا نہیں رہی ہوں۔ شازیہ! دوست بن گئی ہو تو زندگی کے سارے تجربات تمہیں دے رہی ہو
میرے ساتھ جوڈو کراٹے سیکھ میں تو اچھا خاصا سیکھ چکی ہوں۔‘‘

’’ان فلموں سے۔‘‘

’’ہاں ہاں یہ فلمیں۔‘‘ بہت کچھ دیتی ہیں اور پھر یہ سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ کسی بھی سنسان جگ
کر دونوں باقاعدہ فلموں کے ایکشن کے مطابق مشق کیا کرتی تھیں۔ حمیدہ اس سے زیادہ تیز تھی۔ لیکن کچھ
عرصے کے بعد حمیدہ نے اعتراف کیا کہ شازیہ طاقت ور بھی ہے اور ہر کام کو جلدی پک کر لینے کی ماسٹر۔ ا
خاصا کام آ گیا تھا اور پھر پہلی بار شازیہ کو حمیدہ کی بات کا تجربہ ہوا۔ بالکل اتفاقیہ طور پر چھٹی کے دن وہ ای
سنسان سڑک پر جا نکلی تھی ایک گاڑی آ کر رکی۔ پہلے تھوڑی سی آگے چلی گئی تھی لیکن شازیہ کو دیکھ کر ریو
ہوئی اور اس کے پاس آ کر رک گئی۔

’’ہیلو......‘‘ ایک نوجوان لڑکے نے کھڑکی سے سر نکال لیا۔ اور وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔

’’آ جا۔ بیٹھ جا پیچھے سیر کروائیں تجھے۔‘‘

’’کہاں لے جاؤ گے بھیا!‘‘ شازیہ نے مسخرے پن سے کہا۔

’’بکواس مت کر بہت زیادہ تیز بن رہی ہے چل جاوید اٹھا لے اسے۔‘‘ لڑکے نے ا
دوسرے ساتھی سے کہا اور وہ دونوں نیچے اتر گئے۔ تب پہلی بار شازیہ کو یہ اندازہ ہوا کہ حمیدہ سے اچھا است
اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ تین چار ہی ہاتھوں اور لاتوں نے ان زنانہ نوجوانوں کو زمین چٹا دی اور اس کے بعد
گاڑی میں بیٹھ کر بھاگ گئے۔ پھر تو کئی ایسے واقعات پیش آئے دو تین افراد کی وہ آسانی سے پٹائی کر لیا کر

تھی اور اس طرح اب اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ اس دن بھی وہ ایک سنسان سڑک پر ہی جا رہی تھی کہ ایک قیمتی کار آ کر اس کے قریب رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک لمڈھینگ بیٹھا ہوا تھا۔ دبلا پتلا پچکا ہوا چہرہ۔ چھوٹی سی ڈاڑھی، منہ اگال دان سے بنا ہوا اگر کھولتا تو یقینی طور پر سرخ رنگ کا لاوا بہہ نکلتا۔ چنانچہ منہ بند کیے بیٹھا ہوا تھا۔ برابر کی سیٹ پر ایک اچھی خاصی پروقار شخصیت نظر آ رہی تھی۔ شازیہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

’’دے دو بابو اللہ کے نام پر۔‘‘

’’بات سنو...... بہت کچھ مل جائے گا تمہیں۔ ہمیں تھوڑا سا وقت دو گی۔‘‘ شرم نہیں آتی بیٹی کے برابر کی لڑکی کو چھیڑتے ہوئے۔‘‘ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص نیچے اتر گیا تھا۔

’’دیکھو...... بے وقوف لڑکی میں......‘‘

’’ہاں ہاں۔ ماموں ہو نا تم میرے۔ جاؤ بابا جاؤ۔‘‘ لیکن اسی وقت دبلے پتلے اونٹ نما آدمی نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ شازیہ نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک کھڑا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رسید کیا۔ اور اس کی ٹانگوں میں سوئپ مارنے کی کوشش کی۔ جواب میں اس شخص نے اس کا دوسرا ہاتھ پکڑا اور اس کو مروڑ کر اسے بغل میں دبا لیا۔ پھر کنپٹیوں پر ہاتھ ڈالا اور شازیہ کو یوں لگا جیسے اس کا سر کسی آہنی شکنجے میں جکڑ ا گیا ہو۔ اس شخص نے اس کی گردن پر کچھ اس طرح کا ہاتھ ڈالا کہ شازیہ کو ایک لمحے کے لیے چکر سا آیا اور اس کے بعد اس کے حواس گم ہو گئے۔ تب لمڈھینگ نے اسے اٹھا کر پچھلی سیٹ پر ڈالا اور دروازہ بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ پھر اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ چند گز کا فاصلہ طے ہوا تھا کہ برابر بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔

’’ویسے میں آپ کو بتاؤں صوفی صاحب! یہ باقاعدہ اغوا کا کیس ہے اگر کسی نے ہمیں یہ کرتے ہوئے دیکھ لیا ہو گا تو آسانی سے پولیس اسٹیشن میں جا کر اطلاع دے دے گا اور ہم اس کے اغوا کے الزام میں پکڑے جائیں گے۔‘‘ صوفی نے پہلے دروازہ کھول کر منہ میں بھرا ہوا سرخ طوفان زمین کی نذر کیا اس کے بعد دروازہ بند کر کے بولا۔

’’جناب عالی! آپ بالکل درست فرماتے ہیں۔ درویشوں کے کرم سے کیس تو یہ اغوا کا ہی ہے۔‘‘

’’اور اگر یہ لڑکی ہمارے ساتھ تعاون پر تیار نہ ہوئی اور اس نے پولیس اسٹیشن جا کر رپورٹ درج کرا دی تو۔‘‘

’’نمٹیں گے اللہ مالک ہے۔ ویسے واقعی بہت تیز لڑکی ہے۔‘‘

’’مگر صوفی صاحب! آپ نے اپنا ریکارڈ نہیں توڑا۔‘‘

’’اپنی چیزیں کون توڑتا ہے جناب!‘‘ صوفی نے معصومیت سے کہا۔

’’واہ۔ کیا بات کہی ہے۔ آپ نے بڑی آسانی سے اسے قابو میں کر لیا۔‘‘

’’غیر شادی شدہ ہوں درویشوں کے کرم سے۔‘‘ صوفی نے جواب دیا۔

’’کیا مطلب؟‘‘

’’شادی شدہ ہوتا تو ان خاتون پر ہاتھ بھی نہیں اٹھا سکتا تھا درویشوں کی دعا سے۔ لیکن نا تجربے

کاری بعض اوقات انسان کی زندگی کے لیے بڑی کار آمد ہوتی ہے۔"

"یار خدا کی قسم فلاسفر بھی ہو۔ ایسا ایسا فلسفہ ٹھونکتے ہو کہ طبیعت ہری ہو جاتی ہے۔"

"آداب عرض کرتا ہوں درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"بہر حال یہ ایک بڑا اور مشکل مرحلہ ہے۔ طے ہو جائے تو اچھی بات ہے۔" تھوڑی دیر کے بعد کار اس عمارت میں داخل ہو گئی تھی جو ان لوگوں کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اور اسے گرین ہاؤس کا نام دے دیا گیا تھا۔ دلاور فوراً آیا اور اس نے دروازہ کھولا۔ اندر بے ہوش بھکارن کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"دلاور اٹھاؤ اسے اور اندر لے چلو۔" دلاور نے لڑکی کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور تھوڑی دیر کے بعد اسے ایک ایسے اندرونی کمرے میں پہنچا دیا گیا جو خاص طریقے سے بنایا گیا تھا۔ اور اس کا سارا نظام جدید ترین کمپیوٹر سسٹم تھا۔ لڑکی کو بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ صوفی اور کرنل رحیم شاہ دونوں اس کے آس پاس موجود تھے۔ کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"صوفی صاحب کتنی دیر بعد ہوش میں آ جائے گی یہ۔"

"اصولی طور پر اسے ہوش میں آ جانا چاہئے جناب! میں تو گاڑی میں ہی محتاط تھا کیونکہ جن رگوں پر میں نے دباؤ ڈالا تھا درویشوں کی دعاؤں سے وہ بس تھوڑی دیر کے لیے حواس معطل کر دیتی ہیں باقی سب خیریت ہے۔" صوفی کے یہ جملے ختم ہوئے تھے کہ لڑکی کی آنکھیں کھلنے لگیں اور چند لمحات کے بعد وہ ہوش میں آ گئی۔ جیسے ہی ہوش میں آئی اچھل کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور خونی نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھنے لگی۔

"ہم دونوں...... تم دونوں ایک بات سن لو شازیہ ہے میرا نام۔ قتل کر دو گے مجھے لیکن عزت نہیں لٹنے دوں گی۔ بہت شریف باپ کی بیٹی ہوں۔"

"بیٹا! تم تمہیں تمہاری عزت لوٹنے کے لیے نہیں لائے۔ تم ہمیں محبت کا کوئی بھی نام دے کر ہمیں قبول کر سکتی ہو تم سے کچھ کام ہے ہمیں۔" کرنل رحیم شاہ نے نرم لہجے میں کہا۔ اور لڑکی کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہونے لگے۔ وہ بولی۔

"کوئی نئی چال چلنا چاہتے ہو۔ مگر اطمینان رکھو اب تم لوگوں کا بہت اچھا تجربہ ہو چکا ہے مجھے۔"

"تمہارے تجربے میں کچھ اضافہ کرنا چاہتے ہیں ہم اگر تم قبول کرو۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے کہا اور لڑکی اسے چونک کر دیکھنے لگی۔

"چھوٹی باجی! ہم تمہیں ذرا بھی پریشان نہیں کریں گے وعدہ ہے۔"

"کیوں ان مقدس جملوں کو بدنام کرتے ہو۔"

"دیکھو...... پہلے ہماری بات سن لو۔ اس کے بعد جو بھی فیصلہ چاہو کر لینا۔ بہتر ہے کہ بدزبانی نہ کرو۔ تاکہ بعد میں تمہیں خود شرمندگی نہ ہو۔"

"سناؤ۔" اور کرنل رحیم شاہ اسے اپنے موقف اور اپنے مقصد کے بارے میں بتانے لگے۔ شازیہ غور سے یہ سب کچھ سنتی رہی تھی۔

♥......♥......♥

گرین فورس کے ارکان کی تعداد پانچ ہو چکی تھی۔ نمبر ایک دلاور، نمبر دو شازیہ، دو کرنل رحیم شاہ کے بھتیجے، عادل اور فیضان تھے۔ جنہیں راز دار بنا لیا گیا تھا۔ پانچواں غلام قادر تھا۔ والدین کا تعلق مکران سے تھا۔ لیکن دارالحکومت میں آباد تھا۔

اور بڑی خوبیوں کا مالک کسی زمانے میں سنیما کے سامنے لائن لگایا کرتا تھا۔ مارتے خان کے نام سے مشہور تھا۔ لیکن کبھی کبھی پٹتے خان بھی بن جاتا تھا اور یہ بھی سوفی صد صوفی کی دریافت تھی۔ غلام قادر اچھے نین نقوش کا آدمی تھا۔ ذہین اور باعمل بھی تھا۔ لیکن بس تعلیم وغیرہ نہ ہونے کی وجہ سے بھی کوئی ڈھنگ کا کام نہیں کر سکا تھا۔ اور جب صوفی اور کرنل رحیم شاہ نے اس سے بھرپور تعاون کیا تو ساری باتیں اس کی سمجھ میں آ گئیں اور اس نے باقاعدہ حلف برداری کی کہ ان لوگوں کا وفادار رہے گا اور بدن کا رونگٹا رونگٹا کاٹ دیا جائے۔ وطن کے مفاد کے خلاف کبھی کسی کے سامنے زبان نہیں کھولے گا۔ اس نے کہا۔

"مالک کا شکر ہے کہ اپن جاہل آدمی ہے تعلیم یافتہ لوگ جو ہوتا ہے نا وہ اللہ کے نام میں بھی گنجائش نکال لیتا ہے۔ اپن نے اگر پیدا کرنے والے کا قسم کھایا بس آپ سمجھ لو کہ وہ ہماری زندگی کا مقصد بن گیا۔ بات خلاص۔" چنانچہ یہ پانچ ممبر ہو چکے تھے۔ اور کرنل رحیم شاہ نے صوفی سے کہا تھا۔

"ایک دو افراد اور ڈھنگ کے مل جائیں تو کورم پورا ہو جائے گا۔ اور اب اس کے بعد باقاعدہ کام کا آغاز کیا جائے گا مختلف قسم کی خبریں ہوا کرتی ہیں۔ خبروں کو دینا بھی اخبارات کی ذمے داری ہوتی ہے لیکن بہر حال بہت ہی اہم خبروں کو اتنا مختصر کر دیا جاتا ہے کہ ان کی اہمیت میں کمی ہو جائے اور صحافتی ذمے داریاں بھی پوری ہو جائیں ایسے کام بڑے مشکل ہوتے ہیں چنانچہ دونوں باتوں کا خیال رکھا گیا تھا وہ یہ کہ ان خبروں سے سنسنی نہ پھیلنے پائے اور عوامی حلقے اس طرف متوجہ نہ ہو جائیں نیز یہ کہ اپوزیشن کے اعتراضات اور دوسرے لوگوں کی عدم واقفیت کا جواب دیا جا سکے چنانچہ کل ان پانچویں اہم ترین افراد کی سچ بولنے والی کاروائیوں کی جنہیں ملکی معاملات کے لیے بدترین لمحے قرار دیا گیا تھی۔ گول مول سے الفاظ میں اخبارات میں جگہ دی گئی تھی۔ لیکن کرنل رحیم شاہ کی نگاہیں بہت گہری تھیں۔ اخبار کی ان مختصر خبروں کو پڑھ کر وہ شدید حیرت کا شکار ہو گئے۔ اور اس کے بعد فوراً ہی صوفی سے رابطہ قائم کیا گیا جو چھٹی لے کر اپنے ڈیرے پر گیا ہوا تھا۔ ٹیلی فون پر رابطہ قائم کر کے کرنل رحیم شاہ نے اسے فوراً گرین ہاؤس پہنچنے کے لیے کہا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں صوفی اپنی مشہور زمانہ موٹر سائیکل پر گرین ہاؤس پہنچ گیا کرنل رحیم شاہ برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ اس نے پرتپاک انداز میں صوفی کا خیر مقدم کیا۔

"کہیے صوفی صاحب! آپ کے اہل خانہ بہ خیریت ہیں۔"

"درویشوں کی دعا سے سب خیریت ہے۔ ویسے میرے اہل خانہ میں ایک عدد طوطا ایک بکری اور پانچ مرغیوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ ممن خان کے ہوٹل پر نیاز علی کام کرتا ہے۔ وہی میری غیر موجودگی میں میرے اہل خانہ کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے جواب دیا اور کرنل رحیم ہنسنے لگے پھر بولے۔

"آئیے تشریف رکھیے اصل میں ہم لوگ ابھی تک اپنی لائن آف ایکشن نہیں بنا سکے۔ بے شک

گرین فورس میں جوممبر شامل ہیں۔ان کی تربیت کی جارہی ہے اورانہیں اس قابل بنایا جارہا ہے کہ آگے چل کر وہ ملکی مفادات کے لیے کام کریں۔لیکن ہمیں اپنے لیے جگہ بنانے کے لیے کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔یہ کچھ اخبارات ہیں۔میں نے ایک خبر پڑھی اور میرے دل میں تجسس پیدا ہوا کہ ذرا اٹھا کر دیکھوں کہ پچھلے کچھ دنوں کے اخبارات کیا کہہ رہے ہیں۔دلاور سے پرانے اخبارات مختلف جگہوں سے منگوائے اور آپ دیکھیے میں نے یہ مارکنگ کی ہے۔''صوفی نے وہ چھوٹی سی خبر پڑھی جو حاشیے میں تھی۔لکھا تھا۔

''حیرت انگیز طور پر ملک کے ماہر ترین سائنس دان نے ایسے سائنسی رازوں کا انکشاف کر دیا جوحکومت کی پالیسی کے مطابق انتہائی خفیہ اہم حیثیت کے حامل تھے۔''

پوری خبر میں تفصیل تھی اور سائنس دان مکمل طور پر ایک ذمے دار آدمی ہے لیکن بس کسی پراسرار عمل کے ذریعے وہ جذباتی ہو گئے اورانہوں نے انتہائی قیمتی راز منظر عام پر پیش کر دیے۔کرنل رحیم نے کہا۔

''یہ تو خیر ایک خبر تھی یہ دیکھو یہ کون کون سے لوگ ہیں۔یہاں تک کہ وزارت دفاع کے فرسٹ سیکرٹری نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ابھی تک اخبارات کی رپورٹوں کے مطابق یہ پانچ لوگ ہیں جنہوں نے ملکی راز افشا کر دیے ہیں۔یہ پانچوں زیر حراست ہیں۔لیکن تم اندازہ لگاؤ صوفی کہ کتنی سنگین اور خوف ناک بات ہے۔ایک اشارہ جگہ جگہ دیا جارہا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ کسی پراسرار عمل کے شکار ہو گئے۔ورنہ ان کا ماضی بے داغ ہے اور بھول کر بھی یہ تصور نہیں کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے صوفی کی پیشانی شکن آلود تھی۔اس نے پرخیال انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''بات واقعی سنسنی خیز ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''ان خبروں کو صرف ضرورتاً شائع کیا گیا ہے ورنہ ان کے پس منظر میں تو بہت کچھ ہوگا۔''

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بہت کچھ کے بارے میں ہمیں کیسے معلوم ہوگا۔میں یہی تمام باتیں سوچ رہا تھا اور میں نے آپ سے مشورہ کرنے کے لیے مسٹر صوفی اپنے آپ کو کچھ دیر کے لیے سنبھال رکھا ہے۔جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ شاہ میر خان میرے قریبی عزیز ہیں اور میرے ان کے درمیان دوستانہ تعلقات بھی ہیں۔میں سوچ رہا ہوں کہ وزارت دفاع کے اس ذمے دار شخص کو اپنی خدمات پیش کر دوں اور ویسے بھی میں اس سوچ میں تھا کہ کسی اتنے ہی اہم محکمے سے ہمارا رابطہ ہونا چاہئے تاکہ ہم آگے اپنا کام کرسکیں۔''

''درست فرمایا آپ نے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''تو بس ٹھیک ہے۔میں شاہ میر خاں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ان دنوں چونکہ ملکی حالات ایک خاص سنسنی کا شکار ہو گئے تھے جس کا انکشاف بھی کھل کر نہیں کیا جاسکتا تھا چنانچہ ایک مخصوص عمل کے تحت ساری مشینری حرکت میں تھی۔شاہ میر خان سے بہ مشکل تمام رابطہ قائم ہو سکا تھا۔

''میں تم سے فوراً ملنا چاہتا ہوں شاہ میر۔'' کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

''اصل میں ہم لوگ ایک انوکھی مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں اور میں ہر لمحے مصروف ہوں لیکن رات کو ساڑھے دس بجے کے بعد تم آجانا اور پہلے فون کر لینا۔''

''نہیں۔میں آتو ساڑھے دس بجے کے بعد ہی جاؤں گا لیکن فون کر کے نہیں آؤں گا تمہیں

ساڑھے دس بجے کے بعد میرا انتظار کرنا ہوگا۔تم یہ سمجھ لو کہ جس مشکل میں تم پھنسے ہوئے ہو اسی سلسلے میں' میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں خدا حافظ!'' پھر ساڑھے دس بجے کرنل رحیم شاہ' شاہ میر خان کی کوٹھی پر پہنچ گیا تھا۔گارڈ کو خصوصی طور پر اس کے بارے میں ہدایت کر دی گئی تھی۔شاہ میر خاں کے چہرے پر تھکن اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ویسے تو خیر مجھے تم سے ملاقات کرنا ہی تھی ظاہر بات ہے میرے اور تمہارے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے لیکن تم نے کچھ الفاظ کہہ کر مجھے ایک عجیب سی ذہنی الجھن میں گرفتار کر دیا۔اور تمہارا موبائل بھی مجھے بند ہی ملا۔''

''جان بوجھ کر ایسا کیا تھا میں نے کہ تم کہیں کوئی بہانہ نہ کر دو مجھے۔'' یار ایسی بات نہیں ہے بہانہ بھلا اور وہ بھی تم سے چلو خیر بیٹھو۔''

''جس مشکل میں تم گرفتار ہو شاہ میر خاں وہ یقیناً ان پانچ افراد سے متعلق ہے۔جنہوں نے ملکی راز افشا کیے ہیں۔''

''اوہو۔تمہیں کیسے معلوم۔''

''جانتے ہو میرا تعلق کہاں رہا ہے۔ملٹری انٹیلی جنس سے، جو خبریں دے کر خانہ پری کی گئی ہے، عام لوگوں کے لیے بے شک انہیں بے اثر بنا دیا گیا ہے۔لیکن میرے لیے بھی بے اثر ہو سکتی ہیں وہ۔''

''خدا کی قسم! جو کچھ ہوا اس سے پوری حکومت خطرے میں پڑ گئی ہے۔چلو خیر سرکاری عہدے داران اپنے عہدوں کے لیے تو خیر پریشان ہیں ہی لیکن تم یہ دیکھو کہ ان عوامل سے شدید خطرہ محسوس کیا جارہا ہے جن کی بدولت یہ سب کچھ ہوا۔''

''میں تم سے یہی سب کچھ کہنا چاہتا تھا۔میر خان اور میں زیادہ وقت نہیں لوں گا تمہارا۔''

''ساڑھے گیارہ بجے مجھے پھر جانا ہے اور ایک میٹنگ میں شریک ہونا ہے۔''

''جانتا ہوں۔جانتا ہوں کہنا یہ چاہتا تھا کہ میں نے اس سلسلے میں نئے سرے سے کچھ کارروائیوں کا آغاز کیا ہے۔تمہاری حکومت نے تو مجھے معذور سمجھ کر میری چھٹی کر دی تھی۔لیکن میرا فرض مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں اپنے کام پورے کرتا رہوں۔جو ایک محب وطن فوجی کی ذمے داری ہوتی ہے۔چنانچہ میں نے اس سلسلے میں باقاعدہ کام شروع کر دیا کچھ افراد میرے ساتھی ہیں مجھے ذرا تفصیل بتا دو اس سارے مسئلے کی تاکہ میں آگے کام شروع کرسکوں۔'' اور شاہ میر خان نے وہ تمام واقعات پوری تفصیل سے بتا دیے۔جن کی تفصیل اخبارات کی خبروں میں موجود نہیں تھی۔اس بات کا اظہار بھی کر دیا کہ کچھ انجکشن ایسے ہیں جو ان لوگوں کے معاملات میں مشترک پائے گئے ہیں۔یہی بتایا کہ اس سلسلے میں ایجنسیاں حرکت میں آگئیں ہیں اور شدت کے ساتھ تحقیقات ہو رہی ہے۔

''میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں شاہ میر خان، اپنے طریقے سے میں اس کام کو سرانجام دینے کی کوشش کروں گا۔لیکن اگر کسی مسئلے پر مجھے پولیس یا آرمی کی یا صدر کی ضرورت پیش آگئی تو کیا تم میری مدد کرو گے۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو کرنل رحیم شاہ! دو ہی باتیں ہیں اول تو تم خود ایک ذمہ دار فوجی رہے ہو۔

رہے ہو کیا بلکہ ہو۔ کسی بھی وقت تمہاری خدمات ملک کے لیے طلب کی جاسکتی ہیں۔

اب یہ الگ بات ہے تمہیں کیا دی جاتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ تم میرے لیے انتہائی معتمد آدمی ہو۔ میرے لیے نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں حکومت کا کوئی بھی شخص جس کا تعلق خاص طور سے ملٹری سے ہوگا۔ کرنل رحیم شاہ کا شان دار ماضی اس بات کا کھلا ثبوت ہے۔ کہ وہ ایک خالص محب وطن شخصیت ہے۔'' کرنل رحیم شاہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اس نے کھڑے ہوکر ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''تم تیاریاں کرو اور جاؤ۔ مجھے بس انہی الفاظ کی ضرورت تھی۔''

''اور سنو۔ رحیم شاہ! یہ میرا خاص موبائل نمبر رکھ لو۔ جو صرف چند لوگوں کے علم میں ہے اور جو ہر لمحے موجود ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے۔'' کرنل رحیم شاہ مطمئن انداز میں وہاں سے واپس لوٹا تھا اور اس کے بعد صوفی کے ساتھ اس کی میٹنگ ہوئی۔ اور اس نے صوفی سے کہا۔

''بس صوفی صاحب! آپ یہ سمجھ لیجیے کہ یہ ہمارا امرحلہ ہے۔''

''میں نے پیر دمڑی شاہ کے مزار پر جاکر منت مانگ لی ہے۔ اور مجھے وہاں سے اشارے موصول ہوئے ہیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے مجھ سے مدد کا وعدہ کیا گیا ہے۔''

''دمڑی شاہ۔''

''جی حضور۔ ایک ریگستانی علاقے میں چھوٹا سا مزار ہے ان کا۔ کم لوگ جاتے ہیں اس طرف لیکن حق اللہ میں کبھی کبھی چلا جاتا ہوں۔''

''صوفی صاحب! میں بزرگوں سے اتنی ہی عقیدت رکھتا ہوں جتنی آپ لیکن براہ کرم یہاں آپ تھوڑا سا پریکٹیکل ہوجایئے۔''

''پوری زندگی گزر گئی جناب والا، درویشوں کے کرم سے انہی درویشوں کی دعاؤں نے مجھے سرخرو کیا ہے۔ حق اللہ۔ حق اللہ۔ حق اللہ۔'' صوفی نعرے لگانے لگا۔

''پھر آپ اس سلسلے میں کوئی لائحہ عمل بتایئے۔''

''رہنمائی ہوگی۔ رہنمائی ہوگی۔'' صوفی پر اس وقت وجد طاری تھا کرنل رحیم شاہ پر تشویش طور پر خاموش ہوگیا۔

♥......♥......♥

ممن خان نے دو نئی بھینسیں خریدی تھیں۔ اور باقاعدہ ایک تقریب کرڈالی تھی۔ آج شام کو اس کے ہوٹل پر دوستوں کی محفل جمنے والی تھی۔ صوفی کے ڈیرے پر خود آیا تھا۔

''اماں صوفی صاحب! کہیں بھاگ جانے کی تیاریوں لگے ہو کیا۔''

''نہیں آیئے۔ ممن خان صاحب درویشوں کی دعا سے کہیں جانے کا ارادہ نہیں تھا۔''

''پھر یہ کپڑوں پر استری کیوں ہو رہی ہے۔'' ممن خان نے سامنے زمین پر بچھی ہوئی چادر پر پتلون کو دیکھا اور ساتھ ہی پیتل کے اس برتن کو جسے پتلون پر رگڑ رگڑ کر استری کی جارہی تھی۔ صوفی اپنا کام ایسے ہی چلالیا کرتا تھا!

''ارے وہ کچھ نہیں بس آج کل ذرا خان صاحب کی طرف سے صاف ستھرے رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔''

''لگ رہا ہے، بہت دن سے بلکہ عزیزی بتا رہا تھا کہ اب ٹھیلا پل پر نہیں لگتا۔ کہیں جگہ بدل لی ہے کیا۔''

''وہ بس عارضی طور پر بند کرلیا ہے۔''

''ایں اور ہمیں معلوم ہی نہیں۔ جبھی تو ہم کہہ رہے تھے کہ آج کل ہر مال دس روپے کی گردان کم ہی ہو رہی ہے۔ کیا بات ہے کیا کاروبار مندا پڑ گیا تھا۔''

''نہیں ممن خان صاحب! کرم فرما جینے نہیں دیتے۔ ہماری زندگی کا مقصد تو صرف دو روٹی ہے درویشوں کی دعاؤں سے ہمیں مل جائے اور ہمارے ذریعے کچھ ضرورت مندوں کو مل جائے بس اور کیا درکار ہوتا ہے۔''

''تو کیا پھر محکمہ پولیس میں گھس گئے۔''

''نہیں اپنا ہی کام شروع کیا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''کیا مطلب؟ کیا بیچ رہے ہو آج کل۔''

''نہیں بیچ تو کچھ نہیں رہے۔ کچھ غیر سرکاری کام ہی ہیں۔ ایک پرائیویٹ ادارے سے منسلک ہو گئے ہیں۔''

''اچھا خیر چھوڑو۔ دو نئی بھینسیں خریدی ہیں نا۔ شام کو پبلک کو بلالیا ہے۔ ذرا بریانی کی دیگ پکائی ہے۔ کچھ میٹھا کرلیں گے شام کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھایئے گا۔''

''مبارک باد پیشگی وصول کیجیے۔''

''اماں کہیں اڑ مت جایئو تمہارا کہیں ٹھکانہ نہیں ہے۔''

''نہیں۔ ممن خان! آپ سے منحرف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سائے سے محرومی ہوجائے۔''

''اللہ جیتا رکھے۔ تم جیسا پڑوسی بھی تو ہو کوئی۔ اور پڑوسی کیا اب تو میاں بھئی رشتے دار بھی تم ہو۔ خاندان والے بھی تم۔ اچھا چلتا ہوں ذرا دیکھ بھال کر رہا ہوں۔ بریانی بھی ٹھیک پکوانی ہے ورنہ یہ بات تو تم جانتے ہو صوفی میاں! کہ میرے ہاں بریانی کھانے والے معمولی لوگ نہیں۔ صحیح معنوں میں بریانی کی تاریخ ہم ہی سے منسلک ہے۔''

''ہاں اس میں کیا شک ہے ان کھانے والوں کو تو پتا بھی نہیں ہے کہ بریانی ہوتی کیا چیز ہے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو ہم حاضر ہوجائیں گے۔'' شام کو بڑے اہتمام کے ساتھ صوفی ممن خان کے ہوٹل کے بیچ پر موجود تھا۔ خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ تمام ہی شناسا موجود تھے۔ صوفی نے خاص طور سے کرنل رحیم شاہ کو فون کر کے کہا تھا کہ آج کی شام دوستوں کے نام ہے۔ کسی مسئلے میں نہیں الجھے گا۔ رحیم شاہ نے خاموشی اختیار کر لی تھی بہرحال اس وقت خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ بریانی کی خوشبو چاروں طرف چکراتی پھر رہی تھی۔ اور صوفی اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں کو بتا رہا تھا۔

''میاں! یہ شہنشاہوں نے بھی بڑی آخری جوت رکھی تھی درویشوں کی دعاؤں سے عیش وعشرت، عیاشی، کھانا پینا ایک تماشا بنا ہوا تھا۔ اب یہ بریانی ہی دیکھ لو دلی اور لکھنو کی چلتی تھی لکھنو والوں کو تم جانو کہ

نخروں کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا تھا۔ بڑی نفاست سے ہر چیز بنتی تھی۔ ادھر موتیا بنا یعنی موتیا پلاؤ۔ جس میں ایک ایک بوٹی کو صفائی کر کے ڈالا گیا۔ چاول کی سفیدی پر نشان نہ آنے پائے۔ تیار ہو گیا موتیا اور پہنچا دلی والوں کے پاس تو دلی والوں نے سارے مسالے اکٹھے کیے سالن پکایا اور چاولوں میں ڈال کر بریانی بنالی۔ مرچوں کا بناؤ وہی دلی والا سی کرو اور کھاتے جاؤ۔ اس طرح سے وہاں، دو پیازہ پکا کیا بات ہے دو پیازے کی۔ بوٹی پر اگر چیچھڑے کا نشان نظر آ گیا۔ تو دیگیں تباہ کر دی گئیں۔ دلی والوں کو پتا چلا تو پکا دی گئی نہاری۔ اور وہ مسالے ڈالے گئے کہ رہے نام درویشوں کا۔'' صوفی نے کہا اسی وقت ایک گٹھے ہوئے بدن کا نوجوان آدمی ہوٹل کے دروازے پر نظر آیا۔ یہ شاہی تھا اسی محلے کا رہنے والا سب کا دوست لیکن اس کی چمچماتی ہوئی موٹر سائیکل اور قیمتی لباس صوفی کے لیے خاص طور سے حیرانی کا باعث تھا چونکہ بہت دن بعد اس نے شاہی کو دیکھا تھا۔

''درویش رحم کریں! یہ اپنا شاہی تو بڑا چمک رہا ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''ہاں۔ آج کل اس کی اڑ کے لگ رہی ہے۔ وہ موٹر سائیکل نہیں دیکھی چمچماتی ہوئی یاماہا ایک سو بیس۔''

''ہاں ہاں دیکھ رہے ہیں۔'' شاہی اندر آ گیا۔ ایک ایک سے ہاتھ ملاتے ہوئے وہ صوفی کی طرف بڑھا۔

''انسپکٹر صاحب! کیسے حال ہیں آپ کے۔''

''درویشوں کی دعائیں ہیں بس، لیکن تم نے ہمیں انسپکٹر کہنا نہیں چھوڑا۔''

''انسپکٹر تو تم شکل سے ہی لگتے ہو ڈیوٹی پر ہو یا نہ ہو۔''

''پھر سوچ لو۔ پولیس کا کام تو تفتیش کرنا ہے۔ تمہارے بارے میں تفتیش شروع کر دی تو مشکل میں نہ پڑ جاؤ درویشوں کی دعاؤں سے۔'' جواب میں سب لوگ ہنسنے لگے۔ شاہی کے سامنے بریانی پیش کی گئی۔ لیکن صوفی کو بہرحال حیرت تھی۔ اپنی رگ تجسس کو نہ دبا سکا۔ کہنے لگا۔

''اور شاہی! تم نے وقت نہیں دیا مجھے بہت دن کے بعد ملاقات کر رہا ہوں تم سے درویشوں کے کرم سے۔''

''اماں! وقت ہے تمہارے لیے جب بھی کہو جان حاضر ہے۔'' شاہی نے کہا۔

''یہاں۔ فارغ ہو کر گھر چلتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' ممن خان کے ہوٹل سے لے کر صوفی شاہی کو لے کر سیدھا اپنی رہائش گاہ پہنچا تھا۔ شاہی مسکرا کر اس کا گھر دیکھنے لگا پھر بولا۔

''یار! صوفی صاحب زمین جنبد نہ جنبد اپنے صوفی صاحب! یہ گھر ہمیشہ ایک ہی شکل میں نظر آتا ہے۔ یار! کچھ بدلوا سے۔''

''شاہی تم ہمارے یار ہو نا درویشوں کے کرم سے۔''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔''

''کچھ عرصے پہلے تم راج گیری کیا کرتے تھے۔ گھر بناتے تھے مستری تھے۔''

''تھے کیا اب بھی ہوں۔''

''مگر اس وقت تمہارے یہ ٹھاٹ باٹ نہیں تھے۔''

''بس اللہ کا کرم ہے صوفی میاں! مالک جب دینا چاہتا ہے تو کہیں سے بھی دے دیتا ہے۔''

''یہی تم سے معلوم کرنا چاہتا تھا میں دیکھو...... میں نے بڑی دنیا دیکھی ہے درویشوں کی دعاؤں سے اس دور میں دوست پیدا کرنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس وقت ہے جب انسان تمام اخلاقیات اور شرافت اپنے اوپر سے جھاڑ کر بے لباس ہو جاتا ہے درویشوں کی دعاؤں سے اور مشکل اس وقت ہے جب وہ اپنی تمام تر شرافیات اور انسانیت کے ساتھ عزت اور دیانت داری سے روٹی کمانا چاہے۔ مجھے معاف کرنا شاہی! تمہارا حلیہ بدل گیا ہے۔ یہ قیمتی لباس اور یہ موٹر سائیکل میرے دوست نہ ہوتے تو میں تمہاری طرف توجہ بھی نہ دیتا۔ بس یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کسی ایسے دھندے میں تو نہیں پڑ گئے جو دو نمبر ہو اور بعد میں تمہارے لیے مشکل بن جائے۔''

''نہیں میاں بھائی صوفی! میرے ماں باپ بھی اچھے نیک لوگ تھے اور انہوں نے مجھے عزت کی روٹی اور حلال کی روزی کما کر کھلائی۔ میں اتنا برا بھی نہیں ہوں کہ دو نمبر کے دھندوں میں پڑ جاتا رہا جہاں تک سوال میری حالت بدلنے کا ہے تو مولا کریم عزت دے بابا صفر کو جس نے بہت کچھ دیا ہے مجھے۔''

صوفی چونک کر بولا۔

کیا نام لیا تم نے؟'' جواب میں شاہی ہنسنے لگا پھر بولا۔

''بابا صفر!''

''واہ۔ یہ کون صاحب ہیں۔''

''میاں بڑے پہنچے ہوئے ہیں چلو تمہارے بھی وارے نیارے کرادوں گا۔''

''کوئی بزرگ ہیں کیا۔''

''ایسے ویسے۔ پکے اللہ والے ہیں وہ جو کہتے ہیں نا کہ تارک الدنیا، تارک الدنیا۔ ہاں دنیا کو ترک کیا ہوا ہے۔ کیا شان ہے مزار دریافت ہو رہے ہیں کہیں سے حکم دے کر چلنے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ لمبی کہانی ہے۔''

''اماں قسم ہے تمہیں! ذرا سناؤ تو سہی مجھے۔'' صوفی نے پانوں کی ڈبیا اور چھالی تمباکو کا بٹوہ سامنے رکھتے ہوئے دانت نکال کر کہا۔ پھر ایک پان شاہی کو پیش کیا گیا اور دوسری گلوری صوفی نے خود اپنی جیب میں رکھ لی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور دانت نکلے پڑ رہے تھے۔ پھر اس نے کہا۔

''واہ..... کیا اچھا نام ہے بابا صفر! مگر یہ کون ہیں اور کہاں سے مل گئے تمہیں۔'' صوفی نے پوری دلچسپی کے ساتھ پوچھا اور شاہی نے آنکھیں بند کر لیں تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔

''زیادہ دن پرانی بات نہیں ہے۔ یہاں سے جونا پوری جا رہا تھا۔ بس میں بیٹھ کر جونا پوری کے لیے وہ بسیں چلتی کیا ہیں چل لیتی ہیں۔ جہاں تک ان کی ہمت ہوتی ہے۔ راستے میں بس خراب ہو گئی اور ڈرائیور نے مسافروں سے کہا کہ وہ اتر جائیں کوئی دوسری بس آئی تو اس میں بٹھا دیا جائے گا۔ میں بھی اتر گیا۔ جونا پوری کے لیے بسیں دو دو تین گھنٹے کے بعد آتی ہیں۔ سارے مسافر پریشان ہو گئے تھے۔ ڈرائیور

نے کہا کہ ہوسکتا ہے کہ یہی بس ٹھیک ہو جائے۔ سب ادھر ادھر گھومنے پھرنے لگے میں بھی سڑک سے نیچے اتر کر آگے بڑھ گیا اور ایک جگہ ایسی ٹھنڈی اور سایہ دار نظر آئی کہ میں نے سوچا کہ چلو تھوڑی دیر آرام ہی کر لوں۔ درخت کے نیچے ڈیرا لگا دیا میں نے۔ سر کے نیچے اینٹ رکھی اور بھاء میاں سو گئے۔ بس وہ کہتے ہیں نا کہ تقدیر کو جب دینا ہوتا ہے تو ایسے ہی دیتی ہے گہری نیند آ گئی۔ کسی نے دیکھا نہیں کہ میں سو گیا۔ وہی بس ٹھیک ہوئی اور چلی گئی وہاں سے...... اور میں سوتا پڑا رہ گیا۔ اپنی نیند تو مشہور ہے گدھے گھوڑے سب بیچ دیتے ہیں۔ تو بس سوتے رہے اور صوفی میاں وہیں رات ہو گئی۔ نہ جانے کون سا ٹائم تھا جو آنکھ کھلی ہر طرف گھرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ گیدڑوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ قسم اللہ کی ہوا ہی کھسک گئی۔ جب گزرے ہوئے واقعات یاد آئے تو جان ہی نکل گئی۔ وہ علاقہ تو کالی کھتی کا علاقہ ہے۔ کالی کھتی پتا ہے نا آپ کو۔ جہاں پہلے اینٹوں کے بھٹے ہوا کرتے تھے۔ بعد میں نہ جانے کیوں وہاں سے بھٹے ختم ہو گئے۔ بہر حال ہم گرتے پڑتے سڑک پر آ گئے۔ مگر بے سود، بھلا اس وقت یہاں سے کسی بس کے گزرنے کا کیا سوال تھا۔ جان ہی نکل گئی ہم نے سوچا کہ چلو شاہی آخری دن آ گیا ہے زندگی کا۔ بس مولا کی یاد میں بیٹھ گئے کہ مولا بچا لے اس رات کو، صبح ہی صبح چل پڑیں گے جو ہوگا دیکھا جائے میاں کوئی گھنٹہ گزرا تھا کہ دور سے روشنی نظر آئی۔ اب ہماری تو جان ہی نکل گئی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس ویرانے میں کس نے موم بتی جلا دی ہے۔ بہت دیر تک سوچتے رہے کہ کیا کرنا چاہئے پھر ہمت کی اور چل پڑے اس طرف وہاں جا کر دیکھا تو ایک عجیب سی جگہ بنی ہوئی تھی۔ ایک گھر جیسا تھا۔ اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ گھر یہاں کس نے بنا لیا ہے۔ پھر وہیں ہماری ملاقات ان بزرگ سے ہوئی سائے کو دیکھ کر ہی جان نکل گئی تھی۔ پر بڑی ہمدردی سے انہوں نے کہا۔

"بیٹا ڈرتے نہیں ہیں۔ انسان کو تو اللہ پاک نے اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا ہے اور اشرف کو کسی سے ڈرنا نہیں چاہئے۔" ہمیں ایک دم یاد آ گیا کہ ہمارے تایا کا نام اشرف تھا۔ ہم نے کہا۔

"ڈر کون رہا ہے۔ اگر ڈر رہے ہوتے تو ادھر آتے کائے کو۔" بزرگ نے ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے۔

"چائے پیو گے۔" ہم نے کہا۔

"میاں سبحان اللہ۔ چائے مل گئی تو سمجھ لو زندگی مل گئی۔ آپ کو تو پتا ہی ہے صوفی صاحب ممن بھائی سے دوستی چائے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ مگر اس ٹائم ممن بھائی چائے میں پوستے ڈالتے تھے بعد میں لوگوں کے کہنے سننے پر انہوں نے یہ دھندا ترک کر دیا۔ بلکہ آپ ہی نے تو انہیں منع کیا تھا اور روکا تھا۔ چائے میں ڈوڈے ڈالنے کو۔"

"درویشوں کی دعا سے۔" صوفی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"مگر میاں ماننے والا ہو تو ایسا ہو دوستی نبھا دی ممن خان نے۔"

"ہاں اس میں کیا شک ہے۔"

"ہاں تو ہم بات کر رہے تھے ان بزرگ کی۔ چائے پلائی اور کیا چائے پلائی۔ بس مزہ آ گیا۔" کہنے لگے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" پھر ہم نے ان سے پوچھا کہ۔ "چچا میاں آپ کا نام کیا ہے؟" دیر تک سوچ میں ڈوبے رہے پھر بولے۔

"ناموں سے کیا ہوتا ہے بیٹا! انسان کا عمل ہی نام بن جاتا ہے۔ میں تو ابھی صفر ہوں۔" ہم نے کہا۔

"اماں ابا تھے تمہارے؟ بولے کائے کو نہیں تھے۔" ہم نے کہا۔

"انہوں نے کوئی نام تو رکھا ہوگا؟" کہنے لگے۔

"رکھا ہوگا کچھ ہم بھول گئے۔ اب تو ہم اپنے آپ کو صفر کہتے ہیں۔ یعنی ہم کچھ بھی نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"چچا میاں صفر کا وزن جانتے ہو کتنا ہوتا ہے۔ ہزاروں کے حساب سے بڑھتا ہے الف پر لگا دو دس بن جاتا ہے، دس سو بن جاتا سو ہزار، صفر تو بڑی بھاری چیز ہوتی ہے۔" ہنسنے لگے بولے کہ۔ "آدمی سمجھ دار معلوم ہوتے ہو" پھر کہنے لگے کہ۔ "ہمیں حکم دے کر یہاں بھیجا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ ایک باکرامت ہستی یہاں کی زمین میں اکیلی سو رہی ہے اس کا ساتھ دو۔" ہم نے کہا۔ "چچا میاں کائے کو ڈرا رہے ہو۔ کس کی بات کر رہے ہو آخر۔ تو زمین کی طرف اشارہ کر کے بولے کہ۔ "دیکھو وہ دیکھو اور صوفی صاحب ہم نے جو دیکھا قسم اللہ کی کیا بتائیں آپ کو۔ جس طرف انہوں نے اشارہ کیا وہاں سپاٹ زمین سے اچانک ہی روشنیاں پھوٹ پڑیں اور ایسی روشنی کہ بس دیکھنے والے دیکھیں۔ اس روشنی میں ہمیں ایک قبر نظر آئی۔ قبر تو خیر جیسی تھی مگر چادر اس پر ہری پڑی ہوئی تھی اور کیا ہری ہری روشنی بکھر گئی ہر طرف ہم تو آنکھیں پھاڑ کر رہ گئے۔ ساری جان سے لرز گئے تھے ہم بڑی مشکل سے ہم نے کہا کہ چچا میاں کیا بزرگ ہستی کی کرامت ہے ہمیں حکم ملا ہے کہ یہاں ان کا مزار بنایا جائے۔ تم جو کوئی بھی ہو یہ بتاؤ۔ بزرگوں سے کوئی دلچسپی ہے، ہم نے کہا کہ۔ "کیا بات کرتے ہو چچا میاں بزرگ تو ہماری ریڑھ کی ہڈی ہیں انہی کے سائے میں تو پل بڑھ رہے ہیں کہنے لگے۔" یہاں مزار بنا دو۔ تمہیں اس کا صلہ ملے گا۔" ہم نے کہا کہ ہر چیز صلے کے لیے تو نہیں ہوتی۔ ہم دل و جان سے تیار ہیں اور آپ تو یہ بات جانتے ہو صوفی صاحب کہ اپنے نہ کوئی آگے ہے اور نہ پیچھے تو ہم نے کہا کہ صبح سے کام شروع کر دیں گے۔ مگر وہ صفر بابا جو ہے نا بندہ بڑے کام کی چیز ہے۔ سارا سامان ہمیں نکال کر دیا کدال پھاوڑا اور بس رات گزرنے کے بعد صبح کو ہم نے کام شروع کر دیا ویسے بھی اپنا تو کام یہی ہے تم جانتے ہو۔ ساری نشان دہی کرنے کے بعد ہم نے سب سے پہلے وہاں مٹی ڈال کر قبر بنا دی۔ پھول بھی چچا میاں نے خود ہی لا کر دیے تھے اور کہاں سے لا کر دیے تھے یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ بس جناب ادھر کام شروع کر دیا۔ صفر بابا کا کہنا ہے کہ وہاں کوئی باقاعدہ مزار نہیں تعمیر کرنا۔ ایسی بزرگ، ہستیوں کو عمارت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس وہ چاہتے ہیں کہ گنے چنے لوگ وہاں آتے رہیں اور ان بزرگ کے لیے فاتحہ خوانی کرتے رہیں۔ خود بابا صفر مجاور بن کر بیٹھ گئے ہیں۔ اب ہم کو ان کے بہت سے کام کرنے ہیں۔ بڑے کام باقی ہیں۔ انہوں نے ہماری بہتری کے لیے دعائیں بھی کیں اور کیا بزرگ ہستی ہیں میاں گھر میں بیٹھ کر پیسے ملنا شروع ہو گئے۔ کبھی کہیں سے کوئی رقم ہاتھ آ جاتی تھی کبھی کہیں سے۔ ہم بھی بس عقیدت مند ہیں ان کے۔ بہت سی جگہ بیٹھ کر ان کی شان میں باتیں کر چکے ہیں۔ وہ قبر ذرا شہر سے باہر ہے ورنہ اب تک تو وہاں عرس شروع ہو چکا ہوتا۔"

''حق اللہ۔ حق اللہ۔ درویشوں کا ظہور اسی انداز میں ہوتا ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔ یار ہم بھی چلیں گے تمہارے ساتھ۔''

''جب مرضی آئے چلو اپنی تو جاگیر ہے وہ جگہ۔''

''قبر وغیرہ کا کام پورا ہو گیا۔''

''ابھی کہاں۔ ابھی تو کام کر رہے ہیں۔ ہم، کچی چار دیواری بنانے کے لیے کہا ہے۔ ایک ہفتے کی چھٹی لے لی تھی۔ چچا میاں سے مطلب یہ کہ صفر بابا سے اور کہا تھا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر کام کر دیں گے۔''

''بھئی۔ میں بھی چلوں گا اس نیک کام میں تو حصہ لینا درویشوں کی مہربانی ہوتی ہے۔ ویسے یہ موٹر سائیکل وغیرہ بھی۔''

''ہاں نا۔ بولا نا بس کہیں نہ کہیں سے رقم مل جاتی ہے اسی سے یہ سب کچھ کیا ہے۔ کبھی تکیے کے نیچے کبھی دیوار کے طاق سے کبھی راستے میں پڑی مل جاتی ہے۔ بس جو مانگیں اللہ پاک دے دیتا ہے، کل چلو ہمارے ساتھ۔''

''ٹھیک ہے چلیں گے ساتھ ساتھ، ایسے موقع بھلا چھوڑنے کے لیے ہوتے ہی ہیں۔'' صوفی بہت کچھ سوچتا رہا تھا۔ دوسرے دن یہ بات طے پائی تھی کہ صبح ہی چلیں گے۔ دوسری صبح شاہی اپنی موٹر سائیکل پر پہنچ گیا۔ صوفی اپنی موٹر سائیکل کو جگہ جگہ سے تیل دے رہا تھا۔

''ممن خان سے حلوہ پوری کے لیے کہہ کر آیا ہوں ابھی فخرو لے کر آ رہا ہوگا۔ ناشتا کرتے ہی نکل چلیں گے۔ یہ اپنی پھٹ پھٹیا کیوں صاف کر رہے ہو؟''

''دونوں گاڑیاں لے کر چلیں گے۔''

''اماں معاف کر دو بھائی ایک دفعہ یاد ہے ہم لوگ گئے تھے اس پر چار میل تک مجھے دھکا لگانا پڑا تھا تمہاری اس پھٹ پھٹیا کو' میری گاڑی پر چلو برانڈ نیو ہے۔ ذرا اس کی چال مستانی دیکھنا۔'' صوفی نے شرمندگی سے گردن ہلا دی تھی۔

ناشتے وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے صوفی نے اپنا قومی لباس پہنا۔ یعنی شیروانی اور ڈھیلا پائجامہ، بہت کچھ کمایا تھا اور بہت کچھ کماتا رہتا تھا۔ لیکن پتا نہیں یہ اس کی فطرت کا کون سا رنگ تھا اور ایسا کیوں تھا کہ ہمیشہ اپنے حال میں مست رہتا تھا۔ موٹر سائیکل آنی جانی چیز ہے۔ کئی بار بکی تھی اور خریدنے والے ہاتھ جوڑ کر واپس کر گئے تھے اور اپنی رقم واپس کر گئے تھے اور صوفی صاحب! اس موٹر سائیکل کو چلانا آپ ہی کا کارنامہ ہے۔ صوفی دماغ کا ٹھنڈا آدمی تھا بس ایک بار غصے میں کسی سے کہا تھا کہ میاں موٹر سائیکل چلانا تو سیکھ لو پہلے۔ یہ ایسی موٹر سائیکل ہے کہ موت کے کنویں میں بھی چلاؤ گے تو کبھی دھوکا نہیں دے گی۔ لینے والے نے کہا تھا کہ حضرت اس کا سڑکوں پر چلانا ہی موت کے کنویں میں چلانے کے مترادف ہے۔ جان کھونے کے لیے اس سے اچھی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ بہرحال اس وقت صوفی صاحب شاہی کی موٹر بائیک پر ہی بیٹھے ہوئے تھے اور شاہی انہیں صفر بابا کے بارے میں تفصیل بتاتا جا رہا تھا۔

''خود بہ خود غائب ہو جاتے ہیں سارا سارا دن پتا نہیں چلتا لیکن جب ان کی قیام گاہ میں داخل ہو

تو پتا چلا کہ تسبیح کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں۔ جب کہ پہلے پوری قیام گاہ کا جائزہ لینے کے باوجود کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔''

''درویش رحم کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ کیا جانے کس بھیس میں باوا مل جائے بھگوان۔'' کبیر داس نے بالکل ٹھیک ہی کہا تھا۔ راستے بھر عقیدت کی باتیں ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ کالی کھتی کا علاقہ آ گیا اور شاہی نے موٹر سائیکل پکی سڑک سے کچے راستے پر اتار دی۔ تھوڑا سا کچا فاصلہ طے کر کے وہ اس جگہ تک پہنچ گئے۔ جہاں ایک عظیم الشان قبر بنی ہوئی تھی۔ قبر پر تازہ تازہ پھول پڑے ہوئے تھے جو بہرحال شاہی نے نہیں ڈالے تھے۔ قبر کے گرد ایک چوکور احاطہ کوئی دو فٹ کا اونچا کھڑا ہو چکا تھا۔ ایک طرف تعمیراتی اوزار رکھے ہوئے تھے۔ پہاڑ کے نزدیک ہی وہ عجیب وغریب جگہ تھی۔ جو نہ جانے کس زمانے میں کس مقصد کے تحت تعمیر کی گئی ہوگی۔ لیکن اب وہاں کافی بڑی جگہ بنی ہوئی تھی۔ صوفی گہری نگاہوں سے وہاں کا جائزہ لیتا رہا۔ دور دور تک کوئی انسان کا وجود موجود نہیں تھا۔ صوفی نے کہا۔

وہ بزرگ میرا مطلب ہے صفر بابا کہاں ہیں۔''

''ہو سکتا ہے اندر ہوں اور ہو سکتا ہے موجود نہ ہوں۔''

''ہوں۔ ہم اندر جا سکتے۔''

''جا سکتے ہیں۔ صفر بابا کو مجھ پر بڑا اعتماد ہے۔ کافی دن سے ان کی خدمت میں حاضری دے رہا ہوں بس سمجھ لو۔ میں ان کا خاص آدمی ہوں۔ ایک بار تو ہنس کر کہنے لگے کہ شاہی یہ مزار مکمل ہو جائے تو تم ہی اس کے مجاور بن جانا تم سے بہتر آدمی مجھے کوئی نظر نہیں آتا۔''

''درویش رحم کریں۔'' صوفی ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ پھر اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹکنے لگیں۔ اور اس نے کہا۔

''تو پھر چلو ہم کام شروع کر دیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ذرا کپڑے بدل لوں۔'' شاہی نے کہا۔

''تمہارے کپڑے یہاں موجود ہیں۔''

''ہاں موجود ہیں۔'' میں نے بتایا نا تمہیں کہ بڑا کام کرتا ہوں یہاں، اس کا صلہ پایا ہے میں نے دیکھ لو۔'' شاہی کپڑے بدلنے کے لیے اندر عمارت میں چلا گیا اور صوفی عقیدت بھری نگاہوں سے اس قبر کو دیکھنے لگا۔ بہرحال کوئی پہنچے ہوئے ہی بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ شاہی اندر سے باہر آیا لیکن وہ کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ باہر نکلا تو صوفی نے اس کے ساتھ لمبی، چوڑی جسامت کے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا بہترین صحت کا مالک تھا اور خاصا پر رعب نظر آتا تھا۔ صوفی بے اختیار آگے بڑھا اور اس نے بزرگ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر عقیدت سے چوم لیے۔

''حضورِ من، جناب والا ایک عقیدت مند کی حیثیت سے اپنے صوفی کو قبول کیجیے۔''

''حق اللہ۔ حق اللہ۔'' جواب میں اس بوڑھے کے منہ سے بھی حق اللہ کی آواز سنائی دی پھر بوڑھے نے کہا۔

''شاہی نے ہمیں آپ کے بارے میں بتایا ہے صوفی صاحب! کہنے لگا بڑے اچھے آدمی ہیں اور مزار

کی تعمیر میں اپنی خدمات سرانجام دینا چاہتے ہیں۔ بات یہ ہے عزیزی! کہ ہم بھی بہت دور سے آئے ہیں۔ بس بشارت ہوئی تھی ہمیں کہ یہاں ایک صاحب کرامت دفن ہیں لیکن ان کی ابھی کوئی باقاعدہ قبر نہیں بنائی ہے۔ ہم یہاں پہنچ گئے۔ پھر ہمارے ہی دل میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ ان کے فیض سے دوسروں کو بھی فیض یاب کیا جائے۔ چنانچہ ہم نے اس مزار کی تعمیر کا منصوبہ بنایا اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں صوفی صاحب کہ بزرگ خود اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں یہ بچہ یہاں آ گیا اور اس نے ہماری بڑی ذمے داریاں سنبھال لیں۔ مزار تعمیر ہو جائے آپ لوگوں کی ذمے داری یہی ہے کہ حاجت مندوں اور ضرورت مندوں کو یہاں لائیں مگر ذرا محدود تعداد میں۔ ہم نہیں چاہتے کہ بہت بڑا میلا یہاں لگ جائے۔ اصل میں ہماری خواہش ہے کہ صاحب علم ہی یہاں آئیں۔ کیونکہ غیر تعلیم یافتہ لوگ مزار کی حرمت کا خیال نہیں کرتے ہیں آپ کو اس کا خیال رکھنا ہے۔"

"آپ مکمل اطمینان فرمایئے آپ کا خادم حاضر ہے۔" صوفی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا آپ لوگ اپنا کام سرانجام دیں۔ ہم ذرا کسی کام سے جا رہے ہیں۔" اور پھر بزرگ وہاں سے چل پڑے۔ صوفی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"واہ...... لگتا ہے کوئی شخصیت ہے۔"

"ایسی ویسی۔ صوفی صاحب کچھ دن یہاں کام کریں اور ان کی کرامات دیکھیں۔" وہ دونوں بزرگ کو جاتے دیکھتے رہے پھر اچانک ہی کافی فاصلے پر نظر آنے والی سڑک پر ایک لینڈ کروزر آ کر رکی اور اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ سڑک سے نیچے اترنے لگی۔ صوفی نے چونک کر لینڈ کروزر کو دیکھا۔ وہ کافی قریب آ گئی اتنی کہ اس کا نمبر وغیرہ دیکھا جا سکتا تھا۔ پھر اس سے ایک آدمی نیچے اترا اور اس نے بڑے احترام سے لینڈ کروزر کا پچھلا دروازہ کھولا اور بابا صاحب اس میں بیٹھ گئے۔ لینڈ کروزر واپس سڑک کی جانب چل پڑی تھی۔

"ایسا بھی ہوتا ہے۔ یہ کون لوگ ہیں جو انہیں لے جاتے ہیں۔"

"ہاں اکثر ہوتا رہتا ہے۔ بابا صاحب کے عقیدت مندوں کی کوئی کمی نہیں۔" شاہی نے عقیدت سے پر لہجے میں کہا۔ اور صوفی حق اللہ۔ حق اللہ کہتے ہوئے واپس پلٹ گیا۔ اس کے بعد دونوں احاطے پر کام کرتے ہو رہے۔ کوئی دو یا ڈھائی بجے کے قریب شاہی نے انگڑائی لے کر کہا۔

"صوفی صاحب میں تو تھک گیا۔ کیا خیال ہے تھوڑی دیر آرام کر لوں۔ ٹھہریں پہلے کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔ صوفی ہاتھ وغیرہ دھو کر بیٹھ گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد شاہی کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے کر باہر آ گیا تو صوفی نے کہا۔

"اس کا بھی انتظام ہے۔ یہاں۔"

"صوفی صاحب! یہاں کیا نہیں ہے۔ بس بزرگوں کی قربت اختیار کر لو۔ جو مانگو گے سو پاؤ گے۔"

"اس میں شک ہے درویشوں کے کرم سے۔" صوفی نے جواب دیا۔ پھر کھانے پینے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد شاہی نے ایک طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"میں ادھر سو جاتا ہوں۔ آپ بھی تھوڑی دیر آرام کر لو۔ کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے۔ لیٹیں گے اس کے بعد پھر تھوڑا سا کام کریں گے۔ یہاں آنے اور جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہم جب چاہیں گے یہاں سے

چلے جائیں گے۔ بابا صفر کے آنے جانے کا کوئی ٹائم مقرر نہیں ہے۔ ہم سوچتے ہی رہیں گے اور بابا صفر اندر سے نمودار ہو جائیں گے۔" صوفی نے گردن ہلا دی۔ تھوڑی دیر تک وہ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ آنکھوں میں نیم غنودگی کی سی کیفیت آ گئی تھی۔ پھر دفعتاً ہی اس کا ذہن جاگا۔ لیکن اس کی دہری کیفیات والا ذہن تھا۔ ایک عقیدت مند کی حیثیت سے وہ بالکل ہی گاؤدی ہو جاتا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہو جاتی تھیں مگر جب اس کے اندر کا وہ متجسس شخص جاگتا تھا تو وہ شخص بڑے بڑے کارنامے سرانجام دے دیتا تھا۔ بالکل نادانستگی میں جیسے وہ کسی کے زیر اثر ہو۔ یہ بھی ایک دلچسپ ہی بات تھی۔ ایک مرتبہ کسی نے صوفی سے یہ سوال کیا تھا۔ "صوفی صاحب آپ یہ بتایئے ویسے تو آپ بڑے پیر پرست ہیں۔ یہ پیری مریدی کے چکر میں رہتے ہیں لیکن جب آپ کارکردگی دکھانا چاہتے ہیں تو نہ جانے کسی کی روح حلول کر جاتی ہے کہ آپ آتش بن جاتے ہیں۔ یہ قصہ کیا ہے؟"

"درویشوں کا کرم ہے یہ بھی میرا خیال ہے ایسے لمحات میں کسی جاسوس بزرگ کی روح میرے اندر سرائیت کر جاتی ہے۔"

"جاسوس بزرگ۔"

"تو اور کیا یہ جاسوسی واسوسی کا سلسلہ تم لوگ کیا سمجھتے ہو۔ کیا یہ تازہ ترین چیز ہے۔ زمانہ قدیم میں نہ جانے کتنے کتنے بڑے اسلامی جاسوس ہوا کرتے تھے۔"

"اسلامی جاسوس۔" سوال کرنے والا ہنس پڑا۔

"ہنس رہے ہو بےوقوفو! یہ شعبہ بالکل الگ ہے معلومات حاصل کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا جاتا تھا۔ درویشوں کی دعاؤں سے بس یوں سمجھ لو کہ ہمارے اندر ایسی ہی کوئی روح حلول کر جاتی ہے۔ لیکن ابھی تک اس نے ہم سے اپنا تعارف نہیں کرایا درویشوں کی دعاؤں سے۔" اس وقت بھی صوفی کا ذہن اسی انداز میں جاگا تھا۔ اس نے سوچا کہ پہلی بات تو یہ کہ یہ بابا صفر یہاں جو مزار تعمیر کر رہے ہیں اس کا مقصد کیا ہے۔ کس طرح کے لوگوں کو یہ یہاں بلانا چاہتے ہیں۔ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے۔ ذرا غور تو کیا جائے۔ اول تو دو باتیں ہوتی ہیں ڈھونگی بھی کمائی کے لیے اس طرح کے ذرائع استعمال کرتے ہیں۔ بے شمار اس قسم کے لوگ ہیں جن کے بارے میں اخبارات ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر آتا رہتا ہے۔ جو اس انداز میں کمائی کرتے ہیں۔ یہ ذرا سوچنے والی بات تھی وہ لینڈ کروزر کس طرف سے آئی اور کہاں چلی گئی۔ ایک تارک الدنیا بابا صاحب کا بھلا باہر کی دنیا سے کیا تعلق ہے۔ یہ ساری باتیں تو سوچنے کے قابل تھیں۔ بہر حال صوفی سوچتا رہا اور پھر اس کے دل میں تجسس شدت اختیار کر گیا۔ ذرا سا معلوم تو کرنا چاہئے۔ اور اس کے لیے اس نے اندر کی کھوج کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ شاہی مزے کی نیند سو رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے اس کی نیند کو گہرا کر دیا تھا۔ صوفی اندر داخل ہو گیا بڑی اجاڑ سی عمارت تھی نہ جانے کس زمانے کی تعمیر کی ہوئی۔ قدیم دیواریں اور اس طرح کی دوسری چیزیں سونے کے لیے کمرا جہاں معمولی بستر بچھا ہوا تھا۔ پتھر کی ایک الماری جس پر کپڑے کا پردہ ڈال دیا گیا تھا الماری میں معمولی قسم کے برتن وغیرہ کھانے پینے کی کافی اشیاء وہاں موجود تھیں۔ یہ تمام چیزیں قابل توجہ تھیں۔ صوفی عمارت کا جائزہ لیتا رہا۔ نہ جانے کس خیال کے تحت اس نے خود ہی زمین پر بچھا

ہوا بستر تھوڑا سا اٹھایا تو اسے ایک ایسی جگہ نظر آئی۔ جہاں ایک چوکور سا خانہ بنا ہوا تھا۔ صوفی کو یہ جگہ بڑ
عجیب محسوس ہوئی اس نے خانے میں ہاتھ ڈال کر اسے ٹٹولا۔ تو اسے لوہے کا ایک کڑا نظر آیا۔ اس نے ا
کڑے کو اٹھا کر دیکھنا چاہا۔ لیکن جیسے ہی اس نے کڑا کھینچا۔ بائیں سمت دیوار میں کچھ سرسراہٹ سنائی دی
اس کے بعد ایک دروازہ سا کھل گیا۔ صوفی اچھل پڑا۔ یہ دروازہ بہت عجیب تھا۔ سامنے کے حصے پر ٹوٹی پھ
اینٹوں کا ڈیزائن پینٹ کیا گیا تھا اور کچھ اس طرح وہ دوسری دیوار سے ہم آہنگ تھا کہ دیکھنے والے کو ذرا ا
اندازہ نہ ہو سکے کہ وہ اصل اینٹیں نہیں ہیں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک فینسی دروازہ تھا۔ صوفی اش اش
نے لگا کس خوب صورتی سے ٹوٹی اینٹیں پینٹ کی گئی تھیں کہ ذرہ برابر بھی شبہ نہ ہو سکے۔ لیکن ان کے پیچھے ن
آنے والا دروازہ صوفی کی حسیں تیز ہو گئیں اور اس کے بعد وہ دعائیں پڑھتا ہوا اس دروازے سے اندر دا
ہو گیا۔ یہ انتہائی حیرت ناک جگہ تھی۔ دروازے کے دوسری جانب چھ سیڑھیاں نیچے تک گئی تھیں اور اس
بعد ایک قدیم سرنگ نظر آ رہی تھی جو بالکل صاف و شفاف تھی اور نہ جانے کہاں تک چلی گئی تھی۔ ابتدائی ح
میں ایک کمرے جیسی جگہ بنی ہوئی تھی۔ جہاں کچھ الماریاں نظر آ رہی تھیں۔ یہاں مکمل اندھیرا تھا۔ بس تار
سے عادی ہو جانے والی آنکھیں ہلکے ہلکے ہیولے دیکھ سکتی تھیں۔ صوفی الماری کے قریب پہنچ گیا اور پھر ا
نے الماری کھولنے کی کوشش کی۔ خوش قسمتی سے الماری لاک نہیں تھی۔ الماری کے اندر چھوٹے چھوٹے پیک
چنے ہوئے تھے۔ صوفی نے ان میں سے ایک پیکٹ نکالا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس نیم تاریک ماحول میں
صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو سکتا تھا لیکن پیکٹوں کی تعداد اتنی تھی اور کچھ اس طرح بے ترتیب تھی کہ اگر ایک آد
پیکٹ غائب کر لیا جاتا تو کوئی حرج نہیں تھا۔ صوفی کچھ لمحے سوچتا رہا اور پھر اس نے گردن ہلا دی۔ پھر وہ وہا
سے نکل آیا۔ گویا اس وقت جو حس جاگی تھی اس نے واقعی کام کر دکھایا تھا۔ باہر نکلنے کے بعد پھرتی سے وہ ا
جگہ سے باہر نکل آیا۔ قرب و جوار کا جائزہ لیا۔ ابھی وہاں کسی کا وجود نہیں تھا۔ اس نے ایک جگہ بیٹھ
پیکٹ کھول کر دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پیکٹ میں انجکشنوں کے وائیل بڑی ترتیب
سے چنے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیسے انجکشن ہیں۔ ویسے سب کی نوعیت ایک ہی جیسی معلوم ہو رہی تھی۔ صو
کچھ لمحے سوچتا رہا۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ ان میں سے ایک دو وائیل نکال لے اور اپنے لباس میں چھپا۔
لیکن اگر پیکٹ میں سے کچھ وائیل کم دیکھے گئے تو ہو سکتا ہے صفر بابا کو شبہ ہو جائے۔ چنانچہ اس نے پیکٹ
سنبھال کر اپنے لباس میں چھپا لیا۔ لیکن اب صورت حال بالکل تبدیل ہو گئی تھی۔ نظریہ ہی بدل گیا تھا۔ شا
نے جس طرح عقیدت سے ان کی کرامات کا تذکرہ کیا تھا۔ صوفی جیسا پیر پرست یہ سوچ کر پوری عقیدت
کے ساتھ ادھر آ گیا تھا کہ یقیناً کوئی پہنچے ہوئے بزرگ ہوں گے۔ لیکن یہ بزرگ تو کچھ زیادہ ہی آگے پہنچ
ہوئے تھے۔ انجکشنوں کی موجودگی بڑی تعجب خیز تھی یہاں ان بزرگی کے کاموں میں انجکشنوں کا کیا دخل او
اب اس دخل کے بارے میں معلومات حاصل کرنا بہت ضروری تھا۔ وہ باہر آ گیا۔ ایک بار پھر چاروں طرف
جائزہ لیا۔ دور دور تک کوئی موجود نہیں تھا۔ چنانچہ شاہی پر ایک نگاہ ڈال کر کہ وہ سو رہا ہے۔ واپس اندر چلا گیا
یہ سرنگ اس کے لیے ناقابل یقین تھی۔ اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ یہ خاصی طویل ہے۔ کہاں تک گئی ہے اس
بارے میں کوئی آخری بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ بہر طور وہ اوپر اوپر سے جائزہ لیتا رہا اور پھر باہر نکل آیا اور کا

میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد شاہی جاگ گیا تھا اس نے کہا۔

"کہیے صوفی صاحب! سوئے تھوڑی بہت دیر۔"

"نہیں عزیزم! نیند کہاں آتی ہے درویشوں کے کرم سے بس ایسے ہی لیٹے رہے۔"

"یہاں کچھ روحانی سکون ملتا ہے۔"

"درویش رحم کریں روحانی اور جسمانی دونوں سکون یہاں موجود ہیں۔"

"میں نے کہا تھا نا مرشد کی کیا بات ہے۔" شاہی نے عقیدت سے کہا۔ پھر شام جھکنے لگی تو شاہی بولا۔

"آیئے صوفی صاحب چلتے ہیں۔ آج کا دن یادگار دن ہے۔ آپ نے بھی بابا صفر کی زیارت کر لی۔ آتے جاتے رہیں۔"

"ہاں۔ حاضری دیا کروں گا۔" صوفی نے جواب دیا۔

♥......♥......♥

اعلا پیانے پر تحقیقات ہو رہی تھیں۔ وہ تمام بڑے بڑے لوگ خود اپنی کیفیت پر حیران تھے اور انٹیلی جنس کے خصوصی اہلکاران سے مسلسل معلومات حاصل کر رہے تھے۔ بہت دور دور تک چھان بین ہو رہی تھی۔ لیکن ایک بات مشترک تھی یہ پانچوں افراد جن کے ذریعے ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا تھا۔ ماضی کے بہترین لوگوں میں سے تھے اور ان کی ذات پر ایک بھی دھبا موجود نہیں تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی ملک کے خلاف کبھی کوئی ایسا عمل نہیں کیا تھا۔ ان میں سے چند ایک کے بزرگ بھی دو پشتوں سے ملک کے لیے سر دھڑ کی بازی لگاتے آئے تھے اور ان میں کچھ شہدا بھی تھے۔ گویا ان کی ذات پر تو ذرہ برابر شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ سب انتہائی حد تک قابل اعتماد لوگ تھے۔ چنانچہ کچھ وقت کی تحقیق کے بعد ان سب کو ان سے سرزد ہونے والی غلطی سے بری الذمہ قرار دیا گیا اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ انجکشنوں کے وہ نشان جو ان کے جسموں پر پائے گئے تھے۔ یقیناً بہت ہی سنگین خطرات کی نشان دہی کر رہے تھے۔ خون کی رپورٹ بھی معتدل تھی گویا جو عمل ان پر ہوتا تھا اس کے بعد وہ نارمل بھی ہو جاتے تھے۔ جس وقت انہیں انجکشن لگنے کا احساس ہوا تھا۔ اس پر بھی غور کر کے چند افراد کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ لیکن وہ صحیح لوگ نہیں تھے اور بعد میں یہ ثابت ہو گیا تھا کہ انجکشن لگانے میں ان کا ہاتھ نہیں ہے۔ صوفی بہر طور اپنے طور پر بہت سی معلومات حاصل کر چکا تھا اور اس کے ذہن میں وہ خفیہ سرنگ بری طرح کھٹک رہی تھی۔ اس نے اپنے طور پر کام شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اس علاقے کی جغرافیائی حیثیت کو سامنے رکھ کر وہ نقشہ نویسی کرنے لگا اور یہ اندازہ لگانے لگا کہ اگر یہ سرنگ کہیں دور تک بنائی گئی ہے تو کہاں تک جا سکتی ہے۔ یہ معلومات اس کے لیے انتہائی ضروری تھیں اور وہ اس کی مکمل تحقیقات میں مصروف تھا۔ کرنل رحیم شاہ نے اپنے طور پر ابھی تک جو کچھ کیا تھا۔ وہ تو محض ابتداء تھی۔ اپنی منصوبہ بندی کا آغاز اس نے ابھی نہیں کیا تھا۔ بلکہ آہستہ آہستہ ہی اپنے آپ کو مستحکم کر کے کام کرنا چاہتا تھا۔ ادھر شاہ میر خان نے بے شک کرنل رحیم شاہ کو اس بارے میں کچھ تفصیلات بتا دی تھیں۔ لیکن ظاہر ہے ایک ایسے شخص کو جو اپنے عہدے سے ریٹائر ہو چکا تھا۔ تھوڑی سی معذوری کی شکل میں تھا۔ بہت زیادہ فعال نہیں کہا جا سکتا تھا۔ چنانچہ دوبارہ اس سلسلے میں کوئی خاص رابطہ قائم نہیں ہو سکا لیکن نہ جانے کیوں کرنل

رحیم شاہ کے دل کو ایک آس سی لگی ہوئی تھی کہ شاید اس بارے میں کوئی پیش قدمی ہو سکے۔صوفی سے ا
رابطہ مسلسل رہا تھا ابھی تک وہ دارالحکومت میں ہی تھے۔کرنل رحیم شاہ صرف دو دن کے لیے اپنے گھر گیا
اور پھر واپس دارالحکومت آ گیا تھا۔پھر اس نے صوفی کو طلب کر لیا۔

''صوفی صاحب! فی الحال ہماری ٹیم یعنی گرین فورس ان ہی پانچ افراد پر مشتمل ہے۔ایسا کر
ہیں کچھ دن کے لیے گرین فورس میں باقی ممبروں کو بھرتی کرنے کا سلسلہ ترک کر دیتے ہیں اور اس سلسلے
کام کا آغاز کرتے ہیں۔''

''کس سلسلے میں۔''

''میں نے آپ کو بتایا تھا نا۔ملک کے پانچ اہم ترین افراد جن کا ماضی بے داغ ہے اور جو ملک
کے اہم ترین ستونوں میں تصور کیے جاتے ہیں۔نادانستہ طور پر ایسے انکشافات کا باعث بنے ہیں۔جو انھیں
موت کی قیمت پر بھی نہیں کرنا چاہئے تھا اور اعلاترین حکام اس بات پر مکمل طور پر اتفاق کر چکے ہیں کہ یہ
انوکھے طریقہ کار کے پیش نگاہ ہوا ہے۔ان کے جسموں پر انجکشنوں کے نشانات پائے گئے ہیں جن ک
بارے میں وہ نہیں بتا سکتے کہ کب اور کس طرح ان کے لگائے گئے تھے۔سب کا یہی بیان ہے کہ اچانک
انھیں اپنے جسم کے مختلف حصوں پر چبھن کا احساس ہوا تھا اور اس کے بعد وہ اس احساس کو بھول گئے تھے۔گ
یہ انجکشن اس طرح ان کے جسموں کو لگائے گئے تھے کہ انھیں انجکشن لگانے والے کا پتہ نہ چلے اور ان کا کام
جائے۔صوفی کے ذہن میں پھر ایک جھماکا ہوا انجکشنوں کا وہ پیکٹ ابھی تک اس کے پاس تھا اور اس وقت
کرنل رحیم شاہ کے اس انکشاف پر صوفی کے ذہن کے بہت سے دریچے کھل گئے تھے۔جب وہ بے اختیار
جاتا۔تو سامنے والے ماحول کو بھول جاتا تھا۔حالانکہ وہ کرنل رحیم شاہ کا بے حد احترام کرتا تھا۔لیکن پس ا
کی اپنی فطرت تھی۔وہ آنکھیں بند کر کے گھومنے لگا اور اس کے منہ سے ہلکی ہلکی آوازیں نکلنے لگیں۔حق اللہ......
حق اللہ...... حق اللہ۔کرنل رحیم شاہ سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگا۔صوفی کی اصل شخصیت سے اسے اچھی طرح
واقفیت تھی اور پھر خود بھی ذرا پیر پرست قسم کا آدمی تھا۔چنانچہ خود بھی خاموشی سے صوفی کے سامنے بیٹھ گیا
صوفی دیر تک وجد کی سی کیفیت میں رہا اور کرنل رحیم شاہ عقیدت مندانہ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔پھر صوفی
نے آنکھیں کھولیں۔تو وہ انگارہ ہو رہی تھیں اور ان میں عجیب سی کیفیت تیر رہی تھی۔کرنل رحیم شاہ خاموش
نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

''صوفی صاحب خیریت۔اچانک ہی آپ پر کیفیت طاری ہو گئی۔''

''دو...... درویش رحم کریں ہم سے کوئی گستاخی تو نہیں ہوئی صاحب۔''صوفی نے کہا۔

''صوفی صاحب! میں بے شک ایک فوجی آدمی ہوں اور جب انسان کا مزاج فوجی بن جاتا ہے
وہ کوئی بھی ایسی چیز برداشت نہیں کر سکتا جو ڈسپلن کے خلاف ہو۔لیکن مجھے یہ احساس ہے کہ میں ریٹائر ہو چکا
ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی احساس ہے کہ آپ ذرا مختلف قسم کے انسان ہیں۔ویسے میں جو انکشافات
آپ پر کر رہا تھا اس کے بعد وجد کی اس کیفیت کا سبب جاننا چاہتا ہوں۔''صوفی نے اپنے لباس میں ہاتھ
ڈال کر انجکشنوں کا وہ پیکٹ نکال لیا۔کرنل رحیم شاہ اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔صوفی نے پیکٹ کھولا اور پیکٹ

میں رکھے ہوئے انجکشن وائل رحیم شاہ کے سامنے کر دیے۔

''یہ...... یہ تو انجکشن ہیں۔''

''جی...... درویشوں کی دعاؤں سے آپ سے ایک درخواست ہے اصل میں ابھی میرے وسائل تو
اتنے نہیں ہیں کہ بہت سے امور میں تنہا سرانجام دے سکوں۔محکمہ سراغ رسانی کے کچھ اعلا افسران مسلسل میری
ناک میں رہتے ہیں۔میں انہیں برداشت نہیں ہوتا۔بہر حال میں چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ان انجکشنوں میں
موجود دوا کی رپورٹ چاہتا ہوں یہ کیا ہے اور اس سے کیا کیا نقصانات پہنچ سکتے ہیں۔''

''مگر صوفی صاحب۔''

''حق اللہ۔''صوفی کی آواز ابھری۔

''نہیں میرا مطلب ہے کہ یہ۔''

''درویش رحم کریں۔حق اللہ حق اللہ۔''صوفی نے زور زور سے ضربیں لگانے لگا۔کرنل رحیم شاہ
گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا تھا اور اس کے بعد بولا۔

''ٹھیک ہے اس کی لیبارٹری رپورٹ آپ کو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مل جائے گی یا اس سے بھی
کچھ پہلے۔''

''اجازت عطا فرمائیے۔بس کچھ ایسی ہی کیفیت ہو گئی ہے۔''صوفی نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ
گیا۔کرنل رحیم شاہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اسے دیکھنے لگا تھا۔پھر اس نے انجکشنوں کا پیکٹ اٹھا لیا۔
سادہ ڈبا تھا اور اس کے اندر باقاعدہ انجکشنوں کے رکھنے کی جگہیں بنی ہوئی تھیں کرنل رحیم شاہ تھوڑی دیر تک
انہیں دیکھتا رہا اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ابھی باقاعدہ شاہ میر خان
کے حوالے سے کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔اگر تقدیر یاوری کر جائے اور کوئی ایسا کارنامہ سرانجام ہو جائے۔جس
سے شاہ میر خان کو اپنی طرف متوجہ کیا جائے تو آگے کے کام آسان ہو جائیں گے۔بہر حال اس کے لیے اس
کو کافی تگ و دو کرنا تھی ادھر صوفی اب ذرا مختلف انداز میں سوچ رہا تھا۔وہ لینڈ کروزر اس کو یاد تھی جو بابا صفر کو
وہاں سے لے کر گئی تھی۔چنانچہ اس نے اپنے طور پر کام شروع کر دیا اور آخر کار اسے یہ پتا چلانے میں کوئی
وقت نہیں ہوئی کہ لینڈ کروزر شہر کے ایک متمول شخص احسان غزنوی کی ہے۔احسان غزنوی کی نگرانی کرنا صوفی
کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔لینڈ کروزر میں اسے وہ نوجوان بھی نظر آ گیا۔جسے اس نے بے شک دور سے
دیکھا تھا۔لیکن اس کی گہری نگاہوں نے اسے ایک لمحے کے اندر پہچان لیا اور بس صوفی کی کھٹارا موٹر سائیکل
اس لینڈ کروزر کا تعاقب کرنے لگی۔پھر لینڈ کروزر کو اس نے ایک ایسی جگہ روکا۔جہاں سنسان جگہ تھی۔لینڈ
کروزر ڈرائیو کرنے والا حیرت سے صوفی کی موٹر سائیکل کو دیکھنے لگا۔ایسی کھٹارا موٹر سائیکلیں بھی چلتی ہیں
اس نے دل میں سوچا مگر یہ اونٹ کی نسل کا فرد چاہتا کیا ہے۔

''سلام عرض کرتا ہوں درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''اب سلام بھی درویشوں کی دعاؤں سے عرض کیے جانے لگے۔''نوجوان نے کہا۔

''درویش رحم کریں مجھ پر بھی اور آپ پر بھی۔''

'' آمین ثم آمین۔ آپ پر زیادہ رحم کریں چونکہ جس طرح آپ نے اپنی ڈیکوٹا اس لینڈ کروز
کے سامنے روکی ہے اگر میں فل بریک نہ لگاتا تو اس کے ساتھ آپ کا جو حشر ہوتا وہ آپ کے علم میں ہے۔''
'' اسم شریف پوچھ سکتا ہوں۔''
'' شاہد۔'' نوجوان نے جواب دیا۔
'' شاہد صاحب یہ موٹر سائیکل آپ کو ناپسند ہے نا، میں اسے اس جگہ کھڑی کیے دیتا ہوں۔ آپ کو
لینڈ کروزر میں مجھے تھوڑا سا سفر کرنا پڑے گا۔''
'' کیا مطلب؟''
'' دیکھیے ایک مسئلہ ہے۔'' صوفی نے رازدارانہ انداز میں شاہد سے کہا۔ شاہد اسے حیرت سے دیکھ
رہا تھا لیکن اس کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ کوئی ایسا عمل ہو جائے گا۔ اچانک ہی صوفی کے دونوں ہاتھ پھیلے
اور پھر خاصی قوت سے شاہد کے چہرے پر پڑے ہتھیلیاں کنپٹیوں پر پڑیں اور شاہد کے دماغ میں بجلی سی
کوند گئی۔ خود جوان اور تندرست آدمی تھا ایک لمحے کے اندر سمجھنے کی کوشش کی لیکن دونوں طرف سے ہتھیلیوں کا
کنپٹیوں پر دباؤ کچھ ایسا عجیب تھا کہ دوسرے ہی لمحے اس کے حواس کی لہر اس کا ساتھ چھوڑنے لگی صوفی نے
اسے بازو میں سنبھال لیا تھا اور اس کے بعد اس نے اس کی لینڈ کروزر میں اس لٹا دیا اور خود موٹر سائیکل کی
جانب بڑھ گیا۔
'' عزیزہ! ویسے تو تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اصل میں بدصورت بیویوں اور کھٹارا موٹر سائیکلوں کا
یہی فائدہ ہے کہ ان کے گم ہونے کا خطرہ نہیں ہوتا۔ تم کچھ وقت یہاں قیام کرو۔ ہم بہت جلد تمہارا وصال
حاصل کرلیں گے درویشوں کی دعاؤں سے۔'' یہ کہہ کر صوفی لینڈ کروزر میں بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کرکے چل
پڑا۔ لینڈ کروزر کا رخ گرین ہاؤس کی طرف ہی تھا۔ گرین ہاؤس میں آنے والا یہ پہلا شکار تھا۔ گرین ہاؤس
کے ممبروں نے اس کا استقبال کیا۔ شازیہ اس وقت موجود نہیں تھی۔ دلاور وغیرہ یہاں موجود تھے۔ شاہد کو ایک
کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ صوفی نے دلاور سے کہا۔
'' دلاور! یہ لینڈ کروزر لے جاؤ۔ اور اسے یہاں سے کافی فاصلے پر کسی ایسی جگہ کھڑی کرآؤ جہاں
سے اس بات کا شبہ نہ ہو سکے کہ اس کا تعلق کسی طرح یہاں سے رہا ہے۔ اسٹیئرنگ پر سے ہاتھوں کے نشانات
صاف کردینا۔''
'' جی صوفی صاحب۔'' دلاور نے صوفی سے لینڈ کروزر کی چابی لیتے ہوئے کہا۔ صوفی اسے یہ
ہدایات دے کر کمرے میں آگیا جہاں شاہد حیران و پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ اس حسین عمارت اور خاص طور سے
اس عظیم و شان کمرے کو دیکھ کر وہ شدید حیران تھا۔ پھر اس نے کہا۔
'' آپ نے مجھے بے ہوش کردیا تھا۔ اگر آپ مجھے لوٹنا چاہتے تھے تو وہیں سے میرے پاس جو کچھ
تھا لے لیتے۔ آپ کی شخصیت مجھے بڑی عجیب سی لگ رہی ہے۔''
'' عزیزی نجیب الطرفین ہیں۔ کبھی کسی کا دس روپے کا نوٹ نہیں مارا درویشوں کی دعا سے آپ
ہم پر لوٹ مار کا شبہ نہ کیجیے گا۔ ہمیں آپ سے کچھ ضروری معلومات حاصل کرنی ہیں۔''

'' اور اس کے لیے آپ نے یہ طریقہ کار اختیار کیا ہے۔ جب کہ آپ کا تعلق محکمہ پولیس سے بھی نہیں
معلوم ہوتا۔ سب سے پہلے آپ اپنا تعارف کرائیے ہم سے، آپ کون ہیں؟''
'' خادم کو صوفی کہتے ہیں۔ درویشوں کی دعا سے۔ آپ کے قدموں کی خاک ہوں۔ بس ایک ذرا
سی معلومات فراہم فرما دیجیے گا۔ بڑی عنایت ہوگی۔''
'' سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آپ جس انداز میں مجھے جہاں سے لائے ہیں اس کے بعد میں آپ
سے کوئی تعاون نہیں کروں گا۔''
'' ہم بذات خود تشدد نہیں کرتے کسی پر لیکن وہ جو شخص ہے جسے آپ نے باہر دیکھا ہے۔ بڑا درندہ
صفت ہے اور انسان کو ایذہ پہنچانے کا ماہر درویشوں کی دعاؤں سے آپ کی اتنی مرمت کرے گا وہ کہ پھر آپ
طویل عرصے تک یہاں سے جانا پسند نہ کریں گے۔ چونکہ آپ کی ڈیزائن میں کافی تبدیلی پیدا ہو چکی ہوگی۔''
'' عجیب آدمی ہیں آپ۔ میں کہتا ہوں آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔''
'' میں نے پہلے بھی آپ سے عرض کیا تھا کہ کچھ تھوڑی سی معلومات درکار ہیں بس وہ ہمیں فراہم
کردیجیے۔ یوں سمجھ لیں کہ سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ شاہد سوچتا رہا۔ اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ یہ شخص جو
سامنے موجود ہے۔ بہ ظاہر تو ایک مریل سانپ نظر آرہا ہے جو کینچلی میں لپٹا ہوا ہو۔ لیکن اس کی آواز خاصی
خوفناک ہے۔ کیا معلوم کرنا چاہتا ہے پتہ تو چلے۔ چنانچہ اس نے کہا۔
'' ٹھیک ہے۔ کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ مجھ سے اور کیا اس کے بعد مجھے آپ کے چنگل سے
رہائی حاصل ہو جائے گی۔''
'' ایک ایک کر کے سوال کیجیے۔ آپ نے پہلا سوال یہ کیا ہے درویشوں کے کرم سے کہ ہم کیا
پوچھنا چاہتے ہیں آپ سے۔''
'' یہ درویشوں کو آپ درمیان میں کیوں لے آتے ہیں۔''
'' درویش اول، درمیان اور آخر اور ہر جگہ موجود ہے۔ انہی کے روحانی فیض سے اس کائنات کا بھرم
قائم ہے۔ چنانچہ آپ ان پر کوئی اعتراض نہ فرمائیے گا۔ ہم آپ سے کالی کھتی کے بارے پوچھنا چاہتے ہیں۔''
'' کیا؟''
'' جی ہاں۔'' کالی کھتی کا وہ علاقہ جہاں آپ بابا صفر سے ملاقات کیا کرتے ہیں۔'' صوفی نے کہا
اور شاہد عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔
'' بابا صفر یعنی انکل زیرو۔''
'' اچھا......آپ انہیں انگریزی میں جانتے ہیں چلیے یوں ہی سہی۔ تو میں آپ سے یہ معلوم کررہا
تھا کہ ان سے آپ کا کیا تعلق ہے۔''
'' جانتے ہیں آپ انہیں۔ ایک عظیم انسان ہیں وہ۔ اتنے عظیم کہ آپ تصور بھی نہیں کرسکتے۔''
'' انہی کی عظمت نے ہمیں آپ کی طرف متوجہ کیا ہے۔ آپ کا ان سے کیا رابطہ ہیں اور کس طرح
سے ہے۔''

''میں بھی ان کے عقیدت مندوں میں سے ہوں۔ آپ نے دیکھا نہیں وہاں مزار شریف تعمیر رہا ہے اور اس کی تعمیر میں اب میں نمایاں طریقے سے حصہ لینا چاہتا ہوں۔ آپ براہ کرم مجھے ان کے بار میں تفصیل بتایئے۔''

''عجیب احمق آدمی ہو۔ اس کے لیے یہ سنسنی خیز طریقہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی مجھے وہ بتا دیتے تو میں سارا مسئلہ اسی جگہ حل کر دیتا اور اپنے گھر روانہ ہو جاتا یہ بتاؤ۔ یہاں آئے ہوئے مجھے کتنی د گزری ہے۔''

''حضور! آپ کچھ بے تکلفی فرما رہے ہیں درویشوں کے کرم سے ایسے نہ کیجئے گا۔ ہم ہمارے ہی بارے میں پوچھنے بیٹھ گئے۔ اگر مفاہمت ہوئی تو یہ بھی بتا دیں گے آپ کو لیکن فی الحال آپ ہمار رہنمائی فرمایئے۔''

''تم جس طرح مجھے یہاں لائے ہو میں تم سے تعاون نہیں کروں گا۔ یہاں سے مجھے باعزت طریقے سے باہر لے چلو۔ میری لینڈ کروزر میرے حوالے کرو اس کے بعد میں تمہیں انکل زیرو کے بار میں بتاؤں گا۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا جناب درویشوں کی دعا سے ہم بحالت مجبوری آپ سے دوسرا انداز اختیار کر رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر صوفی نے بیل دبائی جس سے باہر اطلاع ہو جاتی تھی۔ دلاور اپنا کام کر کے واپس آچکا تھا۔ کمرے میں داخل ہو گیا۔ صوفی نے اس سے کہا۔

''یہ ہمارے معزز مہمان ہیں۔ ہم ان سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں لیکن یہ جارحیت پر آمادہ ہیں درویشوں کے کرم سے آپ ذرا ان سے مفاہمت کرانے کی کوشش کریں۔ دلاور نے بات کو سمجھنے کے بعد شاہد کی طرف دیکھا اور بولا۔

''نام کیا ہے بچے تیرا۔''

''تم لوگ شاید ایسے نہیں مانو گے کیا سمجھا ہے یہ تم نے مجھے۔'' شاہد نے اتنا ہی کہا تھا کہ دلاور کا زوردار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا اور شاہد اپنی جگہ سے تین فٹ دور جا گرا۔ دلاور نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ کر اسے اٹھایا۔ اور بولا

''یہ پہلا تھپڑ ہے اس کے بعد تمہارے جبڑے پر گھونسا پڑے گا۔ پھر میں تمہیں تمہارے بال پکڑ کر اٹھاؤں گا اور زمین پر دے ماروں گا۔ اس کے بعد دو تین ٹھوکریں یہ پہلا مرحلہ ہے۔ دوسرے مرحلے میں ہم تمہارا سر گنجا کر دیں گے۔ تیسرے مرحلے میں تمہیں سگریٹوں سے داغا جائے گا۔ اب بتاؤ کیا تمہیں پہلے مرحلے میں داخل کر دیا جائے۔''

''تم.... تم.... تم.... سوچ لو میں بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔'' شاہد نے کہا اور دلاور کا دوسرا تھپڑ اس کے منہ پر پڑا اس کا ہونٹ کٹ گیا تھا۔ اس کے منہ سے خون بہنے لگا تھا۔ دلاور نے اس کا گریبان پکڑا اور بولا۔

''یہ اضافی تھپڑ ہے۔ اس کے بعد......''

''ٹھہرو...... ٹھہرو رک جاؤ۔ میں جانتا ہوں تم جرائم پیشہ لوگ ہو اس لیے تم اس طرح کی حرکتیں کر رہے ہو اور یہ شخص جھوٹ بولتا ہے یہ انکل زیرو کا معتقد نہیں ہے بلکہ کوئی اور ہی چکر چلانا چاہتا ہے وہاں۔ کیا معلوم کرنا چاہتے ہو تم انکل زیرو کے بارے میں۔''

''یہی...... جناب من کہ آپ کی ان سے پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی درویشوں کی دعاؤں سے۔''
صوفی نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا اور شاہد ہونٹوں سے ٹپکنے والا خون صاف کرنے لگا۔ اب اس بات کا تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر اس نے صحیح بات نہ بتائی۔ تو یہ لوگ جو کوئی بھی ہیں۔ اس پر بدترین تشدد کریں گے۔ چنانچہ اس نے شروع سے اب تک کی کہانی سنا دی۔ اس نے کہا۔

''ہمارے ذہنوں پر کچھ اس طرح کا اثر یہ ہوا کہ ہم انکل زیرو کی کوئی بات ٹال نہیں سکے ہم سے ان کا مسلسل رابطہ ہے۔ ہم ان کے بہت سے چھوٹے موٹے کام کیا کرتے ہیں۔ اکثر میں کالی کھتی جاتا ہوں۔ وہ میرے ساتھ شہر آ جاتے ہیں۔ ایک طرح سے وہ ہمارے مرشد کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔''

''تمہارے ساتھ باقی جو لوگ ہیں ان کی تفصیل بتاؤ۔'' صوفی نے سوال کیا اور اس کے بعد وہ سارے نام نوٹ کر لیے گئے، جو شاہد نے بتائے تھے۔ عدنان، فوزی، مینا وغیرہ یہ سب کے سب انکل زیرو کے لیے مصروف عمل تھے۔ اور ان کی ہدایت کے مطابق سارے کام سرانجام دے رہے تھے۔ صوفی نے بڑے احترام سے شاہد کا شکریہ ادا کیا اور بولا۔

''عزیز من کچھ دن ہمارے مہمان رہو۔ بہت جلد ہم تمہیں باعزت طریقے سے یہاں سے روانہ کر دیں گے۔''

''ہم...... مہمان۔''

''ہاں...... مجبوری ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ تمہارا یہاں رہنا بہت ضروری ہے ہم تمہیں آزاد نہیں کر سکتے اور سنو...... یہاں سے نکلنے کی کوشش کر سکتے ہو۔ کچھ جگہ خطرات ہیں جن سے تمہیں آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ باقی اس کے باوجود اگر کوشش کرنا چاہتے ہو۔ تو تمہاری مرضی ویسے تمہارے یہاں آنے کا علم کسی کو نہیں ہے۔ اگر رحلت فرما گئے تو خاموشی سے تدفین کر دیں گے، کسی کو اطلاع بھی نہیں دیں گے۔ خدا حافظ۔'' صوفی نے کہا اور کمرے سے باہر نکل آیا شاہد پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کو دیکھتا رہ گیا تھا۔

♥......♥......♥

صرف عادل اور فیضان نہیں تھے۔ باقی ساری گرین فورس اس وقت گرین ہاؤس کے ڈرائنگ ہال میں جمع تھی۔ غلام قادر ایک طرف سوچ میں ڈوبا ہوا بیٹھا تھا۔ دلاور اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو گود میں لیے آہستہ آہستہ اس کا سر سہلا رہا تھا۔ اور بیٹا اس کے سینے سے لگا سو رہا تھا۔ شازیہ اپنے ناخن نیل کٹر کی ریتی سے گھس رہی تھی۔ صوفی، صوفے پر دونوں پاؤں سمیٹے بیٹھا جگالی کر رہا تھا۔ اچانک ہی شازیہ نے کہا۔

''چھوٹے بابا! آپ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئے۔ دیکھنے میں آپ کوئی فقیر معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کا کردار اس سے بالکل مختلف ہے۔ ویسے چھوٹے بابا ایک بات کہوں آپ سے۔ آپ برا تو نہیں مانیں گے۔'' صوفی کے منہ سے غوں غوں کی آواز نکلی پان کی پیک حلق تک بھری ہوئی تھی۔ ایک ذرا سی غلطی ہو جاتی تو

سینہ گلن رہو جاتا۔ شازیہ نے کہا۔

''اگر آپ فقیروں والا گیٹ اپ کرلیں تو دعوے سے کہتی ہوں کہ کوئی پہنچے ہوئے فقیر لگیں گے گیر واکفنی بغل میں کمنڈل دیکھنے کی چیز لگیں گے آپ۔ اگر کبھی کسی کیس کی تفتیش کے سلسلے میں آپ کو کسی فقیر کا کردار کرنا پڑے تو گیٹ اپ مجھ سے کرایئے گا۔'' غلام قادر منہ پھاڑ کر ہنس پڑا۔ دلاور خاموشی سے ایک ڈیکوریشن پیس کو دیکھتا رہا۔ شازیہ نے کہا۔

''حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ میں ابھی تک بڑی کشمکش کا شکار ہوں اور اس بات پر حیران ہوں کہ بڑے بابا نے آخر ہم سب کو کیوں جمع کرلیا ہے۔ انہیں ہم سے کیا حاصل ہوگا۔ وہ جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بارے میں ابھی تک ہمیں کوئی تفصیل نہیں معلوم ہے۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ جتنی بڑی بڑی تنخواہیں ہم لوگوں کو دی جارہی ہیں اس حساب سے کام تو ہمارا کچھ بھی نہیں ہے۔'' صوفی کو بہ حالت مجبوری اپنے حلق کے سرمائے کو اگال دان میں منتقل کرنا پڑا اور سرخ سیلاب اس کے منہ سے نکل کر اگال دان میں منتقل ہوگیا۔ پھر اس نے اپنے کتھے چونے والے دانت صاف کیے اور آستین سے ہونٹ پونچھتے ہوئے بولا۔

''دیکھو......کوئی بھی بلا وجہ اپنا وقت ضائع نہیں کرتا درویشوں کے کرم سے ہر بات کے پس منظر میں کوئی سبب ہوتا ہے۔ تم لوگوں کو جب متحرک ہونا ہوگا۔ متحرک کردیا جائے گا کام تو تم اپنا کر ہی رہے ہو۔ اب جیسے گرین ہاؤس کا مہمان شاہد ہے جب تک صورت حال ہمارے حق میں بہتر نہیں ہو جاتی تمہیں اس مہمان کی مکمل حفاظت کرنا ہے۔''

''تو آپ بے فکر رہیں چھوٹے بابا! آپ کی خواہش کے مطابق یہ سب کچھ ہوگا۔ کوئی شکایت تو نہیں ہے ہم سے۔''

''درویشوں کی دعائیں ہیں۔'' صوفی نے جواب دیا پھر بولا۔

''ویسے شازیہ! تم لوگ مجھے اپنا موقف بتاؤ۔ زندگی تمہارے نزدیک کیا چیز ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''آپ بھی بتائیں گے چھوٹے بابا۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔''

''تو بس آپ یہ سمجھ لیجیے کہ زندگی ایک سڑک ہے جس پر لاتعداد بھکاری جھولی پھیلائے گردش کر رہے ہیں۔ اپنی اپنی خاموش صدائیں لگاتے ہوئے کسی کو عشق کی بھیک درکار ہے۔ کسی کو حسن کی، کسی کو دولت کی، کسی کو صحت کی۔ سب بھکاری صدائیں لگاتے پھر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ زندگی اور کیا ہے میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ ہم پہلی صدا اس وقت لگاتے ہیں جب اس کائنات میں پہلا سانس لیتے ہیں۔ یا یوں سمجھیے کہ جب اس کائنات میں پہلی نگاہ ڈالتے ہیں۔ اور اس کے بعد صدائیں ہماری زندگی بن جاتی ہیں۔ اپنی ہر ضرورت۔ ماں سے دودھ مانگنے کے لیے روتے ہیں اور اس کے بعد اس سے آگے کے سفر کا آغاز ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے چھوٹے بابا کہ میں نے تعلیم حاصل کی۔ ملازمت کے حصول کے لیے کوششیں کیں۔ مجھے [illegible] زندگی اور [illegible] کی زندگی کے لیے ملازمت چاہیے تھی۔ میں نے صدا لگائی اور اس صدا کے جواب میں

کسی اور کی صدا سنائی دی۔ وہ میرے بدن کی بھیک چاہتا تھا۔ بس چھوٹے بابا زندگی اسی کا نام ہے میں سمجھتی ہوں کہ میں نے جو پیشہ اختیار کیا۔ وہ بالکل ٹھیک تھا اور میرے جیسے بہت سے لوگ اس کائنات کی سڑک پر ضرورت کی بھیک مانگتے پھر رہے ہیں۔''

''آگے بولو۔''

''نہیں بس۔ میں نہیں جانتی کہ آگے مجھے کتنی صدائیں لگانی ہوں گی۔ آپ سے دنیا سے اور اس کے بعد وقت سے ماحول سے۔''

''غلام قادر! تم اس بارے میں کیا کہتے ہو تمہارے خیال میں زندگی کیا چیز ہے۔''

''اڑے ماں قسم! چھوٹے بابا صاحب! میرے کو معلوم ہے زندگی کسی بھی سینما ہال کے باہر لگی ہوئی لائن ہے۔ جس میں ہر شخص ٹکٹ لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ اڑے بابا لین سے تھوڑا ادھر ہوا ہماری لکڑی پڑی اس کی کمر پر اور وہ لین میں آکر سیدھا ہوگیا۔ عام طور سے لوگ لین سے باہر جانے کا کوشش مانگتا ہے۔ مگر غلام قادر کو لین سیدھی کرنے کی تنخواہ ہی ملتی تھی۔ ابھی سب ٹھیک ہے۔''

''تو تمہارا خیال ہے زندگی سینما ہال کے باہر لگی ہوئی ٹکٹ گھر کے سامنے کی لائن ہے۔''

''بالکل فٹ ایسا ہی بات ہے چھوٹے بابا صاحب۔''

''دلاور تم کیا کہتے ہو۔''

''میں نے زندگی کا بہت کم تجزیہ کیا ہے۔ زندگی گھر ہے بچے ہیں وہیں سے آغاز ہوتا ہے اور وہیں پر انجام ہوتا ہے۔''

''بہت اچھے اس کا مطلب ہے کہ گرین فورس کی پوری ٹیم فلاسفروں کی ٹیم ہے۔''

''ام بھی آپ بولا چھوٹے بابا صاحب! کہ آپ بھی ہمارے کو بتائے گا کہ زندگی کیا ہے۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ زندگی درویشوں کی دعا ہے اور بس۔'' صوفی نے کہا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔

شازیہ اپنی جگہ سے اٹھی اور فون کے پاس پہنچ گئی ریسیور اس نے کان سے لگا کر کہا۔

''ہیلو۔''

''رحیم شاہ۔''

''لیس باس۔''

''صوفی صاحب کہاں ہیں۔''

''یہیں ہیں بلاؤں۔''

''ہاں۔'' شازیہ نے صوفی کو اشارہ کیا تو صوفی نے آگے بڑھ کر ریسیور اُٹھالیا اور اس نے کہا۔

''جناب من، حکم عالی۔''

''منہ صاف ہے۔''

''درویشوں کی دعا ہے۔''

''صوفی صاحب! آپ کو ایک پتا بتا رہا ہوں۔ یہاں پہنچ جائیے۔''

''حکم دیجیے۔''

''سابرینہ کمرا نمبر دو سو آٹھ۔''

''وہاں پہنچ کر کیا کروں؟''

''مجھ سے ملاقات اور سینے کار میں آئیے گا۔ موٹر سائیکل پر نہیں۔ آپ کی موٹر سائیکل تو میرا خیال ہے اب پورے شہر میں مشہور ہو چکی ہے۔''

''ناچیز کس قابل ہے۔ بس دعائیں ہیں درویشوں کی۔''

''تشریف لے آیئے۔'' کرنل رحیم شاہ کی آواز سنائی دی۔

''حاضر ہو رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے فون بند ہونے کے بعد صوفی نے ریسیور رکھ دیا اور غلام قادر سے بولا۔

''غلام قادر صاحب! ذرا گاڑی نکال دیجیے میں لباس تبدیل کر لوں۔'' غلام قادر اٹھ کر باہر نکل گیا اور صوفی اپنے کمرے میں آ گیا۔ کرنل رحیم شاہ نے اسے تھوڑے سے آداب سکھا دیے تھے۔ حالانکہ بہت سی باتوں پر اس نے تنقید کی تھی اور کرنل رحیم شاہ پر اعتراض کیا تھا۔ مثلاً لباس کا معاملہ۔

''حضورِ من! شیروانی ہمارا قومی لباس ہے۔ اور یہ ڈھیلے پائنچوں والا پائجامہ بہ خدا زمانہ قدیم میں شرافت کا نشان سمجھا جاتا تھا۔''

''آپ نے خود ہی میری بات کی وضاحت کر دی صوفی صاحب! زمانہ قدیم میں یہ بے شک شرافت کا نشان سمجھا جاتا تھا آج بھی ہم اسے شرافت ہی کا نشان سمجھتے ہیں۔ لیکن شرافت صاحب نے اپنا حلیہ بدل لیا ہے۔ وہ اب چست پتلون اور قمیص میں نظر آتے ہیں۔''

''حضور والا! یہ شرافت صاحب ان کے صاحبزادے ہوتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''دیکھیں صوفی صاحب! وقت خود اپنی ثقافت ہوتا ہے۔ اس دور کے رواج اس کی ثقافت کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ اور پھر ہم لوگ جس شعبے سے منسلک ہیں اس میں ذرا چست و چالاک رہنا پڑتا ہے۔''

''بہ خدا آپ یقین فرمایئے۔ شیروانی اور پائجامے کی افادیت سے آپ انکار نہیں کر سکتے۔ اس کے بہت سے فوائد ہیں۔ زمانہ جدید کے سورما چست پتلونیں اور جیکٹ وغیرہ پہن کر اپنے آپ کو بہت اسمارٹ سمجھتے ہیں۔ اور اگر کوئی ان کی نگاہوں میں شیروانی اور پائجامے والا آ جائے۔ تو وہ یہی سوچیں گے کہ اس بے چارے میں کیا رکھا ہوگا۔ اگر لڑائی بھڑائی کا موقع بھی آ جائے تو وہ یہ سوچ کر اس پر حملہ کریں گے کہ دو ہاتھ مار کر لمبا کر دیں گے اسے درویشوں کی دعاؤں سے۔ لیکن جناب عالی! پھر مشکل میں گرفتار ہو جائیں گے۔ اور جہاں تک چستی اور چالاکی کا مسئلہ ہے تو آپ یقین فرمایئے۔ صرف امتحان کے لیے ہم آپ سے عرض کر رہے ہیں کہ چار چست و چالاک آدمیوں کو آپ ہمارے اوپر چھوڑ دیجیے۔ ہم انہیں شیروانی میں لپیٹ کر پائجامے سے گرہ باندھ دیں گے۔''

''آپ واقعی اس طرح کر سکتے ہیں صوفی صاحب! آپ کی اس بات کو میں چیلنج نہیں کروں گا بہر

حال آپ کی مرضی ہے۔''

''نہیں قبلہ! ہم آپ کے احکامات کی پابندی کریں گے۔ کسی اہم مسئلے میں اگر ضرورت پیش آئی تو آپ کی پسند کا لباس ہی ہمارا لباس ہوگا۔ عام حالات میں اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہمیں ہماری اوقات میں رہنے دیں۔''

''مجھے اعتراض نہیں صوفی صاحب! میرے اور آپ کے درمیان ظاہر ہے۔ کوئی ایسا رابطہ تو نہیں ہے۔ مجھے صرف آپ کا تعاون حاصل ہے۔ اور یہ میرے لیے بہت بڑی بات ہے۔''

''شکر گزار ہیں آپ کے۔'' اور اس کے بعد کرنل رحیم شاہ کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ البتہ موٹر سائیکل وغیرہ کے بارے میں وہ کبھی کبھی صوفی کو ہدایت دے دیا کرتا تھا چنانچہ اس وقت بھی اس نے خاص طور سے کار میں آنے کے لیے کہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد صوفی کی کار اس ہوٹل کی جانب جا رہی تھی جس کا حوالہ کرنل رحیم شاہ نے دیا تھا۔ کرنل رحیم شاہ مطلوبہ کمرے میں اس کا منتظر ملا۔ لیکن کیفیت یہ تھی کہ بری طرح جذباتی ہو رہا تھا۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ صوفی اندر داخل ہوا تو کرنل رحیم شاہ نے مضطربانہ انداز میں آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''خدا کی قسم صوفی صاحب! میری تقدیر بڑی اچھی ہے اور میں تو اسے بزرگوں کا فیض ہی سمجھتا ہوں کہ آپ مجھے اس طرح مل گئے۔''

''ہمیں شرم آ رہی ہے درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''آپ براہ کرام بیٹھ جایئے۔ آپ کی ذہنی وسعتوں کا مجھے پہلے سے ہی اندازہ تھا آپ درحقیقت صوفی صاحب سمندر کی مانند ہیں۔ صوفی صاحب میں کیا کہوں شدت جوش سے دیوانہ ہو رہا ہوں میں۔''

''جناب من! ہم سے کیا قصور ہوا ہے۔ بس یہ فرما دیجیے درویشوں کے کرم سے۔'' جواب میں کرنل رحیم شاہ نے قہقہہ لگایا تھا۔ صوفی پھر بولا۔

''صوفی جی، مم......مم، ہمارا مطلب ہے کہ......''

''صوفی صاحب! آپ کو خدا کا واسطہ کم از کم اتنا تو مجھے بتا دیجیے کہ وہ انجکشن آپ کو کہاں سے دستیاب ہوئے تھے۔''

''آہا......تو کیا انجکشنوں کا کوئی مسئلہ ہے۔''

''جی۔ ان کی لیبارٹری رپورٹ مل گئی ہے اور چونکہ ملٹری کے حوالے سے ان انجکشنوں کے سیال پر تحقیق کی گئی تھی۔ چنانچہ کوئی سقم باقی نہ رہا۔''

''رپورٹ کیا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''یہ انجکشن کچھ ایسی دواؤں کا مجموعہ ہے۔ جو انسان کو ذہنی طور پر ایک عجیب و غریب کیفیت کا شکار کر دیتی ہے۔ اس کے اندر سے سچائیاں ابلتی ہیں۔ وہ دنیا سے بے پناہ مخلص ہو جاتا ہے۔ اور اس کا دل چاہتا ہے کہ ایک لفظ بھی جھوٹ نہ بولے۔ چاہے اس سے نفع ہو یا نقصان۔ یعنی یہ بات ثابت ہو گئی۔ کہ وہ انجکشن جسے بھی لگا دیے جائیں۔ وہ اسی طرح سارے راز اگل دے گا۔ یہ راز اسی طرح منظر عام پر لائے

گئے۔ وہ شاید ان لوگوں کا کوئی ٹیکنیکل منصوبہ تھا۔ لیکن اگر وہ چاہتے تو انفرادی طور پر بھی کسی اہم موضوع ک
بارے میں مطلوبہ افراد سے معلومات حاصل کر سکتے تھے۔ ہم یہ بھی سوچ سکتے ہیں صوفی صاحب! کہ انفراد
طور پر انہوں نے یہ عمل اس لیے نہیں کیا کہ وہ ان بڑے بڑے لوگوں کا پیچ اور قومی پالیسیوں کو ان کے ذر
منظر عام پر لا کر پوری حکومت کو بلیک میل کرنا چاہتے تھے۔ اور اس کے بعد بھی کچھ اور مفادات حاصل کر
چاہتے ہوں گے۔ صوفی صاحب! میں نے شاہ میر خان صاحب کے تعاون سے یہ سب کچھ کیا ہے۔ اور ش
میر خان صاحب اس وقت شدت جوش سے دیوانے ہو رہے ہیں۔ اور مسلسل مجھ سے یہ سوال کیے جار
ہیں کہ یہ انجکشن میں نے کہاں سے حاصل کیے ہیں۔ اب آپ مجھے بتایئے کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا؟"

صوفی کھو گیا تھا۔ اور اس عالم میں ہاتھ سیدھا شیروانی کی جیب میں پہنچتا تھا لیکن اس نے اپ
آپ کو سنبھالا۔ پان کی طلب شدت سے ہو رہی تھی لیکن کرنل رحیم شاہ کا خاص طور سے خیال کرتا تھا۔ چنا
اس نے آنکھیں بھینچ کر گردن جھٹکی اور پھر اس کے منہ سے ایک نعرہ مستانہ نکلا۔

"حق اللہ جناب من! میں نے پیر دمڑی شاہ کے بارے میں عرض کیا تھا۔ جب بھی رہنما
کرتے ہیں اسی طرح سے کرتے ہیں۔"

"آپ کو خدا کا واسطہ صوفی صاحب!" کرنل رحیم شاہ نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور صوفی چونک
کر آنکھیں پھاڑنے لگا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ...... کہ آپ کو یہ سب کہاں سے معلوم ہوا اور یہ انجکشن کہاں
دستیاب ہوئے۔"

"وہی عرض کرنے جا رہے تھے درویشوں کی دعاؤں سے۔ ہمارا کام تقریباً ختم ہے۔ اب آ
کے ذاتی کام کا آغاز ہوتا ہے۔ اور ذاتی کام یہ ہے کہ آپ شاہ میر خان صاحب کو ساتھ لے کر کالی کھٹی
چھاپا ماریں۔"

"کالی کھٹی۔"

"جی ایک مخصوص علاقہ ہے۔"

"ہاں میں جانتا ہوں اس علاقے کے بارے میں مگر وہاں۔"

"وہاں بھی ایک مزار ہے۔ بلکہ یوں سمجھ لیجیے۔ کہ وہ مزار ابھی زیر تعمیر ہے۔ لیکن اصل میں
مزار نہیں ہے۔ وہاں دشمن کے ایجنٹوں نے اپنا مرکز بنایا ہوا ہے۔ آپ کو ہم پوری سچویشن بتا کر نقشہ بنا
دیتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ باقاعدہ آرمی ریڈ کیا جائے۔ اور وہاں سے ان لوگوں کو گرفتار کیا جائے خاص
سے وہاں ایک شخص بابا صفر کے نام سے ہے۔ بابا صفر کو سب سے پہلے قابو میں کیا جائے۔ وہ باقی چیزوں
نشان دہی کر سکے گا۔ پھر صوفی نے ایک کاغذ پر کالی کھٹی کے اس علاقے کا نقشہ بنایا اور نقشہ بنا کر کرنل ر
شاہ کو پیش کر دیا۔ کرنل رحیم شاہ ساری تفصیلات سمجھتا رہا تھا۔ اور اس کے بعد اس نے کہا تھا۔

"کیا آپ اس سلسلے میں۔"

"معذرت چاہتے ہیں اور خواہش مند ہیں کہ آپ اسے صرف گرین فورس کا کارنامہ ہی قرار دیں
کسی بھی چیز کو ہم انفرادی طور پر اپنے آپ سے منسوب نہیں کرنا چاہتے۔"

"اتنے بڑے ہیں آپ صوفی صاحب! کہ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔" کرنل رحیم شاہ سخت
جذباتی ہو رہا تھا۔ بہر حال یہ سارا معاملہ مکمل طور پر سمجھنے کے بعد کرنل رحیم شاہ صوفی کے ساتھ باہر نکل آیا۔
صوفی اپنی کار میں بیٹھ کر گرین ہاؤس چل پڑا۔ اور کرنل رحیم شاہ فوری طور پر شاہ میر خان صاحب سے ملاقات
کے انتظامات کرنے لگا۔

♥......♥......♥

کرنل رحیم شاہ کی اپنی شخصیت بھی معمولی نہیں تھی۔ چنانچہ اس کی سرکردگی میں ایک پورا فوجی
یونٹ کالی کھٹی میں پھیل گیا۔ صوفی نے ایک ایک لائن بنا کر دے دی تھی۔ کرنل رحیم شاہ نے بڑی احتیاط اور
ذہانت کے ساتھ۔ رات کے تقریباً ساڑھے تین بجے کالی کھتی کے اس علاقے پر ریڈ کیا۔ اور سوئے ہوئے بابا
صفر کو گرفتار کر لیا اس کے بعد اس سرنگ کا جائزہ لیا گیا۔ سرنگ بہت طویل تھی۔ اور ان علاقوں سے گزرتی ہوئی
ایک ایسے ویران پہاڑی علاقے میں جا نکلتی تھی۔ جس کے دوسری طرف تھوڑا فاصلہ طے کر کے دشمن ملک کی
سرحد تھی۔ سرنگ بہ ظاہر زیر تعمیر ہی لگتی تھی۔ اور ہو سکتا ہے اسے زیادہ وسعت دے کر برابر کے ملک میں آنے
جانے کا راستہ بنایا جانے والا ہو۔ بہت سی ایسی چیزیں وہاں سے دستیاب ہوئی تھیں۔ جو قابل اعتراض تھیں
بہر حال وہاں پر مکمل طور پر قبضہ کر لیا گیا۔ انجکشن بھی دستیاب ہوئے تھے اس کے علاوہ ایسی ریکارڈنگ مشین
بھی جس کے ذریعے پیغامات مختلف جگہوں پر ارسال کیے جا سکتے تھے سب سے بڑا کام بابا صفر کی گرفتاری کا
تھا۔ اس کا نام ٹھاکر گیا نیشور تھا۔ اور یہ را کا ایجنٹ تھا۔ ایجنٹ کیا بلکہ ایک انتہائی اہم عہدے دار...... اس کے
ذریعے چوبیس اور ایسے ناموں کا انکشاف ہوا۔ جو ملک بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں کچھ تو بڑے بااختیار
لوگ تھے۔ یہ سب بابا صفر کی زیر نگرانی کام کر رہے تھے۔ اور بابا صفر یعنی ٹھاکر گیا نیشور کا کام یہی تھا کہ ابتدا
میں ان انجکشنوں کے ذریعے وہ ایسے لوگوں کو قابو میں کرے جو اہم ترین ملکی راز اسے پہنچاتے رہیں اور اس
سلسلے میں اسے خاصی کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ لیکن ابھی ان کے پاس نسب ترسیل کا ذریعہ نہیں تھا۔ کیونکہ ان
کا رابطہ براہ راست نہیں تھا بلکہ سب مشینی رابطہ تھا۔ سرنگ اگر مکمل ہو جاتی۔ تو کام ہو سکتا تھا اور اس سلسلے میں
کوئی موثر منصوبہ بندی نہیں ہو سکی تھی۔ کیونکہ جہاں سرنگ کا دوسرا سرا تھا۔ وہاں کے بعد سے سخت چٹانی سلسلہ
شروع ہو جاتا تھا۔ اور ان چٹانوں کو بھاری مشینوں کے بغیر کاٹنا ناممکن تھا۔ لیکن پھر بھی جتنی لمبی سرنگ بنالی گئی
تھی وہی ایک حیرت ناک عمل تھا یہ تمام انکشافات اخبارات تک نہیں پہنچنے دیے گئے تھے۔ خفیہ طور پر ان تمام
لوگوں کی گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔

کرنل رحیم شاہ اور صوفی اپنی ذمے داریاں پوری کر کے ایک طرف ہو گئے تھے۔ صوفی کو تو خیر ان
تمام باتوں سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ وہ نام و نمود کے تصور سے بھی گھبراتا تھا۔ خود کرنل رحیم شاہ بھی ایک
پریکٹیکل آدمی تھا۔ اور اسے یہ غرض نہیں ہوتی تھی کہ وہ نام و نمود حاصل کرے لیکن تمام تر کارروائیوں کے مکمل
ہونے کے بعد شاہ میر خان صاحب کی رپورٹ پر ملٹری ہائی کمان کے ہیڈ کوارٹر میں ایک خفیہ میٹنگ ہوئی۔

جس میں گنے چنے لوگ تھے۔اور خود کمانڈر ان چیف اس اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔شاہ میر خان
طرف سے کرنل رحیم شاہ کو بھی دعوت دی گئی تھی۔کرنل رحیم شاہ اپنی بیساکھی کے ذریعے جب وہاں پہنچ
تمام افسران نے ان کا استقبال کیا۔

کرنل رحیم شاہ نے سلیوٹ کیا اور کمانڈر ان چیف نے آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا اور
سامنے بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کو دیکھ کر بولے۔

''بات اصل میں اتنی ہے کہ کچھ لوگ قدرتی طور پر ملک وملت کی بقا کے لیے تخلیق کیے جاتے ہ
اور اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں بھیج دیا ہے بس وہ وقت گزرتا ہے جب ان کی پرورش ہو۔اور وہ ایک مک
شخصیت اختیار کر جائیں۔اور اس کے بعد سے اس وقت تک کے لیے ان کی خدمات کا آغاز ہو جاتا ہے
جب تک کہ وہ واپس اس معبود حقیقی کے پاس نہ پہنچ جائیں۔ہم میں سے تقریباً تمام نہیں تو بہت سے افر
اپنے عہدے کا حلف اٹھاتے ہیں۔دیانت داری کے ساتھ اپنے فرائض پورے کرتے ہیں۔اور پھر ایک ع
ہونے تک ریٹائر ہو جاتے ہیں۔لیکن کچھ ایسے ہوتے ہیں جو ذہنی طور پر کبھی ریٹائرڈ نہیں ہوتے اور ان م
ایک نام کرنل رحیم شاہ کا ہے۔میں انہی کے حوالے سے بات کر رہا تھا کہ انہیں آسمانوں سے صرف ملک
ملت کی خدمت کے لیے بھیجا گیا ہے اور وہ یہ کام کر رہے ہیں۔قانونی حیثیت کے تحت، انکی ایک ٹانگ ضائ
ہونے کے بعد انہیں فوج سے ریٹائر کر دیا گیا تھا۔لیکن آپ میں سے ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ ملٹری انٹیل
جنس کے لیے کرنل رحیم شاہ نے کیا کیا خدمات انجام دی ہیں۔حکومت نے قانون کے تحت انہیں ریٹائر کر د
لیکن انہوں نے اس ریٹائرمنٹ کو قبول نہیں کیا اور اپنا فرض سرانجام دیتے رہے۔چنانچہ موجودہ آپریشن جس
میں ہم نے ٹھا کر گیا نیشور کو پکڑا ہے کا ایک ایک نقطہ کرنل رحیم شاہ نے ترتیب دیا اور ان کی قیادت میں ہم
ایک خوفناک را کے ایجنٹ کو گرفتار کیا۔جس نے صحیح معنوں میں ملک کی بنیادیں ہلانے کا کام شروع کر دیا تھا
لیکن جس ملک میں کرنل رحیم شاہ جیسے لوگ موجود ہوں۔وہاں بیرونی عمل کام نہیں کرنے پاتا۔اور ہر اس آنکھ
کو نکال کر ہتھیلی پر رکھ دیا جاتا ہے جو ملک کے بارے میں برے انداز میں سوچ رہی ہو۔دیکھ رہی ہو۔کرنل
رحیم شاہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے میں انہیں سلام کرتا ہوں کہ انہوں نے ایک اتنا بڑا کارنامہ انجام
دیا اور اس کے لیے میں انہیں شاہ میر خان صاحب کے ہاتھوں ایک اعزاز پیش کرنا چاہتا ہوں۔''

سونے کا ایک میڈل جس کے درمیان میں ایک خوب صورت ہیرا جگمگا رہا تھا۔کمانڈر ان چیف
نے رحیم شاہ کو پہنایا لیکن رحیم شاہ کے اندر ایک خجالت تھی۔ایک شرمندگی کا سا احساس تھا۔اس کی آنکھوں
میں ایک بے تکا چہرہ ناچ رہا تھا جس نے اصلی کارنامہ چٹکیاں بجاتے سرانجام دیا تھا اور خود پس پردہ تھا۔لیکن
جب کرنل رحیم شاہ جذبات میں ڈوبا ہوا گرین ہاؤس پہنچا تو صوفی وہاں موجود نہیں تھا۔

''دلاور! صوفی صاحب کہاں گئے ہیں۔''

''وہ جناب عالی جس شخص کو انہوں نے قید کیا تھا اسے لے کر گئے ہوئے ہیں۔'' دلاور نے جواب
دیا تھا۔قصور شاہد کا بھی نہیں تھا۔وہ بے چارہ صرف ٹھا کر گیا نیشور کا شکار ہوا تھا احسان غزنوی جو اس خاندان
کے سربراہ تھے۔شاہد کی تلاش کے لیے ہر ممکن کوشش کر چکے تھے۔اور اس گھر میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔

شاہد کتنے ہی دن سے گم تھا۔صاعقہ، عدنان، فوزی، مینا یہ سب کے سب بڑے پریشان تھے۔ہر طرح کی
کوششیں کی جا رہی تھیں۔لیکن کوئی مثبت نتیجہ سامنے نہیں آ رہا تھا۔رمضان اور ہمشیرہ بھی ساکت تھے کہ
اچانک شاہد ایک عجیب وغریب شخص کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور سب دنگ رہ گئے۔صوفی نے احسان غزنوی
صاحب کو پوری تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''وہ آدمی درحقیقت پڑوسی ملک کا ایک خطرناک ایجنٹ تھا اور ان انجکشنوں کے ذریعے ملکی
راز حاصل کر رہا تھا۔یہ تمام بچے اس کا شکار ہوئے تھے۔آپ کو تفصیل بتائے دے رہا ہوں۔کسی اور کو نہیں
بتایئے گا۔درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''مگر جناب! آپ کون ہیں کیا آپ کا تعلق ملٹری سے ہے۔''

''جی نہیں۔دنیا سے ترک تعلق کر چکے ہیں۔بس یونہی۔پیروں فقیروں کی خدمت کرتے رہتے
ہیں۔اور وہ ہماری مدد کرتے ہیں درویشوں کے کرم سے چلتے ہیں خدا حافظ۔''

صوفی نے کہا اور اپنے مخصوص انداز میں گردن لچکاتا ہوا وہاں سے واپس پلٹ پڑا۔

♥......♥......♥

ادھر کرنل رحیم شاہ بری طرح جذباتی ہو رہا تھا۔بہت دن کے بعد اپنے گھر گیا تھا۔ورنہ اب اس کا
زیادہ تر وقت دارالحکومت میں ہی گزرنے لگا تھا۔اس وقت وہ سارے گھر والوں کے گھیرے میں بیٹھا ہوا
تھا۔سامنے ہی وہ میڈل رکھا ہوا تھا۔جو اسے اس نئے کارنامے پر ملا تھا۔کرنل رحیم شاہ کے سارے اہل
خاندان اس کے قریب تھے اور وہ انہیں بتا رہا تھا۔

''معذور ہونے کے بعد آپ لوگ یقین کریں۔کئی بار میں نے خودکشی کے بارے میں سوچا دشمن
کو نقصان پہنچانا میرا ایمان ہے۔بے شک انسان اپنی ذمے داری پوری کر لیتا ہے۔اور ذمے داری پوری
کرنے کے بعد وہ کسی گوشہ عافیت میں بیٹھ جاتا ہے۔لیکن میں نے روز اول ہی یہ سوچا تھا کہ صرف اپنا فرض
پورا نہیں کروں گا۔نوکری ایک الگ چیز ہے۔مٹی کی پکار الگ، آپ لوگ یقین کریں۔میرے وطن کے
در و دیوار سرزمین کی سرحدیں میرے ملک کے چپے چپے کی زمین جیسے مجھے اپنا لخت جگر سمجھتی ہے۔اور مجھے یوں
لگتا ہے جیسے اس کا خون جگر میری رگوں میں دوڑتا ہو۔بڑا پیار کرتا ہوں میں اس سے اور میرا دل چاہتا ہے کہ
وطن کی زمین پر نثار ہو جاؤں۔لیکن ٹانگ سے معذور ہونے کے بعد جب سرکاری طور پر مجھے رخصت دے
دی گئی تو میرے دل کی دنیا ویران ہو گئی۔بہت کچھ سوچتا تھا میں اس بارے میں، لیکن بے بسی محسوس کرتا تھا
اور پھر میں تو صرف اور صرف یہی کہتا ہوں کہ قدرت کو میرے حال زار پر ترس آ گیا۔

ایک ایسا کردار ایک ایسا وجود میرے سامنے آیا۔جس کے بارے میں میں نے پہلے کبھی سوچا بھی
نہیں تھا۔لیکن قربان جاؤں ان پیروں فقیروں کے۔زمین سنبھال رکھی ہے انہوں نے، ہر ایک کی مشکل کے
لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں۔اور اللہ اپنے ان نیک بندوں کی دعائیں پوری کر دیتا ہے۔مجھے بالکل
اتفاقیہ طور پر ایک بزرگ کے مزار پر صوفی مل گیا۔ارے کیا چیز ہے یہ خدا جانے کیا چیز ہے مجھے تو وہ کوئی
سائنسی عجوبہ ہی لگتا ہے یوں لگتا ہے جیسے کسی سائنس داں نے ایک روبوٹ بنایا ہو اور اسے کسی طرح اس

سائنس داں سے رہائی ہوگئی ہو۔ روبوٹ سے میرا مطلب ہے وہ روبوٹ مجھے مل گیا۔ ویسے حقیقت یہی
کہ اسے اس کائنات کے عظیم سائنس داں نے بنایا ہے۔ اس سائنس داں نے جس نے یہ ساری کائنات
ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ۔

صوفی ایک انوکھی وبا پھیلی ہے۔ ڈیفنس منسٹر کے بارے میں تو تم لوگوں کو پتا ہی ہے کہ میر
دوست ہیں۔ بڑی تشویش سے کہنے لگے کہ کرنل رحیم شاہ! جو کچھ ہوا ہے اس نے حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔
میں نے صوفی کو بتایا اور وہ بولا کہ وہ پیرو مرشد شاہ کے مزار پر جا رہا ہے۔ اور مسئلے کا حل تلاش کرے گا او
اس نے منٹوں میں وہ حل میرے سامنے پیش کر دیا۔ اس وقت جب مجھے یہ اعزاز پیش کیا جا رہا تھا اور فوجی
کوارٹر میں یہ جملے ادا کیے جا رہے تھے کہ کچھ لوگ کسی قسم کی معذوری قبول نہیں کرتے تو یقین کرو میرا دل
رہا تھا کہ میں صوفی کے وجود میں سما جاؤں۔ صوفی بن جاؤں میں اور انہیں بتاؤں کہ یہ سب کچھ میں تنہا
کیا ہے۔ میرا ایک ہم زاد ہے جو میرے اندر ہے۔ میں تم لوگوں کو یہ صرف اس لیے بتا رہا ہوں کہ تمہیں ا
احترام کرنا ہے جب بھی وہ کبھی یہاں آئے۔"

"لیکن انکل وہ رہتے کہاں ہیں۔"

"بس ایک جملہ سنا ہوگا ان کے منہ سے، یہ ہو رہا ہے درویشوں کے کرم سے، وہ ہو رہا
درویشوں کی دعاؤں سے۔ پتا نہیں بے چارے کا ماضی کیا ہے۔ بڑے ناقدرے لوگ ہیں۔ انسپکٹر کی حیثیت
سے محکمہ پولیس میں ڈیوٹی سر انجام دے رہا تھا۔ لیکن اپنی مخصوص فطرت کا مالک ہے۔ اسے معطل کر دیا گیا
اس کے بعد برخاست۔ پتا ہے کیا کر رہا تھا پچھلے دنوں میں وہ؟" کرنل رحیم شاہ نے آنکھیں بند کر
جھومتے ہوئے کہا۔ بچے منتظر تھے۔ کرنل رحیم شاہ نے آنکھیں کھولیں اور بولا۔

"ایک پل پر ہر مال دس روپے کا ٹھیلا لگاتا تھا" ہنسی کی دبی دبی آوازیں ابھریں اور کرنل رحیم
کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔

"ہنس رہے ہو تم بیٹے! ہنس رہے ہو تم۔ کاش! انسان کی عظمت سمجھ لی جاتی۔ تمہیں کیا معلوم
اس کے پس منظر میں کیا ہے۔ انسان ہر حالت میں انسان ہی ہوتا ہے بیٹا! آج تم اس عالی شان کوٹھی
اپنے شاندار بیڈ روم اور ڈرائنگ روم میں زندگی گزار رہے ہو۔ لیکن تمہیں اندازہ ہے کہ تمہارے ملک کے
صد انسان بھی یہ زندگی نہیں گزارتے جو تم گزار رہے ہو۔ خیر! کیا فائدہ جب تم کسی انسان کی عظمت پر
طرح ہنس سکتے ہو تو تم اس انسان کی قدر کیا کر سکتے ہو۔ چھوڑو...... چھوڑو ان باتوں کو۔" سب کو یہ معلوم ہو
تھا کہ کرنل رحیم شاہ ناراض ہوگیا ہے۔ پھر کرنل ان کے درمیان نہیں رکا تھا اور سب افسوس کرتے ر
تھے۔ عادل نے کہا۔

"یار تم تایا ابو کو جانتے نہیں ہو کہ کس طرح کے انسان ہیں وہ، تم بھی اس وطن کے باشندے ہو

"سوری یار! عادل پتا نہیں کیوں نکل گئی تھی۔" ہنسنے والے نے کہا۔

"اچھا عادل ایک بات بتاؤ انکل نے تمہاری ڈیوٹی بھی تو ان کے ساتھ ہی لگائی ہے۔"

"ہاں۔ لیکن ابھی تک ہم نے کوئی کارنامہ سر انجام نہیں دیا ہے۔ جب کہ اب واقعی یہ آرزو پیدا ہوگئی۔

کہ ہم بھی کچھ ایسا کر کے دکھائیں کہ کل تایا ابو ہماری بھی تعریف کریں۔" وہ سب گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔

♥ ♥ ♥

ممن خان کے ہوٹل میں حسب معمول رونق لگی ہوئی تھی۔ چائے کی سڑپیاں چل رہی تھیں ویٹر
ادھر سے ادھر گھوم رہا تھا۔ رجو کو آئے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ لیکن صوفی بھلا کسی سے کیسے نہ متعارف
ہوتا اس وقت وہ چائے کی پرچ ہاتھ میں رکھے اور پوری کی پوری پیالی پرچ میں انڈیلے ہوئے۔ اس میں
پھونکیں مار رہا تھا۔ چائے کی پرچ اس کی انگلیوں پر ٹکی ہوئی تھی۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ چائے کی سڑپے بھرنا
شروع کر دیے۔ سڑپ سڑپ کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ اسی وقت رحمت خان صوفی کے پاس آ بیٹھا۔

"اماں صوفی صاحب! یہ شاہی سے کیا پھڈا چل گیا ہے۔"

"پھڈا ہمارا۔" صوفی نے حیرانی سے کہا۔

"ارے آپ کو معلوم ہی نہیں ہے۔"

"نہیں بھائی نہیں۔ مگر تم بتا رہے ہو۔ تو کچھ شبہ ہو رہا ہے درویشوں کے کرم سے شاہی ہے کہاں۔"

"باہر تھڑے پر بیٹھا ہوا ہے۔ اندر آیا تھا تمہیں دیکھ کر باہر نکل گیا۔"

"لیجیے ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے اماں ذرا دیکھیں۔ مگر کیا ہوا۔
یعنی ایک ایسی بات جس کا ہمیں پتا ہی نہیں ہے۔ وہ جو کہتے ہیں نا اچھا چلو اس سے کہیں گے۔" اتنی دیر میں دو
اور شناسا آ گئے۔ تو رحمت خان نے کہا۔

"لیجیے قبن بھائی، بھائی صوفی کو پتا ہی نہیں ہے کہ شاہی سے ان کا کوئی پھڈا ہوگیا ہے۔"

"اماں درویشوں کی قسم ہمارے تو فرشتوں کو بھی یہ پتا نہیں تھا۔ آؤ ذرا دیکھیں تو سہی۔ چکر کیا
ہے۔" صوفی نے پرچ میں بچی ہوئی چائے معدے میں انڈیلی اور اس کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ کر چل پڑا۔
اس وقت وہ خالی شلوار اور شلوکے میں ملبوس تھا اور شلوکے کی جیبیں پھولی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے جو کچھ نظر آ رہا
ہوگا وہ دیکھنے دکھانے سے تعلق رکھتا ہوگا۔ ویسے ہی کسی اونٹ کی تخلیق ہو رہی ہوگی۔ کہ برابر سے ایک انسانی
روح گزر گئی اور اونٹ کی باڈی اس کے ساتھ لپٹی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ نتیجے میں صوفی صاحب وجود میں آئے۔
باہر ہوٹل کے تھڑے پر شاہی اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ اور بیڑی پی رہا تھا۔ جب یہ لوگ اس کی طرف
بڑھے۔ تو وہ ایک دم سے بے چین سا ہوگیا۔ صوفی نے آگے بڑھ کر کہا۔

"شاہی۔ اماں کیا سن رہے ہیں ہم، تم ہم سے ناراض ہو" شاہی نے منہ بنایا اور تھڑے سے نیچے
کود گیا پھر وہ آگے بڑھا تو صوفی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بولا۔

"دیکھو میاں! بات اصل میں یہ ہے چھوڑیں گے نہیں تمہیں۔ ہم سے زیادہ طاقت ور ہو تو بازو چھڑا
کر چلے جاؤ۔ وعدہ کرتے ہیں کہ اگر تم نے ہم سے بازو چھڑا لیا تو دوبارہ زندگی بھر تمہاری طرف نگاہ بھر کر نہیں
دیکھیں گے۔ چاہے یہ محلہ ہی کیوں نہ چھوڑنا پڑے۔"

"اماں رہنے دیں صوفی صاحب! وہ جو کہتے ہیں نا بغل میں چھری اور آگے پیچھے کیا ہیں یہ تو مجھے
نہیں معلوم۔"

''اور ہم کیا کہتے ہیں یہ بھی سن لیجئے وہ شعر ہے نا کسی کا۔

کہ وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا

وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

''بھائی شاہی! کم ازکم بتا تو دو ہمیں درویشوں کی دعاؤں سے کہ ہوا کیا ہے۔''

''پوچھ رہے ہو کہ ہوا کیا ہے؟ اماں صوفی صاحب! کسی کے پیٹ پر اس طرح لات ماردینا کو اچھی بات تو نہیں ہے۔ وہاں چاچا صفر کے ہاں کام کر رہے تھے ہم۔ گئے تھے مریدی کرنے اور ان بے چاروں دھڑن تختہ کر دیا۔ سب کچھ کھدوا کر پھکوا دیا گیا ہے ادھر ہماری اچھی خاصی روزی لگ گئی تھی۔ اپنی روزی کے چکر میں تم نے ہماری روزی مروادی۔''

''تو یہ بات ناگوار گزری ہے تمہیں۔''

''او یار! کسی سے اس کا رزق چھین لو اور وہ برا بھی نہیں مانے۔''

''دیکھو بھائی! ہم بتائے دے رہے ہیں سب کو یہ تو آپ کو پتا ہے کہ پولیس میں نوکری کی ہے اور یہ بھی آپ کو پتا ہے کہ دنیا میں ہمارا اپنے وطن کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور جس کا وطن ہو اس کا سب کچھ ہوتا ہے۔ ہم تو تم اپنے آپ کو اکیلا نہیں سمجھتے۔ اس وقت جتنے لوگ بھی ہمارے پاس ہیں درویشوں کی دعاؤں سے ان میں ذرا وہ شخص اپنا ہاتھ اٹھا دے۔ جو کہتا ہے کہ اسے وطن کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ اس کی اپنی جیبیں بھر جائیں باقی سب جہنم میں جائے۔ ذرا اٹھاؤ ہاتھ درویشوں کی دعاؤں سے۔ کوئی ہاتھ اوپر نہیں اٹھا تھا یہاں تک کہ شاہی کا ہاتھ بھی نیچے ہی تھا۔ سب صوفی کو دیکھ رہے تھے۔

''میاں شاہی وہ غیر ملکی جاسوس تھا۔ اس نے وہاں اپنا اڈا بنا رکھا تھا اور ایک سرنگ بھی بنا رکھی تھی۔ اب اس سرنگ کی چھت توڑ دی گئی ہے۔ اور وہ ایک نالے کی سی شکل میں نظر آتی ہے وہ اس سرنگ کو سرحد پار لے جانا چاہتے تھے۔ تاکہ سرحد پار سے جاسوسوں کو آنے جانے میں آسانی ہو۔ میاں پتا ہے تمہیں کیسے دشمن کے ساتھ وقت گزار رہے تھے۔ وہ تو اللہ نے تمہاری بچت کر رکھی ہے درویشوں کی دعاؤں سے ورنہ نہ جانے کیا سے کیا ہو جاتا۔ بس شاہی ہمیں وہاں لے گئے تھے۔ کچھ دیر وہاں وقت گزرا اور اللہ نے ہماری رہنمائی کر دی۔ درویشوں کی دعاؤں سے وہاں وہ سرنگ دریافت کر لی۔ اور ساتھ ہی کچھ ایسی چیزیں بھی جو جاسوسی کے کام آرہی تھیں۔ بس پھر کچھ اعلا افسران سے مل کر پکڑوا دیا ان سسروں کو اب آپ بتائیے شاہی میاں! ہم تو کہتے ہیں کہ آپ کی جان بچالی۔ اللہ نے درویشوں کے کرم سے۔ ورنہ آپ نے بھی وہاں تعمیر تو شروع کر دی تھی۔ وہاں کام کرتے اور دشمنوں کے آلہ کار بن جاتے۔ بہر حال جاسوسوں کو پکڑے تو جانا تھا۔ آپ بھی ان کے ساتھ پکڑے جاتے اور ملک دشمن قرار دے دیے جاتے پھر اس کے بعد آپ کو بھی سزائے موت ہی ملتی۔ یہ تھوڑے سے پیسے تو مل جاتے مگر انہیں خرچ کون کرتا۔ آپ تو لٹک جاتے سولی پر درویشوں کی دعاؤں سے۔'' شاہی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ باقی تمام لوگوں کے منہ بھی کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔ رحمت خان نے کہا۔

''اماں تمہیں قسم ہے صوفی صاحب! سچ کہہ رہے ہو یہ سب کچھ۔''

''سو تو ہے۔'' شاہی جلدی سے آگے بڑھا اس نے جلدی سے جھک کر صوفی کے پاؤں پکڑ لیے اور

صوفی پھدکنے لگا۔

''یہ...... یہ...... یہ کیا کر رہے ہو۔ دیکھو تمہیں اللہ کی قسم، دیکھو ہماری بات سنو ایسا نہ کرو۔ ایسا نہ کرو۔ تمہیں...... تمہیں اللہ کا واسطہ۔'' صوفی کو پیروں میں بہت گدگدی ہوتی تھی۔ بہ مشکل تمام اس نے شاہی سے اپنے پیر چھڑوائے اور بولا۔

''بس تو ناراضگی ختم۔ چلو آؤ اندر بیٹھ کر چائے پئیں گے۔''

♥......♥......♥

کرنل رحیم شاہ کو اس بات سے غرض نہیں تھی کہ صوفی کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ وہ گھر واپس آ گیا تھا۔ دارالحکومت میں اس کے گرین ہاؤس میں باقاعدہ آبادی ہو گئی تھی۔ دلاور اپنے اہل خاندان کے ساتھ اور غلام قادر ویسے ہی وہاں رہتا تھا اس کے علاوہ کچھ خاص قسم کے ملازم بھی رہتے تھے۔ جو گرین ہاؤس کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ شازیہ کا اپنے گھر آنا جانا تھا۔ اتنی بڑی تنخواہ لگا دی گئی تھی اس کی کسی اور معاملے کی ضرورت ہی نہیں رہتی تھی۔ کچھ دن پہلے سڑکوں پر بھیک مانگنے والی گریجویٹ بھکارن اب ایک پروقار شخصیت کی مالک نظر آتی تھی۔ خوش بختی یہ تھی کہ اس نے کبھی کسی کو اپنے بارے میں نہیں بتایا تھا اور خاموشی کے اپنا کام کرتی رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے اہل خاندان کو بھی اس بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ چنانچہ بات بن گئی تھی۔ فی الحال گرین فورس کو یہیں روک دیا گیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کرنل رحیم شاہ نے ان ناتجربے کار لوگوں کو اپنی فورس میں شامل کر کے ایک تجربہ کیا تھا۔ حالانکہ اس طرح کے کاموں میں مکمل طور پر تجربے کار لوگوں کو شامل کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی بس کرنل رحیم شاہ کی ذاتی کوشش تھی کہ اس نے یہ سب کچھ کر ڈالا تھا۔ بلکہ صوفی سے اس بارے میں بات چیت ہوئی تھی تو صوفی نے بھی اس کے خیال کی حمایت کی تھی۔

''حضور من! انسان تو یکساں ہی ہوتے ہیں کسی کو بھی روز اول سے کوئی تربیت نہیں دی جاتی۔ وقت خود سب سے بڑی تربیت کر دیتا ہے۔ چنانچہ میرے خیال میں آپ کا یہ قدم غیر مناسب نہیں ہے۔ اور پھر دیکھتے ہیں آگے چل کر، اگر ہمیں ہماری تمام ضروریات پوری ہونے کی امید نہ ہوئی تو انداز بدل دیں گے۔ یہ لوگ تو ویسے بھی معصوم سے لوگ ہیں اور انہیں اپنے ساتھ شامل کرنا بڑی خوش آئند بات ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''صوفی صاحب! ان لوگوں کی ایک باقاعدہ تربیت بھی ہونی چاہئے اور اس کا بندوبست آپ ہی کو کرنا ہوگا۔''

''حضور والا کی ہدایت کے مطابق جیسا حکم ہوا کریں گے۔'' بہر حال وہ لوگ غیر مطمئن نہیں تھے کرنل رحیم شاہ تو صوفی کی پہلی ہی کوشش سے بڑا مطمئن ہو گیا تھا جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ سردار پور ایک طرح سے دارالحکومت کا نواحی علاقہ ہی کہا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کا محل وقوع بہت ہی خوب صورت تھا۔ دارالحکومت کے مشرقی حصے کا علاقہ پہاڑی علاقہ کہا جاتا تھا۔ اور یہ سلسلہ آخر کار سرحد سے جا ملتا تھا۔

چنانچہ بعض چھوٹے چھوٹے علاقوں میں ایسے پوائنٹ بھی تھے۔ جہاں خاص طور سے نگاہ رکھنی پڑتی تھی۔ کرنل رحیم شاہ ان معاملات سے فارغ ہونے کے بعد آرام کرنے کے لیے سردار پور آ گیا تھا۔ صوفی

کو تو خیر ویسے بھی آزادی تھی۔ چنانچہ ممن خان کا ہوٹل آباد تھا اور صوفی کی ہنگامہ آرائیاں عروج پر۔ قوالی محفلیں، عرس، بزرگوں کے نام تلاش کیے جاتے اور گلی ممن خان میں باقاعدہ شامیانے لگ جاتے اور کسی کسی بزرگ کا عرس شروع ہو جاتا۔ ایک بار پھر فراغت حاصل ہو گئی تھی اور کرنل رحیم شاہ اپنی دولت ا مقاصد پر لٹا رہا تھا۔ لیکن بات یہیں تک محدود نہ رہی۔ شاہ میر خان صاحب نے کرنل رحیم شاہ کو طلب کر لیا۔

''کرنل صاحب! آپ نے جو عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ آپ کے خیال میں آپ فرض پورا کرنے کے بعد مطمئن ہو گئے ہیں۔ لیکن ہم مطمئن نہیں ہوئے۔''

''سمجھا نہیں میرے دوست۔'' کرنل رحیم شاہ نے حسب عادت بے تکلفی سے کہا۔

''ایک بار پھر سرکاری محکمے میں آپ کی انٹری ہو گئی ہے۔ اور یہ متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا ہے کہ کر رحیم شاہ جیسے باعمل آدمی کو معطل نہیں رہنے دیا جائے گا۔ اور ان کے لیے ایک باقاعدہ محکمہ ترتیب دیا جائے گا

''نہیں مجھے یہ منظور نہیں ہے کیونکہ اس طرح مجھ پر بندشیں عائد ہو جائیں گی اور بہرحال سرکاری نوکری سے ریٹائر ہو چکا ہوں۔ ایک بار پھر اپنے ذہن پر کوئی بوجھ لینا پسند نہیں کروں گا۔ پھر مجھے سب کچھ کرنا پڑے گا جو حکومت کی ضرورت ہو گی۔''

''ویسے آپ کا کیا خیال ہے۔ رحیم شاہ صاحب۔'' شاہ میر صاحب نے پوچھا۔

''بس چونکہ میں ایک شعبے سے متعلق رہا ہوں جو ملک دشمنوں کے خلاف سرحدوں کی حفاظت کی اور اس کے ساتھ ساتھ ہی میں ہر طرح کی سازشوں کے سامنے سینہ سپر رہا ہوں۔ اب بھی یہی چاہتا ہوں کہ ملک کے اندر اور باہر ملک کے خلاف جو کچھ بھی ہو اور جہاں تک میرے علم آ جائے۔ میں اس کے لیے کام کروں۔''

''تو ہمارا مقصد بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔''

''نہیں جناب! میں اب آزادی کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ ہاں ایک بات کا آپ سے وعدہ ہوں جو کچھ بھی کروں گا ملکی قانون کے دائرے میں رہ کروں گا۔ کہیں حد سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کر گا۔ جس طرح اس وقت ایک غیر ملکی جاسوس پکڑنے کے سلسلے میں حکومت کی مدد کی ضرورت پیش آئی آئندہ بھی اگر پیش آئی تو یہ مدد مانگوں گا۔ مکمل ثبوت اور ذمے داری کے ساتھ۔''

''تو پھر ایک اور ترکیب ہو سکتی ہے۔'' شاہ صاحب نے کہا اور کرنل رحیم شاہ سوالیہ نگاہوں سے میر کو دیکھنے لگا۔

''وہ یہ کہ کسی خاص محکمے کو آپ سے منسلک کر دیا جائے میرا مطلب ہے اس محکمے کو یا اس ایجنسی خصوصی ہدایت کر دی جائے کہ آپ کی طلبی پر ایک دم ایکشن میں آ جائے اور آپ کی ضرورت کے مطابق کرے اس طرح یہ نہیں ہو گا کہ کسی بھی مسئلے میں آپ کو فورس فراہم نہ ہو سکے۔'' کرنل رحیم شاہ کے چہرے پر محب بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

''میں جانتا ہوں شاہ میر! تم میرے لیے ہر آسانی پیدا کرنا چاہتے ہو۔''

''کیوں نہ پیدا کروں، معذور ہو کر ڈیوٹی سے ہٹ جانے کے باوجود تم آج بھی اس طرح ملک ملت کے لیے مضطرب ہو۔ کون قدر نہ کرے گا اس بات کی۔''

''ٹھیک ہے تم کسی ایجنسی کو میرے لیے مخصوص کر دو۔ مگر اس شکل میں کہ وہ اپنا کام جس طرح کرتی ہے کرتی رہے۔ اگر مجھے کبھی ضرورت پیش آئے۔ تو میری مدد کر دی جائے۔''

''اس کے علاوہ ایک فنڈ ہم تمہارے مشن کے لیے جاری کیے دیتے ہیں۔ تم جس طرح بھی چاہو مکمل طور پر صاحب اختیار ہو کر وہ فنڈ خرچ کرو۔ ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دنیا کی ہر چیز عطا کر دی ہے۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے لیکن اپنے پاس سے صرف اتنا خرچ کرو۔ جتنا ضروری ہو باقی سب سرکاری حساب میں جانا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے یہ بات مجھے منظور ہے۔ کیونکہ میں واقعی اس سلسلے میں کچھ اخراجات کر رہا ہوں اور یقیناً مجھے اس طرح کے فنڈ کی ضرورت پڑے گی۔ حالانکہ میں نے سوچا تھا کہ یہ فنڈ میں ان سے حاصل کروں جن کے خلاف کام کرتا ہوں۔ لیکن وہ ایک ذرا غیر معیاری عمل رہے گا۔''

''نہیں نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔'' کرنل رحیم شاہ گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا تھا۔

♥......♥......♥
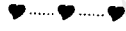
کوہساروں کی دنیا بھی عجیب ہوتی ہے سادہ سادہ زندگی گزارنے والے محنت کش جن کے کارنامے سن کر اور دیکھ کر یقین متزلزل ہو جاتا ہے۔ ناقابل عبور پہاڑی راستے جن کے بارے میں یہ سوچ کر خوف آئے کہ ان ہولناک ڈھلانوں میں انسان تو انسان جانور بھی قدم رکھتے ہوئے وحشت زدہ ہو جاتے ہوں گے۔ لیکن انہیں ڈھلانوں میں اور انہی ناقابل عبور راستوں پر چھوٹے چھوٹے بچے کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ذرا سی دیر میں کہیں سے کہیں پہنچ جانے والے وزنی وزنی سازوسامان کے ساتھ ان راستوں کو عبور کرنے والے کبھی کبھی تو انسان لگتے نہیں ہیں۔ لگتا ہے کوئی آسیبی مخلوق ہے۔ جو یہاں انسانوں کی مانند زندگی گزار رہی ہے۔

اس کے بعد موسموں کی سختی۔ برف باری ہو جائے تو برف کے انبار لگ جائیں۔ لیکن انسان ان میں بھی نمودار ہوتے ہیں۔ ان ہی برف زاروں میں ایک اچھی خاصی وسیع وعریض آبادی سنگینہ بھی ہے۔ سنگینہ بڑی مہذب بستی ہے زیادہ تر مکانات پتھر اور چونے کے بنے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں لکڑیوں کے مکانات بھی نظر آتے ہیں۔ اور کہیں مکانات کی شکل میں عجوبے جیسے کسی ایسی چٹان پر جس کے نیچے کوئی خلا ہو۔ ایک چھوٹا سا خوب صورت گھر جس میں ضروریات زندگی بالکل اسی طرح جیسے عام جگہوں پر دیکھنے والے کا تو سانس بند ہو جائے۔ لیکن اس میں رہنے والے مکمل اور بھرپور سانسیں لیتے ہیں۔ سنگینہ میں ایسے عظیم الشان حویلیاں اور احاطے بھی ہیں جو زمانہ قدیم میں نہ جانے کب سے سربلند چلے آئے ہیں اور انہی میں حکیم جاہ کی حویلی بھی ہے۔

یہ حویلی حکیم جاہ نے نہیں بنوائی تھی۔ نہ جانے اس حویلی کی تاریخ کیا تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ مختلف ناموں سے منسوب ہوتی رہی پتھریلی دیواروں میں گھری ہوئی یہ خوب صورت حویلی باہر ہی سے نہیں اندر سے بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ دنیا کی کون سی چیز ہے جو یہاں موجود نہیں ہے۔ اسی حویلی میں خانم فردوسیہ رہتی ہے۔

خانم فردوسیہ حکیم جاہ کی بیوہ، جس کی صرف ایک بیٹی ہے، حکیم جاہ کچھ عرصے قبل ایک حادثے میں ہلاک، ہوگیا تھا اور اس کے بعد خانم فردوسیہ یہاں کی مکمل مالک اور مختار تھی۔ اپنی نوجوان بیٹی اراشیہ کے ساتھ وہ یہاں حکمرانوں کی زندگی گزار رہی تھی۔ بہت ہی متین فطرت کی مالک اس کی بیٹی کی شکل وصورت میں نظر آ جاتی تھی۔ بلند و بالا قد و قامت نے دونوں ماں بیٹیوں کی شخصیت میں چار چاند لگا دیے تھے اراشیہ بہت ہی شوخ و شنگ تھی لیکن باپ کی موت کے بعد نہ جانے کیوں اس پر ایک خوف سا طاری ہوگیا تھا۔ اور یہ خوف خانم فردوسیہ کے شبہے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ خانم فردوسیہ بری طرح بے کل رہتی تھی اور اس پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری رہتی تھی۔ نہ جانے وہ کس سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پھر اس رات جب ہلکی برف باری ہو رہی تھی اور ماحول پر ایک خوش گوار کیفیت مسلط تھی۔ خانم فردوسیہ آتش دان کے پاس بیٹھی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اراشیہ اس کے پاس پہنچ گئی۔ فردوسیہ نے چونک کر بیٹی کی صورت دیکھی اور اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ اراشیہ نے ایک کرسی گھسیٹی اور ماں کے پاس بیٹھ گئی۔

"میں محسوس کر رہی ہوں کہ ان دنوں آپ بہت زیادہ الجھی ہوئی ہیں خانم!" اراشیہ نے ماں سے کہا۔

"ہاں بالکل ٹھیک سوچ رہی ہو تم اصل میں مجھے وقت کا انتظار تھا اور وقت میرا خیال ہے آ گیا ہے۔ ہمیں ایک ناٹک کرنا ہے اور تم اس ناٹک میں اہم کردار ادا کر رہی ہو۔"

"ناٹک...... کیسا ناٹک اور کیوں؟" اراشیہ نے سوال کیا۔

خانم فردوسیہ کے چہرے پر گہرے غور و فکر کے آثار پھیل گئے۔ تھوڑی دیر تک وہ سوچتی رہی پھر بولی۔

"دیکھو اراشیہ...... میں سمجھتی ہوں کہ تم انتہائی ذہین بچی ہو۔ ہر طرح کی صورت حال سے واقف تمہیں کسی بات سے بے خبر رکھنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ تمہارے علاوہ اور ہے بھی کون۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہم اگر چاہیں تو یہاں سے کسی بھی شہری آبادی میں منتقل ہو سکتے ہیں۔ ہماری اپنی دنیا الگ ہو جائے گی۔ میں تمہیں ایک جدید زندگی دے سکتی ہوں وہیں پر ہم زندگی کے بقیہ دن گزار لیں گے۔ خدا کا دیا ہمارے پاس اتنا کچھ ہے کہ ہم برسوں گزار سکتے ہیں اور ہمیں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ لیکن......" اتنا کہہ کر خانم فردوسیہ خاموش ہوگئی۔ کچھ دیر بالکل خاموش رہی اور اس کے بعد اس نے اراشیہ سے پوچھا۔

"اراشیہ ہمارا وطن بہت وسیع ہے۔ بہت خوبصورت ہے اس کی آبادیاں جدید ترین ہیں ہمارے سمندر ہیں سب کچھ ہے ہمارے پاس کیا تم وہاں جا کر زندگی گزارنا پسند کرو گی۔ میں آج اس سلسلے میں تمہارا جواب چاہتی ہوں۔"

"آپ نے ایک بات لیکن پر آ کر چھوڑ دی تھی۔ لیکن سے آگے کہیں خانم۔" آراشیہ نے کہا اور خانم کی ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تم ایک ذہین بچی ہو۔ لیکن کے بعد کی منزل یہ ہے کہ جب ہم یہاں سے ان پہاڑوں اور چٹانوں اور وادیوں کو چھوڑ کر جائیں گے تو یہ ہمیں حسرت بھری نگاہوں سے تکتی رہ جائیں گی۔ کیوں کہ انہی سے ہماری مٹی لی گئی ہے۔ اور انہی سے ہمارا خمیر اٹھا ہے۔ انہی وادیوں میں ہم نے جینے مرنے کی قسم کھائی ہے۔ انہی وادیوں میں ہمارے خاندان کی روحیں بھٹکتی پھرتی ہیں انہی وادیوں میں ہماری خوشی اور غم بکھرے ہوئے

ہیں۔ اپنی روح کو چھوڑنا کسی کو اچھا نہیں لگتا۔ اپنی روح سے علیحدگی بہت دکھ بھرا عمل ہوتا ہے۔"

"میرا خیال ہے مادر مہربان! اب مجھے جواب دینے کی ضرورت نہیں رہی ہے آپ نے خود مجھ سے پوچھے گئے سوال کا جواب میری زبان میں دے دیا ہے کیونکہ میں آپ کی بیٹی ہوں اور جو سوچ آپ کی ہے وہی میری ہو سکتی ہے۔"

"ہاں ہم ان وادیوں کو نہیں چھوڑیں گے لیکن ان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی نہیں ہونے دیں گے دیکھو اراشیہ میں تم سے پہلے بھی اس خدشے کا کتنی بار اظہار کر چکی ہوں کہ یہ بات میرے دل میں جڑ پکڑ چکی ہے۔ کہ حکیم جاہ اپنی موت نہیں مرے۔ انہیں قتل کیا گیا ہے۔ اور اس سلسلے میں سارا شبہ بابر جاہ پر جاتا ہے۔ بابر جاہ، حکیم جاہ کا چھوٹا بھائی بے شک ہے۔ لیکن تم یہ بھی جانتی ہو کہ وہ سوتیلا ہے اور یہ بات اسی حویلی میں ہمارے علم میں آئی ہے۔ خیانت اس کے چہرے سے جھلکتی ہے۔ بے شک وہ ہمارے لیے ابھی تک کوئی خطرہ نہیں بنا۔ لیکن یہ طے ہے کہ یہاں وہ ملک دشمنوں کے ساتھ مل کر سازشیں کر رہا ہے اور ملک کے لیے خطرہ بنا ہوا ہے۔ اراشیہ ان پہاڑی چٹانوں اور پہاڑی دیواروں کا ہم میں سے ہر شخص پر قرض ہے۔ ہمیں وطن کا سرحدی [illegible] کہا جاتا ہے۔ تو کیا ہم اپنے فرض سے اسی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھے رہیں۔ اراشیہ! مجھے یہ سب بے ایمانی لگتی ہے اور میں بے ایمان نہیں ہوں۔"

"آپ کا مطلب یہ ہے کہ چچا جان ملک کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔"

"خدا کرے ایسا نہ ہو۔ لیکن جو کچھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں۔ وہ ایسا ہی ہے اور مجھے بہت عجیب لگتا ہے۔ وہ سب کچھ۔"

"تو پھر آپ کیا چاہتی ہیں خانم!"

"بہت عرصے پہلے کی بات ہے کہ ایک بار ایک سرحدی مسئلے میں ہماری ملاقات کرنل رحیم شاہ سے ہوئی تھی۔ ملٹری انٹیلی جنس کا آدمی تھا۔ حکیم جاہ کے ساتھ مل کر اس نے کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ تب حکیم جاہ سے بڑی دوستی ہوگئی اس کی اور اکثر جب وہ سنگینہ آتا تھا تو ہمارے پاس ٹھہرتا تھا ایک بار اس نے ہم لوگوں کو بھی اپنی بستی سردار پور میں مدعو کیا تھا۔ خود بھی صاحب حیثیت اور جاگیردار آدمی ہے فوجی زندگی اس کا شوق تھا۔ اور اس شوق کی تکمیل اس نے اس طرح کی کہ بے مثال ہوگیا اس کے علاوہ زخمی ہوا اور اس کی ایک ٹانگ ضائع ہوگئی۔ حکیم جاہ اس سے بہت متاثر تھا۔ بڑی اچھی دوستی رہی ہماری۔ اس کے عزم بے مثال تھے۔ بہرحال فوج سے ریٹائر ہوگیا وہ لیکن اس کے تعلقات بے پناہ ہیں اور وہ ہماری بھرپور مدد کر سکتا ہے۔ ایک بار حکیم جاہ نے مجھ سے کہا تھا کہ اس جیسے لوگ کبھی نچلے نہیں بیٹھتے۔ تم دیکھ لینا وہ منظر عام پر آئے گا کسی اور شکل میں اب تو یہ میں نہیں جانتی کہ اس کا موجودہ حال کیا ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کے پاس جاؤں اور اس کو صورت حال سے آگاہ کروں۔ ممکن ہے وہ اس سلسلے میں کچھ کرے۔"

"تو پھر......؟"

"تو پھر یہ میری روح! بابر جاہ کبھی نہیں چاہے گا کہ میں ایسا کوئی عمل کروں۔ شاید تمہیں اس بات کا اندازہ نہ ہو سکا ہو کہ بابر جاہ خاص طور سے ہماری ہر نقل و حرکت پر نگاہ رکھتا ہے اور وہ ہمیں کہیں بھی تنہا نہیں جانے دے گا۔ وہ نہ صرف ہمارا راستہ روکے گا بلکہ ہو سکتا ہے۔ وہ ہمیں ختم کرنے کی کوشش بھی کرے۔"

"خیر یہ اتنا آسان تو نہیں ہوگا خانم! اراشیہ نے خوف زدہ ہونے کے بجائے کسی قدر تیکھے لہجے میں کہا۔

"ہاں بیٹا! لیکن پھر بھی اس وقت تک تو ہمیں پس منظر میں رہنا ہوگا جب تک کہ حقیقتیں خود اپنا تھوڑا بہت انکشاف نہ کر دیں۔" تھوڑی دیر کے لیے ماحول پر خاموشی مسلط ہوگئی۔ پھر اراشیہ نے کہا۔

"آپ کے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے خانم!"

"منصوبہ ہی سمجھ لو اسے۔ میں کھلم کھلا تم سے یہ بات کہوں گی کہ میں سردار پور جانا چاہتی ہوں رحیم شاہ سے ملنا چاہتی ہوں اور اس کے لیے مجھے ایک ڈراما کرنا پڑے گا۔"

"ہاں۔ میں اس ڈرامے کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔"

"تم تھوڑی سی بیماری تھوڑے سے اضمحلال کا اظہار کرو اور بعد میں یہ کہو کہ تم ماحول سے اکتا گئی ہو۔ ہم سفید لومڑیوں کا شکار کھیلنے کے لیے برفانی علاقوں میں نکلیں گے۔" اور خانم اراشیہ کو اپنے منصوبے کی تفصیل بتانے لگی۔ اراشیہ نے مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"یہ تو اچھا منصوبہ ہے۔ میں اس کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔"

"پھر آغاز کر دو آج ہی سے۔" اور اراشیہ نے مسکرا کر گردن ہلا دی۔

♥......♥......♥

لڑکے لڑکیوں کو بہت لطف آ رہا تھا۔ کرنل رحیم شاہ کے بارے میں اتنا علم تو نہیں تھا کہ وہ پیر پرست ہے۔ خود بھی شاید کسی بزرگ کا مرید تھا۔ اکثر کبھی کبھی مزارات پر چلا جاتا تھا۔ ایک دو بار لڑکے لڑکیوں نے بھی اس کے ساتھ مزارات کے عرس وغیرہ میں شرکت کی تھی۔ لیکن سردار پور کی اس حویلی میں یہ محفل سماع پہلی بار منعقد ہو رہی تھی۔ اور صوفی اس میں پیش پیش تھا۔ نہ صرف وہ خود اس کے انتظامات میں بھر پور حصہ لے رہا تھا۔ بلکہ خصوصی طور پر ممن خان، شاہی، مولوی عبدالجبار، ہدایت علی جیسے تمام افراد بھی انتظامیہ کمیٹی میں شامل تھے۔ سردار پور کی آبادی کے معززین کو مدعو کیا گیا تھا۔

کوٹھی کے ایک حصے میں باورچی لنگر کے لیے دیگیں پکا رہے تھے۔ اور ماحول اس طرح بدل گیا تھا کہ ہر دیکھنے والے کو لطف آئے۔ حویلی کے مکین پہلی بار ایک نئی کیفیت سے روشناس ہو رہے تھے شام جھکنے لگی۔ جگہ جگہ دریاں اور شامیانے بچھا دیے گئے۔ فرشی نشست تھی۔ ایک وسیع و عریض اسٹیج بنایا گیا تھا۔ برقی قمقموں سے کوٹھی جگمگا رہی تھی۔ مہمانوں کے کھانے پینے کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ مغرب کے بعد فاتحہ خوانی شروع ہوئی۔ بہت سے لوگ آ گئے تھے۔ صوفی کی سج دھج قابل دید تھی۔ دانت نکلے پڑ رہے تھے۔ بھاگ بھاگ کر ہر کام کر رہا تھا۔ نئی شیروانی اور پائجامہ اور اس پر دو پلی ٹوپی بہار دے رہی تھی۔ نازی نے فیضان کے کان میں سرگوشی کی۔

"تم نے ہد ہد دیکھا ہے۔"

"ووڈ پیکر۔"

"ویسے تو اس کے کئی نام ہیں۔ اسے نیل کنٹھ بھی کہا جاتا ہے۔ وڈی وڈ پیکر بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن ہد ہد بڑا صحیح نام ہے اور ایک خاص شکل کی نشان دہی کرتا ہے۔"

"کہنا کیا چاہتی ہو۔" فیضان نے کہا۔

"اس شخص کو دیکھ کر ہد ہد کا تصور ذہن میں نہیں ابھرتا۔" نازی نے صوفی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اور فیضان نے بہ مشکل ہنسی روکی پھر مصنوعی غصے میں بولا۔

"وہ میرا باس ہے سمجھیں۔ میرے سامنے اس کی شان میں گستاخی نہ کیا کرو۔" نازی ہنس پڑی اور پھر بولی۔

"ذرا اکڑوں بیٹھو۔"

"کیا مطلب؟"

"جیسے وہ بیٹھا ہے اس طرح بیٹھو" نازی نے اشارہ کیا اور فیضان ہنسی نہ روک سکا۔

"نازی باز آ جاؤ۔"

"خدا کی قسم ہوشیار کر رہی ہوں تمہیں۔ تھوڑے دن اس کی صحبت میں رہے نا تو خود بھی ہد ہد بن جاؤ گے۔"

"یار! مگر ایک بات کہوں۔"

"ہاں بولو۔"

"تمہیں تایا میاں بے وقوف لگتے ہیں۔"

"نہیں بے وقوف نہیں ہیں۔ لیکن بس نہ جانے کیوں وہ اس سے اتنے متاثر ہو گئے ہیں۔"

"اس دن نہیں دیکھا تھا۔ جب اس نے اکھاڑے میں۔"

"بس بس بس وہ تذکرہ مت کیا کرو۔ بڑی شرم آتی ہے ہمیں۔ کسی کو جانوروں کی طرح کھلایا پلایا جائے۔ اور نتیجہ یہ نکلے۔"

"جی نہیں وہ دیواریں توڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن بس ہر اونٹ کے سامنے پہاڑ ہوتا ہے۔"

"تم اس سے بہت متاثر ہو گئے ہو۔"

"بھئی سچی بات یہ ہے کہ اس کے بارے میں جو تفصیلات سنی ہیں وہ تو کچھ ایسی ہی ہیں کہ اس سے متاثر ہونا پڑتا ہے۔ صوفی ان تمام باتوں سے بے نیاز قوالی کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ لنگر ہوا اور لڑکے لڑکیاں عجیب سے انداز میں دیکھنے لگے۔ کھانے پینے والے بڑی نیاز مندی اور عقیدت سے لنگر کھا رہے تھے کسی اور لڑکی نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔

"توبہ توبہ کھانا بھی اسی بے قدری سے کھایا جاتا ہے۔"

"یار! اگر برا نہ مانو تو یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہی بے ترتیبی اور بے قدری انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے۔ ہم نے اپنے آپ پر لاکھوں خول چڑھا لیے ہیں۔ اور اس خول کے اندر بیمار ہو گئے ہیں۔ کیا تم اپنے آپ کو تندرست سمجھتی ہو۔"

"جاؤ جاؤ خود بھی شریک ہو جاؤ انہی میں۔" طنز کرنے والی بولی۔ سننے والا عادل تھا۔ دونوں بھائی اب کرنل رحیم شاہ اور صوفی کے افکار و خیالات کے قائل ہوتے جا رہے تھے۔ پھر محفل سماع کا آغاز ہوا۔

لڑکے لڑکیوں نے منہ میں کپڑے دبا رکھے تھے۔ قوال بھی بے مثال ہوتے ہیں۔ وزن ساڑھے تین سو پونڈ تھوڑا بہت کم ہو جائے تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ پان کی دھڑی ہونٹوں پر جمی ہوئی۔ آنکھوں میں سرمہ، گالوں پر شفق جو سو فی صدی مصنوعی، چمک دمک والے لباس اور اس کے بعد تھل تھلاتے ہوئے جسموں کے ساتھ حلق سے نکلنے والی مدھم آواز نازی پھر بولی۔

''ذرا دیکھو، دیکھو یہ ہاتھی بھی میاؤں میاؤں کر سکتا ہے۔ لگ رہا ہے آواز گلے میں پھنس گئی ہے۔''

''نہ پھنسے تو کیا کرے اتنی موٹی گردن سے کوئی چیز باہر نکل سکتی ہے آسانی کے ساتھ۔ لگتا ہے تربوز میں ہوا بھر دی گئی ہے۔'' نہ جانے کیسے کیسے جملے کہے جاتے رہے۔ قوال اپنی دانست میں قیامت ڈھا رہے تھے محفل میں بہت سوں کو وجد آ رہا تھا۔ کرنل رحیم شاہ تو خیر سنجیدہ آدمی تھا۔ لیکن صوفی پر کیفیت طاری ہو گئی اور وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ خلا میں گردش کر رہے تھے۔

اور اس وقت واقعی ایک ایسا منظر نگاہوں کے سامنے آ گیا تھا کہ اگر لڑکے لڑکیوں کو گھر سے نکال دیے جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ ایک ایک منہ دبا کر باہر بھاگتا تھا اور ہنسی سے فراغت حاصل کر کے واپس آ جاتا تھا۔ بہرحال اسی طرح یہ محفل سماع جاری رہی اور رات کو پانچ ساڑھے پانچ بجے تک ہنگامہ آرائی ہوتی رہی۔ پھر دعا ہوئی قوالوں نے دعا پڑھی۔ صوفی پر مسلسل وجد طاری رہا تھا۔ اور وہ حق اللہ حق اللہ کے نعرے لگاتا رہا تھا۔ اس طرح یہ محفل اختتام پذیر ہوئی۔ لیکن لڑکے لڑکیوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا تھا کہ اس سلسلے کو جاری رہنا چاہئے اور دوسرے دن انہوں نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔

''تایا میاں! یہ محفل سماع صرف ایک دن کی ہوتی ہے کیا۔''

''نہیں عزیزی! ہم اسے تین دن، سات دن، گیارہ دن جاری رکھ سکتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔'' کرنل رحیم شاہ کی بجائے صوفی نے جواب دیا۔

''تو صوفی صاحب! پھر اس کا دورانیہ بڑھائیے۔''

''ایسا کرتے ہیں پیر کلگلے شاہ کا عرس شریف آ رہا ہے۔ ستائیس تاریخ ہوتی ہے ہر سال ستمبر کی۔ آنے والی ہے، سہ روزہ پروگرام ترتیب دے لیتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔ ویسے آپ لوگوں کو تو زحمت ہوتی ہوگی۔''

''درویشوں کی دعاؤں سے بالکل نہیں۔'' جمیل نے جواب دیا۔

''اماں تمہیں قسم سے تو پھر ہو جائے عرس مبارک کا پروگرام۔'' کرنل رحیم شاہ بچوں کی صورت دیکھ رہا تھا اتنا وہ جانتا تھا کہ یہ سارے کے سارے شرارت میں یہ بات کہہ رہے ہیں۔ لیکن اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دیکھو بچو! اگر واقعی تم لوگ بھی اس میں دلچسپی لو تو میں انکار نہیں کروں گا۔ یہ یاد رکھنا۔ اور اس کے بعد سارے انتظامات میں حصہ لینا پڑے گا تمہیں۔''

''ہم دل و جان سے حاضر ہیں چچا میاں۔''

''صوفی صاحب جیسے انسان کا ہاتھ اگر کسی کو حاصل ہو جائے تو کیا نہیں ہو سکتا۔ کیا کہتے ہیں صوفی صاحب!''

''سبحان اللہ۔ جزاک اللہ۔ اللہ تعالیٰ ان بچوں کو درویشوں کو پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے۔''

صوفی نے خشوع و خضوع کے ساتھ کہا۔

♥......♥......♥

بابر جاہ اندر داخل ہو گیا۔ بلند و بالا قد و قامت کا مالک، لمبے چوڑے جسم کا ایک انتہائی کرخت چہرے والا آدمی تھا۔ لیکن بھاوج کے سامنے ہمیشہ گردن خم کیے رہتا تھا۔ اور اس کی ایک وجہ اور بھی تھی وہ یہ کہ خود خانم جس خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ بھی کوئی معمولی خاندان نہیں تھا۔ بہت بڑے لوگ تھے اور بہت بڑے وسائل رکھتے تھے۔ خانم کو اگر کوئی نقصان پہنچ جاتا یا کوئی اور ایسی ویسی بات ہو جاتی تو سنگینہ کی اینٹ سے اینٹ بجائی جا سکتی تھی۔ یہ بات بابر جاہ بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اراشیہ ایک خوب صورت کمبل اوڑھے لیٹی ہوئی تھی۔ بابر جاہ کی آمد کی اطلاع پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ تو بابر جاہ محبت بھرے انداز میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ خانم کچھ فاصلے پر ایک آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ اس نے بھی ایک خوب صورت شال اوڑھ رکھی تھی۔

''کیا بات ہے ہماری بیٹی کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔'' بابر جاہ نے نرم لہجے میں اراشیہ سے کہا۔

''میں بے زار ہو گئی ہوں چچا جان۔ بیزار ہو گئی ہوں میں، اگر میں یہاں سے باہر نہ نکلی تو میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔''

''کیوں باہر نہیں نکلے گی میری بیٹی! تم تیار ہو جاؤ میں تمہیں دارالحکومت بھیج دیتا ہوں۔ سارا انتظام کیے دیتا ہوں وہاں۔ شہر کی پُر رونق زندگی میں تمہارا دل بہل جائے گا۔ ساحل سمندر پر سیر و سیاحت کرنا اور زندگی کو حسین بنا لینا جس کو چاہو تمہارے ساتھ بھیج سکتا ہوں۔''

''نہیں جانا مجھے دارالحکومت، نہیں جانا ساحل سمندر پر میں پہاڑوں کی بیٹی ہوں، میں برف کی بیٹی ہوں۔ میں سفید لومڑیوں کا شکار کھیلنے جاؤں گی۔'' بابر جاہ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔

''موسم بہت اچھا نہیں بیٹا! برف باری کسی بھی وقت ہو سکتی ہے۔ اور سفید لومڑیاں......''

''نہیں نہیں نہیں، بس مما! آپ انتظام کرائیں۔ آپ چچا جان سے کہیں کہ مجھے لومڑیوں کا شکار کھیلنے کے لیے جانے دیں۔'' اراشیہ نے کہا اور پھر چیخ چیخ کر رونے لگی۔ بابر جاہ بوکھلا گیا تھا۔ خانم سنجیدہ انداز میں کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے کہا۔

''بابر جاہ! ذرا کسی کو میرے پاس بھیج دو۔ دلاور کو بھیج دو۔ وہ شکار کا سارا انتظام کرے گا۔'' خانم کا لہجہ حتمی تھا۔ جسے بابر جاہ نے محسوس کر کے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر بولا۔

''ٹھیک ہے دلاور کی کیا ضرورت ہے۔ میں انتظام کیے دیتا ہوں۔ بس ذرا احتیاط کے پیش نگاہ۔''

''نہیں ہم لوگ بزدل چوہے نہیں ہیں احتیاط کر لیں گے۔'' خانم نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے انتظام کر دیا جائے گا۔'' بابر جاہ نے کہا اور پھر آراشیہ کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

''بس بیٹا! اور کچھ بتاؤ۔''

''نہیں چچا جان! آپ بس شکار کا انتظام کر دیجئے۔'' اراشیہ نے بہترین اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

''ہو جائے گا بیٹا! ہو جائے گا۔ دوپہر کے بعد آپ لوگ شکار کے لیے جا سکتی ہیں میں ابھی سارے انتظامات کیے دیتا ہوں۔''

''آپ ذرا بابا ظہوری کو بھیج دیں۔ میں انہیں کچھ ہدایت دینا چاہتی ہوں۔'' خانم نے کہا اور بابر جا
کچھ جواب دیے بغیر باہر نکل گیا۔

خانم کا چہرہ بہ دستور سنجیدہ تھا۔ اراشیہ نے بھی کسی ہلکے پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔ دونوں ماں بیٹیاں ایک
دوسرے کی شکل دیکھنے لگیں۔ اور اس کے بعد اراشیہ نے کہا۔

''ہم اپنی بڑی جیپ میں ہی چلیں گے۔'' خانم نے گردن ہلا دی تھی۔ تین جیپیں سفر کے لیے تیار
تھیں۔ ایک جیپ کے ساتھ ٹرالر بندھا ہوا تھا۔ ٹرالر میں کھانے پینے کا مکمل سامان خیمے اور دوسری ضروریات کی
چیزیں بار کر لی گئی تھیں۔ اس میں چار شکاری موجود تھے۔ دوسری جیپ میں بھی دو شکاری موجود تھے۔ حالانکہ
بابر جاہ نے تیسری جیپ کی مخالفت کی تھی اور کہا تھا۔

''بھابی خانم! یہ دوسری جیپ آپ کے خادموں کی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو بقیہ لوگ بھی اس میں
منتقل ہو سکتے ہیں۔ تیسری جیپ کی ضرورت تو نہیں ہے۔''

''کوئی ہرج نہیں ہے بس میں چاہتی ہوں کہ ذرا تحفظ بھی رہے بچی کے ساتھ۔'' خانم نے کہا۔

''لیکن بھابی خانم!''

''کیوں کیا بات ہے۔ بابر جاہ! کیا تمہیں اخراجات زیادہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ بابا ظہوری
آپ اس کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالیے۔'' خانم نے بوڑھے ڈرائیور سے کہا۔

''ایک لمحے کے لیے بابر جاہ کے چہرے پر اضطراب کے آثار نمودار ہوئے لیکن پھر وہ فوراً نارمل ہو گیا۔

''بابا صاحب! بے شک آپ ایک تجربے کار ڈرائیور ہیں۔ لیکن ذرا احتیاط رکھیے گا۔ برفباری کا
موسم ہے اور پھر برفانی لومڑیاں ہی نہیں۔ کبھی کبھی بھیڑیوں کے غول بھی نمودار ہو جاتے ہیں۔'' جواب میں
بوڑھا ظہوری مسکرا دیا اور بولا۔

''شاہ جی! ہماری زندگی کا تو ایک ایک لمحہ انہی برف زاروں میں گزرا ہے۔ زمین کے ہر کوہان سے
واقفیت ہے ہماری آپ ہم سے یہ بات کہہ رہے ہیں۔''

''ہاں مدبروں کا ایک گروہ ہے پورا۔ جائیے۔'' بابر جاہ نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔ اور اس کے بعد
بابا ظہوری نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ وہ ذرا تند مزاج آدمی تھا۔ تھوڑا سا آگے بڑھ کر بولا۔

''یہ کل کا لونڈا! نہ جانے کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو ہمیں بتاتا ہے کہ ہم احتیاط رکھیں۔ پٹی باندھ
ہماری آنکھوں پر موٹی سی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا دو۔ پھر جہاں جانا ہے بتا دو۔ اور اس کے بعد تماشا دیکھو
یہ اراشیہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی پھر بولی۔

''تماشا تو دوسرے دیکھیں گے نا ظہوری بابا! جیپ میں بیٹھے ہوئے لوگ بھلا تماشا دیکھنے کے قابل
کہاں ہوں گے۔''

''شریر کہیں کی۔'' بوڑھے ظہوری نے مسکراتے ہوئے کہا اور جیپ کی رفتار تیز کر دی۔ باقی دونوں
جیپیں ٹرالر سمیت اس جیپ کے پیچھے آ رہی تھیں۔ سکینہ کی سرحد سے نکلنے کے بعد برفانی راستے شروع ہو گ
اونچے نیچے پہاڑی راستے۔ جن پر چیڑ کے بلند و بالا درخت بہار دے رہے تھے۔ جوں جوں جیپیں آگے بڑھتی

رہی تھیں۔ موسم خراب ہوتا جا رہا تھا۔ آسمان پر بادلوں کے غول تیر رہے تھے اور ایک خنک اور خوش گوار سی فضا
آہستہ آہستہ مسلط ہوتی جا رہی تھی۔ کافی دن کے بعد اراشیہ کو یہ حسین ماحول ملا تھا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

دوپہر کے ڈھائی بجے تک یہ سفر جاری رہا اور اب وہ ایسے علاقے میں تھے جہاں چاروں طرف
برف باری کا برادہ زمین پر بکھرا ہوا تھا۔ اور پہاڑیوں کی شکلیں تبدیل ہو چکی تھیں۔ اُونچے نیچے گول گول ٹیلے
جو برف کے بہت بڑے بڑے گولے نظر آ رہے تھے۔ شاید اس علاقے میں زیادہ برف پڑی تھی کیونکہ سکینہ
میں اتنی برف باری نہیں ہوئی تھی۔ شکاری خانم کے سامنے باادب تھے۔ ڈھائی بجے کے قریب بابا ظہوری نے
گاڑی روک دی۔ اور دونوں جیپیں قریب آ کر رک گئیں۔

''ظاہر ہے ہمیں یہاں چٹانی سائبان نہیں ملیں گے یہیں پر یہ سفر ختم کرنا ہوگا۔ کھانے کی تیاریاں کریں۔''

''کیا حکم ہے خانم۔ کیوں نہ اس جگہ کیمپ لگا لیے جائیں۔''

''ہاں۔ کیا ہرج ہے۔ سفید لومڑیوں کا علاقہ تو شروع ہو چکا ہے۔ میں راستے میں بہت سی
لومڑیاں دیکھ چکی ہوں۔''

''جی خانم!''

''تو پھر کیمپ لگا دو۔''

''اگر پہلے کھانے کی تیاریاں کر لی جائیں ماما تو زیادہ بہتر ہوگا مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے بعد میں خیمہ زنی کر لی جائے گی۔'' فوراً ہی ملازم کھانے کی تیاریوں میں مصروف ہو
گئے۔ اور کچھ دیر بعد ڈبا بند کھانا سپلائی کر دیا گیا۔ کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد کیمپ لگانے کا کاروبار
شروع ہو گیا۔ سفید لومڑیاں رات ہی میں شکار کی جاتی ہیں۔

لیکن موسم ذرا تعاون نہیں کر رہا تھا۔ بادل بار بار آسمان کو ڈھک لیا کرتے تھے۔ ظہوری نے کہا۔

''اگر رات کو بھی یہی سب کچھ رہا تو پھر شکار مشکل ہو جائے گا۔ چونکہ آسمان پر جب چاند نکلتا ہے
لومڑیاں باہر آتی ہیں۔ ورنہ وہ بھی کہیں کونوں کھدروں میں جا کر چھپ جاتی ہیں۔'' کسی نے اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں
کیا تھا۔ بڑے بڑے مضبوط خیمے لگ گئے۔ اور ان پر خاص قسم کی فوم بچھا دی گئی۔ برف کو ہموار کر دیا گیا تھا۔ اس فوم
سے برف کی نمی اوپر تک نہیں آنے پاتی تھی۔ پوسٹر فوم تھی۔ جو برف کو پگھلنے بھی نہیں دیتی تھی۔ یہ خاص قسم کے
انتظامات برف باری کے موسم میں کر لیے جاتے تھے۔

بہر حال برف میں زندگی گزارنے والے اس سے بہت زیادہ متاثر بھی نہیں ہوتے تھے اراشیہ اپنے خیمے
سے باہر نکل آئی اور باہر کے موسم سے لطف اندروز ہونے لگی۔ وہ اس خواب ناک ماحول کا جائزہ لے رہی تھی اور نہ
جانے اس کے ذہن میں کیسے کیسے خیالات آ رہے تھے۔ زندگی میں اس نے بہت کچھ دیکھا تھا اور بہت کچھ نہیں دیکھا
تھا۔ باپ کی غیر موجودگی نے دل کو ایک عجیب سی اداسی بخش دی تھی۔ ہنستے ہنستے رو پڑنے کو دل چاہتا تھا۔

بہت دیر تک وہ ان تمام باتوں پر غور کرتی رہی۔ خانم فردوسیہ محب وطن تھی اور وہ اسی کی اولاد تھی۔ حقیقتاً
بڑی آسائشوں میں وقت گزر سکتا تھا۔ دنیا کے جھگڑوں سے دور زندگی کی تمام تر لطافتوں کے ساتھ لیکن وطن پرستی کے
جذبے وجود پر حاوی تھے۔ وطن کو برے لوگوں کے ہاتھوں میں نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں دونوں ماں بیٹیاں، اور اسی کے

لیے تگ ودو کر رہی تھیں۔ مرحلے طے ہوتے رہے کھانے وغیرہ سے فراغت حاصل کر لی گئی۔ موسم بدستور اپنے
دکھا رہا تھا۔ بڑے شکاری نے پاس آ کر کہا۔

''معزز خانم! موسم تو بے حد خراب ہے۔ میں ایک بار پھر آپ کی توجہ اس کی جانب دلانا
ہوں۔ کیا اس موسم میں لومڑیوں کے شکار کے لیے برف کے ویرانوں میں نکلنا مناسب ہوگا۔''

''تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے کیا موسم ہماری مرضی کے مطابق ہو سکتا ہے۔
تین دن تک یہی موسم رہا تو ہم شکار کھیلے بغیر یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ اس کے بعد فضول باتوں
گریز کرو۔ ہاں۔ میں کسی کو اس کی مرضی کے خلاف عمل کرنے پر مجبور نہیں کرتی۔ تم اگر چاہو تو یہاں آرام
سکتے ہو۔ ہم لوگ اپنا شوق پورا کر لیں گے۔ تم جانتے ہو میں حکیم جاہ کی بیوی ہوں اور حکیم جاہ جس طرح
کے تھے۔ اس کا بھی تمہیں اچھی طرح اندازہ ہوگا۔''

''نہیں خانم! ہم اپنے لیے نہیں آپ کے لیے متفکر ہیں آپ اگر اس موسم میں بھی شکار کے
نکلنا چاہتی ہیں تو بھلا ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''

''مختصر تیاریاں کرو۔ یہ بعد کی بات ہے کہ ہم کتنی دیر شکار کھیلیں گے پھر جب رات کا آغاز ہو
تو دو جیپیں چل پڑیں ایک میں خانم، اراشیہ، ظہوری کے ساتھ تھے دوسری میں چار شکاری موجود تھے۔ باقی
وہیں کیمپ پر چھوڑ دیا گیا تھا کیمپ کے ایک سرے پر تیز روشنیاں جلا دی گئی تھیں مخصوص طرح کی روشنیاں
شدید دھند اور برف باری میں بھی دور سے نظر آ جائیں۔ اور اس کے بعد یہ دونوں جیپیں آگے پیچھے
پڑیں۔ آگے کا موسم اور بھی خوفناک تھا۔ خوف ناک آوازوں کے ساتھ تیز ہوائیں چل پڑی تھیں۔

اور پھر رفتہ رفتہ برف کی دھند آسمان سے زمین پر اترنے لگی شکاریوں کے حوصلے پست ہونے
رہے تھے۔ لیکن خانم ظہوری کو ہدایت دے رہی تھی۔

''ہمیں بائیں سمت اس طرح کٹنا ہے ظہوری کہ کسی کو احساس نہ ہو سکے۔''

''آپ بالکل بے فکر رہیں خانم!'' کوئی پینتیس منٹ تک دھند میں یہ سفر جاری رہا خانم
اراشیہ سے کہا۔

''گولی چلاؤ۔'' اراشیہ نے رائفل سنبھال کر لگاتار تین فائر کیے اور اس کے بعد خانم کی آواز ابھری

''ظہوری! بائیں طرف تمہیں تھوڑے ہی فاصلے پر جا کر سڑک مل جائے گی۔'' ظہوری نے
جیپ کا رخ کاٹ دیا۔ اراشیہ نے ایک بار پھر فائرنگ کی اور یہ ظاہر کیا کہ جیپ سامنے کی سمت ہی جا رہی ہے
لیکن ظہوری نے فوراً ہی جیپ کا رخ تبدیل کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے جیپ کی لائٹیں بجھا دیں
گھپ اندھیرے میں جیپ آگے سفر کرنے لگی۔ صرف برف کی سفیدی چمک رہی تھی۔ ورنہ موسم شدید دھند
شکار تھا۔ ظہوری حالانکہ خاصا عمر رسیدہ تھا۔ لیکن اس کی ڈرائیونگ بے مثال تھی۔ برف پر انتہائی تیز رفتاری
ساتھ جیپ کا یہ سفر جاری تھا۔ اور خانم ماحول پر نگاہیں جمائے ظہوری کو مسلسل ہدایت دے رہی تھی۔

یہاں تک کہ ظہوری نے جیپ کو سڑک پر چڑھا دیا اور اس کے بعد وہ طوفانی انداز اختیار کر گئی
انتہائی تیز رفتاری سے سڑک پر پہنچی تھی اور اتنی ہی تیز رفتاری سے اس نے آگے کا سفر شروع کر دیا تھا

روشنیاں اب بھی بجھی ہوئی تھیں۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے۔ بہتر موسم ملنے لگا۔

دھند کا وہ خوف ناک علاقہ پیچھے رہ گیا تھا۔ سڑکوں پر بھی برف تھی۔ لینڈ سلائڈنگ ہو رہی تھی۔
لیکن ظہوری اس قدر مشاق ڈرائیور تھا کہ اس کو لاکھوں میں ایک کہا جا سکتا تھا۔ یہ طوفانی سفر بڑا ہیجان خیز تھا۔
لیکن ظہوری کا حوصلہ پست نہیں ہوا تھا۔ اور سفر بدستور جاری تھا۔ نہ جانے کتنی دیر گزری تھی کہ مدھم مدھم
روشنیاں نظر آنے لگیں اور خانم کے حلق سے ایک خوشی کی چیخ نکل گئی۔

''اراشیہ! ہم سردار پور پہنچ چکے ہیں کیوں بابا ظہوری!''

''ہاں خانم! ہم سردار پور میں داخل ہونے ہی والے ہیں۔'' ظہوری نے رفتار مزید تیز کر دی اور
پھر روشنیاں قریب آتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ وہ ایک حویلی پر جا کر رک گئے جو رات کے سناٹے میں ڈوبی
ہوئی تھی۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد گیٹ کے چوکیدار نے دروازہ کھولا اور خانم کی جیپ حویلی کے اندر داخل ہو گئی۔

♥......♥......♥

کرنل رحیم شاہ نے رات کے اس وقت بھی اپنے ڈرائنگ روم میں خانم فردوسیہ کا استقبال کیا
تھا۔ خانم فردوسیہ نے کہا۔

''کرنل صاحب! میں جانتی ہوں کہ اس وقت مجھ سے زیادہ غیر مہذب انسان شاید ہی کوئی ہوگا۔
لیکن مجبوریاں انسان سے تہذیب کا ہر انداز چھین لیتی ہیں۔ اس وقت آنا میری اتنی ہی بڑی مجبوری تھی۔''

''حکیم جاہ کے میرے ساتھ جس طرح کے مراسم تھے بھابی! آپ کو اس کا علم ہے۔ اس کے بعد
یہ الفاظ کہہ کر آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔'' کرنل رحیم شاہ نے ماں بیٹی کے لیے کافی وغیرہ منگوائی۔ اور بولا۔

''اس طرح کے مہمان میرے لیے انتہائی خوش گوار ہوتے ہیں اور خدا کرے آپ جس مقصد کے
لیے آئی ہیں۔ میں اس کی تکمیل کر سکوں۔ مجھے دلی مسرت ہوگی۔ براہ کرم کافی لیجیے اور بیٹے یہ کچھ فروٹ وغیرہ
لیں۔'' کرنل نے اراشیہ کی طرف رخ کر کے کہا۔

''شکریہ انکل! میں تو ان تعلقات اور رشتوں کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ جو آپ لوگوں کے
درمیان ہوا کرتے تھے۔ کتنی بڑائی ہے ان رشتوں میں۔'' اراشیہ نے کہا اور کرنل ایک مغموم سانس لے کر
مسکرانے لگا۔ کافی کا دور چلا خانم فردوسیہ نے کہا۔

''مجھے راتوں رات واپس جانا ہے۔ اس لیے میں آپ کا زیادہ وقت برباد نہیں کروں گی۔''

''کیسی بات کرتی ہیں آپ۔ راتوں رات آپ سکینہ جائیں گی۔''

''ہاں۔ جو تفصیل میں آپ کو بتاؤں گی اس کے بعد آپ کو اس پر حیرت نہ رہے گی۔ اصل میں کرنل
رحیم شاہ صاحب! حکیم جاہ کی موت کے بعد ہم پر بے بسی کا دور شروع ہو گیا۔ جیسا کہ ہونا چاہئے گو میرا خاندان
بھی خاصی وسعتوں کا حامل ہے۔ لیکن ہماری روایات ہیں کہ جب بیٹیاں ماں باپ کا گھر چھوڑ دیتی ہیں تو
سسرال ان کی عبادت گاہ بن جاتی ہے اور عبادت گاہوں کا تقدس دنیا کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ میں
چاہتی تو اپنا گھر چھوڑ سکتی تھی چونکہ میرا سربراہ میرے سر پر نہیں رہا تھا۔ مجھ پر کوئی ذمے داری عائد نہیں ہوتی

تھی۔ لیکن سکینہ حکیم جاہ کی سلطنت تھی۔ اور زندگی میں اسے چھوڑنے کا مطلب یہ تھا کہ حکیم جاہ کو نظر اند
دیا جائے۔ جو میں نے نہیں کیا۔ سکینہ میں ویسے تو اور بہت سے عوامل تھے لیکن آج میں کھلی زبان سے یہ
کہہ سکتی ہوں۔ کہ ایک بہت ہی بری شخصیت حکیم جاہ کے چھوٹے بھائی بابر جاہ کی شکل میں وہاں موجود ہ
سسرال کی ایک ایک اینٹ سے محبت کے باوجود بابر جاہ کی شکل میں وہاں موجود ہے۔ سسرال کی ایک ا
اینٹ سے محبت کے باوجود بابر جاہ میرے لیے قابل محبت نہیں ہے کیونکہ وہ میرے وطن کا دشمن ہے۔ کیونک
کے روابط دشمنوں سے ہیں۔ وطن دشمنوں سے۔''

کرنل رحیم شاہ چونک پڑا تھا۔

''آپ کا مطلب ہے سرحد پار کے دشمنوں۔''

''ہاں۔ ہماری سرحدیں جہاں جہاں دشمن ملک سے ملتی ہیں وہاں ہمیں کسی نہ کسی دکھ کا سامنا
پڑتا ہے۔ بس مزاج ہے اس دشمن کا جو امن سے نہیں رہنا چاہتا۔ تو میں عرض کر رہی تھی کہ بابر جاہ کی مشکو
حرکتیں پہلے بھی حکیم جاہ کے لیے تشویش ناک تھیں اور انہوں نے کئی بار مجھ سے اس کا تذکرہ کیا تھا۔ اس وق
جب وہ پریشان رہا کرتے تھے۔ آج میں یہ بات آپ کے سامنے کھلی زبان سے کہہ سکتی ہوں کہ یقیناً میر
شوہر کا حادثہ اتفاقیہ نہیں تھا۔ انہیں قتل کیا گیا تھا۔ کھلی زبان سے کوئی بات کہہ دینا دانش مندی نہیں سمجھی جاتی
ثبوت کے صرف آپ کے سامنے یہ الفاظ دہرا رہی ہوں کہ میرے شوہر کے قتل میں بابر جاہ کا ہی ہاتھ ہے کی
میرے شوہر اس وطن دشمن سرگرمیوں میں رکاوٹ بن رہے تھے۔ حکیم جاہ کی موت کے بعد بابر جاہ نے ہا
پاؤں نکال لیے اور مزید کام شروع کر دیے میرے خلاف وہ بڑی سازش اس لیے نہیں کر سکا کہ بہر حال ا
میرے خاندان کا خوف تھا لیکن میں نے اس کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھی ہے اور وہ بھی میری طرف سے محتاط
ہے۔ کرنل صاحب! میں اگر چاہتی تو شہری آبادیوں میں اپنی بیٹی کے لیے جگہ بنا سکتی تھی۔ لیکن ایک محب و
ہونے کی حیثیت سے میں اور میری بیٹی دونوں وطن کی بہتری اور بقا کے لیے اپنی زندگیاں قربان کرنے کو
ہیں۔ ہم نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا کہ ہم سکینہ نہیں چھوڑیں گے۔ اور چھوڑیں گے بھی تو اس شکل میں
بابر جاہ کی وطن دشمنی کامیاب نہیں ہونے دیں گے اور اس کے خلاف کوئی بھرپور عمل کر کے ان سرحدوں کو محفو
بنائیں گے۔ اور اس کے لیے ہم اب باعمل ہو گئے ہیں۔ خوش نصیبی سے مجھے حکیم جاہ کی کچھ باتیں یاد آ گئیں
جن میں انہوں نے آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وطن کو آپ جیسے لوگوں پر فخر ہے۔ ناز ہے کیونکہ آ
اپنی زندگی وطن کے لیے وقف کر چکے ہیں۔ حکیم جاہ نے آپ کے بار میں مجھے ساری تفصیل بتائی تھی
ویسے بھی میرے آپ سے ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ چنانچہ میرے ذہن نے یہ فیصلہ کیا کہ میں سردار پور کا ر
کروں اور آپ کو ساری صورت حال بتاؤں۔''

رحیم شاہ عقیدت بھری نگاہوں سے خانم فردوسیہ کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

''خانم! آپ جیسی عورتیں اگر ملکوں کی تاریخ میں نہ ہوں۔ تو سچی بات یہ ہے کہ ملکوں کی تاریخیں ادھو
رہ جائیں۔ محب وطن عورتوں کو بہت بڑا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے منصب اور اپنے معیار سے ہٹ کر کا
کرتی ہیں۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ جو کچھ آپ نے مجھے بتایا ہے اس کے بعد اس بات کا سوال ہی نہیں پیدا

کہ میں آنکھیں بند کیے رکھوں۔

میں فوراً ہی ایک ٹیم سکینہ روانہ کرتا ہوں۔ جو آپ سے رابطے میں رہے گی۔'' کرنل رحیم شاہ نے ایک
چھوٹا سا ٹرانسمیٹر نکالا اور اسے خانم کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''اسے آپ اپنے پاس رکھیے اراشیہ بیٹے! میں آپ کو اس کے استعمال کا طریقہ بتائے دیتا ہوں۔ اس
ٹرانسمیٹر پر ہماری ٹیم کے افراد آپ سے رابطہ رکھیں گے اور اطمینان رکھیے یہ ٹرانسمیٹر خاص طور پر بنوا کر منگوائے گئے
ہیں ان کی فریکوئنسی کسی دوسرے ٹرانسمیٹر پر ٹریس آؤٹ نہیں کی جا سکتی۔ اس کے استعمال کا طریقہ سیکھ لیجیے۔
خانم! آپ مجھے یہ بتائیے کہ آپ فوراً ہی کیوں واپس جانا چاہتی ہیں۔ مجھے دارالحکومت سے اپنے ایک دست
راست کو بلانا ہوگا۔ وہی اپنی ٹیم کے ساتھ سکینہ پہنچیں گے۔''

''میں آپ کو اپنے یہاں آنے کا طریقہ بتا دوں۔'' خانم نے کہا اور پوری تفصیل کرنل کو بتا دی۔

''ہاں پھر تو آپ کا واپس جانا ضروری ہے۔''

''صبح سے پہلے مجھے وہاں پہنچنا ہے۔'' خانم نے کہا۔

''ٹھیک ہے اس ٹرانسمیٹر پر میں بھی آپ سے رابطہ قائم رکھوں گا آئیے آپ کو واپس چھوڑ دوں۔
حالانکہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں آپ کو سکینہ تک اپنے ساتھ لیے جاؤں۔ لیکن احتیاط کے پیش نگاہ......''

''نہیں ہم دونوں ماں بیٹیاں پوری طرح پر اعتماد ہیں۔ ہمیں تو صرف اس بات کی خوشی ہے کہ جو
کچھ ہم چاہتے تھے۔ اس کی تکمیل ہو گئی۔''

''ٹرانسمیٹر سنبھال کر رکھیے گا۔'' کرنل نے کہا اور پھر وہ سردار پور کی آخری سرحدوں تک اپنی
گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ آیا تھا اور سرحدوں سے باہر اس نے خانم فردوسیہ کو خدا حافظ کہا تھا۔ خانم فردوسیہ
بہت خوش تھی۔ اراشیہ بھی مسرور نظر آ رہی تھی۔ ظہوری محتاط انداز میں ڈرائیونگ کرنے لگا۔ وہ ایک قابل اعتماد
آدمی تھا اور اس سے ان لوگوں کو کوئی خدشہ نہیں تھا۔ خانم نے ظہوری کو حکم دیا۔

''ظہوری! اب تم کسی تیر کی طرح سکینہ کے نواحی علاقوں میں پہنچو ہمیں صبح کی روشنی وہیں پر ملنی چاہئے۔''

''آپ مطمئن رہیں خانم! آپ کا غلام پوری طرح مستعد ہے۔''

''خدا تمہیں ہمیشہ مستعد رکھے۔ ہمارے لیے تو تم ایک نعمت ہو۔'' خانم نے کہا۔ اراشیہ کہنے لگی۔

''کرنل رحیم شاہ! ایک پاؤں سے معذور ہیں۔ لیکن کس قدر مطمئن اور پر اعتماد نظر آتے ہیں۔ یہ تو
بہت اچھی بات ہے۔''

''جس شخص کی تعریف کے پل حکیم جاہ باندھتے تھے۔ وہ کوئی معمولی شخصیت تو نہیں ہو سکتی۔ تمہیں
اپنے بابا کے بارے میں معلوم ہے۔ خود بھی محتاط آدمی تھے اور دوسروں کے معاملے میں مکمل طور پر محتاط رہا
کرتے تھے۔''

''ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔'' اراشیہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ظہوری آندھی اور طوفان کی
رفتار سے جیپ دوڑا رہا تھا۔ خاصا فاصلہ تھا۔ لیکن ظہوری نے جو رفتار سڑک پر اختیار کی تھی۔ اس کی وجہ سے
انہوں نے یہ فاصلہ وقت سے بہت پہلے طے کر لیا۔ ہاں جب وہ بڑی سڑک سے اس راستے پر اترے جہاں

سے انہیں برفانی علاقوں کا سفر طے کرنا تھا۔تو جیپ کی رفتار خود بہ خود آہستہ ہوتی چلی گئی اور آگے انہیں پہلے سے زیادہ خراب ملا۔اراشیہ! بڑے دلچسپ انداز میں اس برفانی موسم کو دیکھ رہی تھی۔

نہ جانے کیوں پہاڑی علاقوں میں رہنے کے باوجود اسے اس موسم سے اکتاہٹ نہیں ہوئی تھی جب کہ ایسی آبادیوں میں رہنے والے اس موسم کو ایک خراب موسم کہتے ہیں۔وقت تیزی سے اپنا سفر طے کر رہا۔برف باری اور برف کی دھند کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو۔روشنی اپنا معیار ختم نہیں کرتی۔چنانچہ صبح کے مدھم اجالے برف کی چادر کو روشن کرنے لگے۔اور جب روشنی پوری طرح پھیل گئی تو بابا ظہوری نے جیپ ایک ایسی جگہ آڑ میں روک دیا۔جہاں برفباری سے تھوڑی سے حفاظت کی جاسکتی تھی۔اور مزید روشنی پھیلی تو ظہوری نے جیپ کے ہارن بجانا شروع کردیے یہ ان شکاریوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کے ساتھ آئے تھے۔اور نتیجہ بہتر نکلا۔یقینی طور پر شکاری بھی ساری رات انہیں تلاش کرتے رہے ہوں گے۔کسی قدر بہتر موسم میں انہوں نے آخر کار خانم فردوسیہ کی جیپ کو تلاش کرلیا۔اور تھوڑی دیر کے بعد یہ دونوں جیپیں انہیں اپنی طرف آتی نظر آئیں۔اراشیہ نے کہا۔

”یہ دوسری جیپ بھی آگئی۔ہمارے ساتھ تو ایک ہی جیپ آئی تھی۔“

”ظاہر ہے وہ خوف ناک موسم میں ہمیں تلاش کرتے پھرے ہوں گے۔ان کا خیال ہوگا کہ کہیں ہم بھیڑیوں کا شکار نہ بن گئے ہوں۔ظہوری نے جواب دیا۔

”اب ہمیں اسی طرح کا اظہار کرنا ہے۔جیسے ساری رات ہم نے سخت وحشت کے عالم میں گزاری ہے۔“ پوری رات جاگتے رہنے کی وجہ سے حلیے تو پہلے ہی خراب ہو رہے تھے۔چنانچہ جب شکاری ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے انہیں نڈھال پایا۔میر شکری نے کہا۔

”خدا کا شکر ہے خانم! آپ ہمیں زندہ سلامت مل گئیں۔ہمیں افسوس ہے خراب موسم کی بنا پر ہم بھٹک کر اس طرف نکل آئے خوشی کی بات تو یہ ہے کہ تم نے ہمیں پالیا ایک بات بتاؤ۔کیا ہم کسی بہت دور کے راستے پر آگئے ہیں۔“

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔“

”تب تو بابا ظہوری ٹھیک ہی کہتے تھے۔“

”اب کیا حکم ہے خانم!“

”نہیں اندازہ یہ ہو رہا ہے کہ یہ موسم شکار کے لیے مناسب نہیں ہے ہم واپس چلیں گے۔“ خانم نے کہا۔

”یہی بہتر ہے خانم۔“ میر شکاری بولا۔

♥......♥......♥

کرنل رحیم شاہ کو ہر طرح کے اختیارات حاصل ہو گئے تھے۔ڈیفنس منسٹری سے ایک خفیہ اجازت نامہ جاری ہوا تھا۔جو سرحدوں پر تعینات فورسز کے لیے تھا۔اس اجازت نامے کے تحت اس خصوصی ایجنسی گرین فورس کو اختیارات دیے گئے تھے کہ وہ سرحد کے قریب قریب ہر طرح کی کارروائی کرسکتی ہے اور اس

ضرورت کے مطابق مکمل تعاون کیا جائے۔اگر کہیں چیکنگ ہو جائے تو اس اجازت نامے کی رو سے کسی طرح کا کوئی عمل نہ کیا جائے۔وہ جیپ جو کرنل رحیم شاہ نے ہی صوفی کو فراہم کی تھی اپنی مثال آپ تھی اور یہ حقیقت ہے۔کہ بس یوں لگتا تھا جیسے یہ واحد جیپ بنائی گئی ہو۔نہ جانے کون سے ملک کی بنائی ہوئی تھی۔خاصی لمبی اور انتہائی بے تکی بس یوں لگتا تھا جیسے لوگوں نے آپس میں مل کر اس کی باڈی بنا ڈالی ہو۔ضرورت سے زیادہ اونچی تھی اور نچلی تہ میں ڈبل خانہ تھا جو اندر سے ہی کھلتا تھا۔جو ڈیش بورڈ کے پاس سے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ورنہ اگر اس کا سپاٹ حصہ دیکھا جاتا تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ کسی ڈھکن کی طرح اٹھ بھی سکتا ہے۔انتہائی مضبوط اور خاص طور سے برفانی علاقوں میں استعمال کیے جانے والے ٹائر۔ایک حصے میں پرانی طرز کی جگہ جگہ سے سلائی کی ہوئی چھولداری جن کی تعداد کئی تھی۔کھانے پینے کا سامان، فالتو پٹرول اور نہ جانے کیا کیا الم غلم صوفی کو تو خیر اس طرح کی چیزوں سے عشق تھا۔اس کی مشہور زمانہ موٹر سائیکل ہی کیا کم تھی کہ جیپ اسے فراہم کی گئی تھی اور صوفی کی باچھیں کھل گئیں تھیں۔

”تمام تر تیاریوں کے بعد گرین فورس سکینہ کی جانب چل پڑی تھی۔یہ علاقے بے شک سرحدی علاقہ تھا۔لیکن آبادیوں کے آس پاس کے تھوڑے بہت حصے ہی ریاستوں کی ملکیت قرار دیے گئے تھے۔ورنہ باقی سب علاقے تو آزاد تھے۔تاہم یہاں سرداروں کی مداخلت اکثر ہو جایا کرتی تھی۔اور بعض جگہ فوجی جھڑپیں بھی ہو جاتی تھیں۔صوفی کو ہر طرح کی اجازت دے دی گئی تھی۔خانم فردوسیہ کے بارے میں کرنل رحیم شاہ نے اسے مکمل طور پر بتا دیا تھا۔اور صوفی نے پرمسرت لہجے میں کہا تھا۔

”بہ خدا۔ہمیں ایسی محب وطن خاتون کے لیے کچھ کرکے دلی مسرت ہوگی۔آپ مطمئن رہیں جناب من! ہم ان کی بھرپور مدد کریں گے۔““ گرین فورس کے تقریباً تمام ہی افراد اس مہم پر چل پڑے تھے۔ عادل اور فیضان کو ذرا نمایاں حیثیت حاصل تھی۔شازیہ کو ایک مخصوص حیثیت دی گئی تھی۔اور ایک پوری کہانی ترتیب دے لی گئی تھی۔جس کے تحت سوئٹزر لینڈ سے آنے والی یہ مقامی دوشیزہ وطن عزیز کی سیر کر رہی تھی۔ سیر و شکار اور سیاحت اس کا محبوب مشغلہ تھا۔بچپن سوئٹزر لینڈ میں گزارا تھا۔جوان ہو کر کچھ عرصے کے لیے وطن آئی تھی اپنے دو سیکریٹریوں کے ساتھ جو عادل اور فیضان تھے۔اور دو مقامی آدمی انہوں نے ساتھ لیے تھے جس میں ایک غلام قادر اور دوسرا دلاور تھا۔

یہ کہانی ان لوگوں کے لیے ترتیب دی گئی تھی۔جو اگر اتفاقیہ طور پر ان کا راستہ روکیں تو انہیں مطمئن کردیا جائے۔شازیہ ذہنی طور پر ایڈونچر پسند تھی۔اگر نہ ہوتی تو جو زندگی اس نے گزاری تھی۔وہ نہ گزار سکتی۔ چنانچہ یہ کام اس کی پسند کے مطابق تھا۔اور وہ اس سے بہت خوش تھی۔چنانچہ یہ سارے معاملات بڑی خوش اسلوبی سے طے پا گئے تھے۔لیکن سب سے دلچسپ شخصیت صوفی ہی کی تھی۔حیرت انگیز طور پر وہ چاق و چوبند اور خوش مزاج نظر آرہا تھا۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس نے جینز اور جیکٹ پہننا قبول کرلیا تھا۔اپنی اس تبدیلی کی وجہ اس نے اپنے ساتھیوں کو بتاتے ہوئے کہا۔

”اصل میں صرف سوچ کا فرق ہے بلاشک وشبہ مجھے انگریزوں کی تقلید بالکل ناپسند ہے۔اب

آپ ذرا غور فرمائیے۔ ازار بند کی جگہ یہ چمڑے کی پٹی جس کے بارے میں درویش رحم کریں عجیب وغ
خیالات ذہن میں آتے ہیں۔ اور اس کے بعد سامنے کے حصے کے کٹاؤ۔

''لیکن صوفی صاحب! آپ نے اس وقت یہ چست پتلون کیوں پہن لی۔''

''عزیزم! یہ کہنا چاہیے کہ ضرورت ایجاد کی امی ہوتی ہیں۔''

''ایجاد کی امی۔''

''ہاں۔ مہذب والدائیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے کہا اور ایک اجتماعی قہ
لیکن صوفی ان سے بے نیاز کہنے لگا۔

''آپ کو زمانہ قدیم کی برجس کے بارے میں پتا ہے۔''

''برجس، زمانہ جدید کے بارے میں یہاں نہیں پتا کہاں ہوگی اور کیا کر رہی ہوگی۔''

''نہیں برادرم! یہی تو تم لوگوں کی غلط فہمی ہے۔ تم نے انگریز شکاریوں کو برجس پہنے ہوئے نہیں
رانوں کے پاس سے پھولی ہوئی پتلون اور پنڈلیوں پر چست۔''

''ارے ہاں ہاں۔ ہم نے فلموں میں ایسے ڈریس دیکھے ہیں۔ راجاؤں، مہاراجاؤں او
وغیرہ کے اردلی ایسے لباس پہنتے تھے۔''

''ناقص معلومات ہیں آپ کی درویشوں کی دعاؤں سے اردلی نہیں بلکہ راجے مہاراجاؤں کا
لباس تھا یہ۔ تو ہم نے بھی آنکھیں بند کر کے یہی تمام سوچ کر قبول کر لیا۔''

''اور اوپری لباس کے بارے میں کیا خیال ہے یہ جیکٹ۔'' ہماری شیروانی پھاڑ دی گئی
درویشوں کی دعاؤں سے۔'' شازیہ تو ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی تھی۔ صوفی پر اطمینان انداز میں چا
طرف بکھری ہوئی برف کی چادر کو دیکھ رہا تھا۔ فیضان ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ دلاور اور غلام قادر اس کے
بیٹھے ہوئے تھے۔ پچھلے حصے میں صوفی، شازیہ اور عادل موجود تھے اور یہ باتیں ہو رہی تھیں اچانک ہی
ڈرائیونگ کرتے کرتے چونک کر بولا۔

''ارے صوفی صاحب! ایک مسئلہ تو رہ ہی گیا۔''

''کیا۔''

''آپ کو تازہ پان تو یہیں مل سکیں گے ان برف زاروں میں یا فرض کیجیے کسی آبادی میں پہنچ بھی
ہم تو اب وہاں آپ کی طرح تو صاحب ذوق لوگ موجود نہیں ہیں۔'' جواب میں صوفی کی باچھیں کھل گئی تھیں

''ایک بار پھر عرض کریں گے کہ ضرورت ایجاد کی امی ہوتی ہے۔ غلام قادر بتائیے ان حضرات کو

''ارے ماں قسم! ان لوگوں نے گٹکا کدھر کھایا ہوگا۔'' غلام قادر نے کہا۔

''گٹکا۔'' عادل چونک کر بولا۔

''نی اور کیا؟ ابھی صوفی صاحب ان لوگوں کو گٹکا دکھاؤ۔''

''یہ لوگ اس قدر صاحب ذوق نہیں ہیں ویسے تمہارے منہ سے آنے والی خوشبو بتا رہی ہے
نے بھی گٹکا استعمال کیا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''نی آپ سہی بولا باس! ہم بہت پہلے سے گٹکا کھاتا چلا آیا ہے۔ اور ہم نے جس دکان سے آپ
کے لیے گٹکا بنوایا ہے۔ اڑے فنٹوش ہے فنٹوش سچ بولتا ہے آپ کو۔ صوفی صاحب! اس سالے کا گٹکا
پورے شہر میں مشہور ہے۔''

''مگر یہ گٹکا ہے کیا چیز؟''

''وہ تمام لوازمات مرکب کر دیے جاتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے اور انہیں خمیرہ گل قند میں
شمولیت دے کر ان کا قوام تیار کر لیا جاتا ہے مع چھالیا کے آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ کہ یہ گٹکا کتنا قیمتی ہوتا ہے۔
پان بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔''

''ذرا دکھائیے تو سہی۔''

''صرف دکھایا جا سکتا ہے کیونکہ آپ لوگ ناقدرے ہیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی
نے کہا اور پھر اس نے ایک عجیب وغریب چیز ایک مخصوص قسم کی ڈبیا سے نکال کر دکھائی۔ کوئی معجون معلوم ہوتی
تھی۔ لیکن اس سے خوشبوؤں کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

''چکھائیے نا تھوڑا سا۔'' شازیہ بے تکلفی سے بولی۔

''شہزادی صاحبہ! آپ کے دانت خراب ہو جائیں گے درویشوں کی دعاؤں سے آپ سوئٹزر لینڈ
سے آئی ہیں۔ آپ کے منہ سے تو بھیڑوں کی خوشبو آنی چاہیے۔ درویشوں کی کرم سے۔'' شازیہ نے تھوڑا سا
گٹکا اچک ہی لیا تھا۔ پھر تھوڑا تھوڑا سا سبھی کو چکھانا پڑا۔ کچھ نے تھو تھو کیا۔ لیکن غلام قادر اور دلاور نے بڑے
شوق سے اسے کھا لیا تھا۔ شازیہ منہ سے سی سی کی آوازیں نکالتے ہوئے بولی۔

''جو کچھ بھی ہو کم از کم خوشبو بہت اعلا ہے۔ زبان جل گئی۔'' یہ دلچسپ سفر سنگینہ کے ان ویران
برف زاروں کی جانب تھا۔ جن کے بارے میں ایک سنگین رپورٹ تھی ان کے پاس۔

♥......♥......♥

برفانی علاقوں میں موسم کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دھوپ تو خیر ان علاقوں میں کم ہی نکلتی
تھی۔ سورج بے شک آسمان کا سفر طے کرتا ہے۔ لیکن بادلوں کے غلاف میں لپٹا ہوا اور پھر اگر برف باری کا
موسم ہو تب تو کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا۔ بابر جاہ جب سنگینہ سے باہر نکلا تھا تو چمک دار اور روشن دن پھیلا ہوا
تھا۔ اس کے تین خاص ساتھی اس کے ساتھ تھے۔ جس علاقے میں اسے جانا تھا۔ وہاں بھی موسم شفاف ہی
ہوتا تھا۔ لیکن جب وہ اس علاقے میں پہنچا تو موسم ایک دم دھندلا گیا۔ اور ایسا لگا جیسے اچانک ہی طوفان آنے
والا ہو۔ بابا زمان نے پریشانی سے پہاڑوں کی ان چوٹیوں کی جانب دیکھا۔ جن کے درمیان ایک چھوٹا سا درہ
دور سے نظر آتا تھا۔ اس درے کو برف کی دیوار ڈھک لیا کرتی تھی۔ لیکن یہ دیوار بہت پتلی ہوتی تھی۔ اور ذرا
سی کوشش سے توڑی جا سکتی تھی۔ ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ فضائی جائزے سے اس درے کا پتا نہیں چلایا جا سکتا تھا۔
اور زمینی راستہ اس قدر خطرناک تھا کہ اس طرف سرحدی چوکیاں بنانے کی کوشش کی گئی۔ سنگین حادثات ہوئے
اور آخر کار اس جگہ کو مخدوش قرار دے دیا گیا۔ اور یہ طے کیا گیا کہ دور کی پہاڑیوں سے یہاں پر بھی نگاہ رکھی
جائے گی۔ لیکن یہ علاقے عام طور سے دھند میں لپٹے رہتے تھے اور جب بھی دھند صاف ہوتی تو دیکھنے میں

بالکل ویران نظر آتے۔

یہ الگ بات تھی کہ یہاں دھند کا انتظار کیا جاتا تھا۔ اور اس درے سے اپنا کام جاری رکھنے والے اپنا کام دھند کے موسم میں ہی کر لیا کرتے تھے۔ بابر جاہ یہاں پہنچا تو اسے خراب موسم کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک مخصوص جگہ پہنچ کر اس نے جیپ ایک برفانی ٹیلے کی آڑ میں روک دی اور دوربینوں سے درے کی اس دیوار کا جائزہ لیا جانے لگا۔ پھر اس نے اپنے ایک ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''شہزور! موسم تو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی خراب ہو گیا ہے۔ ایسا کرو رابطہ کر کے معلوم کرو کہ وہ لوگ چل پڑے ہیں یا نہیں۔''

''جی آغا!'' شہزور نے کہا اور پھر ایک خاص قسم کا ٹرانسمیٹر نکال لیا۔ اور اس پر کوئی فریکوئنسی سیٹ کرنے لگا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد ایک آواز ابھری۔ جو خاصی خراب تھی۔ زوردار کھڑکھڑاہٹیں گونج رہی تھیں۔

''ہاں کون ہے۔''

''زیرو......زیرو ایسٹ......زیرو زیرو ایسٹ......زیرو زیرو ایسٹ۔''

''زیرو نائین......نائین نائین زیرو نائین......نائین نائین زیرو نائین۔''

''کہاں ہو؟''

''مصیبت میں گرفتار ہیں درے میں اتنی گہری تاریکی ہے کہ سفر سخت مشکل ہو رہا ہے۔ ادھر کا موسم کیسا ہے۔''

''خراب۔''

''تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ کیا درے میں ہی رک کر موسم کے بہتر ہونے کا انتظار کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس قدر خراب موسم میں سفر تو بے حد خطرناک ہو گا۔''

''میں ابھی پوچھ کر بتاتا ہوں۔ انتظار کرو۔''

''ٹرانسمیٹر بند کر رہا ہوں دوبارہ کال کرنا۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ اور ٹرانسمیٹر بند کر دیا گیا۔ بابر جاہ کا ساتھی اسے تفصیل بتانے لگا تو بابر جاہ نے کہا۔

''نہیں۔ ان سے کہو کہ جب کنارے تک آ گئے ہو تو مکمل کر ہی ڈالو۔ بعض اوقات موسم کئی کئی دنوں تک خراب رہتا ہے۔ اگر یہ خراب موسم جاری رہا تو کب تک انتظار کیا جا سکے گا اور پھر مجھے بھی واپس جانا ہے۔''

ٹرانسمیٹر دوبارہ آن کیا گیا۔ اور دوسری طرف سے کال موصول کرنے والے کو پیغام دیا گیا۔ تو اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے تو پوائنٹ پر میرا انتظار کرو۔'' اور اس کے بعد سلسلہ منقطع ہو گیا۔ بابر جاہ کی نگاہیں دوربین سے درے کے دہانے پر موجود اس سفید دیوار کا جائزہ لینے لگیں۔ جو قدرتی طور پر بن جاتی تھی۔ موسم کی خراب کیفیت کا اسے بہ خوبی اندازہ تھا۔ اور واقعی ایسے موسم کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کتنے دن تک چلے۔

کوئی ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑا ان کی آنکھیں اس راستے کو دیکھتے دیکھتے تھک گئیں۔ بابر جاہ بار بار کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھ رہا تھا۔ اور دانت پیس رہا تھا۔

''یہ کتے! پتا نہیں کتنے فاصلے پر رہ گئے۔ کہیں درے میں مر ہی نہ گئے ہوں۔ کروڑوں روپے کا سامان ہے ان کے پاس۔''

''وہ دیکھیے آغا برف کی دیوار ٹوٹ رہی ہے۔'' بابر جاہ کے ساتھی نے کہا۔

سفید دیوار برادے کی شکل میں گر رہی تھی اور اس کے بعد اس جگہ سے ایک تیز روشنی نمودار ہوئی۔ غالباً سفید تیز روشنی کوئی سگنل دیا گیا تھا۔ جواب میں ادھر سے ایک مخصوص ٹارچ نکالی گئی اور اس سے سبز روشنی ڈالی گئی۔ گرین سگنل مل گیا تھا۔ دوربین برف کی دھند میں اس جگہ کا جائزہ لے رہی تھی اور پھر کچھ لمحوں کے بعد خچروں کی ایک قطار نمودار ہونے لگی۔

ان خچروں پر خاص قسم کے کارٹن دونوں طرف لٹکے ہوئے تھے۔ خچروں کی تعداد نو کے قریب تھی اور ان کے ساتھ تقریباً پانچ آدمی پیدل سفر کر رہے تھے۔ ویسے تو برف کے یہ ویرانے بہت ہی ہولناک تھے۔ گہری گہری کھائیاں اور خطرناک راستے لیکن ان راستوں پر سفر کرنے والے ان راستوں کے قدیم راہی معلوم ہوتے ہیں ایک چھوٹی سی پگڈنڈی جو ایک گہری کھائی پر بنی ہوئی تھی۔ پل کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اور اس پر یہ خچر بالکل سیدھ میں سفر کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ چلنے والے ان کے دائیں یا بائیں نہیں بلکہ تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر خچروں کے پیچھے تھے۔ دونوں طرف انتہائی گہری کھائیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ واقعی اس خراب موسم میں ان راستوں کا سفر کوئی آسان بات نہیں تھی۔ تقریباً دو سو گز کا فاصلہ اسی انداز میں طے کیا گیا اور اس کے بعد اس جگہ پہنچ گئے۔ جہاں بابر جاہ اور اس کے ساتھی ان کا انتظار کر رہے تھے۔

آنے والے کرخت چہروں کے مالک! اور بڑے کھردرے لوگ تھے۔ سب سے آگے والے شخص نے کہا۔

''جب ہم اپنی جگہ سے چلے تھے تو موسم بالکل خوشگوار تھا۔ آپ کو اس طرف کے خراب موسم کی اطلاع دینی چاہئے تھی بابر جاہ صاحب! اس انتہائی خطرناک موسم میں یہ سفر کتنا دشوار گزار تھا۔ آپ کو اس کا اندازہ ہے۔ آپ تو کھائی کے اس طرف کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن ہم اور ہمارے خچر اس جگہ سے نیچے گر سکتے تھے۔ آپ نے ہماری زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ بابر جاہ جو آگے والے خچر پر لدے ہوئے کارٹن پر کوئی انٹری دیکھ رہا تھا چونک کر اس کو دیکھنے لگا پھر بولا۔

''کیا بکواس کر رہا ہے تو کیا یہاں آ کر تو نے ہم پر احسان کیا ہے۔''

''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں بابر جاہ صاحب! آپ کو میرے بارے میں پتا ہے کہ میری کیا حیثیت ہے۔'' بابر جاہ نے ایک دم ہولسٹر پر ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا اور بولا۔

''یہ صرف کاروبار ہے۔ مجھے تیری حیثیت سے کیا لینا اور کاروبار اس طرح احسان جتا کر نہیں کیا جا سکتا۔ جو رقم تم لوگ مجھ سے وصول کرو گے۔ وہ اس سلسلے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور بس۔''

''آپ کی اس بداخلاقی کی رپورٹ میں متعلقہ افراد کو ضرور کروں گا۔'' اس شخص نے ناخوشگوار لہجے میں کہا اور اسی وقت بابر جاہ کا الٹا ہاتھ اس کے منہ پر پڑا۔ اور وہ گرتے گرتے بچا۔ باقی لوگ سنگین نگاہوں سے اس صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ بابر جاہ کے تینوں ساتھی مستعد تھے۔ اور اس طرح تیار تھے کہ اگر

دوسری طرف سے ذرا بھی کوئی مداخلت کی جائے تو فوراً ہی جنگ کا آغاز کر دیں۔ تھپڑ کھانے والے افراد نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ لیکن سب کو ٹھنڈا پا کر وہ خود بھی نارمل ہو گیا۔ اور گہری گہری سانسیں لے کر منہ سے بہنے والا خون صاف کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''مال اتارو۔''

''یہاں نہیں گدھے کے بچے اگر تیری موت میرے ہی ہاتھوں لکھی ہوئی ہے تو تجھے......'' ابھی بابر جاہ نے اتنا ہی کہا تھا کہ۔ دفعتاً ایک خوف ناک آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ بھیڑیوں کی آوازیں تھیں۔ وہ اچانک ہی چیخنے لگے تھے۔ اور آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی تعداد کافی ہے۔ بابر جاہ بھی ایک دم اچھل پڑا تھا۔ پھر دور سے انہوں نے ایک خوف ناک منظر دیکھا۔ وہ لاتعداد بھیڑیے تھے۔ جو اسی طرف دوڑ رہے تھے۔ اور ان کے حلق سے خوں خوار آوازیں نکل رہی تھیں۔ سامان لدے ہوئے خچروں نے بدکنا شروع کر دیا۔ جو سامان لے کر آئے تھے۔ وہ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ بابر جاہ برق رفتاری سے پیچھے ہٹ کر اپنی جیپ کی طرف دوڑا اور اس کے تینوں ساتھیوں نے اس کی تقلید کی۔ بھیڑیے اسی طرف آ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ خچروں کے قریب پہنچ گئے۔ ایک طرف خچر سامان سمیت بھاگنے لگے۔ اور دوسرے وہ جوان کے ساتھ آئے تھے۔ جان بچانے کے لیے ادھر ادھر چھپنے لگے۔ انتہائی خوف ناک منظر تھا۔ بھوکے سفید بھیڑیے۔ خچروں اور انسانوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ جب کہ بابر جاہ نے جیپ اسٹارٹ کر کے تیزی سے ایک طرف موڑ دی تھی۔ وہ ان لوگوں کو اکیلا چھوڑ کر دوڑ پڑا تھا۔ بہت سے خچر پلٹ کر ادھر سے ادھر بھاگے اور سامان سمیت کھائی میں جا گرے۔ بہت سے خچروں کو بھیڑیوں نے ہلاک کر دیا اور سامان کے کارٹن زمین پر بکھر گئے۔ وہ لوگ جو خچروں کے ساتھ آئے تھے فائرنگ بھی نہیں کر سکے۔ بابر جاہ نے جیپ ایک ایسے برفانی ٹیلے کی آڑ میں روک دی جہاں وہ بھیڑیوں سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ وہ لوگ جیپ سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے لمبی لمبی رائفلیں نکال لی تھیں۔ جو مقامی طور پر ہی بنی ہوئی تھیں۔ انہیں لے کر وہ برفانی ٹیلوں پر چڑھ گئے اور بہت دور کا ہولناک جائزہ لینے لگے۔

سفید برف پر خون کی دھاریں بہہ گئی تھیں۔ خچر دم توڑ رہے تھے اور خوں خوار بھیڑیے انہیں اس طرح بھنبھوڑ رہے تھے۔ جیسے ان سے ازلی دشمنی ہو۔

♥......♥......♥

انسانوں اور درندوں کے درمیان ایک بھیانک کشمکش ہو رہی تھی۔ بے چارے خچر درمیان میں پس رہے تھے۔ بھیڑیوں نے انہیں بھی چیر پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ سفید برف پر خون کے دھارے جگہ جگہ بہہ رہے تھے اور ایک عجیب سی منظر کشی ہو گئی تھی۔ بابر جاہ اور اس کے ساتھی دم بہ خود موجود تھے عارضی طور پر تو محفوظ جگہ کہی جا سکتی تھی۔ لیکن اگر کہیں بھیڑیوں کا رخ اس طرف ہو گیا تو پھر یہ رائفلیں بھی زیادہ ساتھ نہیں دے سکیں گی۔ ویسے بھیڑیوں کے اتنے بڑے غول کبھی کبھی ہی نظر آتے ہیں آن کی آن میں انہوں نے درے سے آنے والوں کا صفایا کر دیا۔ بہت سے خچر بھاگ گئے تھے کچھ زخمی تھے اور کچھ ہلاک ہو چکے تھے۔ سامان جگہ جگہ بکھرا ہوا تھا۔ اچانک ہی بابر جاہ کی رائفل نے گولیاں اگلنا شروع کر دیں۔ اور اس کے ساتھی چونک پڑے۔

بابر جاہ بھیڑیوں کو نشانہ نہیں بنا رہا تھا بلکہ اس نے بھاگنے والے خچروں کا نشانہ لے کر گولیاں چلائی تھیں پھر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''ایک بھی خچر زندہ نہ واپس جانے پائے۔ بھیڑیوں سے زیادہ یہ ہمارے لیے خطرناک ہو سکتے ہیں۔ بابر جاہ کی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن انہوں نے بابر جاہ کی ہدایت پر عمل کیا۔ اور بھاگنے والے خچر بھی ڈھیر ہو گئے۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ بھیڑیے گولیاں چلنے کی آوازوں کا اندازہ لگا کر اس طرف کا رخ نہ کر لیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اچانک ہی انہوں نے بائیں سمت اختیار کی اور اس کے بعد ہر ایک بھیڑیا اپنا کام چھوڑ کر بائیں سمت دوڑ پڑا۔ جیسے کسی بات کی نشان دہی کی گئی ہو۔ اور پھر آن کی آن میں آخری بھیڑیا بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ برف کے اس وسیع و عریض علاقے میں جو خوفناک تباہی نظر آ رہی تھی وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی بابر جاہ کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے اپنے کسی خاص ساتھی کو آواز دی۔

''باز میر!''

''باز میر! میں سمجھتا ہوں اس وقت ہم جس مشکل میں گھر گئے ہیں۔ ایسی مشکل ہمیں اپنے سارے کیریئر کے دوران کبھی پیش نہیں آئی۔ اب فیصلہ کرو ہمیں کیا کرنا ہے۔ اگر کوئی فوجی ہیلی کاپٹر دن کی روشنی میں یہاں سے گشت کرتا ہوا گزر گیا۔ تو سمجھ لو یہ علاقہ ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا۔ یہاں سیکورٹی سخت کر دی جائے گی اور اتنا شاندار علاقہ ہمیں دوبارہ نصیب نہیں ہو سکتا۔ خچروں اور انسانوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگانا آسان کام نہیں ہو گا۔''

''خان جی ہمیں فوری طور پر ایس ٹو سے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔ ایس ٹو کی ٹیم کو بلا کر سب سے پہلے ان لاشوں کو ٹھکانے لگانا ہو گا اور اس کے بعد یہ سامان پوائنٹ پر منتقل کرنا ہو گا جتنا بھی ہو سکے۔''

''اوہ۔ میرا دماغ اس قدر معطل ہو رہا ہے کہ میرے ذہن میں تدبیر نہیں آ سکی باز میر! میں تمہیں اسی لیے سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں چلو یہ کام تم ہی کرو میں ان لوگوں کو اطلاع دیتا ہوں کہ یہاں کیا حادثہ ہو گیا ہے۔'' باز میر نامی شخص ٹرانسمیٹر پر کسی کو کال کرنے لگا۔ اور ادھر بابر جاہ دوسرے ٹرانسمیٹر پر کسی ہارڈ رسک کو کال کرنے لگا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد بابر جاہ کا رابطہ ان سے ہو گیا۔ جن سے وہ رابطہ قائم کرنا چاہتا تھا۔

''ہارڈ رسک۔''

''ایک بری اطلاع ہے جناب۔''

''ہم دیکھ چکے ہیں۔ اس حادثے پر ہم دلی رنج کا اظہار کرتے ہیں۔ اصل میں ہمارے پاس کچھ ایسے ذرائع تھے جن سے ہم آپ کو باخبر کر سکتے تھے مگر ہم دوسری سمت نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ جو واقعہ پیش آیا ہے اس کا ذمے دار ہم آپ کو قرار نہیں دے سکتے مسٹر بابر جاہ! آپ اس حادثے کے نشانات مٹانے کی جدوجہد کریں ہم خود آپ سے رابطہ قائم کر کے آپ کو قرب و جوار کی پوزیشن بتاتے رہیں گے۔''

''بہت بہت شکریہ۔ آپ نے میری ایک بہت بڑی مشکل حل کر دی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ آپ کو اس خوف ناک تباہی کی اطلاع کیسے دوں۔ درحقیقت آپ جیسے قابل اعتماد دوستوں پر مجھے فخر ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔''

''ہمیں بھی آپ کی دوستی ہر حال میں عزیز ہے۔ بابر صاحب۔ یہ نقصانات تو زندگی کا حص
ہیں...... چلتے رہتے ہیں آپ ان کے لیے فکر مند نہ ہوں۔ صورت حال قابو میں ہے اس ہنگامہ آرائی ک
اطلاع سرحدی محافظ تک نہیں پہنچ پائی۔ وہ اپنی پوزیشن پر ہیں۔ اگر ضرورت ہوئی تو ہم آپ کو کا
کریں گے۔''

''شکریہ۔'' بابر جاہ نے کہا اور ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔ باز میر بھی اپنا کام کر کے واپس آ گیا تھا۔

''حالات ہموار ہوتے جا رہے ہیں جناب! ایس ٹو والے پہنچ رہے ہیں۔ میں نے انہیں تما
انتظامات کے لیے کہہ دیا ہے۔'' بابر جاہ نے مسکرا کر گردن ہلا کر کہا۔

''حادثہ تو یہ بہت ہولناک تھا۔ لیکن تقدیر ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ میں نے سرحد پار رابطہ قا
کیا تھا۔ وہ لوگ بہت ایڈوانس ہیں۔ اس علاقے پر بھرپور نگاہ رکھے ہوئے تھے وہ اور انہوں نے اپنی آنکھو
سے اس تباہی کو دیکھ لیا ہے اور ہم سے ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔''

''تھینکس گاڈ! اس کا مطلب ہے کہ برا وقت ٹل گیا۔''

''باقی کام ہو جائے اس کے بعد ہی یہ بات کہی جا سکتی ہے۔'' بابر جاہ نے کہا پھر دو بڑے ٹرک
آتے ہوئے نظر آئے۔ برف کی سفیدی میں تاریک دھبے روشنیوں کے بغیر سفر کر رہے تھے۔ لیکن انہیں دیک
جا سکتا تھا۔ کوئی تیس افراد ان ٹرکوں سے اترے تھے۔ اور بابر جاہ انہیں ہدایات دیتا رہا تھا۔ تقریباً ساڑھے تی
گھنٹے تک انہوں نے انسانوں اور خچروں کی لاشوں کو ٹھکانے لگایا۔ گہری کھائیوں میں ان لاشوں کو گھسیٹ
گھسیٹ کر پھینک دیا گیا۔ اور اس کے بعد وہ سامان ٹرکوں پر بار کیا جانے لگا۔

بابر جاہ، باز میر اور دوسرے افراد جو بابر جاہ کے ساتھ تھے ایس ٹو والوں کو ہدایات دے رہ
تھے۔ ایس ٹو کے لوگ سفید وردیوں میں ملبوس تھے ان کی وردیاں ان کے جسموں کو ہر طرح کی سردی س
محفوظ رکھنے کا کام انجام دے رہی تھیں چنانچہ وہ اپنا کام انتہائی مستعدی سے کر رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ
سامان انہیں کہاں منتقل کرنا ہے۔ بابر جاہ اور باز میر بلند ٹیلوں پر چڑھ کر دور دور تک کا جائزہ لے رہے تھ
اور پھر سارا سامان ٹرکوں پر منتقل ہو گیا تو ٹرک وہاں سے واپس چل پڑے۔

ساری رات گزر گئی اس کام میں۔ صبح کا اجالا نمودار ہو رہا تھا۔ بابر جاہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا

''تم لوگوں پر موت کیوں طاری ہے؟ قہوہ بناؤ ہمیں بھی دو اور خود بھی پیو۔ ہر طرح کا خطرہ ٹل گ
ہے۔ اور ہم اب صرف سفید لومڑیوں کے شکاری ہیں۔'' بابر جاہ نے قہقہہ لگایا اور اس کے ساتھی اس کی ہدای
پر عمل کرنے لگے۔ گرم گرم قہوے کے گھونٹ ہر شخص کو فرحت بخش رہے تھے اور اب وہ چاق و چوبند نظر آ ر
تھے۔ چنانچہ بابر جاہ نے کہا۔

''روانگی کی تیاریاں کرو۔'' اور وہ لوگ اپنا سامان سمیٹنے لگے۔

ساری رات سخت مشقت میں گزری تھی لیکن کام چونکہ تسلی بخش طریقے سے ہو گیا تھا۔ اس لیے
غیر مطمئن نہیں تھے۔ آخر کار اس ہولناک برفانی علاقے سے واپسی کا سفر شروع ہو گیا راستے میں باز میر نے کہا

''خان جی! اگر مناسب سمجھیں تو ایک نگاہ مال پر ڈالتے جائیں۔ سارا مال ہی منتشر ہو گیا ہے۔

ذرا یہ دیکھ لیں کہ ایس ٹو والوں نے مال کو تسلی بخش طور پر جمایا ہے یا نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' بابر جاہ نے باز میر سے اتفاق کرتے ہوئے کہا اور گاڑیوں کے رخ موڑ دیئے
گئے۔ پھر اونچے نیچے برفانی راستے طے کرتے ہوئے وہ ایک ایسے پہاڑی سلسلے تک پہنچے جو برف سے ڈھکا
ہوا تھا۔ بلند و بالا پہاڑی ٹیلوں کا یہ سلسلہ بہت دور تک چلا گیا تھا۔ برف کی موٹی چادر نے اسے برفانی گلیشیئر
بنا کر رکھ دیا تھا۔ لیکن یہ لوگ جانتے تھے کہ راستے کدھر ہیں چنانچہ وہ ان غاروں کے دہانوں تک پہنچ گئے۔ جو
برف میں چھپے ہوئے تھے۔ ان غاروں میں داخل ہونے کا راستہ بھی انہیں ہی معلوم تھا۔

چنانچہ جب وہ غاروں میں داخل ہوئے تو اس طرح کے آثار نظر آ رہے تھے۔ جن سے یہ ظاہر ہو کہ
ایس ٹو والے مال ادھر منتقل کر کے گئے ہیں برف گرتی تو یہ نشانات بھی چھپ جاتے۔ لیکن ابھی زیادہ وقت نہیں
ہوا تھا۔ وہ غار میں اندر داخل ہو کر مصنوعی روشنی کرنے لگے اور کچھ دیر کے بعد عظیم الشان غاروں کا منظر نمایاں
ہو گیا۔ پہاڑی ٹیلوں کے اندر ہی اندر ان غاروں میں سوراخ کر کے انہیں ایک دوسرے سے منسلک کر دیا گیا
تھا۔ یہ کام یقیناً انتہائی مشقت طلب تھا۔ لیکن ایسا لگتا تھا جیسے اسمگلنگ کا یہ سلسلہ بہت پرانا ہے۔ اور ان غاروں
کو انتہائی محفوظ طریقے سے قابل استعمال بنایا گیا تھا۔ وہ اشیا جو تھوڑی دیر پہلے ان خچروں پر بار ہو کر ادھر سے
آئی تھیں۔ ایک طرف سلیقے سے جمی ہوئی تھیں اور ان سے پچھلے دن کی تاریخ پڑی ہوئی تھی۔

ایک دو کارٹن کھول کر اندر کے سامان کا جائزہ لیا گیا۔ اور اس کے بعد کارٹن بند کر دیے گئے اور
بابر جاہ نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔

''ٹھیک ہے باز میر۔''

''جی خان جی ٹھیک لگ رہا ہے سب کچھ۔''

''وہاں کا جائزہ بھی ہم نے لے لیا ہے ادھر بھی سب خیریت ہی ہے۔''

''جی خان جی۔'' اور اس کے بعد یہ لوگ وہاں سے باہر نکل آئے۔ گاڑیاں چل پڑیں لیکن ابھی
انہوں نے کوئی آٹھ سے دس منٹ کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ اچانک ہی انہیں ایک بڑی پرانے طرز کی جیپ نظر
آئی اور وہ چونک پڑے۔

''یہ کون ہیں؟'' بابر جاہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

''پتا نہیں خان جی۔'' باز میر نے آنکھوں پر دور بین لگا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے دور بین
بابر جاہ کی طرف بڑھا دی۔ اور بابر جاہ اس جیپ کو فوکس کرنے لگا۔ پھر بولا۔

''پتا نہیں کون ہیں ممکن ہے شکاری ہوں۔''

''خان جی۔ ایک کام ہم آج تک نہیں کر سکے۔'' باز میر بولا۔

''کیا؟''

''ان راستوں کو شکاریوں کے لیے ممنوع قرار دے دیا جائے۔''

''میں نے کئی بار کوشش کی ہے۔ وزارت سیاحت اس بات پر تیار نہیں ہوئی وہ اس کی وجہ معلوم
کرنا چاہتی ہے۔''

''اب آپ دیکھیے یہ اس طرف بے دھڑک چلے آ رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ ان غاروں تک آ جائیں گے۔ لیکن بات تو خطرناک ہے۔''

''آؤ دیکھتے ہیں کون ہے۔'' اور گاڑیوں کا رخ اس جانب ہو گیا۔ پھر تھوڑا فاصلہ طے ہوا تھا کہ بڑی جیپ سے انہیں دیکھ لیا گیا اور جیپ رک گئی۔ باز میر اور بابر جاہ اس جیپ پر تبصرہ کر رہے تھے۔

''بڑی پرانی جیپ ہے۔ کمپنی نے شاید ابتدائی دنوں میں اس طرح کی جیپیں بنائی تھیں۔''

''ہاں خان جی! فولاد کی طرح مضبوط ہے۔ اور ان برفانی علاقوں میں سفر کے لیے انتہائی موزوں۔''

''اگر یہ بات ہے تو پھر یہ جیپ ہماری ہوئی۔''

''وہ کیسے۔''

''جہاں اتنے انسان گہرے کھڈ میں پڑے ہیں۔ وہاں کچھ اور سہی۔'' بابر جاہ نے سفاکی سے کہا۔ اور کچھ دیر کے بعد وہ اس بڑی جیپ تک پہنچ گئے۔ بڑی جیپ میں کل چھ افراد سوار تھے۔ سارے کے سارے ہی اپنی مثال آپ تھے۔ لیکن وہ حسین لڑکی جس کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ اس برفانی علاقے میں وہ برف کی دیوی معلوم ہو رہی تھی۔ بڑا خوب صورت لباس پہنا ہوا تھا اس نے۔ بابر جاہ حسن پرست آدمی تھا۔ اس نے مقامی زبان میں باز میر سے کہا۔

''باز میر یہ حور تو ہمارا دل چھین کر لے گئی۔''

''ہاں خان جی۔ مجھے اندازہ ہے کہ اس نے آپ کے دماغ پر ٹھک ٹھک شروع کر دی ہو گی۔''

''انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا۔ خیال رکھا جائے۔'' اور اس کے بعد بابر جاہ اپنی جیب سے اتر آیا اور ان کے پاس پہنچ گیا۔

''سس...... سلام علیکم درویشوں کی دعاؤں سے۔'' سب سے آگے والے اونٹ کی طرح بے تکے آدمی نے کہا۔ بابر جاہ نے گردن ہلائی اور ان سب کی شکلیں دیکھتے ہوئے بولا۔

''نیچے اتر آؤ تم لوگ تعمیل کرو درویشوں کی دعاؤں سے لم ڈھینگ نے پھر کہا اور ایک ایک کر کے وہ سب نیچے اتر آئے۔ بابر جاہ مسکراتی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''آپ لوگ مقامی زبان سمجھتے ہیں۔''

''نہیں۔ درویشوں کے کرم سے۔'' لم ڈھینگ دانت نکالتے ہوئے بولا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے دانت، دانت نہیں بلکہ کتھے اور چونے کا جما ہوا ملغوبہ نظر آتے تھے۔ بابر جاہ نے نفرت سے ناک سکوڑی اور بولا۔

''کون ہو تم لوگ۔''

''لل...... لماڑی...... میرا مطلب ہے برف کی لومڑی کا...... برف نہیں...... اے تم آگے آ کر بتاؤ۔'' اس شخص نے ایک نوجوان سے کہا اور نوجوان آگے بڑھ آیا۔

''شکاری ہیں جناب۔ برفانی لومڑیوں کا شکار کھیلنے کے لیے آئے ہیں۔''

''اوہو آپ بھی۔'' بابر جاہ نے براہ راست لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور لڑکی کے ہونٹوں پر

ایک دل کش مسکراہٹ پھیل گئی۔

''پہاڑوں کے بیٹے! میں نے تمہارا نام غلط تو نہیں لیا۔'' بابر جاہ کو یہ انداز تخاطب بڑا اچھا لگا تھا اس نے کہا۔

''ہم پہاڑی لوگ ہیں آپ اپنا تعارف نہیں کرائیں گی میڈم۔''

''میرا نام رابعہ سونیکا ہے۔ میرے والدین مقامی لوگ ہی تھے۔ لیکن وہ یہاں سے چلے گئے تھے۔ میں نے دنیا کے تین مختلف ملکوں میں عمر گزاری ہے۔ والدین کی موت کے بعد اپنے وطن واپس آ گئی ہوں۔ دارالحکومت میں رہتی ہوں۔ ان علاقوں کے بارے میں سنا تھا کہ بہت حسین ترین علاقے ہیں اور بلاشبہ یہ مجھے سوئٹزرلینڈ سے زیادہ پسند آئے ہیں۔ یہاں کی بات ہی اور ہے۔ یہاں کی ہواؤں میں فضاؤں میں اپنے وطن کی خوشبو رچی ہوئی ہے ہم لوگ یہاں سفید لومڑیوں کا شکار کھیلنے آئے تھے۔ یہ مسٹر صوفی ہیں ایک پرانے شکاری بہت تجربہ رکھتے ہیں اور یہ دو افراد ان کے معاون اور یہ دو میرے سیکریٹری ہیں۔'' لڑکی نے سب کا تعارف کرایا اور اپنا نرم و نازک ہاتھ بابر جاہ کی طرف بڑھا دیا اس کے چہرے پر ایک لگاوٹ بھری مسکراہٹ تھی۔ جو بابر جاہ کو بہت بھلی لگ رہی تھی سوچ کر تو یہ آیا تھا کہ ان شکاریوں کو موت کی نیند سلا دے گا۔ لیکن لڑکی نے ماحول ہی بدل دیا تھا۔

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی مس سونیکا! ہم آپ کو اپنی سرزمین پر خوش آمدید کہتے ہیں۔ میرا نام بابر جاہ ہے اور میں ان علاقوں کا مالک ہوں۔ یہاں میرا حکم چلتا ہے۔ ویسے آپ لوگ نے کتنی برفانی لومڑیاں شکار کیں۔''

''کک...... کہاں شکار کیں۔ ہماری شکل دیکھ کر، بھمم...... بھاگ جاتی ہیں درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی نے کہا۔ بابر جاہ کے کچھ ساتھی ہنس پڑے ان میں سے ایک نے دبی زبان سے کہا۔

''لگڑ بھگڑ سمجھتی ہوں گی آپ کو۔''

''پپ...... پتا نہیں لومڑیوں کی فطرت سے ہمیں کوئی واقفیت نہیں ہے۔ شاید آپ کو ہو درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی نے کہا اور وہ شخص شرمندہ سا ہو گیا۔ بابر جاہ ہنس پڑا تھا پھر بولا۔

''تو آپ میر شکاری ہیں۔''

''درویش آپ پر رحم کریں بڑی اچھی بات کہی آپ نے مناسب معاوضہ لے کر ہم مختلف قسم کے شکار کرایا کرتے ہیں۔ پچھلے سال ہم نے ایک سو چالیس مچھلیاں پکڑ کر ریکارڈ قائم کیا تھا۔''

''ایک سو چالیس مچھلیاں پکڑ کر۔''

''جی۔ مچھلیوں کا شکار کرا رہے تھے ہم کچھ لوگوں کو۔''

''ایک سو چالیس مچھلیاں کہاں سے پکڑیں آپ نے۔''

''ایک فش فارم کے ٹینک سے درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی نے جواب دیا اور اس بار بابر جاہ بھی ہنس پڑا تھا۔

''آپ لوگ بہت دلچسپ لوگ ہیں ہم پہاڑی لوگوں کی ایک روایت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ جو کوئی

ہمارے علاقے میں آتا ہے۔ پہلے ہم اسے اپنا مہمان رکھتے ہیں۔ اور اگر ہماری میزبانی قبول نہ کی جا
ہم اپنے علاقوں میں آنے والوں کو گولی مار دیتے ہیں۔ یہاں وہی لوگ داخل ہو سکتے ہیں ہمارے مہما
ہمارے دشمن اور دشمن کو ہم واپس نہیں جانے دیتے۔ آپ لوگوں کو ہمارا مہمان بننا ہوگا۔ ہم آپ کو
لومڑیوں کے ڈھیر میں ڈھک دیں گے۔''

''تت...... تب تو ہماری موت واقع ہو جائے گی درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی نے گھبرا
ہوئے لہجے میں کہا۔

''نہیں...... مطلب یہ کہ لومڑیوں کا شکار کر کے آپ کیا کریں گے۔''

''ظاہر ہے ہم ان کی کھالیں حاصل کریں گے۔''

''وہی میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ میں سفید لومڑیوں کی کھالوں کے انبار لگا دوں گا آپ کے گرد

''اوہ مائی گاڈ...... اوہ مائی گاڈ...... مسٹر جابر باہ۔''

''نہیں بابر جاہ۔ آیئے...... ہمارے ساتھ آیئے۔ سنو تم جس سے ایک ان کے ساتھ ان کی ج
میں جا کر بیٹھ جاؤ۔ اور باقی اپنی گاڑی میں چلو...... میڈم! آپ میرے ساتھ آ جایئے۔''

بابر جاہ نے کہا اور سونیکا خوشی سے اس پر آمادہ ہو گئی۔ وہ بابر جاہ کے ساتھ جیپ میں جا کر بیٹھ گئی تھ
بابر جاہ اس تعاون پر بڑا خوش تھا۔ جیپیں آگے بڑھ گئیں۔ بابر جاہ نے کہا۔

''یہ علاقہ سنگینہ کا علاقہ کہلاتا ہے اور سنگینہ میری ریاست ہے میں اس کا حکمراں ہوں میر
بڑے بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ بھابی اور اس کی بیٹی اراشیہ ہماری حویلی میں رہتی ہیں آپ کو ان لوگوں
درمیان جا کر بڑی خوشی ہوگی۔ ویسے آپ کا نام بڑا خوب صورت ہے مس سونیکا۔''

''شکریہ...... میں نے اپنے وطن کے ان علاقوں کے بارے میں سنا تھا کہ یہاں کے لوگ بڑ
مہمان نواز ہوتے ہیں۔ آج اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔ آپ بہت اچھے ہیں جابر باہ صاحب!''

''بابر جاہ۔'' بابر جاہ نے اپنے نام کی تصحیح کی۔

''جی جی وہی معافی چاہتی ہوں۔'' رابعہ سونیکا نے کہا۔

''نہیں کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ مجھے اچھا لگتا ہے۔'' بابر جاہ انہیں لے
حویلی پہنچ گیا۔ برفانی ڈھلانوں کی گہرائیوں میں یہ وسیع و عریض احاطہ اور اس کے بعد اس احاطے کے اندر
ہوئی خوب صورت عمارت جو دو حصوں پر مشتمل تھی۔ ایک حصے کو زنان خانہ کہا جاتا تھا۔ یہاں کی روایت
مطابق زنان خانہ میں پردے کا اہتمام ہوا کرتا تھا لیکن خانم فردوسیہ نے یہ پردے داری ختم کر دی تھی۔ وہ آزا
فطرت کی مالک تھی اور اس سلسلے میں بابر جاہ اسے مجبور نہیں کر سکا تھا۔ ان لوگوں کو ایک بہترین قیام گاہ دی گئی
بابر جاہ نے جو کمرا رابعہ سونیکا کو دیا تھا۔ وہ اس کی خواب گاہ سے ملحق تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے باز میر سے کہا۔

''اس لڑکی نے تو کچھ دیر کے اندر ہی اندر میرے دل و دماغ پر قبضہ جما لیا ہے باز میر۔''

''خان جی وہ واقعی برف کی شہزادی معلوم ہوتی ہے۔''

''واہ...... کیا خوب صورت نام دیا ہے تم نے اسے۔ ان کی خاطر مدارات میں کوئی کمی نہ رکھو ہم ا

پر بہت اچھا تاثر قائم کرنا چاہتے ہیں۔'' بابر جاہ نے باز میر کو ہدایت کی۔

''آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی خان جی۔'' باز میر گردن خم کر کے بولا۔

♥......♥......♥

اراشیہ نے اس عجیب و غریب انسان کو دیکھا جو آنکھیں بند کیے سیدھا منہ اٹھائے چلا آ رہا تھا۔
اراشیہ اسے دیکھ کر رک گئی۔ وہ شخص اس کے قریب پہنچ کر رک گیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔

''خداوند عالم! تم پر رحمتوں کی بارش کرے درویشوں کی دعاؤں سے، اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے
تو تمہارا نام آراشیہ ہے۔'' آراشیہ نے حیرانی سے اسے دیکھا پھر بولی۔

''تم وہی ہو نا جو چچا جان کے مہمان ہو۔''

''ہم مہمان ضرور ہیں اس حویلی میں لیکن چچا جان۔''

''میں بابر جاہ کی بات کر رہی ہوں۔''

''ہاں۔''

''کہاں سے آئے ہو؟''

''ہم تو خیر دارالحکومت سے آئے ہیں درویشوں کے کرم سے لیکن رابعہ سونیکا سوئٹزرلینڈ سے آئی
ہے اور یہاں ان برفانی علاقوں میں لومڑیوں کا شکار کھیلنا چاہتی ہے۔''

''تو لومڑیاں ہمارے گھر میں گھسی ہوئی ہیں۔ یہاں کیوں آئے ہو تم لوگ۔''

''درویش رحم کریں وہ صاحب! ہمیں زبردستی مہمان بنا کر لے آئے۔''

''ہوں...... مہمان۔'' اتنی دیر میں خانم فردوسیہ بھی ادھر نکل آئیں۔

''کیا بات ہے آراشیہ!''

''مما! آپ دیکھیے اس طرح منہ اٹھائے چلے آئے ہیں اس طرف جیسے ساری حویلی چچا جان کی
ملکیت ہو۔ یہ ان کے مہمان ہیں نا۔''

''نہیں بیٹا! حویلی کے احاطے میں ہر مہمان قابل احترام ہوتا ہے۔''

''پھول جھڑ رہے ہیں آپ کے منہ سے درویشوں کی دعاؤں سے، ویسے آپ ان کی والدہ ہیں۔''

''ہاں۔ آپ لوگ یہاں کب تک قیام کریں گے۔''

''جب آپ حکم دیں گے چلے جائیں گے۔''

''نہیں میرا یہ مقصد بالکل نہیں ہے۔ آپ آرام سے یہاں رہیں میں نے تو ایسے ہی آپ کا
پروگرام پوچھا تھا۔''

''جی...... شکار کھیلنے کا ارادہ ہے ہمارا حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ مجھے معصوم جانوروں پر گولی
چلاتے ہوئے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ درویشوں کے کرم سے۔''

''یہ آپ کے ہر جملے میں درویش کہاں سے آ جاتے ہیں۔''

''فیض ہے ان کا، بس کرم نوازی ہے خود بہ خود آ جاتے ہیں درویشوں کی دعا سے۔''

''آؤ آراشیہ! ہمیں کچھ کام کرنا ہے۔'' خانم نے کہا اور اس کے بعد آراشیہ کا ہاتھ پکڑ کر اس ساتھ آگے چلی گئی۔ لم ڈھینگ آگے بڑھ گیا تھا۔ اس دوران وہ حویلی کے مختلف حصوں میں چکراتا رہا جب کہ رابعہ سونیکا نے پوری طرح بابر جاہ کو اپنی مٹھی میں کرلیا تھا۔ وہ اتنی خوب صورت باتیں کرتی تھی بابر سے کہ بابر جاہ اس کے پاس سے ہٹتا ہی نہیں تھا۔ ہر انسان کے اندر ایک اور شخصیت چھپی ہوئی ہوتی ہے چاہے وہ کتنا ہی وحشی کتنا ہی دیوانہ کیوں نہ ہو۔ لیکن بعض اوقات چند الفاظ اسے مار دیتے ہیں۔ ایک خو صورت لڑکی جب اسے پہاڑوں کا شہزادہ اور زمانہ قدیم کا دلیر انسان کہتی تھی تو بابر جاہ کا سینہ فخر سے پھول تھا۔ رابعہ سونیکا ہر وقت اس کے ساتھ رہنا چاہتی تھی اور بابر جاہ کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔

''میرا بس چلے تو میں ساری زندگی ان برف زاروں میں آپ کے ساتھ گزار دوں مسٹر باگڑ جاہ۔

''باگڑ جاہ۔'' بابر شاہ نے کہا اور ہنس پڑا۔

''معاف کرنا کوئی اور نام رکھ لو مجھ سے نہیں صحیح نام لیا جاتا۔''

''تم جو بھی کہتی ہو سونیکا! مجھے اچھا لگتا ہے۔''

باز میر نے بابر جاہ سے کہا۔

''خان جی آپ کچھ زیادہ متاثر نہیں ہو گئے ہیں۔ اس لڑکی سے۔''

''باز میر۔ میں نے زندگی میں بہت سے کھیل کھیلے ہیں اسے تو میں اس لیے اپنے ساتھ لایا تھا کچھ عرصہ اسے اپنا مہمان رکھوں گا اور اس کے بعد بھگا دوں گا لیکن یوں لگتا ہے جیسے اس لڑکی کی تقدیر میں ا حویلی کے حصے داری لکھ دی گئی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں خان جی!'' باز میر بولا۔

''میں اس سے شادی کروں گا باز میر! وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے اسے یہاں رکھا جا سکتا ہے۔''

دوسری طرف خانم فردوسیہ الجھن میں گرفتار تھی۔ آخر کار اس سے نہ رہا گیا تو اس نے ٹرانسمیٹر کرنل رحیم شاہ سے رابطہ قائم کیا۔

''کرنل صاحب! آپ نے ہمارے لیے کچھ کیا نہیں بات کچھ بھی نہیں ہے لیکن پھر بھی چاہ ہوں کہ اس سلسلے میں کم از کم کام کا آغاز تو کریں۔''

''آغاز ہو چکا ہے بھابی جی۔ میری ٹیم آپ کے پاس پہنچ گئی ہے۔''

''آپ کی ٹیم۔''

''ہاں۔ صوفی صاحب نے مجھے اطلاع دی ہے کہ اس وقت وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ حویلی میں مقیم ہیں۔''

''صوفی صاحب۔''

''حلیہ بتاتا ہوں آپ کو ان کا، ہو سکتا ہے آپ کی ان سے ملاقات ہوئی ہو۔'' کرنل رحیم شاہ نے کہا اور پھر جو حلیہ اس نے خانم فردوسیہ کو بتایا اسے سن کر خانم فردوسیہ ششدر رہ گئی۔

''میرے خدا تو یہ میر شکاری، میرا مطلب ہے درویشوں کے کرم سے۔''

''بالکل بالکل۔ یہ وہ شخص ہے جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردے گا۔ آپ اسے کوئی معمولی چیز نہ سمجھیں۔ بس ذرا ٹائپ ایسی ہے اس کی اور انداز اسی طرح کا اختیار کر لیتا ہے۔''

''میرے خدا...... میرے خدا......'' خانم فردوسیہ سر پکڑ کر رہ گئی تھی۔

♥......♥......♥

خانم فردوسیہ نے آراشیہ کو غور سے دیکھا آراشیہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسیوں کے سائے تھے۔ خانم فردوسیہ نے کہا۔

''کیا بات ہے آراشیہ افسردہ ہو۔''

''ہاں خانم افسردہ ہوں۔ اچھا نہیں لگ رہا موسم بھی ڈھل ہے اور ویسے بھی آپ کو معلوم ہے کہ یہاں ہمارے لیے کچھ بھی نہیں ہے بس صبح ہوتی ہے شام ہو جاتی ہے نہ کوئی تفریح نہ اور کچھ۔ مما ایک بات کہوں آپ سے۔''

''ہاں بولو۔''

''کیا مل رہا ہے ہمیں سنگینہ میں مما! شہر چلیے کم از کم وہاں زندگی کی رونقیں تو ہیں۔''

''میں خود بھی اسی انداز میں سوچ رہی تھی ایک کام کر لیتے ہیں آراشیہ! اگر تم پسند کرو تو۔''

''جی مما! بتائیے۔''

''ہم شہر چلیں گے وہیں اپنے لیے قیام کا بندوبست بھی کریں گے۔ لیکن کچھ عرصے رک جاتے ہیں یہاں کی ذمے داریاں ہم پولیٹیکل ایجنٹ کو سونپ دیں گے۔ اپنے سارے مفادات کا نگراں اسے بنا دیں گے یا ایک ٹیم بنا دیں گے جو سنگینہ میں ہمارے مفادات کی نگرانی کرے۔ لیکن بیٹا! ہم نے ایک مقصد چنا ہے۔ میں مانتی ہوں کہ ہم میں سے ہر شخص کو اپنی زندگی کے دن پورے کر کے زمین کی آغوش میں سما جانا ہے۔ لیکن وطن کی چھت نسلوں کی امانت ہوتی ہے اس چھت کو مضبوط ستونوں پر قائم کرنا اس چھت کے نیچے ایک سانس بھی گزارنے والے کی ذمے داری بن جاتی ہے۔ ہم نے تو زندگی کے بہت سے سال اس چھت کے نیچے گزارے ہیں۔ دیکھو۔ اس چھت نے ہمیں پروان چڑھایا زمین نے ہمیں وہ سب کچھ دیا جو ہماری ضرورت ہو سکتی تھی۔ اپنی تھوڑی سی زندگی کی دل بستگی کے لیے کیا ہم اس چھت کو تنہا اور ویران چھوڑ دیں۔ ان لوگوں کے حوالے کر دیں۔ جو اس کے ستونوں کو ڈھا کر اسے زمین بوس کر دیں۔ آراشیہ۔ مجھے جواب دو۔''

''نہیں ماما! ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو بس ایسے ہی اپنی بوریت کا اظہار کر رہی تھی۔

''آپ نے جو کوشش کی تھی اس کا کوئی نتیجہ نہیں حاصل ہوا۔''

''کون سی کوشش کی بات کر رہی ہو۔''

''وہی انکل رحیم شاہ سے ملاقات کی۔''

''عجیب و غریب انکشاف ہوا ہے ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ میں نے ان سے رابطہ قائم کیا تھا۔ ان کے دیے ہوئے ٹرانسمیٹر پر۔''

''کیا؟''

''یہ جو کچھ مہمان آئے ہیں نا۔ تم نے دیکھا ہوگا بابر جاہ کے ساتھ۔''
''ہاں کچھ عجیب و غریب چیزیں آئی ہیں۔ ایک خاتون بھی ہیں جن کی کوئی کل سیدھی نہیں نظر آئی مجھے۔ ایسا لگتا ہے جیسے انہیں خواتین سے تو کوئی دلچسپی نہیں ہے اور انکل بابر جاہ! بس مما میں کیا بتاؤں چھوٹا منہ اور بڑی بات ہوگی۔''
''یہ اسی ٹیم کی فرد ہے نا۔''
''ہاں۔''
''اور مزید کچھ لوگ بھی ہیں۔''
''ہاں کل چھ افراد ہیں اور ان میں ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ مما! میں اس شخص کی بات کر رہی ہوں۔ جو شیروانی اور ڈھیلے پائچوں کا پائجامہ پہنے رہتا ہے اور کوئی قدیم روح معلوم ہوتا ہے۔''
''اراشیہ! رحیم شاہ نے بتایا ہے کہ وہی صوفی صاحب ہیں یعنی ان کے بھیجے ہوئے یہ ٹیم رحیم شاہ کی ہے۔''
''کیا۔'' آراشیہ کا منہ حیرت سے کھل گیا پھر وہ بے اختیار ہنس پڑی اور بولی۔
''کیا رحیم شاہ صاحب نے فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد کوئی سرکس بنانے کا فیصلہ کیا ہے ان جوکروں کو اکٹھا کر لینے کا مقصد تو یہی ہو سکتا ہے۔''
''کیا پتا۔ وہ انتہائی سنجیدہ آدمی ہیں۔ تمہیں حیرت ہوگی یہ سن کر کہ وہ کہہ رہے تھے کہ صوفی بڑے کام کا آدمی ہے۔ بس اسے برداشت کر لینا بڑی بات ہوگی۔''
''آراشیہ! ایک کام کرو۔''
''جی۔''
''ذرا پتا لگاؤ بابر جاہ کہاں ہے اگر بابر جاہ کہیں مصروف ہو تو ذرا صوفی کو بلا کر لاؤ۔ میں اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''
''کسی کے ہاتھ بلوا لوں۔''
''نہیں۔ تم صورت حال کا جائزہ لو اور اس کے بعد بتاؤ۔''
''میں دیکھتی ہوں۔''
''پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ صوفی کے ساتھ اندر آ گئی۔ صوفی شیروانی اور پائجامے میں ملبوس تھا۔ منہ میں پان کی گلوری دبی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں بناسپتی گھی کا ایک ڈبا تھا اور اس ڈبے میں پان کا ملغوبہ اراشیہ کی ناک چڑھی ہوئی تھی۔ خانم فردوسیہ نے گہری نگاہوں سے صوفی کو دیکھا۔ اور صوفی لکھنوی انداز میں جھک جھک کر سلام کرنے لگا۔
''آیئے صوفی صاحب! آیئے تشریف رکھیے۔ آراشیہ دروازہ بند کر دو۔'' آراشیہ نے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا صوفی نے ڈبا ایک جگہ زمین پر رکھا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔
''یہاں تشریف رکھیے آپ اور یہ ڈبے میں کیا ہے۔''

''غم غم، قم قم...... غم غم، قم قم۔'' صوفی نے دوبار کہا۔
''او ہو...... آپ نے اسے اگالدان بنا رکھا ہے۔ چلیے ابھی تو کام چلایئے میں آپ کو اگالدان مہیا کر دوں گی۔''
''غیرڑ یہ...... غیرڑ یہ۔'' صوفی نے کہا پھر ڈبا اٹھا کر منہ کا سارا ملغوبہ اس میں الٹ دیا اور اس کے بعد شیروانی کی جیب سے ایک رومال نکالا جو خون آلود محسوس ہوتا تھا لیکن وہ خون نہیں تھا بلکہ کتھے چونے کا رنگ تھا۔ ہونٹوں کو اچھی طرح صاف کر کے اس نے رومال دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔ آراشیہ کو الٹی آ رہی تھی۔ اس نے کہا۔
''میں جاؤں مما!''
''نہیں بیٹھو۔ صوفی صاحب! میں معافی چاہتی ہوں کیا آپ پانوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔''
''نہیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔''
''درویشوں کی دعاؤں سے۔ کیا مطلب۔''
''اس کائنات کی چھت کو قائم رکھنے میں درویشوں، پیروں، ولیوں اور بزرگوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے محترمہ! اس لیے میں عاشق درویش ہوں اور ہر کام ان کی رضا اور پوری رغبت کے ساتھ کرتا ہوں۔''
''خیر...... آپ کا اپنا عمل ہے صوفی صاحب! آپ سے جو بات میں کرنا چاہتی ہوں۔ آپ براہ کرم اس کا صحیح جواب دیں۔ مجھے تو پہچانتے ہیں نا آپ۔''
''دل و جان سے دل و جان سے، درویشوں کے کرم سے۔''
''ایک بات بتایئے، دل و جان سے یا درویشوں کے کرم سے......'' آراشیہ بولے بغیر نہ رہ سکی۔ خانم نے ہاتھ اٹھایا اور بولیں۔
''بیٹھ جاؤ آراشیہ! کھڑی کیوں ہو۔'' آراشیہ بیٹھ گئی تھی وہ بہ غور صوفی کے حلیے کا جائزہ لے رہی تھی۔ بڑا عجیب سالگ رہا تھا اسے، خانم نے کہا۔
''جی صوفی صاحب! ہمارے ایک کرم فرما ہیں کرنل رحیم شاہ! جانتے ہیں آپ انہیں۔''
''جی درویشوں کے کرم سے اور محترمہ میں آپ سے کوئی لگی لپٹی بات نہیں کروں گا آپ کو تسلی دینا بھی ضروری تھا۔ ہم لوگ کرنل رحیم شاہ ہی کے بھیجے ہوئے ہیں۔ کرنل صاحب نے تمام صورت حال بتا کر ہمیں یہاں بھیجا تھا ہم نے براہ راست یہاں آنے کے بجائے ایسا طریقہ اختیار کیا کہ بابر جاہ صاحب ہمیں خود ہی یہاں آنے کی دعوت دے دیں درویشوں کے کرم سے، اور اس کوشش میں ہمیں کامیابی حاصل ہو گئی۔ محترمہ! آپ بے فکر ہو جائیں جو ذمے داری ہم نے سنبھال لی ہے سمجھ لیجیے اسے پورا کر کے ہی چھوڑیں گے، دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔ موقع بہتر ہے آپ ہمیں تھوڑی سی تفصیل بتا دیجیے۔''
''یہ لوگ جو آپ کے ساتھ آئے ہیں صوفی صاحب! یہ سب آپ کے اعتماد کے لوگ ہیں۔''
''یہ پوری ٹیم کرنل رحیم شاہ کی ہے۔''
''ہوں۔ تب تو خیر ٹھیک ہے۔ یقیناً شاہ جی نے کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا ہوگا۔ صوفی صاحب میں

اس لڑکی کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہوں۔ جوان دنوں بابر جاہ کے ساتھ دیکھی جا رہی ہے۔''

''دیکھیے...... ہر طرح کی کوششیں کی جاتی ہیں بس سمجھ لیجیے کہ وہ مکڑی کی طرح بابر جاہ کے شا
پر سوار ہو چکی ہے اور یقیناً دور کی کوڑی لائے گی درویشوں کے کرم سے۔ آپ براہ کرم ہمارے لوگوں
داروں پر تنقید نہ کریں۔ آپ یہ فرمائیے کہ آپ کو بابر جاہ سے متعلق کس طرح کے شکوک وشبہات ہیں۔''
فردوسیہ وہ تمام گفتگو دہرانے لگی۔ جو اس نے کرنل رحیم شاہ سے کی تھی۔

''بابر جاہ صاحب! ہمیں جس پوائنٹ پر ملے تھے وہ پوائنٹ مشکوک ہو سکتا ہے۔ بس اب
جلد ہم ادھر کا دورہ کرنے والے ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ ان کا طریقہ کار کیا ہے اگر آپ کا شک صحیح نکلا تو آ
بالکل اطمینان رکھیے گا ہم وطن دشمنوں کو منظر عام پر لے آئیں گے۔''

''ایک درخواست کروں صوفی صاحب۔''

''جی جی۔''

''آپ شکاری پارٹی کی حیثیت سے وہاں جائیں گے نا۔''

''جی سفید لومڑیوں کے شکاری کی حیثیت سے۔''

''میں اگر آپ کے ساتھ چلوں تو......'' صوفی تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔

''آپ ضرور چلیے گا ہم آپ کے لیے گنجائش نکال لیں گے۔'' صوفی کافی دیر تک اسے تسلیاں د
رہا اور اس کے بعد خانم نے اسے رخصت کر دیا۔

آراشیہ صوفی کے باہر نکلتے ہی ہنس پڑی۔ اور پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر بولی۔

''پان نوش فرمائیے گا درویشوں کی دعا سے۔''

''نہیں آراشیہ! آدمی خاصا ذہین معلوم ہوتا ہے۔''

''وہی پرانی کہاوت ہے غالباً تیمور لنگ کے دربار میں ایک شخص آیا تھا جو اندھا تھا نام تھا دولت
بادشاہ نے اس سے نام پوچھا۔ اور جب اس اندھے نے اپنا نام بتایا تو وہ بہت ہنسا۔ کہنے لگا کہ اب دولت
اندھی بھی نہیں ہوتی کہ اندھوں کے پاس آ جائے۔ اندھے نے ہنس کر کہا۔

''دولت اندھی ہی ہوتی ہے جناب! ورنہ لنگڑے لولوں کے پاس کیسے پہنچ جائے۔ تو اب ذہا
بھی اونٹوں میں تقسیم ہونے لگی۔ مما! کیسا آدمی ہے اس دور میں بھی ایسا لباس پہنتا ہے اور پھر ایسے ادا
سے متعلق! وہ چاہے تو اپنا حلیہ بہتر بھی بنا سکتا ہے۔''

''کاش وہ ہمارے لیے کام کا آدمی ثابت ہو۔'' خانم فردوسیہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

باز میر خود ہی شامت کا مارا غلام قادر کے سامنے آ گیا تھا۔ شاید ہلکے سے نشے میں بھی تھا اس
ساتھ اس کا خاص آدمی شاکر خان بھی تھا۔ شاکر خان کو یہ لوگ سینڈو کہتے تھے اور وہ خاصا طاقت ور آدمی
فطرت میں سرکشی بے پناہ تھی۔ باز میر نے ان لوگوں کو دیکھا اس وقت دلاور اور غلام قادر گردن جھکائے
باتیں کر رہے تھے کہ باز میر، شاکر خان کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

''اوہ۔ کالی بلا کیا ہو رہا ہے یار! میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔ تم لوگوں کا شکار پارٹی

تعلق۔ اور شہزادی صاحبہ نے تمہارا انتخاب کیوں کیا ہے۔''

''تمہارے کو کیا کھٹکا ہو گیا ہے۔ ابھی دیکھو نا دلاور بھائی سالہ پدی جیسا آدمی ہے۔ اور بات کرتا
ہے میرے سے۔ ابھی دیں گا ایک فنکا تو ناک غائب ہو جائے گا۔ جاؤ رے...... ہمارے منہ مت لگو۔ ہمارا
دماغ پھرا ہوا ہے۔''

''ابے مجھے جانتا ہے میں کون ہوں!''

''اڑے ماں قسم اس حرامی کا شامت ہی آ گیا ہے۔ دلاور بھائی نکال دو اس سے باہر ابھی دیکھو
تمہارے کو جو بولتا تھا۔ ابھی اس آدمی کو یہ نہیں معلوم کہ مہمانوں کے کمرے میں آواز مار کر آ پڑتا ہے۔ ابھی
جاؤ تم اگر تمہارا شامت نہیں آیا تو۔'' باز میر بھی ترنگ میں تھا اور اس نے شاکر خان سے کہا۔

''اس کی بکواس سمجھ میں آ رہی ہے۔''

''اڑے خدا کا قسم اس کا کٹی کیے بغیر کام نہیں چلے گا دلاور بھائی۔ ابھی اسے نکالو باہر۔''

''شاکر خان اس کو بتاؤ میں کون ہوں۔'' شاکر خان ویسے ہی غصے میں آ رہا تھا آگے بڑھا اور غلام
قادر کا گریبان پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا۔

''اڑے اخروٹ کا چٹنی تمہارے کو شامت بلائے بغیر کام نہیں چلے گا۔'' غلام قادر نے اس کے
ہاتھ سے گریبان چھڑایا اور پھر اس کا گریبان پکڑ کر ایک زوردار سر کی ٹکر شاکر خان کے سر پر ماری۔ شاکر خان
کی ناک کی ہڈی ٹیڑھی ہو گئی۔ اور ناک سے خون کا فوارہ بہ نکلا۔ غلام قادر نے پلٹ کر ایک گھونسا اس کے
جبڑے پر دیا اور شاکر خان اپنے تمام ترتن وتوش کے ساتھ اچھل کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ دلاور جلدی سے کھڑا
ہو گیا تھا۔

''نہیں بس غلام قادر بس۔''

''اڑے تو دیکھو نا اس خانہ خراب کو میرے منہ کائے کو لگتا بابا! ابھی جاؤ نہیں تو ہڈی پسلی ایک
کر دئیں گا۔ ماں قسم دلاور بھائی اس کو نکال دو باہر۔ اڑے خانہ خراب کا بچہ بلا وجہ لگنے کو آ گیا۔ اڑے ماں قسم
ابھی اس کی دونوں ٹانگیں توڑ دے گا۔ اپنے پیروں سے چل کر نہیں جائیں گا یہ۔''

''میں دیکھ لوں گا تمہیں دیکھ لوں گا۔''

''اڑے جاؤ نا بے زمیر...... بے زمیر ہی ہے نا تیرا نام، وہ بولتے ہیں نا دلاور بھائی کیا بولتے ہیں
یار! آلو خاں، بینگن خان، منڈی خان، لوٹا خان، مٹکا خان یہ سالہ لوگ ایسے ہی نام رکھ لیتا۔ جو مرضی آئے نام
رکھ لیا۔ اڑے نکالو اس کو کمرے سے باہر۔'' غلام قادر آہستہ آہستہ غصے میں آتا جا رہا تھا۔ دلاور نے کہا۔

''آپ لوگ خود جانا پسند کریں گے یا کچھ کوشش کی جائے۔'' شاکر خان آستین سے خون پونچھ کر
پھر غلام قادر کی طرف متوجہ ہوا تو باز میر نے کہا۔

''نہیں شاکر خان آؤ...... ذرا بات کرتے ہیں بابر جاہ صاحب سے! انہوں نے انہیں اتنا منہ
کیوں لگا رکھا ہے۔''

''ٹھیک ہے مگر میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔''

''اڑے ابھی بتائیں تمہارے کو۔ چھوڑیں گا یا نہیں چھوڑیں گا۔''

''بس ٹھیک ہے آؤ۔'' اور باز میر شاکر خان کے ساتھ باہر نکل گیا تو غلام قادر بولا۔

''چلا گیا ابھی میرے مغز لگتا ہے میں اس کو ٹھیک کر دیں گا دلاور بھائی۔''

''بس بس۔ اچھی مرمت کر ڈالی تم نے کہیں صوفی صاحب کو اعتراض نہ ہو۔''

''ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لیں گا چھوٹے بابا سے۔ پھر آپ دیکھو نا ہم تو وہاں نہیں گیا تھا۔'' اتنی دیر میں صوفی آ گیا۔ ان لوگوں نے اپنے طور پر صوفی کو چھوٹے بابا اور رحیم شاہ کو بڑے بابا کہنا شروع کر دیا تھا صوفی نے گردن ہلا کر کہا۔

''سب کچھ میں نے دیکھ لیا اور سن بھی لیا۔ درویشوں کے کرم سے ٹھیک جا رہے ہو۔'' غلام قادر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

♥......♥......♥
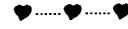
صوفی تقریباً پوری حویلی کا چکر لگا چکا تھا جب نہ جانے کس طرح بابر جاہ کی آنکھ کھل گئی اور اس نے صوفی کو دیکھ لیا۔ صوفی حویلی کا پوری طرح جائزہ لے چکا تھا۔ بہ ظاہر تو کوئی ایسی مشکوک بات نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن پھر وہ ایک راہ داری سے باہر نکلا ہی تھا کہ بابر جاہ سامنے آ گیا۔ وہ متجسس نگاہوں سے صوفی کو دیکھ رہا تھا۔ صوفی آنکھیں کھولے ہوئے سیدھا اسی طرف آ رہا تھا۔ ایک لمحے کے اندر اندر اس نے چال میں ایک اجنبی سی کیفیت پیدا کر لی تھی۔ اور پھر وہ بابر جاہ کے بالکل قریب سے گزر گیا۔ تو بابر جاہ کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ صوفی کی لاتعلقی یہ بتاتی تھی کہ وہ ہوش وحواس میں نہیں ہے۔

بابر جاہ اس کا پیچھا کرنے لگا صوفی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے دیکھ لیا گیا ہے۔ اور بابر جاہ اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی اداکاری میں مزید استحکام پیدا کر لیا۔ سامنے ایک دیوار آئی تو وہ اس دیوار سے جا ٹکرایا اور اس کے بعد اس نے رخ بدل کر بائیں سمت اختیار کر لی۔ پھر ایک جگہ تین سیڑھیاں آئیں تو وہ بڑے آرام سے نیچے جا گرا۔ کچھ دیر اوندھے منہ پڑا رہا اور اس کے بعد اپنی جگہ سے اُٹھ کر سیدھا چل پڑا۔

اب بابر جاہ کو یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہے۔ آخر کار صوفی نے اپنی آرام گاہ کا رخ کیا اور جب وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو کر اپنے بستر پر جا گرا تب بابر جاہ نے اس کا پیچھا چھوڑا۔ لیکن دوسری صبح ناشتے کی میز پر اس نے شازیہ سے سب پہلا سوال یہی کیا تھا۔

''ڈیئر سونیکا! کیا تمہیں میر شکاری کے بارے میں کوئی ایسی بات معلوم ہے جو عام لوگوں سے ہٹ کر ہو۔'' صوفی اس دوران شازیہ کو یہ بتا چکا تھا کہ رات کو اسے حویلی میں گھومتے پھرتے دیکھ لیا گیا ہے۔ شازیہ نے کہا۔

''نہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک ماہر شکاری ہے۔ ابھی تک تو خیر میں نے اس کے شکار کا انداز نہیں دیکھا۔ لیکن لوگ یہی کہتے ہیں بلکہ جن لوگوں نے مجھے اس کی جانب متوجہ کیا ہے۔ انہوں نے یہی کہا تھا کہ برفانی علاقوں میں شکار کھلانے والا اس سے اچھا آدمی اور کوئی نہیں ہو سکتا۔''

''یقیناً ایسی بات ہو گی۔ لیکن میں جو سوال پوچھ رہا ہوں وہ ذرا مختلف ہے۔ یہ شخص کیا کسی خاص

بیماری کا شکار ہے۔''

''ہاں اس کے بارے میں اس کے ساتھیوں نے بتایا تھا کہ یہ نیند میں چلنے کا عادی ہے۔''

''یہی میں پوچھنا چاہتا تھا۔ رات کو میں نے اسے نیند میں چلتے ہوئے دیکھا تھا۔

''اوہ۔ کیا واقعی آپ نے مجھے کیوں نہیں جگا لیا بابر جاہ صاحب! میں نے اس مرض کے بارے میں صرف سنا ہے کبھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔'' بابر جاہ مسکرا دیا پھر بولا۔

''آپ کو نیند سے جگانے کو دل نہیں چاہا تھا ورنہ خواہش تو یہی تھی۔''

''اگر آپ دوبارہ اسے نیند میں چلتا دیکھیں تو پلیز مجھے بھی جگا لیں میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ نیند میں چلنے والوں کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔''

''میرا تو دل چاہتا ہے کہ دن رات آپ کے ساتھ جاگتا رہوں۔'' بابر جاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یوں لگتا ہے جیسے اب آپ مجھے سکینہ سے واپس نہیں جانے دیں گے۔'' شازیہ نے ایک دل کش مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ہاں بھلا اب کیا سوال پیدا ہوتا ہے اس کا۔''

''کیا مطلب۔'' شازیہ ناز بھرے انداز میں بولی۔

''آپ کو واپس کہاں جانے دوں گا ذرا غور کریں سکینہ کی ملکہ سکینہ میں رہے گی یا کہیں اور جائے گی۔''

''آپ نے نام بڑا اچھا لیا سکینہ کی ملکہ! لیکن وہ ہے کون۔'' بابر جاہ نے مسکراتے ہوئے شازیہ کو دیکھا اور بولا۔

''آپ۔'' اس وقت صوفی کمرے میں داخل ہوا تھا اور بابر جاہ کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔

''صوفی صاحب! کیا کمروں میں داخل ہونے کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ ویسے تو آپ شکل وصورت سے اونٹ ہی معلوم ہوتے ہیں۔ حرکات وسکنات بھی آپ کی اونٹوں جیسی ہیں۔''

''معافی چاہتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔ اصل میں ہم آپ سے بات کرنے آئے تھے۔ ہمیں پتا چلا کہ آپ یہاں موجود ہیں۔ واپس جاتے ہیں دوبارہ اجازت طلب کر لیں گے۔''

''آ جائیے...... آ جائیے...... جب آ ہی چکے ہیں یہاں پر، کیا بات کرنی ہے آپ کو مجھ سے۔''

''وہ ہمیں تو پتا چلا تھا بلکہ شہزادی صاحبہ نے ہم سے یہی کہا تھا کہ انہیں سفید لومڑیوں کا شکار کھیلنے کا شوق ہے اور ہمیں لایا بھی اسی لیے گیا تھا یہاں۔ لیکن ایسا لگ رہا ہے جیسے ہمیں اس چار دیواری میں قید کر کے رکھ دیا گیا ہو۔''

بابر جاہ نے سنجیدہ نگاہوں سے صوفی کو دیکھا اور سرد لہجے میں بولا۔

''تو آپ شکار کھیلنا چاہتے ہیں۔''

جناب دو...... درویشوں کے کرم سے نجیب الطرفین ہے۔ آج تک جو کھایا ہے محنت کر کے کھایا ہے۔ ہمیں شکاری کی حیثیت سے یہاں لایا گیا ہے چھوٹی بیگم صاحبہ سفید لومڑیوں کا شکار کھیلنا چاہتی ہیں۔

ابھی تک اس کا آغاز بھی نہیں ہوا ہم تو یہی چاہتے ہیں۔ اپنا فرض پورا کر دیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے بس یہ احساس قتل کیے دے رہا ہے کہ بیٹھ کر مفت کا کھا رہے ہیں۔ کچھ ہاتھ پاؤں ہلیں تو......"

"شکار کرنا آتا ہے آپ کو۔" بابر جاہ کا لہجہ مذاق اڑانے والا تھا۔

"جی...... دو...... درویشوں کی دعاؤں سے میر شکاری ہیں۔"

"چلیے...... یہی بتا دیجیے کہ یہ میر کیا چیز ہوتی ہے۔ شکاری تو خیر پتا چل گیا۔"

"میں......" ہونقوں کے سے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگا پھر بولا۔

"یعنی بڑے شکاری...... یعنی شکاریوں کے استاد۔"

"اور آپ ان دو شکاریوں کے استاد ہیں۔"

"جج ہاں...... جج، جی ہاں درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے جیب میں پانوں کا بٹوہ تلاش کرتے ہوئے کہا۔ اب اس کے چہرے پر رونق آ گئی تھی۔ اس نے بٹوے کو پیار سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"اصل میں شکاریوں کی صحبت رہی ہے۔ وہ ممن خان ہیں نا اپنے ممن خان کے میاں سسر بڑے نامور شکاری تھے۔ ان کی تو پوری زندگی اعلا درجے کے شکاروں میں گزری۔ بتاتے ہیں کہ وہ آنکھ سے شست نہیں باندھتے تھے۔ بلکہ کان سے نشانہ لیا کرتے تھے۔"

"کان کا نشانہ۔"

"مطلب یہ ہے کہ رائفل کی نال سے کان کے ذریعے نشانہ لیا کرتے تھے۔ یعنی آواز پر نشانہ لگاتے تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ ایسے ہی ایک برفانی علاقے میں لومڑیوں کا شکار کھیلنے نکل گئے۔ رات کا وقت تھا برف کی ایک جمی ہوئی جھیل کے گرد ڈیرے لگائے گئے تھے۔ آدھی رات کا وقت تھا ماحول پر گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پٹ پٹ، پٹ پٹ کی آواز فضا میں ابھری اور ممن خان صاحب کے میاں سسر نے رائفل نکال لی۔ سمجھ گئے کہ لومڑی بیٹھی ہوئی کچھ کھا رہی ہے۔ بس جناب آواز پر نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ لوگ دوڑ پڑے، اور جب اس جگہ پہنچے جہاں نشانہ لیا گیا تھا تو وہاں دیکھا انہوں نے کہ خون کے کچھ چھینٹے ہیں اور پتھر پر لومڑی کی سفید دم رکھی ہوئی ہے پتا یہ چلا کہ لومڑی پتھر پر دم مار رہی تھی۔ نشانہ چونکہ آواز کا لیا تھا اس لیے دم وہاں رہ گئی۔ اور لومڑی بھاگ گئی۔" بابر جاہ دانت پیستے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

"لومڑی بھاگ گئی۔"

"درویشوں کے کرم سے۔"

"ٹھیک ہے آپ شکار کھیلنا چاہتے ہیں۔"

"خود نہیں کھیلنا چاہتے بلکہ چھوٹی بیگم صاحبہ کے دیے ہوئے معاوضے کی ادائیگی کرنا چاہتے ہیں۔"

"آپ کو میں شکار پر [illegible]۔ جائیے تیاریاں کیجیے کل ہم شکار پر چل رہے ہیں۔"

"بہت نوازش بڑا شکریہ درویش آپ کو خوشیاں عطا کریں۔" صوفی نے بٹوہ کھولا تو بابر جاہ غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"یہ گندگی آپ میرے سامنے نہیں کریں گے۔"

"اصلی قوام مراد آبادی۔"

"گیٹ آؤٹ۔" بابر جاہ غرایا اور صوفی خوف زدہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔ پھر اس کے منہ سے ہلکی سی آواز نکلی۔

"درویش رحم کریں۔" اور اس کے بعد وہ باہر نکل گیا۔ بابر جاہ نے شازیہ کی طرف دیکھا اور بولا۔

"کس جال میں پھنس گئی ہیں آپ مس سونیا کیا چیز ہے یہ شخص میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ اگر آپ کو واقعی لومڑیوں کے شکار کا شوق تھا تو کسی ڈھنگ کے آدمی سے کام لیا ہوتا۔"

"میں نے کہا نا میرے سیکریٹریوں نے پتا نہیں کہاں سے ان صاحب کو تلاش کر لیا۔ میں تو ویسے بھی یہاں کے ماحول سے ناواقف ہوں۔"

"آپ کے دونوں سیکریٹری بھی مجھے گدھے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ بہر حال کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ کو بھی شکار کا شوق ہے۔

جہاں تک لومڑی کی کھالوں کا تعلق ہے میں آپ کو اپنا گودام دکھاؤں گا۔ سیزن میں میرے آدمی شکار کھیلتے ہیں۔ اور لومڑیوں کی کھالیں ایکسپورٹ کرتے ہیں بڑا اعلا درجے کا ذخیرہ ہے میرے پاس آپ دیکھیں گی تو خوش ہو جائیں گی اور یہ لمبو اونٹ کا بچہ کل اسے شکار کھلاؤں گا۔ زندگی بھر یاد رکھے گا۔" بابر جاہ نے کہا اور اس کے بعد اس نے باز میر کو بلا لیا۔

"باز میر شکار کی تیاریاں کرو۔ کل ہم شکار کے لیے نکلیں گے۔"

"ٹھیک ہے خان جی۔" باز میر نے جواب دیا۔

♥......♥......♥

تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں صوفی نے رات کو خفیہ طور پر خانم فردوسیہ سے رابطہ قائم کیا تھا۔

"شکار پر جا رہے ہیں ہم لوگ درویشوں کے کرم سے۔"

"اوہ اچھا۔ مگر صوفی صاحب کیا میں نہیں جا سکتی شکار پر۔"

"محترمہ عالیہ۔ یہ فیصلہ تو آپ کریں گی درویشوں کی دعاؤں سے، ویسے میرا خیال ہے آپ کا جانا مناسب ہوگا کم از کم آپ قرب و جوار کی نشان دہی تو کر سکیں گی۔ وہ جگہ جہاں آپ کے خیال میں کوئی غلط کام ہوتا ہے۔"

"ہاں ایسے پوائنٹس تو میرے ذہن میں ہیں۔ خیر ٹھیک ہے صوفی صاحب! میں خود کوشش کروں گی۔" اور جب خانم نے تیاریاں ہوتے اور گاڑیاں کستے ہوئے دیکھا تو وہاں پہنچ گئی۔

"کیا تم لوگ شکار کھیلنے جا رہے ہو۔" اس نے براہ راست بابر جاہ سے سوال کیا۔ بابر جاہ نے پر ادب لہجے میں کہا۔

"ہاں بھابی خانم! یہ مہمان جو آئے ہیں نا ہمارے انہیں بھی شکار کا بڑا شوق ہے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تھوڑی سی سیر کرا دی جائے انہیں۔"

"کیا میں اس قابل نہیں تھی کہ تم لوگ مجھے بھی پوچھ لیتے۔" خانم نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

''نہیں بھابی خانم! یہ بات نہیں ہے ہم نے سوچا کہ آپ شاید ہماری کمپنی پسند نہ کریں۔''

''ہاں میرے لیے تو زندگی کی ساری دلچسپیاں موجود ہیں۔ اس دن گئی تھی سوچا تھا کہ شاید تم بھی ساتھ دو اور یہ سوچ کر کہ بھائی اس دنیا میں نہیں ہے۔ تو کم از کم بھابی کے لیے بھی تو تھوڑا سا وقت نکال لو لیکن بابر جاہ تم ہمیں اپنے ذہن سے نکال چکے ہو۔''

''ارے ارے نہیں بھابی خانم! ایسی بات نہیں ہے۔''

''ہے نا ایسی ہی بات ورنہ ایک بار تو پوچھ لیتے مجھے نہیں تو کم از کم بھتیجی کو پوچھ لیتے جو باپ کی موت کے بعد ایک ایک کی شکل دیکھتی رہتی ہے۔''

''آپ پلیز چلیے ہمارے ساتھ۔ ایسی کوئی بات بالکل نہیں تھی بھابی خانم! چلیے آپ ہمارے ساتھ۔'' بابر جاہ نے بہ حالت مجبوری کہا۔

''ہاں میں جاؤں گی۔ تم لوگ کتنا ہی مجھے نظر انداز کر دو لیکن میرا بھی دل چاہتا ہے۔'' اور خانم تیار ہونے چل پڑی۔

بابر جاہ ہونٹ سکوڑے اسے دیکھتا رہا پیچھے ہی باز میر کھڑا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

''خان جی۔''

''ابے خان جی کے بچے! سارا کیا دھرا چوپٹ ہو جائے گا ہم تو بڑے تفریحی پروگرام بنا رہے تھے۔ اس سالے لم ڈھینگ کو سبق دینا تھا پر مصیبت کہاں سے گلے پڑ گئی اور پھر سونیکا یار! بڑی گڑ بڑ ہو گئی۔''

''خان جی ایک بات کہوں وہ جو ایک مثال ہے نا کہ گیڈر کی جب موت آتی ہے تو شہر کی طرف دوڑتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں آج یہ کھیل بھی ختم کر دیں۔''

''کون سا کھیل۔''

''یہی پھانس جو آپ کے دماغ میں چبھتی ہے۔ میری مراد خانم فردوسیہ سے ہے لے جاتے ہیں وہیں پر دھڑن تختہ کر دیں گے۔''

''دھڑن تختے کی اولاد! کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ ابھی یہ ممکن نہیں ہے جائیداد اور زمینوں کا قصہ جب تک ختم نہیں ہو جاتا ساری چیزیں میرے نام منتقل نہیں ہو جاتیں۔ خانم اور آراشیہ کی زندگی ضروری ہے میں ایک ایک کر کے مختلف طریقوں سے ضروری کاغذات پر دستخط لوں گا۔ ان کی زندگی تو بہت ضروری ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہو خان جی! یہ بات پتا نہیں کیوں بار بار میرے دماغ سے اتر جاتی ہے۔''

''اپنے دماغ کا علاج کرا جب تو یہ باتیں کرتا ہے تو مجھے بڑا غصہ آتا ہے۔''

''ٹھیک ہے خان جی! کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس چلا جاؤں گا۔'' باز میر نے سوکھے سے منہ کے ساتھ کہا۔

''ایک کام کرنا ہے تجھے۔''

''بولو خان جی! حکم کرو۔''

''ہمیں کسی خاص پوائنٹ پر جا کر الگ ہو جانا ہے اور تجھے اس سلسلے میں میری مدد کرنی ہے۔''

''ٹھیک ہے خان جی! یہ کون سی بڑی بات ہے آپ کا مطلب ہے کہ آپ میڈم کے ساتھ......۔''

''جی میرا یہی مطلب ہے۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے۔'' بابر جاہ نے کہا۔

''جی نہیں۔ بالکل نہیں ہم تو آپ کو مبارک باد دینے والوں میں سب سے آگے آگے ہیں۔''

''جو میں نے کہا ہے اس کا پورا انتظام بھی کرنا ہے اور خیال بھی رکھنا ہے۔''

''آپ فکر ہی مت کرو جی۔''

''ایسا نہ ہو کہ خانم میرے پیچھے پیچھے رہیں اور میں تیرا سر پھاڑنے پر غور کروں۔''

''نہیں اس کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔'' باز میر نے بے غیرتی سے ہنستے ہوئے کہا۔

ادھر صوفی بھی اپنے گروپ کے ساتھ تیار ہو گیا تھا۔ دلاور اور غلام قادر نے چست لباس پہنے ہوئے تھے اور صوفی کو دیکھ کر بڑی مشکل سے اپنی ہنسی دبا رہے تھے کیونکہ صوفی بھی اس وقت زبردست قسم کے شکاری لباس میں تھا اور اس کی اس ہیئت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پانوں کی جگالی بہ دستور چل رہی تھی۔ پانوں کا بٹوہ اس طرح پتلون کی بیلٹ کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ جیسے ہولسٹر لٹکا ہوا ہو۔ کارتوسوں کی پیٹیاں اس نے دونوں شانوں پر سجائی ہوئی تھیں اور اس میں بارہ بور کے زبردست کارتوس بھرے ہوئے تھے۔ اور اس... چمڑے کا ایک کیس موجود تھا دونوں شانوں سے رائفلیں لٹک رہی تھیں اور وہ واقعی میر شکاری نظر آ رہا تھا۔ آراشیہ نے تو اس کی طرف دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ماں نے پوچھا تو وہ ہنس کر بولی۔

''ماما! قسم سے یہ جانور ہمارے چڑیا گھر میں کیسا اچھا لگے گا۔ ماما پلیز ایک چڑیا گھر بنا لیجیے گھر میں۔''

''بری بات ہے آراشیہ! تم چاہے کچھ بھی کہو میں کرنل رحیم شاہ کو معمولی شخصیت نہیں سمجھتی۔''

''ایک بات اور ہے ممّا!''

''ہاں کہو۔''

''آپ کو کرنل رحیم شاہ بھابی کہتے ہیں نا۔''

''ہاں۔''

''کہیں انہوں نے بھابی دیور کا رشتہ نہ نبھایا ہو۔''

''بے کار باتیں نہ کرو تیار ہو جاؤ۔'' خانم کے لیے الگ جیپ تیار کی گئی تھی۔ لیکن جب صوفی نے اپنی جیپ اسٹارٹ کی تو بابر جاہ بے چینی سے بولا۔

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ صوفی صاحب! تین گاڑیاں جا رہی ہیں کافی نہیں ہوں گی۔'' بابر جاہ کو اپنا منصوبہ فیل ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ان تینوں گاڑیوں کے سلسلے میں اس نے اپنا پروگرام ترتیب دے دیا تھا۔ ایک گاڑی کو وہ راستے سے ہی غائب کرنا چاہتا تھا۔ جس میں شازیہ اس کے ساتھ ہوتی۔ یہ بات اس نے باز میر کو بتا دی تھی باز میر نے کہا۔

''خان جی! آپ بالکل فکر مت کرو۔ آپ عیش کرو جی! ہم ساری صورت حال کو سنبھال لیں گے۔''

لیکن اب یہ چوتھی بے تکی جیپ جسے نہ جانے کون سے زمانے میں اور کس نے خریدا تھا۔ جو طرح طرح کے سامان سے لدی ہوئی تھی۔ پیٹرول کے چھوٹے چھوٹے ڈبے ایک مخصوص انداز میں اس میں سجے ہوئے تھے۔ اور اس

کے علاوہ بھی نہ جانے کیا کیا الم غلم۔

بہر حال باز میر سے یہ بات طے ہو چکی تھی کہ تھوڑا سا وقت ان لوگوں کے ساتھ گزاریں گے اور راستہ بدل دیں گے۔ غرض یہ کہ اس سج دھج کے ساتھ یہ گاڑی چل پڑی۔ صوفی نے معذرت کرتے ہوئے کہا تھا۔

''جناب اعلا! وہ جو کہتے ہیں نا کہ بیوی اور گاڑی اپنی ہونی چاہیے اور اپنے ساتھ رہنی چاہیے تو درویشوں کی دعاؤں سے، بیوی کا تو کوئی وجود نہیں ہے۔ لیکن گاڑی ہماری اپنی ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے ہم ان کے نخرے اٹھا لیا کرتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے اور عزت سادات رہ جاتی ہے۔''

''شرم کی بات ہے صوفی صاحب! آپ نے اس طرح محدود کر لیا ہے اپنے آپ کو کیا کہا جائے آپ کے بارے میں۔''

''لغویت سے پرہیز فرمایئے درویشوں کی دعاؤں سے ہمیں بھی غصہ آتا ہے۔'' صوفی نے برا مان کر کہا۔ اور بابر جاہ کے قہقہے ابلنے لگے۔ گاڑیاں چل پڑیں۔

بابر جاہ شازیہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اور بار بار اس کی جانب دیکھنے لگتا تھا۔

شازیہ اس کے لیے ایک عجیب و غریب حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ جب کہ وہ اس طرح کا انسان نہیں تھا اس نے سوچا تھا کہ زندگی میں تھوڑا بہت ٹھہراؤ بھی تو ضروری ہوتا ہے۔ اگر یہ لڑکی اس کی بیوی کی حیثیت سے پہاڑوں میں فروکش ہو جائے تو اچھا وقت گزرے گا۔ اس نے شازیہ سے کہا۔

''سونیکا! اپنے مستقبل کے بارے میں تم نے کیا سوچا۔ باہر کی دنیاؤں میں زندگی گزارنے کے بعد جب تم نے اپنے وطن کا رخ کیا ہو گا تو تمہارے ذہن میں خیالات تو بہت سے ہوں گے۔'' شازیہ مسکرا کر بولی۔

''ہاں تھے۔ بابر جی! ایک عمر ایسی ہوتی ہے جس میں انسان خواب دیکھے بغیر نہیں جی سکتا۔''

''آپ بھی خواب دیکھتی رہی ہیں۔''

''کیوں۔ کیا وہ عمر مجھ پر نہیں آئی۔''

''آپ تو اس عمر سے گزر رہی ہیں۔''

''گذار تو نہیں چکی ہوں نا۔''

''کتنی بامحاورہ باتیں کر لیتی ہیں آپ حالانکہ آپ نے دیار غیر میں وقت گزارہ ہے۔''

''بس میں بھی پہاڑوں کے شہزادے کے خواب دیکھتی رہی ہوں۔''

''پہاڑوں کے شہزادے کے۔'' بابر جاہ کا سینہ خوشی سے پھول گیا۔

''ہاں۔''

''ملا وہ شہزادہ آپ کو۔''

''آپ کا کیا خیال ہے۔'' شازیہ نے کہا۔

''نہیں یہ بات تو آپ بتائیں گی سونیکا۔''

''نہیں میں کچھ نہیں بتاؤں گی وہ دیکھیے وہ کیا چیز ہے۔'' شازیہ نے ایک طرف اشارہ کیا اور بابر جاہ چونک کر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر تعجب سے بولا۔

''کہاں؟ کیا ہے؟ ایک منٹ۔'' یہ کہہ کر اس نے دوربین آنکھوں سے لگائی اور دیر تک دیکھتا رہا۔

''مجھے تو کچھ نظر نہیں آیا، کیا تھا؟۔''

''لیجیے مجھے کچھ نظر نہیں آیا کچھ ہوتا تو بتاتی۔'' شازیہ نے کہا اور قہقہہ مار کر ہنس پڑی بابر جاہ شرمندہ ہو گیا تھا۔ پھر وہ بولا۔

''تو مذاق ہو رہا تھا جناب۔''

''جی۔''

ادھر خانم فردوسیہ جان بوجھ کر صوفی کے ساتھ اس کی جیپ میں بیٹھی تھی۔ آراشیہ بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ صوفی کے بارے میں یہ جان کر کہ اس کا تعلق کرنل رحیم شاہ سے ہے ماں بیٹی کو شدید حیرت تھی۔ کبھی کبھی تو خود خانم فردوسیہ سوچنے لگتی تھی کہ کہیں کرنل رحیم شاہ نے اس کی بات کو محض مذاق سمجھ کر تو نہیں ٹال دیا۔ فردوسیہ کے شوہر نے کرنل رحیم شاہ کے بارے میں اچھی رائے کا اظہار کیا تھا اس سے خانم فردوسیہ متاثر ہوئی تھی۔ اور اتنی مشقت اٹھا کر کرنل رحیم شاہ تک پہنچی تھی۔ اس وقت بھی صوفی اس سے تھوڑے سے فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور دلاور جیپ ڈرائیو کر رہا تھا۔ غلام قادر جیپ کے پچھلے حصے میں بیٹھا ہوا تھا۔ دفعتاً آراشیہ نے کہا۔

''مما! یہ گاڑی تو بڑے کمال کی بنی ہوئی ہے۔ آپ دیکھ رہی ہیں کہ اس ناہموار راستے پر بھی کوئی جرک نہیں ہے۔ ویسے انکل صوفی کیا اس کار بنانے والی کمپنی نے صرف یہی ایک گاڑی بنائی تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے تو ہم نے کبھی ایسی گاڑی کی تصویر بھی نہیں دیکھی۔''

''درویش بہتر جانتے ہیں۔ بس شکار کے لیے اس سے اچھی گاڑی دوسری نہیں ہو سکتی۔''

''ایک بات بتایئے انکل! آپ خود بھی تو درویش ہیں۔''

''توبہ توبہ۔ درویش رحم کریں۔ یہ تو بڑی بعد کی منزل ہوتی ہے نہ جانے انسان کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ تب کہیں درویش کا درجہ ملتا ہے۔ ایک بات بتائیں گی آپ۔''

''جی۔''

''کبھی آپ نے اپنی حویلی میں قوالیاں کروائی ہیں۔''

''قوالیاں'' آراشیہ ہنس پڑی۔

''کیوں؟ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔''

''ہنسنے کی بات یہ ہے کہ میں قوالیوں کے بارے میں جانتی ہوں۔ ایک بہت موٹا سا آدمی بیچ میں بیٹھا ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے وہ سیاروں پر رہنے والی مخلوق سے محو گفتگو ہو اور اس کے ساتھ باقی لوگ اس خلائی مخلوق کو بھگانے میں کوشاں ہوں۔ ہاتھ ایک دوسرے پر مار مار کر منہ سے ہش ہش کر کے۔ ایک عجیب و غریب صورت حال ہوتی ہے، آپ اسی کی بات کر رہے ہیں نا۔''

''توبہ فرمایئے، توبہ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''اچھا ایک بات بتایئے۔ میں درویشوں کی دعاؤں سے توبہ کیسے فرماؤں۔''

''مم...... میرا...... مطلب ہے۔ ہمارا مطلب ہے کہ...... کہ۔''

"انکل! اچھا ایک بات اور بتائیے یہ آپ اتنے پان کیوں کھاتے رہتے ہیں۔ آپ نے کبھی آئینے میں اپنی شکل دیکھی ہے۔"

"آراشیہ!" مما کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

"مما! میں انکل سے معذرت کر لیتی ہوں۔ میں نے کسی مقصد کے تحت یہ بات نہیں کہی میرا مطلب ہے انکل! اتنے پان کھاتے ہیں اور انہوں نے اپنا حلیہ پتا نہیں ایسا کیوں بنا رکھا ہے۔ انکل! یہ بتائیے آپ کپڑے پہنتے ہیں نا۔ وہ کون سے سیارے کے ہیں۔"

"ان کا تعلق شرفا سے ہے۔"

"شرفا! کیا یہ کسی قبیلے کا نام ہے۔" آراشیہ نے کہا اور قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

"ہاں۔ یہی سمجھ لیجیے۔ شرفا کا ایک قبیلہ ہوتا ہے درویشوں کے کرم سے۔"

"قبیلہ بھی درویشوں ہی کے کرم سے ہوتا ہے۔"

"بی بی! آپ درویشوں کے بارے میں جانتی نہیں ہیں۔ اس لیے اس طرح کی باتیں کر رہی ہیں یوں سمجھ لیجئے کہ یہ تختہ زمین درویشوں نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے آپ جو کچھ اپنی دنیا میں دیکھتی ہیں اس کے پس منظر میں درویشیت اور روحانیت کی ایک دنیا آباد ہے۔ شہر کا نظام آئی جی ڈی آئی جی۔ ایس پی ڈی ایس پی۔ اور اس کے بعد انسپکٹر اور سب انسپکٹر اور پھر کانسٹیبل سنبھالے ہوئے ہوتے ہیں ایک ایسا نیٹ ورک ہوتا ہے جس کے تحت شہر میں امن و امان اور برائیوں کی روک تھام کا عمل ہوتا ہے۔ آپ یہ سمجھ لیجئے روحانیت کی دنیا میں بھی یہی تمام عہدے ہوتے ہیں مقصد یہ کہ ان کے مساوی عہدے اور اس طرح درویش، ولی، مجذوب، ابدال یہ اپنے اپنے کام سنبھالے ہوئے ہوتے ہیں اور شہری نظام کو ان آفات سے بچاتے ہیں جو برائیوں کے نتیجے میں وجود میں آتی ہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ جرائم کی کیا کیا اقسام ہیں۔ بعض جرائم قابل دست اندازی پولیس ہوتے ہیں۔ اخلاقی اور ایمانی جرائم ہوتے ہیں۔ اور بعض جرائم پس پردہ ہوتے ہیں برائیاں انسان کے وجود میں پرورش پاتی ہیں اگر ان ساری برائیوں کو فروغ حاصل ہو جائے تو سمجھ لیجئے آپ کہ یہ چھوٹی سی کائنات جہنم کا نمونہ بن جائے گی۔ معافی چاہتا ہوں۔ اب آپ خود دیکھ لیجئے خانم فردوسیہ آپ کے گھر سے جرم جنم لے رہا ہے۔" خانم فردوسیہ نے بوکھلائی ہوئی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اور بولی۔

"چھوڑیئے صوفی صاحب! اس موضوع پر پھر کبھی بات کر لیں گے۔"

"درویش ہم سب کو اپنی پناہ میں رکھیں۔" صوفی نے کہا۔

خاصا سفر طے کر لیا گیا تھا۔ اب تاحد نظر برف کے ویران پھیلے ہوئے تھے ابھی تک انہوں نے گاڑیاں نہیں روکی تھیں حالانکہ کئی بار برفانی لومڑیوں کے غول سامنے سے گزر رہے تھے، لیکن بابر جاہ نے ان پر گولی نہیں چلائی تھی۔ ویسے بھی طریقہ کار یہی ہوتا ہے کہ پہلے کسی جگہ کیمپ لگایا جاتا ہے اور اس کے بعد منظم طریقے سے شکار کھیلا جاتا ہے۔" شازیہ نے یہ سوال بابر جاہ سے کر ہی ڈالا۔

"میرا خیال ہے جو لومڑیاں ہمارے سامنے سے گزر جاتی ہیں ان سے ہمارا کوئی روحانی تعلق نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" بابر جاہ ہنس پڑا۔

"آخر ہم شکار کیوں نہیں کر رہے؟"

"وجہ ہے اس کی۔" بابر جاہ مسکرا کر بولا۔

"کیا وجہ ہے۔"

"اگر ہم شکار کا آغاز کر دیتے ہیں تو شکار یہیں سے شروع ہو جائے گا۔ جب کہ میں یہاں سے ہٹ کر صحیح معنوں سے شکار کے لطف سے آشنا کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر تک ہم لوگ ان کے ساتھ رہیں گے اور اس کے بعد شکار ہی کھیلنے کے انداز میں ان سے دور ہو جائیں گے۔ بعد میں پورا دن یہ شکار کھیلیں گے اور ہم......" بابر جاہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

عادل اور فیضان کو اس نے دوسری گاڑی میں اپنے آدمیوں کے ساتھ رکھا تھا حالانکہ وہ باڈی گارڈز کے طور پر ساتھ تھے لیکن اس سلسلے میں بھی بابر جاہ نے کہا تھا۔

"محترمہ! آپ پہاڑوں کی پناہ میں ہیں۔ آپ کو ان معمولی سے باڈی گارڈز کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کے باڈی گارڈز تو ہم لوگ ہیں۔" شازیہ مسکرا کر خاموش ہو گئی تھی۔

"یہ سفر ایک جگہ ختم ہوا اور یہاں کیمپ لگا دیا گیا بہت ہی خوب صورت پیراشوٹ کے خیمے جگہ جگہ نصب کر دیے گئے اور جنگل میں منگل ہو گیا برف کے اس وسیع و عریض میدان میں یہ خیمے بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ ہنگامہ آرائی شروع ہو گئی۔ کھانے پینے کا بندوبست کیا گیا۔ صوفی وغیرہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے تھے۔

فیضان کی نگاہیں شازیہ پر تھی جو یہاں آنے کے بعد سے اب تک بابر جاہ کے ساتھ نظر آتی رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ دور بین آنکھوں سے لگائے شازیہ اور بابر جاہ کو فوکس کیے ہوئے تھا کہ عادل اس کے پاس پہنچ گیا۔

"میں نے تمہارے اینگل کا جائزہ لے لیا ہے تم اس وقت ان دونوں کو دیکھ رہے ہو۔"

"عادل مجھے ایک بات بتاؤ۔ شازیہ! ہمارے درمیان ایک کارکن کی حیثیت رکھتی ہے۔ تم بھی بے وقوف نہیں ہو۔ میں بھی بے وقوف نہیں ہوں۔ اس نے جو رویہ اور طریقہ کار اپنایا ہے تمہارے خیال میں کیا وہ ہمارے لیے قابل برداشت ہے۔"

"دیکھو میں تمہیں ایک بات بتاؤں اصولی طور پر اگر میرے دل کی بات پوچھتے ہو تو مجھے کرنل صاحب کا یہ طریقہ کار پسند ہی نہیں آیا یہ شخص جس کا نام صوفی ہے آخر ایسی کون سی خوبیوں کا مالک ہے اگر بعض معاملات میں اس کا ساتھ دے دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ یہ کوئی مدبر ہو گیا۔ چلو۔ پچھلے معاملے میں کوئی تکا لگ گیا لیکن ہر بار ایسا کوئی تکا لگ سکتا ہے۔

"اس بات کو چھوڑو۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ کیا شازیہ اسی لیے یہاں آئی تھی کہ اپنے لیے تابناک مستقبل تلاش کرے مجھے تو یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ اس نے بابر جاہ کو اپنے جال میں پھانس کر اپنے مستقبل کا بندوبست کر لیا ہے؟"

"کیا کہا جا سکتا ہے۔" انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ صوفی ان کے عقب میں آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔

عادل نے گہری سانس لے کر کہا۔

''بہر حال اس کا ماضی اس کی شخصیت کا عکاس ہے وہ کہیں سے......''

''درویش رحم کریں۔ آپ لوگ بڑی غلط گفتگو فرما رہے ہیں۔ درویشوں کے کرم سے''صوفی کی آواز سنائی دی اور دونوں چونک کر پلٹے۔ صوفی نے کہا۔

''دیکھیے آپ میں سے ہر شخص کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ کسی بھی کیس کی تفتیش کرتے ہوئے آپ لوگ اپنے ذہن سے بھی کام لے سکتے ہیں اور اگر کوئی مناسب ترکیب آپ کے ذہن میں آجائے تو زیادہ سے زیادہ اتنا کریں کہ مشورہ کرلیں آپس میں کہ اس پر عمل کرنا مناسب ہے یا نہیں۔ جہاں تک گرین فورس کے ممبروں کے کردار کا تعلق ہے تو سب سے پہلے آپ کو اپنے آپ پر اعتبار کرنا ہوگا۔ اگر آپ کو اپنے اوپر اعتماد نہیں ہے تو سمجھیے سب کچھ بے کار ہے۔ شازیہ کے ماضی کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہتے تھے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''وہ......وہ نہیں چھوٹے بابا! اصل میں۔''

''بات کھل کر کرنی چاہیے ورنہ آپ کو غیر مخلص قرار دیا جا سکتا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

صوفی کے لہجے میں ایک انوکھی کرختگی تھی جسے ان دونوں نے محسوس کرلیا۔

''چھوٹے بابا! آپ یقین کریں گرین فورس کا ایک ایک کارکن غلام قادر اور دلاور سمیت ہمیں بالکل اپنا لگتا ہے اور یہ ایک خاندان بن گیا ہے صرف ٹیم نہیں۔ شازیہ ہماری عزت ہماری آبرو ہے آپ دیکھیے، لیجیے یہ دوربین۔''

''درویشوں کا کرم ہے میری بینائی بہت تیز ہے۔ شازیہ نے ہم لوگوں سے مشورہ کیے بغیر ایک ایسے نقطے پر انگلی رکھ دی ہے درویشوں کے کرم سے جو ہمیں کامیابی کی منزل تک پہنچا دے گا۔ بابر جاہ ہی اس سلسلے میں سرفہرست ہے۔ اور شازیہ نے موقع سے فائدہ اٹھا کر جال ڈال دیا ہے۔ شازیہ ہمیں بہت جلدی رزلٹ دے گی بس اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہیں کر رہی مجھے بھی اعتماد ہے درویشوں کی دعاؤں سے اور آپ کو بھی اعتماد ہو جانا چاہیے۔''

''سوری چھوٹے بابا! فیضان نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔ شکار کی تیاریاں ہوئیں صوفی نے اپنی جیپ کو بدستور اپنے استعمال میں رکھا تھا۔ وہ اس سے اترا ہی نہیں تھا جب کہ کئی بار بابر جاہ نے بھی اس سے کہا کہ وہ میر شکاری کے طور پر ان کے ساتھ آگے آگے آئے خانم اور آراشیہ بھی صوفی کے ساتھ تھیں۔ کیمپ میں کچھ ملازموں کو چھوڑ دیا گیا تھا اور یہ لوگ شکار کھیلنے کے لیے نکل پڑے تھے۔ اب باقاعدہ انتظام کیا گیا تھا۔ بابر جاہ نے کہا۔

''بس تھوڑی دیر ان کے ساتھ گزارتے ہیں ذرا تمہارے میر شکاری کو بتاؤں کہ سفید لومڑیاں اتنی شریف زادی نہیں ہوتیں کہ آسانی سے شکار کرلی جائیں ان کے شکار کا ایک طریقہ کار ہوتا ہے۔''

''مگر آپ کیا کریں گے بابر جاہ صاحب۔''

''وہ دیکھیے لومڑیوں کا ایک غول سامنے آرہا ہے۔'' بابر جاہ نے کہا۔

صوفی وغیرہ نے بھی لومڑیاں دیکھ لی تھیں۔ خانم نے کہا۔

''صوفی صاحب! ہمارا مقصد بے شک شکار نہیں ہے آپ نے یہاں کے حالات کا کچھ اندازہ لگایا۔''

''جن علاقوں سے میں گزرا ہوں درویشوں کے کرم سے میرا ان کے بارے میں یہ اندازہ ہے کہ وہاں سرحد پار اسمگلنگ نہیں ہو سکتی چونکہ راستے دشوار گزار ہیں۔ جو کارروائیاں ہو رہی ہیں اس کے لیے یقینی طور پر کوئی ایسی جگہ موجود ہے جہاں سے سرحد عبور کی جا سکتی ہے۔ اور محافظوں کے علم میں نہیں آتی۔''

''ہمیں جگہ تلاش کرنی ہے۔''

''گولی چلائیے لومڑیاں قریب آچکی ہیں۔'' صوفی نے پریشان نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اسی وقت ایک فائر ہوا اور لومڑیوں کے غول نے راستہ بدل لیا۔ صوفی کے منہ سے آواز نکلی۔

''خدا کا شکر ہے بچ گئیں درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''جی۔'' آراشیہ حیرت سے بولی۔

''بی بی دیکھو تو سہی برف کی یہ سفید شہزادیاں، معصوم معصوم سی، دم اٹھائے، اپنی زندگی کے سفر میں مصروف ہیں ہم انہیں مار کر کیا کریں گے؟''

''ارے تو کیا آپ شکار نہیں کھیلیں گے۔''

''ہم لومڑیوں کا شکار نہیں کھیلتے۔ ہاں اگر برفانی ریچھ یا پھر خوف ناک درندے سامنے آئے تو ان سے اپنی جان بچانے کے لیے گولی چلائی جا سکتی ہے۔ ان بے چاریوں کو مارنے سے کیا فائدہ۔'' آراشیہ ایک گہری سانس لے کر ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ خانم فردوسیہ نے گردن ہلا کر کہا۔

''خدا کی قسم یہی نظریات میرے ہیں صوفی صاحب! اللہ آپ کو سلامت رکھے۔''

دوسری طرف بابر جاہ ہنس رہا تھا۔

''یہ آپ کے میر شکاری صاحب تو ایک بھی لومڑی نہیں مار سکے۔''

''آپ نے فائر کر کے انہیں بھگا جو دیا۔''

''یہی تو میرا منصوبہ ہے ایک لومڑی مار کر دکھا دے یہ شخص تو میں جانوں۔ آپ بھی رابعہ بس یونہی ہیں بلاوجہ ایسے لوگوں پر بھروسا کر لیتی ہیں۔''

''آپ نے مجھے رابعہ کہہ کر پکارا۔''

''ہاں۔ سونیکا اجنبی نام لگتا ہے۔ اور اب آپ میرے لیے اجنبی نہیں رہی ہیں حالانکہ بہت خوب صورت نام ہے آپ کا لیکن میں آپ کو صرف رابعہ کہوں گا۔ آپ نے ایک بات کہی تھی نا رابعہ۔''

''کیا۔''

''آپ نے کہا تھا کہ آپ کو بھی پہاڑوں کے شہنشاہ کا انتظار ہے اور یہ آپ کی عمر کا تقاضا بھی ہے۔''

''جی کہا تھا۔''

''تو آئیے میں آپ کو پہاڑوں میں اپنی مملکت دکھاؤں۔ آئیے۔''

''جی!'' تو کیا ان پہاڑوں میں بھی آپ کی کوئی مملکت ہے۔'' شازیہ نے بابر جاہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی ہے۔''

''سنگینہ سے ہٹ کر؟''

''علاقہ تو یہ پورا سنگینہ ہی کا ہے لیکن میری مملکت کی برانچ...... باز میر! میں ذرا اسٹیشن فور جا رہا ہوں تم لوگ ادھر کے حالات سنبھالو۔''

''ٹھیک ہے خان جی! آپ بے فکر رہیں۔'' باز میر نے کہا اور اس کے بعد اچانک بابر جاہ نے اپنی جیپ کا رخ تبدیل کر دیا۔ اس وقت وہ ایک ایسی ڈھلان میں تھا جہاں سے صوفی وغیرہ اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ سفر چونکہ ساتھ ساتھ ہی ہو رہا تھا اس لیے بابر جاہ نے اپنی جیپ خاص طور سے ڈھلان میں رکھی تھی۔ تاکہ داہنے ہاتھ پر سفر کرنے والوں کو اس کی جیپ نظر نہ آئے وہ سیدھا ہی سیدھا جیپ کو ایک طرف لیے چلا گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد دوسری گاڑیاں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں۔

شازیہ کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا دو صورتیں تھیں۔ پہلی تو یہ کہ وہ بابر جاہ کے ساتھ سفر کرنے سے انکار کر دے۔ ٹرانسمیٹر اس کے پاس موجود تھا۔ لیکن ظاہر ہے وہ اسے فی الفور استعمال نہیں کر سکتی تھی دوسری صورت یہ تھی کہ اگر بابر جاہ کو بے وقوف بنا کر آگے کے بارے میں معلومات حاصل ہو جاتیں تو یہ ایک بڑی کامیابی ہوگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے صوفی سے اجازت لیے بغیر بابر جاہ کو اپنا ٹارگٹ بنا لیا تھا۔ اصل میں تھوڑی بہت معلومات انہیں ان معاملات کے بارے میں صوفی سے ہی ملی تھیں کہ اصل کیس کیا ہے اور سنگینہ میں انہیں کیا کرنا ہے۔ ان حالات میں بابر جاہ نے جیسے ہی اس کی جانب توجہ سے دیکھا تو اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ شخص کام کا ہو سکتا ہے اور اگر جڑ پر ہی ہاتھ ڈال دیا جائے تو باقی شاخیں اور پتیاں خود بہ خود قابو میں آ سکتی ہیں۔ باہر کی دنیا میں وہ ہر طرح کے کرداروں سے نمٹ چکی تھی۔ اس سے پہلے ملازمتوں کی تلاش میں دفتروں کے چکر کاٹے تھے۔ تب بھی اسے اس طرح کے سینکڑوں لوگ ملے تھے۔ جو اسے ملازمت نہیں دینا چاہتے تھے بلکہ اس کی کفالت کرنا چاہتے تھے۔ پھر جب بھکاریوں کی دنیا میں آئی تو لوگوں سے واقفیت حاصل ہوئی۔ اس طرح اسے یہ تجربہ اچھی طرح ہو چکا تھا اور بابر جاہ کے مزاج کو وہ اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔

اس نے اللہ پر بھروسا کیا اور فیصلہ کر لیا کہ اگر بابر جاہ کسی غلط ارادے سے اسے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے تو اس تربیت کو کام میں لائے گی جو پہلے بھی اس نے حاصل کی تھی۔ اور اس کے بعد صوفی نے بہت سے گر اسے بتا دیے تھے۔ چنانچہ اس نے اپنا دل مضبوط کیا اور بابر جاہ سے باتیں کرتی رہی۔ لیکن ان راستوں کو وہ پوری طرح اپنے ذہن میں رکھ رہی تھی جن سے بابر جاہ گزر رہا تھا۔ یہاں تک کہ بابر جاہ ایک [illegible] برفانی دیوار کے پاس پہنچ گیا جس کے دوسری طرف بھی پہاڑی ٹیلے موجود تھے۔ برفانی [illegible] اور پہاڑی ٹیلے میں موجود تھے اور بابر جاہ نے جیپ اس برفانی دیوار کی آڑ میں روک دی۔

''کیسی عجیب جگہ ہے۔'' شازیہ نے حیران لہجے میں کہا۔

''ہاں۔ میری اصل مملکت۔'' بابر جاہ مسکراتے ہوئے بولا۔

کافی وقت گزر چکا تھا اور اب شام زمین پر اترنے لگی تھی ایسے برفانی علاقوں میں جب بادل جھکتے ہیں تو آن کی آن میں منظر بدل جاتا ہے ان لوگوں نے سفر کا آغاز دن کی روشنی میں کیا تھا اس کے بعد کیمپ

وغیرہ لگانے اور کھانے پینے میں خاصا وقت گزر گیا تھا پھر وہ برف پر شکار کے لیے نکلے تھے۔ برف کی سفیدی جہاں روشنی کو مزید چمکا دیتی ہے۔ وہیں اگر بادل جھک آئیں تو شام کے سائے میں اس پر اسی برق رفتاری سے جھکتے ہیں۔

بابر جاہ نے شازیہ کو اشارہ کیا اور پھر وہ غار جو برف میں چھپا ہوا تھا۔ شازیہ کی نگاہوں کے سامنے آیا بابر جاہ اسے لے کر غار میں داخل ہوا تھا۔

''یہ...... یہ برفانی غار۔'' شازیہ بولی۔

''ہاں ڈیئر سونیکا! آؤ میں تمہیں ایک عجیب وغریب دنیا سے روشناس کراؤں۔'' بابر جاہ نے کہا اور اس کے بعد وہ غار میں داخل ہو گیا۔ غار میں مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن کوئی بہت ہی نفیس قسم کا جنریٹر تھا۔ جو بے آواز تھا لیکن اس نے غار کو دن کی طرح روشن کر دیا اور اس کے بعد سونیا نے اس عجیب وغریب غار کا منظر دیکھا۔ یہاں لکڑی کی لمبی لمبی پیٹیوں کے انبار تھے۔ یہ پیٹیاں قدرتی دیواروں کے ساتھ ساتھ چھت تک چنی ہوئی تھیں۔ بابر جاہ نے مسکراتی نگاہوں سے سونیکا کو دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر اس نے ایک کھلی ہوئی پیٹی کا تختہ اٹھا دیا۔ سونیکا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''یہ...... یہ تو اسلحہ ہے۔''

''ہاں روسی کلاشنکوفیں جنہوں نے افغانستان میں تباہی مچا دی تھی۔ اور پھر روسی انہیں چھوڑ کر بھاگ گئے اور یہ لاکھوں کی تعداد میں دوسرے لوگوں کے ہاتھ لگ گئیں۔ اسمگلروں نے انہیں حاصل کیا اور ضرورت مندوں کو دینا شروع کر دیا۔ ہمارے پاس ان کا اتنا ذخیرہ ہے کہ باقاعدہ ایک اسلحہ خانہ بنایا جا سکتا ہے۔ آؤ......'' وہ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ پھر غار کے اندر دوسرے غار میں داخل ہو گیا۔ یہاں بھی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اور دیواروں کے ساتھ ساتھ کارٹن چنے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان کارٹنوں میں الیکٹرونکس کی اشیاء سجی ہوئی تھیں۔

نہ جانے کس کس طرح کے الیکٹرونک کے آلات تھے کروڑوں روپے کی مالیت کے یہ آلات یہاں ان غاروں میں چھپے ہوئے تھے۔ بابر جاہ نے کہا۔

''اور یہ بھی میری مملکت ہیں ہمارے ملک کی مارکیٹیں ان اشیاء سے بھری پڑی ہیں۔ ان میں سے دس پرسنٹ قانونی طور پر منگوائی جاتی ہیں اور نوے پرسنٹ ہم سپلائی کرتے ہیں ہمارے پوائنٹس بنے ہوئے ہیں اور ہمارے گاہک مستقل ہیں آؤ۔'' شازیہ کا دل بری طرح لرز رہا تھا۔ اسی مسئلے کو حل کرنے کے لیے تو یہ لوگ یہاں پر آئے تھے اور یہ مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہو گیا تھا۔ لیکن کیا ان غاروں سے زندہ واپسی ممکن ہو سکے گی۔ کیا وہ چھوٹے بابا کو اپنے اس کارنامے کے بارے میں بتا سکے گی۔ ٹرانسمیٹر اس کے پاس موجود تھا لیکن وہ ایک خاص پوائنٹ پر لگا ہوا تھا ایک بٹن دبا دینے سے اس ٹرانسمیٹر پر کال کرنے والے کو یہ پتا چل جاتا تھا کہ اس وقت مخدوش حالات ہیں۔ اور ٹرانسمیٹر کے مالک کو کال کرنا مناسب نہیں تھا۔ یہاں ان غاروں میں ایسا چانس ملنا تو بڑا مشکل تھا۔

بہرحال وہ ان غاروں کا جائزہ لیتی رہی در حقیقت ان میں اتنا کچھ موجود تھا کہ بیان نہیں کیا جا

سکتا۔ شازیہ ایک ایک چیز کو دیکھ کر حیران تھی۔ بابر جاہ نے کہا۔

"دیکھا تم نے یہ میری مملکت ہے۔ میں ان تمام اشیا کا بلاشرکت غیرے مالک ہوں اور اگر چاہوں تو انہیں فروخت کر کے تمہارے دارالحکومت جیسا ایک شہر بسا سکتا ہوں۔ میں چاہوں تو سنکیانگ کو آزاد ریاست قرار دے سکتا ہوں۔ اپنی فوج بنا سکتا ہوں۔ تمہارے ایک جملے سے میں بے حد متاثر ہو گیا تم نے مجھے پہاڑوں کا شہنشاہ کہا تھا نا۔ بتاؤ میں پہاڑوں کا شہنشاہ ہوں یا نہیں۔"

"آپ بہت بڑے آدمی ہیں بابر جاہ صاحب! واقعی آپ بہت بڑے آدمی ہیں مگر یہ سب ان پہاڑوں میں...... یہ کہاں سے آیا۔"

"دنیا بھر سے اسمگلر میرے لیے یہ تمام چیزیں مہیا کرتے ہیں۔ میں نے ان لوگوں کو ایک آف ایکشن دی ہے۔ پہاڑوں کے ذریعے وہ میرے پاس آتے ہیں۔ باقاعدہ میں ایک نیٹ ورک قائم کیے ہوئے ہوں اور اب شہزادی سونیکا درحقیقت تم پہاڑوں کی ملکہ کہلاؤ گی۔ تم میری زندگی میں جس طرح داخل ہوئی ہو مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے یہ میری تقدیر کا ایک فیصلہ تھا۔ آؤ بیٹھو......" بابر جاہ نے کہا اور ایک خوب صورت نشست گاہ پر شازیہ کو بٹھا دیا۔ پھر وہ ایک الماری کی جانب بڑھ گیا۔ الماری سے اس نے شراب کی بوتل اور گلاس نکالے۔ اور انہیں نشست گاہ کے سامنے ایک خوب صورت میز پر رکھ دیا۔ پھر بولا۔

"وہ بے وقوف لوگ برفانی لومڑیوں سے زندگی چھینیں گے اور ہم یہاں زندگی کے سب سے حسین تجربے سے روشناس ہوں گے۔"

♥......♥......♥

تھوڑی ہی دیر کے بعد فیضان نے عادل کو اس بات سے آگاہ کیا اور شازیہ اور بابر جاہ غائب ہیں اور اس کے بعد عادل نے دلاور کو اس بات کی اطلاع دی اس وقت صوفی ان کے پاس نہیں تھا جب کہ قادر صوفی کے ساتھ ہی تھا۔

"کک...... کہاں؟ کہاں چلی گئی وہ۔"

"بابر جاہ اسے لے گیا۔"

"میں صوفی صاحب کو اطلاع کرتا ہوں کسی طرح۔" دلاور نے کہا۔

"اور صوفی صاحب جو جواب دیں ہمیں بتاؤ کیونکہ ہم خانم کی موجودگی میں ٹرانسمیٹر نہیں استعمال کر سکتے اس کی اجازت نہیں ہے۔"

"میں ذاتی طور پر انہیں اطلاع دیتا ہوں۔" دلاور نے کہا اور اپنی جگہ سے اس طرف چل پڑا جہاں صوفی کی جیپ کھڑی ہوئی تھی شام تیزی سے رات کی سیاہی میں تبدیل ہوتی جارہی تھی ابھی دلاور دو ہی قدم چلا تھا کہ ہوا کے دوش پر ایک خوف ناک آواز سنائی دی۔ اور وہ چونک پڑے بھیڑیوں کے بھونکنے کی آواز تھی۔ باز میر اور اس کے ساتھی انہی لوگوں کے ساتھ موجود تھے۔

بابر جاہ منصوبے کے مطابق اپنی جیپ کو خاموشی سے اس طرف لے گیا تھا بھیڑیوں کی اس آواز نے باز میر کو چوکنا کر دیا۔ چونکہ تھوڑے ہی عرصے قبل ایک ہولناک منظر نگاہوں کے سامنے آچکا تھا۔ باز

جلدی سے اپنی جیپ پر کھڑا ہو گیا اور اس نے دور دور تک نگاہیں دوڑائیں پتا نہیں چل رہا تھا کہ بھیڑیے کس طرف ہیں اور کتنا فاصلہ ہے۔"

ادھر خانم فردوسیہ نے بھی بھیڑیوں کی آوازیں سن لی تھیں۔ وہ سہمی ہوئی آواز میں صوفی سے بولی۔

"بھیڑیے...... آپ آوازیں سن رہے ہیں۔"

"اوہو...... یہ بھیڑیوں کی آوازیں ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"صوفی صاحب درویشوں کی دعائیں اتنی ارزاں نہیں ہوتیں۔ بھاگیے کیمپ کی طرف یہ بھیڑیے بڑے خطرناک ہوتے ہیں، کبھی کبھی تو ان کے غول اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ......" لیکن جملہ پورا نہیں ہو سکا۔ اچانک ہی باز میر خوف زدہ لہجے میں چیخا۔

"اسی طرف آرہے ہیں وہ۔ اسی طرف آرہے ہیں کیمپ کی طرف بھاگو۔" اور اس کے بعد اس نے اپنی جیپ کا رخ کیمپ کی طرف کر دیا۔

"آپ بھی چلیے صوفی صاحب۔" دلاور جلدی سے جیپ میں آبیٹھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"بابر جاہ صاحب اور شہزادی رابعہ سونیکا کی جیپ موجود نہیں ہے۔"

"آؤ......" صوفی نے کہا اور دلاور نے جیپ اسٹارٹ کر کے کیمپ کی طرف دوڑا دی بھیڑیوں کی آوازیں قریب آتی جارہی تھیں۔ دور سے انہوں نے سفید بھیڑیوں کے غول کے غول اس طرف آتے ہوئے دیکھے۔ زبانیں لٹکائے جبڑے کھولے برق رفتاری سے دوڑے چلے آرہے تھے۔ یہ تمام لوگ جلد از جلد کیمپ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ لیکن صوفی نے اچانک ہی دلاور سے کہا۔

"دلاور وہ برفانی ٹیلا دیکھ رہے ہو درویشوں کے کرم سے۔"

"جی صوفی صاحب۔"

"جیپ ادھر لے چلو۔"

"نہیں کیمپ پر چلیے صوفی صاحب!"

"ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا ہوں جیپ کو اس طرف جانے دیجئے۔ دلاور جتنی اونچائی تک اسے لے جا سکتے ہو اسے لے چلو۔"

"جی...... صوفی صاحب۔" دلاور نے کہا اور اس کے بعد اس نے بڑی مہارت سے جیپ کو برفانی ٹیلے پر چڑھا دیا۔ برف کی یہ چادر پہاڑی ٹیلے پر تھی اور بہت مضبوط تھی خانم کو یہ کارروائی بڑی عجیب سی محسوس ہوئی۔ لیکن صوفی صورت حال کا شاید اندازہ لگا چکا تھا۔ فیضان اور عادل بھی دوسری جیپ سے اتر کر اس طرف بھاگ آئے کیمپ زیادہ فاصلہ پر نہیں تھا وہ لوگ بھی کسی نہ کسی طرح صوفی کے پاس پہنچ گئے تھے۔ ادھر بھیڑیوں کو دیکھ کر سب کے حواس گم ہوتے جارہے تھے۔ وہ انتہائی تعداد میں تھے۔ باز میر نے رائفل سنبھال لی اپنے ساتھیوں کو منظم کیا اور کیمپ کے مختلف حصوں میں مورچے بنا لیے وہ چیخ کر بولا۔

"تم لوگ بھی ادھر آجاؤ۔ وہاں کیوں جا مرے ہو گولیاں چلاؤ ورنہ...... یہ ہم کو چیر پھاڑ کر مار دیں گے۔" کیمپ میں موجود غلام جو رات کے کھانے وغیرہ کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سب رائفلیں سنبھال کر آگئے

تھے۔اچانک ہی بھیڑیوں پر فائرنگ شروع کر دی گئی۔

''یہ بابر جاہ کہاں مر گیا کم بخت!'' لیکن صوفی نے کوئی جواب نہیں دیا۔آراشیہ سہمی ہوئی نگاہوں سے بھیڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ گولیوں کی پہلی باڑ نے کئی بھیڑیے برف پر گرا دیے۔ جو بھیڑیے زخمی ہو کر گرے تھے ان پر تمام بھیڑیے ٹوٹ پڑے اور خون کی بو پر دیوانے ہو جانے والوں نے آن کی آن میں انہیں چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ادھر باز میر اور اس کے ساتھیوں نے بھیڑیوں پر مسلسل فائرنگ جاری رکھی تھی۔ایک سمت یہ خونریزی ہو رہی تھی۔ دوسری جانب وہ لوگ پیچھے سے آنے والوں سے بے خبر تھے جو آن کی آن میں کیمپ تک پہنچ گئے اور اس کے بعد دوسرے بھیانک منظر کا آغاز ہو گیا۔اور باز میر کیمپ کے ملازموں پر یہ بھیڑیے ٹوٹ پڑے۔ ان کے ہاتھوں سے رائفلیں گر پڑیں۔ اور بھیڑیوں نے انہیں نرخروں سے پکڑ لیا۔ ایک ایک شخص کو ایک ایک درجن بھیڑیے نوچ بھنبھوڑ رہے تھے کوئی کسی کا بازو اکھاڑ کر لے جا رہا تھا۔تو کسی نے کسی کی گردن کو چبانا شروع کر دیا تھا۔کوئی آنتیں منہ میں دبائے انہیں کھینچنے میں مصروف تھا خانم فردوسیہ نے اگر آراشیہ کا منہ پوری قوت سے نہ بھینچ رکھا ہوتا تو آراشیہ کے حلق سے نکلنے والی دل دوز چیخیں بھیڑیوں کو اس طرف متوجہ کر دیتیں۔ ابھی تک وہ اس جانب بالکل متوجہ نہیں ہوئے تھے جب کہ برفانی ٹیلے کے پاس سے گروہ کے گروہ گزرے تھے۔ اور انہیں بالکل قریب سے دیکھا گیا تھا اگر وہ پلٹ کر اس ٹیلے پر لٹکی ہوئی جیپ کی جانب متوجہ ہو جاتے تو یقینی طور پر ان کا رخ اس سمت بھی ہو سکتا تھا کیونکہ کیمپ میں تھے ہی کتنے افراد۔صوفی نے سرد آواز سے کہا۔

''صرف میں گولی چلاؤں گا اور کوئی ایک بھی گولی نہ چلائے۔ اپنے سانسوں تک کو بند کر لو۔ درویشوں کے کرم سے۔'' یہ کہہ کر صوفی نے کچھ کارروائی شروع کر دی۔ عجیب وغریب جیپ سے اس نے پیٹرول کے چھوٹے چھوٹے تین چار ڈبے کھولے اور ان کے کارک ہٹانے لگا پھر اس نے غلام قادر سے کہا۔

''کیا تم لوگ یہ ڈبے پوری قوت سے ان خیموں تک پھینک سکتے ہو جو سامنے لگے ہوئے ہیں؟''

''اڑے ماں قسم آپ بولو چھوٹے بابا صاحب تو میں ان کو......''

''بس بس بس۔ میں اب فائرنگ کرتا ہوں۔ جیسے ہی یہ خیمے گریں تم ان پر نشانہ باندھ کر یہ پیٹرول کے ڈبے پھینکو گے۔'' صوفی نے حکم دیا۔

خانم فردوسیہ خاموش نگاہوں سے یہ بھیانک منظر دیکھ رہی تھی۔ صوفی نے رائفل سنبھالی پھر ایک تنے ہوئے خیمے کے ان کھونٹوں پر جس پر خیمے کھڑے ہوئے تھے۔ صوفی نے فائرنگ کی خیموں کی رسیاں کھل گئیں اور خیمے زمین بوس ہو گئے۔ غلام قادر کے ہاتھ سے نکلا ہوا پیٹرول کا ڈبا گرے ہوئے خیمے پر پڑا۔ صوفی نے اس طرح دوسرا اور تیسرا خیمہ گرایا۔ اور غلام قادر اور دلاور نے اپنی شان دار مہارت سے کام لے کر پیٹرول کے وہ ڈبے ان خیموں پر پھینک دیے۔ پیٹرول کی بو فضا میں پھیل گئی تھی بھیڑیے بہ دستور اپنے کام میں مصروف تھے۔ دفعتاً ہی صوفی نے فائر کیا اور گولی ایک پیٹرول سے بھیگے ہوئے خیمے پر پڑی ایک دم سے خیمے نے آگ پکڑ لی تھی۔ بھیڑیے ایک لمحے کے لیے رکے لیکن پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے وہاں موجود ہر ذی روح کو چیر پھاڑ کر پھینک دیا تھا اور اب لاشوں کو گھسیٹتے اور بھنبھوڑتے پھر رہے تھے۔

''اس نے اچانک ہی ان جلتے ہوئے خیموں پر کارتوسوں کی پیٹیاں گھما کر پھینکیں دوسرے ہی لمحے یہ کارتوس خوف ناک آوازوں کے ساتھ پھٹنے لگے۔ بھیڑیوں میں بھگدڑ مچ گئی آگ سے تو خیر وہ ڈر رہے تھے۔ لیکن اس کے بعد جو کارتوس دھماکوں سے پھٹے اور ان کے ذریعے جو تباہی پھیلی انہوں نے بھیڑیوں کو نروس کر دیا۔ایک لمحے کے لیے وہ اپنی وحشت ناکی سے رکے اور اس کے بعد ان کی خوف ناک آوازیں گونجنے لگیں۔ ان کی تنظیم دیکھنے کے قابل تھی۔ انہوں نے ایک سمت کا رخ کیا اور برق رفتاری سے دوڑ پڑے۔اس کے بعد کسی بھی بھیڑیے نے رکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے برفانی بھیڑیوں کا یہ غول اس طرح غائب ہوا کہ ان کا نام ونشان مٹ گیا لیکن کیمپ کے آس پاس موجود انسانی جسموں میں ذرہ برابر کوئی جنبش نہیں تھی وہ سب موت کا شکار ہو چکے تھے اور ان کی لاشیں چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں سفید برف پر خون کے نشانات کے سوا کچھ نہیں تھا۔

خانم فردوسیہ پتھرائی ہوئی نگاہوں سے یہ منظر دیکھ رہی تھی صوفی نے دلاور سے کہا۔

''دلاور...... جیپ آرام سے نیچے اتار دو۔ بلکہ ایسا کرو جیپ اسی جگہ رہنے دو آؤ فیضان...... عادل...... آ جاؤ درویشوں کی دعاؤں سے۔ دیکھیں ان میں سے کوئی زندہ تو نہیں ہے اور کسی کو ہماری مدد کی ضرورت تو نہیں ہے۔ وہ سب احتیاط کے ساتھ جیپ سے اترے صرف آراشیہ اور خانم فردوسیہ جیپ میں بیٹھی ہوئی تھیں فردوسیہ نے آہستہ سے کہا۔

''آراشیہ! کیا خیال ہے تمہارا۔ کرنل رحیم شاہ نے غلط تو نہیں کہا تھا۔ دیکھو خود کو سنبھالو تم چٹان زادی ہو چٹانوں جیسا ہی کردار ادا کرو اپنے آپ کو عام لوگوں کی طرح خوف زدہ نہ کرو۔''

''میں ٹھیک ہوں مما!'' آراشیہ کی ہلکی سی آواز ابھری۔

♥......♥......♥

شازیہ کے سارے وجود میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہی تھی بابر جاہ نے دو گلاسوں میں شراب انڈیلی اور مسکرا کر بولا۔

''پہاڑوں کی شہزادی کی صحت کا جام...... لیجیے پرنسز مونیکا۔''

''مم میں شراب نہیں پیتی۔'' شازیہ بولی۔

''کیوں......'' بابر جاہ حیرت سے بولا۔

''بس ماحول نہیں ملا۔''

''باہر کے ملکوں میں رہ کر بھی۔''

''ہاں۔ہم مذہبی رہے۔''

''مگر یہ بابر کی مملکت ہے۔ بابر ملکہ کو چاہتا ہے۔لیکن یہ چاہت تعمیل حکم بھی چاہتی ہے۔ آپ شراب پئیں۔''

''سوری بابر صاحب۔''

''کیا بکواس ہے۔اس حسین ماحول میں کسی بھی بات کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے اور پھر سونیکا

جان میں تم سے شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ جس طرح ان غاروں کی دنیا میری ہے اسی طرح تم بھی میری ہو۔ تمہارے وجود کا ہر ذرہ میرا ہے۔ چلو گلاس اٹھاؤ......'' بابر نے اپنا گلاس خالی کر دیا۔ شازیہ نے خود کو سنبھالا پھر بولی۔

''آپ بہک رہے ہیں۔ بابر جاہ۔ آیئے باہر چلیں۔''

''گلاس اٹھاؤ اور یہ لباس اتار دو۔ میں اپنی نئی مملکت کے ہر گوشے سے روشناس ہونا چاہتا ہوں۔''

''بابر صاحب۔ ایسا نہ کریں۔''

''تم میرے غصے کو جگا رہی ہو۔ گلاس اٹھاؤ۔'' بابر جاہ غرایا۔

''آپ جلدی کر رہے ہیں بابر جاہ۔ مجھے تو ابھی آپ سے بہت سی معلومات حاصل کرنا تھیں۔ آپ کھیل ختم کر کے مجھے افسوس ہوگا کیونکہ ابھی مجھے آپ کی اس مملکت کے بارے میں کافی تفصیل معلوم کرنی تھیں۔''

''سب کچھ بعد میں......'' گلاس اٹھاؤ۔''

''اٹھا لوں گلاس۔'' شازیہ کی آواز بدل گئی۔

''اٹھاؤ......بابر جاہ چیخا اور شازیہ نے گلاس اٹھا لیا۔ بابر جاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اپنا گلاس دوبارہ بھر لیا۔ ''میں نے دوسری فرمائش بھی کی تھی۔''

''لباس اتارنے کی۔''

''ہاں۔''

''یہ کام آپ خود کریں بابر صاحب۔ شازیہ نے خود سپردگی کے انداز میں کہا اور بابر جاہ نے جھومتے ہوئے اپنا گلاس رکھ دیا پھر آگے بڑھا اور شازیہ کے لباس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ شازیہ نے اچانک گلاس میں موجود شراب اس کے چہرے پر اچھال دی۔ اور دوسرے لمحے اس نے گلاس ایک سخت پتھر پر مار کر اس کے کنارے توڑ دیئے۔ گلاس اب ایک تیز دھار ہتھیار بن گیا تھا۔

لیکن بابر جاہ کے چہرے پر غصے کے بجائے ایک زہریلی مسکراہٹ نظر آئی۔ وہ پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ پھر اس کی آواز ابھری۔ ''اب تم میرے لیے ایک عام لڑکی بن گئیں۔ وہ نہیں رہیں جو میں نے سوچا تھا۔ بے بی، اس غار میں یہ کھیل اکثر ہوتا رہتا ہے۔ میرا نام بابر جاہ ہے دنیا کے خطرناک ترین لوگوں سے میرا واسطہ پڑتا ہے تم تو ایک معصوم سی بچی ہو۔''

''کھیل واقعی بدل گیا ہے بابر جاہ۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ تم سے تمہاری اس اسمگلنگ کے طریقہ کار کے بارے میں معلوم کروں۔ تم سے پوچھوں کہ تمہارے ساتھ مقامی افراد میں اور کون کون لوگ شامل ہیں اور پھر ایک مکمل رپورٹ اپنے افسران کو پیش کروں۔ لیکن اب مجھے تمہاری لاش ان کے حوالے کرنا ہوگی۔''

''افسران......'' بابر جاہ چونک کر بولا۔

''ہاں بابر جاہ۔ ہمارا گروپ تمہارے بارے میں تحقیقات کرنے کے لیے سنکینہ آیا ہے۔ اور بہت ہی مختصر وقت میں ہمیں تمہارے بارے میں تفصیل معلوم ہوگئی۔ نہ صرف تفصیل بلکہ یہ ٹھکانا بھی۔'' شازیہ کے انداز میں بے خوفی تھی۔ لیکن بابر جاہ کے چہرے پر آگ سلگنے لگی تھی۔

♥......♥......♥

کچھ دیر وہ خونی نگاہوں سے شازیہ کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

''کیا تم ٹھیک کہہ رہی ہو یا کوئی ڈراما کر رہی ہو۔''

''نہیں بابر جاہ! جو کچھ کہہ رہی ہوں سچ کہہ رہی ہوں۔''

''اور تمہیں یہاں کس نے بلایا۔ کیا اس کتیا نے میرا مطلب ہے تمغر دوسیہ نے۔

''اگر تم اسے کتیا کہتے ہو تو تمہاری مرضی ہے لیکن ہمارا کام اتنی جلدی ہو جائے گا یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم تھا۔ ویسے بابر جاہ یقین کرنا نہ جانے کیوں مجھے لگا تھا کہ میرے لیے کام کے آدمی ثابت ہو سکتے ہو۔''

''حرام زادی! تجھے ان علاقوں کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہیں اور میں جو کچھ سن چکا ہوں اور جو میرا اندازہ ہے وہ یہ ہے کہ اب تک بھیڑیوں کے غول نے ان کا تیا پانچہ کر دیا ہوگا اور وہ زندگی سے محروم ہو گئے ہوں گے اگر تو اس بات کی توقع رکھتی ہے کہ ابھی تیرے مددگار یہاں پہنچ جائیں گے، تو نکال دے اس خیال کو ذہن سے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بالکل بے فکر رہ۔'' شازیہ ہنس پڑی پھر بولی۔

''نہیں بابر جاہ! ہم جتنے افراد ہیں نا ہمیں تربیت دی گئی ہے کہ جو کچھ بھی کریں خدا پر بھروسا کر کے کریں اس کے بعد اپنے آپ پر۔ مجھے یہاں کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس خود اپنے ذرائع ہیں۔''

''دیکھتا ہوں میں تیرے ذرائع کو کیا کر لیتی ہے ان ذرائع سے بے وقوف عورت بہت بدنصیب ہے تو میں تجھے سنکینہ کی ملکہ بنانا چاہتا تھا۔ یہ سب کچھ تو نے دیکھ ہی لیا ہے۔ بہت مختصر وقت میں خانم فردوسیہ اور اس کی بیٹی آراشیہ کسی حادثے کا شکار ہو کر مر جائیں گی۔ انہیں صرف اس لیے زندہ رکھا گیا ہے کہ کچھ ضروریات ان سے اٹکی ہیں ورنہ اب تک وہ زندگی کی بازی ہار چکی ہوتیں۔ میں نے اپنے بھائی کو نہیں چھوڑا تو وہ میرے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن مجھے شبہ تھا کہ وہ بہت کچھ سمجھ چکی ہے اور میرے خلاف کارروائی میں مصروف ہو گئی ہے لیکن پروا نہیں۔ یہی تو بابر جاہ کی خوبی ہے کہ ہر طرح کے بگڑے ہوئے حالات کو ٹھیک کر لیتا ہے۔ کیا سمجھی میں نے تو یہ سوچا تھا کہ تجھ جیسی خوب صورت اور ذہین عورت کو اپنی زندگی میں شامل کر لوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی میں پہلی بار میں نے کسی سے شادی کرنے کے بارے میں سوچا تھا۔ ورنہ عورت میرے لیے ایک بے نام اور بے حقیقت چیز ہے۔ مجھ جیسے آدمی کو عورت کا حصول کوئی مشکل مرحلہ نہیں محسوس ہوتا۔ لیکن کچھ لوگ تیری طرح بدقسمت ہوتے ہیں اور اب، اب تو اپنی زندگی کے سب سے بدترین وقت سے روشناس ہونے کے لیے تیار ہو جا۔''

''میں تیار ہوں بابر جاہ! بولو کیا کروں۔ تم یقینی طور پر پہلے میرا لباس نوچو گے کیوں۔'' شازیہ کی وہ فطرت ابھر آئی جو اس کی شخصیت کا ایک حصہ تھی۔ ایک لمحے کے لیے بابر جاہ کے چہرے پر حیرت کے نقوش نظر آئے۔ پھر وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

''اور یہ ایک اچھی عادت ہے۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا لیکن بے وقوف وہ بھی نہیں تھا۔ جیسے ہی شازیہ نے اس کے قریب آنے پر اپنا پاؤں گھمایا وہ بیٹھ گیا اور اس کے بعد اس نے شازیہ کا ایک پاؤں اپنی گرفت میں لے لیا۔ لیکن اب یہ شازیہ کا فن تھا کہ اپنا ایک پاؤں مضبوط گرفت میں آنے کے بعد اس نے اس کا سہارا لیا اور پلٹ کر دوسرا پاؤں پوری قوت سے بابر جاہ کے منہ پر دے مارا۔ یہ بابر جاہ کے لیے نئی جہت تھی اس کے

منہ پر بہت زوردار لات پڑی تھی اور وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں اسے بھی برا نہیں سمجھتا کیونکہ بہر حال جسے پسند کیا جاتا ہے اس کے اندر کچھ خوبیوں کی توقع بھی کی جاتی ہے۔ البتہ اب یہ ضرور معلوم کرنا چاہوں گا میں تم سے کہ تمہارا تعلق کیا محکمہ خفیہ سے ہے؟“

”ہاں یہی سمجھ لو۔“

”مگر تمہیں کیا اطلاعات دی گئی ہیں میرے بارے میں اور کیا اب بھی تم اس بات کا اعتراف نہیں کروگی کہ یہ کام خانم فردوسیہ نے کیا ہے۔“

”اگر میں یہ اعتراف کرلوں تو تم کیا کروگے ڈیئر بابر جاہ۔“

”اصل میں بس وہ جو بات ہوتی ہے نا۔ انسان اپنے آپ کو مطمئن کرنا چاہتا ہے کبھی کبھی میرے اندر شرافت ابھر آتی ہے۔ حالانکہ میں شرافت کو حماقت کہتا ہوں تو مطلب یہ کہ شرافت ابھر آئی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ بہتر ہے کہ کسی کو میری ذات سے بے مقصد نقصان نہ پہنچے لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ مجھے نقصان پہنچانے کے درپے ہے تو پھر ذرا اندر سے اطمینان ہو جاتا ہے۔“ بابر جاہ نے کہا۔ اپنی دانست میں شازیہ کو باتوں میں الجھا کر بے وقوف بنا رہا تھا اور ایسی پچویشن طے کر چکا تھا جس سے وہ شازیہ پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائے۔ یہ باتیں کرتے ہوئے اس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی۔ حقیقتاً اسے خود بھی اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا۔ کیونکہ اس بار شازیہ کی لات اس کے سینے پر پڑی اور اتنی زور سے پڑی کہ اس کی پسلیاں ہل گئیں سینے میں شدید تکلیف ہوئی اور وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ پھر اس کے اندر بھی دیوانگی بے دار ہونے لگی لیکن دیوانگی ایسے موقعوں پر سب سے مہلک چیز ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ جذباتی ہو کر آگے بڑھا تھا اس سے شازیہ کو اپنے کام میں آسانی ہوگئی۔ پے درپے تین لاتیں اس نے بابر جاہ کے سر سینے اور آخر میں لات کمر پر ماری اور وہ اوندھے منہ فرش پر جا گرا شازیہ فوراً ہی آگے بڑھی اور اوندھے پڑے ہوئے بابر جاہ کی کمر پر پاؤں رکھ کر اس نے بابر جاہ کی ایک ٹانگ پکڑ کر اوپر اٹھالی اور ایک زوردار جھٹکا دے کر اسے موڑا اس طرح ریڑھ کی ہڈی کے منکے سرک جاتے ہیں۔ بابر جاہ کے منہ سے نکلنے والی آوازیں دور دور تک گئی رہی ہوں گی۔ وہ شدید اذیت کا شکار ہو گیا اور کمر ٹوٹے سانپ کی طرح بل کھا کر لوٹیں لگانے لگا۔

شازیہ نے دو تین لاتیں اس پر رسید کیں اور بابر جاہ کے ہوش وحواس درست ہو گئے۔ لیکن پھر اس نے فوراً ہی ریوالور نکال لیا۔ بڑی مشکل سے سیدھا ہو کر شازیہ پر لگاتار کئی فائر جھونک مارے لیکن شازیہ زمین پر لیٹ گئی اور اس طرح اس سے بچنے میں کامیاب ہو گئی۔ بابر جاہ دیوانہ وار اس پر فائرنگ کر رہا تھا کہ میگزین خالی ہو گیا اور شازیہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

”بابر جاہ! تم اپنی زندگی کے بدترین نقصان سے دوچار ہو رہے ہو مجھے افسوس ہے۔“ یہ کہہ کر شازیہ اس کی جانب بڑھی اور ایک بار پھر اس نے بابر جاہ کے چہرے پر ہاتھ ڈال کر اس کی گردن اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے لی پھر ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ اسے ایک سمت موڑ دیا۔ بابر جاہ کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ وہ تڑپنے لگا اور چند ہی لمحوں کے بعد اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ شازیہ نے سرد لہجے میں کہا۔

”شاید میں ایسا نہ کرتی بابر جاہ! لیکن تم نے میری نسوانیت کی توہین کی تھی اور اس کی سزا میں ابھی ہی نہیں ہمیشہ ایسی حرکت کرنے والے کو اسی انداز میں دوں گی۔“ اس کے بعد اس نے ٹرانسمیٹر نکال لیا تھا۔

♥......♥......♥

خانم فردوسیہ اور آراشیہ صوفی کی طرف سے ہونے والی کارروائیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ دونوں ساکت تھیں ان کے سامنے بابر جاہ کے آدمیوں کی لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے کوئی بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ لیکن خانم فردوسیہ، آراشیہ اور صوفی کے ساتھ موجود کسی شخص کو خراش تک نہیں آئی تھی۔ خانم فردوسیہ نے پھر آراشیہ سے کہا۔

”کرنل رحیم شاہ بہت ہی پراسرار شخصیت ہے۔“

”مگر خانم اس وقت تو کرنل رحیم شاہ یہاں موجود نہیں تھے یہ کارنامہ تو اس شخص نے سرانجام دیا ہے۔ جسے شخص کہتے ہوئے بھی ہنسی آتی ہے۔“

”نہیں آراشیہ! انسان کی جسمانیت پر اس کی شخصیت کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ تم دیکھو جو کچھ کیا ہے اس نے تمہارے سامنے ہی کیا ہے۔ قدرت نے ہر شخص کو کسی نہ کسی صفت سے نوازا ہے۔ تم دیکھو کیا انوکھی شخصیت پائی ہے اس نے۔“ اچانک ہی آراشیہ نے صوفی کو ٹرانسمیٹر نکال کر کسی سے بات کرتے دیکھا۔ فردوسیہ خاموشی سے قرب وجوار میں پھیلے ہوئے ہول ناک مناظر کو دیکھ رہی تھی۔ صوفی کسی سے بات کرتا رہا۔ پھر اس نے ٹرانسمیٹر پر کسی اور سے گفتگو کی اور اس کے بعد دانت نکالے ہوئے خانم فردوسیہ کے پاس پہنچ گیا۔

”آپ کا یہ بابر جاہ تو بڑا ہی کچا انسان نکلا درویشوں کے کرم سے۔“

”جب درویشوں کا کرم ہو صوفی صاحب! تو پھر کچا پکا کیا معنی رکھتا ہے۔“ خانم فردوسیہ نے بھی اس وقت ظرافت سے کام لیا۔

”حق اللہ......حق اللہ......آپ کے لیے خوش خبری ہے محترمہ! درویشوں کی دعاؤں سے۔“

”بتا دیجئے۔“

”وہ لڑکی جس کو آپ نے کوئی فاحشہ سمجھا ہوگا درویشوں کے کرم سے اپنا کام سرانجام دے چکی ہے۔“

”صوفی صاحب! پہلے تو آپ اپنے الفاظ درست کر لیجئے کتنی ہی بڑی قسم لے لیجیے مجھ سے میں نے اس لڑکی کو ایک لمحے کے لیے بھی غلط نہیں سمجھا۔ ہاں اس وقت تک ذرا الجھن کا شکار تھی۔ جب تک مجھے یہ نہیں معلوم ہوا تھا کہ آپ لوگوں کا تعلق کرنل رحیم شاہ سے ہے لیکن جب مجھے معلوم ہوا تو یہ بات بھی میری سمجھ میں آ گئی اور آپ یقین کر لیجیے کہ میں نے آراشیہ سے بھی یہ بات کہی تھی کہ صرف ایک جال ہوسکتا ہے جو بابر جاہ پر پھینکا گیا ہے۔“

”بالکل۔ درویشوں کی دعاؤں سے یہ جال بڑی کامیابی سے بابر جاہ پر پھینکا گیا ہماری ساتھی لڑکی نے ان غاروں کا پتا لگا لیا ہے جہاں اسمگلنگ کا سامان رکھا جاتا ہے اور ایک افسوس ناک خبر بھی آپ کو سننا پڑے گی کہ بابر جاہ اس لڑکی کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا ہے۔“

"کیا؟"

"ہاں۔ اس بے وقوف آدمی نے اس چھلاوے پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"صوفی صاحب، صوفی صاحب درویش ایسی دعائیں کسی کو نہیں دیتے آپ براہ کرم ہر مسئلے میں درویشوں کو نہ گھسیٹ لیا کریں۔"

"یہ رمز کی باتیں ہیں خانم فردوسیہ آپ نہیں سمجھیں گی درویشوں کے کرم سے۔"

"ٹھیک کہتے ہیں یہ مما! درویشوں سے ذرا ہماری واقفیت کم ہی ہے۔" آراشیہ بھی ہنس کر بولی۔ لیکن خانم فردوسیہ حیران سی اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"کیا واقعی بابر جاہ مر گیا۔"

"ظاہر ہے، اس نے ٹرانسمیٹر پر ہمیں اطلاع دی ہے ہم اپنے ہر شخص کی بات پر بھرپور بھروسا کرتے ہیں۔ مار دیا اس نے بابر جاہ کو، مجبوری ہی ہوگی۔ ویسے کسی موذی کا جلد از جلد دنیا سے چلے جانا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ کرنل صاحب کو اطلاع دے دی گئی ہے کیا آپ ان جگہوں کو دیکھنا پسند کریں گی۔ جن کے بارے میں خود آپ کو معلومات حاصل نہیں ہیں۔"

"ہاں کیوں نہیں۔" خانم فردوسیہ نے جواب دیا۔

شازیہ نے ہی راستوں کی نشاندہی کی تھی اور صوفی اپنے اس مختصر قافلے کو اپنی مخصوص جیپ میں ان غاروں تک لے گیا تھا۔ شازیہ غاروں کے دہانے کے باہر ہی ملی اور اس کے بعد وہ ان لوگوں کو لے کر اندر ان غاروں میں پہنچ گئی۔ صوفی، دلاور اور باقی لوگوں نے ان غاروں میں موجود اسمگل کی ہوئی اشیا کے اس عظیم الشان ذخیرے کو دیکھا اور ششدر رہ گئے۔ اس کے ساتھ ہی غار کے اندر پڑی ہوئی بابر جاہ کی لاش سب لوگوں کے لیے عبرت کا سامان پیدا کر رہی تھی۔ خانم فردوسیہ نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔

"وہ میرے شوہر کا بھائی تھا اور شروع میں مجھے بہت عزیز تھا لیکن میرا وطن دنیا کی ہر شے سے زیادہ قیمتی ہے۔ میں اس کے لیے دل میں اگر دکھ کا ہلکا سا احساس پاتی ہوں تو وہ اس لیے فنا ہو جاتا ہے کہ وہ وطن دشمن تھا۔"

"نہیں خانم آپ کو یہ سن کر شاید دکھ ہو بلکہ یقیناً دکھ ہوگا کہ وہ آپ کے شوہر کا قاتل بھی تھا مجھ سے گفتگو کے دوران اس نے اپنے کالے کارنامے بیان کرتے ہوئے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ اس نے اپنے بھائی کو راستے سے ہٹایا اور اس کے بعد وہ آپ کو زندگی سے محروم کرنا چاہتا تھا اب تک اس نے صرف ایسا اس لیے نہیں کیا کہ کسی مسئلے میں اسے آپ کی ضرورت بھی تھی۔" آراشیہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

"یہ میرے باپ کا قاتل ہے آہ...... کاش! مجھے اس بات کا پہلے سے علم ہو جاتا اور یہ زندہ ہوتا۔"

♥......♥......♥

کرنل رحیم شاہ نے بھرپور سرکاری قوتوں کے ساتھ ان غاروں پر ریڈ کیا تھا اور وہاں سے اربوں روپے کی قیمت کا یہ سامان سرکاری تحویل میں لے لیا تھا۔ اربوں روپے کی قیمت کے اس سامان کی کوئی

حیثیت نہیں تھی۔ اصل مسئلہ اس کے یہاں تک آنے کا تھا چنانچہ ایک رپورٹ تیار کی گئی اور ان راستوں کی مزید حفاظت کی تیاریاں کی گئیں جہاں سے اسمگلر آسانی سے اپنا کام کر لیا کرتے تھے اس طرح حکومت کی نگاہ میں کرنل رحیم شاہ کی ایک اور حیثیت کا اندراج ہو گیا تھا اور پھر جب ان تمام کارروائیوں کی تفصیل کا جائزہ لینے کے بعد صوفی واپسی کے لیے تیار ہوا تو آراشیہ اور خانم فردوسیہ پیچھے پڑ گئیں۔

"نہیں صوفی صاحب! سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، ابھی نہیں جانے دوں گی میں۔ آپ بے شک میرے لیے مجبور نہیں ہیں اور میں آپ کو روکنے کا کوئی جواز نہیں رکھتی لیکن بس درخواست ضرور کروں گی کہ ابھی نہ جائیں مجھے آپ سے کچھ مشورے بھی کرنے ہیں۔" صوفی بہ حالت مجبوری رک گیا تھا۔ آراشیہ نے شازیہ سے کہا۔

"مجھے معاف کرنا شازیہ! میں نے تمہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھا تھا خاص طور پر چچا بابر جاہ کے ساتھ تمہارا جو رویہ تھا۔ میں یہ سوچتی تھی کہ شاید تمہیں اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ بابر جاہ ایک دولت مند آدمی ہے اور تم اسی لیے اس سے پینگیں بڑھا رہی ہو کہ بعد میں تم اس کی حیثیت سے فائدہ حاصل کر سکو۔" شازیہ مسکرا کر خاموش ہو گئی تو آراشیہ کہنے لگی۔

"لیکن ایک بات کہوں تمہارا پہلا نام مجھے بے حد پسند تھا۔ رابعہ سونیکا! میں نے اس وقت انتہائی افسوس سے سوچا تھا کہ کاش! تم اپنے نام کی طرح اچھے کردار کی مالک بھی ہوتیں لیکن مجھے معاف کرنا۔ بعض اوقات انسان جہالت میں بہت سے فیصلے کر لیا کرتا ہے۔"

"نہیں آراشیہ! اسے جہالت نہ کہو ظاہر ہے تمہیں معلوم ہی کیا تھا میرے بارے میں۔"

"مجھے تھوڑا سا وقت دو۔" خانم فردوسیہ نے اس رات صوفی کے ساتھ ایک لمبی نشست کی اور بولی۔

"صوفی صاحب یہ پہاڑ، یہ برف زار مجھے بہت عزیز ہیں لیکن جس شخصیت کی وجہ سے یہ مجھے عزیز تھے۔ وہ ہمارے درمیان نہیں رہی۔"

"درویش رحم کریں۔"

"میں دارالحکومت میں جا کر آباد ہونا چاہتی ہوں یہاں کے لیے میں کیا کروں۔"

"یہاں چند مزارات بنوا دیجیے میرا مطلب ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"مزارات!"

"نہیں وہ میرے منہ سے نکل گیا تھا۔" صوفی نے کہا اور جیب میں پانوں کا بٹوہ تلاش کرنے لگا۔

نیک مشورہ خانم فردوسیہ نے کرنل رحیم شاہ سے کیا تھا۔ کرنل رحیم شاہ اپنی اس مہم سے فارغ ہو کر یہاں آیا تھا۔ فوجی دستے ان علاقوں پر کنٹرول حاصل کر چکے تھے۔ خصوصی طور پر خاردار تاروں کی باڑیں دور دور تک لگائی جا رہی تھیں جنہیں عبور کر کے اسمگلر اس طرف کبھی نہیں آ سکتے تھے۔ یہ تمام کارروائیاں کرنل رحیم شاہ کے مشوروں سے ہو رہی تھیں۔ شاہ میر خاں صاحب نے خصوصی طور پر اس کے لیے سفارش کی تھی کہ کرنل صاحب اس بارے میں حکومت کو مشورے دیں۔ تمام کاموں سے فراغت ہو گئی تھی اور کرنل رحیم شاہ سکینہ کی اس پہاڑی حویلی میں خانم فردوسیہ کا مہمان بنا تھا۔

"بہت اچھی بات ہے یہاں کا کنٹرول پولیٹیکل ایجنٹ کے قبضے میں دے دیا جائے۔ خانم
اسمگلروں کی اس کارروائی کے نتیجے میں حکومت مکمل توجہ کے ساتھ یہاں اپنے اسٹیشن قائم کر دے گی
اسمگلنگ روکی جاسکے۔ آپ اس موقع سے فائدہ اٹھائیے واقعی آراشیہ کو شہری زندگی کی ضرورت ہے۔"

"اور وہاں میں صوفی صاحب سے بھی مل سکوں گی۔ بہت ہی دل کش انسان ہیں یہ درویشوں
دعاؤں سے۔" آراشیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

پھر اسی رات جب صوفی، رحیم شاہ کے پاس بیٹھا ہوا اس سلسلے میں تفصیلات بتا رہا تھا تو باہر
ہارمونیم بجنے کی آواز سنائی دی اور دونوں چونک پڑے۔

"یہ۔ یہ کیا ہے؟" کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"پتا نہیں۔" ہارمونیم کے ساتھ ساتھ ڈھول اور دوسرے ساز کی آواز آئی تو یہ باہر نکل آئے
حویلی کے ایک گوشے میں تیز روشنیاں جل رہی تھیں اور بہت سے لوگ یہاں جمع تھے۔

"یہ کیا طلسم ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی کے منہ سے نکلا اسی وقت عقب سے خانم
فردوسیہ کی آواز سنائی دی۔

"یہ آپ کے اعزاز میں ہے صوفی صاحب۔ آراشیہ نے کبھی قوالی نہیں دیکھی تھی اور یہاں
پہاڑوں میں اس کا رواج بھی نہیں ہے۔ لیکن میں نے آپ کے اعزاز میں اس کا بندوبست کیا ہے۔ خدا
شکر ہے کہ یہ پہنچ گئے۔"

"تو یہ اپنے ڈھولن شاہ اور ہم نوا کی آوازیں ہیں۔ ڈھولن شاہ تو اس وقت قیامت مچائے ہوئے
ہیں۔ قوالی کی دنیا میں۔"

صوفی خوشی سے ناچنے لگا۔ کرنل رحیم شاہ بھی ان تمام چیزوں کا شوقین تھا۔ آراشیہ، خانم فردوسیہ
اور تمام لوگ قوالی میں پہنچ گئے اور اس کے بعد تو آراشیہ ہنس ہنس کر دوہری ہوگئی۔ جب صوفی کو ڈھولن شاہ کی
ایک غزل پر زبردست حال آگیا اور وہ اٹھ کر ناچنے لگا۔ شیروانی، ڈھیلا پاجامہ، منہ سے ٹپکتی ہوئی پانوں کی
پیک، آنکھیں بند دونوں ہاتھ فضا میں بلند۔ ہونٹ بھینچے ہوئے اور جب بھی ان سے کوئی آواز نکلتی لوگ اس
طرح بچنے کی کوشش کرتے جیسے منہ سے چھرے نکل رہے ہوں۔ منہ میں دبے ہوئے پان اور چھالیوں کا
تصور تک ختم ہوگیا تھا۔ وجد کا عالم تھا اور صوفی کا رقص۔ آراشیہ ہنس ہنس کر دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ شازیہ نے
سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"یہ آج چھوٹے بابا کو کیا ہوگیا۔ کیا کر رہے ہیں وہ۔"

"اڑے ماں قسم ابھی میرے کو تو یہ لگتا ہے جیسے کوئی جن ون آگیا اپنے چھوٹے بابا پر اٹھ
روکو نا ان کو۔"

"نہیں غلام قادر! حال آگیا ہے ٹھیک ہو جائیں گے۔" دلاور نے غلام قادر کے کندھے پر ہاتھ
رکھتے ہوئے کہا۔

"ماں قسم تمہارے کو بول دیتا ہے دلاور صاحب! ابھی میرے چھوٹے بابا کو کچھ ہوگیا تو میں

سر پھاڑ کر خودکشی کر لوں گا۔ اڑے دیکھو نی کیسا ناچتا پڑا ہے۔" غلام قادر نے گردن ہلا کر کہا۔ آراشیہ بے
اختیار ہنسنے لگی۔

♥......♥......♥

سکینہ کیس کو ختم ہوئے دو مہینے گزر گئے تھے۔ خانم فردوسیہ دارالحکومت منتقل ہوگئی تھی۔ آراشیہ بے
پناہ خوش تھی اس نے صوفی سے درخواست کی تھی کہ یہاں جب تک وہ اپنے دوست بنانے میں کامیاب نہیں
ہو جاتی صوفی ان سے ملتا رہے اور کبھی کبھی انہیں بھی اپنے ہاں آنے کی دعوت دے ظاہر ہے وہ لوگ اسے
گرین ہاؤس نہیں بلا سکتے تھے۔ کیونکہ گرین ہاؤس بہرحال ایک خفیہ جگہ تھی وہاں کے مکین عام سے انداز میں
رہتے تھے اور دیکھنے والے صرف اتنا جانتے تھے کہ گرین ہاؤس میں خاصے افراد رہتے ہیں ایک مکرانی ملازم،
ایک خطرناک قسم کا چوکیدار، ایک اونٹ اور انسان کی ملی جلی قسم وغیرہ۔ یہ اس گھر کے مکین ہیں۔ سادہ اور
پرسکون سی زندگی گزارتے تھے کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا۔ ایک بار آراشیہ پیچھے ہی پڑ گئی۔ اس نے کہا۔

"چھوٹے بابا۔ میں آپ کے گھر چلوں گی۔"

"ہمارے گھر در...... درویش رحم کریں۔"

"کیوں۔ اس میں خوف زدہ ہونے کی کیا بات ہے۔"

"نہیں خوف زدہ ہونے کی بات تو نہیں لیکن پھر بھی۔"

"کیا پھر بھی! آپ ہمیں اپنا گھر نہیں دکھائیں گے۔"

"بس وہ گھر ہے ہی نہیں۔"

"چھپاتے ہیں آپ۔ چھپا رہے ہیں ہم سے۔" آراشیہ نے کہا۔

"درویش رحم کریں ہم پر بھی اور تم پر بھی جھوٹ نہیں بولتے۔"

"آپ کے بیوی بچے کہاں ہیں؟"

"یہ خدا ابتدا ہی نہیں ہوئی درویشوں کی مہربانی سے، بچائے رکھا ہے انہوں نے، قربان جاؤں
ان کی ذات اقدس کے۔"

"کیا مطلب؟"

"ہمارا مطلب یہ ہے کہ...... کہ...... کہ بیوی نہیں ہے اس لیے بچے بھی نہیں ہیں۔"

"کہیں رہتے تو ہیں نا آپ۔ گھر تو ہے آپ کا۔"

"ہاں ہے بی بی لیکن وہ خانہ درویش ہے۔"

"وہاں بھی درویش ہوتے ہیں؟"

"وہاں ہوتے نہیں ہیں درویش بلکہ ان کا ایک عقیدت مند وہاں رہتا ہے۔"

"دیکھیں گے ہم چھوٹے بابا ورنہ جھگڑا ہو جائے گا آپ سے بتائیے کب لے کر چلیں گے آپ ہمیں۔"

"دو...... دو...... درویش رحم کریں۔ آپ یقین کیجیے وہ اس قابل نہیں ہے کہ آپ وہاں جائیں۔"

"چھوڑیے...... یہ ہم پر چھوڑ دیجیے۔"

''صوفی صاحب! بچی کتنے پیار سے آپ سے کہہ رہی ہے آپ مان کیوں نہیں لیتے اس کی بات اور پھر اتنی مان اور چاہت سے شہر آئے ہیں آپ ہی تو ہمارے ہیں اور کون ہے آپ ہی پر ناز کرتے ہیں۔''

''درست فرمایا آپ نے لیکن ہم بھی صحیح کہہ رہے ہیں درویشوں کے کرم سے۔''

''کیا صحیح عرض کرر ہے ہیں آپ۔''

''یہی کہ جہاں ہم رہتے ہیں وہ جگہ۔''

''بری بات ہے صوفی صاحب! آپ تو بہت اچھے انسان ہیں آپ جہاں رہتے ہوں گے وہ بری نہیں ہوگی۔''

''محترمہ! سمجھنے والوں کے لیے بے شک بری نہیں ہے اور جو اس جگہ کو سمجھ نہیں پاتے وہ اسے برا ہی کہتے ہیں۔''

''گویا آپ نے ہمیں ناسمجھ قرار دے دیا ہے۔''

''ہرگز نہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''تو پھر ہم سے احتراز کیوں کرر ہے ہیں۔''

''وعدہ کیجیے چھوٹے بابا!'' خانم فردوسیہ اور آراشیہ اس طرح پیچھے پڑ گئیں کہ صوفی کو اقرار کرنا پڑا۔

''ٹھیک ہے لے جاؤں گا آپ کو اپنے ساتھ۔''

''مگر ایک شرط ہے آپ وہاں کوئی ردوبدل نہیں کریں گے۔ آپ سچ بولتے ہیں ہمیں یقین ہے اگر آپ وعدہ کریں گے تو ایسا ہی کریں گے جیسا کہہ رہے ہیں۔'' صوفی نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر گردن ہلادی تھی۔ ادھر بالکل اتفاقیہ طور پر یار محمد نے دوبار صوفی کو ایک کار میں خانم فردوسیہ اور آراشیہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ بس فطرت ہوتی ہے انداز ہوتا ہے انسان کا۔ یار محمد بے چارہ سیدھا سادھا حالی مزدور، اتنی خوب صورت کار، خوب صورت لڑکی اور عورت کو دیکھ کر ایک ہی تصور اس کے ذہن میں آیا تھا۔ من خان تو خیر صوفی کا بہت گہرا دوست تھا اور اگر من خان کے سامنے صوفی کے بارے میں کوئی بات کہہ دی جائے تو اگر غلط بات ہو تو بڑی ہی مشکل سے معافی مل سکتی تھی۔ لیکن اور لوگ تھے۔'' چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے یار محمد نے کہا۔

''یار نظام علی! یہ صوفی صاحب جو ہیں نا کتنے عرصے سے رہتے ہیں ہمارے درمیان۔''

''بہت عرصے سے۔ یہی لگتا ہے جیسے اسی محلے میں پیدا ہوئے ہوں۔ تجھے معلوم نہیں ہے یار محمد! بڑے بڑے لوگوں نے صوفی صاحب کو نہ جانے کیا کیا پیش کشیں کی ہیں۔ کوٹھی بنگلے، مگر صوفی صاحب نے یہ محلہ نہیں چھوڑا۔ کوٹھیاں چھوڑ دیں، بنگلے چھوڑ دیے۔''

''مگر یار انہوں نے ایک زیادتی کی ہے ہمارے ساتھ۔'' یار محمد نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''صوفی صاحب نے زیادتی کی ہے کسی کے ساتھ، بات یقین کرنے کی نہیں ہے۔''

''کی ہے۔ کہوں گا تب ہی تم یقین کرو گے۔''

''ہے کسی اچھی بات کی توقع تو فوراً کی جاسکتی ہے ان سے۔ لیکن کسی زیادتی وغیرہ کے بارے

میں بات سمجھ میں نہیں آتی۔''

''مگر بتا تو کیا زیادتی کی ہے۔''

''یار! انہوں نے ہم سے بھی کہا ہے کہ ان کی بیوی اور بچے نہیں ہیں۔''

''تو پھر۔''

''بیوی بھی ہے ان کی اور ایک بیٹی بھی ہے۔''

''کیا؟'' نظام الدین کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''ہاں۔ یہ بات میرے علاوہ کسی کو نہیں معلوم۔''

''ہو ہی نہیں سکتا۔''

''ہے نا یار! کئی بار دیکھ چکا ہوں۔''

''بھائی تم کیا سمجھتے ہو اپنے یار کو؟ پولیس کا بڑے سے بڑا افسر رہ چکا ہے۔ ہزاروں بڑے بڑے لوگوں سے جان پہچان ہے۔ یہ کیا بات ہوئی اگر تم نے کسی......''

''سمجھا کرو نظام الدین کسی کی بات اور ہوتی ہے اور بیوی بچوں کی بات اور ہوتی ہے۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھاسکتیں۔ میں نے بھی آخر دنیا گزاری ہے۔''

''بات بڑی عجیب کہہ رہے ہو تم یار محمد مگر ایک بات میں تمہیں بتادوں من خان سے بات کرتے ہیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو من خان کو ضرور پتا ہوگا۔''

''یار من بھائی برا نہ مان جائیں۔''

''نہیں بس پوچھیں گے خیال ظاہر کریں گے۔'' اور من کو شریک کرلیا گیا نظام الدین نے یار محمد کی بات بتائی تو من خان ایک دم ہنس پڑے۔

''ابے کیا بکواس کررہا ہے۔ صوفی صاحب مرد خدا ہیں درویش صفت ہیں ساری باتیں اپنی جگہ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو لاکر اسی گھر میں رکھتے وہ بیوی بچی کو۔ بچی کتنی بڑی ہے؟''

''جوان ہے۔'' یار محمد نے کہا اور من خان ہنس پڑے۔

''پاگل ہوا ہے تو یار محمد! یعنی تیرے خیال میں۔''

''آپ سمجھے نہیں من خان بھائی! بہت سی کہانیاں عجیب وغریب ہوتی ہیں۔ مجھے تو پہلے ہی لگتا تھا کہ اپنے بھائی صوفی غم کے مارے ہوئے ہیں۔ وہ عورت جوان کی گاڑی میں نظر آئی تھی نا۔ بڑی خوب صورت تھی۔ بچی بھی بڑی خوب صورت تھی اور کسی بڑے گھر کے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ ایک اپنے صوفی بھائی ٹھہرے ہمت والے مرد کسی بڑے گھر میں شادی ہوگئی ہوگی اب تم عورتوں کو تو سمجھتے ہی ہونا۔ مرد ذرا ان کی طبیعت سے ہلکا ہو تو نظروں سے گرادیتی ہیں میرا خیال ہے۔ جھگڑا چل رہا تھا میاں بیوی دونوں کا اور اسی جھگڑے کے عالم میں صوفی جی درویش بن گئے۔ اب ہوسکتا ہے کسی وجہ سے صلح ہوگئی ہو۔ بھلا اتنے بڑے آدمی کی بیٹی اس جگہ کیسے آئے گی۔ صوفی صاحب نے بھی بس ضد پکڑلی ہو۔ ٹھیک ہے وہ ادھر ہی رہیں گے ہم لوگوں کو نہیں چھوڑیں گے۔ چاہے بیوی بیٹی کو چھوڑنا پڑے۔ مجھے لگ رہا ہے کچھ مفاہمت ہورہی ہے۔''

"اگر ایسی بات ہے تو پھر تو کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔" ممن خان نے سوچتے ہوئے کہا۔

"کیا کرو گے۔"

"بس دیکھتے ہیں سوچتے ہیں بات کریں گے صوفی صاحب سے۔ ویسے یار یہ تو بڑی دل توڑنے والی بات ہے۔ ہم سے کہہ دیتے تو ہم اسے کوئی اچھا راستہ ہی دکھا دیتے۔" ممن خان بھی کچھ اداس سے ہو گئے۔ ادھر یہ کھچڑی پک رہی تھی اور ادھر صوفی بے چارہ بہ حالت مجبوری آراشیہ اور فردوسیہ کو اپنا گھر دکھانے پر بادل نہ خواستہ تیار ہو گیا تھا اور اس دن اس کی کار اپنے محلے میں داخل ہوئی۔ وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا خانم فردوسیہ اس کے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ صوفی کو اتنی ہی عزت دی جاتی تھی۔ آراشیہ کار کے پچھلے حصے میں تھی۔ بس ایسی جگہوں پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسے ہی صوفی کی کار گلی کے سرے پر نمودار ہوئی اتفاق کی بات کہ یار محمد نے ہی دیکھ لیا، ایسی دوڑ لگائی کہ بڑے بڑے دوڑنے والوں کو پیچھے چھوڑ گیا۔ ممن خان کے ہوٹل میں جا کر دم لیا۔ لو ممن خان ہو گئی بات کی تصدیق۔"

"کیا ہوا؟"

"صوفی صاحب! اپنی گھر والی کو لے آئے۔ میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ مان ٹوٹ گیا ہے آ گئی ہیں شوہر کی یاد میں تڑپتی ہوئی اور کیوں نہ ہو بیٹی جوان ہو گئی ہے باپ کا سایہ تو سر پر ہونا ہی چاہیے۔"

"اماں کیا کہہ رہے ہو بھائی یار محمد! کیا واقعی۔"

"دیکھو وہ دیکھو کار آ رہی ہے۔"

"اچھا...... بھئی یہ تو بڑی بات ہے۔" ذرا سی دیر میں چاروں طرف مورچہ بندی ہو گئی۔ مورچوں میں چھپ چھپ کر دیکھا جا رہا تھا صوفی کے منہ میں پان دبا ہوا تھا اور چہرے پر شدید بدحواسی تھی۔ دروازے کے قریب اس نے کار روک دی اور بولا۔

"آیئے تشریف لایئے۔" آراشیہ نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا یہ کچی پکی آبادی، سڑک ٹوٹے پھوٹے مکانات، ننگ دھڑنگ کھیلتے ہوئے بچے راستے میں کئی جگہ چھوٹے چھوٹے کوڑا گھر۔ سامنے ہی ایک جھونپڑا قسم کا ہوٹل اور یہ ٹاٹ والا دروازہ جس کے آگے کوئی ایک فٹ والی نالی بہہ رہی تھی اور یہ نالی ڈھکی ہوئی بھی نہیں تھی۔ اس میں گندگی اور غلاظت بیٹھی ہوئی صاف نظر آ رہی تھی۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صوفی نے ٹاٹ کا پردہ ہٹاتے ہوئے کہا۔

"قدم رنجہ فرمایئے درویشوں کے کرم سے۔" آراشیہ تو کچھ بدحواس سی ہو گئی تھی لیکن خانم فردوسیہ بالکل نارمل نظر آ رہی تھی۔ نالی پھلانگ کر وہ لوگ اندر داخل ہو گئے اور اس کے بعد صحن کا منظر سامنے آ گیا۔ ایک طرف کسی بیل گاڑی کا پہیہ رکھا ہوا تھا ایک طرف مرغیوں کا خالی ڈربا۔ لیکن زمین پر باقاعدہ باجرے اور مکئی کے دانے پڑے ہوئے تھے۔ صحن کچا، ایک طرف تین ٹوٹے ہوئے گملے جن میں پھول وغیرہ نہیں تھے۔ سامنے پکی اینٹوں کا دالان لیکن اس میں پڑی ہوئی جھلنگا چارپائی۔ جس کے بان زمین سے لگے ہوئے تھے۔ پائینتی کی طرف ایک گدا اور ایک چادر رکھی ہوئی۔ سیدھے ہاتھ پر غار نما باورچی خانہ جس میں گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا اس کے بعد بڑے سے کمرے کا دروازہ۔ صوفی ان لوگوں کو دالان میں لایا اور پھر جلدی سے اندر داخل ہو گیا۔

"ممّا! یہ......" آراشیہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ لیکن خانم فردوسیہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اس کو خاموش کر دیا۔ صوفی اندر سے ایک چارپائی لے آیا جو قدرے سلامت تھی اس نے جلدی سے اس پر دری بچھائی اور بولا۔

"تشریف رکھیے خانم۔"

"شکریہ صوفی صاحب! تو یہ ہے آپ کا دولت خانہ۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"مگر یہاں کے باقی لوگ کہاں ہیں؟" آراشیہ نے سوال کیا۔ صوفی جھلنگا چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے کہا۔

"خانم! آپ سے پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ گھر میں ہمارے علاوہ اور کوئی نہیں ہے درویشوں کے کرم سے۔"

"مگر دروازہ تو کھلا ہوا تھا؟" آراشیہ نے کہا اور صوفی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ایک طرف منہ کر کے پان کی پیک تھوک دی۔ باہر کے تکلفات اپنی جگہ گھر کے ہر گوشے میں ایسے سرخ سرخ سوکھے ہوئے دھبے جگہ جگہ نظر آ رہے تھے۔ پھر وہ بولا۔

"ایسے علاقوں میں گھروں کے دروازے کھلے ہی ہوا کرتے ہیں چھوٹی بی بی صاحبہ! چونکہ یہاں گھروں کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ بات یہ نہیں ہے کہ "رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو۔" آپ گھروں میں سونا بھر کر رکھ دیجیے یہاں۔ وہ بالکل محفوظ ہوتا ہے ہر شخص ایک دوسرے کے گھر کا محافظ ہوتا ہے گھر کا ہی نہیں عزت آبرو کا محافظ بھی ہوتا ہے درویشوں کے کرم سے۔ ایسے محلوں میں بس سڑکیں، گلیاں اور بازار گندے ہوتے ہیں۔ دل بڑے پاکیزہ ہوتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں صوفی صاحب! یہ بچی ہے زمانہ ناشناس اسے پتا نہیں لیکن میں جانتی ہوں یہ ایک بہت بڑی سچائی ہے۔"

"ممّا! دیکھیے وہ کیا ہے؟" آراشیہ نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا ایک کھونٹی پر شیروانی لٹک رہی تھی۔

"شیروانی ہے اور کیا ہے۔"

"مگر ممّا کتنی میلی کچیلی ہے یہ۔"

"عزیزہ! آپ یقین کیجیے ہم اس شیروانی کو قیامت تک نہیں بھول سکتے۔ کیونکہ ہمارے ایک دوست نے بڑی محبت سے ہمیں تحفتاً دی تھی بس۔"

"صوفی صاحب کم از کم استری تو کر لیا کریں آپ اس پر۔" آراشیہ نے کہا۔

"کرتے ہیں جب کہیں جانا ہوتا ہے۔ اگر دن میں جانا ہوتا ہے تو رات کو ہم اسے تہہ کر کے کمر کے نیچے رکھ کر سو جاتے ہیں صبح کو تیار ملتی ہے اور اگر کہیں شکنیں پڑی بھی ہوں تو دیسی استری کا معقول انتظام ہے۔"

"دیسی استری۔"

"جی ہاں کچن میں موجود ہے۔ دکھائیں آپ کو۔" صوفی نے کہا اور اندر سے ایک پیتل کی گڑوی

اٹھالایا۔"

"بس تھوڑا سا پانی چھڑکیے اور اس گڑوی سے استری کر لیجیے۔ جادو کی گڑوی ہے یہ درویش کے کرم سے۔"

"اور یہاں کوئی نہیں ہے۔ اچھا یہ بتائیے یہ گاڑی کا پہیہ کیوں رکھا ہوا ہے۔"

"بہ خدا آج پہلی بار دیکھا ہے ہم نے۔ کسی کا ہوگا، لا کر رکھ گیا ہے، لے جائے گا۔"

"آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ کس کا ہے۔"

"ضرورت ہی نہیں ہے معلوم کرنے کی، کسی کو رکھنے کی ضرورت پیش آئی ہوگی رکھ گیا۔"

"اور مرغیوں کا ڈربا۔"

"محلے کی مرغیاں کبھی کبھی آ جاتی ہیں۔ یہ دانہ دنکا بھی انہی کے لیے ڈال دیا ہے کہ آئیں تو بھوکی پیاسی نہ جائیں اور کسی کی بھلا کیا خدمت کی جا سکتی ہے۔"

"آج ایک بات سمجھ میں آ گئی صوفی صاحب۔" خانم فردوسیہ نے کہا۔

"کیا......؟"

"یہی کہ ہر بات درویشوں کے کرم سے کیوں ہوتی ہے۔" فردوسیہ مسکرا دی ادھر یہ لوگ ہو گئے تھے اور ادھر ممن خان نے محلے میں طوفان مچا دیا تھا۔ صوفی کی بیگم اور بیٹی آئے تھے۔ بھلا اس طرح کیسے جا سکتے تھے۔ چنانچہ انتظامات شروع ہو گئے۔ فوراً ہی لوگوں کو ادھر ادھر دوڑا دیا گیا۔ سارے کام بند کر دیے گئے۔ کھانے پینے کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور گلی میں پتنگ کے کاغذ کی رنگ برنگی جھنڈیاں باندھی جانے لگیں۔ اندر صوفی اپنے مہمانوں سے باتیں کر رہا تھا اور باہر اس طرح بھاگ دوڑ ہو رہی تھی جیسے کوئی منسٹر علاقے میں آ جاتا ہے اور سرکاری حکام وہاں عارضی انتظامات کرتے ہیں گلی کے کناروں پر نالیوں کے گملے سجا دیے گئے تھے۔ جو برابر کی نرسری سے ادھار مانگ کر لائے گئے تھے اور نالیوں پر پھول لہلہا رہے تھے۔ پھر باقی انتظامات ہوئے اچانک ہی ڈھول بجنے کی آواز سنائی دی۔ ڈھول والے صوفی کے دروازے آ گئے تھے اور دھما دھم ڈھول بج رہا تھا۔ پھر چند ہی لمحوں کے بعد کئی افراد صوفی کے گھر میں داخل ہو گئے اجازت وغیرہ کی ضرورت تو پیش آتی ہی نہیں تھی یہاں اس علاقے میں۔ ممن خان کے ہوٹل کی تین چار میزیں وہاں منتقل ہو گئیں اور اس کے بعد وہاں چادریں ڈال دی گئیں۔ کئی رنگوں کی چادریں تھی لیکن صاف ستھری تھیں۔ خانم فردوسیہ اور آراشیہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ لیکن صوفی نے کہا۔

"تشریف رکھیے۔" پھر آگے بڑھ کر بولا۔

"اماں یہ کیا کر رہے ہیں آپ لوگ۔" کسی نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کے بعد پلیٹیں چمچے کھانے پینے کی اشیاء آنا شروع ہو گئیں۔ مٹھائی کے انبار، پھلوں کے انبار ہر طرح بیکری کے آئٹم، تمام میزیں اس طرح بھر دی گئیں جیسے سو پچاس آدمیوں کا انتظام کیا جا رہا ہو۔ صوفی کا بھی منہ حیرت سے کھلا تھا۔ آراشیہ اور فردوسیہ بھی تعجب سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر آراشیہ نے کہا۔

"یہ...... ممایہ...... صوفی صاحب یہ...... آپ نے اتنا تکلف کیوں کیا؟"

"بہ خدا درویشوں کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہمارے فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہ تھا۔ یہ تو بس ان لوگوں کی مہمان نوازی ہے آپ لوگ یہاں آئے ہیں نا۔" اسی وقت ممن خان اندر داخل ہوا اور آراشیہ نے کہا۔

"باہر جو ڈھم ڈھم ہو رہی ہے یہ کیسی ہے؟" ممن خان کے ساتھ یار محمد، نظام الدین، گل شیر خان اور بھی چند افراد تھے سب کے سب گلاب کے تازہ پھولوں کے ہار ہاتھوں میں سجائے ہوئے تھے۔ ممن خان نے کہا۔

"تم سے تو بعد میں نمٹیں گے صوفی میاں! ذرا بھابی اور بھتیجی کو ہار پہنا دیں۔"

"بھا...... بھا......" صوفی کا منہ بھاڑ ہی کی طرح کھل گیا تھا۔ بھا بھا کے علاوہ اور کچھ نہیں نکل سکا تھا۔ باہر ڈھولچی ڈھول بجا رہے تھے اور اس میں تیزی آتی جا رہی تھی پھر ممن خان نے بہت سے نوٹ نچھاور کیے ڈھول بجانے والے اندر آ گئے تھے۔ آراشیہ دلچسپی سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ ڈھول بجانے والے ناچ رہے تھے اس کے ساتھ ہی دوسرے چند لوگوں نے بھی ٹھمکے لگانے شروع کر دیے۔ صوفی ہونقوں کی طرح منہ کھولے کھڑا ہوا تھا اور بچی کچھی پان کی پیک اس کے گریبان پر آ پڑی تھی۔ اب وہ ممن خان وغیرہ سے بھی کوئی سوال نہیں کر رہا تھا۔ یہ ہار خانم فردوسیہ اور آراشیہ کے گلے میں ڈالے گئے۔ یہی شکر تھا ان لوگوں نے اور کچھ نہیں کہا تھا لیکن جب ممن خان نے سو سو کے پانچ نوٹ آراشیہ کو اور دس خانم کو پیش کیے۔ تو دونوں حیران ہو گئیں۔

"بھابی جی! بس ہم غریبوں کی یہی اوقات ہے قبول فرمائیے مہربانی ہوگی۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ بیٹی یہ آپ لے لیں۔"

"ارے ارے یہ کیا کر رہے ہیں۔"

"کہا نا ہم غریب لوگ ہیں اسی طرح اپنی محبت کا اظہار کر سکتے ہیں۔"

"آپ بہت بڑے لوگ ہیں مگر یہ زحمت نہ کیجیے۔"

"دکھ ہوگا ہمیں، چھوٹی سی رقم ہے اگر آپ نے ٹھکرا دی تو۔"

"میں تو نہیں ٹھکراؤں گی میں تو انہیں سنبھال کر رکھوں گی۔" آراشیہ نے کہا۔ ڈھول والے بہ دستور ڈھول بجا رہے تھے اور صوفی کے اوسان خطا ہوئے جا رہے تھے۔

"اب ایسا کریں آپ صوفی صاحب! بھابی جی کو ناشتا کرائیں میں چائے بھجواتا ہوں چلو بھئی۔ چلو باہر نکلو۔" ممن خان ڈھول والوں کو باہر لے گئے۔ ایک ایک کر کے سارے باہر نکل گئے۔ خانم فردوسیہ اور آراشیہ ہنستی مسکراتی نگاہوں سے یہ تمام مناظر دیکھ رہی تھیں۔ اچانک ہی خانم فردوسیہ نے کہا۔

"یہ بھابی کا رشتہ کیسے قائم کر لیا ان لوگوں نے۔" صوفی جو صورت حال کو کافی حد تک سمجھ گیا تھا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"بس یہاں یہی ایک رشتہ ہوتا ہے حالانکہ وہ آپ کے شوہر کے بارے میں کچھ نہیں جانتے لیکن ظاہر ہے کہ انہیں بھائی ہی کہا جا سکتا ہے اور اس لحاظ سے آپ کو بھابی۔"

''اوہ......واقعی کیا لوگ ہیں۔ خدا کی قسم کبھی کبھی تو ایسے لوگوں کے درمیان رہنے کو دل چاہتا ہے۔ عزت محبت پیار واقعی آپ نے ٹھیک کہا صوفی صاحب! بھلا ایسے علاقے میں گھروں کے دروازے بند کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جہاں خلوص کی پہرے داری ہو۔'' خانم فردوسیہ بہت متاثر نظر آ رہی تھی۔ اچانک ہی آراشیہ نے کہا۔

''ایک اور بات بتایئے چھوٹے بابا!''

''جی آیئے اس میں سے کچھ لے لیجیے۔''

''خدا کی پناہ۔ یہ تو ایسا لگتا ہے جیسے پوری بارات کے لیے ہو۔ آئیں مما! میں تو کھاؤں گی میرے دل میں تو ایک اور خیال آ رہا ہے۔ چھوٹے بابا ان گھروں میں عورتیں بھی تو ہوں گی نا وہ بھی اتنی ہی مخلص ہوتی ہوں گی۔''

''ظاہر ہے یہ محبت نگر ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''یقیناً ایسی جگہوں پر درویشوں کی دعائیں ہی ہوتی ہیں۔''

''تو پھر ہمیں ان سے ملوایئے نا۔''

''اس وقت......اس وقت ممکن نہیں ہے پھر کبھی۔''

''ہاں بھئی آراشیہ ایک وقت میں سارے کام نہیں ہو جانے چاہئیں۔ تم بے فکر رہو میں صوفی صاحب کو مجبور کروں گی کہ وہ ہمیں یہاں آنے دیا کریں۔''

''اچھا ایک بات بتایئے صوفی۔'' خانم فردوسیہ نے کہا۔

''ارشاد۔'' صوفی بولا۔ اسے خوشی تھی کہ صورت حال ہموار ہوگئی ہے۔ ان لوگوں کا جو انداز تھا اس سے اس نے جو نتیجہ اخذ کیا تھا۔ وہ تو بڑا ہی سنسنی خیز تھا۔

''کرنل رحیم شاہ صاحب! آپ کو کچھ نذرانہ تو دیتے ہوں گے۔''

''جی ہاں۔ کیوں نہیں۔''

''اور یہ بھی میرے علم میں ہے کہ آپ گورنمنٹ کے لیے پرائیویٹ فورس کا کام کرتے ہیں۔''

''ہاں مگر اس کا معاوضہ قبول نہیں کرتے درویشوں کے کرم سے البتہ کرنل صاحب کو خود اللہ تعالیٰ نے اتنا کچھ دیا ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے کہ وہ ان سارے معاملات کو بہ آسانی ہینڈل کر لیا کرتے ہیں۔ جو کچھ ہمیں ملتا ہے اس کا بھی ایک مصرف ہے۔''

''وہی مصرف میں معلوم کرنا چاہتی ہوں۔'' خانم فردوسیہ نے کہا۔

''بس معزز خاتون! آپ نے یہاں کا ماحول دیکھ لیا ہوگا یہ گلی یہاں سے وہاں تک ہمارا گھر ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ اپنا گھر چھوڑ کر کون ادھر ادھر بھاگتا ہے آپ جیسے کرم فرماؤں کی محبت بہت کچھ دے دیا کرتی ہے۔ لیکن یہاں ہر طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ ہم سب جو کھاتے ہیں مل کر کھاتے ہیں۔ ہمارے مسائل ایک دوسرے کے مسائل ہیں ہم انتظار نہیں کرتے کہ کس کے پاس کیا ہے اور کسے کیا درکار ہے۔ سمجھ لیجیے سب کچھ ہمارے درمیان آپس میں ہی ہو جاتا ہے۔ ہم مشترکہ خوشیاں مناتے ہیں۔ عید ہوتی ہے تو یہاں ہر گھر کے بچے کے بدن پر نئے کپڑے ہوتے ہیں چاہے اس کے والدین اس کے لیے نئے کپڑے بنوانے کی اہلیت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں۔ پھر ہم سب مل کر کھاتے پیتے ہیں۔ ممن خان کا ہوٹل ایک بہت بڑا باورچی خانہ بن جاتا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ اس کے علاوہ بھی جتنے یہاں گھر موجود ہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بات ان گھروں تک ہی محدود نہیں ہے کوئی شخص اگر کھانا کھا رہا ہو اور کوئی اجنبی یہاں کسی کا پتا معلوم کرنے کے لیے آ پہنچے یا کسی کام سے آ پہنچے۔ تو اسے کھانا کھلائے بغیر واپس جانے دینا حرام تصور کیا جاتا ہے درویشوں کے کرم سے۔''

''خدا کی پناہ......خدا کی پناہ آراشیہ سن رہی ہو دیکھ رہی ہو جہاں زندگی گزارنے کا انداز یہ ہو۔ وہاں کی خوشیوں کا ٹھکانا کیا۔ صوفی صاحب ایک بات اور بتایئے۔''

''جی ارشاد......ارشاد۔''

''دو دفعہ۔'' آراشیہ نے ہنس کر پوچھا۔

''درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی بولا اور خانم فردوسیہ گہری سوچ میں ڈوب گئی پھر اس نے کہا۔

''چھوڑیے۔ بہت اچھی جگہ ہے۔ یہ واقعی بہت اچھی جگہ ہے۔ کاش! یہاں ایک گھر میں بھی لے سکتی۔''

''یہ گھر آپ ہی کا ہے خانم! جب بھی آپ کا دل چاہے یہاں تشریف لے آیا کریں۔''

''بات زبانی نہیں ہے۔ آپ سوچ لیجیے صوفی صاحب میں بھی اس خاندان کی ایک ممبر بننا چاہوں گی۔''

''ہم نے عرض کیا نا یہ لوگ بہ خوشی آپ کو قبول کریں گے۔''

''چلیے مسئلہ حل ہو گیا ممی! ویسے آپ یقین کیجیے آپ نے میرے دل کی بات کہی ہے میں تو بڑی متاثر ہوئی ہوں یہاں کے ماحول سے۔ ہم لوگ نقلی زندگی گزارتے ہیں ہمارے درمیان وہ لوگ پھیلے ہوئے ہیں جنہیں ہم ان کے خلوص کا معاوضہ ادا کرتے ہیں۔ پیسے دیتے ہیں انہیں خود سے محبت کرنے کے لیے۔ کتنا فرق ہے مما! کتنا فرق ہے۔'' بہر حال یہ دونوں یہاں آ کر بہت متاثر ہوئی تھیں اور پھر جب یہ واپسی کے لیے نکلیں تو خانم فردوسیہ خود ممن خان کے ہوٹل چلیں۔ آراشیہ بھی ساتھ تھی اس نے ممن خان سے کہا۔

''مجھے آپ کا نام معلوم ہو چکا ہے ممن خاں ہے آپ کا نام، میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں۔''

''ارشاد فرمایئے۔ ارشاد فرمایئے۔'' ممن خان نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

''بات یہ ہے'' خان صاحب! کہ میں آپ کے اس خوب صورت خاندان میں شمولیت اختیار کرنا چاہتی ہوں اور میری آرزو ہے کہ آپ مجھے اپنے درمیان آنے کی اجازت دیں۔''

''خاتون یہ تو بہت بڑی بات کر رہی ہیں آپ بھائیوں کے گھر، بہنیں اجازت لے کر تو نہیں آتیں وہ تو ان کا اپنا میکہ ہوتا ہے اور جب بیٹیاں میکے آتی ہیں تو میکے والے نثار ہو جاتے ہیں۔ یہاں سب آپ کے بہن بھائی ہیں۔ جب بھی آئیں گی ہم آپ کو خوش آمدید کہیں گے۔ کبھی آپ کو ہم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' خانم فردوسیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

♥......♥......♥

''وقت کچھ اور آگے بڑھ گیا تھا۔ بالکل خاموشی طاری تھی اکثر خانم فردوسیہ کے ہاں نش
ہو جایا کرتی تھی کرنل رحیم شاہ بھی زیادہ تر دارالحکومت ہی رہا کرتے تھے اور شاہ میر خان صاحب سے
میٹنگیں ہو جایا کرتی تھیں۔ کرنل رحیم شاہ کے اہل خاندان بہ دستور وہیں اپنے مخصوص علاقے میں ہوتے
وہ لوگ اس جگہ کے عادی تھے ویسے بھی سردار پور ایک خوب صورت پہاڑی علاقہ تھا اور سب سے بڑی
یہ تھی کہ دارالحکومت سے بہت زیادہ دور نہیں تھا۔ وہاں تک آنے جانے میں کوئی دقت نہیں ہوا کرتی تھی۔
خانم فردوسیہ نے اپنے لیے ہر طرح کی آسائشیں پیدا کرلی تھیں۔ وہ صوفی اور کرنل رحیم شاہ سے مسلسل
رکھتی تھیں آراشیہ بھی اب صوفی کو چھوٹے بابا کہنے لگی تھی۔ اور اس نے اس کا تکیہ کلام درویشوں کی دعا
سے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ خانم فردوسیہ اکثر کہا کرتی تھیں۔

''کرنل رحیم شاہ صاحب! قدرت جب کسی کو کچھ دینے پر آجاتی ہے کتنی خاموشی سے دے
کرتی ہے کہ انسان سوچنے بھی نہ پائے۔ بڑا محدود ہوتا ہے انسان اپنی عقل میں، اپنی ذات میں سکیڑ
رہتے ہوئے میں اپنے آپ کو اس پہاڑی بستی کا مالک سمجھتی تھی ہر کام میری ہدایت پر آنکھیں بند کرکے کیا جا
تھا اس کے بعد بابر جاہ نے برائیوں کا آغاز کیا۔ میں کیا اور میری اوقات کیا۔ بس یہ کہنا چاہیے کہ قدر
بابر جاہ کو اس کے کیے کی سزا دینا چاہتی تھی۔ جو مجھے آپ تک آنے کا موقع ملا اور اس کے بعد آپ نے
قابل فخر شخصیت کو وہاں بھیجا جس نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا لیکن سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ
مجھے پتا نہیں کیا مل گیا۔ زندگی اس قدر خوب صورت ہے میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میرے
صوفی۔ زندگی سے جس قدر قریب ہیں کوئی جانے یا نہ جانے لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے
ویسے کرنل صاحب باقی تو سب ٹھیک ٹھاک ہے جیسے کہ محب وطن ہونے کی حیثیت سے آپ نے چند
کے اندر اندر ان وطن دشمنوں کو خاک میں ملا دیا اور حکومت کو اربوں روپوں کا فائدہ پہنچایا اس سے یہ تو پتا
گیا کہ قدرت نے کچھ لوگوں کو دوسروں کی بقا کے لیے متعین کر دیا ہے اور وہ بغیر کسی لالچ اور معاوضے کے
کام سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ بہرحال میں بھی آپ کے ساتھ شریک ہونا چاہتی ہوں۔ آپ مجھ پر مکمل
پر اعتبار کریں زندگی کی قیمت پر بھی کبھی آپ لوگوں کے کسی مفاد کے خلاف زبان نہیں کھولوں گی۔''

''میں جانتا ہوں کہ بھابی بیگم! میرا بھی زندگی کا ایک تجربہ ہے۔'' کرنل رحیم شاہ نے کہا اور پھر
''اور مجھے مسرت ہے کہ میں اپنے دوست کے اہل خاندان کے لیے تھوڑی سی خوشی مہیا کرنے
ذریعہ بنا۔ بہرحال میں آپ سے رابطہ کروں گا اگر کہیں کسی مرحلے پر آپ کا یا آراشیہ کا کوئی کردار ہوا تو
ضرور آپ کو زحمت دوں گا۔''

''انکل، شازیہ، دلاور، غلام قادر وغیرہ بھی تو آپ کی ہدایت پر کام کرتے ہیں میں بھی ایسا ہی کروں گی۔''

''ہاں کیوں نہیں آراشیہ! میں نے کہا نا کہ اگر ضرورت پیش آئی تو میں تمہیں ضرور تکلیف دوں گا''
اس دوران دو تین بار خانم فردوسیہ ان لوگوں کو بھی اپنے گھر بلانا چاہتی تھی۔ شازیہ کے اہل خاندان دلاور
بیوی بچے یہ سب یہاں اس کی کوٹھی میں بے فکری اور بے تکلفی سے آتے جاتے رہتے تھے اور خانم فردوسیہ
سے بہت محبت بھرا سلوک کرتی تھی۔ اس طرح سے الگ ایک چھوٹا سا خاندان بن گیا تھا۔ پھر ایک دن

رحیم شاہ نے صوفی کو فون کرکے طلب کیا اور صوفی اپنی سج دھج کے ساتھ گرین ہاؤس پہنچ گیا۔

اس کی مشہور زمانہ موٹر سائیکل اس کی بہترین سواری تھی اور جب بھی کبھی فرصت کے اوقات ہوا کرتے تھے۔ صوفی اسی موٹر سائیکل پر سفر کیا کرتا تھا۔ جس مکینک کے پاس اس موٹر سائیکل کی مرمت ہوتی تھی۔ اس نے کئی بار کہا تھا۔

''یار صوفی صاحب! یہ کسی زمانے میں موٹر سائیکل ہوگی اب تو اس میں پرانی ایک بھی چیز نہیں ہے۔ پیٹرول کی ٹینکی سے لے کر رم کی تاریں تک بدلی جاچکی ہیں۔ سوائے اس ایک رجسٹریشن نمبر کے، باقی بتایئے اس میں کون سی چیز پرانی رہی۔ کبھی کوئی گڑبڑ ہوتی ہے تو اسے بدل دیا جاتا ہے۔''

''ایک بات بتاؤ خلیل بھائی! درویشوں کی دعاؤں سے۔ انسان پیدا ہوتا ہے تو اسے نام دیا جاتا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ مذہب بدل جاتے ہیں۔ رشتے تبدیل ہوجاتے ہیں نام تو تبدیل نہیں ہوتا اسے اسی نام سے جانا جاتا ہے۔ چاہے اس کے ہزار نام رکھ لیے جائیں۔''

''سو تو ہے۔'' مکینک کہتا۔

''بس تو سمجھ لو کہ اس کا رجسٹریشن نمبر ہی اصل چیز ہے۔'' مکینک بھی ہنس کر خاموش ہوجاتا۔ صوفی کو کون نہیں جانتا تھا۔ کرنل رحیم شاہ نے گرین ہاؤس کے برآمدے میں صوفی کا استقبال کیا۔

''صوفی صاحب! موٹر سائیکل کا سائیلنسر کیوں نہیں بدلوا لیتے آپ۔''

''چل رہا ہے جناب! درویشوں کے کرم سے۔''

''چل تو رہا ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ راستہ چلتے ہوئے لوگ کبھی کبھی اس کی آواز سن کر دوڑ لگا دیتے ہیں کہ شاید کہیں کلاشنکوف چل گئی۔''

''درویشوں کا کرم ہے جناب! یہ تو اس کی خوبیاں ہیں۔''

''آیئے اندر آیئے۔ آج کل آپ ذرا درویشوں سے کچھ دور نظر آنے لگے ہیں۔''

''درویش رحم کریں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔''

''نہ محفل نہ قوالی۔ آپ کو پتا ہے انتہائی محترم بزرگ فضل کمال شاہ صاحب کا عرس مبارک شروع ہوچکا ہے اور ہم ہیں کہ اس طرف توجہ ہی نہیں اخبار میں تین چار بار خبریں آچکی ہیں۔''

''اماں تمہیں واللہ فضل کمال صاحب کا عرس ہو رہا ہے۔''

''جی جی...... اور محفل قوالی چل رہی ہے۔ رات رات بھر تب تو واقعی پھٹکار ہے ہم پر، درویشوں کی دعاؤں سے میرا مطلب ہے مجھ پر۔''

''نہیں مجھ پر بھی کوئی ہرج نہیں ہے۔'' کرنل رحیم شاہ نے مسخرے پن سے کہا۔

''یہ جرات نہیں کرسکتے ہم درویشوں کے کرم سے۔''

''تو پھر چل رہے ہیں آج۔''

''نہ جانے کل کا کیا سوال ہے باقی دنوں کی کسر بھی پوری کریں گے۔'' بس اس کے بعد کرنل رحیم شاہ بھی مست ہوگیا۔ دونوں طویل ترین فاصلہ طے کرکے شہر سے کافی دور پہنچ گئے۔ یہاں واقعی جنگل میں

منگل منایا جا رہا تھا۔ جگہ جگہ آگ کے الاؤ روشن کر دیے گئے تھے۔ کیونکہ موسم میں ذرا خنکی تھی۔ زائرین
عرس کے شرکاء نے اپنے اپنے آرام کا بندوبست کر لیا تھا۔ بہت سے لوگ نظر آ گئے۔ یہاں خال خال درد
تھے۔ جن کے نیچے ڈیرے لگے ہوئے تھے۔ ہر طرح کے لوگ پیر فضل کمال کے معتقدین تھے۔ چنانچہ
درجے کی گاڑیوں کی بھی خاصی تعداد موجود تھی۔ اس وقت رات ہو چکی تھی مزار شریف کے احاطے سے قوالی
کی آواز ابھر رہی تھی۔ صوفی نے بھی اپنی گاڑی پارک کی۔ کرنل رحیم شاہ نے اسٹک سنبھالی اور صوفی
کندھے کا سہارا لیتے ہوئے کشاں کشاں مزار شریف کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ جگہ بھی مل گئی تھی۔ ق
بہت اچھے تھے اور بہت عمدہ قوالی گائی جا رہی تھی۔ دونوں نے فاتحہ خوانی کی اور اس کے بعد محفل قوالی
جا بیٹھے۔ ہر طرح کے لوگ موجود تھے۔ جس جگہ ان لوگوں کو بیٹھنے کی جگہ ملی تھی وہاں مزار شریف کے احاطے
دیوار ختم ہوتی تھی اور اس کے بعد سیڑھیاں چلی گئی تھیں۔ صوفی اور کرنل رحیم شاہ سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ رش
وجہ سے زیادہ دور آگے نہیں جا سکتے تھے۔ بس اسی جگہ کو غنیمت سمجھا گیا اور وہ اپنا ذوق پورا کرتے رہے
اچانک ہی ایک آواز سنائی دی۔

"کیا ہو رہا ہے فیاض۔ کیا ہو رہا ہے نیند آ رہی ہے کیا۔" یہ کسی عورت کی آواز تھی۔ مرد کی آواز ابھری

"نہیں ری نیند نہیں آ رہی چکر آ گیا ہے ذرا سنبھال مجھے۔ چکر آ گیا ہے۔"

"ارے تو خود کو سنبھال فیاض! ہمیں کچھ ہو گیا تو ہمارے رحمت علی کو تو دیکھنے والا ابھی کوئی نہیں
ارے ہمیں ہی تو اس کے لیے کوشش کرنی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔"

"میرے پاس یہ روٹی ہے۔ چپ چاپ کہیں بیٹھ کر کھا لو پیٹ میں کچھ نہیں ہوگا تو چل پھر
سکو گے۔ یہیں کسی پیڑ کے نیچے گر کر مر جاؤ گے۔ لو کھا لو۔"

"ارے ارے اللہ رسول کا نام لیا جا رہا ہے اور میں بیٹھ کر روٹی کھاؤں۔"

"مر جاؤ گے فیاض علی مر جاؤ گے۔ تمہیں اللہ کا واسطہ لو کچھ کھا لو۔"

"اور تم تو جیسے پیٹ بھرے بیٹھی ہوئی ہو حمیدہ! تم کب سے بھوکی ہو پتا ہے کچھ۔"

"کیا کھاؤں کیسے کھاؤں، اسے دیکھا تھا تم نے۔" عورت کی روتی ہوئی آواز ابھری۔

"ہاں دیکھا ہے۔"

"بات تک نہیں کرنے دی ہمیں اس سے۔"

"ہاں حمیدہ! پولیس والے بڑے سخت دل کے مالک ہوتے ہیں۔"

"ذرا سی بات کر لیتے ہم اپنے بیٹے سے تو کیا بگڑ جاتا ان کا۔"

"پگلی ہو بالکل پگلی ہو۔ وہ جانتے ہیں کہ ماں باپ کے دل کیسے دکھی ہوتے ہیں۔ دنیا میں
کے لیے پیسے چاہیے ہوتے ہیں حمیدہ! ہمارے پاس کچھ پیسے ہوتے تو وہ ہمیں اس سے بات کر لینے دیتے

"تو تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا فیاض علی! یہ میرے پاس جو تھوڑے سے پیسے ہیں۔ ہم انہیں
دیتے۔ کیا ہماری بات ہو سکتی تھی اپنے بچے سے۔"

"پتا نہیں۔ کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"سوچو کچھ سوچو۔ فیاض علی ہمارا رحمت اگر ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا تو کیا ہوگا۔"

"اسی لیے تو مرشد کے قدموں میں آیا ہوں۔ مرشد دعا کر دو اللہ سے، دعا کر دو۔ مرشد کبھی تو
تمہیں کچھ نہ دیتے ہوں گے۔ کبھی تو تمہیں کچھ نہ دیتے ہوں گے؟ ہمارے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ نہیں
ہے۔ مگر فقیر کی طرح تمہارے سامنے ہاتھ تو پھیلا سکتے ہیں۔ دعا کر دو مرشد دعا کر دو۔ مرد کی آواز لرزنے لگی تو
عورت نے جلدی سے کہا۔

"خود کو سنبھال فیاض! خود کو سنبھال۔ دیکھو اللہ سے لو لگائی ہے۔ اللہ کچھ نہ کچھ تو کرے گا ہی۔ لو
تمہیں اللہ کا واسطہ یہ کھا لو۔"

"بس تجھے تو ایک ہی پڑی ہوئی ہے یہ کھا لو۔ یہ کھا لو کس دل سے کھا لوں۔ پتا نہیں پولیس والے
میرے بیٹے کو کچھ دے بھی رہے ہوں گے یا نہیں۔ جیل میں تو سنا ہے بڑی سختی کی جاتی ہے۔ کیسا منہ نکلا ہوا تھا
جب عدالت میں اسے لایا گیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر کیسی آنکھیں جھکا لی تھیں اس نے۔"

"روٹی کھا لو پہلے۔"

"روٹی روٹی لگا رکھی ہے تو نے، مجھے اپنے بیٹے کا چہرہ نظر آ رہا ہے۔ دکھا کیا ہے؟"

"یہ روٹیاں ہیں تھوڑی تھوڑی کھا لیتے ہیں اگر نہیں کھائیں گے تو چلا نہیں جائے گا۔ تم یقین کرو
مجھے بھی چکر آ رہے ہیں فیاض۔"

"ٹھیک ہے مرشد کے قدموں میں پڑے رہیں گے۔ جب تک ہمیں روشنی نہیں دکھائیں گے وہ۔"

"میری تو کمر میں درد ہو رہا ہے رات کو جس درخت کے نیچے سوئے تھے بس...... سنا ہے درختوں
کے نیچے تو سونا بھی نہیں چاہیے۔"

"ارے کون سی زندگی پانی ہمیں، ہمارا بیٹا چھوٹ جائے بس اس کے سوا ہمیں اور کیا چاہیے۔"

"ہائے کیسے بچائیں ہم اپنے رحمت علی کو۔"

"ہم کیا بچائیں گے اللہ ہی بچائے گا۔"

"پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا ہے فیاض! جیسے یہ لوگ ہمارے رحمت علی کو مار ڈالیں گے۔"

"ہاں ایسا ہی لگتا ہے۔"

"تو کیا کریں گے ہم؟"

"نہیں حمیدہ! کچھ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے پھانسی ہوئی نا تو اسی پھانسی گھر کے
سامنے ہماری لاشیں بھی پڑی ہوں گی۔ سمجھیں...... ہماری لاشیں بھی وہیں پڑی ہوں گی ارے یہ سہارا تو ہے نا
ہمارے پاس، ہمارا رحمت علی اگر پھانسی چڑھ گیا تو ہم بھی خودکشی کر لیں گے۔ گناہ گار تو ہم ہیں ہی۔ جہنم میں
جانا ہی ہے دنیا میں بھی اور آسمان میں بھی۔ ایک گناہ اور سہی۔"

"لوگوں نے کس طرح اپنا رویہ بدل لیا۔ سب ہی منہ موڑ گئے۔ دلاور نے کس طرح کہہ دیا کہ بھائی
جیسی کرنی، ویسی بھرنی اب اپنے حالات خود دیکھو کون کسی کا ساتھ دیتا ہے۔"

''لو روٹی لے لو۔''

''اور تیرے پاس کیا ہے۔''

''لے لو نا قسم کھاتی ہوں مجھے بھوک نہیں لگ رہی۔''

''تو مجھ سے کیوں کہے جا رہی ہے۔'' مرد کا لہجہ کسی قدر سخت ہو گیا۔

''تمہیں چکر جو آ رہے ہیں۔ پڑ گئے تو میں تو اٹھا کر کہیں لے جا بھی نہیں سکوں گی۔''

''پاگل ہو گئی ہے تو، جوان بیٹا زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار ہے۔ میں تو اتنا چل سکتا ہوں حمیدہ کہ بڑے بڑے بھی چلنے کا تصور نہ کریں۔ میں چل لوں گا تو فکر مت کر۔''

''روٹی تو کھا لو تھوڑی سی تمہیں اللہ کا واسطہ۔''

''کیا روٹی روٹی لگا رکھی ہے۔ کلیجہ چبا رہا ہوں اپنا کوئی گنجائش نہیں ہے۔ روٹی کی میرے پیٹ میں۔'' فیاض کا لہجہ بگڑا ہوا تھا۔

''دیکھو تمہیں میری جان کی قسم کھا لو۔''

''ہٹ تیرے کی۔ بلاوجہ قسمیں دے دیتی ہے۔ ساری زندگی تیری قسمیں پوری کرتا رہا ہوں۔ منع کروں گا تو کہے گی بدل گیا۔ لا ادھر لے آ...... لے آ۔'' بڑی عجیب و غریب گفتگو تھی۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ ذہن قوالی سے ہٹ گیا تھا۔ یہ کیا چکر ہے۔ کون ہیں یہ دکھ کے مارے اور کس طرح یہ آواز کانوں تک پہنچائی گئی ہے۔ یہ کیا قصہ ہے۔ کرنل رحیم شاہ نے صوفی کی طرف دیکھا تھا صوفی بھی اپنی مجذوبانہ کیفیت سے باہر نکل آیا تھا۔ کرنل رحیم شاہ سرگوشی میں بولا۔

''صوفی صاحب۔''

''درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''آپ نے یہ باتیں سنی ہیں۔''

''بحمداللہ...... آپ کا کیا خیال ہے۔ جناب من کیا ہمیں ہی سنی تھیں یہ باتیں۔''

''کیا مطلب صوفی صاحب۔''

''حضور عالی! انہیں ہمارے کانوں تک پہنچایا گیا ہے۔ یہی تو رمز ہوتے ہیں بزرگوں کے درویشوں کی دعاؤں سے۔ کرنل رحیم شاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے کہا۔

''گویا آپ بھی وہی سوچ رہے ہیں صوفی صاحب! جو میں سوچ رہا ہوں۔''

''یہ ہم آہنگی ہی ہمارا درمیانی رشتہ ہے کرنل صاحب! ورنہ سچ یہ ہے کہ نہ کوئی لالچ نہ ضرورت نہ مجھے ہے نہ آپ کو۔ بس یہ انداز ہی ایک دوسرے کا ساتھ بنائے ہوئے ہے۔'' صوفی کے لہجے میں ایک عجیب سی تمکنت پیدا ہو گئی اور کرنل رحیم شاہ متاثر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ کبھی کبھی صوفی بالکل ہی نئے رنگ میں نظر آتا تھا۔ کرنل رحیم شاہ چور نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ دونوں روٹی کھا رہے تھے اور ان کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔ کرنل رحیم شاہ کا دل بھی بھر آیا۔ کھاتے کھاتے دونوں ہی سسکنے لگتے تھے اور ان کے منہ سے آوازیں نکلتی تھیں۔

''یا ولی، یا پیر، یا مرشد، مشکل حل کر دے ہماری مشکل حل کر دے۔ تیرا احسان ہو گا دعا کر دے۔ ہمارے رحمت علی کے لیے اللہ سے، تیری دعاؤں میں ہماری دعاؤں سے کہیں زیادہ قوت ہے۔ دعا کر دے ولی ہمارے لیے، بڑی آس لے کر آئے ہیں تیرے در پر، بے سہارا ہیں کوئی پرسان حال نہیں ہے مدد کر دے ہماری ولی، مدد کر دے۔ تیری دعائیں ضرور کارگر ہو سکتی ہیں ہمارے لیے، بچا لے ہماری زندگی بھر کی کمائی کو، اور کچھ نہیں ہے ہمارے پاس، ہمارے رحمت علی کے سوا۔ بچا لے ولی، بچا لے ولی......'' صوفی اور کرنل رحیم شاہ دم بخود تھے۔ محفل قوالی صبح پانچ بجے تک چلتی رہی اور پانچ بجے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوا۔ زائرین اٹھ اٹھ کر باہر جانے لگے۔ کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

''صوفی صاحب! میں جا کر گاڑی میں بیٹھتا ہوں۔ آپ ان دونوں کو ٹریس کیجیے۔''

''درویش رحم کریں ٹھیک ہے۔'' اور اس کے کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب صبح کے ساڑھے چھ بجے کا وقت ہوا صوفی کرنل رحیم شاہ کے پاس پہنچا۔

''دونوں ایک درخت کے نیچے لیٹ کر سو گئے ہیں غالباً یہاں رکنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

''ہاں عرس ابھی کافی دن تک جاری ہے لیکن صوفی صاحب انہیں لے کر چلتے ہیں ہم، ان کے مسئلے کو دیکھنا ہو گا ویسے آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔ یہ کام ہمیں کرنا چاہیے نا۔''

''اب بھلا کسی خیال کی کیا گنجائش ہے۔ حضور من درویشوں کی دعاؤں سے بزرگوں کا حکم ہو چکا ہے اور میں تو پورے اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ مرشد فضل کمال نے دعوت ہی ہمیں اس کام کے لیے دی تھی اپنا فرض لے کر یہاں سے جا رہے ہیں۔''

''بالکل صوفی صاحب! ویسے بھی طویل عرصہ ہو گیا ہے ایک طرح سے معطل ہی بیٹھے ہوئے ہیں ہم۔ کچھ نہ کچھ تو ہاتھ پاؤں ہلانے ہی چاہئیں۔ ویسے میرا ایک اور خیال ہے اس بارے میں۔''

''کیا درویشوں کے کرم سے۔''

''بھئی دیکھیے۔ ملکی دفاع تو سرزمین وطن کے ایک ایک چپے پر کیا جاتا ہے۔ ہم یہ دفاع کس لیے کرتے ہیں کہ اہل وطن مشکلوں سے نکلیں انہیں ہر لمحے اپنوں کا تحفظ حاصل ہو۔ ملک دشمن اگر سرزمین وطن پر برائیوں کی کارروائی کریں تو ہم ان کے سامنے سینہ چوڑا کر کے کھڑے ہو جائیں۔ لیکن اس طرح اگر کوئی مظلوم دادرسی کا خواہش مند ہو تو کیا وہ ہمارا ہم وطن نہیں ہے۔ کیا اس کی یہ مشکل دور کرنے کے لیے کوشش کرنا ہمارا فرض نہیں ہے۔ صوفی صاحب ایک طرح سے ایک نئی جہت ذہن میں آئی ہے۔ وہ یہ کہ ہم خود کو صرف مخصوص راستوں کا راہی نہ بنائیں۔ بلکہ مشکل جہاں کہیں بھی ہمارے سامنے آئے ہم اس میں اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے سینہ تان کر کھڑے ہو جائیں صوفی صاحب یہ تو بڑا ضروری ہے۔ چنانچہ اس وقت یہ دو مظلوم جس طرح ہمارے سامنے ہیں اصولی طور پر ہم پر سکون حرام ہو جانا چاہیے۔''

''ایسا ہی ہو گا درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے کہا۔

''آئیے پھر نکل چلیں یہاں سے، کام جتنی جلدی ہو زیادہ بہتر ہے پتا نہیں کیا صورت حال نکلے ویسے گاڑی جا سکتی ہے وہاں جہاں وہ موجود ہیں۔''

''جی بالکل۔'' صوفی نے گاڑی کا اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ کرنل رحیم شاہ اس کے برابر بیٹھ گیا اور
وہ لوگ وہاں جا رکے جہاں وہ دونوں بے چارے میلی کچیلی چادریں اوڑھے لیٹے ہوئے تھے۔ کرنل رحیم شاہ
نے اشارہ کیا اور صوفی نیچے اتر گیا۔ پھر اس نے فیاض علی کو جگایا تھا۔ فیاض علی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے
گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا ہو گیا بھائی صاحب۔''

''اٹھیے اور انہیں بھی اٹھائیے۔''

''ایں۔ کیا ہم غلط جگہ سو گئے ہیں۔ یہ آپ کی جگہ ہے کیا؟''

''ہر جگہ اللہ کی ہوتی ہے درویشوں کی دعاؤں سے آپ اٹھیے اور انہیں بھی اٹھائیے۔''

''حمیدہ! حمیدہ! اٹھ نا۔'' عورت بھی جاگ گئی تھی۔

''آئیے۔''

''کک...... کہاں؟''

''آئیے بعد میں بتا دیں گے۔'' صوفی نے فیاض علی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ہاتھ کی گرفت کافی
سخت تھی وہ اسے گاڑی کی طرف لے جانے لگا۔ تو فیاض علی نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''دیکھیے بھائی جی۔ کوئی غلط فہمی ہوئی ہے آپ کو ہم تو عرس پاک میں شرکت کے لیے آئے تھے
اور رات کو قوالیاں سنتے رہے تھے پھر یہاں آ کر لیٹ گئے تھے۔ کوئی بات ہو گئی ہے تو ہمیں بتائیے ہم تو ویسے
ہی مرے ہوئے ہیں۔''

''آپ آئیے درویشوں کے کرم سے آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔''

''گگ...... گاڑی میں کیوں بٹھا رہے ہیں آپ ہمیں۔ پولیس والے ہیں بھائی صاحب۔ کچھ
تو دیجیے۔''

''آئیے حمیدہ بہن! آپ بھی آجائیے۔ بے فکر رہیں آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔'' بہ مشکل تمام ان
دونوں کو گاڑی میں بٹھایا گیا اس دوران صوفی نے دروازے لاک کر دیے اور اسٹیئرنگ پر آ بیٹھا سیدھے سادے
لوگ تھے۔ کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر نہ جانے کیا حرکت کر بیٹھتے لیکن راستے بھر وہ چیختے چلاتے رہے تھے۔

''ہمیں ہمارا قصور تو بتا دیجیے بھائی جان! ارے آپ کو نہیں معلوم ہم تو ویسے ہی ادھ مرے ہیں۔ دعا
مانگنے آئے تھے مزار پاک پر بھائی جان کہاں لیے جا رہے ہیں بتا تو دیجیے۔''

''جو لوگ بزرگوں کے مزاروں پر آتے ہیں نا انہیں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ بلکہ فائدے ہی
فائدے ہوتے ہیں۔ آپ آئیے بے فکر ہو کر بیٹھیے۔'' پھر گاڑی گرین ہاؤس کے گیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔
کیس گرین ہاؤس ہی کا تھا۔ چنانچہ ان دونوں کو وہاں لے جانے میں کوئی الجھن نہیں محسوس کی جا سکتی تھی۔
دونوں بے چارے بری طرح بدحواس تھے۔

''فیاض علی اور حمیدہ بہن! پہلے بھی میں نے آپ سے کہا تھا درویشوں کی دعاؤں سے کہ جو لوگ
بزرگوں کے مزارات پر جاتے ہیں۔ انہیں فائدے ہی فائدے ہوتے ہیں نقصان نہیں ہوتے۔ آپ آئیے

سے اندر آجائیے۔ جس مقصد کے لیے آپ گئے تھے۔ اس میں ہم آپ کی مدد کریں گے۔''

''ارے بھائی! آپ کو نہیں معلوم ہمارا مسئلہ کیا ہے ارے بھائی! پتا نہیں کیوں لے آئے ہیں
آپ ہمیں یہاں ارے بھائی کوئی غلطی ہو گئی ہے تو معاف کر دیجیے۔'' فیاض علی گڑگڑاتا رہا۔ صوفی اور کرنل
رحیم شاہ انہیں کمرے میں لے آئے اور پھر دلاور کی بیوی سے کہا گیا کہ حمیدہ کے کپڑے وغیرہ بدلائے۔ اسے
نہانے کو کہے۔ غلام قادر کے حوالے فیاض علی کو کر دیا گیا تھا۔ غلام قادر نے کہا۔

''اڑے ماں قسم تم تو کتے کا مافق ٹیاؤں، ٹیاؤں کرتا پڑا ہے ڑے۔ اڑے چلو ابھی کپڑا بدل لو ہمیں
تو دیں گا ایک فیٹ۔ بولے جا رہا ہے بولے جا رہا ہے۔''

بہرحال غلام قادر کی اپنی ایک فطرت تھی۔ دونوں کے لباس تبدیل کرائے گئے اور اس کے بعد
ناشتے کے کمرے میں لے جایا گیا۔ بہترین ناشتا لگا دیا گیا تھا۔ فیاض علی نے کہا۔

''آپ لوگ تو یوں لگتا ہے جیسے الف لیلہ کے بادشاہ ہوں۔ ہارون الرشید کی بیگم نے منصور نامی
نوجوان کو ایک رات کے لیے اغوا کر کے اپنی رہائش گاہ میں بلایا تھا اور اسے یہ بتا دیا تھا کہ وہ بادشاہ ہے۔ بس
اس کے بعد بے چارہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہی مر گیا۔ خود کو بادشاہ سمجھنے لگا لیکن ہمارا معاملہ بھائی کچھ اور ہے ہم
درد کے مارے غم زدہ لوگ ہیں۔''

''آپ ناشتا کیجیے ناشتا کرنے کے بعد مجھے آپ سے تفصیلی گفتگو کرنی ہے۔ مختصر الفاظ میں آپ
کو یہ بتا دوں کہ رات کو جب آپ محترم بزرگ فضل کمال کے مزار پر اپنے بیٹے رحمت علی کے لیے دعائیں
مانگنے کے لیے گئے تھے تو ہم آپ کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے آپ دونوں کی باتیں سنیں اور اس
کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ آپ کی بھرپور مدد کی جائے گی۔ رحمت علی کو قانون کے چنگل سے بچایا جائے گا خدا
کرے۔ وہ جس کیس میں بھی ملوث ہوا ہے وہ جھوٹا کیس ہو۔ تا کہ ہمیں سچائی ثابت کرنے میں آسانی ہو۔
آپ سمجھ لیجیے کہ یہ بزرگ فضل کمال صاحب کا ہی کمال ہے۔ اور آپ اس پر بھروسا کیجیے۔ چلیے اب ناشتا
کیجیے۔'' جواب میں فیاض علی رو پڑا۔ پھر بولا۔

''جانتے ہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے میرے بیٹے کو کیا کھانے کو ملا ہوگا۔''

''دیکھیے...... بے شک آپ ماں باپ ہیں۔ میں آپ کے جذبات کا احترام کرتا ہوں لیکن جب
کچھ لوگ خلوص دل سے آپ کے لیے کچھ کرنے پر آمادہ ہوں تو آپ کا تعاون ضروری ہے۔''

''جی......''

''چلیے ناشتا کیجیے۔ اسے آج جو کچھ مل رہا ہے کل وہ نہیں ہوگا۔ آپ ہمیں بھرپور طریقے سے اس
کے بارے میں بتائیے۔ ناشتے کے بعد۔'' آخر کار کرنل رحیم شاہ اور صوفی، فیاض علی کی زبان کھلوانے میں
کامیاب ہو گئے۔ آہوں اور سسکیوں کے دوران اس نے کہا۔

''بس بھائی جان جی! یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ کب اسے کس کا امتحان لینا ہے ہم جی رحیم یار خان
کے ایک چھوٹے سے گاؤں شیخ امانت کے رہنے والے ہیں۔ اسی گاؤں میں پیدا ہوئے، وہیں زندگی گزاری
ابا مرتے ہوئے ایک چھوٹی سی دکان چھوڑ گئے تھے۔ بستی شیخ امانت کے پرانے رہنے والے تھے۔ بستی میں

مڈل اسکول بھی تھا۔ چھٹی جماعت تک پڑھائی کی۔ اس کے بعد ابا مر گئے تو دکان سنبھال لی بڑی چھوٹی دکان تھی جی۔ اتنی کہ بس دال روٹی مل جائے۔ اللہ نے بیٹا دیا۔ شادی پڑوسیوں نے کرادی تھی بس ایک ہی ہوا ہمارا اس کے بعد کوئی اولاد نہیں ہوئی رحمت علی نام رکھا تھا ہم نے اور اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر جی اسے نے مڈل تک پڑھالیا۔ بڑی امیدیں لگا رکھی تھیں اس سے۔ پھر جب وہ جوان ہوا تو رشتے کے ایک بھائی بیٹی سے اس کی منگنی کردی۔ دلارے خان بڑا بے وفا نکلا جب منگنی ہوگئی تو بیٹے کے دل میں بھی امنگ ہوگئی کہ کمائی کرے ہمارے پاس کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا صاحب جی! بستی شیخ امانت میں بھلا نوکری کس کے پاس ہوتی زیادہ سے زیادہ یہ کہ کوئی کسی کی بھینس چرالے۔ یا کسی کے کھیت سے آلو نکال لے۔ لیکن ہم یہ چاہتے تھے اور ہمارا بیٹا رحمت علی بھی یہی چاہتا تھا کہ کچھ بن کر بہو بیاہ کر لائے۔ یہ اس کی آرزو تھی جی۔ ہم سے بات ہوئی تو ہم نے کہا بیٹا! جیسا تو مناسب سمجھ کر۔

بس جی کہنے لگا شہر جا کر نوکری کروں گا ہم نے کبھی شہر نہیں دیکھا تھا اس نے بھی نہیں دیکھا تھا بستی شیخ امانت کے کچھ لڑکے شہر میں کام کرتے تھے۔ ترقی کر گئے تھے جی ہم نے سوچا کہ اللہ ہمارا بھی ہاتھ تھام ہی لے گا۔ دل پر پتھر رکھ کر بیٹے کو شہر بھیجا اور اس کے لیے ہاتھ پھیلا کر بیٹھ گئے جی۔ تھوڑے عرصے کے بعد اس کا خط ملا اور اس نے بتایا کہ اسے کام مل گیا ہے۔ ویسے ایک گھر میں چاکری مل گئی ہے پانچ سو روپے تنخواہ ہے گھر والوں نے کہا ہے کہ اگر اس نے ٹھیک سے کام تو اس کی ترقی بھی ہوجائے گی۔ ہمارے لیے پانچ سو صاحب جی یہ سمجھ لیجیے کہ پانچ ہزار تھے۔ دکان کی آمدنی سو ڈیڑھ سو روپے مہینہ سے زیادہ نہیں تھی۔ ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا رکھی تھی۔ ہم لوگ خواب دیکھنے لگے کہ بس اب تو سارے دلدّر دور ہوگئے حمیدہ کہتی تھی کہ تھوڑے سے پیسے جمع کر کے سب سے پہلے رحمت علی کی شادی کریں گے۔ یہ جھونپڑی اسے دے دیں گے اور اس کے باہر تھوڑی سی چھت اور ڈال لیں گے گھاس پھونس کی اور اس میں ہم گزارہ کرلیں گے۔ بہو بیٹے اندر رہیں گے اور ہم باہر کبھی کبھی ہم خوابوں میں کھو جاتے تھے صاحب جی! ہم کہتے تھے کہ ہمارے رحمت علی کے ہاں اولاد پیدا ہوگی تو ہم کہاں رہیں گے۔ بس جی زندگی میں تھوڑی سی خوشیاں آ گئی تھیں۔ اور اس طرح کوئی چھ سات مہینے گزر گئے۔

لیکن پھر یہ خوشی کالی ہوگئی تھی جی اچانک ہی رحمت علی کے خط بھی آنا بند ہوگئے اور پیسے بھی۔ ایک مہینہ گزرا دو مہینے اور پھر جب تین مہینے گزر گئے تو ہم بری طرح پریشان ہوگئے۔ حمیدہ کہنے لگی کہ کہیں رحمت علی بھٹک تو نہیں گیا۔ اس نے ہم سے رشتہ تو نہیں توڑ لیا۔ شہر میں وہ کسی کے جال میں تو نہیں پھنس گیا۔ پر جی لاچار کیا کرتے ہاں وہ خط موجود تھے جن میں اس گھر کا پتا بھی تھا۔ جہاں وہ کام کرتا تھا ہم نے ہمت کی اور دکان بند کر کے شہر آ گیا۔ بڑے صاحب شہر ہم جیسے دیہاتیوں کے لیے وہ جگہ ہوتی ہے۔ جہاں آ کر ہماری عقل کھو جاتی ہے۔ پورے چودہ دنوں میں مجھے اس کوٹھی کا پتا لگا تھا جہاں میرا رحمت علی کام کرتا تھا۔ کوٹھی پر گیا اور پھر وہاں نوکروں سے ہاتھ جوڑ کر معلوم کیا تو انہوں نے ایک بری کہانی سنائی ہمیں۔ انہوں نے بتایا کہ رحمت علی......'' فیاض علی کی آواز ہچکی میں بدل گئی اور حمیدہ زار و قطار رونے لگی۔ صوفی نے دلاور سے پانی لانے کے لیے کہا۔ فیاض علی کو پانی پلایا گیا اور بہ مشکل تمام وہ سنبھل سکا۔

''انہوں نے بتایا کہ رحمت علی کو اس کوٹھی کے مالک کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا ہے اور وہ اب جیل میں ہے۔ بس جی سینہ پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا میں تو، نوکروں کو مجھ پر رحم آ رہا تھا انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں۔ تو میں نے اسے بتایا کہ بھائی اس کا باپ ہوں میں۔ شیخ امانت بستی سے آیا ہوں تب مجھے نوکر نے تفصیل بتائی۔'' فیاض علی اپنے آنسو پونچھنے لگا۔ شازیہ نے حمیدہ کو سہارا دے کر کہا۔

''آپ بالکل بے فکر رہیں اگر آپ کا بیٹا بے گناہ ہے تو ہم اسے جیل سے نکال لیں گے سمجھ لیجیے ہم یہی کام کرتے ہیں۔''

''چپ ہوجا حمیدہ۔ چپ ہوجا شکر ادا کر بزرگ پیر فضل کمال شاہ کا۔ انہی کے مزار پر منتیں مان رہے تھے نا ہم ارے یہ بزرگ خود تو نکل کر کام نہیں کرتے سہارا ہی پیدا کرتے ہیں نا۔ صاحب جی ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ آپ یقین کرلو۔ ماں باپ اپنی اولاد سے واقف ہوتے ہیں۔ صاحب جی اپنے بچوں کے ایک ایک عمل کو جانتے ہیں وہ۔ رحمت علی مر کر بھی کسی کو نہیں مار سکتا وہ تو بڑا معصوم ہے جی۔ ہمیں نوکروں سے جو بات معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ جی رحمت نے رات کی تاریکی میں مالک کو چھرا مار کر ہلاک کردیا اور سامان سمیٹ کر باہر نکلنے کے لیے تیار ہوگیا۔ رات کی تاریکی میں چونکہ گیٹ پر پہرہ ہوتا ہے اور نکلنا بڑا مشکل ہوتا ہے اس لیے اس نے سامان اپنے پلنگ کے گدے کے نیچے چھپا دیا اور انتظار کرنے لگا کہ صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جائے۔ مگر رات ہی میں اسے پکڑ لیا گیا اور اب وہ مالک کے قتل کے الزام میں جیل میں بند ہے صاحب جی۔ سب اپنے بچوں کو بے قصور سمجھتے ہیں۔ مگر میں ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ رحمت علی نہ چور ہوسکتا ہے اور نہ قاتل۔ وہ کسی کو نہیں مار سکتا صاحب جی۔ نوکروں سے ساری معلومات حاصل کر کے میرے تو پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی جی۔ اس کے بعد میں نے کیا کیا پاپڑ بیلے اللہ جانتا ہے اور بعد میں، میں نے اپنے رحمت علی سے ملنے کی کوششیں شروع کردیں۔ مجھ جیسے دیہاتی کو اس میں کیا مشکلات پیش آئیں کہنا بے کار ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ آخری حد تک پہنچ گیا تھا۔ بہر حال پھر جیل میں میری ملاقات میرے رحمت علی سے ہوئی صاحب جی! جالیوں کے پیچھے ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔'' فیاض علی نے بہ مشکل تمام اپنے لہجے کو سنبھالا پھر بولا۔

''صاحب جی۔ مجھے دیکھ کر بلک بلک کر رو پڑا۔ اس نے اپنی ماں کی قسم کھائی کہ اس نے نہ چوری کی ہے نہ قتل کیا ہے صاحب جی! میں جانتا ہوں وہ ماں کی قسم کبھی جھوٹی نہیں کھا سکتا تھا۔ اس کے آنسو بتا رہے تھے کہ اس نے کچھ نہیں کیا مگر صاحب جی! ہم اس کے لیے کیا کرتے۔ میری تو سمجھ ہی ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ ہانپتا کانپتا بستی پہنچا اور حمیدہ کو ساری بات بتادی اس کے علاوہ ہمارا اور تھا بھی کون۔ ہم دونوں کی کیا حالت ہوئی تھی اللہ بہتر جانتا ہے۔ بس جی ہاتھ پاؤں ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ مگر اپنے بیٹے کو جس عالم میں چھوڑ آیا تھا۔ اسے دیکھ کر ہاتھ پاؤں میں پھر زندگی پیدا ہوگئی۔ بستی کے سیانوں سے مشورے ہے سب کو بتادیا ہے کہ کیا ہوگیا دلارے خاں بھی آ گیا تھا۔ سنگ دل پتھر آنکھیں بدل لیں بچپن کے ساتھی نے، ارے برا وقت تو کسی پر بھی آ سکتا ہے اللہ سے توبہ کی جائے معافی مانگی جائے۔ اس نے ہم پر بہت سی تہمتیں لگائیں اور نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا بستی کے لوگ مشورہ دے رہے تھے کہ شہر جا کر رحمت علی کے لیے کارروائی کی جائے مگر ہم جیسے غریب لوگ جب ایسی بیماری ہم پر آ جاتی ہے جس کا علاج لاکھوں میں ہوتا ہو تو خاموش ہو کر بیٹھ جاتے

ہیں اور اپنے بیمار کو مردہ سمجھ لیتے ہیں کیونکہ ہم ان کا علاج نہیں کرا سکتے۔ ہمارے پاس چھوٹی سی دکان تھی ایک جھونپڑی تھی بس یہ بیچ دی اور شہر آ گئے۔ یہاں آ کر وکیلوں کے دروازوں کے چکر لگائے۔ ایک وکیل صاحب ہمارا کیس لڑنے پر تیار ہو گئے۔ ہم جو کچھ لائے تھے ان کے حوالے کر دیا انہیں وہ پسند نہیں آیا برا بھلا کہا ہمیں اور ہم ان کے پیروں میں پڑ گئے ہم نے اسے کہا کہ وکیل صاحب ہم اپنے بیٹے کی جان کی قیمت نہیں دے سکتے لیکن غلامی کریں گے آپ کی۔ بہر حال مقدمہ چالو ہو گیا صاحب جی! مگر یہ ہمیں پتا چل گیا کہ یہ مقدمہ آسان نہیں تھا۔ اگر ہم اپنے منہ سے کہتے کہ ہمارا بیٹا بے گناہ ہے تو کون مانتا؟ ہماری حیثیت ہی کیا تھی۔ صاحب جی! بس اس کے بعد مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ابھی تین دن پہلے پیشی تھی۔ پیلا رنگ پڑ گیا ہے صاحب جی۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں۔ کیا گبھرو جوان تھا۔ دیکھنے دکھانے کے قابل پر اب اس کا کیا حال ہو گیا ہے صاحب!'' ایک بار پھر دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

♥......♥......♥

''کرنل رحیم شاہ، صوفی، شازیہ، عادل اور فیضان سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ صوفی کے چہرے کے نقوش پتھرائے ہوئے تھے۔ البتہ منہ جگالی کر رہا تھا اور عادل اور فیضان نے کئی بار اسے جگالی کرتے ہوئے دیکھ کر ایک دوسرے کو اشارے کیے تھے۔ پھر اچانک ہی صوفی کے منہ سے غاؤں غاؤں کی آواز نکلی اور وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ غسل خانے میں جا کر منہ میں بھرا ہوا سرخ طوفان منہ کی گرفت سے سے آزاد کیا اس کے بعد کلیاں کیں اور پھر اس سرخ طوفان کے جو آثار غلاظت پھیلے ہوئے تھے ان کی صفائی کرنے لگا۔ باہر فیضان ناک چڑھا کر کہہ رہا تھا۔

''چھوٹے بابا بہت اچھے آدمی ہیں۔ لیکن پتا نہیں یہ پان ان پر کیوں سوار ہو گیا۔ اگر وہ اس غلاظت کے شکار نہ ہوں تو کتنی اچھی بات ہے۔'' کرنل رحیم شاہ نے مسکراتی نگاہوں سے فیضان کو دیکھا اور بولا۔

''فیضان! لوگوں میں پتا نہیں کیا کیا برائیاں ہوتی ہیں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو گے۔ اس بے چارے کی زندگی کا یہی ایک ساتھی اور مقصد ہے اور حقیقی بات یہ ہے کہ اس کے بغیر اس کی ذات کی تکمیل نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے ہمیں اس پر کوئی نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ اس کی اس چھوٹی سی برائی کی پذیرائی کرنی چاہیے۔''

''پتا نہیں انکل صوفی صاحب کا ماضی کیا ہے۔ کبھی ان کے ماضی کی ایک جھلک بھی سامنے نہیں آتی۔ ویسے میں ان کی رہائش گاہ دیکھ چکا ہوں اتنی سادہ اور عجیب سی زندگی ہے کہ بس عقل حیران رہ جائے۔''

''اس کا وہ ماضی جو بالکل ہی پوشیدہ ہے، ہے تو واقعی قابل تجسس لیکن جتنی معلومات مجھے اس کے بارے میں ہیں وہ یہی ہیں کہ بہت ہی نفیس انسان ہے اور نفس کشی کرتا ہے حقیقی معنوں میں انسانیت کے اعلیٰ اصولوں پر کاربند ہے۔ جس کا حکم دے کر انسان کو اس کائنات میں بھیجا گیا ہے۔ اپنی ذات پر توجہ دینے کے بجائے وہ دوسروں کے لیے بہت کچھ کرتا رہا ہے۔ بڑے اچھے اچھے عہدے ملے ہیں اسے لیکن بس وہی اپنی فطرت سے محبت اور اس کو تبدیل نہ کرنے کا شاخسانہ بھگتا رہا ہے۔'' یہ لوگ صوفی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے کہ صوفی اندر سے باہر نکل آیا۔ منہ بالکل صاف ہو گیا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں کی گہرائی دیکھ کر

اندازہ ہوتا تھا کہ صرف ایک چغد ہی نگاہوں کے سامنے نہیں ہے بلکہ جب سوچ میں ڈوبا ہو تو چہرے پر ایسے آثار پیدا ہو جاتے ہیں کہ انسان انہیں دیکھے غور کرے اور ان کا قائل ہو جائے۔ پھر وہ ان کے درمیان آ کر بیٹھ گیا تو کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

''جی صوفی صاحب! کچھ فیصلے کیے ہوں گے آپ نے۔''

''درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''وہی مطلب ہے۔'' کرنل رحیم شاہ نے کہا صوفی نے ایک پیڈ اور پین اپنے ہاتھ میں لیا اور اس پر لکھنے لگا پھر بولا۔

''نمبر ایک درویشوں کے کرم سے۔''

''جی جی بالکل نمبر ایک درویشوں کی دعاؤں سے۔'' عادل نے شرارت سے کہا۔

''ہمارے سامنے وہ گھرانا ہے۔ جس کی تفصیل ابھی تک ہمیں نہیں معلوم۔ لیکن ہمیں اس کے بارے میں تحقیقات کرنا ہوگی۔ یہ کام شازیہ کے سپرد کیا جاتا ہے۔ شازیہ آپ کو بہت جلد اس گھرانے کی تفصیل فراہم کر دی جائے گی۔ آپ یہ کام کر لیجیے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں بھرپور کوشش کروں گی۔''

''میرا مطلب ہے جس شخص کو قتل کیا گیا ہے۔ یعنی جہاں رحمت علی نے ملازمت کی تھی۔ کیا ہے وہاں کی تفصیل یہ شازیہ کو معلوم کرنا ہوگی۔ اس کے بعد ہم عادل اور فیضان کو آگے بڑھائیں گے۔ کرنل صاحب ہمیں ایک کام کرنا ہے پہلے تو ہم بھی شیخ امانت جا کر رحمت علی اور اس کے کردار کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔ اس کے بعد ہمارا دوسرا کام اس وکیل سے ملاقات کرنا ہوگا جسے ان بے چاروں نے اپنا گھر بار بیچ کر معاوضہ ادا کیا ہے۔ یہ ساری تفصیل اس طرح سے ہوگی یعنی ہم کام کو مختلف حصوں میں بانٹ لیتے ہیں۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں صوفی صاحب! تھوڑی سی تبدیلی اس طرح کر لیجیے کہ میں عادل اور فیضان کو لے کر بستی امانت شیخ چلا جاتا ہوں۔ شازیہ کو معلومات فراہم ہو جائیں تو یہ اپنی رپورٹ تیار کر لیں اور صوفی صاحب آپ ان وکیل صاحب کا تعاون حاصل کیجیے گا۔ اصل میں آپ کافی عرصے پولیس سے وابستہ رہے ہیں۔ وکیلوں اور پولیس کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ آپ ان سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔''

''جی......ٹھیک ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے آمادگی کا اظہار کر دیا۔ شازیہ نے اپنے مشن کی تیاریاں کیں یہ ایک ذہین لڑکی تھی اور پہلی بار یہ کسی ایسے سول معاملے میں اپنا کام کرنے کے لیے نکلی تھی۔ دوسری طرف کرنل رحیم شاہ نے عادل اور فیضان کے ساتھ بستی امانت شیخ پہنچے۔ بستی کی واحد مسجد میں نماز ختم ہوئی تھی اور نمازی مسجد سے باہر نکل رہے تھے رحیم شاہ نے عادل سے جیپ روکنے کے لیے کہا۔ اور پھر ایک نمازی کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

''بھائی صاحب بات سنیے گا۔''

''جی کہیے جناب۔''

''اگر آپ کے پاس وقت ہے۔تو میں آپ سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں ہاں کہیے وقت ہی وقت ہے۔''

''کوئی ایسی جگہ ممکن ہے جہاں ہم تھوڑی دیر بیٹھ سکیں گے۔''

''آپ کی گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں۔'' خاصا بے مروت آدمی معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ اس طرح کی چھوٹی بستیوں اور آبادیوں میں اس قدر با اخلاق اور مہمان نواز لوگ ہوا کرتے ہیں کہ کبھی کبھی تو ان کی مہمان نوازی پر انسان حیران رہ جاتا ہے۔لیکن یہ شخص ان روایتوں کا مذاق اڑا رہا تھا۔

''آیئے پھر بیٹھ جایئے۔'' کرنل رحیم شاہ نے کہا اور وہ شخص جیپ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

''اصل میں مجھے کچھ معلومات کرنی تھی ایک شخص کے بارے میں۔''

''ہاں جی حکم کرو۔بستی کے ہر ایک آدمی کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''میں فیاض علی شاہ کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

''فیاض علی۔او جناب وہ شاہ کیسے ہوگیا۔ بتانا پسند کریں گے آپ۔''

''تمہیں اس بات پر اعتراض ہے۔''

''نہیں جی۔جس نے بھی اس کے بارے میں آپ کو یہ بتایا تھا کہ اس کا نام فیاض علی شاہ ہے۔ غلط بتایا ہے جناب! فیاض علی ہے اس کا نام بستی ہی کا رہنے والا تھا ایک چھوٹی سی دکان تھی۔بس جناب وہ جو کہتے ہیں نا کہ باپ پر پوت، پتا پر گھوڑا اب پتا نہیں اس کا مطلب کیا ہے اور ایک بات تو ہم جانتے ہیں کہ باپ نے کم گل نہیں کھلائے ہوں گے جو بیٹے نے کھلائے اللہ بھی بڑا کارساز ہے جی۔بال بال بچالیا اس نے ہمیں۔''

''آپ تو بہت کچھ جانتے ہیں فیاض علی کے بارے میں۔''

''شکریہ جی! اس بار آپ نے اسے شاہ نہیں کہا۔ بڑا غصہ آتا ہے ہمیں۔ہم نہیں جانیں گے اس کے بارے میں تو اور کون جانے گا۔اے میاں صاحب! ہماری بیٹی کی زندگی برباد ہوتے ہوتے بچ گئی۔اللہ نے بچالیا اگر شادی ہوجاتی جیسے فیاض علی کہہ رہا تھا کہ دلارے بھائی نکاح کرلو منگنی تو بڑے لوگوں کے چونچلے ہیں۔ میں نے کہا کہ فیاض علی ہمارے پاس ابھی بندوبست نہیں ہے اور نکاح وکاح کر کے لٹکانا نہیں چاہیے لڑکی کو منگنی کا تو معاملہ یہ ہے کہ جی ہوئی ہوئی نہ ہوئی ٹوٹ گئی۔ پر نکاح کا مسئلہ تو خراب ہوجاتا ہے جی۔بھلا جی اللہ نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ بیٹا قاتل نکلا۔لکھ پتی بننے جا رہا تھا۔ لک کو مار دیا سسرے نے۔اپنے مالک کو قتل کردیا جس کا نمک کھایا اسے قتل کردیا صاحب جی ایک بات آپ کو بتائیں بس جی دیگ کا ایک چاول دیکھا جاتا ہے جس بندے نے اپنے ان داتا کو مار ڈالا ہو وہ کسی اور کی کیا عزت کرے گا۔ بچ گئی ہماری بچی بال بال۔'' عادل اور فیضان نے ایک دوسرے کی صورت دیکھی۔ کرنل رحیم شاہ بھی سمجھ گیا کہ یہی وہ دلارے خاں ہیں جس کی بیٹی سے منگنی ہوئی تھی فیاض علی کے بیٹے کی۔ یہ شخص واقعی برا آدمی تھا۔اس نے پوچھا۔

''مگر صاحب جی آپ اس کے بارے میں کیا معلوم کرنا چاہتے ہو وہ تو اپنی دکان اور جھونپڑی خالی کر چلا گیا۔ بدمعاش بیٹے کا مقدمہ لڑنا تھا اسے اب اس کا اس بستی سے کوئی تعلق نہیں رہا۔''

''تعلق ہے دلارے خاں! سمجھے تعلق ہے۔''

''کیا تعلق ہے جی؟''

''ابھی رحمت علی پر مقدمہ چل رہا ہے سزا نہیں ہوئی اسے پیشیاں ہو رہی ہیں ہوسکتا ہے وہ اپنے مالک کا قاتل نہ نکلے سمجھے۔ایسی صورت میں اگر وہ قاتل نہ ہوا تو بھلا پھر ہم اسے مجرم کیسے قرار دے سکتے ہیں۔اور پھر تمہاری بیٹی کا معاملہ ہے۔منگنی توڑی تو نہیں ہے تم نے اس سے۔''

''او یار کیا بات کرتے ہو۔اب بھلا رحمت علی سے کوئی اپنی اولاد کی تقدیر پھوڑے گا جیل میں ہے وہ آپ کو پتا ہے۔''

''ہاں ہے تو جیل میں مگر ابھی تو مقدمہ چل رہا ہے بھائی ہوسکتا ہے اس پر قتل کا الزام جھوٹا ہو۔''

''او بھائی جان! کچھ بھی ہے اب اپنی بیٹی کی شادی اس سے نہیں کروں گا۔ بدنام ہوچکا ہے وہ۔ میں خود بھی بدنام تھوڑی ہونا چاہتا ہوں کوئی۔''

''مگر یہ تو زیادتی ہے تمہاری اگر وہ مجرم نہ نکلا تو پھر تو تمہیں یہ رشتہ نہیں توڑنا چاہیے۔''

''او میاں! تمہاری کوئی بیٹی ہے یہ بتاؤ مجھے، کیا رکھا ہے اس ننگے بھوکے کے پاس؟ رہنے کا ٹھکانا تک تو نہیں رہا اب اس کا۔فرض کرو اگر وہ جیل سے چھوٹ بھی گیا تو کیا کرے گا۔''

''دیکھو دلارے خاں! بات اصل میں یہ ہے کہ ابھی اس پر مقدمہ چل رہا ہے۔ جب تک فیصلہ نہ ہوجائے تمہیں اس کے بارے میں کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔''

''مگر میاں بھائی تم کون ہو۔''

''میں جو کوئی بھی ہوں ایک بات میں تمہیں بتائے دیتا ہوں یہ خیال اپنے دل سے نکال دو خاص طور سے اس وقت تک جب تک کہ اس مقدمے کا فیصلہ نہ ہوجائے۔''

''چھوڑو بھئی چھوڑو۔ میں تو اپنی بچی کے رشتے کے لئے ایک دو جگہ بات بھی کر چکا ہوں مجھے نہیں کرنی اب اس لڑکے سے شادی چاہے مجرم ہو یا نہ ہو۔''

''یہ ظلم ہے دلارے خاں میں نے سنا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں۔

''کرتے ہوں گے جی! ہم ان کی پسند کو دیکھیں یا اپنی عزت کو دیکھیں۔''

''مان لو میری بات دلارے خاں!''

''او بھائی تو جا اپنا کام کر لنگڑا کہیں کا دلارے خاں کو مجبور کرنے آیا ہے؟ ہماری بیٹی ہے کنوئیں میں ڈال دیں ہم۔''

''اچھا...... عادل چلو ذرا۔'' کرنل رحیم شاہ نے کہا اور عادل نے چونک کر کرنل رحیم شاہ کو دیکھا اور اس کے بعد جیپ اسٹارٹ کردی۔ دلارے خاں کچھ نہیں بولا تھا لیکن جب جیپ برق رفتاری سے بستی امانت شیخ سے باہر نکل آئی تو وہ بوکھلا کر بولا۔

''ابے او کدھر جا رہے ہو دماغ خراب ہوا ہے روکو گاڑی۔ روکو میں کہتا ہوں کہاں جا رہے ہو۔ اغوا برائے تاوان، کیا کر رہے ہوا رے روکو بھائی۔''

''کود جاؤ دلارے خاں! اچھا ہے یہیں تمہارا بھیجا کسی پتھر سے ٹکرا کر نکل جائے تم جیسے آدمی کا

مر جانا بڑا ضروری ہوتا ہے۔"

"ابے لو ابے لو۔ ابے میں نے کیا کر دیا بھائی۔" عادل کو مزہ آ رہا تھا اس نے جیپ کی رفتار اور تیز کر دی۔ دلارے خاں شور مچاتا رہا۔ نہ جانے کرنل رحیم شاہ نے اچانک یہ فیصلہ کیوں کیا تھا۔ جیپ دوڑتی رہی دلارے خاں چیختا رہا اور پھر صبر کر کے بیٹھ گیا۔

"میری بات تو سنو۔ چاہتے کیا ہو تم۔"

"کچھ نہیں دلارے خان! تمہیں کچھ دن رحمت علی کے ساتھ جیل میں رکھا جائے گا تھوڑی سی مرمت کی جائے گی تمہاری اور اس کے بعد تم ٹھیک ہو جاؤ گے اور یہ خیال دل سے نکال دو گے کہ اپنی بیٹی کی شادی کہیں اور کر دو۔ ہم تو تم سے صرف اتنا ہی کہہ رہے تھے کہ تم تھوڑا سا انتظار کر لو۔"

"ابے تو بھیا! میں کون سی شادی کیے دے رہا ہوں کل۔"

"نہیں شادی تو تم بے شک نہیں کیے دے رہے۔ لیکن تمہارے ارادے جو برے ہیں۔"

"مگر پیارے بھائی تم ہو کون۔ کیا تم مجھے جیل میں ڈال دو گے۔"

"ہاں۔ ہمارا تعلق ملٹری انٹیلی جنس سے ہے اگر بات تمہاری سمجھ میں آ جائے تو۔"

"آ گئی آ گئی۔ مگر فوج رحمت علی کے چکر میں کیسے پڑ گئی۔"

"یہ سرکاری راز ہیں لیکن ایک بات تم سن لو۔ اگر تم نے اس وقت تک اپنی بیٹی کی شادی کہیں اور کرنے کی کوشش کی تو ملٹری تمہارے گھر پر چھاپہ مارے گی اور اس کے بعد تمہارا جو کچھ ہو گا وہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"تو یہ بات تم وہیں کہہ دیتے۔ پیارے بھائی! میں مان لیتا۔ بھلا اپنی فوج کا حکم کون نہیں مانے گا۔"

"تو اب تمہارا کیا ارادہ ہے۔"

"نیچے اتار دو پیارے بھائی! بس مل جاتی ہے ادھر سے بستی جانے کے لیے، میرے بیوی بچے خوف سے مر جائیں گے کہ دلارے خاں کہاں چلا گیا۔"

"دلارے خاں ہم تمہارے پاس آتے رہیں گے۔ ایک وعدہ تم سے کیا جاتا ہے وہ یہ کہ اگر رحمت علی مجرم نکلا تو تمہیں مجبور نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اگر اس مقدمے کا فیصلہ ہوئے بغیر تم نے اپنی بیٹی کی شادی کہیں اور کرنے کی کوشش کی تو کم از کم تمہیں زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے تیار ہوں۔"

"گاڑی روک دو۔" کرنل رحیم شاہ نے عادل سے کہا اور عادل نے گاڑی روک دی پھر کرنل رحیم شاہ نے دلارے خاں کو کچھ رقم دے کر کہا۔

"یہاں سے بس میں چلے جانا اور میری بات کا خیال رکھنا۔"

"جی بھائی جی۔" دلارے خاں نے کہا عادل جب گاڑی لے کر واپس لوٹ رہا تھا تو کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"اسے کہتے ہیں لاتوں کے بھوت۔"

♥......♥......♥

ایک پرانے جغادری وکیل تھے۔ نام تھا رضوان علی شاہ بعض لوگ شاہوں کو اسی طرح بدنام کرتے ہیں ویسے صوفی سے جان پہچان نہیں تھی۔ اور صوفی نے بھی انہیں نہیں دیکھا تھا۔ آفس پہنچا تھا اپنے مخصوص لباس میں تھا۔ پہلے تو رضوان علی شاہ کے اسٹاف نے ہی اسے روکا۔

"جی فرمایئے کیا بات ہے کہاں سے آئے ہیں آپ؟"

"مدرسہ فلاح بہبود ان کے متولی معلوم ہوتے ہیں۔" کسی جاہل نے تبصرہ کیا لیکن صوفی رکے بغیر وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ جس کے سامنے وکیل صاحب کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی دو آدمی ارے ارے کرتے ہوئے ان کے پیچھے بھاگے تھے۔ چپڑاسی غالباً کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ صوفی اندر داخل ہو گیا۔ بھاری بھرکم اور شاطر سی شکل والے رضوان علی شاہ نے صوفی کی شکل دیکھی اور اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ کون صاحب ہیں یہ کیا تم لوگ پاگل ہو گئے ہو۔ تمہیں پتا ہے میں اس طرح کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔"

"سر یہ بس...... چلیے جناب باہر چلیے۔"

"اور اگر نہ جائیں تو۔" صوفی نے کہا۔

"ارے یہ بدمعاش اب شیروانی میں بھی آنے لگے۔ شیروانی والے بدمعاش باہر نکل جاؤ مجھے نہیں جانتے تم۔"

"نکلوا دیجیے حضور والا درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی پر بھی مستی چھا گئی تھی۔ دونوں آدمی جو اندر گھس کر آئے تھے۔ صوفی کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔

"جی سر! کیا کریں۔"

"اب بھی پوچھ رہے ہو کیا کریں۔ باہر نکالو اسے۔ وکیل صاحب نے نخوت سے کہا۔ اور دونوں آدمی صوفی کو باہر نکالنے کے لیے زور لگانے لگے۔ صوفی اطمینان سے کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ دونوں اسے دھکیلنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن صوفی کو اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہلا سکے پھر ان کی آنکھوں میں حیرت کے نقوش جاگ اٹھے۔ اتنی دیر میں چپڑاسی بھی آ گیا تھا۔ وہ بھی دبلا پتلا ہی ایک آدمی تھا۔ اس نے حیرت سے یہ منظر دیکھا اور پھر کچھ سوچے سمجھے بغیر صوفی کی کمر سے لپٹ گیا۔ کیفیت یہ تھی کہ تین آدمی تھے اور صوفی کو باہر گھسیٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن لگتا تھا جیسے ایک سنگی ستون ہو جو اپنی جگہ جما کھڑا ہو۔ وہ تینوں بری طرح نروس ہو گئے۔ کیونکہ صوفی کو ہلا بھی نہیں سکے تھے اپنی جگہ سے۔ صوفی کا منہ جگالی کر رہا تھا اور ٹھوڑی پر جگہ جگہ پان کی پیک رینگ آئی تھی پھر اس نے ہونٹ دبا کر کہا۔

"وکیل صاحب اپنے ان مچھروں سے کہہ دیجیے درویشوں کی دعاؤں سے کہ جائیں باہر، بلاوجہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ہمیں آپ سے بڑا ضروری کام ہے اور آپ یقین کریں کہ جو کچھ ہم آپ سے کہنا چاہتے ہیں اسے سن کر آپ کو ہمارا یہاں آنا برا نہیں لگے گا۔"

"رضوان علی شاہ صاحب خود بھی یہ تماشا دیکھ رہے تھے اور انہیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ آنے والا بہ ظاہر جو کچھ نظر آتا ہے۔ وہ الگ ہے لیکن درحقیقت کوئی شے ہے۔ انہوں نے کہا۔

''چھوڑ دو چلے جاؤ باہر جا کر بیٹھو۔ میں دیکھتا ہوں ابھی پولیس کو ٹیلیفون کر کے بلالوں گا اور تم
دن تک الٹا لٹکوائے رکھوں گا۔ تب بات ان کی سمجھ میں آ جائے گی۔ میں پوچھتا ہوں آخر آپ ہیں کون؟''

''بیٹھ کر بتائیں گے درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی نے آستین سے ٹھوڑی پونچھتے ہوئے کہا
آستین پر بہت سی لکیریں بن گئیں۔ چپڑاسی اور دونوں افراد جو اچھے خاصے پڑھے لکھے معلوم ہوتے تھے
حیرت اور غصے کا شکار ہو کر باہر نکل گئے۔ صوفی نے ایک کرسی گھسیٹی اور بیٹھ گیا۔

''رضوان علی شاہ صاحب! احقر کو صوفی کہتے ہیں درویشوں کے کرم سے۔''

''کسی یتیم خانے کے متولی ہیں آپ ظاہر ہے یتیموں کا مال کھا کھا کر انسان اتنا ہی طاقتور
ہو جاتا ہے جتنے آپ ہیں۔ چندہ مانگنے آئے ہوں گے۔''

''جی نہیں، نہ ہم کسی یتیم خانے کے متولی ہیں درویشوں کی دعاؤں سے نہ کسی دینی مدرسے کے
کارکن، ہم تو آپ سے کسی انتہائی ذاتی کام کے سلسلے میں ملاقات کرنے حاضر ہوئے تھے۔''

''کوئی کیس ہے آپ کا تو پہلے بتانا چاہیے تھا باہر وہ لوگ بیٹھے اسی لیے ہیں۔ آپ پہلے تفصیل
بتا دیتے تو وہ آپ کو عزت سے یہاں پہنچا دیتے۔''

''عزت سے تو ہم اب بھی یہاں آئے ہیں۔ دیکھ لیجیے آپ نے بے عزتی کرنے کی کوشش فرمائی
درویشوں کے کرم سے اور ہمارا بال بیکا بھی نہ ہوا۔'' رضوان علی شاہ صوفی کو گھورنے لگا تھا رضوان نے ادھر
ادھر نگاہیں دوڑائیں اور بولا۔

''اگال دان نہیں ہوگا آپ کے پاس۔'' پھر اس کی نگاہ اس خوبصورت باسکٹ پر پڑی جو میز کے
ایک طرف رکھی ہوئی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پھر منہ کا سارا ملغوبہ باسکٹ میں الٹ دیا۔ رضوان علی شاہ
ارے ارے ہی کرتا رہ گیا تھا۔ صوفی نے واپس کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اب منہ میں پان تھا تو آپ سے بات کیسے ہوتی۔''

''میں کہتا ہوں آپ چاہتے کیا ہیں۔''

''حضور من ایک کیس کا مسئلہ ہے ذرا ٹھنڈے ہو کر سنیے گا۔ اگر ممکن ہو تو چائے منگوا لیجیے دودھ
پتی کی ہو تو کیا کہنا۔ نہ مل سکے تو جیسی بھی ملے گی چل جائے گی درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''آپ نے جو حلیہ بنا رکھا ہے نا اپنا۔ اس کے برعکس معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن آپ یہ سمجھ لیجیے میرا
نام بھی رضوان علی شاہ ہے آپ کی عقل درست کر کے نہ رکھ دوں تو نام بدل دوں گا اپنا۔''

''غصہ نہ فرمائیے گا ہم تو بڑے مرنجان مرنج آدمی ہیں۔ ہماری عرض داشت سن لیجیے گا اس کے
بعد جو فیصلہ فرمائیں گے قابل قبول ہوگا درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا
رضوان علی شاہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ لیکن وہ برداشت کر رہا تھا اب تک جو کچھ ہو چکا تھا وہ اس قدر مضحکہ خیز تھا
کہ اس کی عقل کھوپڑی سے اوپر ناچنے لگی تھی۔ اس نے سوچا کہ ٹھنڈے ہو کر اس بے ہودہ شخص کی بات تو سن
لی جائے۔ کون ہے کیا چاہتا ہے۔ کیا کہنا چاہتا ہے۔ یہ معلوم کیے بغیر چارہ کار نہیں تھا۔ اس نے سامنے رکھے
ہوئے پانی کے جگ سے دو گلاس پانی پیا اور گلاس واپس رکھ دیا۔ صوفی نے فوراً ہی وہ گلاس اٹھا لیا تھا اور

اس نے گلاس منہ سے لگا کر پانی کا گھونٹ بھرا اور ایک بار پھر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ رضوان علی شاہ نے دونوں
ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔ کیا بلا سر لگی تھی۔ مزہ ہی آ گیا تھا۔

اچانک ہی صوفی کے منہ سے غڑ غڑ کی آوازیں نکلنے لگیں اور پھر اس نے ایک زوردار کلی
اسی باسکٹ میں کر دی جس میں اس نے پان کا ملغوبہ اگلا تھا۔ یہ باسکٹ رضوان علی شاہ کے پیروں کے پاس
رکھی تھی۔ پان کی پیک کی چھینٹوں سے تو وہ بچ گیا تھا لیکن اب جو سرخ پانی کا طوفان نمودار ہوا تھا اس کی بہت
سی چھینٹیں وکیل صاحب کی پتلون پر پڑی تھیں۔

''معافی کے طلب گار ہیں۔ اصل میں آپ سے صاف ستھری گفتگو کرنا چاہتے ہیں درویشوں کے
کرم سے۔''

''آپ مجھے کسی پاگل خانے سے بھاگے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔''

''غر......غر......غر......'' صوفی نے دوسرا گھونٹ بھرا اور دوبارہ باسکٹ میں کلی کر دی پھر ٹھنڈی
سانس لے کر بولا۔ ''اب ٹھیک ہے۔ جی...... تو ہم آپ سے کچھ گفتگو کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔''

رضوان علی شاہ شدید غصے کے عالم میں بول بھی نہیں سکا تھا، وہ بس خونی نظروں سے صوفی کو گھورتا رہا۔

''قتل کا کیس آپ کے پاس ہے۔ ملزم کا نام رحمت علی ہے۔ اس کے والد فیاض علی نے یہ کیس
آپ کو دیا ہے۔''

''دیا تھا کہو۔ اب وہ میرے پاس نہیں ہے۔''

''ہم سمجھے نہیں حضور والا۔''

''آپ ہیں کون اور کیا چاہتے ہیں۔'' رضوان شاہ غرا کر بولا۔

''خادم ہیں حضور آپ کے اور ایک درخواست لے کر آئے ہیں۔ لیکن آپ کے ان الفاظ نے
ہمیں ششش......شش......شش، ہمارا مطلب یہ ہے کہ ششدر کر دیا ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''ایک بات بھی سمجھ میں نہیں آ رہی آپ کی، پتا نہیں کیا بکواس کر رہے ہیں۔''

''وہ......جج...... جناب عالی! رحمت علی ولد فیاض علی، ہمارا مطلب ہے کہ قتل کا کیس۔''

''وہ تو سمجھ لیا ہے میں نے، آپ رحمت علی کے کون ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔''

''پہلے تو ان الفاظ کی وضاحت فرما دیجیے گا درویشوں کے کرم سے کہ آپ کہتے ہیں کہ وہ کیس
اب آپ کے پاس نہیں ہے۔''

''ہاں میں نے کوئی خیراتی ادارہ نہیں کھول رکھا۔ وہ میری پوری فیس نہیں ادا کر سکتا تو ظاہر ہے میں
اس کیس میں دلچسپی نہیں لے سکتا۔''

''کتنی رقم ادا کی ہے اس نے آپ کو۔'' صوفی نے سوال کیا۔

''جتنی بھی ادا کی ہے میرے پاس اس کا کوئی حساب کتاب نہیں ہے۔ لیکن وہ میری پوری فیس
نہیں ہے۔''

''تو پھر آپ یوں کیجیے گا کہ اس کیس سے دستبردار ہو جائیں۔''

''ہو جائیں کیا ہو چکا ہوں۔ ابھی میں نے تمہیں یہی بتایا ہے مگر میں پھر سوال کروں گا کہ آخر تم ہو کون۔؟''

''ایک بندہ۔'' ناچیز، عاشق درویش، بے اوقات۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''وہ تو شکل سے لگ رہے ہو اور جو حرکتیں تم نے یہاں آ کر کی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انتہائی گھٹیا درجے کی صحبت یافتہ ہو کسی بہت ہی نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے۔''

''بہ خدا...... کیا زبردست پہچان ہے آپ کی۔ بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔ ہم چھوٹی لائن دربار اسٹریٹ میں گھر نمبر بیس میں رہتے ہیں۔ اس علاقے میں جائیں گے تو ممن خان کے ہوٹل کے بارے میں معلومات حاصل کر لیجیے گا۔ ممن خان بڑے مشہور آدمی ہیں۔''

''اب آپ جاتے ہیں یا پولیس کو بلاؤں۔'' رضوان علی شاہ نے کہا۔

''نن...... نہیں ہم کوئی غنڈہ گردی تو نہیں فرما رہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''یہ درویش کہاں سے آ جاتے ہیں ہر بات کے بیچ میں۔''

''ہائے یہی تو آپ کی کم عقلی ہے وکیل صاحب۔ بہ خدا ایک دوستانہ مشورہ دے رہے ہیں درویشوں کی شان میں کبھی گستاخی نہیں فرمایئے گا۔ اگر یہ کام شروع کر دیا آپ نے تو، تو سمجھ لیجیے کہ زوال شروع ہو گیا۔''

''اوہ، میرا خیال ہے اب آپ کا زوال شروع ہو جانا چاہیے۔'' رضوان علی شاہ نے ٹیلیفون کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بس ایک منٹ جناب! بس ایک منٹ اس سے زیادہ وقت نہیں لیں گے آپ کا، معافی چاہتے ہیں اگر ہماری گفتگو سے آپ کی سمع خراشی ہوئی ہے۔ اصل میں ہماری آرزو ہے کہ آپ ان مظلوم لوگوں کی رقم واپس کر دیں۔ ویسے بھی یہ کیس آپ کے بس کا نہیں ہے۔ بے چاروں کو تجربہ نہیں تھا ورنہ کوئی ڈھنگ کا وکیل کرتے۔ آپ جیسے معمولی وکیل قتل کے کیس کی پیروی کرنے کے تو قابل نہیں ہو سکتے۔'' رضوان علی اسے گھورتا رہا اور پھر بولا۔

''آپ ایسا کریں مجھے اپنا پتا بتا جایئے میں آپ سے تفصیلی گفتگو یہاں سے الگ ہٹ کر کروں گا یہ تو میرا دفتر ہے اور میں یہاں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی نہیں چاہتا۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ۔''

''چھوٹی سی بات ہے حضور من آپ ان کی رقم واپس کر دیں اور اس سے دستبردار ہو جائیں۔''

''دیکھو...... بہت ہو گئی۔ اب میں مجبور ہوں کہ تمہارے ساتھ برا سلوک کروں۔''

''نا نا نا نا...... آپ اچھے شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں ہم نے تو ایک درخواست کی ہے آپ سے''

''میں کہتا ہوں کھڑے ہو جاؤ۔'' رضوان علی شاہ خود اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا تو صوفی نے بھی گردن چھوڑ دی۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹولنے لگا۔ رضوان علی شاہ ایک دم دہاڑا۔

''بچاؤ...... دوڑو...... پکڑو اسے یہ ریوالور نکال رہا ہے۔''

''لیکن صوفی کا ہاتھ جیب سے باہر آیا تو اس میں پانیوں کی ڈبیا چھالی تمباکو کا بٹوا تھا۔ لوگ دوڑ کر

اندر آ گئے تو صوفی نے کہا۔

''تلاشی لے لیجیے حضور والا۔ پستول اور ریوالور کی تو بات ہی کیا ہے۔ ہمارے پاس تو نیل کٹر تک نہیں ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔ شاہ صاحب کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ ویسے شاہ صاحب ساری باتیں اپنی جگہ۔ آپ ایسا کیجیے کہ ان کی رقم بینک سے نکلوا لیجیے۔ ہم وہ رقم آپ کو ہضم نہیں کرنے دیں گے اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے۔ تو پتا نوٹ فرما لیجیے گا۔ جب دل چاہے تشریف لایئے غریب خانے کے دروازے آپ پر ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ حضور والا آپ پتا لکھ لیجیے۔'' اس نے رضوان علی شاہ کی میز کے پاس کھڑے آدمی سے کہا اور اس شخص نے بادل نخواستہ بال پوائنٹ اور پیڈ اپنے سامنے کر لیا اور پتا نوٹ کرنے لگا۔ رضوان علی شاہ آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

''تو حضور من! پتا حاضر ہے اڑتالیس گھنٹے آپ کو پیش کیے جاتے ہیں یا تو آپ ان اڑتالیس گھنٹوں میں اپنا بندوبست کر لیجیے گا اور اپنے آپ کو ہم سے بچا لیجیے گا اور اگر نہ بچا سکے تو پھر دو باتیں ہیں آپ ان کی رقم ادا کر دیجیے۔ ورنہ پھر جوتے کھانے کے لیے تیار ہو جایئے گا۔ ہماری اور آپ کی ذاتی بات چیت ہے۔ چلتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''دیکھ لوں گا میں تجھے جوتے کے بچے، دیکھ لوں گا۔'' رضوان علی شاہ نے غراتے ہوئے کہا۔ لیکن صوفی آہستہ قدموں سے باہر نکل گیا تھا۔

♥......♥......♥

شازیہ نے آئینے پر آخری نگاہ ڈالی میک اپ میں تو اسے مہارت حاصل تھی اور وہ جب بھیک مانگتی تھی تو ایسا ایسا میک اپ کرتی تھی کہ دیکھنے والے حیران رہ جائیں۔ اس وقت بھی اس نے ایک الٹرا ماڈرن لڑکی کا روپ اختیار کیا تھا اور اتنا خوب صورت میک اپ کیا تھا کہ بس دیکھنے والے حیران رہ جاتے اور اس سے زیادہ حیران ہونے والا غلام قادر تھا۔

''اڑے ماں قسم آپ تو شازیہ باجی کوئی امریکن فلٹی لگتا پڑا ہے رے۔ ارے بابا دلاور وری دیکھونی یہ میم صاحب کدھر سے آ گیا۔'' شازیہ غلام قادر کے شور مچانے پر ہنس پڑی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دلاور اس کے بیوی بچے سب شازیہ کے گرد جمع ہو گئے۔ دلاور کی بیوی نے دانتوں سے انگلی دبالی۔

''ہائے ہائے۔ یہ تجھے کیا سوجھی شازیہ۔''

''اڑی ماں قسم دیکھونی یار یہ کیا کیا۔''

''کچھ نہیں۔ آپ لوگ بلاوجہ پریشان نہ ہوں یہ چھوٹے بابا کے ایک کام کے سلسلے میں ہے۔''

''واپس آ کر ٹھیک ہو جاؤ گی نا شازیہ بہن۔'' غلام قادر نے کہا۔

''ہاں بھئی۔ بھلا یہ لباس اور یہ چہرہ مہرہ کوئی شریف زادیوں کا کام ہے۔ بس غلام قادر بھائی جانا ہے ایک جگہ مجبوری ہے۔''

''اڑے سمجھتا ہے ڑے میں تو ایسے ہی بولتا۔ دیکھونی! تم نے میرے کو حیران کر دیا ہے ایسے بھی چہرہ بدلا جاتا ہے میں نے کبھی دیکھا نہیں تھا۔''

"چلیے اب تو دیکھ لیا آپ نے اچھا میں چلتی ہوں۔" شازیہ نے اپنا بیگ کندھے سے لٹکاتے ہوئے کہا۔ خاصی بڑی رقم خرچ کی گئی تھی۔ ان اشیا کے حصول میں اور کرنل رحیم شاہ کی پوری پوری مدد ان میں حاصل ہے۔ ظاہر ہے جو کچھ ہو رہا تھا۔ وہ کسی معاوضے کے لیے نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ یہاں وہی جذبہ کار فرما تھا اور خدا کے فضل و کرم سے کرنل کو کسی معاوضے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ قیمتی چیزیں یہیں کے ڈیوٹی فری اسٹور سے حاصل کی گئی تھیں اور اچھا خاصا خرچ ہوگیا تھا لیکن شازیہ کے اپنے پروگرام کے لیے یہ اخراجات بہت ضروری تھے۔

بہر حال شازیہ اس پتے پر چل پڑی۔ جہاں رحمت علی ملازمت کرتا تھا۔ یہ مرزا جواد بیگ نامی شخص کا مسئلہ تھا، مرزا جواد بیگ کو قتل کیا گیا تھا اور شازیہ اس وقت اس قتل کی تفتیش کے لیے مرزا جواد بیگ کے گھر جا رہی تھی ایک ٹیکسی اس نے خود ہی روکی۔ اپنا کام خود کرنے کی عادی تھی۔ ذمے داریاں سونپ دی گئی تھیں اور اب ان ذمے داریوں کو پورا کرنا اس کا کام تھا۔ چنانچہ وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر مطلوبہ پتے پر پہنچ گئی۔ وہ اس وقت بہت ہی ماڈرن نظر آ رہی تھی لیکن اپنے میک اپ میں اس نے انفرادیت قائم رکھی تھی۔ یعنی مقامی چہرہ بھی ہو۔ لیکن اس طرح جیسے زندگی مغرب میں گزاری ہو۔

"آخر کار وہ مطلوبہ جگہ پہنچ گئی۔ معلومات تو حاصل ہو ہی چکی تھیں ایک خوب صورت سا مکان تھا۔ اس کے گیٹ پر پہنچ کر وہ ٹیکسی سے اتری۔ مکان کے سامنے یا آس پاس کوئی موجود نہیں تھا۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو بل ادا کیا اور اس کے بعد گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد ایک ملازم ٹائپ کے آدمی نے دروازہ کھولا تھا۔ نظر باز قسم کا معلوم ہوتا تھا شازیہ کو دیکھتا رہا۔ پھر شازیہ نے مسکرا کر اس سے کہا۔

"ہیلو۔"

"نہیں جی۔ ہم تو نوکر ہیں۔ ہم کیسے ہلیں، آپ اندر جا کر سب کو ہلا لیجیے ہم کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"اوہو۔ تھینک یو...... تھینک یو۔"

"پر بی بی جی بات تو سنیے۔" ملازم جلدی سے شازیہ کے سامنے آ گیا۔ شازیہ کے الفاظ پر اور انداز پر وہ غلط فہمی کا شکار ہوگیا تھا اور بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ چنانچہ شازیہ کے بالکل قریب کھڑے ہو کر اس نے کہا۔

"پر ملنا کس سے ہے آپ کو، کسے بلانے جا رہی ہیں۔"

"وہ مسز جواد بیگ۔"

"اوہ بی بی! کون سی مسز کی بات کر رہی ہو۔ مسز نمبر ایک یا مسز نمبر دو۔" شازیہ کا کام یہیں سے شروع ہوگیا تھا اس نے مسکراتے ہوئے ملازم سے کہا۔

"کیا نام ہے تمہارا۔"

"عیدو...... عیدو...... عید کے دن نماز کے بعد پیدا ہوئے تھے۔" ملازم نے کھیسیں نکال کر کہا۔

"تب تو تم بڑے برکت والے ہو۔"

"دوسروں کے لیے جی دوسروں کے لیے۔ اپنے لیے تو بس عیدو ہیں خالی۔ آپ زمرد بیگم سے

ملیں گی۔"

"سب سے پہلے تو مجھے تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی عیدو! ایسے دلچسپ لوگ کہاں ہوتے ہیں اس دنیا میں، میں تو حیران ہوں کہ تم جیسی پیاری پیاری باتیں کرنے والا ملازم کیسے ہوگیا۔" عیدو کے چہرے پر افسردگی کے آثار پھیل گئے۔ پھر بولا۔

"بس جی تقدیر کے کھیل ہوتے ہیں۔ تقدیر ایسی ہی تھی ہماری پر آپ نے دل بڑھا دیا ہے۔"

"[illegible] میں تم سے پھر ملوں گی۔ یہ بتاؤ کہاں مل سکتی ہوں۔"

"کسی پارک میں فلم دیکھو گی جی ہمارے ساتھ۔"

"فلم...... دیکھتی تو نہیں ہوں لیکن تم کہو گے تو دیکھ لوں گی۔"

"تو پھر نہر والے پل پر۔"

"نہر کے تو بہت سے پل ہیں۔ کون سے پل پر ملو گے۔"

"نہیں جی۔ وہ تو ہم نے ویسے ہی مذاق میں کہہ دیا تھا آپ خود ہمیں اپنا ایڈریس دے دو جی۔ ہم آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔"

"ایسا کرو عیدو۔ شام کو کسی وقت مل سکتے ہو۔ اچھا ایک بات بتاؤ، مستقل طور پر یہیں رہتے ہو۔"

"ہاں جی بالکل۔ چھوٹا سا کوارٹر ہے ہمارا۔"

"ہوں۔ میں تمہیں ایک پتا لکھ کر دیتی ہوں۔ شام کو چھ بجے اس پتے پر آ جانا دقت تو نہیں ہوگی۔"

"چھ بجے تو شو شروع بھی ہو جاتا ہے۔"

"نہیں۔ فلم کسی وقت پھر دیکھیں گے۔ بس تھوڑی دیر بیٹھیں گے باتیں کریں گے۔"

"اور گانا گائیں گے۔ گانا آتا ہے آپ کو۔"

"بہت اچھا آتا ہے۔ سارے پروگرام آہستہ آہستہ کریں گے۔ تم خود مجھے بہت اچھے لگے ہو۔ چلو مجھے بیگم صاحب سے ملا دو اس وقت، لیکن تم ایک عجیب بات کہہ رہے تھے وہ یہ کہ بیگم نمبر ون، بیگم نمبر ٹو۔"

"ہاں جی بالکل۔"

"یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ دونوں ساتھ رہتی ہیں۔"

"نہیں جی۔ بڑی بیگم کا بنگلہ الگ ہے اور وہ بھی ان کے ابا جان نے دیا ہے۔"

"ساری باتیں بعد میں ہوں گی عیدو! یہاں جو بیگم صاحب رہتی ہیں ان کا نام کیا ہے زمرد جہاں ہے نا۔"

"ہاں جی بالکل یہی نام ہے۔"

"مجھے انہی سے ملا دو۔"

"اچھا جی۔ آپ آ جاؤ ڈرائنگ روم میں بیٹھو۔ ارے ہاں آپ کا کیا نام ہے۔"

"شازیہ۔"

"واہ جی واہ۔ ہماری بڑی پھوپھی کی نند کا نام بھی شازیہ ہی تھا۔ بس جی غریبی میں مارے گئے۔ ملا اس سے محبت ہوگئی تھی۔ مگر کون غریب کی محبت کو قبول کرتا ہے۔ ایسے ہی دل بہلا لیتے ہیں جی۔ جانتے

ہیں اپنی اوقات۔" عیدو بکواس کرتا ہوا اسے اندر لے گیا۔ ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور اس کے بعد شاید زمرد جہاں کو اطلاع کرنے چلا گیا۔ پھر جو عورت اندر سے آئی خاصے بھاری بدن کی مالک تھی۔ چہرے پر بڑی سختی کے آثار تھے اور بہت تند مزاج معلوم ہوتی تھی۔ اس نے شازیہ کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر ناک چڑھا کر بولی۔

"کون ہیں بی بی آپ کہاں سے آئی ہیں۔"

"معافی چاہتی ہوں میڈم کینیڈا سے آئی ہوں آپ کو ثریا یاد ہے۔"

"ثریا۔"

"آپ زمرد جہاں ہیں نا۔"

"ہاں۔"

"کریم گنج میں رہتی تھیں۔"

"ہاں ہاں۔"

"آپ کے والد عبدالحلیم۔"

"ہاں بالکل۔"

"آپ کو ثریا یاد نہیں آ رہی۔ وہیں آپ کے پڑوس میں رہتی تھی آپ کی دوست۔"

"ثریا؟"

"جی...... وہ تو ہمیشہ مجھ سے یہ کہتی تھی کہ آپ اس کی بیسٹ فرینڈ ہیں۔"

"آپ آئی کہاں سے ہیں۔" زمرد جہاں نے کہا۔ شازیہ کی نگاہیں گہرائی سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ خطرناک عورت معلوم ہوتی تھی۔

"میں کینیڈا سے آئی ہوں۔ میں تو کوئی بیس سال سے وہاں ہوں۔ دو ڈھائی سال کی تھی میرے والد کینیڈا میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ ثریا تو اب کوئی پانچ چھ سال پہلے وہاں پہنچی ہے اور وہ بھی ہو کر مگر تعجب ہے جب بھی وہ آپ کے بارے میں بات کرتی تھی ایسا لگتا تھا جیسے آپ کی بہترین دوست لیکن آپ اس سے اس طرح اجنبیت کا اظہار کر رہی ہیں جیسے اسے جانتی ہی نہ ہوں۔"

"ہو سکتا ہے ہم دونوں کسی اور نام سے متعارف ہوں آپ کینیڈا سے آئی ہیں۔"

"ہاں دیکھیے اس نے آپ کے لیے تحائف بھیجے ہیں۔" شازیہ نے کہا اور اپنا ہینڈ بیگ کھولا پھر اس میں سے جو قیمتی تحائف نمودار ہوئے انہیں دیکھ کر زمرد جہاں کو سب کچھ یاد آ گیا۔ انتہائی قیمتی تھی۔ جو بہر حال کرنل رحیم شاہ نے اس کیس کے سلسلے میں شازیہ کی فرمائش پر حاصل کی تھی اور اس کا یورپ سے ہی تھا۔ وہیں کی کمپنیوں نے اسے بنایا تھا۔ زمرد جہاں اس جیولری کو دیکھ کر سرشار ہو گئی۔

"یہ ثریا نے میرے لیے بھیجی ہیں۔ ارے توبہ...... توبہ، توبہ بھئی تبھی تو میں کنفیوز ہو رہی تھی اسے ثریا نہیں، بینو کہا کرتے تھے بینو۔"

"ہائے کتنی خوب صورت بریسلیٹ ہے اور یہ نیکلس ارے توبہ یہ تکلیف کی اس نے۔ آپ کا نام کیا ہے بی بی؟"

"شازیہ......"

"آپ کینیڈین ہیں۔"

"نہیں مقامی ہوں بتایا نا بیس سال پہلے میرے فادر......"

"ہاں ہاں ہاں۔ بتایا تھا بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

"مگر مجھے کچھ اور پتا چلا ہے ثریا کو تو شاید آپ کے شوہر کی موت کے بارے میں پتا ہی نہیں ہے۔"

"بس کیا بتاؤں۔ میں عورت ذات جس نے جس کو بتا دیا اس کو پتا چل گیا۔"

"بیمار ہو گئے تھے۔"

"تو تمہیں یہ بات معلوم نہیں۔"

"نہیں میں نے آپ کو بولا نا۔ میں تو کینیڈا سے آئی ہوں۔"

"ہاں ٹھیک ہے پھر تو ٹھیک ہے۔ بیمار کیا ہوئے تھے بی بی بس...... شکار ہو گئے اپنی بے وقوفی کا۔"

"کیا مطلب؟"

"بس تمہیں کیا بتاؤں آرام سے بیٹھو۔ اچھا یہ بتاؤ کیا پیو گی چائے یا کوئی اور چیز۔"

"مہمان ہوں آپ کی آپ کا جو دل چاہے پلا دیں۔"

"یہاں کہاں ٹھہری ہو۔"

"میرے رشتے دار ہیں انہی کے پاس ٹھہری ہوں آئے ہوئے بھی ایک ہفتہ ہو گیا۔ ثریا نے کہا تھا کہ یہ تحائف آپ تک پہنچا دوں۔ آپ کی خیریت معلوم کروں۔ بس میں نے سوچا کہ ذرا آرام ہی سے جاؤں گی۔"

"ہاں بالکل۔ کھانا وغیرہ کھا کر جانا۔"

"ارے نہیں آپ کے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا ہے۔ اس وقت بالکل اس کی گنجائش نہیں ہے۔"

"ہاں۔ بس کیا بتاؤں۔ مرزا صاحب عجیب آدمی تھے کہتے تھے زندگی کے آخری سانس تک ہم دونوں ایک ساتھ رہیں گے۔ پر انہوں نے تو آخری سانس پوری کر لی اور مجھے اس جہنم میں اکیلا چھوڑ گئے۔"

زمرد جہاں بیگم کا انداز اب بالکل تبدیل ہو گیا تھا۔ چہرے کی خشونت غائب ہو گئی تھی۔ بار بار پاس رکھی ہوئی جیولری کو اٹھا کر دیکھنے لگتی تھیں۔ زیور عورت کی کتنی بڑی کمزوری ہے۔ اس وقت شازیہ کو اس کا تجربہ ہو رہا تھا۔ وہ غم زدہ بھی تھیں۔ لیکن جب بھی ان کی نگاہیں زیورات پر پڑتیں ان کی نگاہیں خوشی سے چمکنے لگتی تھیں۔ شازیہ نے کہا۔

"آپ یقین کریں مجھے تو بہت ہی دکھ ہوا تھا۔ آپ کے شوہر کی موت کا۔"

"بس بی بی ایسے ہی لکھی تھی تمہیں پتا ہے انہیں قتل کیا گیا۔"

''مجھے تو یہ ایک لمبی سازش معلوم ہوتی ہے۔اب کس سے کہوں کس سے نہ کہوں زبان کھولوں گی تو خود میری ہی گردن پھنسے گی۔''

''سازش۔''

''ہاں۔تمہیں تو خیر کیا ہی معلوم ہوگا۔ثریا نے پتا نہیں تمہیں بتایا ہو یا نہ بتایا ہو۔یہ ایک درد بھری کہانی ہے۔'' شازیہ کو ہنسی آنے لگی۔حالانکہ ثریا نامی کسی لڑکی کا وجود خود زمرد جہاں کی زندگی میں نہیں تھا۔لیکن زیورات دیکھ کر انہوں نے فوراً ثریا کے وجود کو تسلیم کرلیا تھا۔اب باقی باتیں کینیڈا جا کر دیکھی جائیں گی۔یہ زیورات ان کے قبضے میں آ گئے۔

وہ واپس جائے گی وہاں ثریا سے بات ہوگی اور غلطی کا احساس ہوگا تو پھر کون کیا کرتا ہے۔چنانچہ زمرد جہاں بیگم نے ثریا کو فوراً تسلیم کرلیا تھا۔شازیہ اپنا مطلب پورا کر رہی تھی اور جب وہ راستے سے بھٹکتیں شازیہ انہیں اپنے مطلب پر لے آتی۔

''آخر ایسا کون سنگ دل تھا جس نے آپ کو اس چھوٹی سی عمر میں بیوہ کردیا۔'' یہ چھوٹی سی عمر کا کوڑا بڑا ہی پراثر تھا۔زمرد جہاں کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔

''دنیا تو نہیں جانتی بے شک دوسری بیوی ہوں۔لیکن تم تو کینیڈا میں رہتی ہو۔تمہیں یہاں کے حالات کے بارے میں کیا معلوم۔ماں باپ نے دولت دیکھ کر شادی کردی۔یہ نہیں سوچا کہ میری اور مرزا صاحب کی عمر میں زمین آسمان کا فرق ہے اور پھر وہ پہلے سے شادی شدہ تھے۔کہتے تھے کہ اولاد کے لیے دوسری شادی کررہے ہیں۔مگر اب تم سے کیا چھپاؤں اور کیا بتاؤں۔سمجھ میں نہیں آتا۔ارے خود اولاد پیدا کرنے کے قابل تھے کہاں۔بس دوسروں کی زندگیاں برباد کرنے کا ہی شوق تھا۔مگر وہ شاہ جہاں بیگم بادشاہ زادی انہوں نے مجھے کبھی قبول ہی نہیں کیا۔بھئی میں خود تو نہیں بھاگ کر آئی تھی۔اپنے گھر سے۔میرے ماں باپ کو بے وقوف بنایا تھا مرزا جی نے اور وہ بے چارے چکر میں آ گئے کہ بیٹی راج کرے گی۔بی بی پتا نہیں تمہارا کینیڈا میں کیا ہوتا ہے۔لیکن یہاں کی بڑی بری حالت ہے۔اتنی برائیاں پھیلی ہوئی ہیں معاشرے میں کہ میں تمہیں کیا بتاؤں۔سنو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔ماں باپ یہ نہیں سوچتے کہ بیٹی کا مستقبل کیا ہوگا۔آرزوؤں، امیدوں کا کیا ہوگا۔بھلا تو یہ کرو کہاں مرزا جواد بیگ اور کہاں میں۔۔پر......''

''آپ کہہ رہی تھیں کہ یہ کوئی لمبی بات معلوم ہوتی ہے۔''

''ہاں نوکر تھا ایک بے چارہ رحمت علی نام تھا۔ویسے تو ٹھیک ٹھاک لڑکا تھا۔پر اللہ ہی جانے دماغ میں کیا سمائی۔تھوڑا سا سامان وغیرہ چوری کیا اور پتا نہیں مرزا صاحب کو اس کا پتا چل گیا تھا کیا ہوا تھا۔بس مار ڈالا اس نے مرزا جواد بیگ کو اور پکڑا گیا کمینہ کہیں کا۔''

''اوہو......تو یہ واقعہ ہوا تھا مگر آپ کے خیال میں دوسری بات کیا ہوسکتی ہے۔''

''دیکھو بی بی تم باہر سے آئی ہو میری دشمن نہیں دوست ہو۔میں تو زبان کھولے بغیر نہیں رہ سکتی۔سارا کیا دھرا شاہ جہاں بیگم کا ہے۔میں تو دعوے سے کہتی ہوں کہ اگر پولیس تفتیش کرے تو پتا چل جائے گا کہ رحمت علی کو کس نے یہاں ملازم رکھوایا تھا۔سوفی صدی شاہ جہاں بیگم نے رکھوایا تھا اور انہی کی ہدایت پر رحمت

علی نے مرزا صاحب کو قتل کیا۔

''ہوں۔شاہ جہاں بیگم تو واقعی بہت خطرناک ہیں۔یہ تو بڑی انوکھی بات بتائی ہے آپ نے۔''

''ارے بی بی بس وہی کہا جاتا ہے نا کہ بھولی بھالی صورت والے ہوتے ہیں جلاد بھی۔شاہ جہاں بیگم کی صورت دیکھو تو لگتا ہے جیسے درویش ہوں،اللہ والی ہوں۔ہر وقت روزہ نماز پر بی بی گن کی پکی ہیں۔بدلہ لے لیا شوہر سے دوسری شادی کا،مجھے بیوہ کردیا۔پہاڑ سی زندگی پڑی ہوئی ہے کیسے کٹے گی شوہر کے بغیر دنیا میں سب کچھ دولت ہی تو نہیں ہوتی۔مرزا مرحوم بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں۔پر بی بی۔اکیلا پن تو اکیلا پن ہی ہوتا ہے۔''

''اس میں کیا شک ہے۔'' شازیہ نے ہاں میں ہاں ملائی پھر بولی۔

''مگر یہ ملازم کیا......کیا آپ کے خیال میں شاہ جہاں بیگم نے اسے یہاں مرزا جواد بیگ کے قتل کے لیے بھیجا تھا۔''

''انگاروں پر لوٹتی تھیں وہ تو۔برداشت ہی نہیں کرتی تھیں کہ مرزا صاحب میرے پاس رہیں خود تو محروم تھیں ہی۔مجھے بھی محروم رکھنا چاہتی تھیں۔ارے ڈاکٹروں سے معلوم کرتی رہتی تھیں کہ کہیں میرے ہاں بال بچہ تو نہیں ہونے والا۔اگر کبھی طبیعت خراب ہوئی اور کسی ڈاکٹر کے پاس پہنچ گئی۔تو بس شاہ جہاں بیگم کے دل میں سنکھے لگ گئے۔کیا کہیں اور کیا نہ کہیں۔وہ جو کہتے ہیں نا کہ بلی کھاتی نہیں تو لڑکا دیتی ہے۔بس ایسا ہی ہوا ہے بی بی۔''

''بہت افسوس ہوا۔''

''بس جی افسوس کی کیا بات ہے کرنے والے تو اپنا کام کر گئے۔'' بہت دیر تک شازیہ زمرد جہاں کو ٹٹولتی رہی۔زمرد جہاں کا خیال تھا کہ شاہ جہاں بیگم نے ہی یہ کام کرایا ہے اور بہر حال ایک کردار تو سامنے آیا تھا اب باقی تفصیل بعد ہی میں پتا چل سکتی تھی۔چائے وغیرہ پینے کے بعد وہ وہاں سے اٹھ گئی۔

یہ وزٹ خاصا کامیاب رہا تھا خاص طور سے وہ بے وقوف ملازم جس کا نام عیدو تھا۔خاصا کار آمد معلوم ہوتا تھا۔شازیہ اس سلسلے میں اپنی رپورٹ مکمل کر کے ہی دینا چاہتی تھی۔

چنانچہ شام کو چھ بجے وہ اس جگہ پہنچ گئی جہاں عیدو کو آنا تھا اور پھر جب اس نے عیدو کو آٹو رکشا سے اترتے دیکھا تو اس کے حلق میں قہقہے مچلنے لگے۔عیدو نے جس رنگ کی شلوار قمیض پہنی تھی۔وہ رنگ شاید ہی دنیا کے کسی مرد نے پہنا ہو۔آتشی گلابی چمکتا ہوا رنگ آنکھوں میں کاجل منہ میں پان دبا ہوا اور لازمی بات تھی کہ ہونٹوں کو خاص طور سے پان سے سرخ کیا گیا ہے سر میں تیل چپڑا ہوا تھا۔بال بڑے اسٹائل سے بنے ہوئے تھے اور ماتھے پر چاند نکلا ہوا تھا۔شازیہ نے پہلے تو سوچا تھا کہ اسے کسی ریسٹوران میں بٹھا کر اپنے ساتھ چائے وغیرہ پلائے گی۔لیکن اس حلیے میں جس میں عیدو آیا تھا۔اسے ساتھ لے جا کر شازیہ تماشا نہیں بنانا چاہتی تھی۔وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔اس وقت وہ ٹیکسی میں نہیں بلکہ کار میں آئی تھی اور خود ڈرائیو کرتے ہوئے لائی تھی۔یہی سب سے بڑی بات تھی۔

''میں آ گیا؟'' عیدو نے کسی فلمی ہیرو کے انداز میں کہا۔

''ہیلو......آفت لگ رہے ہو عیدو۔''

"آفت ہے قیامت ہے۔" عیدو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آؤ......گاڑی کی طرف چلتے ہیں۔"

"چلیے جہاں دل چاہے چلیں۔"

"کہیں جائیں گے نہیں ایک دو جگہ رکیں گے بلکہ ایسا کرتے ہیں سمندر کے کنارے چلتے ہیں۔"

"میرا ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے۔" عیدو نے غالباً کوئی شعر پڑھنے کی کوشش کی لیکن ادھورا پڑھ کر خاموش ہو گیا تھا۔

"ڈوب جانا کوئی بات نہیں ہے۔" شازیہ نے کہا اور کار کا دروازہ کھول کر اس نحوست کو اپنے پاس بٹھا لیا اور پھر کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ عیدو نے غالباً کوئی تیز قسم کا عطر بھی لگایا تھا۔ جس کی بو سے شازیہ کو چکر آنے لگے تھے۔ لیکن بہرحال کام اسی کو کہتے ہیں۔ برداشت تو کرنا ہی پڑتا ہے۔

"اب یہ بتاؤ۔ کہاں چلیں۔"

"سمندر۔" عیدو نے جواب دیا۔ پھر ساحل سمندر تک پہنچتے پہنچتے شازیہ کی بری حالت ہو گئی تھی جو عطر عیدو نے لگایا تھا اسی کی طرح منحوس تھا۔ شازیہ بڑی مشکل سے برداشت کر رہی تھی البتہ جب وہ کھلی فضا میں پہنچے تو کچھ سکون ہوا۔

"ہاں بھئی عیدو صاحب! اب آپ بتائیے۔"

"مم...... میں، میں کیا بتاؤں۔ جو کچھ بتانا ہے آپ ہی کو بتانا ہے میں تو بس خادم ہوں جی آپ کا۔ آپ جیسا حکم کرو گی۔ قسم اللہ کی ایسا ہی کروں گا۔"

"ز......ز......زندگی بھر۔"

"ہاں جی اب تو بس عید بقر عید کا ساتھ ہو گیا۔"

"کیا؟"

"نہیں میرا مطلب ہے زندگی موت کا ساتھ ہو گیا۔"

"ہو گیا۔" شازیہ نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"تو اور کیا وہ جو کہتے ہیں نا کہ جو کچھ ہونا ہوتا ہے۔ پہلی ہی نظر میں ہو جاتا ہے۔"

"ہاں۔ تو بات تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو عیدو! میں بس کیا بتاؤں نہ جانے کیوں اچانک ہی تم سے دل لگ گیا ہے۔"

"ہمارا بھی یہی ہوا ہے جی۔" عیدو نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"اچھا۔ تمہارا بھی یہی ہو گیا ہے۔" شازیہ بولی۔

"ہاں جی۔ بس آپ یقین کرو جی۔ دن بھر خواب دیکھتے رہے ہیں۔"

"ارے۔ تو کیا میرے آنے کے بعد تم سو گئے تھے۔" شازیہ نے ہنسی روک کر کہا۔

"نہیں جی۔ ہم تو اپنے کام کر رہے تھے۔"

"تو پھر خواب کیسے دیکھے۔"

"اِس۔ وہ بس ہم دیکھ لیتے ہیں۔ ایسے بھی دیکھ لیتے ہیں۔" عیدو سے اور کوئی جواب نہیں بن پڑا تھا۔

"تم نے مجھ سے میرے بارے میں کچھ نہیں پوچھا عیدو۔"

"لو تو آئے کاہے کے لیے ہیں۔ اب بتا دو نا سب کچھ۔" عیدو نے ناز بھرے لہجے میں کہا۔

"دیکھو ایسا ہوتا ہے عیدو۔ تقدیر اسے کہتے ہیں آئی تھی زمرد جہاں کے پاس اپنے کام اور مل گئے تم۔"

"ہاں جی۔ بس یہی ہوتا ہے وہ جو کہتے ہیں نا۔ تم کیا ملے زمانہ مل گیا۔"

"اچھا یہ کون کہتا ہے؟" شازیہ نے حیرت سے منہ کھول کر کہا۔

"نہیں جی۔ وہ گانا ہے کچھ اسی طرح کا۔"

"عیدو۔ میں کینیڈا سے آئی تھی زمرد بیگم کی ایک دوست نے کچھ چیزیں بھیجی تھیں ان کے لیے وہ لے کر۔ مگر یہاں تو کچھ اور ہی معلوم ہوا۔ پتا چلا کہ بے چارے مرزا جواد بیگ کو کسی ملازم نے مار دیا۔"

"ارے چھوڑیں جی چھوڑیں۔ بس یہی تو بدنصیبی ہوتی ہے ہم ملازموں کی۔ مالک کے لیے سو بار جان دے دیں۔ لیکن کہلائیں گے وہی چور اچکے۔ کوئی ہماری عزت نہیں کرے گا جی...... اگر کہیں سے تھوڑی بہت عزت مل جاتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے عزت کرنے والا ہمارے ساتھ مذاق کر رہا ہو۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔"

"آپ کیا کہتی ہو اب مجھے دیکھو...... میں کسی کو جان سے مار سکتا ہوں۔ دیکھو جی۔ ایک بات کہیں آپ سے۔ دولت ہر شخص کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ہم بھی ماں باپ، بہن بھائی والے ہوتے ہیں۔ ہمیں بھی مالک سے وفاداری کرنا آتی ہے۔ پر ہر شخص ہمیں دیکھے گا ہمیشہ چور اچکے کی نظر سے کبھی اعتبار نہیں کیا جائے گا ہم پر۔ وہ جو بے چارہ رحمت علی تھا نا ایسا سیدھا لڑکا تھا کہ بس کیا بتائیں آپ کو۔ آپ قتل کی باتیں کرتی ہو۔ ہم کہتے ہیں۔ وہ بے چارہ کبھی نہیں مار سکتا تھا۔ معصوم سیدھا سادھا۔"

"اوہ...... واقعی تم سے زیادہ اور کون جانتا ہو گا عیدو اور پھر تم جیسے ذہین لوگ تو ہر بات کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے۔"

"نہیں جی۔ خیال ویال تو ہمارا کچھ بھی نہیں ہے۔ پر ایک بات بتاتے ہیں نہ تو وہ چور تھا نہ ڈاکو تھا اور نہ قاتل۔ اسے تو بس پھنسا دیا گیا۔ پھنس گیا بے چارہ۔"

"گویا تمہارا مطلب ہے۔"

"دیکھو جی بات اصل میں یہ ہے...... اچھا ایک بات بتاؤ۔"

"ہاں کہو۔"

"یہ چھوٹی بیگم صاحب سے آپ کا کیا تعلق ہے۔"

"کچھ بھی نہیں۔ بس ان کی ایک دوست کینیڈا میں رہتی ہے جو میری دوست ہے۔ میں یہاں آئی تو اس نے کچھ سامان بھیجا میرے ہاتھ۔"

"بس جی یہ چھوٹی بیگم صاحبہ جو ہیں نا۔ یہ ذرا دوسری قسم کی ہیں آزادی پسند اور ہم ایک بات بتائیں آپ کو۔ آپ نے جب یہ بات کہہ دی ہے۔ عیدو کا تجربہ معمولی نہیں ہے تو آپ خود سمجھ دار ہو۔ ہم بھی

آپ کو صحیح بتا رہے ہیں۔ یہ کیس دوسرا ہے۔''

''عیدو تم کمال کی شخصیت ہو۔ کیا کیس ہے بتاؤ؟''

''وہ جی بات اصل میں یہ ہے کہ ہمارے مالک یعنی مرزا جواد بیگ اور چھوٹی بیگم صاحبہ کی عمر میں کافی فرق ہے۔ بڑی بیگم سے تو ہمارے صاحب کے ہاں کوئی اولاد نہیں پیدا ہوئی۔ چھوٹی بیگم سے انہوں نے شادی اسی لیے کی تھی کہ اولاد پیدا ہو۔ پر جی اللہ کی مرضی میں کس کا دخل ہوسکتا ہے۔ یہاں بھی وہی ٹائیں ٹائیں فش رہا۔ مگر چھوٹی بیگم صاحبہ ذرا شوقین مزاج ہیں۔ ان کی دوستیاں، دوستیاں نہیں بلکہ دوستے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''ہاں جی۔ نوجوان لڑکے جو اکثر کوٹھی میں آجاتے ہیں اور پھر خوب ڈھول ڈھمکا ہوتا ہے۔ بڑی جی جواد صاحب کو یہ باتیں ناپسند تھیں اور اکثر دونوں کے درمیان لڑائی رہا کرتی تھی۔ ایک دفعہ ہم نے اپنے کانوں سے سنا تھا۔ چھوٹی بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں کہ جواد! تم ہوش میں رہا کرو ورنہ میں تمہیں قتل کردوں گی۔ زندہ نہیں چھوڑوں گی تمہیں اور...... انہوں نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا جی۔ چھوٹی منہ بڑی بات ہے۔ پر آپ دیکھ لینا بات وہی نکلے گی۔ رحمت علی بے چارہ تو قاتل ہو ہی نہیں سکتا۔ بس یوں سمجھ لو کہ بلا کسی نہ کسی کے سر تو پڑنی ہی تھی۔ سو اس بے چارے کے سر پڑ گئی۔''

''اوہو تمہارا مطلب ہے کہ زمرد جہاں بیگم نے مرزا جواد بیگ کو قتل کرایا۔''

''سولی صدی جی۔ جو بندے بیگم صاحبہ سے ملنے ان کے پاس آتے ہیں ان میں ایک سے ایک لفنگا ہے۔ ایسے سسرے کمر مٹکاتے ہیں کہ لڑکیاں بھی کیا ناچیں گی۔ بیگم صاحبہ ان کے ساتھ ہوتی ہیں۔''

''ویسے زمرد جہاں بیگم کی عمر بھی کچھ کم تو نہیں ہے۔''

''معاف کیجیے گا آپ تو باہر کی رہنے والی ہو۔ یہاں کی عورتیں عمر کے معاملے میں بڑی گڑبڑ کرتی ہیں۔ کبھی سچ بول کر جو دکھا دیں۔''

''خیر ایسا تو دنیا بھر میں ہوتا ہے۔''

''ہوتا ہوگا جی۔ ہماری معلومات اتنی نہیں ہے۔'' عیدو نے کہا۔

''اچھا اور وہ بڑی شاہ جہاں بیگم۔''

''بس جی وہ تو فرشتہ ہیں۔ گھر چھوڑ کر خود چلی گئی ہیں۔ مرزا صاحب نے ہی انہیں گھر دلا دیا تھا۔ وہاں اکیلے زندگی گزار رہی ہیں۔ ہم نے تو بہت کوشش کی تھی کہ ہمیں ان کے پاس بھیج دیا جائے۔ پر ہماری کوشش سے کچھ نہیں ہوا۔ سب کے ساتھ بڑا اچھا سلوک تھا ان کا۔ الگ گھر میں رہتی ہیں۔''

''کہاں رہتی ہیں وہ؟ تمہیں تو ان کا پتا معلوم ہوگا۔''

''ہاں جی کیوں نہیں۔'' اور عیدو نے شاہ جہاں بیگم کے گھر کا پتا بھی دیا۔ شازیہ کو عیدو سے جو کچھ معلوم کرنا تھا۔ وہ اس نے معلوم کرلیا پھر بولی۔

''تم یقین کرو تم بہت ہی اچھے دوست ثابت ہوئے میرے لیے۔ میں تم سے ملتی رہوں گی۔''

''لو جی۔ تو جا کہاں رہی ہو۔'' عیدو نے کہا۔

''بس اب چلتی ہوں۔ میرے والدین بھی میرا انتظار کررہے ہوں گے۔''

''پھر کب ملوگی۔''

''دو تین دن کے بعد خود تمہارے پاس آؤں گی۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' اور پھر شازیہ نے عیدو کو ایک ایسی جگہ چھوڑ دیا جہاں اسے واپسی کے لیے بس مل سکتی تھی اور اس کے بعد وہ سوچنے لگی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ کیا شاہ جہاں بیگم سے بھی آج ہی مل لیا جائے اور یہی اس نے مناسب سمجھا تھا۔ لیکن شاہ جہاں بیگم سے ملاقات کے لیے وہ کینیڈا والا بہانہ تو چل نہیں سکتا تھا۔

تھوڑی دیر تک سوچتے رہنے کے بعد اس نے آج ان سے ملنے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ اسی میک اپ اور اسی شکل میں شاہ جہاں بیگم سے نہیں ملنا چاہتی تھی بلکہ اس کے لیے کوئی اور ہی تدبیر مناسب ہوسکتی تھی۔

♥......♥......♥

رضوان علی شاہ کی کار پولیس اسٹیشن کے سامنے رکی تھی۔ نوجوان انسپکٹر ناصر علی سے اس کی اچھی خاصی شناسائی ہوگئی تھی۔ ویسے بھی پولیس اور وکیل کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن ناصر علی خود بھی بہت خوش مزاج نوجوان تھا۔ ہر ایک کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا اس کی فطرت کا حصہ تھا۔ بڑا ہی انسان دوست اور عام پولیس کے آدمیوں سے ذرا مختلف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ تشدد ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔ تشدد کرنا پولیس کی مجبوری ہے۔ ورنہ بڑے بڑے سخت جان مجرم ہوا کرتے ہیں جو پولیس کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ایسے لوگوں کی زبان کھلوانے کے لیے تھوڑی سی غیر انسانی حرکتیں بھی کرنا پڑتی ہیں۔ لیکن ہر ایک ساتھ ضروری نہیں ہے کہ غلط ہی رویہ رکھا جائے اور وہ اپنے اس اصول اور عمل سے خاصے فائدے بھی حاصل کرچکا تھا اور ان پولیس والوں میں تھا۔ جن کے دشمن کم اور دوست زیادہ ہوتے ہیں۔

رحمت علی کا کیس بھی اسی کے پاس تھا۔ چونکہ مرزا جواد بیگ جس علاقے میں رہتے تھے۔ وہ اسی کا علاقہ تھا۔ رضوان علی شاہ سے اس کیس کے سلسلے میں ناصر علی کی ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن ناصر علی کے رویے سے دونوں دوست بن گئے تھے۔ ناصر علی نے مسکراتے ہوئے رضوان شاہ صاحب کا استقبال کیا۔ اور بولا۔

آیئے وکیل صاحب! کیسے مزاج ہیں آپ کے بڑی خوشی ہوئی ہے جب کوئی بے لوث اور بے غرض کسی سے ملنے اس کے پاس آتا ہے۔''

''مگر میں بے لوث اور بے غرض تمہارے پاس نہیں آیا۔'' رضوان علی شاہ نے بھاری آواز میں کہا اور ایک کرسی سنبھال کر بیٹھ گیا۔

''خوش نصیبی ہے کہ آپ جیسے بڑے آدمی کو ہماری ضرورت بھی پیش آئی۔''

''یار ناصر علی! ایک بالکل ہی ذاتی سا معاملہ ہے یا پھر تم خالی ذاتی بھی نہیں کہہ سکتے۔ بس ایک معاملہ ہے جس میں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میری انا کو چیلنج کردیا گیا ہے اور دیکھو برا مت ماننا اس بات کا، یہ کام میں کہیں سے بھی لے سکتا ہوں۔ کیونکہ ظاہر ہے میری بھی شناسائیاں ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں تم میرے ذہن میں آئے اور میں نے سوچا کہ پہلے تم سے بات کرلیتا ہوں۔''

''تو اتنی الجھن کی کیا بات ہے۔ جب آپ یہ سوچ کر آئے ہیں شاہ صاحب تو پھر بھروسا کریں

مجھ پر۔ جس قابل بھی ہوں حاضر ہوں۔"

"یار ایک دو کوڑی کے آدمی نے میرے آفس میں وہ بدتمیزی کی ہے۔ کہ کیا بتاؤں تمہیں۔"

"کون ہے وہ دو کوڑی کا آدمی۔ ہم اسے دو کوڑی کا بھی نہیں چھوڑیں گے۔ ویسے شاہ جی کیا واقعی کسی زمانے میں کوڑیاں بھی چلتی تھیں۔ یہ تو سمندر سے نکلتی ہیں۔ اس میں یہ دو کوڑی اور چار کوڑی کا چکر کیا ہوا کرتا تھا۔"

"مذاق نہیں۔ مذاق نہیں۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں۔"

"میں بھی مذاق نہیں کر رہا ظاہر ہے۔ معلومات میں اضافے کے لیے کسی سے کچھ نہ کچھ پوچھا ہی جاتا ہے۔ آپ براہ کرم مجھے کوڑیوں کے بارے میں بتائیے۔"

"پتا نہیں کون نامعقول ہے اور کیا چاہتا ہے۔ لیکن اس احمق نے میرا دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔"

"کوئی احمق کسی کا دماغ خراب کر سکتا ہے۔ یہ بات آج ہی میرے علم میں آئی ہے۔ چلیے اب ذرا تفصیل بتا ڈالیے۔ کون ہے وہ احمق۔"

"میاں عجب گدھا ہے۔ وہ ایک کیس تھا تمہارے پاس جو ابھی چل رہا ہے۔"

"میرے پاس تو بہت سے کیس چل رہے ہیں آپ کون سے کیس کی بات کر رہے ہیں۔"

"یار! وہی رحمت علی نامی نوجوان۔ جس نے مرزا جواد بیگ کو قتل کر دیا تھا۔"

"ہاں ہاں۔ اپنے مالک کو۔"

"وہی وہی۔ یہ بات تو تمہیں معلوم ہے کہ رحمت علی کے ماں باپ نے یہ کیس مجھے دیا تھا ایک بستی کے رہنے والے ہیں۔ بھئی میرا ایک اصول ہے۔ اپنا فرض بے شک پوری طرح نبھاؤ۔ لیکن اپنے پیٹ سے بھی غداری نہ کرو۔ وہ معاوضہ جو میں وصول کرتا ہوں۔ وہ شخص نہیں دے پایا جس کا نام فیاض علی ہے۔ میں نے اس کیس سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ یہ کہہ دیا ہے اس سے کہ باقی فیس بھی لے آؤ۔ اس کے بعد میں اس مقدمے کی پیروی کروں گا۔ بتاؤ غلط تو نہیں کیا میں نے۔"

"ظاہر ہے آپ کا اپنا موقف ہے کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"ان حضرت نے اپنی طرف سے ایک بدمعاش حاصل کیا ہے۔ اور میرا خیال ہے اس بدمعاش سے انہوں نے یہ معاہدہ کیا ہے کہ اگر وہ ان کی دی ہوئی رقم مجھ سے واپس دلا دے۔ تو اس رقم میں سے کچھ [illegible] اسے بھی دے دیا جائے گا۔"

"ارے رحمت علی کا باپ فیاض علی تو اس قسم کا آدمی نہیں لگتا تھا۔"

"میاں چھوڑو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس قسم کے آدمی نہیں لگتے۔ زیادہ ہی غلط ہوا کرتے ہیں۔ وہ بدمعاش صاحب میرے آفس میں آئے تھے۔ بدمعاشی دکھائی، دھمکیاں دیں کہنے لگے کہ فیاض کی رقم واپس کر دی جائے۔ ورنہ نتیجے کا ذمہ دار میں خود ہوں گا۔ اب تم خود سوچو جس پیشے سے میرا تعلق ہے اس میں اگر اس قسم کی دھمکیاں ہم وکیلوں کو دی جائیں تو ہمارا کیا ہوگا۔"

"ہاں بات تو ٹھیک ہے۔ کون بدمعاش ہے کیا نام ہے اس کا۔"

"نام وام نہیں بتایا پتا بتایا گیا ہے۔"

"صحیح پتا بتایا ہے۔"

"اب یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔"

"کیا پتا بتایا ہے میں بندے بھیج دیتا ہوں۔"

"نہیں بندے بھیجنے کی بات نہیں۔ تمہیں خود میرے ساتھ وہاں چلنا ہوگا۔ ذلیل و خوار کر کے ائیں گے اسے۔"

"ہوں...... ٹھیک ہے اگر ایسی بات ہے تو یوں ہی سہی۔ اب میں آپ کو انکار تو نہیں کر سکتا۔"

"خوش رہو۔ بس اسی کام سے آیا ہوں اس وقت تمہارے پاس۔"

"بتائیے کب چلنا ہے۔"

"لو یہ کیا بات ہوئی۔ آج ہی چلنا ہے ابھی چلنا ہے۔"

"تو چلیے۔ لیکن پہلے کچھ کھا پی لیجیے۔ مہمان ہیں آپ میرے۔"

"خون جگر پی رہا ہوں۔ سب سے بڑی خاطر داری میری یہی ہوگی اس وقت کہ تم چلو اسے جوتے مارتے ہوئے یہاں تک لاؤ۔ اور اس کے بعد کم از کم تین دن کے لیے تھانے میں بند کر دو۔"

"آیئے چلتے ہیں۔" اور پھر تھوڑی دیر کے بعد پولیس کی ایک جیپ جس میں رضوان علی شاہ بھی بیٹھا ہوا تھا اس علاقے کی جانب چل پڑی جہاں صوفی کا قیام تھا۔

پولیس جیپ جس وقت صوفی کے محلے میں داخل ہوئی تو چاروں طرف سے گردنیں باہر نکل آئیں۔ منن خان کے ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی چونک پڑے۔ تاج نے شفیع اللہ سے کہا۔

"یار! لگتا ہے صوفی صاحب کو مجبور کرنے آئے ہیں۔ یہ لوگ کہ وہ دوبارہ انسپکٹری سنبھال لیں۔"

"بھلا انہیں کیا کمی ہے سرکاری حکام مارے مارے پھرتے ہیں ان کے پیچھے، کیا شان ہے صوفی کی، اللہ نے بہت بڑا درجہ دیا ہے اسے۔" پولیس جیپ صوفی کے دروازے پر رک گئی۔ انسپکٹر ناصر علی نے اپنے آدمی کو نیچے اتارا۔ دروازے پر دستک دی تو اندر سے آواز آئی۔

"آ جاؤ بھائی کون ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔" ناصر علی ایک دم چونکا تھا۔ یہ الفاظ اس کے لیے اجنبی نہیں تھے اس نے حیرانی سے رضوان علی شاہ کو دیکھا۔ تو رضوان علی نے کہا۔

"یہی ہے۔ یہی جملے کہتا ہے۔" ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ صوفی دروازے میں نظر آیا اور حیرانی سے بولا۔

"یہاں آنے والے کبھی دستک دے کر نہیں آتے۔ میں حیران ہوا کہ ایسا کون ہے جو میرے بلانے کے باوجود باہر کھڑا ہوا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"صوفی صاحب آپ۔" ناصر علی جو وردی میں تھا آگے بڑھ کر بولا۔

"ایں...... میاں جانتے ہو ہمیں۔"

"حضور والا۔ آپ کے قدموں میں رہ چکا ہوں دو سال تک اس وقت جب آپ گنجان اسٹریٹ

کے ایس ایچ۔ او تھے۔''

''نا...... ناصر علی، ارے پہچان گئے ہم واللہ تمہیں۔ موٹے ہوگئے ہو بری بات ہے۔ پولیس افسروں کو موٹا نہیں ہونا چاہیے۔ کہاں لگے ہوئے ہو آج کل اور یہ...... یہ ارے رضوان علی شاہ صاحب'' رضوان علی شاہ کا چہرہ اتر گیا تھا۔ ناصر علی کا صوفی کے ساتھ تپاک دیکھ کر ایک لمحے کے اندر اسے احساس ہو گیا تھا کہ ان تلوں سے تیل نہیں نکلے گا وہ برا سا منہ بنائے کھڑا ہوا تھا۔

''اندر آؤ...... اندر آؤ...... اندر آؤ...... بڑی خوشی ہوئی آپ بھی آجائیے شاہ جی۔'' صوفی نے کہا۔ ناصر علی تو فوراً اندر داخل ہوگیا تھا۔ رضوان علی شاہ برے برے منہ بنانے لگا۔ صوفی نے جلدی سے بڑھ کر چارپائی پیش کی۔ ناصر علی تو بیٹھ گیا لیکن رضوان علی شاہ کھڑا رہا۔ صوفی جلدی سے اس کے لیے کرسی لے آیا تھا۔

''آدمی کو اتنا بڑا وکیل بھی نہیں ہونا چاہیے کہ چارپائیاں بھول جائے۔ یہ تو ہماری اصل ہیں۔''

''غلط فہمی ہے آپ کو یہ آپ کی اصل ہوگی میری اصل نہیں ہے۔'' رضوان علی شاہ نے کہا۔

''آپ ہمارے مہمان ہیں جناب! براہ کرم تشریف رکھیے۔'' صوفی نے کہا، ناصر علی کو ایک دم یاد آگیا کہ وہ یہاں آیا کس چکر میں تھا۔ وہ صوفی سے بولا۔

''سنا تھا اس وقت بھی جب آپ ہمارے افسر اعلیٰ تھے کہ آپ بڑی سادہ سی زندگی گزارتے ہیں۔ لیکن یہاں ایسی جگہ آپ کا قیام ہوگا۔ یہ سوچا بھی نہیں تھا پولیس کی نوکری کیوں چھوڑ دی آپ نے؟''

''بھئی نوکری ہمارے لیے الگ سی چیز ہے۔ پکڑنا اور چھوڑنا اچھا لگتا ہے ہمیں۔ زندگی اسی انداز میں دلکش لگتی ہے کہ اسے رسی سے باندھ کر پھینک دیا جائے۔ ہوسکتا ہے ہمارے اور تمہارے نظریات میں فرق ہو۔ بس ہماری سوچ یہی ہے۔''

''صوفی صاحب! آپ یقین کریں آپ سے مل کر بڑی خوشی ہورہی ہے۔''

''ہورہی ہوگی۔ ہورہی ہوگی۔ خوشیوں کا کیا ہے معمولی سی بات پر مل جاتی ہیں۔ معمولی سی بات پر ختم ہوجاتی ہیں۔ رضوان علی شاہ صاحب آپ کیا فرماتے ہیں۔ درویشوں کے کرم سے۔''

''ناصر علی! ہم لوگ یہاں کسی کام سے آئے تھے۔ شاید۔'' رضوان علی شاہ نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ایں۔ وہ ہاں یاد آیا۔ اچھا او ہو۔'' ناصر علی بری طرح گڑبڑا گیا تھا۔

''کیا اچھا اور او ہو لگا رکھی ہے۔ یہ صاحب میرے دفتر پہنچے تھے۔ اور مجھے دھمکیاں دے کر آئے تھے۔''

''استغفراللہ...... استغفراللہ عزیزی! ہم نے دھمکیاں تو اپنی زندگی میں ان بڑے بڑے خطرناک مجرموں کو بھی نہیں دیں جو قابل دھمکی تھے درویشوں کی دعاؤں سے۔ آپ کو ضرور غلط فہمی ہوئی تھی۔ ہاں ہم نے یہ ضرور کہا تھا آپ سے کہ ان مظلوموں کی رقم واپس کردیں۔ بڑے غریب ہیں بدنصیبی کا شکار ہوئے ہیں۔ سر چھپانے کا ٹھکانا بھی چھن گیا ہے ان سے۔ جو چھوٹی موٹی رہنے کی جگہ تھی بیچ باچ کر آپ کو آپ کی فیسیں ادا کی اور آپ نے وہ کیس بھی چھوڑ دیا۔ ہم سے ملے تھے بے چارے۔ ایک بزرگ کے مزار پر

دعائیں مانگ رہے تھے۔ بات ہمارے علم میں آگئی۔ پوری تفصیل معلوم کی ہم نے ان سے تو پتا چلا کہ اکلوتا بیٹا عذاب میں گرفتار ہوگیا ہے اور ان کی آنکھوں میں چراغ بجھتے جارہے ہیں۔ بزرگ کامل کا حکم ہوا کہ مدد کرو ان مظلوموں کی۔ بعد میں جب ہمیں ساری تفصیلات معلوم ہوئیں تو پتا چلا کہ ان کے ساتھ تو جو کچھ ہوا ہے وہ ہوا ہی ہے۔ آپ نے بھی ان کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ رضوان علی شاہ صاحب آپ نے ان کا کیس لڑنے سے انکار کردیا ہے اور وہ بھی اس لیے کہ انہیں آپ کی پوری فیس ادا کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ ان کے پاس کچھ ہے ہی نہیں۔ گھر بار بیچ کر انہوں نے آپ کو پیسے دیے۔ اب تو سر چھپانے کا ٹھکانا بھی چھن چکا ہے۔ نہیں رضوان علی شاہ صاحب! کم از کم انسانیت کے رشتے سے بھی بہت کچھ کرنا پڑتا ہے آپ نے مظلوموں کو بے سہارا چھوڑ دیا تو وہ رقم آپ نے کس حساب میں ہڑپ کررکھی ہے ہم تو اس مقصد سے آپ کے پاس گئے تھے کہ آپ سے بات کریں گے ان کے لیے آپ سے مدد مانگیں گے۔ پر آپ نے ہم سے ڈھنگ سے بات تک نہیں کی شاہ صاحب آپ کو اپنا پتا بتا آئے تھے۔ اس بچے کو آپ شاید ہماری گرفتاری کے لیے لائے ہیں۔ دیکھیں قانونی طور پر بھی تو یہ گرفتاری ممکن نہیں ہے۔ بات بالکل صحیح ہے اب آپ نے اس قصے کو بہت آگے بڑھا دیا ہے۔ ناصر علی ان سے کہو ہم نے انہیں اڑتالیس گھنٹے دیے ہیں۔ اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر اگر انہوں نے ان کی رقم واپس نہ کی تو شاید ہمیں کوئی بڑا قدم اٹھانا پڑے۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں بس یہ سمجھ لیجیے اس وقت کہتے ہیں جب فیصلہ کرچکے ہوتے ہیں کہ یہ کرنا ہے۔''

''دیکھ رہے ہو تم دیکھ رہے ہو۔ کیا دی ہوئی فیس واپس کی جاتی ہے اور وہ بھی اس طرح دھمکی دے کر۔''

''میں آپ سے بات کرتا ہوں رضوان علی شاہ صاحب! دو منٹ۔''

''صوفی صاحب! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان کی رقم انہیں واپس مل جانی چاہیے۔''

''دیکھو عزیزی یہ رضوان علی شاہ صاحب جو ہیں یہ بے رحمی سے کام لے رہے ہیں۔ انہوں نے ان کے لیے کچھ بھی نہیں کیا ابھی تک، بلکہ ان کے بیٹے کا کیس چلتا ہے تو یہ عدالت تک میں نہیں ہوتے۔ وہ ولیوں اور درویشوں سے دعائیں مانگنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ ایک وقت کی روٹی تک نہیں ہے ان کے پاس اب ایسے حال میں انہیں ان کی رقم واپس تو کرنی چاہیے اور جانتے ہو ناصر علی ہم اس رقم سے کیا کریں گے ہم اس شخص سے ملیں گے جس نے ان کا گھر خریدا ہے ہم اسے کہیں گے کہ یہ گھر انہیں واپس کردے اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہم سے بن پڑے گا وہ کریں گے اور اب تو یہ بڑا ضروری ہوگیا ہے ہمیں معاف کرنا ناصر علی اگر آپ ان کی طرف سے آئے ہو تو ہم آپ سے بھی یہ بات کہہ رہے ہیں۔ انہیں سمجھا لو نہ سمجھیں تو ہمارے اور ان کے درمیان سے ہٹ جانا۔ باقی ہم خود سمجھائیں گے۔'' صوفی کا لہجہ انتہائی خوفناک ہوگیا۔ ناصر علی نے ایک جھرجھری سی لی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

''نہیں سر!'' آپ کہہ رہے ہیں تو رضوان علی شاہ صاحب کو یہ رقم واپس کرنا پڑے گی۔'' رضوان علی شاہ کرسی پر کھڑا ہوگیا تھا۔

''واپس لیں گے یہ رقم آپ مجھ سے۔''

"میں آپ سے باہر چل کر بات کروں گا رضوان علی شاہ صاحب! صوفی صاحب اجازت دیں گے۔"

"اوہ۔ کچھ چائے وغیرہ۔"

"چائے آپ پر ادھار رہی پھر کسی وقت یہاں آ کر پیوں گا بلکہ آپ ایسا کیجیے پولیس اسٹ آ جائیے۔ میں آپ سے رحمت علی کے بارے میں بھی تفصیلی گفتگو کروں گا۔"

"ارے ہاں۔ کیا رحمت علی کے کیس کی تفتیش آپ ہی نے کی تھی۔"

"ہاں ایف آئی آر میرے ہی تھانے میں درج ہوئی ہے۔"

"تب تو پھر میں پہلی فرصت میں تم سے ملاقات کر رہا ہوں۔ ان کو لے جاؤ۔ ہمارے گھر آ والے مہمان چائے پی کر جاتے ہیں اور مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ چائے نہیں پئیں گے۔ انہیں بس ایک با سمجھا دو۔ پیسے واپس کرنے ہیں اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر ورنہ اس کے بعد جو نقصان پہنچے گا۔ اس کی ذ داری میں قبول نہیں کروں گا۔"

"یس سر۔" ناصر علی نے کھڑے ہو کر سلیوٹ مارا۔ رضوان علی شاہ انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ نا علی نے کہا۔

"آئیے شاہ جی! آئیے براہ کرم۔" یہ کہہ کر ناصر علی رضوان علی شاہ کو لے کر باہر نکل آیا۔ صوفی انہیں دروازے تک چھوڑنے آیا تھا۔ پولیس والے باہر ہی کھڑے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد جیپ واپس چل پڑی۔ رضوان علی شاہ نے کہا۔

"ہاں۔ اب تم مجھے یقیناً نصیحت کرو گے کہ میں وہ رقم واپس کر دوں۔"

"دیکھیے رضوان علی شاہ صاحب! آپ ایک ایسے پیشے سے وابستہ ہیں۔ جس کی عزت و احترام میں خود بھی کرتا ہوں چونکہ میرا اور آپ کا ہزاروں بار تعلق قائم ہوگا۔ لیکن صوفی صاحب نے جو کچھ کہا ہے بڑی حقیقی بات ہے۔ ہمیں انسانی رشتوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے میری آپ سے درخواست ہے۔ یہ رقم آپ واپس کر دیں۔"

"اور اگر نہ کروں تو کیا ہوگا۔"

"یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن اتنا آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ جو کچھ ہوگا وہ ایسا ہوگا جو تمہارے تصور میں بھی نہیں ہوگا۔ صوفی صاحب بہت بڑے پولیس آفیسر رہ چکے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر وہ درویشانہ مزاج کے مالک نہ ہوتے تو شاید اس وقت انسپکٹر جنرل کے عہدے پر فائز ہوتے۔ اتنے ہی ذہین اور اتنے ہی صاحب اختیار ہیں وہ۔ میں آپ کو یہ بتا دوں رضوان علی شاہ صاحب کہ بات پولیس تک ہی محدود نہیں ہے۔ ملٹری انٹیلی جنس کے لیے صوفی صاحب نے اتنے زبردست کارنامے سرانجام دیے ہیں کہ اگر وہ کسی سلسلے میں ملٹری سے ہی مدد مانگ لیں۔ تو ان کی بات پر آنکھیں بند کر کے عمل کیا جائے گا۔ اب آگے آپ خود سمجھ دار ہیں۔" رضوان علی شاہ کے چہرے کے نقوش ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔

♥......♥......♥

"آخر کار شازیہ مرزا جواد بیگ کی دوسری بیوی بلکہ پہلی بیوی شاہ جہاں تک جا پہنچی ایک درمیانے درجے کی آبادی میں چھوٹا سا خوب صورت گھر تھا۔ بیل بجانے پر ایک ملازمہ قسم کی نوجوان لڑکی نے دروازہ کھولا۔ اور سوالیہ نگاہوں سے شازیہ کو دیکھنے لگی۔

"شاہ جہاں بیگم سے ملنا چاہتی ہوں۔" شازیہ نے کہا۔

"آیئے اندر آ جائیے۔ میں خبر کرتی ہوں۔" لڑکی صاف ستھرے لہجے میں بولی اور شازیہ کو اس نے ایک چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں جا بٹھایا اندر سے آواز آئی۔

"مہر کون ہے؟"

"ایک بیگم صاحبہ ہیں آپ سے ملنے آئی ہیں آنٹی۔" لڑکی نے کہا اور چند لمحوں کے بعد سفید سلک کے لباس میں ملبوس ایک خاتون اندر داخل ہوئیں۔ چہرے پر نرمی کے تاثرات لباس میں بے حد سادگی۔ بہت ہی نیک اور نفیس چہرہ نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے شازیہ کو دیکھا تھا شازیہ نے کہا۔

"آپ سے کچھ معلومات حاصل کرنے آئی ہوں بیگم صاحبہ! محکمہ پولیس سے تعلق ہے۔ پولیس کے خفیہ سیل سے تعلق رکھتی ہوں۔"

"بولو کیا چاہتی ہو مجھ سے۔"

"آپ کے شوہر کے قتل کے سلسلے میں کچھ باتیں رہ گئی ہیں ان کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش مند ہوں۔"

"سرکاری اہل کار ہو۔ حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ بری طرح پریشان ہو گئی ہوں۔ تم نوجوان ہو لڑکی یہ اندازہ تمہیں ابھی نہیں ہوگا کہ بیوگی کیا چیز ہوتی ہے۔ سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود شوہر کی چھت اگر حاصل نہ ہو تو ایک ایسا خوف دامن گیر رہتا ہے کہ اللہ کی پناہ، بتاؤ کیا تفتیش باقی رہ گئی ہے۔ قاتل پکڑا جا چکا ہے۔ اب اور کیا چاہتے ہیں قانون کے ہاتھ۔"

"بیگم صاحبہ! یقیناً پولیس نے آپ کے بیانات لکھے ہوں گے اور اندازے لگانے کی کوشش کی گئی ہوگی کہ اس کیس میں کہیں کوئی خامی تو نہیں ہے۔ آپ نے بے شک ان لوگوں کو ساری حقیقتیں بتا دی ہوں گی۔ لیکن تھوڑا بہت میں بھی جاننا چاہتی ہوں۔"

"جاننا چاہتی ہو۔ تمہاری مرضی ہے۔ جان لو۔ بولو کیا پوچھو گی۔"

"پہلا سوال، کیا آپ کے خیال میں وہ لڑکا رحمت مرزا جواد بیگ کا قاتل ہے۔" شاہ جہاں بیگم نے گردن جھکا لی اور دھیمے لہجے میں بولیں۔

"اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن اگر وہ مرزا صاحب کا قاتل ہے بھی تو اس کے پس منظر میں وہ الزام نہیں ہو سکتا جو اس پر لگایا گیا ہے۔"

"یعنی۔"

"یہ کہ اس نے ساز و سامان کے لیے یہ قتل کیا ہے۔ اس نے قتل اگر کیا بھی ہے تو اس کے لیے اسے اس ساز و سامان کی چوری میں ملوث نہیں کیا جا سکتا۔ ارے تم خود سوچو ایسا آدمی جو تھوڑا بہت سامان لے

کر بھاگنا چاہتا ہو وہ قاتل کیسے ہوسکتا ہے۔"

"تو پھر۔"

"دیکھو مجھے اصل بات بتانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے میں تو اپنا شبہ ظاہر کروں گی باقی کام پولیس کا ہوگا کہ وہ کیا کرتی ہے۔"

"ظاہری بات ہے۔ آپ پولیس مین تو نہیں ہیں جو اپنے شبے کے ثبوت بھی پیش کرتی پھریں گی۔"

"خدا تمہیں سلامت رکھے یہی تو میں کہنا چاہتی ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ ڈرتی رہی ہوں۔ کون کسی کا تحفظ کرسکتا ہے۔ پولیس بھی بس اپنے فرائض سرانجام دیتی ہے۔ واردات ہوجاتی ہے تو اس کی تفتیش شروع کردیتی ہے اگر اس پر اس خدشے کا اظہار کیا جائے کہ واردات ہونے والی ہے اور مخبر کو تحفظ کی ضرورت ہے تو تم یقین کرو آج تک تو ایسا ہوا نہیں ہے۔ کہ پولیس کے تحفظ سے کسی کی جان بچ گئی ہو۔ ہاں اگر پولیس کو اطلاع دینے والا مر جائے تو پولیس اخبارات کو یہ بیان ضرور دیتی ہے کہ بہت جلد قاتل کو گرفتار کرلیا جائے گا۔ اب تم مجھے خود بتاؤ۔ مقتول کو اس سے کیا فائدہ قاتل گرفتار ہو بھی گیا تو مقتول کو اس کی زندگی واپس نہیں مل سکتی۔ عجیب طریقہ کار ہیں۔ بلکہ میں تو سچ بات کہتی ہوں میری ناقص رائے تو یہ ہے کہ قانون میں بہت ہی کمزوریاں، بہت سی خامیاں ہیں۔ خیر مجھے معاف کرنا تمہارا تعلق چونکہ خود قانون سے ہے اس لیے تم میری باتوں کو پسند نہیں کروگی۔ میں کھل کر یہ بات کہتی ہوں کہ مرزا جواد بیگ کو راستے سے ہٹایا گیا ہے اور اس کے پس منظر میں ان کی دوسری بیگم ہیں۔ سمجھ رہی ہیں آپ ان کی دوسری بیگم۔"

"اوہ۔ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں بیگم صاحبہ! شازیہ نے پرتجسس لہجے میں کہا۔"

"بہت بڑی بات کہہ گئی ہوں اپنی زبان سے لیکن ایک بات بتاؤ۔ یہ کام تو تم لوگوں کا ہے کہ حقیقتوں کو معلوم کرو میں جو کچھ بھی کہوں گی اسے اس نگاہ سے دیکھا جائے گا کہ میں سوکن ہوں۔ یا وہ میری سوکن ہے لیکن میرے دل کے چھالے کس طرح پھوٹیں گے۔ یہ بتائے بغیر کہ میری سوتن نے بلی کا کام کیا ہے کہ کھایا اور لڑکا دیا۔ ارے کم بخت میرے شوہر کو میری زندگی کا ساتھی ہی رہنے دیتی جو حاصل کرنا تھا۔ حاصل کرلیتی مگر یہ بھی تو آسان نہیں تھا اس کے لیے۔ ذرا اس کا ماضی معلوم کرلو۔ معمولی سے گھرانے کی عورت ہے کوئی بیک گراؤنڈ نہیں ہے اس کا۔ اس طرح کی عورتوں میں سے ایک ہے جو مردوں کو رجھاتی ہیں اور اپنا مستقبل بنالیتی ہیں اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ ٹکے ٹکے کی زندگی گزارنے والی عورت کو اتنی دولت ملی تو یہ احساس ہوگیا کہ یہ دولت جا بھی سکتی ہے۔ اسے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ بات یہ تھی کہ مرزا جواد بیگ کو اولاد کی کوئی بہت زیادہ خواہش نہیں تھی۔ وہ تو سب بہانے ہوتے ہیں ان مردوں کے، اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں اصل بات تو یہ تھی کہ زمرد جہاں نے بے چارے مرزا جواد بیگ کو اپنے حسن و جمال کے جال میں گرفتار کرلیا تھا۔ انہوں نے دوسری شادی اس حیلے سے کی کہ میرے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اللہ تو بہت بڑا ہے۔ مرزا جواد کو اس نے اولاد سے پھر بھی محروم رکھا لیکن ان کا رابطہ مسلسل مجھ سے بھی تھا۔ زمرد جہاں کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ تقدیر میرے دن پھیر دے اور میں صاحب اولاد ہوجاؤں۔ بس یہ خوف اس کو کھائے جا رہا تھا وہ دوسرے مزاج کی عورت ہے وہ جو نچلے درجے کی عورتیں ہوتی ہیں نا۔ جنہیں ان کی

اوقات سے زیادہ مل جائے۔ تو سب سے پہلے وہ اپنی اوقات کو بھولنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ورنہ بی بی ذراسی معلومات حاصل کرلو۔ کس پائے کی عورت ہے وہ کیا کرتی ہے؟ اور کیا نہیں کرتی۔ اب محترمہ کلبوں میں بھی جاتی ہیں گھر میں بھی سنا ہے رقص و موسیقی کی محفلیں جمتی ہیں۔ نوجوان دوست آتے ہیں اور رات رات بھر ہنگامہ آرائی ہوتی ہے۔ مجھے بھی کچھ ملازموں سے پتا چلتا رہتا ہے۔ تو سیدھی سی بات یہ ہے کہ مرزا جواد بیگ کچھ بھی تھے لیکن مرحوم کا ایک خاندانی پس منظر بھی تھا عورت کے جال میں تو بڑے بڑے لوگ گرفتار ہوجاتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ لیکن پھر شاید یہ احساس ہوگیا کہ غلطی کر بیٹھے ہیں۔ اس پائے کی عورت کو بیوی نہیں بنایا جس پائے کی عورت ان کے لیے ضروری تھی کچھ کہا سنا ہوگا۔ یہ ظاہر کیا ہوگا کہ وہ اسے طلاق دے دیں گے۔ یا پھر ہوسکتا ہے کہ کسی وجہ سے زمرد جہاں کی ان رنگ رلیوں کی خبر انہیں ہوگئی تھی۔ اور زمرد جہاں نے اپنے اختیارات سے کام لے کر کام دکھا دیا ہو۔ دیکھو...... دل میں آگ بھڑک اٹھی ہے اس لیے زہر اگل رہی ہوں لیکن یہ سب بے مقصد نہیں ہے۔ اس کا کوئی پس منظر ہے اپنی تفتیش کرو۔ اور پتا چلا لو۔ دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہوجائے گا۔ میں تم سے کھلے الفاظ میں یہ بات کہہ رہی ہوں کہ مرزا جواد بیگ کو قتل کردیا گیا ہے اور اس کے پس منظر میں زمرد جہاں کا ہاتھ ہے۔"

"شازیہ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی وہ بہت خوش ہوگئی تھی ایک بار پھر اسے ایک کیس کو حل کرنے کا موقع ملا تھا۔ جب کہ سکینہ بستی کی خانم فردوسیہ کے مسئلے کو صحیح معنوں میں اسی نے حل کیا تھا اور اس کی اسے داد بھی ملی تھی ویسے اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا کہ شازیہ گرین فورس کی بہترین ممبر ثابت ہورہی تھی اور اس نے بہت کچھ کرکے دکھایا تھا۔ کام تو باقی لوگ بھی کررہے تھے۔ لیکن شازیہ بہت تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ بہت دیر تک وہ شاہ جہاں بیگم سے باتیں کرتی رہی۔ شوہر کا ذکر کرتے ہوئے شاہ جہاں بیگم زار و قطار رونے لگیں۔

"ساتھ تو ہوتا ہے نا، زندگی کا ایک عرصہ گزرتا ہے تب کہیں جا کر اتنی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے مگر پتا نہیں کیسے ہوتے ہیں یہ مرد لمحوں میں برسوں کی رفاقت کو بھلا دیتے ہیں۔ دہری زندگی گزارتے ہیں ہائے اتنے برے نہیں تھے مرزا جواد بیگ شروع شروع میں تو بہت اچھے رہے تھے میرے ساتھ۔ رہنا چاہتی تو میں جانتی تھی کہ میری حق تلفی نہ ہوگی۔ لیکن بی بی سوتن کے ساتھ گزارہ کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ میں اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پاسکی ارے اگر وہیں رہتی تو کم از کم اس حرافہ کی حرکتوں سے تو باخبر رہتی۔"

"بہت دیر تک شاہ جہاں بیگم آنسو بہاتی رہیں۔ شازیہ بہرحال اس حد تک معلومات کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی کہ چھوٹے بابا کو یہ بتا سکے کہ شاہ جہاں بیگم کا کیا موقف ہے۔ وہ واپسی کے اٹھ کھڑی ہوئی اور شاہ جہاں بیگم نے اسے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"دیکھو...... اور تو کچھ نہیں کہتی میں۔ اگر اپنی تفتیش کا آغاز کرو تو میرا نام کسی طرح نہیں آنا چاہیے۔ میرا تو کوئی سہارا نہیں ہے کہ میں اس سے سہارا لے سکوں۔" شازیہ انہیں مطمئن کرکے وہاں سے باہر نکل آئی۔

بہرحال وہ اپنی اس کارروائی کو بے مقصد قرار نہیں دے سکتی تھی۔ تھوڑی سی حقیقتوں کا ادراک ہوا

تھا۔ ابھی اس نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ اچانک ہی اس نے ایک موٹر بائیک کو شاہ جہاں بیگم کے گھر
کے دروازے پر رکتے ہوئے دیکھا۔ موٹر بائیک سے ایک لمبا تڑنگا آدمی نیچے اترا اور شازیہ اسے دیکھ کر اچھل
پڑی۔ اس نے ایک دروازے کی آڑ لے لی تھی۔ جو ایک گھر کا دروازہ تھا۔ موٹر بائیک سے اترنے والا گل
جان تھا اور گل جان ایک پیشہ ور قاتل کی حیثیت سے کئی بار پولیس کے قبضے میں آ چکا تھا۔ سب سے خاص
بات یہ تھی کہ وہ قتل بھی کرتا تھا اور اپنے پیچھے کوئی ثبوت نہیں چھوڑتا تھا۔ پولیس کو کئی بار اس پر شبہ ہوا تھا۔ لیکن
ثبوت نہ ہونے کی بنا پر پولیس گل جان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکی تھی۔ گل جان نے شاہ جہاں بیگم کے دروازے
پر دستک دی اور اس ملازم لڑکی نے دروازہ کھول دیا۔ گل جان اطمینان سے اندر چلا گیا۔ یہ اس قدر حیرت
انگیز بات تھی کہ شازیہ بہت دیر تک وہاں کھڑی حیرت میں ڈوبی رہی۔ پھر جب اسے احساس ہوا تو اس نے
جلدی سے واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔ گل جان جیسا بدکردار اور بری شخصیت کا مالک یہاں کیسے آیا تھا۔
یہ بات قابل غور تھی۔ پھر اچانک ہی شازیہ نے گل جان کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ اس طرح لپک کر باہر آیا
تھا جیسے کسی کی تاک میں ہو اور پھر وہ ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ لیکن شازیہ آڑ میں تھی۔ خوش قسمتی سے اس
وقت اس آڑ میں کھڑی رہی لیکن اس کی ذہانت اس پر عقل کے دروازے کھول رہی تھی۔ گل جان شاہ جہاں
بیگم کے پاس کیوں آیا تھا اور اس طرح باہر نکل کر اسے تلاش کر رہا تھا۔ اسے یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی
تھی۔ گل جان تھوڑی دیر تک ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر اندر واپس چلا گیا۔

اب شازیہ نے برق رفتاری سے یہاں سے بھاگ جانا مناسب سمجھا تھا۔

♥......♥......♥

''صوفی پولیس اسٹیشن میں داخل ہو گیا وہ ناصر علی کو فون کر کے بتا چکا تھا کہ وہ آ رہا ہے ناصر علی اس
کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے بھی اس کی بے حد عزت کرتا تھا۔ صوفی اندر داخل ہوا تو
ناصر علی نے کھڑے ہو کر اسے سلیوٹ کیا اور صوفی ہنستا ہوا آگے بڑھا۔

''اماں کیوں ذلیل کر رہے ہو ناصر علی۔ اب یہ سلیوٹ کسے کیا جا رہا ہے۔ ہماری وردی تو پھر ہو گئی۔''

''آپ کس سے بات کر رہے ہیں صوفی صاحب۔'' میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ ایک ہلکا سا اشارہ
محکمہ پولیس میں واپس آنے کا کریں تو ہمارے نئے آئی جی صاحب! خود بازو پر وردی ڈالے آپ کا انتظار
کریں گے۔ یہ بات مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہے کہ محکمہ پولیس نے آپ کو نہیں چھوڑا بلکہ آپ نے محکمہ
پولیس کو چھوڑ دیا ہے۔''

''بس کرم ہے درویشوں کا بات اصل میں وہی ہے ناصر علی، وہ جو کہتے ہیں نا کہ ہمارے تو نہ
آگے ناتھ نہ پیچھے پگا مالک کریم جہاں اور جس عالم میں زندگی گزروا دے بات زندگی گزارنے کی ہے۔''

''آپ بیٹھیے صوفی صاحب! یہ بتائیے کہ کیا پئیں گے۔''

''پان تھوک رکھا ہے۔ منہ صاف کیے رکھا ہے کیونکہ جانتے تھے کہ تم کچھ کھلائے پلائے بغیر باز
نہیں آؤ گے۔ بس کچھ بھی منگواؤ۔ ٹھنڈی چیز ہو تو بہتر ہے۔'' ناصر علی نے فوراً ہی اردلی کو بلایا اور کچھ مشروب
لانے کے لیے کہا۔ صوفی نے بڑے اطمینان سے پانوں کی ڈبیا اور بٹوہ نکال کر میز پر رکھ لیا تھا۔

''سنایئے صوفی صاحب۔ کیا ہو رہا ہے آج کل۔''

''بس میاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے ٹھیک ہی ہے۔ ہماری تو صورت حال یہی ہے نا کہ آگے نات نہ
پیچھے پگا دو وقت کی روٹی مل جائے تو زندگی گزر جاتی ہے۔ بس یہی ایک طلب ہے۔ دو وقت کی روٹی، ڈھکا
بدن اور درویشوں کی قربت سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ کرم فرما ملتے رہتے ہیں۔ بڑی اعلیٰ حیثیتوں کے حامل
ہوتے ہیں۔ سر پر ہاتھ رکھ دیں تو سمجھ لو تو وہی ہما کے سائے والی بات ہو جاتی ہے۔ درویشوں کی دعاؤں
ے۔'' صوفی نے کہا اور ہنسنے لگا۔ ناصر علی نے کہا۔

''صوفی صاحب! آپ کے پرستاروں میں سے ہوں ان میں سے جو بے لوث آپ کی عزت
کرتے ہیں اور واقعی آپ اس عزت کے مستحق بھی ہیں۔ بہر حال رضوان علی شاہ کا کیا معاملہ ہے۔ ذرا سی
تفصیل اگر میرے علم میں آ جائے تو اچھی بات ہے۔ ویسے میں نے رضوان علی شاہ کو سمجھا تو دیا ہے کہ جو کچھ
صوفی صاحب کہہ رہے ہیں وہ کر دیں۔ میرا خیال ہے بات سمجھ میں آ بھی رہی ہے ان کی۔ چنانچہ دیکھیے کب
رابطہ قائم کرتے ہیں۔''

''ہاں۔ یہ ضروری ہے بہت ضروری اڑتالیس گھنٹے دیے ہیں ہم نے انہیں درویشوں کی دعاؤں
ے، اس کے بعد ان کو نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا۔ کبھی کبھی ایسا بھی کرنا پڑتا ہے۔''

''میں مناسب وقت کا انتظار کر رہا ہوں دیکھو کیا کرتے ہیں وہ۔ ایک زحمت کریں آپ اگر
مناسب سمجھیں تو۔''

''ہاں بولو۔''

''کسی شخص کو عقل آنے میں کبھی کبھی دیر بھی لگ جاتی ہے۔ رضوان علی شاہ کو کرنا وہی پڑے گا جو
آپ نے کہا ہے صوفی صاحب لیکن اگر آپ تھوڑا سا وقت مجھے بھی دے دیں تو میں ذاتی طور پر آپ کا شکر
گزار رہوں گا۔''

''وہ کس سلسلے میں عزیزی۔'' صوفی نے سوال کیا۔

''رضوان علی شاہ کو سمجھاؤں گا ویسے رقم کتنی ہوگی۔''

''ستر اسی ہزار روپے ہیں بات ستر اسی ہزار کی نہیں ہے۔ اصل میں جس کی وہ رقم ہے اس نے
پوری زندگی ستر اسی سو تک نہیں دیکھے ہیں اپنی دیوانگی اور محبت میں ادھر کی رقم ادھر منتقل کر دی ہے۔''

''کچھ اور تفصیل سمجھائیں گے۔''

''ہاں سمجھانا ضروری ہے اصل میں ناصر علی وہ لڑکا جس کا نام رحمت علی ہے اور جسے قتل کے الزام
میں گرفتار کیا گیا ہے۔ میرے خیال میں بے گناہ ہے میں اس وقت ایک بہت ہی پہنچے ہوئے بزرگ کے مزار
پر حاضری میں تھا کہ میں نے دو ستم رسیدہ افراد کی دل دوز فریاد سنی۔ وہ بھوکے پیاسے مزار پر منت مانگنے آئے
تھے۔ یہ رحمت علی کے والدین تھے۔ رحمت علی کی پوری تفصیل مجھے معلوم ہو چکی ہے۔ بستی گنج امانت کا رہنے
والا ہے نوکری کی تلاش میں یہاں آیا تھا اور اسے نوکری مل گئی۔ بوڑھے ماں باپ کا واحد سہارا تھا۔ ساری
تفتیش میں نے مکمل کر لی ہے اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ اس معاملے میں تمہاری تفتیشی رپورٹ کیا ہے ہاں وہ رقم

والا معاملہ رہ گیا درمیان میں، بے چارہ غریب باپ بیٹے کی زندگی بچانے کے لیے شہر آ گیا اور نہ جانے کس طرح رضوان علی شاہ سے ٹکرا گیا۔ انہوں نے اسے اپنی فیس بتائی اور وہ بھاگ دوڑ میں لگ گیا۔ چھوٹی سی جھونپڑی تھی اس کی بستی شیخ امانت میں وہ بیچ دی اس نے دکان و مکان سب بیچ دی، جو وہ وہاں کرتا تھا اور یہ ستر اسی ہزار روپے کی رقم لے کر رضوان علی شاہ کے پاس پہنچ گیا اور رضوان علی شاہ نے شاید اس سے بھی بڑی رقم کا مطالبہ کیا تھا رحمت علی کا کیس لڑنے کے لیے۔ وہ رقم اس نے فوراً اپنے قبضے میں کر لی۔ مگر اس کے بعد جو گھناؤنا قدم اس نے اٹھایا وہ یہ تھا کہ انہوں نے فیاض علی سے کہا کہ باقی رقم کا ابھی بندوبست کرے۔ اور اگر اس نے باقی رقم کا بندوبست نہیں کیا تو وہ اس کا کیس نہیں لڑیں گے اور اس نے ایسا ہی کر دکھایا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ جھونپڑی بھی اسے واپس خرید کر دینی ہے۔ جس شخص کے ہاتھ وہ جھونپڑی بیچی گئی ہے اسے وہ جھونپڑی واپس کرنا ہوگی اور اس رقم سے وہ جھونپڑی دوبارہ واپس ملے گی۔ دیکھو اس رقم کا بندوبست کوئی بھی مخیر آدمی کر سکتا ہے۔ تم یقین کرو میرے لیے مشکل نہیں ہے۔ لیکن رضوان علی شاہ کا طریقہ کار غلط ہے۔"

"بالکل غلط ہے۔" ناصر علی نے پر جوش لہجے میں کہا وہ خود بھی ایک جوشیلا نوجوان تھا اور یہ ساری باتیں سن کر جوش میں آ گیا تھا۔ اردلی نے مشروبات لا کر رکھ دیے تو ناصر علی نے کہا۔

"لیجیے صوفی صاحب۔"

"ازحد شکریہ۔ اب ناصر علی ہمیں اس کیس کے بارے میں بتاؤ۔"

"جی مرزا جواد بیگ اچھے خاصے دولت مند آدمی ہیں۔ دو شادیاں کی ہیں بڑی بیگم الگ رہتی ہیں۔ رحمت علی پر یہ الزام ہے کہ اس نے گھر کا سامان چوری کیا اور اسے لا کر اپنے کوارٹر میں چھپا دیا۔ اس سلسلے میں اس نے اپنے مالک کو قتل کر دیا اور یہاں سے نکلنے کی فکر میں لگ گیا۔ لیکن وقت سے پہلے پکڑا گیا۔"

"رحمت علی نے اس سلسلے میں کیا کہا ہے۔ اعتراف جرم کرتا ہے وہ۔"

"نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اسے کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ وہ سامان اس کے گدے کے نیچے کہاں سے آیا۔"

"ہوں ثبوت اور ملے۔"

"نہیں اس سے بڑا ثبوت اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ آلہ قتل بھی وہیں موجود تھا۔ اور خون آلود بھی تھا پھر وہ سازوسامان جو وہاں چوری کیا گیا تھا۔" صوفی نے سامنے رکھا ہوا مشروب کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا پھر بولا۔

"پان کھا سکتا ہوں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ صوفی صاحب۔ آپ کا خادم آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ اصولی طور پر مجھے اس کرسی پر آپ کے سامنے بیٹھنا بھی نہیں چاہیے براہ کرم آپ پان کھائیے۔ میں پیک تھوکنے کے لیے باسکٹ منگوا کے دیتا ہوں۔ یہاں اگال دان کا انتظام تو نہیں ہے۔ ہاں اگر آپ ملاقات کرتے رہنے کا وعدہ کریں تو اگال دان بھی منگوایا جا سکتا ہے۔"

"شکریہ شکریہ۔" پان کی گلوری منہ میں رکھ کر چھالی تمباکو اور اس کے بعد قوام کھایا گیا اور صوفی اس طرح اونگھنے لگا جیسے بیٹھے بیٹھے سو گیا ہو۔ اگر بھینس کی طرح جگالی نہ کر رہا ہوتا تو یہی سمجھا جا سکتا تھا کہ سو گیا

ہے۔ کوئی دس منٹ تک وہ اسی طرح بیٹھا رہا اور ناصر علی بیٹھا احمقوں کی طرح اسے دیکھتا رہا۔ پھر صوفی نے بھاڑ سا منہ کھولا اور اس کے منہ سے سرخ پرنالہ بہنے لگا۔ باسکٹ میں یہ ملغوبہ اگلنے کے بعد اس نے کہا۔

"سامان کی نوعیت بتاؤ گے۔"

"ہاں۔ کچھ قیمتی برتن جو بہرحال اچھی خاصی مالیت کے تھے اور کچھ ڈیکوریشن پیس تھوڑی سی رقم جو مرزا جواد بیگ کے کوٹ کی جیب میں رکھی ہوئی تھی۔ بس یہی چیزیں تھیں۔"

"آلہ قتل کیا تھا۔"

"ایک چھرا جو خون میں ڈوبا ہوا تھا۔"

"ہاتھوں کے نشانات آلہ قتل سے ملے۔"

"نہیں غالباً اس کے دستے کو رومال سے پکڑا گیا تھا۔"

"رومال ملا۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"نہیں بالکل نہیں۔"

"گویا آلہ قتل کو رومال سے پکڑا گیا رومال پھینک دیا گیا اور آلہ قتل محفوظ کر لیا گیا۔ اس کے علاوہ چوری شدہ اشیاء کچھ ڈیکوریشن برتن اور تھوڑے سے روپے تھے کیا ڈیکوریشن پیس اور برتن مرزا جواد بیگ کے کمرے میں ہوا کرتے تھے اور کیا مرزا جواد بیگ اور ان کی چھوٹی بیگم الگ سویا کرتے تھے۔"

"نہیں دونوں کا بیڈروم مشترک تھا جیسا کہ ہوتا ہے۔"

"برتن اور ڈیکوریشن پیس حاصل کرنے کے بعد ملزم رحمت علی کیا ان تمام چیزوں کو لے جانے کی اجازت لینے گیا تھا ان کے بیڈروم میں۔"

"وہ کسی اور چیز کی تلاش میں ہوگا جیسے کوٹ میں رکھی ہوئی رقم۔"

"ہوں۔ دیکھو کوئی چور اگر چوری کرنے کا منصوبہ بناتا ہے۔ تو پہلے وہ اپنے بچاؤ کا انتظام ضروری سمجھتا ہے۔ یعنی اس جگہ سے بھاگ جان جہاں اس نے چوری کی ہے۔ یہ کیسا مطمئن چور تھا درویشوں کی دعاؤں سے۔ جو چوری کرنے کے بعد آرام سے اپنے کوارٹر میں جا کر سو گیا کہ جو کچھ ہوگا صبح کو دیکھا جائے گا رات کا کام ختم۔"

"صوفی صاحب اس سلسلے میں یہ دلیل پیش کی جاری ہے کہ رات میں وہ باہر نکل نہیں سکتا تھا۔"

"ایک دیہاتی آدمی جس کے بارے میں یہ پتا چل چکا ہے کہ اس نے اپنی ساری زندگی اس چھوٹی سی بستی شیخ امانت میں گزاری۔ وہ اتنا ذہین اور سفاک قاتل نہیں ہو سکتا۔ جو شخص آلہ قتل کے دستے کو رومال سے پکڑتا ہے اور قتل کرنے کے بعد اس آلہ قتل کو اپنے کمرے میں چھپا لیتا ہے اس طرح چوری شدہ مال واسباب کو وہ باہر نکالنے کے لیے بھی کوششیں کر سکتا ہے اور ان کوششوں میں کامیاب بھی ہو سکتا ہے۔ یار! ذرا غور کرو ناصر علی! ایسا مطمئن اور دو رنگا چور ہم نے تو پہلے کبھی نہیں دیکھا درویشوں کے فضل سے تم کیا کہتے ہو اس بارے میں۔"

"نہیں۔ کیس میں گڑبڑ تو ہے۔ لیکن صوفی صاحب وہی والی بات ہو جاتی ہے کہ ہم اصل کہاں

سے تلاش کریں۔ بس ثبوت، کچھ چوری شدہ اشیاء سامنے آئیں اور بات ختم ہوگئی۔ یہی تو اختلاف رہا ہے مجھے اپنے محکمے سے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ جرم کو ختم کیا جائے۔ لیکن ہر چیز کی چھان بین کے بعد یہ نہیں کہ کچھ مخصوص مجرم سوچی سمجھی پلاننگ سے جرم کریں اور پولیس کو غلط راستے پر ڈالنے کے لیے سارے انتظامات کرلیں اور پولیس بڑے پیار سے ان غلط راستوں پر چل پڑے۔''

''ایک بار پھر میں رحمت علی کے سلسلہ میں بات کرتا ہوں ایک دیہاتی نوجوان نوکری کرنے کے لیے آیا ہے۔ چوری کرتا ہے مالک کو قتل کر دیتا ہے اور آرام سے اپنے کوارٹر میں آکر سو جاتا ہے۔ میرے عزیز دوست! ایسا کسی طور ممکن نہیں ہوسکتا۔ پہلا جرم کرنے کے بعد تو انسان آدھا مر جاتا ہے درویشوں کی دعاؤں سے بھلا اسے نیند کیسے آئے گی۔ جب کہ رحمت علی کو نیند کے عالم میں ہی گرفتار کیا گیا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا تم۔ خیر ہم ثبوتوں کی بات کرتے ہیں ثبوت بھی مہیا ہو ہی جائیں گے۔ میں اس سلسلے میں ہر ممکن کوشش کروں گا تم سے مجھے یہی معلومات حاصل کرنی تھیں۔''

صوفی تھوڑی دیر تک ناصر علی کے پاس بیٹھا رہا اس کی فرمائش پر ناصر علی نے اس کیس کے فائل کی فوٹو اسٹیٹ کرانے کے لیے بھجوادی تھی۔ پھر ایک نئی فائل بنا کر اس نے صوفی کے حوالے کی اور صوفی شکریہ ادا کرنے کے بعد وہاں سے اٹھ گیا۔

♥......♥......♥

شازیہ بری طرح چکرائی ہوئی تھی۔ دلاور کے پاس بیٹھی ہوئی وہ صوفی کا انتظار کر رہی تھی۔ میک اپ تبدیل کرلیا تھا اور اب اپنی اصل شکل میں تھی۔ پھر صوفی بھی وہاں پہنچ گیا۔ کرنل رحیم شاہ سردار پور میں ہی تھا۔ کیونکہ کوئی اہم ضرورت آج کل نہیں تھی۔ جہاں تک مسئلہ رحمت علی کا تھا۔ تو کرنل نے پیشکش کر دی تھی کہ اخراجات چاہے کتنے ہی ہو جائیں رحمت علی کو نکال کر لانا ہے۔ ادھر فیاض علی اور اس کی بیوی بھی آرام سے رہ رہے تھے۔ دونوں دن اور رات میں چند ہی گھنٹے سوتے تھے اور بس عبادت کرتے رہتے تھے۔ اپنے لیے سکون مانگتے تھے اور بیٹے کے لیے زندگی اور اس سلسلے میں خدا کے نیک بندے مصروف عمل تھے۔ صوفی مطمئن انداز میں گرین ہاؤس میں داخل ہوا تھا۔ دلاور، غلام قادر اور شازیہ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

عادل اور فیضان سردار پور میں ہی تھے زیادہ تر یہ لوگ وہیں رہا کرتے تھے۔ ہاں جب کام ضرورت ہوتی تھی تو صوفی انہیں طلب کرلیتا تھا۔ بہرحال یہ گرین فوس کے سب سے ناکارہ نمائندے تھے صوفی نے شازیہ کو دیکھا اور بولا۔

''ہاں۔ تم نے کیا کیا شازیہ۔''

''چھوٹے بابا! میں نے خاصی معلومات حاصل کرلی ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی ہنسنے لگا پھر بولا۔

''درویشوں کے نام کو مذاق کے طور پر مت استعمال کیا کرو۔ سمجھتی نہیں ہو تم وقت تمہیں خود بتا دے گا۔ تم کیا جانو کہ ان کا فیض کیا ہوتا ہے۔''

''نہیں چھوٹے بابا! میں نے مذاق نہیں اڑایا اگر آپ نے یہ محسوس کیا ہے تو معافی چاہتی ہوں۔''

''ہاں تو تم کیا کر کے آئی ہو۔''

''پہلے تو چھوٹے بابا میں نے زمرد جہاں سے ملاقات کی یہ زمرد جہاں مرزا جواد بیگ کی دوسری بیوی ہے۔ دونوں کی عمروں میں بہت فرق ہے۔ مرزا جواد بیگ کا اس شادی کے سلسلے میں موقف یہ تھا کہ پہلی بیوی شاہ جہاں سے ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ شاہ جہاں بیگم ایک انتہائی شریف، نیک اور نفیس خاتون ہیں۔ بہرحال میں زمرد جہاں سے ملی شوہر کے بارے میں بات ہوئی۔ شوہر کی موت کا اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہے۔ وہ ایک عیش پرست عورت ہے اور مرزا جواد بیگ اس کے لیے بہت کچھ چھوڑ گیا ہے۔ وہ زندگی کو عیش و عشرت کے عالم میں گزارنا پسند کرتی ہے۔ وہاں موجود ملازموں کا خیال ہے کہ رحمت علی جتنا نیک نفس بچہ تھا وہ قتل نہیں کرسکتا۔ بلکہ اسے پھنسایا گیا ہے۔ جب کہ زمرد جہاں دہری کیفیت کا شکار ہے۔ لیکن چونکہ رحمت علی کے خلاف ثبوت ملے ہیں اس لیے وہ لوگ اسی کو قاتل سمجھتے ہیں۔''

بہرحال اس کے بعد میں شاہ جہاں بیگم سے ملی۔ شاہ جہاں بیگم کھلے الفاظ میں یہ کہتی ہیں کہ ان کا سائبان چھن گیا۔ زمرد ان کی قاتل ہے کیونکہ اس کی رنگ رلیاں رک گئی تھیں ویسے یہ بھی سچ ہے کہ زمرد بیگم عیش پرست ہیں اور ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ سب کچھ ان کے لیے ان کی اوقات سے بہت زیادہ ہے۔ چھوٹے بابا جب کہ اس کے برعکس شاہ جہاں بیگم خاندانی عورت معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے چہرے پر نور ہے۔ عبادت گزار بھی ہیں بلک بلک کر رو رہی تھیں کہ مرزا جواد بیگ کچھ بھی تھے ان کی چھت تو تھے۔ میں ان سے ملاقات کرنے کے بعد باہر نکل آئی۔ لیکن چھوٹے بابا اس کے بعد ایک ایسا واقعہ ہوا جو میرے لیے حیران کن اور میرے ذہن کو الجھا دینے والا تھا۔''

سب چونک کر شازیہ کو دیکھنے لگے۔ شازیہ نے کہا۔

''میں نکل کر تھوڑی دور چلی تھی کہ شاہ جہاں بیگم کے گھر میں نے ایک شخص کو موٹر سائیکل پر آتے ہوئے دیکھا۔ موٹر بائیک کھڑی کر کے وہ بڑے اطمینان سے شاہ جہاں بیگم کے پاس چلا گیا اور پھر اس طرح دوڑ کر باہر آیا۔ جیسے میری تلاش میں ہو۔ شاہ جہاں بیگم نے اسے میرے بارے میں بتایا ہو۔ اور وہ یہ دیکھنے کے لیے نکل کھڑا ہوا ہو کہ پولیس کی کون سی ایسی آفیسر تھی جو شاہ جہاں بیگم سے تفتیش کرنے کے لیے آئی تھی میں تو چھپ گئی تھی۔ وہ دیر تک مجھے تلاش کرتا رہا اس کے بعد اندر چلا گیا اور یہ شخصیت گل جان کی تھی۔ چھوٹے بابا میں گل جان کے بارے میں اس طرح جانتی ہوں کہ جب میں بھکارن بن کر بھیک مانگا کرتی تھی تو میں نے گل جان کا علاقہ بھی دیکھا تھا۔ وہ ایک خطرناک قسم کا غنڈہ ہے اور ہر طرح کی مجرمانہ حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ چھوٹے بابا آپ مجھے بتایئے کہ گل جان جیسے خطرناک آدمی کا شاہ جہاں بیگم سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔''

صوفی خاموش تھا لیکن دلاور جلدی سے بول پڑا۔

''گل جان کو میں جانتا ہوں صوفی صاحب! چھٹا ہوا بدمعاش ہے کئی قتل بھی کر چکا ہے۔ لیکن چالاکی سے کام کرتا ہے۔ آدمی بہت خطرناک ہے۔''

''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ زمرد جہاں نے گل جان کو حاصل کیا ہو اور اسے حکم دیا ہو کہ وہ شاہ جہاں بیگم کو قابو میں رکھے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔'' سب سوچ میں ڈوب گئے۔ دلاور نے کہا۔

"چھوٹے بابا! ایک سیدھا سادھا کام دنیا کا سب سے اچھا کام ہوتا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"گل جان کو اٹھا لاتے ہیں اس سے معلومات حاصل کریں گے۔" دلاور نے بے خوفی سے کہا۔ غلام قادر بولا۔

"اڑے ماں قسم یہ کام میٹرے کو دے دو۔ وڑی میں ایسا فقطھی لگاؤں گا کہ وہ اپنی پیدائش کا حال بھی اگل دے گا۔" صوفی دیر تک سوچتا رہا تھا۔ پھر اس کے بعد اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ گل جان بہت سے انکشافات کرے گا اس کے لیے یہاں مہمان نوازی کا انتظام کرلو۔"

♥......♥......♥

"کرنل رحیم شاہ اچانک ہی گرین ہاؤس پہنچ گئے تھے۔ اس وقت گرین ہاؤس ایک مکمل ہاؤس بنا ہوا تھا۔ شازیہ دلاور کی بیوی کے ساتھ کچن میں کھانا پکا رہی تھی۔ دلاور اور غلام قادر گرین ہاؤس کی کیاریاں درست کر رہے تھے اور صوفی گلے میں ایپرن باندھے ہوئے پورے گھر کی ڈسٹنگ کرتا پھر رہا تھا۔ کرنل رحیم شاہ نے حیرت سے ان تمام لوگوں کے مشاغل دیکھے اور ہنستا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ صوفی کو دیکھ کر تو وہ بہت ہی ہنسا تھا۔

"اوہ صوفی صاحب! یہ آدھا پائجامہ آپ پر خوب جچ رہا ہے۔" کرنل رحیم شاہ نے صوفی کے نچلے بدن کے لباس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ درحقیقت یہ کوئی باقاعدہ جانگیا نہیں تھا بلکہ کسی پائجامہ کو درمیان سے پھاڑ کر اسے جانگیا بنا لیا گیا تھا اور کچھ ایسے اناڑی ہاتھوں نے اسے پھاڑا تھا کہ ایک پائنچہ اونچا اور ایک نیچا ہو گیا تھا اوپر سے صوفی نے قمیص اس جانگیے کے اندر کرلی تھی۔ سوکھی ہوئی دبلی دبلی ٹانگیں جانگیے کے سامنے ٹخنوں تک اترنے والا ایپرن، منہ میں پان، سر پر ٹوپی، صوفی واقعی ایک کلاسیکل چیز لگ رہا تھا۔ کرنل رحیم شاہ کے حلق سے کئی قہقہے نکل گئے اور صوفی نے جالے صاف کرنے والا برش جو لمبے بانس میں بندھا ہوا تھا نیچے رکھا اور کرنل کو سلیوٹ کرنے لگا۔

"وعلیکم سلیوٹ! کیا ہو رہا ہے یہ صوفی صاحب۔"

"بضم...... بضم...... بضم......" صوفی نے اپنے پچکے ہوئے گال پھلاتے ہوئے کہا۔

"ایسا کریں آپ آپ اس بضم بضم سے نجات حاصل کرلیں اور میرے پاس آجائیں۔ میں اپنے کمرے میں ہوں۔" یہ کہہ کر کرنل رحیم شاہ اس بڑے ہال نما کمرے سے نکل گیا اور اپنے کمرے میں جا کر صوفی کی دلچسپ شخصیت پر غور کرنے لگا۔ پانچ منٹ کے اندر اندر صوفی کرنل کے سامنے پہنچ گیا تھا لیکن اس وقت وہ بالکل مناسب لباس میں تھا منہ بھی پان سے صاف تھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے سلیوٹ کیا تو کرنل نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا اور بولا۔

"آیئے تشریف رکھیے۔ کیسے مزاج ہیں آپ کے۔"

"درویشوں کا کام ہے۔ حق اللہ۔"

"وہ دونوں ٹھیک ہیں۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے جواب دیا۔

"کیا پیش رفت ہوئی ہے اس سلسلے میں؟"

"کام جاری ہے اندازے قائم کیے جا رہے ہیں اور اندازہ یہ ہے کہ رحمت علی بے گناہ ہے اس بے چارے کو اس جرم میں پھانسا گیا ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔"

"یقیناً صوفی صاحب! آپ نے اس سلسلے میں معلومات حاصل کی ہوں گی۔"

"گرین فورس مصروف عمل ہے جناب والا! اور ہم بہت جلد اصل مجرم کو منظر عام پر لے آئیں گے اور اس بچے کو اس کے بعد والی پیشی میں چھڑا لیں گے۔"

"اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے صوفی صاحب! بہت سوں کا سہارا ہیں آپ۔"

"حق اللہ...... حق اللہ...... حق اللہ...... مگر جناب ایک اور ضرورت پیش آگئی ہے۔ اس کے سلسلے میں یا تو آپ رہنمائی فرمایئے اور اگر مشکل درپیش ہو تو ہم کوشش کرتے ہیں۔"

"ہاں بتایئے۔"

"جب اس انداز میں بھی کام کرنے کا ارادہ کرلیا ہے آپ نے کہ ہر مظلوم کی دادرسی کی جائے تو ہمیں بہت سے نئے ساتھیوں کی ضرورت پیش آئے گی۔ انسپکٹر اور تھانہ تو میں نے تلاش کرلیا ہے کیونکہ یہ میرا شعبہ رہ چکا ہے۔ ہمیں ایک بہت ہی قابل وکیل کی ضرورت درپیش ہے۔"

"واہ...... کیا عمدہ بات کہی آپ نے صوفی صاحب! ابھی میں جس شخص کے پاس سے اٹھ کر آرہا ہوں اس کا نام فرقان جلیل ہے۔ یہ نام آپ نے ضرور سنا ہوگا۔"

"بیرسٹر فرقان جلیل۔ وہ تو بڑے نامی گرامی بیرسٹر ہیں۔"

"میرے بچپن کا دوست ہے ہم نے میٹرک ایک ساتھ ہی کیا تھا اس کے بعد ہم دونوں کے راستے جدا جدا ہو گئے۔ پہلے بھی اکثر ملتا رہا ہے لیکن کچھ رشتے چل رہے تھے۔ اس نے مجھے فون کیا تھا کہ میں ذرا اس کے پاس آجاؤں اور اس کی بیٹی کے اس رشتے کے بارے میں بات کروں۔ جو آیا ہے اس بات چیت کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا کہ میری مصروفیات کیا ہیں میں نے مختصر الفاظ میں اسے بتا دیا۔ بہت متاثر ہوا کہنے لگا کہ اگر وکیل کی حیثیت سے اس کی ضرورت پیش آئے تو اسے بھی ان نیک کاموں میں ہمیشہ شریک رکھا جائے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا اور یہ کہا کہ جس بچے کے بارے میں ہم لوگ اس وقت کام کر رہے ہیں۔ اس کے کیس کو ری اوپن کرنا ہوگا اور اس سلسلے میں اس کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس نے آمادگی کا اظہار کر دیا ہے۔"

"حق اللہ...... حق اللہ...... اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے۔ یہ بڑے کام کی بات ہوتی ہے اور پھر کرنل رحیم شاہ کو تفصیلی رپورٹ دینے لگا۔

♥......♥......♥

پورا اسکرپٹ عادل کے سامنے تھا اور وہ تین چار بار اس کی ریہرسل کر چکا تھا بہر حال اب اس قدر بے صلاحیت بھی نہیں تھے یہ لوگ کہ اتنا سا کام نہ کر سکتے۔ آخر کار عادل نے نمبر ڈائل کیا۔ صوفی، شازیہ، غلام قادر سب کے سب موجود تھے۔ کچھ لمحوں کے بعد دوسری طرف سے رابطہ ہو گیا اور آواز آئی۔

''ہاں بولو کون ہے۔ کیا بات ہے۔''

''وہ حضور والا ہمیں گل جان صاحب سے بات کرنی ہے۔''

''ہو کون یار! اور یہ حضور والا یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ کام بتاؤ۔''

''گل جان صاحب بول رہے ہیں۔''

''میں نے کہا نا یہاں صاحب واحب کا چکر نہیں چلتا تم کام بتاؤ۔''

''مگر تم بھی تو اپنے بارے میں بتاؤ کہ تم کون ہو۔ اگر گل جان ہو تو صحیح انداز میں بات کرو میں گل جان کا ایک کلائنٹ ہوں اور ان سے ایک بڑا سودا کرنا چاہتا ہوں۔''

''تو ایسے بولو نا یار! تم حضور والا اور جناب والا کر رہے تھے بلاتا ہوں ابھی ہولڈ کرو۔'' دوسری طرف سے کرخت آواز سنائی دی اور پھر چند لمحات کے بعد ایک اور آواز سنائی دی۔

''میں گل جان بول رہا ہوں کون ہو تم۔''

''گل جان صاحب! ایک ضرورت مند ہوں آپ کی مدد چاہتا ہوں اور معاوضہ آپ کو منہ مانگا دینے کو تیار ہوں۔''

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''نادر علی۔'' عادل نے فوراً جواب دیا۔

''ٹھیک ہے نادر علی میرے پتے پر آ جاؤ۔ ٹیلی فون نمبر اگر تم نے کہیں سے معلوم کر لیا تو پتا بھی معلوم ہو گا تمہیں۔''

''وہ دیکھیے گل جان! میرے کچھ دشمن میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں میں نکل نہیں سکتا نواحی علاقے میں ایک خوبصورت پارک ہے۔ میں اس پارک میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ پہلے بھی آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ معاوضہ منہ مانگا دوں گا۔ اور یہ معاوضہ ایک سے پندرہ لاکھ تک ہو سکتا ہے۔ کام آپ کی پسند کے مطابق ہو گا۔ مطلب یہ کہ وہ کام جو آپ کرتے رہے ہیں۔''

''میرے بارے میں تمہیں اطلاع کس نے دی۔''

''جب میں نے اپنے مطلب کے لوگوں کو تلاش کیا تو مجھے آپ کے بارے میں معلوم ہوا کہ آپ میرا کام کر دیں گے۔''

''یہی تو پوچھ رہا ہوں کہاں سے معلوم ہوا۔''

''گل جان صاحب ایک پریشان حال شخص آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یہ تفصیلی ملاقات کے لیے ہی رہنے دیں۔''

''کب ملنا ہے؟'' گل جان نے سوال کیا۔

''میرا بس چلے تو میں اڑ کر آپ کے پاس آ جاؤں۔''

''اڑنا جانتے ہو۔'' گل جان نے ترکی بہ ترکی کہا۔

''وہی تو نہیں آتا اس لیے درخواست کر رہا ہوں کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔''

''ہوں۔ ڈیڑھ بجا ہے۔ دو بجے تک پہنچ جاؤں گا۔ تم گلاب پارک کی بات کر رہے ہو نا۔''

''جی بالکل بالکل۔''

''پہچانوں گا کیسے تمہیں۔''

''میں آپ کو پہچانتا ہوں گلاب پارک میں ایک پھول گڑھی ہے۔ پھولوں کی اس انجمن میں ہماری آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔'' عادل نے کہا۔

''ابے زنانہ ہے کیا۔ باتیں تو ایسی کر رہا ہے۔ چل ٹھیک ہے ایک گھنٹے میں پہنچ جاتا ہوں۔ خیال رکھنا کام میرے مطلب کا نہیں ہوا تب بھی تجھے دس ہزار روپے دینے پڑیں گے مجھے وہاں تک آنے کے۔''

''بیس ہزار دوں گا دولت میرے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔''

''قارون کا پوتا ہے کیا۔'' گل جان نے بھاری سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

''یہی سمجھ لیجیے آپ۔''

''آ رہا ہوں، آ رہا ہوں۔'' عادل نے فون بند کر دیا۔ جس فون پر یہ بات ہو رہی تھی وہ اس طرح کا تھا کہ اس پر ہونے والی بات چیت ایک بٹن دبانے سے گونجنے لگتی تھی اور اسے بہ آسانی سنا جا سکتا تھا۔ عادل نے فون بند کر دیا۔ صوفی اپنی مختصر سی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''حق اللہ...... تیاریاں کرو۔ نئے مہمان کو عزت اور احترام کے ساتھ لانا ہے کوئی خاص جدوجہد نہیں کرنی ہے۔''

''اور اگر وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ آیا تو۔''

''تو کیا بات ہے دوسرے لوگوں کے ساتھ ہی آئے گا۔ باقاعدہ غنڈہ ہے کوئی لچا، لفنگا نہیں ہے۔ اپنی ہوشیاری بھی کر کے آئے گا۔ اس طرح کے معاملات اسے دن رات پیش آتے رہتے ہوں گے۔''

''تو اب ہم کیا کریں۔''

''دس منٹ کے اندر اندر ہمیں پارک میں پہنچ کر پوزیشن لے لینی ہے۔ پھولوں کے اس کنج کے پاس اونچے اونچے برگد کے درخت ہیں وہ کارآمد ہوں گے۔''

''ملاقات کون کرے گا ان سے۔'' دلاور نے پوچھا۔

''عادل، فیضان تم۔ غلام قادر، دلاور، شازیہ تم نے ان لوگوں کو سنبھالو گے جو گل جان کے ساتھ آئیں گے۔ کیا سمجھے۔''

''کیا انہیں بھی ساتھ لانا ہو گا۔''

''بالکل نہیں۔ گل جان کو بھی ہم بے ہوش کر کے ہی لائیں گے۔ ان لوگوں کو بھی کھوپڑیاں سہلا ک
بے ہوش ہی کرنا ہو گا۔ بس اتنا کافی ہے۔''

''پوری پلاننگ ترتیب پا گئی دلاور، فیضان، شازیہ، غلام قادر یہ چاروں افراد پوری طرح تیار ہو
صوفی کی قیادت میں چل پڑے۔ ایک وین ساتھ لی گئی۔ اور ایک کار۔ جس جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ وہ ہر لحا
سے موزوں تھی۔ پھولوں کے اس کنج والے علاقے کے پاس سے سڑک گزرتی تھی اور اس سڑک پر گاڑ

کمڑی کرنا آسان تھا۔ صوفی نے وین کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی ہوئی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ گلاب پارک پہنچ گئے اور اس کے بعد ساری سچویشن انہوں نے کنٹرول کر لی۔

گلابوں کے ایک بڑے کنج کے پاس عادل کو ایک بنچ پر بٹھا دیا گیا۔ وہ قمیض اور پتلون پہنے ہوئے تھا اور شکل وصورت اس طرح کی بنا دی گئی تھی کہ کوئی اسٹوڈنٹ لگ رہا تھا۔ باقی لوگ جگہ جگہ پوشیدہ ہو گئے تھے اور اپنا کام کرنے کے لیے مستعد تھے۔ گلاب پارک کا انتخاب اس لیے کیا گیا تھا کہ یہ شہری آبادی سے دور تھا۔ چھٹی والے دن تو یہاں بہت رش ہوا کرتا تھا۔ عام دنوں میں یہاں ذرا کم ہی لوگ آتے تھے اس وقت بھی یہاں ہو کا عالم طاری تھا۔ عادل خاموش بیٹھا ہوا انتظار کر رہا تھا وہ دل ہی دل میں اپنے اسکرپٹ کو دہرا رہا تھا کہ اسے گل جان سے کیا بات کرنی ہے۔ گل جان ایک جیپ میں وہاں پہنچا تھا اور اس کے ساتھ تین خطرناک قسم کے غنڈے موجود تھے۔ عادل نے جیپ رکتے دیکھی تو جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور جیپ سے اترتے ہوئے گل جان کو دیکھتا رہا۔ ایک آدمی جیپ میں بیٹھا رہا۔ دو آدمی گل جان کے ساتھ اس طرف چل پڑے۔ عادل اس وقت بہت اچھی اداکاری کر رہا تھا۔ دور سے وہ گل جان کا جائزہ لے رہا تھا کافی خطرناک آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بہرحال سنسنی خیز لمحات قریب آتے جا رہے تھے اور انہیں ایک خطرناک کام سرانجام دینا تھا۔ بے حد خطرناک۔

عادل نے معصوم سی شکل بنالی تھی۔ ویسے بھی صوفی کی صحبت میں رہ کر اب وہ خاصا تیز ہو گیا تھا اور اپنے معاملات سمجھ چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ گرین فورس جس انداز میں اپنا کام کر رہی تھی۔ وہ بہرحال ذہانت کے کام ہی تھے۔ گل جان ادھر ادھر دیکھنے لگا تو عادل جلدی سے اٹھ کر اس کے سامنے آ گیا۔

''جناب والا! میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ میں آپ کو پہچان لوں گا۔ میں نے ہی آپ کو زحمت دی تھی۔''

''ابے او لکھنو کے نائی! تمیز سے بات کر یہ تیزی فضول باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں کیا بک بک کر رہا تھا ٹیلی فون پر۔''

''حضور من! اگر میری کسی بات سے آپ کو زحمت ہوئی ہو تو شرم سار ہوں ایک مشکل میں گرفتار ہوں۔ اور آپ کی مدد چاہتا ہوں۔''

''شرم سار ہے اور ایک مشکل میں گرفتار ہے۔ ابے تو تو آغا حشر کاشمیری ہو گیا۔ بول کیا بات ہے۔ آ جا ادھر بیٹھتے ہیں۔''

''حضور من۔''

''او بھائی حضور اور من! اب یہ تم دونوں سے کچھ کہہ رہا ہے۔'' گل جان نے پر مزاح بننے کی کوشش کی اور اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔

''میں عرض کر رہا تھا کہ مجھے جو کچھ کہنا ہے۔ تنہائی میں کہنا ہے۔''

''اور تو کوئی نہیں ہے تیرے ساتھ۔''

''نہیں تنہا ہی ہوں اس کائنات میں اور اسی لیے آپ کی ضرورت پیش آئی۔''

''تیری ایسی تیسی اتنا برا بھلا سن چکا ہے پھر بھی آدمیوں کی طرح نہیں بولتا۔ جاؤ بھئی...... تم دونوں ادھر چلے جاؤ۔'' گل جان نے کہا اور پھر عادل کی طرف دیکھ کر بولا۔

''یار! تم لوگ بس کیا کہوں تمہیں۔ اس نئی نسل نے تو صحیح معنوں میں ہم سب مردوں کی گردن جھکا دی ہے۔ کہیں سے مرد لگتے ہی نہیں ہیں۔ چال میں نزاکت بات میں نزاکت چہرے پر نزاکت۔ ابے سارے کے سارے نزاکتی کیوں ہو گئے ہو یا پھر یہ بھی اینگر دیوریا کا کمال ہے۔ چل بیٹھ جا یار! مجھے غصہ آ رہا ہے تجھ پر۔ ابے کم از کم ایک بات تو مردوں والی کر دے۔''

''آپ جس قدر چاہیں میری توہین فرمالیں۔ میں ایک غمزدہ انسان ہوں۔''

''اچھا۔ انسان بھی ہے۔'' گل جان نے اسے گھورتے ہوئے کہا اور پھر اسے ایک بنچ پر دھکا دے دیا۔

''ہاں بولو۔ کیا بات ہے میں نے تم سے کہا تھا کہ میرے اور تمہارے درمیان اگر کوئی مسئلہ طے نہ ہوا تب بھی دس ہزار روپے لوں گا۔ تجھے مجھ سے کام ہے نالایا ہے دس ہزار روپے۔''

''حاضر خدمت ہیں۔'' عادل نے جلدی سے ہزار ہزار کے دس نوٹ نکال کر گل جان کے سامنے پیش کر دیے اور گل جان بولا۔

''ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ بندہ کام کا ہے۔ اچھا خیر اب اصل بات کہہ دے۔''

''مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔''

''لڑکی سے۔'' گل جان پھر مذاق اڑانے پر اتر آیا۔

''ہاں۔''

''ابے تجھے تو کسی لڑکے سے محبت ہونی چاہیے تھی۔ چل خیر ہو گئی۔ لڑکی نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لی ہوگی اور کہا ہوگا کہ آپا مجھے معاف کر دو۔''

''نہیں وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔''

''ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ بہن کی طرح چاہتی ہوگی تجھے خیر آگے بول۔''

''لڑکی کے گھر والے ظالم سماج بن گئے ہیں ہم دونوں کے درمیان۔''

''سبحان اللہ...... سبحان اللہ۔ تو اب ظالم سماج کی آخری اولاد مجھ سے کیا چاہتا ہے۔''

''وہ کہتی ہے کہ کچھ بھی ہو میں تم سے شادی کروں گی۔''

''ہیں شادی بھی کرے گی تجھ سے۔ لو کمال ہے یہ ملک بھی فرانس بنتا جا رہا ہے۔''

''اچھا پھر......''

''آپ کو ہماری مدد کرنا ہوگی گل جان صاحب لڑکی کے والدین نے کچھ غنڈے پال لیے ہیں۔ ہم آپ کو آپ کا منہ مانگا معاوضہ دیں گے۔ آپ ہم دونوں کا نکاح کرا دیجیے۔''

''بات تو ناجائز ہے مردوں کا نکاح عورتوں سے ہوتا ہے اور عورتوں کا مردوں سے خیر...... ہمیں اس سے کیا غرض۔ خود روئے گی سسری اپنے مقدر کو۔ چل ٹھیک ہے کتنی رقم دے سکے گا ہمیں۔ آپ ہی بتائیے کہ آپ ہمارے لیے کیا کریں گے۔''

''نکاح کرا دیں گے تیرا۔ دو مہینے تک اپنے پاس رکھیں گے۔ مخالفت میں جو کوئی بھی ہو گا اس کا دھڑن تختہ کر دیں گے اور جو کچھ چاہتا ہے وہ بھی بتا دے۔''

''نہیں بس اتنا ہی چاہتے ہیں۔ ادھر یہ گفتگو ہو رہی تھی اور ادھر شازیہ اور غلام قادر نے مل کر جیپ کے پاس کھڑے ہوئے اس کے غنڈے کو سنبھال لیا تھا۔ سر پہ ضرب لگا کر انہوں نے اسے بے ہوش کر دیا تھا اور گھسیٹ کر پھولوں کے کنج میں لے گئے تھے۔ وہ باقی دو افراد ایک طرف کھڑے سگریٹ پی رہے تھے اور انہیں جیپ والے کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا کہ اچانک ہی شازیہ دلدوز آواز میں چیخی اور دونوں جو سگریٹ پی رہے تھے بری طرح اچھل پڑے۔

''لڑکی کے چیخنے کی آواز ہے۔''

''ہاں۔ او ہو ادھر دیکھو کیا ہو رہا ہے۔'' دونوں نے ایک طرف اشارہ کیا غلام قادر نے شازیہ کو کندھوں سے پکڑ کر دبوچ رکھا تھا اور دونوں صاف نظر آ رہے تھے۔ غنڈے اس جانب دوڑے۔ غلام قادر شازیہ کو اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا اور شازیہ جدوجہد کر رہی تھی۔ وہ دونوں ان کے قریب پہنچ گئے۔

''او۔ کالو رک جا اگر زندگی چاہتا ہے تو۔''

''اڑے ماں قسم دیکھو یار کیا پٹی ہے اپن کا اس سے سال بھر سے عشق چل رہا ہے داؤ میں آتی ہی نہیں ہے۔''

''او کالے بندر اپنی شکل دیکھی ہے کبھی۔''

''ارے ماں قسم شکل کا کیا کرنا ہے وڑی دل تو دیکھو۔'' غلام قادر نے گریبان کھولا۔

''اچھا بیٹا اب پھوٹ لے ادھر سے ورنہ مزہ آ جائے گا تجھے بھی۔'' دونوں نے چاقو نکال لیے اور غلام قادر اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ شازیہ گہری نگاہوں سے ان دونوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

''یار! لڑکی تو چکنی ہے۔ یہ کالا بندر بھلا اس کے قابل کہاں۔ بی بی! ہم دونوں کو دیکھو اور ذرا غور سے دیکھو۔ ہم تمہاری ہر خدمت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ چل بے بھاگ جا۔ انہوں نے غلام قادر کو چاقو دکھاتے ہوئے کہا اور غلام قادر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا اب کیفیت یہ تھی کہ شازیہ ان دونوں کے عقب میں تھی اور اس نے وہ وزنی لوہے کا ٹکڑا نکال لیا تھا۔ جو پیچھے سے ان لوگوں کو سنبھالنے کے لیے کافی تھا۔ غلام قادر نے کہا۔

''وڑی دیکھو بابا! ابھی تم ادھر سے چلے جاؤ۔ ہمیں غصہ آ گیا تو تم کو نقصان ہو جائے گا۔''

''شرافت سے جا رہا ہے یا......'' لیکن ابھی ان کے منہ سے اتنا ہی جملہ نکلا تھا کہ پیچھے سے ان میں سے ایک کے سر پر بھرپور ضرب پڑی اور اسکے حلق سے ایک کرخت آواز نکل گئی۔ دوسرا چونک کر پلٹا ہی تھا کہ شازیہ نے اس پر بھی وار کر دیا اور بہر حال اب وہ اس قدر مہارت ضرورت رکھتی تھی کہ اس کا وار خالی نہ جائے۔ دوسرا غنڈہ چونکہ سامنے آ گیا تھا۔ اس لیے چوٹ اس کی پیشانی پر پڑی تھی اور اس کے منہ پر خون کی چادر پھیل گئی۔ جب کہ پہلے والا اوندھے منہ زمین پر گر پڑا تھا۔ شازیہ کو دوسرا وار کرنا پڑا تب کہیں جا کر بات بن سکی۔ ادھر شازیہ کی چیخ سن کر گل جان بھی چونک پڑا تھا۔ پھر وہ گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اور اسی وقت عقب سے دلاور نکل آیا۔ دلاور نے بھی گل جان کے سر پر ضرب ہی لگائی تھی۔ یہاں پارک میں کوئی ڈرامے

بازی نہیں چل سکتی تھی۔ دوسری یا تیسری ضرب سے گل جان زیر ہو سکا اور اس کے بعد غلام قادر اور عادل اسے سنبھال کر اس بند گاڑی کی طرف لے چلے۔ جو تھوڑے فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ باقی افراد کو یہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔

اس کے بعد گرین ہاؤس کے اس مخصوص کمرے ہی میں گل جان کی آنکھ کھلی تھی۔ جو ایسے کاموں کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ یہاں کا ماحول بڑا پراسرار اور سنسنی خیز سا تھا اور اس وقت پوری گرین فورس یہاں موجود تھی۔ سوائے کرنل شاہ کے۔ کرنل رحیم شاہ یہاں موجود نہیں تھا۔ صوفی آرام سے بیٹھا ہوا جگالی کر رہا تھا اس کی آسودہ نگاہیں گل جان کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اور پھر گل جان ہوش میں آ گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کھلے ہی رکھے گئے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ اور اسکے بعد اچانک ہی اچھل کر اپنی جگہ سے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے ایک ایک کی صورت دیکھی دلاور کے چہرے پر آ کر اس کی نگاہ رک گئی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دلاور کو دیکھنے لگا اور پھر اس کے منہ سے حیران حیران سی آواز نکلی۔

''دلاور...... یہ تو ہی ہے۔''

''ہاں میں ہوں گل جان۔''

''اور یہ کون لوگ ہیں۔'' دلاور نے ادھر ادھر دیکھا اور بولا۔

''بس سمجھ لے کہ سارے کے سارے موت کے ہرکارے ہیں۔''

''آہ۔'' گل جان کو اپنے سر میں شدید ٹیس محسوس ہوئی تھی۔ اس کے منہ سے ایک کراہ نکل گئی اور پھر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

''تم لوگوں نے مجھے اغوا کیا ہے۔''

''ارے ہم سے بات کرو نا۔ کیا ادھر ٹیس لگا رکھا ہے۔'' غلام قادر سامنے آ کر بولا اور گل جان چونک کر ادھر دیکھنے لگا۔

''مجھے جانتے ہو تم لوگ کون ہوں میں۔ او ہو تم بھی ہو اس کا مطلب ہے کہ میرے خلاف کوئی سازش کی گئی ہے۔'' اس بار گل جان کی نظر عادل پر پڑی تھی۔

''حضور من۔ جناب والا۔ بس ہم بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔''

''کتنے ہو تم لوگ؟'' گل جان نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر صوفی کی طرف رخ کر کے بولا۔

''اوئے شتر مرغ! کیا تماشا لگا رکھا ہے یہ تم لوگوں نے بیوقوفو! دلاور تو مجھے جانتا ہے۔ میں تم سب کی چٹنی بنا کر پھینک دوں گا۔ تمہاری یہ سازش کامیاب نہیں ہو گی میرے آدمی کہاں ہیں۔ کیا انہیں بھی اٹھا لائے ہو تم۔''

''ہمیں صرف آپ کی ضرورت تھی حضور والا۔'' عادل نے کہا۔

''تو پھر میرا خیال ہے مجھے تجھ سے ہی ابتدا کرنی چاہیے۔ گل جان آگے بڑھا اور عادل کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اس نے عادل کا گریبان ہاتھ میں پکڑا اور اسی وقت عادل کا زور دار تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔ چٹاخ کی زوردار آواز کے ساتھ گل جان پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو گئی

تھیں۔ پھر اس نے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈال کر غالباً ریوالور تلاش کیا۔ لیکن بے وقوف آدمی کے پاس اب کچھ بھی نہیں تھا۔ صوفی نے اچانک ہی پاس رکھا ہوا اگال دان اٹھایا اور منہ کی تمام غلاظت اس میں الٹ دی۔ اس کے بعد دو چار مرتبہ اس میں تھوکا اور تھوکتے ہوئے بولا۔

''آپ نے ہمیں شتر مرغ کے نام سے یاد کیا ہے حضورِ من! گویا بدتمیزی فرمائی آپ نے درویشوں کی دعاؤں سے اور اب جوتے بھی ہمارے ہاتھوں سے کھایئے۔'' صوفی نے پاؤں سے جوتا اتار لیا۔ گل جان بہت غصہ ور تھا۔ اس طرح کی بے عزتی اس کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ طاقت ور بھی تھا۔ وہ تو بس غلطی چوٹ کی وجہ سے نقصان اٹھا گیا تھا۔ لڑنے بھڑنے کا موقع ملتا تو یقینی طور پر بہت کچھ کر سکتا تھا۔

بہر حال صوفی اس کے سامنے آگیا باقی لوگوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب جوتا ہو گا اور گل جان کا سر۔ اور یہی ہوا۔ پہلا جوتا اس کے عین سر پر ہی پڑا تھا۔

''شتر مرغ کہا آپ نے ہمیں۔ اپنے الفاظ واپس لیجیے گا۔''

''میری......'' گل جان نے موٹی سی گالی بکی لیکن اس بار تین جوتے پڑے تھے دو منہ پر اور ایک سر پر اور اس کے بعد ایک دلچسپ تماشا شروع ہو گیا۔ گل جان لپک لپک کر صوفی کو پکڑ رہا تھا اور صوفی صرف اس کے جوتے جھاڑ رہا تھا۔ گل جان کا چہرہ سوج گیا تھا وہ بھی دیوانہ ہی تھا۔ بس اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح صوفی کو اپنی گرفت میں لے لے۔ پھر صوفی نے جوتا ایک طرف پھینک دیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

''اب تک جو کوشش فرماتے رہے ہیں آپ۔ اب ذرا اس سے بھی لطف اندوز ہو لیجیے۔'' گل جان اس بار آگے بڑھا اس نے صوفی کے بدن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ شازیہ کے منہ سے ایک ہلکی سی آواز نکل گئی تھی۔ لیکن فیضان نے کہا۔

''نہیں شازیہ نہیں۔ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ میں نے ایک ایسے آدمی سے صوفی صاحب کی کشتی دیکھی ہے۔ جو ہم لوگوں میں بڑا تیس مار خاں مشہور تھا۔ لیکن اس کی جو درگت بنی دیکھنے والوں نے اچھی طرح دیکھ لیا۔''

شازیہ سامنے دیکھنے لگی۔ گل جان نے صوفی کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر تھوڑے سے حیرت کے نقوش بھی تھے۔ وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس نے لوہے کے بنے ہوئے کسی ڈھانچے کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ اس نے کئی جھٹکے صوفی کو ادھر سے ادھر دیے لیکن صوفی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہو سکا۔ اسکے بعد اس نے گل جان کی دونوں کلائیاں پکڑیں اور انہیں موڑتا چلا گیا۔ پہلے اس نے گل جان کی گرفت ختم کی اور اس کے بعد پلٹ کر اس کے دونوں بازوؤں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ہتھیلی گردن پر جمائی۔ اور پھر اسے مرغا بناتے ہوئے بولا۔

''جب ہار مان لو تو اپنے منہ سے کہہ دینا۔'' گل جان پہلے تو برداشت کرتا رہا اسکی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی جا رہی تھی۔ عجیب و غریب داؤ تھا۔ بالکل یوں لگتا تھا جیسے کوئی کیکڑا اپنے سارے ہاتھ پاؤں کے ساتھ کسی انسانی جسم سے لپٹ گیا ہو اور اس پر قوت آزمائی کر رہا ہو لیکن وہ قوت آزمائی بھی معمولی نہیں تھی۔ گل جان اگر غیر معمولی طور پر طاقت ور نہ ہوتا تو ایک لمحے کے اندر ہی بول پڑتا۔ اس کے پورے بدن نے پسینہ اگل دیا تھا اور اس کے حلق سے گالیاں نکل رہی تھیں۔ آخر میں اس نے کہا۔

خاموش رہے۔ اصل میں آواز موٹی گردن میں چربی کے نیچے پھنس گئی تھی۔ اور بس یہی لگتا تھا جیسے کوئی ہاتھی میاؤں میاں کر رہا ہو۔ وہ زویا کا شوہر تھا۔ اور زویا راجا امیر علی شاہ کی بڑی بیٹی تھی۔ بوٹے سے قد اور خوب صورت بدن کی مالک۔ شوہر کے سلسلے میں کمپلیکس کا شکار تھی اور جھینپی جھینپی رہتی تھی۔

راجا صاحب رانا بختیار کی نئی دریافت تھے۔ لندن بائی پاس کرانے گئے تھے جہاں راجا صاحب سے دوستی ہو گئی تھی۔ صحت یاب ہو کر واپس آئے تو راجا صاحب کو دعوت دے آئے تھے اور راجا صاحب نے وعدہ کر لیا اور پھر انہوں نے وعدہ وفا کر دیا۔ ان کے بیٹے بیٹیاں بھی خوش مزاج تھے اور سب نے راجا صاحب کی فیملی کا پرتپاک خیر مقدم کیا تھا۔ کئی دن کی بے تکلفی کے بعد ارم نے زویا سے پوچھ لیا۔

''زویا تمہیں تمہارے شوہر پسند ہیں۔''

''تم یقین کرو، بہت اچھا انسان ہے۔ بس جسامت۔ اللہ کی دین ہے۔''

''تم اس کے ساتھ خوش ہو۔''

''ناخوش بھی نہیں ہوں۔ شوہر کی حیثیت سے ایسے لوگ آئیڈیل ہوتے ہیں۔ وہ میرا بہت خیال کرتا ہے اور پھر اس قدر سادہ لوح ہے کہ مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہوتی۔ البتہ بس جب ذرا دیکھنے والے اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتے ہیں تو مجھے تھوڑا سا افسوس ہوتا ہے لیکن دوسروں سے کیا، لوگ تو کسی بھی شکل میں کسی کو خوش دیکھنا پسند نہیں کرتے۔'' ارم خاموش ہو گئی۔ شاید وہ کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی۔ لیکن غیر مہذب بات تھی اس لیے خاموش ہو گئی البتہ راجا صاحب نے رانا بختیار کو اپنے داماد کے بارے میں بتایا تھا۔

''وہ ہاتھی کی طرح طاقتور، گینڈے کی طرح مضبوط ہے، بس ریسلنگ کا شوق ہے۔ پہلوانوں سے بڑی عقیدت رکھتا ہے۔ اور خود بھی ایک اچھا پہلوان ہے۔ لیکن پروفیشنل نہیں۔ حالانکہ اس کا باپ ایک درمیانی جسامت کا آدمی تھا اور اپنے بیٹے کے اس شوق سے بہت نفرت کرتا تھا۔ لیکن شاید یہ شوق اسے قدرتی طور پر ملا ہے تم یقین نہیں کرو گے رانا بختیار کہ اس نے بڑے بڑے نامی گرامی پہلوانوں کو چت کر دیا ہے۔''

''ہاں۔ اچھی جسامت ہے اس کی۔''

''بہر حال یہ کوئی ایسا موضوع نہیں تھا جو بہت زیادہ دلچسپی کا باعث ہو۔ راجا شیر بدر کی باتیں بھی بڑی معصوم معصوم ہوتی تھیں۔ وہ ہر ایک کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے پر آمادہ رہتا تھا۔ پھر یہ طے پایا کہ رانا ہاؤس چلا جائے۔ رانا ہاؤس دراصل رانا بختیار علی کا سمر ہاؤس تھا اور یہاں بڑے شان دار انتظامات کیے گئے تھے۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی بستی کے پاس بستی سے تھوڑا ہٹ کر یہ سمر ہاؤس بنایا گیا تھا۔ اور یہاں صرف ایک چوکیدار اپنے خاندان کے ساتھ مستقل رہتا تھا۔ انہی کے سپرد اس سمر ہاؤس کی دیکھ بھال تھی۔

کبھی کبھی رانا فیملی یہاں آجایا کرتی تھی کیونکہ اس کے نواحات بھی بے مثال تھے۔ پھولوں سے لدی پہاڑیاں۔ موسم بہار میں ایک آفاقی منظر پیش کرتی تھیں۔ اور کبھی کبھی جب غیر ملکی سیاح ادھر نکل آتے تھے تو یہیں کے ہو رہنا چاہتے تھے۔ ایسی جگہیں خوابوں ہی میں دیکھی جاتی ہیں۔ ان پہاڑیوں کے دامن میں جنگل بھی پھیلے ہوئے تھے۔ بے ترتیب اور ناہموار ان جنگلوں میں کبھی کبھی درندے بھی آجایا کرتے تھے۔''

چنانچہ رانا کے کچھ ایسے شوقین دوست جو شکار سے دلچسپی رکھتے تھے فرمائش کر کے رانا کے پاس

آجاتے تھے۔لیکن ان دنوں رانا بختیار بڑی ذہنی اذیت میں مبتلا ہو جاتا تھا۔کیونکہ جنگل کے درندوں کو بھی وہ اپنی ملکیت سمجھتا تھا اور ان کا نقصان نہیں چاہتا تھا۔لیکن بس مصلحتیں اور کچھ ایسے تعلقات جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا۔رانا بھی یہاں کسی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا تھا۔اور یہ بھی حیرت ناک بات تھی کہ ان درندوں نے کبھی پاس کی بستی والوں کو نقصان نہیں پہنچایا تھا اور کوئی ایسی شکایت نہیں آئی تھی۔جس کی وجہ سے رانا کو کوئی تشویش ہوتی۔

ایک دو بار ہی ایسے موقع آئے تھے کہ کوئی شیر انسانی جان کا لاگو ہو گیا۔ایسے موقع پر اس شیر کی تلاش خاص طور سے کی جاتی تھی اور اسے مار دیا جاتا تھا۔لیکن یہ سب کچھ نہ ہونے کے برابر ہوا تھا۔

بہر حال سب نے فیصلہ کیا کہ سمر ہاؤس جانے کے لیے یہ بہترین موقع ہے۔اجنبی مہمانوں کو بھی ان مناظر سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا جائے۔رانا بختیار کی بہت سی اولادیں تھیں۔لڑکیاں لڑکے کچھ کی شادی ہو گئی تھی اور ایسے موسم میں وہ شادی شدہ لڑکیاں بھی آجایا کرتی تھیں۔

چنانچہ سمر ہاؤس جانے کے لیے جو قافلہ تیار ہوا وہ چار جیپوں میں سفر کر رہا تھا۔زویا کا شوہر عام طور سے ان لوگوں کی گفتگو کا موضوع بنا رہتا تھا اور وہ اس کے بارے میں طرح طرح کے ریمارکس کس دیتے تھے۔غزالہ نے کہا۔

''زمانہ قدیم کے لوگ تو سنا ہے اس سے بھی لمبے تڑنگے ہوا کرتے تھے۔لیکن یہ شخص بہت عجیب ہے اس کے چہرے پر کسی بچے کی طرح معصوم سی کیفیت نظر آتی ہے۔تم یقین کرو بڑی سادہ سادہ سی باتیں کرتا ہے اور لڑکیوں کے سامنے تو بالکل ہی احمق بن کر رہ جاتا ہے' دل چاہتا ہے حلق پھاڑ پھاڑ کر اس پر قہقہے لگائے جائیں۔لیکن اس خیال سے خاموشی اختیار کرلی جاتی ہے کہ اس کی بیوی برا مانے گی۔''

''اور آواز' آواز تو بس کمال کی ہے۔یوں سمجھ لو اگر تھوڑے سے سر اس آواز میں پیدا ہو جائیں تو لتا منگیشکر کی ایسی کی تیسی ہو جائے۔''ان الفاظ پر عکسہ بری طرح ہنس پڑی۔

''خدا سے ڈرو تم لوگ' ابھی تم لوگوں کے لیے بھی راستے کھلے ہوئے ہیں۔کہیں ایسا نہ ہو کہ تم میں سے کسی کو کوئی ایسا ہی ریسلر مل جائے۔''

''تم جب بھی بات کرنا کفن پھاڑ کر ہی کرنا۔اللہ نہ کرے۔''

''ہوں۔بہر حال ہے ٹریجڈی۔کتنی خوب صورت ہے زویا' نازک نازک سی۔لیکن وہ اس دیو کے ساتھ گزارہ کر رہی ہے۔''

''ارے تمہیں نہیں معلوم زویا اسے پسند کرتی ہے۔''

''تب وہ ایب نارمل ہے۔''

''جیپوں پر مشتمل یہ پارٹی سمر ہاؤس کی جانب سفر کر رہی تھی۔لڑکیوں اور لڑکوں کا یہ گروہ خوب تفریحات کرتا جا رہا تھا۔بوڑھوں نے اپنے لیے ایک ہی جیپ کا انتخاب کیا تھا تاکہ لڑکے لڑکیوں کو ان کی موجودگی سے کوفت نہ ہو۔کئی گھنٹوں کا سفر طے ہو چکا تھا اور اب وہ علاقہ سامنے آگیا تھا جہاں سمر ہاؤس واقع تھا۔جیپوں نے سڑک چھوڑ دی اور پتھریلی زمین پر چل پڑیں۔آگے سرسبز وادی نظر آرہی تھی۔

رفتار کافی سست ہو گئی تھی کیونکہ یہ راستہ بہت ناہموار تھا۔اور بعض جگہ تو نہایت ہی سست رفتاری سے جیپوں کو گزارنا پڑتا تھا۔لیکن ایک جگہ گڑبڑ ہو گئی۔اس جیپ میں لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔اور رانا بختیار کی ایک تیز طرار بیٹی جیپ ڈرائیو کر رہی تھی۔جیپ ایک پتھر سے نیچے اتری اور اس کا ایکسل دوسرے پتھر پر جا ٹکا۔دونوں پہیے اوپر اٹھ گئے تھے۔حالانکہ جیپ فور وہیل ڈرائیو تھی۔لیکن کچھ ایسی گڑبڑ ہوئی تھی کہ آگے کے پہیے اسے آگے بڑھانے میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے۔پھر جب کافی ریس دینے کے بعد بھی کام نہ بنا تو رخسانہ نے جیپ کا انجن بند کر دیا۔باقی جیپیں بھی رک گئی تھیں۔لڑکے نیچے اتر آئے اور پھنسی ہوئی جیپ کے پاس پہنچ گئے جگہ ایسی تھی کہ وہ لوگ خود بھی کوشش کر کے جیپ کو نہیں نکال سکتے تھے۔لیکن لڑکیوں کی موجودگی میں لڑکے کچھ زیادہ بہادر اور طاقتور ہو جاتے ہیں۔چنانچہ سب کے سب اس چکر میں پھنس گئے۔جیپ نہیں نکل پائی تھی۔رانا بختیار اور راجا صاحب بھی آگئے۔

''بھئی اب کیا کیا جائے؟''

''اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ دوسری جیپوں کو آگے لے جا کر اس جیپ کو باندھا جائے اور پھر کھینچ کر اسے اتارا جائے۔''

''کوئی رسا ہے باندھنے کے لیے۔''

''ہونا تو چاہیے۔''زویا اور دوسرے لوگ وہیں کھڑے ہوئے تھے۔راجا شیر بدر نے بیوی کی طرف دیکھا وہ بھی تشویش کا شکار نظر آرہی تھی۔

''کیوں۔تم کیوں پریشان ہو۔''

''دیکھوں ناں۔''وہ بولا اور زویا چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''کیا مطلب؟''

''ارے یہ سب بونے ہیں ذرا سی جیپ نہیں اٹھا سکتے۔میں ابھی اسے نکالتا ہوں۔''

''سنیے' سنیے تو سہی۔اٹھ جائے گی آپ سے۔وہ سب مل کر اسے اٹھا رہے ہیں تو اٹھ نہیں پا رہی۔''

''میں ان سب سے زیادہ طاقتور ہوں۔''

''اچھا جاؤ۔لیکن سمجھ لینا شرمندہ نہ کرنا مجھے۔''شیر بدر آگے بڑھا اور جیپ کے قریب پہنچ گیا۔رانا بختیار نے لڑکیوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ دوسری جیپ میں منتقل ہو جائیں۔ابھی کچھ دیر میں کچھ کر لیا جائے گا۔رسے کی تلاش کی جا رہی تھی۔لیکن اس وقت شیر بدر وہاں پہنچا۔دونوں شاخوں جیسے مضبوط اور چوڑے ہاتھوں سے اس نے لوگوں کو ہٹا کر اور آگے بڑھ کر جیپ کو عقب سے پکڑ لیا۔دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس نے جیپ کو کوئی فٹ اونچا اٹھا لیا ہے۔اور اس کے بعد اس نے زور سے اسے آگے دھکیل دیا۔سب کے سب دم بخود رہ گئے تھے۔طاقت تو بیشک دکھائی جا سکتی تھی۔لیکن اس طرح نہیں' وہ سب کے سب شرمندہ ہو گئے تھے اور جھینپی ہوئی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تھے۔شیر بدر نے خوش ہو کر کہا۔

''یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔اگر ٹرک بھی ہوتا تو میں اسے بھی اٹھا کر اسی طرح نکال دیتا۔اگر کمر کا زور لگا دیتا تو جیپ کو اپنی کمر پر بھی اٹھا سکتا تھا۔''

''یقیناً آپ ایسا کر سکتے تھے۔لیکن اس کے بعد آپ کی کمر کا کیا ہوتا۔''

''ایں' میں کچھ سمجھا نہیں۔'' شیر بدر نے کہا اور سب ہنس پڑے۔

''بہر حال جیپ کی ڈرائیونگ پھر اس لڑکی نے سنبھال لی تھی اور وہ سب آگے بڑھ گئے تھے۔لیکن اب موضوع وہی تھا۔ایک لڑکی نے کہا۔

''سچ بتاؤ جو کچھ بھی ہے وہ تو ایک الگ بات ہے۔لیکن اس وقت اس کی بیوی کے چہرے پر فخر کے جو آثار ہیں' وہ ان کی حقدار ہے۔''

''تو پھر تمہارے لیے بھی کوئی ریسلر ہی تلاش کرلیا جائے۔''

''اب یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کسی کی تعریف کرنے کا مطلب یہ تھوڑی ہوتا ہے۔''

غرض یہ کہ یہ سارا سلسلہ اسی طرح چلتا رہا اور پھر وہ سمر ہاؤس پہنچ گئے۔ اچانک ہی آئے تھے۔اس لیے چوکیدار انہیں دیکھ کر بھونچکا ہو گیا۔لیکن پھر اس نے سب کو سلام کیا اور رانا بختیار اس سے اس کی خیریت پوچھنے لگا۔

''نہیں صاحب خیریت نہیں ہے۔اگر آپ کسی کو بھیج کر ہمیں یہاں آنے کا کہلوا دیتے تو ہم آپ کو یہ۔ ی طرح منع کر دیتے۔''

''کیوں خیریت کیا بات ہے؟'' رانا بختیار نے چونک کر پوچھا۔

نوجوان سمر ہاؤس میں آ کر بے قابو ہو گئے تھے۔ویسے راجا امیر علی شاہ کی دونوں بیٹیاں زویا اور فری تو راستے میں اس علاقے کے مناظر کو دیکھ کر بے خود ہو گئیں۔اور آپس میں گفتگو کرتی ہوئی آ رہی تھیں۔ان میں سے ایک نے کہا۔

یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے بہت سے ممالک پھولوں کے ممالک کہلاتے ہیں۔بعض ملکوں میں پھول قومی حیثیت رکھتا ہے۔میں نے ایک بار ڈنمارک دیکھا تھا۔ڈنمارک میں پھولوں کی اتنی فراوانی کہ بعض اوقات مذاق محسوس ہونے لگتا تھا۔یہاں تو جدھر دیکھو ایسا لگتا ہے جیسے زمین کے بجائے پھول ہی اُگے ہوئے ہوں۔سمر ہاؤس میں بھی یہی کیفیت تھی۔حسین وجمیل کشادہ عمارت چاروں طرف سے درختوں میں گھری ہوئی تھی لیکن پھولوں کی بیلیں ان درختوں کے تنوں پر اس طرح چڑھ گئی تھیں۔جیسے باقاعدہ ان کی ڈیکوریشن کی گئی ہو اور درختوں کے تنوں کو پھولوں کا لباس پہنا دیا گیا ہو۔یہ عجیب وغریب ساخت کے پھول تھے جو بیلوں میں کھلتے تھے اسکے علاوہ نیچے بھی یہی کیفیت تھی' دونوں سائیڈوں میں لان بنے ہوئے تھے اور ان کے کنارے پھولوں سے اس طرح لہلہا رہے تھے کہ جیسے ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے ہوں۔فری نے یہاں بھی آنے کے بعد کہا۔

''لگتا ہے پھولوں کے آبشار گر رہے ہوں۔'' رانا نے ملازم کی یہ بات سن کر لڑکیوں کو نوجوانوں کے ساتھ اندر بھیج دیا اور وہ سب ہنستی ہوئی' قہقہے لگاتی ہوئی سمر ہاؤس کی خوب صورت عمارت کی جانب چل پڑیں۔راجا امیر علی شاہ بھی چلا جائے تاکہ ملازم یوسف خاں سے اکیلے میں بات ہو سکے لیکن راجا صاحب نے بھی ملازم کی بات سن لی تھی۔بہر حال رانا بختیار نے سب کے جانے کے بعد کہا۔

''ہاں یوسف خاں۔کیا بات ہے۔تم تو ایک اچھے خاصے آدمی ہو ایسی عجیب بات کی ہے تم نے کہ میں حیران رہ گیا ہوں۔''

''سرکار بات اتنی ہی عجیب ہے' ہم پڑھے لکھے آدمی تو ہیں نہیں اور ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ بھی نہیں تھا کہ ہم آپ کو اس بارے میں خبر بھجواتے۔''

''اب زیادہ تجسس مت پیدا کرو' بتاؤ کیا قصہ ہے۔''

''ہمارے سارے علاقے آسیب زدہ ہو گئے ہیں۔''

''کیا۔'' رانا بختیار نے سخت نگاہوں سے یوسف خاں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی سرکار' جنگلوں کے سرے پر' جہاں ہماری کاشت ہوتی ہے' آسیبوں نے قبضہ جما لیا ہے۔''

''کیسے آسیب۔''

''سرکار وہ درندوں کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔اتنے بڑے بڑے درندے کہ انسانوں نے کبھی نہ دیکھے ہوں اور اگر ان درندوں کے سامنے کوئی آ جاتا ہے تو بس اس کی خیر نہیں ہوتی۔بستی کے چار آدمی ایک ایک کر کے ان درندوں کا شکار ہو چکے ہیں۔کئی بار ان درندوں نے بستیوں کے آس پاس بھی حملے کیے ہیں اور جانوروں' گھوڑوں اور یہاں تک کہ بیلوں کو بھی ہلاک کر دیا ہے۔''

''کیسے درندے ہوتے ہیں یہ۔''

''لوگوں کا یہی کہنا ہے کہ اتنے اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ جیسے شیر' چیتے اور ریچھ پہلے کبھی نہیں دیکھے گئے۔''

''تم نے دیکھا ہے۔''

''نہیں سرکار۔''

''سنا ہے بس۔''

''جی۔''

''کس سے۔''

''سرکار بستی کے جو لوگ ہلاک ہوئے ہیں ان کی تدفین میں ہم بھی شریک ہوئے تھے۔سارے کے سارے ہمارے جاننے والے ہی تھے اور سرکار صاف نظر آتا کہ انہیں وحشی درندوں نے ہلاک کیا ہے۔انہوں نے ان کی پسلیاں تک چبا ڈالی تھیں۔بدن کے پورے پورے حصے غائب کر دیے تھے۔پھر بستی کے لوگوں نے بھی ان درندوں کو دیکھا۔''

''کیا ان درندوں کا شکار کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی۔'' رانا بختیار نے پوچھا۔

''سرکار بستی کے لوگ کناروں پر پہرے دیتے ہیں اور ان میں سے کچھ نے ایک آدھ بار درندوں پر حملہ کرنے کی کوشش کی ہے۔لیکن درندے اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ پھر وہ ڈر کر اپنی آبادیوں ہی میں گھس جاتے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ اپنے اپنے گھروں میں۔''

''درندوں نے بستی میں کسی کے گھر کو نقصان پہنچایا۔''

''ابھی تک تو نہیں سرکار۔''

''مگر تم یہ کیسے کہہ رہے ہو کہ یہ علاقہ آسیب زدہ ہو گیا ہے۔''

''سرکار یہی کہتے ہیں اب لوگ کہ یہ اصلی درندے نہیں ہیں۔ بلکہ درندوں کی روحیں ہیں جو علاقوں میں بھٹکنے لگی ہیں۔''

''اوہ بکواس بالکل بکواس۔ ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔'' رانا بختیار خاموش ہو گیا'' چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے کہا۔

''بعد میں بات کروں گا تم سے۔ انتظامات کی کیا کیفیت ہے۔''

''سرکار ہر چیز موجود ہے اور آپ حکم کریں تو سب کچھ بازار سے آ جائے گا۔ ابھی تو بستی کے بازار کھلے ہوں گے۔''

''ہوں۔ میں ملازم کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ اسے ساتھ لے کر بستی نکل جانا اور نمبردار کو میری آمد کے بارے میں بتا دینا۔ وہ ساری خریداری کرا دے گا اور اس سے کہنا کہ وہ رات کو میرے پاس آ جائے۔''

''جی سرکار'' یوسف خاں نے جواب دیا اور رانا بختیار اندر چل پڑا۔ راجا امیر شاہ نے کہا۔

''یہ کیا ہے رانا بختیار۔ کیا کہہ رہا تھا یہ شخص جو کچھ یہ کہہ رہا تھا کیا یہ سچ ہے۔'' رانا بختیار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحوں خاموشی رہی پھر وہ بولا۔

''ابھی اس کی تصدیق نہیں کی جا سکتی۔ نمبردار آ جائے تو اس کے بعد پتا چل جائے گا۔''

''ویسے کیا یہ خطرناک بات نہیں ہے۔''

''ہاں ہے تو لیکن فکر کی بات نہیں ہے۔ کیا تم پریشان ہو رہے ہو راجا امیر شاہ۔''

''نہیں بس ایسے ہی سوچ رہا تھا۔ بچے ساتھ ہیں ناں۔ ویسے میں خود شکاری رہ چکا ہوں اور میں نے بہت بار مختلف علاقوں میں شکار کھیلا کوئی حرج نہیں ہے۔ بس ذرا بچوں کے سلسلے میں احتیاط برتیں گے دیکھ لیں گے تمہارے ان آسیبی درندوں کو بھی۔''

ملازم یوسف خاں کے ساتھ چلا گیا تھا۔ پھر جب وہ واپس آیا تو شام کے جھٹپٹے فضاؤں میں اتر آئے تھے اور موسم ابر آلود ہو گیا تھا۔ بستی کا نمبردار جو رانا بختیار کا ملازم تھا۔ بہت سا سامان ساتھ بھر کر لایا تھا۔ جس میں کھانے پینے کی اشیا کے انبار تھے۔ مہمان چونکہ کافی تعداد میں آ گئے تھے اور یوسف خاں نے نمبردار کو بتا دیا تھا اس لیے نمبردار بھی بہت سی چیزیں لے آیا تھا۔ باقی کے لیے اس نے سوچا تھا کہ دن میں لے آئے گا ادھر لڑکے لڑکیاں باہر پھولوں کے کنج میں چہلیں کر رہے تھے اور بڑا ہنگامہ ہو رہا تھا۔

امیر علی شاہ' رانا بختیار کے ساتھ نمبردار کے پاس آ بیٹھا۔ رانا بختیار نمبردار کو بتانے لگا کہ یہاں ان لوگوں کا قیام خاصے عرصے تک رہیگا۔ ضروری سامان مہیا کرے اور نمبردار نے گردن جھکا دی۔ پھر مطلب کی بات آ گئی۔ رانا بختیار نے کہا۔

''اور میں یہ کیا کہانیاں سن رہا ہوں۔ یوسف خاں نے مجھے آسیبی درندوں کی کہانی سنائی تھی۔''

''جی رانا صاحب! ان دنوں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اور سوچنے والوں کی عقل حیران ہے۔ حالانکہ درندے کبھی ان علاقوں کا رخ نہیں کرتے تھے اور ان سے پہلے ایسے واقعات نہیں ہوتے تھے لیکن اب تک چار آدمی ہلاک ہو چکے ہیں اور ان عجیب و غریب درندوں کو بستی کے آس پاس بھی منڈلاتے ہوئے دیکھا گیا ہے لوگوں نے ان پر حملے بھی کیے ہیں۔ لیکن درندے بھاگ جاتے ہیں۔''

''تم نے دیکھا ہے انہیں۔''

''جی سرکار۔ ایک بار ایک ریچھ دیکھا تھا۔ سرکار بڑا عجیب لگتا ہے۔ اس کا قد کوئی دس فٹ کے قریب ہوگا۔ رنگ گہرا کالا تھا اور وہ جھومتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ سرکار آنکھوں سے آگ برستی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ ہم نے خود دیکھا تھا۔ دیکھ کر دل پر ہیبت طاری ہوئی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ آسیبی درندے ہی لگتے ہیں۔ کیونکہ سرکار اتنے بڑے درندوں کو پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ ویسے بستی والوں نے اور بھی درندے دیکھے ہیں ایک ببر شیر دیکھا سرکار۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ مسجد کے گنبد سے تھوڑا ہی چھوٹا سر تھا اسکا اور لمبائی بھی زیادہ تھی۔ بڑی تیزی سے دوڑتا ہوا چلا گیا تھا۔''

''کوئی ایسا دلیر نہیں تھا تمہاری بستی میں جوان درندوں کا سراغ لگاتا۔''

''نہیں سرکار...... تھے اور ہیں بھی آپ پٹھان خان کو جانتے ہیں پٹھان خان کے دونوں بیٹے بڑے جی دار ہیں۔''

''ہاں۔ وہ تو مجھے معلوم ہے۔''

''سرکار! ایک بار انہوں نے بہت دور تک درندے کا پیچھا کیا تھا سمجھ دار لڑکے ہیں۔ پڑھے لکھے بھی ہیں۔ ایک عجیب بات بتائی انہوں نے۔''

''کیا؟''

''جس جگہ درندے بھاگے تھے وہاں زمین کچی تھی۔ وہ لوگ زمین پر درندوں کے پیروں کا سراغ لگانے لگے۔ انہوں نے یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ درندوں کے پاؤں کتنے کتنے بڑے ہیں۔ لیکن سرکار ان لوگوں کا کہنا ہے کہ پاؤں کے نشانات ہی نہیں بنتے ان کے۔ بعد میں دوسرے لوگوں نے بھی یہ کوشش کی تھی۔ زمین پر مٹی بچھائی تھی سرکار! اور درندے اس مٹی پر آئے بھی تھے لیکن پیروں کے نشانات نہیں بنے ان کے۔ بس اسکے بعد سے یہ بات مشہور ہوئی تھی۔ کہ وہ درندے ہیں ہی نہیں بلکہ جنگل کی بلائیں ہیں۔ جو یہاں تباہی مچا رہی ہیں اور اپنے قریب آنے والوں کو زندہ نہیں چھوڑتیں۔ سرکار یہ بات خاص طور سے محسوس کی گئی ہے کہ وہ صرف راستے میں ہی آ جانے والوں کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ لیکن بستی کے کنارے کنارے اکثر وہ شکار کی تلاش میں نکل آتی ہیں البتہ بستی کے کسی گھر میں گھس کر ابھی تک انہوں نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ ویسے اور بھی بہت سے کام ہو رہے ہیں۔''

''کیا۔''

''کچھ جھاڑ پھونک والے بلائے گئے ہیں سرکار جو عمل پڑھ کر جنگل پر دم کر رہے ہیں۔ اور ان بلاؤں کو بھگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بستی میں کافی افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔ تین گھر تو خالی ہی ہو گئے ہیں

اور کچھ لوگ گھر چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں جس کو موقع ملا ہے۔ بستی میں یہ باتیں بھی ہو رہی ہیں سرکار کہ اگر ان بلاؤں نے بستی میں گھس کر انسانوں کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا تو سرکار ان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکے گا۔"

"کیا ان بلاؤں پر گولی چلانے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔"

"نہیں سرکار۔ ایسا ابھی تک نہیں کیا گیا۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے نمبردار اب تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔"

"وہ' سرکار گھر والوں نے کہہ دیا تھا کہ رات میں واپس نہ آنا اگر اجازت ہو جائے تو یہیں کہیں کسی جگہ پڑے رہیں گے۔ کل صبح ہی صبح نکل جائیں گے۔"

"ضرور ضرور نمبردار یہ کوئی کہنے کی بات ہے۔ معافی چاہتا ہوں کہ میں نے تم سے جانے کے لیے کہا۔ آرام سے رہو۔ بلکہ یہ اچھا ہوگا کہ تم یوسف خان کو ساتھ لے کر ہی نکل جاؤ اور سامان وغیرہ یہاں پہنچا دو۔"

"جی سرکار۔ بہت بہت شکریہ۔"

یوسف خان نمبر دار کو آرام کرنے کے لیے کوئی اچھی سی جگہ دو اور اس کی ضرورت کا خیال رکھو۔" رانا بختیار نے کہا اور اس کے بعد راجا صاحب کے ساتھ ایک گوشے میں جا بیٹھا۔ راجا امیر علی شاہ کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آ رہے تھے۔ وہ بچوں کو کھیلتے کودتے دیکھ رہا تھا۔ ان سب نے خاص طور سے راجا شیر بدر کو اپنا نشانہ بنا رکھا تھا۔ پتا نہیں زویا کی کیا کیفیت تھی۔ بہرحال چونکہ یہ لوگ ان سے کافی دور تھے۔ اس لیے صحیح صورت حال کا اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ راجا امیر علی شاہ نے کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں رانا! کہ لندن بہت حسین شہر ہے۔ وہاں زندگی میں ایک الگ حسن ہے لیکن یہ روایات۔ یہ قصے کہانیاں۔ مشرق ہی کا حصہ ہیں اور ان کا اپنا ایک الگ مقام ہے۔ ویسے میں تمہارے چہرے پر تشویش کے آثار دیکھ رہا ہوں اور اس تشویش کو سمجھتا بھی ہوں۔"

"کیا...... رانا بختیار نے سوال کیا۔

"ظاہر ہے تم یہاں ہمیں اس لیے لائے ہو کہ علاقے کی سیر و سیاحت کراؤ۔ ویسے یہ سمر ہاؤس واقعی تم نے بے مثال بنایا ہے اور میں تمہارے اعلا ذوق کا دل سے قائل ہو گیا ہوں۔ لیکن میرے دوست فکر نہ کرو۔ ضروری تو نہیں ہے کہ جنگل گردی ہی کریں۔ کچھ وقت یہاں گزارو جس طرح بھی مناسب سمجھو اس کے بعد جس وقت چاہیں گے یہاں سے واپس نکل چلیں گے۔ شہری زندگی بھی تو بری نہیں ہے۔"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے لیکن اصل مسئلہ یہ نہیں ہے۔ اصل مسئلہ کچھ اور ہے۔"

"کیا ہے؟"

"بتاؤں گا میں تمہیں۔ کچھ ایسے خیالات ہیں میرے دل میں جن کی تصدیق ہو جائے تو بات ذرا بہتر ہو جائے گی۔" رات کے کھانے کے بعد رانا بختیار نے ایک بار پھر نمبردار کو طلب کر لیا۔ راجا امیر علی شاہ اب کیونکہ ان سارے واقعات کا راز دار ہو چکا تھا اس لیے اس سے پرہیز مناسب نہیں تھا۔ نمبردار ادب سے سامنے آ بیٹھا۔

"نمبردار ایک بات بتاؤ۔"

"جی سرکار۔"

"درندے عام طور سے کس سمت دیکھے جاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ جو ہلاکت کے واقعات ہوئے ہیں۔ کیا وہ مغربی حصے کی طرف ہوئے ہیں اور درندوں کی آمد کے علاقے پر غور کر لیا گیا ہے۔"

"جی سرکار۔ مگر آپکو یہ بات کیسے معلوم ہوئی۔" نمبردار نے حیرت سے کہا۔

"اصل میں تم بہت سیدھے آدمی ہو۔ حالات پر غور نہیں کرتے مغربی علاقے کا دوسرا حصہ کس کی ملکیت ہے۔"

"فیروز خان کی سرکار۔" نمبردار نے کہا اور پھر ایک دم سے اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے رانا بختیار کو دیکھنے لگا۔ رانا بختیار بھی اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا اس نے کہا۔

"جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں شاید تم سمجھ گئے ہو نمبردار۔"

"سرکار! کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ فیروز خان نے کوئی ایسی بات کی ہے۔"

"کیا اس بات کے امکانات نہیں ہو سکتے۔"

"سرکار۔ فیروز خان ویسے تو سب کچھ کر سکتا ہے۔ لیکن یہ درندے اس نے کہاں سے منگوا لیے اور انہیں ان علاقوں میں کیسے چھوڑ دیا۔ سرکار یہاں بات ذرا دوسری ہو جاتی ہے۔ حالانکہ ہم نے نہیں سوچا تھا کہ فیروز خان ایسی کوئی حرکت کر سکتا ہے۔"

"وہ بہت تیز اور چالاک آدمی ہے میں کسی پر بلا وجہ الزام نہیں لگا رہا لیکن ایسا عمل کیا جا سکتا ہے۔ فیروز خان اس سے پہلے بھی کئی بار اس طرح کی حرکتیں کر چکا ہے۔"

"سرکار۔ وہ تو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مگر یہ آسیبی درندے اگر آپ کی سمجھ میں کچھ آتا ہے تو ہمیں بتا دیجیے۔"

"نہیں ایسے سمجھ میں تو نہیں آئے گا۔ لیکن چیک کرنا پڑے گا۔ فیروز خان کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"جی سرکار۔"

"ٹھیک ہے جاؤ تم آرام کرو۔" بعد میں راجا امیر علی شاہ نے پوچھا۔

"یہ فیروز خان کون ہے۔"

"دوسری طرف کے علاقے کا زمیندار۔" رانا بختیار بے اختیار مسکرا پڑا پھر بولا۔

"کتنا عرصہ ہو گیا راجا صاحب! تمہیں لندن میں منتقل ہوئے۔"

"بیس سال سے زیادہ۔" راجہ امیر علی شاہ نے جواب دیا۔

"تب تو تم مشرق کی تمام روائتیں بھول گئے ہو گے۔"

"نہیں...... روایت تو نہیں بھولا۔ بیس سال تو بہت ہوتے ہیں۔ بلکہ بیس سال کی بات میں غلط کہہ رہا ہوں۔ غالباً چھبیس سال ہو گئے مجھے۔ اس کے بعد میں نے لندن ہی کی فضاؤں میں زندگی گزاری ہے۔ اصل میں یہاں سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا اور سچی بات ہے دل بہت چاہتا تھا کہ اپنے وطن واپس آؤں۔ لیکن اسی لیے واپس نہیں آیا تھا۔ کیونکہ اپنا کوئی یہاں تھا ہی نہیں اب جب کہ تم ملے اور مجھے یہ احساس

ہوگیا کہ خلوص دل سے مجھے دعوت دے رہے ہو تو سارے بچے میری اس آرزو میں شریک ہو گئے۔ بہر حال مطلب یہ ہے کہنے کا کہ طویل عرصے سے اپنا وطن اور اس کی روایت سے کٹا ہوا ہوں۔''

''میں تمہیں یہ روایت ضرور یاد دلاؤں گا۔ پرانے دور میں لوگوں کے پاس بڑا وقت ہوا کرتا تھا۔ وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ مختلف مشغلے ہوا کرتے تھے۔ خاص طور سے ایسے لوگوں کے پاس جن کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ کرنے کے لیے کوئی کام نہیں ہوتا۔ ہر چیز کے لیے ملازم موجود ہوا کرتے تھے۔ بٹیریں لڑاتے تھے۔ تیتر لڑاتے تھے۔ کتے لڑاتے تھے۔ غرض نہ جانے کیا کیا کرتے تھے۔ خود لڑنے کا اگر شوق تھا۔ تو مقدمے بازی وغیرہ کر لیا کرتے تھے۔ دشمنی لازمی تھی۔ دوست کتنے ہی ہوں اگر دو چار دشمن خانہ ہوں تو دل کیسے لگے۔ بس یوں سمجھ لو فیروز خان بھی ایک ایسا ہی درخت ہے۔ جو بہت قدیم ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''غالباً فیروز خان کے پردادا کے دور کی بات ہے ظاہر ہے اس وقت میرے دادا بھی حیات تھے۔ زمینوں کے مسئلے پر جھگڑا ہوا۔ دشمنی کی بنیاد پڑ گئی۔ سال چھ مہینے میں دو چار قتل ہو جایا کرتے تھے۔ اس دشمنی کی بنیاد پر کوئی سال اگر خالی چلا جاتا تو دونوں ٹیمیں اداس ہو جاتی تھیں کہ کسی کا بھی خون نہیں بہا۔ بہر حال جہاں جائدادیں، زمینیں، ورثہ دولت وغیرہ کی شکل میں منتقل ہوتا۔ وہیں مرنے والے کی وصیت بھی ورثے میں ملتی تھی اور وصیت یہ ہوتی تھی کہ فلاں دشمن کو نقصان پہنچائے بغیر سمجھ لو تمہاری شخصیت مکمل نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہ ورثہ منتقل ہوتا ہوا مجھ تک پہنچا ہے اور وصیت میں فیروز خان ملے ہیں۔'' رانا بختیار نے کہا اور اس کے انداز پر راجا امیر علی شاہ ہنس پڑا پھر بولا۔

''ذرا کچھ اور تفصیل۔''

''پہاڑوں کے پار کی زمینوں کا بڑا حصہ فیروز خان کی ملکیت ہے اور فیروز خان اسی پردادا کی اولاد ہے۔ جس سے میرے پردادا کی دشمنی کا آغاز ہوا تھا۔ وہ بھی رسم دشمنی نبھا رہا ہے اور میں بھی۔ لیکن یار بس قتل وغارت گری سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور شاید یہ نسل اس دشمنی میں زیادہ کامیاب نہ رہ سکے۔ فیروز خان بھی کچھ ٹھنڈے مزاج کا آدمی ہے۔ بس چالیں چلتا رہتا ہے۔ مختلف قسم کی۔ برسات میں پانی کے ایسے بند بنا دیتا ہے کہ ہماری نہروں میں زیادہ پانی نہ آسکے۔ ہم آدمی بھیجتے ہیں بند تڑوا دیتے ہیں خفیہ طور پر، کھلے عام جس دن بھی ایسا ہو سکا۔ اس دن اس دشمنی کو خون مل جائے گا۔ لیکن چونکہ فیروز خان نے خود ایسی کوئی کوشش نہیں کی اس لیے میں نے بھی احتیاط رکھی اور لوگوں کو ہدایت کر دی ہے کہ جہاں تک موقع ملے قتل وغارت گری سے پرہیز کیا جائے۔ فیروز خاں خود بھی کافی نارمل آدمی ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ بھی پیچھے ہٹتا رہا ہے۔ جہاں خوں ریزی کا خطرہ ہو۔''

''بہت دلچسپ...... بہت ہی دلچسپ۔'' راجا امیر علی شاہ نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

''یعنی اس میں دلچسپی کی بات کیا ہے؟''

''بھئی دوستیاں تو نبھائی ہی جاتی ہیں...... دشمنی نبھانا بھی ایک عمل ہے۔ مزے کی بات ہے۔''

''ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن اس وقت صورت حال ذرا سنجیدہ شکل اختیار کر چکی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''یہ انوکھے درندے، کچھ سمجھ میں آتا ہے۔''

''بالکل نہیں۔''

''اور ان سے متعلق روایات پر مجھے تو ایک شبہ ہے راجا امیر علی شاہ۔''

''کیا۔''

''فیروز خاں نے جدید ماحول سے فائدہ اٹھایا ہے اور کوئی نئی سازش تیار کی ہے۔ خیر میں تو یہ نہیں کہتا کہ بستی والے درندوں کے سائز کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں وہ سچ ہے لیکن اس بات کے امکانات ہیں کہ یہ درندے کسی اور جنگل سے ہانک کر یہاں لائے گئے ہوں او فیروز خان ان کے ذریعے اپنی کاروائی کر رہا ہوں۔''

''یعنی وہ درندے فیروز خان یہاں بھیجتا ہے۔''

''امکان ہے اس بات کا۔''

''مگر کیسے ممکن ہے یہ۔''

''اب یہی تو دیکھنا ہے کہ کیسے ممکن ہے۔''

''بستی والوں پر یقین کرتے ہو۔''

''نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''بستی والے بے چارے سیدھے سادھے معصوم لوگ ہیں۔ بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا ان کی ہابی ہوتی ہے۔''

''ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ درندے بے شک ہوں گے۔ آگئے ہوں گے۔ لیکن میرا تو یہ خیال ہے رانا کہ تم فیروز خان کے بارے میں مت سوچو ہو سکتا ہے جنگل میں درندے کہیں سے آگئے ہوں۔''

''فیصلہ کن بات تو نہیں کی میں نے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو اور ہم فیروز خان کے بارے میں غلط سوچ رہے ہوں۔''

''تو پھر اب کیا ارادہ ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''کیا ان درندوں کے بارے میں تحقیقات نہیں کرو گے۔''

''یار! برا مت ماننا راجا امیر علی شاہ! ہم تو پشتوں سے زمیندار ہیں اور ایک ہی شوق ہے ہمارا، کہ اگر کوئی ایسا معاملہ آئے تو پیٹھ دکھا کر بھاگیں نہیں اس کا سینہ تان کر مقابلہ کریں۔''

''تو اس میں میرے برا ماننے کی کیا بات ہے۔''

''اگر اس مسئلے کو میں نے نظر انداز کیا تو صرف تمہاری وجہ سے۔''

''کیوں؟''

"اس لیے کہ تمہارے ساتھ بچے بھی ہیں انہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔"

"نہیں دلیری اور بزدلی قدرت کی دین ہوتے ہیں۔ میں اگر تم سے یہ کہوں کہ میرے بچے بھی بزدل نہیں ہیں تو تمہیں یقین کرنے میں کوئی عار نہیں ہونی چاہیے۔"

"نہیں راجا امیر علی شاہ خدانخواستہ ان الفاظ سے تمہاری توہین مقصود نہیں ہے مجھے بس مہمان ہو اس لیے تمہارا تحفظ کرنا چاہتا ہوں۔"

"دیکھو لندن میں زندگی بالکل مختلف ہے۔ وطن کی یادیں، وطن کی ثقافت ہی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ہم یہاں کی مختلف زندگی دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ تم چاہو تو بچوں سے بھی مشورہ کر لیتا۔ بلکہ میں اگر ایک بات کہوں تم سے تو غلط نہیں ہوں گی۔"

"کیا۔"

"بچوں کو بھی اس بارے میں بتا دو۔"

"پھر اس سے کیا ہوگا۔"

"ہوں۔ انکا مشورہ۔" رانا بختیار نے کہا۔

"نہیں ڈیئر رانا۔ یہاں مجھے تم سے اختلاف ہے۔"

"کیا۔"

"بچوں کو ہر حالت میں اعتماد میں لینا چاہیے۔"

"خیر میں اس سے انکار نہیں کرتا۔ چلو ٹھیک ہے، مشورہ کر لیں گے ان سے۔" دوسرے لوگ جس طرح یہاں کے ماحول سے لطف اندوز ہو رہے تھے وہ دیکھنے کے قابل تھا۔ لڑکے لڑکیوں کی بہت تعداد جن میں سے زیادہ تر رانا بختیار ہی کے بیٹے بیٹیاں تھے۔ کوٹھی میں گھومتے پھر رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گھاس نے خوش نما رنگین پھول بکھیر دیے ہوں۔ وہ سب بے حد مصروف نظر آ رہے تھے حالانکہ راجا شیر بدر سب کی نگاہوں کا مرکز تھے اور ان کی دلچسپ باتیں ماحول کو زعفران زار بنائے ہوئے تھیں لیکن پھر بھی لڑکے لڑکیاں صرف زویا کی وجہ سے احتیاط کر رہے تھے، راجا شیر بدر کوئی نہ کوئی ایسا شگوفہ چھوڑ دیتے کہ سب کے پیٹ ہنستے ہنستے دکھنے لگتے لیکن بہرحال احتیاط رکھی جا رہی تھی البتہ زویا قریب نہ ہوتی تو شیر بدر کے بارے میں دلچسپ فقرے سننے کو مل جاتے تھے۔

رات کا کھانا لگایا گیا۔ سارا اہتمام ہو گیا تھا اس جنگل میں منگل منانے کا۔ کھانا بھی شان دار بنایا تھا نمبردار نے۔ کھانا پکانے والوں کو بھی بھیج دیا تھا۔ چند ملازموں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ ساری ہدایات نمبردار کو رانا بختیار نے دی تھیں۔ بہرحال کھانے کی میز پر بڑی لمبی نشست تھی اور بڑا اعلا کھانا تیار کیا گیا تھا۔ کھانے سے فراغت کے بعد بچوں نے خود ہی بزرگوں کو گھیر لیا۔ رانا بختیار کے بیٹے اور راجا شیر امیر علی شاہ کی دونوں بیٹیاں بھی تھیں ایک کونے میں شیر بدر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ سب اس خوفناک بلا کی طرف متوجہ تھے۔ ہول ناک چیتا بالکل ہی مختلف سمت تیز رفتاری سے چھلانگیں لگا رہا تھا۔ ویسے بھیڑیں چرانے والے کی طرف اس کا رخ ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ پتا نہیں اس کا

کوئی ٹارگٹ تھا یا پھر یونہی۔ پھر کافی دور جانے کے بعد چیتا اچانک رکا۔ زمین پر اس کے پنجے جمے تو تھوڑی گرد اڑی اور پھر اس کے بعد وہ پھر اسی رفتار سے واپس دوسری سمت مڑ گیا۔ امیر شاہ نے آہستہ سے کہا۔

"اگر اس نے اس بھیڑیں چرانے والے کی طرف رخ کر لیا تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ وہ تو اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتا۔"

"ہاں۔ یہ راستے تبدیل کر رہا ہے اور کسی بھی لمحے اس کا رخ کسی بھی طرف ہو سکتا ہے۔ وہ ادھر بھی آ سکتا ہے۔ چیتا پنجے جما جما کر واقعی بار بار اپنا رخ تبدیل کر رہا تھا اور اس طرح رخ تبدیل کرنے کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے باقاعدہ کسی اسٹیئرنگ سے کنٹرول کیا جا رہا ہو اور اس میں اس کی مرضی کا کوئی دخل نہ ہو۔ وہ لوگ گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس وقت یہ ہیبت ناک منظر سب لوگوں کو ساکت کرنے کے لیے کافی تھا ان کی رگوں میں خون جم گیا تھا۔ شوخ شریر لڑکے لڑکیاں دہشت زدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے اور ان کے سانس رکے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ راجا شیر بدر بھی خاموشی سے بیٹھے ہوئے تھوک نگل رہے تھے اور سانسیں تک آہستہ آہستہ لے رہے تھے کہ کہیں چیتے کی توجہ ان کی جانب نہ ہو جائے اور پھر یہی ہوا اس بار چیتے نے ان پہاڑیوں کی طرف رخ تبدیل کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ رانا بختیار نے اپنے گارڈز کو ہوشیار کر دیا۔ اس کی آواز ابھری۔

"ہوشیار...... جیسے ہی وہ اس سمت آنے لگے اس پر فائرنگ شروع کر دی جائے ابھی اس کے الفاظ ختم نہیں ہوئے تھے۔ چیتے نے ادھر ہی کا رخ کر لیا تھا اور اچانک ہی اس پر فائر کھول دیا گیا۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ نے ہیبت ناک فضا میں ایک عجیب سی ہول ناک گونج طاری کر دی درندہ اپنی جگہ رکا اور پھر اچانک اس نے اونچی اونچی چھلانگیں لگانا شروع کر دیں۔ اس کا رخ تبدیل ہو گیا تھا وہ سب عجیب نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے اور درندے کی اس کیفیت کا جائزہ لے رہے تھے۔ گولیاں مسلسل چلائی جا رہی تھیں اور یہ اندازہ تک نہیں ہو پا رہا تھا کہ چیتا گولیوں کی رینج میں ہے بھی یا نہیں لیکن وہ یہ ضرور دیکھ رہے تھے کہ وہ بار بار رخ بدل رہا ہے۔ یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ وہ خود بھی گولیوں کی آواز سے خوف زدہ ہے۔ یہ سنسنی خیز ماحول کافی دیر تک قائم رہا اور پھر رانا بختیار کی ہدایت پر اسٹین گن برداروں نے گولیاں چلانا بند کر دیں۔

درندہ پھر اپنی جگہ رکا اور پھر اچانک اس نے اسی خیمے کی جانب رخ کیا اور دوسرے لمحے وہ خیمے میں داخل ہو گیا پھر ایک اور منظر نگاہوں کے سامنے آیا۔ اچانک ہی خیمہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا وہ سب دیوانوں کی طرح پراسرار منظر دیکھ رہے تھے جو کوئی فلمی منظر ہی معلوم ہوتا تھا حقیقت سے اس کا تعلق نہیں لگ رہا تھا اسی وقت نہ جانے صوفی کو کیا سوجھی کہ اس نے اس طرف دوڑ لگا دی۔ جہاں خیمہ لگا ہوا تھا۔

"ارے ارے روکو اسے روکو...... روکو اسے۔" راجا امیر علی شاہ نے مضطرب انداز میں کہا۔

"روکو وہ کہیں دوبارہ نمودار نہ ہو جائے۔" رانا بختیار خود بھی سہما ہوا تھا۔ لیکن کرنل رحیم شاہ سرد نگاہوں سے علاقے کا جائزہ لے رہا تھا۔ صوفی اس جگہ پہنچ چکا تھا جہاں خیمہ لگا ہوا تھا۔ پھر وہ وہاں سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس سمت آنے لگا جدھر درندہ آیا تھا۔ وہ زمین پر جگہ جگہ نشانات تلاش کر رہا تھا۔ اور وہ لوگ

محسوس کر رہے تھے کہ یہ اونٹ کا ماموں زاد بھائی اس وقت انتہائی پھرتیلا اور چوکس نظر آ رہا ہے۔

اچانک ہی راجا امیر شاہ نے رانا بختیار کے کان کے پاس سرگوشی کی۔

''اس آدمی نے تو چونکا دیا ہے۔''

''کک...... کک...... کس نے؟''

''اسی لمبے اونٹ کی بات کر رہا ہوں ذرا اس کے بدن میں تڑپتی ہوئی بجلیوں کو تو دیکھو ویسے تو یہ ایک بغیر ہڈی کی جونک معلوم ہوتا ہے لیکن اس وقت اس کی پھرتی قابل دید ہے۔''

''ہاں۔ ہے کچھ۔'' رانا بختیار بے خیالی کے انداز میں بولا۔

''وہ کوئی معمولی شخصیت نظر نہیں آتی رانا۔''

''ہاں...... وہ کوئی معمولی شخصیت نہیں ہے۔'' رانا بختیار نے آہستہ سے کہا۔

''میں واقعی اس سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں۔''

''اور اس لڑکی کو نہیں دیکھ رہے تم جو لگتا ہے کہ جیسے کسی شادی کی تقریب میں شریک ہو۔''

''سارے ہی عجیب ہیں۔'' اچانک ہی صوفی ان کے پاس پہنچ گیا۔

''درویش رحم کریں مجھے پتا نہیں کیا کیا داستانیں یاد آ رہی ہیں۔ کرنل صاحب آپ کو معلوم ہے کہ جب غول بیابانی جنگلوں میں گشت کرتے ہیں تو اپنے پیچھے بڑی بڑی عجیب چیزیں پھینک جاتے ہیں۔''

''کہاں کی باتیں کر رہے ہیں آپ صوفی صاحب! آپ تو بالکل اس طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ جس طرح دادی اماں کی کہانیاں ہوتی تھیں کہ بڑھیا چاند میں چرخا کاتتی ہے۔'' صوفی ٹھنڈی سانس لے کر منہ چلانے لگا تھا۔

♥......♥......♥

''بھیڑیں چرانے والے نے آنکھیں کھولیں اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ماحول پر مکمل خاموشی اور سنجیدگی کا راج تھا۔ اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی بانسری بہ ظاہر لکڑی کی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن جب اس نے اس میں کچھ سوراخوں کے اندر لگے ہوئے چھوٹے چھوٹے ناب دبائے تو بانسری درمیان سے دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ اب اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لکڑی کی بنی ہوئی نہیں ہے۔ اس نے آہستہ سے ایک بٹن کو دبایا اور بانسری کا بڑا سرا قریب کر لیا۔ کچھ لمحوں کے بعد ایک ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی پھر ایک آواز سنائی دی۔

''ہاں...... کیا بات ہے؟''

''زیرو تھری۔'' بھیڑیں چرانے والے نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں زیرو تھری بولو۔''

''سر! آپ کو ان لوگوں کے بارے میں معلوم ہے۔ جو اس وقت ان جنگلوں میں بھٹک رہے ہیں۔''

''ہاں۔ لیکن یہ مجھے عام لوگ نہیں معلوم ہوتے۔ تمہاری کیا رائے ہے ان کے بارے میں۔''

''سر! بڑے عجیب و غریب لوگ ہیں یہ۔ حد سے زیادہ دلیر ہیں وہ ہمارے سارے کام میں مداخلت کر رہے ہیں۔ انہوں نے ٹیلی کیٹر پر گولیاں چلائی ہیں۔''

''وہی میں تم سے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ٹیلی کیٹر کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا۔''

''نہیں سر۔''

''تم کہاں ہو؟''

''پوائنٹ پر ہوں۔''

''اب کیا پروگرام ہے۔''

''سر! آپ کا حکم سننا چاہتا ہوں۔'' بھیڑیں چرانے والے نے کہا اور تھوڑی دیر کے لیے دوسری جانب خاموشی طاری ہوگئی۔

''نہیں۔ کام مناسب طریقے سے نہیں ہو رہا۔ یہ گڑبڑ میرے لیے غیر متوقع ہے۔''

''حالانکہ سر! ہم لوگ بڑی محنت سے کام کر رہے ہیں۔ یہ علاقے آسیب زدہ مشہور ہوگئے اور لوگ اس طرف نہیں آتے۔ لیکن پھر بھی کچھ سر پھرے ایسے ہیں سر! جوان باتوں کو خاطر میں نہیں لاتے جیسے یہ ٹیم۔''

''عام لوگوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بس اتنا ہی چاہتا ہوں کہ قرب و جوار کی آبادیاں خالی ہو جائیں اور کوئی اس طرف نہ آئے۔ تاکہ ہم اپنا کام خوش اسلوبی سے جاری رکھیں۔''

''سر! یہ آہستہ آہستہ ہی ہوگا۔''

''یہ لوگ آخر ہیں کون؟''

''بہ ظاہر تو سیاح ہی معلوم ہوتے ہیں۔''

''میں بہ ظاہر سے سخت چڑتا ہوں سمجھے۔''

''جی سر! ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔''

''زیادہ وقت نہیں لگنا چاہیے۔ ان علاقوں میں سیاحوں کو بھی نہیں آنا چاہیے۔ تاکہ ہم سکون سے اپنا کام کر سکیں سمجھے۔''

''جی سر...... لیکن بہت زیادہ جلد بازی انتظامیہ کو بھی ہماری طرف متوجہ کر سکتی ہے۔''

''ہاں۔ یہ مجبوری تو ہے۔ بہر حال میں چاہتا ہوں کہ یہ کام جلد از جلد ہو جانا چاہیے ہماری پروڈکشن رکی ہوئی ہے اور تم جانتے ہو کہ دنیا کا ہم پر شدید دباؤ ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ ہم اس کا کام شروع کر دیں۔''

''جی سر! میں جانتا ہوں۔''

''او کے۔ تمہیں زیادہ تیز انداز میں کام شروع کرنا چاہیے۔ او کے۔''

''او کے۔'' اور اس کے بعد سلسلہ منقطع ہوگیا۔

♥......♥......♥

لڑکیاں اور لڑکے خاصے جز بز ہوئے تھے سبھی نے اپنے اپنے تبصرے کیے تھے اور کسی قدر بے چینی کا اظہار بھی کیا تھا کہ آخر ان خوف ناک حالات میں اب یہاں رکنے کی کیا گنجائش ہے۔ آپس ہی میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔

''تم تو بڑی ایڈونچر پسند ہو پھر ہوا کیوں کھسک رہی ہے۔''

''ہوا کھسک رہی ہوگی تمہاری۔ میں تو کہتی ہوں کہ آخر خطرہ مول لینے سے فائدہ کیا ہے۔''

''خطرے کے بغیر بھی بھلا کوئی زندگی، زندگی ہوتی ہے۔''

''تو ٹھیک ہے مرو یہاں ہمیں کیا؟'' ادھر راجا امیر علی شاہ نے بھی کہا تھا۔

''دیکھو لو بھئی...... میں تو خیر ان حالات سے بالکل خوف زدہ نہیں ہوں۔ تم لوگ بچے بچیوں کے بارے میں سوچ لو۔''

''ویسے یہ صوفی صاحب کیا چیز ہیں ذرا ان کا مکمل انٹرویو ہو جائے۔ مجھے تو یہ شخص بہت پراسرار لگتا ہے۔''

''ہم اسے پراسرار اونٹ کہہ سکتے ہیں۔'' راجا شیر بدر نے بھی گوہر افشانی کی۔

''اپنے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے شیر بدر صاحب!'' نہ جانے کیوں کرنل رحیم شاہ کو صوفی کے بارے میں یہ ریمارکس پسند نہیں آئے۔

''میں تو بس ان لوگوں کی وجہ سے خاموش رہا۔ ورنہ آپ چاہیں تو آپ مجھے اس چیتے کے مقابلے میں چھوڑ سکتے ہیں۔''

''خیر...... میں اپنی بیٹی کو بیوہ نہیں کرنا چاہتا۔''

''چیتے کا مقابلہ تو بعد کی چیز ہے۔ جسے یہ پراسرار اونٹ کہہ رہے ہیں۔ یہ اسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

''یہ نا فرمایئے جناب! آپ یقین کیجیے کہ اگر ایک گھونسا میں نے اس کے سر پر جما دیا تو وہ دوبارہ کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہے گا۔'' راجہ شیر بدر نے کہا۔

''ایسی باتیں نہ کیجیے آپ ہمارے مہمان ہیں۔ آپ جو کچھ بھی کہہ رہے ہوں۔ صوفی صاحب کو ان کی جگہ سے ہلا بھی نہیں سکتے۔'' دلاور کو غصہ آ گیا تھا۔

''بلا لیجیے اپنے صوفی صاحب کو اگر میرے ہی ہاتھوں تڑوانا چاہتے ہیں انہیں تو مجھے اعتراض نہیں ہے۔''

''دیکھیے...... ایک بار پھر آپ کو وارننگ دی جا رہی ہے۔ مہمان ہیں اچھی زبان استعمال کیجیے۔'' شازیہ غصے سے بولی۔

''اس سلسلے میں کسی کی نہیں سنوں گا میں، آپ لوگ باتیں ہی ایسی کر رہے ہیں، مجھے چیلنج کیا گیا ہے...... مجھے۔ جس نے پانچ پانچ آدمیوں کو ایک ساتھ بچھاڑا ہے۔''

''اڑے ماں قسم، تمہارا چٹنی بنا کر تمہارے ملک نہ بھجوا دیا تو غلام قادر نام نہیں ہے بابا لوگ اور کچھ نہیں بولے گا۔ ارے پہلے تو تم میرے سے ہی زور لگا لو صوفی صاحب تو بہت بعد کا چیز ہے۔'' دلاور نے کہا۔

''ارے ارے یہ کیا شروع ہو گیا۔ نہیں جناب! میری بھی کوئی عزت ہے میرا وقار ہے۔ میں یہ چیلنج قبول کرتا ہوں۔ جب چاہیں آپ اپنے صوفی صاحب کو میرے مدمقابل لا سکتے ہیں۔ اگر دو منٹ میں چٹنی بنا کر نہ رکھ دی تو میرا نام بھی راجہ شیر بدر نہیں ہے۔ نام بدل دیجیے آپ لوگ میرا۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر آپ کو راجہ شیر بدر نہیں بلکہ راجہ شہر بدر کہا جائے گا۔'' شازیہ بولی۔ صوفی یہاں موجود نہیں تھا۔

''اچھا اچھا دیکھا جائے گا یہ تفریح بھی ہو جائے گی کسی وقت۔'' رانا بختیار نے کہا اور اس کے بعد شازیہ کے کیمرے کی طرف توجہ دی گئی۔ لیکن یہ بھی ایک دلچسپ بات تھی کہ اتنی ساری شوٹنگ کی گئی تھی۔ لیکن چیتے کی ایک بھی تصویر کیمرے میں نہیں آئی تھی۔ سوائے قرب و جوار کے مناظر کے، جو عام سے تھے اور ان میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔''

''ویسے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایشیا میں خاص طور سے پراسرار داستانوں کا وجود بہت زیادہ ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے رانا بختیار کہ یہ واقعی کوئی آسیبی چکر ہی ہو۔''

''صوفی صاحب آ گئے ہیں ذرا اب ان کی بھی رائے لے لی جائے۔'' ان لوگوں نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ وہیں خیمہ زن تھے جب کہ ان واقعات کے بعد کافی حد تک لوگ خوف زدہ ہو گئے تھے۔ لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ کوئی بھی تنہا جانے کو تیار نہیں تھا یہ تجویز پیش کر دی گئی تھی کہ لڑکے لڑکیاں اگر چاہیں تو واپس جا سکتے ہیں۔ لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئے تھے۔

غرض یہ کہ صوفی وہاں پہنچ گیا۔ خاص طور سے راجا امیر شاہ نے اس کی بہت تعریفیں کی تھیں۔

''صوفی صاحب آپ کی دلیری ناقابل فراموش ہے۔''

''بزرگوں کی دعائیں ہیں جناب میرے ساتھ۔''

''آپ بہت زیادہ درویش پرست معلوم ہوتے ہیں۔''

''رکھا کیا ہے حضور والا! اس دنیا میں، آپ لوگ نہیں سمجھتے۔ آپ کی اس سیاسی اور سماجی دنیا کے علاوہ ایک روحانی دنیا بھی ہے۔ یہاں درویشوں کی حکومت قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں نظام کائنات سونپا ہوا ہے۔ ہر عہدہ موجود ہے وہاں درویشوں کی دعاؤں سے اور اپنے اپنے طور پر کام ہوتا ہے۔''

''وہ تو سب ٹھیک ہے صوفی صاحب! لیکن اس سلسلے میں آپ کیا کہتے ہیں۔''

''کیا کہا جا سکتا ہے۔ جب تک کہ صورت حال کی وضاحت نہ ہو جائے۔''

''نہیں میرا مطلب ہے کہ کیا آپ اسے کوئی آسیبی چکر قرار نہیں دیتے۔''

''اگر یہ کوئی آسیبی چکر ہے تو آپ یقین کیجیے کہ ایک چلے کا بھی نہیں ہے۔''

''چلے۔'' راجہ میر شاہ نے حیرت سے کہا۔

''جی ہاں۔ جہاں میں نے چلہ کشی کی یہ رفو چکر ہو جائیں گے۔ نام ونشان بھی نہیں رہے گا ان کا۔''

''ارے تو پھر چلہ کشی کیجیے نا۔''

''کرنل صاحب کے حکم کا انتظار ہے۔'' صوفی صاحب نے کرنل رحیم شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور کرنل رحیم شاہ مسکرانے لگا پھر بولا۔

''صوفی صاحب کے چلے بھی واقعی بڑے جان دار ہوتے ہیں اور انہوں نے یہ الفاظ غلط نہیں کہا کہ یہ جب چاہیں انہیں رفو چکر کر سکتے ہیں۔''

''اور میرے چیلنج کا کیا ہوا۔'' راجا شیر بدر اصل میں لڑکیوں کے سامنے بے بس ہو گئے تھے جواب

انہیں ان کی دانست میں مذاق اڑانے والی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔صوفی نے چونک کر انہیں دیکھا۔ نوجوانوں میں سے ایک نے کہا۔

''صوفی صاحب! راجا شیر بدر صاحب نے آپ کی دلیری سے ناراض ہوتے ہوئے آپ کو چیلنج کیا ہے کہ آپ ان سے جسمانی مقابلہ کریں۔'' صوفی کے انداز میں ایک کھلنڈرا پن پیدا ہوگیا۔اس نے راجا شیر بدر کو نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے کہا۔

''مگر یہ تو ہمارے مہمان ہیں درویشوں کے کرم سے۔''

''بھاگ رہے ہو میدان چھوڑ کر اس طرح دوڑ لگا کر کسی خاص جگہ تک پہنچ جانا الگ بات ہے اور جسم کو جسم کے مقابلے لانا الگ بات میں نے ان سے کہا ہے کہ میں اگر چاہوں تو صوفی صاحب کی کمر درمیان سے توڑ کر دو ٹکڑے کرسکتا ہوں۔'' صوفی کو بھی جوش آ ہی گیا کہنے لگا۔

''اور اگر آپ ایسا نہ کرسکے درویشوں کی دعاؤں سے تو۔''

''تو پھر میرے لیے سزا آپ تجویز فرما دیجیے۔''

''اڑے میں بولتا ہے سزا میرے کو تجویز کرنے دو۔'' غلام قادر نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔

''یہ تو بات طے ہو چکی ہے کہ اگر راجا شیر بدر صاحب ہار گئے تو ان کا نام راجا شہر بدر ہوگا۔شازیہ بولی۔

''ابھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے فرق تو یہ ہے کہ اگر یہ ہار گئے۔تو انہیں پانچ سو گز کا فاصلہ چھپکلی کی طرح فرش پر چل کر طے کرنا ہوگا۔''

''بولو منظور ہے۔''

''سب کچھ منظور ہے۔تم لوگوں نے سمجھا کیا ہے مجھے۔'' راجہ شیر بدر اکڑ گئے۔

''تو پھر دیر کس بات کی باقی کے کام بعد میں ہوں گے پہلے ذرا یہ ہی طے ہوجائے۔'' دلاور نے کہا۔

''بھئی یہ کیا ہو رہا ہے۔شیر بدر! تم کیوں بے وقوفی کر رہے ہو۔'' راجا امیر علی شاہ نے کہا۔لیکن پھر ان کی آواز سیٹیوں، تالیوں اور چیخوں میں دب گئی۔

''مقابلہ ہوگا، مقابلہ ہوگا۔'' صوفی بھی تیار ہوگیا اور اس کے بعد سارے معاملات طے کر لیے گئے۔غلام قادر نے جو تجویز پیش کی تھی۔راجہ شیر بدر اس پر تیار ہوگیا تھا اور وہ فاصلہ بھی طے کرلیا گیا تھا۔جو اسے ہاتھ پیروں کے بل چل کر طے کرنا تھا۔

ادھر طے یہ ہوا تھا کہ اگر صوفی ہار گیا تو کمر کے دو ٹکڑے تو کیے ہی جائیں گے لیکن صوفی کو دو گھنٹے تک مرغا بننا پڑے گا اور صوفی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ویسے بھی لوگ کہتے ہیں کہ میری شکل مرغوں سے ملتی جلتی ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔بس داڑھی اور میری کمر بس دو چیزوں کی کمی رہ جاتی ہے ایک کلغی دوسری دم، نوجوان لڑکے لڑکیوں کے لیے پھر ایک تفریح کا سامان پیدا ہوگیا تھا۔دونوں کی کشتی کے لیے جگہ ایسی تجویز کی گئی تھی۔جہاں نرم برف موجود تھی۔ راجہ شیر بدر نے باقاعدہ ریسلنگ کا سٹیوم پہن لیا تھا۔جب کہ صوفی کا حلیہ بہت عجیب تھا۔اس نے قمیص اتار دی تھی۔عام طور سے شیروانی اور پائجامہ پہنے ہوتا تھا۔پائجامے میں اس نے ڈبل ازار بند ڈالا تھا۔اور اسے

کس کر باندھ لیا تھا۔

اس وقت ایک عجیب وغریب چیز نگاہوں کے سامنے تھی اور لوگ اس کا بدن دیکھ دیکھ کر ہی ہنس رہے تھے۔

غرض یہ کہ دونوں عارضی طور پر ترتیب دیے گئے اکھاڑے میں آ گئے تھے۔راجا شیر بدر پینترے بدل رہا تھا۔صوفی نے شازیہ سے پانوں کا بٹوہ طلب کیا۔تو راجا شیر بدر نے فوراً اعتراض کردیا۔

''نہیں اس میں طاقت کی دوائیں ہیں۔یہ دوائیں میں نہیں کھانے دوں گا۔'' صوفی ہنس کر خاموش ہوگیا تھا بٹوہ واپس کردیا گیا تھا۔لیکن شازیہ، غلام قادر، دلاور اب صوفی کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ شاید سب سے زیادہ غصہ اسے راجا شیر بدر کے انہی الفاظ پر آیا تھا۔ویسے عادل، فیضان اور کرنل رحیم شاہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ راجا شیر بدر کی شامت ہی آئی ہے۔کیونکہ وہ لوگ پہلے بھی یہ تماشا دیکھ چکے تھے اور پھر اسی تماشے کا آغاز ہوگیا۔راجا شیر بدر نے فری اسٹائل کے طرز پر ایک ٹانگ گھمائی صوفی کو نشانہ بنانا چاہتا تھا لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ اس کے بعد ہونے کیا والا ہے۔صوفی نے اس داؤ سے بچنے کے بجائے پھرتی سے وہ ٹانگ پکڑ لی۔اور پھر اچانک ہی ایک عجیب سی قلابازی کھائی اس نے اور راجہ شیر بدر زمین پر کئی فٹ اونچا اچھلا اور کسی بوری کی طرح زمین پر آ رہا۔برف بے شک تھی لیکن برف پر بھی چوٹ لگتی ہے۔پھر بھی راجا شیر بدر نے پھرتی سے اپنے آپ کو رول کیا اس کا خیال تھا کہ صوفی کہیں اس پر آ نہ پڑے لیکن صوفی اپنی جگہ کھڑا ہوا تھا۔اور ازار بند درست کر رہا تھا۔جس کا ایک سرا باہر نکل آیا تھا۔

''ازار بند میں یہی خرابی ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''خرابی بھی درویشوں کی دعاؤں سے ہی ہوتی ہے۔'' امیر شاہ نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا۔ لیکن اتنی دیر میں راجہ شیر بدر نے اپنی جسامت کے برعکس ایک ایسی زبردست چھلانگ صوفی پر لگائی تھی کہ اگر صوفی اس کی زد میں آجاتا تو واقعی ہڈیاں ہی چٹخ جاتیں۔لیکن یہاں بھی صوفی نے کمال دکھایا۔وقت کا اندازہ اور پھرتی ناقابل یقین تھی۔وہ صرف اتنا جھکا تھا کہ راجا شیر بدر اس کے شانوں کو چھوتا ہوا گزر جائے۔لیکن اس نے شیر بدر کو گزرنے نہیں دیا تھا۔بلکہ اسے اپنے کاندھوں پر لے لیا تھا۔ایک ہاتھ اس کی گردن میں گھمایا تھا اور دوسرا اس کے پیروں میں اس طرح پھنسا دیا تھا کہ راجا شیر بدر ہل بھی نہ سکے اور اس کے بعد صوفی نے چکر کھانے شروع کردیے وہ راجا شیر بدر کو پھرکنی کی طرح گھما رہا تھا اور راجا شیر بدر کے حواس گم ہوئے جا رہے تھے۔کوئی پچاس سیکنڈ تک صوفی راجہ شیر بدر کو اپنے کندھوں پر لیے گھماتا رہا اور پھر اس کے بعد اس نے نہایت اطمینان سے اسے زمین پر کھڑا کردیا۔

راجا شیر بدر بری طرح چکرا گیا تھا اور اب وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے ناچ رہا تھا اپنے آپ کو زمین پر گرنے سے بچانے کے لیے بیلنس کر رہا تھا۔لیکن اتنے زور کے چکر آ رہے تھے کہ سنبھل نہیں پا رہا تھا کچھ اس طرح سے قدم پڑ رہے تھے اس کے جیسے ٹھمکے لگا رہا ہو لڑکے لڑکیوں کی ہنسی اسٹارٹ ہوگئی۔امیر شاہ تک ہنس رہا تھا۔رانا بختیار عجیب سی نگاہوں سے صوفی کو دیکھ رہا تھا۔جو اس طرح کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہوا تھا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی حالانکہ وہ خود بھی اتنا ہی گھوما تھا اسے بھی چکرا آنا چاہیے تھا اس نے کرنل رحیم

شاہ کے کان میں سرگوشی کی۔

''کرنل اب شبہ ہو رہا ہے مجھے۔''

''کیا؟''

''وہ انسان ہی ہے نا؟''

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''نہیں میرا مطلب ہے کوئی روبوٹ۔ تمہارے لیے یہ کام مشکل نہیں تھا۔''

''نہیں یہ انسان ہی ہے اور خاص طور سے خدا نے اسے بڑے بڑے دعوے کرنے والوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا ہے۔''

''کمال شخصیت ہے۔'' راجا شیر بدر آخر کار زمین پر گر پڑا تھا اور صوفی انتظار کر رہا تھا۔

''فیصلہ ہو گیا۔ فیصلہ ہو گیا۔ فیصلہ ہو گیا۔'' کئی آوازوں نے کہا لیکن شازیہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔

''نہیں فیصلہ نہیں ہوا۔ ان کے دل میں کوئی حسرت نہیں رہنا چاہیے۔'' راجا شیر بدر کوئی تین چار منٹ تک اسی طرح بیٹھا رہا اور اس کے بعد اس نے پھر کھڑے ہونے کی کوشش کی اور بولا۔

''یہ بے ایمانی ہے مجھے چکر آ گئے تھے۔''

''ارے ماں قسم...... تمام ہارنے والا یہی بات بولتا ہے پر کوئی بات نہیں ابھی تم کھڑے ہو جاؤ ابھی اس کے بعد تمہیں ڈلڈوزا کیا جائے گا سمجھتے ہو؟ نہیں سمجھتے تو سمجھ لینا، مزہ آ جائے گا۔'' صوفی آگے بڑھا تو راجا شیر بدر کے انداز میں خوف نظر آنے لگا۔ اس نے اس بار پھر صوفی پر حملہ کیا تھا اور صوفی نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے تھے گویا راجہ شیر بدر کو یہ اجازت دی گئی تھی کہ وہ اس کے جسم کو پکڑے اور اس کے بعد وہی پرانا منظر نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ راجا شیر بدر اپنی انتہائی قوت صرف کر رہا تھا لیکن صوفی کو اپنی جگہ سے ہلا نہیں پایا تھا۔

''میرا آپ سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ میں آپ کو زمین پر نہیں بھیجوں گا راجا صاحب۔''

راجا شیر بدر خاموش ہو گیا تھا۔ کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

''کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں یہ ایک کھیل تھا۔ کھیلا گیا سب نے لطف لیا۔''

''اڑے نئیں بڑے بابا ایسا کیسے ہوئیں گا ابھی اس کو پانچ سو گز چھپکلی بن کر چلنا ہوگا۔''

''نہیں وہ ہمارا مہمان ہے۔ ہمارا دوست ہے اور پھر یہ تو ایک کھیل تھا۔ کیوں صوفی صاحب آپ بتائیے۔''

''نہیں نہیں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا واقعی یہ ایک کھیل تھا۔ صوفی نے جواب دیا۔

بہر حال بہت سے چہرے لٹک گئے تھے خود راجا امیر شاہ شرمندہ تھا۔ یہ شرمندگی راجا شیر بدر کے چہرے سے بھی ٹپک رہی تھی۔ غلام قادر کے علاوہ اور کوئی ایسا نہیں تھا جو کچھ کہہ رہا ہو۔ غلام قادر سخت طیش میں تھا اور بار بار اپنی گزارش پیش کر رہا تھا۔ لیکن صوفی نے غلام قادر کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! مانا کرو میری بات وہ ہمارا مہمان ہے۔''

''ارے ماں قسم ابھی تم میرے کو بولو تو ہم اس کو شہر بدر کر دے۔'' غلام قادر نے کہا۔

''کچھ نہیں کچھ نہیں اپنا کام کرو ہم جس مقصد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ اس کی تکمیل ہونی چاہیے یہ تو صرف ایک تفریح تھی جس کو سب نے انجوائے کیا درویشوں کی دعاؤں سے، صوفی نے کہا اور اس کے بعد یہ مجمع منتشر ہو گیا۔

♥......♥......♥

رات یہاں بہت سنسنی خیز ہوا کرتی تھی۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ٹولیاں بنا کر بیٹھ گئے۔ خوش گپیاں ہونے لگیں۔ صوفی غیر معمولی طور پر خاموش تھا۔ وہ ایک الگ گوشے میں بیٹھا کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی اور وہ لوگ سونے کے لیے لیٹ گئے تھے لیکن طے یہی کیا گیا تھا کہ ہر شخص اپنی جگہ مستعد رہے گا۔ مسلح افراد اپنی جگہ موجود اور ہوشیار تھے۔ صوفی نے خود بھی ایک رائفل لی تھی اور اسے لوڈ کر کے اپنے پاس رکھ لیا تھا اور اس کے بعد وہ بہ دستور گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ پھر نہ جانے رات کا کون سا وقت تھا کہ ہلکی ہلکی سیٹیاں سنائی دیں ان کا مطلب یہ تھا کہ کوئی خطرہ سر پر موجود ہے۔ سبھی ہوشیار ہو گئے۔ لڑکے لڑکیوں کو تو اب ان معاملات سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی۔ لیکن باقی تمام لوگ چوکنے ہو گئے۔ سیٹیوں کی وجہ معلوم کی گئی تو پتا چلا کہ اچانک ہی کوئی خیمہ نمودار ہوا ہے۔ اچانک صوفی کی آواز ابھری۔

''براہ کرم اس درندے پر آج ایک بھی گولی نہ چلائی جائے۔''

''کیا مطلب؟'' رانا بختیار نے پوچھا۔

''تھوڑا سا تجربہ کرنے دیجیے مجھے۔''

''اور اگر اس نے ہماری جانب رخ کیا تو؟''

''تب بھی گولی نہ چلائی جائے۔ یہ اہم ضرورت ہے۔'' کرنل رحیم شاہ صوفی کے لہجے کو پہچان گیا اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے گولی نہیں چلائی جائے گی۔'' منہ کھلے اور بند ہو گئے۔ لوگ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ رانا بختیار نے البتہ کرنل رحیم شاہ کے کان میں کہا۔

''ذمے داری میری ہے میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر اس نے کسی کو نقصان پہنچایا تو سب سے پہلا آدمی میں ہوں گا۔''

''نہیں...... میرا یہ مطلب نہیں ہے۔'' اچانک ہی انہیں خاموش ہونا پڑا۔ خیمے سے وہی طوفانی درندہ برآمد ہوا اور چھلانگیں لگاتا ہوا باہر نکلا۔ پھر اس نے ان کی جانب رخ کر لیا تھا ان کے سانس پھولنے لگے۔ کرنل رحیم شاہ آگے آ گیا تھا۔ راجا امیر شاہ کی آواز ابھری۔

''کرنل کے مر جانے سے کیا فرق پڑے گا اس کے بعد تو ہماری باری آئے گی وہ دیکھو وہ اس طرف ہے۔ آہ...... میرا خیال ہے اس نے ہماری بو پا لی ہے۔ یہ صوفی، صوفی......'' لیکن انہوں نے دیکھا کہ صوفی غائب ہو گیا ہے۔ مسلح افراد بھی بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے کیونکہ انہیں گولی چلانے کے لیے منع کر دیا گیا تھا جبکہ درندہ ان کے قریب آتا جا رہا تھا۔ پھر اچانک ہی گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ دو گولیاں چلی تھیں۔ سیاہ درندے نے ایک قلابازی کھائی۔ ان لوگوں نے ایک بات خاص طور سے محسوس کی تھی وہ یہ کہ

سیاہ درندے کی وہ دونوں آنکھیں جو بجلی کے بلب کی طرح روشن تھیں۔ اچانک بجھ گئی تھیں اور ان سے خارج ہونے والی روشنی غائب ہوگئی تھی۔ پھر اچانک ہی درندہ ان کی نگاہوں کے سامنے سے گم ہوگیا۔ اور اس کے ساتھ ہی دوسرا حیرت ناک منظر بھی ان کی نگاہوں کے سامنے آیا۔ وہ خیمہ بھی ایک دم غائب ہوگیا تھا۔ لوگوں پر سکتہ طاری تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک ہی کیا ہوگیا پھر صوفی انہیں نظر آیا۔ جو ان کے قریب آ رہا تھا۔ کرنل رحیم شاہ کے علاوہ صورت حال کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن کرنل رحیم شاہ نے آگے بڑھ کر صوفی کو گلے لگالیا تھا۔

''خدا کی قسم صوفی صاحب! میں نے یہ سب کچھ صرف آپ ہی کے بل پر شروع کیا تھا اور مجھے دلی مسرت ہے کہ میرا فیصلہ بالکل ٹھیک تھا۔''

''مگر یہ...... یہ...... یہ سب...... یہ تو واقعی حیرت انگیز رہا۔'' راجا امیر شاہ کی آواز ابھری۔

''درویش زندہ باد۔'' رانا بختیار بولا۔

''اڑے ماں قسم، بابا کتنی زور سے اچھلا ہے۔'' غلام قادر نے دلاور کے کان میں سرگوشی کی اور شازیہ اس سرگوشی کو سن کر ہنس پڑی۔

''اس کا مطلب ہے کہ بات کچھ آگے بڑھ گئی۔''

''درحقیقت یہ لوگ ایک چلے کے بھی نہیں ہیں۔'' کرنل رحیم شاہ خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ صوفی نے کوئی کارنامہ سرانجام دے دیا ہے۔ بات بہت زیادہ تفصیل میں جانے کی نہیں تھی۔ لیکن صوفی نے اس وقت ان لوگوں کو ساری بات بتا دینا ضروری سمجھا چونکہ ان کی مدد کے بغیر کام ہو نہیں سکتا تھا۔

''ہم نے زمین پر دیکھا ہے کہ درندوں کے قدموں کے نشانات نہیں بنتے درویشوں کی دعاؤں سے اور ہم نے یہ بھی دیکھا کہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آواز اسے خوف زدہ کر دیتی ہے۔ اس سے ایک احساس ہمارے ذہن میں پیدا ہوا کہ یہ درندہ جسمانی طور پر کچھ نہیں ہے۔ کوئی ایسی چیز جو قابل بے شک ہے لیکن کوئی ٹھوس وجود نہیں رکھتی۔ البتہ یہ بات ذرا حیرت ناک تھی۔ درویشوں کی دعاؤں سے کہ ٹھوس وجود نہ ہونے کے باوجود وہ انسانی زندگی کو کیسے ختم کر دیتا ہے۔ چنانچہ درویشوں نے میری رہنمائی کی۔ میں نے بابا تیر انداز پانی پتی کا تصور کیا اور انہوں نے میری رہنمائی کی۔ میرے دماغ میں اس کی آنکھوں کا خیال آیا۔ وہ آنکھیں غیر معمولی تھیں اور آپ لوگ اس بات کو سن کر حیران ہو جائیں گے کہ وہ ایک انوکھی چیز تھی۔ بس اس کے پورے وجود میں ایک کیمرا نما مشین ہے۔ جو سارا کام کرتی ہے اور وہ مشین آنکھوں کی جگہ لگائی گئی ہے۔ اس کا بقیہ جسم صرف اس مشین سے خارج ہونے والی شعاعوں کا نتیجہ ہے۔ وہ کیمرا یہ میرے پاس موجود ہے۔ چونکہ اس کے خاتمے کے بعد کیمرے کو تو زمین پر پڑے رہ جانا ہی تھا۔'' یہ کہہ کر صوفی نے سیاہ رنگ کا چھوٹا سا بکس جس کے نچلے سرے پر لاتعداد تار لگے ہوئے تھے اور سامنے کے حصے پر ٹوٹے ہوئے بلب لگے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے سامنے کر دیا۔ وہ سب سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ اس کے بعد ان کے حوصلے بے حد بڑھ گئے اور پھر رانا بختیار نے کہا۔

''اب اس کے بعد تو ہم اس مسئلے کے خاتمے کے بعد ہی یہاں سے جائیں گے۔'' تیسری رات کا

ند نکلا تھا۔ سب لوگ اس بات کے لیے تیار تھے کہ اگر کوئی واقعہ ہو تو ہوشیار رہیں۔ پھر کافی فاصلے پر انہوں نے اس بھیڑیں چرانے والے کو دیکھا جو بیٹھا ہوا مدھم آواز میں بانسری بجا رہا تھا۔ صوفی نے کہا۔

''براہ کرم...... مجھے جانے دیجیے۔ غالباً زمانہ قدیم میں، میں ہیر تھا اور بانسری کی تانیں سن کر رانجھا کے پاس چلا جاتا تھا درویشوں کی دعاؤں سے آج پھر میرے دل میں یہی لہر جاگی ہے۔ آپ لوگ میرا پیچھا نہ کیجیے۔'' کسی نے کچھ کہنا چاہا لیکن کرنل رحیم شاہ نے روکتے ہوئے کہا۔

''نہیں اب تو آپ کو کم از کم صوفی صاحب پر بھروسا کرنا چاہیے۔'' صوفی وہاں سے آگے چلا گیا۔ اس نے اسی جگہ اس بھیڑیں چرانے والے کو دیکھا۔ جو مست ہو کر بانسری بجا رہا تھا۔ صوفی اس کے سامنے بیٹھ کر جھومنے لگا۔ چرواہے نے اچانک ہی صوفی کو دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

''تم پھر آ گئے۔''

''درویش مجھ پر رحم کریں۔ تمہاری بانسری کی تانیں اتنی ہی خوبصورت ہوتی ہیں۔''

''مگر تمہارے ساتھ تو اور لوگ بھی ہیں۔''

''ہاں۔''

''انہیں بانسری سے دلچسپی نہیں ہے۔''

''پتا نہیں۔''

''لو اگر ایسی بات ہے تو میں تمہیں یہ بانسری تحفے کے طور پر پیش کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے بانسری کا رخ صوفی کی جانب کر دیا۔ کوئی دوسرا شاید تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اچانک کیا ہونے والا ہے۔ لیکن صوفی کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اندر سے لے کر باہر تک وہ کیا چیز ہے۔

بھیڑیں چرانے والے نے سادگی سے بانسری کا رخ اس کی طرف کیا تھا دوسرے لمحے بانسری کے سوراخ سے سفید رنگ کا ایک غبار نکلا۔ جس نے صوفی کے چہرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لیکن صوفی نے بھی دم کرلیا تھا۔ وہ سانس بند کرنے کا ماہر تھا اور دیر تک سانس روک سکتا تھا۔ سفید رنگ کے غبار نے اس کے چہرے کو لپیٹ میں لے لیا تھا اور صوفی اس وقت دم بہ خود ہوگیا تھا۔ جیسے اس کی روح پرواز کرگئی ہو۔ پھر رفتہ رفتہ وہ جھومنے لگا اور اس کے بعد بے سدھ ہو کر زمین پر اوندھا لیٹ گیا۔

بھیڑیں چرانے والا جلدی سے کھڑا ہوگیا تھا۔ ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر تیزی سے صوفی کو اٹھا کر اپنے شانوں پر ڈال لیا۔ وہ انتہائی طاقت ور آدمی معلوم ہوتا تھا اور اس کے بعد اس نے صوفی کو کندھے پر ڈال کر جس تیزی سے دوڑ لگائی تھی۔ اس پر کوئی بھی دیکھنے والا حیران ہوسکتا تھا۔ صوفی کے دونوں ہاتھ جھول رہے تھے اور اس نے پورا بدن بے سدھ چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اب وہ آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا غبار کے اثرات اس پر تھوڑے بہت اثر انداز ضرور ہوئے تھے اور اسے اپنی آنکھوں میں جلن سی محسوس ہو رہی تھی۔

بھیڑیں چرانے والا اسے لے کر دوڑتا رہا اور صوفی اطمینان سے آنکھیں کھول کر اس راستے کا جائزہ لیتا رہا۔ جدھر سے وہ گزر رہا تھا پھر مشرقی پہاڑیوں کے قریب پہنچ کر وہ ایک جگہ رکا اس نے ایک پہاڑی

چٹان کے رخنے میں ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹولا۔ دوسرے لمحے پہاڑی چٹان اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ دوا
سنبھالے ہوئے اندر داخل ہوا۔ اور اندر کچھ اور افراد اس کے پاس پہنچ گئے۔ بھیڑیں چرانے والے نے صو
کو نیچے ڈالتے ہوئے کہا۔

''اسے باس تک پہنچادو اور بتادو کہ میں اسے لے کر آیا ہوں۔ میں اپنی جگہ جا رہا ہوں۔''

''او کے سر! آپ جائیے۔'' انہوں نے جواب دیا اور ایک بار پھر صوفی کو اٹھا لیا گیا۔ وہ لوگ ا
کشادہ سی سرنگ میں آگے بڑھ رہے تھے۔ آگے جا کر یہ سرنگ ایک بڑے سے غار میں تبدیل ہو گئی تھ
یہاں کا ماحول بالکل ٹھنڈا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہاں ایئر کنڈیشنر لگے ہوئے ہیں۔ لیکن پہاڑیوں
یہ سب کچھ بڑا حیران کن تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہاں ان کا کوئی باقاعدہ نظام قائم ہے۔ صوفی
ایک ایسے ہی غار میں لے جا کر لٹا دیا گیا۔ جو کشادہ تھا لیکن اس کی زمین ناہموار تھی۔ اس میں مدھم مد
روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دیوار پر کسی ایسی چیز کا پینٹ کیا گیا تھا جس سے روشنی خارج ہو رہی تھی۔ صوفی نے ایک
بار پھر آنکھیں بند کر لی تھیں تاکہ انہیں احساس نہ ہو کہ وہ ہوش میں ہے۔ وہ لوگ اسے لٹا کر باہر نکل گئے
صوفی نے آنکھیں کھول کر ماحول کو دیکھا۔

غار کافی بڑا تھا لیکن اسے عجیب و غریب شکل دی گئی تھی۔ جگہ جگہ جھاڑیاں لگائی گئی تھیں۔ ج
مصنوعی تھیں ان جھاڑیوں میں گہرے موٹے جالے لگے ہوئے تھے۔ ان جالوں میں مکڑیاں بھی نظر آرہی
تھیں کہیں کہیں چمگادڑیں بھی چپکی ہوئی تھیں اور ماحول بہت بھیانک تھا لیکن سب بالکل مصنوعی تھا۔ صوفی
کھجانے لگا۔ کیا مقصد ہے ان لوگوں کا کیا چاہتے ہیں۔ یہ جاننا اسی طرح ممکن تھا کہ خاموشی اختیار کی جائے۔

چنانچہ تقریباً ایک گھنٹے تک وہ لیٹا رہا اس کے بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اگر ان لوگوں کا یہ خیال ہو کہ
بے ہوشی کتنی طویل ہو سکتی ہے۔ تو اب انہیں یقین آ گیا ہوگا کہ اسے ہوش آ گیا ہے۔ صوفی منہ سے ڈرا
ڈری آوازیں نکالنے لگا اور اس کا نتیجہ اس کی توقع کے مطابق ہی نکلا ایک تیز روشنی کا دھبا سفید تھا اور آہستہ
آہستہ وہ دھبا بڑھتا چلا گیا۔ پھر روشنی میں ہی لپٹا ہوا ایک وجود ایک دیوار سے نکل کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے
لگا۔ صوفی دہشت سے کانپنے لگا تھا۔

لیکن یہ انداز سو فی صدی مصنوعی تھا۔ البتہ اس کے منہ سے ڈری ڈری آوازوں کے ساتھ پڑھنے
کی آوازیں نکل رہی تھیں سفید لباس میں ملبوس ایک بہت زیادہ بوڑھا شخص اس کے سامنے آ گیا۔ بڑی بڑی سی
داڑھی سینے پر لٹکی ہوئی تھی۔ جو برف کی طرح سفید تھی۔ سر کے بال بھی لمبے لمبے اور بالکل سفید تھے۔ یہاں
تک کہ بھنویں بھی سفید تھیں اس کے چہرے کی جھریاں اس کی شخصیت سے ہم آہنگ تھیں اور اس کی گول گول
آنکھیں صوفی پر مرکوز تھیں۔

صوفی بدستور خوف زدہ ہونے کا مظاہرہ کرتا رہا۔ بوڑھا اس سے کچھ فاصلے پر آ کر کھڑا ہو گیا اور
اس نے صوفی کی طرف نظر اٹھا کر کہا۔

''کون ہو تم؟''

جواب میں صوفی کے منہ سے وظیفے کی آواز نکلنے لگی۔ وہ وظیفہ پڑھ پڑھ کر اس پر پھونکیں مارنے لگا

''نہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آتش زادہ ہوں آگ کا بیٹا! اور تو انسان لیکن اطمینان
رکھنا میں تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔''

''مم...... معاف کریں درویشوں کی دعاؤں سے۔ مجھے معاف کر دیں۔''

''کہہ دیا تجھ سے کہ ہم نے تجھے نقصان پہنچانے کے لیے نہیں بلایا۔ بلکہ ان حقیقتوں سے روشناس
کرنے کے لیے بلایا ہے۔ جن سے شاید تمہارے ساتھی واقف نہیں ہیں۔ پہلے یہ علاقہ صرف ہماری ملکیت
تھا۔ یہاں ہماری پوری آبادی بکھری ہوئی تھی۔ لیکن پھر کچھ ایسے حالات ہوئے کہ ہم کچھ عرصے کے لیے
ترک سکونت کر کے یہاں سے چلے گئے۔ لیکن زمین جس کی ہوتی ہے اس کی ملکیت ہوتی ہے یہاں بستیاں
بن گئیں لوگ بھی رہنے لگے۔ لیکن یہ بری بات ہے جب ہم اپنے قبیلے کے ساتھ واپس آ گئے ہیں تو تم سب
لوگوں کو یہ علاقہ خالی کر دینا چاہیے۔ ہم نرم دل اور نیک طبیعت ہیں۔ انسانوں کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔
لیکن اگر تم لوگوں نے اپنی ہٹ دھرمی نہ چھوڑی تو ہم بھی مجبور ہو جائیں گے کہ تمہیں تباہ و برباد کر دیں۔ وہ
درندے ہمارے بھیجے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ بھی آگ سے بنے ہوئے ہیں۔ لیکن ابھی ہم نے انہیں قابو میں
رکھا ہے اور انہوں نے زیادہ انسانوں کو نقصان نہیں پہنچایا۔ تم لوگ جو کوئی بھی ہو۔ جہاں سے بھی آئے ہو ہم
تمہیں بتاتے ہیں فوراً ہی یہ جگہ چھوڑ دو اور ادھر کا رخ مت کرو۔''

''مم...... میں، مم...... میں، مم...... میں آپ سے ان سب کی طرف سے معافی چاہتا ہوں ہمیں
اس بات کا تو پتا ہی نہیں تھا۔''

''تمہارے ساتھ جو لوگ آئے ہیں وہ کون ہیں۔''

''ان میں سے ایک ان علاقوں کا مالک رانا بختیار ہے۔ باقی سب اس کے مہمان ہیں اور ان کے
بیٹے بیٹیاں ہیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔

''مجھے کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں کسی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا لیکن رانا بختیار سے کہہ دینا
کہ یہ علاقے اس کے نہیں ہیں بلکہ شہنشاہ جنات کی ملکیت ہیں۔ وہ ان علاقوں کو چھوڑ دے۔ جہاں رہ رہا ہے
وہاں رہتا رہے لیکن اپنی آبادیوں کو خالی کرا دے اگر ایسا نہ ہوا تو پھر اس کے لیے اور یہاں کے رہنے والوں
کے لیے خوف ناک تباہی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس کے بعد اگر ان درندوں پر کوئی گولی چلائی گئی تو یہ گولیاں
واپس پلٹ کر ان لوگوں کو جا لگیں گی۔ جنہوں نے یہ گولیاں چلائی ہوں گی میں انسانی زندگیوں کو ختم نہیں کرنا
چاہتا۔ لیکن جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہی ہونا چاہیے۔''

''کیا یہ سارا علاقہ آپ کا ہے درویشوں کے کرم سے۔''

''ہاں۔''

''تو آپ لوگوں کے گھر بھی ہوں گے یہاں پر۔''

''مطلب؟''

''میں یہ گھر دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''نہیں جناتوں کے ایسے کچھ راز ہوتے ہیں۔''

''معافی چاہتا ہوں میں نے کبھی جنوں کا گھر نہیں دیکھا درویشوں کے کرم سے۔''

''اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ میں نے تمہیں یہاں اس لیے بلایا ہے کہ تمہارے ذریعے ان لوگوں کو یہ پیغام دے دوں۔ ہم یہاں اپنے قبیلے کو دوبارہ آباد کر رہے ہیں۔ اگر ہمیں مجبور کیا گیا تو پھر ان لوگوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کیا سمجھے۔''

''ٹھیک ہے۔ کیا میں یہاں سے جا سکتا ہوں۔''

''ہاں کیوں نہیں۔'' پھر اچانک ہی اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور ویسا ہی غبار پھر نمودار ہوا اور صوفی کے چہرے کے گرد پھیل گیا لیکن صوفی اس کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ اس بار بھی اس نے حبس دم کر لیا لیکن بے ہوش ہونے کی بہترین اداکاری کی۔ کافی دیر تک وہ اسی طرح پڑا رہا اس کے کان صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ اچانک ہی اسے کچھ سوجھی اور وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پھر ایک چٹان کے پیچھے پہنچ گیا اس نے اپنی سانس تک بند کر لی تھی۔ آنے والے چار افراد تھے وہ اندر داخل ہوئے اور دفعتاً ان کے منہ سے نکلا۔

''ارے کہاں گیا؟'' لیکن اس کے بعد انہوں نے باہر دوڑ لگا دی تھی اور اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ صوفی انتہائی احتیاط کے ساتھ وہاں کا جائزہ لینے لگا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ لوگ اس کی تلاش میں چاروں طرف بھاگ رہے ہیں۔ لیکن وہ بھی صوفی تھا اس نے پوشیدہ رہنے کے لیے ایسی ایسی جگہوں کا انتخاب کیا تھا کہ ان فرشتے کبھی اسے تلاش نہ کر سکیں اور آخر کار حقیقتوں کا انکشاف ہو ہی گیا۔

وہ ایک خفیہ تہ خانہ تھا۔ تہ خانہ کیا بلکہ غار تھا جہاں مشینیں لگی ہوئی تھیں اور اس جگہ کو بڑی احتیاط کے ساتھ ساؤنڈ پروف کیا گیا تھا۔ یہاں اسے جو کچھ نظر آیا اسے دیکھ صوفی دنگ رہ گیا تھا۔ یہ نوٹ چھاپنے کی مشینیں تھیں اور دنیا بھر کی کرنسی کے یہاں انبار لگے ہوئے تھے۔ ڈالر، یورو اور بھی بہت سے نوٹ جو اربوں کی تعداد میں تھے۔ صوفی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

پھر اس کے بعد ایک ہنگامہ خیز مہم کا آغاز ہو گیا۔ یعنی یہاں سے نکلنے کی مہم کا آغاز۔ صوفی جانتا تھا کہ اب اگر وہ اپنی جگہ پہنچا تو اسے واپس نہیں جانے دیا جائے گا اور اتنی دیر کی گم شدگی کا پورا پورا حساب لیا جائے گا۔ لیکن باہر کا ماحول بے حد خوف ناک تھا۔ وہ کالے چیتے اب ایک نہیں کئی کی تعداد میں تھے اور چاروں طرف بھاگتے پھر رہے تھے۔

''در...... درویش رحم کریں۔'' صوفی کے منہ سے نکلا۔ چیتوں کی آنکھوں سے نکلنے والی روشنیاں ہر طرف گردش کر رہی تھیں۔ صوفی جانتا تھا کہ اسے ان روشنیوں کی زد سے بچنا ہے اور پھر صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی جب صوفی ان خیموں کے نزدیک پہنچا تھا جہاں سب لوگ جاگ کر اس کا انتظار کر رہے تھے ساری صورت حال صوفی نے ان لوگوں کو بتا دی اور کرنل رحیم شاہ نے فوراً ہدایت کی کہ یہاں سے جس قدر جلدی واپسی ہو سکے بہتر ہے۔ چنانچہ اسی وقت انہوں نے خیمے وغیرہ یہیں چھوڑ دیے تاکہ وہ سب اس احساس کا شکار رہیں کہ یہ سب یہیں ہیں۔ یہ کوئی نقصان کی بات نہیں تھی۔ بس انہیں یہاں سے نکل جانا تھا۔ پھر اس کے بعد کی کارروائی کرنل رحیم شاہ کے سپرد تھی۔

''فوجی ہیلی کاپٹروں نے اس علاقے کو پوری طرح گھیر لیا تھا جہاں سے جعلی کرنسی بنانے والوں کا

عظیم الشان نیٹ ورک دریافت ہوا تھا کہ حکومت ہل کر رہ گئی تھی۔ چونکہ اپنے علاقے میں یہ کارروائی ہوئی تھی اور نہ جانے دنیا کے کون کون سے ملکوں میں یہ جعلی کرنسی پھیل رہی تھی۔ اس لیے اس بات کو پوری طرح صیغہ راز میں رکھا گیا اور خاموشی سے مجرموں کو پکڑ کر کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا۔ لیکن سرکاری طور پر اس مہم جوئی کو بڑی اہمیت دی گئی تھی اور ایک بار پھر وزارت داخلہ نے کرنل رحیم شاہ کو قومی ہیرو قرار دیا تھا اور کرنل رحیم شاہ نے نہایت دکھ بھرے انداز میں کہا تھا۔

''کاش! میں ان لوگوں کو بتا سکتا کہ اس تمام اعلیٰ کارکردگی کے پس پردہ کون ہے۔''

''درویش آپ پر بھی رحم کریں اور مجھ پر بھی یہ اتنی اہم بات نہیں ہے کہ آپ اس کے لیے پریشان ہو جائیں۔'' صوفی نے جواب دیا تھا۔

صوفی کے لیے جب فرصت کے اوقات ہوں تو سب سے بہترین ٹھکانا اس کا اپنا گھر ہی ہوتا تھا۔ ممن خان کا ہوٹل، باہر کی گلی، سب دلچسپیاں ہی دلچسپیاں اعلیٰ درجے کی کوٹھیوں میں رہنے والے زندگی کو اپنے خول میں قید کر دینے والے بھلا ایسے علاقوں کے حسن کا کہاں تجزیہ کر سکتے ہیں۔ جہاں گھروں کے دروازے بند نہ ہوتے ہوں ہر شخص بلا روک ٹوک کسی بھی دروازے سے اندر داخل ہو جائے اور صاحب خانہ یہ تک نہ سوچے کہ وہ کیوں آیا تھا۔ آیا ہو گا اپنے کسی کام سے کام کر کے چلا گیا۔ ایسی جگہوں کی زندگیاں بھی تلف ہوتی ہیں اور شاید یہی انسانی زندگی ہے بھی۔ تکلفات کے لحاف میں لپٹے ہوئے لوگ بھلا اس زندگی کو کیا جانے۔

چنانچہ صوفی آج کل یہی زندگی گزار رہا تھا۔ گلی میں دو بار محفل قوالی ہو چکی تھی اور مزے کی بات یہ ہے کہ گرین فورس کی ٹیم نے یہ قوالی اٹینڈ کی ہی تھی۔ لیکن کرنل رحیم شاہ بھی اس میں بہ نفس نفیس موجود تھا۔ صوفی کی سرمستیاں شباب پر کیوں نہ ہوتیں۔

بہر حال وہ خوش و خرم زندگی گزار رہا تھا۔ مستیاں ہی مستیاں زندگی میں تھیں اس وقت بھی وہ صحن میں بیٹھا ہوا ایک بڑی بالٹی قریب رکھے نہا رہا تھا کہ اس کی کوئی مہمان لڑکی اسے تلاش کرتی ہوئی پہنچ گئی۔ بدرالدین اسے دروازے کے باہر ہی مل گیا تھا۔ صوفی کا محلے دار تھا۔

''دیکھیے۔ میں یہ ایک پتا معلوم کر کے آئی ہوں وہ صاحب پہلے محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھے۔ بعد میں انہوں نے محکمہ پولیس چھوڑ دیا۔ صوفی صاحب کہلاتے ہیں۔''

''تو بی بی اتنی تفصیل میں جانے کی کیا ضرورت ہے جب آپ کو یہ معلوم ہے کہ وہ صوفی صاحب کہلاتے ہیں۔ تو بس اتنا ہی کہہ دینا کافی تھا وہ سامنے جو ٹاٹ کا پردہ لٹکا ہوا ہے۔ اسے اٹھا کر اندر چلی جایئے۔''

''وہ......'' لڑکی حیرت سے بولی۔

''جی ہاں کیوں؟ تعجب کی بات ہے کیا۔''

''نن...... نہیں میرا مطلب ہے کہ...... کہ، دروازے پر کوئی بیل وغیرہ نہیں ہے۔''

''ہم لوگوں کے ہاں دروازوں پر بیل بندھے ہوتے ہیں بیل نہیں ہوتیں آپ آرام سے پردہ ہٹائیے اور اندر چلی جائیے۔ صوفی آپ کو مل جائیں گے۔'' لڑکی اندر چلی گئی تھی۔ لیکن پھر دوسرے لمحے وہ

ٹھٹک کر رک گئی۔ ایک عجیب و غریب مخلوق گھر کے صحن میں، پیڑھی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ برابر بالٹی رکھی ہوئی
بالٹی میں ایک مگا تیر رہا تھا۔ یہ مخلوق صابن میں ڈوبی ہوئی تھی۔ نچلے بدن پر ایک کپڑا بندھا ہوا تھا اور بس
پسلیوں کا انبار نظر آ رہا تھا۔ جن پر شاید زندگی میں کبھی مناسب گوشت نہیں آیا تھا۔ اسی طرح سے دبلے
ہاتھ پاؤں سارے کے سارے ٹیڑھے میڑھے بس لگتا تھا کہ فرشتوں نے جلدی میں کچھ بنا دیا ہے اور وہ
بہت کچھ بن گیا ہے لیکن بھلا کون ان فولادی بازوؤں کی فولادیت کو جانے جب تک کہ اسے خود ان سے
واسطہ نہ پڑے، آنے والی کو الجھن ہوگئی۔ رکے یا باہر نکل جائے۔ اور واقعی وہ باہر آ گئی۔ لیکن باہر بدلا
بھی جا چکا تھا۔ کچھ لمحے سوچتی رہی اور پھر ایک بار پھر اس نے ٹاٹ کا پردہ ہٹایا اور تیز آواز میں بولی۔

''میں اندر آ سکتی ہوں۔'' اور اچانک ہی بھونچال آ گیا۔ پیڑھی پر بیٹھے ہوئے عجیب و غریب
شخص نے اندر چھلانگ لگا دی لڑکی نے اس خوف سے آنکھیں بند کر لیں کہ کہیں اس افراتفری میں وہ بے
چارہ اس کپڑے سے بھی محروم نہ ہو جائے۔ جو اس کے بدن سے لپٹا ہوا ہے صابن بہ دستور سر میں لگا ہوا تھا
وہ اندر گھس گیا لڑکی کو بے اختیار ہنسی آ گئی تھی۔ پھر اندر سے آواز آئی۔

''کون ہیں آپ کون ہیں؟''

''جی میں صوفی صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''ذرا دو منٹ کے لیے باہر تشریف لے جایئے۔ سر پر لگا ہوا صابن دھولوں۔ آپ کو زحمت تو ہوگی!

''معافی چاہتی ہوں۔''

''آپ کو خدا کا واسطہ بس دو منٹ کے لیے۔''

''نن...... نہیں میرا مطلب ہے میں اس طرح اندر آنے کی معافی چاہتی ہوں۔ جا رہی ہوں
باہر۔'' پھر دو منٹ سے زیادہ لگ گئے تھے اور لڑکی باہر ہی کھڑی رہی تھی اس کے بعد اندر ہی سے آواز آئی۔

''اگر آپ باہر موجود ہیں تو اندر آ جایئے۔'' بالٹی وغیرہ ہٹا کر رکھ دی گئی تھی۔ دالان لمبا
چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور صاف لگ رہا تھا کہ افراتفری میں ان میں سے ایک چارپائی پر چادر اور دلا
بچھائی گئی ہے۔ وہ عجیب و غریب مخلوق اب کپڑوں میں تھی۔ لیکن اس میں فرق نہیں آیا تھا۔

''مم...... میں صوفی صاحب سے......''

''جی جی...... آپ تشریف رکھیے تازہ تازہ دری بچھائی ہے درویشوں کے کرم سے۔''

''جی۔''

''آ جایئے۔'' صوفی نے پھر کہا اور لڑکی دالان میں داخل ہوگئی۔ اس نے حیران نگاہوں سے
چاروں طرف دیکھا پھر بولی۔

''دیکھیے یہاں...... ریٹائرڈ انسپکٹر میرا مطلب ہے کہ انسپکٹر صوفی صاحب......''

''خادم ہی کو صوفی کہتے ہیں درویشوں کے کرم سے اور ایک تصحیح فرما لیجیے ہم ریٹائر نہیں ہوئے بلکہ
ہم نے محکمہ پولیس کو ریٹائر کر دیا۔ یعنی خود ملازمت چھوڑ دی۔''

''جج...... جی، ہاں مجھے پتا ہے۔''

''آپ فرمایئے ہم سے کیوں ملنا چاہتی ہیں۔''

''صوفی صاحب! مجھے آپ کا کافی وقت درکار ہے آپ براہ کرم میری پوری کہانی سن لیجیے گا۔
اگر آپ کو وہ اس قابل محسوس ہو تو میری مدد کیجیے گا ورنہ......''

''جی جی، جی جی، ارشاد، ارشاد۔'' صوفی نے کہا اتنی دیر میں ممن خاں کا باہر کے کام والا لڑکا
چائے کی ٹرے سجائے ہوئے اندر آ گیا اس میں ایک ٹرے میں بسکٹ بھی رکھے ہوئے تھے۔

''لیجیے۔''

''مم...... مگر یہ چائے۔''

''جی ہاں...... آپ تشریف لائیں تو چائے آپ کے پیچھے پیچھے آ گئی۔''

''مگر آپ نے چائے کے لیے کہا تو نہیں تھا۔''

''جس علاقے میں آپ آئی ہیں نا محترمہ! وہاں درویشوں کی دعاؤں سے مہمانوں کے لیے کسی کو
بتانے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ آپ یہاں ستر گھرانوں کی مہمان ہیں۔ ہر شخص آپ کی خدمت کے لیے
حاضر ہوگا درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''واقعی...... میں بہت متاثر ہوئی ہوں اس بات سے میرا نام رابعہ سلطان ہے۔''

''جی رابعہ سلطان صاحبہ! فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں درویشوں کے کرم سے۔''

''اب اگر آپ اجازت دیں تو یہ چائے پی لی جائے۔'' رابعہ بے تکلفی سے بولی۔

''ہاں ہاں۔ جی جی جی، حق اللہ، حق اللہ۔''

''صوفی صاحب! اگر میں آپ کا انٹرویو لوں تو کیسا رہے گا۔''

''ہم کیا عرض کر سکتے ہیں۔ مگر آپ اس انٹرویو کا کریں گی کیا؟''

''میں صحافی ہوں۔''

''اچھا...... بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''میرا پہلا سوال۔'' رابعہ سلطان بولی۔

''جی۔''

''یہ درویشوں کی دعائیں آگے پیچھے کہاں سے شامل ہو جاتی ہیں۔''

''ایک مضبوط نقطۂ نظر ہے کائنات کے ستون ایسے ہی ہواؤں پر قائم نہیں ہیں۔ کچھ نادیدہ
کندھے انہیں سہارا دیے ہوئے ہیں اور وہ کندھے اللہ تعالیٰ کے پیارے درویش، ولیوں، قطبوں اور ابدالوں
کے ہیں۔ میرا خیال ہے اس سے زیادہ آپ نہ پوچھیے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ اُن کی دعائیں زندگی کی ضامن
ہوتی ہیں۔''

''نہیں نہیں۔ خدانخواستہ میں اختلاف نہیں کر رہی آپ کی بات سے بس چونکہ آپ بار بار یہ تکیہ
کلام استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے پوچھ رہی تھی۔''

''درویش پناہ میں رکھیں۔'' صوفی نے کہا۔

"آپ سوچ تو رہے ہوں گے کہ کتنی بے تکلف لڑکی ہے۔"

"جج، جی ہاں، جی ہاں۔"

"یعنی آپ واقعی سوچ رہے ہیں۔" رابعہ مسکرا کر بولی۔

"جی نہیں۔ جی نہیں۔"

"جی ہاں...... جی نہیں۔"

"میرا مطلب ہے کہ میں یہ غور کررہا ہوں کہ آپ نے اس غریب خانے پر آنے کی زحمت کیسے کی"

"آپ کو سچ بتاؤں بہت سی جگہوں سے آپ کے بارے میں مجھے معلومات حاصل ہو چکی ہیں میں اس بات کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ چونکہ تھوڑا سا صحافت سے تعلق ہے اور صحافت سے تعلق ہونے کی بنا پر محکمہ پولیس سے بھی تھوڑے سے رابطے رہتے ہیں۔ بس یوں سمجھیے کہ آپ کے بارے میں بھی کچھ تفصیلات ایسے ہی موصول ہوئی تھیں۔"

"درویش ہم سب پر رحم کریں لیجیے چائے لیجیے۔" چائے پی گئی۔ رابعہ نے کہا۔

"صوفی صاحب! کافی عرصہ محکمہ پولیس میں رہے ہیں آپ، آپ نے اپنا گھر نہیں بنایا۔"

"آپ کو کیسے معلوم محترمہ کہ ہم نے اپنا گھر نہیں بنایا۔"

"نہیں نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ پھر آپ یہاں عارضی طور پر رہ رہے ہیں۔"

"سوفی صدی عارضی طور پر جب تک اس پنجر میں سانس قید ہے۔ ہمیں اس عارضی پناہ گاہ میں رہنا ہی پڑے گا۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ آسمانوں کی وسعتوں میں اپنا گھر بنائیں اور وہی گھر ہمیں پسند بھی ہے۔"

"آپ واقعی صوفی ہیں۔" رابعہ بولی۔

"آپ اب فرما دیجیے ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں۔"

"صوفی صاحب! ایک بہت اہم مسئلے میں آپ کی مدد چاہتی ہوں۔ دیکھیے یہ بات میرے علم میں ہے کہ آپ انسان دوست ہیں اور مظلوموں کی مدد بھی کرتے ہیں۔ میں ایک خاص مسئلے میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"جی! آپ دیر نہ فرمائیے۔"

"آپ وقت تو دیں گے نا مجھے۔"

"دے چکا ہوں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے جواب دیا اور رابعہ سلطان سوچ میں ڈوب گئی۔ بہت دیر تک سوچتی رہی پھر بولی۔

"میں نہیں جانتی کہ پولیس والوں کے لیے کون سا موسم، موسم بہار ہوتا ہے۔ مجھے آج تک اس کا اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔ قدم قدم پر امنگوں بھرے شباب کی حسین آہٹوں کے منتظر یہ نوجوان جب وردی میں آ جاتے ہیں تو نہ جانے زندگی کی حقیقی لطافتوں سے اتنی دور کیوں چلے جاتے ہیں۔ میں آپ کو ایک نام بتانا چاہتی ہوں اس کا نام راجا ناصر ہے۔"

"راجا ناصر! پتا نہیں کچھ سنا ہوا نام لگتا ہے۔"

"جی...... میں پچھلے کئی سالوں سے اس سے واقف ہوں بڑا ادبی آدمی ہے اور بڑی بامحاورہ گفتگو کرتا ہے لیکن بہر حال جب پولیس والا ہوتا ہے۔ تو ہر قسم کے ذوق لطیف سے عاری ہو جاتا ہے میں اس دن حسب معمول خبروں کے شکار پر نکلی تھی۔ آپ جانتے ہیں صوفی صاحب کہ انسانوں سے بھرے ہوئے اس شہر میں خبروں کی کمی نہیں ہوتی۔ اس دن آسمان پر بادلوں بھری کجلاہٹوں کے نیچے میری کار مختلف مقامات کے چکر لگا رہی تھی۔ لیکن پھر ان کی جلاہٹوں میں سرمستیاں ابھر آئیں اور ان کی جوانی چھلک پڑی موٹی موٹی بوندوں نے روزمرہ کے معاملات میں مصروف انسانوں کو چھکا دیا۔

"آپ صحافی ہیں، ادیبہ ہیں یا شاعرہ۔"

"نہیں پلیز پلیز، میرے الفاظ پر آپ گرفت نہ کریں۔ بدنصیبی یہ ہے کہ میرا تعلق جس خاندان سے ہے وہ خالص ادبی ذوق کا حامل ہے اور بچپن ہی سے مجھے یہ موٹے موٹے الفاظ بولنے کی عادت پڑ گئی ہے۔"

"درویش رحم کریں۔ بری عادت ہے۔"

"خیر تو میں آپ کو بتا رہی تھی کہ زندگی کے بوجھ تلے دبے ہوئے اور معاشی مسائل میں الجھے ہوئے انسانوں کے لیے موسم کی یہ شاعری بے معنی ہوتی ہے۔ لیکن ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں ابھر آتی ہیں جو فکر فردا سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ اتفاق سے میں اس پولیس اسٹیشن کے قریب سے گزر رہی تھی جس میں راجا ناصر ان دنوں انچارج کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ بس یونہی جی چاہا کہ اس سے تھوڑی سی گپ شپ کی جائے ممکن ہے کوئی نئی خبر ہی مل جائے۔ چنانچہ میں پولیس اسٹیشن میں داخل ہو گئی۔ ناصر اپنے دفتر میں موجود تھا حسب معمول اس کے سامنے فائل کھلے ہوئے تھے اور وہ موسم سے بے نیاز ان میں گم تھا موسم کی رم جھم یہاں کے ماحول پر بھی اثر انداز تھی۔ پولیس کانسٹیبل ہیڈ محرر کے کمرے میں گھسے ہوئے سگریٹ کا دھواں اڑا رہے تھے۔ چائے والا زمین پر چائے لیے پیالیوں میں چائے انڈیل رہا تھا۔ انچارج کے کمرے سے تھوڑے ہی فاصلے پر رکھی ہوئی ایک بینچ پر ایک نوجوان لڑکی اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ وہ سادہ سادہ اور معصوم خدوخال کی مالک تھی اور اس کے جسم پر سستا سا لباس تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں۔ نہ جانے بے چاری کس الجھن کا شکار ہو کر اس غیر مناسب جگہ پہنچ گئی تھی۔ میں اس پر ایک گہری سی نظر ڈالتی ہوئی ناصر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ آپ سن رہے ہیں نا صوفی صاحب۔" رابعہ سلطان نے صوفی کو دیکھتے ہوئے کہا اور صوفی جیسے چونک پڑا۔

"آپ بہت اچھی شاعرہ ہو سکتی ہیں۔ ابھی تک میں صرف آپ کی شاعری سن رہا ہوں درویشوں کے کرم سے۔" صوفی نے جواب دیا اور رابعہ ہنس پڑی پھر بولی۔

"بہر حال معافی چاہتی ہوں کوشش کروں گی کہ اب ٹو دی پوائنٹ بات کروں۔ تو میں راجا ناصر کے بارے میں بتا رہی ہوں۔ اس کی افسرانہ شان برقرار رہی۔ کسی بھی داخل ہونے والے کو سر اٹھا کر دیکھنے کے لیے اس طرح کے آفیسر مجبور نہیں ہوتے۔ اس نے میرے قدموں کی آہٹ کی بھی پرواہ نہیں کی لیکن ایسے بے تکلف افراد چند ہی ہوں گے۔ جو اس کے سامنے ایسے فائل اٹھا کر پٹخ دیں۔ میری اس حرکت پر وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جاگ گئی۔"

''اوہو...... کہاں سے آمریں تم صبح ہی صبح۔''

''یہ صبح ہے۔'' میں نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ راجہ ناصر نے سگریٹ کا پیکٹ اٹھالیا اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔

''تم ان فائلوں میں ہی مرے رہو گے یا کبھی تمہارے دل میں انسانیت بھی جاگے گی۔''

''اگر انسانیت جاگ اٹھے گی تو کیا ہوگا۔'' اس نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔ اس بے چاری معصوم اور سادہ سی لڑکی پر اس نے کوئی توجہ بھی نہیں دی تھی۔

''باہر بارش ہو رہی ہے۔''

''اچھا...... کیا باہر بارش میں لڑکیاں برس رہی ہیں۔'' راجا ناصر نے مجھ پر طنز کیا۔

''لڑکیاں بھی برس رہی ہوتیں تو تم یقیناً اسی طرح اپنے دفتر میں گھسے رہتے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''بھئی ہم ٹھہرے عوام کے خادم اور حکومت کے وفادار ہمیں اپنے جذبات لاکر میں رکھ کر نوکری کرنی پڑتی ہے۔ موسم سے لطف اندوز تو وہ ہوتے ہیں جو روزانہ صرف ٹیلی فونوں پر لاکھوں روپے ادھر سے ادھر کر دیتے ہیں۔ خیر چھوڑو کیا لوگی۔''

''کافی لیکن عمدہ، پولیس والی کافی نہیں۔'' میں نے جواب دیا اور راجا ناصر ٹیلیفون پر کسی ماتحت کو کافی کے لیے ہدایت دینے لگا۔ میں نے اس سے سوال کیا۔

''کیا مصروفیت چل رہی ہے آج کل۔''

''بس اتر گیا موسم کا بھوت۔ آ گئیں کاروبار پر لیکن افسوس آج کل میرے پاس تمہارے لیے کوئی خبر نہیں ہے۔ کافی پیو اور ٹھنڈی ٹھنڈی رخصت ہو جاؤ۔''

''میں تمہارے بارے میں سوچتی ہوں ناصر تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔ اچھے خاصے صاحب ذوق ہوتے ہوئے بھی......'' ابھی میں اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ دروازے پر کچھ آہٹیں سنائی دیں اور یوں لگا جیسے کوئی کسی کو زبردستی روک رہا ہو۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہی لڑکی دوڑتی ہوئی اندر گھس گئی۔ اس نے گرنے سے بچنے کے لیے میری کرسی کا سہارا لیا تو میں چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ اس لڑکی کو میں اپنی جگہ سے بھی دیکھ رہی تھی۔ باہر بینچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی سے ملنا چاہ رہی ہو اور اسے اس کا موقع نہ ملا ہو۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس وقت ایسی ہی کوئی صورت حال ہے۔ اس لڑکی کو میں نے اندر آتے ہوئے دیکھا لیکن پھر ایک دم اس کی آواز سننے لگی۔ وہ بولی۔

''سر! ...... سر خدا کے واسطے ایک بار میری بات سن لیجیے۔ یہ میری زندگی کا سوال ہے اگر آپ نے...... آپ نے سر!'' اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی اس کے پیچھے ہیڈ کانسٹیبل اندر گھس آیا تھا۔

''سر! یہ بدتمیز لڑکی زبردستی اندر گھس آئی ہے بارش کی وجہ سے باہر بینچ پر بٹھا دیا تھا ہم نے اسے کہ ایک دم اٹھ کر آپ کے کمرے کی طرف دوڑ پڑی۔ معافی چاہتا ہوں سر!'' ہیڈ کانسٹیبل نے کہا اور لڑکی کی جانب بڑھا لیکن لڑکی دوڑ کر راجا ناصر کی کرسی کے پیچھے پہنچ گئی۔

''سر! خدا کیلیے میری بات پر توجہ دیں۔ میں چاہتی ہوں آپ مجھے گرفتار کر لیں۔ مجھے بند کریں۔ اس طرح میری زندگی بچ جائے گی۔ ورنہ سر، ورنہ......''

''کیا مصیبت ہے کیا پولیس والوں کو لاک اپ کے علاوہ ایک پاگل خانہ بھی بنانا پڑے گا۔'' راجا ناصر نے بے رحمی سے کہا پھر کانسٹیبل کی طرف دیکھ کر غرایا۔

''تم دیکھ رہے ہو ہم کافی پی رہے ہیں۔ میں باتیں کر رہا ہوں یہ لڑکی اب اب تک یہاں موجود ہے۔ میں نے تو کہا تھا کہ تم اسے باہر بھگا دو۔'' راجا ناصر نے ہیڈ کانسٹیبل کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''سر! آپ کو خدا کا واسطہ سر، میں پاگل نہیں، خدا کی قسم میں پاگل نہیں ہوں آپ میری بات پر غور کریں۔ آپ سن تو لیں۔ خدا کے واسطے آپ سنجیدگی سے میری بات سن لیں۔ آپ...... آپ......''

ہیڈ کانسٹیبل لڑکی کی طرف دوڑا تو لڑکی نے دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ ناصر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ غراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تم جاتی ہو یا میں تمہارے ساتھ پولیس والوں کی طرح پیش آؤں۔'' پھر وہ ہیڈ کانسٹیبل کی طرف دیکھ کر بولا۔

''بارش شروع ہونے سے قبل تمہیں اسے یہاں سے نکال دینا چاہیے تھا۔ جاؤ اسے لے جاؤ اس کے بعد یہ تمہارے کمرے میں نہ آنے پائے۔''

''آپ کو خدا کا واسطہ سر، آپ کو خدا کا واسطہ، آپ یقین کریں وہ بے حد خونخوار آدمی ہے۔ سر، دنیا میں اتنی عجیب و غریب اور دہشت ناک شخصیت کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ سر، اس نے مجھے اغوا کر لیا تھا۔ میں نے...... میں نے آنکھ کھول کر اسے کمرے میں دیکھا سر وہ...... سر وہ ایک وحشی کتے کی طرح سے ہے۔ اتنا بڑا چہرہ ہے سر اس کا...... سر وہ، سر وہ...... سر پلیز، میرے ساتھ زیادتی ہوئی۔ میں آپ کو نہیں بتا سکتی سر، میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔ سر پلیز، سر میری مدد کیجیے۔ مجھے وہ لوگ وہیں روک لینا چاہتے تھے۔ میں ایک غریب آدمی ہوں سر، لیکن کسی طرح کمرے کی کھڑکی کھلی رہ گئی اور میں وہاں سے بھاگ نکلی ورنہ نہ جانے، نہ جانے میرے ساتھ کیا ہوتا، سر نہ جانے میں یہاں تک کس طرح پہنچی ہوں۔ خدا کے لیے سر، میری بات پر توجہ دیں میرے تعاقب میں بہت سے لوگ لگے ہوئے ہیں۔ آپ نے اگر مجھے یہاں سے نکال دیا تو...... تو......''

''ہیڈ کانسٹیبل!'' راجا ناصر حلق پھاڑ کر چیخا اور لڑکی سہم گئی۔ پھر اس نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔

''تو آپ میری بات نہیں سنیں گے سر!'' پھر اس نے کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے بھائی، تم تکلیف مت کرو میں خود ہی چلی جاؤں گی۔'' یہ کہہ کر وہ تھکے تھکے قدموں سے دروازے کی سمت بڑھ گئی۔

''ان حالات میں صوفی صاحب! میں ایک خاموش تماشائی بننے کے علاوہ اور کیا کر سکتی تھی۔ سادہ سے کپڑوں میں ملبوس یہ لڑکی مجھے کسی طرح پاگل نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن اس مختصر سے وقت میں مجھے کسی قسم کی مداخلت کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل بھی لڑکی کے پیچھے ہی پیچھے باہر نکل گیا تھا۔ ناصر مجھ سے نگاہیں چرا رہا تھا۔

''یہ لڑکی پاگل تو نہیں معلوم ہوتی۔'' میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بہت خوب، گویا اب آپ بھی مجھے بور کریں گی۔ کیا اس کی کسی بات میں کوئی ربط تھا۔ آپ سن رہی تھیں اس کی بکواس۔''

''اگر وہ پاگل بھی تھی۔ تو میرے خیال میں تمہیں اس کی مدد کرنی چاہیے تھی۔ نہ جانے کس گھر کی عزت ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ تم اسے اس کے گھر پہنچاؤ۔''

''بس بس محترمہ! پولیس کی مصروفیات کے بارے میں آپ کی معلومات نہایت ناقص ہیں ان رفاہی کاموں کے لیے دوسرے ادارے موجود ہیں۔ محکمہ پولیس کے لیے اور بھی بہت سے کام ہیں۔'' راجا ناصر نے کہا۔

میرے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پھیل گئے۔ بات وہی تھی راجا ناصر سے میں صرف اس لیے نہیں ملتی تھی کہ وہ پولیس آفیسر تھا اور میں صحافی۔ میں اس کی دل سے عزت کرتی تھی۔ لیکن آج نہ جانے کیوں وہ میرے ذہن سے اتر گیا تھا۔ میں بھٹکی بھٹکی سی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

''میں چلتی ہوں راجہ ناصر! پتا نہیں کیوں میرے ذہن پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی ہے۔ تم ذرا غور کرو اس کے الفاظ کیا تھے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اسے لاک اپ میں بند کر دیا جائے تو اس کی زندگی محفوظ رہ سکتی ہے۔''

''پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ تمہارا کیا خیال ہے صرف اس کی بکواس پر میں دوڑ پڑتا یار! بور مت کرو اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔''

''ٹھیک ہے میں چلتی ہوں سوری۔ میں نے تمہارا کافی وقت ضائع کیا۔''

''بیٹھو، باہر بارش ہے۔''

''نہیں تاریکی پھیل رہی ہے۔ ویسے بھی وقت کافی گزر چکا ہے۔''

''مرضی ہے تمہاری۔'' راجا ناصر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ تھانے کی عمارت سے باہر نکلتے ہوئے میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو اپنے قریب بلایا اور اس سے پوچھا۔

''کہاں ہے وہ لڑکی۔''

''وہ تو چلی گئی میڈم۔''

''اتنی تیز بارش میں۔''

''میں نے کہا تھا اس سے کہ وہ باہر درخت کے نیچے بیٹھ جائے اور جب بارش رکے تو چلی جائے مگر وہ مانی نہیں۔'' ہیڈ کانسٹیبل نے نظر چراتے ہوئے کہا اور میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنی گاڑی کی سمت بڑھ گئی۔ بارش اب ہلکی ہوگئی تھی۔ لیکن اس نے سڑیں جل تھل کر دی تھیں۔ ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ کئی گاڑیاں سڑکوں پر بند ہوگئی تھیں۔ اور ان کے مالک انہیں یہیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ میں اپنی گاڑی اسٹارٹ کر کے چل پڑی۔ مجھے کچھ مخصوص راستوں سے گزرنا تھا۔ ایک خاص سڑک پر پہنچنے کے لیے مجھے کوئی چار کلومیٹر کا راستہ طے کرنا پڑتا۔ لیکن ایک پتلی گلی ایسی تھی۔ جو ان دونوں سڑکوں کے درمیان رابطہ تھی اور اس سے فاصلہ کم ہو جاتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسی گلی کا راستہ اختیار کیا۔ یہ جگہ ناہموار تھی اور جگہ جگہ چھوٹے

گڑھوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ کار کی ہیڈ لائٹ جلانی پڑی تھیں۔ اول تو ویسے ہی رات ہو چکی تھی پھر بادلوں نے اور ماحول کو گہرا کیا ہوا تھا۔ تیز روشنیاں ان گڑھوں کو نمایاں کرنے لگیں اور میں حتی الامکان ان سے بچتی ہوئی آہستہ روی سے آگے نکل پڑی۔ میں نے سڑک پر نگاہیں جما رکھی تھیں اور پھر اچانک ہی مجھے ایک گڑھے میں پڑا ہوا ایک انسانی جسم نظر آیا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''کوئی حادثہ ہوا ہے۔ اس چھوٹی سی سنسان سڑک پر تو کوئی واردات بھی بہ آسانی ہو سکتی ہے۔ میں نے بریک پر ہلکا سا دباؤ ڈالا اور کار اس انسانی جسم سے تھوڑے فاصلے پر جا کر رک گئی۔ کار کی ہیڈ لائٹس نے اس جسم کو روشنیوں کی زد میں لے لیا تھا اور اس کے بعد میں پھرتی سے اس کے قریب پہنچ گئی۔ انتہائی دردناک منظر تھا۔ ایک نوجوان لڑکی کو کسی بھاری گاڑی نے کچل دیا تھا۔ نچلا دھڑ پس کر رہ گیا تھا۔ بارش کی چھینٹوں نے قرب و جوار سے خون دھو دیا تھا بعض اندرونی اعضاء نکل کر بکھر گئے تھے۔ میں سکتے میں کھڑی رہ گئی۔ دفعتاً میری نگاہ لڑکی کے نقوش پر پڑی۔ اور میرے بدن میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ میں بے اختیار آگے بڑھی اور اس پر جھک گئی۔ اندازہ بالکل درست تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو پولیس اسٹیشن پر زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔ میرے دل میں غم و اندوہ کا طوفان امنڈ آیا۔ اس بے بسی کی موت پر میرا دل رو پڑا۔ اس کی دردبھری آواز کا ایک ایک لفظ میرے کانوں میں گونج اٹھا اور پھر میرا دل غصے سے بھر گیا۔ اگر راجا ناصر اس کی باتوں کو پاگل پن نہ سمجھتا تو اس کی زندگی بچ سکتی تھی۔ میں شدید غم کے عالم میں وہاں کھڑی ہوئی تھی کہ دفعتاً ہی میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال ابھرا۔

صحافت کی زندگی صوفی صاحب! بہت سے رموز سے واقف کر دیتی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے یوں لگا جیسے راجا ناصر کے انداز میں کوئی خاص بات تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ راجا ناصر نے جان بوجھ کر اس لڑکی کی مدد کرنے سے گریز کیا ہے۔ قانون کا محافظ قانون شکن نہیں ہو سکتا۔ بس یہ شبہ تھا۔ میں کشمکش کا شکار ہوگئی اور پھر اچانک ہی میرے اندر کا احساس جاگ اٹھا اگر راجا ناصر نے جان بوجھ کر اس کی درخواست کو نظر انداز کیا ہے تو وہ خود بھی مجرم ہے۔''

بہرحال میرے اپنے بھی کچھ فرائض تھے۔ میں اپنی کار کی طرف بڑھی کار سے اپنا کیمرہ اٹھایا فلش چیک کیے اور پھر لاش کے قریب پہنچ کر مختلف زاویوں سے اس کی تصویر بنانے لگی۔ ابھی میں اس کام میں مصروف تھی کہ دفعتاً دو تیز روشنیاں مجھ پر پڑیں۔ کسی دوسرے نے بھی غالباً میرے ہی انداز میں مختصر راستہ اختیار کیا تھا اور اس سڑک پر نکل آیا تھا۔ میں نے کیمرہ فولڈ کیا اور اسے جلدی سے کار میں ڈال دیا۔

پھر وہ گاڑی قریب پہنچ گئی یہ پولیس جیپ تھی اور اس میں راجا ناصر موجود تھا وہ جلدی سے اتر کر میرے قریب آ گیا۔

''کیا ہوا۔ کیا بات ہے؟'' میرے بولنے سے پہلے اس کی نگاہ لاش پر جا پڑی اور وہ دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

''اوہو...... کیا یہ تمہاری گاڑی کا شکار ہوئی ہے۔'' راجا ناصر کا لہجہ مصنوعی تھا۔ میں نے غصیلی نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہا۔

''ہوئی تو نہیں ہے۔ لیکن اگر تم چاہو تو اسے میرے سر ڈال سکتے ہو۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ حادثہ کسی بھاری گاڑی سے ہوا ہے۔ تمہاری ننھی سی کار یہ کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتی۔''

''شکریہ میرا تو خیال تھا تم مجھے فوراً ہی ہتھکڑیاں لگا دو گے۔''

''تعجب ہے اس چھوٹی سی سڑک پر بھاری گاڑی کہاں سے آ گئی۔ ویسے حادثہ ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری۔''

''تمہیں اس بات پر تعجب نہیں ہوا راجا ناصر! کہ یہ وہی لڑکی ہے جو اب سے تھوڑی دیر قبل تمہارے سامنے کھڑی تم سے زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔ تمہیں بتا رہی تھی کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔''

''ایں...... ہاں، واقعی یہ تو وہی ہے۔'' راجا ناصر کا لہجہ اب بھی مصنوعی مصنوعی سا تھا۔ پھر وہ بولا۔

''مگر واقعی کیا...... کیا......''

''ہاں...... تم نے اسے بارش میں پولیس اسٹیشن سے نکال دیا تھا۔''

''مجھے کیا پتا تھا کہ سچ مچ موت اس کا تعاقب کر رہی ہے۔'' راجا ناصر بولا۔ پھر اس نے اپنے آدمیوں کو ضروری ہدایات کیں اور دو کانسٹیبل جیپ میں بیٹھ کر متعلقہ افراد کو بلانے چلے گئے۔ جنہیں اس کے بعد کی کارروائی کرنا تھی۔ ہلکی پھوار میں میرے کپڑے بھیگ گئے تھے لیکن ذہن بہت خراب ہو رہا تھا۔ میرے کانوں میں مسلسل لڑکی کی آواز گونج رہی تھی۔

''سر وہ لوگ مجھے آپ کے پاس نہیں آنے دے رہے تھے۔ یہ میری زندگی کا سوال ہے۔ اگر آپ نے، اگر آپ......'' دفعتاً راجا ناصر چونک کر میری طرف بڑھا اور بولا۔

''کل تم اس حادثے کے بارے میں خبر شائع کرو گی۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''یہ بتاؤ۔ رابعہ ہمارے تمہارے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔''

''کیا مطلب میں سمجھی نہیں۔''

''میں چاہتا ہوں کہ اس چھوٹی سی خبر کو تم اپنے اخبار میں جگہ نہ دو۔ ممکن ہے تم اس لڑکی کے لیے جذباتی ہو گئی ہو۔ کیونکہ تمہارے سامنے زندہ تھی مگر یہ سوچ کر ایسے سینکڑوں واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے بھول جاؤ کہ تم وہاں موجود تھیں۔'' صوفی صاحب میں خاموشی سے راجا ناصر کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر میں نے سوال کیا۔

''مگر یہ تھی کون۔''

''میں نہیں جانتا بھٹکتی ہوئی آئی تھی الٹی سیدھی باتیں کر رہی تھی اس لیے میں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ تم سوچو کتنی الجھنیں ہوتی ہیں ہمارے پاس ان الجھنوں میں اس قسم کی لڑکیوں کے بارے میں گنجائش کہاں نکلتی ہے۔ میں نے اسی لیے اسے نظر انداز کر دیا تھا۔ سنو رابعہ تم ان واقعات کو پوشیدہ رکھو۔ بس میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا اور میری درخواست ہے کہ اب تم یہاں سے چلی جاؤ اور پولیس کو اس کا کام کرنے

دو۔'' راجا ناصر کے انداز میں ایسی بات میں نے پہلے کبھی نہیں پائی تھی۔ مصلحت نے مجھے محتاط کر دیا۔ میں خاموشی سے اپنی کار تک پہنچی اور اسے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دیا۔ یہ فیصلہ تو اب مجھے کرنا تھا کہ میں اس سلسلے میں کیا اقدامات کروں گی۔ جہاں تک بات اس سنسنی خیز خبر کی تھی۔ تو اس کے لیے میں واقعی کوئی دشمنی مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ لیکن میں اس لڑکی کا خون بھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔ ایک ذمے دار افسر نے میرے سامنے مجرمانہ غفلت کا ثبوت دیا تھا اور میرا ضمیر اس غفلت کی پردہ پوشی کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ اگر لڑکی کو پولیس کی پناہ مل جاتی تو وہ شاید اس حادثے کا شکار نہ ہوتی۔

ناصر کے رویے سے میرے ذہن میں پہلے ہی شبہات نے سر ابھارا تھا اب مجھے یقین سا ہوتا جا رہا تھا کہ ناصر کسی خاص مقصد کے تحت لڑکی کو نظر انداز کر رہا ہے۔ ممکن ہے وہ کسی کا آلہ کار ہو اور جب لڑکی تھانے جا کر اس سے ملی ہو تو اس نے کسی کو اس کی اطلاع بھی دی ہو۔ اچانک ہی مجھے پولیس اسٹیشن کے قریب ایک چھوٹا سا ہوٹل یاد آ گیا جو ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ جب میں پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی تھی۔ تب بھی یہ کھلا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں یہ خیال میرے ذہن میں پختہ ہو گیا اور دوسرے لمحے میری کار کا رخ بدل گیا۔

چھوٹے سے ہوٹل میں دو چار آدمی میزوں پر نظر آ رہے تھے کاؤنٹر پر بیٹھے دبلے پتلے شخص کے چہرے پر زردی کے آثار نمایاں تھے۔ میں اسے دیکھ کر خواہ مخواہ مسکرا دی اور وہ چونک کر پہلو بدلنے لگا۔ ویٹر سے چائے طلب کر کے میں اس کی چسکیاں لیتی ہوئی کاؤنٹر کلرک کو دیکھ کر مسکراتی رہی پھر جب میں بل ادا کر کے اٹھی تو سیدھے کاؤنٹر پر پہنچی۔ کاؤنٹر کلرک خاصا بے قرار ہو چکا تھا۔ میں نے بڑی لگاوٹ سے کہا۔

''کیا میں ایک فون کر سکتی ہوں جناب اس نے خاموشی سے فون اُٹھا کر میرے سامنے رکھ دیا۔''

''پریشان نظر آ رہے ہیں آپ۔''

میں نے یونہی ایک نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں تو...... مگر تم مسکرا کیوں رہی ہو۔''

''آپ کی پریشانی کو جانتی ہوں میں۔ آپ کی پریشانی کی وجہ سامنے والا پولیس اسٹیشن بھی ہو سکتا ہے۔ سچ بتانا کیا پولیس والے تمہیں پریشان نہیں کرتے۔''

''بادشاہ لوگ ہیں کوئی ان کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔''

''ابھی ایک دو گھنٹے قبل انچارج صاحب نے یہاں سے فون کیا تھا اور کال کے پیسے بھی نہیں دیے تھے۔''

''تم کال کی بات کر رہی ہو۔ یہاں چائے یا کافی کے پیسے بھی نہیں ملتے۔''

''فون تو کیا تھا نا انہوں نے۔''

''ہاں۔ تھانے کا فون خراب تھا۔''

''کتنی دیر پہلے کی بات ہے۔''

''دو گھنٹے کے قریب ہو گئے۔''

''کسی لڑکی کو فون کیا ہو گا۔''

''مجھے کیا معلوم تھا مجھے تو کاؤنٹر سے بھگا دیا گیا تھا۔'' کلرک نے جواب دیا۔ میں نے ریسیور

واپس رکھ دیا اور کہا۔

''شاید دوسری طرف کا فون خراب ہے بارش کی وجہ سے۔'' میں دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ بے چارہ کاؤنٹر کلرک حیرت سے منہ کھولے مجھے جاتے دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیا سوچ رہا ہوگا میرے بارے میں، لیکن میرا شبہ کتنا درست نکلا تھا۔

بہرحال میرے لیے یہ ایک انتہائی دکھ بھرا مسئلہ بن چکا تھا۔ صوفی صاحب! آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں آپ کا وقت ضائع کرنے آ گئی ہوں اور اتنی لمبی کہانی سنانے بیٹھ گئی ہوں۔ صوفی صاحب بلاوجہ کبھی کوئی کسی کی طرف کا رخ نہیں کرتا۔ کچھ معلومات مجھے آپ کے بارے میں تھیں۔ جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے صوفی صاحب بس یوں سمجھ لیجیے کہ متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ جرنلزم میں ماسٹرز کیا تھا ویسے بھی زندگی کے الجھاوے اتنے تھے کہ میں جانتی تھی کہ مجھے ملازمت کر کے زندگی گزارنا ہوگی۔ صوفی صاحب میں اپنی شخصیت کو بھول گئی اور میں نے صحافت کا پیشہ اپنا لیا اور بس ظاہر ہے اس زندگی میں پولیس سے رابطے پڑتے ہیں۔ راجا ناصر تھوڑا سا خوش ذوق بھی تھا پتا نہیں اسے کیا ہو گیا تھا۔ سر! میں آپ سے بے حد شرمندہ ہوں اصل میں آپ کے پاس آنے کا مقصد۔''

''آپ مجھے اپنے بارے میں بتاتی رہیے۔ درویش ویسے آپ پر بھی رحم کریں مجھ پر بھی۔''

''صوفی صاحب! آپ مجھے وقت دے رہے ہیں کوئی مصروفیت تو نہیں ہے نا۔''

''یہ بھی ایک مصروفیت ہے۔ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم محافظت کے شعبے میں بھی برائیوں کا شکار ہیں۔'' لیکن بہرحال صوفی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''سر! اس کے بعد میں نے ان تمام معاملات پر غور کرنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنے گھر پہنچنے کے بعد اپنے ذہن میں اس معصوم لڑکی کی زندگی کا خاکہ بنانا شروع کر دیا۔ شکل و صورت اور لباس سے وہ ایک متوسط گھرانے کی فرد معلوم ہوتی تھی۔ سر کہنے کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ یہ جملہ ادا کرنے کی عادی ہے۔ ممکن ہے کسی دفتر وغیرہ میں ملازمت کرتی ہو۔ دوسری بات یہ کہ وہ ذہنی طور پر غیر متوازن نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اس کے غم آلود چہرے سے پتا چلتا تھا کہ کسی ذہنی حادثے کا شکار ہوئی ہے۔ لیکن زندگی کے خوف نے وقتی طور پر اس حادثے سے ذہن ہٹا دیا ہے۔ گویا اس حادثے کے بعد بھی وہ زندہ رہنے کی خواہش مند تھی۔ نمبر تین یہ صوفی صاحب کہ وہ لوگ جو اس کی زندگی کے گاہک تھے اس کی پولیس اسٹیشن پر موجودگی سے واقف تھے اور باہر اسکا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن صوفی صاحب یہ سوچتے ہوئے میرے ذہن میں کچھ الجھن پیدا ہوگئی تھی۔ یہاں راجا ناصر کا کردار مشکوک ہو جاتا تھا۔ کیا ان لوگوں کو یقین تھا کہ لڑکی پولیس کی مدد حاصل نہیں کر سکے گی اور ان کا یقین اس قدر مکمل نکلا کہ انہوں نے اطمینان سے اس کا تعاقب کر کے اسے قتل کر دیا۔ اس صورت میں گویا راجا ناصر اس شخصیت سے واقف تھا اور کسی طور اس کے لیے مجبور بھی کہ اس کے خلاف کسی کی مدد نہ کرے۔ اس آخری بات نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ایک ذمے دار صحافی کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ حکام بالا کو اس شخص کے ذاتی کردار سے آگاہ کروں جس نے اپنے فرض سے مجرمانہ غفلت برتتے ہوئے اپنے پیشے اور محکمے کو بدنام کیا۔ لیکن راجا ناصر کی شخصیت اور اس سے پہلے میری اس سے واقفیت اور اس

کی شخصیت اور اس کا کردار اس بات کی تردید کرتے تھے۔ لیکن کوئی نہ کوئی گرہ ضرور تھی۔

بہرحال راجا ناصر نے ایک طرح سے دھمکی کا انداز اختیار کیا تھا کہ یہ خبر میں اخبار کو نہ دوں۔ لیکن اگر اس نے اپنے فرض سے غفلت برتی تھی۔ تو کم از کم میں اپنے فرض سے غفلت نہیں برتنا چاہتی تھی۔ میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ راجا ناصر میرے نکلتے ہی میرے پیچھے پیچھے کیوں چلا آیا تھا جب کہ اس سے قبل اس نے کہیں جانے کا تذکرہ بھی نہیں کیا تھا اور خاص طور سے اس سڑک پر جہاں لاش موجود تھی۔ میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے ایک ننھا ساڈکٹو ریکارڈر نکال کر اسے فون سے منسلک کر دیا میں نے یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ میں یہ رپورٹ اخبار کو نہیں دوں گی اور اس سلسلے میں اپنی معلومات پوشیدہ رکھوں گی لیکن راجا ناصر کو مجھے حقائق سے آگاہ کرنا پڑے گا۔ لڑکی کی موت کی خبر اگر اخبارات میں نہ آئی تو میں اسے مجبور کروں گی کہ وہ لڑکی کے بارے میں تفتیش کر کے مجھے اس سے آگاہ کرے۔

بہرحال میں یہ فیصلہ کر کے مطمئن ہو گئی تھی رات کو کوئی سوا گیارہ بجے کے قریب راجا ناصر کا فون آیا۔

''ہیلو۔''

''کیا سو گئی تھیں۔''

''نہیں۔''

''میں تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں۔''

''تو پھر آ جاؤ۔'' میں نے جواب دیا اور تقریباً بیس منٹ کے بعد راجا ناصر میرے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ البتہ اس دوران میں نے کچھ بندوبست کر لیا تھا اور راجا ناصر کی آواز ریکارڈ کرنے کے سارے انتظامات کر لیے تھے۔ راجا ناصر پولیس والا تھا۔ اس کے چہرے سے کوئی احساس نہیں ہو رہا تھا چنانچہ وہ کافی کی فرمائش کر کے بیٹھ گیا۔ کافی پیتے ہوئے اس نے کہا۔

''میں اکثر تمہارے بارے میں سوچتا ہوں رابعہ! تمہاری زندگی بہت عجیب ہے کیا تمہیں کسی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔''

''میں سمجھی نہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم اپنے پیشے کے لیے نہایت موزوں ہو۔ لیکن اس ملک میں اتنے ذہین لوگوں کی قدر ذرا مشکل سے ہی ہوتی ہے۔ بہرحال میں تم سے اپنے آنے کا مقصد چھپانا نہیں چاہتا۔ میں اس لاش کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔''

''ہاں بولو...... کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''کیا تم نے اس سلسلے میں کوئی رپورٹ تیار کی ہے۔''

''نہیں میں نے تم سے تعاون کا فیصلہ کیا ہے۔''

''زندہ باد...... واقعی مجھے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہے کم از کم مجھے اتنا ضرور کرنا چاہیے تھا کہ اسے بہ حفاظت اس کے گھر تک پہنچوا دیتا۔ مگر بس بارش کے موسم نے ذہن پر یہ کاہلی طاری کر دی تھی۔''

''اور......'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں میرا مقصد ہے کہ......''

''سوری راجا ناصر! میں نے یقین نہیں کیا تمہاری بات پر۔''

''کیوں؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''تم کہولت کا شکار نہیں تھے۔ کیونکہ تھوڑی ہی دیر کے بعد تم جیپ میں بیٹھ کر باہر نکل آئے تھے'' میری چبھتی ہوئی آواز نے راجا ناصر کا چہرہ پھیکا کر دیا۔ وہ تلخ لہجے میں بولا۔

''تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''برا تو نہیں مانو گے میری بات کا؟''

''اس کی پروا مت کرو تم۔''

''تم صرف میرے تعاقب میں نکلے تھے۔ تمہیں احساس تھا میں لڑکی کے معاملے میں سنجیدہ ہوگئی ہوں، کیا سمجھے۔ تم نے اسے پاگل ثابت کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی تھی۔''

''تم میری توہین کر رہی ہو۔''

''میں نے پہلے ہی تم سے معذرت کی تھی۔ ویسے میں تمہیں بتا دوں کہ یہ خبر میں نے اپنے اخبار کو نہیں دی۔ جب کہ میرے پاس لاش کی تصویریں بھی موجود تھیں۔''

''کیا؟'' راجا ناصر اچھل پڑا۔

''ہاں کیمرا میری کار میں موجود تھا ظاہر ہے ایک صحافی کے لیے ضروری تھا۔ بہر حال میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ ایک دوست کی حیثیت سے میں تمہارے مفاد کے خلاف کوئی کام نہیں کروں گی۔ لیکن تم مجھے اس لڑکی کے بارے میں پوری تفصیل بتاؤ گے اور میں جانتی ہوں کہ تمہیں اس کی موت اور دشمنوں کے بارے میں مکمل تفصیلات معلوم ہیں۔''

''گویا تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتی ہو۔'' راجہ ناصر نے کہا۔

''جو کچھ بھی تم سمجھو۔'' راجا ناصر مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔

''میں نے لاش ضروری کارروائیوں کے بعد اسپتال پہنچا دی ہے۔ میرے رجسٹر میں اس کا اندراج ہو چکا ہے۔ لاش سے کوئی ایسی چیز برآمد نہیں ہوئی جو معلومات کا ذریعہ بن سکتی۔ اسپتال میں اس کے بارے میں رپورٹنگ ہو چکی ہے۔ صبح کو اس کی تصویر اخبارات میں شناخت کے لیے چھپ جائے گی۔ یہ کارروائی ہو چکی ہے۔ مجھے صرف اتنا سا افسوس ہے کہ وہ میرے پاس آئی تھی اور میں اس پر توجہ نہیں دے سکا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ بات منظر عام پر آئے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں یہ تفصیل کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ لیکن ایک بات نوٹ کر لو راجا ناصر، مجھے اس لڑکی کے بارے میں مکمل تفصیل درکار ہے اور یہ میرا مشن بن چکی ہے۔''

''تم ضد کر رہی ہو اور میں اس ضد کو ناپسند کرتا ہوں یہ بات ہمارے درمیان شدید اختلاف کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔ او کے۔''

''ارے ارے کافی تو پیو۔'' لیکن وہ رکے بغیر باہر نکل گیا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ وہ سخت غصے کے عالم میں گیا ہے۔ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے آرام سے ڈکٹو ریکارڈر اٹھایا اور اسے ریوائنڈ کر کے وہ آواز سننے لگی۔ کارکردگی تسلی بخش تھی اس میں راجا ناصر کا وہ اعتراف موجود تھا۔ جس میں اس نے بتایا تھا کہ لڑکی موت سے پہلے اس سے ملی تھی۔

بہر حال میں نے خاموشی سے وقت گزارا اپنی کافی ختم کی اور رات کو نہ جانے کس وقت تک میرا ذہن ان گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ دوسری صبح کے تمام اخبارات چائے کے ساتھ مل گئے۔ میرے اخبار میں اس بارے میں کوئی رپورٹ نہیں تھی۔ لیکن دو اخبارات میں انتہائی چھوٹی سی جگہ پر ایک کالمی خبر لگی ہوئی تھی۔ نامعلوم گاڑی نے دوشیزہ کو کچل دیا۔ مقامی پولیس اسٹیشن کے انچارج جب بارش کے دوران گشت پر نکلے تو ایک سڑک پر انہیں ایک نوجوان دوشیزہ کی کچلی ہوئی لاش نظر آئی۔ جسے کسی بھاری گاڑی نے کچل دیا تھا۔ پولیس نے لاش قبضے میں لے لی ہے اور گاڑی کی تلاش میں مصروف ہے۔

بہر حال یہ تھی یہ ساری تفصیل، میں نے سب سے پہلے وہ رول لیا جس میں تصویریں موجود تھیں اور اس کے بعد میں اسے لے کر اپنے دفتر پہنچ گئی۔ لیکن اپنے ایڈیٹر کو میں نے بہت ہی مختصر الفاظ میں ایک کہانی گھڑ کر سناتے ہوئے کہا یہ تصویریں بڑی خاموشی کے ساتھ پرنٹ کرالی جائیں۔ ان کے کہنے سے میں نے مختصر الفاظ میں صرف اتنا کہا کہ بعض اوقات ہمیں اپنے پیشے سے بے ایمانی کرنا ہوتی ہے اور مصلحت سے کام لینا ہوتا ہے۔ میرے ایڈیٹر صاحب مجھ سے بحث کرتے رہے اور پھر بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن اس وقت میں ششدر رہ گئی۔ جب میرے ایڈیٹر صاحب ہی نے مجھے طلب کیا اور بولے۔

''جو لڑکی ان تصویروں میں مقتول نظر آئی ہے۔ مجھے اس کے بارے میں معلومات حاصل ہوگئی ہیں۔ ہمارا فوٹو گرافر اسے پہچانتا ہے۔''

''اوہ میرے خدا...... کیا اس کے بارے میں کچھ تفصیل پتا چلی۔''

''ابھی نہیں...... میں نے اسے بلایا ہے۔'' فوٹو گرافر ایک نوجوان آدمی تھا۔ ایڈیٹر صاحب اس سے تصویروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگے۔ تو اس نے کہا۔

''جی سر! یہ لڑکی ہمارے پڑوس میں ہی رہتی ہے۔ پچھلے دو سال سے میں اسے دیکھ رہا ہوں جس بس اسٹاپ سے میں سوار ہوتا ہوں۔ اس سے یہ بھی ہوتی ہے۔''

''اس کا مکان بھی معلوم ہے تمہیں۔''

''نہیں جناب! لیکن قریب ہی رہتی ہے۔''

''ہوں، اچھا کیا آج وہ بس اسٹاپ پر نظر آئی تھی۔''

''نہیں سر! آج نہیں دیکھا میں نے اسے۔''

''کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ وہ صبح ہی صبح کہاں جاتی ہوگی۔''

''معلوم نہیں! لیکن کہیں نوکری ہی کرتی ہوگی۔''

''اسکول یا کالج کا وقت بھی یہی ہوتا ہے۔''

''جی نہیں۔ وہ کالج کی طالبہ نہیں تھی۔''

''لباس کیسا پہنتی تھی وہ۔''

''بس صاف ستھرا لیکن معمولی۔''

''کبھی اس کے ساتھ کوئی مرد وغیرہ نظر نہیں آیا۔''

''کبھی نہیں۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ ایک حادثے کا شکار ہوگئی ہے۔''

''جی۔ اس کی تصویریں بناتے ہوئے مجھے بڑا دکھ ہوا ہے۔''

''مجھے بتاؤ رفیق! کیا اس سلسلے میں تم میری کوئی مدد کر سکتے ہو۔''

''کیسی مدد میڈم۔''

''ہم اس لڑکی کا گھر تلاش کریں گے۔ تمہیں ایک دو تصویریں ذرا ایسی بنانی ہیں کہ کلوز اپ ہوگا۔''

''جیسا آپ حکم کریں۔'' میرے ایڈیٹر صاحب نے اس کے جانے کے بعد مجھ سے پوچھا۔

''یہ رول تمہارے پاس موجود ہے جب کہ کسی اخبار میں ایسی کوئی چیز نہیں چھپی۔ تم مجھے بتاؤ کیا تمہیں اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہیں۔'' میں سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ بلاشک وشبہ میرے اخبار کے ایڈیٹر صاحب ایک شریف النفس انسان تھے میں نے کچھ لمحے سوچا۔ پھر میں نے ان سے کہا۔

''جی سر۔ میں نے کل شام اس لڑکی کو زندہ سلامت پولیس اسٹیشن پر دیکھا تھا۔ وہ تھانے کے انچارج کے سامنے گڑگڑا رہی تھی کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ لیکن انچارج صاحب کا خیال تھا کہ وہ پاگل ہے چنانچہ اس پاگل پر انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی اور اس کے بعد اس کی کچلی لاش ایک سڑک پر پائی گئی۔

''اوہ میرے خدا۔'' ایڈیٹر صاحب نے کہا اور پھر چونک کر بولے۔

''وہ انچارج راجا ناصر تو نہیں ہے۔''

''جی۔''

''یہ تصویریں تمہیں کہاں سے مل گئیں؟''

''سب سے پہلے میں نے اس لاش کو دیکھا تھا اور پولیس کے پہنچنے سے قبل میں نے اس کی تصاویر اتار لیں۔'' ایڈیٹر صاحب گہری سوچ میں ڈوب گئے پھر بولے۔

''تمہارے سینے میں جو جذبہ پرورش پا رہا ہے وہ قابل احترام ہے رابعہ، بلاشبہ ایک سچے انسان کے سینے میں برائی کے خلاف کھڑے ہونے کی لگن ہوئی ہے۔ لیکن احتیاط بھی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے تم کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہونا۔ میں تمہارے جذبے کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ لیکن بیٹی میں نے اپنی پوری زندگی اسی دشت کی سیاحی میں گزاری ہے۔ عمر کے اس آخری دور میں اگر اپنی ذات کے سکون کے لیے کوئی راستہ ملتا ہے۔ تو میں اس پر دوڑنے کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔''

''شکریہ سر۔ میں اس مظلوم لڑکی کی اس آواز کو مرتے وقت تک نہیں بھول سکوں گی جس میں وہ اپنی زندگی کے لیے گڑگڑا رہی تھی۔''

بہرحال ہم لوگوں نے کام کا آغاز کر دیا۔ میں نے راستے میں اپنے فوٹو گرافر سے اس لڑکی کے

بارے میں پوچھا۔

''تم نے کبھی اس کا نام معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

''نہیں میڈم! آپ یقین کریں وہ بے حد شریف لڑکی تھی۔ اب آپ سے میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے کوشش کی تھی۔ لیکن اس نے کبھی توجہ نہیں دی۔ بس وہ نظریں جھکائے رہتی تھی۔ مجھے اس کی لاش دیکھ کر سخت صدمہ ہوا ہے۔''

''کیا ہم اس کا گھر تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

''ہاں کیوں نہیں۔ چھوٹا سا علاقہ ہے۔''

''ٹھیک۔'' کچھ دیر کے بعد کار ایک نواحی بستی میں داخل ہوگئی۔ ہم لوگ گھر تلاش کرتے ہوئے آخر کار ایک مکان تک پہنچ گئے۔

''یہ میرا گھر ہے اگر آپ یہاں تھوڑی دیر انتظار کر لیں تو میں خود جا کر معلومات حاصل کروں۔''

''ویری گڈ...... یہ بہت اچھا رہے گا۔'' میں مکان میں داخل ہوگئی۔ فوٹو گرافر کی بیوی بچوں نے میرا بہت اچھی طرح استقبال کیا تھا اور جو کام بے چارہ فوٹو گرافر کرنے کے لیے گیا تھا۔ وہ اس کے بیوی بچوں نے کر دیا۔

پڑوس کے ایک مکان میں ایک لڑکی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ جس کی تصویر اخبار میں چھپی تھی۔ یہ بات گھر سے ہی پتا چل گئی اور صوفی صاحب اس کے بعد ہمیں بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ جن سے یہ اندازہ ہوگیا کہ لڑکی کسی بہت بڑے آدی کی درندگی کا شکار ہوئی اور بڑے آدمی نے پولیس کو بھی اپنے قبضے میں کر لیا۔ صوفی صاحب میرے دل کے ٹکڑے ہوگئے میں نے اپنے ایڈیٹر سے بات کی تو انہوں نے غمگین انداز میں مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بس کیا کیا جائے۔'' لڑکی کا نام دردانہ تھا اور بے چاری ملازمت کرتی تھی، سترہ سال کا ایک چھوٹا بھائی تھا جو پڑھ رہا تھا۔ بس آپ یہ سمجھ لیجیے کہ یہ ان کے گھر کے حالات تھے۔ لیکن صوفی صاحب اس کے بعد جو ہوا وہ انتہائی دردناک حادثہ تھا۔ پہلے تو اس بات کو صرف ایک حادثہ قرار دیا جا رہا تھا لیکن پھر اس کے بعد اچانک ہی دو تین دن کے بعد اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی۔ جس میں دردانہ کے قتل کا ذمے دار اس کے سترہ سالہ بھائی حفیظ کو قرار دیا گیا۔ اسے بہن کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور اس کی کہانی یوں بنائی گئی کہ خوب صورت دردانہ ایک فرم میں ملازمت کرتی تھی اور ماں اور بھائی کی کفالت کے لیے روزی کماتی تھی۔ لیکن کچھ عرصے قبل اس کے بھائی کو شبہ ہوگیا کہ اس کا چال چلن خراب ہے اس نے کئی بار بہن کو سمجھایا لیکن دردانہ نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی۔ کیونکہ بھائی خود اس کے زیر کفالت تھا۔ آخر کار غیور بھائی بہن کی اس روش کو برداشت نہیں کر سکا اور اس نے دردانہ کو قتل کر کے اسے ٹرک کے حادثے کی شکل دے دی۔ پولیس نے حفیظ کو گرفتار کر لیا ہے اور اس سے پوچھ گچھ کر رہی ہے۔

بس یہ تھی صورت حال میں نے ایڈیٹر صاحب سے کہا وہ کسی قدر جھلائے ہوئے سے تھے۔ کہنے لگے۔

''بابا میں کیا کروں۔ میں خود تو ان تمام چیزوں کا ذمے دار نہیں ہوں۔''

''لیکن ایڈیٹر صاحب۔''

''بس پلیز......بس۔''

''اس کے بھائی کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور اس کے پس منظر میں ضرور کوئی کہانی ہے۔''

''تو پھر تم یوں کرو کہ جس طرح بھی تم سے بن پڑے۔ یہ کہانی معلوم کرنے کی کوشش کرو۔ تمہیں سمجھانے کی ہر کوشش تو ناکام ہوگئی ہے۔'' ایڈیٹر صاحب نے کہا اور صوفی صاحب مجھے یوں لگا جیسے واقعی میں کبھی کچھ نہیں کرسکوں گی۔ کیا میں واقعی کچھ نہیں کرسکوں گی؟ صوفی صاحب نہ جانے کب سے بھاگ دوڑ کر رہی ہوں میری حفیظ سے ملاقات تک نہیں ہوسکی۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی کو جاننے کی سزا دی گئی ہے اسے۔ پھر میں نے وکیل فرقان جلیل صاحب سے ملی اور فرقان جلیل نے مجھے کہا کہ اگر تم ایک بے لوث اور انسانیت کے نام پر کسی مددگار کی ضرورت مند ہو تو یہ پتا میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ میں خود بھی آپ کو تھوڑا بہت جانتی تھی صوفی صاحب۔ لیکن فرقان جلیل صاحب نے مجھے یہ پتا دے کر آپ کے پاس بھیجا ہے اور میں نے پوری کہانی آپ کے گوش گزار کردی ہے۔''

صوفی نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا رابعہ سلطان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

صوفی کے چہرے سے اس کی کیفیات کا پتا چلا لینا ناممکنات میں تھا البتہ وہ زور زور سے جگالی کر رہا تھا اور اس کی پتلی داڑھی عجیب بہار دے رہی تھی۔ نہ جانے کیوں رابعہ سلطان کو اسے دیکھ کر غصہ آ گیا۔

''آپ بڑے بے رحم انسان ہیں!'' وہ روتے روتے چیخ کر بولی۔

''در......درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی بے اختیار بولا

''درویش یہ دعائیں بھی کرتے ہیں۔'' وہ غرا کر بولی۔

''نن نہیں۔ مطلب ہے کہ......''

''میں اتنی دیر سے رو رہی ہوں آپ نے مجھے خاموش کرانے کی کوشش نہیں کی۔''

''در درویش رحم کریں۔ ہمیں آتا نہیں ہے۔''

''کیا!''

''خواتین کو خاموش کرانا۔'' صوفی نے درد بھری آواز میں کہا اور رابعہ بے اختیار ہنس پڑی۔ صوفی کا چہرہ ہونق ہو رہا تھا۔

''آپ نے شادی نہیں کی؟''

''اسی لیے نہیں کی۔''

''کس لیے؟''

''خواتین ناقابل فہم ہیں ہمارے لیے۔''

''کیوں؟''

''پتا نہیں۔''

''نہیں آپ مجھے بتائیے۔''

''کک کیا۔''

''ابھی خود آپ نے کہا ہے۔''

''بہت سی باتیں کہیں ہیں ہم نے درویشوں کی دعاؤں سے۔ آپ کا اشارہ کس طرف ہے۔'' صوفی نے سادگی سے کہا۔

''آپ نے کہا تھا۔''

''ارشاد ارشاد۔'' صوفی بولا۔

''یہ نہیں کہا تھا۔'' رابعہ ہنس پڑی۔

''تو پھر......''

''آپ بھی بس کمال ہیں صوفی صاحب۔''

''بس ایسا ہی ہے درویشوں کے کرم سے اور آپ دیکھیے نا ابھی کچھ لمحے قبل آپ رو رہی تھیں اور اب ہنس رہی ہیں۔''

''رو رہی تھی میں اس مظلوم گھرانے کے اوپر اور ہنس رہی ہوں آپ پر اتنے بڑے بڑے کارناموں کے سلسلے میں آپ کا نام لیا جاتا ہے اور آپ ایک خاتون کو خاموش نہیں کرا سکتے!''

''آپ یقین کریں وہ کارنامے کچھ بھی نہیں ہیں کسی خاتون کے آگے، اور پھر تو یہ بڑے بڑے ذہین لوگ کہہ گئے ہیں کہ عورت کو خاموش کرانا ایک ناممکن بات ہے۔ ہم بھلا یہ کیسے کرسکتے تھے۔'' نہ جانے کیوں رابعہ سلطان کے ذہن میں ایک عجیب سی لہر آ کر رہ گئی۔ کیا انسان اتنا معصوم بھی ہوتا ہے۔ شخصیتوں کے کتنے روپ ہوتے ہیں۔ یہ شخص جو چہرے مہرے اور جسمانیت کے لحاظ سے کسی کے لیے بھی قابل توجہ نہیں ہوگا، جو یہ کہتا ہے کہ اسے خواتین کو خاموش کرانا نہیں آتا۔ وہ کیا ہوگا۔ کیسا ہوگا۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں کیا کچھ نہیں ہوگا۔ کیا انسان صرف اچھے چہروں سے ہی محبت کرے وہ جو خوب صورت نہیں ہوتے اگر کوئی ان کے سینوں میں جھانک کر دیکھے تو ان کے دل کہیں زیادہ حسین ہوتے ہیں۔ اس نے محبت بھری نگاہوں سے صوفی کو دیکھا۔ صوفی کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد صوفی کی آواز ابھری۔

''دو......درویش رحم کریں۔''

''درویشوں سے آپ کا بڑا گہرا تعلق لگتا ہے۔'' رابعہ سلطان مسکرا کر بولی۔

''ایں......جی......جی ہاں، دو......درویش اور پیر پرستی۔''

''پتا ہے کیوں دل چاہ رہا ہے کہ آپ سے بہت سی ذاتی باتیں کروں۔''

''دل کی باتوں کو نظر انداز کرنا چاہیے۔ نہ جانے کیا کیا چاہنے لگتا ہے آپ اس کے چکر میں نہ پڑیں درویش آپ پر رحم کریں۔''

''درویش......درویش......درویش اس کے علاوہ بھی آپ کی زندگی میں کچھ ہے۔''

''جس کی زندگی میں درویش ہوں اسے کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔'' صوفی نے جواب دیا اور رابعہ سلطان ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔

''آپ واقعی بڑے عجیب انسان ہیں صوفی صاحب۔''

''اچھا۔ ہوسکتا ہے آپ کا کہنا درست ہو۔''

''پھر بتایئے۔ کیا فیصلہ کیا آپ نے؟''

''کچھ وقت دیں گی آپ ہمیں۔''

''میں تو آپ کے پاس ہی موجود ہوں۔''

''ہمارا مطلب ہے کہ نا موجود ہوکر۔'' صوفی نے کہا اور رابعہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں جاؤں۔''

''جی یہی عرض کرنا چاہتے ہیں۔''

''ٹھیک۔ تو پھر آپ ہی بتایئے جس مقصد کے تحت میں آپ کے پاس آئی تھی، اس کے لیے آپ نے کیا سوچا۔''

''ابھی تک کچھ نہیں۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ کی ہدایت کے مطابق میں چلتی ہوں لیکن مجھے صرف یہ بتا دیجیے کہ بعد میں آپ کے پاس آؤں یا نہیں۔''

''نن نہیں...... کیوں نہیں۔''

''ٹھیک ہے میں حاضری دوں گی اور آپ یقیناً کوئی فیصلہ کریں گے۔''

''یقیناً یقیناً محترمہ!'' رابعہ سلطان کا انداز تو ایسا تھا جیسے وہ یہاں سے جانا ہی نہ چاہتی ہو۔ لیکن جانا تو تھا اس کے جانے کے بعد صوفی دیر تک اپنی عادت کے مطابق ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے اسے دیکھتا رہا اسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور صوفی چونک کر اس ٹیلیفون کو دیکھنے لگا۔ جیسے کوئی ان ہونی بات ہوگئی ہو۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر ٹیلیفون کا ریسیور اٹھالیا۔

''صوفی صاحب سے بات کرنی ہے۔''

''بول رہا ہوں درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''واہ...... کیا عقیدہ ہے صوفی صاحب آپ کا۔ یعنی آپ کے منہ سے آواز بھی درویشوں کی دعاؤں سے نکلتی ہے۔''

''کک...... کون صاحب ہیں۔'' صوفی نے سوال کیا۔

''فرقان جلیل بول رہا ہوں۔''

''اخاہ...... وکیل صاحب! کہیے کیسے مزاج ہیں۔'' صوفی خوش اخلاقی سے بولا۔

''بالکل ٹھیک۔ اچھا ایک بات بتایئے۔ کیا محترمہ رابعہ سلطان آپ کے پاس پہنچیں۔''

''جی ہاں۔ ابھی ابھی گئی ہیں۔''

''انہوں نے اپنی آمد کا مقصد تو بتا دیا ہوگا۔''

''درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''صوفی صاحب! معافی چاہتا ہوں کسی برے نظریے سے میں نے انہیں آپ کے پاس نہیں بھیجا مطلب یہ تھا کہ میں خود تو ہر طرح سے اس مسئلے میں آگے قدم بڑھانے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے آپ سے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ کرنل رحیم شاہ اور آپ جس مشن پر کام کر رہے ہیں۔ وہ بڑا بے مثال ہے اور میں آپ کے ساتھ اس میں بھرپور طریقے سے شرکت کرنے پر تیار ہوں۔ رابعہ سلطان نے جس مقتول لڑکی کا کیس بتایا ہے وہ بے چاری دنیا سے بھی چلی گئی اور اس کے بعد اس کا بھائی بھی مصیبت میں ڈال دیا گیا۔ یقیناً اس کے پس منظر میں کوئی کہانی ہوگی۔ کسی نے اپنی زندگی بچانے کے لیے یہ سب کچھ کیا ہے۔ پولیس آفیسر راحد ناصر جیسے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ بک گیا ہوگا۔ بہرحال یہ نہ سمجھیں کہ میں نے صرف آپ ہی کو اس مسئلے میں ملوث کیا ہے بلکہ ہم بھرپور طریقے سے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کام کریں گے اور اس بچے کو مصیبت سے نکالیں گے بلکہ اصل مجرم کو منظر عام پر بھی لائیں گے۔''

''میں آپ کے ساتھ ہوں وکیل صاحب۔''

''پھر آپ یہ بتایئے کہ آغاز کہاں سے کریں گے۔''

''تھوڑا سا وقت دیجیے سوچنے کے لیے جو ہونا تھا وہ تو ہی ہو چکا ہے۔'' صوفی نے اس سلسلے میں فرقان جلیل سے بھی وعدہ کر لیا تھا۔ جہاں تک رابعہ سلطان کا تعلق ہے وہ بہت جذباتی قسم کی لڑکی تھی وہ اپنے طور پر سب کچھ کر دینا چاہتی تھی۔

ادھر اس نے صوفی کے بارے میں سوچا تھا۔ اپنے طور پر جو جدوجہد کر رہی تھی اس میں صوفی کا کردار اس کا نام اس کے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

دوسرے دن وہ اپنے دفتر پہنچی اور ایڈیٹر صاحب سے بات چیت کرنے لگی۔

''جی سر! ہمیں اس سلسلے میں خاصی بھاگ دوڑ کرنی ہے۔''

''مگر کیوں۔'' ایڈیٹر صاحب نے کہا۔

''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں سر!'' اخبارات کا کام اور کیا ہوتا ہے۔ آپ دیکھیے ایک لڑکی کو قتل کر دیا گیا۔ قتل سے پہلے اس نے ایک پولیس آفیسر سے گڑگڑا، گڑگڑا کر مدد مانگی اور اس سے کہا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ اگر پولیس آفیسر نے اس سے لاپروائی برتی تو وہ موت کی آغوش میں چلی جائے گی اور پولیس آفیسر نے اسے دھتکار کر نکال دیا۔ پھر وہی ہوا جس کا لڑکی کو خطرہ تھا۔ وہ ہلاک کر دی گئی۔ نہ صرف ہلاک کر دی گئی بلکہ اس کے معصوم بھائی کو بھی جال میں پھنسا لیا گیا۔ سر! میں ان واقعات کی گواہ ہوں۔''

''وہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو رابعہ...... لیکن۔''

''نہیں سر! یہ لیکن ہی تو سب سے بڑی مشکل ہے اس کائنات میں پتا نہیں ہم اس لیکن سے کب چھٹکارا حاصل کر سکیں گے۔''

''تمہاری عمر کی لڑکیاں اتنی ہی جذباتی ہوتی ہیں۔ بہرحال میں تم سے صرف اتنا کہوں گا کہ جو کچھ کرنا سوچ سمجھ کر کرنا۔ اخبار کی ساکھ متاثر نہ ہو۔ رابعہ نے صوفی کو فون پر کال کیا۔ لیکن صوفی اس وقت کہیں گیا ہوا تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ گرین ہاؤس سے ٹیلیفون آیا تھا اور کرنل رحیم شاہ کی آمد کی اطلاع ملی تھی۔

صوفی اپنی مخصوص سج دھج کے ساتھ کرنل رحیم شاہ کے پاس پہنچ گیا۔ کرنل رحیم شاہ نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا تھا۔

''بھئی صوفی صاحب! اب تو دل چاہ رہا ہے کہ ٹانگ کا کوئی علاج کرا ہی لیا جائے تاکہ آپ کے ساتھ بھاگ دوڑ میں شامل ہو جاؤں۔''

''جناب والا اگر کوئی مناسب علاج ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے تو آپ ضرور یہ علاج کرائیے گا۔''

''ہاں بچے پیچھے پڑ رہے ہیں کہ تھوڑے عرصے کے لیے امریکا جاؤں۔ وہاں سے کچھ معلومات حاصل کر کے آئے ہیں وہ۔ مصنوعی اعضا لگانے والی کچھ کمپنیوں نے ایسے اعضاء تیار کیے ہیں جو بالکل اصل کے مطابق ہوتے ہیں۔ خواہش مند تو خیر میں بھی ہوں۔ ظاہر ہے انسان اپنے اندر کوئی کمی پسند نہیں کرتا۔ یہاں کے معاملات آپ کے سپرد ہیں۔ کچھ وقت لگ جائے گا وہاں مجھے۔''

''کوئی حرج نہیں ہے۔''

''بس میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ آپ سے اجازت لے کر ہی عمل کا آغاز کروں گا۔ مصروفیات کیا چل رہی ہیں آج کل۔'' مختصر الفاظ میں صوفی نے رابعہ سلطان کے بارے میں بتایا تو کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

''بڑے بڑے ایسے ہمارے اردگرد بکھرے ہوئے ہیں بس جو نگاہ میں آ جائے اس پر دکھ ہوتا ہے۔ آپ میرا خیال ہے کام کیجیے۔ میری طرف سے اجازت ہے۔ میں بس تھوڑے سے کام آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً گرین ہاؤس میں ہماری گرین فورس کی دیکھ بھال۔ اس کی نگرانی اور اس کے ذمے داریاں۔''

''جی بالکل۔ میں سمجھ رہا ہوں۔'' صوفی نے جواب دیا۔ کرنل رحیم شاہ بہت دیر تک بتا رہا تھا۔ کرنل رحیم شاہ کا یہ پروگرام خاصا طویل تھا۔ لیکن چونکہ ان دنوں ایسی اور کوئی بات بھی نہیں تھی اس لیے کوئی تردد بھی نہیں ہوا۔ دوسرے دن صوفی معمول کے مطابق اپنے عیش کدے میں عیش کر رہا تھا کہ رابعہ سلطان اس کے پاس پہنچ گئی۔ وہ صوفی کی اجازت پر اندر آنے کے بعد دیر تک کھڑی صوفی کو دیکھتی رہی تھی اور صوفی طرح طرح کے پینترے بدل رہا تھا۔ رابعہ سلطان نے کہا۔

''صوفی صاحب! مجھے آپ کے ماضی کی رپورٹ درکار ہے۔''

''خ خ...... خدا کی قسم ہم نے ماضی میں کوئی ایسا جرم نہیں کیا جو قابل گرفت ہو درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''کیا ہے آپ نے ایک جرم۔'' رابعہ سلطان آگے بڑھ کر ایک پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ج ج...... جرم۔'' صوفی ہکلا کر بولا۔

''جی۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔'' رابعہ نے کہا اور صوفی بھی اچھل پڑا۔

''کک...... کیا فرمایا۔''

''درویشوں کے کرم سے جو کچھ بھی فرمایا صحیح فرمایا۔ اب میں بھی یہی جملہ استعمال کیا کروں گی۔''

''آپ یقین کیجیے بڑی برکت ہوتی ہے درویشوں کے تصور سے اور ہر کام میں ان کا نام شامل کر کے۔''

''اصل میں صوفی صاحب میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔'' رابعہ سلطان نے کہا۔

''کیوں...... کیا اس لڑکے حفیظ کے کیس پر کام کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔'' صوفی نے فوراً ہی کہا اور رابعہ آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

''مطلب؟''

''میرا مطلب ہے پہلے تو آپ اس مسئلے پر کام کر رہی تھیں اب آپ شادی کرنے پر آمادہ ہو گئیں درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''یہ درویشوں کی دعائیں ہیں نا۔ کیا آپ بھی میرے لیے دعائیں کر سکتے ہیں۔''

''میں درویش تو نہیں ہوں۔''

''ہیں تو نہیں مگر بننے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ اچھا خیر چھوڑیے۔ اس وقت اس موضوع پر بات نہیں کرتے آپ یہ بتائیے۔ کیا سوچا ہے آپ نے۔''

''ہم آپ کے ساتھ کام کرنے پر تیار ہیں۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''ہائے ہم۔'' رابعہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور صوفی چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر کہا۔

''آپ نے کچھ فرمایا۔''

''درویشوں کے کرم سے۔'' رابعہ نے کہا اور ہنس پڑی۔

''ج ج...... جی اب بتائیے...... کک...... کہاں چلنا ہے۔''

''آپ بتائیے۔''

''میرا خیال ہے ہم اس بچے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اس جگہ چلیں جہاں وہ رہتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اور پھر صوفی رابعہ کے ساتھ اس علاقے میں پہنچ گیا۔ ایک مکان پر پہنچ کر رابعہ نے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ ایک خاتون نے دروازہ کھولا۔ انہوں نے رابعہ سے کہا۔

''بی بی۔ تم تو پہلے بھی آ چکی ہو شاید۔''

''جی ہاں۔ اسی سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے آئی تھی اور آپ کے شوہر نے میرے ساتھ سختی برتی تھی۔''

''ارے وہ...... ہاں...... بے چارے پریشان رہتے ہیں۔ آ جاؤ...... اندر آ جاؤ تمہارے ساتھ اور کوئی بھی ہے۔''

''جی ہاں...... یہ صاحب ہیں۔''

''اچھا اچھا...... تمہارے ڈرائیور معلوم ہوتے ہیں۔''

''نن...... نہیں۔''

''پھر...... اردلی۔''

''ارے نہیں نہیں ہم دونوں تحقیقات کرنے آئے ہیں۔''

''تو آ جاؤ نا۔ غلام علی کے ابا گھر پر نہیں ہیں۔''

کار آمد باتیں معلوم ہوئی تھیں۔

جب وہ وہاں سے چلنے لگے تو خاتون نے ایک دفعہ پھر یاد دہانی کرائی۔ ''بی بی میرے دو کام ضرور کر ا۔ ایک تو یہ کہ امریکا کو ہمارے ملک میں نہیں گھسنے دینا۔ دوسرے تھوڑی سی چینی سستی کرا دو۔ بہت دن ہو گئے ہیں حلوا کھائے ہوئے۔''

''بہرحال صوفی اور رابعہ سلطان کا اچھا خاصا گٹھ جوڑ ہو گیا تھا۔ رابعہ سلطان تو غالباً سر پھری ہی تھی جو صوفی جیسے آدمی سے اس طرح متاثر ہو گئی تھی لیکن صوفی اپنے کام کے سلسلے میں اب پوری طرح حرکت میں آ گیا تھا۔ چنانچہ مزید کارروائی ہونے لگی۔ گرین فورس کے ممبروں کی فی الحال ضرورت نہیں تھی۔ صوفی اپنے طور پر ہی اس ہلکے پھلکے مسئلے کو حل کر لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا۔ بے چارے حفیظ کو تو بہن کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا لیکن اس کی ماں کہاں غائب ہو گئی۔

رابعہ سلطان اور صوفی دونوں ہی اس اسپتال پہنچے تھے جہاں دردانہ کا پوسٹ مارٹم ہوا تھا۔ اسپتال کی خوب صورت عمارت کی پورٹیکو میں کار رکی تو رابعہ سلطان نے صوفی کا شانہ دبایا اور صوفی کے منہ سے پان کی پچکاری نکلتے نکلتے رہ گئی۔

''یہ کیا صوفی صاحب آپ اپنے منہ میں اتنا سا ملغوبہ بھرے ہوتے ہیں خدا کے لیے اسے تھوکیے۔ صوفی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اسپتال کی خوب صورت عمارت کے فرش پر پان کی پیک تھوک دی۔ رابعہ نے عجیب سے انداز میں اسے دیکھا۔ پھر وہ ایک گہری سانس لے کر گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''سامنے دیکھ رہے ہیں۔''

''کک...... کہاں۔''

''وہ اس طرف دیکھیے۔'' صوفی نے ادھر دیکھا تو اسے راجا ناصر نظر آیا اس کا نام رابعہ نے ہی بتایا تھا۔ راجا ناصر ایک ڈاکٹر سے بات کر رہا تھا۔ اس نے بھی رابعہ کو دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ تیز رفتاری سے آگے بڑھا اور راہداری میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گیا۔

''ہیلو رپورٹر! کہو کیسی ہو؟'' یہ کہہ کر اس نے صوفی پر نگاہ ڈالی۔ وہ صوفی کو نہیں پہچانتا تھا۔ لیکن طنز کرنے سے باز نہ آیا۔

''تو آج کل یہ ہو رہا ہے۔ ویسے تم سے ملاقات مقدر میں لکھی ہوئی تھی۔ کتنا ہی بچنے کی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ کہیں نہ کہیں ٹکرا ہی جاتی ہو۔''

''میں سمجھتی ہوں کہ اپنی راہ چلنے والوں کو خاموشی سے فاصلہ طے کرنا چاہیے۔''

''ارے واہ...... الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے یعنی ناراض مجھے ہونا چاہیے تھا۔ الٹا تم ہو رہی ہو۔ چھوڑو کسی خاص کام سے آئی ہو۔''

''ہاں آئی تو خاص کام سے ہی تھی۔''

''کیا کام تھا؟''

''تمہیں بتانا ضروری ہے کیا؟''

''نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں، مقصد یہ تھا کہ اگر جلدی نہ ہو تو سامنے والے ہوٹل میں میری طرف سے ایک کپ چائے ہو جائے۔ ویسے یہ صاحب کتنی دیر تک تم سے چپکے رہیں گے دوسری بات یہ کہ یہ صاحب ہیں بھی یا نہیں۔'' صوفی نے صبر و سکون کے ساتھ اس کے جملے سنے تھے۔

''مطلب کیا ہے تمہارا۔''

''میرا تو کوئی مطلب نہیں ہے۔ البتہ چائے ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' رابعہ سلطان نے کسی خاص ارادے کے تحت کہا اور واپسی کے لیے پلٹ پڑی۔ صوفی اس کے ساتھ قدم آگے بڑھانے لگا تو راجا ناصر نے کہا۔

''اوہو...... اوہو...... یہ پکا جوڑ معلوم ہوتا ہے کچھ۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان صاحب کو ہم یہیں چھوڑ دیں تھوڑی دیر کے لیے۔''

''پولیس میں رہنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ آدمی پاگل پن کی حد تک بداخلاق ہو جائے۔ یہ میرے مہمان ہیں۔ چائے کا بل میں ادا کر دوں گی اگر تم چلنا چاہو تو۔ ویسے بھی پولیس کے پیسے کی چائے مسلمانوں کو جائز نہیں ہے۔'' رابعہ سلطان نے بھرپور وار کیا لیکن راجا ناصر مسکراتا ہوا ان کے ساتھ چل پڑا۔

''ریستوران تھوڑے فاصلے پر ہی تھا۔ وہ ایک میز پر جا بیٹھے۔ ایک بار پھر راجا ناصر نے رابعہ سلطان کو دیکھا اور بولا۔

''میرا خیال ہے جب سے ہماری شناسائی ہوئی ہے ہمارے درمیان کوئی تلخی نہیں ہوئی لیکن یہ دو دن ہمارے درمیان ایک دیوار سی کھڑی کر گئے ہیں۔ کیا کہتی ہو اس بارے میں۔''

''بالکل ٹھیک ہے۔'' رابعہ نے بے تکلفی سے کہا۔

''وجہ پتا چل سکتی ہے۔''

''آہا...... کیوں نہیں۔ وجہ وہ مظلوم لڑکی دردانہ ہے، جو تم سے اپنے لیے زندگی مانگ رہی تھی اور تم نے بڑی محنت سے موت دے دی۔''

''مگر تمہیں اس کی اتنی پروا کیوں ہے۔''

''دیکھو۔ برا مت ماننا راجا ناصر! ابھی تک میں نے تمہارے بارے میں کچھ نہیں لکھا لیکن دردانہ کے قتل کیس میں تمہارا کردار کافی مشکوک ہے اور میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم اس سلسلے میں کافی محنت کر رہے ہو۔'' راجا ناصر نے ایک بار پھر صوفی کی طرف دیکھا جو اپنے خالی منہ کی صفائی کر رہا تھا اور لگتا تھا جیسے اسے ان دونوں کی گفتگو سے کوئی دل چسپی نہیں ہو۔''

''کم از کم معیار کا خیال رکھا کرو۔'' راجا ناصر برا سا منہ بنا کر بولا۔ پھر کہنے لگا۔

''ہاں۔ تو کیا تمہارے خیال میں میں نے دردانہ کا قتل کیا ہے۔''

''نہیں۔ یہ خیال تو نہیں ہے میرا۔ لیکن تم قاتل کی معاونت ضرور کر رہے ہو۔''

''میں قانون کا محافظ ہوں مس دردانہ۔''

''دکھ تو یہی ہے راجا ناصر! قانون عوام کا آخری سہارا ہوتا ہے۔ قانون ہی بے بس انسان کی

ڈھال ہوتا ہے۔ میں اس قابل احترام نام کے ساتھ ہر بے کردار انسان کے وجود سے نفرت کرتی ہوں۔ میں قانون اور جرم کو ایک دوسرے کا مخالف ہی دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''واہ۔ واہ۔ واہ۔ بڑی جذباتی تقریر کرلی ہے تم نے۔'' راجا ناصر نے ہلکے سے ہاتھ سے تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔ صوفی کو ان دونوں نے بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا اور صوفی بھی احمقوں کی طرح بیٹھا ہوا یہ باتیں سن رہا تھا۔

''کیا بات کرتے ہو راجا ناصر! جذبات کا تو انسانی زندگی سے گہرا رشتہ ہے۔ جذبات ہی تو ہمیں اشرف بناتے ہیں۔ ورنہ ہم خود انسان کیوں ہیں۔''

''دیکھو بے بی! اپنے ذہن سے یہ احمقانہ غلط فہمی نکال دو۔''

''کون سی غلط فہمی۔''

''یہی کہ دردانہ کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ ہے۔''

''میں نے یہ بات کب کہی۔ ہاں تم نے اس سلسلے میں قاتل کی معاونت کی ہے۔ سوری ڈیئر۔ راجا ناصر اگر تم چاہتے تو اس لڑکی کی مدد کر کے اس کی جان بچا سکتے تھے۔ لیکن جو کچھ تم نے کیا ہے کیا اس کی تفصیل مجھ سے سننا پسند کرو گے۔''

''بالکل سنوں گا۔ ذرا دیکھوں تو سہی محترمہ نے کیا کہانی بنائی ہے۔''

''کہانی ایک سچ ہے۔ بارش کی اس شام دردانہ تمہارے پاس آئی اور اس نے تمہیں اپنی تباہی کی داستان سنائی۔ لیکن اس داستان میں اس نے ایک ایسی شخصیت کا ذکر کیا جس کا نام سن کر تم بے بس ہو گئے۔ کیوں کہ اس پر ہاتھ ڈالنا تمہارے بس کی بات نہیں تھی۔ تم نے اس لڑکی کو پاگل قرار دے کر بھگا دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی تم نے مناسب سمجھا کہ اپنے دوستوں کو اس خطرناک بات کی اطلاع دے دو۔ لڑکی کسی دوسری جگہ بھی پہنچ سکتی تھی وہ تمہارے دوستوں کا نام بھی لے سکتی تھی چنانچہ تم اپنی جگہ سے اٹھے تم نے سامنے والے ہوٹل سے فون کیا۔ میرے پاس اس کا مکمل ثبوت موجود ہے راجا ناصر۔ بہر حال تمہارے دوستوں نے تمہیں جواب دیا ہوگا کہ تم فکر مت کرو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور پھر سب ٹھیک ہو گیا۔ لیکن بدقسمتی سے میں درمیان میں پہنچ گئی اور آپ نے میری توجہ ہٹانے کے لیے بھرپور کوشش کی۔ جب میں وہاں سے نکل آئی تو آپ کے ذہن میں تشویش پیدا ہوئی اور لاش کے پاس میرے فوراً بعد آپ خود پہنچ گئے۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ اس بدنصیب خاندان کی بے بسی سے فائدہ اٹھانے کی پوری پوری کوشش کی گئی۔ حفیظ کی ماں کو یہ کہہ کر اغوا کر لیا گیا کہ ان کی بیٹی اسپتال میں ہے اور وہ بے چارے گھر سے نکل آئے۔ تب حفیظ پر الزام لگایا گیا تا کہ کیس ختم ہو جائے۔ مجھے بتایئے راجا صاحب حفیظ کی ماں کہاں ہے؟ بتایئے مجھے۔'' رابعہ سلطان کا لہجہ جذباتی ہو گیا اور صوفی نے صاف محسوس کیا کہ راجا ناصر کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے لیکن دوسرے لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا البتہ اب اس کا چہرہ کرخت ہو گیا۔ اس نے کہا۔

''رابعہ تم صحافی ہو۔ کرائم رپورٹر ہو تم۔ کرائم رپورٹر اور پولیس کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ لیکن جو الزامات تم نے مجھ پر لگائے ہیں کیا اس کے بعد بھی تم یہ توقع رکھتی ہو کہ مستقبل میں تم سے کوئی تعاون کروں گا۔''

''سنو...... میں نے ابھی تک کچھ بھی نہیں لکھا ہے اس بارے میں لیکن میں ایک عمدہ فیچر تیار کرنے پر غور کر رہی ہوں۔''

''ویری گڈ...... اب اس کا مطلب ہے تم پولیس کو بلیک میل کرو گی۔''

''نہیں...... میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ دردانہ کے قاتل کو منظر عام پر لایا جائے۔''

''ہوں...... ضرور لاؤ۔'' یہ کہہ کر اس نے چائے کا آرڈر دیا رابعہ سلطان کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ راجا ناصر بار بار صوفی کی شکل دیکھنے لگتا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''ان صاحب کا کچھ تو تعارف کراؤ۔ کون ہیں آخر یہ۔''

''اگر ضروری سمجھتی تو کرا دیتی فی الحال یہ سمجھ لو کہ یہ بے چارے اندھے گونگے اور بہرے ہیں۔''

''واہ۔ گونگے اور بہرے کی بات مان لیتا ہوں لیکن اندھے تو نہیں ہیں یا پھر تم نے اخلاقاً انہیں اندھا بنا دیا ہے۔'' ویٹر نے چائے کے برتن لا کر رکھے اور راجا ناصر کہنے لگا۔

''بڑی اچھی چائے ہے شکر ذرا زیادہ ڈال دینا تا کہ زبان میں مٹھاس پیدا ہو جائے۔ ویسے بی بی بعض اوقات انسان خود اپنی ذہانت سے شکست کھاتا ہے۔ چائے پیو، گھر جاؤ اور آرام کرو۔ ہاں مجھے اجازت دو۔ میں تمہارے لیے نیک جذبات رکھتا ہوں۔ ورنہ تمہاری اس تلخ گفتگو کو برداشت نہ کر پاتا۔'' راجا ناصر نے جیب سے بل کی رقم نکال کر رکھ دی اور اٹھ گیا۔ رابعہ سلطان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ارے واہ۔ کیا بات ہے۔ بڑے آدمی ہو دوسروں کو اس طرح چائے پلا دیتے ہو۔ چلو ٹھیک ہے ہم تو چائے پی کر ہی جائیں گے ویسے ایک بات سن جاؤ دردانہ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں یہ بات درج نہیں کی گئی ہے کہ اس کی آبروریزی کی گئی لیکن میں نے اس کا ثبوت حاصل کر لیا ہے۔ کیا سمجھے۔'' رابعہ سلطان کے ان الفاظ پر صوفی کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ لیکن راجا ناصر کے قدم رک گئے تھے۔

اس دوران رابعہ سلطان نے صوفی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''آیئے صوفی صاحب! کسی اچھے ہوٹل میں چائے پئیں گے کیا گھٹیا جگہ ہے۔ آیئے......'' صوفی خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا۔ نہ جانے کیوں اس وقت یہ لڑکی اسے بڑی اچھی لگی تھی۔ پھر رابعہ سلطان نے کہا۔

''اب کیا کہتے ہیں صوفی صاحب۔''

''واپس۔'' صوفی نے کہا رابعہ سلطان کار تک پہنچ گئی۔ وہ غور سے صوفی کا چہرہ دیکھ رہی تھی پھر اس نے کہا۔

''بات اصل میں یہ ہے صوفی صاحب کہ ہمیں اس سلسلے میں کام کرنا ہے۔ آپ نے راجا ناصر کا رویہ دیکھ لیا۔ نہ جانے کیوں میرے ذہن میں یہ بات آئی ہے کہ میرا راستہ روکا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ میرے ساتھ ہوں تو پھر کسی کی ہمت نہیں پڑے گی۔''

''درویشوں کی دعا سے۔''

''ہاں ہاں...... سوری میں یہ کہنا بھول گئی تھی۔'' رابعہ سلطان مسکرا کر بولی۔

''بس مجھے یہیں اتار دیجیے۔''

''کیوں خیریت؟''

''وہ سامنے فرقان جلیل صاحب کا آفس ہے ان سے مل کر جاؤں گا۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''میرا سلام کہہ دیجیے گا۔'' رابعہ سلطان نے کہا اور صوفی وہیں اتر گیا۔ رابعہ سلطان آگے بڑھ گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد صوفی فرقان جلیل کے آفس میں داخل ہو گیا۔ فرقان جلیل نے اس کا پرجوش استقبال کیا تھا۔ کہنے لگا۔

''وہ شعر کہنا عجیب سا لگتا ہے۔ کیونکہ وہ اتنا گھس پٹ گیا ہے مگر تعجب کی بات ہے شاعروں نے اس سے اچھا شعر آج تک کہا ہی نہیں۔ میں اس شعر کی بات کر رہا ہوں کہ۔

''وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے''

''سلام عرض کرتا ہوں۔'' صوفی نے کہا۔

''وعلیکم السلام۔ صوفی صاحب! آئیے تشریف رکھیے۔ کہیے کہاں سے آ رہے ہیں۔''

''آپ مصروف ہیں۔''

''بالکل نہیں۔ آپ کی آمد سے بے پناہ خوش ہوں۔''

''میں رابعہ سلطان کے ساتھ اسپتال گیا تھا۔ وہ اپنے طور پر کام کر رہی ہے۔ ذرا اس کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

''صوفی صاحب! وہ اچھے گھر کی لڑکی ہے۔ بڑی پرجوش، بڑی باہمت دعائیں ہی کر سکتے ہیں ہم اس کے لیے کہ جس جوش و خروش کے ساتھ وہ اس دنیا میں ہنگامہ کرنے نکلی ہے اور کر رہی ہے اس کے لیے اللہ اس کی حفاظت کرے۔ ابھی تو اصل میں لڑ رہی ہے اور کہیں ایسی جگہ جا کر نہیں ٹکرائی جہاں اسے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو لیکن آپ جانتے ہیں صوفی صاحب کہ کون سا دور چل رہا ہے۔ غلط کام کرنے والوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں سب کچھ کر ڈالتے ہیں وہ اور مخالفوں کو آسانی سے زیر کر لیتے ہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ بہرحال میں نے بھی محسوس کیا ہے کہ وہ بہت پرجوش ہے۔''

''جی صوفی صاحب! لیکن ایک بات آپ سے عرض کروں۔ بہت اچھی لڑکی ہے میں نے بڑی امیدوں سے اسے آپ کے پاس بھیجا تھا۔ آپ کا اپنا کیا خیال ہے اور پھر ویسے بھی صوفی صاحب جو بیڑا آپ نے اٹھایا ہے۔ یہ کیس سو فی صدی اس پر پورا اترتا ہے۔ اگر آپ اس کی مدد کریں گے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے مزاج کے مطابق بات ہے۔''

''درویش سب پر رحم کریں۔ بالکل ٹھیک کہتے ہیں آپ ویسے رابعہ سلطان کے مسئلے میں تھوڑی سی اور معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا میں آپ سے۔''

''ارشاد......ارشاد۔'' فرقان جلیل نے کہا پھر صوفی کافی دیر تک اس سے رابعہ سلطان کے بارے میں باتیں کرتا رہا تھا۔

رابعہ سلطان کے بارے میں جو کچھ فرقان جلیل نے بتایا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ اس کے جوش و خروش کا عالم دیدنی تھا اور اس سلسلے میں جو کچھ وہ کر رہی تھی وہ سمجھ دار لوگوں کے لیے بڑا سنسنی خیز تھا۔ اس نے اپنے

ایڈیٹر کو فون کیا اور اطلاع دی کہ کل کے اخبار میں دردانہ کے قتل کے سلسلے میں ایک خصوصی رپورٹ شائع کرنی ہے۔ وہ اس کے لیے تیاریاں مکمل کر لیں۔

''ٹھیک ہے تم دیکھو...... ظاہر ہے جو چیز اخبار کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگی ہم اسے اولیت دیں گے۔'' ایڈیٹر صاحب نے جواب دیا۔ لیکن نہ جانے کیوں انہیں رابعہ سلطان کے لہجے میں کوئی خاص بات محسوس ہوئی تھی۔ بہرحال رابعہ سلطان کام میں مصروف ہو گئی اور اس کے بعد شام کو پانچ بجے وہ اپنا مضمون لے کر ایڈیٹر صاحب کے پاس پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ وہ تصویریں بھی تھیں جو اس نے خصوصی طور پر اس وقت بنالی تھیں جب دردانہ کو قتل کیا گیا تھا۔ ایڈیٹر صاحب نے غور سے رابعہ سلطان کا لکھا ہوا مضمون پڑھا۔ ان کے چہرے پر تشویش کے آثار ابھر آئے۔ پھر انہوں نے مضمون ختم کر کے گہری نگاہوں سے رابعہ کو دیکھا اور بولے۔

''کافی سخت ہے۔!''

''ہاں مجھے اندازہ ہے لیکن جناب! ہمارے اخبار کی پالیسی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بہت مضبوط ہے۔ ہم ہمیشہ حقائق کا تجزیہ کر کے انہیں پیش کرتے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ جو کچھ تم نے لکھا ہے۔ اس سے ہم دشمنی خرید لیں گے۔'' ایڈیٹر صاحب بولے۔

''دوستوں کے درمیان تو زندگی آرام سے گزر جاتی ہے سر! لیکن میں سمجھتی ہوں کہ دشمنوں کے بغیر جینے میں کیا خاص مزہ ہے اور پھر ہم تو سچ کی حمایت کرتے ہیں۔ کیا آپ کے خیال میں حقیقت سے آنکھیں چرا کر بیٹھ جانا اچھی بات ہے۔ یہ سب کچھ اسی طرح شائع کیا جائے گا۔ براہ کرم اس میں کوئی ردوبدل نہ ہو۔''

''ٹھیک ہے۔'' دوسرے دن وہ تمام تفصیل شائع ہو گئی۔ عنوان تھا دردانہ کا قتل اہل دل کے لیے ایک چیلنج ہے۔ اس کے بعد مقتولہ کی ایک نمایاں تصویر تھی جس میں کچلی ہوئی پڑی تھی۔ پھر لکھا تھا۔

آسمان پر جب بھورے بادلوں کے غول مٹر گشت پر نکلتے ہیں اور ہوائیں ان کی نمی سے متاثر ہو کر اہل زمین کے دلوں میں امنگیں جگاتی ہیں تو زمین پر بسنے والے مختلف کیفیات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ شاعر آرزو کرتا ہے کہ اے ابر کرم آج اتنا برس کہ اس کے محبوب کو واپسی کے لیے سواری نہ ملے۔ ادیب اپنی محبوبہ کے بھیگے بدن اس کی گالوں پر بہتے ہوئے پانی کی قطار سمیٹنے لگتا ہے۔ صاحب زر شراب و کباب کی محفل جما لیتے ہیں۔ ان کے خیال میں آسمان سے شراب برس رہی ہوتی ہے۔ ان سے چھوٹے لوگ گرم گرم کافی کی بھاپ سے مست ہو جاتے ہیں اور ان سے بھی چھوٹے کسی ٹپکتے ہوئے چھپر کے نیچے بیڑی کے کش لے کر ہی خود کو مطمئن کر لیتے ہیں، لیکن زمین مسائل کی ماں ہے اور ابر کرم بعض انسانوں کے لیے نہ جانے کیا بن جاتا ہے۔ شاید موت کا پیغام بر بھی۔ یہ موت کہیں بجلی کے ٹوٹے ہوئے تار کے کرنٹ سے واقع ہوتی ہے۔ کہیں کھلے گٹر میں گر کر جن میں پانی بہہ رہا ہوتا ہے۔ کہیں کسی بوسیدہ چھت کے بیٹھ جانے سے، لیکن افسوس بارش کی اس حسین شام میں دردانہ قتل کر دی گئی۔ اسے بجلی کے کرنٹ نے نہیں، کھلے ہوئے گٹر نے نہیں، کسی بوسیدہ چھت نے نہیں بلکہ انسانی ہاتھوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ انہوں نے ابر کرم کی رحمتوں سے بھیگی ہوئی سنسان سڑک پر دردانہ کو کچل کر ہلاک کر دیا اور یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ یہ سب کچھ ایک جانے بوجھے منصوبے کے تحت کیا گیا۔ دردانہ کوئی سماجی یا سیاسی شخصیت نہیں تھی۔ معمولی سے گھر میں اپنی ماں اور زیر تعلیم

بھائی کی کفیل ایک غریب لڑکی تھی۔ لیکن یہ غریب لڑکی کسی کی ہوس کی بھینٹ چڑھ کر جب اس ہوس پرست کے لیے خطرہ بنی تو اس کے احتجاج پر دردانہ سے زندگی چھین لی گئی۔ بدنصیب دردانہ کو احساس ہوگیا تھا کہ وہ اس ہوس پرست کا راز لے کر نکل تو بھاگی ہے لیکن اس کی زندگی چند لمحوں کی مہمان ہے۔ چناں چہ اس نے تھانے کا رخ کیا۔ اس نے قانون کے محافظ کے حضور پہنچ کر اپنی زندگی کو لاحق خطرے سے آگاہ کیا، لیکن وہ محافظ بھی سحر زدہ تھا، اس کے سامنے جس بڑی شخصیت کا تذکرہ کیا گیا اس نے اسے بے حس بنا دیا۔ چنانچہ چہ اس لڑکی کو تحفظ دینے کے بجائے نکال دیا۔ اسے موت کے بے رحم سایوں کے حوالے کر دیا اور دردانہ پر کیے گئے ظلم وستم کی داستان قبرستان میں دفن ہوگئی۔ ہم قانون کے محافظوں پر کوئی الزام تراشی نہیں کرتے، لیکن چند بنیادی سوالات ہیں جن کی جواب دہی مشکوک ذہنوں کو مطمئن کر سکتی ہے۔ سوال نمبر ایک یہ ہے۔

بارش میں بھیگتی ہوئی ایک لڑکی اگر کسی قانون کے محافظ سے جا کر یہ فریاد کرے کہ اس پر ظلم ہوا ہے اور اس کی زندگی خطرے میں ہے تو کیا محافظ کے سینے میں اس کا فرض نہیں جاگنا چاہیے۔ کیا یہ اس پر لازم نہیں کہ محافظ اس کی دادرسی کرے اور اسے بہ حفاظت اس کے گھر تک پہنچانے کا بندوبست کرے کیا ایسی لڑکی کے لیے قانونی تحفظ ضروری نہیں تھا۔

سوال نمبر دو......

دردانہ کے قتل کے سلسلے میں اس کے بھائی حفیظ کو گرفتار کیا گیا ہے اور اس پر بدچلنی کا الزام لگایا گیا ہے۔ پولیس اگر اس کی بدچلنی کا ثبوت پیش کرے اور اعلیٰ حکام اس سلسلے میں کسی جانب داری کے امکان کو نظر انداز نہ کریں۔ اہل محلّہ اور دوسرے افراد کو مکمل جانی تحفظ دے کر ان سے درخواست کی جائے کہ وہ دردانہ کے کردار پر اپنی رائے کا اظہار کریں۔

سوال نمبر تین......

اہل محلّہ کے بیان کے مطابق دردانہ ایک شریف الطبع لڑکی تھی اور کہیں ملازمت کرنے جاتی تھی۔ متعلقہ حکام یہ معلوم کریں کہ وہ کہاں ملازمت کرنے جاتی تھی۔ یہ بات اس کی ماں اور بھائی بہ آسانی بتا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ حکام ان دونوں کی زندگی کو تحفظ فراہم کریں کیوں کہ وہ جنہوں نے خود کو چھپانے کے لیے دردانہ کو قتل کیا ہے۔ [illegible]ردانہ سے متعلق ہر ثبوت کو ضائع کرنے کی کوشش کریں گے۔

سوال نمبر چار

واقعات کی تفتیش دیانت دار افسروں کے سپرد کی جائے اور ان پر پوری نگاہ رکھی جائے۔ دردانہ کے بھائی حفیظ کے بیان پر خاص طور پر توجہ دی جائے اور اس بارے میں چند باتوں کو ملحوظ خاطر رکھا جائے مثلاً یہ کہ کیا کسی بدچلن بہن کے قتل کے لیے کوئی سیدھا سادا کم سن نوجوان اتنی گہری پلاننگ کر سکتا ہے۔ کیا دردانہ کو سڑک پر ہلاک کرنے کی کوشش اور وہ بھی اس وقت جب وہ قانونی تحفظ سے ناکام ہو کر واپس آ رہی تھی۔ حفیظ جیسے معمولی انسان کی کوشش قرار دی جا سکتی ہے جو ابھی خود طالب علم ہے اور بہن کی کفالت پر گزارہ کر کے اپنا مستقبل تعمیر کر رہا ہے۔ دردانہ کی ماں اپنے بیٹے کے بارے میں بہتر طور پر بتا سکتی ہے بشرطے کہ وہ اس قابل رہے۔

سوال نمبر پانچ......

دردانہ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ اعلیٰ حکام اس رپورٹ کے حصول کے بعد مناسب رائے قائم کر سکتے ہیں اگر ضرورت پیش آئے تو دردانہ کی لاش دوبارہ نکلوا کر اس کی رپورٹ حاصل کی جائے۔ اس ضمن میں یہ بات خاص طور سے قابل توجہ ہے کہ قانونی حصول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ورثا کی تلاش کے بغیر چند گھنٹوں کے اندر اندر اس کی لاش کو دفنا دیا گیا۔ کیا اسے سرد خانے میں رکھ کر مقتولہ کے ورثا کو تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ چند معمولی نکتے ہیں لیکن عوام کے ذہنوں کو مطمئن کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان پر توجہ [illegible]ی جائے تاکہ اہل زر اپنی درندہ صفت کارروائیوں کے بعد بھی محفوظ رہ کر من مانی نہ کر سکیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان انکشافات کی روشنی میں مقتولہ دردانہ کی تفتیش کو نئے سرے سے شروع کیا جائے تاکہ ہر خاص و عام کے ذہن میں اپنے جان و مال کے تحفظ کا یقین پیدا ہو اور دردانہ جیسی بے بس لڑکیاں کونوں کھدروں میں منہ نہ چھپاتی پھریں اور بے شمار گھرانے فاقہ کشی کا شکار ہو کر زندگی سے محروم نہ ہو جائیں۔"

یہ وہ تفصیلی رپورٹ تھی جس کے بارے میں خود رابعہ سلطان کا اندازہ تھا کہ بارود کے ڈھیر میں چنگاری ڈالی گئی ہے اور نتیجے میں جو دھماکے ہوں گے معمولی نہیں ہوں گے۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی اور اندازہ بالکل ٹھیک نکلا۔ سب سے پہلے اس کے پاس آنے والا راجا ناصر ہی تھا، جس کا چہرہ انتہائی خشک ہو رہا تھا۔ دروازہ کھلا تو وہ بے لگام اونٹ کی مانند اندر گھسا چلا آیا۔ لیکن رابعہ سلطان نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو بالکل تیار رکھا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہیلو۔"

"اپنی اوقات سے بڑھ کر جسارت کی ہے تم نے، میں نے تمہیں ہمیشہ دوستانہ انداز میں خوش آمدید کہا تھا لیکن اب تمہیں میری دشمنی کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔"

"دشمن ہو تو تم جیسا راجا ناصر! جو پہلے سے دشمنی کی اطلاع دے دیتا ہے۔"

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے اس دشمنی کی ابتدا کیوں کی ہے۔"

"مظلوم دردانہ کی حمایت میں جسے تمہارے تعاون سے قتل کر دیا گیا۔"

"اور میں تمہارے اس خیال کی پہلے بھی تردید کر چکا ہوں۔ میں صرف پولیس انسپکٹر ہوں میرا دائرہ کار محدود ہے۔ تم جانتی ہو جو کچھ تم نے کیا ہے اس کے سلسلے میں تم نے بہت بڑے لوگوں کی دشمنی مول لی ہے۔"

"کام کی بات کرو راجا ناصر! تم اگر چاہو تو مجھ سے سودا کر سکتے ہو۔"

"تم سے......" وہ حقارت سے بولا۔

"ہاں ظاہر میرے پاس اسی لیے آئے ہو تم۔"

"خوش فہمی سے نکلو محترمہ رابعہ سلطان! تم بھی اس وقت وہاں موجود تھیں۔ جب پولیس نے پہلی بار لاش دیکھی تھی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ حادثہ تمہاری ہی گاڑی سے ہوا ہو۔" راجا ناصر نے کہا اور رابعہ ہنس پڑی۔

"بہت پریشان لگ رہے ہو۔ ایسی اوٹ پٹانگ باتیں اسی پریشانی کے عالم میں کہی جا سکتی ہیں۔"

"مطلب......"

''بیٹھو...... بیٹھو تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی بڑے آدمی سے پالا پڑا ہے بیٹھو کیا پیو گے۔ بہرحال دشمن ہی سہی گھر پر آئے تو ہو اور پریشان بھی ہو۔ مجھے تم پر ترس آ رہا ہے۔''

''میں تمہیں گولی بھی مار سکتا ہوں سمجھیں۔'' راجا ناصر طیش میں آ گیا اور رابعہ سلطان کے بھی تیور بدل گئے۔ اس نے سرد نگاہوں سے اسے دیکھا اور زہریلے لہجے میں بولی۔

''مردوں کی سی ایک بھی بات نہیں ہے تمہارے اندر راجا ناصر اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تمہارا ضمیر مجرم ہے۔ عمل کرنے والے صرف دھمکیاں نہیں دیتے عمل کرتے ہیں۔ اگر تم ایسی کوشش کر سکتے ہو تو ضرور کرو۔ لیکن یہ بھی میں تمہیں بتا دوں کہ اس کے نتیجے میں تم اپنے قدموں پر واپس نہیں جا سکتے میں خود تمہیں کسی اسپتال پہنچا دوں گی سمجھے۔ غصے کے مارے راجا ناصر کا برا حال تھا۔ غصے کی انتہا نے اسے نڈھال کر دیا۔ ...ھ دار آدمی تھا اس لیے فوراً ہی اپنے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا اور رابعہ سلطان کو ...ورتے ہوئے ایک صوفے میں دھنس گیا۔ کافی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ رابعہ سلطان اسے دیکھتی رہی۔ آخر کار اس نے کہا۔

''آخر تم کس بل پر اتنے بڑے اقدامات کر رہی ہو۔ تمہارا لہجہ اتنا ٹھوس کیوں ہے۔ کیا صرف اس اخبار کے بل پر! زندگی اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے رابعہ! زندگی کو یوں گنوا دینا زندگی کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔''

''پھر وہی دھمکیاں...... دیکھو میں تمہیں وارننگ دے رہی ہوں کہ یہ دھمکیاں تمہارے حق میں بہتر نہیں ہیں۔''

''تمہیں میری پہنچ کا اندازہ بہت جلد ہو جائے گا سمجھیں کچھ بھی ثابت نہیں کر سکو گی تم، یہ بھی نہیں کہ وہ تھانے آئی تھی اور میں اس بات سے واقف تھا۔''

''میں نے کسی بنیاد پر یہ بات لکھی ہے راجا ناصر۔''

''میں اس بنیاد کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''تم جو کچھ جاننا چاہتے ہو وہ فی الحال میں تمہیں بتانے سے رہی۔ ہاں عدالت میں اپنی معلومات کا نچوڑ پیش کر دوں گی۔ بات براہ راست چوں کہ تم تک پہنچی ہے اس لیے تم ایسا کرو کہ پولیس کی طرف سے اخبار پر مقدمہ قائم کرو۔''

''یہ بھی ہو جائے گا اور اس سے پہلے اور بھی بہت کچھ، لیکن یقین کرو اس بہت کچھ میں میرا ہاتھ نہیں ہوگا۔''

''چلو پھر یہی بتا دو کہ کس کس کا ہاتھ ہوگا۔'' رابعہ نے کہا اور راجا ناصر حیرت سے اسے دیکھنے لگا پھر گردن ہلا کر بولا۔

''ٹھیک ہے تم خود بھگتو گی مجھے کیا۔''

''کیا تمہارے یہ کرم فرما تمہارا تحفظ نہیں کریں گے۔'' رابعہ نے سوال کیا۔

''میری طرف سے فکرمند نہ ہونا۔''

''تب پریشانی کس بات کی ہے۔ تمہارے کرم فرما تم سے ان غلطیوں کی باز پرس ضرور کریں گے

اور تمہیں ایک بار پھر اس کی سزا دیں گے کہ تم نے ذہانت سے کام کیوں نہیں کیا اور یہ اس وقت ہوگا جب میں انہیں عدالت میں بے نقاب کروں گی۔'' راجا ناصر ایک بار پھر پریشان ہو گیا۔ وہ سخت ذہنی ہیجان کا شکار نظر آ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

''اس کے علاوہ بھی اور کچھ ہو سکتا ہے۔'' رابعہ سلطان نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا؟''

''تم اپنی ان ذمے داریوں کو ایمانداری سے نبھاؤ۔ جھوٹ کے بجائے سچ کا ساتھ دو، میں تم سے تعاون کروں گی۔ حفیظ کی گردن پھندے سے نکال دو یہ تم کر سکتے ہو۔ مجھے اس کی ماں کے بارے میں بتاؤ۔ وہ کہاں ہے اور مجھے دردانہ کے قاتلوں کے بارے میں بھی بتاؤ۔'' راجا ناصر ہتھے سے اکھڑ گیا اور کھڑا ہو کر بولا۔

''اب میں اتنا مجبور بھی نہیں ہوں جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ سمجھیں اور دوبارہ تم سے ملاقات نہیں کروں گا۔''

''خدا حافظ۔'' رابعہ سلطان نے پرسکون لہجے میں کہا۔

بہرحال یہ سب کچھ اس کی توقع کے برعکس نہیں تھا، اسے کسی اور ہی کا انتظار تھا اور وہ ابھی تک نہیں آیا تھا چناں چہ اس کی کار سڑکوں پر چکرانے لگی اور جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا تعاقب نہیں کیا جا رہا تو وہ صوفی کے گھر کی جانب چل پڑی۔

لیکن وہاں پہنچ کر اسے مایوسی ہوئی۔ صوفی کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن صوفی گھر پر موجود نہیں تھا۔ نتیجے میں ممن خاں کے ہوٹل تک پہنچنا پڑا۔ ممن خاں کے ہوٹل پر اس کی زبردست پذیرائی ہوئی۔ کیوں کہ اسے صوفی کے ہاں پہلے بھی آتے جاتے دیکھ لیا گیا تھا۔ رابعہ سلطان کو ایک انوکھے منظر کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر شخص اس کی راہ میں بچھا جا رہا تھا لیکن دل چسپ بات یہ تھی کہ کسی کے چہرے پر اس کے لیے کوئی برے تاثرات نہیں تھے۔ اسے بہن، بیٹی اور باجی کہہ کر مخاطب کیا جا رہا تھا۔

''میں صوفی صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''گئے ہوئے ہیں، گھر پر نہیں ہیں، یہ نہیں پتا کہ کہاں گئے ہوئے ہیں۔''

''مگر گھر کا دروازہ تو کھلا ہوا ہے۔''

''پیاری بہن جس گلی میں تم آئی ہو نا اس میں کسی بھی کھلے دروازے سے تم اندر داخل ہو جاؤ۔ ضروری نہیں ہے کہ گھر کا رہنے والا موجود ہو۔ ہم لوگ گھروں کے دروازے بند نہیں کرتے، ہر دروازہ کھلا ہی ہوا ہوتا ہے۔''

''یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ صوفی صاحب کہاں ملیں گے۔''

''افسوس یہ نہیں معلوم۔''

رابعہ سلطان وہاں سے واپس چل پڑی تھی۔

♥......♥......♥

ادھر صوفی نے بھی رابعہ سلطان کا تحریر کردہ مضمون پڑھا تھا اور تشویش میں ڈوب گیا تھا۔ اس وقت

وہ گرین ہاؤس میں بیٹھا ہوا تھا۔ کرنل رحیم شاہ ملک سے باہر جا چکا تھا۔ باقی ساری ذمے داریاں صوفی کے کندھوں پر آ پڑی تھیں۔ اس وقت شازیہ، دلاور اور غلام قادر صوفی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ غلام قادر نے کہا۔

''اڑے ماں قسم چھوٹا بابا۔ ابھی تمہارا چہرہ مہرہ اترا ہوا نظر آ رہا ہے ابھی میرے کو سچ سچ بتاؤ کوئی پریشانی ہے تمہارے کو۔ صوفی نے جیب میں پانوں کا بٹوہ تلاش کیا۔ ڈبیا نکال کر سامنے رکھی تو شازیہ ہنس کر بول پڑی۔

''چھوٹے بابا کے پاس شاید پان ختم ہوگئے ہیں۔''

''نہیں پانوں کی کافی تعداد موجود ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''تو پھر کیا بات ہے غلام قادر بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں۔''

''میں آپ کو ایک بات بتاؤں چھوٹے بابا۔ کبھی کبھی ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ اور بڑے بابا مل کر صرف ہماری پرورش کر رہے ہیں، ہمارے اخراجات ادا کر رہے ہیں، آپ ہمیں کسی بڑے کام کا موقع ہی نہیں دیتے، آپ نے جس طرح ہمیں اپنی ٹیم میں شامل کیا ہے۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ گرین فورس کے ممبروں کی حیثیت سے ہماری ذمے داریاں کچھ اور ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہمیں ان ذمے داریوں کو پورا کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔

''درویش تم سب لوگوں کو اپنی پناہ میں رکھیں۔''

''بے شک آپ کی دعائیں بھی ہمارے لیے بہت ضروری ہیں۔ چھوٹے بابا لیکن جو احتجاج ہم آپ سے کر رہے ہیں۔ کیا اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

''نن نہیں...... کیوں نہیں...... مم...... مگر، میں......''

''ہم جانتے ہیں کہ چھوٹے بابا۔ آپ بہت ذہین ہیں، بہت ہی زبردست کردار کے مالک ہیں آپ۔ آپ چٹکی بجا کر سارے مسائل حل کر لیا کرتے ہیں، لیکن چھوٹے بابا ہمیں بھی تو کسی مرض کی دوا سمجھیں۔ کچھ ذمے داریاں دے کر تو دیکھیں۔ آپ کے یہ خادم ذمے داریوں کو پورا کر بھی سکتے ہیں یا نہیں۔''

''کک...... کیوں نہیں، کک...... کیوں نہیں درویشوں کی دعاؤں سے تم ذہین لوگ ہو۔ یہ بات میں جانتا ہوں۔''

''تو پھر ہماری ذہانت کو کبھی آزمایا کیوں نہیں جاتا۔''

''میری پریشانی کی وجہ جاننا چاہتے ہو۔''

''ہاں چھوٹے بابا آپ بتایئے ہمیں۔''

''تو پھر اخبار کا یہ مضمون پڑھو۔'' صوفی نے کہا اور اخبار ان کے سامنے رکھ دیا۔ تینوں اخبار پر جھک گئے تھے۔ یہ سارا مضمون انہوں نے پڑھا اور اس کے بعد سوالیہ نگاہوں سے صوفی کو دیکھنے لگے تب صوفی نے انہیں رابعہ سلطان کی آمد، وکیل فرقان جلیل کی سفارش اور باقی تمام چیزوں کے بارے میں بتایا پھر بولا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ میں اس مسئلے میں تمہاری ذہانت کو آواز دیتا ہوں۔ بتاؤ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔'' تینوں خاموشی سے بیٹھ گئے تھے پھر شازیہ نے کہا۔

''چھوٹے بابا۔ آپ ہم تینوں کو مشاورت کا موقع دیجیے۔''

''میں چلا جاتا ہوں درویشوں کی دعاؤں سے۔ ایک پان کھانا چاہتا ہوں۔ پان ختم ہونے سے پہلے آپ لوگوں کو میرے پاس آ جانا چاہیے۔ کیوں کہ میں سنجیدگی سے کام کرنا چاہتا ہوں۔ یہ مضمون جس لڑکی نے لکھا ہے میرا مطلب رابعہ سلطان سے ہے۔ میں جانتا ہوں اس کی زندگی اب خطرے میں پڑ جائے گی۔ کیا سمجھے؟''

''ٹھیک ہے۔ آپ ہمیں تھوڑا سا موقع دیجیے اور اس کے بعد صوفی ایک دوسرے کمرے میں جا بیٹھا اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ رابعہ سلطان کی طرف سے پریشان تھا یہ لڑکی جذباتی تھی لیکن پرجوش تھی اور جو کچھ اس نے لکھا تھا وہ بہت ہی خوف ناک تھا۔

♥ ...... ♥ ...... ♥

شازیہ کا انتخاب گرین فورس کے لیے بڑی اہم حیثیت رکھتا تھا۔ اب تک گرین فورس نے جتنے کارنامے سرانجام دیے تھے۔ ان کے سلسلے میں تمام بیرونی معاملات میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والی شخصیت شازیہ ہی کی تھی۔ یہ بات ان لوگوں نے بالکل سچ کہی تھی۔ غلام قادر بے شک ایک عام سطح کا انسان تھا، لیکن ذہانت کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ اپنے طور پر وہ بہت ذمے دار آدمی تھا اور کام کرنا جانتا تھا۔ دلاور جرم کی دنیا کا انسان تھا اور بے شک جرائم کرنا بھی معمولی بات نہیں ہوتی۔ پوری پلاننگ کرنی پڑتی ہے۔ عادل اور فیضان اس وقت سردار گڑھ میں تھے۔ وہ گرین فورس کی ٹیم میں ایک طرح سے بس سفارشی حیثیت رکھتے تھے اور انہوں نے آج تک کوئی نمایاں کارنامہ سرانجام نہیں دیا تھا۔ اس کا اندازہ کرنل رحیم شاہ کو بھی تھا، لیکن کرنل رحیم شاہ کا کہنا تھا کہ آخر کار وہ تجربہ حاصل کر لیں گے۔

ان لوگوں نے جو منصوبہ بندی کی تھی بہت شان دار تھی اور تھوڑا ہی وقت گزارنے کے بعد اسے بڑی کام یابی مل گئی تھی۔ اس نے وہ ٹھکانا معلوم کر لیا تھا جہاں دردانہ کی ماں کو رکھا گیا تھا۔ غلام قادر اور دلاور بھرپور طریقے سے شازیہ کی معاونت کر رہے تھے۔ اس وقت سب سے پہلی بات یہ تھی کہ حفیظ کی ماں کو بچانا ضروری تھا۔ یقینی طور پر بوڑھی عورت کو کوئی ایسی بات بھی معلوم ہوسکتی تھی جو انتہائی کارآمد ثابت ہوتی۔ اس وقت وہ دشمنوں کی تحویل میں تھی اور طاقت ور ہاتھ اور نگاہیں اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔

بہرحال اب اسے بازیاب کرانا تھا۔ چناں چہ شازیہ نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ پونے گیارہ بجے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کپڑوں کی الماری سے اس نے مخصوص لباس نکالا۔ چند اہم چیزیں پرس میں رکھیں اور باہر جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ اپنے کام کے سلسلے میں وہ ہمیشہ مستعد رہا کرتی تھی اور یہ اس کا مخصوص طریقہ کار تھا اس وقت سڑکیں سنسان ہو چکی تھیں۔ اکا دکا کاریں رکشا یا موٹر سائیکلیں نظر آ جاتی تھیں۔ تھوڑی دور تک شازیہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ تعاقب کا اندازہ کرتی رہی اور جب اسے یقین ہوگیا کہ اس کا تعاقب نہیں کیا جا رہا تو اس نے کار کا رخ اس مخصوص اسپتال کی جانب کر دیا جس کے بارے میں اطلاع ملی تھی کہ دردانہ اور حفیظ کی ماں کو وہاں رکھا گیا ہے۔ اسپتال کی سفید عمارت روشن تھی۔ کمپاؤنڈ میں بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ شعبہ حادثات بھی کھلا ہوا تھا اور لوگ آتے جاتے بھی نظر آ رہے تھے۔ شازیہ نے

پارکنگ سائیڈ پر کار روکی اور اسے لاک کر کے نیچے اتر آئی۔ پھر وہ پروقار انداز میں چلتی ہوئی ریسپشن پر پہنچ گئی۔ ایک نوجوان کلرک نرس سے گفتگو میں مصروف تھی۔ شازیہ کی مداخلت پر دونوں خاموش ہو کر شازیہ کی طرف دیکھنے لگے۔

''کمرہ نمبر اکیاون میں جانا ہے۔ براہ کرم کیا آپ مجھے گائیڈ کریں گے۔'' شازیہ نے بڑے پروقار انداز میں کہا اور اس کے اثرات نمایاں طور پر محسوس ہوئے۔ مرد نے کہا۔

''پہلی منزل پر بائیں ہاتھ پر مڑ جائیے۔''

''جی......'' شازیہ اپنا بڑا ہینڈ بیگ سنبھالے ہوئے مطمئن اوپری منزل کی جانب چل پڑی۔

صاف ستھرا اسپتال تھا۔ کشادہ اور روشن راہ داری میں بائیں جانب مڑتے ہی پہلا کمرا نمبر چوالیس تھا۔ اس ترتیب سے آگے بڑھتی رہی۔ اکیاون نمبر دروازے کے سامنے ایک پولیس کانسٹیبل دیوار سے ٹکا آنکھ بند کیے بیٹھا تھا۔ سامنے سے ایک نرس آ رہی تھی۔ شازیہ سیدھی نکلتی چلی گئی۔ نرس نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی تھی جو بے معنی تھی۔ اس وقت چاروں طرف خاموشی طاری تھی۔ شازیہ راہ داری کے آخری سرے پر پہنچ گئی۔ وہاں ایک باتھ روم تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور باتھ روم کا دروازہ بند کر کے اس نے جلدی سے اپنے بدن سے مخصوص لباس اتارا۔ نیچے سفید قمیص موجود تھی۔ پھر اس نے نرسوں والی ٹوپی کلپ سے پھنسائی اور گاؤن تہ کر کے ہینڈ بیگ میں رکھا اس کے بعد اس نے بیگ سے ایک خاص چیز نکالی اور بیگ دوبارہ بند کر کے باتھ روم سے نکل آئی۔ سنسان راہ داری اسے مکمل تعاون کا یقین دلا رہی تھی۔

وہ آہستہ قدموں سے پولیس کانسٹیبل کے قریب سے گزری اور اس کے ہاتھ میں دبی اسپرے کی بوتل سے سفید رنگ کی پھوار نکل کر کانسٹیبل کے چہرے پر پڑی۔ کانسٹیبل نے ایک لمحے کے لیے دونوں ہاتھ ہلائے اور پھر اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے گر گئے۔

شازیہ اس کے سامنے سے گزر کر آگے بڑھتی چلی گئی۔ لیکن اس بار وہ زیادہ دور نہیں گئی اور چند ہی قدم چل کر واپس آ گئی۔ پھر روم نمبر اکیاون کا دروازہ کھول کر تیزی سے اندر داخل ہو گئی۔ اندر نیلی روشنی تھی۔ ایک مسہری پر دبلے پتلے بدن کی ایک عورت لیٹی ہوئی تھی۔ شازیہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر اسپرے کی ہلکی سی دھار اس کے چہرے پر پھینکی اور اس کے بعد وہ خاموشی سے باہر نکل آئی۔ اب وہ اس راہ داری کی دوسری طرف جا رہی تھی۔ سیڑھیوں کے پاس اسے مطلوبہ افراد مل گئے۔ یہ دونوں وارڈ بوائے تھے جو تھکے تھکے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک شاید سگریٹ بھرنے میں مصروف تھا۔ شازیہ کو دیکھتے ہی اس نے چرس کی گولی چھپالی۔

''اٹھو......'' شازیہ کرخت لہجے میں بولی اور شاید اس کا بگڑا ہوا لہجہ کام کر گیا۔ وہ دونوں چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''یس...... یس سسٹر۔'' ایک نے بہ مشکل کہا۔

''اسٹریچر لاؤ۔'' شازیہ نے رخ بدل لیا اور سگریٹ بھرنے والا جلدی سے ایک طرف بڑھ گیا۔ وہ دیوار سے لگا ہوا اسٹریچر گھسیٹ کر شازیہ کے قریب آیا تو شازیہ دوسری طرف مڑ گئی۔ وہ دونوں اس کے پیچھے

پیچھے چلنے لگے تھے۔ شازیہ انہیں روم نمبر اکیاون میں لے گئی۔ کانسٹیبل کی کچی نیند اب خوب گہری ہو گئی تھی اور شازیہ کو یقین تھا کہ وہ کئی گھنٹے تک نہیں جاگ سکے گا۔ وارڈ بوائے چوں کہ غلط حرکت کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے اس لیے ان کے ذہن میں صرف یہ خیال تھا کہ نرس کا غصہ دور کر دیا جائے۔

چناں چہ وہ شازیہ کے اشارے پر تمام تر عمل کر رہے تھے۔ پھر اس دبلی پتلی مریضہ کو اٹھا کر اسٹریچر پر ڈال دیا گیا۔

''چلو نیچے لے چلو ایمرجنسی وارڈ کے قریب۔'' شازیہ نے کہا اور انہیں آگے جانے کے لیے راستہ دے دیا۔ دونوں بلا چوں چراں آگے بڑھ گئے۔ شازیہ نے بوڑھی عورت کا چہرہ چادر سے ڈھک دیا تھا اور وہ ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی تھی۔ اسٹریچر سے جانے کا راستہ ڈھلوان تھا اور دوسری سمت میں تھا جسے شازیہ نہیں جانتی تھی۔ پھر وہ جس جگہ نیچے اترے وہ ایمرجنسی وارڈ کا عقبی حصہ تھا جہاں کار بہ آسانی لائی جا سکتی تھی اور کسی قدر تاریکی بھی تھی۔

''کہاں لے چلنا ہے سسٹر۔'' ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''اسے پہچانتے ہو۔'' شازیہ نے اسپرے کی بوتل ان کے سامنے کر دی اور وہ دونوں اسے دیکھنے لگے لیکن پھر اچانک ہی پیچھے ہٹے، کیوں کہ اسپرے کی پھوار ان کے چہروں پر پڑی تھی۔ چند سیکنڈ تک وہ آنکھیں پھاڑتے رہے پھر دونوں ایک دوسرے پر ڈھیر ہو گئے۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی شازیہ برق رفتاری سے اپنی کار کی جانب بڑھی۔ پارکنگ لاٹ سے کار نکالی اور چکر کاٹ کر ایمرجنسی وارڈ کے عقب میں آ گئی۔ پھر اس نے بزرگ خاتون کو کار کی عقبی سیٹ پر ڈال دیا۔ کیوں کہ وہ ہلکے پھلکے جسم کی مالک تھی اس لیے اس میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ شازیہ نے برق رفتاری سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔

اسپتال کی عمارت سے باہر نکلتے ہوئے اس کو جس قدر خوشی تھی وہ اسے برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ چھوٹے بابا نے پہلا کام اس کے سپرد کیا تھا اور یہ لوگ بڑی خوشی سے اپنا کام سرانجام دے رہے تھے۔ اپنے اس کام میں اس نے دلاور اور غلام قادر کو بھی شریک نہیں کیا تھا، لیکن بہر حال ابھی کچھ اور دوسرے مرحلے بھی تھے۔ اسے بہت سارا کام کرنا تھا۔ آخر کار وہ گرین ہاؤس میں داخل ہو گئی۔

دلاور اور غلام قادر جاگ رہے تھے۔ غلام قادر نے اسے دیکھ کر آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

''ارے ماں قسم کیا یہی ہے وہ۔''

''ہاں۔''

''کمال ہے۔ دلاور! دیکھا تم نے شازیہ بہن کو۔''

''ہاں۔'' دلاور نے آہستہ سے کہا۔

''وہ معمر عورت کو بڑے احترام کے ساتھ اندر لے آئے تھے۔

''کیا ابھی چھوٹے بابا کو بولنا ہے۔''

''نہیں نہیں ابھی نہیں۔ ابھی ذرا ہمیں ان سے بات چیت کرنی ہے۔ وہ بوڑھی عورت کئی گھنٹے کے بعد ہوش میں آئی تھی اور اس کے منہ سے عجیب و غریب الفاظ نکلے تھے۔ وہ لوگ غور سے اسے سننے لگے۔

بوڑھی عورت کہہ رہی تھی۔

''فرشتے آسمان سے اترتے ہیں زمین پر ان کے پیر پیلے ہوجاتے ہوں گے۔ قالین بچھادو جبرائیل علیہ السلام بھی فرشتے ہیں۔ دل کو داغ داغ کردو، سینہ جلادو ہوشیار طوفان نوح نہ آجائے۔ گناہوں سے بچو۔ فرشتے آسمان سے اتر آئے ہیں۔ اسے صاف کرو زمین گندی ہے۔'' وہ تینوں معمر عورت کو دیکھ رہے تھے۔ لادر نے آہستہ سے کہا۔

''جس قدر صدمات اسے اٹھانے پڑے ہیں ظاہر ہے اس کی یہ حالت ہونی ہی تھی۔''

''اب کیا کیا جائے۔''

''دیکھتے ہیں۔''

''چھوٹے بابا کو بھی نہیں بتانا اس سلسلے میں۔''

''نہیں بتائیں گے لیکن ذرا تھوڑا سا وقت گزرنے دو۔ میں ابھی اور بھی کچھ کرنا چاہتی ہوں۔''

''بہرحال شازیہ اپنے طور پر مصروف تھی ادھر رابعہ سلطان مسلسل کوششوں میں لگی ہوئی تھی۔ بڑی مشکل کے بعد اس نے بھی پتا لگایا تھا کہ دردانہ اور حفیظ کی ماں کہاں ہیں، لیکن جب وہ اسپتال پہنچی تو کام بگڑ چکا تھا۔ اسپتال میں ہنگامہ آرائی ہورہی تھی اور اس کی تفصیل یہ تھی کہ اسپتال کے کمرے سے ایک مریضہ کو اغوا کرلیا گیا تھا جس پر باقاعدہ پولیس کا پہرہ لگا ہوا تھا اور یہی وہ مریضہ تھی جس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے رابعہ سلطان یہاں تک پہنچی تھی۔ اس وقت خاصی رات ہوگئی تھی۔ وہ بہت پریشان ہوگئی۔

بہرحال کافی دیر تک اسپتال میں قیام کرکے وہ تفصیلات معلوم کرتی رہی۔ ایک رپورٹر کی حیثیت سے ایسے کام اس کے لیے مشکل نہیں ہوا کرتے تھے۔ اس کے کاغذات اس کے پاس ہی ہوتے تھے۔ بہرحال وہ وہاں سے واپس پلٹی۔ خاصی رات ہوچکی تھی۔ اس کے ذہن پر اداسیوں کا حملہ تھا۔ صوفی نے ابھی تک اس سے رابطہ نہیں قائم کیا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ صوفی کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوگئی تھی۔ عام لوگ اگر اس بات کو سنتے تو اسے اس کی دیوانگی ہی کہتے، لیکن دل تو کم بخت دل ہی ہوتا ہے۔ پتا نہیں کس وقت کیا کربیٹھے۔ رابعہ کے ساتھ شاید ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔ صوفی جیسا لم ڈھینگ بھلا اس قابل تھا کہ اس سے محبت کی جائے۔ لیکن انسان کے دل کی بناوٹ کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔ نہ جانے کیوں رابعہ کا جی چاہا کہ کسی طرح ان کے بارے میں کچھ اور معلومات حاصل ہوں اور پھر اس کے ذہن میں دردانہ کے گھر کا تصور آگیا۔ کیوں نہ گھر کی باریک بینی سے تلاشی لی جائے۔ اس نے سوچا۔

اور پھر اس کی کار اس طرف چل پڑی۔ وہ خاموشی سے علاقے میں داخل ہوگئی۔ پس ماندہ علاقے میں تاریکی کا راج تھا۔ قرب و جوار میں کسی انسان کا وجود نہیں تھا۔ وہ دردانہ کے گھر کے پاس پہنچ گئی۔ خالی مکان سائیں سائیں کررہا تھا۔ رابعہ سلطان نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اچھل کر صحن کی ایک دیوار پکڑ لی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ صحن میں کھڑی ہوئی تھی۔ چھوٹا سے بے نور مکان مکینوں کی تباہ حالی پر رو رہا تھا۔ اس کے اکلوتے کمرے کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ رابعہ بے آواز چلتی ہوئی دروازے کے پاس پہنچی، لیکن اچانک ہی ٹھٹھک گئی۔ تالا کھلا ہوا تھا اور کنڈی میں لٹک رہا تھا۔ یقیناً یہ پہلے بند ہوگا اور یہ دروازہ اس وقت مقفل کیا گیا ہوگا جب گھر کے مکینوں کو اچانک دردانہ کے حادثے کی اطلاع ملی ہوگی، لیکن اس وقت اس کا کھلا ہونا اس بات کا ثبوت تھا کہ مکینوں کی عدم موجودگی میں کسی نے مکان کی تلاشی لی ہے۔ اچانک ہی اندر سے آواز سنائی دی اور ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں رابعہ کے ذہن نے خطرے کا اعلان کردیا۔ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے ادھر ادھر دیکھا لیکن دیر ہوچکی تھی۔ ابھی وہ چھپنے کے لیے جگہ کوئی تلاش کررہی تھی کہ دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور کوئی پوری قوت سے اس سے ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہی کوئی چمکدار چیز بھی اس کی طرف لپکی تھی۔ لیکن بہرحال کچھ تو تقدیر کا ساتھ اور اس کے علاوہ رابعہ کے اپنے شوق اس کے کام آگئے جو جسم اس سے ٹکرایا تھا رابعہ نے اس کی ٹکر سے ہی فائدہ اٹھایا اور پھرتی سے ایک سمت لڑھک گئی۔ اس طرح وہ اس لمحے چاقو کے وار سے بچ گئی جو اس کی پسلیوں پر کیا گیا تھا۔ نیچے لڑھکنے کے بعد وہ فوراً سنبھل گئی۔ حملہ آور اب یقینی طور پر سامنے سے حملہ کرنا چاہتا تھا اور رابعہ کے دونوں پاؤں اس حملے کو روکنے کے لیے تیار تھے، لیکن صورت حال بدل گئی۔ حملہ آور اس کی اچانک آمد سے بدحواس ہوگیا تھا۔ اس نے پلٹ کر دوبارہ حملہ کرنے کے بجائے صحن کے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی اور بری طرح دروازے سے ٹکرایا لیکن کسی نہ کسی طرح بھاگنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

''اس کے پیچھے دوڑنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا لیکن یہ قصہ کیا تھا۔ حملہ آور کوئی معمولی چور اچکا تھا جو اکیلا گھر دیکھ کر چوری کی نیت سے گھس آیا تھا یا اسے کسی خاص چیز کی تلاش تھی۔ جس انداز میں اس نے پھرتی کے ساتھ چاقو چلایا تھا اس سے اس کی مہارت کا اندازہ ہوتا تھا لہٰذا اسے کوئی معمولی چور اچکا تسلیم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ رابعہ چند لمحے اسی طرح دم سادھے اسی طرح پڑی رہی پھر وہ کمرے کی طرف بڑھی اور کھلے ہوئے دروازے سے کمرے میں داخل ہوگئی۔ دیوار پر بٹن لگے ہوئے تھے اس نے ایک بٹن روشن کیا اور مدھم سا پیلا بلب مالکان کی حرماں نصیبی کا اعلان کرنے لگا۔

اندر داخل ہوکر رابعہ نے کمرے کا جائزہ لیا۔ بلاشبہ یہ چوری کی واردات نہیں تھی۔ کمرے کا سامان پھیلا ہوا پڑا تھا۔ ہر چیز الٹ پلٹ کردی گئی تھی۔ وہ چند لمحے جائزہ لیتی رہی۔ اس نے ایک خاص بات نوٹ کی تھی کہ باہر سے یہ مکان جس قدر معمولی اور لٹا پٹا ہوا نظر آرہا تھا اندر سے ایسا نہیں تھا۔ بکھرے ہوئے سامان میں بیش قیمت چیزیں بھی تھیں جن کی موجودگی اس افلاس شدہ مکان میں باعث حیرت تھی۔ اچانک ہی باہر سے پھر کچھ آوازیں ابھریں اور اس کے بعد لوگوں نے چور چور کے نعرے لگانا شروع کردیے۔ رابعہ کے اوسان خطا ہوگئے۔ یہ کیا ہوگیا۔ اگر یہ لوگ اندر گھس آئے اور انہوں نے رابعہ کو پکڑ لیا تو بعد کی باتیں تو بعد میں ہی ہوتیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور مکان کے پچھلی طرف سے گھوم کر اوپر کود گئی۔ تنگ سی گلی میں اس کے پاؤں کیچڑ میں لتھڑ گئے، لیکن اس کی پروا کیے بغیر وہ تیزی سے آگے بڑھی اور مکان کی پچھلی طرف سے گھوم کر سامنے کے رخ پر آگئی۔ رات کی تاریکی نے اس کی پردہ پوشی کی تھی۔ کافی لوگ جمع ہوگئے تھے۔ ان میں عورتیں اور مرد دونوں ہی تھے۔ ان کے درمیان ایک شخص اکڑوں بیٹھا کراہ رہا تھا۔ ایک لمحے تک تو صورت حال رابعہ کی سمجھ میں نہیں آئی لیکن پھر اسے اندازہ ہوگیا کہ کمال ہوگیا ہے۔ درمیان میں بیٹھا ہوا شخص زخمی تھا، لیکن وہ لوگ اسے اٹھانے کے بجائے اس کے بارے میں باتیں کررہے تھے۔

"بگڑ گیا بھیا...... بگڑ گیا یہ محلہ بھی۔ اب تو یہاں رہنا بس اپنے آپ کو ذلیل کرنا ہے۔"

"مگر ہوا کیا ہے۔ کچھ پتا تو چلے۔"

"ہونا کیا تھا بھائی محلے کا ماحول بگڑ گیا ہے۔ لونڈے جوان ہو کر برے راستوں پر چل پڑے ہیں۔ جوئے اور سنیما کی لت لگ گئی ہے اور اب تو وہ بھی آ گیا ہے کیا کہتے ہیں اسے انٹر...... انٹرویو'...... کسی نے کہا۔

"اماں نہیں وہ جو آ گیا ہے نا۔ وہ جو لونڈے وہاں جا کر بیٹھ جاتے ہیں اور وہ چلاتے ہیں۔"

"انٹرنیٹ۔"

"ہاں ہاں وہی۔ اب بتاؤ یہ حرکتیں نہیں کریں گے تو کیا کریں گے۔"

"یہ محمود ہے نا۔ اسے کیا ہو گیا۔" کسی نے درمیان میں بیٹھے ہوئے زخمی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"بس ہوا کچھ نہیں۔ یہاں بے چارہ پیشاب کرنے بیٹھا کہ کوئی حفیظ کے گھر سے نکل کر اس سے ٹکرا گیا۔ اس نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو چاقو مار گیا۔"

"ارے کہاں گیا؟ کون تھا؟"

"اپنا نام اور پتا بتا کر نہیں گیا ورنہ تو میں ضرور بتا دیتا۔" سوال کرنے والوں کو تلخی سے جواب دیا گیا۔

"محلے ہی کا کوئی لونڈا ہو گا کسی باہر والے کی کیا مجال ہے کہ ہمارے علاقے میں آ جائے۔ اچھا اسے دفع کرو۔ اسے تو اٹھاؤ بے چارے کو یہ زخمی بیٹھا ہوا ہے کہاں لگا ہے چاقو۔" رابعہ سلطان نے ایک گہری سانس لی۔ اب وہ اس گھر میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ اہل محلہ کو یقین تھا کہ اس مکان میں چوری کی گئی ہے۔

بہر حال وہ وہاں سے نکل آئی اور اپنی کار میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کر دیا۔ کیچڑ سے آلودہ جوتے پیروں میں سخت تکلیف دے رہے تھے۔ تھوڑی دور جا کر اس نے ان سے نجات حاصل کی اور انہیں اتار کر باہر پھینک دیا۔ پھر وہ ننگے پاؤں کار ڈرائیو کرتی ہوئی اپنی رہائش گاہ تک آ گئی تھی۔

نہ جانے کیوں دل کو ایک شدید اداسی کا احساس ہو رہا تھا اور یہ سوچ رہی تھی وہ کہ کیا اس سلسلے میں واقعی اسے کوئی کامیابی حاصل ہو سکے گی۔ وہ لوگ حد سے زیادہ چالاک تھے اور اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا۔ اس مکان کی تلاشی لینے میں دیر ہو گئی تھی یقیناً وہاں کوئی ایسی چیز موجود تھی جس سے واقعات پر روشنی پڑ سکتی۔ ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے۔ کاش! کچھ پتا چل سکتا۔

بہر حال اس مسئلے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اخبار کے لیے آرٹیکل دینا ضروری تھا اور یہ اس وقت اس کا پسندیدہ موضوع تھا۔ چناں چہ اس نے آرٹیکل لکھنا شروع کر دیا۔ دردانہ کو اس لیے نظر انداز نہ کیا جائے کہ وہ ایک غریب خاندان کی آبرو تھی۔ معاشرے کا تحفظ قوم کی ذمے داری ہوتی ہے اور جو قوم اپنے معاشرے کا تحفظ نہیں کر پاتی وہ اپنی تہذیب اور ثقافت کو کھو دیتی ہے۔ اس وطن کی لاکھوں بیٹیاں اپنے مسائل کے حل کی تلاش میں صبح صبح ہی گھروں سے نکل جاتی ہیں۔ وہ اسکولوں، دفتروں، کارخانوں میں نوکریاں کرتی ہیں اور اپنے بوجھل ماحول کو سدھارنے کے لیے بے پناہ محنت کرتی ہیں ان معقول محنت کشوں کے ساتھ۔ اگر ہم کوئی بہتر سلوک نہیں کر سکتے تو کم از کم یہ تو ہماری ذمے داری ہے کہ ان کی عزت و آبرو کی حفاظت کریں۔ یہ ہمارا اخلاقی اور معاشرتی فرض ہے۔ یوں تو یہ فرض ہر انسان پر لاگو ہوتا ہے لیکن انتظامی اداروں کو ان پر

خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ معصوم مقتولہ دردانہ کے کردار پر بدکاری کا ٹھپا لگا کر اس کے بھائی کو گرفتار کیا گیا ہے، لیکن یہ پولیس کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ اس الزام کو ثابت کرے۔ پریس کو موقع دیا جائے کہ وہ دردانہ کے بھائی سے انٹرویو لے سکے۔ دردانہ کی ماں کی پوری پوری حفاظت کی جائے۔ اس کے بیان سے عوام کو مطلع کیا جائے۔ دردانہ کا قتل ان محنت کش لڑکیوں کے لیے خوف کی بنیاد رکھتا ہے جو نوکریاں کر کے اپنے خاندانوں کی کفالت کرتی ہیں۔ دردانہ کے قتل کے سلسلے میں ایک ایک بات کی وضاحت بہت ضروری ہے اور اس سلسلے میں انتظامیہ کو توجہ دینی چاہیے۔

اسے یہ دکھ تھا وہ اس گھر کی صحیح طور پر تلاشی نہ لے سکی۔ ایک بار پھر اس نے محلے کا رخ کیا تھا اور ان خاتون کے دوسری سمت والے گھر میں جو پورے دنوں سے تھیں چلی گئی تھی۔ یہ خاتون بھی بہت خوش اخلاق تھیں اور انہوں نے بڑا پرتپاک استقبال کیا تھا۔

"اے بی بی! پتا نہیں کیا ہو رہا ہے اللہ جانے، لیکن خدا لگتی کہتی ہوں کہ ان لوگوں پر آفت آ گئی ہے۔ بس وہ جو کہتے ہیں اللہ سب لوگوں کو مشکل سے بچائے۔ ویسے ایک بات بتاؤ۔ بیٹا شادی ہو گئی تمہاری۔"

"جی ہاں۔ تین بچے ہیں۔" رابعہ سلطان نے گہری سانس لے جواب دیا اور وہ چونک پڑیں۔

"اچھا۔ اچھا۔ ماشاء اللہ۔" ان کی آواز میں گرم جوشی ختم ہو گئی۔ پھر وہ بولیں۔

"میاں کیا کرتے ہیں۔"

"میاؤں میاؤں کرتے ہیں۔" لفظ میاں سن کر نہ جانے کیوں رابعہ کے ذہن میں میاؤں میاؤں گونجنے لگتی تھی۔ وہ خاتون چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔ ان کے چونکنے پر وہ بھی سنبھل گئی۔

"مطلب میں سمجھی نہیں۔"

"بس جی نکھٹو ہیں گھر میں پڑے رہتے ہیں۔ میری ہی کمائی پر گزر ہو رہا ہے۔" رابعہ نے جلدی سے بات بنا دی اور بڑی بی افسردہ ہو گئیں۔

"ہاں بیٹی! لڑکیوں کی تقدیر بھی عجیب ہوتی ہے۔ ماں باپ جس کے پلے باندھ دیں بے چاریاں گزارہ کرتی ہیں۔ گھر کی چار دیواری میں انسان محفوظ نہ ہو تو کہاں جائے۔ بہت چھوٹی عمر میں شادی ہو گئی تمہاری۔ تین بچوں کی ماں تو لگتی ہی نہیں ہو۔ کوئی چھوٹی بہن بھی ہیں تمہاری۔" بڑی بی نے کہا۔

"جی نہیں ساری دنیا میں تنہا ہوں۔ ایک بہن تھی وہ بے چاری بھی حادثے کا شکار ہو گئی۔"

"حادثے کا شکار۔"

"ہاں۔ بالکل ایسے ہی جیسے آپ کے پڑوس میں وہ بچی دردانہ۔"

"ہاں بیٹی۔ حالانکہ اسے بہت کم دیکھا تھا لیکن بی بی اللہ جنت نصیب کرے جو کچھ اس کے بارے میں اُڑایا گیا ہے سب غلط ہے۔ سارے محلے میں کسی سے پوچھ لو۔ کوئی اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

"آپ سے زیادہ ان لوگوں کو کون جانتا ہو گا۔ آپ تو اکثر وہاں آتی جاتی ہوں گی۔"

"نہیں۔ فرصت کہاں ملتی ہے۔" بہرحال یہاں سے بھی کوئی بہت بڑی بات معلوم نہیں ہوئی تھی۔
ایک بار پھر اسے صوفی کا خیال آیا اور وہ صوفی کی جانب چل پڑی۔ ممن خان کے ہوٹل میں جاکر صوفی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اسے بہت عجیب لگتا تھا، لیکن بعض اوقات یہ سب کچھ بھی کرنا ہی پڑتا ہے۔ البتہ آج صوفی اسے مل گیا تھا۔ نہ جانے کیوں رابعہ سلطان کے لہجے میں اور انداز میں ایک شکایت سی پیدا ہوگئی۔

"صوفی صاحب! مجھے یوں لگتا ہے جیسے آپ اس معاملے میں دل چسپی نہیں لے رہے۔ میں تو کتنی ہی بار آپ سے ملنے آچکی ہوں۔"

"جی...... جی ہاں...... معافی چاہتے ہیں بس اصل میں اتفاق ہوتا ہے۔"

"نہیں میں تو کچھ اور ہی محسوس کررہی ہوں۔"

"کیا درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"یہی کہ آپ مجھ سے بھاگ رہے ہیں۔"

"بھاگ رہے ہیں؟" صوفی حیرت سے بولا۔ "ہم تو یہیں کھڑے ہیں۔"

"مذاق کررہے ہیں آپ۔"

"بب...... یہ خدا لڑکیوں سے مذاق کرنے کی ہمت کبھی نہیں ہوتی۔ عام طور سے تھپڑ ماردیا کرتی ہیں۔"

"جاہل لڑکیاں ایسا کرتی ہیں۔ ویسے صوفی صاحب سچ بتایئے فرقان جلیل صاحب نے جو کچھ کہا تھا آپ اس سلسلے میں دلچسپی نہیں لے رہے نا۔"

"یہ...... یہ بات نہیں ہے۔ بس تھوڑی سی معلومات درکار ہوتی ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں آج کل ذرا مصروف ہیں۔ ایک چلہ کریں گے اور ساری حقیقتیں سامنے آجائیں گی۔"

"چلہ......"

"بہت سے معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں اگر کوئی خاص عمل نہ کیا جائے...... تو بس ایک چلہ کرلیجیے یوں سمجھ لیجیے کہ ہر مشکل کا حل ایک چلے میں موجود ہے۔"

"چلہ......"

"جج...... جی ہاں، وظیفہ۔ آپ اگر کرنا چاہیں تو۔"

"جی نہیں۔ میں عملی شخصیت رکھتی ہوں اس طرح کی باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔"

"حق اللہ۔ درویش سب پر رحم کریں۔"

"جی ہاں۔ خیر میں بددل ہوکر جارہی ہوں۔ دوبارہ آپ سے ملاقات نہیں کروں گی۔"

"ارے نہیں نہیں۔ بب...... بددل نہ ہوں درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے تو بددل نہیں ہورہی البتہ آپ سے بددل ہوں۔"

"اچھا یہ بتایئے آغاز کہاں سے کرنا چاہتی ہیں۔"

"آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں کہ بس چٹکی بجائیں گے اور سارے معاملات حل ہوجائیں گے۔"

"ممکن ہے ایسا ہوجائے۔" صوفی نے جواب دیا۔

"مطلب۔"

"میں نے کہا نا آپ حکم کیجیے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ یہ مجرم تو ایک چلے کا بھی نہیں ہے۔" رابعہ سلطان کو یہ ساری باتیں اچھی نہیں محسوس ہوئی تھیں۔
صوفی کے بارے میں تو فرقان جلیل نے بتایا تھا کہ وہ بہت ہی حساس انسان ہے کسی بے گناہ کو مشکل میں نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن صوفی کی طرف سے اس کیس میں نہ جانے کیوں کچھ بے اعتنائی برتی جارہی تھی۔
بہرحال رابعہ سلطان نے اب بھی ہار نہیں مانی تھی۔ وہ اپنے طور پر کوششیں کررہی تھی۔ دوسری صبح اسے اپنے اخبار کے ایڈیٹر کا فون ملا۔

"تم خیریت سے تو ہو نا رابعہ!" ایڈیٹر صاحب نے بزرگانہ شفقت سے پوچھا۔

"جی سر! ٹھیک ہوں۔ کوئی خاص بات ہے کیا۔"

"ہاں۔ ردعمل ہوگیا ہے۔"

"جی۔" رابعہ حیرت سے بولی۔

"تقریباً پندرہ بیس افراد ایک ٹرک میں بیٹھ کر دفتر آئے تھے اور یہاں انہوں نے کافی توڑ پھوڑ کی مجھے بھی مارا پیٹا اور اسٹاف کو بھی کافی چوٹیں آئی ہیں۔ میں ان غنڈوں میں سے چند کی شکلیں دیکھ چکا ہوں لیکن ان کی نشاندہی نہیں کرسکتا۔"

"اوہ میرے خدا آپ کو زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں۔"

"نہیں میری چوٹوں کی فکر نہ کرو۔ اپنے بارے میں سوچو۔"

"کیا آپ نے پولیس کو فون کردیا ہے۔"

"ہاں اطلاع تو دینی ہی تھی۔ خیر میں نے تمہیں فون پر صرف اس لیے اطلاع دی ہے کہ تم اپنا خیال رکھو۔ دفتر آرہی ہو کیا؟"

"جی پہنچ رہی ہوں۔" رابعہ سلطان خاصی پریشان ہوگئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ جو کچھ وہ کررہی ہے یا لکھ رہی ہے۔ وہ اس شخص کو متاثر کررہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دفتر پہنچ گئی۔ اس واقعے کو رونما ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ کیونکہ اب بھی دفتر کی عمارت کے سامنے لوگ کھڑے ہوئے اس ہنگامے پر تبصرہ کررہے تھے۔ رابعہ اندر داخل ہوگئی۔ تمام اسٹاف ایک جگہ جمع تھا۔ دفتر کی حالت تباہ تھی۔ ایڈیٹر صاحب اپنے کمرے میں موجود تھے۔ ان کی پیشانی پر پٹی بندھی ہوئی تھی جس پر خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ چہرے پر بھی خراشیں تھیں اور بایاں ہاتھ ایک رومال سے باندھ کر گردن میں لٹکا دیا گیا تھا۔ کمرے میں کچھ دوسرے صحافی بھی موجود تھے۔ ایڈیٹر صاحب اسے دیکھ کر مسکرائے۔ رابعہ بے چینی سے بولی۔

"آپ نے کسی ڈاکٹر کو نہیں فون کیا؟"

"آنے والا ہے۔"

"اس کے بعد ڈاکٹر اور انسپکٹر ساتھ ہی ساتھ آئے تھے۔ لیکن انسپکٹر کو دیکھ کر رابعہ سلطان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ اس کے بعد کی کارروائی بس عارضی ہی تھی۔ انسپکٹر راجا ناصر تھا اور اس

نے اس بارے میں تھوڑی سی چھان بین کی تھی۔ البتہ رابعہ سلطان کے پاس وہ خاص طور پر پہنچا تھا۔

''ساری صورت حال میں سمجھ رہی ہوں۔''

''تم یہاں سے نکل کر میرا مطلب ہے جب میں یہاں سے چلا جاؤں تو بائیں سمت ایک ریسٹورنٹ ہے۔ اس میں آ جانا۔'' رابعہ نے ایک نظر راجا ناصر کو دیکھا اور خاموش ہوگئی۔ کافی دیر تک وہ ایڈیٹر صاحب سے اظہار افسوس کرتی رہی۔ ڈاکٹر بھی آ گیا تھا اور باقی کاغذی کارروائی بھی ہوگئی تھی، پھر راجا ناصر تفصیلات معلوم کرنے کے بعد وہاں سے چلا گیا اور کچھ دیر بعد رابعہ سلطان اس ریسٹورنٹ میں پہنچ گئی۔ ایک سنسان سے گوشے میں راجا ناصر بیٹھا ہوا تھا۔ رابعہ کو اس نے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ویٹر کو بلا کر چائے کا آرڈر کر دیا۔

''تو آخر تم نے انہیں اپنی جانب متوجہ کر ہی لیا۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ تم آگ لگا رہی ہو اور اس آگ سے جھلسنے والے جھلسنا شروع ہوگئے ہیں۔ میں تمہاری رپورٹنگ سے واقعی بہت متاثر ہوں۔''

''شکریہ۔'' رابعہ نے طویل سانس لے کر کہا۔

''بہر حال مجھے افسوس ہے۔''

''تمہیں تو ان لوگوں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہوں گی۔'' رابعہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ تو راجا ناصر کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ اس نے کسی قدر افسردہ لہجے میں کہا۔

''گویا تم ابھی تک میرے خلوص سے مطمئن نہیں ہو۔ حالانکہ میں نے زندگی میں پہلی بار اپنے ضمیر کی آواز سنی تھی اور آواز کی اس زنجیر سے بندھا تمہارے پاس چلا آیا تھا۔ افسوس تمہارے ذہن میں ابھی تک میرے بارے میں شکوک موجود ہیں۔ میں تمہیں ایک بات بتاؤں رابعہ! ہم لوگ بھی انسان ہیں۔ فرض کی ادائیگی میں بعض اوقات ہمیں حد سے تجاوز کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ بھی ہماری مجبوری ہوتی ہے کبھی کبھی ہمارے ہاتھوں کی پہنچ محدود کر دی جاتی ہے۔ ہم کچھ کرنا چاہتے ہیں لیکن کر نہیں پاتے۔ یہ سلسلہ بھی کچھ اس قسم کا تھا۔''

''دردانہ یاد ہے تمہیں راجا ناصر۔''

''ہاں یاد ہے۔''

''اور اس کی التجائیں بھی یاد ہیں۔''

''ہاں رابعہ۔''

''وہ کہہ رہی تھی سر! میری بات تو سن لیں۔ سر میری زندگی کو خطرہ ہے سر آپ۔''

''خدا کے لیے اب ان الفاظ کو مت دہراؤ۔'' راجا ناصر کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوگئے۔

''ٹھیک ہے اس وقت تمہاری مجبوری تھی لیکن اب ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے دشمنوں کے خلاف کچھ کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔'' راجا ناصر بے بسی سے رابعہ سلطان کی صورت دیکھنے لگا پھر طویل سانس لے کر بولا۔

''تم اس معاملے میں واقعی اتنی سنجیدہ ہو۔''

''اب بھی پوچھنے کی گنجائش رہ جاتی ہے نہ صرف میں بلکہ میرے ایڈیٹر صاحب جو اس اخبار کے

مالک بھی ہیں اور اسٹاف۔''

''ٹھیک ہے میں جو کچھ تمہارے لیے کر سکتا ہوں ضرور کروں گا۔''

''راجا ناصر! جب تک دردانہ کی التجائیں میرے کانوں میں گونجتی رہیں گی مجھے سکون نہیں ملے گا۔''

''سنو رابعہ! غور سے سنو شاید تم اس سے کچھ نتیجہ اخذ کر سکو جو میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔ تم صحافی ہو اور ایک اخبار میں کام کرتی ہو یہ صرف تمہارا شوق ہی نہیں بلکہ تمہاری ضرورت بھی ہے۔''

''بے شک اس میں کیا شک ہے۔''

''بہر حال تم یہ بتاؤ کہ اگر یہ اخبار تمہارے ہاتھ سے نکل جائے تو تمہیں پریشانی ہوگی یا نہیں۔''

''کیوں نہیں ہوگی۔ یہ کوئی سوال ہے۔''

''بس ایسی ہی چند مجبوریاں انسان کے آڑے آ جاتی ہیں اور اسے اپنے ضمیر کے خلاف کام کرنا پڑتا ہے۔ دردانہ جب میرے پاس آئی تھی تو میں نے اس پر توجہ دی تھی، لیکن جب اس نے مجھے ایک ایسی شخصیت کا حوالہ دیا جو بڑی پراثر ہے تو میں چونک پڑا۔ میں تمہیں ایک بات اور بھی بتاؤں۔ اس سے قبل بھی ایسا ہی کیس میرے پاس آ چکا ہے۔'' راجا ناصر کا یہ انکشاف چونکا دینے والا تھا۔ رابعہ جلدی سے بولی۔

''میں سمجھی نہیں۔''

''تین چار ماہ پہلے کی بات ہے میں دوسرے تھانے میں انچارج تھا۔ یہ بھی ایک رات ہی کا واقعہ ہے۔ میں ایک چوراہے سے گزر رہا تھا کہ بدحواس لڑکی مجھے پولیس یونیفارم میں دیکھ کر میری طرف دوڑی اور مجھ سے پناہ کی درخواست کی۔ اس نے مجھے ٹوٹے پھوٹے اور بے ربط لہجے میں بتایا کہ وہ ایک ایسے شخص کا شکار ہوئی ہے جو بہت بڑا آدمی ہے، لیکن اس نے اسے جس جگہ بھیجا تھا وہ...... وہ ایک خوف ناک جگہ تھی اور وہاں ایک عجیب و غریب شخصیت موجود تھی۔ اس نے مجھے تفصیل بتائی تھی۔ رابعہ اس نے کہا تھا کہ اس شخصیت کا جسم بڑا عجیب ہے وہ اوپر سے مکمل ہے لیکن اس کے پاؤں سے زیادہ کے نہیں ہیں۔ باقی اس میں تمام تر انسانی صفات موجود ہیں۔ اس لڑکی کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔

بہر حال میں اسے اپنے ساتھ لے گیا اور تحقیقات شروع کر دیں۔ لڑکی کو میں نے ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرایا لیکن وہاں پہنچ کر وہ ذہنی طور پر بالکل ہی معطل ہوگئی اور اس کے بعد اس نے کسی کو ایک لفظ بھی نہ بتایا۔ مجبوراً میں نے اس کی تصویریں اخبارات کو دیں اور اس کے سرپرستوں کی تلاش شروع کر دی، لیکن پہلے ہی روز مجھے احکامات ملے کہ اس بارے میں ایک لفظ بھی کسی کو نہ بتایا جائے اور اس کیس کی فائل کو اوپر پہنچا دیا جائے۔ ان احکامات کو میں ٹال نہیں سکتا تھا۔ چناں چہ میں نے مجبور ہو کر وہی سب کچھ کیا۔ اسپتال کے انچارج نے اطلاع دی کہ چند لوگوں نے لڑکی کو اسپتال سے اغوا کر لیا ہے اور اس سلسلے میں اسپتال کا انچارج رپورٹ درج کرانا چاہتا ہے۔ میں نے اوپر سے رابطہ قائم کیا تو مجھے اطلاع ملی کہ میں اپنے روزنامچے میں تھوڑی سی تبدیلی کر لوں اور رپورٹ میں درج کروں کہ لڑکی چوں کہ پاگل تھی اس لیے اسپتال سے فرار ہوگئی۔ میں نے اسپتال کے انچارج کا حوالہ دیا تو کہا گیا کہ میں اپنی طرف سے رپورٹ درج کرلوں۔ اسپتال کا انچارج بھی یہی بیان دے گا مجھے بے فکر رہنا چاہیے، اور پھر یہی ہوا۔ دوسرے روز جب

میں نے اسپتال کے انچارج سے رابطہ قائم کیا تو اس نے بتایا کہ اسے غلط فہمی ہوگئی۔ لڑکی اصل میں دیوانگی کی حالت میں فرار ہوئی تھی۔ نہ جانے کس طرح دل پر جبر کرکے میں نے ان سے جھوٹ بولا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اس روز دردانہ کو نظر انداز کر دیا تھا۔ میری مجبوری تمہاری سمجھ میں آ گئی ہوگی۔'' راجا ناصر کرب ناک انداز میں خاموش ہوگیا۔

اس وقت اس کی باتوں سے سچائی جھلک رہی تھی۔ رابعہ سلطان کے ذہن میں بہت سے خانے روشن ہوگئے تھے۔ اس نے کہا۔

''تمہارا بہت شکریہ راجا ناصر! میں تمہاری ایک ایک بات کو سچ سمجھتی ہوں لیکن کیا کروں تمہارے ذہن میں یہ احساس نہیں جاگا کہ وہ شخصیت کتنی ہی بڑی ہو تمہارے فرائض کی راہ میں حائل ہو رہی ہے۔ انسان اپنے ضمیر کے ہاتھوں تو مجبور ہوتا ہے۔ تم نے اس شخصیت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔''

''بس بعض اوقات ذمے داریاں انسان کو انسانیت سے بہت دور لے جاتی ہیں اور میں تمہیں بتاؤں کہ میں نے ایسے بہت سے سورماؤں کو سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتے ہوئے دیکھا ہے جنہوں نے ضمیر کی بات مانی تھی۔ لیکن نہ تو وہ اپنے ضمیر کو خوش کر سکے اور نہ ہی اپنے حالات بہتر بنا سکے اور در بہ در ہوگئے۔ رابعہ تم میری ایک بات مانو گی۔''

''ہاں بولو۔''

''اس جھگڑے میں مت پڑو۔''

''نہیں راجا ناصر تم جانتے ہو۔ میں بھی ایک عورت ہوں اور میری بہنیں کسی ایسے انسان کے ہتھے چڑھ رہی ہیں تو کیا میں انہیں چھوڑ دوں گی تم اپنے آپ کو ایک باپ اور بھائی کی حیثیت سے دیکھو اور اس کے بعد اپنے ضمیر سے سوال کرو۔''

''آہ...... کاش۔''

''کاش نہیں...... کاش انسان کو حقیقت سے بہت دور لے جاتا ہے۔ یہ بتاؤ تم میری تھوڑی سی مدد کر سکتے ہو۔''

''بولو کیا۔''

''مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ ہدایت کہاں سے ملتی ہیں؟''

''نہیں رابعہ ایسا کوئی سوال مجھ سے نہ کرو۔''

''وہ فون نمبر ہی بتا دو جس پر تم اس شخصیت کو اطلاع دیتے ہو۔''

''ایک ہی سوال ہے۔''

''مجھے اس لڑکی کے والدین کا پتا بتا سکتے ہو جسے تم نے پہلی مرتبہ پناہ دی تھی۔''

''ہاں یہ کام میں کر سکتا ہوں۔''

''کب کرو گے؟''

''ذرا فائل دیکھ کر میں تمہیں بتاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔''

''افسوس تمہیں میری شخصیت سے مایوسی ہوئی ہوگی۔''

''ہاں۔ واقعی میں سوچتی تھی کہ شاید ایک اچھے انسان کی حیثیت سے تم میری مدد پر آمادہ ہو جاؤ۔'' رابعہ نے جواب دیا اور راجا ناصر مسکرانے لگا، پھر بولا۔

''تمہارے ایڈیٹر صاحب زخمی کر دیے گئے ہیں انہیں بھی تو اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ معلومات حاصل ہوں گی۔''

''بہر حال اب جو کچھ بھی ہے دیکھوں گی کہ کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد رابعہ سلطان اور راجا ناصر ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے تھے۔ ایک طویل وقت گزر چکا تھا۔ رابعہ سلطان کو اس فیلڈ میں کام کرتے ہوئے، لیکن اس بار اسے جو دشواری ہوئی تھی اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ کچھ بھی ہو جائے، کیسے ہی نقصانات سے دوچار کیوں نہ ہونا پڑے میں اس شخصیت کو بے نقاب کر کے رہوں گی، جس نے دردانہ جیسی معصوم لڑکی کو قتل کیا ہے...... لیکن صوفی۔

نہ جانے کیوں رابعہ سلطان کا دل چاہنے لگا۔

فرقان جلیل نے صوفی کا پرجوش استقبال کیا تھا۔

''یہ نہ سمجھیے صوفی صاحب کہ میں نے کھلے منہ آپ کو یہاں آنے کے لیے بلایا۔ اصل میں، میری خواہش تھی کہ......

''بات ختم ہو جاتی ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ آپ کی خواہش تھی، ہم آ گئے۔'' صوفی نے کہا اور جیب سے پان کی ڈبیا اور چھالی تمباکو کا بٹوہ نکال کر میز پر رکھا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ فرقان جلیل نے یہ دونوں چیزیں دیکھیں اور ہنس پڑا۔

''کمال ہے صوفی صاحب، پان تو بہت سے لوگ کھاتے ہیں، لیکن یہ نقشین ڈبیا اور کپڑے کا یہ بٹوہ۔ اس میں پڑی ہوئی یہ ڈوری جسے کھینچ کر اس کے الگ الگ خانے کھولے اور بند کیے جاتے ہیں۔ یہ سب اس دور میں کہاں نظر آتے ہیں۔''

''بات کچھ اور ہے عزیزی۔ درویشوں کے کرم سے۔ لوازمہ انسانی زندگی میں ایک مقام رکھتا ہے، لیکن بدنصیبی سے لغت کے صفحات میں اس لفظ کی اہمیت کو بہت کم کر دیا ہے جبکہ یہ زندگی کے ہر عمل سے تعلق رکھتا ہے، جیسے سالن میں نمک، گرم مسالا جس سے سالن مکمل ہوتا ہے یعنی لوازمات، پان کی ایک تاریخ ہے، درویشوں کی دعاؤں سے۔ شرفا کی روایت، یہ چیزیں اس کا لوازمہ ہیں۔ گلوری کی آبرو۔''

''خدا کی قسم! آپ کی شکل میں ماضی کے چراغ روشن نظر آتے ہیں۔ صوفی صاحب! ایک بات کہوں برا تو نہیں مانیں گے۔''

''ارشاد۔'' صوفی نے کہا۔

''کپڑے کے بنے ہوئے اس بٹوے کا رنگ کیا تھا، یعنی جب یہ نوخیز تھا۔'' فرقان جلیل نے مزاح انداز میں کہا۔

''اوپر سے قرمزی اور نچلا حصہ بنفشی تھا اور یہ پھندنے ہلکے پیلے رنگ کے تھے۔ بڑے سجتے تھے اپنی عمر کے ساتھ۔''

''صوفی صاحب اب آپ اس کے رنگ کو کون سا رنگ کہیں گے۔'' فرقان جلیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دنیا ہی بدرنگی ہوگئی ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے آہستہ سے کہا۔

''ارے ارے کیا کہہ رہے ہیں آپ صوفی صاحب۔ درویشوں کی دعاؤں سے دنیا بدرنگی ہوگئی؟''

''جی۔'' مطلب نکلنے والی بات ہے۔ ظاہر ہے جب برائیاں اس حد تک بڑھ جائیں تو دل سے دعائیں کب نکلتی ہیں۔ وہ تو پھر بھی بزرگانِ دین کی نرم دلی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دنیا کی بہتری کے لیے ہی دعائیں کرتے ہیں ورنہ سچ بات تو یہ ہے کہ اس کی گنجائش ختم ہوگئی ہے۔'' صوفی نے عالمانہ انداز میں کہا۔

''صوفی صاحب! آپ یہ بٹوہ بدل کیوں نہیں دیتے۔ میل سے چکٹ رہا ہے۔''

''فرقان جلیل صاحب۔ آپ اسے ہماری مستقل مزاجی کہہ سکتے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ یہ بٹوا بڑے اہتمام سے ہمیں ایک ایسی بزرگ خاتون نے بنا کر دیا تھا جو اس دور میں بھی اس کی بناوٹ کے بارے میں جاننے والی تنہا خاتون تھیں، ورنہ اس دور کی خواتین بے چاری دنیا کی ہر چیز بازار سے خریدتی ہیں اور بازار والوں نے بھی ان کی دکھتی رگ پکڑ لی ہے۔ ان بزرگ خاتون نے یہ بٹوہ ہمیں پیش کیا تھا اور کچھ عرصے کے بعد اس جہان سے رحلت فرما گئیں تھیں۔ بس ان کی یادگار ہے اور یادگاریں تبدیل نہیں کی جاسکتیں۔'' فرقان جلیل ہنسنے لگا، پھر بولا۔

''بہرحال اس میں بھی آپ کی حسین فطرت کا پہلو جھلکتا ہے۔ خیر چھوڑیئے صوفی صاحب۔ میں نے جو گستاخی کی ہے آپ کو یہاں طلب کرنے کی، اس کا پس منظر آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔''

''جی۔''

''صوفی صاحب رابعہ سلطان کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی جی۔'' نفیس خاتون ہیں۔ بلاشبہ صاحب عزم و ہمت، جس کام کا بیڑا اٹھالیں اسے انجام دینے کی بھرپور کوشش کرتی ہیں۔''

''ایک ایسے خاندان سے تعلق ہے جہاں بہت زیادہ سختیاں تھیں۔ تعلیمی مراحل بڑی مشکل سے طے کیے اور اس کے بعد صحافت کی لائن میں [illegible] آنے کے لیے نہ جانے کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑے، لیکن وہی ہوتا ہے نہ [illegible] مشکلات سے گزر کر اور [illegible] ہی سونا کندن بنتا ہے لیکن اس کندن کے لیے راستے بڑے کٹھن ہوگئے [illegible] کیونکہ اس کے پاس [illegible] ہیں جو ہر طرح کی آسانیاں فراہم کر دیتے ہیں مثلاً صحافت کی زندگی میں وہ صحافی بڑے کامیاب [illegible] ن کا کوئی بیک گراؤنڈ ہوتا ہے۔ انہیں بڑے بڑے لوگوں کی مدد حاصل ہوتی [illegible] سب کچھ کر لیتے ہیں لیکن وہ جن کے پاس یہ وسائل نہیں ہوتے کیسی [illegible] مشکلوں [illegible] صوفی صاحب آپ کو اس کے بارے میں ضرور علم ہوگا۔''

''[illegible] درویشوں کی دعاؤں سے تھوڑی سی معلومات ہیں۔''

''صوفی صاحب، رابعہ سلطان بڑی امید اور آرزو لے کر آپ کے پاس پہنچی تھی لیکن اس کا خیال ہے کہ آپ اس مسئلے میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے۔''

''کک...... کس مسئلے میں؟'' صوفی نے ہکلائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''وہی لڑکی دردانہ جسے ہلاک کر دیا گیا تھا۔'' صوفی نے گردن جھکالی۔ کچھ دیر اپنی چگی داڑھی کھجاتا رہا۔ اس کے بعد گردن اٹھا کر بولا۔

''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ وہ ایک مظلوم لڑکی تھی جیسا کہ محترمہ رابعہ سلطان نے ہمیں اس کے بارے میں تفصیل بتائی۔ درویشوں کی دعاؤں سے کسی مظلوم کی دادرسی نہ کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے، لیکن بعض اوقات کچھ اس طرح کی رکاوٹیں درمیان میں آجاتی ہیں کہ ان سے نمٹنا مشکل ہوجائے۔ بہرحال درویش رہنمائی کریں گے۔ آپ انہیں سمجھا دیجیے گا۔''

''نہیں صوفی صاحب۔ وہ لڑکی بہت اچھی ہے۔ آپ یقین کریں۔ میں اس کی بے پناہ عزت کرتا ہوں۔ اس طرح تڑپ رہی ہے اس لڑکی دردانہ کے لیے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ خاص طور سے اس کی والدہ وغیرہ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ بھی اس کے لیے بڑی تکلیف دہ بات ہے اور ویسے بھی صوفی صاحب جیسا کہ آپ نے ایک بار بتایا کہ آپ کا یہ مشن ہے اور اتنی بڑی شخصیت آپ کے ساتھ ہے یعنی کرنل رحیم شاہ جن کا ایک سنہری ماضی ہے۔ میں اس کی خواہش پر آپ سے یہ سوال کر رہا ہوں کہ کیا آپ بھی اس مسئلے کو نظرانداز کر دیں گے اور اس معصوم مرحومہ کی دادرسی نہیں کریں گے؟''

''نہیں نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ سب کچھ کیا جائے گا۔''

فرقان جلیل کو تفصیل بتانے اور اس سے گفتگو کرنے کے بعد صوفی وہاں سے چل پڑا، لیکن اس کے ذہن میں عجیب عجیب سے احساسات تھے۔ کسی بھی طرح وہ فرقان جلیل کو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ رابعہ سلطان نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ اس کے بس سے باہر ہے۔ ایک ماضی ہے اس کا۔ کچھ راز ہیں زندگی کے جو ہر ایک کو نہیں بتائے جاسکتے۔ بہرحال رابعہ سلطان کے بارے میں نہ جانے وہ کیا کیا باتیں سوچتا رہا ہوگا۔

♥......♥......♥

رابعہ کو نہ صرف جو تفصیلات معلوم ہوئی تھیں۔ انہوں نے اسے بے چین کر رکھا تھا بلکہ بڑی شدت سے وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ اسے کسی ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جو اس کی مشکلات کو سمجھ سکے۔ جہاں اس کے راستے رک جاتے ہیں وہاں ایسا کوئی ساتھی ان راستوں کو طے کرنے میں مدد کرتا ہے۔ اسے ایسی ہی مدد کی ضرورت تھی اور اس سلسلے میں صوفی اسے ایک ایسا ساتھی نظر آیا تھا جو اگر حاصل ہوجائے تو ان تمام خواہشوں کی تکمیل ہوجائے جو دل میں جنم لیتی رہتی تھیں۔ سرپھری ہی تھی ورنہ صوفی کے وجود کو تو اونٹ سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ ایک ایسے اونٹ سے اس طرح کی قربت کا تصور ہی مضحکہ خیز تھا لیکن بات وہی ہوتی ہے کہ بعض لوگوں کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا جاسکتا۔ وہ اندر سے پتا ہی نہیں چلتے کہ کیسے ہیں ان کے دل و دماغ میں کون سی کھچڑی پک رہی ہے۔ رابعہ سلطان کی بھی کیفیت کچھ ایسی ہی تھی۔ لوگ اپنے ساتھی کو اپنی پسند کو ایک دلکش رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں لیکن وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں

جو چہرے مہرے اور ظاہری حلیے سے بالکل متاثر نہیں کرتے، بلکہ اندر سے اندر تک کا سفر کیا جاتا ہے۔ اس وقت بھی رابعہ سلطان صوفی کی رہائش گاہ کی جانب جا رہی تھی۔ اس گلی میں داخل ہونا ہی ایک مشکل امر تھا، لیکن اس سے زیادہ مشکل صوفی کی شخصیت تھی۔ وہ فرقان جلیل کے پاس گئی تھی۔ بس ایک عجیب سی بے چینی اس کے سارے وجود میں گردش کر رہی تھی، حالانکہ صورت حال بھیانک دور میں داخل ہوگئی تھی۔ اخبار کے دفتر پر حملہ ایڈیٹر صاحب کی پٹائی۔ یہ چیزیں اس بات کا اظہار کر رہی تھیں کہ صورت حال سنگین ہے۔ اسے اتنا آسان نہیں سمجھنا چاہیے۔ بہرطور یہ سب کچھ اپنی جگہ تھا۔ صوفی کی شخصیت سے دلچسپی اپنی جگہ۔ یہ پاگل لڑکی صوفی کے بارے میں بالکل ہی مختلف انداز سے سوچنے لگی تھی۔ گلی کے لوگوں نے اسے دلچسپی کی نگاہوں سے دیکھا، لیکن ان نگاہوں میں اس کے لیے کوئی برائی نہیں تھی۔ ممن خان کے ہوٹل پر بے فکرے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ''ارے وہ بی بی ہیں جو پہلے بھی صوفی صاحب کے گھر آ چکی ہیں۔''

''صوفی تو شاید اندر نہیں ہیں۔''

''ہاں! کچھ کہہ کر گئے ہیں۔''

''بھلا وہ کبھی کسی سے کچھ کہہ کر جاتے ہیں۔ اپنی پھٹپھٹیا پر نکلے ہیں۔ پوری سج دھج کے ساتھ۔ اس کا مطلب ہے کہ کسی سرکاری کام سے نہیں گئے۔'' وہ لوگ تبصرے کرتے رہے اور رابعہ سلطان صوفی کے دروازے پر پہنچ گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس پر پردہ بھی پڑا ہوا تھا۔ رابعہ سلطان نے ادھر ادھر دیکھا اور یہ دیکھ کسی قدر خجل سی ہوگئی کہ لوگوں کی نگاہیں اس کی جانب اٹھی ہوئی ہیں، لیکن کچھ ہی لمحوں میں اس نے اپنے آپ کو ان سے بے گانہ کر لیا اور دروازہ بجانے لگی۔ اسی وقت ایک پستہ قامت آدمی اس کے پاس پہنچ گیا۔

''سلام خلوص عرض کرتا ہوں۔'' اس نے لکھنوی انداز میں آدھا جھک کر ہاتھ کو پیشانی سے لگاتے ہوئے کہا۔

''صوفی صاحب سے ملنے آئی ہوں۔''

''اسی سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔''

''کیوں کیا بات ہے؟''

''فدوی کو بے زار لکھنوی کہتے ہیں۔ شاعری میں کمال حاصل کیا ہے لیکن مشاعروں کے علاوہ کہیں اپنے اشعار سناتا نہیں ہوں۔ ہاں اگر آپ حکم دیں تو دو چار پیش کر دوں۔''

''میں صوفی صاحب سے ملنے آئی ہوں۔''

''ایں جی ہاں! وہی۔ وہی تو عرض کر رہا تھا۔ صوفی صاحب تشریف نہیں رکھتے۔ میرا مطلب ہے اندر نہیں ہیں۔''

''مگر دروازہ تو کھلا ہوا ہے۔''

''شاید آپ کے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ اس گلی میں ہر گھر کے دروازے کھلے ہی ہوا کرتے ہیں۔ وہ عرض کیا ہے کہ

چاہیے دل کے دریچوں کو کھلا رہنے دو
عین ممکن ہے کہ آئے کوئی مہمان عزیز

''چنانچہ۔''

''آپ نے تو شعر سنا ہی دیا ہے۔'' رابعہ سلطان کو ایک دم ہنسی آ گئی۔

''ایں۔ سنا دیا؟'' بے زار لکھنوی صاحب چونک کر بولے۔

''کہاں گئے ہیں صوفی صاحب آپ بتا سکتے ہیں۔''

''اللہ جانے اور وہ جانیں، لیکن آپ چاہیں تو انتظار کر سکتی ہیں۔ آ سکتے ہیں کسی بھی لمحے میں۔ اپنی زوجہ محترمہ کے ساتھ گئے ہیں۔'' بے زار لکھنوی نے کہا اور رابعہ سلطان بری طرح چونک پڑی۔ اس کے دل کو دھچکا سا لگا تھا۔ اس نے بے زار لکھنوی صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''زوجہ محترمہ کیا چیز ہوتی ہیں؟''

''اہلیہ...... اہلیہ یعنی بیگم، بیوی، وائف۔'' بے زار لکھنوی نے زوجہ کے بہت سے ترجمے کر ڈالے۔

''مگر وہ تو غیر شادی شدہ ہیں۔''

''محترمہ آپ ایک شاعر سے گفتگو فرما رہی ہیں۔ شادی اور شدہ ان دو الفاظ کی تشریح میں کتابوں کی کتابیں شائع کی جا سکتی ہیں۔ شادی شادمانی کا نام ہے اور شدہ اہل کو کہتے ہیں، یعنی صوفی صاحب مختلف مزاج کے انسان ہیں۔ ویسے یہ شعر ان پر صادق آتا ہے۔

کہ جو اہل ہوتے ہیں انہیں ملتی ہے اہلیہ
ہر شخص کے نصیب میں منے کی ماں کہاں

''تو مطلب یہ ہے کہ صوفی صاحب کی اپنی پسند اپنا انتخاب ہے۔ انہوں نے اپنی اہلیت کا ثبوت کسی خاتون کی شکل میں نہیں دیا بلکہ ایک موٹر سائیکل ہے۔ جو عرصہ دراز سے ان کی آغوش میں ہلکورے لے رہی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ صوفی صاحب کو نوادرات سے دلچسپی ہے اور وہ موٹر سائیکل بھی نوادرات میں سے ایک ہے۔ ناز و نعم سے چلتی ہے۔ عمر کی بہت سی منازل طے کر چکی ہے اس لیے نخرے زیادہ کرتی ہے، مگر بات وہی ہے نا کہ نخرے اٹھانے والا بھی تو چاہیے۔ صوفی صاحب اس کا ہر نخرہ برداشت کرتے ہیں۔ جب بھی موج میں ہوتے ہیں اسے لے کر سیر کرنے نکل جاتے ہیں۔'' رابعہ سلطان جو کچھ لمحوں کے لیے بدحواس سی ہوگئی تھی۔ اس تشریح سے شاید مطمئن ہوگئی اور پھر بے زار لکھنوی صاحب کی باتوں میں دلچسپی لینے لگی۔

''تو زوجہ آپ نے اس موٹر سائیکل کو کہا ہے۔''

''جی ہاں۔ بس چند ہی چیزوں سے تو رشتہ ہے صوفی صاحب کا۔ مثلاً پانوں کی ڈبیا، چھالیا اور تمباکو کا بٹوا یا پھر وہ قدیم شیروانی جو اوپر سے شیروانی اور اندر سے پریشانی کے مترادف ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ انہی چند چیزوں کے ساتھ وہ زندگی گزار رہے ہیں۔ جب فرصت میں ہوں اور کچھ سیر و سیاحت کرنا چاہیں تو اس وقت ان تمام چیزوں سے لیس ہو کر جاتے ہیں۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا ہے۔''

''پھر تو واپسی جلدی ممکن نہیں ہے۔''

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ابھی کچھ لمحوں کے بعد بھی واپسی ہو سکتی ہے۔ اچھا یہ بتائیے۔ آپ انتظار کریں گی ان کا۔''

"تھوڑی دیر کے لیتی ہوں، کیا حرج ہے؟"

"تو اندر تشریف رکھیے گا۔ میں آپ کے لیے چائے بھجواتا ہوں۔"

"ارے نہیں، کہاں تکلیف کریں گے۔"

"میں نہیں تکلیف کروں گا۔ ممن خاں کا چائے چی تکلیف کرے گا۔"

"چائے چی......؟"

"جی ہاں۔ باورچی کھانا پکاتے ہیں، چائے چی چائے بناتا ہے۔ یہ خادم کی اختراع ہے۔" بے زار لکھنوی صاحب نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا اور رابعہ سلطان ہنسنے لگی۔ پھر بولی۔

"ٹھیک ہے۔ آپ براہ کرم چائے بھجوا دیجیے گا۔" بے زار لکھنوی چلے گئے اور رابعہ سلطان ہنستے ہوئے اندر آ کر ایک چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اچھا خاصا بڑا گھر تھا۔ لیکن سارے کا سارا برے حالات کا شکار۔ ہر چیز منتشر، سب کچھ تتر بتر، کپڑوں کے غیر استری شدہ ڈھیر، صحن میں بکھرے ہوئے برتن۔ بے ترتیبی ہر شے سے ٹپکتی تھی۔ بہرحال صوفی میں شاید یہی انفرادیت تھی۔ وہ بیٹھی صوفی کا انتظار کرتی رہی۔ پھر بے زار لکھنوی صاحب چائے کے برتن اٹھائے ہوئے اندر آئے۔ ان کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ چائے صاف ستھرے برتنوں میں لائی گئی تھی۔ بے زار صاحب بے زار نظر آ رہے تھے۔ کہنے لگے۔

"ایک بات پوچھ سکتے ہیں آپ سے محترمہ!"

"جی ضرور۔"

"کیا ہم نے آپ کی سمع خراشی کی ہے۔؟"

"کیا؟"

"سمع خراشی۔"

"یہ کیا ہوتا ہے؟"

"یعنی ایسی ناگوار گفتگو کی ہے جو آپ کو پسند نہ آئی ہو۔"

"نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"ممن خاں صاحب کا خیال ہے کہ ہم نے آپ کو پریشان کیا ہے۔ اب اس نامعقول شخص کو انہوں نے اسی لیے ہمارے ساتھ بھیجا ہے کہ یہ ہمیں یہاں سے پکڑ کر واپس لے جائے۔ فیصلہ آپ پر چھوڑے دیتے ہیں۔ آپ کیا حکم دیتی ہیں، ہم جائیں یا یہاں آپ کے پاس بیٹھ کر انتظار میں آپ کی مدد کریں۔"

"فالتو باتیں مت کرو۔ بے زار صاحب! ممن خاں نے جو کچھ کہا ہے۔ مجھے وہی تم سے کرانا ہے۔ چلو نکلو ادھر سے۔" بے زار صاحب کے ساتھ آنے والے نے کہا۔

"بدتمیزی تو تمہاری عادت ہے۔ چلو چلتے ہیں۔" بے زار لکھنوی نے کہا اور آنے والا شخص انہیں دھکیلتا ہوا باہر نکال لے گیا۔ رابعہ سلطان کو پھر ہنسی آ گئی تھی۔ بہرحال یہ سنہرا ماحول تھا۔ دنیاوی اقدار سے ہٹ کر بالکل اس طرح جیسے کسی سیارے کی کہانی ہو۔ انسانوں نے تو اپنے آپ پر اتنے مصنوعی خول چڑھا لیے ہیں کہ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ یہ جگہ واقعی کسی سیارے کے مترادف ہے اور دفعتہً رابعہ سلطان کے

ذہن میں خیال آیا ہے کہ کیوں نہ اس بے ترتیبی کو ترتیب میں بدل دیا جائے۔ چائے پی لینا زیادہ اچھا ہے۔ اس نے چائے پی اور اس کے بعد دیوانگی کا شکار ہو گئی۔ یعنی گھر کی صفائی، ستھرائی پر تل گئی اور دو گھنٹے کی شدید محنت کے بعد اس نے گھر کو چمکا کر رکھ دیا اور اس کی محنت بارآور ہو گئی۔ باہر سے اس طرح کی آواز آئی تھی جیسے کوئی ہیلی کاپٹر گلی میں اتر رہا ہو اور کچھ لمحوں کے بعد یہ ہیلی کاپٹر اندر داخل ہو گیا، لیکن وہ ہیلی کاپٹر نہیں بلکہ موٹر سائیکل تھی اور اس موٹر سائیکل پر صوفی صاحب سوار تھے۔ اپنی مخصوص سج دھج کے ساتھ شیروانی، کھلے پائنچے کا پاجامہ اور اس پر جوگر کیا نظر آ رہے تھے۔ اس کی تشریح الفاظ میں ممکن نہیں ہے۔ گھر کو دیکھا اور پھر ہونق ہو کر رہ گئے۔ رابعہ سلطان پر نگاہ پڑی تو بولے۔

"مم...... معافی چاہتے ہیں۔ در در...... درویشوں کے کرم سے، غلط جگہ گھس آئے۔ مم مم...... مگر گھر تو ہمارا ہی جیسا ہے۔" رابعہ سلطان پھر ہنس پڑی اور بہ مشکل تمام اس نے صوفی کے ہونق چہرے کو دیکھ کر کہا۔

"آپ ہی کا گھر ہے جناب۔"

"ہیں!...... صوفی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔

"ہاں۔ گھر تو ہمارا ہی ہے۔ سامنے ممن خاں کا ہوٹل بھی ہے، لیکن یہ حلیہ ہمارے گھر کا نہیں ہے۔"

"حلیہ ٹھیک کیا گیا ہے۔ میں بہت دیر سے یہاں آئی ہوئی ہوں۔"

"اوہ! تو آپ نے یہ بھی کر ڈالا۔"

"ہاں...... اور اکثر کرتی رہوں گی۔ آپ کا دل چاہے جتنا اس گھر کو بگاڑیے۔ میں یہاں آؤں گی اور یہ سب کچھ کر دیا کروں گی۔" نا جانے کیوں رابعہ سلطان کو غصہ سا آ گیا۔ صوفی عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

"محترمہ! رابعہ سلطان صاحبہ، زندگی اگر بے ترتیب ہو تو کسی شے کی ترتیب اچھی نہیں لگتی۔ اس ترتیب نے انسان سے نہ جانے کیا چھین لیا ہے۔ بے ترتیبی اس رنگ کو کم کرتی ہے۔ سمجھ رہی ہیں آپ۔ بے ترتیبی اگر زندگی کا حصہ بن جائے تو پھر ترتیب اچھی نہیں لگتی۔ بہرحال میری فرقان جلیل صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ پتا یہ چلا کہ آپ کچھ برگشتہ ہیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔" رابعہ سلطان اس جملے پر ہنس پڑی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"پتا نہیں۔ درویشوں نے کیا عمل کیا ہے کہ آپ ذہن پر ایسے مسلط ہو گئے ہیں۔ کاش وہ عمل مجھے بھی معلوم ہو جائے۔ خیر چھوڑیے ان باتوں کو۔ آپ یہ بتائیے کہ دردانہ کے سلسلے میں آپ کیا کر رہے ہیں؟ ایک نوجوان لڑکا زندگی اور موت کی کش مکش کا شکار ہے۔ صاحب ثروت اور دولت مند لوگ اپنے اختیارات سے کام لے کر ایک زندگی چھیننے کے بعد دو زندگیاں اور چھین رہے ہیں۔ صوفی صاحب کیا ہم بے بسی سے بیٹھ کر یہ انتظار کرتے رہیں گے کہ کب وہ لڑکا پھانسی پر چڑھ جاتا ہے۔

"بہ خدا ایسا نہیں ہوگا درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے کہا۔

"لیکن آپ تو اس سلسلے میں توجہ ہی نہیں دے رہے۔"

"بہت جلد ہم ایک چلہ کاٹیں گے۔ اس بارے میں مؤکل ہماری رہنمائی کریں گے اور اس وقت

ہم آپ کو تفصیل بتائیں گے۔''

''یہ صرف ایک مذاق ہے جو آپ مجھ سے کر رہے ہیں۔'' رابعہ سلطان نے کہا۔

''مذاق تو ہم نے زندگی میں کبھی اپنے آپ سے بھی نہیں کیا۔''

''چلہ کشی سے کہیں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔''

''بزرگوں سے لو لگا کر دیکھیے۔ آپ کی اس سے اچھی رہنمائی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔''

''صوفی صاحب میں جا رہی ہوں۔ میرا خیال ہے یہاں پر میں نے غلطی نہیں کی جیسا کہ میں نے آپ سے کہہ دیا ہے۔ یہ میں کرتی رہوں گی۔ آپ چاہے کتنے ناراض کیوں نہ ہوں۔ اگر آپ سنجیدہ ہو جائیں تو براہ کرم یہ ضرور سوچ لیں کہ آپ نے میری دل آزاری کی ہے۔''

''پھر صوفی ارے، ارے، ارے ہی کرتا رہ گیا اور رابعہ سلطان غصے سے دندناتی ہوئی باہر نکل گئی۔

♥......♥......♥

''یہ سب کچھ اپنی جگہ تھا، لیکن رابعہ کسی بھی قیمت پر اس مسئلے کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہ مظلوم چہرہ ہمیشہ گھومتا رہتا تھا جو پولیس اسٹیشن میں بیٹھ کر زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا اور پھر زندگی اس سے چھن گئی تھی۔ راجا ناصر نے اسے کسی اور لڑکی کے بارے میں بھی بتایا تھا، جو اسی طرح کے سنگین حادثے کا شکار ہوئی تھی۔ اس کا پتا بھی راجا ناصر نے آخر بتا دیا تھا، چنانچہ اب رابعہ سلطان نے اسی جانب رُخ کیا تھا۔ یہ بھی ایک پس ماندہ بستی ہی تھی۔ رابعہ نے اس علاقے سے ذرا فاصلے پر رُک کر قرب و جوار سے معلومات حاصل کیں اور پھر اس مکان کی جانب چل پڑی جو کسی ریاض علی نامی شخص کا تھا۔ یہ نام بھی راجا ناصر ہی نے بتایا تھا۔ چھوٹے چھوٹے مکانات کا سلسلہ تا حد نظر چلا گیا تھا۔ مطلوبہ نمبر کے مکان کے بارے میں بھی رابعہ کو جلدی ہی معلوم ہو گیا۔ جس شخص نے اسے اس مکان کے بارے میں بتایا تھا وہ ایک عمر رسیدہ آدمی تھا۔

''کس سے ملنا ہے تمہیں بیٹی۔''

''ریاض علی صاحب۔''

''کسی دوسرے شہر سے آئی ہو کیا؟''

''جی، جی ہاں۔''

''کیا تم ان لوگوں کی رشتے دار ہو؟''

''جی ہاں'' لیکن بہت عرصے کے بعد یہاں آئی ہوں۔ آپ یہ سوالات کیوں کر رہے ہیں۔''

رابعہ ان سوالات میں کچھ الجھ سی گئی تھی۔

''بیٹی۔ ریاض علی کو تو مرے ہوئے بھی دو مہینے ہو گئے۔ بے چارہ غربت میں ہی مر گیا تھا۔ دمے کے مریض کی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے۔ بڑے غیرت مند لوگ ہیں، لیکن بے چارہ ریاض علی بھی کیا کرتا۔ بیماری ہی پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔ مجبوراً بیٹی کو نوکری کے لیے گھر سے نکلنا پڑا، مگر اللہ کی مرضی میں کون دخل دے سکتا ہے۔''

''کیوں، کیا ہوا......؟'' رابعہ نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''قتل کر دیا تھا بیٹا۔ قتل ہو گئی تھی، بے چاری صائمہ اور اسی کا صدمہ ریاض علی کو بھی لے گیا۔ اب بڑی بی کی جان رہ گئی ہے۔ ابھی تو عدت کے دن گزار رہی ہیں۔ اس کے بعد جب تک جیئیں گی لوگوں کے برتن بھانڈے صاف کر کے ہی پیٹ بھریں گی ورنہ ان بے چاروں کے پاس کیا رکھا ہے۔'' رابعہ ایک بار پھر بدحواس سی ہو گئی۔ کیا زندگی اسی کا نام ہے؟ خوشیاں تو تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وہ اس مکان کے دروازے کو بجانے لگی اور کچھ دیر کے بعد دروازہ کھل گیا۔ اسے اندر آنے کی اجازت دے دی گئی۔ چھوٹے سے صحن کے بعد ایک برآمدہ تھا جس میں بچھے ہوئے تخت پر ایک بزرگ خاتون نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بہت لاغر تھیں، چہرے پر غم جیسے منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک اور بھاری سی بدن کی خاتون قریب موجود تھیں۔ دونوں کچھ عجیب سے انداز میں رابعہ کو دیکھ رہی تھیں۔ غم زدہ خاتون نے لرزتے ہوئے نرم لہجہ میں کہا۔

''بیٹی، کہاں سے آئی ہو، کس سے کام ہے، میں نے تو پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔''

''صائمہ کی والدہ آپ ہی ہیں۔'' رابعہ نے سوال کیا۔

''ہاں بیٹی۔ پتا نہیں کسے بدنصیب کہوں! اسے یا اپنے آپ کو۔ میں ہی بدنصیب اس بدنصیب کی ماں ہوں، آؤ بیٹھو۔''

''میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔'' رابعہ قریب ہی تخت پر بیٹھ گئی۔

''ہاں بولو کیا بات ہے؟''

''اصل میں میرا تعلق ایک رفاہی ادارے سے ہے۔ آپ کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہتی ہوں۔''

''کہو بیٹی......؟'' صائمہ کی والدہ نے کہا۔

''میں تھوڑی سی تنہائی چاہتی ہوں۔ اگر یہ خاتون برا نہ مانیں۔''

''بیٹی سمجھ لے میں تنہا ہوں۔ یہی لوگ تو میرے ہم درد اور غم گسار ہیں۔ انہی کے سہارے زندگی گزرے گی۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے انہی کے سامنے ہی کہہ دو۔''

''نہیں، کوئی بات نہیں ہے۔ میں چلتی ہوں۔ کوئی بات نہیں بیٹی۔ تم تنہائی میں ہی بات کر لو۔ ویسے بھی اب مجھے گھر جانا تھا۔ سارا کام ایسے ہی پڑا ہوا ہے۔ دوسری خاتون نے اٹھتے ہوئے کہا۔ صائمہ کی والدہ کا منہ کھلا اور بند ہو گیا۔ بہرحال ان کے جانے کے بعد رابعہ سلطان نے کہا۔

''آپ کے شوہر کے انتقال کی خبر سن کر بہت افسوس ہوا ہے۔ میں پہلا سوال آپ سے یہ کرنا چاہتی ہوں کہ آپ کی گزر اوقات کا ذریعہ کیا ہو گا؟''

''یہ میں کیا جانوں۔ جو خدا نے مقدر میں لکھ دیا ہو گا؟''

''پھر بھی، آپ نے کچھ تو سوچا ہو گا۔'' عمر رسیدہ خاتون کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور پھر انہوں نے کہا۔

''مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ اگر ہے تو صرف اپنے خدا سے کہ اس نے کیوں مجھے زمین پر بوجھ بن کر رہنے دیا ہے۔ موت تو مجھے بھی آ سکتی تھی۔ یہ کیسا امتحان ہے میرا کہ بیٹی اور شوہر کی جدائی زندہ رہ کر برداشت کروں۔ کبھی کبھی تو خدا سے بھی بغاوت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ سوچتی ہوں گناہ اور ثواب کو بھول

کر خودکشی کرلوں، لیکن خودکشی حرام ہے۔ ایک آس تو ہے کہ موت کے بعد اپنوں کے چہرے دیکھ سکوں گی۔ برائی کر کے مروں گی تو وہ آس بھی جائے گی۔'' ایک ایسا کرب، ایک ایسا غم ان الفاظ میں تھا کہ رابعہ سلطان کی آنکھوں میں بھی آنسو چھلک آئے۔ وہ خود پر قابو پانا مشکل محسوس کر رہی تھی۔ دلاسا ایسے انسان کو دیا جاتا ہے جو بلک رہا ہو۔ اسے کس طرح دلاسا دیا جائے جو خود اپنے غم کا مذاق بن چکا ہو۔ وہ سکتے کے سے عالم میں بیٹھی صائمہ کی والدہ کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا اور مدھم لہجے میں بولی۔

''آپ نے کچھ تعلیم حاصل کی ہے۔''

''ہاں، میٹرک تک پڑھا تھا۔''

''صائمہ کی موت کا راز آپ کو معلوم نہیں ہوا۔''

''بڑا عجیب سوال ہے بیٹی۔ کہیں صائمہ جیسی لاوارث لڑکیوں کی موت کا راز بھی معلوم ہوتا ہے۔''

''آپ کے دل میں اس کے انتقام کا جذبہ بھی نہیں ابھرا۔'' صائمہ کی والدہ پھیکے سے انداز میں ہنسیں، پھر بولیں۔

''انتقام کا فیشن بھی تو بڑے لوگوں کا ہوتا ہے۔ ہم جیسے لوگ تو کسی جاگیردار کی شکارگاہ کے ہرنوں کی مانند ہوتے ہیں جو اپنی دانست میں آزادی سے چوکڑیاں بھرتے ہیں، لیکن کسی بھی وقت انہیں شکار کرلیا جاتا ہے۔ کیا شکاری سے انتقام لیا جاسکتا ہے؟''

''رابعہ سلطان کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ خاتون کے الفاظ تھے کہ زہر میں بجھی ہوئی چھریاں، جو پورے بدن میں اتر رہی تھیں۔ بہ مشکل تمام رابعہ نے خود کو سنبھال کر کہا۔

''ماں جی، کیا آپ میری مدد کرسکتی ہیں؟''

''مدد۔ میں؟'' خاتون نے نگاہیں اٹھا کر رابعہ کو دیکھا۔

''ہاں۔''

''بولو کیا چاہتی ہو؟''

''مجھے صائمہ کے بارے میں کچھ معلومات درکار ہیں؟''

''کیا کرو گی ان معلومات کا؟''

''بس یوں سمجھ لیں کہ اسی پر میری نوکری کا دارومدار ہے۔'' رابعہ نے عاجزی سے کہا۔

''نوکری۔ تو تم بھی نوکری کرتی ہو۔''

''ہاں ماں جی۔''

''چھوڑ دو نوکری بیٹا، نوکری چھوڑ دو۔ باہر کی دنیا ابھی ہماری بیٹیوں کے لیے سازگار نہیں ہے کوئی تمہیں بیرون ملک نوکری دلانے کا جھانسا دے گا۔ کوئی کچھ کہے گا، کوئی کچھ کہے گا۔ تمہیں خدا کا واسطہ نوکری چھوڑ دو۔ جو روکھی سوکھی میسر آئے، اپنے گھر میں بیٹھ کے کھالینا۔ گھروں کا کام کرلینا، بچوں کو پڑھا لینا۔ نوکری مت کرنا۔ وعدہ کرو اب تم نوکری نہیں کرو گی۔ بولو، اب تم گھر سے نہیں نکلو گی۔'' بزرگ خاتون پر ایک ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی۔ رابعہ کے سارے اعصاب کشیدہ ہوئے جا رہے تھے۔ صائمہ کی والدہ کے

انداز نے اس سے بہت کچھ چھین لیا تھا اور بہ مشکل تمام بولی۔

''میں، نوکری نہیں کروں گی ماں جی، لیکن صائمہ کا انتقام ضرور لوں گی۔ آپ کو صائمہ ہی کا واسطہ، میری مدد کیجیے۔''

''خدا انتقام لے گا بیٹی، خدا انتقام لے گا۔ جب ہم اس کو مانتے ہیں تو وہ ہماری کیوں نہ سنے گا۔ تم کسی کی عزت ہو، جس گھر کی عزت ہو، اس کی آبرو بن کر رہو۔ مظلوم صائمہ کا انتقام خدا لے گا۔''

''مجھے صرف تھوڑی سی چھوٹی چھوٹی باتیں بتادیں۔ تھوڑی سی۔''

''بولو...... کیا چاہتی ہو؟''

''میں صائمہ کے کاغذات کی تلاشی لینا چاہتی ہوں۔ مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کیا اور کہاں کام کرتی تھی۔ بس اتنا سا پتا چل جائے تو میری مشکل حل ہوجائے گی۔''

''ٹھیک ہے، آؤ میں تمہیں اس کی الماری دکھا دوں رابعہ سلطان الماری کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ کچھ کپڑے وغیرہ تھے اور کچھ کاغذات بھی تھے اور رابعہ بڑے غور سے ان کاغذات کا جائزہ لیتی رہی اور پھر اسے ان کاغذات میں ایک پھٹا ہوا وزیٹنگ کارڈ مل گیا جس پر سی۔ بی لمیٹڈ لکھا ہوا تھا۔ سی۔ بی۔ لمیٹڈ۔ وہ عورت اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکی تھی۔ بس یہ پتا چلا تھا کہ صائمہ حالات سے مجبور ہو کر نوکری کرنے نکل پڑی تھی۔ یہ نوکری وہ کہاں کر رہی تھی، یہ پتا نہیں چل سکا تھا، لیکن سی۔ بی۔ لمیٹڈ ایک اشارہ تھا اور رابعہ سلطان نے پھٹا ہوا کارڈ اپنے لباس میں رکھ لیا تھا، پھر اس کے بعد وہ دو دن تک سی۔ بی۔ لمیٹڈ کی تلاش میں نہ جانے کہاں سے کہاں بھٹکتی پھر رہی تھی۔ اخبار کے ایڈیٹر صاحب نے بھی اور کچھ صحافیوں نے جن میں اعجاز خان سب سے زیادہ سمجھ دار اور تیز آدمی تھا۔ اس کی مدد کی تھی، لیکن ابھی تک سی۔ بی۔ لمیٹڈ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوسکا تھا، البتہ رابعہ سلطان نے آگے بڑھ کر کام کرنے کے لیے اپنی ایک خاص مہارت سے کام لیا تھا اور یہ مہارت میک اپ کی تھی۔ اس نے اپنے چہرے پر بہت خوب صورت میک اپ کیا تھا اور واقعی اس کی ایک باکمال شخصیت تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ ممکن ہے اس سلسلے میں جو ہنگامہ وہ کر رہی ہے کچھ لوگوں کو اس کے بارے میں اطلاع ہوچکی ہو اور اس کی نگرانی کی جائے۔ کسی بھی چیز کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ خدشہ راجا ناصر نے بھی ظاہر کیا تھا۔ بہر حال وہ اب بھی سی۔ بی۔ لمیٹڈ کی تلاش میں مصروف عمل تھی، لیکن ابھی تک کچھ پتا نہیں چل سکا تھا، البتہ اسی میک اپ میں اسے ایک دلچسپ واقعے دوچار ہونا پڑا۔ وہ ایک مضافاتی سڑک سے گزر رہی تھی کہ اس نے ایک شخص کو دیکھا۔ جس سڑک پر وہ جا رہی تھی وہ شہر سے نکل کر پہاڑی راستے سے گزرتے ہوئے کافی دور تک چلی جاتی تھی۔ حد نگاہ سرسبز و شاداب کھیت پھیلے ہوئے تھے اور اس سڑک پر سفر کرتے ہوئے بڑی فرحت کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ آخر کار اس جگہ پہنچ گئی جہاں کے لیے نکلی تھی۔ ایک صاف ستھری اور پتلی سڑک مین روڈ سے اتر کر نیچے کوٹھی تک چلی جاتی تھی یہ شاید کسی کا فارم ہاؤس تھا۔ سڑک کے دونوں سمت درختوں کی قطاریں تھیں۔ ذیلی سڑک پر وہ تھوڑی دور تک چلی تھی کہ سڑک کے بیچوں بیچ اسے ایک موٹر سائیکل کھڑی نظر آئی۔ انتہائی پرانے ماڈل کی موٹر سائیکل سڑک کے درمیان اس طرح کھڑی کی گئی تھی کہ باقی گاڑیوں کا وہاں سے نکلنا مشکل تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور ادھر

ادھر نگاہیں دوڑانے لگی۔ دفعتاً اسے دور ایک درخت کے عقب میں ہلکی سی تحریک کا احساس ہوا۔ کوئی چیز حرکت کرتی نظر آئی۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک جوتا تھا جو پاؤں میں پھنسا ہوا تھا اور وہ پاؤں دوسری ٹانگ کے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا۔ وہ موٹر سائیکل کے قریب پہنچ گئی، لیکن اس شخص کو کوئی احساس نہیں ہوا۔ درخت کے عقب میں ہلنے والا پاؤں بہ دستور ہلتا رہا۔ جب کئی بار پاؤں پٹخنے کے باوجود اس کی پوزیشن میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تو اسے اس شخص پر غصہ آنے لگا اور اس نے زور سے چیخ کر کہا۔

''کون ہیں آپ اور یہ کیا بدتمیزی ہے، لیکن جواب اب بھی نہیں ملا تھا۔'' رابعہ سلطان کو مزید غصہ آیا تو بولی۔

''اگر تم مر چکے ہو تو تمہاری یہ ٹانگ کیسے ہل رہی ہے۔؟''

''میرے منہ پر سے یہ کپڑا ہٹاؤ تو بتاؤں درویشوں کی دعاؤں سے۔'' آواز آئی تو رابعہ اچھل پڑی۔ موٹر سائیکل اسے جانی پہچانی تو لگی تھی لیکن ضروری تو نہیں ہے کہ اس طرح کی ہر موٹر سائیکل صوفی کی ہی ہو، لیکن آواز صوفی کی ہی تھی اور خاص طور سے درویشوں کی دعاؤں سے۔ اس وقت صوفی کا حلیہ بھی ذرا کچھ مختلف تھا۔ گرے کلر کی ٹخنوں سے اونچی پتلون براؤن اور سیاہ رنگ کی چست قمیص جس کا گریبان کھلا ہوا تھا، باقی چہرہ تبدیل کیسے کیا جا سکتا تھا سوائے اس کے کہ اس وقت منہ میں پان نہیں تھا اور رابعہ سلطان چونکہ میک اپ میں تھی اس لیے صوفی نے ابھی اسے نہیں پہچانا تھا۔ وہ چندھیائی ہوئی نگاہوں سے رابعہ کو دیکھ رہا تھا۔ رابعہ نے بھی ایک دم اپنا انداز تبدیل کر لیا اور غصے کی سی آواز میں بولی۔

''تم زندہ ہو۔''

''فلسفے کی زبان میں بات کر رہی ہو درویشوں کے کرم سے۔''

''لڑکیوں کو دیکھ کر بہت زیادہ اسمارٹ بن رہے ہو؟''

''کسی لاغر بلی کی طرح غرانے کے بجائے انسانوں کی طرح بات کرو تو تمہیں جواب دوں گا درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی اس وقت بالکل ہی مختلف انداز میں نظر آ رہا تھا۔

''میں پوچھ رہی تھی کہ تم زندہ ہو؟''

''کون زندہ ہے؟ اس کائنات میں اگر تم زندگی کی تلاش میں نکلی ہو تو جہاں سے آئی ہو وہیں واپس چلی جاؤ۔ اس کائنات میں زندگی کا وجود باقی نہیں رہا ہے۔ انسان ختم ہو چکا ہے۔ یہ تو چلتے پھرتے سائے ہیں۔ ان میں زندگی کہاں ملے گی۔''

''فلاسفر ہو، یہ سڑک پر موٹر سائیکل کیوں کھڑی کر رکھی ہے؟''

''ہائے۔ اب تو کھڑا ہونا پڑے گا۔ درویشوں کے کرم سے۔''

''وہ کراہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا، پھر بولا۔

''میں ٹھیک تین بجے یہاں پہنچا تھا۔ سوچا تھا کہ اس کوٹھی کے مالک سے ملاقات کروں گا۔ یہ صاحب جن کا نام شہباز خان ہے، بڑی اہم حیثیت کے مالک ہیں۔''

''تم سے شہباز خان کا کیا تعلق؟'' رابعہ سلطان نے کرخت لہجے میں کہا۔ اسے یہ اندازہ تو ہو گیا

تھا کہ صوفی کے فرشتوں کو بھی یہ شبہ نہیں ہوا ہے کہ یہ رابعہ سلطان ہے۔ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہ رہی تھی۔

''یہ...... شہباز خان کیا تمہارے کوئی عزیز ہیں؟''

''نہیں...... میں ان کا عزیز ہوں۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''بہت زیادہ چہک رہے ہو۔''

''کچھ کم کیے دیتا ہوں۔''

''میں کہتی ہوں موٹر سائیکل ہٹاؤ یہاں سے۔''

''ایک بات کا جواب دو گی۔''

''ہاں بولو۔''

''تم مسلمان ہو؟''

''الحمدللہ۔''

''خدا اور رسول پر یقین رکھتی ہو؟''

''کیوں نہیں۔''

''تو پھر حلفیہ کہو کہ میری موٹر سائیکل ہٹاتے ہی تم فرار تو نہیں ہو جاؤ گی۔''

''کیا مطلب ہے؟ کیا بکواس ہے؟''

''مجھے تم سے ایک بہت ضروری کام ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ نہیں فرار ہوں گی۔'' رابعہ نے مزے لیتے ہوئے کہا۔

''خدا تمہیں دوسری بار خوش رکھے۔ اس نے کہا اور موٹر سائیکل کو اسٹینڈ سے اتارتے ہوئے سڑک کے کنارے لے گیا۔''

''اب بولو۔''

''تم کہاں جا رہی ہو؟''

''ظاہر ہے شہباز خان کی طرف۔''

''تو ٹھیک ہے۔'' دونوں ساتھ ہی چلتے ہیں۔

''آؤ......'' رابعہ سلطان نے کہا اور صوفی اس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ رابعہ سلطان نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''موٹر سائیکل میں کیا خرابی ہو گئی تھی؟''

''پیٹرولیا کی مریض ہے۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''پیٹرولیا......؟ کیا مطلب؟''

''پیٹ خالی ہو گیا ہے کم بخت کا۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ دور دراز علاقوں میں جا کر دھوکا دیتی ہے۔ بس کیا کہوں اب انسانوں کے بعد مشینوں ہی کی بے وفائی برداشت کرنا پڑے گی انسان کو؟

''پیٹرول ختم ہو گیا ہے اس کا......'' رابعہ ہنسی روکتے ہوئے بولی۔

''ہاں...... سب کے اپنے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔''

''لیکن...... آپ نے یہاں آتے ہوئے یہ خیال کیوں نہیں رکھا؟''

''میں نے خیال تو رکھا تھا لیکن پیٹرول پمپ والے ادھار نہیں دیتے۔'' وہ افسردگی سے بولا۔

''ادھار؟'' رابعہ نے حیرت سے کہا۔

''کیوں؟ اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟''

''نہیں میرا مطلب ہے کیا تمہارے پاس پیسے نہیں تھے؟'' پیٹرول بھلا ادھار کہاں سے مل سکتا ہے؟''

''پیسے...... ہر وقت تو نہیں ہوتے۔ ادھار ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے۔ عالمی پیمانے پر ادھار کا کاروبار ہو رہا ہے۔ بس...... بس کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ ادھار کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔''

''تو پھر اب کیا کرو گے؟''

''کچھ نہیں...... موٹر سائیکل دھکیلتے ہوئے وہاں تک لے جاؤں گا یا پھر وہاں پہنچنے کے بعد کچھ تھوڑا سا قرض مانگوں گا۔'' شہباز خان صاحب سے میری شناسائی ہے۔ صوفی نے جواب دیا اور رابعہ سلطان خاموش ہو گئی۔ پھر دونوں اس سامنے والی کوٹھی میں پہنچ گئے جہاں شہباز خان بیٹھا تھا۔ رابعہ سلطان تو ایڈیٹر صاحب کے ایک کام سے یہاں تک آئی تھی، لیکن صوفی یہاں کیوں آیا تھا؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بہر حال رابعہ سلطان اس بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ آخر کار وہ شہباز خان تک پہنچ گئی۔ دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا تھا۔ شہباز خان کوئی معمولی شخصیت نہیں تھی۔ وہ باقاعدہ ایک سیاست دان تھا۔ کئی بار الیکشن میں حصہ لے چکا تھا، لیکن اس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ خود الیکشن میں جیتنا نہیں چاہتا بلکہ بہت بڑے بڑے لوگوں کے اشارے پر الیکشن کے معاملات کو الجھانے کا کام کرتا ہے اور ٹانگیں اڑا اڑا کر صورت حال کو مشکل بنا دیتا ہے۔ بہر حال شہباز خان آ گیا تھا۔ رابعہ کو پہلی بار ایک عجیب سی الجھن کا احساس ہوا۔ وہ میک اپ میں تھی اور اس نے صوفی کو اپنے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اب اگر وہ ایڈیٹر صاحب کا پیغام شہباز خان کو دیتی ہے تو اپنے بارے میں کیا بتائے گی۔ ابھی وہ فیصلہ بھی نہیں کر پائی تھی کہ شہباز خان ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک استقبالیہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ رابعہ سلطان جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ صوفی بھی کھڑا ہو گیا تھا لیکن شہباز خان رابعہ سلطان کی طرف رخ کرنے کے بجائے آگے بڑھا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بغل گیر ہو گیا۔

''یار کمال ہے صوفی صاحب...... وقت تو جیسے آپ پر ٹھہر گیا ہے۔ جیسے تھے ویسے ہی نظر آتے ہیں۔''

''درویشوں کی دعائیں ہیں، حالانکہ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔'' صوفی نے کہا۔

''کیسا؟''

''یہی کہ انسان یکساں نظر آئے۔ یہ وقت تو وہ ہے کہ ہر شخص لمحہ لمحہ بدلتا رہتا ہے۔ حالات کے تحت۔''

''اتنا میں جانتا ہوں صوفی صاحب کہ حالات آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ بی بی آپ کے ساتھ ہیں؟''

''نہیں۔ راستے میں مل گئی تھیں۔ ساتھ ہی اندر داخل ہوئی ہیں۔''

''جی بی بی...... آپ کون ہیں؟ کیا کام ہے آپ کو؟''

''سر وہ تنہائی میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

''انہیں جانتی ہیں آپ؟'' شہباز خان نے صوفی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''جی۔ جی۔ جی نہیں۔''

''آپ یہ سمجھ لیجیے کہ ان کی موجودگی میرے لیے تنہائی ہی ہے۔''

''لیکن وہ...... سر مجھے کسی کا پیغام دینا ہے آپ کو۔''

''کوئی حرج نہیں ہے۔ خواتین کا احترام ہمارے لیے ایک معاشرتی ذمے داری ہے۔ میں کچھ لمحوں کے لیے باہر چلا جاتا ہوں۔ آپ ان کی بات سن لیجیے گا۔'' صوفی نے کہا۔

''ارے...... ارے...... سنیے تو سہی۔ صوفی صاحب...... سنیے۔ یہ تو بری بات ہے۔ میں انہیں اندرونی کمرے میں لے جاتا ہوں۔ وہاں سن لوں گا۔ آپ براہ کرم بیٹھیے۔'' لیکن صوفی باہر نکل گیا تھا۔ شہباز خان نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور بولا۔

''جی بی بی۔ کہیے اور رابعہ سلطان اسے ایڈیٹر صاحب کا پیغام دینے لگی۔

''ٹھیک ہے اور کوئی حکم میرے لیے۔''

''نہیں جناب۔''

''آپ انہیں اطمینان دلا دیجیے۔ میں یہ آرٹیکل انہیں بجھوا دوں گا۔ ان کی خواہش کے مطابق۔'' اس نے کہا۔ مقصد یہ تھا کہ رابعہ فوراً وہاں سے نکل جائے۔ بہر حال رابعہ کا کام اتنا ہی تھا۔ صوفی یہاں کس لیے آیا ہے۔ یہ ذرا سوچنے کی بات تھی، لیکن ظاہر ہے اسے پتا نہیں چل سکتا تھا۔ بہر حال وہ باہر نکل آئی، لیکن واپسی میں بھی اس کا ذہن سوچوں کے بھنور میں پھنسا ہوا تھا۔ صوفی کے شہباز خان سے اتنے گہرے تعلقات تھے۔ بہر حال وقت نئے نئے انکشافات کر رہا تھا۔ حیرت اسے اپنے آپ پر تھی۔ یہ شخص اس قابل تو نہیں ہے کہ اس کے لیے راتیں حرام کی جائیں۔ اسے اپنے آپ پر جھنجلاہٹ ہونے لگی، لیکن بات وہی آ جاتی ہے۔ پتا نہیں دل یا دماغ کا کون سا حصہ ہے جو اس قسم کی دیوانگی میں مبتلا کر دیتا ہے، ورنہ سچی بات یہ ہے کہ اپنی ایک سانس بھی اپنے قبضے میں نہیں ہے۔ بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو نظر انداز کر کے دوسروں کے لیے دل جلایا جائے۔ فرقان جلیل سے ابھی اس سلسلے میں کچھ شکایت سی کی تھی۔ صوفی اس معاملے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لے رہا۔ جب کہ فرقان جلیل نے کہا تھا کہ ان لوگوں کا تو مشن ہی یہ ہے۔ بہر حال اب اس کی اپنی انا بھی جاگ اٹھی تھی۔ اتنا نہیں گرنا چاہیے کسی کے سامنے کہ خود اپنے آپ سے شرمندگی ہونے لگے۔ یہ کم بخت ذہن جو ایک ایسے شخص سے متاثر ہو گیا ہے جس کی اپنی کوئی شخصیت نہیں ہے۔ رابعہ صوفی کی برائیاں تلاش کرنے لگی۔ بے تکا، غلیظ، احمقانہ باتیں کرنے والا۔ اٹھتے بیٹھتے درویش، ایسے لوگ پریکٹیکل نہیں ہوتے۔ بلاوجہ میں اپنا سر کھپا رہی ہوں۔ فرض کرو، میں اگر اسے اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہو بھی جاؤں تو دنیا میرا مذاق ہی اڑائے گی۔ مجھے اپنے آپ کو سنبھالنا چاہیے اور اس کے بعد کوئی تین دن وہ اسی میں مصروف رہی۔ اس دوران نہ تو راجا ناصر سے ملاقات ہوئی تھی اور نہ ہی کوئی اور ایسی خبر ملی تھی جس سے اس طرف نشان دہی ہو سکے۔ اس کے علاوہ سی۔ بی۔ لمیٹڈ کا بھی کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ پتا نہیں، کیا بات تھی۔ ایک دن وہ بیٹھی

اخبار کا مطالعہ کر رہی تھی کہ عوامی اشتہارات میں ایک تین سطری اشتہار پر نظر پڑی۔ ایک لیڈی ریسپشنسٹ کی ضرورت تھی۔ خوب صورت اور نوجوان ہونے کی شرط تھی، لیکن ایڈریس سی۔ بی۔ لمیٹڈ لکھا ہوا تھا اور ایک پرانے سے علاقے کی ایک عمارت کے فلیٹ نمبر 30 کا پتا دیا گیا تھا۔ رابعہ سلطان سی۔ بی۔ لمیٹڈ کا نام پڑھ کر اچھل پڑی۔ اب یہ تو نہیں کہا جاسکتا تھا کہ یہ وہی مطلوبہ سی۔ بی۔ لمیٹڈ ہے یا کوئی اور جگہ، لیکن پہلی بار ایک نشان سامنے آیا تھا، اس پر توجہ نہ دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ اس خبر کو شیئر کرنے کے لیے کوئی ایسی ہستی ہی نہیں تھی۔ نہ جانے کیوں صوفی سے ایک شکایت کا سا احساس ہوا۔ کیا وہ ان معلومات کا شریک کار نہیں بن سکتا تھا؟ ذہن کو جھٹک کر اداسی کی وہ لہر دور کی جو ذہن میں در آئی تھی اور اس کے بعد اشتہار پڑھنے لگی۔ پھر فیصلہ کیا کہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ تیاریاں کرنے لگی۔ دوسرے دن انٹرویو کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ تیار ہو کر چل پڑی۔ اپنی ذہانت سے کام لے کر اس نے ایسا حلیہ اختیار کیا تھا جو ایک درمیانے درجے کے گھرانے کی لڑکی کا تھا۔ وہ عمارت جس علاقے میں تھی وہ ایک پس ماندہ علاقہ تھا۔ سستے اشتہارات میں اس ضرورت کا اشتہار دیا گیا تھا۔ اب پتا نہیں ان تمام باتوں کا پس منظر کیا تھا، لیکن انہیں سوچ کر کم از کم سی۔ بی۔ لمیٹڈ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ صائمہ اسی کے سلسلے میں گئی تھی۔ تجربہ کرنے میں کیا حرج ہے؟ بہر حال وہ اس علاقے میں پہنچ گئی۔ جس عمارت میں سی۔ بی۔ لمیٹڈ کا دفتر قائم تھا وہ دفاتر کی عمارت ہی تھی۔ بوسیدہ حال اور کسی قدر غلیظ۔ جس دفتر میں داخل ہوئی وہ بھی بس درمیانے درجے کا ہی تھا۔ تین چار کمرے تھے۔ ایک کمرے کو ویٹنگ روم بنایا گیا تھا اور اس ویٹنگ روم میں اس وقت چار لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ سبھی نے خوب صورت نظر آنے کی کوشش کی تھی، کیونکہ یہ اشتہاری ضرورت کا ایک حصہ تھا۔ پرانے طرز کے صوفے پڑے ہوئے تھے، جو ثابت تو تھے لیکن خاصے خستہ حال۔ سامنے کمرے کا دروازہ تھا جس پر مینجر لکھا ہوا تھا۔ بائیں طرف ایک کمرا تھا جس میں تین چار میزیں پڑی ہوئی تھیں اور میزوں پر لوگ کام بھی کر رہے تھے۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ مینجر صاحب آ چکے تھے۔ پہلی لڑکی کو طلب کیا گیا۔ کوئی چھ سات منٹ کے بعد وہ باہر نکلی تو اس کا چہرہ مایوسی سے لٹکا ہوا تھا۔ بہر حال پانچواں نمبر رابعہ سلطان کا ہی تھا۔ اس دوران تین لڑکیاں اور آ چکی تھیں۔ رابعہ سلطان کمرے میں داخل ہوگئی اس دوران وہ سارے ماحول کا جائزہ لیتی رہی تھی۔ کیا اتنی معمولی سی جگہ اس واقعے سے متعلق ہوسکتی ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، لیکن جب اس کی طلبی ہوئی اور وہ اندر پہنچی تو سب سے پہلے مینجر کا چہرہ دیکھ کر ہی اس کے ذہن کو ایک جھٹکے کا احساس ہوا تھا۔ یہ شخص بے شک اچھے سوٹ میں ملبوس تھا۔ لیکن چہرے سے کوئی شریف آدمی نہیں لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی کرختگی تھی، لیکن لہجہ نرم تھا۔ رابعہ سلطان کو اس نے نگاہیں اٹھائے بغیر سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک نظر چاروں طرف دیکھا۔ مینجر کی میز پر کئی ٹیلیفون رکھے ہوئے تھے۔ بائیں سمت رنگین شیشہ لگا ہوا تھا جس کے دوسری طرف نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ صرف ایک دیوار تھی اور اس دیوار میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ دروازہ غالباً کسی اور طرف ہوگا۔ مینجر نے مخاطب ہوتے کہا۔

ہے آپ کا؟“

”نوشین ریاض۔“

”کیا تعلیم ہے؟ مس نوشین۔“

”گریجویٹ۔“

”پہلے کہیں ملازمت کی ہے؟“

”نہیں۔“

”اب کیوں کرنا چاہتی ہیں؟“

”ضرورت کے تحت۔“

”کتنی تنخواہ درکار ہوگی؟“

”آپ کی خواہش کے مطابق کیونکہ مجھے کام کرنا ہے۔“

”ٹیلی فون اٹینڈ کرنا ہوں گے آپ کو...... اس کے علاوہ تھوڑا سا فائل ورک۔ ڈیوٹی ٹائم نو سے پانچ۔“

”جی ٹھیک ہے۔“

”ایڈریس دیجیے۔ آپ کو اطلاع کردی جائے گی۔“ مینجر کا انداز بالکل سپاٹ تھا، لیکن اسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور مینجر نے جلدی سے فون اٹھالیا۔ اسے کان سے لگا کر بولا۔

”جی۔ پھر اس کے بعد وہ صرف فون سنتا ہی رہا تھا۔ آخر میں اس نے بغیر کچھ کہے سنے فون بند کردیا۔ رابعہ سلطان خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ ذرا الجھن کا شکار تھی، لیکن نہ جانے کیوں اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ شاید وہ صحیح جگہ آ گئی ہے۔ مینجر نے سامنے رکھے ہوئے کاغذات دیکھے اور پھر بولا۔

”دیکھیں بی بی...... ہمارا ایک اصول ہے، جو لوگ ہمارے ساتھ کام کرتے ہیں ہمارے لیے گھر کے افراد کی طرح ہوتے ہیں۔ انہیں راز داری اور ذمے داری کے ساتھ کام کرنا ہوتا ہے۔ ہم کوئی غلط کام نہیں کرتے۔ زیادہ بڑا کاروبار بھی نہیں ہے ہمارا، لیکن اپنے ورکرز کو ہم ہمیشہ خوش رکھتے ہیں۔ فی الحال ہم آپ کو آٹھ ہزار روپے ماہوار تنخواہ دے سکتے ہیں۔ بہر حال آپ یہ سمجھیے۔ آپ کی ملازمت پکی ہوگئی۔ آپ چاہیں تو آج سے ہی ٹیبل سنبھال سکتی ہیں۔ رابعہ سلطان جو تھوڑے سے ذہنی دباؤ کا شکار تھی۔ ایک دم سنبھل گئی۔ شاید...... تقدیر زور مار رہی ہے۔ ان لوگوں کی کھلی پیش کش اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ بات بن گئی ہے۔ مینجر نے کہا۔

”وہ جو کہا جاتا ہے نہ کہ جو کام کل کرنا ہو وہ آج کرنا چاہیے تو آپ کو آپ کی ٹیبل دکھا دی جائے۔ آپ کسی کو اپنی ملازمت لگ جانے کی اطلاع دینا چاہتی ہیں۔“

”ن...... ن...... نہیں۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ مینجر نے کہا اور بیل بجادی۔ ایک چپڑاسی ٹائپ کا آدمی اندر آیا اور اس نے کہا۔

”میڈم کو سامنے والا کمرہ دکھا دو یہ ہماری نئی ساتھی ہیں۔“ رابعہ سلطان با دل نہ خواستہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ایک میز اسے دے دی گئی تھی۔ ایک درمیانی عمر کا آدمی کچھ فائل لے کر آیا۔ رابعہ سلطان کو کا

بتاتے ہوئے بولا۔

''آپ ذرا ان کی ترتیب کر لیجیے۔ معاف کیجیے گا ہمارا دفتر معمولی سا ہے، لیکن اصولوں کے لوگ ہیں یہاں آپ کو کبھی تنخواہ کے حصول میں دقت پیش نہیں آئے گی۔ پہلی تاریخ کو آپ کا لفافہ آپ کے پاس ہوگا اور نہ ہی کسی اور ذہنی الجھن سے آپ کا واسطہ پڑے گا۔ رابعہ سلطان بہ ظاہر کاغذات میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس نے اس شخص کو بھی دیکھا تھا جس نے یہ رویہ اختیار کرتے ہوئے اس سے بہتر انداز میں بات چیت کی تھی، لیکن اس چہرے کا کیا کیا جاتا جس پر شرافت کا کوئی نشان نہیں تھا اور پھر ایک اور شبہ جو اس کے ذہن میں تھا وہ اسے پریشان کیے ہوئے تھا۔ وہ ٹیلی فون جو منیجر کو ملا تھا اور منیجر کا رویہ فوراً تبدیل ہوگیا تھا۔ یقینی طور پر وہ رابعہ سلطان ہی کے بارے میں تھا اور شاید اسی پر رابعہ سلطان کو ملازمت دینے کی ہدایت کی گئی تھی۔ بہرحال سی۔ بی۔ لمیٹڈ تک پہنچ گئی تھی۔ صائمہ کے گھر سے سی۔ بی۔ لمیٹڈ کا بس ایک کارڈ ملا تھا جسے پھاڑ دیا گیا تھا لیکن یہ ایک اشارہ تھا اور وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتی تھی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ بہرحال دوسرے دن سے وہ باقاعدگی کے ساتھ آفس جانا شروع ہوگئی۔ پہلے دن اس نے اپنی میز پر بیٹھ کے کام کیا تھا اور یہ کام ہر طرح سے فرم سے متعلق تھا البتہ رات کو جب وہ گھر واپس آئی تھی تو اس نے بڑی بے کلی محسوس کی تھی۔ کسے بتاؤں اپنی اس کارکردگی کے بارے میں، راجا ناصر ذہن میں آیا تھا لیکن راجا ناصر کا کردار اس کی نگاہوں میں بہتر نہیں تھا۔ راجا ناصر کسی بھی لمحے اپنی ملازمت کے ہاتھوں شکار ہو سکتا ہے۔ یہ رسک نہیں لیا جا سکتا۔ صوفی۔ دل میں یہ خیال آیا لیکن وہ دل مسوس کر رہ گئی اور بہت دیر تک اپنے آپ پر نفرین بھیجتی رہی۔ ایک ایسی شخصیت جسے کوئی بھی پسند نہ کرے خواہ مخواہ اسے اپنے ذہن پر سوار کر رہی ہے۔ نہیں...... ہرگز نہیں بہرحال دوسرا دن بھی برا نہیں گزرا تھا، البتہ جب وہ واپس پلٹی تو اس نے پیلے رنگ کی اس کار کو دیکھا جو اس کا تعاقب کر رہی تھی اور اسے یاد آیا کہ پچھلے دن بھی یہ کار اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ ایک دم اس کے ذہن میں چھناکا ہوا تھا۔ یہ تعاقب...... یہ تعاقب...... یہ تعاقب۔

♥......♥......♥

صوفی گرین ہاؤس میں داخل ہوگیا۔ شازیہ لپک کر اس کے پاس پہنچ گئی تھی۔

''کیا ہے چھوٹے بابا۔ اتنی بوریت ہو رہی ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ نہ کوئی کام نہ دھندا، بس گھر میں بیٹھے رہو۔ کیا مجرموں نے جرائم کرنا چھوڑ دیے ہیں؟ یا آپ نے ان پر توجہ دینا ترک کر دی ہے۔ بتائیے نا چھوٹے بابا۔''

''درویش ہم سب پر رحم کریں۔ واقعی چل تو خاموشی ہی رہی ہے۔ تم ایسا کرو شازیہ میں ایک وظیفہ بتائے دیتا ہوں۔ چالیس دن تک پڑھنے کے لیے بیٹھ جاؤ۔ چالیس دن تو گزر ہی جائیں گے۔ درویشوں کی دعاؤں سے اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' شازیہ ہنس پڑی۔ پھر بولی۔

''اور اس سے حاصل کیا ہوگا؟''

''چالیس دن کی مصروفیت۔'' صوفی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ اتنی دیر میں غلام قادر آ گیا۔

''اڑے ماں قسم ابھی تمہارے کو یاد کیا وڑی کدھر مر گیا تم چھوٹا بابا۔''

''ان سب کے لیے کوئی ایسا مشغلہ تلاش کرنا پڑے گا جیسا اس عامل نے اپنے جن کے لیے کیا تھا۔ صوفی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''وڑی میرے کو تو معلوم نہیں۔ جن نے، عامل کو کیا کیا تھا۔'' غلام قادر بولا۔

''جن نے نہیں بلکہ عامل نے جن کے ساتھ کیا تھا۔ جن کو کوئی کام بتانا تھا۔ وہ ہر وقت کہتا رہتا تھا کہ مجھے کوئی کام بتائیے۔ عامل نے اسے ایک چھلنی دیتے ہوئے کہا کہ اس چھلنی میں پانی بھر لاؤ۔ جن چھلنی میں پانی بھرتا وہ گر جاتا۔ بس اسی پریشانی میں اس کا وقت گزرنے لگا۔''

''ارے خدا قسم، وہ جن تھا یا پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کا کلرک جس سے کوئی کام ہی نہیں بنتا پڑا۔ ابھی اگر جن تھا وہ تو اس کے لیے چھلنی میں پانی لانا کون سا مشکل تھا۔ بات کرتا ہے۔'' غلام قادر نے گردن ٹیڑھی کر کے اور منہ بنا کر کہا۔

صوفی ان لوگوں کے ساتھ داخل ہوگیا تھا۔ کرنل رحیم شاہ ملک سے باہر گیا ہوا تھا اور بالکل اتفاقی طور پر صوفی کا گزر بھی ادھر سے نہیں ہوا تھا۔ اس لیے یہ لوگ شکایت کر رہے تھے لیکن فیضان اور عادل کو اس نے کام سے لگایا ہوا تھا اور اس وقت وہ انہی کو فون کر کے وہ گرین ہاؤس پہنچا تھا اور اس کے اہل خاندان، شازیہ اس کی والدہ اور بہن سب کے سب یہاں خوش تھے۔ ان کا اپنا ایک خاندان بن چکا تھا۔ سب ایک دوسرے کے دکھ درد کے ساتھی تھے۔ عیش و آرام کی زندگی ان کا مقدر بن چکی تھی۔ کرنل رحیم شاہ نے ان کے لیے ہر ضروری سہولت مہیا کر دی تھی۔ بہرحال تھوڑی دیر کے بعد عادل اور فیضان وہاں پہنچ گئے۔ دونوں کے پاس موٹر سائیکلیں تھیں اور پھر وہ صوفی کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے صوفی کو سلام کیا تو صوفی نے کہا۔

''ہاں۔''

''آپ کا خیال بالکل ٹھیک تھا چھوٹے بابا! رابعہ سلطان کا تعاقب کل بھی کیا گیا تھا اور آج بھی کیا گیا ہے۔ تعاقب کرنے والا ایک مقامی غنڈہ فیروز ہے۔ فیروز ایک پیلے رنگ کی گاڑی میں مسلسل پیچھے لگا ہوا ہے۔ ہم نے ابھی اسے چیک نہیں کیا، لیکن اس کی رہائش گاہ وغیرہ کا ہمیں پتا ہے۔ کل بھی جب رابعہ سلطان دفتر سے نکلی تھیں تو فیروز ان کے پیچھے لگ گیا تھا۔ وہ ایک آٹو رکشا میں اپنے گھر پہنچی تھیں۔ آج بھی وہ صبح ہی صبح اس کے گھر پر پہنچ گیا۔ وہاں سے ان کا تعاقب کرتا ہوا دفتر تک آیا۔ دفتر سے تعاقب کرتا ہوا گھر تک۔ رابعہ سلطان نے کہیں اور کا رخ نہیں کیا۔ بس گھر اور دفتر، دفتر اور گھر۔ اب اس وقت وہ اپنے گھر پر ہیں۔''

''درویش رحم کریں۔'' صوفی نے کہا۔

''کس پر۔'' شازیہ نے سوال کر ڈالا اور صوفی پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔ اس کی پیشانی پر گہری لکیریں تھیں۔ پھر اس نے کہا۔

''کل تیسرا دن ہے۔ کل صورت حال کا مزید جائزہ لو اور اس کے بعد جو کچھ بھی ہو مجھے بتانا۔''

''جی۔'' عادل نے کہا، پھر اس کے بعد صوفی ان لوگوں سے دوسرے موضوعات پر باتیں کر رہا تھا۔ کرنل رحیم شاہ کی واپسی کا ابھی کوئی اشارہ نہیں ملا تھا۔

♥......♥......♥

’’فیروز بیگ نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر پیلے رنگ کی وہ کار ایک مکان کی آڑ میں روک دی۔ یہاں اسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ نیچے اترا اور سیٹی بجاتا ہوا اس عالی شان کوٹھی کے گیٹ کی جانب بڑھ گیا، جو جلال الدین شاہ کی کوٹھی تھی۔ جلال الدین شاہ ایک بہت بڑا صنعت کار تھا۔ وہ نامی گرامی شخص تھا اس کی بہت سی فیکٹریاں اور شوروم شہر میں موجود تھے۔ کوئی تین سال قبل اس کا انتقال ہو چکا تھا اور اب اس کی بیوہ ناظمہ جلال سارے امور سنبھالے ہوئے تھی۔ ناظمہ جلال ایک سخت گیر عورت تھی۔ بھاری بدن، بھاری جبڑے، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، بھنچے ہوئے ہونٹ اس کی سنگ دلی کا پتا دیتے تھے۔ بہت کم بولتی تھی۔ چہرے پر ہر وقت ایک کرختگی سی چھائی رہتی تھی۔ پیشانی شکن آلود ہوتی تھی۔ لہجہ مدھم لیکن ٹھوس۔ ایک عجیب وغریب کردار تھا اس کا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ بہر حال اس کی زندگی سے کون سی کہانی وابستہ تھی یہ تو ابھی صیغہ راز میں ہی تھا۔ فیروز بیگ کوٹھی سے اندر داخل ہوگیا۔ ملازموں نے اسے ایک مخصوص کمرے میں پہنچا دیا جو ڈرائنگ روم نہیں تھا بلکہ ہلکے پھلکے فرنیچر سے آراستہ ایک عام سی نشست گاہ تھی۔ یہاں وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ سامنے کا پردہ ہٹا اور بھاری بدن کی مالکہ ناظمہ جلال سفید سلک کے خاص انداز کے لباس میں اندر داخل ہوگئی۔ اس وقت اس کی آنکھیں غنودگی میں ڈوبی ہوئی تھیں اور خاصی سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ اس نے فیروز بیگ کو دیکھا جو اس کے آتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور پھر وہ خود ایک صوفے پر بیٹھی اور اس کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

’’بیٹھو۔‘‘ فیروز بیگ مودبانہ انداز میں بیٹھ گیا تھا۔ اس نے کہا۔

’’میڈم آپ کی واپسی کب ہوئی؟‘‘

’’اب سے تھوڑی دیر پہلے، لیکن میں شہر پرسوں ہی واپس آ گئی تھی۔‘‘

’’آپ نے مجھے طلب نہیں کیا، اس لیے میں پوچھ رہا تھا میڈم۔‘‘

’’ضرورت کے بغیر نہ تو اس طرف آنے کی کوشش کرنا اور نہ ہی میں تمہیں بلاؤں گی۔ ہمیں خیال رکھنا ہے۔‘‘

’’آپ اطمینان رکھیں۔ ان باتوں کا تو میں خاص طور سے خیال رکھتا ہوں۔‘‘

’’ہوں۔ کیا رپورٹ ہے؟‘‘

’’میڈم! آپ مجھ سے زیادہ بہتر طریقے سے جانتی ہیں یہ بات تو خیر طے ہے کہ یہ وہی اخباری رپورٹر ہے جو ہمارے خلاف زہر اگلتی رہی ہے۔ بہت زیادہ ہم درد اور انسان دوست بننے کی کوشش کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ راجا ناصر نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ راجا ناصر اب بھی ہمارا ہی وفادار ہے، لیکن یہ خود کافی تیز معلوم ہوتی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ یہ ریاض علی کے گھر بھی پہنچ گئی تھی۔ لازمی بات ہے کہ ریاض علی کی بیٹی صائمہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے پہنچی تھی جس کی چھٹی کر دی تھی ان لوگوں نے۔‘‘

’’ہاں وہ مجھے معلوم ہے لیکن تم پورے اعتماد کے ساتھ کیسے کہتے ہو کہ یہ وہی ہے؟‘‘

’’میڈم! ایسی باتیں بلاوجہ تو نہیں کہی جا سکتیں۔‘‘

’’دفتر کی کیا کیفیت ہے۔ یہ بات تو تمہیں معلوم ہے کہ میرے اشارے پر اسے رکھا ہے۔ منیجر

سمجھتا ہے کہ میں نے اسے کسی اور مقصد کے لیے رکھا ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ بڑی خطرناک لڑکی ہے۔ اس طرح کی جذباتی لڑکیاں عام طور سے مشکل کا باعث بن جاتی ہیں۔ ہم ایسی کسی لڑکی کو کسی طرح بھی موقع نہیں دے سکتے۔‘‘

’’جی میڈم! میں سمجھتا ہوں۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’ٹھیک۔ اچھا اب بتاؤ، کرنا کیا ہے؟‘‘

’’میڈم جو بھی حکم دیں۔‘‘

’’میرا خیال ہے خطرے کو زیادہ قریب نہیں آنے دینا چاہیے۔ تم آج اسے اٹھالو۔ کیا سمجھے؟‘‘

’’ٹھیک ہے میڈم۔ میں خود بھی آپ کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ خطرے کو زیادہ موقع نہیں دینا چاہیے۔ اسے اٹھالینا بہت مناسب ہے۔‘‘

’’میں انتظار کروں گی۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ ابھی تو دفتر سے جا چکی ہے، لیکن کسی کام سے گھر سے باہر نکلے گی تو میں اسے اٹھالاؤں گا۔‘‘

’’گھر میں گھس کر اٹھالاؤ۔ کون کون ہوتا ہے اس کے ساتھ؟‘‘

’’میرا خیال ہے میڈم کوئی بھی نہیں۔‘‘

’’تو پھر کیا مشکل ہے؟‘‘

’’ٹھیک ہے وہ پہنچ جائے گی۔‘‘ فیروز نے جواب دیا۔

♥......♥......♥

رابعہ واقعی بددل ہوگئی تھی۔ صوفی کی بے اعتنائی نے اسے ایک دکھ دیا تھا۔ دل پھینک لڑکی نہیں تھی۔ زندگی کو بہت تلخ انداز میں گزارا تھا اس نے۔ حسن و عشق بے شک زندگی کا ایک حصہ ہوتے ہیں لیکن بعض کردار ایسے ہوتے ہیں جنہیں اس حد تک پہنچنے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ وہ زندگی سے اس طرح جنگ کرتے رہتے ہیں کہ ان کی زندگی میں اس قسم کا گداز پیدا نہیں ہو پاتا۔ رابعہ بھی انہی لوگوں میں سے تھی اور شاید اس کی فطرت کی یہی انفرادیت تھی کہ اس نے صوفی جیسے آدمی کو اپنا مرکز نگاہ بنالیا تھا۔ یہ ایک جذباتی عمل ہی تھا اور اس کے شناساؤں کے لیے یقیناً حیران کن ہوتا اگر وہ اس بارے میں جان پاتے۔ خود اس کے دفتر میں ایسے بہت سے لوگ تھے جنہوں نے اس کی جانب قدم بڑھانے کی کوشش کی تھی لیکن رابعہ جیسی اسٹریٹ فارورڈ لڑکی اس طرح کسی سڑک چھاپ سے عشق نہیں لڑا سکتی تھی۔ اس نے بڑے پیار بڑی محبت سے ان سے اپنے رشتے قائم کر لیے تھے اور وہ سب شرمندہ ہوگئے تھے۔ ایڈیٹر صاحب بھی رابعہ کے کردار سے بہت متاثر تھے، لیکن ان دنوں رابعہ مشکل کا شکار تھی۔ وہ اونٹ کا بچہ جس کی کوئی کل سیدھی نہیں تھی اس طرح اس کے دل کو بھا گیا تھا کہ وہ دنگ رہ گئی تھی۔ بہر حال بہت الجھنوں کا شکار تھی وہ۔ سی بی لمیٹڈ میں کام کرتے ہوئے اسے تین دن گزر چکے تھے۔ ابھی تک کوئی ایسی بات سامنے نہیں آئی تھی جو مشکوک ہوتی۔ نہ تو کوئی ایسا کردار اسے ملا تھا اور اب وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ سی بی لمیٹڈ صرف ایک اتفاق

ہو اور صائمہ بے چاری جو ملازمت کی تلاش میں سرگرداں رہتی تھی، کہیں سے سی بی لمیٹڈ کی کسی اشتہار وغیرہ سے متاثر ہوئی ہو اور اس سلسلے میں اس نے وہ کارڈ حاصل کیا ہو جو اس کے پاس موجود تھا۔ ملازمت نہ ملنے پر اس نے وہ کارڈ پھاڑ کر پھینک دیا۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچا جا سکتا تھا، چنانچہ وہ کسی حد تک بددل ہی ہوگئی تھی۔ اب نوکری تو کرتی نہیں تھی اس نے اخبار کے دفتر سے چھٹی لے رکھی تھی۔ ایڈیٹر صاحب اکثر اسے فون کرتے رہتے تھے۔ وہ خود بھی اس کے مشن سے متاثر تھے۔ ادھر فرقان جلیل بھی کئی بار اس سے پوچھ چکا تھا لیکن رابعہ نے اسے اپنی ذہنی کیفیت نہیں بتائی تھی اور فرقان جلیل کو یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ وہ خود اس سلسلے میں کام کر رہی ہے۔ صوفی صاحب شاید مصروف ہیں، اس لیے اسے وقت نہیں دے پا رہے۔ بہرحال اس وقت بھی وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ اسے ایڈیٹر صاحب کا فون موصول ہوا۔

"جی سر! کیسے مزاج ہیں آپ کے؟"

"میں تو ٹھیک ہوں رابعہ۔ تم اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"سر ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو ہمیشہ ٹھیک رہتے ہیں۔" رابعہ نے جواب دیا۔

"میں نہیں مانتا۔" ایڈیٹر صاحب بولے۔

"کیوں سر؟"

"تم حد سے زیادہ جذباتی ہو رابعہ۔ خیر جذبات زندگی کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ جذبات تو جانوروں میں بھی ملتے ہیں۔ یہی جان داروں اور بے جانوں کے درمیان تفریق ہوتے ہیں اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ وہ غیر جذباتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یا تو وہ جھوٹ بولتا ہے یا پھر وہ انسانوں سے الگ کوئی چیز ہے۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ جذباتی ہونا تو کوئی بری بات نہیں ہے لیکن رابعہ میری اور تمہاری عمر کے درمیان جو تفریق ہے اس کا سہارا لے کر میں بزرگ کی حیثیت سے سمجھاتا ہوں کہ ضرورت سے زیادہ جذباتیت بڑے نقصان کی چیز ہے۔ وہ لوگ جو کسی چیز سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوتے، بہت اچھی زندگی گزارتے ہیں اور میں اس وقت خاص طور سے یہ سوچ رہا ہوں کہ ان دو لڑکیوں کی موت نے تمہیں دیوانہ بنا دیا ہے۔ تم زندگی کا خطرہ مول لے رہی ہو۔ دیکھو۔ مجرم جب جرم کرتا ہے تو اس کی اپنی ایک پلاننگ ہوتی ہے۔ وہ اس پر بہت غور کرتا ہے، بہت سوچتا ہے اور سوچنے سمجھنے کے بعد وہ جرم کرتا ہے اور پھر اس جرم کی تفتیش کرنے والے ظاہر ہے صرف چھوٹے چھوٹے پوائنٹس تلاش کرتے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی باقاعدہ سڑک نہیں ہوتی جو جرم کے گھر پر جا کر ختم ہو جائے، جنہوں نے یہ سب کچھ کیا ہے وہ اتنے منظم لوگ ہوں گے کہ ان تک پہنچنا آسان کام نہیں ہوگا۔ تم بے شک جو کوشش کر رہی ہو وہ قابل ستائش ہے، لیکن رابعہ اس کے لیے اپنے آپ کو وقف نہ کرو۔ جاری رکھو اپنا یہ عمل، کوشش کرتی رہو، لیکن تم جس طرح جذباتی ہو رہی ہو اور جس طرح یہ چاہتی ہو کہ یہ کیس فوراً ختم ہو جائے۔ میں سمجھتا ہوں یہ مشکل ہے۔"

"سر! میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ کوئی تیسری لڑکی اس طرح ظلم کا شکار نہ ہو۔"

"بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔ یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ اس سے پہلے نہ جانے کتنی لڑکیاں اس درندگی کی بھینٹ چڑھ چکی ہوں گی۔ بات علم میں آ جانے والی ہے، اگر اس شام تم راجا ناصر کے دفتر میں نہ

پہنچی ہوتیں تو اس لڑکی کے بارے میں تمہیں کچھ نہ معلوم ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ اخبار کو یہ خبر ملتی کہ ایک لڑکی حادثے کا شکار ہوگئی اور اس کی لاش ایک گلی میں پائی گئی۔ بس اس کے بعد تم پولیس کی تفتیش پر انحصار کرتیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تیسری لڑکی کی بات نہ کرو۔"

"سر۔ چلیے ٹھیک ہے وہ تیسری نہ سہی بیسویں، پچیسویں یا پچاسویں لڑکی ہے۔ اگر وہ پچاسویں ہے تو میں اکیانویں لڑکی کو بچانا چاہتی ہوں۔" رابعہ سلطان نے کہا۔

"تم ایسا کرو میرے پاس آ جاؤ۔ گھر پر ہوں۔ تم سے باتیں کروں گا۔ دل چاہ رہا ہے۔ ویسے بھی کئی دن سے تم سے ملاقات نہیں ہوئی۔" رابعہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔

"میں آ رہی ہوں سر۔ آتی ہوں ابھی تھوڑی دیر میں۔"

"میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" ایڈیٹر صاحب نے کہا اور فون کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

ایڈیٹر صاحب ایک مشفق اور بہت ہی اچھے انسان تھے۔ رابعہ صرف اس لیے ان کی عزت نہیں کرتی تھی کہ وہ اس کے اخبار کے ایڈیٹر تھے بلکہ ایک انسان کی حیثیت سے بھی وہ ان سے متاثر تھی۔ ان کی طلبی پر وہ فوراً ان کے پاس جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ ویسے بھی گھر میں اس وقت بے کار تھی اور یہ غور کر رہی تھی کہ اب وہ سی۔ بی۔ لمیٹڈ کی ملازمت کو جاری رکھے یا نہ رکھے۔ وہاں سے اسے ابھی تک کچھ نہیں حاصل ہوا تھا۔ اس سلسلے میں ایڈیٹر صاحب سے مشورہ کر لینا بھی مناسب ہوگا۔ اس نے سوچا اور لباس تبدیل کرنے لگی پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ باہر نکل آئی۔ اپنے خاص اصولوں کے تحت اس نے اپنے آپ کو ایک حد تک محدود رکھا تھا۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے ایک آٹو رکشا مل گیا تو وہ اس میں بیٹھ گئی اور آٹو رکشا کے ڈرائیور کو اس نے اس علاقے کا پتا بتا دیا۔ شام رات کی دھندلاہٹوں میں ڈوب چکی تھی اور اندھیرا فضاؤں پر تیزی سے مسلط ہوتا جا رہا تھا۔ جس علاقے میں رہتی تھی وہاں سے تقریباً کوئی تین میل تک راستے سنسان ہوا کرتے تھے۔ ویسے بھی یہ کوئی مصروف گزرگاہ نہیں تھی۔ درمیانے درجے کا علاقہ تھا۔ رکشا ابھی تھوڑی دور گیا تھا کہ نیلے رنگ کی ایک پرانی کار نے اس کا راستہ روک لیا۔ رکشا ڈرائیور نے بریک لگائے اور منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا۔ غالباً وہ کار والے کو گالیاں دے رہا تھا۔ کار سے تین چار آدمی نیچے اتر آئے۔ رکشے والا انہیں برا بھلا کہنے لگا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ اس طرح گاڑی آگے لگائی، اگر میں پورے بریک نہ لگا دیتا۔" لیکن دو آدمیوں نے رکشے والے کا گریبان پکڑا اور ایک جھٹکے سے اسے نیچے کھینچ لیا۔ رکشے والے کے منہ سے ارے ارے ہی نکلا تھا کہ ایک زوردار گھونسا اس کے جبڑے پر پڑا۔ وہ ایک طرف لڑھکا تو دوسرے آدمی نے اس کے سر پر کسی چیز سے ضرب لگا دی۔ رابعہ سلطان گھبرا کر رکشے سے نیچے اتر آئی تھی۔ رکشا ڈرائیور لہرانے لگا اور اس کے بعد وہیں سڑک پر ڈھیر ہوگیا۔ رابعہ سلطان جیسے ہی نیچے اتری، کار سے اترنے والے دو آدمیوں نے ریوالور کی نال اس کی پسلیوں سے لگا دی۔

"چلو کار میں بیٹھو۔"

"کک...... کیا...... کیا بدتمیزی ہے؟" رابعہ سلطان کے منہ سے ہکلائی ہوئی آواز نکلی، لیکن

دوسرے ہی لمحے ان میں سے ایک نے اس کی گردن دبوچی اور کار کے کھلے دروازے سے اندر دھکا دے دیا، پھر وہ دونوں پھرتی سے اس کے دائیں بائیں آ بیٹھے۔ باقی دو افراد میں سے ایک نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور دوسرا اس کے برابر بیٹھ گیا۔ کار برق رفتاری سے آگے بڑھ گئی تھی۔

اس قسم کے واقعات کی رپورٹنگ تو رابعہ نے بہت سی بار کی تھی خود کسی ایسے واقعے سے دوچار ہونے کا تجربہ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا اور وہ کچھ دیر کے لیے بالکل گم سم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے برابر بیٹھنے والوں نے دونوں طرف سے ریوالور کی نالیں اس کی پسلیوں سے لگائی ہوئی تھیں۔ کار کی رفتار بھی خاصی تیز تھی۔ رابعہ کو ایک لمحے کے اندر اندازہ ہو گیا کہ اس کے لیے ان لوگوں کے چنگل سے بچنا مشکل ہے، وہ کسی سنگین حادثے کے لیے ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کرنے لگی۔

حالات جس طرح اچانک پیش آئے تھے۔ ان میں عقل کا باقی رہ جانا کیا معنی رکھتا تھا؟ راستوں کو بھی ذہن میں نہیں رکھ سکی اور غش کی سی کیفیت میں کار کا یہ سفر طے ہوا پھر وہ کون سے علاقے میں آئی۔ کون سی عمارت میں جا کر رکی۔ رابعہ سلطان کو اس کا کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔ دونوں طرف بیٹھے ہوئے افراد دروازہ کھول کر نیچے اتر گئے اور پھر انہی میں سے ایک نے ریوالور سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''چلو نیچے اترو، بیگم صاحبہ کار آپ کو لے کر کسی اور شہر نہیں جائے گی۔ اترو۔'' وہ غرایا تو رابعہ نے سیٹ پر ہاتھ ٹکائے اور اپنے جسم کو جنبش دے کر دروازے کی طرف کھسکایا، پھر نیچے اتر گئی۔ پاؤں لرز رہے تھے۔ بے حد کوشش کر رہی تھی کہ خود کو سنبھال سکے، لیکن بس اعصابی کمزوری اس طرح سوار تھی کہ اگر کار کا سہارا نہ لیتی تو شاید گر پڑتی۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑا۔ رابعہ نے اس سے بازو چھڑانے کی کوشش کی۔ وہ غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''شرافت سے ہمارے ساتھ چلو۔ ہم کسی عورت کی بے عزتی کرنا پسند نہیں کرتے، لیکن اگر تمہیں اس کا شوق ہے تو ہمیں اعتراض نہیں ہے۔ یہ کہہ کر اس نے رابعہ کو کندھے سے پکڑ کر دھکا دیا۔ رابعہ گرتے گرتے بچی۔ یہ اندازہ اسے ہو گیا تھا کہ اب ان کی ہدایت پر عمل کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔

عالی شان عمارت کے اندرونی حصے میں پہنچنے کے بعد وہ اسے لیے ہوئے ڈرائنگ روم سے بھی آگے بڑھ گئے اور پھر شاید یہ کوئی مخصوص نشست گاہ تھی جہاں تک پہنچنے کے لیے کئی راہ داریاں طے کرنی پڑتی تھیں۔ اس کے بعد اسے لانے والوں نے ایک بند دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ ان کے انداز میں بڑی جارحیت تھی اور رابعہ محسوس کر رہی تھی کہ خاصا مشکل وقت آ پڑا ہے اور ہو سکتا ہے یہ لمحات اس کے لیے زندگی اور موت کے لمحات بن جائیں۔ بڑے سے کمرے میں پہنچ کر وہ رک گئی۔ اسے لانے والے اسے وہاں چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے۔ رابعہ احمق نہیں تھی کہ یہ سوچتی کہ وہ دروازہ کھلا چھوڑ گئے ہوں گے۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لازمی امر تھا کہ دروازہ باہر سے بند کر دیا ہوگا۔

وہ وحشت زدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کمرے کا ایک اندرونی دروازہ بھی تھا جس پر پردہ جھول رہا تھا۔ چند لمحے ہی گزرے تھے کہ پردے کے عقب سے ایک دراز قامت عورت اندر داخل ہوئی۔ اس نے سفید سلک کا مخصوص طرز کا عربی لبادہ پہنا ہوا تھا۔ چہرے سے خاصی بارعب نظر آ رہی تھی۔ چال میں

بھی ایک وقار تھا۔ اندر داخل ہوئی۔ سرد نگاہوں سے رابعہ سلطان کو دیکھا۔ ایک صوفے پر جا بیٹھی اور رابعہ سلطان سے بولی۔

''بیٹھو۔ رابعہ سلطان کے قدم خود بھی بے جان سے ہو رہے تھے۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے وہ آگے بڑھی اور عورت کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''رابعہ سلطان!'' اس نے رابعہ کی طرف انگلی اٹھا کر کہا اور پھر رابعہ کے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔

''میں...... ناظمہ جلال ہوں۔ میرے شوہر جلال الدین ملک کے بہت بڑے صنعت کاروں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے، لیکن ان کا چھوڑا ہوا کاروبار اب بھی بہت وسیع ہے اور باہر کے کئی ملکوں میں بھی پھیلا ہوا ہے۔ ہم لوگ اس ملک کے دولت مند لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ سرکاری طور پر بھی ہماری بڑی عزت ہے۔ اعلیٰ حکام سے ہمارے گہرے تعلقات ہیں جس کی بنا پر ہمارا کوئی کام بھی رکتا نہیں ہے اور ہم لوگ ہر مشکل کا حل بہ آسانی تلاش کر لیتے ہیں۔ رابعہ سلطان! تم نے اگر اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش ہے تو بے شک تم دنیا کی نگاہوں سے چھپ سکتی ہو، لیکن ہماری نگاہوں سے نہیں۔ سمجھ رہی ہو نا تم۔ تم اخبار میں کام کرتی ہو اور تم ہی وہ لڑکی جوان لڑکیوں کے قتل کے سلسلے میں ضرورت سے زیادہ لکھ رہی ہو۔ جب کہ دوسرے اخبارات اس بارے میں زیادہ شور نہیں مچا رہے۔ کیا سمجھیں؟ تمہارے اخبار کے ایڈیٹر صاحب کو وارننگ دی گئی لیکن پتا یہ چلا کہ تم اس سلسلے میں خاصی جذباتی ہو اور شاید اپنے ایڈیٹر صاحب کے احکامات بھی قبول نہیں کرتیں۔ رابعہ سلطان بعض اوقات کچھ معاملات انسان کی مجبوری بن جاتے ہیں اور وہ مجبوری کے آگے اس طرح بے بس ہو جاتا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ میں تمہیں بتاؤں قدرت نے ویسے تو انسان کو بہت سے جذبوں سے نوازا ہے لیکن ان میں ایک جذبہ جو ہے وہ بڑی انفرادیت رکھتا ہے اور وہ ہے جذبہ محبت۔ ایسی تکلیف دہ کیفیت ہوتی ہے یہ کہ بس...... بیان سے باہر ہے بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ الفاظ میں اس کی تشریح ہو ہی نہیں سکتی۔ رابعہ سلطان...... تھوڑا سا اپنے بارے میں بتاؤں تمہیں، ایک اچھے خاصے گھرانے کی شریف زادی تھی میں۔ یہاں میں لفظ ''تھی'' استعمال کر رہی ہوں، کیونکہ جو کچھ میں نے کیا ہے وہ کوئی اچھا عمل نہیں ہے۔ سو فی صدی مجرمانہ کارروائی ہے وہ۔ زندگیاں گئی ہیں۔ اس لیے کوئی معمولی بات نہیں ہے میں اپنے آپ کو کوئی اچھی شخصیت نہیں کہہ سکتی، لیکن بات وہی ہے یہ لفظ مجبوری بہت سے عیبوں کی پردہ پوشی کر لیتا ہے۔ خیر میں اس لیے اتنی باتیں کر رہی ہوں کہ تمہارا تعلق شعبہ صحافت سے ہے۔ تم ایک صحافی ہو، لیکن میری مجبوریاں مجھے تم سے دشمنی پر آمادہ کرتی ہیں اور تم اس بات میں حق بہ جانب ہو کہ مجھے ایک بدترین دشمن کی نگاہ سے دیکھو۔ اب یہاں پر سوال یہ آ جاتا ہے کہ دو دشمنوں کے درمیان جب طاقت آزمائی ہوتی ہے تو ان میں سے ایک کو شکست کھانی پڑتی ہے۔ تمہیں منع کیا گیا تمہارے ایڈیٹر صاحب کے ذریعے کہ بی بی مت پڑو ان چکروں میں۔ وہ لڑکیاں جو ہلاک کی گئیں حالات سے سمجھوتہ کرنا نہیں جانتی تھیں۔ بلاوجہ عزت آبرو کا ڈھونگ رچا کر زندگی سے لڑیں اور موت کا شکار ہو گئیں۔ مجبوری تھی ہم اپنے آپ کو منظر عام پر نہیں لانا چاہتے تھے۔ بہت سے سوالات تمہارے ذہن میں آ رہے ہوں گے۔ بتا رہی ہوں تمہیں، تمہارے ہر سوال کا جواب دے

رہی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور دیوار پر لگے ہوئے ایک سوئچ کو دبا دیا۔ سامنے کی دیوار کا ایک حصہ اس طرح سرکنے لگا جیسے سلائیڈنگ ڈور ہوتے ہیں۔ اس کے عقب میں انتہائی شفاف شیشہ لگا ہوا تھا اور وہ دیوار جو بہ ظاہر دیوار نظر آتی تھی، دیوار نہیں تھی بلکہ کوئی اور چیز تھی جو فولڈ ہو سکتی تھی اور پھر شیشے کے دوسری طرف ایک انتہائی بدنما مخلوق نظر آئی۔ اس کی عمر کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن ایک جوان شخص کا چہرہ تھا۔ کوئی ایک فٹ لمبا چہرہ، پچکے ہوئے گال، پھیلی ہوئی آنکھیں، ضرورت سے زیادہ چوڑی ٹھوڑی، کسی پہلوان جیسی گردن، اسی مناسبت سے جسم بھی تھا۔ قد تقریباً چھ فٹ لیکن اوپر کا دھڑ بلا مبالغہ پانچ فٹ سے کم نہیں تھا اور ٹانگیں صرف ایک فٹ گول گول، موٹی پنڈلیاں، ایک عجیب و غریب مخلوق تھی۔ لوگوں کے جسم بڑے ہوتے ہیں موٹے اور بھدے بھی ہوتے ہیں لیکن اس جسم کی بناوٹ اتنی عجیب تھی کہ آنکھوں کو یقین نہ آئے۔ وہ کسی پنجرے میں بند چیتے کی طرح پورے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ جسمانی ساخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ فولاد ہے۔ سلائیڈنگ دیوار ہٹتے ہی اس نے شیشے سے اس طرف دیکھا۔ پہلے اس کی نگاہ ناظمہ جلال پر پڑی اور اس کے بعد رابعہ سلطان پر۔ دوسرے لمحے اس نے چھلانگ لگائی اور شیشے کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اب وہ تیز چمک دار آنکھوں سے رابعہ سلطان کو دیکھ رہا تھا اور اس کے منہ سے کتے جیسی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ عجیب سے انداز میں کراہ رہا تھا اور اس کے چہرے پر نحوست پھیلتی جا رہی تھی۔ رابعہ سلطان کا پورا جسم لرز کر رہ گیا۔ بدنما مخلوق اسے دیکھتی رہی، تب اس کی پھٹی پھٹی آواز ابھری۔

"ماما...... ماما...... اسے اندر بھیج دو۔ دروازہ کھول دو ماما۔ بھیج دو اسے اندر۔ ماما پلیز۔ اسے اندر بھیج دو۔ تمہاری مہربانی ہوگی۔"

"انتظار کرو۔" ناظمہ جلال کی سپاٹ آواز ابھری اور وہ بچوں کی طرح مچلنے لگا۔

"جلدی بھیج دو ماما۔ ماما پلیز۔" عورت نے دیوار کے پاس جا کر بٹن دبایا اور سلائیڈنگ وال اپنی جگہ برابر ہوگئی۔ وہ پھر صوفے پر آ بیٹھی اور بولی۔

"یہ گل ہے جسے تم نے دیکھا۔ میرا بیٹا۔ میں نے اس کا نام گل رکھا ہے یعنی پھول۔ ماں تو نہیں ہو نا تم۔ تم غیر شادی شدہ ہو۔ وہ بادشاہ والی کہانی بھی سنی ہوگی تم نے، جس نے بچوں کے حسن کا انتخاب ایک ماں کے سپرد کر دیا تھا۔ ہزاروں خوب صورت بچوں میں سے ماں نے اپنے کالے کلوٹے بچے کو اول حسین بچہ قرار دیا تھا۔ قدرت نے ماں کی نگاہ ایسی ہی پیدا کی ہے۔ کسی ماں کو اس کی کل کائنات میں سمیٹنا ہو تو اس کا بچہ اس کے سامنے کر دو۔ میرے لیے بھی یہ گل ہی ہے۔ ایک نازک پھول، حالانکہ یہ اپنے مضبوط ہاتھوں سے لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں موڑ سکتا ہے۔ ایک گھونسا مار کر کسی بھی انسان کا بھیجا باہر نکال سکتا ہے، لیکن میرے لیے وہ گل ہے۔ سولہ سال ہوگئے تھے۔ میں اولاد کے لیے تڑپ رہی تھی۔ تقدیر کا کھیل ہے، شاید تمہیں یقین نہ آئے کہ جس وقت میری شادی ہوئی تھی۔ اس وقت میری عمر ٹھیک ٹھاک تھی، لیکن ذہنی طور پر میں بہت معصوم تھی۔ میں نے شادی صرف اس لیے کی تھی کہ مجھے بتایا گیا تھا کہ شادی کے بعد چھوٹے چھوٹے بچے دنیا میں آ جاتے ہیں۔ بچے مجھے اتنے پسند تھے کہ بتا نہیں سکتی۔ دوسروں کے بچوں کو گود میں لے کر کھلایا کرتی تھی، لیکن پھر بچوں کی مائیں معذرت کر کے انہیں میری گود سے لے کر چلی جاتی تھیں اور میں مچلتی رہ جاتی تھی۔

میرے دل میں یہ آرزو مچلتی تھی کہ کاش یہ بچہ میری ملکیت ہوتا۔ کوئی اسے میرے پاس سے نہ لے جاتا۔ میں شادی کے لیے صرف اس لیے تیار ہوگئی کہ اس کے بعد میرے اپنے بچے ہوں گے اور میں ان کی مالک ہوں گی۔ جلال دین بہت اچھے آدمی تھے۔ ہر طرح سے میرا خیال رکھتے تھے۔ بے انتہا دولت مند کاروباری امور میں دن رات پھنسے ہوئے لیکن تقدیر نے مجھ پر وہ مہربانی نہیں کی۔ شادی کا پہلا سال، دوسرا سال، تیسرا سال اور اس کے بعد بہت سے سال گزر گئے، لیکن ہمارے ہاں اولاد پیدا نہیں ہوئی۔ میری ذہنی کیفیت خراب ہوتی چلی گئی۔ اس کائنات سے نفرت ہوگئی تھی مجھے۔ میں ماں نہیں بن سکی تھی۔ ہزاروں علاج، دعائیں، منتیں لیکن اولاد سے محروم رہی۔ میں ذہنی مریضہ بن گئی تھی۔ سولہ سال، پورے سولہ سال میں نے کرب میں گزارے، لیکن پھر اچانک قدرت مجھ پر مہربان ہوئی اور آخر کار میں نے ایک بیٹے کو جنم دیا، لیکن نہ جانے کیوں، تقدیر میرے ساتھ مذاق کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ میرا بچہ اپاہج نہیں تھا، لیکن عجیب الخلقت تھا۔ جسم دیکھ چکی ہو اس وقت اس کے پاؤں چار انچ یا تین انچ سے زیادہ نہیں تھے۔ جب وہ اس دنیا میں آیا جب کہ اس کا دھڑ یعنی اوپر کا بدن بہت لمبا تھا۔ جلال الدین تو اسی وقت شدید بددل ہوگئے تھے۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کے ساتھ کہا تھا کہ ناظمہ اولاد ہماری تقدیر میں نہیں ہے۔ دکھی تو میں بھی تھی لیکن ماں اور باپ میں فرق ہوتا ہے۔ باپ کو اس کی ظاہری کیفیت سے دکھ ہوا تھا، لیکن مجھے وہ ہر حال میں عزیز تھا۔ میں نے اس کا نام گل رکھا۔ جلال الدین نے کبھی اسے باپ کی محبت نہیں دی۔ وہ ویسے تو نارمل تھا، لیکن جب عمر کی اس منزل میں آیا جہاں شعور جاگ اٹھتا ہے تو اسے احساس ہوا کہ لوگ اسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ زیادہ تر اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اس کی جسمانی معذوری کو مذاق کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو اس کے اندر جھنجلاہٹیں بے دار ہوگئیں اور جب اس نے اپنے کالج کی ایک لڑکی سے اظہار عشق کیا اور اس لڑکی نے اسے تھپڑ مار دیا تو اس پر جنون طاری ہوگیا۔ اس نے اس لڑکی کو اغوا کیا اور اپنی خلوت میں لانے کے بعد اپنے ہاتھوں سے اس کی گردن دبا دی۔ وہاں وہ بالکل جنونی ہوگیا اور اس عالم میں آ گیا۔ اس کی ذہنی رو بھٹکتی رہی اور پھر ایک دن جلال الدین کو اس کی اس حرکت کے بارے میں معلوم ہوگیا۔ میں تو اپنے بچے کے جنون کو ختم کرنے کے لیے اس کی ہر طرح سے معاونت کرتی تھی، لیکن جلال الدین کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ میرے بچے کی زندگی لینے پر تل گئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ پولیس کو اس بارے میں اطلاع دے دیں گے۔ میں نے کہا جلال اس کا علاج کراؤ۔ کہنے لگے کیا علاج کراؤں۔ آدھا دھڑ کٹوا کر ٹانگیں لگوا دوں اس کے جسم میں۔ کیا کروں؟"

"تو پولیس کے ذریعے تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"میں اس کے جنون کو انسان کی زندگی سے کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

مختصر یہ کہ جلال الدین ہر قیمت پر میرے بچے کو نقصان پہنچانے پر تل گئے۔ تب مجھے مجبوراً انتہائی قدم اٹھانا پڑا۔ میں نے انہیں زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ مجھے اپنے بچے سے اتنا ہی پیار تھا۔ سولہ سال کے بعد تو میری زندگی میں بہار آئی تھی۔ اب یہ تو قدرت کا عمل تھا میرے بچے کا قصور تو نہیں تھا۔ جلال الدین ختم ہوگئے۔ میں نے کسی کو اس بات کا پتا چلنے نہیں دیا تھا کہ میں نے جلال الدین کو ہلاک کیا ہے۔ اب اس کے بعد صورت حال یہ تھی کہ میں نے گل کو اس جگہ قید کر دیا تھا۔ اسے ہر وقت حسین لڑکیوں کی خواہش رہتی ہے۔

میں اسے آزاد نہیں چھوڑ سکتی تھی، کیونکہ میں جانتی تھی کہ کہیں کسی بھی جگہ وہ زندگی کھو بیٹھے گا۔ میں اس کی فرمائشیں پوری کرتی ہوں اور میں نے اس کے لیے طریقہ کار منتخب کیا ہوا ہے۔ سی۔ بی۔ لمیٹڈ کے نام سے میں نے ایک پس ماندہ علاقے میں ایک ادارہ بنا دیا ہے۔ یہاں میرے اپنے آدمی ہوتے ہیں۔ وہ لڑکیوں کے لیے اشتہار دیا کرتے ہیں۔ اصل میں یہ ادارہ میں نے پس ماندہ علاقے میں اس لیے قائم کیا ہے کہ لوگوں کے لیے باعث دلچسپی نہ ہو۔ ایک معمولی سا کاروبار وہاں کیا جائے، پھر یہ کہ ملازمت کی متلاشی لڑکیاں جن کا نچلے طبقے سے تعلق ہو۔ وہاں ملازمت کے حصول کے لیے پہنچیں۔ میں انہیں بہترین پیش کش کرتی ہوں، لیکن وہ دیوانیاں نہ جانے کیسے کیسے احساسات کا شکار ہوتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اعلیٰ مستقبل کی خواہش مند ہوتی ہے اور سوچتی ہیں کہ ان کے خوابوں کا شہزادہ پرستان سے گھوڑے پر بیٹھ کر آتا ہی ہوگا۔ جب کہ تم جانتی ہو رابعہ سلطان کہ خواب کبھی پورے نہیں ہوتے۔ وہ تو ایک دماغی عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں، جو مان جاتی ہیں میں انہیں بہت کچھ دے دیتی ہوں اور جو بپھر جاتی ہیں، مجبوراً ان کی زندگی چھیننا پڑتی ہے کہ کہیں وہ میرے بچے کو مشکل میں نہ ڈال دیں۔ میرا خیال ہے تمہارے ہر سوال کی وضاحت ہوگئی ہے۔ تم نے خواہ مخواہ آگ میں ہاتھ ڈالا ہے۔ بیسیوں قتل ہوتے ہیں روزانہ، ہزاروں حادثے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر حادثے کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ رابعہ سلطان، سمجھایا تھا تمہیں مختلف طرح سے نہیں مانی، کوئی کیا کر سکتا ہے۔

”تم جیسی عورت کا روئے زمین پر وجود کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ بالکل تعجب کی بات کی نہیں ہے۔“ ناظمہ جلال ہنس پڑی۔ ایک بار پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے دیوار پر لگا ہوا ایک اور سوئچ دبایا۔ اس سے دو عمل ہوئے تھے۔ پہلا تو یہ کہ دروازے پر اسٹیل کی ایک شیلڈ آ گری تھی اور وہ دروازہ لاک ہوگیا تھا۔ دوسری وہ دیوار ایک بار پھر نمایاں ہوگئی تھی۔ رابعہ سلطان اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ کیونکہ اب وہ شیشے کی دیوار کو بھی سرکتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور وہ خوف ناک وجود پھر اس طرف متوجہ ہوگیا تھا ناظمہ جلال نے کہا۔

”ہم ماں بیٹوں کے درمیان بڑی گہری دوستی ہے۔ میں اس لیے اس کے قریب رہتی ہوں کہ کہیں کوئی لڑکی میرے بچے کو زخمی نہ کر دے۔“ خوف ناک وجود بھاڑ جیسا منہ کھولے قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کا ایک قدم آٹھ انچ سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ بہت بھیانک لگ رہا تھا وہ اس وقت۔ رابعہ سلطان صوفے کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ وہ اس شخص کی جسمانی کیفیت کا اندازہ لگا چکی تھی۔ واقعی فولاد کا ٹکڑا معلوم ہوتا تھا اور اس کے چہرے کی وحشت بتاتی تھی کہ وہ بالکل غیر انسانی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس کی ذہنی کیفیت بالکل ٹھیک نہیں تھی اور رابعہ سلطان نے وحشت زدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا تو ناظمہ جلال نے کہا۔

”ضروری نہیں تھا کہ میں تمہیں اس طرح بلا لیتی لیکن کیا کہا جائے اور کیا کیا جائے، تم بہت زیادہ جذباتی ہوگئی تھیں۔ میں یہ تو نہیں چاہتی کہ میرا بچہ منظر عام پر آئے اور حکومت اسے گرفتار کر کے نقصان پہنچانے پر مجبور کر دے۔ کاش تم مجھ سے ملتیں۔ ہم کتوں کا پیٹ اچھی طرح بھر دیتے ہیں۔ جس کے لیے میں نے اپنے شوہر کو ہلاک کر دیا۔ اسے میں بھلا دوسروں کے ہاتھوں کیسے نقصان پہنچنے دے سکتی ہوں۔“

”لیکن آپ نے ان کا علاج کیوں نہیں کرایا؟“

”بس...... علاج ہی تو کر رہی ہوں اب...... شیر گوشت کھانے کا عادی ہو جاتا ہے تو اسے گوشت ہی کھلایا جاتا ہے۔ یہی اس کا علاج ہے۔ میں اسے زندہ رکھنا چاہتی ہوں، اس لیے کہ ماں ہوں۔ ناظمہ جلال نے کہا۔ ہول ناک وجود آہستہ آہستہ رابعہ سلطان کے قریب آ رہا تھا کہ اچانک ہی کمرے سے ملحق واش روم سے دروازہ کھول کر کوئی اندر گھس آیا اور ناظمہ جلال چونک پڑی۔ اس کی آنکھوں میں شدید وحشت اور حیرت کے آثار پھیل گئے تھے اور رابعہ سلطان سکتے میں کھڑی رہ گئی تھی۔ کیونکہ آنے والا صوفی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ صوفی کہنے لگا۔

”میں ایک بے اولاد باپ ہوں۔ درویشوں کے کرم سے۔ میری کوئی اولاد نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے شادی ہی نہیں کی۔ ویسے میں بہت سارے امراض کا علاج کرتا ہوں۔ حکیم کالینوس جو جالینوس کے تایا زاد تھے۔ میرے ماموں زاد چچا تھے۔ ان سے میں نے حکمت سیکھی۔ آپ اس کا علاج چاہتی ہیں نا۔ آپ یقین کریں میں اس کا بہترین علاج کر دوں گا۔“ صوفی کی یہاں آمد ایک جادوئی عمل کی طرح سے تھی، جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ ناظمہ جلال بھی شاید اسی لیے حیران تھی وہ خوف ناک وجود اس طرح ساکت ہوگیا تھا جیسے کوئی روبوٹ چلتے چلتے رک جائے۔ ناظمہ جلال نے سوال کر ڈالا۔

”تم کون ہو اور یہاں تک کیسے آئے۔“

”بس...... آپ ہی لوگوں کی مہربانی ہے۔ اصل میں یہ گٹر لائن جو ہوتی ہے نا بعض جگہ بڑی کارآمد ہوتی ہے۔ بڑے لوگ اس پر توجہ نہیں دیتے۔ سارے کام ملازموں پر چھوڑ دینا اچھی بات نہیں ہے۔ آپ کے اس واش روم کے بالکل پچھلے حصے میں گٹر کی مین لائن ہے اور واش روم میں لگی ہوئی کھڑکی اتنی مضبوط نہیں کہ اسے اکھاڑا نہ جا سکے۔ بس یہی جگہیں ہماری یہاں آمد کا راستہ بنی ہیں درویشوں کی دعاؤں سے اور پھر کسی بھی سلسلے میں آپ درویشوں سے امداد طلب کر لیں۔ سمجھ لیں بیڑا پار ہوگیا۔ حق اللہ......“ صوفی نے درویشانہ شان سے کہا، لیکن ناظمہ جلال شاید اسے باتوں میں الجھا کر کچھ کرنا چاہتی تھی۔ اس نے قریب رکھے ہوئے پرس سے ریوالور نکالنا چاہا، لیکن صوفی ہوشیار تھا۔ اچانک ہی صوفی نے چھلانگ لگائی اور ناظمہ جلال کی کمر پر ایک لات رسید کی۔ ناظمہ جلال صوفے سے اٹھ کر اوندھے منہ نیچے جا پڑی۔

”یہ لات جائز ہے، کیونکہ ابھی ایک شریف زادی کی آبرو خطرے میں تھی اور یہ دوسری لات۔“ صوفی نے گری ہوئی ناظمہ جلال کے ایک اور لات ماری جو اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی اور ناظمہ جلال کئی لڑھکنیاں کھا گئی۔ صوفی نے کہا۔

”آپ نے...... بہ قول آپ کے کتوں کا پیٹ بھر کے ان لڑکیوں کا قتل کرا دیا لیکن آپ دوسری ماؤں کو بھول گئیں جنہیں خود بھی اپنی اولاد سے اتنی ہی محبت تھی۔“ صوفی کا چہرہ اس وقت بالکل تبدیل ہوگیا تھا۔ رابعہ سلطان ایک دیوار سے کمر لگا کر کھڑی ہوگئی تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے صوفی کو دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً ہی وہ خوف ناک وجود متحرک ہوگیا۔ اس نے ایک بہت وزنی صوفہ اس طرح اٹھا لیا جیسے وہ کاغذ کا بنا ہوا ہو اور پھر وہ صوفہ اس نے صوفی پر اچھا دیا۔ صوفی بڑے پروقار انداز میں ایک طرف ہٹ گیا تھا۔

”اس کا کوئی علاج نہیں ہے، لیکن جیسا کہ میں نے کہا میں اس کا علاج کیے دیتا ہوں۔ یہ دنیا کے لیے خطرہ ہے اور بہ قول آپ کے کئی لڑکیاں اس کی وحشت کی بھینٹ چڑھ چکی ہیں، چنانچہ اس کا دنیا میں رہنا

مناسب نہیں ہے۔ جلال الدین ٹھیک کرتے تھے کہ اس سے نفرت کرتے تھے۔ کوئی اپاہج قابل نفرت نہیں ہوتا لیکن اگر تم جیسی ذلیل عورتیں اپنے جنون کا شکار ہو کر اسے درندہ بنا دیں تو پھر درندوں کی تو ہلاکت بڑی ضروری چیز ہوتی ہے۔ درندوں کو ختم ہو جانا چاہیے۔ میں تم سے معافی نہیں مانگوں گا ناظمہ جلال! کیوں کہ تم خود ایک بدنما عورت ہو، لیکن افسوس میں تمہاری اس وحشت کو ختم کر رہا ہوں۔'' صوفی آگے بڑھا، اچانک خوف ناک وجود نے بڑی برق رفتاری سے صوفی کی طرف چھلانگ لگائی تھی اور اسے کمر سے پکڑ لیا تھا۔ ناظمہ جلال کے حلق سے ایک قہقہہ آزاد ہو گیا۔

''اونٹ کی نسل کے فرد تو جو کوئی بھی ہے میں نہیں جانتی، لیکن جو بھی میرے بچے کے مخالف ہوتا ہے میں اس کے خون کی پیاسی ہوتی ہوں۔ اب بچ۔ احمق یہ فولاد کا بنا ہوا ہے۔ اب تو اپنے آپ کو اس گرفت سے آزاد کرا کے دیکھ لے۔ میں تجھے انعام دوں گی۔ یہ وہ ہے جو لوہے کو اپنے ہاتھوں سے موڑ کر موم کی طرح رکھ دیتا ہے۔ اچانک ہی ناظمہ جلال کی آواز بند ہو گئی۔ خوف ناک وجود کے حلق سے ایک چیخ نکلی تھی اور وہ صوفی کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ نہ جانے صوفی نے کیا عمل کیا تھا؟ پھر وہ رابعہ سلطان کی طرف مڑا اور کہنے لگا۔

''یہ ایک افسوس ناک عمل ہو گا رابعہ، لیکن مجبوری ہے۔ یہ قول محترمہ ناظمہ جلال کے وہ اس کے لیے زندگی مہیا کرتی ہیں، لیکن اس کی زندگی دوسروں کے لیے موت کے مترادف ہے۔ موت کو آزادی تو نہیں دی جا سکتی۔ معافی چاہتا ہوں محترمہ! ناظمہ جلال، درویشوں کی دعاؤں سے۔ آپ صرف اپنے بچے کی زندگی کے لیے بہت سی زندگیاں نہیں چھین سکتیں۔ جو کچھ اب تک آپ کر چکی ہیں۔ کاش وہ بھی روکا جا سکتا، لیکن بے ضمیروں کی تعداد کم نہیں ہے۔ بے ضمیر صرف اپنے تھوڑے سے مفاد کے لیے نہ جانے کتنے لوگوں کو زندگی سے محروم کر دیتے ہیں۔ میں معافی چاہتا ہوں آپ سے محترمہ ناظمہ جلال! آپ کی زندگی کے سب سے بڑے مقصد کو ختم کر رہا ہوں۔ یہ جو بہ قول آپ کے اسٹیل مین ہے، بس اتنی ہی زندگی لے کر اس دنیا میں آیا تھا۔ آپ خود اس کی موت کا سبب بن گئیں۔ کوئی کیا کر سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر صوفی نے وہ ریوالور اٹھا لیا جو ناظمہ جلال کے ہاتھ سے گرا تھا اور اس وقت صوفی کے پیروں کے نزدیک ہی پڑا ہوا تھا۔ ناظمہ جلال کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''یہ...... یہ...... کیا بدتمیزی ہے؟ یہ کیا...... ارے او پاگل...... لیکن صوفی کی پستول سے نکلی ہوئی گولی اس جانور کی پیشانی پر پڑی تھی جو انسانوں جیسی شکل رکھتا تھا لیکن جانوروں سے بدتر تھا۔ ناظمہ جلال نے ایک وحشت ناک چیخ ماری اور اس عجیب الخلقت وجود کی جانب لپکی، لیکن صوفی کی پستول سے نکلی ہوئی دوسری گولی نے ناظمہ جلال کی گردن سے گزر کر اس عجیب الخلقت وجود کے سینے کو نشانہ بنایا تھا اور دوسری گولی عین اس کے دل کے مقام پر لگی تھی۔ جبکہ ناظمہ جلال ایک دم رک گئی تھی اور پھر وہ کسی ستون کی طرح ہی نیچے آ رہی تھی۔ اس کا خاتمہ ایک لمحے کے اندر ہو گیا تھا۔ ادھر وہ عجیب الخلقت وجود زمین پر تڑپ رہا تھا۔ اس کے حلق سے خرخراہٹیں نکل رہی تھیں اور وہ بھی چند ہی لمحوں میں زندگی کھونے والا تھا۔ رابعہ سلطان کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر صوفی کو دیکھ رہی تھی۔ ایک ایسا بے ضرر اور مرنجان مرنج شخص

جو بالکل کسی مٹی میں رینگتے ہوئے کینچوے کی مانند نظر آتا تھا۔ اس نے اتنی وحشت خیزی کے ساتھ دو انسانی زندگی ختم کر دی تھیں۔ رابعہ سلطان کو اس حد تک امید نہیں تھی، لیکن بہرحال اب اسے یاد آ رہا تھا کہ فرقان جلیل نے صوفی کے بارے میں بہت ہی پراعتماد لہجے میں کہا تھا کہ اگر وہ رابعہ سلطان کے لیے کام کرنے پر آمادہ ہو جائے تو سمجھو کہ مشکل حل ہو جائے گی۔ بڑے سنسنی خیز حالات و واقعات تھے۔ صوفی اچانک ہی اس کمرے میں بروقت نمودار ہوا تھا جہاں یہ سارا ڈرامہ ہو رہا تھا اور یہ ایک بہت بڑا سچ تھا کہ اگر صوفی اس وقت یہاں نہ آتا تو رابعہ سلطان بہت ہی مشکل حالات کا شکار ہو گئی ہوتی۔ یہ وحشی ماں بیٹے اس کے ساتھ جو سلوک کرتے اس کا تصور بھی انتہائی ہول ناک تھا۔ رابعہ سلطان ایک دم صوفی کی ممنون کرم ہو گئی تھی اور اس کے انداز میں تشکر پیدا ہو گیا تھا۔ صوفی اس کے قریب پہنچ کر بولا۔

''آیئے، یہاں سے نکل جانا بہت ضروری ہے۔ ہم بھیڑیوں کی کچھار میں ہیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے، مم...... میرا مطلب ہے کہ جگہ بڑی خطرناک ہے۔ باہر بہت سے لوگ موجود ہیں جو ان دونوں وحشی ماں بیٹوں کے مددگار ہوں گے۔ ہمیں فوراً نکل چلنا چاہیے۔ صوفی نے بے اختیار رابعہ سلطان کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر واش روم میں داخل ہو گیا۔

''ہمارا پہلا سفر جس جگہ سے شروع ہو گا وہ بڑی عجیب ہے لیکن مجبوری ہے۔'' رابعہ سلطان نے دیکھا کہ انتہائی حسین واش روم کی ایک کھڑکی غائب ہے اور اس سے بہ آسانی گزرا جا سکتا ہے۔ صوفی نے اس کھڑکی کے دوسری طرف پہنچ کر رابعہ سلطان سے کہا۔

''آ جایئے محترمہ! مطلع صاف ہے۔'' رابعہ سلطان کھڑکی کے ذریعے نیچے پہنچی۔ کھڑکی کے فریم کو اس نے کھڑکی سے لگا ہوا دیکھا تھا۔ کوئی چار گز کے فاصلے پر ایک گٹر کا ڈھکن کھلا ہوا تھا۔ صوفی نے کہا۔

''اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ کار نہیں ہے۔ ویسے یہ بھی ایک دلچسپ تجربہ ہے اور انسان کو ہر طرح کے حالات سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ کون جانے زندگی میں کب آپ کو پھر کسی ایسے گٹر میں سفر کرنے کا مسئلہ درپیش ہو۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔ آ جایئے۔'' رابعہ سلطان بادل نخواستہ اس گٹر میں اتر گئی تھی۔ صوفی نے اسے سہارا دے کر نیچے اتارا تھا۔ گٹر تو گٹر ہی ہوتا ہے، غلاظت سے بھرپور رابعہ سلطان اس قیمتی کمرے کے قالین کو پہلے بھی کالی کیچڑ سے بدنما دیکھ چکی تھی، جس کے واش روم سے صوفی اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے علاوہ واش روم میں خود اس کے پیروں کے کالے نشانات موجود تھے۔ اس کا دماغ بدبو سے پھٹا جا رہا تھا لیکن صوفی اس کے ہاتھ پکڑے آگے کا سفر کر رہا تھا جیسے ساری زندگی گٹر میں ہی گزاری ہو، البتہ فاصلہ اتنا زیادہ طے نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس عالی شان کوٹھی سے کوئی پچاس گز دور نکلنے کے بعد گٹر کا دوسرا ہول آتا تھا۔ یہاں کا ڈھکن بھی ہٹا ہوا تھا اور اس سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ پہلے صوفی نے گردن [illegible] دیکھا اور اس کے بعد رابعہ سلطان کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

''تشریف لایئے۔'' وہ اس طرح بولا جیسے اسے اپنے خوب صورت ڈرائنگ روم میں آنے کے لیے کہہ رہا ہو۔

♥......♥......♥

راجا ناصر دوبار اخبار کے دفتر پہنچا تھا اور دو ہی بار رابعہ سلطان کے گھر پھر بہ مشکل تمام اس نے رابعہ سلطان کو اخبار کے دفتر میں ہی جا پکڑا تھا۔ اس وقت وہ کہیں سے آئی تھی اور دفتر کی عمارت میں داخل ہونے والی تھی۔ راجا ناصر اسے نیچے ہی مل گیا اور رابعہ سلطان کے پاس جا کر بولا۔

"تمہیں میرے آنے کی اطلاع نہیں ملی، حالانکہ میں گھر پر بھی اپنا کارڈ پھینک کر آیا تھا اور دفتر میں ایڈیٹر صاحب سے بھی دو دفعہ درخواست کر کے گیا تھا کہ جیسے ہی تم آؤ۔ مجھے فون کر لو۔"

"دفتر میں تیسرے دن آئی ہوں۔ دو دن سے نہیں آ رہی تھی۔ گھر پر بھی نہیں تھی۔"

"تو کہاں مصروف تھیں۔"

"بس ایسے ہی، دماغی بحران کا شکار تھی۔"

"مجھے شبہ تھا اس بات کا۔" راجا ناصر نے گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"کس بات کا۔" رابعہ سلطان اجنبی بن کر بولی۔

"آؤ، دو دن سے دفتر نہیں آئیں تو دو گھنٹے کے لیے میرے ساتھ آ جاؤ۔ دو گھنٹے کے بعد دفتر چلی جانا۔"

"چلو۔" رابعہ سلطان نے کہا اور راجا ناصر کی کار میں بیٹھ کر چل پڑی۔ زیادہ فاصلہ نہیں طے کیا تھا۔ ایک چھوٹے سے خوب صورت ریستوران میں راجا ناصر اسے لے کر پہنچ گیا اور پھر ایک میز کے گرد دونوں بیٹھ گئے۔ راجا ناصر اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے نہیں بتاؤ گی رابعہ!"

"کیا۔" رابعہ سلطان نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"انہیں کس نے ہلاک کیا؟" اچانک رابعہ سلطان کے چہرے کے عضلات تن گئے۔ اسی دوران ویٹر آ گیا تھا۔ راجا ناصر نے اسے کافی اور اس کے ساتھ کچھ لوازمات لانے کے لیے کہا، لیکن رابعہ سلطان کے چہرے پر ایک کھچاوٹ سی پیدا ہو گئی تھی، جسے راجا ناصر نے بھی محسوس کر لیا۔

"پلیز رابعہ، مجھے غیر مت سمجھو، مجھے بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟"

"اگر کسی دماغی تکلیف میں مبتلا ہو تو مجھے تم سے ہمدردی ہے بلکہ یہ بھی مجھے بتاؤ کہ میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں اور اگر ایسی کوئی بات نہیں ہے تو پھر مجھے بتاؤ کہ کیا پوچھ رہے ہو؟"

"رابعہ پلیز، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ زندگی بھر اس مسئلے میں کسی کے سامنے زبان نہیں کھولوں گا۔ مجھے بتاؤ۔ ان ماں بیٹوں کو کس نے ہلاک کیا؟"

"گڈ۔" رابعہ نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر کہا۔

"یعنی تم کوئی جاسوسی ڈراما اسٹیج کر رہے ہو۔؟"

"تو مجھے نہیں بتاؤ گی تم اس بارے میں!"

"اگر تم نے اس کے بعد اس طرح کے احمقانہ الفاظ ادا کیے تو میں ایک لمحہ انتظار کیے بغیر یہاں سے اٹھ جاؤں گی۔"

"رابعہ! ناظمہ جلال اور اس کے بیٹے گل جلال کو کسی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ انہوں نے میرا

مطلب ہے ہلاک کرنے والوں نے دونوں ماں بیٹوں کو ناظمہ جلال ہی کے ریوالور سے ہلاک کیا ہے اور اس کے بعد واش روم کے راستے ایک گٹر کے ذریعے باہر نکل گئے ہیں۔"

"یہ ناظمہ جلال اور گل جلال کیا...... تمہارے خاندان کے افراد ہیں۔" رابعہ کے لہجے میں ایک تیکھا پن پیدا ہو گیا۔

"بتاتا ہوں میں تمہیں۔ گل جلال ایک بہت بڑے صنعت کار جلال الدین کا بیٹا تھا۔ بڑی منتوں مرادوں کے بعد ان کے ہاں اولاد پیدا ہوئی تھی۔ بے چارے جلال الدین صاحب تو زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکے، لیکن ناظمہ جلال اپنے بیٹے کی پرورش کر رہی تھی اور یہ بیٹا...... یہ بیٹا نارمل نہیں تھا۔ وہ جنسی جنون کا شکار تھا اور ناظمہ جلال اس کے لیے غریب گھرانوں کی لڑکیاں مہیا کرتی تھی۔ وہ انہیں دھوکے سے سی۔ بی۔ لمیٹڈ نامی ایک فرم میں بلاتی تھی۔ اس کے اہل کار ان لڑکیوں کا انٹرویو کرتے تھے اور یہ اندازہ لگا لیتے تھے کہ ان کا پس منظر کیا ہے۔ کوئی ان کے لیے لڑنے والا تو نہیں ہے اور جب انہیں اس بات کا یقین ہو جاتا تھا تو لڑکی گل جلال کی خلوت میں پہنچ جاتی تھی اور وہ وحشی درندہ اسے پامال کر دیتا تھا۔ اگر لڑکی نے احتجاج کیا تو اسے ہلاک کر دیا گیا اور اگر وہ خاموش رہی تو اسے معقول معاوضہ دے کر زبان بند رکھنے پر مجبور کر دیا جاتا تھا۔ وہ لڑکی دردانہ اسی وجہ سے قتل ہوئی اور اب صورت حال یہ ہے کہ کسی نے ان دونوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا، جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے تمہیں وہاں دیکھا گیا تھا۔ مطلب یہ کہ تم وہاں تک پہنچائی گئی تھیں۔" رابعہ سلطان کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو گیا۔ اس نے راجا ناصر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"خیر، میں نہ تو وہاں گئی نہ مجھے کسی ذریعے سے وہاں تک پہنچایا گیا، لیکن یہ جان کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم ناظمہ جلال دست راست تھے۔ ورنہ تمہیں اس حد تک تفصیل نہ معلوم ہوتی۔ جہاں تک ان دونوں کے قتل کے کا معاملہ ہے تو یہ تو ہونا ہی تھا۔ کوئی نہ کوئی دل والا یہ سب کچھ کر سکتا تھا، لیکن مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی ہے کہ تم جیسے بے غیرت لوگ بھی ایسے لوگوں کے آلہ کار ہوتے ہیں۔"

"رابعہ! دوست ہو تم میری، بڑا ربط و تعاون رہا ہے میرے اور تمہارے درمیان، لیکن جو کچھ تم کہہ رہی ہو، میں تم سے یہ سوال کر سکتا ہوں کہ کیا تم ہوش میں ہو؟"

"ہاں۔ میں ہوش میں ہوں راجا ناصر۔ اتنی تفصیل جانتے تھے تم اور تم نے اس سلسلے میں کوئی کارروائی نہیں کی، بلکہ مجھ سے بھی مسلسل جھوٹ بولتے رہے۔ وحدہٗ لاشریک کی قسم، میں نے انہیں قتل نہیں کیا، لیکن ان کے قتل سے مجھے جس قدر خوشی ہوئی ہے میں بتا نہیں سکتی اور تم، تمہارے ساتھ میں ایک لمحہ بیٹھنا بلکہ تمہاری طرف رخ کر کے تھوکنا پسند نہیں کرتی۔ تم جیسے بدکردار لوگوں سے جس قدر نفرت کی جائے کم ہے۔ جا رہی ہوں۔ تم پولیس آفیسر ہو۔ چیلنج کر کے جا رہی ہوں تم جب چاہو میرے خلاف کارروائی کر سکتے ہو۔ میں تمہیں اس طرح نیچا دکھاؤں گی کہ زندگی بھر یاد رکھو گے۔"

"رابعہ! میں اگر چاہوں تو یہیں اسی جگہ تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا سکتا ہوں۔"

"اگر تم نے مجھے یہاں ہتھکڑیاں لگا دیں تو میں تمہیں چیلنج کر رہی ہوں کہ تمہیں کتے کی موت مار دوں گی اور تمہاری لاش کسی کوڑے دان میں پڑی پائی جائے گی۔ مرد ہو، پولیس آفیسر ہو، جاؤ ایک معمولی سی

صحافی لڑکی کا چیلنج قبول کرو۔" رابعہ نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ کرسی گھسیٹ کر کھڑی ہوئی۔ ایک لمحے تک انتظار کرتی رہی۔ راجا ناصر سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا۔ رابعہ پاؤں پٹختے ہوئے ریستوران سے باہر نکل گئی۔ اسی وقت ویٹر راجا ناصر کی مطلوبہ اشیاء لے آیا تھا۔

♥......♥......♥

رابعہ سلطان اس گلی میں داخل ہوگئی جہاں صوفی کا مکان تھا۔ اس وقت بھی ممن خان کا ہوٹل کھلا ہوا تھا اور مستقل گاہک وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ دور سے ہی بے زار لکھنوی صاحب نے رابعہ سلطان کو دیکھا اور اُچھل کر اپنی جگہ سے کھڑے ہوگئے۔

"آ گئیں۔"

"کون؟" برابر بیٹھے ہوئے رحمت خاں نے پوچھا۔

"اماں...... وہ دیکھو سامنے خراماں خراماں...... معطر معطر۔"

"صوفی صاحب کے پاس آئی ہیں۔"

"میں جا کر ذرا اطلاع دے دوں۔ بے زار لکھنوی اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے تو رحمت خان نے ان کے کندھے پکڑ کر انہیں دبوچ لیا۔"

"اماں بے زار صاحب! چہ ہو گئے کیا؟ صوفی صاحب کے ہاتھ سے پٹو گے۔"

"کیوں...... کیوں...... کیوں۔"

"بیٹھو...... صوفی صاحب گھر میں موجود ہیں اس وقت۔ تم کیوں دوڑے جا رہے ہو؟"

"اماں کندھے تو چھوڑو۔ مہمان کا استقبال تو ہماری خاندانی روایات ہیں۔"

"اور بات نہ ماننے والے کی ہڈیاں توڑ دینا میری خاندانی روایت۔" رحمت خان نے کہا۔

"دیکھو...... اسے کہتے ہیں عورت۔ اچھی خاصی باتیں ہو رہی تھیں موجودہ سیاست پر کہ عورت بیچ میں آ گئی اور پھڈا شروع ہو گیا۔" رابعہ سلطان اس دوران صوفی کے گھر کے دروازے پر پہنچ گئی تھی۔ پراسرار نگاہوں سے اس نے ممن خاں کے ہوٹل کی طرف دیکھا تو بے زار لکھنوی جلدی سے بولے۔

"جی ہاں...... جی ہاں...... چلی جائیے اندر۔ موجود ہیں اندر۔" ایک بار پھر انہوں نے اس طرف دوڑ لگانے کی کوشش کی، لیکن رحمت خان پشاوری پٹھان تھا اور خاصا طاقت ور بھی، چنانچہ بے زار لکھنوی اٹھ نہ پائے اور رابعہ سلطان اندر داخل ہو گئی۔ صوفی سرخ رنگ کا ایک پنڈلیوں تک تہبند باندھے پان کی گلوری منہ میں دبائے گھر کی صفائی کر رہا تھا۔ رابعہ سلطان نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ تو صوفی اچھل پڑا۔ پھر رابعہ سلطان کو دیکھ کر اس نے جو چھلانگ لگائی تو چھ فٹ لمبی چارپائی عبور کر گیا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ رابعہ سلطان بے اختیار ہنس پڑی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد صوفی اندر سے برآمد ہوا تو اس نے کرتا پہنا ہوا تھا، البتہ سرخ رنگ کی لنگی جوں کی توں تھی۔

"مم...... معافی چاہتے ہیں درویشوں کے کرم سے۔"

"معاف کیا۔"

"امید نہیں تھی کہ کوئی اس طرح داخل ہو جائے گا۔"

"امید رکھنی چاہیے۔"

"غلطی ہو گئی۔"

"میرا آنا ناگوار تو نہیں گزرا۔"

"نہیں۔"

"بھلا مہمانوں کی آمد سے کوئی ناگواری محسوس کرتا ہے۔ تشریف رکھیے اس خانہ بے تکلف میں۔ آپ کی پذیرائی کے لیے یہاں اندر فرنیچر تو موجود نہیں ہے۔ جو کچھ ہے حاضر ہے۔" رابعہ نے ادھر ادھر دیکھا پھر بولی۔

"کچھ تبدیلی محسوس کر رہی ہوں۔"

"کیا۔"

"یہی کہ بے ترتیبی نظر نہیں آ رہی۔"

"آپ نے صفائی ہی ایسی کی ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ ابھی آہستہ آہستہ سب کچھ ہوگا۔ مم...... میرا مطلب ہے۔"

"میں نے کہہ دیا کہ یہ سب کچھ نہیں ہوگا۔" اسی وقت بے زار لکھنوی اندر داخل ہوئے۔ ہاتھوں میں چائے کی ٹرے اور اس پر بسکٹ وغیرہ کی پلیٹ سجی ہوئی تھی۔ صوفی نے گہری نگاہوں سے انہیں دیکھا تو بولے۔

"رکھیے اور جائیے۔"

"بیٹھنے کو نہ کہیں گے صوفی صاحب! آپ دیکھ رہے ہیں ٹرے میں تین پیالیاں رکھی ہوئی ہیں۔"

"بے زار صاحب جائیے ایک پیالی اٹھا کر لے جائیے۔" صوفی نے خالی پیالی اٹھائی اور بے زار صاحب کے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ پیالی اور پرچ بجاتے ہوئے بار بار ان دونوں کو گھورتے ہوئے باہر نکل گئے تھے۔

صوفی نے رابعہ سلطان کو دیکھا اور چائے ڈالنے کے لیے آگے بڑھا تو رابعہ سلطان جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں۔ یہ کام مجھے کرنے دیجیے۔ ٹھیک ہے آپ کے قریب آنے کی اجازت تو نہیں ہے، لیکن میری عقیدت تو آپ مجھ سے نہیں چھین سکتے۔"

"حق اللہ۔ حق اللہ۔" صوفی نے کہا۔

"صوفی صاحب۔ کیا آپ اپنے ذہن کو اور اپنی شخصیت کو وہ مستقل رنگ نہیں دے سکتے جو میں نے ناظمہ جلال کے گھر میں دیکھا تھا۔"

"بس۔ یوں سمجھیے کہ یہ وحشت کبھی کبھی ہی ابھرتی ہے۔"

"آہ! اس کیفیت کو آپ وحشت نہ کہیں۔ صوفی صاحب میں بہت متاثر ہوں آپ سے خیر چھوڑیئے۔ ایک الجھن پیش آ گئی ہے۔"

"ارشاد...... ارشاد۔"

’’یہ چائے لیجیے۔‘‘

’’شکریہ۔‘‘ صوفی نے چائے کی پیالی رابعہ سلطان کے ہاتھ سے لے لی اور بسکٹوں کی پلیٹ اس کی طرف بڑھا کر بولا۔

’’دیکھیے۔ نفاست، اقدار سب کچھ اپنا ایک مقام رکھتے ہیں، لیکن پاسبان عقل کو کبھی کبھی شخصیت سے دور رکھا جائے تو کوئی حرج نہیں ہوتا درویشوں کی دعاؤں سے۔ اس لیے یہ بسکٹ بھی نوش فرمائیے۔‘‘

’’میں نے منع کب کیا تھا؟‘‘ رابعہ نے مسکراتے ہوئے ایک بسکٹ ہاتھ میں اٹھالیا۔ صوفی خوش ہوگیا تھا اس نے خود بھی پلیٹ میں سے ایک بسکٹ اٹھایا اور اسے چائے میں ڈبو دیا۔

’’ارے...... ارے...... یہ کیا؟‘‘

’’کب...... کہاں......؟‘‘ صوفی نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ اس دوران بھیگا ہوا بسکٹ ٹوٹ کر چائے میں گر پڑا تھا۔

رابعہ بے اختیار ہنس پڑی۔

’’اب کیا کریں گے؟‘‘

’’نیچے بیٹھ جائے گا۔ آخر میں کھایا جاسکتا ہے۔ یہ بے وقوف چمچہ کبھی ساتھ نہیں لاتا۔‘‘ صوفی نے جواب دیا اور چائے کا ایک سِپ لیا۔ رابعہ بری طرح ہنس رہی تھی۔

’’خدا کی قسم، بڑے کمال کے آدمی ہیں آپ، لیکن اب مجھے بھی یہ لگتا ہے کہ یہی سب کچھ زندگی کا ایک حصہ ہے۔‘‘

’’درویشوں کی دعاؤں سے۔‘‘ صوفی نے جواب دیا۔ پھر بولا۔

’’آپ کچھ بتانے جارہی تھیں۔‘‘

’’ہاں۔‘‘ کچھ مسائل ہیں۔ مجھے بڑی زبردست دھمکی ملی ہے اور اس سلسلے میں مجھے آپ کی ضرورت ہے۔‘‘

’’درویش رحم کریں۔‘‘ صوفی نے کہا اور سُڑپ سُڑپ کرکے چائے پینے لگا۔

پتا نہیں رابعہ سلطان پر کیا جنون سوار ہوا تھا۔ بہ ذات خود وہ اچھی خاصی لڑکی تھی۔ خوش شکل، خوش مزاج، تعلیم یافتہ، ہر لحاظ سے ایک موزوں شخصیت کی مالک اور اس کے مدمقابل صوفی تھا۔ ویسے تو از راہ مذاق بہت سی باتیں کرلی جاتی ہیں، لیکن صوفی کے بارے میں اگر یہ کہا جائے تو وہ غلط نہیں ہوگا کہ وہ ماضی کا اونٹ اور حال کا صوفی تھا۔ ساری حرکتیں عجیب وغریب دنیا سے بے گانہ، لیکن رابعہ سلطان اس پر مرمٹی تھی۔ صوفی کی طرف سے ایک بار بھی پذیرائی نہیں ہوئی تھی، لیکن وہ بار بار صوفی تک پہنچ جاتی تھی۔ یہ بات ابھی تک اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں ہوئی تھی کہ اس نے صوفی کے دل میں بھی کوئی کونپل کھلائی ہے یا نہیں بہر حال وہ اپنا کام کررہی تھی۔ راجا ناصر سے جس طرح جھگڑا ہوا تھا وہ بہت زیادہ تھا۔ رابعہ کے اپنے اتنے اختیارات نہیں تھے کہ وہ راجا ناصر سے لڑسکتی، لیکن طبیعت میں تیزی اور تندی تھی۔ راجا ناصر کو چیلنج کر آئی تھی خوف زدہ وہ اب بھی نہیں تھی لیکن بہر حال صوفی تک پہنچ گئی تھی۔

’’آپ نے صوفی صاحب بڑے صبر وسکون سے یہ سن لیا کہ مجھے بڑی زبردست دھمکی ملی ہے۔ نہیں پوچھا آپ نے کہ دھمکی دینے والا کون ہے اور آپ اس کے خلاف کیا کریں گے یہ کہہ کر رابعہ سلطان نے صوفی کے چہرے پر نظریں جمادیں، لیکن اس چہرے پر کوئی تغیر نظر آجاتا تو نام پھر صوفی نہ ہوتا۔ صوفی نے چائے کی پیالی میں بچی ہوئی چائے کو دائرے کی شکل میں ہلایا اور تہ میں پڑا ہوا بسکٹ جواب آٹے کی شکل اختیار کرچکا تھا۔ باریک پتی کے ساتھ شامل ہوکر چائے میں ابھر آیا۔ صوفی نے اسے حلق میں انڈیل لیا اور ہونٹ صاف کرکے پیالی نیچے رکھ دی۔ رابعہ سلطان نے ایک بار پھر پیالی میں جھانکا اور ہنس پڑی۔

’’غائب۔‘‘

’’درویشوں کی دعاؤں سے۔‘‘

’’توبہ توبہ درویش بھی پریشان ہوگئے ہوں گے آپ سے تو۔‘‘

’’نہیں ابھی آپ نے صبر وسکون کی بات کہی تھی ہمارا صبر ہی سکون دیتا ہے۔ بڑی اچھی بات کی۔ ویسے دھمکی کس نے دی ہے آپ کو؟‘‘

’’صوفی صاحب میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ راجا ناصر کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اپنے آپ کو پولیس ڈپارٹمنٹ میں سب سے زیادہ تیز طرار سمجھتا ہے۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ میرا اس سے تعلق صرف اتنا ہی ہے جتنا ایک صحافی کا پولیس آفیسر سے ہوسکتا ہے۔ تھوڑا سا بے تکلف ہوگیا ہے مجھ سے جذباتی ہوا تھا اور لڑکی کے سلسلے میں تھوڑی بہت مدد کی تھی اس نے، لیکن صوفی صاحب یہ کم بخت کاغذ کے ٹکڑے یا اس سے متعلق دوسری چیزیں انسان کو انسانیت سے کتنا دور لے گئے ہیں۔ وہ پتا نہیں کس دباؤ میں ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ان دونوں ماں بیٹوں کے قتل کے بعد بھی کوئی ایسی شخصیت ہے جو اسے اس بات پر اکسا رہی ہے کہ ان کے قاتلوں کا پتا چلائے۔ سیدھی سیدھی بات کہ اسے کوئی آفر کی گئی ہوگی۔‘‘

’’آپ سے کیا بات ہوئی۔‘‘ صوفی نے سوال کیا۔

’’بس وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ گل جلال اور اس کی ماں ناظمہ جلال کو قتل کس نے کیا اور اس نے سیدھا سیدھا یہ الزام لگایا کہ مجھے وہاں پہنچایا گیا اور میں نے اگر ان دونوں کو قتل نہیں کیا تو بہر حال قاتلوں سے واقف ہوں۔ مجھے یہ دھمکی دے رہا تھا کہ میں اسے قاتل کا نام بتادوں۔ بس میں بھی ذرا جذباتی ہوگئی۔‘‘

’’حق اللہ، آپ نے کس قسم کے جذبات کا مظاہرہ کیا۔‘‘ صوفی نے سوال کیا۔

’’بس جب اس نے مجھ سے کہا کہ اگر میں چاہوں تو اسی جگہ تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا سکتا ہوں تو میں نے اس سے کہہ دیا کہ میں اسے کتے کی موت ماروں گی اور اس کی لاش کسی کوڑے دان میں پڑی پائی جائے گی۔

’’درویش رحم کریں۔ پھر اب۔‘‘

’’نہیں کچھ نہیں...... بات آپ کے کانوں تک لے آئی ہوں۔ آپ اس وقت متحرک ہوتے ہیں جب پانی سر سے اونچا ہوجاتا ہے۔ خیر اطلاع دے دی ہے آپ کو اگر کہیں کچھ ہوجائے تو ذرا راجا ناصر کو ٹٹول

لیجیے گا۔'' رابعہ پھر جذباتی ہوگئی۔

''ارے نہیں...... نہیں...... کچھ نہیں ہوگا آپ کو، وہ قانون کا رکھوالا ہے قانون کے خلاف تو کچھ نہیں کر پائے گا۔'' رابعہ کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی، کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔

''صوفی صاحب بات کچھ بھی نہیں ہے۔ زندگی ایسے الٹ پھیر سے دو چار ہوئی ہے کہ ہم درد کا تصور کھو بیٹھی ہوں، بے چاری دردانہ یاد آتی ہے۔ گھر سے باہر نکلی تھی اپنے گھر کے حالات سدھارنے کے لیے شکار ہوگئی۔ میرا خیال ہے ہر لڑکی تھوڑی بہت دردانہ ہوتی ہے۔ میں بھی اپنے آپ کو ان ہی میں شمار کرتی ہوں۔ آپ سے نہ ہم دردی کی بھیک مانگ رہی ہوں اور نہ یہ چاہتی ہوں کہ آپ میرے لیے سرگرداں ہوں، بس کم بخت عقل کبھی کبھی ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ سوری آپ میرے لیے فکر مند نہ ہوں۔'' رابعہ سلطان خود بھی کافی جذباتی لڑکی تھی۔ کچھ اس طرح جذبات میں ڈوبی کہ کچھ دیر پہلے کا خوش گوار موڈ ختم ہوگیا اور اس نے انتظار نہیں کیا تھا اور صوفی کے دروازے سے باہر نکل گئی۔ صوفی منہ کھول کر رہ گیا تھا۔ دل چاہا کہ رابعہ کو آواز دے کر روک لے، لیکن یہی اس کی خوبی تھی کہ کبھی دل کی باتوں میں نہیں آتا تھا، البتہ جب پان کی گلوری منہ میں منتقل ہوگئی تو زعفران کی خوشبو دماغ کو معطر کرنے لگی۔ چھالی اور تمباکو منہ میں حل ہونے لگے تو دماغ کی ساری رگیں کھل گئیں۔ راجا ناصر، اس کے ذہن نے آواز لگائی اور اس کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اس وقت شیروانی نہیں پہنی تھی بلکہ پتلون اور قمیص استعمال کی تھی اور پھر تاریخی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر چل پڑا۔ راجا ناصر سے ملاقات ہو چکی تھی۔ تھانے کی عمارت میں داخل ہوا تو پتا چلا کہ راجا ناصر اندر موجود ہے۔

موٹر سائیکل کھڑی کر کے اندر چلا گیا۔ راجا ناصر نے ایک لمحے تک اسے پہچاننے کی کوشش کی اور پھر اس کے منہ سے طنزیہ آواز نکلی۔

''آخاہ...... غالباً صوفی صاحب کہلاتے ہیں آپ۔''

''درویشوں کی دعاؤں سے۔ صوفی نے تھانے کے احاطے میں منہ کی غلاظت اگل دی تھی اس لیے منہ ابھی صاف تھا۔'' آیئے تشریف رکھیے۔ فرمایئے کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

''آپ سے اپنا تعارف کروانا چاہتے ہیں۔ درویشوں کے کرم سے۔''

''تعارف۔''

''ہاں۔''

''میرا خیال ہے ہمارا تعارف ہے۔''

''یہ بات آپ کو معلوم نہیں کہ ماضی میں ہم بھی انسپکٹر کے عہدے پر رہ چکے ہیں۔''

''معلوم ہے...... معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کی تنزلی ہوتی رہی تھی۔ نااہلیت کی بنیاد پر اور آخر کار آپ کو محکمہ پولیس سے نکال دیا گیا۔''

''آداب...... آداب......'' صوفی نے جھک کر کہا۔

''خیر مسخرہ پن نہ کریں۔ آپ ماضی کے انسپکٹر تھے، حال میں آپ کچھ بھی نہیں۔ یہاں کیسے آنا ہوا۔''

''وہ جناب عالی! دست بستہ گزارش ہے کہ رابعہ سلطان ہمارے پاس آئی تھیں۔ انہوں نے کچھ

گزارشات کی ہیں۔''

''ایک بات بتایئے صوفی صاحب! رابعہ سلطان سے آپ کا کیا تعلق ہوگیا۔ مطلب یہ کہ معاف کیجیے گا کہ اس قابل تو آپ ہیں نہیں کہ کوئی لڑکی آپ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے۔''

''درویشوں کی دعا ہے۔'' صوفی نے مستانہ وار کہا۔

''یہ بھی درویشوں کی دعا ہے۔''

''درویشوں کی شان میں گستاخی نہ فرمایئے گا۔ اصل میں بات یہ ہے کہ اس کائنات کے دو نظام چل رہے ہیں۔ ایک وہ جو سرکاری اہل کاروں اور وزارتوں پر مشتمل ہے اور ایک وہ جو روحانیت کا نظام ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں راجا ناصر صاحب! ہر شہر، ہر قریے، ہر علاقے میں بزرگوں کا ایک نظام موجود ہے۔ دنیا کے بارے میں کچھ فیصلے ہوتے ہیں۔ قطب ابدال ہیں مجذوب درویش ہیں ولی ہیں۔ ہماری گزارش ہے کہ انہیں نہ چھیڑیے گا، کیونکہ اس کے بعد دنیاوی سازشیں تو زندگی بچا لیتی ہیں لیکن روحانیت کے خلاف کوئی سازش کامیاب نہیں ہو سکتی۔''

''آپ یہی بتانے آئے تھے میرے پاس۔ یہ تھانہ ہے جناب! اور یہاں ہماری بادشاہت ہوتی ہے۔ بس آپ یہ سمجھیں کہ ہم اس تھانے کے ابدال ہیں۔''

''توبہ فرمایئے...... توبہ گستاخی فرما رہے ہیں آپ، درویشوں کی دعاؤں سے۔'' راجا ناصر بے اختیار ہنس پڑا۔

''جب گستاخی بھی ہم درویشوں کی دعاؤں سے فرما رہے ہیں تو آپ کو کیا تکلیف ہے۔ اچھا چھوڑیے آپ ان باتوں کو، ہاں۔ رابعہ سلطان کے بارے میں آپ کچھ کہہ رہے تھے۔''

''کچھ دھمکیاں وغیرہ ہوئی ہیں آپ دونوں کے درمیان۔''

''اوہو...... اوہو...... اوہو...... اب راجا ناصر کی بھنویں سکڑ گئیں۔ وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر سوچ میں ڈوبا رہا پھر بولا۔

''تو پھر آپ کو بھی شامل تفتیش کیا جائے گا۔ اچھا ایک بات بتایئے یہ ناظمہ جلال کا کیا قصہ ہے؟'' اور......

''میرا مطلب ہے کہ کیا آپ نے ان دونوں ماں بیٹوں کے قتل کے سلسلے میں رابعہ سلطان کی معاونت کی ہے۔ ویسے رابعہ سلطان مجھے جو دھمکیاں دے کر گئی ہے اس لیے میں کہنے پر مجبور ہوگیا ہوں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ صوفی صاحب آپ تو خود پولیس والے رہ چکے ہیں جن لوگوں پر ہمیں شبہ ہوجاتا ہے ان کے لیے کوشش تو یہ کرتے ہیں کہ انہیں ثبوتوں کی بنیاد پر پکڑیں، لیکن بعض جگہ ایسا ہوتا ہے کہ انہیں پکڑنے کے بعد ثبوت حاصل کیے جاتے ہیں۔ میں بہت جلد رابعہ سلطان پر ہاتھ ڈال دوں گا۔ ذرا اس کے ہم دردوں کی تلاش میں ہوں تاکہ انہیں بھی ساتھ ہی ساتھ ملوث کروں۔ ان میں ایک آپ بھی ہو سکتے ہیں۔ ذرا پتا لکھوایئے اپنا۔'' صوفی صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے کہا۔

''لکھ لیجیے گا ٹیلی فون نمبر بھی لکھ لیجیے گا۔''

''ہاں۔ ہاں۔ بالکل......''

"یہ اچھا ہوا کہ آپ نے خود ہمیں چھیڑ دیا اور اب ہم چھڑ گئے درویشوں کے کرم سے، اب ہمارے اور آپ کے درمیان اچھی خاصی چھیڑ خانی چلے گی۔"

"یہ بھی ہوسکتا ہے صوفی صاحب کہ میں آپ کو یہیں بند کردوں لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کو وہ ہوگا۔ ایسا کریں کہ آپ رابعہ سلطان سے میرے بارے میں تذکرہ کر کے یہ کہہ دیں کہ خود میرے پاس آجائے اور ساری حقیقتیں اگل دے، ورنہ صوفی صاحب میں آپ کو اس پتے سے اٹھالوں گا اور سیدھی سی بات ہے کہ تھانوں میں جس طرح سے مہمانوں کی پذیرائی ہوتی ہے اسی طرح آپ کی پذیرائی کر کے آپ سے حقیقت معلوم کرلی جائے گی۔ جایئے۔ بس اس کے بعد اٹھ جایئے، بجائے اس کے کہ میں ابھی کانسٹیبلوں کو بلوا کر تمہیں ابھی بند کردوں دفعہ ہوجاؤ یہاں سے، اٹھو۔" راجا ناصر نے سامنے رکھا ہوا رولر اٹھایا اور میز پر زور سے مارا۔ صوفی اپنی جگہ کھڑا ہوگیا تھا۔ اس نے راجا ناصر پر ایک محبت بھری نگاہ ڈالی اور اس کے منہ سے نکلا......

"درویش رحم کریں۔" پھر وہ واپسی کے لیے مڑ گیا تھا۔

♥......♥......♥

راجا ناصر اس کے جانے کے بعد تھوڑی دیر تک غصے سے کھولتا رہا، پھر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں شیطان ناچ رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے صوفی سے ایک نفرت کا احساس ہو رہا تھا اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ رابعہ سے انتقام لے۔ گہرائیاں تاریک تھیں۔ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ دل میں یہ جذبہ کیوں پیدا ہوگیا ہے۔ بہرحال اسی شام پانچ بجے کے قریب وہ رابعہ سے ملا۔ رابعہ آفس سے نکل رہی تھی۔ اس نے اپنی جیپ رابعہ کے سامنے روک لی اور مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہیلو رابعہ۔"

"ہیلو۔ پولیس والے بھی اب لچے لفنگوں کی طرح لڑکیوں کا راستہ روکنے لگے ہیں۔"

"رابعہ میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی۔ ٹھیک ہے ہم لوگوں کے درمیان کوئی اور ربط اور رشتہ نہیں ہے، لیکن ہم لڑتے کیوں رہتے ہیں۔ آؤ چائے پینے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔"

"نہیں مسٹر راجا ناصر، اب میرے اور آپ کے درمیان یہ تعلق نہیں رہا کہ ہم دونوں ایک ہی میز پر بیٹھ کر چائے پئیں۔"

"نہ سہی، لیکن تمہیں اپنی رپورٹنگ کے لیے میری ضرورت نہیں پیش آئے گی۔"

"کارڈ پیش کروں گی اور اصولوں کی بنیاد پر آپ کو مجبور کروں گی اور اگر آپ نے میری مدد نہ کی تو پھر میرا اخبار آپ کے خلاف لکھے گا۔"

"بابا آؤ تو سہی، چلو تھانے ہی چلو۔ روزنامچے میں کئی نئی خبریں درج ہیں۔ آجاؤ۔"

"آپ چلیے۔ میں آرہی ہوں۔" رابعہ سلطان نے کہا اور راجا ناصر اسے گھورنے لگا۔ پھر بولا۔

"ٹھیک ہے، میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" وہ تھانے پہنچ گیا۔ رابعہ کو بہرحال وہاں پہنچنے میں بہت دیر لگی تھی۔ راجا ناصر اندر ہی اندر سلگ رہا تھا مگر اس نے رابعہ کے استقبال میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور آپ میری چائے نہیں پئیں گی۔"

"شکریہ راجا ناصر۔"

"یہ اور بتا دیجیے اور کتنے دن تک آپ ایسا کریں گی، کیونکہ لڑائی تو ہمارے درمیان ہوتی ہی رہتی ہے۔ پھر کوئی واقعہ صلح کرا دیتا ہے۔"

"نہ لڑائی ہے نہ صلح، آپ نے کچھ بدتمیزیاں کی تھیں۔ میں نے ان کا جواب دے دیا آپ کو اب بھی میں کہے دیتی ہوں کہ آپ کا تھانہ ہے نا یہ مجھے لاک اپ میں ڈال کر دکھا دیجیے۔"

"توبہ...... توبہ...... توبہ، کس دل سے آپ کو لاک اپ میں ڈالوں گا محترمہ رابعہ سلطان۔" راجا ناصر نے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ پھر بولا۔

"اب تنہا بھی چائے نہیں پی سکتا حالانکہ بڑا دل چاہ رہا ہے۔ اچھا چلیں چھوڑیے۔ او! شہزاد علی وہ ذرا روزنامچے میں سے کچھ خبریں رابعہ سلطان کو دے دیجیے۔ وہ جو اسمگلروں کی آپس کی جنگ کے بارے میں خبریں ہیں۔ رابعہ آپ ایسا کریں کہ جب آپ یہاں سے جائیں تو شہزاد علی سے یہ خبریں لیتی جائیں۔ اچھی خبریں ہیں۔"

"بہت بہت شکریہ اس تعاون کا۔"

"اور کوئی خدمت میرے لیے۔"

"خدمت نہیں کچھ سوالات ذہن میں مچل رہے ہیں۔ وہ جو اپنے صوفی صاحب ہیں، کیا تم نے ان سے شکایت کی ہے میری۔"

"صوفی صاحب دوست ہیں میرے، مددگار ہیں۔ انہوں نے بہت سے معاملات میں میری مدد کی ہے بات تو بتانی ہی پڑتی ہے ناں۔"

"گویا وہ ہم سے زیادہ صاحب اقتدار ہیں۔" راجا ناصر نے کہا۔ پھر بولا۔

"ٹھیک ہے ہر انسان کے اپنے ذاتی معاملات ہوتے ہیں مگر ایک سوال رابعہ میرے ذہن میں بار بار گردش کرنے لگتا ہے۔ ظاہر تم یہ نہیں کہو گی کہ پوچھیے کیا سوال ہے؟ لیکن میں خود ہی بتائے دیتا ہوں۔ کیا کسی بھی لحاظ سے یہ شخص تمہارے قابل ہے؟"

"آپ یہ سوال کیوں کر رہے ہیں؟"

"نہیں رابعہ بات دراصل یہ ہے کہ ساری باتیں اپنی جگہ تمہاری طبیعت میں نفاست بھی ہے۔ ذہانت بھی ہے، سب کچھ ہے اور پتا نہیں کیوں عام پریس رپورٹر سے ہٹ کر میں تمہارے لیے اپنے دل میں ایک جگہ سی محسوس کرتا ہوں۔ اچھے اور صاف ستھرے لوگ شگفتہ طبیعتوں کے مالک بہرحال اہمیت تو رکھتے ہیں تم ان میں سے ایک ہو اور میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔ بے پناہ عزت۔ پھر صوفی میں تمہیں کیا نظر آیا۔ انتہائی گندہ، گھٹیا اور لغو آدمی آیا تھا میرے پاس، تمہارے ہی سلسلے میں۔ میں نے برا بھلا کہہ کر بھگا دیا ہے اور یہ کہہ دیا ہے کہ آئندہ وہ میری طرف کا رخ نہ کرے ورنہ نقصان اٹھائے گا۔"

"ویری گڈ...... کمال کر دیا راجا ناصر آپ نے واقعی کمال کر دیا۔ اتنے بڑے آدمی کو دھتکار دینا کسی عام آدمی کا کام نہیں ہے۔"

''بڑا آدمی۔'' راجا ناصر نے حقارت سے کہا۔

''اوں...... ہوں...... اب یہ الگ بات ہے کہ بڑے چھوٹے کی پہچان ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہوتی۔'' رابعہ طنزیہ انداز میں مسکرا کے بولی۔

''خیر ہمیں ایک دوسرے پر طنز نہیں کرنا چاہیے۔ ہم اچھے دوست رہ چکے ہیں افسوس تو مجھے یہ ہے کہ ہماری دوستی میں ایک شخص نے رخنہ اندازی کر دی ہے۔''

''میں واقعی حیران ہوں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے تم اس کے مقابلے میں شدید احساس کمتری کا شکار ہو۔''

''برا نہیں مانوں گا تمہاری باتوں کا، جو دل میں آئے کہتی رہو۔ لیکن میں تمہیں ایک بات بتاؤں، میرا اصل مسئلہ جو ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے ناظمہ جلال اور اس کے بیٹوں کے قاتلوں کا پتا چل جائے۔''

''بڑے وفادار ہو تم ان کے۔ خیر ہوتا ہے انسان اور کتے میں تھوڑا ہی سا فرق ہوتا ہے۔''

راجا ناصر رابعہ سلطان کے ان الفاظ پر تلملا گیا لیکن اس نے برداشت کیا، البتہ اس کی آنکھوں کی شیطانی چمک رابعہ سلطان نہیں دیکھ سکی تھی۔ اس نے کہا۔

''ساڑھے سات بجے بلکہ آٹھ بجے میں اپنے آخری مشن پر نکلوں گا اور اس آخری مشن سے میں ناظمہ جلال کے قاتلوں کا پتا لگا لوں گا اور اس کے بعد محترمہ رابعہ سلطان میرا فرض ہوگا کہ میں ان قاتلوں کو منظر عام پر پیش کروں۔ ہاں آپ سے سودے بازی کی جا سکتی ہے۔''

''مجھ سے۔''

''ارے ارے کیا بے ہودہ الفاظ نکل گئے میری زبان سے۔ چمڑے کی زبان ہے پھسل ہی جاتی ہے۔ مجھے کتنی بے چینی سے رات کے آٹھ بجنے کا انتظار ہے۔ آپ نہیں جانتیں۔''

''نہ میں جاننا چاہتی ہوں۔'' رابعہ سلطان نے کہا۔ پھر بولی۔

''میرے لائق اور کوئی خدمت۔''

''ابھی نہیں جب آپ کے لائق خدمت کا موقع آئے گا تو محترمہ ہم آپ سے وہ خدمت بھی لے ہی لیں گے۔ اچھا ٹھیک ہے تو آپ جانا چاہتی ہیں شاید۔''

''ہاں۔''

''شہزاد علی سے خبریں لیتی جائیے۔''

''شکریہ۔'' رابعہ سلطان نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

❤......❤......❤

بڑا تجسس تھا اس کے ذہن میں۔ رات کو آٹھ بجے راجا ناصر آخر کیا کرنے جا رہا ہے، پتا تو چلے۔ پتا چلنا چاہیے اور اس کے لیے اس نے اپنا منصوبہ مکمل کر لیا۔ راجا ناصر کے بارے میں اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے تھانے ہی میں ہے جہاں سے اسے راجا ناصر پر نگاہ رکھنی تھی۔ ٹھیک آٹھ بج کر دس منٹ پر راجا ناصر تھانے کی عمارت سے باہر نکلا۔ اس نے اپنی جیپ اسٹارٹ کی۔ رابعہ سلطان نے اس موقع کے لیے رینٹ
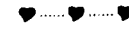
اے کار سے ایک گاڑی حاصل کر لی تھی اور اسے خود ڈرائیو کر رہی تھی۔ چنانچہ جیسے ہی راجا ناصر تھانے کی عمارت سے باہر نکل کر چلا رابعہ سلطان نے اپنی گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔ راجا ناصر مختلف راستوں سے ہوتا ہوا آخر کار سائٹ ایریا پہنچ گیا۔ رابعہ سلطان کو شدید تجسس تھا۔ کون سا ایسا ذریعہ اسے حاصل ہوا ہے جس سے وہ ناظمہ جلال اور اس کے بیٹے کے قتل کا سراغ لگانا چاہتا ہے۔ کیا واقعی اسے کوئی ایسی چیز حاصل ہوگئی ہے۔ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ راجا ناصر کا تعاقب کرتی رہی۔ سائٹ ایریا سے آگے بڑھ کر راجا ناصر شیر شاہ کے علاقے میں پہنچا پھر گل بائی اور اس کے بعد وہ ہاکس بے روڈ پر چل پڑا۔

رابعہ سلطان انتہائی مہارت کے ساتھ اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ آخر کار سمندروں کی بستی ہاکس بے سامنے آ گئی اور تھوڑی دیر کے بعد راجا ناصر نے اپنی جیپ ایک خوب صورت ہٹ کے عقبی حصے میں روک دی۔ تاحد نگاہ سنسان نظر آ رہی تھیں۔ ان سے کافی فاصلے پر سمندر اپنی پرسکون آوازیں نشر کر رہا تھا۔ لہروں کی سفیدی ایک پراسرار منظر پیش کر رہی تھی۔ تاحد نگاہ پانی نظر آ رہا تھا اور اس کے پیش منظر میں راجا ناصر اپنی جیپ کے پاس کھڑا ہوا تھا۔

رابعہ سلطان نے ہٹ کے عقب میں اپنی گاڑی روکی اور پھرتی سے نیچے اتر آئی۔ راجا ناصر نے جیپ کے ڈیش بورڈ سے ایک ٹارچ نکالی جس کا شیشہ گرین کلر کا تھا۔ اس ٹارچ کا رخ زمین کی طرف کر کے تین مرتبہ ہلایا اور اس کے بعد اسے واپس جیپ میں رکھا۔ پھر شاید اس نے ہٹ کا دروازہ کھولا تھا اور اندر داخل ہو گیا تھا۔ رابعہ سلطان کو اس کی یہ تمام حرکات انتہائی پراسرار لگ رہی تھیں۔ وہ چند لمحے سانس روکے کھڑی رہی اور اس کے بعد اس نے برق رفتاری سے آگے کا سفر شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ہٹ کے عقبی حصے میں پہنچ گئی۔ ہٹ کے اندر روشنی نظر آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی جنریٹر چلنے کی آواز ابھر رہی تھی۔ گویا راجا ناصر نے یہاں جنریٹر آن کر دیا تھا۔ رابعہ سلطان کھڑکی کا رخنہ تلاش کرنے لگی جہاں سے وہ اندر کا منظر دیکھ سکے لیکن ہٹ کی تمام کھڑکیاں مضبوطی کے ساتھ بند تھیں اور پراسرار سناٹے میں رابعہ سلطان نہیں چاہتی تھی کہ کوئی آہٹ ہو۔

آخر کار وہ ہٹ کے دروازے پر آ گئی۔ تین مرتبہ ٹارچ روشن کرنے کا مطلب یہ تھا کہ راجا ناصر نے کسی کو اپنی یہاں آمد کی اطلاع دی ہے اس لیے وہ فوراً ہی اندر داخل نہیں ہوئی۔ ہاں کچھ دیر کے بعد جب اور کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تو وہ آگے بڑھی اور ہٹ کے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ ایک چھوٹا سا کوریڈور اور اس کے بعد وسیع و عریض کمرہ برابر میں دو بیڈ روم، کچن وغیرہ۔ ایک وسیع و عرض کمرے میں راجا ناصر ایک کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ دفعتاً اس کی آواز ابھری۔

''آ جاؤ...... اندر آ جاؤ...... میں تم سے مخاطب ہوں رابعہ سلطان۔ اندر آ جاؤ۔'' رابعہ کے پورے بدن نے ایک دم پسینہ چھوڑ دیا۔ راجا ناصر کو اس کی آمد کی خبر ہے۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ پلٹ کر واپس بھاگ جائے لیکن یہ بڑی بزدلی تھی چنانچہ اس نے ہمت کی اور اندر داخل ہو گئی۔ راجا ناصر بڑے سکون کے ساتھ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

''آؤ رابعہ۔ بہت دیر لگا دی اندر آنے میں۔ میں تو شروع ہی سے تمہاری آمد سے واقف تھا۔ خیر

کہو کیسے مزاج ہیں۔"

"تمہارا تعاقب کر رہی تھی۔ دیکھنا چاہتی تھی کہ تم قاتلوں کا سراغ کیسے لگا رہے ہو؟"

"قاتلوں کا سراغ...... مجھے کیا پڑی ہے۔ رابعہ سلطان۔ مرنے والے مر گئے مجھے کوئی معاوضہ تو نہیں ملا۔ میرے ذہن میں تو صرف ایک تجسس تھا جسے میں رفع کرنا چاہتا تھا اور پھر تم نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔ چیلنج کیا تھا مجھے۔ راجا ناصر کو۔ رابعہ بات یہ نہیں ہے، میں ایک پولیس والا ضرور ہوں، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک غیور مرد بھی ہوں اور مردوں کی مردانگی کو چیلنج نہیں کرنا چاہیے۔ افسوس میرا یہ پیغام تم دوسری عورتوں کو نہیں دے سکتیں۔ لیکن کاش کوئی تمہیں یہ بتا دیتا کہ دنیا کا ہر کام کرو لیکن کبھی کسی مرد کو اس طرح چیلنج نہ کرو، ہیں۔ نقصان اٹھالیا نا تم نے رابعہ! بہرحال انسان غلطی کرتا ہے، اس کی سزا پاتا ہے۔ تم اس اونٹ کے بچے پر انحصار کرنے لگی تھیں جو کچھ بھی نہیں ہے۔ بے اوقات سا شخص جو کسی قابل نہیں ہے اور تم اس پر بھروسا کر رہی تھیں۔ میرا نام راجا ناصر ہے۔ ذاتی طور پر مختلف مزاج کا انسان ہوں اور شاید یہی مزاج مجھے پولیس کی نوکری میں لے آیا ہے غلطی کی تم نے اب غلطی کی سزا بھگتو۔ کیا سمجھیں؟"

"بکواس کر رہے ہو تم۔ عادی ہو تم بکواس کرنے کے۔"

"ہاں یہی سمجھ لو۔ بہرحال مجھے افسوس ہے رابعہ بہت اچھی دوست تھیں تم میری۔ میرے مزاج کو تم جانتی ہو۔ دردانہ مجھ سے زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ لیکن اس کا قتل ہو جانا ضروری تھا۔ کیوں کہ اس طرح وہ ناظمہ جلال کی رسوائی کا باعث بنتی۔ اب تم دیکھو نا ہر شخص اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ کچھ لوگ صرف دوسروں کے کام آنے کے لیے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جن کے کام دوسرے آتے ہیں۔ دردانہ کا یہی مصرف تھا لیکن تم لوگ جذباتی ہو گئے۔ تم نے ناظمہ جلال کو قتل کر دیا۔ خیر ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ جو ہونا تھا ہو گیا اگر تم اس سلسلے میں تعاون کر لیتیں تو بات ختم ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے ذمے داری میری تو نہیں تھی، نہ میرا ان لوگوں سے کوئی رشتہ تھا۔ بات صرف اتنی تھی رابعہ سلطان کہ اس اعتراف کے بعد میں تمہیں اپنے تصرف میں لانا چاہتا تھا۔ تم اتنی اتنی بڑی باتیں کر گئیں کہ بات میرے ہاتھ سے بھی نکل گئی۔"

"او کے۔ تمہاری بکواس سن لی۔ جا رہی ہوں میں اور اس کے بعد یاد رکھنا کہ رابعہ سلطان نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ہی راجا ناصر اسپرنگ کے گڈے کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا اور رابعہ سلطان پر آ پڑا۔ رابعہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کی توقع نہیں رکھتی تھی۔ ساری باتیں اپنی جگہ مگر رابعہ سلطان اس کو اس قدر بدکردار نہیں سمجھتی تھی۔ راجا ناصر نے جیب سے ایک چھوٹی سی چپٹی شیشی نکالی۔ پرفیوم جیسے خوش بو تھی اس میں۔ رابعہ سلطان کے چہرے پر ایک ہلکی سی پھوار مار دی اور پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔ چہرے سے اس وقت وہ بالکل شیطان لگ رہا تھا۔ رابعہ سلطان کو یوں لگا جیسے اس کا سانس بند ہو گیا ہو۔ راجا ناصر اسے وحشی کتے کی طرح گھور رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا اور پھر اس کے ہاتھ اس کے لباس کی جانب بڑھ گئے۔

♥......♥......♥
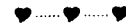
صوفی کو یہ فون اس کے گھر پر ہی موصول ہوا تھا۔ اس وقت کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

رات کا وقت تھا۔ فون اٹھا کر اس نے ریسیور کان سے لگا لیا۔"

"ہیلو صوفی صاحب! انسپکٹر راجا ناصر بول رہا ہوں۔"

"حکم فرمائیے جناب عالی! درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے بااخلاق لہجے میں کہا۔

"جو کچھ تم نے کہا ہے وہ تو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک اطلاع دے رہا ہوں تمہیں۔"

"ارشاد...... ارشاد......"

"ہاکس بے پہنچ جاؤ۔ بلیو لائن والی سڑک کے اختتام پر ایک ہٹ جس کے پیچھے جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں۔ ان جھاڑیوں میں رابعہ سلطان کی لاش موجود ہے۔ اس کی آبروریزی کی گئی ہے اور اس کے بعد گلا دبا کر اسے ختم کر دیا گیا ہے۔ تمہاری دوست ہے، تم پر اس کی آخری رسومات کا فرض عائد ہوتا ہے۔" صوفی ایک لمحے سکتے کے عالم میں رہ گیا تھا۔ اس نے کہا۔

"اچھا مذاق فرما لیتے ہیں آپ درویشوں کے کرم سے۔"

"ہاں...... واقعی میں بہت اچھا مذاق کر لیتا ہوں۔ میں نے تمہیں اطلاع دے دی ہے۔ اس سے پہلے کہ آوارہ کتے رات بھر میں اسے چیر پھاڑ کر اس کی لاش مسخ کر دیں اگر تم پسند کرو تو اسے وہاں سے اٹھوا لو۔"

"کس نے قتل کیا ہے اسے؟" صوفی کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔

"میں نے۔" راجا ناصر نے جواب دیا۔

"وجہ؟"

"حد سے زیادہ آگے بڑھنے کی کوشش، میری توہین کرنے کی کوشش، مجھے چیلنج کیا تھا اس نے اور مجھے ابھی زندگی کا طویل عرصہ گزارنا ہے۔ اگر ایک چیلنج پر شکست قبول کر لیتا تو زندگی میں شکست کا آغاز ہو جاتا، جو مجھے ناپسند ہے۔"

"راجا ناصر تم سنجیدہ ہو۔" صوفی نے سوال کیا اور دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔ صوفی بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا، لیکن بہرحال اس اطلاع کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ ایک لمحے خاموش رہا اور اس کے بعد اس نے گرین ہاؤس فون کیا۔ فون شازیہ نے اٹھایا تھا۔

"جی چھوٹے بابا۔"

"عادل اور فیضان آئے ہوئے تھے، ہیں یا چلے گئے۔"

"نہیں چھوٹے بابا ہیں۔"

"فون پر بلاؤ۔" فون پر فیضان آیا تھا۔

"جی صوفی صاحب!"

"تیار ہو جاؤ اور گاڑی لے لینا۔ تم دونوں کو ہاکس بے بلیو لائن پہنچنا ہے۔ بلیو لائن سمجھتے ہو؟"

"نہیں۔"

"ٹھیک ہے زیرو پوائنٹ پر پہنچ جاؤ۔ میں بھی ابھی آ رہا ہوں۔" صوفی نے یہ کہہ کر فون بند کیا اور اس کے بعد تیار ہو گیا۔ اب اس وقت موٹر سائیکل سے کام نہیں چل سکتا تھا چنانچہ اس نے گاڑی نکالی جو

تھوڑے فاصلے پر بند رہتی تھی۔ لیکن بالکل تیار اور اس کے بعد اس کی کار برق رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔ اگر واقعی راجا ناصر نے رابعہ سلطان کو قتل کر دیا ہے تو یہ انتہائی غم ناک المیہ ہوگا۔ خون اگر کسی اور کا ہے تب بھی صوفی بہر حال ہوشیار رہے۔ پھر وہ عادل اور فیضان سے پہلے ہی زیرو پوائنٹ پہنچ گیا تھا یہاں کیونکہ ان دونوں کی گاڑی موجود نہیں تھیں اس لیے اس نے انتظار کیا اور چند ہی منٹ بعد اسے کار کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ عادل اور فیضان وہاں پہنچ گئے تھے۔

"آؤ ہوشیار رہنا، ہمارے اوپر فائرنگ بھی ہو سکتی ہے۔" صوفی نے کہا۔

"جی سر! اور پھر جھاڑیوں میں رابعہ سلطان کی لاش مل گئی تھی۔ اطلاع بالکل ٹھیک تھی۔ صوفی کچھ دیر اس لاش کو دیکھتا رہا اس کے بعد اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں اور پھر عادل اور فیضان سے کہا۔

"لاش اٹھا کر میری گاڑی میں ڈال دو۔"

"جی سر، لیکن یہ...... عادل نے کچھ کہنا چاہا لیکن صوفی کا چہرہ اس وقت بالکل اجنبی لگ رہا تھا۔ یہ وہ چہرہ تھا ہی نہیں جس پر یتیمی برستی رہتی تھی۔ اس وقت ان آنکھوں میں اتنی سفاکی نظر آ رہی تھی جسے ناقابل یقین کہا جا سکتا تھا۔ لاش اٹھا کر صوفی کی گاڑی کے عقبی حصے میں ڈال دی گئی اور صوفی نے کہا۔

"تھوڑا فاصلہ دے کر میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔" اور اس کے بعد اس نے کار وہاں سے واپس موڑ دی۔ وہ خاموشی سے کار ڈرائیو کر رہا تھا اور اس کی نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ذہن سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ آخر کار ایک پرائیویٹ اسپتال کے سامنے اس نے کار روکی۔ فیضان اور عادل بھی اب قریب آ گئے تھے۔

"اسے احتیاط سے اٹھا کر اسپتال کے عقبی حصے میں ڈال دو۔ چوکیدار گردش کر رہا ہے خیال رکھنا دیکھنے نہ پائے۔ میں نگرانی کر رہا ہوں۔" اور عادل اور فیضان نے صوفی کی ہدایت پر عمل کیا۔ لاش ایسی جگہ ڈال دی گئی جہاں سے وہ فوری طور پر نگاہوں میں آ سکتی تھی۔

اس کے بعد صوفی نے آہستہ سے کہا۔

"رابعہ سلطان برا ہوا ہے تمہارے ساتھ، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم حق کی جنگ لڑتے ہوئے شہید ہوئی ہو۔ میں نے تمہارا ساتھ دیا تھا اور اب بھی......" یہ کہہ کر وہ واپس مڑا۔ عادل اور فیضان کو اس نے ساتھ آنے کا اشارہ کیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تینوں ایک ریسٹوران میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"سر! یہ لڑکی رابعہ سلطان ہی تھی نا۔" فیضان نے کہا۔

"ہاں۔"

"لیکن آپ کو اس لاش کا علم کیسے ہوا؟"

"قاتل نے مجھے فون کیا تھا۔"

"قاتل نے۔"

"ہاں۔"

"ہم سمجھے نہیں جناب۔"

"اس نے مجھے فون کر کے کہا تھا کہ اس نے رابعہ سلطان کو قتل کر دیا اور اس کی لاش بلیو لائن کے آخری سرے کی ہٹ کے پاس پڑی ہوئی ہے۔"

"مگر اس کا قاتل کون تھا؟"

"انسپکٹر راجا ناصر۔" صوفی نے جواب دیا۔ عادل اور فیضان چند لمحے سکتے کے عالم میں رہے پھر فیضان ہی نے سوال کیا۔

"لیکن سر ایک بات بتائیے۔ آپ نے رابعہ سلطان کی تلاشی بھی نہیں کی۔"

"قتل ایک انسپکٹر نے کیا ہے اور اس کی وجہ میں جانتا ہوں۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو کسی غلطی کی توقع ہو سکتی تھی۔ لیکن انسپکٹر نے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی ہوگی جس سے وہ کسی شکنجے میں جکڑا جا سکے۔" صوفی نے جواب دیا۔

♥......♥......♥

واقعی کچھ تبدیلی تو ضرور تھی۔ شازیہ، دلاور، غلام قادر وغیرہ کسی قدر حیران تھے۔ تینوں کے درمیان صوفی ہی موضع بنا رہتا تھا۔ کرنل رحیم شاہ کے پیغام آتے رہتے تھے۔ باہر کچھ زیادہ ہی مصروفیت ہوگئی تھی البتہ وہ یہ سوال ضرور کرتا تھا کہ انہیں اس کی فوری ضرورت تو نہیں ہے۔ اس وقت بھی وہ تینوں بیٹھے ہوئے اس موضع پر گفتگو کر رہے تھے۔ غلام قادر نے کہا۔

"اڑے ماں قسم! میرے دل کو تو ایک خیال آتا پڑا ہے۔ بڑا بابا کو بلاؤ اس کو بولو کہ چھوٹا بابا خراب ہو گیا ایں۔"

"تو بڑے بابا آتے ہی کیا کر لیں گے اور پھر خرابی صرف اتنی ہوگئی ہے کہ آج کل چھوٹے بابا کا موڈ خراب ہو گیا ہے۔ نہ تو وہ درویشوں کی بات کرتے ہیں اور نہ ہی ان کے انداز میں کوئی نرمی پائی جاتی ہے۔"

"خدا قسم ڑے! میرے کو تو ایسا لگتا پڑا ہے۔ جیسے چھوٹا بابا چھوٹا بابا رہا ہی نہ ہو۔" واقعی رابعہ سلطان کے قتل نے صوفی کے ذہن پر کوئی بڑا اثر ہی ڈالا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان دنوں اس نے پان کھانا بھی چھوڑ دیے تھے۔ پان شاید اس کی طبیعت میں نرمی پیدا کرتا تھا، لیکن ان دنوں وہ پان نہیں کھا رہا تھا۔ محمد خان نے پوچھا بھی تھا کہ

"اماں صوفی صاحب کیا پان چھوڑ دیا؟"

"نہیں خان صاحب اتنے عرصے کی رفاقت اتنی آسانی سے تو ختم نہیں ہوتی۔ بس آج کل کچھ دل نہیں لگ رہا۔ مزہ نہیں آ رہا۔ آئیں گے ذرا آرام سے کھائیں گے۔" محمد خان کے ہوٹل پر دو افراد کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ بیچ بچاؤ کرایا گیا۔ صوفی تو اس وقت قہوہ خانے ہی میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب دونوں میں ہاتھا پائی ہونے لگی تو صوفی نے آگے بڑھ کر ان کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کی تو ان میں سے ایک تو مان گیا لیکن دوسرے نے صوفی کے منع کرنے کے باوجود ماننے والے کی پٹائی شروع کر دی۔ نتیجے میں صوفی نے اس کی گردن پکڑی اور پھر ایک ایسا زوردار ہاتھ جبڑے پر رسید کیا کہ اس کے تین دانت ٹوٹ گئے اور پھر وہ گر کر بے ہوش ہو گیا۔

''اس سے کہنا کہ پولیس اسٹیشن جاکر ہماری رپورٹ درج کروادے۔'' صوفی نے کہا اور ہوٹل سے اپنے گھر آ گیا۔ پٹنے والا پرانا آدمی تھا۔ اسی محلے کا۔ علاج کرانے بے شک چلا گیا لیکن تھانے والے نہیں گیا۔ صوفی کے اس رویے کے بارے میں یہاں بھی خوب چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ لیکن اس کے بعد ایک دوسرے واقعے نے صورت حال کو ایک نیا ہی رنگ دے دیا۔ صوفی وہ نہیں رہا تھا۔ گلاب نامی نوجوان محلے کا اوباش نوجوان تھا۔ پڑوس کی ایک لڑکی پر نگاہ رکھتا تھا۔ لڑکی اس سے متاثر نہیں تھی۔ تھا بھی بدچلن اور آوارہ۔ لڑکی کے ماں باپ سے رشتے کی بات کی تو باپ نے طعنہ دیتے ہوئے کہا کہ تو ہے کس قابل، پہلے کسی قابل بن اس کے بعد مجھ سے بات کرنا۔ نتیجے میں یہ نوجوان گھر سے غائب ہو گیا۔ کوئی سوا دو سال کے بعد اس دن وہ اچانک واپس آ گیا۔ اس نے آخر لڑکی کے باپ سے ملاقات کی اور بتایا کہ وہ اس کی خواہش پوری کرنے دوبئی چلا گیا تھا۔ وہ بتائے کہ اب وہ اس سے کیا چاہتا ہے، تو لڑکی کے باپ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اس کی تو میں نے شادی کر دی۔ کیا تو مجھ سے کہہ کر گیا تھا'' نوجوان نے اس بات کے جواب میں ایک زوردار تھپڑ لڑکی کے باپ کے منہ پر رسید کیا اور بولا۔

''حرام زادے مجھ سے تو نے کہا تھا کہ میں کسی قابل بنوں۔ کچھ کر کے دکھاؤں اور پھر تجھ سے شادی کی بات کروں۔''

اس گلی میں اس سے پہلے ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا۔ لوگ لڑکی کے گھر کے آس پاس جمع ہو گئے تھے لیکن لڑکی کے عاشق نے ایک لمبا چھرا نکال لیا تھا۔ اس نے یہ چھرا لوگوں کی طرف لہراتے ہوئے کہا۔

''زندگی اور موت کی بات ہے۔ قسم اولاد کی کسی نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو میرے اوپر خون سوار ہے۔ انتڑیاں نکال کر باہر پھینک دوں گا۔ خبردار...... خبردار کوئی آگے بڑھنے کی ہمت نہ کرے۔ تمام لوگ دم بہ خود تھے۔ لڑکی کا باپ سکتے کے عالم میں کھڑا ہوا تھا کہ صوفی کی موٹر سائیکل کی پھٹا پھٹ سنائی دی۔ کہیں سے آ رہا تھا۔ موٹر سائیکل مجمع سے ہٹا کر روک دی اور صورت حال معلوم کرتا ہوا قریب آ گیا۔ پھر اس نے یہ منظر دیکھا تو اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔

''عزیزم بات سنو! زمانہ حال کی حکومت نے اس سلسلے میں کافی نرمیاں پیدا کر دی ہیں۔ اگر لڑکے اور لڑکی کی مرضی ہو تو پھر اسے یہ اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنے فیصلے پر عمل درآمد کر لیں درویشوں کی دعاؤں سے قانون ان کا مددگار ہوتا ہے۔ آپ صرف اتنا بتا دیجیے کہ جس لڑکی سے آپ محبت کرتے ہیں کیا وہ بھی آپ کو اتنا ہی چاہتی ہے؟''

''صوفی صاحب! بڑی عزت کرتا ہوں آپ کی۔ راستے سے ہٹ جائیے۔ اس وقت میرا راستہ جو بھی روکنے کی کوشش کرے گا میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ چھرا مار دوں گا اسے۔''

''ہم نے کچھ اور عرض کیا تھا آپ سے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''کوئی درویش نہیں، میں اس لڑکی کو لیے جا رہا ہوں، تم لوگوں سے جو کچھ کیا جائے وہ کر لینا۔''

''ارے...... ارے...... ارے اب ایسا بھی کیا ہم ہیں ناں...... ہاں لڑکی اگر تیار ہے تو ہم

درخواست کریں گے اس کے والد صاحب قبلہ سے کہ جھگڑا نہ بڑھائیں، نکاح کر دیں۔''

''وہ تیار نہیں ہے صوفی صاحب، وہ تو زار و قطار رو رہی ہے آپ اس سے خود پوچھ لیں۔''

''تو پھر میاں جائیے ٹھنڈے ٹھنڈے چلے جائیے زندگی بڑی قیمتی چیز ہے اسے کھونا اچھی بات نہیں ہے۔'' صوفی آگے بڑھا تو اس شخص نے چھرا تان لیا۔

''میں کہتا ہوں ہٹ جاؤ راستے سے۔''

''آپ کے کہنے کی کوئی وقعت نہیں ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے کہا اور پھرتی سے ایک پاؤں کی ٹھوکر اس شخص کی پنڈلی پر ماری۔ اس کے حلق سے ایک کراہ بے شک نکلی لیکن اس نے بجلی کی سی رفتار کے ساتھ صوفی پر چھرے کے یکے بعد دیگرے وار کرنا شروع کر دیے۔ لوگوں کے حلق سے وحشت بھری چیخیں نکل گئیں، لیکن انہوں نے صوفی کی پھرتی بھی دیکھی۔ صوفی جھکائیاں دے دے کر اپنے آپ کو بچاتا رہا اور آخر کار اس نے زوردار لات موقع ملتے ہی اس شخص کی بغل میں ماری اور چھرا اس کے ہاتھ نکل کر فضا میں بلند ہو گیا۔ چھرا تو نیچے گرا ہی تھا لیکن وہ شخص بھی مرنے مارنے پر ہی آمادہ تھا۔ اس نے صوفی پر چھلانگ لگائی تو صوفی نے اسے بازوؤں میں لپک لیا۔ حالانکہ وہ بھی اچھا خاصا تن درست آدمی تھا۔ لیکن صوفی نے اسے اس طرح دبوچا کہ اس کی ہر حرکت ناکام ہو گئی۔ صوفی نے اسے آہستہ سے زمین پر رکھا اور بولا۔

''اب عقل ٹھکانے آئی۔'' لیکن اس شخص نے اچانک ہی صوفی کے منہ پر ٹکر ماری۔ صوفی پیچھے ہٹ گیا اور پھر اس کے بعد لوگوں نے انتہائی وحشیانہ تماشا دیکھا تھا۔ صوفی نے اسے گھونسوں پر رکھ لیا تھا۔ توانا نوجوان بار بار گرتا تھا لیکن صوفی اسے اٹھا کر مار رہا تھا۔ اس کا پورا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا۔ کئی جگہ سے خون بہ رہا تھا۔ لوگ ساکت کھڑے تھے۔ صوفی نے اسے مارا تھا وہ انتہائی وحشت کا مظاہرہ تھا۔ لوگوں نے صوفی کو کبھی اس حال میں نہیں دیکھا تھا۔

''اس کو اٹھوا کر کسی گندے نالے میں پھنکوا دو۔ کوئی بھی مسئلہ ہو ہمیں آگے کیا جائے۔'' یہ کہہ کر صوفی آگے بڑھ گیا۔ محمد خان گہری سانس لے کر گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''یہ بندہ تو ہمارے لیے ہمیشہ ہی ڈھال بنا رہا ہے لیکن اس وقت اس نے جو کام کیا ہے اس سے پہلے اس کا یہ مزاج نہیں تھا۔ اماں یاد ہے تمہیں بندے علی خاں! ایک مرتبہ صوفی صاحب نے ایک بدمعاش کو مارا تھا لیکن بڑے پیار سے اور پھر ہلدی چونا بھی خود ہی لگایا تھا لیکن اس وقت ان کے تور دیکھنے کے قابل تھے۔ لگ رہا تھا کہ ختم ہی کر ڈالیں گے سسرے کو۔ تھا تو وہ بھی اسی قابل مگر اب دیکھو بعد میں کیا ہوتا ہے۔ کسی نے اس شخص کو اٹھا کر اسپتال پہنچا دیا۔ صوفی کی تبدیلیوں کے بارے میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ واقعی صوفی خاصا مختلف نظر آ رہا تھا۔ ان دنوں شازیہ، دلاور، غلام قادر، فیضان اور عادل بھی یہ بات کہہ رہے تھے کہ اچانک ہی چھوٹے بابا کے اندر کچھ تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ رابعہ سلطان کے قتل کے چودہ دن بعد صوفی نے شازیہ سے کہا۔

''شازیہ ہم تمہیں کچھ بتانا چاہتے ہیں۔ پچھلے کچھ دنوں سے ہم کام کر رہے ہیں۔ تمہاری ضرورت پیش آ گئی ہے۔''

"حکم چھوٹے بابا میری ضرورت پیش آ گئی ہے تو بھلا میں انکار کیسے کر سکتی ہوں۔"

"رابعہ سلطان ایک صحافی لڑکی تھی۔ دل میں انسانیت کے لیے ہم دردی رکھتی تھی۔ بے چاری معمولی سے گھرانے کی فرد تھی لیکن جذبوں سے مالا مال تھی۔ قتل کر دیا گیا اسے آبرو ریزی کے بعد۔" صوفی شازیہ کو تمام تفصیلات بتانے لگا۔ شازیہ کا چہرہ غم میں ڈوب گیا تھا۔

"اور بات کچھ اور نہیں ہے شازیہ۔ ظاہر ہے ہر شخص رشتے دار نہیں ہوتا۔ ہم اگر رشتے داروں کے لیے اپنے سینے میں غم پالیں تو دوسرے لوگوں کا کیا ہوگا اور پھر انسانیت کا رشتہ تو ہر ایک سے ہوتا ہے درویشوں کے کرم سے۔ راجا ناصر کو آزاد نہیں رہنا چاہیے، اسے سزا تو ملنی چاہیے۔"

"سو فی صدی ملنی چاہیے چھوٹے بابا۔"

"ایک عزیزہ ہے نگینہ نام ہے۔ کچھ مشکوک کردار کی مالک ہے۔ راجا ناصر آج کل اس سے تعلقات بڑھا رہا ہے۔ ہمیں ایک جگہ چاہیے۔ میں تمہاری ملاقات نگینہ سے کرا سکتا ہوں۔ ذرا سا اس کی آواز کی نقل کر لو۔"

"ہو جائے گا بابا صاحب۔"

"بس تو اتنا کر لو اس کے بعد آگے کا عمل کیا جائے گا۔"

"آپ مجھے نگینہ کا پتا بتا دیجیے۔" اور دوسرے ہی دن شاندار صلاحیتوں کی مالک شازیہ نے بدلی ہوئی آواز میں صوفی سے گفتگو کی تو صوفی نے چونک کر اسے دیکھا۔

"یہ نگینہ کی آواز ہے چھوٹے بابا۔"

"خیر تمہارے کمالات پر تو ہمیں ویسے بھی یقین ہے۔ اب ایسا کرتے ہیں کہ نگینہ کو ذرا ایک دن کے لیے غائب کر کے ادھر لے آنا ہے۔ یہ کام غلام قادر اور دلاور کر لیں گے۔" اور پھر منصوبے کے تحت نگینہ کا تعاقب کیا گیا اور ایک جگہ دلاور نے اسے اٹھا کر کار میں ڈال لیا اور وہ گرین ہاؤس منتقل ہوگئی۔ پھر شازیہ نے راجا ناصر کو فون کیا۔ آواز نگینہ ہی کی تھی۔

"ہیلو...... کیا راجا ناصر صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے۔؟"

"اتنی خوب صورت آواز سن کر بھلا کون کافر اس سے انکار کر سکتا ہے۔ میں راجا ناصر ہی بول رہا ہوں۔"

"کہاں غائب ہیں آپ؟"

"ارے پچھلی ہی رات تو ہم نے ایک ساتھ ڈنر کیا ہے۔"

"پچھلی ہی رات۔" شازیہ نے دل نوازی سے کہا۔ "اس کے بعد جناب پوری رات گزری ہے اور اب یہ اتنا دن گزر گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ون وے ٹریفک چل رہا ہے۔" راجا ناصر ہنسنے لگا پھر...

"بس حکم کا انتظار رہتا ہے ابھی آ جاؤں۔"

"تو فون کس لیے کیا ہے؟"

"پہنچا۔ فون بند کر دو تا کہ دیر نہ ہو جائے۔" راجا ناصر نے کہا اور خود فون بند کر دیا۔

صوفی خاموشی سے ایک صوفے پر بیٹھا ہوا آنکھیں بند کیے کسی سوچ میں گم تھا۔ لیکن اس...

شازیہ کی آواز پر لگے ہوئے تھے پھر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی آنکھوں میں تحسین کے جذبات تھے۔

"آ رہا ہے۔"

"جی چھوٹے بابا۔"

"صحیح ہے۔ ظاہر ہے تنہا آئے گا۔ کسی جگہ پر چھاپا مارنے نہیں جا رہا، بلکہ......" صوفی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ شازیہ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر بولی۔

"اب میں کیا کروں؟"

"جانا چاہو تو جا سکتی ہو۔ ہم نگینہ بن کر اس کا استقبال کر لیں گے۔" صوفی نے کہا اور شازیہ ہنس پڑی۔ پھر بولی۔

"نہیں ساتھ ہی چلیں گے چھوٹے بابا۔"

"ہوں...... اندر کے کمرے میں چلی جاؤ۔ اگر آواز دے تو بول کر اسے اندر ہی بلا لینا۔ وہ کمرا محفوظ ہے۔" تقریباً بیس منٹ کے بعد دروازے کی بیل بجی۔ انٹر کام لگا ہوا تھا۔ شازیہ نے نگینہ کی آواز میں پوچھا۔

"کون؟"

"کون ہو سکتا ہے۔" شازیہ نے بٹن دبا کر دروازہ کھول دیا۔ تالا آٹومیٹک تھا۔ راجا ناصر کے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی اور پھر اس کی آواز ابھری۔

"کہاں ہو؟"

"تلاش کر لو۔" شازیہ نے بے خوفی سے کہا اور راجا ناصر مسکراتا ہوا اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ شازیہ سامنے ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ "کر لیا نا تلاش۔" وہ بولا اور پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شازیہ کو دیکھنے لگا پھر اس نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر بولا۔

"آپ...... آپ کون ہیں؟"

"ارے کیا ہو گیا تمہیں۔"

"کیا مطلب۔"

"اداکاری کر رہے ہو۔" شازیہ نے کہا۔

"مگر...... میں...... یہ...... آپ۔"

"گڈ۔ اس وقت تو تم کسی اسکول کے طالب علم ہو رہے ہو۔"

"م...... میں...... یہ۔ آپ یہ سب کیا ہے؟ کون ہیں آپ؟" راجا ناصر بولا۔

"اچھا جناب اب ہم کون ہو گئے۔" شازیہ بہ دستور نگینہ کی آواز میں بول رہی تھی۔

"خدا کی قسم تمہارا چہرہ...... میں نے نشہ بھی نہیں کیا۔" راجا ناصر بولا۔

"جناب راجا ناصر صاحب بغیر نشے ہی کے آپ کی یہ حالت ہو گئی۔"

"میں پوچھتا ہوں کون ہو تم؟ کیا تم نے میک اپ کیا ہوا ہے؟"

"درویشوں کی دعاؤں سے۔" عقب میں صوفی کی آواز سنائی دی۔ راجا ناصر کچھ اس طرح الجھ گیا

تھا کہ اس نے عقب پر غور بھی نہیں کیا۔ صوفی نے دروازے سے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کیا تھا اور اس کے بعد آہستہ سے چلتا ہوا راجا ناصر کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اپنے پہلے جملے کے ساتھ ہی اس نے راجا ناصر کے ہولسٹر پر ہاتھ ڈال دیا اور ایک انسپکٹر جانتا تھا کہ پستول کس طرح ہولسٹر سے باہر آتا ہے۔ راجا ناصر نے یہ آواز سنی اور اس کا پستول ہولسٹر سے نکل گیا۔ وہ گھبرا کر پلٹا تو صوفی دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''کیسے مزاج ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔'' راجا ناصر کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ وہ آنکھیں پھاڑے صوفی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں کبھی صوفی پر اور کبھی اپنے ریوالور پر اٹھ جاتیں جو صوفی کے ہاتھ میں تھا، پھر اس نے پلٹ کر شازیہ کو دیکھا اور بولا۔

''شت...... تو...... یہ کوئی جال ہے۔''

''سوفی صدی۔''

''تم لوگ...... تمہارے خیال میں تمہارے علاوہ کوئی دوسرا شکاری ہو بھی نہیں سکتا۔'' راجا ناصر چند لمحے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر بولا۔

''نگینہ کہاں ہے؟''

''انگوٹھی میں۔'' شازیہ نے کہا اور ہنس پڑی۔

''تم کون ہو؟''

''انگوٹھی۔'' شازیہ نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''صوفی صاحب کیوں بلایا ہے مجھے اس طرح یہاں اور نگینہ کو کہاں غائب کر دیا ہے آپ لوگوں نے۔ مجھے نہیں جانتے آپ۔''

''جانتے ہیں۔ تم نے رابعہ سلطان کو قتل کیوں کر دیا؟''

''میری مرضی...... آپ اس کے بھائی لگتے ہیں؟''

''ہم اس کے کیا لگتے ہیں یا نہیں لگتے۔ اس بات کو چھوڑ دو۔ تم نے اسے صرف اس لیے قتل کیا کہ۔''

''نہیں...... نہیں میں نے آپ کو تفصیل تو بتائی تھی۔ وہ میری پسندیدہ عورت تھی لیکن وہ مجھے پسند نہیں کر رہی تھی اور پھر اس نے حد سے اونچی پرواز شروع کر دی تھی۔ میں نے اس کی چھٹی کر دی۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ وہ میرے ساتھ منسلک ہو گئی تھی۔''

''یہی تو اس نے سب سے بڑی غلطی کی تھی۔ صوفی صاحب لائیں ریوالور مجھے دیں اور ہوش کی دوا کریں۔ آپ کے ساتھ جو کچھ کروں گا آپ اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''صوفی نے شازیہ کو آواز دی اور کہا۔

''شازیہ اسے سنبھالو۔'' یہ کہہ کر اس نے ریوالور شازیہ کی طرف اچھال دیا۔ راجا ناصر نے اسے لپک کر پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے صوفی کی لات پیچھے سے اس کی کمر پر پڑی اور وہ کئی فٹ اونچا اچھل کر زمین پر گر پڑا۔ صوفی نے آگے بڑھ کر اس کی ٹانگیں پکڑ لیں۔''

''ویسے تو خاصا شور شرابا ہو سکتا ہے دریشوں کی دعاؤں سے۔ لیکن ہم کرنا نہیں چاہتے چنانچہ بسم اللہ۔'' یہ کہہ کر صوفی نے اس کی پنڈلی پر اپنا پاؤں رکھا اور اس کے بعد شازیہ نے جو دہاڑ سنی۔ اس نے اس کے کان سنسنا کر رکھ دیے۔ راجا ناصر کی ٹانگ پنڈلی کے پاس سے ٹوٹ گئی تھی اور وہ پورے کمرے میں تڑپتا پھر رہا تھا۔ صوفی چند لمحے اسے کمرے میں لوٹ لگاتے دیکھتا رہا اور اس کے بعد اس نے اس کی اس ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر پاؤں رکھ دیا۔

''مر گیا...... مر جاؤں گا۔ مر گیا...... مر جاؤں گا۔''

''کمال ہے اردو بھی ٹھیک نہیں ہے تمہاری۔ پہلے کہتے ہو مر گیا، پھر کہتے ہو مر جاؤں گا تو یہ ایک ہوئی دوسری ٹانگ بھی تو باقی ہے تمہاری، مگر ایسے نہیں صوفی نے اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر اٹھا کر دوسری ٹانگ رکھی اور ایک بار پھر اس نے پوری قوت سے اس پر پاؤں مارا۔ دوسری پنڈلی بھی جھول گئی تھی اور اس طرح جھولی تھی کہ دونوں ٹانگیں مڑ کر لٹکی ہوئی کھال کے ساتھ منسلک رہ گئی تھی۔ صوفی نے بڑی سفاکی کے ساتھ اس کی ران پر پاؤں مارا اور شاید ران کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد اس نے اس کے دونوں ہاتھ توڑے اور پھر جیب سے ایک چھوٹا چاقو نکالا اور بولا۔

''لڑکی رابعہ سلطان بے سہارا تھی۔ تم بہت بڑے آدمی تھے۔ تم نے اسے دھوکے سے بلایا۔ قتل کر دیا۔ ویسے تو میں تمہیں مہلت دے سکتا ہوں لیکن دینا نہیں چاہتا۔ اب میں تمہاری زبان کاٹوں گا اور اس کے بعد تمہارے ہاتھوں کی پانچوں انگلیاں۔ تم اس قدر بے بس ہو جاؤ گے کہ اپنے لیے کچھ کر بھی نہ سکو گے راجا ناصر! اگر زندہ بچ جاؤ تو بس اس بات پر افسوس کرنا کہ تم اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کے مرتکب ہوئے ہو۔ یہ افسوس تمہیں زندگی بھر رہے گا۔ میری طرف سے اجازت ہے کہ تم میرے خلاف جو چاہو کر سکتے ہو۔''

شازیہ بہت بہادر ہو گئی تھی اور پھر جنگ و جدال کے ماحول سے اچھی خاصی روشناس بھی لیکن اس وقت درحقیقت اس کا ذہن قابو میں نہیں رہ سکا۔ جب صوفی نے راجا ناصر کی دونوں ہاتھوں کی پانچوں انگلیاں کاٹ لیں اور اس کے بعد انتہائی وحشیانہ انداز میں اس کا منہ کھول کر اس کی زبان...... شازیہ نے آنکھیں بھینچ لی تھیں اور اس کے بعد لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

یہ تمام کارروائی کرنے کے بعد صوفی تھوڑی دیر تک ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ راجا ناصر واقعی بہت طاقت ور تھا کہ اتنی شدید اذیت کے بعد بھی ہوش میں رہا تھا لیکن جو ہو گیا تھا اگر واقعی زندہ بچ گیا تو اس سے زیادہ افسوس کا مقام اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا جو اسے کرنا پڑتا۔ کچھ لمحوں کے بعد صوفی باہر نکل آیا اور پھر شازیہ کو لے کر وہاں سے چل پڑا اور تھوڑی دیر کے بعد گرین ہاؤس پہنچ گئے۔ نگینہ کو اس طرح یہاں قید کیا گیا تھا کہ وہ نہ تو کسی عمارت کو پہچان سکے اور نہ کسی آدمی کو۔ بس اسے زندہ رکھنا مقصود تھا کیونکہ اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ شازیہ کی حالت ابھی تک خراب تھی۔ تھوڑی دیر تک یہ لوگ کھاتے پیتے رہے۔ باقی لوگوں کو صورت حال کا علم نہیں تھا۔ نہ ہی شازیہ بتانے کی پوزیشن میں تھی، لیکن اس نے اتنا ضرور کہا۔

''چھوٹے بابا جب آپ کو اس کی یہ حالت کرنا تھی تو میرے خیال میں آپ کو اسے مار دینا چاہیے تھا۔''

''تم شاید وہاں سے نکل آئی تھیں۔'' شازیہ جب میں نے اسے کہا تھا کہ میں اسے زندہ رکھنا چاہتا ہوں تا کہ اس نے رابعہ سلطان کے ساتھ جو کچھ کیا اس پر جب تک زندہ رہے افسوس کرتا رہے۔ مر جانے سے

کوئی فائدہ نہیں ہوتا مگر تم کیوں ایسا کہہ رہی ہو۔ کیا صرف اس لیے کہ وہ اس اذیت سے گزر رہا ہوگا۔''

''نہیں چھوٹے بابا۔ جو کچھ اس نے کیا ہے اس کی تو اسے سزا ملنی ہی چاہیے تھی لیکن کیا وہ آپ کی نشان وہی نہیں کردے گا؟''

''مزہ آئے گا نا۔''

''میں تو اس وقت ملک میں ہوں ہی نہیں۔ سارے کام کر چکا ہوں۔ ایک فلائٹ سے ملک سے باہر بھی جا چکا ہوں۔ لوگ تصدیق کریں گے کہ جو الزام مجھ پر لگایا گیا ہے وہ غلط ہے۔ میں تو یہاں تھا ہی نہیں۔ کسی نے مجھے پھنسانے کی کوشش کی ہے۔''

''اوہ۔ چھوٹے بابا، میری سوچ بھی بہت چھوٹی ہے۔ میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ کام آپ نے کیا ہے۔'' شازیہ نے جواب دیا۔

♥......♥......♥

بعد میں خاصی لے دے ہوئی تھی۔ نگینہ نے بیانات دیے تھے اور اخبارات راجا ناصر کے بارے میں بہت کچھ لکھتے رہے تھے اور بے شمار قیاس آرائیاں کی گئی تھیں اور یہ کہا گیا تھا کہ راجا ناصر کو کسی خاص دشمنی کی بنیاد پر قتل کیا گیا ہے پھر ایس پی جمشید مرزا نے صوفی سے ملاقات کی تھی۔ نہ جانے کہاں سے اسے کچھ بھنک لگ گئی تھی۔ ایک تجربے کار پولیس آفیسر تھا۔ صوفی کو اس نے اپنے آفس میں طلب کیا تھا اور صوفی وہاں پہنچ گیا تھا اور وہ زندہ درگور تھا۔ ادھر شازیہ اینڈ کمپنی یعنی گرین فورس اس بات پر مصر تھی کہ چھوٹے بابا بدل گیا ہے۔ اس کی فطرت میں ایک وحشت اور ایک درندگی آ گئی ہے۔ چالاک لوگ تھے، احمق نہیں تھے۔ رابعہ سلطان کے بارے میں انہیں ساری تفصیل معلوم ہوگئی تھی اور یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ صوفی کی زندگی میں چند لمحوں کے لیے پر بہار ہواؤں کا ایک جھونکا آیا تھا اور اس کے بعد فضاؤں میں تحلیل ہوگیا، لیکن صوفی کی زندگی میں ایک کرخت گیر سختی دے گیا تھا۔ پھر کرنل رحیم شاہ بھی آ گیا۔ گرین ہاؤس پہنچا تو صوفی کے علاوہ سب سے ملاقات ہوئی۔ شازیہ بہر حال لڑکی تھی۔ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکی اور صوفی کے بارے میں ساری تفصیل بتا دی۔ کہنے لگی۔

''چھوٹے بابا تو اس طرح تبدیل ہوگئے ہیں کہ آپ ملیں گے تو یقین نہیں کر پائیں گے۔ ویسے بڑے بابا میں آپ سے ایک بات کہوں۔ وہ رابعہ سلطان سے عشق کرنے لگے تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اندر عشق کے جراثیم موجود ہیں۔''

بیٹا یہ تحقیق تو آپ ہی کر سکتی ہو۔ ہم تو ناتجربے کار آدمی ہیں اس معاملے میں۔'' کرنل رحیم شاہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں بابا میں آپ سے سچ کہہ رہی ہوں، اگر انہیں تھوڑی سی زندگی تبدیل کرنے کا موقع مل جائے تو چھوٹے بابا بہت اچھے بن سکتے ہیں۔''

''برے تو وہ اب بھی نہیں ہیں۔ کوئی تجویز ان کے لیے تمہارے ذہن میں ہے۔''

''پہلی بات تو میں آپ کو یہ بتادوں بڑے بابا کہ جمشید مرزا نامی پولیس آفیسر آج کل چھوٹے بابا

کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ راجا ناصر کے عزیز ہیں اور چھوٹے بابا کو راجا ناصر کے قتل کا ذمے دار قرار دینا چاہتے ہیں۔ ثبوت کوئی نہیں ہے ان کے پاس کیونکہ چھوٹے بابا نے تحفظ کا معقول بندوبست کرلیا تھا۔ بیانات پر ہر جگہ یہ بات موجود ہے کہ وہ ان دنوں ملک میں تھے ہی نہیں۔ یہ کام انہوں نے اپنے لیے خود کرلیا تھا۔ مزاج اتنا تیز ہوگیا ہے کہ ذرا بھی کوئی تلخ ہوجائے تو اس کی پٹائی کر دیتے ہیں۔''

''پان کھا رہے ہیں؟''

''ہاں۔ باقی سب وہی کا وہی ہے۔ میرے ذہن میں ایک تجویز ہے بڑے بابا۔ آپ بھی سوچیں کہ کیسی لڑکی ہے؟''

''نہیں بھئی میں کیوں سوچوں گا۔ کیا تجویز ہے؟''

''چھوٹے بابا کو اس جگہ سے نکال لیا جائے جہاں وہ رہتے ہیں۔ ایک اچھا سا گھر انہیں دے دیا جائے۔ یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے گرین ہاؤس میں سب لوگوں کا جمع ہوجانا مناسب نہیں ہے۔ لیکن چھوٹے بابا کے لیے خاص طور سے ایک گھر الگ درکار ہوگا۔ وہاں ان کی شخصیت میں تبدیلی ضرور پیدا ہوگی۔ ہم لوگ بھی کوشش کریں گے۔ وہ جگہ جہاں وہ رہتے ہیں اگر ہم وہاں جا کر کچھ کریں تو آپ یقین کریں کہ ان کے سومددگار آ جائیں گے جو کہیں گے کہ صوفی کو صوفی ہی رہنے دیں۔'' کرنل رحیم شاہ سوچ میں ڈوب گیا۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

''بات تم لوگوں کی بالکل ٹھیک ہے۔ کسی نئے گھر کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ کوئی چھوٹا سا خوبصورت بنگلہ جو صوفی کے لیے کافی ہو۔ البتہ ہم صوفی کو یہ اجازت ضرور دے دیں گے کہ وہ اپنے پرانے گھر سے بھی رابطہ رکھیں۔ کچھ ایسا چکر چلائیں گے جس کے مطابق یہ کہا جائے کہ یہ نیا گھر گرین ہاؤس کی بقا کے لیے بہت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر صوفی کو اس پر آمادہ کرنا ناممکنات میں سے ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔''

''خیر میں ہی کوئی ترکیب کروں گا ویسے ایک تحفہ میں صوفی کو ضرور دوں گا۔''

''وہ کیا؟''

''حسینہ۔''

''یہ کون ہیں؟''

''ہمارا ایک ملازم ہے الیاس خاں۔ الیاس خاں کی بہن ہے کیا سر پھری خاتون ہیں۔ یہ سمجھ لو ابھی تھوڑے دن ہوئے ہمارے گھر آئی ہیں۔ لیکن پورے گھر کے حالات درست کر دینے کی فکر میں ہیں۔ بچے خاصے خلاف ہو چکے ہیں ان کے، میرا خیال ہے انہیں صوفی صاحب کی تربیت پر مامور کردیا جائے۔''

''ارے واقعی لطف آ جائے گا۔'' شازیہ ہنس کر بولی۔

''کرتا ہوں بندوبست۔ ویسے وہ خاتون ایک حادثے کا شکار ہوئی ہیں۔ مطلب یہ کہ سات سال تک ایک شخص سے منگنی رہی اور اس کے بعد وہ مشرق وسطیٰ سے واپس آیا تو بیوی اور تین بچوں کے ساتھ تھا۔ محترمہ حسینہ کی ذہنی کیفیت کا آپ لوگ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ خیر جمشید مرزا کا پورا قصہ کیا ہے۔''

''بس چھوٹے بابا کے پیچھے لگا ہوا ہے اور انہیں چیلنج کیا ہے۔ وہ ایک باقاعدہ پولیس آفیسر ہیں، شخصیت بھی اچھی خاصی ہے۔''

''ویسے اب تم لوگوں نے مجھے ایک بڑی عجیب بات بتائی ہے۔ ویسے میں محترمہ ناظمہ جلال کو بھی جانتا تھا لیکن جو کہانی ان سے منسوب ہوئی ہے بڑی کمال کی کہانی ہے۔ خیر میں صوفی صاحب سے ملاقات کروں گا اور پھر کرنل رحیم شاہ خود ہی صوفی کے گھر پہنچ گیا۔ اس درویشانہ ماحول سے خود بھی کافی رغبت تھی۔ یہاں اس نے کئی گھنٹے بڑے اچھے گزارے۔ سادہ دل لوگوں کی سادہ دل بستی میں جو محبتیں ملتی ہیں وہ واقعی کسی عالی شان محل میں بھی نہیں مل سکتیں۔ محمد خان اور دوسرے تمام حضرات خاطر مدارات میں لگ گئے۔ صوفی بچھا جا رہا تھا۔ بہرحال جب بڑی مشکل سے فراغت ملی تو کرنل رحیم شاہ نے صوفی سے کہا۔

''صوفی صاحب دیار غیر سے ایک انتہائی سنسنی خیز منصوبہ لے کر آیا ہوں۔ بات کچھ بھی نہیں ہے لیکن وہی کہتے ہیں نا کہ جب تک اللہ تعالیٰ نے زندگی عطا کی ہے۔ وطن عزیز کے لیے وطن عزیز میں رہنے والوں کے لیے جو بھی کاوشیں کی جاسکیں وہ سرمایہ زندگی ہوتی ہیں۔''

''بخدا لفظ بہ لفظ صحیح فرمایا آپ نے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''صوفی صاحب فتنہء اسرائیل آپ کو پتا ہے کہ یہودی کسی ایک محاذ پر کام نہیں کر رہے اگر ان کا ایک محاذ ہو تو ہم ان پر پوری طرح نگاہ رکھیں۔ وہ ہمارے خلاف ہر وہ عمل کر رہے ہیں جو وہ کر سکتے ہیں اور اس کے لیے انہوں نے اپنے تمام تر وسائل استعمال کر رکھے ہیں۔ دہشت گردی، بم دھماکے، ریلوے لائنوں کی تباہی، معاشی حملے، یہ سب کچھ کیے جا رہے ہیں اور اس کے روح رواں وہی ہیں۔ صوفی صاحب بات کچھ آگے بڑھنا چاہیے۔ ہم لوگ اندرونی اور بیرونی معاملات پر بھرپور نگاہ رکھنے کے خواہش مند ہیں۔ آپ سے ایک درخواست ہے میری۔''

''ارشاد...... ارشاد۔'' صوفی نے بڑے خلوص کے ساتھ کہا۔

''میں چاہتا ہوں گرین ہاؤس کے علاوہ ایک اور گھر بھی آپ کے پاس ہو جہاں میں اور آپ دونوں ہر طرح کی منصوبہ بندی کر سکیں۔ یہ گھر آپ اپنا قائم رکھیے لیکن میری خواہش ہے کہ آپ اسے اپنا مرکز نہ بنایئے کیونکہ اس مرکز کی بڑی شہرت ہو چکی ہے۔ ایک ایسا خفیہ گھر جہاں بہت کم افراد اس بات سے واقف ہوں کہ آپ وہاں رہتے ہیں۔ آپ کی دیکھ بھال کے لیے ایک خاتون فراہم کر دی جائیں گی۔ یہ ہمارے پروگرام کا پہلا حصہ ہوگا۔''

''میں حاضر ہوں۔'' صوفی نے سادگی سے کہا۔

''کرنل رحیم شاہ نے اپنی مسکراہٹ کو بڑی احتیاط کے ساتھ دبا لیا تھا۔

''تو پھر ٹھیک میں کوشش کرتا ہوں۔''

''اور سنائیں کوئی اور مسئلہ۔''

''نہیں، درویشوں کی دعاؤں سے سب ٹھیک ٹھاک ہے۔'' صوفی نے انسپکٹر جمشید مرزا کا نام بھی نہیں لیا تھا لیکن کرنل رحیم شاہ نے وزیر داخلہ شاہ میر خاں صاحب کو ساری تفصیل بتائی اور بولے۔'' یہ غلط فہمی

ہے ایس پی صاحب کو کہ انہوں نے اس طرح سے سوچا ہے۔ صوفی کو اگر کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو علی الاعلان کر ڈالتا ہے ذرا جمشید مرزا کو سمجھا دیں۔''

''ٹھیک ہے سمجھا دوں گا۔''

اس طرف مکان کی تلاش شروع ہو گئی تھی اور دوسری طرف ایس پی جمشید مرزا جو ہر طرح سے صوفی کی تاک میں لگا ہوا تھا اس وقت اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب اسے وہ کال موصول ہوئی۔ شاہ میر صاحب نے براہِ راست اسے مخاطب کر ڈالا تھا اور ایس پی جمشید مرزا بری طرح بوکھلا گیا تھا۔

''یس سر...... جی...... سر آپ نے براہِ راست...... سر حکم۔''

''جمشید مرزا صاحب بول رہے ہیں۔''

''جی سر...... ہاں سر...... بالکل سر۔''

''جمشید مرزا صاحب آپ کی ایک شکایت آئی ہے میرے پاس ایک انتہائی خاص آدمی نے آپ کے بارے میں مجھے تفصیل بتاتے ہوئے کہا ہے کہ آپ اپنے اختیارات سے ناجائز کام لے رہے ہیں۔''

''س...... س...... سر...... میں م...... م۔ کچھ نشان دہی کر دی جائے۔''

''آپ کا ریکارڈ طلب کر لیا ہے میں نے، دیکھتا ہوں آپ کا ماضی کیا رہا ہے کس طرح آپ اس عہدے تک پہنچے ہیں۔ آپ نے خود اس کے لیے زمین تیار کی ہے ورنہ اس سے پہلے۔''

''سر اگر ایک بار مجھے اپنی غلطی معلوم ہو جائے تو......''

''صوفی صاحب کو جانتے ہیں آپ جو ماضی میں محکمے میں انسپکٹر بھی رہ چکے ہیں۔''

''ص...... صوفی جی ہاں سر۔''

''کیا معلوم ہے اس شخص کے بارے میں آپ کو۔''

''سر یہی کہ کئی بار وہ محکمہ پولیس میں گئے اور اپنی ناقص کارکردگی کی بناء پر وہاں سے نکال دیے گئے۔''

''خیر آپ کی معلومات میں، میں کچھ ترمیم کر دوں، ناقص کارکردگی کی بنا پر نہیں، بلکہ اپنی اصول پسند فطرت کی بنا پر ان کا گزارا آپ جیسے پولیس آفیسروں کے ساتھ نہیں ہو سکا۔ ورنہ یہ اس وقت کم از کم ڈی آئی جی کے عہدے پر ضرور ہوتے۔ بہرحال میں نے سنا ہے کہ آپ نے انہیں کسی قسم کی وارننگ دی ہے۔''

''سر...... وہ میرا بھتیجا قتل کر دیا گیا تھا اور اس سلسلے میں ہزاروں شواہد یہی ملتے ہیں کہ اس کے پس پشت صوفی صاحب تھے۔''

''ثبوت ہیں آپ کے پاس۔''

''نہیں سر، کوئی ثبوت نہیں ہے۔''

''تو دوبارہ اگر تم نے یہ جملے اپنی زبان سے ادا کیے تو میں آپ کی گرفتاری کے آرڈر جاری کر دوں گا۔ کسی معزز اور شریف شہری کے لیے بغیر ثبوت کے یہ جملے ادا کرنا بھی جرم ہے۔ اگر آپ نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے تو آپ کو اس بات کا علم ہوگا۔''

''جی سر...... یس...... سر...... ہاں سر......''

''خیال رکھیے گا اس کے بعد آپ صوفی صاحب سے کوئی ایسی بات نہیں کریں گے۔ ورنہ آپ کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔''

''یس سر...... یس سر......'' ایس پی جمشید مرزا نے کہا۔

♥......♥......♥

صوفی کا نیا گھر بہت خوبصورت تھا۔ بہت زیادہ وسیع نہیں تھا لیکن پھر بھی اچھی مکانیت تھی۔ چار بیڈ روم، بہت بڑا ڈائننگ، ٹی وی لاؤنج، ایک چھوٹا سا لان جس پر خوب صورت گھاس، موٹر گیراج، بہرحال ایک انتہائی مکمل مکان تھا۔ صوفی نے پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ باقی تمام لوگوں کو بھی مکان پسند آیا تھا۔ کرنل رحیم شاہ کیونکہ خود بھی پیر پرست انسان تھا اس لیے مکان کا افتتاح محفل قوالی سے ہوا اور صوفی کی فرمائش پر محمد خاں اور دوسرے تمام افراد کو وہاں دعوت دی گئی۔

''شازیہ، دلاور، عادل، فیضان، کرنل رحیم شاہ، غلام قادر کو تو گھر بے حد پسند آیا تھا اور اس نے خوشی سے کہا تھا۔

''اڑے ماں قسم یہ تو گرین ہاؤس سے بھی اچھا ہے۔ چھوٹا بابا میرے کو ادھر چوکیدار لگا دو۔''

''تم لوگ یہاں سے براہِ راست تعلق رکھو گے۔ ظاہر ہے صوفی صاحب کو تنہا تو نہیں چھوڑا جاسکتا۔'' کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے ڑے، ابھی اپن تھوڑے دن تو ادھر سے نہیں جاتا اے میرے کو اجازت دیو مجھے یہ جگہ بہت پسند آیا ہے۔''

''ہاں ہاں اجازت کی کیا بات ہے۔'' باہر محفل قوالی میں بھی ایک عجیب سماں بندھا تھا۔ پاس پڑوس کے لوگ بھی آ گئے تھے اور نئے پڑوسی کو خوش آمدید کہا تھا۔ ایک اور صاحب جو اس وقت مہمان خصوصی بن گئے تھے وہ معشوق نشیلے تھے۔ کافی عرصہ پہلے تقریباً پانچ چھ سال پہلے محمد خان کے ہوٹل کے پچھواڑے نعمت خالہ کے ہاؤس گیسٹ تھے اور اکثر نعمت خالہ دوسرے تیسرے دن ان کے پانچ برتن اور ایک ٹین کا صندوق اٹھا کر باہر پھینک دیا کرتی تھیں۔ پڑوسیوں سے مذاکرات ہوتے اور آخرکار معشوق نشیلے صاحب کو واپس تھوڑی سی مہلت دے دی جاتی۔ اصل میں شاعر قسم کے آدمی تھے اور جب انسان شعر کہنے لگتا ہے تو اس کو کسی اور کام کی فرصت کہاں ہوتی ہے۔ کرتے دھرتے کچھ نہیں تھے۔ بیوی بچے بھی نہیں تھے جو گھر سے باہر نکلنے پر مجبور کرتے۔ بس الٹی سیدھی شاعری کرتے رہتے تھے۔ کہیں سے مل جاتا تو کھا لیتے۔ ادھار لینے میں پی ایچ ڈی کیا تھا اور اکثر ادھار لے کر کام چلا لیا کرتے تھے۔ آخرکار ایک دن غیرت آئی ساری زندگی کا سرمایہ ایک کڑاہی دو دیگچیاں، دو پلیٹیں اور ایک گلاس مع صندوق کے نعمت خالہ کے حوالے کیا اور خود دوبئی کے لیے چل دیے۔ مشورہ کسی سے نہیں کیا تھا۔ بس ایک خط لکھ گئے تھے کہ نعمت خالہ بھاری ساتھ لاؤں گا اگر لوٹا گلستان سے۔ پانچ سال تک کوئی پتا نہیں چل سکا تھا۔ پانچ سال کے بعد اچانک وارد ہوئے تھے، لیکن بہاریں تو ساتھ نہیں لا سکے تھے البتہ خود خزاں بن گئے تھے۔ اچھی خاصی تروتازہ شخصیت تھی کسی زمانے میں۔ گالوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ دانت کچھ ضرورت سے زیادہ لمبے نظر آنے لگے تھے اس لیے چہرہ سوکھ گیا

تھا۔ بدن بھی ظاہر ہے اسمارٹ ہوگیا تھا۔

نعمت خالہ نے تو خیر نیا مہمان رکھ لیا تھا۔ محمد خان بہت ہی اچھے آدمی ہیں۔ ہوٹل کے ایک بیرونی ھے میں بستر بچھانے کی جگہ دے دی تھی۔ بہرحال صوفی کے نئے گھر کے بارے میں سن کر پہنچ گئے تھے۔ صحیح معنوں میں ان لوگوں نے خوشی کی محفل تو نہیں البتہ محفل تعزیت منعقد کر ڈالی تھی۔

''اماں صوفی صاحب اتنے عرصے کا ساتھ چھوڑ رہے ہو۔'' محمد خان نے دکھ بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''محمد خاں صاحب عقل بالکل ہی ساتھ چھوڑ گئی درویشوں کی دعاؤں سے میاں ہم تو یہ وصیت کر چکے ہیں کہ اسی گھر میں ہماری قبر بھی بنا دی جائے بھلا وہ گھر چھوڑیں گے۔ بس آپ سمجھا کریں۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ اب پتا نہیں کیوں ہوتی ہے یہ اللہ ہی جانتا ہے یہ صرف ایک عارضی ٹھکانا ہے جہاں کبھی کبھی قیام کر لیا کریں گے ورنہ اپنی بستی زندہ باد۔'' صوفی نے کہا اور سب لوگ مطمئن ہوگئے۔

صوفی نے بڑی گرم جوشی سے معشوق نشیلے کا استقبال کیا تھا اور پھر اس کے بعد معشوق نشیلے نے اپنی کہانی سناتے ہوئے کہا تھا۔

''بس صوفی صاحب وقت نے ساتھ نہیں دیا تقدیر نے تعاون نہیں کیا یہاں سے بات ہوئی تھی ملک سے باہر بھجوانے والے ایک حضرت سے یہ طے کیا تھا کہ کما کما کر ان کی ادائیگی کریں گے۔'' لانچ سمندر میں سفر کر رہی تھی، کوسٹ گارڈ نے چھاپا مارا اور جانا کہیں تھا پہنچ کہیں گئے ایک جگہ پہنچے تو وہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ جانسن نام تھا کہنے لگے کہ میرے ساتھ لندن چلو، میں نے کہا یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ دوبئی کے بجائے لندن پہنچ جائیں گے۔ لندن لیے گئے اپنا سامان ہمیں تھما دیا۔ اس سامان میں نشہ آور ادویات تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہم نکال لے جائیں گے لیکن ہم نے خود کسٹم حکام کو پیش کش کر دی کہ ذرا ہمارے سامان کا جائزہ تو لیں نتیجے میں ہمیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ سزا پوری کی تو ہمیں ہمارے وطن بھجوایا گیا۔ یہ ہے داستان نشیلا شعر و شاعری چل رہی ہے باقاعدہ۔ بلکہ ہم نے کچھ تبدیلیاں پیدا کر لی ہیں تاکہ اشعار کی چوری نہ ہو سکے کسی وقت محفل مشاعرہ منعقد کرا دیں۔ بخدا پورا مشاعرہ نہ لوٹ لیں تو ہمارا نام بھی نہیں۔ محفل سماع میں بھی بہت لطیفہ گوئیاں ہوئیں۔ لیکن آخرکار یہ تقریب بھی ختم ہوئی اور اس کے بعد واقعی کرنل رحیم شاہ نے محترمہ حسینہ کو تحفے کے طور پر صوفی کو پیش کیا۔

''یہ حسینہ بی بی ہیں۔'' کرنل رحیم شاہ نے تعارف کروایا تو صوفی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پان کی پیک زمین پر ٹپکی تو حسینہ نے کہا۔

''اے، یہ اگال دان تو بند تو کرو، توبہ توبہ منہ سے غلاظت گر رہی ہے۔ اے۔ رحیم میاں کہاں لے آئے تم مجھے۔''

''حسینہ بیگم سمجھایا ہے آپ کو صوفی صاحب ہیں یہ۔ ان کی خدمت کرنی ہے۔''

''ہائے...... خدا کی نیکی یہ برا وقت مجھی پر آنا تھا۔ میں ان کی خدمت کروں گی میاں اگر کوئی گستاخی ہوئی تھی تو کسی جانوروں کے طویلے میں جھاڑو پونچھے پر لگا دیتے۔ کم از کم یہ ہوتا کہ دل میں خیال ہوتا کہ جانوروں میں رہ رہی ہوں۔ اب ذرا دیکھو۔ اے میں کہتی ہوں کہ ان کا یہ اگال دان کھلا کیسے رہ گیا۔

''صوفی صاحب حسینہ بیگم کو دیکھ کر آپ کو حیرت کیوں ہوئی؟''

''ان کی بدنصیبی اور دنیا کی ستم ظریفی پر درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی نے بھی برجستہ جواب دیا۔ یہ کیفیت اس کے اندر پیدا ہوگئی تھی کہ۔ اب وہ کسی کی زیادہ رکھتا نہیں تھا۔

''بدنصیبی۔ ستم ظریفی بات سمجھ میں نہیں آئی۔''

''ان کا نام تو کالونچ بیگم ہونا چاہیے تھا۔ ذرا معلومات کر کے بتائیے کہ حسینہ نام ازراہِ مذاق رکھا گیا تھا یا پھر وہ لطیفے والی بات تھی یعنی بادشاہ کے سامنے بچوں کا مقابلہ حسن اور ایک عورت کا اپنی کالی کلوٹی اولاد کے لیے دنیا کے سب سے خوب صورت بچے کا انعام حاصل کرنا۔ والدین نے اگر یہ مذاق کیا ہے تو کیا وہ اس دنیا میں ہیں کہ ان سے باز پرس کی جاسکے درویشوں کے کرم سے۔ آپ ذرا ان کے چہرے پر یہ تارکول چڑھا ہوا دیکھیے اور اس کے بعد ان کے نام پر غور کیجیے۔'' بجائے حسینہ بیگم اس بات پر غصہ ہوتیں اچانک ہنس پڑیں اور بولیں۔

''میاں خوب نبھے گی ہماری۔ تو چلو تم مجھے کالونچی کہہ لو مگر میں تمہیں کیا کہوں۔ رحیم میاں خدالگتی کیا ایسا نہیں لگتا جیسے راتوں رات دیمک کھا گئی ہو۔ منہ میں اگر بڑے بڑے دو سیب رکھیں تو گال چھ فٹ پھول جائیں اللہ معاف کرے داڑھی کا مذاق اڑانا گناہ ہے اس سے زیادہ یہ داڑھی کا مذاق خود نہیں اڑا رہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے بکرے کی دم چھل گئی ہو اور پھر باقی لگتا ہے تھوڑے دن میں مر جائیں گے اللہ نہ کرے۔''

''حسینہ بیگم زبان پر قابو نہیں رکھ سکتیں آپ۔''

''ارے یہ بھی تو رکھیں نا زبان پر قابو۔''

''مگر کرنل صاحب آپ نے انہیں زحمت کیوں دی ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''یہیں رہیں گی صوفی صاحب، اسی گھر میں، آپ کے ساتھ آپ کا ہر کام کریں گی اور ایک درخواست میں کروں گا آپ سے۔ ہم سب ان کی عزت کرتے ہیں اور ہماری خواہش ہے کہ آپ بھی ان کا خیال رکھیں۔'' اس موضوع پر گفتگو ختم کی جاتی ہے۔ حسینہ بیگم یہ گھر آپ کی تحویل میں ہے اور صوفی صاحب کو مطمئن کرنا آپ کا فرض۔''

''اللہ ہماری مغفرت کرے۔'' حسینہ بیگم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ پھر جب وہ کمرے سے باہر چلی گئیں تو صوفی بولا۔

''جناب عالی! کون سے دن کی پاداش میں آپ نے ہمیں۔''

''نہیں صوفی صاحب آپ یقین کریں بڑی اچھی خاتون ہیں۔ دل کی بھی اچھی ہیں اور ذمے دار بھی ہیں۔ تھوڑا وقت گزرنے دیجیے آپ محسوس کریں گے کہ آپ کو ان کی اشد ضرورت ہے۔''

''درویش رحم کریں۔'' صوفی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

♥......♥......♥

گرین ہاؤس کافی خوب صورت عمارت تھی۔ دلاور خاں کا پورا خاندان اس میں رہتا تھا۔ شازیہ کی والدہ اور بہنیں بھی وہاں پر موجود تھیں۔ یہ عمارت بڑی وسعتوں میں تھی۔ ان لوگوں کی قیام گاہ کا بندوبست

ایک الگ تھلگ حصے میں کیا گیا تھا جب کہ ضروری امور کے لیے دوسرا حصہ مخصوص کر لیا گیا تھا لیکن صوفی کے نئے گھر کی اہمیت کچھ ایسی بڑھ گئی تھی کہ اب اکثر تمام لوگ وہاں جمع ہو جایا کرتے تھے۔ صوفی بھی اپنی فطرت کے خلاف بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ جو تبدیلی اس کے اندر رونما ہوئی تھی اس کے تحت عام طور سے اپنے اس نئے گھر میں ہی رہتا تھا۔ حسینہ بیگم کا تو واقعی کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ صوفی کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا تھا۔ وقت پر کھانا، وقت پر اٹھنا، وقت پر پہننا لیکن صوفی نے حسینہ بیگم کی ذات کو اپنے آپ تک ہی محدود رہنے دیا تھا، کسی اور کو اس میں شامل نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس وقت جو سب سے بڑی مشکل درپیش تھی وہ معشوق نشیلے صاحب کی تھی۔ وہ تو ادھار کھائے بیٹھے رہا کرتے تھے۔ جان کو آ گئے تھے۔ جب دیکھو نازل۔ پس گھر میں آتے تو ایک ایک سے اس طرح محبت اور شناسائی کا اظہار کرتے جیسے بڑی قدیم رشتے داری ہو۔ بہرحال ماحول میں تبدیلیاں سی پیدا ہو گئی تھیں۔ خاص طور سے غلام قادر کی تو ان سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ حسینہ میں یہ خوبی تھی کہ بے مقصد کسی کے سامنے نہیں آتی تھی لیکن غلام قادر سے دو چار بار جھڑپ ہو چکی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو ناپسند کرتے تھے۔ معشوق نشیلے نے ایک بار کہا۔

''آپ کو دیکھ کر تو واقعی ذوقِ شاعری چکنا چور ہو جاتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کی صورت نظر نہ آیا کرے۔''

''اڑے خدا قسم تمہاری آنکھوں سے نظر بھی آتا ہے۔ ابھی یار میں کئی بار جھانک کر دیکھ چکا ہوں کہ کہیں تم وہ شیشے تو نہیں لگاتے جو آنکھوں کے اندر لگا لیتے ہیں۔ ابی جاؤ یار ورنہ تمہارا سارا نشہ نکال کر تمہارے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔''

''غلط فہمی کے مریض ہو۔ یہ نہ سمجھنا کہ تن توش میں ہم پر بھاری ہو، بخدا جو سنا ہے آپ نے نہ چھیڑ آگ لگا دوں گا آشیانے کو۔''

''اڑے جاؤ تم چھوابی آگ لگائیں گا تو میں تم کو اسی آگ پر سیخ میں پرو کر بھون لے گا۔''

''ہائیں...... ہائیں...... ہائیں، یہ تم لوگوں نے لڑنا کیوں شروع کر دیا درویشوں کے کرم سے۔''

''واہ صوفی صاحب واہ، آپ کی گفتگو مزہ دے جاتی ہے لڑنا بھی اگر درویشوں کے کرم سے شروع ہو تو بات کیا ہوئی۔'' اس وقت بھی جب تمام لوگ بیٹھے ہوئے تھے پتا نہیں وہ کس طرح اندر گھس آئے تھے، گھنٹی بجائے بغیر۔ غلام قادر نے چونک کر انہیں دیکھا تھا اور پھر کہا تھا۔

''اڑے ماں قسم آپ لوگوں میں سے چراغ کس کے پاس ہے؟''

''چراغ''

''اڑے اور کیا اب یہ دیکھو یہ چھت سے اترا ہے۔''

''صوفی صاحب حیرت ہے۔ آپ نے ہمیں ان وحشیوں کے سپرد کر دیا ہے۔ معشوق نشیلے نے نزاکت سے کہا۔ اتنی دیر میں حسینہ بیگم آ گئیں۔

چائے پئیں گے آپ لوگ یا ٹھنڈا۔ ویسے چلو خیر بات کروں گی تم سے ان شہد کی مکھیوں کے بارے میں، کیا لاؤں۔''

''چائے اور اس کے ساتھ۔''

''درویشوں کی دعائیں۔'' معشوق نشیلے نے فوراً ہی جملہ پورا کیا اور ہی ہی کرنے لگے۔ شازیہ انہیں غور سے دیکھ رہی تھی۔

''آپ آئے کیسے یہ تو بتایئے۔''

''بھئی کچھ بری عادتیں بچپن ہی سے پڑی ہوئی ہیں۔ عام طور سے کھیتوں میں احاطے کی دیواریں پھلانگ کے اندر جاتے تھے۔ آم اور کچے امرود کھایا کرتے تھے۔ گھروں میں آنے جانے کی عادت بھی ایسے ہی پڑ گئی۔ بس سوچتے ہیں کہ کون گھنٹی بجانے کا تکلف کرے۔''

''کسی دن پولیس والے نے دیکھ لیا تو ہم میں سے کوئی نہیں کہے گا کہ آپ سے ہمارا کیا تعلق ہے؟''

''چھوڑیے چھوڑیے کچھ ایسی محفل نظر آ رہی ہے جی کہ اشعار بالکل اس طرح دماغ میں آ رہے ہیں جیسے وہ خود کار زینے ہوا کرتے ہیں نہ ان کی سیڑھیاں۔'' ابھی وہ لوگ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ دروازے کی گھنٹی بجی اور حسینہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر بیرونی حصے میں چلی گئی۔

''صوفی صاحب وہ جو آپ نے معیار زندگی قائم کر رکھا ہے، یعنی یہ دروازہ کھلا رکھنا اگر آپ چوکیدار رکھ لیں گے تو بخدا اس گھر کا حسن خراب ہو جائے گا۔'' ابھی زیادہ باتیں نہیں ہوئی تھی کہ حسینہ واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا کارڈ دبا ہوا تھا۔

''لمبے تڑنگے ہیں لیکن شکل سے ہونق لگتے ہیں۔ اللہ مارے بڑی جلدی میں ہیں جیسے باتھ روم جانا چاہتے ہوں۔ کیا یہ کارڈ، صوفی صاحب کو دے دوں۔'' صوفی نے چٹکی میں کارڈ پکڑا اور اسے دیکھنے لگا۔ لکھا ہوا تھا...... ایس ایس سجادی اس کے ساتھ ہی پتا لکھا ہوا تھا، جو بی ٹیمپل روڈ مکان نمبر 27 تھا۔

''بلاؤ ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ یہ ایس ایس سجادی صاحب نہ جانے کون ہیں، ضرور کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر یہاں تک آئے ہیں، کیونکہ اس نام کے کسی آدمی سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ حسینہ باہر چلی گئی تھی، لیکن چند ہی لمحوں کے بعد وہ ہانپتی کانپتی آئی۔

''لیٹے ہوئے ہیں، لیٹے ہوئے ہیں، آوازیں دینے پر بھی نہیں اٹھ رہے۔''

''درویش رحم کریں، کون لیٹا ہوا ہے؟''

''ہونق جیسے، اچھے کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور زمین پر لیٹے ہوئے ہیں۔ حسینہ کے جملے ابھی پورے بھی نہیں ہوئے تھے کہ صوفی نے دروازے کی جانب چھلانگ لگا دی اور پھر اس نے بھی دروازے کے سامنے لیٹے ہوئے اس شخص کو دیکھا۔ واقعی عمدہ لباس تھا۔ چہرے سے بھی کوئی شریف آدمی معلوم ہوتا تھا، لیکن جو صورت حال نظر آ رہی تھی اسے دیکھ کر صوفی دنگ رہ گیا۔ شازیہ، غلام قادر اور باقی افراد بھی پہنچ گئے۔ فیضان کی آواز ابھری۔

''مر چکا ہے۔'' معشوق نشیلے بری طرح اچھل پڑے۔

''کک...... کیا۔ رحلت فرما گئے ہیں۔''

''اٹھاؤ۔'' صوفی نے کہا۔ ایک لمحے کے اندر اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ وہ ادھیڑ عمر شخص موت کی آغوش میں جا چکا ہے۔ گیٹ بند کر دیا گیا تھا۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا تھا کہ اس کے جسم پر کوئی زخم وغیرہ کا تو نشان نہیں ہے، چنانچہ لاش کو ایک محفوظ جگہ رکھ کر اس کے لباس کی تلاشی لی جانے لگی۔ لباس میں تھوڑی سی کرنسی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا، نہ ہی پورے جسم پر زخم کا کوئی نشان، موت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اچانک ہی شازیہ کی نگاہ باہر کی جانب اٹھ گئی اور اس نے ایک دم صوفی سے سرگوشی کی۔

''چھوٹے بابا پولیس۔'' صوفی نے بھی چونک کر سامنے دیکھا اور پھر دوسرے لمحے سرگوشی کی۔

''پچھلے دروازے سے باہر نکل جاؤ۔ فوراً اور میری طرف سے اطلاع کا انتظار کرو۔'' معشوق نشیلے نے یہ الفاظ نہیں سنے تھے۔ صوفی نے سرگوشی کے انداز میں اس سے کہا۔

''معشوق صاحب آپ میرے پرانے محلے کے آدمی ہیں۔ یہاں آپ کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ ملنے آئے تھے آپ مجھ سے کہ یہ واقعہ پیش آ گیا۔''

''حسینہ تم بھی سن لو، یہاں اور کوئی نہیں آیا تھا۔

''ارے تو وہ موئے مارے کہاں چلے گئے اور جو چائے کے برتن اندر پھیلے ہوئے ہیں۔''

''درویش آپ کو ہمیشہ ہمیشہ خوش رکھیں، انہیں لے جا کر کچن میں دھو دیجیے اور ایسا ہر نشان مٹا دیجیے جس سے یہ پتا چلے کہ یہاں دوسرے کچھ افراد بھی موجود تھے۔'' حسینہ میں یہ خوبی تھی کہ زیادہ بحث نہیں کرتی تھی۔ تنہائی کی بات دوسری تھی لیکن ایسے کسی مرحلے پر۔

پھر بیل بجنے پر صوفی نے معشوق نشیلے سے کہا کہ وہ جا کر دروازہ کھولیں، لیکن ذرا ہوشیاری سے۔ آپ تو پہلے بھی اسٹیج ڈرامہ کرتے رہے ہیں۔ معشوق نشیلے صاحب آپ کے لیے تھوڑی سی اداکاری مشکل تو نہیں ہو گی، پتا نہیں چلنا چاہیے درویشوں کی دعاؤں سے۔'' باقی ساری باتیں اپنے معمول کے مطابق تھیں۔ انسپکٹر اندر داخل ہو گیا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''لاش کہاں ہے؟''

''اندر سو رہی ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے کہا۔

''جی۔''

''آیئے تشریف لایئے۔ قدم رنجہ فرمایئے۔'' انسپکٹر نے سر سے پاؤں تک صوفی کو دیکھا تھا۔ صوفی کو پہچانتا نہیں تھا خود بھی نوجوان آدمی تھا، لیکن بگڑے ہوئے مزاج مالک نہیں تھا۔ صوفی کو حیرت تھی کہ پولیس اتنی جلدی کیسے پہنچ گئی۔ انسپکٹر نے لاش کا معائنہ کیا اور بولا۔

''طریقۂ قتل کیا ہے؟''

''بس اپنی مرضی سے گئے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔ اس طرح کی موت پر ایک شعر پیش خدمت ہے۔''

''آپ کا تعلق کسی ناٹک کمپنی سے ہے، کیا حلیے بنا رکھے ہیں آپ لوگوں نے۔''

''حضور من برامت مانیے گا ہم تو اس گھر میں تھوڑے دن پہلے آئے ہیں، بڑے مشکل حالات کا شکار ہوئے ہیں۔ آپ یہ فرمایئے آپ کو لاش کی اطلاع کس نے دی؟''

''ٹیلی فون ملا تھا مجھے۔ آپ کے مکان کا نمبر بتایا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ دروازے پر ایک لاش پڑی ہوئی ہے، بس۔''

''ہوں۔ اس طرح یہاں آ گئے۔''

''یہ حضرت تشریف لائے تھے، بیل بجائی تھی۔ ہماری عزیزہ جو یہاں گھر کے امور سنبھالتی ہیں۔ دروازے پر گئیں تو انہوں نے یہ کارڈ اندر بھجوایا اور ہم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ہم نے حسینہ عالم سے کہا کہ انہیں بلا کر ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ وہ دوبارہ گئیں اور واپس آئیں تو کہنے لگیں کہ وہ تو لیٹے ہوئے ہیں۔ تب ہم نے جا کر دیکھا تو ہمیں یہ حضرت نظر آئے۔ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اٹھا کر اندر لے آئے، بس اتنی سی کہانی ہے اور سارا کھیل تھوڑے سے وقفے کا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''یہ آپ نے درویشوں کی دعاؤں سے درویشوں کی دعاؤں سے کیا لگا رکھی ہے۔'' انسپکٹر نے تند لہجے میں کہا۔

''دیکھیے محترم ہم سے باز پرس نہ فرمایئے گا بات ہمارے اور درویشوں کے درمیان رہنے دیجیے گا۔ آپ اپنا کام کیجیے گا۔''

''ایس۔ ایس سجادی بی ٹیمپل روڈ مکان نمبر 27 آپ کا ان سے کیا تعلق تھا؟''

''تعلق قائم اس وقت ہوتا جب یہ زندہ سلامت اندر آتے۔ ہم نہیں جانتے کہ کیا قصہ تھا۔ مرحوم ملاقات سے پہلے ہی رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔''

''ہم جائیں۔'' معشوق نشیلے نے کہا۔

''کیا بکواس ہے آپ میں سے کوئی نہیں ہل سکتا۔ ویسے اس گھر میں اور کون رہتا ہے؟''

''حسینہ عالم اور ہم۔ یہ معشوق صاحب تو مہمان کے طور پر آئے ہوئے ہیں۔''

''اے دیکھو میاں، دو دفعہ تم نے مجھے حسینہ عالم کہہ کر میرا مذاق اڑایا ہے۔ اب قسم اللہ کی خاموش نہیں رہنے کی۔ میں کہتی ہوں اللہ نے شکل کالی بنائی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اے پولیس والے! تم ہی بتا دو بھیا کالے تو اللہ میاں کے پیارے ہوتے ہیں۔ میری غربت کا مذاق اڑایا جاتا ہے یہاں۔''

''بب...... بب...... بخدا پتا نہیں کیوں حسینہ کے ساتھ حسینہء عالم نکل جاتا ہے۔ معافی چاہتے ہیں آپ سے عزیزہ۔ آئندہ خیال رکھیں گے۔''

''انسپکٹر نے لاش کا معائنہ کیا۔ پھر بولا۔

''میرا خیال ہے ایس پی صاحب کو اطلاع دے دی جائے۔ انہیں اکثر یہ شکایت رہتی ہے کہ انہیں موقع واردات کا معائنہ نہیں کروایا جاتا۔ ورنہ ان کے خیال کے مطابق کوئی نہ کوئی نشان موقع واردات پر مل ہی جاتا ہے اور سنیے آپ کا نام کیا ہے؟''

''احقر کو صوفی کہتے ہیں۔''

''صوفی صاحب براہِ کرم کسی چیز کو نہ چھوئیں، پولیس آپ کے گھر کی تلاشی بھی لے گی۔''

''ہمیں اعتراض نہیں ہے، بزرگوں کی دعاؤں سے۔'' انسپکٹر نے ٹھنڈی سانس لی اور موبائل فون

پر اپنے افسر اعلیٰ سے رابطہ قائم کرنے لگا۔ صوفی مطمئن نظر آ رہا تھا۔

''حسینہ نے کہا، چائے یا کافی بنا کر لاؤں۔''

''پولیس والوں سے ایسا مذاق نہیں کرتے۔'' صوفی نے فوراً ہی حسینہ کو منع کر دیا۔ انسپکٹر نے تیکھی نگاہوں سے صوفی کی طرف دیکھا۔ کچھ بولا نہیں۔ معشوق نشیلے نے کہا۔

''میں جاؤں۔''

''ہتھکڑیاں لگوا دوں تمہارے ہاتھوں میں۔''

''جج...... جی...... کک...... کیوں؟''

''جاؤں...... جاؤں جو لگا رکھی ہے آپ نے۔''

''وہ کچھ اشعار تڑپ رہے ہیں سینے میں۔''

''ڈنڈے مار کر انہیں باہر نکال دیا جائے تو کیسا رہے گا؟''

''صوفی صاحب آپ اس قدر بے اختیار ہو گئے ہیں یہ صاحب مسلسل ڈنڈے اور ہتھکڑی کی باتیں کر رہے ہیں۔ کیا آپ کے تمام عہدے ختم ہو گئے۔'' صوفی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور جیب میں پانوں کی ڈبیا تلاش کرنے لگا۔

''ایک منٹ...... ایک منٹ۔ تلاشی لو ان کی جیبوں کی۔'' انسپکٹر نے کہا اور پھر ریوالور صوفی کی سمت اٹھا کر بولا۔ ''ہاتھ بلند کر دیجیے۔''

''غلطی فرما رہے ہیں آپ، لیکن فرما لیجیے آپ کی عمر ہی ایسی ہے درویشوں کے کرم سے۔''

اے۔ ایس۔ آئی نے پانوں کی ڈبیا، چھالیا، تمباکو کا بٹوا اٹھا کر میز پر رکھ دیا اور بولا۔

''اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔''

''میاں تین سو چھتیس روپے وہ کیا ہے آپ کے جیب میں منتقل ہو گئے؟''

''نہیں وہ تمہاری ہی جیب میں ہیں۔'' اے ایس آئی نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''دیکھ لیں۔'' صوفی نے انسپکٹر سے اجازت لی اور انسپکٹر اسے گھورنے لگا۔ صوفی نے سامنے کی جیب میں رکھے ہوئے پیسوں سے اندازہ لگایا اور پھر بولا۔

''درویش آپ پر رحم کریں۔ بے حد شکریہ۔ غریب آدمی ہیں۔''

''کیا کرتے ہیں آپ؟''

''غریب اسی لیے ہیں کہ کچھ نہیں کرتے۔''

''آپ نے کہا کہ آپ کو اس مکان میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا؟''

''جی ہاں۔ ایک دوسرے محلے میں رہتے تھے۔ نشیلے میرا مطلب معشوق نشیلے ہمارے پرانے پڑوسیوں میں سے ہیں اور مجھ سے ملنے آئے تھے۔''

''کیا کہلاتا ہے وہ علاقہ۔''

''ستارہ لائن کہلاتی ہے وہ جگہ درویشوں کی دعاؤں سے۔ اب یہ ستارہ کون تھیں کم از کم پچاس

سے لے کر اسی سال تک کے رہنے والے یہ نہیں بتا سکتے کیونکہ ستارہ لائن ان کی پیدائش سے پہلے عالم وجود میں آ چکی تھی درویشوں کی دعاؤں سے۔'' انسپکٹر نے برا سا منہ بنایا تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد ایک اور جیپ وہاں پر پہنچی اور اس سے جو شخصیت اتری اسے دیکھ کر صوفی نے ایک ٹھنڈی سانس لی تھی۔ یہ ایس پی جمشید مرزا تھے۔ انسپکٹر نے زوردار سلیوٹ کیا۔ جمشید مرزا نے اسے دیکھا اور اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ پھر جیسے ہی اس کی نگاہ صوفی پر پڑی وہ اس طرح اچھلا جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔

''اخاہ صوفی صاحب کیسے مزاج ہیں؟''

''چشم ما روشن دل ما شاد۔ اپنے گھر میں قدم رنجہ فرمائی کا از حد شکر گزار ہوں۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ آپ اس طرح تشریف لائے اندر ڈرائنگ روم میں تشریف لے چلیے۔ حسینہ ڈرائنگ روم کھول دیجیے۔''

''ایک منٹ ایک منٹ صوفی صاحب۔ کیا بات ہے انسپکٹر تم نے کس لاش......'' ایس پی کا جملہ ادھورہ رہ گیا کیونکہ اس کی نگاہ پر لاش پڑی تھی۔ پھر وہ مزید کچھ کہے سنے بغیر لاش کے قریب آیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

''قتل۔''

''کچھ عرض نہیں کیا جا سکتا۔''

''کتنی دیر پہلے یہ قتل کیا گیا۔''

''جناب کل وقفہ ستائیس اٹھائیس منٹ کا ہے۔''

''تفصیل بتاؤ۔''

''انسپکٹر نے مختصر سی تفصیل بتا دی تھی۔

''اور آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

''ان کا کہنا ہے کہ یہ گھر انہی کا ہے۔ یہ کارڈ ان کے پاس بھجوایا گیا تھا۔ یہاں پر اپنی ایک ملازمہ کے ساتھ رہتے ہیں۔''

''اے پولیس بھیا میری بات سنو، ملازمہ نہیں ہوں میں ان کی وہ ہوں وہ...... وہ جو کہتے ہیں ناں۔''

''منگیتر۔'' جمشید مرزا مذاق کے موڈ میں آ گئے۔''

''جھاڑو پھرے تمہارے منہ پر۔ منگیتر ہوں گی میں تمہاری، اس لم ڈھینگ کی، معاف کیجیے کیوں زبان گندی کرا رہے ہیں آپ لوگ۔ میں کہتی ہوں......'' حسینہ پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی اور صوفی نے کہا۔

''اس سلسلے میں میری معلومات ناقص ہیں کہ محکمہ پولیس کے لوگ ہر جگہ ہر طرح کا مذاق کر سکتے ہیں۔''

''اور اب آپ یہ شکایت لے کر وزیر داخلہ کے پاس چلے جائیں گے، جو آپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں۔'' انسپکٹر ان الفاظ پر چونکا تھا۔ ایس پی نے ہدایت کی۔

''جملہ کارروائیاں کریں اور لاش اسپتال پہنچوا دیں۔ مجھے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ درکار ہے۔ کارڈ مجھے دیجیے۔'' اس نے انسپکٹر سے کہا اور انسپکٹر نے کارڈ ایس پی صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

''ایس ایس سجادی۔ بی ٹیمپل روڈ۔ میرا خیال ہے ہمیں فوری کارروائی کرنی چاہیے۔ ٹیلی فون وغیرہ پر اطلاع دینا مناسب نہیں ہے۔ ہم خود ہی چلتے ہیں۔ صوفی صاحب آپ کو بھی ہمارا ساتھ دینا پڑے گا۔ ایک سوال کا جواب مجھے دیجیے۔''

''جی...... جی...... ارشاد...... ارشاد۔''

''آپ کہتے ہیں کہ آپ اس شخص کو نہیں جانتے جس کی لاش آپ کے دروازے پر پڑی پائی گئی ہے۔''

''جی ہاں، ساری تفصیل آپ سے عرض کر چکے ہیں۔ مرحوم ہم سے ملنا چاہتے تھے۔ ممکن ہے کہ دل کا عارضہ ہو اور قلب نے حرکت کرنا بند کر دی ہو۔ پھر یہ تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے پتا چل جائے گا۔''

''جی...... جی...... جی کیا خیال ہے آپ کا اس سلسلے میں آپ ہمارے ساتھ تعاون کرنا پسند کریں گے یا ہماری کوئی اور شکایت وزیر داخلہ تک پہنچ جائے گی۔''

''آپ جو حکم فرمائیں۔''

''تو پھر لباس وغیرہ تبدیل کر لیجیے۔ تھوڑی سی تفتیش میں آپ کی قربت ویسے بھی ہمارے لیے ضروری ہے اور یوں بھی آپ محکمہ پولیس میں ایک بڑے آفیسر رہ چکے ہیں۔'' انسپکٹر ایک بار پھر چونکا تھا۔ اس کا ہاتھ سلام کے لیے اٹھا تھا لیکن ایس پی کے انداز میں تھوڑا سا طنز محسوس کر کے اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔

♥......♥......♥

صوفی کو دلچسپی تو خیر تھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ ایس ایس سجادی اس سے کیوں ملنے آیا تھا۔ اس کی تفصیل اگر جمشید مرزا کے ساتھ جا کر حاصل ہو جائے تو کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ جمشید مرزا کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ صوفی کے ساتھ مفاہمت بھی کر رہا ہو اور سختی بھی کہ اگر صوفی نہ جائے تو وہ اسے زبردستی لے جائے۔ ویسے بھی تھوڑے بہت فرائض ضرور تھے۔ لباس تبدیل کیا اور باہر آ کر جمشید مرزا کی کار میں بیٹھ گیا۔

''ٹیمپل روڈ۔'' جمشید مرزا نے اپنے ڈرائیور سے کہا اور ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

''آپ سے کچھ ایسے حالات میں ملاقات ہوئی صوفی صاحب کہ ہم یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ ہم دوستی کریں یا دشمنی؟''

''درویش آپ پر رحم کریں۔ دشمنی سے کچھ حاصل تو نہیں ہوتا اگر آپ کو حاصل ہوتا ہے تو ضرور حاصل کیجیے گا۔''

''مجھے اپنے بھتیجے کے قاتلوں کا پتا چلانا ہے۔ راجا ناصر کی موت ہم اہل خاندان آسانی سے فراموش نہیں کر سکتے۔''

''ویسے آپ کی ذمے داری بھی ہے کہ قاتلوں کا پتا چلائیں۔ محکمہ پولیس میں رہنے کا فائدہ ہی کیا درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''یہ درویش آپ کے سر پر کہاں سے سوار ہو گئے ہیں۔ ہر جملہ آپ کا اسی جگہ ختم ہوتا ہے۔''

''یہ آپ نہیں سمجھ پائیں گے اور جو بات آپ کی سمجھ میں نہ آئے اس کے پیچھے اس طرح نہ پڑا کریں۔''

''اس طرح تو تفتیش کے دروازے ہی بند ہو جاتے ہیں۔''

"درویشوں کے بارے میں کسی تفتیش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ عقل اور دانش کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"بہت خوب واقعی شاہ میر خاں صاحب نے آپ کو بڑے اختیارات دے دیے ہیں کہ آپ مجھ جیسے سینئر پولیس آفیسر کو عقل اور دانش کا مشورہ دیتے ہیں۔" صوفی چند لمحات خاموش رہا پھر بولا۔

"بات دراصل وہی ہے۔ آپ ہر جگہ پولیس کا انداز اختیار کرتے ہیں چنانچہ آپ بھلا کیا دوستیاں قائم کریں گے۔" صوفی نے بہ دستور نئے انداز کے مطابق کہا اور بڑی سنگین صورت حال پیدا ہوگئی۔ ایس پی کے چہرے پر شدید غصے کے آثار تھے، لیکن بہر حال اس نے سنبھال لیا۔ بی ٹیمپل روڈ پہنچ کر کوٹھی نمبر 27 تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں آئی، البتہ یہ کوٹھی سب سے الگ تھی۔ دوسری عمارتوں سے تقریباً دو تین فرلانگ کے فاصلے پر، درمیانی جگہ پر بے ترتیب درخت پھیلے ہوئے تھے۔ پرانی اور مرمت طلب کوٹھی تھی۔ بیرونی گیٹ ٹوٹ چکا تھا۔ چنانچہ ایس پی کے اشارے پر جیپ کمپاؤنڈ میں جا کر رکی۔ سالہا سال سے دروازوں پر سفیدی نہیں کی گئی تھی۔ کمپاؤنڈ میں چاروں طرف ویرانی نظر آئی۔ بے ترتیب درختوں نے کمپاؤنڈ کو جنگل بنا رکھا تھا۔ ایس پی اور صوفی نیچے اتر آئے اور پھر وہ ایک ناہموار روش سے گزرتے ہوئے پورچ تک پہنچے۔ کچھ لمحے وہاں رک کر ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہے۔ پھر ایس۔ پی نے برآمدے میں جا کر کال بیل کا بٹن دبایا۔ اندر سے گھنٹی کی آواز آئی لیکن خاصے انتظار کے بعد بھی دروازہ نہیں کھلا تھا۔

"لگتا ہے اندر کوئی نہیں ہے۔" صوفی نے کہا اور ایس پی نے دروازے پر دباؤ ڈالا لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔

"دروازہ اندر سے بند ہے۔ اس کا مقصد ہے کوٹھی اندر سے خالی نہیں ہے۔" ایس پی بولا اور ایک بار پھر اس نے کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھی۔ اس بار اندر سے قدموں کی چاپ سنائی دی اور اندر سے چٹخنی گرنے کی آواز کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے ایک وحشت زدہ بوڑھا نظر آیا جو سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"سجادی صاحب یہیں رہتے ہیں۔" جمشید مرزا نے سوال کیا، لیکن بوڑھا خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔

"تم نے سنا نہیں کیا۔ سجادی صاحب یہیں رہتے ہیں؟"

"گونگا معلوم ہوتا ہے؟"

"اوہو۔ ہوسکتا ہے۔ پھر اب کیا کریں؟"

"وہ کارڈ آپ کے پاس موجود ہے۔" صوفی نے سوال کیا۔

"ایں...... ہاں، ہے۔ ایس پی جمشید مرزا نے جیب سے کارڈ نکال لیا۔ صوفی نے وہ کارڈ اس کے ہاتھ سے لیا اور بوڑھے کے سامنے کرتے ہوئے اسے اشارہ کیا، لیکن بوڑھے نے ہاتھ کی جنبش سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے جھٹکے کے ساتھ پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کر دیا۔

"ایس پی سخت غصے میں آ گیا تھا۔ وہ دروازے پر لات مارنے ہی والا تھا کہ صوفی نے دونوں ہاتھ سامنے کر دیے اور بولا۔

"نہیں بے کار ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں کوئی اور راستہ اختیار کرنا چاہیے۔"

"تمہارا مطلب ہے غیر قانونی طریقے سے اندر داخل ہوا جائے۔"

"تو آپ قانون کی چکی چلایئے درویشوں کی دعاؤں سے۔ میں چلتا ہوں۔"

"صوفی صاحب ہوش و حواس قائم رکھیے۔"

"تو پھر آیئے۔" صوفی نے کہا اور ایک طرف بڑھ گیا۔ بہر حال وہ عمارت کے گرد چکر لگانے لگے۔ ایک اور دروازہ نظر آیا جو عمارت میں داخل ہونے کا راستہ تھا۔ صوفی ہی نے یہ دروازہ دریافت کیا تھا۔ چنانچہ وہ داخل ہوگئے۔ سامنے ہی ایک طویل راہ داری بنی ہوئی تھی جس کے دونوں اطراف میں کمرے تھے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس بوڑھے کے علاوہ عمارت میں کوئی اور موجود نہیں ہے پھر وہ آگے بڑھتے رہے اور کمروں میں گھس گھس کر دیکھتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں صفائی کا تصور بھی نہ کیا جاتا ہو۔ ہر چیز پر گرد کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ آخر کار وہ ایک بڑے کمرے میں پہنچے جہاں بے شمار چھوٹے چھوٹے اسٹول نظر آئے۔ ان پر مختلف چھوٹے چھوٹے پتھروں کے نمونے رکھے ہوئے تھے اور اس سے ایس ایس سجادی کی مصروفیات کا پتا چلتا تھا۔ پھر انہوں نے ایک خوب صورت مجسمہ دیکھا جو پلاسٹر آف پیرس سے بنا ہوا تھا اور کسی حسین عورت کا تھا لیکن اس کے دونوں بازو ٹوٹے ہوئے تھے۔ چہرے پر جگہ جگہ گندگی مل دی گئی تھی۔ برہنہ بدن پر ٹوٹ پھوٹ کے بہت سے نشان تھے۔ پاس ہی ایک ڈنڈا رکھا ہوا تھا جس میں پلاسٹر آف پیرس لگا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک ہنٹر بھی رکھا ہوا تھا۔ وہ حیران نگاہوں سے اس سارے منظر کو دیکھنے لگے۔ جمشید مرزا بھی حیران نظر آ رہا تھا۔ اس نے جھک کر مجسمے کو دیکھا ٹوٹی ہوئی جگہوں پر انگلی لگائی تو پلاسٹر آف پیرس صاف نظر آنے لگا۔

"مجسمہ زیادہ پرانا نہیں ہے اور ہنٹر اور ڈنڈے سے صاف پتا چلتا ہے کہ کوئی اسے پیٹ پیٹ کر توڑتا رہا ہے۔"

"اسی لیے کہتے ہیں کہ عورت سے بچا جائے۔ درویش رحم کریں۔"

"آپ کی الٹی سیدھی باتیں بس یوں سمجھ لیجیے برداشت کر رہا ہوں۔ یہ نہ سمجھیں کہ شاہ میر صاحب نے آپ کو زندگی بھر کا تحفظ دے رکھا ہے۔"

"کوئی گستاخی ہوگئی درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے گستاخی تو نہیں ہوتی لیکن درویشوں کی بددعاؤں سے بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ آپ یوں سمجھیں کہ میں آپ کو اپنا استادِ محترم بنا کر یہاں لایا ہوں۔ آپ پولیس کی تحویل میں ہیں کیونکہ آپ کے گھر سے ایک لاش دستیاب ہوئی ہے۔"

"میں درویشوں سے آپ کے لیے بھی دعا گو ہوں۔ حق اللہ۔" صوفی نے معصوم سی شکل بنا کر کہا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے ایس پی جمشید مرزا پر رحم کھا رہا ہو۔ جمشید مرزا نے دانت پیس کر اسے دیکھا۔ صوفی کا انداز غصہ دلانے والا تھا لیکن اس نے بھی غالباً صبر کیا۔ موجودہ صورت حال نے اسے اپنے طلسم میں جکڑ لیا تھا۔ وہ ادھر ادھر کا جائزہ لیتا رہا پھر بولا۔

"آیئے۔"

"شکر ہے آپ کو یہاں سے باہر نکلنے کا خیال تو آیا۔"

''اس وقت بولیے جب میں آپ کو مخاطب کروں۔ سمجھے! مجھے غصہ نہ دلایئے۔''

''بب...... بہت بہتر...... ویسے آپ کا کیا خیال ہے یہ ٹوٹا ہوا مجسمہ، ڈنڈا اور ہنٹر کسی دلچسپ کہانی کی طرف متوجہ نہیں کرتا۔''

''ایس۔ ایس سجادی کا ذریعہ معاش کیا تھا اس کا پتا چلنا چاہیے۔'' ایس پی نے بے اختیار کہا۔ پھر اس طرح چونک پڑا جیسے غلطی ہوگئی ہو۔ وہ دروازے سے باہر نکل آئے۔ دوسرے کمرے میں داخل ہوئے تھے کہ کچھ آہٹیں سنائی دیں اور چند لمحوں کے بعد وہی گونگا ملازم اندر آ گیا۔ اس کی آنکھوں سے غصہ ٹپک رہا تھا۔ اس نے حلق سے بے معنی آوازیں نکالیں اور ہاتھ نچانے لگا۔ یہ مقصد تھا کہ یہ لوگ اس طرح کیوں اندر گھس آئے اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

''بکواس بند کرو اور ہمارے ساتھ ساتھ آؤ۔'' پتا نہیں وہ گونگے کے ساتھ بہرہ بھی تھا یا نہیں لیکن وہ ان کے پاس رک گیا تھا۔ صوفی نے چونک کر اسے دیکھا تھا اور پھر جیبوں میں پان کی ڈبیا اور بٹوا تلاش کرنے لگا۔ پھر غصیلے لہجے میں بولا۔

''آپ لوگوں نے میرا اسلحہ اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ کیا وہ آپ کی جیب میں موجود ہے؟''

''اسلحہ......؟'' جمشید مرزا نے چونک کر کہا۔

''جی ہاں آپ کا انداز تو یہی تھا جیسے وہ اسلحہ ہو۔ میری مراد پانوں کی ڈبیا اور چھالیہ تمباکو کے بٹوے سے ہے۔''

''اس وقت آپ پولیس کی تحویل میں ہیں اس لیے فضول باتوں سے گریز کیجیے گا۔ آیئے۔ ایس پی اس کمرے سے باہر نکل آیا، لیکن صوفی کو اس وقت غصہ آ گیا تھا۔ ایس پی کے ساتھ احمقانہ انداز میں اس عمارت کا جائزہ لینا بے معنی تھا۔ گونگے ملازم کو بھی جمشید مرزا نے اپنے ساتھ لے رکھا تھا۔ پھر جمشید مرزا گونگا ملازم ایک اور کمرے میں داخل ہوئے۔ صوفی جان بوجھ کر پیچھے رہ گیا تھا جیسے ہی وہ دونوں اندر داخل ہوئے صوفی نے باہر سے دروازہ بند کر دیا اور خود وہاں سے دوڑ لگا دی لیکن وہ احمق نہیں تھا۔ عمارت کے باہر پولیس کی جیپ موجود تھی۔ کانسٹیبل بھی تھے۔ ایس پی کے پاس موبائل بھی تھا چنانچہ باہر نکلنا حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا اس لیے وہ وہاں سے دوڑا اور پھرتی سے آگے بڑھتا ہوا کافی فاصلے پر نکل آیا۔ پھر ایک کمرے کی دوچھتی اس کی آرام گاہ بنی۔ دروازہ زور زور سے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ صوفی نے ایک جمائی لی اور پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''یہ بٹوا اور ڈبیا کہیں داغ مفارقت نہ دے جائیں درویشوں کی دعاؤں سے۔''

♥......♥......♥

دل و ماغ میں جو تبدیلی آئی تھی۔ اس کا پس منظر رابعہ سلطان کی موت بھی تھی۔ جس انداز میں صوفی نے رابعہ سلطان کی موت کا بدلہ لیا تھا وہ اس کی فطرت کے بالکل خلاف بات تھی، لیکن راجہ ناصر نے اسے اس کے لیے مجبور کر دیا تھا اور پتا نہیں دل کی کون سی گہرائیاں متاثر ہوگئی تھیں۔ بہر حال یہ جگہ اس کے لیے خاصی بہتر ثابت ہوئی۔ آوازیں ہی سنتا تھا اور پھر یہ آوازیں بند ہوگئیں۔ غالباً ایس پی نے یہ سوچا تھا کہ

وہ کسی راستے سے نکل گیا ہے۔ ایس پی کے لیے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ یقینی طور پر موبائل فون پر اس نے باہر لوگوں سے رابطہ قائم کیا ہوگا اور اس کے بعد دروازہ کھل گیا ہوگا۔ بھاگ دوڑ کی آوازیں تو آ ہی رہی تھیں۔ صوفی کو جب مکمل طور پر اس بات کا اطمینان ہوگیا کہ جمشید مرزا جا چکا ہے تو وہ نیچے اتر آیا اور انتہائی محتاط انداز میں قرب و جوار کا جائزہ لیتا رہا۔ جمشید مرزا بھی چالاکی کر سکتا تھا یہ بات اس کے ذہن میں آ سکتی تھی کہ ممکن ہے وہ یہیں موجود ہو، چنانچہ وہ خاموشی اختیار کر سکتا تھا اور اس طرح صوفی پر ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ بہر طور نیچے اترنے کے بعد صوفی کو احساس ہوا کہ ایسی کوئی بات ہے نہیں، جمشید مرزا جا چکا ہے البتہ انتہائی محتاط انداز میں دروازے تک پہنچ کر اس نے یہ پتا ضرور لگا لیا کہ گھر کا دروازہ باہر سے سیل کر دیا گیا ہے لیکن کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ امکانات تھے اس بات کے، باہر پولیس کا پہرہ بھی بلکہ یقیناً ہونا چاہیے کیونکہ جمشید مرزا مذاق ہی مذاق میں ایس پی کے عہدے تک نہ پہنچ گیا ہوگا۔ وہ خود بھی ذہانت رکھتا ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات انسان خود اپنی ذہانتوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ صوفی نے یہ مکمل پلان کرنے کے بعد کہ نہ تو یہاں سے نکلنا مشکل ہے اور نہ اب اندر کسی کے آنے کے امکانات ہیں۔ ایس ایس سجادی کے گھر کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ وہ بڑی باریک بینی سے ہر چیز کا جائزہ لے رہا تھا حالانکہ اس بات کے نشانات صاف مل گئے تھے کہ جمشید مرزا نے بھی بھرپور طریقے سے تلاشی لی ہے اور کوئی جگہ چھوڑی نہیں ہے لیکن صوفی کی تلاشی لینے کا طریقہ ذرا مختلف تھا۔ ایس ایس سجادی نے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ صوفی بڑی گہرائی سے سوچ رہا تھا۔ پھر ایک میز کی دراز سے اسے ایک ایسی چیز مل گئی جو کسی کے لیے کارآمد ہو یا نہ ہو لیکن صوفی کے لیے ضرور کارآمد تھی۔ یہ ایک سادہ کاغذ تھا جس کے ایک گوشے پر بس ایک نشان بنا ہوا تھا اور یہ نشان......'' صوفی اسے دیکھ کر سکتے کے عالم میں رہ گیا تھا۔ اس نے نہایت احتیاط کے ساتھ وہ کاغذ تہ کر کے جیب میں رکھ لیا اور مزید تلاشی لینے لگا لیکن اس کاغذ کے علاوہ اسے کوئی ایسی چیز نہیں ملی جو اس کے لیے کارآمد ہوتی البتہ اس کے دماغ میں بڑی تبدیلی پیدا ہوگئی تھی۔

یہاں مکمل طور پر مطمئن ہونے کے بعد کہ سجادی کے گھر میں کوئی اور چیز موجود نہیں ہے وہ اس راستے پر چل پڑا جس پر پہنچ کر بہ آسانی باہر نکلا جا سکتا تھا اور واقعی اسے باہر نکلنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی جبکہ مکان کے باہر پولیس کی ایک باقاعدہ موبائل کھڑی ہوئی تھی اور پولیس والے مستعد بھی تھے۔ صوفی بہت دور تک پیدل چلتا رہا اور پھر ایک راستے پر مڑا ہی تھا کہ ایک سایہ برق رفتاری سے اس کی طرف جھپٹا اور صوفی ٹھٹک گیا۔ یہ ایک لحیم شحیم آدمی تھا جس کے ہاتھ میں اعشاریہ دو آٹھ کا ریوالور دبا ہوا تھا۔ اس نے ریوالور کی نال صوفی کی پسلیوں سے لگا دی اور غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''گلی میں مڑ جاؤ چلو، شاباش۔ زندگی بڑی قیمتی چیز ہوتی ہے۔'' صوفی نے اسے دیکھا اور بے اختیار اس کے دانت باہر نکل آئے۔

''اچھا چلیے۔'' اور پھر وہ سہما ہوا سا اس کے احکامات کی تعمیل کرتا رہا۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے ڈر کے مارے جان نکلی جا رہی ہو۔

''تیز چلو۔'' لحیم شحیم شخص پھر غرایا اور ساتھ ہی ریوالور کی نال کا دباؤ بھی کچھ بڑھ گیا۔ صوفی نے

رفتار تیز کردی۔ وہ ایک پتلی سی گلی میں مڑے جو حد نظر تک سنسان تھی لیکن دفعتاً صوفی لڑکھڑایا۔ ایسا لگا جیسے ٹھوکر لگی ہو۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بدن کو بیلنس کیا لیکن ایک پاؤں پیچھے کی جانب مڑا اور ریوالور والے کے حلق سے ایک کریہہ چیخ نکل گئی۔ یہ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ صوفی کا مدمقابل سمجھ بھی نہیں پایا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ پیٹ کے نیچے رکھ کر جھکا تو صوفی کی دوسری لات اس کی گردن پر پڑی اور اس کے ساتھ ساتھ ہی اس نے بڑی مشاقی کے ساتھ اس شخص کے ریوالور پر بھی ہاتھ ڈال دیا۔ وہ شخص منہ کھول کر چیخنے ہی والا تھا کہ ریوالور کا دستہ اس کے سر پر تڑاخ سے پڑا اور اسے کراہنے اور چیخنے کا ہوش بھی نہیں رہا۔ پیشانی زمین سے لگی تو پھر نہ اٹھ سکی۔ صوفی نے ادھر ادھر دیکھا۔ قرب و جوار میں اب بھی سناٹا تھا جو کچھ ہوا تھا یا تو اضطرابی حرکت تھی یا پھر صوفی یہ ہی چاہتا تھا کہ حملہ آور سے فوراً جان بچائے۔ اس نے بڑی پھرتی سے اسے سیدھا کیا اور جامہ تلاشی لینے لگا۔ تین چار وزیٹنگ کارڈ نکلے جو ایک ہی نام کے تھے۔ اس کے بعد اس نے ادھر ادھر دیکھا اور کارڈ جیب میں رکھ لیے۔ نیچے گرا ہوا آدمی بے ہوش سڑک پر گرا ہوا تھا۔ صوفی تیزی سے ایک جانب مڑ گیا۔ سامنے کشادہ سڑک تھی۔ اس سڑک پر سے اچھا خاصا ٹریفک گزر رہا تھا اس نے ایک ٹیکسی روکی اور بولا۔

"چلو۔" ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ تیز رفتاری سے آگے بڑھ گیا۔ تھوڑے فاصلے پر پہنچنے کے بعد اس نے ٹیکسی ایک سینما ہاؤس کے سامنے رکوائی اور نیچے اتر کر ڈرائیور کو بل کی رقم ادا کردی۔ تھوڑی دور تک پیدل چلتا رہا۔ بہت محتاط انداز میں وہ چاروں طرف دیکھ رہا تھا لیکن جب اسے یہ اطمینان ہوگیا کہ کوئی بھی اس پر نگاہ نہیں رکھے ہوئے ہے تو اس نے ایک اور ٹیکسی کی اور اس میں بیٹھ کر گرین ہاؤس کی جانب چل پڑا۔

♥.....♥.....♥

گرین ہاؤس کی مجلس مشاورت جمع تھی۔ گرین فورس کے پانچوں ممبر موجود تھے اور صوفی انہیں اب تک کی تمام صورت حال بتا چکا تھا۔ یہ تبدیلی صوفی میں بالکل نئی رونما ہوئی تھی۔ اب سے تھوڑے ہی عرصے پہلے وہ اپنی ذات میں محدود رہتا تھا جو کچھ بھی کرنا ہوتا تھا خود ہی خاموشی کے ساتھ کرلیتا۔ کرنل رحیم شاہ تک سے اتنی گہری مشاورت نہیں ہوتی تھی بلکہ صرف ضروری امور پر باتیں ہوجایا کرتی تھیں۔ رابعہ سلطان کی موت کے بعد یہ تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ رابعہ سلطان شاید اس کی زندگی کی واحد لڑکی تھی جس نے اس پر محبت بھری نگاہ ڈالی تھی اور صحیح معنوں میں صوفی پر قربان ہوگئی تھی۔ شازیہ نے فیضان اور عادل سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا۔

"چھوٹے بابا کی فطرت میں جو تبدیلی رونما ہوئی ہے کیا تم میری اس بات پر یقین کرسکتے ہو کہ ایسا صرف رابعہ سلطان کی موت کی وجہ سے ہوا ہے۔ اب میں نہیں جانتی کہ تم لوگوں نے اس بات پر گہری نگاہ ڈالی یا نہیں کہ رابعہ سلطان چھوٹے بابا سے متاثر تھی۔ چھوٹے بابا کی موجودہ کیفیت یہ بتاتی ہے۔ کہیں نہ کہیں ان کے دل پر بھی ایک بوند ٹپکی تھی۔ بس ایک بوند اور اس کے بعد کم بخت راجہ ناصر نے دوسری بوند کا موقع ہی نہ دیا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ چھوٹے بابا کے اندر لچک ہے۔ یعنی اگر ان سے کوئی محبت کرے، انہیں چاہے تو اس مٹی میں کونپلیں اگ سکتی ہیں۔"

"انسان تو انسان ہی ہوتا ہے شازیہ۔" عادل نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

بہر حال اس وقت صوفی ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ پان کی گلوری منہ میں بے شک دبی ہوئی تھی۔ اس نے بڑے دکھ بھرے انداز میں کہا تھا۔

"جمشید مرزا نے اور کوئی حرکت کی یا نہ کی لیکن ہماری قدیم پانوں کی ڈبیا اور بٹوہ وغیرہ لے گئے۔ اب وہ ان کی تحویل میں ہے تو اس کی واپسی کے لیے انہیں بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ یعنی وہ چیزیں انہیں واپس کرنا پڑیں گی۔ اگر انہوں نے اسے ضائع کردیا ہے تو پھر صوفی جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوگیا۔"

"عارضی طور پر آپ......"

"نہیں......نہیں، بہت سے کام عارضی نہیں ہوا کرتے درویشوں کی دعاؤں سے۔ خیر چھوڑو۔ ہم غیر ضروری باتوں میں الجھ گئے ہیں۔ میں تمہیں شارمن کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس وقت کی بات ہے جب میں باقاعدہ محکمہ پولیس میں تھا۔ ٹکراؤ ہوگیا تھا اس سے، جو کچھ کرنے آیا تھا اسے چھوڑ کر بھاگنا پڑا اور اتفاق کی بات یہ کہ اس کی محبوبہ میرے ہاتھ لگ گئی۔ بڑی عجیب عورت تھی۔ ہم اسے کوئی بڑا نقصان نہ پہنچاتے مگر اس نے خودکشی کرلی۔ لوبیتا اس کا نام تھا۔ نسلاً اسکوپ تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ شارمن کے دل میں میرے لیے انتقام کا جذبہ ضرور ہوگا درویشوں کی دعاؤں سے۔ میرے ذہن میں یہ بات آرہی ہے کہ ایس ایس سجادی کا میرے گھر کے دروازے کے آگے آکر مرنا......"

"بدقسمتی سے ہمیں ایس ایس سجادی کے پروفیشن کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ یہ ڈیوٹی میں فیضان کے سپرد کررہا ہوں۔ تمہارا کام یہ ہے کہ ایس ایس سجادی کا ماضی تلاش کرو۔"

"ٹھیک ہے چھوٹے بابا۔ میں کام شروع کیے دیتا ہوں، لیکن ایک بات پر مجھے حیرت ہے۔"

"کیا؟"

"اگر یہ کام باقاعدہ سازش کے تحت ہوا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ شارمن کو آپ کی نئی رہائش گاہ کے بارے میں معلوم ہوچکا تھا۔" صوفی نے گدھ کی طرح گردن ہلائی اور بولا۔

"بڑی معمولی سی بات کہی ہے تم نے۔"

"نہیں۔ معمولی بات اس خیال سے نہیں ہے چھوٹے بابا کہ بڑے بابا نے یہ عمارت آپ کی رہائش کے لیے حاصل کی ہے اور آپ کی رہائش کو بہر طور خفیہ رکھا جانا تھا۔"

"نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔"

"مطلب۔"

"مجھے اس کی ہدایت دے دی گئی تھی درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"کیا مطلب؟"

"اس عمارت کو نمایاں رکھنا تھا تا کہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ میں اس عمارت میں مقیم ہوں۔ میرا خیال ہے کہ کرنل صاحب اب مجھے ایک باقاعدہ حیثیت دے رہے ہیں درویشوں کے کرم سے۔ یہ بات تو میں تم لوگوں کو بتا چکا ہوں کہ وزیر داخلہ ہماری پشت پر ہیں اور شاہ میر صاحب ہمارے ہر مسئلے میں ہماری مدد کررہے تھے۔ اصل میں کرنل صاحب گرین ہاؤس کو خاص طور سے دوسروں کی نگاہوں سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں اور

یہی اس عمارت میں قیام کا مقصد ہے۔ وہ لوگ صوفی کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ شازیہ نے کہا۔

"ساری باتیں اپنی جگہ لیکن چھوٹے بابا ہوشیار ہونا ضروری ہے خاص طور پر میری رائے ہے کہ آپ کے آس پاس ہم لوگ خفیہ طور پر موجود رہیں۔" صوفی کے ہونٹوں پر باریک سی مسکراہٹ ابھر آئی اور اس نے کہا۔

"نہیں، میرے اردگرد درویشوں کی دعائیں ہیں، ولیوں کا پہرہ ہے، میں اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہوں۔ تم لوگ میرے بارے میں فکر مند نہ ہو۔"

"جمشید مرزا کا مسئلہ کیا ہوگا؟"

"نہیں۔ کچھ نہیں۔ ایسے لوگوں کا اردگرد رہنا مناسب ہوتا ہے۔" دلاور کی بیوی نے آ کر اطلاع دی کہ کرنل صاحب سردار پور سے آگئے ہیں۔ سب نے باہر نکل کر کرنل کا استقبال کیا تھا۔ کرنل مسکراتا ہوا بیساکھی ٹیکتا ہوا آگے بڑھا۔

"واہ گرین فورس پوری پاور میں ہے اس وقت۔ کوئی خاص بات۔"

"جی۔" ڈرائنگ روم کے اس مخصوص حصے میں بیٹھ کر جہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میٹنگ ہوئی تھی۔ کرنل کو بھی ساری تفصیلات بتائی گئیں۔

"مجھے خاصی حد تک اس بارے میں معلومات حاصل ہیں لیکن صوفی صاحب اس شارمن کے بارے میں مجھے تفصیلات کا علم نہیں ہے۔"

"اسرائیلی ایجنٹ ہے۔ ایک بار پہلے بھی یہاں کسی مذموم مقصد کے تحت آیا تھا، لیکن درویشوں کی دعاؤں سے میری نگاہوں میں آگیا۔ خوب چلی میرے اور اس کے درمیان۔ بھاگنا پڑا اسے، مگر اس کی محبوبہ ہمارے ہاتھ آگئی۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ اس نے خودکشی کرلی ورنہ اس سے خاصی اچھی معلومات حاصل ہونے کی توقع تھی۔"

"لازمی بات ہے کہ اس کے ذہن میں انتقام کا جذبہ بھی ہوگا۔" کرنل نے لقمہ دیا۔

"اگر سچ مچ وہ اس سے محبت کرتا تھا تو یہ جذبہ ہونا چاہیے۔" کرنل رحیم شاہ نے چونک کر صوفی کو دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہاں صوفی صاحب ہونا تو چاہیے لیکن سب آپ کی طرح جواں مرد نہیں ہوتے۔" صوفی اس اشارے کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کافی دیر تک یہ مجلس رہی۔ جمشید مرزا کا ذکر ایک بار پھر آگیا۔ کرنل نے کہا۔

"اور تم اسے ایس ایس سجادی کے گھر میں بند کرآئے تھے۔"

"جی ضروری تھا۔"

"کس طرح کا آدمی ہے۔"

"اب میں سمجھ گیا کہ وہ کس طرح کا آدمی ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"میرا خیال ہے کہ میں شاہ میر صاحب سے کہہ کر کوئی مناسب کام کرادیتا ہوں یعنی شاہ میر خا

ب ان کا تبادلہ بھی کرسکتے ہیں۔"

"نہیں شاہ میر خان صاحب کو ایسے چھوٹے موٹے معاملات میں تکلیف دینا مناسب نہیں ہے۔"

"لیکن وہ تمہارے راستے روکے گا صوفی۔"

"درویشوں کا کرم چاہیے جناب یہ بہت اچھی بات ہے کہ تھوڑی سی ادھر ادھر کی باتیں بھی ہوتی باقی سب ٹھیک ہے آپ فکر نہ کریں۔"

"تو پھر اب کیا ارادہ ہے تمہارا۔"

"ویسے تو میں سمجھتا ہوں کہ شارمن نے جو کچھ کیا ہے وہ ایک دلچسپ لیکن ایک خطرناک بات ہے۔ وہ یہ ہے کہ شارمن بارود کا ماہر ہے اور مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ جو پچھلے دنوں تخریبی کارروائیاں ہوئی یعنی مختلف جگہوں پر دھماکے اور تباہی۔ اس میں شارمن کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ یہ تو آپ سمجھتے ہیں کہ تخریبی ...اصر ہر قیمت پر ہمارے ملک میں انتشار چاہتی ہیں اس کے لیے کچھ نام مخصوص ہیں۔ بہرحال اگر شارمن یہاں کسی ایسے مذموم مقصد کے لیے آیا ہے تو یہ اس کی زندگی کا آخری سفر ہوگا درویشوں کے کرم سے۔" آپ اطمینان رکھیں۔"

"مجھے اطمینان ہے۔" کرنل رحیم شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

♥......♥......♥

جمشید مرزا اپنے طرز کی واحد ہی شخصیت تھی۔ بہت ہی عجیب و غریب قسم کا آدمی۔ وہ ایک زمانے ...ں محکمہ پولیس میں براہِ راست ڈی ایس پی بھرتی ہوا تھا اور اس بھرتی ہونے کی وجہ ایک بہت بڑی شخصیت کی سفارش تھی، لیکن کبھی کوئی نمایاں کارنامہ سرانجام نہیں دے سکا تھا اور ہمیشہ اس کوشش میں رہتا تھا کہ کوئی بڑا کام کرڈالے لیکن ممکن نہیں ہوسکا تھا۔ ڈی ایس پی سے ایس پی بننے کا راز بھی بڑا دلچسپ تھا۔ محکماتی طور پر کچھ لوگوں کو ترقیاں دی گئی تھیں اور وہیں ایک بدنصیب افسر کا نام تبدیل ہوگیا اور یہ ترقی جمشید مرزا کو مل گئی۔ خوش پوش آدمی تھا۔ اصل میں ساری کامیابی کا سہرا بیگم صاحبہ کے سر تھا، اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ یہ عہدہ سسرال کی عنایت تھا اور بیگم صاحبہ جہیز میں لے کر آئی تھیں، ورنہ بے چارے جمشید مرزا بہ ذات خود کچھ نہیں تھے۔ اس حساب سے بیگم ان کی شخصیت پر حاوی تھیں۔

حد سے زیادہ اداکاری کے شوقین تھے اور اپنے آپ کو ایک انتہائی مستعد اور قابل فخر پولیس والا سمجھتے تھے لیکن بیگم کے سامنے تو بڑے بڑے سورما بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔ جمشید مرزا تو بھیگے چوہے تھے بلی تو بڑی چیز ہوتی ہے۔ گھر میں ملازم تھے لیکن جمشید مرزا بہ ذات خود بیوی کے ملازم تھے۔ دنیا کے سامنے کی بات اور تھی لیکن جب دنیا کے سامنے نہ ہوتے تو بیوی کے حضور دست بستہ کھڑے رہا کرتے تھے۔ طبیعت میں نخوت تھا اور خاص طور سے اپنے ماتحتوں کے سامنے اپنے آپ کو بہت بلند ظاہر کرنے کے خواہش مند، لیکن صوفی جو کام دکھا گیا تھا وہ ان کے منہ پر بڑی گہری کالک بن گیا تھا۔ ایک ایسا آدمی جس کی بہ قول جمشید مرزا کے کوئی بھی سیدھی کل نہیں تھی اور انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"یار یہ شخص آدمی بھی ہے یا نہیں؟ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی اونٹ ہزار سال کا ہونے کے بعد

اپنی جون بدلنے میں کامیاب ہوگیا ہو۔'' اپنی دانست میں انہوں نے بہت دلچسپ جملہ کہا تھا اور انسپکٹر رازی
جو اس سلسلے میں کام کر رہا تھا، بڑی مشکل سے ہنسنے میں کامیاب ہوا تھا، کیونکہ جمشید مرزا یہی چاہتے تھے لیکن
بہرحال انسپکٹر رازی کے سامنے صوفی ان لوگوں کو کمرے میں بند کر گیا تھا اور جمشید مرزا غصے کی شدت سے
دیوانے ہوگئے تھے۔ موبائل فون پر انہوں نے باہر کھڑے اسٹاف سے رابطہ قائم کیا اور دو والیس آئی اندر آئے
اور انہوں نے دروازہ کھول کر جمشید مرزا کو آزاد کیا۔ اس کے بعد ان لوگوں کی شامت آ گئی۔ جمشید مرزا
معلومات حاصل کر رہے تھے کہ صوفی کدھر سے باہر نکلا۔ کوٹھی کی سرسری تلاشی ضرور لی گئی تھی لیکن اتنی عقل کسی
کو نہیں آئی تھی کہ وہیں صوفی کو تلاش کر لیتے جبکہ یہ بات سب کو بتا دی گئی تھی کہ وہ گیٹ سے باہر نہیں نکلا
ہے۔ بہرحال ایس ایس سجادی کی لاش اسپتال پہنچا دی گئی تھی اور وہاں اس کے بارے میں سرسری سی
تحقیقات ہو رہی تھیں جو ایسے موقع پر ہوا کرتی ہیں۔

جمشید مرزا انسپکٹر رازی کے ساتھ تھانے آ گئے تھے اور سخت غصے کے عالم میں تھے۔

''اس شخص کے بارے میں مجھے تفصیلی رپورٹ درکار ہے۔ اس کی پہنچ محکمہء داخلہ تک کیسے ہے،
ماضی میں یہ کیا کرتا رہا ہے، یہ نہیں جانتا کہ اس نے بھیڑیوں کی بھٹ میں گھسنے کی کوشش کی ہے اس کے تمام
کل پرزے الگ کر کے نہ رکھ دوں تو جمشید نام نہیں ہے۔'' انسپکٹر رازی نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔

''جرات دیکھیے جناب سیدھا سیدھا چونا لگا گیا۔''

''چلو دیکھوں گا جو کچھ ہوا ہے دیکھوں گا۔ تمہاری ڈیوٹی لگاتا ہوں تم اس کا ماضی معلوم کرنے کی
کوشش کرو۔''

''تھوڑا بہت تو مجھے معلوم ہے جناب۔'' انسپکٹر رازی نے کہا اور جمشید مرزا خونخوار نگاہوں سے
اسے دیکھنے لگا۔

''احمقانہ باتیں، احمقانہ باتیں میں کہتا ہوں کہ سارے جہاں کے احمق میرے ہی نصیب میں
لکھے گئے ہیں۔ یہی بتاؤ گے نا تم مجھے کہ ماضی وہ انسپکٹر رہ چکا ہے اور شاید یہ بھی تیر مارو گے تم مجھے بتانے کے
لیے کہ وہ ایک نااہل پولیس انسپکٹر رہا ہے اور جس نے زندگی میں کبھی کوئی نمایاں کارنامہ سرانجام نہیں دیا اور
نتیجے میں بار بار اسے محکمے سے نکالا جاتا رہا ہے۔''

''جی سر بالکل بالکل آپ تو واقعی اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔'' انسپکٹر رازی نے
مکھن لگاتے ہوئے کہا۔

''اتنی معلومات بھی انسان کو نہ ہوں تو لعنت ہے اس پر۔''

''جی سر بالکل۔'' انسپکٹر رازی بولا اور جمشید مرزا چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا لیکن انسپکٹر کے
چہرے پر عقیدت مندانہ آثار تھے۔ چنانچہ جمشید مرزا مطمئن ہوگیا کہ اس کا مذاق نہیں اڑایا جا رہا اور اس نے کہا۔

''مگر میں چاہتا ہوں کہ اس کا بیک گراؤنڈ معلوم کیا جائے۔ آخر وہ وزارت داخلہ تک کیسے پہنچ گیا۔''

''سر ایک بات ہے۔ وہ جو کچھ کر گیا اس کا ثبوت تو ہم نہیں دے سکیں گے۔ آپ یہ بتائیے کہ اس
کے خلاف کیا کریں گے؟''

''میں......'' تم وہ سوچ بھی نہیں سکتے میں جو کچھ اس کے خلاف کروں گا۔ چلو تیاریاں کرو ہمیں
اس کے گھر پر ریڈ کرنا ہے جائے گا کہاں بچ کر جو کرنا ہے وہ کر لیں گے سفارشیں تو بعد میں آتی رہیں گی۔''

''جی سر، کیا کرنا ہے مجھے۔'' انسپکٹر رازی نے سوال کیا۔

''پولیس پارٹی تیار کرو ہم اس کے گھر پر چھاپا ماریں گے۔'' جمشید مرزا خود بھی تھوڑا سا انتہا پسند
تھا۔ پولیس کی تین موبائلوں نے انسپکٹر صوفی کی اس نئی رہائش گاہ کو گھیر لیا تھا جو کرنل رحیم شاہ نے اس کے لیے
مہیا کی تھی۔ اس وقت حسینہ کے علاوہ کوٹھی میں کوئی موجود نہیں تھا۔ جمشید مرزا کی بیل پر حسینہ نے ہی دروازہ
کھولا تھا۔ جمشید مرزا کو دیکھ کر بولی۔

''ہاں بولو کیا بات ہے؟''

''پیچھے ہٹو۔''

''مرد کی اولاد ہوں، پیچھے ہٹنا نہیں سیکھا۔ اس طرف ہوئی جاتی ہوں۔'' حسینہ نے کہا اور دائیں
سمت ہوگئی۔ جمشید مرزا اسے گھورتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ پھر بولا۔

''صوفی سے ملنا ہے۔''

''بات کرنے کی تمیز ہے یا نہیں، تم سے عمر میں تھوڑا بہت ہی چھوٹا ہو تو ہو۔''

''بکواس کیوں کرتی ہو تم، جانتی ہو یہ وردی نہیں دیکھ رہیں۔''

''ارے جاؤ...... جاؤ بہت سی وردیاں دیکھی ہیں۔ میری نند کے سسر فوج میں بہت بڑے افسر
تھے۔ وردی پہن کر آتے تھے۔ سارے ڈرتے تھے۔ میں نہیں ڈرتی تھی۔ اللہ کے فضل سے، ارے یہ کیا تم
اندھے گھوڑے کی طرح اندر گھسے چلے آ رہے ہو، گھر میں گھسنے کی تمیز ہے تمہیں۔''

''بڑھیا مار کھائے گی کیا۔''

''مر گئے مارنے والے میری...... نند کے سسر۔''

''فوج میں تھے۔'' انسپکٹر رازی نے جلدی سے کہا۔

''اے تجھے کیسے معلوم بیٹا۔'' حسینہ سے حیرت سے انسپکٹر رازی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ بہت سے
پولیس والے اندر چلے آئے تھے۔ جمشید مرزا نے کہا۔

''جاؤ اندر تلاشی لو'' اور پولیس والے اندر دوڑ گئے۔

''ارے...... ارے خدا تمہیں سمجھے دیکھو گھر کی کوئی چیز چوری ہوگئی تو حلق میں انگلی ڈال کر نکلوا
لوں گی۔ ارے سمجھا کیا ہے تم لوگوں نے۔''

''بڑی بی شرافت کے ساتھ اندر آؤ۔''

''کون ہے تم میں سے شرافت؟ شکلوں سے تو سارے لفنگے لگ رہے ہو اللہ مارے۔'' حسینہ نے
کہا اور جمشید مرزا کے ساتھ قدم بڑھا کے اندر آ گئی۔

''میں کہتی ہوں تمہیں کیا موت پڑی ہے کیوں آئے ہو یہاں۔''

''تم خاموش نہیں رہو گی۔''

"ہائے کسی کے باپ کا دیا کھاتی ہوں کیا؟ کیوں خاموش رہوں گی؟"

"اندر آؤ۔"

"آ رہی ہوں۔ آ رہی ہوں۔ دھمکی کیوں دے رہے ہو مرضی کی مالک ہوں اندر آؤں یا نہ آؤں۔" حسینہ نے کہا اور اندر داخل ہوگئی۔

"صوفی کہاں ہیں؟"

"ہیں کہا ہے نا تم نے، چلو اب بتائے دیتی ہوں، گئے ہوئے ہیں۔"

"بیٹھ جاؤ۔"

"پھر وہی حکم نہیں بیٹھوں گی۔" حسینہ نے کہا پولیس والے سارے گھر میں صوفی کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ کافی دیر گزر گئی تھی۔ جمشید مرزا نے کہا۔

"یہ لوگ کیا تلاش کر رہے ہیں۔"

"چیزیں ٹٹول رہے ہوں گے۔ رپٹ لکھواؤں گی پولیس میں باقاعدہ تمہارے ہی آدمی تمہیں پکڑیں گے۔ کوئی چیز غائب ہوئی ہو ذرا دیکھو تو سہی بتاتی ہوں تمہیں اچھی طرح سے۔"

"نہیں کوئی کچھ نہیں اڑائے گا آپ ہمیں بتایئے کہ صوفی صاحب کہاں گئے ہیں؟" رازی نے مصلحت سے کام لیا۔

"اے میاں! تم ذرا شریف زادے لگتے ہو، مجھے نہیں معلوم نوکری کرتی ہوں اس گھر میں، مالک کہیں بتا کر جاتے ہیں۔"

"ہوں۔" آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں معزز خاتون۔" انسپکٹر رازی نے کہا اور جمشید مرزا نے چونک کر رازی کو دیکھا۔ رازی نے عاجزی سے گردن ہلا دی تھی۔ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ ان معزز خاتون کو ہینڈل کرنے کا طریقہ اسے آتا ہے۔ براہِ کرم اس میں مداخلت نہ کی جائے۔ چنانچہ جمشید مرزا دانت پیستا ہوا خاموش ہوگیا۔

"جی آپ نے بتایا نہیں معزز خاتون؟"

"اے میاں کیا بتاؤں بس بڑا اچھا انسان ہے فرشتوں کی طرح معصوم۔ نوکرانی میں ہوں گھر کی، نوکر وہ میرا بنا ہوا ہے۔ سارے کام کرتا ہے۔ بس ذرا مزاج کا چڑچڑا ہوگیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں پہلے ایسا نہیں تھا۔"

"کرتا کیا ہے۔" جمشید مرزا نے کہا۔

"تم تو بھیا بات ہی نہ کرو مجھ سے۔ تمہاری صورت دیکھ کر خون کھولتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کسی طویلے میں بندر رہے ہو آج تک انسانوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے تمہیں۔" جمشید مرزا خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ رازی بہ مشکل تمام مسکراہٹیں روک رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"ہاں تو صوفی صاحب کے بارے میں آپ نے یہ نہیں بتایا خاتون کے وہ کیا کرتے ہیں۔"

"اے اگر وہ مجھے بتا دے تو میں تمہیں بتاتی ناں، بس باہر آتے جاتے رہتے ہیں۔ ایک دو دفعہ تو میں نے پوچھا بھی تو کہنے لگے کہ "بی بی اپنے کام سے کام رکھو۔ نوکروں کو زیادہ فضول باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔"

"بھیا نوکر تو ہیں ناں۔ خاموش ہوگئے اپنا سا منہ لے کر۔ اللہ کسی پر یہ وقت نہ ڈالے۔" حسینہ کی آواز رندھ گئی۔ صوفی گھر میں نہیں ملا تھا۔ جمشید مرزا نے کہا۔

"تلاشی لو۔"

"ارے ارے ارے...... یہ جب بھی بولے گا چھپڑ پھاڑ کر ہی بولے گا لے کر دیکھو تلاشی۔"

"نہیں معزز خاتون تلاشی لینا ضروری ہے۔ ہمیں اصل میں کچھ اطلاعات ملی ہیں صوفی صاحب کے بارے میں۔"

"کیا اطلاعات ملی ہیں۔ ذرا مجھے بھی تو بتاؤ؟"

"یہی کہ وہ جرائم پیشہ ہیں اور غلط کام کرتے ہیں۔"

"آئے نہ...... نہ...... ایسا نہ...... ایسا مت کہو وہ...... اور...... غلط کام کرے گا۔" جمشید مرزا کو یہاں سے کچھ نہیں معلوم ہوا تھا۔ صوفی موجود نہیں تھا ورنہ شاید بات کوئی غلط رخ اختیار کر جاتی لیکن بدنصیبی اس وقت یہ تھی کہ معشوق نشیلے دروازہ کھلا دیکھ کر اندر گھس آئے تھے۔ پولیس والوں نے بھی انہیں نہیں روکا تھا۔ ہونق سے آگے بڑھ رہے تھے۔ احاطے میں بھی پولیس والے موجود تھے۔ حیران حیران سے اندر پہنچے تو دھر لیے گئے۔"

"اوہ...... ہو یہ بھی تھے یہ بھی صوفی صاحب کے ساتھی ہیں۔ ایس پی صاحب انسپکٹر رازی جو اس دن صوفی کے گھر آیا تھا۔ اس نے معشوق نشیلے کو بھی دیکھا تھا۔" معشوق نشیلے اس طرح اچھلے جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔

"نہیں...... نہیں...... ہاں...... کیا کیا۔"

"یہ آپ شاعری فرما رہے ہیں کیا؟ جمشید مرزا نے کہا۔

"نن...... نہیں۔ آپ کو...... شش...... شاعری سے دلچسپی ہے۔ ہم شاعر ہیں۔ نشیلے تخلص کرتے ہیں نام معشوق علی ہے۔"

"ہوں...... نشہ کرتے ہو تم۔"

"نن...... نہیں جناب تخلص کرتے ہیں۔"

"یہ کیا ہوتا ہے؟" جمشید مرزا نے سوال کیا۔

"ہوتا ہے سر شاعری میں ہوتا ہے۔"

"ایک شعر عرض ہے دھر چوں...... مہر چوں، مگر چوں خیال چوں۔"

"چوں چوں کے بچے منہ بند کر ایسا تھپڑ پڑے گا کہ منہ ٹیڑھا ہو جائے گا۔"

"یہ داد دی ہے آپ نے ہم تو ٹیکنیکل شعر عرض کیا کرتے ہیں۔ اب دیکھیے ناں زمانہ حال میں یا زمانہ قدیم میں معشوق ہوا کرتے تھے۔ ہمارے جیسے نہیں، بلکہ عجیب عجیب۔ کسی کی کمر نہیں ہوتی تھی، کسی کی گردن کی جگہ صراحی لگی ہوتی تھی۔ نزاکتوں میں بے مثال تھے۔ انگلیاں ککڑیاں جیسی دباؤ تو ٹوٹ جائیں۔"

"اسے لے جا کر باہر گاڑی میں بٹھاؤ۔" جمشید مرزا نے کہا۔

''عزت افزائی کے لیے شکریہ۔ پیدل آئے ہیں پیدل ہی چلے جائیں گے۔'' صوفی صاحب کے پاس آئے تھے۔

''بیٹھو۔''

''بہت بہت شکریہ۔ ایک شعر عرض ہے اس سلسلے میں۔'' جمشید مرزا نے غصے میں آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

''ایسے...... ایسے...... ایسے تو نہیں دماغ سے اتر گیا فوراً کے فوراً۔'' ویسے مصرعہ بولا تھا۔ کھٹ پونیاں...... کھٹ پونیاں...... کھٹ پونیاں...... کھٹ کھٹ جمشید مرزا نے معشوق نشیلے کی گردن دبا دی تھی اور پھر معشوق نشیلے ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد جمشید مرزا نے اس کی گردن چھوڑی اور کہا۔

''لے جاؤ اسے یہاں سے، آج یہ میرے ہاتھوں سے مارا جائے گا۔ تھانے میں پوچھ گچھ کریں گے اس سے۔''

''تھتھ...... تھتھ...... تھانہ۔ ارے باپ رے...... میں کہاں پھنس گیا۔ میں تو بس صوفی صاحب سے ملنے آیا تھا۔ دراصل کچھ پیسے درکار تھے۔ میری مدد کرتے ہیں وہ۔''

''لے چلو۔'' جمشید مرزا دھاڑا اور پولیس والے معشوق نشیلے کو بازوؤں سے لٹکائے ہوئے باہر لے گئے۔ انہوں نے دونوں پاؤں سکیڑ لیے تھے۔

''کیا کہتے ہو؟''

''سر میرا خیال ہے۔ پولیس والوں کی ڈیوٹی لگا دیجیے وہ اطلاع دیں گے تو ہم یہاں آ جائیں گے۔''

''ہوں ٹھیک ہے''

''کہو، کیا اسے بھی لے چلیں؟''

♥......♥......♥

صوفی اندر داخل ہو گیا۔ حسینہ نے دروازہ کھولتے ہی آغاز کر دیا تھا۔

''وہ آئے تھے پولیس کی گاڑی میں بیٹھ کر یہاں۔ خوب توڑ پھوڑ مچائی۔ اے میں کہتی ہوں تمہارا کاروبار کیا ہے۔ آخر مجھ جیسی شریف زادی یہاں آ کر پھنس گئی۔ توبہ۔ توبہ۔ پولیس کے حملے ہوتے ہیں۔''

''پو...... پولیس کے حملے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''بکواس مت کرو برے کام کسی درویش کی دعا سے نہیں ہوتے۔ خود تم جیسے لوگ درویش بن کر بیٹھ جاتے ہیں اور یہ حلیہ جو تم نے بنا رکھا ہے ناں دنیا کو بے وقوف بنا لے تو بنا لے حسینہ بے وقوف نہیں بنے گی۔''

''حسینہ بے وقوف کہاں بنتی ہے مگر آپ ہمیں ذرا تفصیل تو بتائیں۔''

''جوتی بتائے میری تفصیل۔ گھس آئے کم بخت مارے، ذرا بھر میں، جیسے ابا نے کوٹھی خرید کر دی ہو۔ نہ جانے کیا کیا کچھ کیا اور پھر وہ آ گئے تمہارے لے پالک۔''

''لل...... لل...... لل...... لے پالک وہ کون ہیں درویشوں کے کرم سے۔''

''کہہ دیا ناں درویشوں کا تذکرہ میرے سامنے نہ کیا کرو۔ خود بھی گناہ گار ہوتے مجھے بھی گناہ گار

کرو گے۔ پتا نہیں کرنل صاحب نے کون سی دشمنی نکالی ہے۔ ملے تو کہوں گی کہ بھیا کسی مویشی خانے میں نوکری دلا دو یہاں سے نکال لو یہاں تو ایک ہی جانور نے دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔'' حسینہ بکتی جھکتی رہی۔ صوفی اندر داخل ہو گیا۔ بہرحال پتا چل گیا تھا کہ جمشید مرزا نے پولیس کی نفری کے ساتھ یہاں پر تلاشی لی ہے۔ صوفی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جمشید مرزا جو کچھ کر رہا ہے اس کا اسے شدید نقصان اٹھانا پڑ سکتا ہے لیکن صوفی کے اندر جو تبدیلی پیدا ہوئی تھی وہ بالکل مختلف تھی۔ یہ بھی پتا چل گیا کہ معشوق نشیلے کو تھانے لے جایا گیا ہے۔ بہرحال وہ سوچتا رہا پھر اس نے تھانے کا نمبر تلاش کر کے فون کیا۔

دوسری طرف اتفاق سے انسپکٹر رازی نے ہی فون اٹھایا تھا۔ اس کی آواز سنائی دی۔

''پولیس اسٹیشن۔''

''کون صاحب بول رہے ہیں۔''

''انسپکٹر رازی۔ آپ کو کس سے بات کرنی ہے۔''

''چلیے آپ ہی سہی، میں صوفی بول رہا ہوں۔''

''آہا۔ صوفی صاحب بڑے بہادر آدمی ہیں آپ۔''

''درویشوں کا کرم ہے ورنہ ہم کس قابل ہیں حق اللہ۔'' صوفی نے کہا۔

''نہیں میرا خیال ہے آپ پر درویشوں کا کرم نہیں ہے۔ ایس پی صاحب کے ساتھ جو بدتمیزی آپ نے کی ہے اس کا آپ کو بھرپور نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔'' صوفی ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کے لیے تبدیل ہوا تھا لیکن پھر اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور بولا۔

''درویش آپ پر رحم کریں۔ آپ کے برے وقت کی پیش گوئی کرنا ہماری مجبوری ہے۔''

''میرے برے وقت کی۔''

''جی ہاں کیوں کہ آپ نے ہم سے بدتمیزی کی ہے۔ باقی رہا ایس پی صاحب کا معاملہ تو میرا خیال ہے ایس پی کا عہدہ انہیں راس نہیں آ رہا۔ ایک مہینے کے اندر اندر وہ ڈی ایس پی ہو جائیں گے۔''

''آپ ولی اللہ ہیں۔''

''استغفر اللہ۔ ہمیں یہ درجہ کہاں سے مرحمت ہو سکتا ہے خیر باقی تو ساری بعد کی باتیں ہیں ہمارے دوست کو ہمارے گھر سے اٹھا کر لے گئے ہیں آپ، معشوق نشیلے ہے ان کا نام۔''

''جی ہاں لاک اپ میں ہیں۔''

''ایک منٹ کے اندر اندر انہیں معذرت کر کے چھوڑ دیجیے گا کوئی ضمانت وغیرہ نہیں ہو گی ان کی ان سے صاف صاف کہہ دیجیے کہ صوفی نے ان کے لیے حکم دیا ہے۔''

''حکم۔''

''جی۔ آپ کا کیا خیال ہے آپ سے درخواست کی جائے۔''

''صوفی صاحب بہت زیادہ ہواؤں میں اڑ رہے ہیں آپ۔''

''نہیں ہم تو زمین پر ہی قدم رنجہ فرمائے ہوئے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے البتہ آپ اپنے

اڑنے کا سامان نہ کیجیے گا۔ انسپکٹر کے عہدے سے سب انسپکٹر کے عہدے پر آنا اور پولیس ہیڈ آفس میں ڈیوٹی دینا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔''

''جی...... جی...... جی۔ ایک بات آپ ذہن میں رکھیے صوفی صاحب۔ میں نے اگر آپ پر ہاتھ ڈال دیا تو آپ کی تمام اڑان ختم ہو جائے گی۔''

''یار کیسے لوگ ہیں آپ۔ خیر میں آپ سے زیادہ بات نہیں کروں گا۔ معشوق نشیلے کو اب سے دس منٹ کے اندر اندر نہ چھوڑا گیا تو سمجھ لیجیے کہ آپ ایس آئی بن گئے اور جمشید مرزا اے ایس پی۔''

''شٹ اپ۔'' انسپکٹر رازی کی آواز سنائی دی اور اس نے غراتے ہوئے فون کریڈل پر پٹخ دیا۔

صوفی نے خود بھی ریسیور رکھا اور گہری سانسیں لینے لگا۔ تھوڑی دیر وہ اسی طرح کھڑا سوچتا رہا اور اس کے بعد وہ ایک کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ یہاں سے تہ خانے میں اترنے کا راستہ تھا۔ تہ خانے میں سے اس نے کچھ چیزیں نکالیں اور ایک کینوس بیگ شانے پر لاد لیا۔ یہ سفری بیگ تھا اور اس میں نہ جانے کیا کیا سامان بھرا ہوا تھا۔ پھر وہ باہر نکلا اور پھر ایک گیراج سے اس نے نئی موٹر سائیکل نکالی۔ یہ وہ مشہور زمانہ موٹر سائیکل نہیں تھی جسے صوفی کی شخصیت کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت تھا بھی وہ بدلے ہوئے انداز میں اور اگر شازیہ اور دوسرے لوگ اسے اس انداز میں دیکھ لیتے تو بہت خوش ہوتے۔ اچھا خاصا اسمارٹ آدمی نظر آ رہا تھا۔ لباس بھی ڈھنگ کا ہی پہنا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور برق رفتاری سے روانہ ہو گیا۔ بہت سے فاصلے طے کرتا ہوا وہ ایک لمحے کے لیے ایس ایس سجادی کی کوٹھی کے سامنے رکا اور پھر وہاں سے آگے بڑھتا چلا گیا لیکن زیادہ دور نہیں کچھ دور جانے کے بعد اس نے موٹر سائیکل جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں روکی اور خود محتاط انداز میں وہاں سے واپس ایس ایس سجادی کی رہائش گاہ کی طرف چل پڑا۔ یہ بات اس کے لیے ایک معما بنی ہوئی تھی کہ ایس ایس سجادی آخر کرتا کیا ہے۔ شارمن کا نشان سامنے تو آیا تھا لیکن ابھی تک شارمن کا کوئی پتا نہیں چلا تھا۔ اس کا نام نوبل شارمن تھا اور وہ بارود کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ صوفی کے ذہن میں بڑی تشویش تھی اگر وہ یہاں آیا ہے تو آخر کیوں اور ایس ایس سجادی کا سارا معاملہ...... شارمن نے اگر صوفی کو اپنی آمد کی اطلاع دی ہے ایس ایس سجادی کے قتل سے تو بہر حال یہ بھی ایک سنسنی خیز بات ہے، کیونکہ اس کے بعد وہ اپنے عمل کا آغاز کرے گا اور اس کا عمل ظاہر ہے یہی سب کچھ تھا یعنی تخریب کاری، بم دھماکے اور پلوں وغیرہ کو اڑانے کی کوشش۔

صوفی کے دل میں اس قسم کی تشویش تھی۔ وہ کوٹھی کی پشت پر پہنچ گیا۔ یہاں ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔ یہاں ایک جگہ رک کر تھیلے سے بڑا ٹرانسمیٹر نکالا اور اس پر گرین فورس کے ان لوگوں کو ہدایت دینے لگا جو اس عمارت کی نگرانی کر رہے تھے۔

''ہاں کیا صورت حال ہے؟''

''پولیس والے بے پروائی سے اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہے ہیں۔ دو افراد ہیں جو بیداری کے شکار نظر آ رہے ہیں اور کوئی تبدیلی یہاں نہیں ہوئی۔''

''اوکے۔'' اس نے ٹرانسمیٹر بند نہیں کیا تھا کہ اچانک اسے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں

سنائی دیں اور وہ بڑی احتیاط سے کسی لچک دار سانپ کی طرح نشیب میں اترتا چلا گیا۔ ابھی وہ سطح زمین تک اترنے بھی نہیں پایا تھا کہ دفعتاً کوئی اس پر آ گیا۔ نہ صرف آ گرا بلکہ اس سمیت نشیب میں اترتا چلا گیا۔ صوفی نے گرتے گرتے کوشش کی تھی کہ حملہ آور کے دونوں ہاتھ اس کی گرفت میں آ جائیں اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو گیا لیکن دفعتاً ہی اس کے حلق سے ایک بھرائی ہوئی آواز نکلی۔

''درویش...... درویش۔ درویش رحم کریں۔'' ایک لمحے میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی مرد کا جسم نہیں ہے دونوں لڑھکتے ہوئے سطح زمین تک پہنچے۔ حملہ آور نے اٹھ کر بھاگنا چاہا لیکن اس کے بال صوفی کی گرفت میں آ گئے اور دوسرے لمحے ایک نسوانی چیخ فضا میں لہرا گئی۔ وہ کراہ کر پلٹی اور صوفی کے بازو پر گھونسے مارنے لگی۔

''درویش...... درویش آپ پر بھی رحم کریں اور مجھ پر بھی براہِ کرم جدوجہد نہ فرمائیے گا۔ ہم آپ کو چھوڑیں گے نہیں۔'' صوفی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

''کتے میرے بال چھوڑو بال ٹوٹ جائیں گے۔''

''نہیں محترمہ غلط فہمی ہوئی ہے آپ کو۔ آپ کے بال کسی کتے نے نہیں پکڑے بلکہ یہ ہم ہیں۔''

اچانک ہی اس نے محسوس کیا کہ جیسے حملہ آور نے ہاتھ پاؤں ڈال دیے ہوں لیکن صوفی اب بھی اس کے بال مٹھی میں جکڑے ہوئے تھا۔''

''خدا کے لیے مجھے جانے دو میں چور نہیں ہوں۔ بس یوں سمجھ لو کہ ایک شر کا شکار ہو گئی مجھے کیا پتا تھا تم یہاں مر رہے ہو۔''

''دیکھیے غلط بیانی نہ فرمائیے گا۔ ہمیں حقیقتوں کا ادراک ہو جاتا ہے۔''

''تم پاگل ہو کیا پتا نہیں کیا کیا بک رہے ہو۔'' وہ بولی۔

''کچھ دیر کے لیے خاموشی اختیار کیجیے کہ بات آگے بڑھے۔''

''مجھے اٹھنے دو۔'' وہ پھر منمنائی۔

''کیا مجھے تمہارا گلا گھونٹنا پڑے گا اب خاموش رہو۔'' صوفی غرایا اور لڑکی ایک دم خاموش ہو گئی۔

صوفی خود بھی خاموش ہو کر مختلف قسم کی آوازیں سنتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد فضا میں سرچ لائٹ کی شعاعیں دکھائی دیں۔ صوفی نے کہا۔ اب کم از کم موٹر سائیکل تو ان کے ہاتھ ضرور آ جائے گی۔ ایسے میں پولیس کے علاوہ اور کون سرچ لائٹ استعمال کرے گا۔ اس کا مقصد ہے کہ گرین فورس کے کمزور نوجوانوں کو صورت حال کا علم ہی نہیں ہے۔ پولیس نے یہاں باقاعدہ ڈیرہ جمایا ہوا ہے۔ بہر حال وہ خاموش پڑا رہا۔

کچھ دیر کے بعد سرچ لائٹ کی شعاعیں غائب ہو گئیں۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ لوگ نشیب کی طرف آنے کی ہمت نہیں کریں گے لیکن پھر بھی وہ محتاط رہنا چاہتا تھا لیکن اس بلا کا کیا کیا جائے جس کے بال اب بھی اس کی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ سوچتا رہا۔ دوسری طرف وہ لڑکی اس طرح خاموش ہو گئی تھی جیسے گہری نیند سو گئی ہو۔ صوفی کو کچھ خیال آیا اس نے اس کے بالوں پر گرفت مضبوط کر کے جھٹکا دیا اور وہ پھر کراہی۔

''کیا مصیبت ہے۔''

''سوتو نہیں گئیں تم۔''

''مجھے چھوڑ دو...... چھوڑ دو...... میں کہتی ہوں مجھے تم چھوڑ دو۔'' یک بہ یک وہ زور آزمائی پر آمادہ نظر آنے لگی۔

''سارے بال اکھڑ کر مٹھی میں آجائیں گے۔'' صوفی نے کہا۔

''چھوڑ دو مجھے، ورنہ میں شور مچاتی ہوں۔''

''اوہ ہو...... تب تو شاید تمہارا گلا ہی گھونٹنا پڑے۔'' صوفی کی آواز میں ایک انوکھی غراہٹ ابھر آئی۔ دفعتاً اوپر سے آوازیں آنے لگیں۔ کئی لوگ بہ یک وقت بول رہے تھے۔ صوفی ان کی آوازیں سننے کی کوشش کرنے لگا اور اسے اندازہ ہوگیا کہ موٹر سائیکل ان کے ہاتھ لگ گئی ہے۔ اب کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان میں سے کوئی ادھر بھی آنکلے۔ ان کے پاس سرچ لائٹ تو تھی ہی۔ اس نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ تھوڑے ہی فاصلے پر تاریکی کچھ زیادہ گہری معلوم ہوئی۔ غالباً یہ کسی قسم کی جھاڑیاں تھیں۔

''چلو کھسکو ادھر چلو۔'' صوفی نے جھاڑیوں کی طرف اشارہ کرکے آہستہ سے کہا۔

''کک...... کیوں؟''

''کیا تم آوازیں نہیں سن رہیں۔ وہ ادھر ہی آرہے ہیں۔''

''کون ہیں وہ۔''

''پولیس۔''

''اور تم کون ہو؟'' لڑکی نے سوال کیا۔

''ایک عاشق درویش۔'' بس اس سے زیادہ کیا بتائیں۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے تم کوئی اچھے آدمی نہیں معلوم ہوتے۔''

''حق اللہ...... حق اللہ۔ دفعتاً وہ اس پر پوری طرح جھکا اور دونوں ہاتھوں سے اس لڑکی کو اٹھالیا۔ اب وہ جھکا جھکا جھاڑیوں کی طرف بڑھ رہا تھا اور وہ لڑکی اس کی گرفت سے نکل جانے کے لیے مچل رہی تھی لیکن نہ جانے کیوں اس نے اپنی آواز بند رکھی تھی اور شور نہیں مچایا تھا۔ جھاڑیوں کی پشت پر پہنچ کر صوفی نے اسے کسی وزنی بوجھ کی طرح پھینک دیا۔''

''تم انسان ہو یا جانور۔''

''عام طور سے لوگ ہمیں اونٹ سے تشبیہ دیا کرتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے، لیکن ہم کسی کی بات کا برا نہیں مانتے۔''

''میں پوچھتی ہوں تم کون ہو؟''

''تعارف اگر باقاعدہ ہو تو زیادہ دلچسپ رہے گا درویشوں کے کرم سے۔ آپ پہلے اپنے بارے میں بتایئے۔''

''میں کیوں بتاؤں؟''

''تو پھر ہماری یہ ڈیوٹی کیوں لگائی جارہی ہے۔'' صوفی نے کہا۔

''دیکھو میں اب بھی کہتی ہوں مجھے جانے دو۔''

''تعارف کے بغیر تو یہ ممکن نہیں ہوگا چاہے ساری رات یہیں گزر جائے...... چاہے ساری رات گزر جائے۔''

''ہوں۔ تو پھر یہ لو لڑکی نے جنبش کی۔ یہ بات تو اس کے فرشتے بھی نہیں جانتے تھے کہ شدید تاریکی کے باوجود اس کے مدمقابل کی آنکھیں الوؤں کی طرح دیکھنے کی عادی ہوں گی۔ اس نے پستول نکالا ہی تھا کہ صوفی نے اس کے ہاتھ پر جھپٹا مارا اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر صوفی کے ہاتھ میں پہنچ گیا۔ صوفی کو یقین تھا کہ وہ غیر مسلح نہیں ہوگی۔ جیسے ہی اس نے پستول کی جھلک دیکھی تیزی سے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور دوسرے ہی لمحے پستول اس کے ہاتھ میں آگیا لیکن اس کے ساتھ ہی پھر اس کے بال اس کی مٹھی میں جکڑ کر رہ گئے تھے۔

''ہوں، تو آپ نے یہ ثابت فرما دیا محترمہ کہ آپ جرائم پیشہ ہیں، لیکن ہم اب بھی آپ کے ساتھ وہ سلوک نہیں کریں گے جو کسی جرائم پیشہ فرد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ اب آپ اوقات میں آجائیں۔ اصل میں اگر یہاں کچھ لوگ ہماری تلاش میں سرگرداں نہ ہوتے تو ہم آپ کے ساتھ دوسرا سلوک کرسکتے تھے۔''

''میں کہتی ہوں مجھے چھوڑ دو ورنہ دیکھو اچھا نہیں ہوگا۔''

''آخری الفاظ یہی ہوا کرتے ہیں اور اس کے بعد نیک بیبیاں ٹسوے بہانہ شروع کردیتی ہیں۔''

''تم آخر ہو کون؟''

''عرض کر دیا اور جو ایک بار کہہ دیا سو کہہ دیا ورنہ۔''

''ڈیڈ کراس۔'' لڑکی سرگوشی کے انداز میں بولی اور صوفی چونک پڑا۔'' ڈیڈ کراس شارمن کا نشان تھا اس کا مطلب کہ اس لڑکی کا تعلق شارمن سے ہے۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''نوبل شارمن۔'' لڑکی بری طرح اچھل پڑی تھی۔ اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر صوفی کو دیکھا اور بولی۔

''اتنی دیر سے کیوں جھک مار رہے تھے۔''

''اور آپ کیا کر رہی تھیں؟''

''لعنت ہے...... لاؤ میرا پستول مجھے واپس دو۔''

''یہ لو، صوفی نے انتہائی پھرتی سے اس کی پستول کے چیمبر خالی کیے اور پستول اس کے حوالے کردیا۔

''مقامی آدمی معلوم ہوتے ہو؟''

''ظاہر ہے جس مقام پر ہیں اللہ نے وہیں اچھار کھا ہے۔''

''میرے بال اکھاڑ کر رکھ دیے۔ تم یہاں کیا کر رہے تھے؟''

''بس جو کچھ بھی کر رہے تھے۔ اچھا کر رہے تھے۔''

''میں تو مقامی جگہ تک پہنچ گئی تھی۔ اس آواز نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔''

''اوہو.....تو آپ بھی اسی آواز کا شکار ہوئی ہیں۔''

''تم کس سلسلے میں آئے تھے۔''

''بہت سے معاملات تھے۔''

''خیر ہوگا میں یہاں سے زیادہ دور نہیں رہتی۔''

''لیکن ابھی ہم اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر سکتے۔''

''کیوں؟''

''ارے دیکھ نہیں رہیں چھپے ہوئے لوگ حرکت میں آگئے ہیں۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''کچھ تو باوردی ہیں جو کھلے عام پہرہ دے رہے تھے اور کچھ سی آئی ڈی والے جو ادھر ادھر چھپ کر عمارت کی نگرانی کر رہے تھے۔ اچھا ہوا کہ تم نے اندر گھسنے کی کوشش نہیں کی۔''

''میں سچ کہتی ہوں کہ اس طرح اچانک آواز نے بوکھلا دیا تھا ورنہ میں اس طرح پہنچتی کہ سی آئی ڈی بھی جھک مار کر رہ جاتی۔''

''کوئی چور دروازہ۔''

''تو اور کیا۔ میرے علاوہ کسی اور کو اس کا علم نہیں ہے۔'' صوفی دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ لڑکی سے کچھ معلومات حاصل ہو سکیں گی۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہی پھر وہ بولی۔

''میں دیکھوں کہ سڑک کی کیا پوزیشن ہے؟''

''مردوں کا کام مردوں پر زیادہ سجتا ہے۔ آؤ۔'' صوفی نے کہا اور اس کے بعد دونوں جھکے جھکے چڑھائی پر چڑھنے لگے۔ کچھ دور چلنے کے بعد صوفی نے اسے پیچھے ہی روک دیا اور خود سینے کے بل کھسکتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ ماحول بہ ظاہر بالکل سنسان نظر آ رہا تھا۔ کچھ دور سامنے ایک دھبا سا نظر آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر آنکھیں پھاڑنے کے بعد یہ اندازہ ہو گیا کہ موٹر سائیکل بھی وہیں موجود ہے جہاں صوفی نے چھوڑی تھی۔ وہ چپ چاپ پلٹ پڑا۔

''کیا بات ہے؟'' لڑکی سرسراتی آواز میں بولی۔

''چال چل رہے ہیں۔ احمق کہیں کے۔'' واپس چلو صوفی نے کہا۔

''مطلب۔''

''آؤ.....آؤ۔'' صوفی نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور نشیب میں اترتا چلا گیا۔ اس بار وہ جھاڑیوں کے قریب رکنے کے بجائے آگے بڑھتے چلے گئے تھے۔''

''کہاں جا رہے ہو؟''

''تم نے کہا تھا کہ تم قریب ہی رہتی ہو۔''

''ہاں ریڈ اسکوائر وہ سامنے۔''

''اوہو.....اچھا خاصا فاصلے پر ہے۔''

''ہاں۔''

''کیسے آئی تھیں یہاں پر پیدل۔''

''نہیں رکشا سے۔''

''میری موٹر سائیکل اب بھی ادھر ہی موجود ہے۔'' صوفی ہاتھ اٹھا کر بولا۔

''تو پھر اسے کیوں نہ لے لیا جائے۔''

''بس درویشوں کی اجازت نہیں ہے ورنہ میں اتنا ہی عقل مند ہوتا۔''

''کیا مطلب؟''

''سیدھی سی بات ہے۔ انہوں نے موٹر سائیکل دیکھ لی ہے۔ ان کے پاس سرچ لائٹ بھی تھی لیکن انہوں نے میری گاڑی وہاں سے ہٹائی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ گاڑی کے آس پاس ہی چھپے ہوئے انتظار کر رہے ہوں گے کہ میں وہاں جا کر گاڑی حاصل کروں درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''اوہ.....تم کافی چالاک معلوم ہوتے ہو، لیکن ایک بات بتاؤ۔''

''پوچھو۔''

''گاڑی کے نمبر سے وہ تم تک نہیں پہنچ جائیں گے۔'' صوفی خاموش ہو گیا۔

''جواب نہیں دیا تم نے۔''

''درویش اس سلسلے میں بھی کچھ کر ہی لیں گے۔''

''یہ تم نے درویش درویش کیا لگا رکھی ہے؟''

''میں صورت سے تمہیں کیا معلوم ہوتا ہوں درویشوں کے کرم سے۔''

''بس درویشوں کے کرم ہی معلوم ہوتے ہو۔'' لڑکی نے گہری سانس لے کر کہا اور گردن ہلائی پھر بولی۔

''مگر تم.....مطلب ہے۔ ریڈ کراس میں، مگر آدمی تو چالاک ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ مقامی طور پر تمہیں نمائندہ مقرر کر کے غلطی نہیں کی گئی۔ ویسے ایک بات کہوں۔''

''کتنی دور پیدل چلنا پڑے گا۔''

''چلتے ہیں۔'' صوفی نے کہا اور وہ لوگ وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ صوفی اس وقت بالکل ہی بدلی ہوئی کیفیت کا شکار تھا۔ واقعی اس کے شناساؤں نے اسے اس عالم میں شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔ ایس ایس سجادی والی عمارت بہت پیچھے ہی رہ گئی تھی۔ وہ لمبا چکر لے رہے تھے۔ صوفی کو اندازہ ہو چکا تھا کہ کہاں سے مڑ کر وہ سیدھے ریڈ اسکوائر والی عمارت تک پہنچ جائیں گے، لیکن دفعتاً انہیں پھر ایک دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ سرچ لائٹوں کی شعاعیں میدان میں دور تک چکرانے لگی تھیں۔ ایک بار روشنی کی زد میں آئے اور پھر اس کے دائرے میں جکڑ کر رہ گئے۔ سرچ لائٹ ان کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہی تھی۔

''یہ کیا ہوا؟'' وہ بوکھلا کر بولی۔

''پرواہ نہ کرو درویشوں کے کرم سے ویسے تمہارا نام کیا ہے؟''

"رینا......رینا سیسل۔"

"عیسائی ہو؟"

"ہاں۔"

"یہ مسٹر سیسل تمہارے شوہر ہیں۔"

"نہیں میرے فادر۔"

"تمہارے گھر پر اور کون ہے؟"

"کوئی بھی نہیں میں تنہا رہتی ہوں۔"

"اوہ......ہو......وہ دیکھو پولیس والے ہماری طرف آ رہے ہیں۔" سرچ لائٹ ان کے ساتھ ہی حرکت کر رہی تھی۔ اور وہ پوری طرح روشنی میں تھے۔ لڑکی بھی پوری طرح روشنی میں نہائی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ لڑکی کافی خوب صورت تھی۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ چوبیس پچیس سال ہی ہوگی۔ سیاہ جیکٹ اور سیاہ پتلون ہی میں ملبوس تھی۔ صوفی نے کہا۔

"تمہارے چہرے کی سفیدی تمہارے کپڑوں پر اتر گئی ہے۔ اپنے کپڑے جھاڑ لو۔" لڑکی نے یہی کیا تھا۔ دفعتاً ان کی طرف آنے والوں میں سے کسی نے گرج کر کہا۔

"رک جاؤ ورنہ گولی مار دی جائے گی۔" صوفی نے ایک دم ہاتھ اٹھا دیے اور رک گیا۔ وہ تیزی سے قریب آ گئے تھے۔ صوفی نے کہا۔

"کیا بات ہے خیریت؟"

"تم لوگ یہاں اس وقت کیا کر رہے ہو؟"

"یہ کوئی ممنوعہ علاقہ تو ہے نہیں ہم یہاں چہل قدمی کر رہے ہیں۔"

"آپ کون ہیں۔"

"سر سے پاؤں تک آدمی۔"

"اصل میں یہاں ایک قتل ہو گیا ہے۔"

"تو پھر۔" صوفی نے کہا۔

"آپ کا قیام کہاں ہے؟"

"وہ سامنے والی عمارت میں ریڈ اسکوائر فلیٹ نمبر 20۔" صوفی بدستور آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ سرچ لائٹ کے دائرے سے باہر نکل گئے۔ لڑکی کچھ زیادہ ہی خوف زدہ نظر آ رہی تھی، لیکن اس کے بعد کسی نے انہیں روکا نہیں۔"

"کمال کر دیا تم نے واقعی۔"

"یہ کمال میرا نہیں درویشوں کا ہے جن کے بارے میں تم بار بار پوچھ رہی ہو۔ اپنے نیک معاملات درویشوں کے سپرد کر دو تمہیں دقت نہیں ہوگی۔ وہ آبادی کے قریب پہنچ گئے اور پھر ریڈ اسکوائر کی عمارت تک لڑکی نے کہا۔

"مگر تم نے انہیں صحیح پتا کیوں بتا دیا؟"

"بے فکر رہو کوئی ادھر کا رخ بھی نہیں کرے گا۔ انہیں تو کسی ایک آدمی کو کسی نہ کسی طرح اس میں پھانسنا ہے۔"

"کیسے۔"

"جس کے گھر کے دروازے پر ایس ایس سجادی کی لاش ملی تھی۔"

"اس کا نام شاید صوفی ہے۔" لڑکی نے کہا۔

"تم اسے جانتی ہو۔" صوفی ایک دم سمجھ گیا۔

"ہاں اکثر ہماری میٹنگوں میں اس کا نام آیا ہے۔"

"چلو......چلو۔ رک کیوں گئیں اندر چلو۔"

"آؤ۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ عمارت کافی بڑی معلوم ہوتی تھی۔ کہیں بھی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ برآمدے میں آئے۔ سوئچ آن کرنے کی آواز سنائی دی اور برآمدہ روشن ہو گیا۔ صوفی چاروں طرف دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

"اتنی بڑی عمارت میں تنہا رہتی ہو؟"

"صرف دو کمرے میرے پاس ہیں اور بقیہ دوسرے معاملات میں استعمال ہوتے ہیں۔ صوفی نے گردن ہلائی اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ غیر متوقع طور پر وہ بڑی گہرائیوں میں پہنچ گیا ہے۔ نوبل شارمن بہت خطرناک آدمی تھا۔ صوفی کے ہاتھوں اسے یہاں بدترین حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس لیے صوفی ان کے علم میں تھا لیکن شاید نوبل شارمن کے بقیہ افراد صوفی کی شکل سے واقف نہیں تھے اس لیے لڑکی بھی اسے نہیں پہچان سکی تھی۔ عمارت سنسان پڑی تھی۔ وہ مختلف راہ داریوں سے گزرتی ہوئی بلب روشن کرتی جا رہی تھی۔ آخر کار وہ ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔

"نشست کا کمرا تھا اور سلیقے سے سجایا گیا تھا۔

"بیٹھو۔" لڑکی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور صوفی چاروں طرف کا جائزہ لیتے ہوئے بیٹھ گیا۔

"اب یہ بتاؤ چائے پیو گے یا کافی۔"

"کچھ بھی نہیں۔"

"پی لو میرا خود بھی دل چاہ رہا ہے۔"

"میں زیادہ دیر رک نہیں سکوں گا، کیونکہ جو کچھ کرنا ہے اسی وقت کرنا ہے۔"

"میں نہیں سمجھی۔"

"یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ تم چور دروازے سے واقف ہو۔ میرا مطلب ہے ایس ایس سجادی کی رہائش گاہ کے چور دروازے سے۔"

"اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے۔"

"کیا جاننا چاہتی ہو؟"

''میرا مطلب ہے تم ہماری آرگنائزیشن کے لیے کب سے کام کرتے ہو۔''

''خاصا وقت گزر گیا۔''

''ایک بات بتاؤ۔''

''کیا۔''

''سجادی کی موت کی خبر آج ہی وہاں پہنچ گئی تھی۔''

''صرف دو گھنٹے کے بعد۔''

''تو پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''کوٹھی میں داخل ہونا بہت ضروری ہے۔''

''کیوں؟'' وہ اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''کاغذات۔'' صوفی نے اندھیرے میں چیختے ہوئے کہا۔

''ہم بے خبر تو نہیں ہیں ویسے تم آرگنائزیشن میں کیا عہدہ رکھتے ہو؟''

''مقامی انچارج۔ چلو چھوڑو ان باتوں کو۔ اب جلدی سے چور دروازے کی نشان دہی کردو اور یہ بھی بتادو کہ کاغذات کہاں ملیں گے۔ لڑکی چونک کر اسے گھورنے لگی تھی۔ پھر اس نے کہا اگر تم انچارج ہو تو یہ بات تمہیں معلوم ہونی چاہیے تھی۔''

''اب بحث بھی کروگی۔ صوفی آنکھیں نکال کر بولا۔ لڑکی اسے بہ غور دیکھے جا رہی تھی۔ پھر اچانک ہی اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے صوفی کو گھورتے ہوئے کہا۔ اب جو کچھ ہوگا درویشوں کی دعاؤں سے ہوگا۔'' اس نے کہا اور ہنس پڑی۔ دوسرے لمحے اس کے ہاتھ میں پستول نظر آنے لگا۔ نال صوفی کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔ صوفی حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔

''ہاں مجھے اندازہ ہوگیا کہ تم ہم میں سے نہیں ہو لیکن تم نے بڑی کامیابی سے مجھے بے وقوف بنایا۔ آدمی بے شک چالاک ہو لیکن یہ نہیں جانتے کہ آرگنائزیشن کی کیفیت ذرا مختلف ہے۔ ہم لوگ مختلف انداز میں ایک دوسرے کے شناسا ہوتے ہیں۔''

''تو اب کیا تم اب مجھے ماردوگی درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''درویشوں کی دعاؤں سے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اب ان فضول باتوں کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ کون ہو تم؟'' اور اس چکر میں کیسے پڑے ہو؟''

''بس نصیب کے بارے میں جانتی ہو۔ دو ہوتے ہیں خوش نصیب اور بدنصیب۔''

''بکواس مت کرو۔ مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو؟'' اور ان معاملات سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''دیکھو میری اور اپنی عمر کا فرق محسوس کرو تم کس انداز میں مجھ سے بات کر رہی ہو۔''

''پستول دیکھ رہے ہو یہ۔''

''ہاں دیکھ رہا ہوں...... پھر۔''

''مطلب یہ کہ تم اس کا نشانہ بھی بن سکتے ہو۔''

''اس سے کیا فرق پڑے گا؟''

''بولو گے نہیں۔ میں پوچھتی ہوں تم کون ہو؟''

''لڑکی، بہتری اسی میں ہے کہ چور دروازے کا پتا بتادو اور یہ بھی بتاؤ کہ کاغذات کہاں ہیں؟''

''سمجھ گئی میں تم یقیناً مقامی انتظامیہ کے آدمی ہو اور اگر یہ بات ہے تو تم یہاں سے زندہ نہیں جا سکو گے۔''

''میں زندہ ہی جاؤں گا، کیونکہ انتظامیہ کا آدمی نہیں ہوں۔''

''پھر کون ہو؟''

''بلیک میلر۔''

''ارے کیا تم نے یہ پینترا بدلا ہے۔''

''بس یوں ہی سمجھ لو۔'' صوفی اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''تو پھر یہ لو۔'' لڑکی نے دانت بھینچ کر ٹریگر دبا دیا۔

''ہائے میں مرگیا درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے مسخرے پن سے کہا۔ لڑکی نے متحیرانہ انداز میں پستول کی طرف دیکھا اور اچھل کر کھڑی ہوگئی۔

''اب بیٹھ جاؤ...... کافی اچھل کود کرلی ہے تم نے ایک لڑکی ہونے کی حیثیت سے بہت کچھ کیا ہے لیکن تمہیں یاد ہے نا میں نے کس طرح تمہارے بال پکڑے تھے۔ اسی طرح تمہاری ناک دونوں نتھنوں میں انگلیاں ڈال کر اسے اوپر تک چیر دوں گا اور تمہارا چہرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بگڑ جائے گا۔ چلو اگر پلاسٹک سرجری کرا بھی لیتی ہو تو بھی ناک ایسی تو نہیں رہے گی۔''

''یہ...... یہ...... یہ۔''

''ہاں...... ہاں...... ہاں، اس کے کارتوس میری جیب میں ہیں۔'' صوفی نے کہا۔ پھر بولا۔

''چلو اب چلتے ہیں یہاں سے۔''

''کک...... کہاں۔ میں نہیں جاؤں گی۔''

''تو پھر زبردستی لے جاؤں گا۔'' صوفی نے کہا۔

''دیکھو میں تمہیں بتا دیتی ہوں، سب کچھ لیکن صوفی رابعہ سلطان کے قتل کے بعد شاید ایک بار پھر سے زندہ ہوگیا تھا۔ بے شک وہ ایک مرنجان مرنج شخصیت کا مالک تھا لیکن پولیس کے مختلف محکموں میں اس نے جو کارنامے سرانجام دیے تھے وہ معمولی نہیں تھے اور اب بھی وہ اسی کیفیت کا مالک تھا۔ چنانچہ اس نے جھپٹ کر لڑکی کی گردن پکڑ لی اور اس کی کنپٹیوں پر دباؤ ڈالنے لگا۔ لڑکی نے اس کی کلائیوں پر ہاتھ ڈال دیا تھا لیکن اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس نے دو فولادی سلاخیں پکڑ لی ہوں۔''

''کچھ ہی لمحوں کے اندر اندر اس کی آنکھیں بند ہوگئیں اور صوفی نے اسے آہستگی سے فرش پر ڈال دیا پھر وہ کمرے کا جائزہ لینے لگا اور اس کے بعد خواب گاہ کی طرف چل پڑا جس توقع پر آیا تھا وہ بھی پوری ہوگئی یہاں فون موجود تھا۔ اس نے ریسیور پر گرین ہاؤس کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔''

''کون ہے ڑے؟''

''صوفی بول رہا ہوں۔''

''اڑے ماں قسم آواز نہیں پہچانا تھا چھوٹے بابا۔''

''ایک پتا نوٹ کرو۔ شازیہ اور دلاور کو اس پتے پر بھیج دو۔ گاڑی میں آنا ہے۔ ہوشیار رہنا ہے۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔ اسے کہو جلدی سے یہاں پہنچے۔''

''ٹھیک ہے چھوٹا بابا۔'' وہ دونوں ابی پونچتا اے۔'' غلام قادر نے کہا اور اس کے بعد صوفی نے فون بند کر دیا۔ ریسیور رکھ کر وہ اس کمرے کی تلاشی لینے لگا، لیکن کوئی کارآمد چیز ہاتھ نہیں لگی تھی۔ اس کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ خطرہ تھا کہ کوئی آ ہی نہ جائے۔ ویسے بہت سی باتیں ذہن میں چکرا رہی تھیں۔ لڑکی کسی آرگنائزیشن سے تعلق رکھتی تھی اور اس کا سربراہ شارمن ہی تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ شارمن کسی خاص منصوبے کے تحت پورے گروہ کے ساتھ یہاں آیا ہے جہاں تک ایس ایس سجادی کا تعلق ہے اس بات کے امکانات تھے کہ ایس ایس سجادی کسی طرح اس کے پروگرام سے واقف ہو یا شریک کار ہو یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ان ساتھیوں میں سے ہی کوئی ہو اور مقامی طور پر اس کے لیے اسے راستے سے ہٹا دیا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی شارمن اس فکر میں بھی ہو کہ سجادی کے کاغذات کوٹھی میں سے نکلوالے۔ اس لڑکی نے بتایا تھا کہ وہ نہ صرف چور دروازے سے واقف ہے اور اسے وہ مقام بھی معلوم ہے جہاں کاغذات رکھے ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے لڑکی کا ایس ایس سجادی سے گہرا تعلق ہو۔ بہرحال چند لمحوں تک وہ سوچتا رہا اور اس کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ گاڑی کا انتظار عمارت کے اندر بیٹھ کر نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ پوری عمارت اس کی دیکھی ہوئی نہیں ہے۔ اس نے بے ہوش لڑکی کو اپنے کاندھے پر ڈالا اور اپنے پیچھے ساری روشنیاں گل کرتا ہوا باہر چلا آیا۔ پائیں باغ میں اندھیرا تھا۔ وہ وہاں سے باہر نکل آیا۔ اس نے لڑکی کو پتھر کی بنچ پر لٹا دیا اور خود چار دیواری کے باہر دیکھنے لگا۔ اندازے کے مطابق ایک کار تاریکی میں پھاٹک پر رکی ہوئی تھی اور اس سے روشنی کی ایک لمبی سی شعاع فضا میں منتشر ہوئی تھی۔ شازیہ آ گئی تھی۔ صوفی نے ایک بار پھر بے ہوش لڑکی کو کاندھے پر اٹھا کر ڈالا اور گاڑی کے قریب پہنچ گیا۔ دلاور نے اس کی مدد کی تھی اور پھر وہ وہاں سے تیزی سے چل پڑے۔

''کیا قصہ ہے چھوٹے بابا؟'' شازیہ نے لڑکی کو گھورتے ہوئے کہا۔

''ابھی تک قصہ، قصہ درویش ہی بنا ہوا ہے۔ دیکھیں آگے کیا قصہ نکلتا ہے۔'' صوفی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''یہ لڑکی کون ہے؟''

''ہوش میں آنے کے بعد خود ہی بتائے گی۔ چلو چلتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گرین ہاؤس میں داخل ہو رہے تھے۔ لڑکی کو گرین ہاؤس کے ایک مخصوص کمرے میں پہنچا دیا گیا اور ایک بستر پر لٹا کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی جانے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ہوش میں آ گئی تھی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چونک کر دیکھا۔ صوفی نے اس وقت پان کی گلوری منہ میں رکھ لی تھی اور پان چبا رہا تھا لیکن ابھی مرغلہ پیک

نہیں بن سکا تھا۔ وہ صوفی کو دیکھنے لگی اور پھر ایک دم اچھل کر بیٹھ گئی۔

''کون ہو تم...... بتاؤ؟''

''عاشق درویش۔''

''میں کہاں ہوں؟''

''یہیں ہیں آپ درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے مذاق کیا۔

''شٹ اپ۔ مجھے یہاں کون لایا ہے؟''

''ظاہر ہے یہ گستاخی ہم سے ہی سرزد ہوئی ہے جس کے لیے دست بستہ آپ سے معافی کے خواستگار ہیں۔ یقین ہے کہ آپ اپنی فطری فراخ دلی سے کام لے کر......''

''تم بکواس بند نہیں کرو گے۔''

''کمال ہے خود سوال کر رہی ہیں اور خود بکواس بند کرنے کا حکم دے رہی ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''میں پوچھتی ہوں مجھے یہاں لانے کا مقصد بتاؤ؟''

''مقصد تو ہم خود بھی نہیں جانتے۔ بس کبھی کبھی کوئی پسند آ جاتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ انہیں ساتھ لے آیا جائے۔''

''سنو...... اپنے آپ کو بہت زیادہ اسمارٹ ظاہر کرنے کی کوشش مت کرو تم ایک احمق قسم کے آدمی ہو۔ یہ نہ سمجھنا کہ تم مجھے بے وقوف بنا سکتے ہو۔ میرا نام رینا ہے۔ رینا سیسل۔''

''یقیناً...... یقیناً۔ بھلا ہمیں اس سے کیا اختلاف ہوسکتا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے جواب دیا پھر بولا۔

''اب آپ یہاں آرام فرمائیے۔''

''دیکھو مجھے یہاں سے جانے دو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''اللہ مالک ہے۔ اب جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔'' صوفی نے کہا اور اس کے بعد وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ ذہن میں ایک منصوبہ بنا لیا گیا تھا اور اب اس کے تحت ہی کام کرنا تھا۔ گرین ہاؤس میں یہ کمرا ایسے لوگوں کے لیے مخصوص تھا جنہیں یہاں کچھ وقت گزارنا ہوا اور وہ باہر نکلنے کی کوشش میں کامیاب نہ ہونے پائیں۔ چنانچہ لڑکی کو وہاں آرام سے چھوڑ دیا گیا البتہ ٹیلیفون کی موجودگی وہاں قابل غور تھی، لیکن اس کے لیے باقاعدہ انتظام کر لیا گیا تھا۔ شازیہ اس وقت اس ٹیلیفون پر موجود تھی جو اس ٹیلیفون کا دوسرا کنکشن تھا۔ صوفی نے یہاں اپنی ذہانت کے مطابق بہت سارے انتظام کیے تھے۔ باہر نکل کر اس نے شازیہ کو ہوشیار کر دیا اور پھر خود ایک اور ٹیلیفون پر جا بیٹھا۔ اب وہ اپنی یادداشت سے کام لے رہا تھا، لیکن تقریباً جیسے بند کمرے کے ٹیلیفون کو استعمال کیا جا رہا ہو۔ صوفی ایک دم تیار ہو گیا۔ یہ بڑا زبردست سسٹم تھا کوئی بھی نمبر ڈائل کیا جائے وہ اس مخصوص ٹیلیفون سے آ ملتا تھا جو اس کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ بات وہاں نہیں ہوسکتی تھی جہاں یہ فون کیا جائے بلکہ جس جگہ دوسرا ٹیلیفون رکھا ہوا تھا وہاں سے بات کی جاسکتی تھی۔ صوفی اپنے طور پر شارمن کی آواز کی نقل کے لیے تیار تھا، حالانکہ شارمن سے ملاقات بہت سال پرانی تھی لیکن بہرحال کچھ ذہانتیں ہی تھیں جنہوں نے صوفی

کوصوفی کی حیثیت دی تھی اور اس نے محکمہ پولیس میں تہلکہ مچادیا تھا۔تھوڑی دیر کے بعد لڑکی کی آواز ابھری۔

’’ہیلو.....ہیلو.....ہیلو۔‘‘ اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔صوفی نے ایک بٹن آن کردیا اور بولا۔

’’ہیلو.....‘‘

’’سر میں ریناسیسل بول رہی ہوں۔‘‘

’’ہاں بولو۔‘‘

’’سر وہ میں اپنے منصوبے میں ناکام رہی ہوں۔‘‘

’’مجھے اطلاع مل چکی ہے۔کہاں مر رہی ہو اس وقت۔‘‘ صوفی کے حلق سے آواز نکلی۔

’’دیکھیے سر قصور میرا نہیں ہے میں ایک عجیب وغریب جال میں پھنس گئی ہوں۔‘‘

’’بکتی جاؤ کیا ہوا ہے اور ریناسیسل نے ساری تفصیل بتادی لیکن بس اس حد تک کہ وہ کس طرح ایک عجیب وغریب شخصیت کے جال میں پھنسی ہے۔

’’جانتی ہو وہ کون ہے؟‘‘

’’نہیں جانتی سر۔بہ ظاہر دیکھنے میں بالکل گدھا لگتا ہے لیکن بہت چالاک ہے۔‘‘

’’صوفی ہے اس کا نام۔‘‘

’’جی رینا کی آواز چیخنے کے مترادف تھی۔‘‘

’’ہاں وہ صوفی ہے رینا اور تم میرے اصول جانتی ہو لنگڑے گھوڑے کو میں ہمیشہ گولی ماردیا کرتا ہوں وہ جو میرے مقصد کے لیے کسی طور صحیح کام نہیں کرپاتے بلکہ میرے لیے مشکلوں کا باعث بن جاتے ہیں۔میرے خیال میں جینے کے قابل نہیں ہوتے۔یہ میرا اصول ہے شاید تمہیں اس کے بارے میں علم نہ ہو لیکن افسوس لڑکی اب تمہاری زندگی میرے لیے بے مقصد ہے۔‘‘

’’سر میری بات سنیے۔‘‘

’’نہیں بہتر یہ ہوگا کہ تم خودکشی کرلو۔یہی بہتر ہے،اگر زندہ واپس نکل بھی آئیں تو میرے آدمیوں کا مخصوص مشن یہی ہوگا کہ تمہیں قتل کردیں اور پھر......‘‘

’’س......سس......سر پلیز میری بات تو سنیے۔سر......سر......لیکن اس کے بعد صوفی نے وہ بٹن آف کردیا تھا۔برابر ہی غلام قادر بیٹھا ہوا تھا۔کہنے لگا۔

’’ارے ماں قسم چھوٹے بابا تمہارا تو جون ہی بدل گیا ہے۔سانپ کے مافق دو ہزار سال کے بعد بھی بدل لیا ہے وہ ڑے۔‘‘ صوفی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔دانہ پھینکا تھا اور اس کے بعد انتظار تھا کہ صورت حال کچھ واضح ہوجائے۔ایک گھنٹے کا وقت دیا اس نے ریناسیسل کو ایک گھنٹے کے بعد شازیہ کھانے پینے کا سامان لے کر اس کمرے میں داخل ہوئی۔صوفی ساتھ ساتھ ہی تھا۔ایک نگاہ میں دیکھنے سے اندازہ ہوگیا کہ ریناسیسل کے ہوش وحواس درست ہوگئے ہیں۔وہ بے حد خوف زدہ معلوم ہوتی تھی۔شازیہ نے کھانا اس کے سامنے رکھا۔تو صوفی نے کہا۔

’’مہمان نوازی ہمارا قومی ورثہ ہے درویشوں کی دعاؤں سے اور میرا خیال ہے کہ آپ کھانے

پینے سے گریز نہیں کریں گی۔ہیں ریناسیسل۔ریناسیسل نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے شازیہ کو دیکھا اور بولی۔

’’میں آپ سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں جناب۔‘‘

’’ہاں ہاں ہم حاضر ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔‘‘ شازیہ باہر نکل گئی تھی۔رینا نے خوف زدہ نگاہوں سے صوفی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’میں مشکل میں گرفتار ہوگئی ہوں۔‘‘

’’ہاں خدا دشمن کو بھی ایسے لمحات نصیب نہ کرے لیکن ہم آپ سے ایک وعدہ کرسکتے ہیں......وہ یہ کہ اگر آپ ہمیں ساری تفصیل بتادیں گی تو ہم آپ کو یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں گے پوری دیانت داری کے ساتھ۔‘‘ اور ریناسیسل نے گردن ہلائی اور بولی۔

’’نہیں،میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی۔میری مدد کریں جناب!‘‘

’’ارے،ارے یہ اچانک ہماری مہمان بننے پر کیوں مصر ہوگئیں جب کہ اس سے پہلے تو آپ۔‘‘

’’آپ صوفی صاحب ہیں۔‘‘

’’الحمدللہ کیوں خیریت ہمارے بارے میں اچانک آپ کو معلومات کیسے حاصل ہوگئیں۔‘‘

’’صوفی صاحب میری زندگی خطرے میں ہے۔‘‘

’’نہیں،ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔‘‘

’’آپ سے نہیں مجھے دوسروں سے زندگی کا خطرہ ہے۔‘‘

’’کوئی بھی آپ کو یہاں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔یہ آپ سے ہمارا وعدہ ہے۔‘‘

’’اب براہ کرم آپ۔‘‘

’’ہاں۔ہاں کہیے۔‘‘

’’دیکھیں میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔‘‘

’’ہم بھی آپ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔‘‘

’’آپ ہمیں ان کاغذات کے بارے میں بتادیجیے۔ہم آپ کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کریں گے۔‘‘

’’میں آپ کو سب کچھ بتادوں گی لیکن آپ براہ کرم میری زندگی بچایئے وہ مجھے مار ڈالے گا۔‘‘

’’کون؟‘‘

’’نوبل شارمن۔‘‘

’’ڈیڈ کراس۔‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’یہی اس کا نشان ہے۔‘‘

’’کہاں ہے وہ؟‘‘

’’یہیں اسی شہر میں۔‘‘

''کس جگہ۔''

''مجھے نہیں معلوم۔ میں آپ کو یہ فون جو رکھا ہے سامنے، میری اس پر اس سے بات ہوئی تھی۔'' صوفی نے اس وقت فون کو دیکھا اور پھر غصیلے لہجے میں بولا۔

''بیوقوفوں نے کتنی ہی بار مجھے اپنی حماقتوں کی وجہ سے نقصان پہنچایا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اس کمرے سے فون کی لائن کاٹ دی جائے تو آپ نے اس کا مقصد ہے فون کیا ہے کسی کو۔''

''ہاں لیکن اس فون نے میری کایا پلٹ دی ہے۔''

''وہ کیسے......؟''

''میں آپ کو بتائے دیتی ہوں۔ شارمن کے بارے میں مجھے اندازہ ہے کہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کیونکہ آپ نے اس کا نام لیا تھا اور میں بھی جانتی ہوں کہ شارمن آپ سے خوف زدہ ہے۔ کیوں خوف زدہ ہے یہ میں نہیں جانتی۔ بہر حال آپ جانتے ہیں کہ وہ ایک تخریب کار ہے اور یہاں وہ کسی خاص منصوبے کے تحت آیا ہے، لیکن وہ آپ سے خوف زدہ ہے۔ شارمن کا یہاں منیجر ایس ایس سجادی تھا۔ وہ شخص جو آپ کے دروازے پر جا کر مرا، شارمن نے اسے ایک خاص قسم کا زہر دیا تھا اس زہر کے اثرات مرنے کے بعد سسٹم سے ختم ہوجاتے ہیں۔ شارمن آپ کو روشنی میں لانا چاہتا تھا۔ وہ آپ کو باعمل کر کے آپ پر نگاہ رکھنے کا خواہش مند تھا۔ یعنی یہ کہ پہلے چونکہ اس کے اور آپ کے درمیان کوئی تسلسل رہ چکی ہے وہ چاہتا تھا کہ آپ براہ راست اس کی طرف متوجہ ہوجائیں تاکہ وہ آپ سے ہوشیار رہے۔ یہ صورت حال تھی۔ اس نے اس لیے ایس ایس سجادی کو آپ کے دروازے پر قتل کروادیا لیکن کچھ ایسے کاغذات جو سجادی کے پاس تھے۔ وہیں عمارت میں رہ گئے اور وہ پریشان ہوگیا کہ کہیں وہ کاغذات آپ کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ یہ ہے ساری کہانی، لیکن میں چونکہ ان کاغذات کے حصول میں ناکام رہی اور آپ کے ہتھے چڑھ گئی اس لیے وہ مجھے قتل کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرے گا۔ وہ اسی قسم کا انسان ہے۔

صوفی صاحب میری زندگی خطرے میں ہے۔ میں آپ کو سب کچھ بتادیتی ہوں ان کاغذات کے بارے میں بھی جو شارمن کی نشان دہی کرتے ہیں۔ بہ شرطیکہ شارمن فوراً ہی وہاں نہ پہنچ گیا ہو اگر آپ وہاں جائیں گے، تو بھی اس کی آپ سے وہاں ملاقات ہوسکتی ہے اور میں آپ سے سچ کہہ رہی ہوں۔'' صوفی پر خیال انداز میں گردن ہلانے لگا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''شارمن سے یہاں آپ کی ملاقات ہوئی مس رینا۔''

''نہیں۔ وہ خود عام لوگوں کے سامنے نہیں آتا لیکن پھر بھی میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی ہے۔''

''تنہا ہے یہاں۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے ساتھ تین اور اسرائیلی جاسوس آئے ہیں۔ باقی کام مقامی لوگوں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔''

''میں ا نہی مقامی لوگوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

جو یہاں اس گروپ کو چلا رہا ہے۔''

''ہاں بتاؤ۔''

''طاہر شاہ اگر تم نے اس کا نام سنا ہو۔''

''طاہر شاہ۔''

''ہاں یہ ذات خود بزرگ بنا رہتا ہے پیری مریدی کا چکر چلا رکھا ہے اس کے مریدوں کا ایک گروپ ہے جو جرائم پیشہ گروپ ہے اور بڑے پیمانے پر کام کرتا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ شہر میں ہونے والے بے شار ہنگاموں میں طاہر شاہ گروپ کام کرتا ہے۔''

''گڈ طاہر شاہ کے بارے میں معلومات حاصل ہوجائے گی مگر تمہیں اس کے بارے میں کیسے معلوم؟''

''مجھے شارمن کے بارے میں کیسے معلوم میرا مطلب ہے ڈیڈ کراس میں سب کچھ مجھے بتایا گیا تھا۔''

''معاوضہ کیا ملتا ہے؟''

''بہت زیادہ اتنا کہ کسی اور کام میں نہیں مل سکتا۔''

''کیا کیا ہے اب تک درویشوں کے کرم سے۔''

''یقین کرو چھوٹے موٹے کاموں کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا لیکن یہ بات پہلے بتادی گئی تھی کہ اگر دیے ہوئے کام کے سلسلے میں ناکام رہی تو گولی ماردی جائے گی۔''

''کون کون ہے۔''

''کہاں۔''

''میرا مطلب ہے تمہارا کون کون ہے؟''

''کوئی نہیں ہے بہت دور گاؤں میں ایک خالہ اور اس کے بچے ہوتے ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے پروان چڑھایا۔ ان کی دیکھ بھال میں ہی کرتی ہوں پیسے بھیجتی ہوں باقاعدہ۔''

''یہاں اور کوئی نہیں ہے؟''

''نہیں۔''

''جینا چاہتی ہو؟''

''کون نہیں چاہتا!''

''تو پھر ٹھیک ہے یہاں رہو اور خبردار ذرا ہوشیار رہنا میں جب چاہوں گا تمہیں یہاں سے نکال لے جاؤں گا۔ خود اگر نکلنے کی کوشش کروگی تو میرا خیال ہے یہاں جو لوگ موجود ہیں وہ شارمن گروپ سے کم نہیں ہیں۔ ویسے فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔''

''اور کوئی معلومات؟''

''یہاں کوئی مزار بنا رکھا ہے اس نے جعلی مزار ہے۔''

''اوہو......اوہو پیر ڈھکن شاہ۔''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''کبھی گئی نہیں ہو؟''

''نہیں۔ بھلا عورتوں کا وہاں کیا کام؟'' لڑکی نے بتایا اور صوفی گردن ہلا کر خاموش ہوگیا۔ بہر حال ایک دلچسپ صورت حال سامنے آ گئی تھی۔

♥......♥......♥

صوفی اپنے نئے گھر میں داخل ہوگیا۔ اس گھر کو بھی گرین ولا کا نام دیا گیا تھا۔ دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی حسینہ کی بھیانک صورت نظر آئی تو صوفی کے منہ سے نکلا۔

''جل تو جلال تو صاحب کمال تو آئی بلا کو ٹال تو درویشوں کی دعاؤں سے۔'' حسینہ نے یہ بڑبڑاہٹ سن لی تھی اور ترکی بہ ترکی بولی۔

''لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ اللہ شیطان سے محفوظ رکھے۔''

''سبحان اللہ۔ اس گھر میں بڑا مذہبی ماحول پیدا ہوگیا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''اے خاک پڑے اس گھر پر۔ یہ گھر ہے یا بوچڑ خانہ۔''

''آپ کو یہاں بوچڑ کون نظر آتا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''درویشوں کی دعاؤں سے ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ تو نصیب کا پھیر ہے۔ کہیں نہ ملے رحیم شاہ صاحب جی تو پوچھوں گی کہ بھیا ہم نے تو ہمیشہ نمک حلالی کی ہے یہ مرنے سے پہلے ہی جہنم میں کیوں بھجوادیا۔''

جاسکتی ہیں آپ جب آپ کا دل چاہے۔ ہم تو آپ کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''اپنی جھاڑو پھری صورت کو دیکھا ہے کبھی ملا دو پیازہ لگتے ہو پورے کے پورے صبح کو اٹھ کر شکل دیکھ لو تو دن بھر روٹی نہ ملے۔''

''آپ کو اپنے کالی بلا ہونے کا احساس نہیں ہے۔ کالونچ پھری ہوئی ہے آپ کی شکل پر دل تو چاہتا ہی نہیں ہے کچھ اور کہنے کو سوائے کالونچ کے۔''

''اے تو کہتا کون ہے تجھ سے کہ تم کچھ کہو۔ اونٹ کے پہلوٹی کے بیٹے۔ کسی کو دکھاؤ تو سہی اپنے آپ کو ہاتھ کہیں جارہے ہیں، پیر کہیں جارہے ہیں، گردن شتر مرغ کی طرح آگے بڑھی ہوئی اور اوپر سے یہ چگا۔ میں کہتی ہوں۔''

''کچھ نہیں کہتیں آپ۔ جس قدر جلد ہو دفعہ ہو جایئے یہاں سے۔''

''جاتی ہے میری جوتی۔'' حسینہ نے انگوٹھا دکھا کر کہا۔

''بے شک جوتی پہن کر جایئے۔ اس جوتی میں آپ کے پاؤں ضرور ہونے چاہئیں۔''

''کیا جرائم پیشہ لوگوں میں آ پھنسی۔ میں کہتی ہوں یہ پولیس والے ہر وقت ادھر ہی کے چکر کیوں لگاتے رہتے ہیں۔''

''پولیس والے......؟''

''اور کیا تمہارے چچا ماموں......''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے کالونچ بیگم۔ جب سے آپ تشریف لائی ہیں اسی طرح کے گھٹیا لوگ

یہاں کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ ہمیں تو یوں لگتا ہے جیسے آپ نے اپنے نام کی کافی تشہیر کر ڈالی ہو یا پھر لوگوں نے آپ کی ہولناک صورت دیکھ کر ایک دوسرے کو بتانا شروع کر دیا ہو کہ اس گھر میں چڑیلوں کا بسیرا ہے، مگر آپ کسی پولیس والوں کی بات کر رہی تھیں۔''

''وہ جنید جمشید مرزا۔ باپ کے گھر کی طرح منہ اٹھائے گھسے چلے آتے ہیں۔ دھمکیاں دیتے ہیں مجھے۔''

''آئے تھے......؟''

''تو اور کیا جھک مار رہی ہوں؟''

''ہوں کیا کہہ رہے تھے......؟''

''اے ڈکیت کو ہی پوچھ رہے تھے۔ بھیا ارے چوری ڈکیتی کرتے ہو تو پہاڑوں اور غاروں میں جا کر رہو۔ کھیتوں کھلیانوں میں جا کر رہو۔ عجب دیدہ دلیر ڈاکو ہو۔ شہر کی آبادی میں دھڑلے سے رہتے ہو۔ نا بابا نا۔ ایسا تو نہیں چلے گا۔ سوچنا پڑے گا اور کرنا پڑے گا۔''

''خیر جمشید مرزا صاحب کو ذرا دیکھنا ہوگا۔'' صوفی کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آنے لگے۔ کچھ لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

''ہم تو یہ سوچ کر آئے تھے حسینہ بیگم کہ آپ نے کچھ اچھا سا کھانا وغیرہ پکایا ہوگا۔ اس سے تو مومن خان کا ہوٹل ٹھیک تھا۔ بھوکے ہوتے تھے تو دس منٹ میں کھانا آجاتا تھا۔''

''دس منٹ میں آتا تھا نا۔ جاؤ اندر جاکے بیٹھو پانچ منٹ میں آیا جاتا ہے۔'' حسینہ بیگم نے کہا۔

''فراغت حاصل کرنے کے بعد صوفی اپنی جگہ سے اٹھا۔ ٹیلی فون کے قریب پہنچا اور کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد کسی سے رابطہ قائم ہوگیا تو اس نے کہا۔

''احقر بول رہا ہے البا روس صوفی۔''

''جی ہاں بس دعائیں درکار ہیں۔ آپ کی دعاؤں کے طفیل زندگی گزر رہی ہے۔ جی ہاں جی ہاں ایک نام نوٹ فرمایئے گا۔ جی ظاہر ہے آپ کے شعبے کے مطابق آپ کو زحمت دی ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ جی نام جمشید مرزا ہے۔ جی ہاں آپ کو تو پتا ہی ہے ایس پی کے عہدے پر فائز ہیں۔ جی۔ جی...... جی بالکل ہاں بس ذرا ان کی خفیہ معاملات کی ضرورت ہے ہم جانتے ہیں آپ کا ادارہ اس سلسلے میں بڑا نیک نام ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ جی...... جی چیک کوریئر کے ذریعہ بھجوادیا جائے گا لیکن معلومات جلد از جلد درکار ہوں گی۔ شکریہ۔

''صوفی نے ریسیور رکھ دیا۔ تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھا رہا پھر دوبارہ ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ یہ نمبر گرین ہاؤس کے تھے۔

''شازیہ سے رابطہ قائم ہوا تو اس نے کہا۔

''عزیزہ شازیہ ہم بول رہے ہیں۔''

''جی چھوٹے بابا حکم۔''

''شازیہ کھیل کھیلتا ہے آپ کو درویشوں کے کرم سے۔ ایک مزار ہے بابا پیر ڈھکن شاہ صاحب

کا۔ یہاں کے سجادہ نشین طاہر شاہ صاحب ہیں۔ غلام قادر اور دلاور کو ساتھ لے کر عقیدت مندوں کی حیثیت
سے ڈھکن شاہ کے مزار پر چلے جاؤ۔ یہاں پر مکمل نگرانی کرنی ہے۔ میرا رابطہ رہے گا بلکہ ایسا کرو شازیہ کہ پورا
کھیل کھیلو۔ تم مریضہ ہو۔ ہوش، حواس قائم نہیں ہیں۔ غلام قادر اور دلاور تمہیں لے کر وہاں جاتے ہیں اور با
ڈھکن شاہ کے مجاور طاہر شاہ سے شازیہ کا علاج کرانا چاہتے ہیں۔ طاہر شاہ صاحب جو مانگے پوری کر دیا
پیسوں کی پرواہ نہیں ہے۔ کہو کیسی رہے گی اداکاری۔ یہ اداکاری کر سکتے ہو نہ تم لوگ۔''

''جی چھوٹے بابا۔ آپ نے شازیہ کو حکم دیا ہے کبھی مایوس کیا ہے آپ کو۔''

''درویش رحم کریں۔ غلام قادر اور دلاور کو بھی سمجھا دینا۔''

''ٹھیک ہے چھوٹے بابا۔''

''خدا حافظ۔'' صوفی نے کہا اور فون بند کر کے نیم دراز کیفیت میں آ گیا لیکن اسی وقت حسینہ
اندر آ گئی۔

''چلیے تیار ہے کھانا۔''

''کیوں مذاق کر رہی ہیں کالونچ بیگم۔''

''اے کالے تو اللہ کے پیارے ہوتے ہیں۔ چلیے اٹھیں۔ سمجھا نہیں ہے آپ نے ہمیں ابھی
تک۔'' صوفی کھانے کے کمرے کی طرف چل پڑا تھا۔

♥.....♥.....♥

جمشید مرزا نے معشوق نشیلے کو لاک اپ سے نکلوا کر اپنے کمرے میں بلوایا۔ اس کی آنکھوں میں
بھوکے بلوں جیسی کیفیت تھی۔ صوفی نے واقعی اسے اتنا زچ کر دیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر صوفی کو اپنے قبضے میں
کرنا چاہتا تھا، حالانکہ شاہ میر خان صاحب کی طرف سے اسے وارننگ بھی ملی تھی لیکن جمشید مرزا اس قدر غصے
میں تھا کہ اس نے اس وارننگ کو نظر انداز کر دیا تھا۔ بہرحال معشوق نشیلے جمشید مرزا کے سامنے پہنچ گئے۔

''اصل نام کیا ہے تمہارا۔ نا میں تمہیں معشوق کہہ سکتا ہوں اور نا نشیلا۔ دونوں چیزیں حرام ہیں۔ تم
جیسے منحوس صورت آدمی کو معشوق کہنا کوئی گدھا ہی پسند کرے گا اور اگر مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ تم نشے میں ہوا
رہتے ہو تو میں تمہاری کھال اتروا کر تمہارے پیروں میں ڈال دوں گا۔''

''حضور من۔ مالک ہیں آپ۔ میں تو محکمہ پولیس کے اس قدر اختیار رکھنے کا قائل نہیں ہوں۔
آپ نے بغیر کسی جرم کے مجھے گرفتار کر رکھا ہے۔''

''اختیارات کے قائل نہیں ہو۔ چلو مرغا بنو، جاؤ۔'' جمشید مرزا نے کہا اور معشوق نشیلے کے ہونٹوں
پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر وہ بولا۔

''یہ صحیح الدماغی کی نشانی نہیں ہے۔ آپ کسی انسان کو مرغا بنا کر رکھ سکتے ہیں تو پہلے یوں کریں کہ
اس کانسٹیبل کو مرغا بنا کر دکھائیں۔ ہم بھی بن جائیں گے۔''

''بہت سرکشی کر رہے ہو تم۔''

''حد ہوتی ہے جناب ایک شعر ہے اس سلسلے میں۔''

ناکاشم اوں ناباشم آں
نارخشند دم ناکم لوٹا

''کیا بکواس ہے؟'' جمشید مرزا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''فارسی ہے آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔''

''واقعی تمہاری شامت ہی آ رہی ہے۔ میں تم پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہتا لیکن یہ سمجھ لو اگر اٹھ گیا تو
ڑی ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔''

''روایتی باتیں روایتی باتیں۔ رقیص دم دار نادارم، نا کفالت۔''

''ابے یہ کون سی فارسی ہے۔ گدھے کی دم۔'' جمشید مرزا غصے سے دھاڑا پھر اس نے انسپکٹر رازی
لو آواز دی۔

''انسپکٹر راضی۔'' رازی اندر داخل ہو رہا تھا۔ سامنے آ کر اس نے سیلوٹ کیا۔

''یار یہ میرے ہاتھوں اپنی موت کو دعوت دے رہا ہے۔ اس سے پوچھو صوفی کہاں ملے گا؟''

''حضور یہ سوال تو آپ بھی کر سکتے تھے۔ اگر صوفی صاحب اپنے گھر میں نہیں ملے تو پھر آپ کو وہ
ن خان صاحب کے ہوٹل میں ملیں گے۔''

''یہ کون سی جگہ ہے۔''

''میں جانتا ہوں سر۔'' انسپکٹر رازی نے کہا۔

''وہاں کیوں ملتا ہے وہ۔''

''سران کا پرانا گھر وہیں ہے۔'' انسپکٹر رازی نے جواب دیا۔ جمشید مرزا کے چہرے پر نفرت کے
نقوش پھیل گئے تھے۔ اس نے کہا۔

''ایک بار میں اسے لاک اپ میں ضرور ڈالوں گا۔ بعد میں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ میں مصروف
ہوں اس وقت جیسے ہی فرصت ملے گی ہم اس کے اس پرانے گھر پر ریڈ کریں گے۔''

''ان صاحب کا کیا کیا جائے؟''

''لاک اپ میں ڈال دو۔ فی الحال اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا جا سکتا، اسے ساتھ لے کر ہی
چلیں گے۔'' جمشید مرزا نے کہا۔

پھر فرصت دوسرے دن ہی ملی تھی۔ جمشید مرزا صوفی کے اوپر بری طرح خار کھائے ہوئے بیٹھا
تھا۔ اس نے ہر طرح کا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انسپکٹر رازی معشوق نشیلے اور کچھ نفری کو ساتھ لے کر وہ
صوفی کے اس گھر کی جانب چل پڑا جو روایتی حیثیت کا حامل تھا۔ یقیناً شامت آئی تھی لیکن کس کی......؟''

گلی کے لوگوں نے درجنوں بار ایسے کھیل دیکھے تھے۔ صوفی کے مخالف بڑے کر و فر کے ساتھ
صوفی پر حملہ آور ہوتے تھے اور اس کے بعد اسی کر و فر کے ساتھ ان کی واپسی ہو جاتی تھی۔ لیکن اس شکل میں
کہ عموماً وہ سر کھجا رہے ہوتے تھے۔ جو پتا جمشید مرزا کو معشوق نشیلے سے ملا تھا وہ نگاہوں کے سامنے تھا۔ پولیس
کی دو جیپیں جب محمد خان کے ہوٹل کے سامنے آ کر رکیں تو ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی نظریں اس طرف

اٹھ گئیں اور کانا پھوسیاں ہونے لگیں۔ صوفی کے گھر کا دروازہ تو خیر کبھی بند نہیں ہوتا تھا بلکہ جیسا کہ یہاں آنے والوں کو اس محلے کے بارے میں پتا چلا تھا کہ یہاں گھر کے دروازے بند نہیں ہوتے تو اسی کے مطابق اس وقت بھی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ انسپکٹر رازی نے دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دی۔

''کوئی ہے؟''

''درویشوں کا کرم ہے۔ کون صاحب؟'' اندر سے آواز آئی اور انسپکٹر رازی نے پلٹ کر جمشید مرزا کی طرف دیکھا اور گردن ہلا دی۔ مقصد یہ تھا کہ صوفی کی آواز اندر سے آئی ہے۔ یقیناً وہ اندر موجود ہے۔ جمشید مرزا نے ادھر ادھر کا جائزہ لیا اور پھر انسپکٹر رازی سے کہا۔

''پولیس لگا دو چاروں طرف سے وہ بھاگنے نہ پائے۔'' چاروں طرف تو خیر پولیس کیا ہی لگتی صرف دو پولیس والے ایک لمبا چکر کاٹ کر گھر کے پیچھے چلے گئے تھے باقی صوفی کے گھر کے آس پاس لگ گئے تھے۔ دو رائفل تان کر محمد خان کے ہوٹل پر بھی کھڑے ہو گئے تھے اور اس کے بعد جمشید مرزا انسپکٹر رازی اور دوسرے انسپکٹر بغیر اجازت اندر داخل ہو گئے پہلے انہوں نے رائفلیں تانی ہوئی تھیں۔ اندر کا منظر قابل دید تھا۔ صوفی اوپر بدن سے ننگا تھا۔ نچلے جسم پر ایک اونچا سا تہبند بندھا ہوا تھا اور وہ اپنے بنیان سے جوئیں نکال رہا تھا۔ ان لوگوں کو دیکھ کر اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔ بنیان ایک طرف رکھا اور مدہم لہجے میں بولا۔

''درویش رحم کریں۔ کیا آپ کے پیچھے کتے لگے ہوئے ہیں؟''

''کھڑے ہو جاؤ۔'' جمشید مرزا ڈپٹ کر بولا۔

''باہر جائیے آپ...... لل...... لنگی میں ہیں اور ہم ہمیشہ لنگی کو کس کر باندھنے میں ناکام رہے ہیں۔ بقیہ ذمے داری آپ پر ہو گی۔ دونوں اے ایس آئی ہنس پڑے۔ انسپکٹر رازی نے بہ مشکل تمام اپنی مسکراہٹ دبائی تھی۔ لیکن جمشید مرزا کا پارہ چڑھ گیا تھا۔

''خوب اس کا مطلب ہے کہ آپ مذاق فرمانا بھی جانتے ہیں۔''

''مذاق تو آپ نے فرمایا ہے درویشوں کے کرم سے۔ پولیس کی وردی پہنے ہوئے ہیں۔ لیکن ڈاکوؤں کی طرح گھر میں گھس آئے ہیں۔ کیا آپ سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ کون سے قانون کے تحت آپ اس گھر میں گھسے ہیں اور وہ بھی اس جارحیت کے ساتھ۔''

''صوفی صاحب ایک بات میں آپ کو بتا دوں میں نہیں جانتا کہ کس حوالے سے آپ اعلیٰ حکام تک پہنچ گئے تھے لیکن رات گئی بات گئی۔ غلط فہمی دل سے نکال دیجیے۔ اپنی توہین پر اپنے عہدے کو بھی داؤ پر لگا سکتا ہوں۔ لیکن آپ کا وہ حشر کروں گا کہ آپ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔'' صوفی کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ وہ مسکراتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ البتہ پیٹ پر بندھے ہوئے تہبند میں اس نے مضبوطی سے گرہ لگائی تھی اور پھر وہ بولا۔

''تشریف رکھنے کے لیے کیا کہوں آپ سے۔ اس خانہ بے تکلف میں عمدہ فرنیچر تو ہے نہیں۔ یہ چارپائی پسند کریں تو حاضر ہے۔ البتہ بنیان سے کچھ جوئیں فرار ہو گئی ہیں اور اس چارپائی کے بانوں ہی پر کہیں ادھر ادھر گھوم رہی ہیں۔ ہم تو تلاش کرنے میں ناکام رہے درویشوں کی دعاؤں سے آپ کو نظر

آجائیں تو ان کی ہلاکت کا انتظام خود فرما لیجیے گا۔ باقی آپ نے جو کچھ کہا ہے۔ نہ آپ اپنے عہدے کو داؤ پر لگائیے نہ ہم اس کی فرمائش کریں گے۔ چلیے اب گدھوں کی طرح منہ اٹھا کر گھس ہی آئے ہیں تو ذرا بتائیے کہ آنے کی وجہ کیا ہے؟'' انسپکٹر رازی نے بوکھلائے ہوئے انداز میں جمشید مرزا کی طرف دیکھا۔ جمشید مرزا کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا البتہ اے ایس آئی نے چند قدم پیچھے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔ ایس پی صاحب کی صحیح قسم کی بے عزتی ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے وہ جس قدر بھی گرم نہ ہو جاتے کم تھا۔

''میں آپ کو صرف ہتھکڑیاں نہیں بلکہ پیروں میں بیڑیاں لگا کر لے جاؤں گا کیا سمجھتے ہیں آپ؟''

''ایس ایس سجادی کے قتل کا الزام میں آپ پر عائد کرتا ہوں۔''

''آپ چشم دید گواہ تھے۔'' صوفی نے سوال کیا۔

''یہ بعد میں بتاؤں گا۔''

''بہتر، اور......''

''اور اس کے بعد آپ پولیس کے دو اعلیٰ افسروں کو اس مکان میں بند کر کے نکل بھاگے تھے۔''

''جی۔''

''میں نے آپ کے کارکن معشوق نشیلے کو لاک اپ میں بند کر رکھا ہے، آپ یہ سمجھ لیجیے کہ آپ کے ایک ایک آدمی کے بدن کی کھال اتار دوں گا۔''

''الٹا لٹکا کر۔'' صوفی نے سوال کیا۔

''یہ بھی کر کے دکھا دوں گا۔''

''نہیں میں نے کسی اور مقصد کے تحت کہا تھا میرا مطلب صرف یہ تھا کہ محکمہ پولیس میں آنے سے پہلے آپ کیا کرتے تھے؟'' بات انسپکٹر رازی کی سمجھ میں آئی تو اس کا منہ بے اختیار ہنسی کے لیے کھل گیا لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا تھا۔ ادھر دونوں سب انسپکٹروں کا برا حال تھا۔ وہ ہنسی روک رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے پانی نکل آیا تھا جب کہ جمشید مرزا زندگی کے سب سے بدترین دور سے گزر رہا تھا۔ صوفی نے کہا

''مرزا جی سب سے برا کام آپ نے یہی کیا ہے کہ معشوق نشیلے جو فارسی میں شاعری کرتے ہیں اور آپ سمجھتے کہ زمانہ قدیم کے بعد درویشوں کی دعاؤں سے فارسی کی شاعری کم از کم ایشیا میں نہیں بلکہ ہمارے وطن میں ختم ہو گئی ہے۔ اب تو اونگے بونگے شاعر شاعری کرتے ہیں اور اب تو ان کا انداز بیان بس اب آپ سے کیا عرض کریں درویشوں کی دعاؤں سے۔ بھلا بتائیے۔ ترارورو، ترارورو، ترارورو، ہنچک، ہنچک، ہنچک۔ یہ شاعری کی کون سی صنف ہے اور ان الفاظ کا مطلب کیا ہے؟''

''ہتھکڑیاں لگا دو۔'' جمشید مرزا نے سب انسپکٹروں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ایک منٹ، ایک منٹ، ایک منٹ۔ آپ نے سارا کیا دھرا چوپٹ کر دیا درویشوں کی دعاؤں سے۔ ہم تو آپ سے ایک بہت ہی دل کش اور دلچسپ سودا کرنے والے تھے اور آپ یقین کریں کہ اگر آپ یہاں تشریف نہ لاتے تو بس ہم آپ سے رابطہ کرنے ہی والے تھے۔ اصل میں دو افراد ہمارے ہاتھ لگ گئے

ہیں، جن کا تعلق بدر ٹریڈر سے ہے اور بدر ٹریڈر والے، ہمیں ساری تفصیل بتا چکے ہیں۔ یعنی یہ کہ انہوں نے اپنی فرم کو دیوالیہ قرار دے دیا ہے۔ آپ نے ان لوگوں کو گرفتار کر کے ٹھیک ایک مہینے کے بعد رہائی عطا فرما دی تھی۔ درویشوں کی دعاؤں سے اور اس کے عوض آپ نے پچاس لاکھ روپے لیے تھے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔ اصل میں بڑے ہی نالائق لوگ ہوتے ہیں۔ آپ کا وہ اکاؤنٹ جو آپ نے حیدر علی شاہ کے نام سے کھولا ہے ہمارے علم میں آ گیا ہے اور حیدر علی شاہ کے بارے میں مکمل تحقیق ہو چکی ہے کہ اس نام کا کوئی شخص موجود نہیں ہے۔ پچاس لاکھ روپوں سے تو خیر آپ کو ہاتھ دھونا ہی پڑے گا۔ لیکن حیدر علی شاہ کے جعلی شناختی کارڈ جس پر آپ کی تصویر موجود ہے کی فوٹو کاپی بینک کو فراہم کی گئی ہے مختلف کاموں میں استعمال کیا ہے۔ ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ آپ کے دستخطوں کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ ان تمام تفصیلات کو جاننے کے بعد ہم نے تو یہ سوچا تھا کہ آپ سے دوستی کی جائے۔ آپ جیسے کماؤ پوت کہاں ملتے ہیں۔ ہم نے سوچا تھوڑا کمیشن ہم بھی لے لیں اور اگر آپ یہ کمیشن نہ دیں تو پھر یہ تمام چیزیں ہم منظر عام پر لے آئیں۔

کمال احمد ٹرسٹ کے ٹرسٹی بھی آپ کی سرپرستی کا دعویٰ کرتے ہیں اور وہاں جو جو کچھ ہوتا ہے آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں اور ہم بھی۔ چلیے باقی باتیں نہیں بتاتے ہم اور یہ انسپکٹر رازی ہیں۔ رازی صاحب آپ خود رازی رہتے ہیں دوسروں کو ناراض کر دیتے ہیں، مثلاً وہ کوٹھی جس پر آپ نے حال میں قبضہ کیا ہے اس کے مالک کے بیٹے کو قتل کے الزام سے بری کر کے، حالانکہ بہت سے عینی گواہ موجود ہیں۔ دو عینی گواہ اس وقت ہمارے قبضے میں موجود ہیں اور ہم......'' صوفی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ انسپکٹر رازی جو اب تک آنکھیں اور منہ پھاڑے جمشید مرزا کے کارنامے سن رہا تھا، اپنی طرف توجہ پا کر ایک دم سکتے میں آ گیا۔ ادھر جمشید مرزا جسکی سٹی گم ہو چکی تھی اور جس کا رنگ پیلا پڑ گیا اور اس کی سرخی ختم ہو گئی تھی۔ دہشت زدہ نگاہوں سے صوفی کو دیکھ رہا تھا اور سب سے پہلا کام اس نے سب انسپکٹروں کی طرف مڑ کر کہا۔

''تم لوگ باہر جاؤ۔'' دونوں سب انسپکٹر جانتے تھے کہ اب انہیں حکم ملنے ہی والا ہے۔ باہر نکل کر ایک نے دوسرے سے کہا۔

''او ہو یار سنا تم نے مر گئے ایس پی صاحب جان نکل گئی۔''

''مگر یار اتنے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیے ہیں ان لوگوں نے ہم تو بالکل الو کے پٹھے ہی ہیں کہ ہمارے ہاتھ کچھ نہیں لگتا۔''

''بات بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''مگر......'' دونوں سب انسپکٹر یہ باتیں کر رہے تھے اور اندر جمشید مرزا کے پیروں کی جیسے جان نکل گئی تھی۔ صوفی کہہ رہا تھا۔

''جی ہاں آپ بڑے آرام سے آج کل اپنی مشکل ان کاؤنٹر حل کر لیتے ہیں، لیکن ہمارے ساتھ آپ یہ بھی نہیں کر سکیں گے۔ چونکہ ایس ایس او ڈیپارٹمنٹ کے افسر اعلیٰ کو یہ تمام تفصیلات دے دی گئی ہیں اور ان سے کہا گیا ہے کہ اگر ہمیں کوئی خطرہ درپیش آ جائے درویشوں کی دعاؤں سے تو ان تفصیلات کو کھول کر دیکھ لیں۔ نقصان پہنچانے والے کا نام و نشان سب کچھ حاصل ہو جائے گا اور ادھر ایک تفصیلی رپورٹ

ید مرزا آپ کے اور انسپکٹر رازی کے نام سے وزارت داخلہ کو پہنچا دی گئی ہے اور اس تفصیلی رپورٹ میں یہ چیزیں موجود ہیں لیکن سربمہر لفافے کی شکل میں۔ اصل میں صورت حال ہی کچھ ایسی تھی درویشوں کی وں سے کہ ہمیں یہ سارے انتظامات کرنے پڑے ہیں۔ سب سے پہلے جمشید مرزا چند قدم آگے بڑھ کر پر بیٹھ گیا تھا۔ صوفی نے چونک کر کہا۔

''جوؤں سے ہوشیار۔'' انسپکٹر رازی بھی ایک دیوار سے ٹک گیا تھا۔ جمشید مرزا صوفی کو گھورتا رہا ر بولا۔

''آپ اتنے خطرناک آدمی ہیں، یہ تو ہمیں معلوم ہی نہ تھا۔''

''درویشوں کا کرم ہے آپ کی دعاؤں سے ورنہ ہم کس قابل ہیں۔ پان کھائیے گا۔'' صوفی نے ں کر ایک تپائی پر رکھی ہوئی پانوں کی ڈبیا اٹھائی اور بولا۔

''اصل میں آپ نے بڑی زیادتیاں فرمائی ہیں ذرا دیکھیے۔ یہ وہ تاریخی ڈبیا نہیں ہے جسے ہماری نیت کا ایک حصہ کہا جاتا ہے۔ آپ نے وہ اپنے قبضے میں لے لی ہے ایک بات ہم آپ سے کہیں اگر وں کی ڈبیا اور وہ بٹوہ ضائع کر دیا گیا تو ہماری آپ کی مفاہمت زندگی بھر نہیں ہو سکتی درویشوں کی دعاؤں ے اگر آپ نے اسے حفاظت سے رکھا ہے تو سمجھ لیجیے کہ بات چیت کی جا سکتی ہے۔'' جمشید مرزا گہری گہری سانسیں لینے لگا تھا۔

♥......♥......♥

شازیہ سے اچھی اداکاری کون کر سکتا تھا۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کا بہترین کردار ادا کر رہی تھی۔ ال بکھرے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ لباس بدن پر پورا تھا، بری طرح میلا کچیلا اور مسلا ہوا۔ دلاور اور غلام قادر بھی افلاس زدہ لوگوں کے روپ میں تھے۔ وہ ایک ٹیکسی سے اترے تھے اور پیر ڈھکن شاہ کے مزار کے احاطے میں داخل ہو گئے تھے۔ غلط وقت تھا اس وقت ڈھکن کے مریض نہیں آتے تھے۔ یہ کام شام کو پانچ بجے سے شروع ہوتا تھا اور ڈھکن شاہ کا مجاور طاہر شاہ مریضوں کو دیکھتا تھا۔ احاطے میں چند افراد موجود تھے۔ انہوں نے خشک سی نگاہوں سے ان لوگوں کو دیکھا۔ شازیہ اپنے پیروں ہی سے چل کر آ رہی تھی، لیکن اس کی اداکاری اس قدر شاندار تھی کہ کوئی بھی اسے دیکھ کر یہ سمجھ سکتا تھا کہ یہ دماغی طور پر غیر متوازن ہے۔ اس کے منہ سے بڑبڑاہٹیں نکل رہی تھیں۔

''دے دے ولی...... ملا دے ولی۔ بچا لے ولی۔'' اس کا سر ادھر ادھر گردش کر رہا تھا۔ مزار کے احاطے کے اندر موجود لوگ دلاور اور غلام قادر کے پاس پہنچ گئے۔

''کیا بات ہے بھائی۔ یہ کہاں گھسے چلے آ رہے ہو۔'' غلام قادر نے خونی نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کون سی جگہ ہے یہ؟'' تم اندھے نہیں ہو دیکھ نہیں رہے کہ اس کی کیا حالت ہے اور تم یہ انداز اختیار کر رہے ہو؟''

''م...... مطلب یہ نہیں ہے۔ طاہر شاہ صاحب تو پانچ بجے کے بعد آتے ہیں۔''

ہے۔ باہر کے معاملات تم دیکھ لو۔''

''ٹھیک ہے۔'' غلام قادر نے دلاور اور شازیہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ تمام باتیں پہلے
ہو چکی تھیں کہ کچھ فیصلے خود کیے جا سکتے ہیں اور ان کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ پھر شازیہ
کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں واقعی دو عمر رسیدہ عورتیں موجود تھیں، جنہیں ہدایت کر دی گئی۔ دلاور
سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے طاہر شاہ کی نظریں پہچان لی تھیں۔ شازیہ کو اس نے جس انداز میں
اس میں کوئی شرافت اور پاکیزگی نہیں تھی۔ لازمی امر تھا کہ وہ اس کے لیے دل میں برائی رکھتا تھا اور اس
کے امکانات بھرپور تھے کہ شازیہ کے ساتھ کوئی سخت سلوک ہو لیکن اس خیال سے دلاور دل ہی دل میں
تھا۔ کہ اگر اس نے شازیہ کے ساتھ کوئی بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تو اپنی زندگی کے بدترین حادثے
دوچار ہوگا۔ شازیہ پر اسے پورا پورا بھروسا تھا۔ بہرطور وقت گزرتا رہا۔ پانچ بجے کے بعد بہت سے معتقد
وہاں آئے اور طاہر شاہ نے خوب ڈرامے کیے۔ ساڑھے سات بجے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ دلاور سب کچھ
دیکھتا رہا تھا۔

پھر تقریباً ساڑھے آٹھ بجے کھانے پینے کے لیے دیا گیا، لیکن دلاور کھانے کے سلسلے میں محتاط
تھا۔ یہ احساس اس نے نہ ہونے دیا کہ وہ کھانا نہیں کھا رہا لیکن وہ پوری طرح محتاط رہا تھا۔ اس وقت رات
تقریباً دس بجے تھے کہ دلاور شاہ نے طاہر شاہ کو دیکھا، جو خود چلتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔ دلاور شاہ کھڑا ہو گیا۔
''بیٹھو۔'' طاہر شاہ نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور وہ خود اس کے سامنے ایک اسٹول
پر بیٹھ گیا۔

''شاہ جی آپ، ادھر آ جائیے۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ میں نے ابھی تک تمہارا نام نہیں پوچھا۔''

''شاہ جی...... وہ......''

''رکو...... رکو، میں تمہارا نام بتاتا ہوں دلاور شاہ ہے نا تمہارا نام۔''

''شاہ جی سے کون سی بات چھپی ہوئی ہے۔''

''ہاں دلاور شاہ بہت سی باتیں واقعی ہم سے چھپی ہوئی نہیں ہوتیں اور بہت سی ایسی باتیں ہوتی
ہیں جن کا اظہار ہم خود کر دیتے ہیں تم تو ماضی میں بہت کچھ رہ چکے ہو۔ بڑا نام تھا تمہارا اب یہ کس روپ میں
نظر آ رہے ہو۔ تم اور کوئی غریب آدمی۔ بس یہ سمجھ لو کہ ہمارا ایک علم ہے تمہارے بارے میں۔ بتاؤ دلاور شاہ
کیا تم دلاور نہیں ہو۔ دلاور کی گردن جھک گئی۔ اس نے کہا۔

''ہاں شاہ جی۔ ایک سوال کرتے آپ مجھ سے، میں آپ کو خود ہی سب کچھ بتا دیتا۔ میں دلاور
ہی ہوں۔''

''اور یہ دلاور یہاں ڈھکن شاہ کے مزار پر کیوں آیا ہے کیا راز پوشیدہ ہے اس میں۔''

''راز نہیں جی بس انسان اسی طرح بدل جاتا ہے۔ آپ یوں سمجھ لیجیے میری ایک کہانی ہے۔
ویسے تو میرے بیوی بچے بھی ہیں۔ بیوی نے چھتیس بار کہا دلاور سے برا کام چھوڑ دے تو بال بچے والا ہے۔

شاہ جی میں نے سوچا کہ جو کام کر رہا ہوں وہ چھوڑ دوں تو کیا کروں گا۔ غربت دامن پکڑ لے گی۔ شاہ جی
چھپ چھپا کر اپنے بیوی بچوں کے لیے سب کچھ کرتا رہا، لیکن پھر وہ بڑی اماں مل گئی جس کا نام نادرہ بیگم تھا۔
کچھ تھا شاہ جی اس کے اندر کچھ تھا۔ بڑے پیار سے مجھ سے بولی کہ دلاور بیٹا نہیں ہے تو میرا اگر دل چاہ رہا
ہے کہ تجھے بیٹا کہوں پر بیٹا راستے میں ایک رکاوٹ ہے۔ بیٹا کیا تو اس رکاوٹ کو دور کر دے گا۔ دل نے کہا
کہ مان لے اس کی بات۔ پھر وہ مجھ سے کہنے لگی کہ میرے کام چھوڑ دے۔ بتایا تھا میں نے اسے کہ جو کچھ کرتا
ہوں وہی جانتا ہوں اور کچھ نہیں کر سکوں گا۔ شاہ جی چھوڑ دیے برے کام، ایک جگہ دلوادی اس نے مجھے رہنے
کے لیے۔ بیوی بچے وہیں ہیں خود تو مر گئی اپنی یہ بیٹی میرے لیے چھوڑ گئی۔ شاہ جی واقعی کچھ نہیں ہے میرے
پاس اس کے علاج کے لیے مگر دل یہ چاہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہو جائے۔''

''دلاور ایک بات بتاؤ۔''

''جی شاہ جی۔''

''دنیا اگر برائی کی طرف جائے تو اس کا بہترین خیر مقدم کیا جاتا ہے اور اگر وہ نیکیوں کے
راستوں پر چل پڑے تو آخر کار موت کے وقت تک سارے معاملات ختم ہو جاتے ہیں اور ہاتھ کچھ نہیں آتا۔
تمہیں حیرت ہو رہی ہوگی دلاور کہ میں کیسی باتیں کر رہا ہوں مگر یہ سچ ہے دلاور یہ سچ ہے۔ اس لڑکی کا کوئی
روحانی علاج نہیں ہو سکتا۔ روحانیت کہاں ہے؟ کیا جانتے ہو تم ڈھکن شاہ کے بارے میں کہ یہ کون تھے۔ تھے
بھی یا نہیں تھے۔ کسی ضرورت مند نے یہ اینٹوں اور پتھروں کا مزار بنا کر لوگوں کے جذبات سمیٹ لیے اور
کمائی شروع کر دی۔ دلاور واپس آ جاؤ اپنی دنیا میں لڑکی کو کسی اچھے اسپتال میں داخل کراؤ، اچھی ہو جائے
گی۔ کوئی فضول خیال دل میں نہ لاؤ۔ کیا بیماری ہے اسے یہ تو کوئی ڈاکٹر ہی بتا سکے گا۔ پیسہ چاہیے اس کے
لیے پیسہ اگر واقعی اس کے لیے اپنے دل میں سچے جذبات رکھتے ہو۔ تو پھر علاج کراؤ۔ دلاور عجیب سی نگاہوں
سے طاہر شاہ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''شاہ جی ایک بات بتائیں گے آپ؟''

''ہاں پوچھو۔''

''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

''دلاور ظاہر ہے کہ ساری تفصیل تو میں تمہیں نہیں بتا سکتا، لیکن اتنا ضرور بتاؤں گا کہ ڈھکن شاہ
صرف ایک کہانی ہے۔ میرے پاس کوئی روحانیت نہیں ہے۔ میں یہاں بیٹھ کر کچھ کام کر رہا ہوں۔ کیا تم فوری
طور پر ایک لاکھ روپے کمانا پسند کرو گے۔''

''اے...... اے...... اے ایک لاکھ......'' دلاور نے بدحواس ہو جانے کی اداکاری کی۔

''بہت بڑی رقم تو نہیں ہے یہ تمہارے لیے۔ لاکھوں میں کھیلتے رہے ہو تم۔''

''پرانی بات ہے شاہ جی بہت پرانی بات ہے۔ اب تو آپ یہ سمجھ لیجیے۔''

''جانتا ہوں...... جانتا ہوں تم لوگوں پر جب شرافت کا دورہ پڑتا ہے تو ایسی ہی زندگی گزارتے ہو
تم۔ دلاور میں تمہیں کام دلوا سکتا ہوں۔ فوری طور پر ایک لاکھ روپیہ ایڈوانس رکھو۔ میں دیتا ہوں تمہیں یہ رقم اور

اس کے بعد تم یہ سمجھ لو کہ سارے معاملات ٹھیک ہو جائیں گے۔ دیکھو اگر تم دلاورا۔ دلاورا نہ ہوتے اور صرف دلاور ہوتے تو بات بدل جاتی۔ لیکن مجھے نئے نئے لوگوں کی ضرورت پڑتی ہے اور تم مجھے کام کے آدمی نظر آئے ہو، کیونکہ میں تمہارا ماضی جانتا ہوں۔ ایک منٹ میں طاہر شاہ نے اپنے لباس سے ہزار کے نوٹ کی ایک گڈی نکالی اور دلاور شاہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ تم اپنے مسائل حل کرنے کے لیے رکھو۔ لڑکی کی طرف سے تم بے فکر رہو میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں۔ لیکن اگر میرا اور تمہارا ساتھ ہو جاتا ہے تو تم فکر مند نہ ہو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' دلاور شاہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولا۔

''واہ شاہ جی واہ۔ آیا کس لیے تھا، کام کیا کر ڈالا آپ نے۔ ٹھیک ہے لائیے بہت دن سے یہ سب کچھ سوچ رہا تھا۔ اگر تقدیر نے اسی دائرے میں قید کر رکھا ہے تو میں یہ دائرہ قبول کر لیتا ہوں۔ کیا زندگی ہے۔ آ گیا واپس شاہ جی دلاورا واپس آ گیا۔'' طاہر شاہ نے مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر دلاور شاہ کا شانہ تھپتھپایا۔ پھر اس نے کہا۔

''کام فوراً کر دو پرسوں اتوار ہے اور اتوار کو تمہیں ایک کام کرنا ہے؟''

''ٹھیک ہے شاہ جی میں حاضر ہوں۔'' دلاور نے کہا۔

''کھانا کھا لیا نا۔''

''جی شاہ جی۔''

''ٹھیک ہے آرام کرو، لڑکی کی طرف سے بالکل بے فکر رہو۔ ایسا کرتے ہیں ایک آدھ دن میں اسے کسی صحیح جگہ داخل کرا دیتے ہیں۔ باقی اتوار کے دن تمہیں کام کرنا ہے اور سنو جذباتی ہونے کی کوشش نہ کرنا میرے کام برے ہی ہوتے ہیں۔ ان سے کسے نقصان پہنچتا ہے کسے فائدہ تم اس کی بالکل فکر نہ کرنا۔''

''جی شاہ جی آپ بالکل اطمینان رکھو۔'' دلاور نے جواب دیا۔

♥……♥……♥

دلاور نے غلام قادر سے ساری کہانی بیان کر دی تھی اور یہ کہانی ہاتھوں ہاتھ صوفی تک پہنچ گئی تھی۔ صوفی کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ عارضی طور پر سہی جمشید مرزا اور انسپکٹر رازی ہوش میں آ گئے تھے لیکن صوفی جانتا تھا کہ پولیس والے ہیں۔ اپنی جیسی کوشش ضرور کریں گے۔ معشوق نشیلے کو بھی لاک اپ سے رہائی مل گئی تھی اور وہ سیدھے صوفی کے پاس پہنچے تھے۔

''عرض کیا ہے۔ کنوں کم کم، کنوں کم کم گھنے رستے سرا کم کم۔''

''دفع کم کم بھاگو کم کم چلو کم کم، غرق کم کم درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''واہ واہ کیا کاف اور کاف کے قافیے ملے ہیں۔''

''چلے جائیے نشیلے صاحب جمشید مرزا آنے ہی والا ہے کہہ رہا تھا غلطی سے چھوڑ دیا، ورنہ ابھی دس بارہ دن خاطر مدارات کا ارادہ تھا۔

''مم، مگر، یعنی وہی بے قصوری غرقستی۔''

''میرا خیال ہے ابھی آنے ہی والے ہیں۔''

''دوبارہ کب ملاقات ہو گی صوفی صاحب۔''

''جیل سے واپسی پر۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''جیل سے واپسی۔''

''تو اور کیا سمجھ رہے ہو تم۔ خدا کی مار ہو سب پر۔ تھانہ، جیل، پولیس اور کچھ تو سننے کو ہی نہیں ملتا یہاں تو۔ حسینہ نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی ابھی اندر داخل ہوئی تھی۔

''ان پر ایک شعر ہو جائے۔'' صوفی نے کہا۔

''بغیر چائے کے ہو نہیں سکتا آخر یہ چائے کی ایک پیالی کیوں لائی ہیں؟''

''خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کر رہی ہیں۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟ ہم سمجھے نہیں۔ یعنی کہ وہی درما۔'' اچانک ہی باہر سے کسی ہارن کی آواز سنائی دی تو معشوق نشیلے ماماہی کرتے رہ گئے اور صوفی نے کہا۔

''اب میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ آخر کار پولیس آ گئی۔''

''نن……نہیں……صوفی صاحب! یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ ہم نے ساری زندگی کوئی جرم نہیں کیا۔''

''جائیے دیوار کود کر بھاگ جائیے۔ ورنہ گئے کام سے آپ۔ ہارن پتا نہیں کسی اور گاڑی کا بجا ہو گا، لیکن معشوق نشیلے صاحب جو احاطے کی دیوار کود کر بھاگے تو پلٹ کر نہیں دیکھا۔ بہر حال دلاور نے غلام قادر کو ساری تفصیل بتائی تھی۔ شازیہ بھی وہیں تھی اور اس کے لیے کسی معقول اسپتال کا بندوبست ہو رہا تھا۔ صوفی نے غلام قادر کو کچھ ہدایات دیں اور غلام قادر نے یہ ہدایات دلاور تک پہنچا دیں جو ابھی وہیں رہ رہا تھا اور اسے اتوار کی صبح کام سے جانا تھا۔ اب یہ کام کیا تھا۔ یہ اللہ بہتر جانتا تھا۔ بہر حال دلاور وہیں رہ رہا تھا، لیکن نئی جو اطلاعات پہنچی تھیں ان کے تحت ہفتے کی رات کو شازیہ کو وہاں سے فرار ہو جانا تھا۔ پیر ڈھکن شاہ کے مزار پر آنے کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ پہلی بات تو طاہر شاہ تک رسائی اور اس کے بعد باقی کارروائی، جس کے لیے دلاور کو ایک زبردست کارکردگی کا مظاہرہ کرنا تھا۔

بہر حال شازیہ کو وہاں سے ہٹانے کا منصوبہ کسی اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ سوائے اس کے کام میں طوالت ہو رہی تھی اور صوفی کے اندر یہی ایک خوبی تھی کہ وہ مختصر وقت میں بڑے سے بڑا کام کر لیا کرتا تھا۔

♥……♥……♥

دلاور نے یہ وقت بڑے سکون سے گزارا تھا۔ بہر حال اسے کوئی مشکل بھی نہیں پیش آئی تھی۔ اتوار کی صبح ناشتے وغیرہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اسے طلب کر لیا گیا۔ رات کو شازیہ کو فرار ہونا تھا لیکن ساڑھے بارہ بجے کے قریب غلام قادر کے ذریعے پیغام ملا کہ شازیہ کو ابھی یہیں رہنا ہے۔ تھوڑی سی تبدیلی ہو گئی ہے پروگرام میں چنانچہ دلاور مطمئن تھا۔

''بہر حال وہ مزار کے اندرونی حصے میں داخل ہو گیا۔ یہاں طاہر شاہ اس کا منتظر تھا۔

''آج اتوار ہے دلاورا۔''

''جی شاہ جی۔''

''بتا رہا ہوں تمہیں۔ اسے اپنے دل میں محفوظ رکھنا بات معمولی نہیں ہے۔ ذرا سی لغزش تمہاری زندگی کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔''

''جی شاہ جی۔''

''سفید لائن اسٹریٹ نمبر بیس۔ وہاں جاؤ تمہارا تعارف ہو چکا ہے۔ وہاں تمہیں جو کچھ بھی ہدایت ملے اس پر عمل کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے شاہ جی۔ کب جاؤں؟''

''بس فوراً چلے جاؤ۔'' اور دلاور وہاں سے باہر نکل آیا۔ ایک ایڈریس کا پتا چلا تھا اسے۔ فوراً ہی اس نے ٹرانسمیٹر پر صوفی کو کال کی۔

''ہاں دلاور بولو۔''

''چھوٹے بابا میں......''

''تم ابھی مزار سے باہر نکلے ہو۔ میں بذات خود تم پر نگاہ رکھے ہوئے ہوں۔ بولو آگے کیا ہدایت ملی ہے۔ خبردار! ادھر ادھر مت دیکھنا درویشوں کی دعاؤں سے، حالانکہ تمہارے آس پاس کوئی نہیں ہے۔ طاہر شاہ نے تم پر پورا بھروسا کیا ہے، لیکن احتیاط ضرورت کی بڑی اماں ہوتی ہے درویشوں کے کرم سے۔ بولو جلدی بولو۔''

''سفید لائن اسٹریٹ نمبر بیس۔''

''سفید لائن۔ وہیں جا رہے ہو۔''

''جی چھوٹے بابا۔''

''بالکل بے فکر رہنا۔ پریشانی کی کوئی گنجائش نہیں ہے جو کچھ کہا گیا پورے اعتماد سے کرو۔''

''جی۔'' دلاور کو بڑا اطمینان ہو گیا لیکن اسے حیرت تھی کہ اتنی صبح صبح صوفی اس کے آس پاس ہی موجود ہے۔ اس نے ایک ہی جملہ کہا تھا لیکن دلاور کو یقین ہو گیا تھا کہ صوفی ہزار آنکھوں سے اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ ایک آٹو رکشا نے آخر کار اسے سفید لائن کے علاقے میں اتار دیا۔ ایک انتہائی خوب صورت اور جدید علاقہ تھا۔ عام طور سے اسے تفریحی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں بہت سے فارم ہاؤسز بنے ہوئے تھے جنہیں دلہن کی طرح سجا دیا گیا تھا یہ فارم ہاؤس مختلف تقاریب کے لیے کرائے پر دیے جاتے تھے اور ان کے کرائے بے پناہ تھے۔ اس کے علاوہ یہاں کے خوش گوار ماحول کی وجہ سے چھوٹے مکانات بنا کر کرائے پر اٹھا دیے گئے تھے اور بعض مکانات دولت مند لوگوں نے خود بنائے تھے۔ بہر حال اسٹریٹ نمبر بیس بھی ایک خوبصورت علاقہ تھا۔ دلاور کافی فاصلے پر اتر گیا تھا اور اس کے بعد بیس نمبر تلاش کرتا ہوا آگے بڑھ گیا حالانکہ وہ گیارہ نمبر پر اترا تھا اور اندازہ تھا کہ بیس نمبر کہاں ہوگا۔ بیس نمبر پر پہنچ کر اس نے دروازے کی بیل بجائی۔ ایک انتہائی دراز قامت آدمی نے اسے اندر بلا لیا۔

''دلاور۔''

''ہاں۔''

''ادھر چلے جاؤ۔'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ایک گودام سا بنا ہوا تھا۔ اصل عمارت سامنے تھی اور یہ اندازہ نہیں تھا کہ اصل عمارت میں کون کون ہے۔ گودام نما جگہ میں داخل ہونے کے بعد اسی لمبے تڑنگے آدمی نے دلاور سے کہا۔

''ہاں۔ میں تمہیں ساری تفصیل بتائے دیتا ہوں۔''

''آپ کون ہیں صاحب جی۔ آپ سے میرا تعارف نہیں ہو سکا۔''

''مجھ سے اگر کسی کا تعارف ہوتا ہے تو اس کے ہاتھ پاؤں سلامت نہیں ہوتے۔ میری لغت میں تعارف کا مطلب یہی ہے۔''

''اچھا...... ایسا تعارف میں نہیں چاہتا۔ کام بتاؤ۔ دلاور کا لہجہ بھی خشک ہو گیا اور وہ شخص مسکرانے لگا۔'' پھر اس نے کہا۔

''اندازہ لگا رہا تھا دلاور! کہ تم اب بھی اتنے ہی گرم مزاج ہو یا کچھ ٹھنڈے پڑے ہو۔''

''کام بتاؤ کام۔''

''دیکھو تین آدمی یہاں اور آنے والے ہیں۔ تم چاروں بلیو گارڈن جاؤ گے۔ بلیو گارڈن میں سیاسی جلسے وغیرہ ہوا کرتے ہیں یا اور ثقافتی پروگرام ہوا کرتے ہیں۔ آج شام کو سات بجے وہاں ایک جلسہ ہے۔ بلیو گارڈن کو سجایا جا رہا ہے۔ جلسہ گاہ اس کے مشرقی گوشے میں ہے، وہاں حسین پودے رکھے ہوئے ہیں، تم چاروں مالی کی حیثیت سے وہاں جاؤ گے اور تمہیں وہاں بم نصب کرنے ہیں۔ باقی تین آدمی تو سادہ سادہ کام کریں گے لیکن یہ بم نصب کرنے کا کام تمہاری ذمے داری ہے، کیونکہ اس سے پہلے بھی تم یہ کام کرتے رہے ہو۔'' دلاور کو اپنا ماضی یاد آ گیا اور اسے ایک ہلکی سی شرمندگی کا احساس ہونے لگا۔ اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے صاحب جی! بم کا ٹائپ کیا ہے؟''

''ریکس۔ او۔ زیڈ۔ تم اس ٹائپ کو سمجھتے ہو۔''

''ریموٹ کنٹرول۔''

''ہاں۔''

''اور کیا کرنا ہوگا؟''

''ریموٹ تمہارے پاس رہے گا۔ جلسہ گاہ میں جب بہت سے آدمی آ جائیں گے تو ٹھیک آٹھ بج کر دس منٹ پر تم کو یہ بم بلاسٹ کرنے ہیں۔ ہوشیار رہنا تم جیسے تجربے کار آدمی سے کسی چوک کی توقع نہیں ہے۔ آؤ۔ میں تمہیں بم دیتا ہوں یہاں سے تم سیدھے بلیو گارڈن جاؤ گے اور وہاں اپنا کام کرو گے۔'' دلاور نے ایک ٹھنڈی سانس لی تھی اور پھر اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے صاحب جی!'' لمبے چوڑے آدمی نے ایک طرف رکھا ہوا کارٹن کھول لیا۔ دلاور کو جو کچھ دیا گیا اسے دلاور اچھی طرح سمجھتا تھا۔ یہ خوشی کی بات تھی کہ باقی تین آدمی اس کے ماتحت تھے۔ اگر ان تینوں کو بھی بم دیے جاتے اور وہ بم ایکسپرٹ ہوتے تو دلاور کو اپنا کام مشکل نظر آتا۔ بات کافی وقت کی تھی،

چنانچہ وہ مطمئن تھا۔ طاہر شاہ بھی دلاور کی جانب سے مطمئن ہی ہوگا۔ کیونکہ اس نے دلاور کے بارے میں کوئی خاص تحقیق نہیں کی تھی اور اسے اس کا کام سونپ دیا تھا۔ باقی تین افراد یہیں سے اسے دیے گئے اور اس کے ساتھ ہی ایک پرانی فورڈ کار بھی جسے انہی میں سے ایک چلا رہا تھا۔ اس نے دلاور کو اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔

''سر جی! بم محفوظ ہے نا۔''

''کیوں۔ کیا بات ہے کیا تمہیں یہ جملے کہنے چاہیے تھے۔''

''نہیں سر جی! میں غریب آدمی ہوں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ حالات کی پریشانی کی وجہ سے یہ کام کرنے پر مجبور ہوگیا ہوں ورنہ میں اندر سے ایسا نہیں ہوں۔''

''اگر تم نے دوسرا لفظ کہا تو تمہیں گولی ماردی جائے گی۔ تمہیں پتا ہے کہ ایسے کاموں کے سلسلے میں کوئی گفتگو نہیں کی جاتی۔ دلاور نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''معافی چاہتا ہوں سر جی!'' وہ شخص بولا اور پھر مسکرانے لگا۔

''کیوں اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

''ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں۔ بس یوں سمجھ لیجیے یہ آپ کا امتحان تھا۔'' اس نے کہا۔ دلاور نفرت سے منہ سکوڑ کر خاموش ہوگیا تھا۔ بہرحال فورڈ کار بلیو گارڈن سے کافی فاصلے پر ایک جگہ روک دی گئی۔ اسی شخص نے کہا۔

''مالیوں کو مالیوں کے ہی انداز سے گارڈن میں داخل ہونا چاہیے۔ گاڑی کی ڈگی میں کھرپیاں وغیرہ رکھی ہوئی ہیں، انہیں نکال لو۔'' سارے کام ہدایت کے مطابق ہی کیے گئے تھے۔ ان لوگوں کے حلیے بھی مالیوں جیسے ہی تھے، چنانچہ وہ بلیو گارڈن میں داخل ہوگئے۔ ابھی یہاں کچھ بھی نہیں تھا لیکن جلسہ گاہ کی پوری نشان دہی کر دی گئی تھی اور یہ لوگ مطلوبہ جگہ پہنچ گئے تھے۔ سارے مالی کاموں پر مصروف ہوگئے۔ دلاور نے وہ خوف ناک بم نکالا جو انتہائی زبردست بارودی قوت کا تھا اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر وہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ بم کے تمام فیوز نکال کر جیب میں ڈال لیے۔ کسی بھی طرح کے خطرے کو وہ سامنے نہیں رہنے دینا چاہتا تھا۔ یہ فیوز انتہائی احتیاط سے نکالے گئے تھے۔ بم کے بارے میں پوری طرح نہ جاننے والا کوئی شخص یہ کام نہیں کرسکتا تھا۔

دلاور نے اپنی تمام تر مہارت کے ساتھ بم کو ایسی جگہ نصب کردیا جہاں سے اگر وہ بلاسٹ ہوتو شدید ترین تباہی پھیلائے۔ اس کے بعد اس نے ریموٹ سنبھالا اور باقی لوگوں کو اشارہ کیا باقی لوگ بلاوجہ جو پودوں سے چھیڑ چھاڑ کررہے تھے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور تھوڑی دیر بعد پرانی فورڈ واپسی کا سفر طے کررہی تھی۔ دلاور نے ان کی دانست میں اپنا کام مکمل کرلیا تھا وہ ان کی گڈ بک میں آ گیا تھا۔ اب یہ الگ بات تھی کہ وہ بم کبھی بلاسٹ نہ ہوتا۔ ادھر صوفی کیا کر رہا تھا یہ بات کسی کو نہیں معلوم تھی، لیکن دوپہر کے بعد دلاور جب ڈھکن شاہ کے مزار پر اسی حجرے میں آرام کر رہا تھا جہاں شازیہ کو رکھا گیا تھا تو اس کی فوراً طلبی ہوئی اور طاہر شاہ نے اسے اپنے پاس بلالیا۔

''بم کا ریموٹ تمہارے پاس موجود ہے۔''

''جی شاہ جی خیر تو ہے۔''

''ہاں خیر ہے۔ اصل میں اس میٹنگ کا پروگرام ملتوی ہوگیا ہے جو وہاں ہونے والی تھی۔ چنانچہ اب تمہیں اسی احتیاط کے ساتھ بم وہاں سے واپس نکال لینا ہے۔''

''جی شاہ جی۔'' دلاور نے جواب دیا۔ اس طرح بات ٹل گئی تھی اور دلاور کو کچھ وقت مل گیا تھا جب کہ طاہر شاہ نے اس سے ملاقات کرکے بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا کہ بہرحال اس نے اپنا کام بہ خوبی سرانجام دے لیا ہے البتہ صوفی اپنے طور پر ادھر ایک کام سرانجام دے رہا تھا، چنانچہ سفید لائن کی کاٹیج نمبر 20 کے سامنے ایک بہت ہی قیمتی گاڑی خراب ہوگئی اور ڈرائیور اتر کر احمقانہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ ایک ہونق سا آدمی تھا۔ شیروانی پاجامے میں ملبوس منہ میں پان کا ملغوبہ بھرا ہوا۔ سفید لائن کے چوکیدار نے اتفاقیہ طور پر اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ دیر تک ڈرائیور کو دیکھتا رہا پھر جیسے ہی ڈرائیور کی نگاہ اس پر پڑی اس کی آواز ابھری۔

''ماں او بھائی۔ بھائی جان۔ بھائی صاحب بھائی میاں، ذرا میری مدد فرمایئے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی درویشوں کے کرم سے۔ چوکیدار برا سا منہ بنائے ہوئے اس کے قریب آ گیا تھا۔''

''یہ گگ گاڑی...... کک، کک کباڑہ درویش۔''

''کیا ہوا ہے؟''

''پپ...... پتا نہیں۔''

''تمہاری گاڑی ہے؟''

''مذاق اڑا رہے ہو میرا درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''کیا......'' چوکیدار نے حیرت سے منہ کھول کر کہا۔

''میری صورت تمہیں ایسی نظر آرہی ہے کہ میں ایسی گاڑی کا مالک ہوں گا؟''

''تو پھر کہیں سے چرا کر لائے ہو؟''

''درویش رحم کریں۔''

''کیا درویش درویش لگا رکھی ہے۔ بات کیا ہے یہ بتاؤ اور گاڑی یہاں سے ہٹاؤ۔ ہمارے صاحب لوگ آتے جاتے ہیں۔ ہماری ڈیوٹی ہے۔''

''تت...... تو ذرا دھ...... دھ...... دھکا لگا کر آگے کرا دیجیے، میرے ناف نلے خراب ہیں درویشوں کے کرم سے میں خود۔''

''چلو، چلو۔'' چوکیدار نے اپنی رائفل فٹ پاتھ کے ساتھ لگے ہوئے ایک چھوٹے سے درخت سے لگائی اور گاڑی کے پیچھے آ گیا۔

''بونٹ تو بند کرو بے وقوف آدمی۔ اس نے کہا۔

''جج، جی ہاں۔'' شیروانی والے نے بونٹ بند کیا اور پیچھے آ گیا۔

''ارے کیا گاڑی ناک کی سیدھ میں لے جاؤ گے۔''

"بس آپ تھوڑی سی آگے کرا دیجیے تا کہ آپ کے صاحب کا موڈ خراب نہ ہو۔ شیروانی والے نے کہا اور قوی ہیکل چوکیدار جھک کر گاڑی کو دھکا لگانے لگا۔ شاید زندگی میں پہلی بار اس نے کوئی نیک کام کیا تھا جس کا صلہ اسے ملا۔ سر پر پڑنے والی ضرب اتنی ہی طاقت ور تھی کہ اس کی آنکھوں میں ستارے ناچ گئے۔ دونوں ہاتھ پھیلے اور سر گاڑی سے جا لگا، لیکن دوسری اور پھر تیسری ضرب نے باقی تکلیفوں سے آزاد کر دیا۔ قوی ہیکل جسم کا مالک تھا لیکن شیروانی والے ڈرائیور نے اسے اس طرح اٹھا لیا جیسے وہ کوئی کھلونا ہو۔ کندھوں پر لاد کر وہ آگے بڑھا، دروازہ کھولا اور چوکیدار کو کار کی پچھلی سیٹ پر ٹھونس دیا۔ رائفل اٹھا کر گاڑی میں ڈالی اور اس کے بعد ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔

چند ہی لمحوں کے بعد کار اسٹارٹ ہو کر ہوا ہو گئی تھی۔

♥.....♥.....♥

گرین ہاؤس کے خصوصی کمرے میں چوکیدار کو ہوش آیا تھا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ پلکیں جھپکتا رہا اور اس کے بعد ایک دم آنکھیں پھاڑ کر اٹھ بیٹھا۔ سامنے ہی دو افراد بیٹھے ہوئے تھے جو اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ چوکیدار نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"کون ہو تم، مجھے یہاں کون لایا ہے، میری رائفل کہاں ہے۔" اس نے جلدی سے اپنی پیٹی پر اپنا پستول تلاش کیا لیکن کپڑوں کے علاوہ کوئی چیز اس کے پاس موجود نہیں تھی۔ دونوں افراد سنبھل گئے۔ چوکیدار نے ان کے ہاتھوں میں پستول دیکھے تھے۔

"بیٹھ جاؤ آرام سے تم سے کچھ سوالات کیے جائیں گے۔" ابھی سامنے والے آدمی نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہی ڈرائیور اندر داخل ہوا جو اسے بے ہوش کر کے یہاں تک لایا تھا۔ چوکیدار اسے دیکھ کر دانت پیسنے لگا۔

"تو تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا تھا۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"صوفی صاحب ہمارے لیے کیا حکم ہے؟"

"اماں کیا پیٹ میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ بیٹھو ذرا، یہ صاحب ہمیں کچھ بتائیں گے بھائی صاحب کیا نام ہے تمہارا؟" صوفی نے بڑے نیاز مندانہ انداز میں پوچھا۔

"میں تجھے بتاؤں کہ میرا کیا نام ہے؟" چوکیدار غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"یہی درخواست کی ہے ہم نے آپ سے۔"

"قریب آؤ بیٹا اور ان دونوں سے کہو کہ ہمارے معاملے میں مداخلت نہ کریں۔ اگر تم پوچھ سکتے ہو پھر مجھ سے جو جی چاہے پوچھ لو اور اگر میں تمہاری چٹنی بنا دوں تو پھر مجھے جانے دینا۔"

"عادل، فیضان تم لوگ کچھ نہیں بولو گے۔ کم از کم یہ حق ان صاحب کا ہے کہ ہمارا اور ان کا براہ راست رابطہ رہے۔" صوفی نے کہا اور شیروانی کے بٹن کھولنے لگا۔ اندر سے عجیب چیز برآمد ہوئی تھی اسے دیکھ کر چوکیدار کو ہنسی آنے لگی۔ اس نے بھی اپنی آستینیں وغیرہ چڑھا لیں۔ صوفی قریب پہنچ گیا۔

"دیکھیے کسی بھی شرط کے سلسلے میں ایمان داری پہلی شرط ہوتی ہے۔ آپ نے وعدہ کیا ہے کہ اگر

آپ ہمیں مارنے میں کامیاب نہ ہوئے تو پھر ہمیں سب کچھ بتا دیں گے۔"

"ہاں وعدہ کیا ہے اور تم نے بھی وعدہ کیا ہے کہ اگر میں نے تمہارا حلیہ خراب کر دیا تو تم مجھے جانے دو گے۔"

"بالکل بہ خدا بالکل ایمانداری سے درویشوں کے کرم سے۔" صوفی نے کہا۔ فیضان اور عادل دلچسپی سے یہ تماشا دیکھنے لگے۔ یہ بات تو پورے اعتماد کے ساتھ پتا تھی کہ کیا ہونے والا ہے؟ ہڈیوں کے اس ڈھانچے کے بارے میں بس یہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ ایک ایسا عجیب و غریب روبوٹ ہے جو خالص اسٹیل سے بنا ہوا ہے لیکن بنانے والے نے کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ گوشت پوست کا انسان نہیں ہے۔ چوکیدار کو اپنے قد و قامت پر بڑا ناز تھا۔ چنانچہ اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور کسی اندھے بھینسے کی طرح اس نے صوفی کے سینے پر ٹکر مارنے کی کوشش کی، لیکن یہ بھی صوفی ہی کا کمال تھا کہ اس نے صرف اس کے سامنے سے ہٹنے پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ ذرا سا اپنی جگہ سے ہٹ کر چوکیدار کی گردن اپنی بغل میں لے لی۔ اس کے بعد جو تماشا ہوا وہ دیکھنے کے قابل تھا۔

ہر بار ایک نیا ہی کھیل سامنے آیا کرتا تھا گرین فورس کے ممبروں کا۔ صوفی نے اس کی گردن پکڑی ہوئی تھی اور وہ صوفی کے پیٹ میں گھونسے مار رہا تھا لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ چوٹ اسی کے ہاتھ میں لگ رہی ہے۔ صوفی تو ہل بھی نہیں رہا تھا۔ ڈرائیور نے جب مار پیٹ سے کوئی فائدہ ہوتے نہ دیکھا تو اس نے صوفی کو اپنے بدن کی قوت سے ہٹانے کی کوشش کی، لیکن یہ بھی ممکن نہیں ہو سکا۔ پھر تو وہ عجیب مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔ اب وہ صرف اپنے آپ کو صوفی سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی دس منٹ تک وہ شدید جدوجہد کرتا رہا اور اس کے بعد اس کے ہاتھ پاؤں لٹک گئے۔ پاؤں گھسٹنے لگے، بے ہوش تو نہیں ہوا تھا لیکن نیم بے ہوشی کی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا، کیونکہ بہت دیر سے گردن صوفی کے ہاتھ میں تھی۔ صوفی کی آواز ابھری۔

"اگر حکم فرمائیں تو چھوڑ دیا جائے۔" جواب میں چوکیدار کے حلق سے گھٹی گھٹی سی آوازیں ہی نکلی تھیں۔ صوفی نے اسے چھوڑا تو وہ کسی مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے زمین پر گر گیا تھا لیکن اتنی سکت اس میں ضرور تھی کہ اوندھا زمین پر گرنے کے بعد وہ سیدھا ہو گیا البتہ شاید اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا، چنانچہ زمین پر لیٹا پلکیں جھپکتا رہا۔ صوفی نے کہا۔

"پان نوش فرمائیے گا۔ معاف کیجیے گا پان نہیں پانی۔" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری تو صوفی نے فیضان سے کہا۔

"اب یہ ہمارا اولین فرض ہے کہ مہمان کو پانی پلایا جائے چوکیدار کو پانی پلایا گیا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب وہ حیرت سے صوفی کو دیکھ رہا تھا۔" پھر وہ آہستہ سے بولا۔

"کیا تم مشین کے انسان ہو؟"

"اللہ کے نیک بندے ہیں۔ درویشوں کا دیا کھاتے ہیں۔ آپ فرمائیے اپنی شرط پوری کرنے کے لیے تیار ہیں یا نہیں۔"

"پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" چوکیدار نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

♥.....♥.....♥

شاہ میر خان صاحب کرنل رحیم شاہ کو بھرپور تعاون دیتے تھے چنانچہ استعمال پولیس کو ہی کیا گیا تو لیکن اتنے بھرپور طریقے سے تقریباً آدھے دارالحکومت کی پولیس فورس نے ریڈ کیا تھا۔ سفید لائن کے کاٹیج نمبر 20 سے جس سفید فام کو گرفتار کیا گیا تھا وہ شارمن ہی تھا۔ دنیا کا چالاک ترین مجرم جس کا تعلق براہ راست تل ابیب سے تھا۔ دنیا بھر کی تمام تر کارروائیوں میں اسے حکومت اسرائیل کی بھرپور مدد حاصل ہوا کرتی تھی اور وہی اسکی پناہ گاہ بھی تھی۔ ایک مشکل مرحلہ کھڑا ہوگیا تھا۔ شارمن کے نام کو منظر عام پر نہیں لایا جا سکتا تھا۔ کرنل رحیم شاہ نے اس سلسلے میں ایک نیا ہی فارمولا پیش کیا جو صوفی کی مدد سے تیار ہوا۔ شارمن کے نام کو منظر عام پر نہیں لایا گیا بلکہ ایک اور نام سامنے کردیا گیا اور پولیس مقابلے میں اس کی ہلاکت کا اعلان بھی کردیا گیا۔ صوفی نے اپنے ہاتھوں سے شارمن کا چہرہ مسخ کردیا تھا تاکہ اسے پہچانا نہ جاسکے۔ یہ ایک انوکھا اختتام تھا کسی کیس کا، ورنہ اس سے پہلے ایسا کوئی کام نہیں ہوا تھا کہ کسی مجرم کی اصل حیثیت یا شخصیت بدل دی جائے۔ لیکن ضروری سمجھا گیا تھا۔ بعد میں شاہ میر خان صاحب نے کرنل رحیم شاہ اور صوفی کو بلایا تھا۔

''صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب قدرت کے کام ہوتے ہیں یعنی یہ کہ کچھ ایسی شخصیتیں پیدا ہوجائیں جو بے غرض اور بے لوث وطن عزیز کے لیے کام کریں اور ان کا نام بھی منظر عام پر نہ آئے۔ انہیں کوئی مالی فائدہ نہ ہو بس کیا کہا جاسکتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگوں کے لیے میں کیا کروں۔'' کرنل رحیم شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یار وطن عزیز صرف تمہارا ہی تو نہیں ہے، ہم بھی اسی آسمان تلے زندگی گزار رہے ہیں۔

♥......♥......♥

مقامی بینک کی یہ مصروف ترین شاخ تھی۔ کاروباری علاقے میں تھی اور چشم زدن میں یہاں کروڑوں آتے تھے اور کروڑوں جاتے تھے۔ عملے کے افراد کو سر اٹھانے کی مہلت نہیں ملتی تھی اور اب تو دو دن کی چھٹیوں کے بعد بینک کھلا تھا چنانچہ انتارش تھا کہ عملے کے افراد جھنجھلا کر رہ گئے تھے۔ خوب صورت لابی میں لوگوں کے بیٹھنے کے لیے نشست گاہیں بنی ہوئی تھیں اور دوسری طرف شیشوں کے کیبن۔ اس بینک کی یہ خوب صورت ترین برانچ تھی اور اس برانچ میں وہ لمبے اور بے ڈھنگے بش کوٹ میں ملبوس شخص خاکی رنگ کی ملگجی پتلون پہنے ہوئے کندھے پر ایک بغلی تھیلا لٹکائے ہوئے داخل ہوا تھا، لیکن کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ کوئی خاص طور سے اس کی طرف توجہ دے۔ اس جیسے بہت سے تھے۔ بہر حال اس نے ایک کونے میں جاکر کندھے سے تھیلا اتارا اور زمین پر رکھ دیا پھر اس میں سے ایک سیاہ رنگ کا ڈبا نکال لیا۔ اس ڈبے کے نزدیک بیٹھ کر وہ اس میں کچھ کارروائی کرنے لگا۔ بینک کا چوکیدار تھوڑے فاصلے پر موجود تھا اور یہ اتفاق ہی کی بات تھی کہ اس کی نگاہ اس کی طرف اٹھ گئی۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ چوکیدار کی ڈیوٹی ہی یہی تھی کہ وہ لوگوں پر نگاہ رکھے ایسی کوئی عجیب وغریب کارروائی کرتے دیکھ کر وہ اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ بدہیئت شخص سیاہ رنگ کے ڈبے میں لگے ہوئے تاروں کو جوڑ رہا تھا۔

چوکیدار اس کی یہ کارروائی دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کر کیا رہا ہے، لیکن اب اس کے لیے ناگزیر ہوگیا تھا کہ وہ اس سے اس کام کے بارے میں پوچھے جو وہ کررہا تھا چنانچہ وہ جھکا اور اس سے بولا۔

''کیا کر رہے ہو تم؟'' چوکیدار کی آواز سخت نہیں تھی۔ نیچے ڈبے میں کارروائی کرنے والے شخص نے چونک کر چوکیدار کی طرف دیکھا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

''بھائی صاحب یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔'' چوکیدار نے پھر پوچھا۔ اس شخص کا کام شاید ختم ہوگیا تھا چنانچہ اس نے ڈبے میں لگا ہوا ایک گول بٹن ایک طرف گھما دیا۔

''یہ کیا چیز ہے؟'' چوکیدار نے پھر پوچھا۔

''کیا بکواس کیے جارہے ہو تم جو کچھ ہے سامنے آجائے گا۔'' اس نے خوں خوار لہجے میں کہا۔ چوکیدار ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگیا اور اسے گھورنے لگا۔

قریب سے اسے چوکیدار نے دیکھا تو اسے عجیب سا لگا۔ اس آدمی کی آنکھیں گہری سرخ تھیں۔ نقوش بھی بری طرح بگڑے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے چہرہ کسی نے کسی مشین میں رکھ کر پچکا دیا ہو۔

''کیا مطلب؟'' چوکیدار نے پھر کہا۔

''بکواس بند کرو اپنا کام کرو۔'' اس نے کرخت لہجے میں کہا اور چوکیدار کو بھی غصہ آگیا اور بولا۔

''سنو یہاں لوگ پیسوں کے لین دین کے لیے آتے ہیں تم یہاں بیٹھ کر کیا کوئی مشین تیار کر رہے ہو۔ بتاؤ کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

''اور اگر نہ بتاؤں تو۔'' وہ غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''بتانا پڑے گا تمہیں۔''

''میں شرافت سے کہہ رہا ہوں کہ یہاں دے دفع ہوجاؤ۔''

''اب بھی ہم تمہیں دفع کردیں گے۔'' چوکیدار نے غصیلے لہجے میں کہا اور ذرا ہٹ کر ادھر ادھر دیکھا اور دوبارہ اس شخص کے پاس آگیا۔

''ابھی اگر تمہارا کوئی چیک ویک ہے تو ہمیں بتاؤ ورنہ یہ سامان اٹھاؤ اور سامان لے کر باہر نکل جاؤ۔ ادھر کوئی سامان رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہ تھیلا اٹھاؤ یہ تم نے ادھر کیوں پھینک دیا ہے۔'' اس نے ایک گہری سانس لی اور وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا، لیکن چوکیدار کو اس کے دوسرے عمل کے بارے میں کوئی شبہ بھی نہیں تھا۔ دوسرے لمحے اس کا ہاتھ چوکیدار کے منہ پر پڑا اور چوکیدار کا بھیجا ہل گیا۔ ایسا زوردار ہاتھ تھا، حالانکہ چوکیدار بھی ایک قوی ہیکل آدمی تھا لیکن یہ ایسا تھپڑ تھا کہ اس کا سر چکرا گیا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ اسے اپنے جبڑوں کی ہڈیاں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں لیکن بہر حال اس کی ڈیوٹی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور شانے سے لٹکی ہوئی بندوق اتار لی لیکن اس سے قبل کہ وہ بندوق سیدھی کرتا اس خوف ناک آدمی نے اس کے ہاتھ سے بندوق چھین لی اور پھر ایک اور عجیب وغریب منظر نگاہوں کے سامنے آیا۔ اس نے بندوق کی نال دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر موڑی اور اسے بالکل ٹیڑھا کرکے چوکیدار کے ہاتھوں میں اچھال دیا۔ لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے اس عجیب وغریب منظر کو دیکھا تھا اور حیرانی سے منہ پھاڑے رہ گئے تھے۔ پھر اس سے قبل کہ کوئی اپنی جگہ سے حرکت کرتا وہ شخص اس سیاہ رنگ کے ڈبے کو ہاتھ میں لے کر کیش کاؤنٹر پر پہنچ گیا اور اس نے جیب سے ایک ریوالور نکالا اور کیشیئر کے سامنے رکھ کر بولا۔

''یہ میرے ہاتھ میں جو تم لوگ سیاہ ڈبا دیکھ رہے ہو، یہ ایک انتہائی طاقت ور بم ہے اور اس میں لگے ہوئے سرخ بٹن کو دباتے ہی بینک کی یہ عمارت ہوا میں اڑ جائے گی۔ اس لیے جو شخص جہاں کھڑا ہے اپنے ہاتھ سر پر رکھ کر کھڑا رہے۔ اگر کسی نے بینک کے دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش بھی کی تو نتیجے کا ذمے دار وہ خود ہوگا۔'' اس کی آواز ایسی تیز اور گونج دار تھی جیسے کسی لاؤڈ اسپیکر سے نکل رہی ہو۔ یہ آواز تقریباً یہاں موجود تمام ہی لوگوں نے سنی تھی۔ کچھ تو سمجھ ہی نہیں سکے تھے کہ کیا ہو رہا ہے اور جو سمجھ گئے تھے وہ دہشت زدہ ہو کر رہ گئے تھے۔ بینک لوٹنے کا یہ ایک نیا طریقہ تھا جو بینک میں موجود لوگ حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ نہ صرف حیران تھے بلکہ دہشت زدہ بھی تھے۔ یہ شخص جو کہہ رہا ہے اگر یہ حقیقت ہے تو واقعی یہ ایک انوکھی داستان ہوگی جسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ان دنوں سب کچھ ہوسکتا تھا خاص طور سے بم بلاسٹ تو اتنے ہو رہے تھے کہ خبریں پڑھتے پڑھتے کان پک گئے تھے۔ یہاں یہ لوگ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ وہ کسی بھی قیمت پر اپنے بدن کے ٹکڑے نہیں ہوتے دیکھ سکتے تھے، لیکن بہر حال پھر بھی وہ لوگ جو دروازہ کے قریب تھے، دروازوں سے نکل بھاگے البتہ یہ پتا نہیں چل گیا تھا کہ بینک میں ڈاکا پڑ رہا ہے اور سڑک پر ڈاکا...... ڈاکا کے الفاظ گونجنے لگے لیکن اندر موجود تنہا ڈاکو نہایت اطمینان سے کھڑا ہوا تھا۔ اسے کسی بھی قسم کے شور کی کوئی پروا نہیں تھی۔ کینوس کا جو تھیلا اس کے ہاتھ میں تھا اسے اس نے کیشیئر کے سامنے رکھ دیا اور بولا۔

''اسے بھر دو اور سوچ لو اگر زندگی پیاری ہے تو جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو ورنہ سب سے پہلے تمہاری ہی زندگی ختم ہوگی۔'' لیکن کیشیئر کو زندگی پیاری نہیں تھی۔ وہ اپنے فرض کی ادائیگی سے باز نہ رہ سکا، تھیلا ہاتھ میں لے کر اس نے دفعتاً فرش پر دے مارا لیکن وہ بے انتہا پھرتیلا ثابت ہوا۔ تھیلا اس کے سر پر سے گزر گیا۔ اس نے تیزی سے باہر جاتے ہوئے تھیلے کو اپنے ہاتھ سے پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے پستول سے گولی چلا دی۔ گولی نے کیشیئر کا شانہ توڑ دیا تھا۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے تمام لوگ طرح طرح کی آوازیں نکالتے ہوئے کھڑے ہوگئے۔ وہ سب دہشت زدہ تھے اس شخص نے پھر ایک آدمی کو اشارہ کیا جو کیشیئر کے نزدیک بیٹھا ہوا تھا اور بولا۔

''چلو تم اٹھو اور اگر اپنی حالت اس جیسی نہیں چاہتے تو اس تھیلے کو نوٹوں سے بھر دو۔ وہ شخص کیشیئر کی طرح بہادر نہیں تھا اس لیے اس نے تھیلا پکڑ لیا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹوں کی گڈیاں اس میں ڈالنے لگا۔ بینک کی عمارت کے سامنے بے شمار لوگ جمع ہوگئے تھے لیکن اندر کے حالات کسی کو معلوم نہیں تھے۔ کسی نے اندر داخل ہونے کی ہمت نہیں کی تھی۔ پولیس والے بھی شاید قرب و جوار میں موجود نہیں تھے یا پھر اگر موجود بھی ہوں گے تو ایسے موقع پر وہ بھی احتیاط برتتے ہیں۔ فرض کی ادائیگی تو ڈاکا پڑنے کے بعد بھی کی جاسکتی ہے۔ اس شخص کا تھیلا بھر گیا اور وہ ساری درازیں خالی ہوگئیں جو نوٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ نزدیک رکھی ہوئی تجوری کے نوٹ بھی تھیلے میں پہنچ گئے تھے اور تھیلے کا وزن کافی بڑھ گیا تھا۔ تب اس نے تھیلے کا وزن اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے اپنے کندھے پر لٹکا کر کاؤنٹر کے پاس سے ہٹ گیا۔ اس نے کہا۔

''میں نے غلط نہیں کیا ہے تم لوگوں کو اگر زندگی پیاری ہے تو اپنی اپنی جگہ کھڑے رہو ورنہ سوچ لو تم سب لوگ اپنی موت کے ذمے دار خود ہوگے۔'' ابھی اس کے منہ سے اتنے ہی الفاظ نکلے تھے کہ دفعتاً وہ رک

گیا۔ اس کا دایاں پاؤں آگے بڑھنے کے لیے اٹھا ہوا تھا لیکن وہ اسی طرح اٹھے کا اٹھا رہ گیا۔ تھیلا کندھے سے جھول رہا تھا۔ اس بم کا ریموٹ کنٹرول اس کے ہاتھ میں موجود تھا جو ابھی کاؤنٹر پر رکھا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں پستول بھی تھا۔ وہ جس ایکشن میں تھا اسی میں رہ گیا تھا بس یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی پتھر کا مجسمہ ہو، جیسے کسی ماہر سنگ تراش نے ایک خاص ایکشن میں تراشا ہو۔ اس کا چہرہ بھی بے جان نہیں لگ رہا تھا۔ لوگوں نے خوف زدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس کی یہ ادا کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اب تک وہ اسے صرف دہشت اور خوف سے دیکھ رہے تھے لیکن اب اس دہشت میں حیرت بھی شامل تھی۔ دس سیکنڈ، بیس سیکنڈ، تیس سیکنڈ، پچاس سیکنڈ پورا ایک منٹ گزر گیا تو لوگوں نے چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔ باہر کھڑے ہوئے کچھ لوگ ایک دم اندر داخل ہوگئے اور اس کے بعد ہنگامہ ہوگیا۔ چاروں طرف سے لوگ اس آدمی پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے اسے گرانے کی کوشش کی، اسے مارنا چاہا، مجمع میں موجود ایک شخص نے اس کے ہاتھ سے ریموٹ کنٹرول لے لیا اور بولا۔

''ایک منٹ...... ایک منٹ ٹھہرو۔'' اس شخص نے کہا اور پھر پھرتی سے اس نے کاؤنٹر پر رکھا ہوا ڈبا اٹھا لیا اور الٹے قدموں پیچھے کھسکنے لگا۔ وہ غالباً اس بم کے خوف ناک اثرات سے لوگوں کو بچانا چاہتا تھا ورنہ کوئی بھی احمق اس منجمد ہو جانے والے شخص کے ہاتھ سے ریموٹ کنٹرول لے کر بینک کی اس عمارت کو دھماکے سے اڑانے کا باعث بن سکتا تھا۔ وہ اس آلے کو ہوا میں بلند کیے کیے ایک طرف چل پڑا۔ ڈاکو کو مارنے والے بے شمار لوگ تھے لیکن جس پہلے شخص نے اسے گھونسا مارا جو اس کے جبڑے پر رسید کیا گیا تھا۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکل گئی۔ اس نے داہنے ہاتھ سے گھونسا مارا تھا اور اس کے ہاتھ کے اوپری حصے کی تمام انگلیاں چٹخ گئی تھیں۔ اتنی شدید تکلیف ہوئی تھی ان ہڈیوں میں کہ وہ ہاتھ دبا کر دہرا ہوگیا تھا پھر جس شخص نے بھی اسے مارنے کی کوشش کی اس کا یہی حشر ہوا۔ اس کا بدن فولاد سے زیادہ سخت ہوگیا تھا جو چیز اس پر پڑ رہی تھی وہ کچھ کی کچھ ہو جاتی تھی اور اس کے بعد مارنے والوں کو خود ہی عقل آگئی۔ اب اتنی بہادری تو وہ دکھا ہی سکتے تھے۔ پھر ایک پہلوان نما شخص نے اس کی ٹانگوں میں گھس کر اسے گرانے کی کوشش کی۔ انداز ایسا تھا کہ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو ڈاکو چاروں شانے چت ہو جاتا لیکن ذرا سی دیر میں اسے سخت شرمندگی کا احساس ہوا۔ وہ ان فولادی ٹانگوں کو ہلا بھی نہیں سکا تھا۔ یہاں تک اس کا جو پاؤں اٹھا ہوا تھا وہ بھی اٹھے کا اٹھا رہ گیا تھا۔ یہ لوگ چونک کر پیچھے ہٹ گئے اور حیرت سے ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگا۔ پھر کسی نے کہا۔

''یہ...... یہ...... تو جیسے پتھر کا ہوگیا ہے۔ ذرا دیر میں یہ افواہ چاروں طرف پھیل گئی لیکن بینک کے عملے کے لوگ وہ تھیلا اس کے ہاتھ سے اتارنے میں کامیاب ہوگئے تھے جس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے اور کچھ افراد کیشیئر کو سنبھال کر مینیجر کے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے اور مینیجر خوف زدہ انداز میں اسپتال کو فون کر رہا تھا۔ دوسرے ٹیلی فون پر پولیس پولیس کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک پولیس موبائل وہاں پہنچی اور چند پولیس والے جو موبائل سے اترے تھے بینک میں گھس آئے۔ انہوں نے ڈنڈے سنبھال کر لوگوں کو منتشر کیا وہ شخص جو ریموٹ کنٹرول اور بم کا ڈبا سنبھالے ہوئے تھا بری طرح چیخ رہا تھا۔

''براہ کرم...... براہ کرم مجھ سے بچ کر نکلنا ورنہ یہ عمارت تباہ ہو جائے گی ہم سب مر جائیں گے۔

مجھ سے بچ کر نکلنا، مجھے ہلانا نہیں۔" لوگ اس سے بچ بچ کر نکل رہے تھے۔ ایک پولیس والا اس کے قریب پہنچ گیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم۔ کیا اٹھائے ہوئے ہو؟"

"یہ ایک خوف ناک بم ہے اور یہ اس کا ریموٹ کنٹرول۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"لاؤ ادھر لاؤ۔" پولیس والا بولا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم! یہ بم نہایت خوف ناک ہے پوری عمارت کو اڑا دے گا۔ یہ سرخ بٹن اگر دب گیا تو یہ سمجھ لو کہ عمارت تباہ ہو جائے گی۔"

"بکواس مت کرو۔ ادھر لاؤ اسے۔" پولیس والے نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

"بکواس تم بند کرو۔ بے وقوف آدمی۔ میں ایک عام آدمی نہیں ہوں اور سیکورٹی سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرے ہاتھ میں جو چیز ہے اگر تمہارے ہاتھ میں دے دوں تو تم سب کی موت کا باعث بن جاؤ گے۔"

"گویا تم بھی اس ڈاکے میں شریک ہو۔" پولیس والے کو اس کے یہ الفاظ اپنی توہین محسوس ہوئے تھے۔ بے شک اس نے اپنے آپ کو سیکورٹی کا آدمی کہا تھا لیکن کوئی ثبوت تو نہیں دیا تھا اس نے۔"

"ہاں میں شریک ہوں لیکن ابھی تم پیچھے ہٹ جاؤ، بعد میں اگر تم چاہو تو مجھے گولی مار دینا اگر تم پیچھے نہ ہٹے تو......" اچانک اس شخص کی آواز میں غراہٹ پیدا ہو گئی اور پولیس والا اس آواز سے متاثر ہو کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اب بھی جوں کا توں کھڑا تھا اور بینک میں عملے کے لوگوں کے سوا کوئی اندر نہیں رہ گیا تھا البتہ کچھ پولیس والے اس پتھر کے آدمی کو ہلا ہلا کر دیکھ رہے تھے اور ان کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے۔ انہوں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسے کیا ہو گیا ہے۔ اے تم لوگوں نے کیا کیا ہے اس کے ساتھ۔" ایک پولیس آفیسر نے بینک کے عملے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"دیکھ لیجیے سرکار پتھر کا بنا دیا ہے ہم نے اسے۔ ایک آدمی نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

کچھ دیر کے بعد مزید پولیس زیادہ تیاریوں کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ انہیں یہاں کی تمام صورت حال بتائی گئی تھی۔ چنانچہ یہ لوگ پوری طرح تیار ہو کر آئے تھے۔ کیشیئر کو اسپتال بھجوا دیا گیا۔ ایک بڑا پولیس افسر اس پتھریلے مجسمے کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے مینیجر سے کہا۔

"کیا ہے یہ......؟"

"ڈاکو۔" مینیجر نے سانس لے کر کہا۔

"کیا مطلب......؟"

"کیا عرض کر سکتا ہوں جناب۔"

"مذاق فرما رہے ہیں آپ......" پولیس افسر نے بھنویں سکیڑ کر کہا۔

"بھلا یہ جرات کر سکتا ہوں۔ جتنے لوگ یہاں موجود ہیں ان سے پوچھ لیجیے۔" مینیجر نے کہا اور پولیس افسر نے حیرانی سے اس مجسمے کو دیکھا۔ بہر حال اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ مینجر وغیرہ سوالات کرنے لگا۔ دوسرے لوگوں نے بھی اسے ویسی ہی کہانی سنائی۔ بینک کی رقم لٹنے سے بچ گئی تھی۔ بس کیشیئر بے چارہ زخمی ہو گیا تھا۔ آفیسر نے تحقیقات مکمل کیں پھر اس نے پولیس والوں سے کہا۔

"چلو تصویریں وغیرہ بنواؤ۔" ابتدائی کام مکمل ہونے کے بعد اس نے کہا۔ "اٹھواؤ اسے یہاں سے۔" چار پولیس والے مجسمے کی طرف بڑھے۔ لیکن پھر ان کے ہوش درست ہو گئے۔ وہ مجسمے کو اس کی جگہ سے ہلا بھی نہیں سکے تھے۔ آفیسر نے خود بھی کوشش کی تھی اور ناکام رہا تھا۔ پھر اس نے موبائل سیدھا کر کے کہا۔ "میں ہیڈ آفس فون کرتا ہوں۔ بات کچھ آگے کی نظر آ رہی ہے۔" لوگ اس کے متحرک ہونے اور باتیں کرنے کی کہانی سنا رہے ہیں۔

وہ وہاں سے تھوڑی دور ہٹ کر ہیڈ آفس کال کرنے لگا۔ لیکن ابھی وہ فون پر بات ہی کر رہا تھا کہ دفعتاً کئی چیخیں ابھریں اور وہ چونک پڑا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ چیخنے والے پولیس کانسٹیبل تھے جو اب بھی اس مجسمے کو اس کی جگہ سے ہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ چیختے ہوئے مجسمے ک۔ پاس سے ہٹ گئے اور مجسمہ......وہ آگ کی طرح سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے لوہے کا ٹکڑا بھٹی میں تپ کر سرخ ہو جاتا ہے۔ فضا میں اچانک سخت تپش اور حدت پھیلتی جا رہی تھی۔

پوری طرح دہکنے کے بعد وہ لوہے کا سرخ سیال بن کر زمین پر پھیلنے لگا۔ ماربل کا فرش گرم پگھلے ہوئے لوہے سے چٹخنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد زمین پر سرخ لوہے کے ڈھیر اور اس سے نکلنے والی لکیروں کے سوا کچھ نہیں رہا۔ پراسرار ڈاکو پگھل گیا تھا۔ تپے ہوئے لوہے کا ڈھیر کچھ دیر سرخ رہا پھر اس میں سیاہی آنے لگی۔ حیرت بھری آنکھیں اس ناقابل یقین منظر کو دیکھ رہی تھیں۔

♥......♥......♥

رانا سرکار کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی، لیکن ان کے قریبی حلقے کہتے تھے کہ یہ شخص چالیس کا جوان ہے......اپنی کارکردگی سے اس نے یہ بات منوالی تھی۔ شدید محنت کرنے والا آدمی تھا۔ اس کی سخت گیر فطرت کے باوجود اس کا اسٹاف اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ لیکن یہ سخت گیری صرف کام کے سلسلے میں تھی باقی حالات میں وہ ایک مشفق انسان تھا۔

نوجوان ریشم اس کی سیکرٹری تھی۔ وہ ریشم سے بھی بہت محبت سے پیش آتا تھا اور ریشم اسے اپنے بزرگ کی حیثیت دیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اس نوجوان بوڑھے کو دیکھ رہی تھی جو سر جھکائے کام میں مصروف تھا۔ کتنی شان دار شخصیت ہے اس کی۔ سنجیدہ متین چہرہ، کھڑے کھڑے نقوش، کنپٹیوں پر سفید بال بے حد بھلے لگتے تھے۔ اس کے اور رانا سرکار کے درمیان شیشے کی ایک دیوار تھی۔ جب بھی رانا صاحب کو اس کی ضرورت ہوتی وہ ایک مخصوص انداز میں اسے دیکھتے اور ریشم جیسے ان کی منتظر ہوتی تھی۔

اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ رانا صاحب نے ادھر دیکھا تو ریشم اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر وہ ان کے کمرے کا دروازے کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

"مس ریشم۔ آپ شاید کچھ بھول رہی ہیں؟"

"جی سر......" ریشم نہ سمجھنے والے انداز میں انہیں دیکھنے لگی۔

"کوئی اپائنٹمنٹ تھا ہمارا شاید؟"

ریشم اچھل پڑی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ شام پانچ بجے ایک اہم میٹنگ میں جانا تھا اور اس وقت پونے پانچ بج رہے تھے۔ یہ اس کی ذمے داری تھی کہ وہ انہیں وقت پر روانہ کرے لیکن وہ بھول گئی تھی۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور اس نے خوف زدہ نگاہوں سے رانا سرکار کو دیکھا۔

"نہیں...... فکر مند نہ ہوں۔ یہ کچھ کاغذات بریف کیس میں رکھ دیں۔" رانا صاحب کرسی سے کھڑے ہوگئے۔ ریشم نے جلدی جلدی کاغذات سنبھال کر رکھے اور بریف کیس لے کر آگے بڑھی۔ "ارے نہیں...... لائیے بریف مجھے دے دیجیے۔" "پلیز...... ابھی میں نخوت کی اس منزل تک نہیں پہنچا ہوں۔"

رانا صاحب نے بریف کیس اس کے ہاتھ سے لیا اور باہر نکل آئے۔ پھر انہوں نے رفتار کچھ تیز کردی۔ باہر ڈرائیور کار کے قریب کھڑا تھا۔ رانا صاحب کو عمارت کے دروازے پر دیکھ کر اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ رانا صاحب نے جھک کر بریف کیس کار میں رکھا پھر ایک پاؤں اندر رکھا اور پھر ایک دم ساکت ہوگئے۔

ڈرائیور ان کے اندر بیٹھنے کا انتظار کرنے لگا تاکہ دروازہ بند کرکے اسٹیئرنگ سنبھالے، لیکن رانا صاحب اندر داخل نہ ہوئے۔ ڈرائیور کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ اس نے کہا۔

"کیا بات ہے سر......؟" لیکن سر کا کوئی جواب نہ ملا بلکہ ڈرائیور کو ایک دم احساس ہوگیا کہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ ایک عجیب سی مردنی رانا صاحب کے چہرے پر نظر آئی تھی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور بولا۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے سر۔ کوئی بات......" یہ کہہ کر اس نے رانا صاحب کو کا بازو چھوا، لیکن...... پھر وہ حیرت سے اچھل پڑا...... بازو فولاد کی طرح سخت ہوگیا تھا۔

اس نے پریشانی سے سامنے دیکھا۔ ریشم باہر تک آئی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر وہ تیزی سے آگے آئی اور ڈرائیور کو دیکھ کر بولی۔

"کیا بات ہے خادم خان؟"

"ادھر دیکھو بی بی صاحب...... کوئی دورہ پڑا ہے شاید۔"

"دورہ......؟"

"ہاں۔ بدن پتھر کی طرح اکڑ گیا ہے۔"

"ریشم نے بھی آگے بڑھ کر رانا صاحب کو دیکھا اور پھر بدحواسی سے بولی۔" ہاں لگ تو رہا ہے۔ میں صاحب کے فیملی ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔ وہ اندر دوڑ گئی۔ فون تک جاتے جاتے اس نے اسٹاف کے چند افراد کو بھی صورت حال بتا دی اور بہت سے لوگ باہر دوڑ گئے۔ پھر سبھی نے کوشش کرلی لیکن کئی طاقت ور نوجوان بھی مل کر رانا صاحب کے بدن کو جنبش نہیں دے سکے۔ وہ پسینہ پسینہ ہوگئے تھے۔

کچھ ہی دیر کے اندر دفتر کا سارا اسٹاف وہاں جمع ہوگیا۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ کافی دیر ہوگئی۔ ہر طرح کی کوشش کرلی گئی لیکن کوئی رانا صاحب کی پوزیشن تبدیل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی پہنچنے میں دیر نہیں دکھائی تھی، لیکن وہ بے چارہ بھی کچھ نہیں کرسکا۔ آخرکار پولیس

کو بلالیا گیا۔ پولیس والے الگ اپنی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ ابھی کچھ بھی نہ ہو پایا تھا کہ اچانک رانا صاحب کے کپڑوں میں آگ لگ گئی اور ان کے پورے بدن سے شعلے ابل پڑے۔ سب گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے تھے۔ چاروں طرف شور مچ گیا۔ لوگ آگ بجھانے کی کوشش کرنے لگے لیکن آگ صرف کپڑوں تک محدود نہیں تھی، رانا سرکار کا پورا بدن تپتے ہوئے لوہے کی طرح سرخ ہوگیا تھا آن کی آن میں سر کے بال چرمرا کر جل گئے تھے۔ آہستہ آہستہ ان سرخ ہوتے ہوئے بدن کی تپش شدید سے شدید ہوتی گئی اور پھر دیکھنے والوں کو چکر آگئے۔ رانا صاحب جواب ایک آتشیں مجسمہ بن گئے تھے نیچے زمین پر بہنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں فولاد کا ایک ڈھیر تھا جو آہستہ آہستہ سیاہ پڑتا جارہا تھا۔

♥......♥......♥
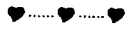
"تیرا بیڑا غرق۔ ستیاناس مارے پتا چل جائے کہ تجھے کس نے بنایا ہے تو منڈیا مروڑ کر رکھ دوں۔ ناک میں دم آگیا ہے دو دفعہ ہنڈیا جل چکی ہے۔ عاجز کردیا ہے اس ٹرن ٹرن نے۔ ارے ذرا صبر کرو...... موت پڑے آرہی ہوں۔"

حسینہ نے مگا بھر کر پانی ہانڈی میں ڈال دیا اور ہانڈی سے دھواں اٹھنے لگا۔ اس وقت کہیں سے صوفی کی آواز سنائی دی۔

"حسینہ بیگم...... کیا رحلت کرگئیں درویشوں کی دعاؤں سے۔ کتنی دیر سے فون کی گھنٹی بج رہی ہے، سن نہیں رہیں۔"

"آئے ہائے۔ میں نے تو رحلت نہیں فرمائی۔ تم کیوں دفن ہوگئے غسل خانے میں۔ کتنی دیر تک ان کچھیوں کو رگڑتے رہو گے چوہے جیسی کھال اتر جائے گی۔ ارے باہر مروآ کر میری ہانڈی جل رہی ہے۔"

"آپ فون دیکھیے۔ میں آرہا ہوں۔" صوفی نے جواب دیا۔

"ہونہہ...... فون دیکھیے۔" حسینہ نے کہا اور بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے سے نکل آئی۔ دوسرے کمرے میں جا کر اس نے ریسیور اٹھایا اور دہاڑی۔ "ہاں۔ بھونکو۔ کیا بھونکنا ہے۔"

"حسینہ بیگم۔" دوسری طرف سے کرنل رحیم شاہ کی آواز سنائی دی۔

"کون...... بڑے صاحب۔"

"میں ہی ہوں۔ لیکن آپ کیا کہہ رہی تھیں؟"

"وہ جی بس...... قسمت پھوڑ دی ہے آپ نے۔"

"کیوں...... خیر تو ہے؟"

"شر ہی شر ہے صاحب جی۔ کہاں پھنسا دیا آپ نے۔"

"آپ خوش نہیں ہیں یہاں؟"

"کیا خوشی کیا غم...... بس زندگی تو کاٹنی ہی ہے۔"

"بات کیا ہے بتائیے تو سہی۔"

"نہیں کوئی بات نہیں ہے۔ بس لڑائی ہوتی ہے بات بات پر۔ اب آپ دیکھیے کالی ہوں تو کیا

ناک نقشہ تو برا نہیں ہے آپ خود خدا لگتی کہیے کیا میں صرف کالونچ ہوں۔"

"کالونچ......؟"

"ہاں۔ وہ تو جیسے وحید مراد ہیں۔"

"آپ کس کی بات کر رہی ہیں حسینہ بیگم۔" کرنل رحیم شاہ سمجھ تو گیا تھا لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ صوفی تو ایک نہایت بردبار آدمی تھا۔

"ارے لپوریئے کی بات کر رہی ہوں جس کے پاس آپ نے بھیج دیا ہے۔"

"کہاں ہیں......؟"

"اپنی تقدیر دھو رہے ہیں گھنٹے بھر سے۔"

"غسل خانے میں ہیں؟"

"ہاں۔ لیجیے آ گئے ہیں۔" حسینہ بیگم نے دروازے سے صوفی کو داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

صوفی نے آگے بڑھ کر ریسیور لے لیا۔ پھر بولا۔

"ہیلو۔"

"صوفی صاحب......"

"درویشوں کے کرم سے۔"

"میں رحیم شاہ بول رہا ہوں۔"

"چشم ما روشن...... حکم۔"

"کوئی مصروفیت تو نہیں ہے؟"

"آپ حکم فرمایئے۔"

"سب لوگ بلا رہے ہیں۔ آ جایئے۔"

"بسر و چشم۔ حاضر ہوئے جاتے ہیں۔"

"میں انتظار کر رہا ہوں۔ خدا حافظ۔" دوسری طرف سے فون بند ہوا تو صوفی نے بھی ریسیور رکھ دیا۔ اور پھر کان میں انگلی ڈال کر زور زور سے ہلاتے ہوئے مڑا۔ سامنے ہی حسینہ بیگم کھڑی اسے گھور رہی تھیں۔

"جی فرمایئے۔"

"یہ ڈھول ڈبا ہٹوا دو گھر سے۔ ایک کام کر سکتی ہوں میں یا باورچی خانے میں لگا دو یا دوسرے کاموں میں۔"

"ڈھول کس وقت بجاتی ہیں آپ؟" صوفی حیرت سے بولا۔

"اے وہی مواٹرن ٹرن۔"

"فون......؟"

"ہوگا۔ مجھے کیا۔"

"ہوں۔ درویش رحم کریں آپ پر۔" صوفی نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بہت سی باتیں کرنی ہیں تم سے۔ وہ جو جھاڑو پیٹا یہاں آتا ہے اسے سنبھال لو ورنہ کسی دن کچھ ہو جائے گا۔"

"جھجھ۔ جھاڑو پیٹا؟"

"منہ لال کر دوں گی اینٹ مار کر۔"

"یہ کون ہے؟" صوفی نے پوچھا۔

"اے وہی گنے کی مشین میں پچکا ہوا۔ وہ کم بخت جسے کون کتیا معشوق کہتی ہے۔ چرسی گھوڑے جیسی شکل کا۔"

"معشوق نشیلے عالم۔"

"خدا کی مار پڑے اس پر۔"

"کوئی بات ہو گئی اس سے۔"

"میری عمر پوچھ رہا تھا۔ میں کتنی ہوں، پچیس کی ہو گئی تو اسے کیا۔"

"پپ...... پچیس۔" صوفی تھوک نگل کر بولا۔

"مٹا مارا مجھے سلور جوبلی کہنے لگا ہے۔"

"گویا اس نے آپ کو پچیس کا تسلیم کر لیا درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"وہ ہوتا کون ہے میرا سگا۔"

صوفی نے بات آگے نہیں بڑھائی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ پیچھے حسینہ نہ جانے کیا کیا بکتی رہی تھی۔ صوفی نے جلدی جلدی تیاری کی اور پھر کار لے کر چل پڑا۔ کرنل رحیم شاہ سے ملنا تھا اس لیے لباس بھی ڈھنگ کا پہنا تھا۔

گرین ہاؤس میں گرین فورس کے تمام ممبروں نے صوفی کا استقبال کیا تھا۔ کرنل رحیم شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی صوفی صاحب، آپ کے بارے میں بڑی افواہیں گردش کر رہی ہیں آج کل۔"

"درویش پناہ میں رکھیں۔"

"حسینہ کیسی جا رہی ہے؟"

"بہت بہتر۔"

"خیر۔ یہ بتایئے شہر میں ہونے والی تازہ وارداتوں کے بارے میں کچھ سن گن ہے۔"

"تازہ وارداتوں کے بارے میں؟"

شازیہ اور فیضان نے ایک مختصر سی رپورٹ تیار کی ہے۔ میں وقت ضائع کیے بغیر وہ آپ کے سامنے دہرائے دیتا ہوں۔" کرنل رحیم شاہ نے سامنے رکھی ہوئی فائل کو کھول کر نظر کا چشمہ لگاتے ہوئے کہا۔

صوفی خاموشی سے ایک جگہ بیٹھ گیا تھا۔ تب کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"پہلی واردات بینک میں ہوئی تھی۔ شہر کی ایک بھری پری شاہراہ پر ایک ڈاکو بینک میں داخل

ہوا۔ اس نے وہاں لوگوں کو یرغمال بناتے ہوئے دھمکی دی کہ اس کے پاس ریموٹ کنٹرول بم ہے۔ بہت بڑی رقم اس نے ایک بیگ میں بھر لی، لیکن وہ وہاں سے گیا نہیں، بلکہ اچانک چلتے چلتے پتھرا گیا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ بے شمار افراد نے اسے اس کی جگہ سے ہلانے کی کوشش کی، لیکن وہ ایک انتہائی مضبوط سنگی مجسمے کی شکل اختیار کر گیا اور اسے ہلایا نہ جا سکا، پھر اچانک ہی وہ بھٹی میں تپے ہوئے لوہے کی طرح سرخ ہوا اور پھر سرخ لوہے کی شکل میں ہی زمین پر بہ گیا۔ بینک کا ماربل کا فرش تڑخ گیا تھا۔

اس کے بعد دوسری واردات ایک انتہائی اہم محکمے میں کام کرنے والے افسر اعلیٰ رانا سرکار کے ساتھ ہوئی۔ رانا سرکار کسی میٹنگ میں شرکت کے لیے جا رہا تھا جیسے ہی وہ اپنی کار میں داخل ہوا اچانک پتھرا گیا اور اس کے بعد سرخ ہو کر بہ گیا۔ تیسری واردات ایک ہوٹل میں ہوئی جہاں ایک کال گرل اپنے گاہک کے ساتھ بیٹھی رنگ رلیاں منا رہی تھی کہ اچانک اس کا گاہک اسی کیفیت کا شکار ہو گیا۔ اس شخص کے بارے میں یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہ کون تھا اور کس حیثیت کا مالک تھا۔ ظاہر ہے وہ پانی بن کر بہ گیا تھا۔ یہ تین وارداتیں ہوئی ہیں۔ صوفی صاحب کیا آپ نے......؟"

"مم...... معافی چاہتے ہیں درویشوں کے کرم سے۔ پچھلے دنوں اخبار ذرا توجہ سے نہیں دیکھا اس لیے ہمیں اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔"

"ظاہر ہے صورت حال بھی ایسی ہی تھی۔ بہر حال لیبارٹریز میں لوہے کا یہ ڈھیر تجزیے کے لیے بھیجا گیا تھا لیکن وہ لوگ ابھی تک رپورٹ نہیں دے سکے۔ شاید وہ صحیح تجزیہ نہیں کر پا رہے ہے۔"

"ہوں...... درویش رحم کریں۔" صوفی داڑھی کھجانے لگا۔

"خیر ویسے تو ہر شخص ہر شہری ایک قیمتی فرد ہے، لیکن رانا سرکار کے بارے میں خصوصی طور پر لے دے ہو رہی ہے۔ وہ ایک اہم شخصیت کا مالک ہے اور پھر واردات بھی کچھ انوکھی سی ہی ہے۔ دیکھنا پڑے گا خاص طور سے۔"

"جی۔"

"میرا خیال تھا کہ بات آپ کے علم میں آ گئی ہو گی، لیکن خیر اب ذرا توجہ دیجیے اس سلسلے میں اور بھی وارداتیں ہو سکتی ہیں۔ ظاہر ہے، یہ کوئی عام بات نہیں ہے۔ میرا خیال ہے پھر کوئی سر پھرا ہمارے وطن میں داخل ہو کر ہمیں چیلنج کر رہا ہے۔ ایسے سر پھروں سے ہمیں صرف اتنی ہی دلچسپی ہے کہ ہم ان کا منہ کالا کر کے انہیں ان کی حرکتوں سے روک دیں۔" کرنل رحیم شاہ پُر خیال انداز میں دیوار کو دیکھنے لگا۔ سب کے چہروں پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

♥......♥......♥

اسے ہال کہنا بڑی بدحالی کی بات تھی۔ بس کوئی کھنڈر ہی معلوم ہوتا تھا۔ ٹوٹی ہوئی دیواروں والا چھتوں میں جالے لگے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ چڑیوں نے گھونسلے بنا لیے تھے۔ دیواریں بھی عجیب سی کیفیت پیش کر رہی تھیں، ان میں جگہ جگہ کوہان ابھرے ہوئے تھے، لیکن دیواروں کے نچلے حصے میں فرش کے پاس ایک مشینی جال پھیلا ہوا تھا۔ ایک عجیب و غریب مشینیں جن میں بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ بہت سے ڈائل

روشن ہو رہے تھے۔ چمک دار نقطے ادھر سے ادھر دوڑتے پھر رہے تھے اور وہ سب خاموش بیٹھے پھٹی نگاہوں سے ان نقطوں کو گھور رہے تھے۔ بار بار ان کی نگاہیں دروازے کی جانب اٹھ جاتیں جو ناہموار تھا اور کسی غار کے دہانے میں ہی بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

یہ خاموشی کافی دیر تک اسی طرح جاری رہی پھر ان میں سے ایک نے گہری سانس لی اور دوسرے چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ جیسے انہیں حیرت ہوئی ہو کہ ان میں سے کوئی اب بھی سانس لے سکتا ہے۔ سانس لینے والے شخص نے کہا۔

"یہ خاموشی ہمیں کیا دے سکے گی؟"

"ہاں۔ یہی ہم بھی سوچ رہے ہیں۔ ہمیں موت کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔" دوسرے نے کہا۔

"موت اور صرف موت۔"

"کیا ہم اس قدر ناکارہ ہو چکے ہیں کہ اپنی زندگی کا بندوبست نہ کر سکیں؟"

"لیکن کیسے......؟" ایک اور شخص نے سوال کیا اور ایک بار پھر پہلے جیسی خاموشی طاری ہو گئی البتہ یہ خاموشی زیادہ طویل نہیں تھی۔ انہی میں سے ایک نے کہا۔

"نہیں۔ اس طرح تو ہم اپنے آپ کو موت کے حوالے نہیں کر سکتے۔"

"تو پھر بولو کیا کرو گے؟"

"کچھ بھی سہی، یہ بات تو تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ جلاد ہے بلکہ اسے جلاد کہنا اپنا ہی مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ وہ بے حد بھیانک انسان ہے۔ وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا، کیونکہ وہ پہلے ہی کہہ چکا ہے کہ اس کے پاس معافی کا لفظ نہیں ہے۔"

"یار ہم اس قدر بزدل ہو گئے کہ اب بیٹھ کر موت کا انتظار کریں۔"

"ہم بے بس ہیں کیا کر سکتے ہیں؟"

"نہیں ایسا نہ کہو، میں جینا چاہتا ہوں، میں جینا چاہتا ہوں۔" یہ الفاظ ادا کرنے والے کے لہجے میں ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔

"خود کو قابو میں رکھو۔ جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد کے حالات ہمارے حق میں نہیں ہیں۔"

"تم نے ہی ہم سب کو موت کے حوالے کیا ہے۔ تم نے ہمارے ذہن خراب کر دیے ہیں۔"

"میں اپنے اندر کی آواز نہیں دبا سکتا۔ میرا دل وہی سب کچھ کہہ رہا ہے جو میری زبان تمہارے سامنے بیان کر رہی ہے۔"

"اپنے دل کو نکال کر باہر پھینک دو۔ میرے اعصاب اب خوف برداشت کرنے کے قابل نہیں رہے۔"

ایک بار پھر ہر شخص خاموش ہو گیا تھا۔ پھر اچانک ہی سناٹے میں ایک عجیب سی آواز ابھری۔ آواز غالباً اس انوکھی مشین میں لگے کسی اسپیکر سے ابھری تھی اور ان سب کے چہرے کچھ اور پیلے ہو گئے۔ ان کے چہروں پر موت کی زردی پھیل گئی تھی۔ بہ مشکل تمام ان میں سے ایک اپنی جگہ سے اٹھا اور اس مشین کے

نزدیک پہنچ گیا۔ اس نے مشین کا ایک لیور آن کیا اور پھر اس میں لگے ایک اسپیکر سے مکھیوں کی بھنبھناہٹ اُبھرنے لگی اور اس کے بعد ایک آواز ابھری۔

"انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ۔"

"ہم سب موجود ہیں سر۔" مشین کے پاس کھڑے ہوئے آدمی نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"موجود ہو، بھاگے نہیں یہاں سے۔" طنزیہ لہجے میں پوچھا گیا۔

"باس۔ ہم غدار نہیں ہیں جو کچھ ہوا اس میں بے شک کوتاہی تو ہوئی ہے، لیکن ہمارا قصور نہیں تھا۔"

"میرا تھا، میرا تھا...... مجھے تسلیم ہے دوستو! اور جو سزا میں تمہیں دینا چاہتا ہوں اصولی بات یہ ہے کہ وہ تم مجھے دے دو۔ کیا میں تمہارے سامنے آجاؤں۔"

مشین سے ابھرنے والی آواز کے بارے میں یہ اندازہ نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ کسی مرد کی آواز ہے یا عورت کی۔

"اب جو کچھ ہو چکا ہے، بس ہم اس کے لیے معافی مانگنا چاہتے ہیں اگر اس کی گنجائش ہو تو۔"

"تم خود ہی بتادو کیا گنجائش ہے؟"

"ہاں۔ ہے چیف۔"

"ویری گڈ! کمال کی شخصیت ہے تمہاری، بتاؤ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"باس! جنریٹر کے بارے میں انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ وہ صحیح کام نہیں کررہا، وہاں سے دو آدمی آئے اور سارا دن جنریٹر پر مصروف رہے اور انہوں نے بتایا کہ جنریٹر ٹھیک ہو چکا ہے اور اب اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ باس اس وقت تک وہ حادثہ ہو چکا تھا۔ ہم اس میں بے قصور تھے۔ پھر بھی ہم نے اس سے پہلے جنریٹر کو استعمال نہیں کیا اور دوسرے جنریٹر سے کام چلاتے رہے لیکن وہ بھی فیل ہوگیا اور پھر مسلسل دو حادثے رونما ہوئے، آپ خود بتائیے باس یہ کام تو فرسٹ انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ کا تھا۔ خوف سے بے قابو ہو کر ہم نے پھر اسی جنریٹر پر اکتفا کی جو پہلے خراب ہو چکا تھا اور باس......"

"ہاں ہاں۔ ہاں ہاں جو دو افراد اس سلسلے میں ملوث ہیں انہیں بھی سزا دی جائے گی، لیکن تم نے اپنا فرض پورا نہیں کیا۔ کیا جنریٹر کی خرابی کی انڈیکیشن نہیں ملتی۔ تم لوگ کہاں تھے اس وقت، بتاؤ کہاں تھے؟"

"آپ یقین کریں باس ہم اپنی ڈیوٹی پر تھے، ہم دھوکا کھا گئے۔"

"گڈ...... یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ میری لغت میں دھوکا کھانے کی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے تم سے پہلے بھی یہ بات کہہ دی تھی۔ تمہیں ہر طرح کی پیش کش کی تھی میں نے۔ کہا تھا نا میں نے کہ دھوکا مت کھانا۔ غلطی مت کرنا، جو چاہے لے سکتے ہو جیسے چاہو زندگی گزار سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے باس اگر ہو سکے تو آپ ہمیں معاف کر دیں اور اس کے بعد ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ کوئی غلطی نہیں ہوگی۔"

"سوچ لو۔ انسان ہو، اگر غلطی ہوگئی تو؟"

"بالکل نہیں ہوگی باس۔" ان سب کے چہرے ایک دم سے کھل گئے۔ انہیں یوں لگا جیسے باس کی آواز میں نرمی آگئی ہے۔

"اگر غلطی ہوگئی تو؟"

"تو ہم خودکشی کرلیں گے باس۔ اپنے ہاتھوں سے اپنی گردنیں کاٹ لیں گے۔"

"ارے واہ! یہ بھی ایک دلچسپ منظر ہوگا۔ بڑی عمدہ بات کہی ہے تم نے ہمیں پسند آئی چلو ٹھیک ہے۔ جاؤ انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ میں چلے جاؤ۔ وہاں جا کر نئے جنریٹر کھول لو، لیکن صرف ایک بات یاد رکھو۔ جنریٹر کو صحیح طور پر چیک کرنا تمہاری ذمے داری ہے۔"

"آپ کا بے حد شکریہ باس۔" آواز بند ہوگئی اور وہ سب ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈال کر ناچنے لگے۔

♥......♥......♥

مذاق مذاق میں ایس پی کے عہدے تک نہیں پہنچا تھا۔ عقل تھی یہ الگ بات ہے کہ زیادہ بھاگ دوڑ کا قائل نہیں تھا۔ بس خاص تکنیک سے کام چلا لیتا تھا اور بہت سے کیس حل کر ڈالے تھے۔ محکمے میں بڑی بات تھی لیکن کچھ لوگ اسے جانتے بھی تھے کہ وہ کیا ہے۔

بہرحال پہلے تو صوفی کے ہاتھوں اسے زک پہنچی تھی لیکن دوسری بار جو کچھ ہوا تھا جو خفیہ راز صوفی نے منکشف کیے تھے وہ ایسے تھے کہ پوری زندگی کی نیک نامی خاک میں مل سکتی تھی۔ وہ دو کوڑی کا ہو کر رہ جاتا۔

بات صرف اس تک نہیں تھی، انسپکٹر رازی بھی شکار ہوا تھا۔ وہ تو اتنا خوف زدہ ہوا تھا کہ دو ماہ کی چھٹی لے لی تھی اس نے۔ بات چونکہ ایس پی کے سامنے کھلی تھی اس لیے اس کے اوسان اور خطا ہوگئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایس پی صاحب کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی۔ بہرحال جمشید مرزا ان دنوں بہت پریشان تھا۔ اس دوران اس نے صوفی کے بارے میں مزید معلومات حاصل کی تھیں اور اسے پتا چل گیا تھا کہ لوہے کے پنجر میں عقل کا بیش بہا خزانہ ہے اور وہ بڑے بڑے معرکے سر کر چکا ہے۔ فوجی حکام بے حد عزت کرتے ہیں۔ فطرتاً صوفی ہے ورنہ چاہے تو بہت کچھ بن سکتا ہے۔

ان ہی الجھنوں میں پھنسا ہوا تھا کہ ایک اور افتاد آپڑی۔ کچھ انوکھی وارداتیں ہوئی تھیں جن میں ایک بینک کا واقعہ ہوا تھا، ایک رانا سرکار کا اور ایک واقعہ ہوٹل میں ہوا تھا۔ انسپکٹر جنرل نے اسے طلب کرلیا۔ پوری تفصیل بتا کر انہوں نے جمشید مرزا سے کہا۔

"پانچ پینل بنائے گئے ہیں جو آزادانہ طور پر اس بارے میں تحقیقات کریں گے جو کوئی اس سلسلے میں سب سے اعلیٰ کارکردگی دکھائے گا اسے ایک اہم سرٹیفکیٹ اور دوسرے اعزازات ملیں گے۔ ایک پینل کی سربراہی تمہیں دی جارہی ہے۔ اپنی ٹیم خود منتخب کرلو۔"

"یس سر......"

"یہ ایک خاص چیز ہے جو تمہیں امانت کے طور پر دی جارہی ہے۔" آئی جی صاحب نے لوہے کا ایک ٹکڑا اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا ہے سر؟'' جمشید مرزا نے پوچھا۔

''پگھلے ہوئے انسان کا ایک ٹکڑا۔''

''اوہ۔''

''اس کی صحیح رپورٹ کوئی لیبارٹری ابھی تک پیش نہیں کر سکی۔ تمہیں اجازت ہے کہ اپنے طور پر اس کے بارے میں معلوم کرو۔''

''یس سر......؟'' جمشید مرزا نے کہا۔

''میری خواہش ہے کہ یہ اعزاز تمہیں ملے۔''

''شکریہ سر......''

''اور یہ میرا حکم بھی ہے۔'' جمشید مرزا یہ حکم لے کر وہاں سے چلا آیا لیکن اس کی پیشانی شکن آلود تھی۔ بہت ہی الجھا ہوا معاملہ تھا۔ ان دنوں ویسے بھی اس کی ذہنی حالت زیادہ بہتر نہیں تھی۔ اپنے آفس آ کر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کے دماغ میں تھنور پڑ رہے تھے کیا کرنا چاہیے؟ کہاں سے آغاز کرنا چاہیے؟ بہت دیر تک وہ مختلف انداز سے سوچتا رہا اور غور کرتا رہا پھر اچانک اس کے دماغ میں بجلی سی چمکی۔ انسانی شکل کا ایک اونٹ آنکھوں میں آیا اور وہ بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ صوفی...... اس نے سوچا۔ اگر وہ کسی طرح اس کی مدد پر تیار ہو جائے تو......!''

پھر وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ باہر آ کر اس نے سرکاری جیپ لی تھی اور تیزی سے اپنے گھر کی طرف دوڑ گیا تھا۔ اس کے کانوں میں کچھ الفاظ گونج رہے تھے۔

اصل میں آپ نے بڑی زیادتیاں فرمائی ہیں۔ خود دیکھیے، یہ وہ تاریخی ڈبیا ہے جسے ہماری شخصیت کا ایک حصہ کہا جاتا ہے۔ آپ نے وہ اپنے قبضے میں لے لی ہے۔ ایک بات ہم آپ سے کہیں اگر پانوں کی وہ ڈبیا اور بٹوہ آپ نے ضائع کر دیا ہے تو ہماری آپ کی مفاہمت زندگی بھر نہیں ہو سکتی درویشوں کی دعاؤں سے۔''

رات بھر وہ ذہن پر زور دیتا رہا تھا کہ دونوں چیزیں کہاں رکھی ہیں۔ وہ اس کے گھر کی ایک الماری میں رکھی تھیں۔ جیپ پورچ میں کھڑی کر کے وہ دیوانوں کی طرح اندر بھاگا...... بیوی ارے ارے کرتی رہ گئی لیکن وہ دوڑ کر اس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ بڑی وحشت کے عالم میں اس نے الماری کھولی تھی اور اس جگہ پر نگاہیں دوڑائی تھیں جہاں پانوں کی وہ ڈبیا رکھی تھی اور پھر اس کی بینائی چلی گئی۔ دماغ چکرا گیا۔ گرنے سے بچنے کے لیے اس نے الماری کے پٹ کا سہارا لیا۔ دونوں چیزیں وہاں نہیں تھیں۔

جمشید مرزا دیر تک آنکھیں پھاڑے سکتے کے سے عالم میں وہاں کھڑا رہا۔ پھر بیوی ہی کسی کام سے اندر آ گئی تھی اور اس نے جمشید مرزا کو اس طرح کھڑے ہوئے دیکھا تھا۔

''خیر تو ہے کیا ہو گیا ہے؟'' بیوی کی آواز پر جمشید مرزا چونک پڑا، پھر مضمحل لہجے میں بولا۔

''یہاں کچھ رکھا ہوا تھا۔ کہاں گیا؟''

''کچھ......'' بیوی نے حیرانی سے پوچھا۔

''زمانہ قدیم کی پان رکھنے والی گندی سی نقشین چوکور ڈبیا اور کپڑے کا سلا ہوا بٹوا۔''

''کسی عمر رسیدہ محبوبہ نے تحفے کے طور پر دیا تھا کیا؟'' بیوی نے پر مزاح لہجے میں پوچھا۔

''آپ مذاق فرما رہی ہیں میری جان پر بنی ہوئی ہے۔''

''کچھ تعارف تو کروا دیں۔ ویسے تو ہم نے کبھی آپ کی عمر نہیں پوچھی لیکن اللہ خود ہی مشکلات حل کر دیتا ہے۔ کم از کم ستر سال کی تو ضرور رہوں گی وہ محترمہ جنھوں نے یہ چیزیں آپ کو تحفتاً دی تھیں۔''

''دیکھو تم مذاق کر رہی ہو۔ وہ مجرموں کے خلاف ایک بہت بڑا ثبوت ہے بتا سکتی ہو کہاں گئیں؟''

''ارے باپ رے سچ کہہ رہے ہو۔'' بیوی اب کچھ سنجیدہ ہوئی تھی۔

''یہ مذاق کرنے کا وقت ہے میری جان پر بنی ہوئی ہے۔'' جمشید مرزا اغرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اصل میں الماری ٹھیک کرنے کے لیے آئی تھی۔ یہ دونوں بے تکی چیزیں تھیں۔ بٹوا تو اتنا میلا تھا کہ آپ کی اس سفید قمیص پر دھبا لگ گیا اس سے اور ایسی ہی کچھ کیفیت پانوں کی اس ڈبیا کی تھی۔ مجھے غصہ تو آیا تھا مگر آپ سے کہنا بھول گئی۔ پلاسٹک کے شاپر میں ہی رکھ دیں یہ چیزیں۔''

''میں پوچھتا ہوں گئیں کہاں؟''

''بے تکی چیزیں تھیں اس لیے میں نے ملازمہ کو دے دیں۔''

''مم...... مم...... ملازمہ...... کون سی ملازمہ۔''

''ارے وہی بشیراں بی بی۔''

''بلاؤ اس کم بخت کو جلدی۔ تمہیں پتا نہیں کہ وہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔'' بیوی جمشید مرزا کی کیفیت دیکھ کر سنجیدہ ہو گئی۔ باہر بھاگی تو جمشید مرزا بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے لپکا تھا۔ ملازمہ بشیراں بی بی سرونٹ کوارٹر کے پچھلے حصے میں جھاڑو دے رہی تھی۔ جھاڑو کی سر...... سر کی آواز فضا میں بلند ہو رہی تھی اور ہلکی ہلکی گرد اڑ رہی تھی اس سے اندازہ ہو گیا کہ بشیراں کس طرف ہے۔ ان دونوں کو اس طرح اپنی طرف آتے دیکھ کر ملازمہ بھی بوکھلا گئی تھی۔ جمشید مرزا کی بیوی نے کہا۔

''بشیراں چھوڑ جھاڑو بات سن ادھر آ۔''

''جی بی بی۔'' بشیراں سہمی سہمی سی آ گئی۔

''میں نے تجھے پانوں کی ڈبیا دی تھی اور وہ کپڑے کا بنا ہوا بٹوا؟''

''جی بی بی، یاد ہے۔''

''کہاں ہے وہ۔''

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ صاحب کے کام کا ہے لا جلدی سے لا۔''

''لو جی، بی بی جی وہ میرے پاس نہیں ہے۔''

''نہیں ہے۔'' جمشید مرزا حلق پھاڑ کر چیخا۔

''صاحب جی وہ میری خالہ آئی ہوئی تھی نور پور سے، میں نے اسے دے دیا جی وہ پان کھاتی ہے۔ میں تو پان کھاتی بھی نہیں ہوں۔ خالہ کو دونوں چیزیں بڑی پسند آئی تھیں۔ کہنے لگی یہ پرانے زمانے کا ہے اب لوگوں کے پاس ایسی چیزیں کہاں ہوتی ہیں۔''

"بک...... بک کیے جا رہی ہو وہ بڑے کام کی چیز تھی۔"

"لو جی پھر میرا قصور تو نہیں ہے۔ آپ نے مجھے دے دی تھی میرے لیے تو بے کار تھی۔ وہ خالہ لے کر نور پور چلی گئی۔"

"نور پور...... اوہ، مجھے نور پور جانا پڑے گا اس کے ساتھ۔" جمشید مرزا نے کہا اور پھر بولا۔

"جلدی سے تو منہ ہاتھ دھو کر اپنے کپڑے بدل لے وہ بڑے کام کی چیز تھی۔ غلطی سے تیرے پاس چلی گئی۔"

"لو جی ٹھیک ہے تو کیا نور پور لے جا رہے ہو مجھے۔"

"نہیں جنت الفردوس لے جا رہا ہوں۔" جمشید مرزا نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"تو بک بک کرنے کے بجائے جا اندر اور منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل۔ ہم باہر کھڑے تیرا انتظار کر رہے ہیں۔" بشیراں کوارٹر میں چلی گئی تو بیوی نے کہا۔

"خود جاؤ گے نور پور۔"

"میں نے تم سے کہہ دیا ہے ناں۔ اگر وہ بٹوا اور ڈبیا نہ ملی تو یہیں آس پاس کسی کنویں وغیرہ کو تلاش کر کے اس میں کود کر خودکشی کر لوں گا۔"

"آج کل کنویں کہاں ہوتے ہیں؟" بیوی نے کہا پھر چونک کر بولی۔

"مم...... میرا مطلب ہے کہ اگر میں بھی ساتھ چلوں تو۔"

"کیوں بشیراں کو لے کر میں ہنی مون منانے جا رہا ہوں کیا؟"

"نہیں وہ تو ٹھیک ہے مجھے یقین ہے کہ تم ایسا نہیں کرو گے۔ بشیراں کو میں نے چھانٹ کر رکھا ہے ورنہ تمہاری نظر بازی سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

"دیکھو اس وقت میرا خون مت جلاؤ۔ تمہیں نہیں معلوم کہ پانوں کی ڈبیا اور بٹوے کی قدر و قیمت کیا ہے؟"

"اللہ ہی بہتر جانتا ہے تو میں چلو تیار ہو جاؤں، نور پور اب کوئی پاس بھی نہیں رکھا ہوا ہے اور پھر سچی بات یہ ہے کہ مردوں پر اعتبار کرنے والی بیویوں نے ہمیشہ ہی چوٹ کھائی ہے۔"

"لعنت ہو تم پر۔ میں گاڑی نکال رہا ہوں ذرا چیک کر لوں خود ڈرائیو کر کے جاؤں گا۔ ڈرائیور کو ساتھ نہیں لے جا رہا۔"

"جیسا آپ پسند کریں۔" بیوی نے کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد جمشید مرزا تیز رفتاری کا ریکارڈ توڑ رہا تھا۔ بڑی جنونی کیفیت طاری تھی اس پر۔ یہ اتفاق تھا کہ یہ ذمے داری اس کے سپرد کر دی گئی تھی اور اس عجیب و غریب کیس کو حل کرنے کے لیے اس کی خدمات بھی حاصل کی گئی تھیں۔ کون نہیں چاہتا کہ ترقی ہو، مرتبے میں اضافہ ہو۔ جمشید مرزا نے اور کوئی کارنامہ تو انجام نہیں دیا تھا۔ سوائے اس کے کہ اس نے ایک شان دار فیصلہ کیا تھا یعنی یہ کہ اگر صوفی سے اس کی دوستی ہو جائے تو صوفی جیسا دماغ اس کے لیے بڑا کارآمد ثابت ہو سکتا ہے اس بات کے امکانات ہیں کہ صوفی جیسا ذہین آدمی ان وارداتوں کا سراغ نکال لے۔ پانوں کی

ڈبیا اور بٹوا تو ویسے بھی اسے واپس کرنا تھا، کیونکہ صوفی نے جو دھمکی دی تھی اس نے اس کے اعصاب کشیدہ کر دیے تھے۔ کمایا تو اس نے اس کے علاوہ بھی اور بہت کچھ تھا۔ کافی جائیداد تھی، شہر میں اثاثے بھی مختلف ناموں سے بینکوں میں تھے، لیکن صوفی نے جن چیزوں کی نشان دہی کی تھی اگر وہ واقعی منظرعام پر آ جائیں تو عمر قید تک ہو سکتی ہے۔ اس چیز نے بھی اس کے دل میں پنکھے لگا دیے تھے۔ بہرحال...... یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ صوفی سے بنائے رکھنے ہی میں فائدہ ہے اور اس کے لیے پانوں کی ڈبیا کا حصول لازمی تھا۔

خدا خدا کر کے نور پور پہنچا۔ بشیراں بی بی راستہ بتاتی جا رہی تھی۔ ایک گندے سے محلے کے گندے سے مکان کے سامنے قیمتی جیپ روک دی گئی اور جمشید مرزا نے بشیراں اور اس کی بیوی کو اندر بھیج دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب بشیراں وہاں سے واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں پانوں کی ڈبیا اور بٹوا موجود تھا جسے دیکھ کر جمشید مرزا کی جان میں جان آئی تھی۔ اس وقت تک اس کی جان سولی پر ہی لٹکی ہوئی تھی لیکن اب اس کے انداز میں سکون پیدا ہو گیا تھا۔

♥......♥......♥

نئی زندگی ملی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ کسی غلطی کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ انتہائی ظالم انسان تھا بلکہ اسے انسان کہنا بہت مشکل تھا۔ وہ انسان نہیں بلکہ درندہ تھا۔ آواز انسانوں کی سی تھی لیکن حرکتیں درندوں سے بھی شدید تھیں۔ بات صرف یہیں تک محدود نہیں تھی بہت سی جگہوں پر وہ اس کے ساتھ رہ چکے تھے بلکہ اپنی مرضی سے نہیں وہ اس کے ساتھ رہنے پر مجبور تھے۔ اگر وہ اس سے دور ہونا چاہتے تب بھی زندگی کا کوئی امکان نہیں تھا اور اس کے ساتھ رہتے ہوئے بھی زندگی سولی پر چڑھی رہتی تھی۔ وہ اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیوں کی مانند تھے اور اس کے اشاروں پر ناچنے کے لیے مجبور تھے حالانکہ وہ سب دنیا کے بہترین انجینئر تھے۔ ان کے پاس اعلیٰ ترین ڈگریاں تھیں لیکن جب سے وہ اس کے جال میں پھنسے تھے اپنی شخصیت اور اپنی حیثیت کھو چکے تھے۔ ان ڈگریوں کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ وہ جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزار رہے تھے۔ زندگی کسے پیاری نہیں ہوتی۔ انہیں بھی پیاری تھی اور زندگی ہی کے بدلے وہ اپنی شخصیت اور اپنی حیثیت کو نظرانداز کرنے پر مجبور ہوئے تھے اور انہوں نے اس جانور کی غلامی قبول کر لی تھی۔ وہ اس درندے کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔ وہ کون تھا اور کیا تھا؟ ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا۔ بس انہیں اس کی آواز سنائی دیتی تھی البتہ وہ اپنے آپ کو ایک بااصول آدمی پیش کرنے کی کوشش ضرور کرتا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کے کچھ اصول بہت اچھے تھے۔ ان کے تحفظ کا پورا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ لیکن کون اس کی غلامی کی زندگی کو پسند کرتا ہے۔ دنیا کے کسی بھی خطے میں چلے جاؤ لیکن ہر وقت اس کی زد پر رہو...... اعلیٰ قسم کے ہوٹلوں میں وقت گزارو...... بہترین قسم کے کلبوں میں ڈانس کرو...... عمدہ سے عمدہ کھاؤ...... اخراجات کی طرف سے بےفکر رہو...... شہنشاہوں کی طرح دولت لٹاؤ...... جو کچھ بھی چاہو کرو، لیکن اس کے بعد غلامی ہر حال میں کرنا پڑی تھی اور اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ اس نے ان لوگوں کو بار بار اس بات کی وارننگ دی تھی کہ وہ اپنے کام کے دوران کوئی ایسی غلطی نہ کریں جو اس کے لیے مشکل کا باعث بن جائے کیونکہ غلطی کی کوئی معافی اس کے پاس نہیں تھی اور اس کے آدمی خاص طور سے اس بات کا خیال رکھتے تھے۔ سب کچھ

اپنی جگہ لیکن وہ غلطی کرنے والے کو کبھی معاف نہیں کرتا تھا۔ اسے سزا دی جاتی تھی اور جب بھی کسی کو سزا دی جاتی تھی اس کی پوری پوری تشہیر کردی جاتی تھی اور وارننگ دہرا دی جاتی تھی کہ سب کچھ برداشت ہے لیکن...... غلطی برداشت نہیں ہوگی اور غلطی کرنے والوں کو معاف نہیں کیا جائے گا۔

چنانچہ ہر ایک خیال رکھتا تھا۔ ایسے بہت ہی کم مواقع آئے تھے کہ اس نے کسی کو معاف کردیا ہو لیکن ان پانچوں کو اس سنگین غلطی پر معافی مل چکی تھی۔ ان کی خوشیاں جس قدر بھی ہوتیں کم تھیں چنانچہ وہ خوشی سے ناچتے رہے۔...... لیکن ناچتے ناچتے ان میں سے ایک اچانک ساکت ہوگیا۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا...... اس کے بعد چوتھا اور پانچواں...... سب ہی ایک دوسرے کو خوف زدہ انداز میں دیکھ رہے تھے۔

”کیوں کیا بات ہے؟“ ایک نے دوسرے سے خوف زدہ انداز میں پوچھا، لیکن کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”تم چپ کیوں ہوگئے؟“

”بس ایسے ہی۔“

”کوئی وجہ ہے تمہارے ذہن میں؟“

”ہاں ہے۔“

”کیا......؟“

”ایک خیال آ گیا تھا۔“

”کیسا خیال......؟“ دوسرے نے پوچھا۔ اس کی آواز میں ایک خوف زدہ کیفیت رچی ہوئی تھی۔

”وہی خیال جو تمہارے ذہن میں ہے۔“

”نہیں ناممکن ایسا نہیں ہوسکتا۔“ دوسرا ہذیانی انداز میں بولا۔

”اس نے ہمیں معافی نہیں دی ہے بلکہ اپنے مخصوص انداز میں ہمیں بے وقوف بنا دیا ہے۔“

”یہ نہ کہو، ایسا نہ کہو، خدا کے لیے ایسا نہ کہو۔ میرے دل کی حرکت بند ہوجائے گی۔“ چوتھا خوف زدہ لہجے میں بولا۔

”لیکن دوستو! صرف ایک مفروضے کی بنا پر خوف سے مرجانا کوئی عقل مندی نہیں ہے۔“ پانچویں نے ہمت کر کے کہا۔ چاروں امید بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

”پرانا ریکارڈ ثابت کرتا ہے کہ اس نے اپنے لیے کام کرنے والوں کی کبھی پروا نہیں کی۔ وہ ہم لوگوں کو اپنی قوت نہیں سمجھتا۔ بس ہم لوگ تو اس کے لیے کام کرنے والی کٹھ پتلیاں ہیں۔ وہ کٹھ پتلیاں جن میں سے اگر کوئی کٹھ پتلی ناکارہ ہوجائے تو دوسری اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ اسے اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ کتنی کٹھ پتلیاں کام کی پوزیشن میں ہیں اور کتنی نہیں ہیں۔ اس کے لیے ایسی کٹھ پتلیوں کو جمع کرلینا کوئی مشکل کام نہیں۔“

”پھر بھی ہمیں خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ چلو انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ میں چلیں ورنہ کہیں کسی دوسری غلطی کے مرتکب نہ ہوجائیں۔ ان تینوں نے کہا اور پانچوں سہمے سہمے سے قدموں سے آگے بڑھ گئے۔

♥......♥......♥

حسینہ منہ بناتی ہوئی دروازے کی جانب بڑھ گئی اور پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔ معشوق نشیلے کی ...ل نظر آئی تھی۔ ہاتھوں میں ایک ڈبا پکڑے ہوئے کھڑا تھا...... حسینہ کو دیکھ کر مسکرایا تو حسینہ نے منہ بناتے ...ئے کہا۔

”خدا کی مار ہو تم پر۔ تم تو ایسا کرو کہ نقاب بنوالو اپنے لیے۔ منہ پر نقاب ڈال کر کسی کے سامنے ...ا کرو۔ شکل دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔“

”حسینہ عالم ہم تو بس تمہاری زیارت کرنے آجاتے ہیں اور وہ جو کہتے ہیں ناں کہ عقیدت کے ...ول محبت کے پیڑے یہ لیجیے آپ کی خدمت میں خالص ممن خان بدایونی کے پیڑے۔“

”جھاڑو پھرے تمہارے منہ پر بھی اور ممن خان کے منہ پر بھی۔ میں پیڑے ویڑے نہیں کھاتی۔“

”ارے...... ارے...... ارے کیا بدذوقی ہے اور یہ دروازے سے پیچھے نہیں ہٹیں گی آپ مس ...سلور جوبلی۔“

”دیکھ جوتی اتاروں گی اور منہ پر اتنی لگاؤں گی کہ منہ سے خون ڈال دے گا۔“ حسینہ نے غصے ...ے آگ بگولہ ہوکر کہا اور معشوق نشیلے کی نگاہیں اس کے پیروں پر پڑیں۔ وہ ایک دم ہنس پڑا۔

”نکالیے جوتے نکالیے آپ تو ننگے پاؤں کھڑی ہوئی ہیں مس سلور جوبلی۔“

”اے...... تیرا ستیاناس سلور جوبلی، سلور جوبلی کہے جارہا ہے میں کہتی ہوں نظر لگائے گا کیا مجھے؟“

”نظر تو لگ گئی ہے آپ سے حسینہ بیگم اور اس سلسلے میں شاعری بھی شروع کردی ہے ہم نے، آپ کی شان میں۔“

”میں تیری شان میں کچھ کروں؟“

”کر لیجیے۔ کون منع کرتا ہے آپ کو۔ ویسے شعر عرض ہے۔ دوہرا معکوش بن معشوق جانم۔“

”شروع ہوگیا بھونکنا اے تیری بات اللہ جانے کس کی سمجھ میں آتی ہوگی؟“

”ترجمہ کیے دیتا ہوں حسینہ بیگم۔“

”ٹھہر جا میں تیرا ترجمہ کرتی ہوں۔“ حسینہ بیگم نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر سامنے پڑی ہوئی اینٹ اٹھالی۔ معشوق نشیلے کو صورت حال سنگین نظر آئی چنانچہ بھاگ جانا مناسب سمجھا۔ حسینہ دروازے سے باہر تک آئی تھی۔ معشوق نشیلے نے رک کر کہا۔

”سوچ لیجیے حسینہ بیگم پورے آدھا کلو پیڑے ہیں۔ ایک دفعہ چکھ لیتیں تو ہمیں اس طرح اندر آنے سے منع نہ کرتیں۔“

”ٹھہر میں تجھے بتاتی ہوں۔“ حسینہ بیگم نے کہا اور اینٹ پھینک ماری۔ معشوق نشیلے تیار تھے چنانچہ صاف اینٹ کو بچا گئے۔ اب حسینہ بیگم نہتی تھیں چنانچہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر قریب پہنچا اور کہنے لگا۔

”چھوڑیے بڑی محبت سے لائے ہیں یہ پیڑے...... قبول فرما لیجیے تو زہے عزت افزائی ہو زون بالا چوں۔“

”تو یہ بتا ملنے کس سے آیا تھا؟ کیا اپنی نسل کے اس بندر سے۔“

”نہیں صوفی صاحب تو ممن خان کے ہوٹل پر بیٹھے ہیں اسی لیے تو ہم بھاگے وہاں سے نگاہیں

بچا کر کہ تنہائی میں آپ سے ملاقات کر لیں۔''

''اے تیری...... تنہائی کی۔'' حسینہ بیگم نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اس بڑے پتھر کی طرف لپکیں جو سامنے ہی پڑا ہوا تھا۔

''لعنت ہو اس پتھر پر۔'' معشوق نشیلے کے منہ سے نکلا اور اس نے ڈبا ہاتھ میں پکڑ کر پھر لمبی چھلانگ لگائی۔ باہر کا منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ اگر حسینہ چور چور کا شور مچا دیتی تو کوٹھیوں کے دروازے پر کھڑے ہوئے گارڈ ضرور اس کی مدد کرتے اور ہو سکتا تھا کہ کسی طرف سے کوئی گولی آتی اور معشوق نشیلے کو چاٹ جاتی۔ چنانچہ معشوق نشیلے سنجیدہ ہو گیا اور اس کے بعد ایک گھر کی آڑ میں پناہ لی۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پیڑوں کا ڈبا کھول کر دو تین پیڑے کھائے اور اس کے بعد گرن جھٹک کر وہاں سے واپس پلٹ پڑا۔ حسینہ ہاتھ میں بڑا پتھر لیے انتظار کرتی رہی، لیکن اس کے بعد جب معشوق سامنے نہ آیا تو واپس دروازے کی طرف مڑ گئی۔ پتھر اس نے باہر ہی پھینک دیا۔ دروازے کی طرف خاصا گند ہو رہا تھا اندر کی طرف سے اس نے سوچا کہ جھاڑو لگا دے۔ چنانچہ اندر جا کے جھاڑو اٹھائی اور دروازے کی دوسری طرف کی صفائی کرنے لگی۔ اسی وقت جمشید مرزا کی جیپ دروازے کے سامنے رکی تھی۔ جمشید مرزا اتر کر دروازے پر آیا۔ کال بیل پر انگلی رکھی اور حسینہ کا چہرہ غصے سے اور کالا ہو گیا۔ جھاڑو اٹھائی اور دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ قدموں کی چاپ نہیں ہونے دی تھی وہ یہی سمجھی تھی کہ معشوق نشیلے پھر آ گیا تھا۔ جھاڑو پوری طرح ہاتھ میں سنبھالی ہوئی تھی اور قدم آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دروازے کا پٹ کھولا اور جھاڑو سیدھی کی لیکن پتا نہیں اس کی خوش قسمتی تھی یا جمشید مرزا کی کہ اس نے پولیس کی وردی دیکھ لی اور جب جمشید مرزا نے اسے جھاڑو سے مسلح دیکھ لیا ادھر تو حسینہ نے اپنا ہاتھ روک لیا اور ادھر جمشید مرزا پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا لیکن اس کے چہرے پر انتہائی غصے کے آثار نمودار ہو گئے۔

''تیرا دماغ بالکل ہی خراب ہو گیا ہے کیا۔ جوتے مار مار کے دماغ کے تمام کیڑے جھاڑ دوں گا کیا اس طرح آنے والوں کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے۔ جمشید مرزا شدید غصے کے عالم میں بولا۔

''اے تو مجھے کیا معلوم کہ تم ہو وہ حرامی کا پلا بڑی دیر سے تنگ کر رہا تھا۔''

''صوفی صاحب ہیں۔''

''گٹر میں ڈوب کر مر گئے ہیں۔ جنازے کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی۔''

''تیرا تو میں صحیح انتظام کروں گا تو فکر مت کر پھر ابھی تیرا دماغ ٹھیک کر دوں صوفی صاحب ہیں اندر۔''

''گئے ہوئے ہیں۔''

''کہاں گئے ہوئے ہیں کچھ پتا ہے؟''

''اماں نہیں ہوں اس کی جو مجھے بتا کر جائے۔ پہلے بھی کئی بار تم یہ سوال کر چکے ہو۔''

''ہوں...... اچھا ٹھیک ہے۔'' جمشید مرزا نے کہا اور واپسی کے لیے پلٹ پڑا۔ بہر حال وہ پانوں کی ڈبیا اور بٹوا لایا تھا۔ فولاد کا وہ ٹکڑا جو اسے آئی جی صاحب نے دیا تھا اگر کسی طرح کام میں آ جائے تو پینل جو پانچ جگہ بنائے گئے تھے ان میں اسے فوقیت حاصل ہو جائے۔ ابھی اس نے اپنی ٹیم بھی منتخب نہیں کی تھی۔

ایک بار صوفی سے مل لینا چاہتا تھا پھر شاید تقدیر ہی کچھ کہہ رہی تھی کہ اس علاقے سے باہر نکلا ہی تھا کہ صوفی اپنی موٹر سائیکل پر نظر آ گیا۔ کھڑ کھڑ کی آواز سے وہ صوفی کی جانب متوجہ ہوا تھا اور اسے دیکھ کر چونک پڑا تھا۔

''بہر حال جیپ کو موٹر سائیکل کے برابر لے آیا اور آواز دی۔

''صوفی صاحب...... بھائی صوفی صاحب۔'' صوفی نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور پھر منہ بند کیے کیے ہاتھ ہلایا۔

''رُکیے۔ ذرا رکیے۔ آپ سے ہی ملاقات کرنے کے لیے حاضری دی تھی۔'' صوفی نے موٹر سائیکل سائیڈ سے لگائی اور اس کا انجن اسٹارٹ کیے کیے جمشید مزار کا انتظار کرنے لگا۔ جمشید مرزا نے اس سے چند قدم کے فاصلے پر جیپ روکی اور خود اتر کر نیچے آ گیا۔

''آپ ہی کے گھر گیا تھا۔ پتا چلا کہ آپ کہیں تشریف لے گئے ہیں۔''

''گم...... گم ہم...... تم، صوفی نے زور زور سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''براہ کرم پان تھوک دیجیے آپ سے بات کرنی ہے۔ صوفی نے پیک کا پٹاخا زمین پر مارا اور پھر شیروانی کی آستین سے منہ پونچھتے ہوئے بولا۔

''فرمایئے۔ کیا خدمت ہے ہمارے لیے۔''

''آپ سے کچھ بات کرنی ہے صوفی صاحب۔ بہت ضروری بات چیت ہے۔''

''تو کریے۔''

''یہاں نہیں وہ سامنے ریستوران نظر آ رہا ہے۔ آپ کے ساتھ ایک پیالی چائے پینا میرے لیے خوش قسمتی کا باعث ہو گا۔''

''در...... در...... درویش رحم کریں۔ کوئی لمبی چال معلوم ہوتی ہے آپ کے لہجے میں یہ شہد کہاں سے کھل گیا۔ لگتا ہے کوئی میٹھی چیز کھا کر آ رہے ہیں۔''

''آپ مجھے تھوڑا سا وقت تو دیجیے۔''

''یہ لیجیے درویشوں کے کرم سے۔''

''سامنے والے ہوٹل میں۔''

''جی نہیں ہوٹل میں جا کر تماشا بننا آپ کے لیے بھی مناسب نہیں ہو گا اور ہمارے لیے بھی۔ کیونکہ آپ کے جسم پر پولیس کی وردی ہے البتہ ادھر دیکھیے وہ زیر تعمیر عمارت کے برابر خان ریسٹورنٹ ہے۔ جھونپڑی، چٹائیاں، چینک، درویشوں کے کرم سے۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' جمشید مرزا نے کہا اور پھر بولا۔

''موٹر سائیکل اگر آپ یہیں رکھ دیں تو کیا حرج ہے؟''

''جناب من ایسا نہ فرمایئے گا۔ ہمارے لیے تو یہ جان جگر کا درجہ رکھتی ہے درویشوں کے کرم سے۔ آپ اپنی جیپ میں تشریف لایئے گا۔ ہم اپنی عزیزہ کے ساتھ آتے ہیں۔'' صوفی نے کہا جمشید مرزا پر بری گزر رہی تھی لیکن وقت سب کچھ کرا دیتا ہے البتہ جھونپڑا ہوٹل کے سامنے جب پولیس کی جیپ رکی اور اس

سے ایک افسرِ اعلیٰ نیچے اترا تو بھگدڑ مچ گئی۔ بینچوں پر چائے وغیرہ سے شغل کرنے والے لوگ پیچھے سے کھسک لیے۔ چند ہی افراد بیٹھے رہ گئے تھے۔ خود جھونپڑا ہوٹل کا مالک بری طرح حواس باختہ ہو گیا تھا۔ کبھی اٹھتا کبھی بیٹھ جاتا۔ جمشید مرزا نے برا سا منہ بنا کر چاروں طرف دیکھا اور پھر صوفی کے ساتھ ایک بینچ کی جانب بڑھ گیا۔ لوگوں نے اسے بیٹھتے ہوئے دیکھا تو سکون کی گہری سانس لی۔ ویسے بھی وہ تنہا تھا اور ساتھ میں پولیس کانسٹیبل وغیرہ نہیں تھے۔

''آپ بھی بس صوفی صاحب، دیکھیے ناں کیا بدتمیزی کر رہے ہیں یہ لوگ۔''

''آپ کی شخصیت ہی ایسی ہے۔ حضورِ اعلیٰ درویشوں کے کرم سے کہ لوگ آپ کی قربت کی تاب نہیں لا پاتے۔ بھئی خان صاحب ذرا عمدہ سی چائے بھجوائیے۔'' صوفی نے اونٹ کی طرح گردن لمبی کر کے کہا اور خاں صاحب پر پھر بدحواسی کے دورے پڑ گئے۔ جمشید مرزا کے لیے اب یہی لازم تھا کہ وہ ان ساری باتوں کو نظر انداز کر کے اپنے کام کا آغاز کرے۔

چنانچہ اس نے اپنی جیب سے پانوں کی ڈبیا اور بٹوا نکال کر صوفی کے سامنے رکھ دیا اور صوفی ایک دم اچھل پڑا۔

''اماں نہیں واللہ یہ تم ہو جانِ من۔'' اس نے جلدی سے پانوں کی ڈبیا اٹھا کر گلے سے لگالی۔ بٹوے کو اٹھا اٹھا کر چومنے لگا۔ جمشید مرزا خاموش نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بہت دیر تک صوفی یہ چوما چاٹی کرتا رہا۔ پھر اس نے یہ دونوں چیزیں میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''تو یوں سمجھیے مرزا جی کہ ہمارے اور آپ کے درمیان مفاہمت ہو گئی۔''

''شکریہ صوفی صاحب لیکن ایک سوال کیے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔''

''نہ رہیں...... نہ رہیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''صوفی صاحب آپ نے تو خیر میرے بارے میں بہت زیادہ معلومات حاصل کر ڈالیں لیکن میں آپ سے صرف ایک سوال کروں گا۔ مجھے آپ کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ یہ ہیں کہ آپ ہمیشہ سے ایک لاابالی آدمی رہے ہیں۔ بہت عرصے پہلے فرید پور سے ٹرانسفر ہو کر یہاں دارالحکومت آئے تھے اور اس کے بعد سے آپ محکمہ پولیس سے آنکھ مچولی کھیلتے رہے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے مجھے کہ آپ...... سنجیدگی سے اپنے کام کرتے تو آج بہت بڑے عہدے پر ہوتے۔ چلیے میں آپ سے یہ پوچھنے کا حق تو نہیں رکھتا کہ ایسا کیوں کرتے رہے ہیں، لیکن اتنا بتا دیجیے کہ باقی معاملات کیا حیثیت رکھتے ہیں مثلاً وہ گھر جو اس گندی سی گلی میں ہے اور جہاں آپ بڑے ذوق و شوق سے رہتے ہیں مجھے پتا چلا ہے کہ یہ نیا گھر تو آپ نے بس لے ہی لیا ہے پانوں کی یہ ڈبیا اور بٹوا، یہ موٹر سائیکل اور زندگی کی یہ تنہائی یہ سب کیا حیثیت رکھتی ہیں؟''

''آپ نے پہلا سوال خود ہی رد کر دیا یعنی کہ ہم نے محکماتی عہدے کیوں قبول نہیں کیے تو عزیز من بات صرف اتنی سی ہے کہ درویشوں کی صحبت رہی ہے۔ قناعت پسندی درویشوں کا شیوہ ہوتا ہے اور ہم بھی ان کے سائے میں چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بڑے عہدے بڑی مصیبتوں کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ ہم ٹھہرے من موجی آدمی، جو دل چاہا کیا جو نہ دل چاہا اس پر کبھی مجبور نہ ہوئے اور جو گھٹتے بڑھتے رہے ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ یہاں تک کہ محکمہ پولیس سے نکال دیے گئے۔ اس کی بھی ہمیں کوئی پروا نہیں تھی۔ بس دال روٹی چلنی چاہیے۔ ردی پیپر بیچے، اخبار بھی بیچے اور دوسرے کام بھی کیے۔ کیا فرق پڑتا ہے تو مطلب یہ کہ ہمارا اپنی زندگی سے سمجھوتہ ہے۔ آپ سے کس نے کہا کہ ہم تنہا ہیں۔ ایک جم غفیر ہمارے ساتھ ہے درویشوں کے کرم سے ممن خان کا ہوٹل اور بھی بہت سے لوگ۔ ہم مطمئن ہیں اپنی زندگی سے۔''

''بڑی بات ہے صوفی صاحب۔ ہر شخص غرض مند ہوتا ہے آپ کے پاس ایک غرض سے آیا ہوں۔ یہ جگہ اس گفتگو کے لیے مناسب نہیں ہے لیکن آپ نے پسند فرمائی ہے اس لیے مجھے بھی سر آنکھوں پر قبول ہے۔''

''ارشاد...... ارشاد۔'' صوفی نے کہا اسی وقت خاں صاحب نے بہ نفسِ نفیس چائے کی کیتلی اور چھوٹی چھوٹی پیالیاں سامنے لا کر رکھ دیں۔ جمشید مرزا نے ناک سکوڑی تھی لیکن صوفی نے بڑے پیار سے ان پیالیوں میں دودھ پتی والی چائے نکالی تھی۔

''نوش فرمائیے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''یار پلیز یہ پیالیاں گندی ہیں میں نہیں پی سکوں گا۔''

''توہین نہ فرمائیے خاں صاحب سر پھرے ہیں۔ دو منٹ میں عزت اتار دیتے ہیں۔ دیکھیے انہوں نے باہر والے سے چائے بھیجنے کے بجائے خود آپ کے سامنے چائے رکھی ہے اور ہم ان کے مداح ہیں آپ چائے پی کر تو دیکھیے۔''

''یہ لوگ یہاں سے بھاگ کیوں گئے۔ پولیس کو دیکھ کر۔''

''ہر شریف آدمی بھاگتا ہے۔ یہ سب شریف لوگ تھے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے کہا اور جمشید مرزا تلملا کر رہ گیا، لیکن اس نے بڑی مشکل سے ضبط کر لیا تھا۔ صوفی کے اصرار پر اسے بہرحال اس گندی سی پیالی میں چائے پینا پڑی۔ جیسے بھی اسے زہر مار کیا اس کا دل ہی جانتا تھا۔ اس کے بعد اس نے کہا۔

''صوفی صاحب۔ آپ سے گہری دوستی کی بنیاد رکھنا چاہتا ہوں۔''

''غالباً آپ نے تیسویں مرتبہ یہ الفاظ ادا کیے ہیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''جو کچھ بھی آپ سمجھیں صوفی صاحب۔ میں آپ کو بتاؤں میرا سلسلہ کچھ عجیب سا ہے۔ اس دن آپ نے میرے بارے میں کچھ انکشافات بیان فرمائے تھے۔ بات درست ہی تھی۔ واقعی میں نے وہ سب کچھ کیا تھا۔ میں اس کا اعتراف کرتا ہوں لیکن آپ کو ایک بات ضرور بتاؤں صوفی صاحب جن لوگوں سے میں نے وہ سب کچھ حاصل کیا وہ بہ ذات خود بڑے آگے کی چیز ہیں۔ جو کچھ انہوں نے مجھے دیا وہ ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ان پر ہاتھ ڈالنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ بہت بڑے بڑے لوگ ہیں۔ وہ بس یوں سمجھیے کہ انہوں نے مجھے ایک طرح سے بخشش دے دی تھی لیکن بہرحال رشوت تو وہ تھی صوفی صاحب ان تمام چیزوں پر میں اپنا حق نہیں سمجھتا میرا ماضی بہت عجیب ہے ذرا مختلف قسم کا انسان تھا کچھ اور بننا چاہتا تھا والد صاحب کی سختی نے محکمہ پولیس میں پہنچا دیا۔ ذہنی طور پر یہاں کا آدمی نہیں ہوں۔ میرا کام کچھ اور ہی ہے۔''

بہر حال صوفی صاحب میں ذہین بھی نہیں ہوں۔ میرے سپرد بہت سے کام کر دیے جاتے ہیں۔ میری جان پر بن آتی ہے صوفی صاحب میں چاہتا ہوں کہ آپ میری مدد کریں۔''

''مذاق کر رہے ہو عزیزی! درویشوں کے کرم سے ہم کیا مدد کر سکیں گے ہم تو خود انتہائی غریب آدمی ہیں۔''

''نہیں میں مالی مدد کی بات نہیں کر رہا۔ بہت سارے کیس میرے سپرد کر دیے جاتے ہیں۔ مجھے اس بات کا علم ہے کہ آپ نے بڑے بڑے مرحلے حل کیے ہیں اور بہت سے ملزموں کی گردنیں ناپی ہیں۔ صوفی صاحب میری آرزو ہے کہ اگر کوئی کیس مجھے ملے تو آپ میری مدد کریں۔ جتنا معاوضہ آپ چاہیں گے میں آپ کو ادا کروں گا۔''

''اچھا۔'' صوفی نے خوشی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ پانوں کی ڈبیا اور بٹوا اس نے بڑے پیار سے جیب میں رکھ لیا تھا۔

''آپ اپنا حلیہ بالکل تبدیل کر لیں۔ آپ جس چیز پر ہاتھ رکھ دیں گے وہ میں خرید کر آپ کے حوالے کر دوں گا۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ فی الحال ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟''

''صوفی صاحب میں جانتا ہوں کہ آپ کا تعلق محکمہ پولیس سے نہیں ہے لیکن آپ کے تعلقات اور آپ کی پہنچ کا میں دل سے قائل ہوں۔ اس وقت ایک عجیب وغریب مرحلہ درپیش ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ محکمہ پولیس کے کئی ڈیپارٹمنٹوں میں پینل بنائے گئے ہیں اور ان کے سپرد ایک ذمے داری کی گئی ہے آپ نے یقینی طور پر وہ واقعات ضرور پڑھے ہوں گے اخبارات میں جن میں زندہ انسان اچانک ہی پتھرا جاتے ہیں اور اس کے بعد پگھل کر بہہ جاتے ہیں۔ اب یہ بڑی عجیب وغریب بات ہے کہ وہ فولاد میں ڈھل جاتے ہیں۔''

''جی...... جی...... جی پڑھے ہیں میں نے۔''

''صوفی صاحب ایک پینل کا انچارج مجھے بھی بنایا گیا ہے۔ ابھی میں نے اپنی ٹیم کی تشکیل نہیں کی ہے لیکن میں نے کچھ اور ہی سوچا ہے اور وہ یہ ہے کہ میں باقاعدہ کوئی ٹیم نہیں بناؤں گا بلکہ آپ سے مدد حاصل کر کے کام کروں گا۔''

''درویش آپ پر رحم کریں۔'' صوفی نے چائے کے بڑے بڑے گھونٹ لیتے ہوئے کہا اور پھر دوسری پیالی بھر لی۔''

''اس سلسلے میں کیا معلومات حاصل ہو چکی ہیں آپ کو۔''

''بالکل نہیں۔ ابھی میں نے کام کا آغاز ہی نہیں کیا ہے۔ آئی جی صاحب نے لوہے کا ایک ٹکڑا مجھے بھی دیا ہے جو ان میں سے ایک پگھلے ہوئے شخص کا ہے اور مکمل اختیارات دیے ہیں کہ اپنے پینل کے ذریعے میں یہ کام کر سکتا ہوں۔ یہ دیکھیے یہ ہے وہ فولاد کا ٹکڑا۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ یہ ایک انسانی جسم کا ٹکڑا ہے۔'' صوفی کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے دلچسپی کی چمک پیدا ہوئی۔ چینک کی دوسری پیالی خالی کر کے اس نے میز پر رکھی اور پھر لوہے کے اس ٹکڑے کو اٹھا کر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر تک وہ اسے دیکھتا رہا۔ پھر

اچانک ہی اس کی آنکھوں میں ایک شوخ سی چمک لہرائی۔ ٹکڑے کو مٹھی میں دبا کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور جمشید مرزا تعجب بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''خیریت۔''

''نہیں۔'' صوفی نے کہا اور دوسرے ہی لمحے اس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی۔ جمشید مرزا تو اپنی جگہ ساکت رہ گیا تھا لیکن جب اسے احساس ہوا کہ کیا ہوا ہے تو وہ بھی جلدی سے اپنی جگہ سے کھڑا ہوا لیکن اتنی دیر میں باہر سے موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی تھی اور جمشید مرزا ناچ کر رہ گیا تھا پھر وہ جیپ کی طرف بڑھا لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا۔ موٹر سائیکل ایک پتلی سی گلی میں گھس کر غائب ہو گئی تھی اور اب اس کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ صوفی نے ایک بار پھر زبردست دھوکا دیا تھا۔ لوہے کا وہ ٹکڑا ایک طرح سے بہت بڑی حیثیت کا حامل تھا اور اگر آئی جی نے اس کے بارے میں سوال کر لیا اور جمشید مرزا ٹکڑا حاصل کرنے میں ناکام رہا تو اسے سسپنڈ بھی کیا جا سکتا تھا۔

♥......♥......♥

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ غاروں ہی غاروں میں یہ سارا تہ خانہ بنا ہوا ہوگا۔ یہ انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ تھا۔ پانچوں اندر داخل ہو گئے۔ وہاں اور بھی بہت سے لوگ کام کر رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے بہت ہی بڑا کارنامہ سرانجام دیا جا رہا ہو۔ چاروں طرف خاص طرح کی مشینیں نصب تھیں۔ ایک طرف ایک اسٹور بھی بنا ہوا تھا۔ یہاں بے شمار چیزیں کارٹنوں میں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کارٹنوں میں زیادہ تر اسٹیشنری پڑی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کی اشیاء بھی جس غار میں یہ داخل ہوئے تھے وہ بہت بڑا تھا اور اس میں داخلے کا ایک ہی دروازہ تھا۔ یہ دروازہ بھی بالکل ویسا ہی تھا جیسے دوسرے بقیہ دروازے تھے۔ ناہموار اور ٹیڑھے میڑھے۔ کوئی دوسرا نکاسی کا راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ انہوں نے اندر داخل ہو کر ادھر ادھر دیکھا بڑی بڑی پیٹیوں میں سامان پیک رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ ایک پیٹی جانب بڑھ گئے۔ اس پر جنریٹر لکھا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

''کیا خیال ہے اسے یہیں کھول لیا جائے۔''

''ہاں۔ یہی جگہ مناسب رہے گی۔ لکڑی کی تختی یہیں رکھ دیں گے ورنہ انہیں واپس رکھنے آنا ہوگا۔ جنریٹر کو ٹرالی پر رکھ کر لے چلیں گے۔''

''ٹرالی لے آؤ۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔ وہ کونے میں رکھی ہوئی ٹرالی نزدیک لے آیا۔ بقیہ لوگ اوزاروں کا بیگ اٹھا کر اس میں سے اوزار نکالنے لگے۔ پھر جنریٹر کی پیٹی کی جانب متوجہ ہو گئے جو بہت مضبوطی سے پیک کی گئی تھی۔ اس میں پتریاں لگی ہوئی تھیں۔ لوہا کاٹنے والی قینچی سے پتریاں کاٹی گئیں اور پھر ان میں سے ایک نے پلاس پیٹی کے رخنے میں ڈال کر اندر ٹھونکا۔ اچھی طرح ٹھونکنے کے بعد اس نے پلاس کے دوسرے حصے پر زور ڈالا۔ تختے نے چرچرا کر اپنی جگہ چھوڑ دی۔ تختہ تھوڑا سا نہیں پورا ہٹ گیا۔ دوسرے آدمی نے دوسرے تختے کو اٹھایا اور پوری قوت سے اوپر اٹھا دیا لیکن ان کے کان وہ آواز نہ سن سکے تھے جو اچانک تختہ اٹھنے سے پیدا ہو گئی تھی۔ دوسرا تختہ بھی اٹھ گیا تھا۔ اس لیے پیٹی میں کافی خلا پیدا ہو گیا تھا اور اتنا خلا

پیدا ہوگیا کہ انہوں نے وہ آواز سنی لی اور حیرت زدہ رہ گئے۔ عجیب سی آواز تھی جیسے جنریٹر ہلکی سی آواز کے ساتھ چلنے لگا ہو۔ انہوں نے حیرت بھرے انداز میں اندر دیکھنے کی کوشش کی لیکن اسی وقت بہت سے ڈیمو کھلے تختے سے باہر نکل پڑے۔ یہ کالے رنگ کے ڈیمو تھے اور ان کی شکل انتہائی بھیانک تھی۔ پورا غول ایک دم باہر نکلا تھا اور اس طرح بھرا مار کر نکلا تھا کہ وہ پوری طرح ان کے پورے چہروں سے ٹکرائے وہ دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے تھے لیکن ڈیمو کے گروہ نے اچانک ان پر حملہ کر دیا تھا اور ان کے جسم کے کھلے حصوں سے چمٹ گئے تھے۔ وہ انہیں کاٹ رہے تھے۔ ان کی دل دوز چیخیں کمرے میں گونجنے لگیں۔ یہ بڑے بڑے ڈیمو جس جگہ کاٹتے تھے وہاں اس قدر تکلیف ہوتی تھی جیسے کسی نے سوراخ کر کے تیزاب بھر دیا ہو اور ایسی ناقابل بیان تکلیف جس کا الفاظ میں بیان ناممکن ہے۔ وہ چاروں طرف بھاگتے پھر رہے تھے لیکن ننھی ننھی خوف ناک بلاؤں نے ان کا پیچھا شروع کر دیا۔ بہ مشکل تمام ان میں سے دو دروازے کے قریب پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی یہ دیکھ ان کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پھیل گئیں کہ پتھریلے غار کا...... وہ خودکار دروازہ جو ایک خاص انداز سے کھلتا تھا باہر سے بند تھا۔ اسے کھولنے کی کوشش اندر سے کی ہی نہیں جاسکتی تھی۔ ڈیمو مسلسل ان کے جسموں سے چمٹے ہوئے تھے اور ان پر جو اذیت گزر رہی تھی وہ ایسی ہی تھی کہ انہیں چند ساعت میں مرجانا چاہیے تھا لیکن زندگی بچانے کی کوششوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ زمین پر لوٹیاں لگا رہے تھے۔ زمین سے اپنے بدن کو رگڑ رہے تھے لیکن ڈیمو تھے کہ ان کا بدن کھا کھا کر ان میں پیوست ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی تعداد اتنی تھی کہ ان پر قابو نہیں پایا جاسکتا تھا۔ اب وہ کپڑوں سے بھی چمٹ گئے تھے اور ان کے لمبے لمبے تیز ڈنگ کپڑوں سے گزر کر جسم میں پیوست ہو رہے تھے۔ ایک ایک آدمی سے ہزاروں ڈیمو چمٹے ہوئے تھے۔ وہ لوگ ان سے اپنے آپ کو چھڑانے میں بالکل ناکام ہوگئے تھے۔ چند لمحوں بعد وہ سب کے سب سیاہ دھبوں میں تبدیل ہوگئے۔ اس قدر آدم خور مکھیاں ان کے بدن سے چمٹ گئی تھیں کہ اب ان کا بدن نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ آنکھیں، ناک، کان، بال، گردن غرض کہ بدن کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں کالے رنگ کے ڈیمو نہ چمٹے ہوئے ہوں لیکن ان کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ڈیمو ان کے بدن کا گوشت کھا رہے تھے اور تقریباً پندرہ منٹ کے بعد وہاں پانچ انسانی ڈھانچوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ پنجروں میں صرف ہڈیاں نظر آ رہی تھیں یا کہیں کہیں خون کا کوئی قطرہ یا گوشت کا کوئی ریزہ جو کسی ڈیمو کی نگاہ سے محفوظ رہ گیا ہو ورنہ آدم خور مکھیاں ان کا سارا گوشت ختم کر چکی تھیں۔ یہاں تک کہ دل، کلیجہ، پھیپھڑے بھی ختم ہو چکے تھے۔ یہ ایک حیرت انگیز سزا تھی۔ اتنی حیرت انگیز کہ انسانی ذہن اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ڈیمو اور مکھیاں منتشر ہونے لگے اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ اسی پیٹی کی طرف جا رہی تھیں جہاں سے وہ آئی تھیں۔ چند ساعت کے بعد کمرے میں کسی ایک بھی ڈیمو کا وجود نہیں تھا حالانکہ پیٹی کے [illegible] کھڑے ہوئے تھے۔ اس کے بعد خودکار دروازہ کھل گیا۔ باہر چند افراد کھڑے ہوئے تھے جنہیں خاص طور سے ہدایات دی گئی تھیں اور کہا گیا تھا کہ یہاں کھڑے ہو کر ان پانچوں افراد کا انجام دیکھیں جن کی وجہ سے جنریٹر خراب ہوئے اور ان کا راز ان غاروں سے نکل کر منظر عام تک پہنچ گیا۔ دیکھنے والوں نے ہڈیوں کے یہ پنجر دیکھے اور ان کے بدن خوف و دہشت سے کانپنے لگے۔ وہ سب خشک ہونٹوں پر

زبان پھیرتے ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔

♥......♥......♥

چھوٹا سا درمیانے درجے کا گھر تھا۔ تین بیڈروم، ایک ڈائننگ، کچن اور دوسری تمام چیزیں۔ خوب صورت لڑکی کچن میں کھانا بنا رہی تھی۔ ایک کمرے میں ایک انتہائی بدشکل آدمی جس کا چہرہ بے حد مکروہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں...... موٹے موٹے لٹکے ہوئے ہونٹ...... درمیانہ سا قد کو بڑ نکلا ہوا، پتلی پتلی ٹانگیں۔ ایک عجیب وغریب مخلوق معلوم ہوتی تھی لیکن اس کی آنکھیں کسی درندے کی آنکھیں محسوس ہوتی تھیں۔ اس قدر خوف ناک کہ صرف آنکھوں کو دیکھ لیا جائے تو دل کی حرکت بند ہونے لگے۔ لڑکی تھوڑی دیر کے بعد کھانے کی ٹرے لیے ہوئے اس کمرے میں داخل ہوگئی۔ بدہیئت آدمی سامنے رکھے ہوئے۔ ٹیلی ویژن سیٹ پر کچھ دیکھ رہا تھا۔ یہ ٹیلی ویژن سیٹ انتہائی مخصوص انداز کا تھا جو اس پر نظر آ رہا تھا وہ بھی بے حد خوف ناک تھا۔ یہ وہی منظر تھا جس میں غاروں کے اندر ان پانچ افراد کو زہریلی مکھیوں یا آدم خور مکھیوں کے حوالے کیا گیا تھا۔ لڑکی نے ٹرے رکھی اور افسوس بھری نگاہوں سے یہ منظر دیکھنے لگی۔ خوف ناک آدمی نے پلٹ کر لڑکی کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹ مسکراہٹ کے انداز میں کھنچ گئے۔ لمبے لمبے مکروہ دانت جو انتہائی غلیظ تھے نمایاں ہوگئے۔ لڑکی نے آنکھیں بھینچ کر ٹھنڈی سانس لی اور اس شخص نے سوئچ آف کر دیا پھر اس کی نرم آواز ابھری۔

”سوری ایلیٹ مجھے پتا ہے کہ تمہیں یہ منظر دیکھ کر دکھ ہوا ہوگا۔“

”شائیکو میں تم سے کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ یہ تم غلط کر رہے ہو۔ انسانوں کی زندگی اس قدر بے وقعت نہیں ہوتی کہ تم انہیں یوں ختم کر دو۔“

”تم نہیں سمجھتیں ایلیٹ مجھے تاج محل بنانا ہے اس نئے دور میں مجھے تمہاری محبت کا تاج محل تعمیر کرنا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میری راہ میں رکاوٹیں آئیں۔ میری زندگی کے بارے میں تم جانتی ہو۔ آہ! جب بھی زندگی کی کتاب کھولتا ہوں ایک عجیب وغریب کہانی یاد آ جاتی ہے۔ سان فرانسسکو کی سڑک پر ایک عورت ایک بچے کو جنم دے رہی تھی۔ وہ ایک بے سہارا بھکارن تھی۔ اس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں تھا۔ وہ سڑکوں پر ماری ماری پھرتی تھی۔ وہ بدشکل بھی تھی۔ بس اسکی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ عورت تھی اور کوئی مادر زاد اسے تباہ کر گیا۔ وہ بے چاری نیم دیوانی عورت نہیں جانتی تھی کہ اس کی کیفیت کیا ہے۔ اسی حالت میں اس نے اس مکروہ بچے کو جنم دیا۔ پتا نہیں وہ لوگ کون تھے جو اس عورت کی لاش اور نوزائیدہ بچے کو کسی خیراتی ادارے میں لے گئے اور بس۔ عورت کی تو تدفین کر دی گئی۔ بچے کی پرورش اس خیراتی ادارے نے کی۔ لیکن پانچ سال کی عمر میں ہی اس کی صلاحیتوں کو دیکھ کر اس ادارے نے اسے ایک ایسے ادارے کے حوالے کر دیا جو سرکاری پیمانے پر بچوں کی پرورش کرتا تھا اور ان کے رجحان کو دیکھ کر ان کے لیے راستے متعین کرتا تھا۔ بچے کا نام انہی لوگوں نے شائیکو رکھا اور مجھے ایک سائنسی ادارے کے حوالے کر دیا گیا۔ میں نے سائنس میں کمال دکھانا شروع کر دیا اور گیارہ سال کی عمر میں میری شہرت کا ڈنکا بج گیا۔ میں ایک عظیم سائنٹسٹ تھا۔ [illegible] عظیم [illegible] اپنے فن میں آگے بڑھتا چلا گیا لیکن بدنصیبی ایلیٹ بدنصیبی، کم بخت انسان

تھا انسانوں کی طرح جینا چاہتا تھا مگر اس کا مکروہ چہرہ اس کی بھیانک شخصیت اسے جنون کا شکار بنائے رہی۔ اسے اپنے جیسے انسانوں سے نفرت ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے آپ کو روپوش کر لیا۔ اسے محبت کی تلاش تھی جو اسے کہیں سے نہ مل سکی اور اس کا ذہن تخریبی کارروائیوں کا شکار ہوتا رہا۔ دنیا اس کے آگے کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ بھٹکتا رہا اور یہاں آ گیا۔ ایلیٹ اس کے بعد تم مجھے یہاں کی سڑکوں پر ملیں۔ میں نہیں جانتا کہ تمہارے دل میں میرے لیے یہ جذبے کیسے پیدا ہو گئے کہ تم نے مجھے، میری مکروہ صورت کو نظر انداز کر کے محبت کی نگاہ سے دیکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی میرے لیے سب کچھ تھا۔ ایلیٹ میں نے تمہارا اچھی طرح تجزیہ کیا ہے تم کوئی فریب نہیں کر رہی ہو مجھ سے۔ بس تمہارے دل میں میرے لیے پیار جاگ اٹھا ہے۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ ایلیٹ میں تو ایک سائنسی دماغ رکھتا ہوں اور اس کے بعد میں نے تمہارے لیے بہت کچھ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایلیٹ ابھی میں تعمیر کی منزل میں ہوں جن لوگوں کو میں دنیا کی ہر آسائش مہیا کر دیتا ہوں ان کی غلطی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ میں نے بینک رابری کے لیے کچھ لوگوں کا انتخاب کیا تاکہ میرے پاس دولت اکٹھی ہو جائے اور میں اپنے مقصد کی تکمیل کر لوں لیکن ان لوگوں نے جزبز غلط طریقے سے چلا کر میرا منصوبہ فیل کر دیا۔ کیا میں انہیں زندہ چھوڑ سکتا تھا۔ شہر میں تشہیر تو ہو گئی اور اب اس پر تحقیق ہو رہی ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ دوسرے لوگ بالکل ہی احمق ہوں گے اور میری کاوشوں کو سمجھ نہیں پائیں گے۔ خود سوچو اگر اسی طرح یہ لوگ غلطیاں کرتے رہے تو پھر میرا مشن کیسے پورا ہوگا۔ مجھے تمہارے پیار کا تاج محل تعمیر کرنا ہے اور اس کے لیے میں کوئی غلطی برداشت نہیں کروں گا۔ کیونکہ کوئی بھی غلطی میری نشان دہی کر دے گی اور اس کے بعد ایلیٹ تم خود سوچ لو مر جانے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اپنا مشن پورا کیے بغیر میں نہیں مرنا چاہتا۔“

”میں نقصان کرنے والوں کو کبھی زندہ نہیں چھوڑ سکتا اس لیے مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ان میں سے کسی نے یا پھر یہ سمجھ لو کہ ان جیسوں میں سے کسی نے میرے ساتھ کوئی رحم کا سلوک نہیں کیا تو پھر مجھے کیا پڑی ہے کہ ان کے ساتھ رحم کا سلوک کروں۔“

”مگر شائیکو مجھے یہ...... درندگی پسند نہیں ہے۔“

”ایلیٹ اب دیکھو نا!...... میں تو یہ کوشش کرتا ہوں کہ جس طرح میں ان لوگوں کا خیال رکھتا ہوں اسی طرح وہ بھی میرے مقصد کی تکمیل کرنے میں میری مدد کریں۔ بہرحال صورت حال ذرا مشکل ہو گئی ہے میرے لیے۔ مجھے کچھ دن کے لیے اپنا کام روکنا پڑے گا۔“

”چلو کھانا کھاؤ۔“ لڑکی نے نرم لہجے میں اس سے کہا اور کھانے کی ٹرے اس کے آگے رکھ دی۔ بدہیئت آدمی کھانے میں مصروف ہو گیا تھا۔ کھانے کے دوران اس نے کہا۔

”بہت محنت کی ہے میں نے، جن پہاڑی غاروں میں میں نے اپنی لیب بنائی ہے میں ہر وقت خوف زدہ رہتا ہوں کہ کہیں ان کا راز وقت سے پہلے منظر عام پر نہ آ جائے۔ دیکھو ایلیٹ میں نے وہاں کیا کیا جمع نہیں کیا۔ دنیا کی جدید ترین سائنسی مشینیں وہاں موجود ہیں اور میں ان میں اضافہ کر رہا ہوں۔“

”مجھے تمہاری ضرورت ہے شائیکو۔ اپنی حفاظت کا بھی بندوبست رکھو۔ میرا تاج محل تو تم ہو۔

مجھے کسی تاج محل کی ضرورت نہیں ہے۔ بس تم زندہ سلامت رہو۔“ بدہیئت شائیکو ایلیٹ کو دیکھ کر مسکرانے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت ناچ رہی تھی۔

♥......♥......♥

انسپکٹر جنرل صاحب نے جو ذمے داری اسے سونپی تھی اس کے سلسلے میں جواب طلبی ہونے ہی والی تھی اور فولاد کا ٹکڑا اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ بس اس کے بعد جو ہونا تھا وہ خود جانتا تھا۔ دماغ کھچڑی بن کر رہ گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ صوفی سے وہ فولادی ٹکڑا نکلوانا ایک مشکل کام ہے۔ بیوی اس کی پریشانی سے الگ پریشان تھی اور اکثر اس سے پوچھتی رہتی تھی کہ بات کیا ہے۔

”دیکھو میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو دفتری معاملات کے سلسلے میں اپنے گھر میں بیٹھ کر مشورے کرتے ہیں۔ تم سے ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ اگر بتانے کی کوئی بات ہوئی تو سب سے پہلے تمہیں بتاؤں گا۔ دوسری صورت میں درخواست کرتا ہوں میں تم سے کہ میرے کان کھانے کی کوشش مت کیا کرو۔“

”تم ان مردوں میں سے نہیں ہو۔“ بیوی نے اوپری ہونٹ بھینچ کر کہا۔

”مطلب کیا ہے تمہارا......؟“

”ٹھیک ہے کسی مناسب پروقت تمہارے اس سوال کا جواب دوں گی۔“

”بھاڑ میں جاؤ۔ بجائے اس کے کہ میری پریشانی سے متاثر ہوتیں۔ مجھے دھمکیاں دے رہی ہو۔“ بیوی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی تھی۔ جمشید مرزا فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ آخر کار اس نے ایک فیصلہ کر ہی لیا۔ اس سے پہلے کہ آئی جی صاحب اسے طلب کر کے ذلیل کریں اور اس کے لیے سزا تجویز کی جائے کیوں نہ اس جھگڑے کو ختم ہی کر دیا جائے چنانچہ وہ تیار ہو کر چل پڑا اور پھر خود ہی آئی جی صاحب کے سامنے پیش ہو گیا۔ آئی جی صاحب نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر بولے۔

”ہوں...... اس کا مطلب ہے کہ تم کوئی اعلیٰ کارکردگی دکھانے میں کامیاب ہو گئے ہو۔ کہو کیا رپورٹ ہے؟ کیا بتا رہے ہو مجھے......؟“

”سر! میرے پاس کوئی رپورٹ نہیں ہے بلکہ میں آپ سے کچھ ہدایات لینے آیا ہوں۔“ آئی جی صاحب ٹیڑھی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔

”ایک شخص ہے جناب! کسی زمانے میں محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھا۔ لوگ اس کے بارے میں بہت سی داستانیں گھڑے ہوئے ہیں بلکہ بعض لوگوں کا تو کہنا یہ ہے کہ وہ اگر چاہتا اور اپنے معاملات میں سنجیدہ ہو جاتا یا محکمے کی ہدایات قبول کر لیتا تو شاید وہ آپ کی جگہ بیٹھا ہوتا۔ یہی کہا جاتا ہے اس کے بارے میں، صوفی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔“ آئی جی صاحب نے چونک کر جمشید مرزا کو دیکھا بولے۔

”اچھا...... آگے کہو؟“

”سر! کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟“

”نہیں۔ میرے دور میں شاید وہ انسپکٹر نہیں رہا۔“

''جی سر! نکال دیا گیا تھا محکمہ پولیس سے۔''

''تم اپنا مقصد بتاؤ۔ بڑا تفصیلی تعارف کرا رہے ہو۔ کیا قصہ ہے؟''

''سر وہ بڑی جارحیت کرتا رہتا ہے اور اسے وزیر داخلہ صاحب کا تعاون حاصل ہے۔''

''کہاں کی اڑا رہے ہو۔ ایسا کوئی شخص میرے علم میں کیوں نہیں ہے؟''

''میں کیا عرض کرسکتا ہوں جناب! اسے بڑا تحفظ حاصل ہے۔ ہوم منسٹر اس کے کسی معاملات میں مداخلت پر خود متحرک ہو جاتے ہیں۔''

''ہوں...... اچھا پھر؟''

''سر! میری بھی اس سے تھوڑی بہت سلام دعا ہے لیکن بس اس حد تک کہ بعض معاملات میں میں اس سے مشورے لے لیتا ہوں۔ سر! فولاد کا وہ ٹکڑا جو آپ نے مجھے دیا تھا وہ لے کر بھاگ گیا ہے۔'' آئی جی صاحب بری طرح چونک پڑے۔

''بھاگ گیا ہے......؟''

''جی سر۔''

''ایک بات بتاؤ جمشید مرزا! کس قسم کا نشہ کرتے ہو؟''

''نہیں سر! جو کچھ کہہ رہا ہوں ہوش و حواس کے عالم میں کہہ رہا ہوں۔''

''تو پھر لوہے کا وہ ٹکڑا کیا تم نے گلے میں لٹکا رکھا تھا جسے وہ لے کر بھاگ گیا۔''

''نہیں سر۔ اس کم بخت کے کچھ تعلقات ہیں مختلف جگہوں پر۔ اپنی تحقیقات کے سلسلے میں اتفاقیہ طور پر اس سے بھی رابطہ کرنا پڑا اور اس نے دھوکے سے وہ ٹکڑا اپنی مٹھی میں لیا اور فرار ہو گیا۔''

''پھر......؟''

''بس سر! تھوڑے سے اختیارات چاہتا ہوں۔ وزارت داخلہ اگر پولیس کے ان معاملات میں مداخلت نہ کرے تو کیا زیادہ بہتر نہیں ہے؟''

''یہ سوال تم براہ راست وزارت داخلہ سے کرسکتے ہو۔'' آئی جی صاحب نے طنزیہ کہا۔

''نہیں سر! ظاہر ہے آپ کے حکم کے بغیر میں کچھ بھی نہیں کرسکتا۔''

''تو میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ جاؤ احتیاط کرو۔''

''سر! محکماتی طور پر۔''

''نہیں۔ محکمہ کسی سے یہ بات فخر سے نہیں کہہ سکتا کہ ایک غیر متعلق آدمی کوئی اہم چیز محکمے کے ایک بڑے آفیسر سے چھین کر بھاگ گیا ہے اور وہ آفیسر فریاد کرتا پھر رہا ہے۔ یہ بات میں کہوں گا۔''

''لیکن سر۔''

''بس...... سر...... سر مت کرو۔ میں نے ایک اہم چیز تمہارے سپرد کی ہے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر میں اس کی واپسی چاہتا ہوں اور اس کے بعد یہ کیس تم سے لے لیا جائے گا۔ پانچ میں سے چار پینل کام شروع کر چکے ہیں اور تم صرف کسی ایک آدمی کی شکایت لے کر میرے پاس آئے ہو۔؟''

''لیکن سر۔''

''کچھ نہیں۔ مسٹر جمشید مرزا! آپ جایئے اور چوبیس گھنٹے کے اندر مجھے فولاد کا وہ ٹکڑا واپس لا کر دیجیے۔ اسے کسی غیر متعلق ہاتھ میں جانا کسی بھی طور قابل قبول نہیں ہے۔ یہ آپ کی اپنی ذمے داری ہے۔''

''سر میں۔''

''آپ جاسکتے ہیں۔''

''یس سر۔'' جمشید مرزا نے سیلوٹ کیا اور واپس پلٹ پڑا۔ تقدیر ہی خراب تھی، لیکن صوفی...... وہ بری طرح کھولتا ہوا آئی جی صاحب کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

♥ ...... ♥ ...... ♥

شائیکو نے جو کچھ ایلیٹ سے کہا تھا وہ بڑا متاثر کن تھا۔ وہ ایک کبڑا اور انتہائی بدشکل انسان تھا لیکن نہ جانے کیوں ایلیٹ کے ذہن کا کون سا حصہ اس سے متاثر ہو گیا تھا۔ ایک ایسا شخص جس کے پاس لوگ بیٹھنا بھی پسند نہ کریں ایلیٹ درحقیقت اس سے پیار کرنے لگی تھی۔ وہ خود بھی کبھی کبھی اپنا تجزیہ کرنے لگتی تھی اور نہ جانے کیوں خود بھی اسے کبھی کبھی احساس ہوتا تھا کہ زمانہ قدیم میں ناٹرڈیم کے جس کبڑے عاشق کی داستانیں کتابوں میں درج تھیں۔ فلموں اور ڈراموں میں ناٹرڈیم کے کبڑے کو دکھایا جاتا تھا اور...... محبت کی لازوال داستانیں رقم کی جاتی تھیں ایلیٹ کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ زمانہ قدیم کے اس کبڑے کی محبوبہ ہے اور زیادتیاں اور مظلومیاں...... ناٹرڈیم کے اس گھنٹہ بجانے والے کبڑے کو برداشت کرنا پڑی تھی۔ اس کا فرض ہے کہ ان کا ازالہ کرے اور یہ احساس کچھ اس طرح اس کی ذات پر مسلط تھا کہ وہ شائیکو کا پورا پورا خیال رکھتی تھی۔ پڑھی لکھی عورت تھی۔ شائیکو کی ظاہری کیفیت کچھ بھی ہو لیکن اس کی دماغی صلاحیتوں کا دل سے اعتراف کرتی تھی۔ چار دیواری میں جس طرح اس نے اس پورے علاقے کو کنٹرول کر کے وہاں اپنی تجربہ گاہ بنائی تھی اور جس طرح اس نے بے شمار افراد کو اپنا غلام بنا رکھا تھا یہ اس کی اعلیٰ ترین ذہنی صلاحیتوں کا عکس تھا اور ایلیٹ کچھ اسی ٹائپ کی لڑکی تھی۔ چہرہ مہرہ شکل وصورت اسے زیادہ نہیں بھاتا تھا۔ بس صلاحیتوں کی دل سے قائل تھی۔ بہرحال ایلیٹ شائیکو کے عمل سے اتفاق نہیں کرتی تھی لیکن اس کے مقصد سے اسے محبت تھی۔ شائیکو ایلیٹ کو ملکہ برطانیہ کے برابر کی حیثیت دینا چاہتا تھا اور اسی کے لیے مصروف عمل تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اسے بھی ایک تاج محل بنانا ہے ایلیٹ کے لیے اور بہرحال دنیا کی شاطر ترین عورت بھی محبت کے ان الفاظ کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کرسکتی تھی۔ بہرحال وہ خود بھی شائیکو کے ساتھ مل کر کام کرتی تھی اور شائیکو نے ان دنوں اسے ایک شخص کے پیچھے لگایا تھا۔

''اعلیٰ ترین صلاحیتوں کا مالک ہے۔ مقامی یونیورسٹی میں بڑی عزت دار حیثیت کا مالک۔ پروفیسر اطہر کے نام سے لوگ اسے جانتے ہیں۔ صاحب حیثیت اور شوقیہ طور پر یونیورسٹی میں پڑھاتا ہے۔ تمہیں اس سے دوستی کرنی ہے اور احتیاط کے ساتھ اسے یہاں تک لانا ہے۔ میں اگر چاہوں تو اسے اغوا بھی کرا سکتا ہوں لیکن تم جانتی ہو کہ شخصیتوں کا تجزیہ میرا محبوب مشغلہ ہے۔ میں اسے یہاں لانے سے پہلے اس کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا ہوں اور ایلیٹ انتہائی کوششیں کر کے پروفیسر اطہر تک پہنچ گئی تھی۔ اب

اسے شائیکو یا ایلیٹ کی بدقسمتی کہا جاسکتا ہے کہ شائیکو کو پروفیسر اطہر کے بارے میں ساری تفصیلات کا علم نہیں تھا۔ کمال کی شخصیت تھی اس کی، اس سے پہلے وہ اس طرح کا انسان نہیں تھا لیکن ایک بار ایک پہاڑی مقام پر لینڈ سلائیڈنگ سے اس کی کار کو ایک حادثہ پیش آیا تھا اور اس کے سر پر شدید چوٹ لگی تھی۔ علاج سے وہ ٹھیک تو ہوگیا لیکن یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا دماغ دو حصوں میں تقسیم ہوگیا ہے اور دونوں حصوں کا ایک دوسرے سے رابطہ نہیں ہے۔ اس کے بعد جو شناسا اسے جانتے تھے انہیں یہ تو اندازہ ہوگیا تھا کہ پروفیسر اطہر...... اس حادثے کے بعد خاصا بدل گیا ہے لیکن دماغ کی دہری کیفیت کے بارے میں انہیں بھی نہیں معلوم تھا۔ یہ بہت گہرا معاملہ تھا اور ڈاکٹروں کے سامنے نہیں آسکا تھا۔ پروفیسر اطہر کی کیفیت یہ تھی کہ وہ پہلے سے بے پناہ ذہین ہوگیا تھا۔ دماغ کے جس حصے کو وہ چاہتا تھا استعمال کرتا تھا اور اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ ڈبل برین ہوگیا ہے۔ پھر ایلیٹ نامی حسین لڑکی اس کی زندگی میں آئی۔ وہ بہت زیادہ حسن پرست نہیں تھا۔ شادی کی تھی اس نے، لیکن بیوی صرف ڈیڑھ سال زندہ رہی اور اس کے بعد اس نے اپنے ڈیڑھ سال تجربے سے فائدہ اٹھایا اور دوسری شادی کے چکر میں نہیں پڑا۔ اہل خاندان تھے۔ اسے دوسری شادی سے بھی دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن وہ حسین لڑکی کچھ اس طرح اثر انداز ہوئی کہ وہ اس کا گرویدہ ہوگیا۔ ایلیٹ سے اس کی ملاقاتیں ہونے لگیں اور یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹ اس کے بارے میں کھسر پھسر کرنے لگے کہ یہ غیر ملکی لڑکی کس طرح اطہر کی زندگی پر اثر انداز ہوگئی ہے۔ ایلیٹ کے ساتھ پروفیسر اطہر شام کے بعد مختلف پبلک مقامات پر دیکھا جاتا تھا۔ اس کے لباس کی نفاست کچھ اور بڑھ گئی تھی اور وہ پہلے سے زیادہ پر اثر شخصیت کا مالک نظر آنے لگا تھا۔ پھر ایک شام ایلیٹ نے اسے اپنی ماما سے ملانے کے لیے کہا۔

''ہم ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے ہیں جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا پروفیسر اطہر! ماما کے سوا میری زندگی میں کوئی نہیں ہے، ہمارے پاس کچھ اثاثے ہیں جن سے ہم اپنی زندگی کی گاڑی گھسیٹتے ہیں۔ بس آپ یوں سمجھ لیجیے کہ اس کائنات میں ماما کے سوا میرا کوئی نہیں ہے۔ میں نے آپ کا تذکرہ ان سے کردیا ہے، آپ ماما سے مل کر خوش ہوں گے۔'' پروفیسر اطہر ہنس کر بولا۔

''تو پھر ٹھیک ہے ملاؤ مجھے ان سے۔ میں خوش ہونا چاہتا ہوں اور ایلیٹ پروفیسر اطہر کو اپنے گھر لے گئی۔ اسی چھوٹے سے گھر میں جس کے بیسمنٹ میں چھوٹی سی تجربہ گاہ بنا رکھی تھی۔ اوپر کا گھر سادہ سادہ سا تھا لیکن اس سادگی کے نیچے بڑی پُرکاری تھی۔ پروفیسر اطہر مسکراتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوگیا۔ سادہ سا ڈرائنگ روم معمولی سے فرنیچر سے آراستہ...... ایلیٹ کہنے لگی۔

''آپ کو یہاں آکے کوئی خوشی نہیں ہوگی۔ پروفیسر میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں ہم جس حیثیت کے مالک ہیں آج آپ اس سے بھی واقف ہوگئے۔''

''ہاں...... اور انتہائی متاثر ہوں تمہارے گھر کے اس سادہ سے ماحول سے۔''

''آپ بہت بڑے آدمی ہیں جو آپ نے ہماری اس حیثیت کو قبول کرلیا۔ اچھا بیٹھیے میں ماما کو بلا کر لاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر ایلیٹ باہر نکل گئی لیکن ماما کے بجائے وہ ایک بار پھر خود آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک گلاس تھا جو پلیٹ میں رکھا ہوا تھا اور اس میں ایک خوش رنگ مشروب رکھا ہوا تھا۔ اس نے مشروب پروفیسر

اطہر کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''ماما باتھ روم میں ہیں۔ میں ذرا ان کی ہیلپ کررہی ہوں۔ آپ پلیز یہ لیجیے میں ابھی آئی۔''

''اوکے...... اوکے۔'' پروفیسر اطہر نے کہا اور ایلیٹ باہر نکل گئی۔ پروفیسر مسکرا کر آنکھیں بند کرکے گردن جھٹکنے لگا۔ اس نے خود نہیں سوچا تھا کہ اس قربت یا اس یگانگت کا انجام کیا ہوگا۔ کیا دوسری شادی کرکے زندگی کے سفر میں تبدیلی کیا ہونی چاہیے اس نے مشروب کا گلاس اٹھایا اور اس کے چھوٹے چھوٹے سپ لینے لگا۔ بہت خوش ذائقہ مشروب تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہے۔ ابھی کچھ چار پانچ ہی سپ لیے ہوں گے کہ ایلیٹ ایک بار پھر مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس نے لباس تبدیل کررکھا تھا اور اس کے پیچھے جو شخص داخل ہوا اسے دیکھ کر پروفیسر اطہر حیران رہ گیا۔ انتہائی بدہیئت اور بھیانک شخصیت تھی۔ اس نے اس شخص کے پیچھے دیکھا تو ایلیٹ ہنس پڑی۔

''ماما کو تلاش کررہے ہو پروفیسر۔'' پروفیسر کو نہ جانے کیوں ایلیٹ کا لہجہ بدلا ہوا محسوس ہوا تھا۔ آنے والے شخص نے کہا۔

''میرا نام شائیکو ہے۔ پروفیسر اطہر میں کیا ہوں اس کی تفصیل جان کرنہ تو آپ کو خوشی ہوگی نہ کوئی فائدہ۔ چنانچہ کیوں نہ ہم کام کی باتیں کریں۔''

''ایلیٹ ماما کہاں ہیں تمہاری......؟''

''میری ماما کا کوئی وجود نہیں ہے۔ پروفیسر اطہر میری زندگی کا مقصد میرا محبوب میرا مالک دنیا کے کسی بھی رشتے کا تصور کرلو۔ شائیکو سے میرا جو بھی رشتہ ہے میری مراد ہے محبت کا رشتہ۔'' پروفیسر اطہر نہ سمجھنے والے انداز میں ان دونوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

''لیکن تم نے مجھ سے کہا تھا ایلیٹ......''

''ہاں یہ ضروری تھا۔ مسٹر شائیکو آپ سے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ آرام سے بیٹھیے پروفیسر میری نگاہیں تمہارے پورے وجود کا جائزہ لے چکی ہیں۔ ہتھیار نام کی کوئی چیز نہیں ہے تمہارے پاس۔ آپ ویسے بھی نرم و نازک طبیعت کے مالک ہیں جبکہ میں سخت گیر ہوں اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے ہر قسم کا کام کرلیتا ہوں۔''

''ایلیٹ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔'' پروفیسر اطہر نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''ہاں پروفیسر۔ شائیکو کی خواہش پر۔'' ایلیٹ نے جواب دیا۔

''ٹھیک اور شائیکو کی خواہش میرے لیے ان لائن کا درجہ رکھتی ہے۔''

''تم چاہتے کیا ہو مسٹر شائیکو۔''

''پروفیسر اب تک میں ہر طرح کے تجربات کرتا رہا ہوں۔ آپ کی شخصیت کے بارے میں میں نے خاصی معلومات حاصل کی ہیں۔ اگر آپ کسی بینک کو لوٹتے ہیں یا دولت حاصل کرنے کے لیے کوئی مجرمانہ قدم اٹھاتے ہیں تو یوں سمجھ لیجیے کہ آپ کے قریب ترین شناسا تک اپنی دماغی کیفیت پر شک کرنے لگیں گے اور یہ سوچیں گے کہ انہیں ضرور کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ حقیقت وہ نہیں ہے جو وہ سوچ رہے ہیں اور سمجھ رہ

ہیں۔ میں ایسے نیک نام لوگوں سے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے کام لینا چاہتا ہوں جن پر کسی کو شبہ نہ ہو سکے اور جب کام کی تکمیل ہو جائے تو مجھے اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ میرے لیے کام کرنے والے پر کیا گزری؟ آپ سمجھ رہے ہیں ناں میری بات۔ طریقہ کار یہ کہ آپ کے دماغ کا چھوٹا سا آپریشن کر کے میں اس میں ایک مائیکرو چپ پوشیدہ کر دوں گا اور ایک دور دراز مقام سے ریڈیائی جنریٹر کے ذریعے اس مائیکرو چپ کو کنٹرول کیا جائے گا جو آپ کے ذہن میں موجود ہوگی۔ پروفیسر اطہر آپ اس طرح ہمارے لیے کام کریں گے اور جب آپ دنیا کی نگاہوں میں مشکوک ہو جائیں گے تو پھر آپ کی چھٹی کر دی جائے گی۔ یہی ہمارا طریقہ کار ہے۔''

''تم اس طرح آسانی سے مجھ پر قابو نہیں پا سکو گے مائی ڈیئر۔''

''نہیں پروفیسر آپ پر قابو پایا جا چکا ہے۔ آپ اگر کھڑے ہونے کی کوشش کریں گے تو کھڑے نہیں ہو پائیں گے۔ کیونکہ جو مشروب آپ پی چکے ہیں وہ بس اب آپ پر اثر انداز ہونے والا ہی ہوگا اور آپ کے اعصاب بے جان ہو جائیں گے۔'' شائیکو نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا۔

''آپ کوشش کیجیے اٹھنے کی۔'' پروفیسر اطہر نے واقعی اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ اٹھ نہیں سکا تھا

♥......♥......♥

کرنل رحیم کو سردار گڑھ سے اس کی بیٹی کا فون موصول ہوا تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ آپ کے دوست پروفیسر اطہر آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں اور انہوں نے کہا کہ یہ ملاقات فوری طور پر ہونا ضروری ہے کیونکہ یہ ان کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔

''تم نے اسے میرا موبائل نمبر نہیں دیا۔'' کرنل رحیم نے پوچھا۔

''نہیں پپا۔ آپ سے اجازت لیے بغیر میں آپ کا موبائل نمبر کیسے دے سکتی تھی؟''

''اس کا فون نمبر یا موبائل نمبر لیا ہے تم نے۔''

''جی...... جی۔ انہوں نے خود اپنا موبائل نمبر دیا ہے۔''

''بتاؤ۔'' کرنل رحیم شاہ نے کہا اور اس کی بیٹی اسے پروفیسر اطہر کا موبائل نمبر بتانے لگی تھی جسے کرنل رحیم شاہ نے نوٹ کر لیا۔ ان دنوں وہ دارالحکومت میں ہی تھا اور گرین ہاؤس میں گرین فورس کے درمیان ایک دلچسپ وقت گزار رہا تھا۔ ویسے پچھلے دنوں جو وارداتیں ہوئی تھیں وہ بھی اس کے لیے دلچسپی کا باعث تھیں اور اب وہ پوری طرح ان کا تجزیہ کر رہا تھا اور ان کے بارے میں اپنے طور پر رپورٹیں تیار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پروفیسر اطہر سے رابطہ قائم کیا۔

''میں کرنل رحیم شاہ بول رہا ہوں۔''

''اوہو...... کرنل براہ کرم ایک پانچ منٹ صبر کر لو لیکن اپنا موبائل آن رکھنا میرے موبائل کی سی ایل آئی پر تمہارا نمبر موجود ہے۔ میں پانچ منٹ کے بعد تمہیں رنگ کرتا ہوں۔'' کرنل رحیم شاہ نے موبائل آف کر دیا اور پھر ٹھیک پانچ منٹ کے بعد اسے پروفیسر اطہر کا فون موصول ہوا۔

''جی کرنل......''

''کیسے ہو پروفیسر۔ بہت عرصے کے بعد میری یاد آئی۔ خیریت۔''

''بالکل خیریت نہیں ہے۔ میں ایک انتہائی اہم اور سنگین قومی مسئلے پر تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ براہ کرم مجھے فوری طور پر وقت دو جب میں تمہیں تفصیل بتاؤں گا تو تم اس بات کو تسلیم کرو گے کہ فوراً ہی تمہارا مجھ سے ملنا بہت ضروری تھا اور بات انتہائی غیر معمولی ہے۔''

''ٹھیک ہے جگہ بتاؤ۔''

''میں بہت پریشان بھی ہوں اور یوں سمجھ لو کہ کچھ ایسے جرائم پیشہ لوگوں کی نگاہوں میں ہوں جو بے حد خطرناک ہیں اور مجھے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔''

''اچھا تو پھر تم ایسا کرو کہ آدھے گھنٹے کے بعد گھر سے باہر نکل آؤ۔ للی آرکیڈ نام کی عمارت رانکسن روڈ پر ہے جانتے ہو اس کے بارے میں۔''

''اچھی طرح......'' پروفیسر کی آواز سنائی دی۔

''للی آرکیڈ میں ایک بہت بڑا شوروم رابرا سٹور کے نام سے ہے۔ اس میں داخل ہو جاؤ اور سیدھے مینیجر کے کمرے میں پہنچ جاؤ۔ وہاں سے تمہیں پک کر لیا جائے گا۔''

''مینیجر کو میرے بارے میں علم ہوگا؟''

''ہاں بالکل مطمئن رہو۔''

''او کے۔'' پروفیسر نے جواب دیا اور کرنل رحیم شاہ نے موبائل بند کر دیا۔ اس کے فوراً بعد اس نے صوفی کو موبائل پر کال کی اور کچھ لمحوں کے بعد کال ریسیو کر لی گئی۔

''کہاں ہیں صوفی صاحب؟''

''گرین ہاؤس کے گیٹ پر درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے فوراً ہی جواب دیا۔

''کیا......؟''

''جی ہاں گرین ہاؤس کے سامنے ہوں۔''

''بھئی واہ! آپ تو اللہ دین کا جن ہو گئے۔ آیئے آپ کا شدت سے انتظار کر رہا ہوں۔''

''بہ سر و چشم...... بہ سر و چشم حاضر ہوئے۔'' صوفی نے کہا اور کچھ دیر بعد وہ کرنل رحیم شاہ کے سامنے حاضر ہو گیا۔

''صوفی صاحب آپ ایسے ہی ادھر آ رہے تھے یا کوئی کام تھا؟''

''نہیں مجھے حاضری دینا تھی۔ کچھ رپورٹیں تھیں ہمارے پاس۔''

''ٹھیک ہے آیئے پھر تھوڑی دیر بیٹھتے ہیں اور اس کے بعد چلنا ہے ہمیں۔''

''شکریہ۔'' صوفی نے کہا اور سامنے بیٹھ گیا۔

''کیسی کیا رپورٹیں ہیں؟''

''وہی لوگ مدنگاہ ہیں درویشوں کی دعاؤں سے جو بے چارے گوشت پوست کا جسم چھوڑ کر آہنی وجود اختیار کر گئے ہیں۔''

"ہاں اس وقت اہم ترین مسئلہ یہی ہے۔"

"یہ لوہے کا وہ ٹکڑا ہے جو ان کے وجود کا ایک حصہ ہے۔" صوفی نے جیب سے لوہے کا ٹکڑا نکال کر کرنل رحیم شاہ کے سامنے رکھ دیا اور کرنل رحیم شاہ کی آنکھیں پھٹ کر رہ گئیں۔

"یہ...... یہ آپ کو کہاں سے حاصل ہوا؟"

"ایس پی صاحب نے مرحمت فرمایا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"کون ایس پی......؟"

"ایس پی جمشید مرزا۔"

"اوہو اس نام کا تذکرہ آپ مجھ سے کر چکے ہیں۔"

"جی ہاں۔ بڑے پر مذاق آدمی ہیں۔ اکثر مذاق فرماتے رہتے ہیں۔ ہم نے بھی ان کے ساتھ آنکھ مچولی کر رکھی ہے۔" صوفی نے کہا اور مختصر الفاظ میں کرنل رحیم شاہ کو جمشید مرزا کے بارے میں اور لوہے کے اس ٹکڑے کے حصول کے بارے میں بتانے لگا۔ کرنل رحیم شاہ جیسا سنجیدہ آدمی بھی ہنس پڑا تھا۔

"بھئی صوفی صاحب یہ شازیہ، غلام قادر، دلاور وغیرہ پچھلے کچھ دنوں سے مجھے بتا رہے ہیں کہ آپ کی شخصیت میں ایک اہم تبدیلی رونما ہو چکی ہے اور آپ کے اندر جارحیت بیدار ہو گئی ہے۔ آپ کے اس عمل سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔"

"حضور من! ہمیں انسانیت کی فہرست سے خارج کیوں کر دیا جاتا ہے۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر ہم بھی حس لطیف رکھتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔ اس لطافت اور ظرافت کو ہماری ذات سے الگ کر دینا ہمارے ساتھ ظلم اور ناانصافی ہے۔"

"ارے نہیں......نہیں۔ یہ مقصد نہیں ہے۔ ایس پی جمشید مرزا تو سخت ناراض ہوگا۔"

"میرا خیال ہے کہ سرکاری پیمانے پر ایک توپ منظور کرا رہے ہوں گے کیونکہ اس سے کم ہمیں وہ سزا نہیں دے سکتے۔ توپ کے دہانے سے باندھ کر ہمیں ٹکڑوں میں تقسیم کر دینا چاہتے ہوں گے۔ ان کی کاوشیں یہی بتا رہی ہیں البتہ یہ حسینہ عالم جو آپ نے ہمیں تحفتہً مرحمت فرمائی ہیں، ہمیں خطرہ ہے کہ کسی دن جمشید مرزا پر حملہ آور نہ ہو جائیں اور باقاعدہ پولیس کیس نہ بن جائے۔"

"واقعی صوفی صاحب سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ کے اندر اس قدر حسن ظرافت ہوگی۔ چلیے فکر نہ کریں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ دیکھ لیتے شاہ میر صاحب زندہ باد۔ اچھا اب یہ بتائیے کہ اس میں سے آپ نے کوئی نتیجہ اخذ کیا؟"

"ہم کیا نتیجہ اخذ کرتے البتہ ہم نے اس کا لیبارٹری میں تجزیہ کرایا ہے اور مکمل رپورٹ یہ ہے کہ یہ صرف لوہے کا ایک ٹکڑا ہے اس کا کوئی ماضی نہیں ہے اور نہ ہی اس میں کسی طرح کے کسی مادے کی آمیزش پائی گئی ہے۔"

"بابا یہ سائنسی باتیں ہیں۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اچھا خیر چھوڑیئے اس وقت ذرا ایک اہم شخصیت کے تحفظ کی بات آ گئی ہے۔ میرا خیال ہے ہم اسے گرین ہاؤس تک لے آتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" صوفی نے یہ سوال تک نہیں کیا تھا کہ یہ اہم شخصیت کس کی ہے۔ کرنل رحیم شاہ کو اس کی بہت ساری عادتیں بے حد پسند تھیں۔ ان میں سے ایک یہ عادت بھی تھی۔ صوفی سے اس نے ایک بار سوال کیا تھا تو اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا تھا۔

"بات اصل میں یہ ہے کہ سر کہ اعتماد بہت بڑی چیز کا نام ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے پر اعتماد کیا ہے اور اسی اعتماد کے رشتے پر چل رہے ہیں۔ جس دن یہ رشتہ ختم ہوا ہم ایک دوسرے سے صورت آشنا بھی نہ رہیں گے درویشوں کی دعاؤں سے۔ تھوڑی دیر کے بعد کرنل رحیم شاہ اور صوفی مطلوبہ جگہ جا رہے تھے۔ غلام قادر، شازیہ اور دلاور کو ایک دوسری کار میں خاص قسم کی ہدایات دے کر لایا جا رہا تھا۔ کرنل رحیم شاہ نے انہیں ہدایت کی تھی کہ رابراسٹور سے واپسی پر اگر ان کا تعاقب کیا جائے تو تعاقب کرنے والوں کا نہ صرف رستہ روکنے کی کوشش کی جائے بلکہ ان میں سے کسی ایک کو زخمی کر کے قبضے میں لے لیا جائے۔ یہ مخصوص ہدایات دینے کے بعد ان لوگوں کو ساتھ آنے کے لیے کہا گیا تھا اور وہ دوسری کار میں تعاقب کر رہے تھے۔ کار صوفی ڈرائیو کر رہا تھا۔ آخر کار وہ منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ یہاں رابراسٹور نامی شوروم تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ راستے میں کرنل رحیم شاہ نے اپنے شناسا شوروم مینیجر کو ہدایات دے دی تھیں۔ یہ لوگ رابراسٹور میں داخل ہو گئے۔ صوفی اس وقت پوری طرح چوکنا نظر آ رہا تھا۔ وہ کرنل رحیم شاہ کی حفاظت کر رہا تھا جو اپنی بیساکھی کے سہارے چلتا ہوا مینیجر کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ یہاں پروفیسر موجود تھا۔ اس کے سامنے چائے کی پیالی رکھی ہوئی تھی اور مینیجر اس سے بہت اچھی طرح پیش آ رہا تھا۔ چنانچہ پروفیسر اطہر کرنل رحیم شاہ سے گلے ملا۔ کرنل رحیم شاہ نے مینیجر کا شکریہ ادا کیا۔ مینیجر نے اسے بھی چائے کی پیش کش کی تھی لیکن کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"نہیں ڈیئر توفیق بعد میں۔ اس وقت اجازت دو اور ہاں سنو میں نے خاص طور سے رابراسٹور کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ تمہارے ہاں پچھلا دروازہ بھی موجود ہے۔ ہم پچھلے دروازے سے باہر جائیں گے۔"

"ٹھیک میں کھلوائے دیتا ہوں، وہ ایمرجنسی ڈور ہے۔"

"بالکل ٹھیک اسے ایمرجنسی ہی تصور کرو۔" صوفی باہر نکل کر کار پچھلی گلی میں لے آیا۔ اس نے شازیہ اور گرین فورس کے باقی دونوں ممبرز کو مستعد دیکھا تھا۔ کرنل رحیم شاہ پروفیسر اطہر کے ساتھ پچھلے دروازے سے باہر نکل کر کار میں بیٹھ گیا اور کار گرین ہاؤس کی جانب چل پڑی۔ ان لوگوں نے ایک دوسری کار کو اپنے تعاقب میں دیکھ لیا تھا جس میں شازیہ وغیرہ موجود تھے۔ طے یہ کیا گیا تھا کہ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر گھوما جائے گا اور اس کے بعد گرین ہاؤس کا رخ کیا جائے گا۔ راستے میں کرنل رحیم شاہ نے پروفیسر اطہر سے پوچھا۔

"آپ کی کار کہاں ہے؟"

"میں نے بھی اسی طرح اپنے گھر کا عقبی راستہ اختیار کیا تھا اور اپنی کار میں نہیں بلکہ ٹیکسی میں یہاں آیا تھا۔"

"گڈ......" اس کا مطلب ہے کہ تعاقب کا کوئی امکان نہیں ہے۔"

"پھر تھوڑی دیر کے بعد کرنل رحیم شاہ نے شازیہ سے رابطہ قائم کیا اور شازیہ نے فوراً ہی فون ریسیو کیا۔

"کیا پوزیشن ہے؟"

"نہیں سر۔ دور دور تک کسی کے تعاقب کا شبہ نہیں ہے اس سے زیادہ محتاط طریقہ کار کوئی اختیار نہیں کر سکتا۔"

"او کے۔ اب ہم گرین ہاؤس کا رخ کر رہے ہیں۔ پروفیسر اطہر کو گرین ہاؤس لے آیا گیا۔ ابھی تک کرنل رحیم شاہ نے اس سے کسی سنگین صورت حال کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ بہر حال وہ لوگ گرین ہاؤس کے مخصوص کمرے میں پہنچ گئے۔ یہاں صرف صوفی اور کرنل رحیم شاہ نے پروفیسر سے گفتگو کی۔ رحیم شاہ نے مختصر الفاظ میں صوفی کا تعارف کرا دیا تھا۔ پروفیسر اطہر نے کہا۔

"میں ایک بہت ہی سنگین صورت حال سے دوچار ہوں۔ سنو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔ پچھلے دنوں کچھ عجیب و غریب واقعات ہوئے ہیں۔ بینک لوٹنے کی کوشش کی گئی ہے اور وہاں ایک ڈاکو لوہے کی طرح سرخ ہو کر پگھل کر بہ گیا ہے۔ بات...... مذاق معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا پس منظر مضحکہ خیز نہیں ہے اور بھی چند واقعات ہوئے ہیں جن میں ایسی ہی صورت حال پیش آئی ہے مثلاً ایک شخص رانا سرکار اور دوسرا......"

"کیا تمہیں اس بارے میں کوئی معلومات حاصل ہیں پروفیسر۔" کرنل رحیم شاہ نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

"نہ صرف معلومات بلکہ جیسا کہ میں نے تم سے کہا کہ میں ایک سنگین صورت سے دوچار ہو چکا ہوں، لیکن یہ بالکل اتفاق ہے کہ ایک حادثہ اس صورت سے بچاؤ کا ذریعہ بن گیا۔ کرنل رحیم شاہ آپ میرے دوست بھی ہیں اور بہر حال میری گڈ بک پر بھی ہیں۔ بے شمار بار اپنے اسٹوڈنٹس کو پڑھاتے وقت میں نے آپ کی محب وطن شخصیت کا ذکر کیا ہے اور ان سے یہ کہا ہے کہ کرنل رحیم شاہ میرا آئیڈیل ہے۔ بے لوث، بے غرض، محب وطن۔ کرنل کچھ عرصے قبل میرے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ اس حادثے میں زندگی تو بچ گئی لیکن مجھے ایک عجیب و غریب قوت حاصل ہو گئی۔ اب تک اس قوت سے میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا لیکن لگتا ہے قدرت نے مجھے ان ہی لمحات سے دوچار ہونے کے لیے یہ قوت بخشی تھی۔ اس وقت سے میرا ذہن دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ میں اپنی ذہنی قوتوں سے پوری طرح واقف ہوں جو حصہ استعمال ہو رہا ہوتا ہے میں جانتا ہوں وہاں سے کیا کیا، کیا جا سکتا ہے، بہت دن سے میں اسی سوچ میں تھا کہ اپنے دماغ کے دونوں حصوں سے میں الگ الگ کون سے فائدے اٹھا سکتا ہوں۔ کوئی ترکیب تو سمجھ میں نہیں آ سکی تھی لیکن بہر حال میں سوچتا ضرور تھا۔

یہ واقعات جو مجھے پیش آئے ہیں بڑے سنسنی خیز اور حیران کن ہیں۔ کرنل مجھے اغوا کر لیا گیا۔ طریقہ کار بہت عجیب و غریب تھا۔ اپنی حماقت سے میں ایلیٹ نامی ایک لڑکی سے بہت زیادہ متاثر ہو گیا اور وہی لڑکی مجھے اپنے ساتھ لے کر ایک عمارت میں گئی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اپنے اہل خانہ سے ملانا چاہتی ہے۔ وہاں مجھے ایک بہت مکروہ اور بدشکل شخص ملا، جس نے اپنا نام مجھے شائیکو بتایا اور مجھ سے کہا کہ وہ ایک عظیم سائنٹسٹ ہے۔ وہ شخص ایلیٹ نامی لڑکی سے محبت کرتا ہے اور اس کے لیے دولت کے انبار لگانا چاہتا ہے۔ وہ ایک سائنٹسٹ ہے۔ اس نے ساری تفصیل مجھے بتائی اور مجھ سے کہا کہ وہ میرے دماغ میں ایک مائیکرو چپ فٹ کرنا چاہتا ہے جس سے وہ مجھے اپنے طور پر تمام ہدایات دے سکتا ہے۔ وہ مجھے بہت سے معاملات میں استعمال کرنا چاہتا تھا جس میں شاید بینکوں کو لوٹنا بھی شامل ہے اور کچھ ایسے کام بھی جن کے

بارے میں میری شخصیت پر کوئی شبہ نہ کیا جا سکے اور میں وہ کام کر ڈالوں اور سرکاری طور پر یہ بات تسلیم ہی نہ کی جائے کہ ایسا کوئی کام نیک نام پروفیسر اطہر نے کیا ہے۔ وہ میری نیک نامی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے مفلوج کر دیا تھا اور اسی کیفیت میں اس نے میرا آپریشن کیا اور وہ مائیکرو چپ میرے دماغ میں فٹ کر دی۔ وہ اپنے فن کا ماہر ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ میں ڈبل برین ہوں۔ اس نے میرے دماغ کے جس حصے پر مائیکرو چپ فٹ کی ہے وہ تو اس کا مطیع ہو گیا ہے لیکن دوسرا حصہ آزاد ہے اور اس آزاد حصے سے میں اپنے طور پر ہر بات سوچ سکتا ہوں اور وہ مائیکرو چپ متحرک نہیں ہوگی۔ بس اسی سے فائدہ اٹھا کر میں نے تم سے رجوع کیا ہے۔ مائیکرو چپ دماغ میں فٹ ہو جانے کے بعد مجھے اس شخص کی مکمل تفصیل معلوم ہو چکی ہے کیونکہ وہ سب کچھ اس کی یادداشت میں موجود ہے، وہ ایک عظیم سائنس داں تھا لیکن انتہائی حد تک بدصورت ہونے کی بنیاد پر اسے جگہ جگہ ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنی زندگی کے کسی بھی شعبے میں وہ کوئی نمایاں حیثیت نہیں حاصل کر سکا اور بہت سی دکھی کیفیتوں کا شکار رہا۔ مطلب یہ کہ اسے اپنی زندگی کا ناکام ترین انسان کہا جا سکتا ہے، لیکن پھر ایلیٹ نامی لڑکی نے اس کے دل میں تحریک پیدا کی اور وہ زندگی کی جانب راغب ہو گیا۔ اسے ایلیٹ کا مستقبل بنانے اور سنوارنے کی خواہش پیدا ہوئی اور اس نے اس پر کام شروع کر دیا۔

چنانچہ اپنے طور پر اس نے ہمارے وطن کا انتخاب کیا۔ عقل کے اندھے مغربی شاطر یہ سوچتے ہیں کہ ایشیا میں بے وقوفوں کی بھرمار ہے اور یہاں آ کر وہ ہر طرح کی من مانی کر سکتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہاں انہیں بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس شخص نے بھی یہاں آنے کے بعد ہمارے شہر کے مغربی حصے کے پہاڑی سلسلے میں غاروں کے اندر اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کیا اور وہاں کچھ سائنسی مشینیں نصب کر دیں جو اس کی اپنی ایجاد کردہ ہیں اور ان مشینوں کے ذریعے وہ عجوبے وجود میں آئے یعنی انسانی جسم کا ٹھہرا جانا اور پھر پگھل کر بہ جانا یہ عمل ہوا ہے۔ وہ اپنے طور پر بڑے معمولی انداز میں یہاں رہتا ہے لیکن اس کی فطرت میں تھوڑی سی دیوانگی ہے۔ ایلیٹ کے سوا شاید اسے دنیا میں کسی سے دلچسپی نہیں ہے اور وہ ایلیٹ ہی کے سہارے زندہ رہنا چاہتا ہے۔ بڑی عجیب و غریب اور مکروہ شخصیت ہے اس کی۔

بہر حال اس نے اپنی دانست میں مجھے مکمل طور پر ٹرانس میں لے لیا ہے۔ خدا کے فضل سے میرے دماغ کا یہ دوسرا حصہ میرا اپنا ہے اور مائیکرو چپ اس حصے پر اثر انداز نہیں ہو سکی ہے چنانچہ میں اس کے ذریعے آپ کو اطلاع دے رہا ہوں۔ اب بتائیے میری ڈیوٹی کیا ہے؟"

صوفی پروفیسر اطہر کی یہ کہانی حیرت اور دلچسپی سے سن رہا تھا۔ خود کرنل رحیم شاہ کی عجیب و غریب کیفیت تھی اور وہ بار بار صوفی کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ صوفی نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ اپنے ذہن کے دوسرے حصے سے کام لے کر اسے شکست دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔"

"ہاں۔ قدرت نے شاید وہ حادثہ اسی لیے کیا تھا کہ اس طرح میں اپنے وطن کے لیے کچھ کر سکوں۔"

"آپ یقینی طور پر اس کی نشان دہی بھی کر سکتے ہیں۔"

"سو فی صدی۔"

"اس وقت آپ کے ذہن پر اس کا کنٹرول نہیں ہوگا۔"

"نہیں۔ چونکہ میں اپنے دماغ کے دوسرے حصے کو استعمال کر رہا ہوں۔"

"تب براہ کرم اس کے بارے میں ہمیں ساری تفصیلات فراہم کر دیجیے۔" صوفی نے کہا اور پروفیسر اطہر انہیں مکمل تفصیل بتانے لگا۔ صوفی باقاعدہ یہ تفصیل تاریخ پر نوٹ کر رہا تھا۔

♥......♥......♥

شاہ میر خان نے بھرپور مدد کی تھی۔ باقاعدہ فوجی حکام سے رابطے قائم کیے گئے تھے اور انہیں ساری صورت حال بتائی گئی تھی چنانچہ انتہائی خاموشی کے ساتھ رات کو پانچ ہیلی کاپٹر کمانڈوز کے ساتھ ان پہاڑیوں میں اتر گئے تھے جہاں غاروں کے اندر ایک عجیب و غریب مشینی نظام قائم کیا گیا تھا اور یہ بات تعجب خیز تھی کہ کسی غیر ملک میں اور وہ بھی دارالحکومت کے قریبی علاقے میں اس طرح کی مشینری نصب کر لی گئی تھیں۔ پھر جب شائیکو کی رہائش گاہ پر چھاپہ مارا گیا تو وہ ایلیٹ کے قدموں میں بیٹھا ہوا اپنی عقیدت کا اظہار کر رہا تھا۔ صوفی، کرنل رحیم شاہ اور بریگیڈیئر آفاق احمد نے اس گھر پر ریڈ کیا تھا۔ شائیکو مسلح افراد کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ایلیٹ بھی سکتے کے عالم میں کھڑی ہوئی تھی۔ پھر اچانک ہی شائیکو زمین پر سیدھا سیدھا لیٹ گیا اور ان لوگوں نے حیرت انگیز منظر دیکھا۔ اس نے اس طرح لیٹ کر اپنے آپ کو گول کر لیا تھا جیسے کوئی چیز فولڈ کر دی جاتی ہے اور پھر اپنی جگہ سے اچھلا تو چھت سے ٹکرایا تھا۔ بہ ظاہر اس کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو ششدر کر کے نکل جانے کی فکر میں تھا لیکن جب وہ پھرکی کی طرح گھوم کر کھلا اور دروازے کی طرف لپکا تو صوفی نے بڑے اطمینان سے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی گردن اپنی گرفت میں لے لی اور ایک دم سے گھوم کر اسے زمین پر دے مارا۔ اس کے منہ سے نکلا۔

"حق اللہ۔ تم بہت بڑے فن کار ہو شائیکو، لیکن درویشوں کے کش میں بڑی قوت ہے۔ ایک بار پھر شائیکو نے پلٹ کر اپنی ٹانگیں صوفی کی گردن سے لپیٹیں اور طاقت صرف کرنے لگا لیکن صوفی نے اسے زمین پر رگڑ دیا اور اس کی ریڑھ کی ہڈی کی کھال چھل گئی۔ ایلیٹ بے اختیار چیخنے لگی تھی لیکن اسے بھی بازوؤں سے پکڑ کر دبوچ لیا گیا تھا۔ وہ چیخ رہی تھی۔

"نہیں...... نہیں...... چھوڑ دو اسے، وہ بہت اچھا انسان ہے۔ پلیز چھوڑ دو اسے...... اس نے زندگی میں کچھ نہیں پایا، چھوڑ دو اسے پلیز۔" لیکن کچھ ہی لمحوں کے بعد صوفی کے رگڑوں نے شائیکو کو بے سدھ کر دیا۔ بریگیڈیئر کرنل رحیم شاہ سے کہہ رہا تھا۔

"آپ کا ساتھی باکمال شخصیت کا مالک ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس شعبدہ گر نے ہم لوگوں کو تو حیران ہی کر دیا تھا۔"

"جی ہاں۔ اصل میں اس سے بڑا شعبدہ گر اس کے سامنے تھا۔" کرنل رحیم شاہ نے کہا اور قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

♥......♥......♥

وزارت داخلہ نے خصوصی طور پر کرنل رحیم شاہ کی گرین فورس کو سرکاری محکمے میں جگہ دی تھی اور اس کے لیے ایک خصوصی گرانٹ منگوائی تھی۔ چنانچہ اب گرین فورس کے تقریباً اخراجات حکومت برداشت کر رہی تھی حالانکہ کرنل رحیم شاہ نے شاہ میر سے کہا تھا کہ وہ اور صوفی یہ تمام کاوشیں ایک محب وطن کی حیثیت سے کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں جو ٹیم تشکیل دی گئی ہے وہ بھی اسی جذبے سے مالا مال ہے۔ کرنل رحیم شاہ نے کہا تھا۔

"شاہ میر اصل میں انسان کو اگر اس کی محنت کا صلہ مل جائے تو میرے خیال میں تو اس کی عمر بڑھ جاتی ہے اور کسی کو اگر زندگی کا تحفہ ملے تو تم خود بتاؤ کہ اس سے بڑا تحفہ اور کیا ہوتا ہے۔ مجھے فوجی ذمے داری سے وقت سے پہلے رہا کر دیا گیا کیونکہ میرے اندر ایک کمی پیدا ہوگئی تھی۔ یقین کرو شدید غم کا شکار تھا لیکن میرا عزم مردہ نہ ہوا۔ میں نے اپنی جدوجہد کے لیے ایک راستہ منتخب کیا اور درحقیقت وہ شعر اچھا تو لگتا ہے جو مجھے یاد نہیں ہے یعنی یہ کہ کارواں بنتا گیا، شاید وہ ہے کہ میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر ہم سفر ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا، شاید ایسی ہی کوئی بات ہے لیکن مجھے صوفی کی شکل میں جیسی شخصیت ملی ہے تمہیں اس کا اندازہ ہے بس اسی کی بنا پر گرین فورس تشکیل دے سکا ہوں ورنہ تمہیں معلوم ہے کہ میں اس قدر فعال نہیں ہوں کہ ہر طرح کی بھاگ دوڑ کر سکوں لیکن صوفی کو تم دیکھ ہی چکے ہو۔"

"واقعی کمال کی شخصیت ہے مگر میرے دوست یہ جو کچھ تمہیں سرکاری طور پر مل رہا ہے ناں ظاہر ہے اپنی جیب سے نہیں دے رہا اور نہ ہی یہ ان کاوشوں کا صلہ ہے۔ اب ذرا غور تو کرو کیا خوف ناک صورت حال تھی لیکن صوفی نے سنبھال لی۔ کوئی معمولی بات ہے۔ کتنی خاموشی سے ایک خوف ناک مجرم کو ختم کر دیا گیا۔ خود میری بھی زبردست عزت افزائی ہو رہی ہے اگر اتنا سا کام ممکن ہو سکا تو یہ کون سی بڑی بات ہے۔ تم ان لوگوں پر جو بھی اخراجات کر رہے ہو کرتے رہو۔ تھوڑی سی کوشش سے جو کچھ انہیں حاصل ہو رہا ہے اسے جاری رہنے دو۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔" کرنل رحیم شاہ مسکرا کر خاموش ہوگیا تھا اور شاہ میر نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کرنل رحیم شاہ ایک خالص فوجی ہے اگر انکار پر تل جاتا تو پھر اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بہرحال شاہ میر کو بھی دلی تقویت حاصل ہوگئی تھی اور محکمہ فورس میں وہ اپنی کارکردگی کو بہتر بنا سکتے تھے کیونکہ محکمے میں ایسے لوگوں کی کمی ہی ہوا کرتی ہے جو پوری طرح اپنی ذمے داریاں سرانجام دے سکیں۔ نااہلیت اس دور کی سب سے بڑی لعنت ہے اور دنیا جانتی ہے کہ یہ لعنت کس طرح مسلط ہو چکی ہے۔

♥......♥......♥

چھٹی کا دن تھا۔ صوفی ابھی تک کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ باورچی خانے سے حسینہ کی ہانڈیاں بجانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد صوفی کے کمرے میں آئی۔ صوفی بستر پر ہی لیٹا ہوا تھا۔ حسینہ نے کمرے میں جھانکا اور بولی۔

"مر گئے۔" صوفی نے چونک کر حسینہ کو دیکھا اور بدن کو چادر سے ڈھکنے لگا۔

"بی کالونچ اکثر میں نے دیکھا ہے تم چوری چھپے آتی ہو اور اگر میں سو رہا ہوتا ہوں تو مجھے گھورتی ہو۔"

"جھاڑو پھرے تمہاری شکل پر اگر کبھی صبح ہی صبح جاگ جاتے ہو تو آنکھیں بند کیے کیے پھرتی ہوں کہ کوئی اور صورت نظر آ جائے تو اچھا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ پہلی شکل تمہاری دیکھ لوں اور اس کے بعد دن

بھر مصیبت میں گرفتار رہوں اور تم کہتے ہو کہ میں تمہیں جھانکنے آتی ہوں۔ اے میں کہتی ہوں کہ کبھی کسی سوئے ہوئے گدھے کو دیکھا ہے تم نے جس کے جسم کی کھال اتر گئی ہو۔"

"خیر میں نے مرے ہوئے گدھے کو دیکھا ہے یا نہیں ہے لیکن یہ خدا کالی بلی سے میں بھی بہت ڈرتا ہوں اور تم نے یہ تو بڑے مزے کی بات کہی یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ تم میری صورت دیکھنے سے بچتی ہو اور میں تمہاری صورت دیکھنے سے بڑا پریشان کن مرحلے پر آ جاتا ہوں۔ اگر تم ایسی صورت میں نظر آ جاؤ۔"

"اب مرو گے یا نہیں......؟"

"تم پر تو کبھی نہیں مروں گا درویشوں کی دعاؤں سے۔ اس بھول میں بھی مت رہنا۔"

"کیا مطلب میں سمجھی نہیں......؟"

"کس پر مرنے کی بات کر رہی ہو کالی بلا۔" صوفی کو در حقیقت حسینہ کے ساتھ اس چھیڑ چھاڑ میں خاصا لطف آنے لگا تھا۔ حسینہ اسے گھورتی رہی پھر ایک دم ہنس پڑی۔

"اماں کا کیا نام تھا تمہاری......؟" اس نے سوال کیا اور صوفی اس سوال سے چکرا گیا۔ یہ سوال ذرا انوکھا اور اجنبی تھا۔

"مطلب کیا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"نہیں نہیں بتاؤ...... بتاؤ۔" "اب فضول باتیں کیے جا رہی ہو یا کچھ چائے وغیرہ لاؤ گی۔"

"یہی دیکھنے تو آئی تھی کہ اگر زندہ ہو تو چائے کا پوچھ لوں گی۔ دوپہر ہونے والی ہے، کھانا بھی پکانا ہوگا۔"

"تم پر بھی درویشوں کی مار حسینہ بیگم کھانے میرے لیے پکاتی ہو یا اپنے لیے۔ اول تو میں بھی گھر میں کھاتا ہی نہیں ہوں اور اگر کھاتا بھی ہوں تو دو چار لقمے اور تم اہتمام ایسے کرتی ہو جیسے پتا نہیں کیا میرے لیے دیگ پکا رہی ہو۔"

"دیگ تو خیر میں تمہارے چالیسویں پر ہی پکاؤں گی۔ میں خود بھی یہی کہتی ہوں کہ پتا نہیں کہاں کہاں کتوں کی طرح منہ مارتے پھرتے ہو۔ گھر میں کچھ کھاؤ تو میں کچھ پکاؤں۔"

"تمہیں پکانا آتا ہی کیا ہے جو کبھی گھر میں ڈھنگ سے کھاؤں۔" صوفی کو بھی ایک مشغلہ ہی مل گیا تھا۔ حسینہ ہری مرچ سے زیادہ تیز تھی اور بہر حال صوفی کی زندگی میں یہ ایک انقلاب تھا ورنہ ممن خان والی گلی میں دوست تو بہت سے تھے لیکن چونچیں چلانے کے لیے کوئی نہیں تھا۔ کرنل رحیم شاہ کا بھی ایک طرح سے شکر گزار تھا کہ اس نے کم از کم زبان کی تیزی کا معقول بندوبست کر دیا تھا اور صوفی حسینہ بیگم سے خوب مزے لیتا تھا۔

"بہر حال حسینہ چلی گئی اور صوفی اٹھ کر غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ یہاں سے اسے ممن خان کے ہاں جانا تھا۔ بلاوا آیا تھا معشوق نشیلے کے ذریعے اطلاع ملی تھی کہ گلی میں چندہ ہو رہا ہے تاکہ عرس کا بندوبست کیا جا سکے۔ بہت دن سے صوفی نے ایسی کسی چیز میں حصہ نہیں لیا تھا چنانچہ یہ فیصلہ کر کے کہ عرس کا بہترین انتظام کرے گا۔ وہ تیاریاں کرنے لگا۔

♥......♥......♥

ہاشم درانی اپنی شان دار لینڈ کروزر سے نیچے اتر گیا۔ ملاقات ذاتی ہی سہی لیکن وزیر داخلہ کی

رہائش گاہ کی سیکورٹی اپنی جگہ تھی۔ ہر شخص کو ان مدارج سے گزرنا ہوتا تھا جو سرکاری نوعیت کے تھے۔ ہاشم درانی کو بہر حال تمام تر مراحل سے گزرنے کے بعد ہی شاہ میر کے ڈرائنگ روم میں داخل ہونا نصیب ہوا تھا البتہ شاہ میر نے اسے انتظار نہیں کرایا تھا بلکہ جیسے ہی شاہ میر کے سیکرٹری نے اسے بیٹھنے کی پیش کش کی شاہ میر اندرونی کمرے سے باہر نکل آیا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر ہاشم درانی سے گلے ملا۔

"یار اب تو یہ حسرت ہی رہ گئی دل میں کہ جس طرح ہم لوگ اسکول اور کالج میں ایک دوسرے کے ساتھ رہا کرتے تھے اسی طرح دوبارہ بھی تم سے ملاقات ہو سکے۔"

"میں شرمندہ ہوں مگر تھوڑی سی غلطی تمہاری بھی ہے۔ مجھے بلا لیتے تو میں اس سیکورٹی کے بغیر تمہارے پاس حاضر ہوتا۔ اب یہ یہاں کی روایات میں سے ہے تو میری بھی مجبوری ہے۔"

"مذاق کر رہا ہوں تم تو سنجیدہ ہو گئے۔" ہاشم درانی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"بیٹھو۔" اور ہاشم درانی بیٹھ گیا۔

"اکیلے ہو۔" یہ سوال کر کے دل نہیں دکھاتے تم میرا۔

"نہیں یار میرا مطلب ہے کوئی ساتھ نہیں آیا تمہارے۔"

"نہیں۔ ایک اہم مسئلے میں تمہارے پاس آیا ہوں اس لیے ناظمہ کو بھی ساتھ نہیں لایا حالانکہ تم جانتے ہو کہ وہ میرے وجود کا ایک حصہ بن چکی ہے۔"

"کیسی ہے؟"

"شکر ہے خدا کا ٹھیک ہے۔"

"معاف کرنا ذاتی سا سوال ہے اس کے لیے جو مخالفتیں ہو رہی تھیں جاری ہیں یا......"

"کسی کی مجال ہے، میں نے کہہ دیا ہے کہ اگر ناظمہ کے خلاف کسی کے منہ سے ایک لفظ نکلا یا کسی کے ردعمل میں کوئی خرابی آئی تو وہ کوئی بھی ہو کم از کم میرے گھر میں وہ اس کا آخری دن ہوگا۔"

"خدا تمہیں اس کا اجر دے۔ بہت اچھے انسان ہو یہ ہونا ہی چاہیے تھا۔ اصل میں ناظمہ درانی، ہاشم درانی کے بھائی کی بیٹی تھی اور ہاشم درانی کا بھائی عادل درانی بہت بری فطرت کا مالک شخص تھا۔ اس نے ہاشم درانی کے خاندان کو شدید ترین نقصان سے دوچار کیا تھا۔ یہاں تک کہ ہاشم درانی کی بیوی عالیہ درانی عادل درانی کے ہاتھوں ہی ماری گئی تھی۔ گو وہ ایک حادثہ تھا لیکن ہوا عادل درانی کے ہاتھوں سے تھا۔ نہ صرف عالیہ درانی بلکہ عادل درانی کی اپنی بیوی بھی اسی حادثے میں عالیہ درانی کے ساتھ ماری گئی تھی اور اس وقت ناظمہ جو عادل درانی کی بیٹی تھی صرف چھ سال کی تھی خود ہاشم درانی کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی اور اہل خاندان میں سے بہت سے لوگ ساتھ رہا کرتے تھے۔

بہر حال عادل درانی یہ حادثہ کرنے کے بعد فرار ہوا اور ایک ایکسیڈنٹ میں مارا گیا۔ سارا خاندان اس بات پر اتفاق کرتا تھا کہ ناظمہ جو عادل درانی کی بیٹی تھی اسے گھر سے نکال باہر کیا جائے۔ لیکن ہاشم درانی نے اس سلسلے میں بڑی ہمت کا ثبوت دیا اور بچی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے بعد سے بے چاری ناظمہ درانی پورے خاندان کی نفرتوں کا شکار رہی۔ اسے ہاشم درانی کی شفقت ہمیشہ حاصل رہی۔ ہاشم درانی

نے اسے اپنی سیکرٹری بنا کر رکھا ہوا تھا۔ ناظمہ نے ہاشم درانی کے ہر لمحے کو سنبھال رکھا تھا اور واقعی ہاشم درانی اس وقت اس کا اس طرح مقروض ہوگیا تھا کہ اس کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں چل سکتا تھا اور یہ بات اس کے بہت سے قریبی دوستوں کو معلوم تھی اور شاہ میر بھی اس کے بچپن کے دوستوں میں سے ایک تھے۔ دونوں نے اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک ایک ساتھ تعلیم حاصل کی تھی ہاشم درانی چونکہ ایک بہت بڑے بزنس مین کا بیٹا تھا۔ بڑی جاگیریں تھیں اس کی وہ تو اپنی منصب پر نکل گیا اور شاہ میر نے اپنی ذمے داریاں سرکاری محکمے میں سنبھال لیں اور ترقی کرتے کرتے وزارت داخلہ تک پہنچ گیا۔ ہرچند کہ ہاشم درانی ایک بزنس مین تھا اور بڑی کامیابی سے اپنا بزنس چلا رہا تھا لیکن اس کی فطرت میں بھی مہم جوئی اور آوارہ گردی موجود تھی چنانچہ آدھی سے زیادہ دنیا دیکھ چکا تھا۔ بزنس کے معاملے میں بھی اسے اس آوارہ گردی سے بڑے فائدے حاصل ہوئے تھے۔ یہ تھی ہاشم درانی کی شخصیت اور اس وقت وہ شاہ میر کو اطلاع دے کر اس کے پاس آیا تھا۔ اس نے شاہ میر سے یہی کہا تھا کہ ایک بہت اہم مسئلہ ہے جس کے لیے اسے کچھ وقت درکار ہے۔

ابتدائی گفتگو اور ہلکی پھلکی خاطر مدارات کے بعد ہاشم درانی نے کہا۔

’’میں جانتا ہوں شاہ میر کہ تمہارا وقت بے حد قیمتی ہے اور میں اس قیمتی وقت میں کوئی مداخلت نہیں کرنا چاہتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اب میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں رہا تھا جس کی بنا پر میں بات کو ٹالتا رہتا۔ پچھلے کچھ عرصے سے میں انتہائی خطرات میں گھرا ہوا ہوں۔‘‘

’’خطرات......‘‘

’’ہاں یہ ضروری ہے کہ میں تمہیں وہ پوری تفصیل بتاؤں لیکن شرط یہ ہے کہ تم بھی دلچسپی سے سنو اور اگر تم یہ محسوس کرتے ہو کہ تم اپنے قیمتی وقت میں سے مجھے وقت نہیں دے سکو گے تو یقین کرو کہ میں برا مانے بغیر واپس چلا جاؤں گا۔ کیونکہ یہ میرے لیے ایک اہم معاملہ ہے بلکہ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہیں ہوگا کہ یہ میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔‘‘

’’ارے...... ارے خود بہ خود مفروضات کا شکار ہو کر غصے میں آ رہے ہو۔ ارے بھائی میں نے کہا کہ میں مصروف ہوں اور تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ تم اگر چاہو تو میں چوبیس گھنٹے تک اسی جگہ بیٹھا ہوا تمہاری باتیں سنتا رہوں اور تم سے باتیں کرتا رہوں۔ یہ کیا بات کہی تم نے یار۔ اب وقت اتنا ناسازگار بھی نہیں ہوگیا ہے۔ نہ میرے لیے اور نہ تمہارے لیے۔‘‘

’’شکریہ۔ اصل میں بس یہ احساس ہوتا ہے کہ بعض اوقات ہم کسی مشکل میں دوسرے کو بھی گھسیٹ لیتے ہیں۔‘‘

’’میں دوسرا نہیں ہوں اور اب یہ باتیں کیے بغیر اصل موضوع پر آ جاؤ۔‘‘

’’شکریہ لاؤ پھر مشروب کا ایک اور گلاس مجھے دو۔‘‘ ہاشم درانی نے شاہ میر کی باتوں سے مطمئن ہوتے ہوئے کہا اور شاہ میر اپنے دوست کی دل جوئی کرنے لگا۔ مشروب کے گھونٹ لیتے ہوئے ہاشم درانی اس طرح خاموش ہو کر غور کرتا رہا جیسے گزرے ہوئے واقعات مجتمع کر رہا ہو۔ پھر اس نے کہا۔

’’تقریباً گیارہ ماہ پہلے کی بات ہے یہ تو تمہارے علم میں ہے کہ میں کبھی بزنس ٹور پر اور کبھی اپنی

فطرت کے مطابق دوسرے ملکوں میں بھی جاتا رہتا ہوں، وہاں کی مختلف تفریحات میں بھی حصہ لیتا ہوں۔‘‘

’’ہاں۔ ہاں۔ میں جانتا ہوں اور ان تفریحات کے بارے میں بھی جانتا ہوں۔‘‘ شاہ میر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ گیارہ مہینے پہلے کی بات ہے کہ میں ہانگ کانگ میں تھا اور اس وقت میں ایک ہوٹل میں کھانا کھا رہا تھا۔ رات کا وقت تھا کہ ایک دبلا پتلا آدمی میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ یہ ہانگ کانگ کا مقامی آدمی تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت زیادہ خوف زدہ ہے۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا اور وہ چور نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ میں حیران رہ گیا۔ تھوڑا سا اندازہ تو مجھے یہ بھی ہو رہا تھا کہ وہ آدمی مجھے غلط سمجھا تھا۔ اس نے جیب سے ایک بڑا سا لفافہ نکال کر میز کے نیچے سے میرے گھٹنوں پر رکھ دیا اور آہستہ سے بولا کہ۔

’’میں خطرے میں ہوں تم اس لفافے کو ڈی آر پہنچا دینا۔‘‘

’’اس نے مجھے تاکید کرتے ہوئے کہا کہ یہ لفافہ ہر قیمت پر ڈی آر پہنچ جانا چاہیے پھر اس سے قبل میں اس سے کچھ کہتا وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ میں حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ اس شخص کی خوف زدہ شکل اور اس کا انداز بتاتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو واقعی خطرے میں محسوس کر رہا ہے۔ یہ خطرہ کیا تھا اور اسے کون سی مشکل پیش آنے والی تھی۔ اس کا ذرہ برابر مجھے اندازہ نہیں تھا۔ بات بہت ہی حیرت انگیز تھی۔ بہرحال میں نے لفافہ جیب میں ڈال لیا۔ اس شخص کے پیچھے نکل کر بھاگنا میرے لیے ممکن نہیں تھا، لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ یہ ہوا کیسے ہے اور ڈی آر کیا چیز ہے۔ میں بہت دیر تک حیران سا بیٹھا رہا اور پھر ہوٹل کے کمرے میں پہنچنے کے بعد میں نے لفافہ جیب سے نکالا۔ لفافے پر کئی سیلیں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے اسی حالت میں رکھ دیا اور دوسرے دن میں نے اپنی کوشش کے مطابق ڈی آر کے بارے میں معلومات حاصل کیں لیکن انتہائی چھان بین کے باوجود مجھے یہ نہیں پتا چل سکا کہ یہ ڈی آر کون ہے۔ سرکاری محکمات کے بارے میں بھی میں نے اپنی صلاحیت سے کام لے کر معلومات حاصل کیں لیکن ڈی آر نام کی کوئی چیز اس میں موجود نہیں تھی۔ آخرکار میں نے تنگ آ کر اس لفافے کو کھول ڈالا اور اس میں رکھے ہوئے کاغذات کا جائزہ لینے لگا۔ ان کاغذات میں کسی شمیان ہوہو کے بارے میں تفصیل درج تھی۔ ان میں کچھ تجارتی قسم کے کاغذات بھی تھے لیکن تجارت کی نوعیت بڑی سنسنی خیز تھی۔ شمیان ہوہو کا نام جگہ جگہ دہرایا گیا تھا۔ کاغذات مختلف زبانوں میں تھے۔ میں پوری طرح انہیں سمجھ نہیں سکا تھا البتہ ایک نیا نام مجھے اور معلوم ہوا تھا ڈی آر کے علاوہ اور یہ تھا شمیان ہوہو۔ بعد میں میں نے شمیان ہوہو کے بارے میں چھان بین کی اور مجھے بہت کچھ معلوم ہوا لیکن یہ نہ معلوم ہوسکا کہ شمیان ہوہو کون ہے اور کہاں ہے؟ وہ ایک آفاقی قسم کا جرائم پیشہ آدمی تھا اور اس کے ایجنٹ آئے دن گرفتار ہوتے رہتے تھے لیکن ان ایجنٹوں میں سے بھی کوئی شمیان ہوہو کا صحیح پتا نہ بتا سکا۔ اس کے علاوہ ایک اور انوکھی بات مجھے معلوم ہوئی۔ وہ یہ کہ شمیان ہوہو ایک روایتی نام ہے اور ہانگ کانگ کی قدیم تاریخ میں یہ نام اسی حیثیت سے پایا جاتا ہے۔ تقریباً کئی سو سال سے یہ نام زندہ تھا۔‘‘

’’واہ...... زبردست۔ شاہ میر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’بہرحال کاغذات میری تحویل میں ہی رہے لیکن کچھ عرصے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ کچھ لوگ ان کاغذات کی تلاش میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ کاغذات ملنے کے چند ہی ماہ کے بعد وہ لوگ میرے پیچھے لگ

گئے تھے اور اس قدر سنسنی خیز حالات ہوئے تھے کہ کئی بار انہوں نے مجھے پالیا وہ مجھے ہلاک کر سکتے تھے لیکن کاغذات کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکے اور مجبوراً مجھے وہ کاغذات اس طرح چھپانا پڑے کہ انہیں دستیاب نہ ہو جائیں۔ پھر کتنی ہی بار وہ چوری چھپے میری قیام گاہ میں بھی داخل ہوئے لیکن انہیں کاغذات کی ہوا بھی نہ لگ سکی پھر اس کے بعد انہوں نے ٹیلی فون پر مجھے دھمکیاں دیں اور دوسرے ذرائع سے موت کے نشانات بھیجنا شروع کر دیے۔ کبھی کسی اژدھے کی شکل میں، کبھی مڑے ہوئے خطرناک خنجروں کی شکل میں اور کبھی زہریلے تیروں کی شکل میں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے بتایا جاتا رہا کہ اب وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"وہ شخص کبھی دکھائی دیا جس نے کاغذات آپ کو دیے تھے۔"

"نہیں۔ وہ کبھی نہیں نظر آیا۔ میں جانتا ہوں شاہ میر کہ ان لوگوں کو اس بات کا علم ہو چکا ہے کہ میں کاغذات دیکھ چکا ہوں اور شمیان ہوہو کے بارے میں مجھے بہت سی تفصیلات معلوم ہو چکی ہیں۔ ظاہر ہے میں نے اس سلسلے میں کبھی کوئی جدوجہد نہیں کی لیکن وہ لوگ صرف کاغذات کی وجہ سے مجھے زندہ رکھے ہوئے ہیں اگر کاغذات ان کے قبضے میں پہنچ گئے تو سب سے پہلا کام وہ یہ ہی کریں گے کہ مجھے ہلاک کر دیں گے۔"

"ہاں۔ اس بات کے امکانات تو ہیں۔"

"یہی وجہ ہے کہ میں ان کاغذات کو واپس نہیں کرنا چاہتا ورنہ مجھے ان سے ذرہ برابر دلچسپی نہیں ہے۔ یوں سمجھ لو کہ میں نے ایک سانپ کا سر پکڑ رکھا ہے اگر میں نے سانپ کا سر چھوڑا تو وہ پلٹ کر مجھے ڈس لے گا۔"

"کیا وہ کاغذات میں بھی دیکھ سکتا ہوں؟"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں کسی بھی قیمت پر سانپ کی گرفت ڈھیلی نہیں کروں گا؟"

"اچھا۔"

"نہیں۔ اپنے لہجے میں یہ کیفیت پیدا نہ کرو۔ میرے موقف کو سمجھو۔ ان کاغذات کو کسی بھی شکل میں منظر عام پر لانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے علم میں آ جاویں۔ وہ اسی طرح میری نگرانی کر رہے ہیں۔"

"ہوں۔ بات واقعی سنسنی خیز ہے۔"

"اس سارے معاملے کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ میری کچھ مدد کر سکو گے؟"

"پولیس کی مدد لینا چاہو گے؟"

"یار دیکھو ٹالنے والی بات مت کرو۔ پولیس روایتی طریقے اپنے فرائض سرانجام دیتی ہے بھلا اسے کیا پڑی ہے کہ وہ سنجیدگی سے میرے اس مسئلہ پر کام کرے میں مارا جاؤں گا۔"

"ہوں...... اچھا...... اوہو...... اوہو۔" اچانک ہی شاہ میر کے منہ سے نکلا اور ہاشم درانی اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"خیریت۔ کیا بات ہے؟ کوئی کلیو ملا ہے کیا شمیان ہوہو کے بارے میں۔"

"نہیں شمیان ہوہو کے بارے میں تو کوئی کلیو نہیں ملا لیکن ایک شخص یاد آ گیا ہے۔ تمہارا کام بن گیا ہے۔ بے فکر ہو جاؤ۔" شاہ میر نے کہا اور ہاشم درانی غور سے اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔

"شاہ میر! دیکھو زندگی میں بہت کم میں نے دوسرے پر انحصار کیا ہے۔ ہر طرح کی مشکلات اور

تکلیفیں خود ہی جھیلتا رہا ہوں۔ یہ معاملہ میری زندگی اور موت کا ہے۔ اس بات پر میں بھی ہر مسلمان کی طرح عقیدہ رکھتا ہوں کہ موت آئی تو کوئی روکنے والا نہیں ہو گا لیکن پھر بھی انسان اپنے طور پر ایسی کسی موت سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ معاملہ اتنا غیر سنجیدہ نہیں ہے کم از کم میرے لیے۔"

"او بھائی تو کون یہ کہہ رہا ہے تم سے کہ وہ غیر سنجیدہ ہے۔ ایک کردار میرے ذہن میں آیا تھا جس پر مجھے بہت اعتماد ہے۔ میں اس بات پر چونکا تھا۔ تم نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ میں کوئی مسخرہ پن کر رہا ہوں۔ میں ایک ذمے دار شخص ہوں اور مسخرے پن سے ملکوں کے داخلی معاملات نہیں چلتے۔ نہ جانے کیوں تم نے اس انداز میں سوچا۔" شاہ میر کا لہجہ بہ دستور ناخوشگوار تھا۔

"میرا مطلب یہ نہیں ہے؟"

"میں نے تم سے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل ٹھیک کہا ہے۔ بے فکر ہو جاؤ۔ ایک شخص کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں بہت جلد وہ تمہارے پاس پہنچ جائے گا اس وقت تک تم اپنے آپ کو محفوظ رکھو۔"

"ٹھیک ہے...... اوکے...... اوکے۔" ہاشم درانی نے کہا۔ شاہ میر نے بھی اپنا رویہ تبدیل کر لیا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم ذہنی طور پر الجھے ہوئے اور پریشان ہو لیکن فکر مت کرو ایک انتہائی پر اعتماد شخصیت تمہارے پاس پہنچے گی تمہیں اس پر بھروسا کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ واقعی تم نے یہ بات تو بالکل ٹھیک کہی کہ مسخرے پن سے ملکوں کے داخلی معاملات نہیں چلتے۔ اس بات پر میں تم سے اتفاق کرتا ہوں اور میرا خیال ہے تم برا مان گئے میری بات کا۔ برا نہ مانو دوست! بس یہ سمجھ لو کہ ذہنی طور پر اتنا ہی الجھا ہوا ہوں کہ دل چاہتا ہے کہ کوئی میرا ساتھی بن جائے۔" شاہ میر نے اسے بڑی تسلیاں دی تھیں۔

♥......♥......♥

صبح ساڑھے سات بجے تھے ویسے تو صوفی بھی جلدی اٹھ جایا کرتا تھا لیکن حسینہ کی وجہ سے وہ جاگنے کے باوجود بستر میں پڑا رہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ حسینہ کو اس کی وجہ سے صبح ہی صبح تکلیف ہو۔ ویسے بھی وہ دیر تک سونے کی عادی تھی لیکن صوفی کی وجہ سے جلدی جاگ جاتی تھی اور ناشتہ بناتے ہوئے بک بک جھک جھک کرتی رہتی تھی۔ چنانچہ اس وقت بھی وہ بستر میں اینٹھ رہی تھی کہ دروازے کی بیل بج اٹھی اور حسینہ اچھل کر بیٹھ گئی۔

"یہ صبح ہی صبح کون آن مرا۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے انداز میں کہا۔ بیل دوسری اور تیسری بار بجی تو حسینہ زور سے چیخی۔

"آخری وقت آ گیا ہے کیا۔ موت پیچھے لگی ہوئی ہے۔ موت پڑے! ذرا صبر تو کر آ رہی ہوں۔" صوفی نے بھی یہ آوازیں سنی تھیں لیکن منتظر تھا کہ حسینہ کی چیخ دھاڑ کا کیا نتیجہ نکلتا ہے اور کون نازل ہوتا ہے۔ ادھر حسینہ گیٹ پر پہنچ گئی تھی اور پھر اس کا پارہ آسمان کو پہنچ گیا کیونکہ جو شکل اسے نظر آئی تھی وہ معشوق نشیلے کی تھی۔

"اللہ توبہ...... اللہ توبہ...... ہائے یہ کیا ہو گیا۔ ارے کس کی شکل دیکھ لی میں نے صبح ہی صبح اے موذی تجھے کہیں اور رزق موت نہیں ہے یہاں کیوں آ مرا؟"

''اس وقت منہ نہ لگو حسینہ بیگم۔ موڈ ٹھیک نہیں ہے میرا۔'' معشوق نشیلے نے سنجیدگی سے کہا۔

''تجھے ڈھائی گھڑی کا ہیضہ آئے تیرا موڈ ٹھیک نہیں ہے تو یہاں کیوں آ مرا؟''

''تمہارے باپ کا گھر ہے یہ کیا۔ جب دیکھو بدتمیزی کرتی رہتی ہو۔''

''تیرے باپ کا ہے؟'' حسینہ نے کہا۔

''بابا ہٹ جاؤ سامنے سے صوفی صاحب سے ملنے آیا ہوں۔ بات کرنی پڑے گی تمہارے سلسلے میں ورنہ میں ہوں ذرا بگڑے دماغ کا آدمی۔''

''تو آدمی ہے ہی کب۔ خبر کرتی ہوں ابھی سو رہے ہوں گے۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ صوفی صاحب کو تم چار دن سے جانتی ہو ہم ان کے ہمیشہ کے شناسا ہیں۔ صبح جلدی اٹھنے کے عادی ہیں۔''

''ارے اب تیرے منہ کیا لگوں۔ آ مر اندر آ جا۔'' معشوق نشیلے اندر داخل ہو گئے۔ صوفی یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ بہر حال کچھ دیر کے بعد معشوق نشیلے اس کے پاس پہنچ گئے۔

''اتنی صبح واقعی کیسے آنا ہوا؟''

''مرشد! بس یوں سمجھ لیجیے کہ زندگی آپ کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے۔''

''درویش رحم کریں ہمارے ہاتھ تو خالی ہیں۔''

''نہیں مرشد! آپ کے ہاتھ خالی نہیں ہیں۔ آپ کی ولایت کو پہنچ گیا ہوں میں۔''

''اماں! کیا بک رہے ہو۔ ہم ولایت میں کہاں ہم تو اپنے وطن میں ہی ہیں۔''

''نہیں سرکار عالی! بس رات کو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا ہے۔''

''تاڑی پی تھی کیا صبح ہی صبح۔'' صوفی نے پریشان لہجے میں کہا۔

''کچھ نہیں پیا۔ پیر گگن شاہ نے آپ کے نام ایک پیغام بھیجا ہے۔''

''پیر گگ...... گگ...... گگ۔'' صوفی اچھل کر بیٹھ گیا۔

''بہ خدا آپ جانتے ہیں کہ پیر گگن شاہ کے نام سے کوئی جھوٹی روایت منسوب کرتا ہے تو چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر کوڑھی ہو جاتا ہے۔''

''اسی لیے تو کہہ رہے ہیں کہ پیر گگن شاہ کا نام لے کر تم کیا کہہ رہے ہو۔''

''خواب نہیں تھا۔ صوفی صاحب خواب نہیں تھا۔ جاگ رہا تھا۔ بالکل جاگ رہا تھا کہ آنکھوں میں دھواں سا بھر گیا اور اس دھوئیں میں مرد خدا کی تصویر نظر آئی۔ کہنے لگا کہ معشوق نشیلے کہاں مارے مارے پھر رہے ہو۔ تمہارے سامنے ایک اتنی عظیم شخصیت موجود ہے اور تم نجات کے راستے نہ جانے کہاں کہاں تلاش کرتے پھر رہے ہو۔ جاؤ صوفی کے قدموں میں اپنے آپ کو پہنچا دو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اماں نہیں واللہ۔'' صوفی اچھل کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر عقیدت کے نقوش نظر آ رہے تھے۔ حسینہ ابھی تک دروازے سے باہر نہیں گئی تھی دونوں کی باتیں سن رہی تھی اور انہیں دیکھ رہی تھی جلبلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''جھاڑو پھرے دونوں ہی باولے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ واپس مڑی تو صوفی نے جلدی سے آواز دی۔

''اب جاگ ہی گئی ہیں حسینہ بیگم! تو ذرا اچھا سا ناشتہ بنا دیجیے۔۔ یہ معشوق نشیلے بھی ہمارے ساتھ ہی ناشتہ کریں گے۔''

''گوبر میں زہر ملا کر لے آؤں۔ چائے کے ساتھ کھا لینا دونوں کے دونوں۔ خود بھی دنیا کے جھگڑوں سے بچو گے اور دوسروں پر بھی رحم کر جاؤ گے۔'' حسینہ بیگم نے کہا اور بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ صوفی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور معشوق نشیلے کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''ہاں۔ آگے کہو۔''

''آگے کیا کہوں صوفی صاحب؟ پہلے یہ بتائیے کہ اس عورت سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟''

''ار...... رر...... رشتہ ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ بس کرنل صاحب نے ہمیں یہ تحفہ عنایت فرمایا ہے۔''

''تب پھر تم ایسا کرو کہ کرنل صاحب پر شہد کی مکھیاں چھوڑ دو۔'' معشوق نشیلے نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''آخر کیوں؟''

''اماں صوفی صاحب! یہ کالی مرچ گھروں میں رکھنے کے قابل ہے۔ صبح ہی صبح منہ دیکھ لو تو دن بھر روٹی نہ ملے۔ نخرے ایسے جیسے آکاش سے اتری ہوئی اپسرا ہو۔ جب یہاں آؤ یوں سمجھ لو کہ گالی گفتاریوں سے ہی بات کرتی ہے آخر سمجھتی کیا ہے یہ اپنے آپ کو۔''

''چھوڑو گگن شاہ کا بتاؤ۔''

''وہی بتانے جا رہے تھے کہ یہ کم بخت گلے میں اٹک گئی۔ صوفی صاحب کہیں کچھ ہو نہ جائے۔ آپ ہمیں پھر دوش نہ دیجیے گا۔ بہر حال گگن شاہ صاحب نے ہم سے کہا کہ معشوق نشیلے دنیا میں بھٹکتا پھر رہا ہے نجات کی تلاش میں جا۔ صوفی کی شاگردی اختیار کر لے وہ جو کہے وہ کرتا رہ خبردار اس کا دامن مت چھوڑنا ورنہ نقصان اٹھائے گا۔''

''دد...... دد...... دامن۔'' صوفی نے جلدی سے اپنی قمیص کا دامن پکڑ لیا۔

''اب کتنا ہی اجتناب کریں ہم در دولت نہیں چھوڑنے کے صوفی صاحب۔''

''یعنی یہیں رہو گے؟''

''سڑک کے کتے کی طرح پڑے رہیں گے۔ یہ آپ کے در سے جائیں گے نہیں۔''

''وہ تو ٹھ...... ٹھیک ہے لیکن۔''

''بس صوفی صاحب...... بس کچھ نہ کہیے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی۔'' صوفی گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا تھا۔ گگن شاہ سے اسے بڑی عقیدت تھی۔ ان کا نام بھی وضو کر کے لیا کرتا تھا۔ بہر حال گگن شاہ کا حوالہ دیا گیا تھا۔ کیا کہتا کیا نہ کہتا۔ معشوق نشیلے کو پتا نہیں کیا سوجھی تھی۔ بہر حال اس کے بعد حسینہ نے ناشتہ لگا دیا اور دونوں گگن شاہ کی باتیں کرتے رہے پھر تھوڑی دیر کے بعد صوفی کو کرنل رحیم شاہ کا فون موصول ہوا۔

''صوفی صاحب جاگ گئے تھے۔''

''دو......دو......درویشوں کے کرم سے۔''

''ناشتہ وغیرہ کرلیا۔''

''جی ہاں۔''

''آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔''

''فرمایئے۔''

''گرین ہاؤس آ جایئے۔''

''آ رہا ہوں۔'' صوفی نے کہا اور فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ معشوق نشیلے نے کہا۔

''کہاں چلے صوفی صاحب۔ یہاں اگر آپ ہمیں چھوڑ جائیں گے تو یوں سمجھ لیجیے کہ کہیں ہمارے ہاتھ سے کوئی خون نہ ہو جائے۔''

''جذباتی نہ ہوں آیئے ہمارے ساتھ۔'' صوفی نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ موٹر سائیکل پر معشوق نشیلے کے ساتھ گرین ہاؤس جا رہا تھا۔ دونوں دیکھنے کی چیز لگ رہے تھے۔ بہت لوگوں نے رک رک کر انہیں دیکھا تھا۔

''بہر حال کرنل رحیم شاہ نے کسی خاص کام سے ہی طلب کیا ہوگا۔ صوفی سوچ رہا تھا اور واقعی کام خاص ہی تھا۔ ایک نئی اور دلچسپ مہم کا آغاز۔

معشوق نشیلے موٹر سائیکل پر اسی طرح بیٹھے تھے جیسے کوئی شہ سوار گھوڑے کی سواری کر رہا ہو۔ صولی مخصوص سج دھج میں تھا۔ یہاں تک کہ دونوں گرین ہاؤس پہنچ گئے اور پھر موٹر سائیکل گرین ہاؤس میں پارک کر دی گئی۔ اس وقت صرف دلاور کا خاندان اور خود دلاور یہاں موجود تھا۔ صوفی نے دلاور سے کہا۔

''عزیزی یہ معزز مہمان ہیں، انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ کرنل صاحب کہاں ہیں؟''

''لائبریری میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں صوفی صاحب۔''

''آپ یہاں تشریف رکھیے معشوق صاحب۔ میں ذرا کسی سے مل کر آتا ہوں۔'' معشوق نشیلے کو بات معلوم نہیں تھی کہ یہ بھی صوفی کا کوئی اور گھر ہے، وہ یہی سمجھا تھا کہ صوفی کسی سے ملنے آیا ہے۔ خود تو بے کا آدمی تھا۔ پیچھے لگا چلا آیا تھا۔ بہر حال صوفی تو اندر چلا گیا۔ دلاور اور معشوق نشیلے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔

''سبحان اللہ کیا خوب صورت گھر ہے۔ آپ شاید یہاں ملازم ہیں۔''

''جی نوکر ہوں۔''

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر کیا نام ہے آپ کا۔''

''دلاور۔''

''ارے واہ...... فارسہ جانتے ہیں آپ؟''

''جی؟''

''زبان ہے ایک۔''

''فارسی کے بارے میں تو جانتا ہوں، فارسہ کا لفظ پہلی بار سنا ہے۔''

''بس یہی تو جدت ہے۔ اس جدت پر ایک شعر عرض ہے۔

گناہ چم گناہ چم در گناہ چم

بد سو مشکل بہر سو چم چما چم

''جی۔'' دلاور نے بھنویں سکیڑ کر کہا اور کچھ لمحے کے بعد غلام قادر بھی اندر پہنچ گیا۔ اس نے معشوق نشیلے عالم کو تمسخرانہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔ پھر وہ دلاور سے بولا۔

''اڑے ماں قسم کتنے میں لیانی اچھا ہے۔'' یہ سوال معشوق نشیلے کے بارے میں ہی کیا گیا تھا۔ دلاور کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔

''صوفی صاحب کے ساتھ آئے ہیں۔ ان کے مہمان ہیں۔''

''اڑے ہاں باہر میں نے صوفی کا موٹر سائیکل دیکھا پڑ یہ مہمان اوہ ہو۔ ہو۔ صوفی صاحب نے اپنی نسل کا کوئی پیس منگوایا ہوگا ڑے۔ ابی سلاں ویلکم کم بھائی صاحب۔''

''یہ افریقہ سے کب آئے۔'' معشوق نشیلے نے دلاور سے کہا۔

''اڑے ماں قسم انٹی فنٹی افریقہ کا ابی میں غلام قادر ہوں آپ کا نام۔'' غلام قادر نے کہا۔

''فدوی کو معشوق نشیلے کہتے ہیں۔''

''اڑے آپ کو کیا کہتے ہیں فدوی کی بات چھوڑو۔''

''میرا مطلب ہے میں اپنی ہی بات کر رہا ہوں۔''

''پھر یہ فدوی کون ہے؟''

''آپ کی حسین اردو بتا رہی ہے کہ فدوی آپ کی سمجھ میں نہیں آ سکیں گے۔''

''اڑے یار تو پر...... سئی کا بات بولونی۔ یہ پدوی اور فدوا کیا ہوتا ہے؟''

''فدوی اور فدوا، بکشم ناز بردم چونا، چونا۔''

''وی او کتا کتا کدرا سے توڑا سا اس میں تمبا کو کو بی مارو۔'' غلام قادر نے اپنی طرف سے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

''شاعری کا مذاق اڑا رہے ہیں آپ۔''

''نئی ڑے اپن خود بھی شاعر اے۔''

''اچھا کیا کہتے۔''

''ابی کچھ نئی کہتے یار۔ تیرے کو بتاتے ہیں کہ اپنی بی شاعر ہے۔ شعر ماروں۔''

''مم...... مم...... مار پیٹ مناسب نہیں ہوتی۔''

''وئی ہمارا مطلب ہے یار ابی تم نے کیا میرے کو شعر سنایا۔''

''فارسہ میں تھا۔''

"اوہ۔ نکال کر باہر رکھو فارسہ سے ابی یہ میرا شعر سنو! وائی خدا قسم سیاں نے انگلی مروڑا اے، خدا کا قسم میں شرما گیا تم سناؤ، تم سناؤ۔"

"میں تو فارسہ ہی میں سنا سکتا ہوں۔"

"اڑے بابا فارسہ سے نکال کر سناؤ" دلاور ہنس رہا تھا پھر دونوں کے درمیان شاعری شروع ہوگئی۔ غلام قادر اپنی مخصوص اردو میں معشوق نشیلے صاحب کو شعر سنا رہا تھا اور معشوق صاحب ایسے ایسے انوکھے شعر ہانک رہے تھے جو شاید کسی کی سمجھ میں کبھی نہ آسکیں۔ غلام قادر بہ دستور ان کا مذاق اڑا رہا تھا پھر شازیہ بھی آگئی اور جیسے ہی شازیہ اندر داخل ہوئی۔ معشوق نشیلے اٹھ کھڑے ہوئے اور لکھنوی انداز میں اسے سلام کرتے ہوئے بولے۔

"آداب پیش کرتے ہیں آداب پیش کرتا ہوں۔"

"اڑے سیدھا بیٹھو۔ کھوتے کا بچے ابی جو کچھ پیش کرے گا اس کو دیکھ کر تم زیر ہو جائے گا۔ شازیہ کے منہ سے قہقہہ نکل گیا اس نے دلاور کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔

"صوفی صاحب کے ساتھ آئے ہیں، شاعر ہیں۔"

"یہ خدا آپ ہمیں کچھ غنیمت معلوم ہوتی ہیں۔ اس مناسبت سے ہم اگر آپ کو غنیمت کہیں تو کیا آپ ناپسند فرمائیں گی۔"

"سوچ لیجیے۔ خاموشی ہی غنیمت ہے ورنہ میں اسپتال سے بھاگ کر آرہی ہوں۔" شازیہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"اسپتال سے، خیریت دشمنوں کی نگاہوں سے دور کیا کچھ طبیعت ناساز ہوگئی تھی۔"

"جی نہیں دماغی اسپتال کی بات کر رہی ہوں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ میں پاگل ہوں۔"

"پپ...... پپ...... پاگل۔" معشوق نشیلے کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ بچپن ہی سے اسے پاگلوں سے شدید خوف محسوس ہوتا تھا۔ اصل میں ایک پاگل نے پتھر مار کر اس کا سر پھاڑ دیا تھا۔ بس جب سے پاگل کے لفظ سے ہی اسے سخت وحشت ہوتی تھی۔ اس نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور بولا۔

"اب تو کوئی شعر بھی یاد نہیں آئے گا۔ وہ ذرا صوفی صاحب کو اطلاع کر دیجیے ہم کچھ حاجت محسوس کر رہے ہیں۔ ہم وہاں جاتے ہیں۔ آپ ذرا صوفی کو بتا دیجیے کہ معشوق نشیلے بور ہوگئے ہیں۔ انہیں تسلی عطا فرمائیے۔ وہ واش روم۔"

"آیئے۔ آیئے۔" دلاور نے کہا اور معشوق نشیلے کو لے کر واش روم کی طرف چل پڑے۔ شازیہ ایک دم چل پڑی تھی۔

"غلام قادر یہ ہے کیا چیز۔"

"بس اس سے اندازہ لگا لیجیے کہ صوفی صاحب لائے ہیں۔" غلام قادر نے جواب دیا اور شازیہ دوبارہ ہنس پڑی۔

♥......♥......♥
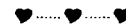
کرنل رحیم شاہ سے پوری تفصیل معلوم کرنے کے بعد صوفی سر ہلانے لگا۔

"دلچسپ صورت حال ہے میرا خیال ہے لطف آئے گا۔"

"آپ کی پسند کا کیس ہے۔"

"جانا کہاں ہوگا۔" صوفی نے سوال کیا۔

"سراج پور۔ ہاشم درانی بہرحال ایک بہترین شخصیت ہیں۔"

"سراج پور۔" صوفی انگلیوں پر کوئی حساب لگانے لگا۔ پھر بولا۔

"سمجھ گیا درویشوں کی دعاؤں سے، اکیلا جانا ہے۔"

"یہ سوال آپ مجھ سے کر رہے ہیں صوفی صاحب۔ بھئی آپ کی مرضی ہے۔ دیکھیے اور ایک بات خاص طور سے کہوں گا۔ ذرا سوچ سمجھ کر۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ اس طرح سے آپ مطمئن رہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔ ویسے ٹیم تو ہماری جائے گی لیکن خفیہ طور پر تا کہ بہ وقتِ ضرورت ہماری مدد کر سکے البتہ ایک مسئلہ ٹیڑھا ہے۔"

"وہ کیا؟" کرنل رحیم شاہ نے سوال کیا تو صوفی بے اختیار مسکرانے لگا۔ کرنل رحیم بھی مسکرایا تو انہوں نے کہا۔

"یقیناً کوئی اتنی ہی اہم بات ہوگی کہ آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔"

"آپ نے ہمیں حسینہ عنایت فرمائی ہے۔"

"ارے...... وہ، ہاں۔ بس یوں سمجھ لیجیے صوفی صاحب آپ کی تفریح طبع کے لیے، زبان کی بری ہے مگر دل کی بہت اچھی عورت ہے۔ اگر آپ اسے ہینڈل کر گئے تو آپ کے لیے جان بھی دے سکتی ہے۔"

"بھلا ایسی معصوم اور ننھی سی جان کا ہمیں کیا کرنا ہے کرنل صاحب درویشوں کی دعاؤں سے، لیکن ہماری جو عزت افزائی کرتی ہے وہ بے مثال ہے بہرحال آپ کا تحفہ ہے ہمیں کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ ہم نے اس کے لیے ایک تریاق دریافت کر لیا ہے۔"

"تریاق......؟"

"جی ہاں۔ نام ہے معشوق نشیلے۔ فارسی کے بجائے فارسہ میں شاعری کرتے ہیں اور جب شاعری فارسہ میں ہو تو اس قدر آزاد ہوتی ہے کہ آپ شرم سے نظریں جھکا لیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔"

کرنل رحیم شاہ بے اختیار ہنس پڑا تھا۔ اس نے کہا۔

"تب تو دیکھنے دکھانے کی چیز ہوگی۔"

"جی ہاں۔ دیکھنے کی بھی اور دکھانے کی بھی۔ کسی وقت اس کی نمائش کریں گے، ویسے ہم ان دونوں ہی کو ساتھ لے جا رہے ہیں۔"

"کک...... کک...... کیا......؟" کرنل رحیم شاہ اچھل پڑا۔

"جی ہاں۔ ذرا تھوڑی سی دل لگی رہے گی۔ دل لگانے کے لیے دل لگی رہنا تو بہت ضروری ہے ناں......؟"

''آپ جیسا مناسب سمجھیں۔ ویسے ہاشم درانی کو بھی مزہ آ جائے گا۔ میں نے اس سے کہہ بھی دیا ہے کہ ذرا خیال رکھے۔''

''جی۔ جی۔ ہمیں بہ ذریعہ ٹرین ہی روانہ ہونا ہے، کیونکہ ان دونوں کو بھی لے جانا ہے۔''

''جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ صوفی صاحب آپ کے کسی مسئلے میں، میں نے تو ٹانگ اڑائی ہی نہیں ہے۔'' اس کے بعد صوفی دو دن تک تیاری کرتا رہا تھا۔ استاد معشوق نشیلے صاحب بھی بے مثال شخصیت کے مالک تھے۔ کیونکہ صوفی کی نئی کوٹھی ہی میں آ گئے تھے۔ صوفی نے ایک کمرہ انہیں دے دیا تھا۔ اسی میں قیام تھا۔ حسینہ کی اور معشوق صاحب کی ایسی چلتی تھی کہ صوفی کو کانوں کو ہاتھ لگانے پڑتے تھے۔ ویسے صوفی نے معشوق نشیلے صاحب سے کہہ دیا تھا۔

''دیکھیے استاد ایک بات ہم آپ سے عرض کر دیں۔ حسینہ بیگم ہمارے ایک بہت ہی معزز کرم فرما کے لیے ایک محترم ہستی ہیں۔ انہیں بھی ملازمہ نہ سمجھیے گا۔ عزت اور احترام سے بات کیجیے باقی جہاں تک ان کے اور آپ کے معاملات کا تعلق ہے تو بس اس قدر زچ نہ فرمایئے انہیں کہ ہاتھا پائی پر اتر آئیں۔ وہ ہمیں پسند نہ ہوگی۔''

''ارے جناب! صوفی صاحب! اتنی کرم فرمائیاں کی ہیں آپ نے کہ بھلا آپ کے کسی حکم سے سرتابی کی مجال کر سکتے ہیں؟'' ویسے وہ محترمہ سلور جوبلی ہمارے دل میں اترتی جا رہی ہیں۔''

''آپ جانے اور آپ کا دل۔ ہم تو صرف یہی کہیں گے آپ سے کہ درویش آپ پر رحم کریں۔

پھر صوفی نے ان دونوں کو سفر پر جانے کی اطلاع دی تھی۔ حسینہ کو جب اس نے بتایا کہ اسے اس کے ساتھ چلنا ہے تو حسینہ نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔

''آخر خدا نے تمہارے دل میں ڈال ہی دی ناں۔''

''کک...... کک...... کیا؟''

''ہماری محبت۔''

''لل......لل...... لاحول ولاقوۃ۔ درویشوں کی دعاؤں سے بھلا آپ سے بھی کوئی محبت کر سکتا ہے حسینہ عالم۔''

''چھوڑو آنکھیں کچھ اور کہہ رہی ہیں زبان کچھ اور یہ دورخی نہیں چلے گی میاں ہمارے ساتھ۔''

''بک...... بکواس بند کیجیے۔ آپ نے آخر مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟ کوّے پالنے کا شوق نہیں ہے مجھے محترمہ۔''

''کوّے......؟''

''جی ہاں کوی کہہ لیجیے۔''

''مجھے کوی کہہ رہے ہو......؟''

اور کسی دیوار کو کہوں گا۔

''واہ!...... جس طرح فارسی کو ہم نے فارسہ کیا، صوفی صاحب اس طرح آپ نے کوّے کو کوی

کر دیا۔ ویسے اگر یہ لقب آپ نے ان محترمہ کو دیا ہے تو آپ یقین کیجیے کہ آپ پر ہزار بار قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔''

''اے مری کے لیے تیری قربانی تو میں کر دوں گی...... میں کہتی ہوں کہ آخر آپ اسے لائے کیوں ہیں صوفی صاحب! کمبخت کو میرے ہی ہاتھوں مروانا ہے۔''

''آپ لوگ فضول باتوں سے پرہیز فرمائیں درویشوں کی دعاؤں سے۔ آپ دونوں کو میرے ساتھ چلنا ہے۔''

''لو اسے بھی چلنا ہے پھر کیا خاک مزہ آئے گا ہنی مون میں۔''

''جج...... جج...... جی۔'' صوفی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پھر اچانک ہی اس نے لہجہ سخت کر لیا۔ پھر بولا۔

''دیکھو حسینہ یہ کرنل صاحب کا حکم ہے کہ تمہیں ساتھ لے جاؤں۔''

''اور اس کے لیے کس کا حکم ہے۔'' حسینہ نے معشوق نشیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کو اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔ آپ میری بات سمجھ لیجیے۔ آپ دونوں کو جس جگہ ہم لے جا رہے ہیں وہاں اعتدال میں رہنا ہے۔ اگر کوئی بے تکی حرکت کی تو سمجھ لیجیے کہ آپ دونوں کی وہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوگی۔''

''اف میرے مولا! کوئی خطرناک جگہ ہے کیا......؟''

''تیاریاں کیجیے اور بکواس سے گریز کیجیے گا۔''

''آئے ہائے اتنی دیر سے احترام کر رہی ہوں اس خیال سے کہ سیر کرانے لے جا رہا ہے۔ دھمکیوں پر دھمکیاں دیے جا رہا ہے کر لے بات کرنل سے میں کسی کا دیا نہیں کھاتی۔ محنت کا کھاتی ہوں۔''

''ماشاء اللہ کیا محنت کرتی ہیں آپ زبان چلانے میں، کتنی محنت کرنا پڑتی ہے یہ کوئی ہمارے دل سے پوچھے۔'' معشوق نشیلے کی زبان کھجلائی۔

''بس تیری تو میں......'' حسینہ نے جھک کر پاؤں کی جوتی اٹھائی اور معشوق نشیلے باہر نکل بھاگے۔ حسینہ ان کے پیچھے پیچھے باہر نکل گئی تھی صوفی نے چھت کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

''در...... در...... درویش رحم کریں۔''

♥......♥......♥

ہاشم درانی کے دونوں بھتیجے حسن اور نصرت ریلوے اسٹیشن پر ٹرین کی آمد کے منتظر تھے۔ ان دونوں کو مختصر طور پر جو تفصیل بتائی گئی تھی۔ ہاشم درانی نے کہا تھا۔

''میں جس کام کے لیے گیا تھا۔ شاہ میر صاحب نے مجھ سے تعاون کرتے ہوئے کسی خاص شخص کو مخصوص کیا ہے۔ میرا خیال ہے وہ سیکرٹ سروس کا کوئی آدمی تھا۔ ہوم سیکرٹ سروس میں ایسے ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔

بہر حال یقینی طور پر کوئی بڑی پرسنلٹی ہوگی، تم لوگ بڑے عزت واحترام کے ساتھ انہیں یہاں تک

لے آنا۔ دونوں راستے میں باتیں کرتے آئے تھے۔

''یار اس طرح کی شخصیتوں کے بارے میں فلمیں وغیرہ تو دیکھی ہیں۔ کبھی بہ ذات خود واسطہ نہیں پڑا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی اعلیٰ ہی پائے کی چیز ہوگی۔ اسمارٹ، شان دار دیکھنے دکھانے سے تعلق رکھنے والی۔'' یہ باتیں کرتے ہوئے وہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تھے اور اب ٹرین کی آمد کے منتظر تھے۔ یہ دونوں جوان خوش شکل، اسمارٹ اور تعلیم یافتہ تھے اور دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے بے تکلف تھے۔

''ٹرین کچھ لیٹ ہوگئی ہے شاید۔'' حسن نے کہا۔

''ہاں۔ وقت تو ہو چکا ہے ٹرینیں وقت پر پہنچتی ہی کہاں ہیں؟''

''میں تو اس آدمی کے بارے میں سوچ رہا ہوں تمہیں مشن امپوسیبل یاد ہے۔''

وہ فلم تھی یار، میرا خیال ہے اس قسم کا آدمی کوئی چڑچڑا اور بد دماغ سا شخص تھا۔ سڑیل قسم کا بھی۔''

''مگر حالات واقعات بڑے سنسنی خیز ہیں چچا میاں جتنے پریشان ہیں تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے۔''

''میں تم سے اتفاق نہیں کرتا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ چچا جان نے اتنی دولت کیسے کمالی۔ ایسے لوگوں کو تو بہت اسمارٹ ہونا چاہیے۔ کوئی تک بھی ہے آخر۔ گھر میں بلیاں روئیں تو گھر میں کوئی نہ کوئی آفت ضرور آئے گی، الو کی آواز سن کر دم نکل جائے گا، اگر کھانا کھاتے وقت کسی نے پلیٹ میں چھری اور کانٹے کو کراس کر کے رکھ دیا تو بدشگونی، صبح ہی صبح اگر کوئی کانا آدمی نظر آ جائے تو مصیبت، کہیں جاتے ہوئے بلی راستہ کاٹ جائے تو واپسی۔''

''ہاں۔ یہ واقعی تعجب کی بات ہے۔ انکل درانی پڑھے لکھے آدمی ہیں۔''

''بس پرانے زمانے کی تعلیم میں بھی یہ سب کچھ سکھایا جاتا ہوگا۔''

''مگر وہ پرانے ہیں کہاں۔ سوائے پرانے خیالات کے۔''

''یہ ہی سہی۔ بہرحال یہ پرانے خیالات ہی پرانے لوگوں سے منتقل ہوتے ہیں۔ تیز قسم کی گھنٹی کی آواز سن کر وہ چونک پڑے۔ یہ ٹرین کی آمد کا اشارہ تھا۔ سراج پور ایک چھوٹا سا پہاڑی اسٹیشن تھا چنانچہ جدید ترین انتظامات تو یہاں تھے نہیں مسافروں کو ہوشیار کرنے کے لیے گھنٹی بجائی جاتی تھی۔ اس وقت بھی پورے پلیٹ فارم پر چند ہی افراد نظر آ رہے تھے۔ ان میں نیلی وردی والے خلاصی بھی تھے جو اتنی شان سے اکڑ اکڑ کر چلتے تھے جیسے وہ اسٹیشن ماسٹر سے بھی کوئی بڑی چیز ہوں کھانا فروخت کرنے والے اپنے جالی دار لکڑی کے صندوق جن کے اندر ایک لالٹین جل رہی تھی۔ مونڈھے سے اٹھا کر کاندھے پر رکھ کر چل پڑے۔ پان بیڑی سگریٹ بیچنے والے لڑکے نے جو اپنے منہ سے طبلہ بجا بجا کر ایک گیت گا رہا تھا اپنی ٹرے اٹھا کر گردن میں لٹکالی۔

ٹرین آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پلیٹ فارم سے لگ گئی اور حسن اور نصرت دونوں گیٹ پر کھڑے ہو گئے تھے۔ ٹرین سے صرف تین افراد نیچے اترے حسن اور نصرت کی نگاہوں نے انہیں دیکھا پھر دوسرے ڈبوں کا طواف کرنے لگے۔ یہ تین تو نہیں ہو سکتے تھے جو ہاشم درانی کے مہمان تھے۔ یہ تو انتہائی فرسودہ قسم کے پرانے طرز کے لوگ تھے۔ دو افراد نے شیروانیاں پہنی ہوئی تھیں۔ ایک کا تو حلیہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ چگی داڑھی، ترکی ٹوپی، پرانی شیروانی، کھلے پائنچوں کا پاجامہ، ہاتھ میں کوئی چیز دبی ہوئی۔ منہ میں پان کی جگالی کرتا ہوا۔

دوسرے نے بھی شیروانی، پاجامہ اور ترکی ٹوپی ہی پہن رکھی تھی۔ یہ بھی اپنی نسل کا اکلوتا ہی لگتا تھا۔ تیسرے ایک خاتون تھیں جنہوں نے سر سے پاؤں تک والا سفید برقعہ پہن رکھا تھا۔ آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے۔ دونوں مردوں نے اٹیچیاں اٹھا رکھی تھیں اور خاتون نے پان دان اٹھایا ہوا تھا جو نقشیں تھا اور شاید تانبے کا بنا ہوا تھا۔

ٹرین یہاں صرف چار پانچ منٹ ہی رکتی تھی۔ ان چار پانچ منٹوں میں حسن اور نصرت ٹرین سے ایک سرے سے دوسرے تک نہیں نظریں دوڑاتے رہے مگر اور کوئی ٹرین سے نہیں اترا تھا۔ ان کی نگاہیں ان تینوں کا طواف کرنے لگیں۔ حسن نے کہا۔

''یہ کیا ہوا......؟''

''پتا نہیں۔''

''کیا وہ لوگ نہیں آئے؟''

''انکل سے بات کریں موبائل پر۔''

''یہ تینوں۔''

''ابے دماغ خراب ہے کیا، یہ کون سی نسل کے بکرے ہیں؟''

''یار مگر پھر بھی۔''

''پھر بھی کیا؟''

''ٹھہرو ایک منٹ میں معلوم کرتا ہوں۔''

''دماغ خراب ہوا ہے نصرت کون آنے والا ہے تمہیں اس بات کا پتا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر انکل کو فون کرنے سے پہلے کم از کم ان لوگوں سے بات ہی کر لی جائے۔''

''جاؤ۔ جاؤ۔ جاؤ کرو۔'' حسن نے منہ بنا کر کہا اور نصرت آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ان تینوں کے نزدیک پہنچ گیا۔

''السلام علیکم۔'' اس نے کہا اور دونوں مرد چونک کر اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ پھر انہوں نے سلام کا جواب بڑے احترام سے دیا اور ان میں سے ایک نے کہا۔

''جی فرمایئے۔''

''آپ لوگ دارالحکومت سے آئے ہیں۔''

''درویشوں کے کرم سے۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''اصل میں ہم بھی یہاں کچھ لوگوں کی تلاش میں آئے ہیں جو دارالحکومت ہی سے آنے والے تھے۔ ہاشم درانی کے مہمان۔''

''بہ خدا ہم ہی ہیں وہ۔'' یہ کہہ کر چگی داڑھی والا دونوں ہاتھ پھیلا کر نصرت کی طرف جھپٹا اور نصرت اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ کچھ جھینپ سا گیا تھا۔

''گلے نہیں ملیں گے عزیزی ہم ہی تمہارے مہمان ہیں۔''

''آپ کو۔''

''جی ہاں۔ ہاشم درانی ہی کی طلبی پر یہاں بھیجا گیا ہے۔''

''اوہ آیئے۔''

''لیجیے یہ تھیلے سنبھال لیجیے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''فارسہ جانتے ہیں آپ۔'' دوسرے صاحب نے سوال کیا۔

''کیا......؟'' نصرت بولا۔ اس دوران حسن بھی صورت حال کا جائزہ لے کر آگے بڑھ آیا تھا۔

''ہم نے عرض کیا آپ فارسہ جانتے ہیں؟''

''فارسہ......؟''

''جی ہاں......؟''

''جی نہیں، میں نہیں جانتا۔''

''مجبوری ہے پھر بھی ایک شعر حاضر ہے۔ کنا، کنم، کنی، کنے کنا کنوں کنام دم''

''دوسرا مصرعہ پیش ہے۔'' اتنی دیر میں حسن قریب آ گیا تھا۔

''کیا بات ہے؟''

''یہی لوگ ہیں۔'' نصرت نے کہا۔

''کیا......؟'' حسن کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''تھیلے نہیں پکڑے آپ نے۔''

''جی نہیں۔ یہ آپ ہی پکڑیئے۔'' دونوں کا موڈ خاصا خراب سا ہو گیا تھا۔ سوچ کر تو کچھ آئے تھے لیکن نکلا کچھ تھا۔ پھر راستے بھر ان کے منہ بنے رہے تھے۔ انہوں نے ان سے باقاعدہ تعارف کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ کار پہاڑی راستوں میں چکراتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی، لیکن جب ان کا شروع کا تاثر ختم ہوا تو دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ صوفی تو بے نیازی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا، لیکن معشوق نشیلے پوری طرح ان کی جانب متوجہ تھے انہیں یوں لگا جیسے یہ دونوں ہنس کر ان کا مذاق اڑا رہے ہوں۔

چنانچہ انہوں نے بھی ایک جوابی قہقہہ لگا ڈالا۔ سب لوگ بے اختیار چونک پڑے تھے۔ حسن نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ایک بار پھر ہنس پڑا۔ اصل میں وہ سوچ رہا تھا کہ خاصی تفریح رہے گی۔ ہاشم صاحب ویسے بھی ایک تند مزاج آدمی تھے۔ ان کی جھلاہٹ قابل دید ہوگی۔ یہ معزز مہمان ان کے لیے بڑے شان دار ثابت ہوں گے اور وہ پاگلوں کی طرح سر پیٹتے پھریں گے ادھر نصرت بھی یہی سوچ رہا تھا کہ ہاشم جھلائے ہوئے ذہن کا مالک ہے اگر اسے کوئی بات دوبارہ دہرانی پڑتی تھی تو ان کا پارہ ہائی ہو جاتا تھا۔

چہ جائیکہ یہ تینوں۔ دفعتاً ہی ایک نسوانی آواز ابھری۔

''اے تیرا بیڑا غرق۔ تجھ سے آرام سے نہیں بیٹھا جاتا۔ چمٹا جا رہا ہے مری کالیا اے تو نے کبھی ماں بہنیں نہیں دیکھیں یہ دوسری مصیبت تھی۔ آواز شٹل کاک سے آئی تھی اور دھکا معشوق کو لگا تھا۔

''اے بی بی آپ درمیان میں آ کیوں بیٹھی ہیں۔ کالی منحوس شکل ایسے ہی موقعوں سے فائدہ [اٹھاتی] ہیں۔ اماں صوفی صاحب اس بھوتنی کو ادھر کنارے پر بٹھا دو، بھیا گاڑی روک لیجیے ذرا سر پر سوار

[ہو] جائے گی کالی چڑیل۔''

''اور تو منحوس مارے غارت ہو جائے خدا کرے، کہیں بھی چین نہیں لینے دیتا، اے تجھے بھی اس [مر]دے کو ساتھ لانے کی پڑی ہوئی تھی۔ میں کہتی ہوں اس کا اچار ڈالے گا یہاں۔

''اس کا ڈال لینا کالی جامن کا۔'' حسن اور نصرت حیرت سے منہ کھولے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ ان کی ہنسی گم ہو گئی تھی جیسے ہی وہ خاموش ہوئے ان کی ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا اور اس کے بعد تو ان سے ہنسی رو کے بغیر رک نہیں رہی تھی اسی طرح ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ گھر پہنچے تھے۔ ناظمہ کو تلاش کر رہے تھے۔ ناظمہ تو نظر نہیں آئی تھی سمیر مل گیا۔ دونوں نے کار سے اترتے ہی چھلانگ لگا دی تھیں اور سمیر کی طرف لپکے تھے۔ سمیر حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

''ناظمہ......ناظمہ کہاں ہے ناظمہ۔'' انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے اگر تم ہنس نہ رہے ہوتے تو میں یہی سمجھتا کہ ناظمہ کو کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ کیا ہوا، کیا ہو گیا بتاؤ تو سہی کچھ۔''

''وہ دیکھو، وہ دیکھو، وہ دیکھو۔'' حسن نے اشارہ کیا۔ صوفی ایک طرف سے اور معشوق نشیلے دوسری طرف سے اتر آئے تھے جبکہ حسینہ بیگم ابھی کار میں ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ صوفی نے انہیں بہ مشکل اتارا تو سمیر حیرت سے بولا۔

''یہ کیا لائے ہو تم؟''

''لاجواب چیزیں اور تین تین خدا کی قسم سراج پور کی کوٹھی میں بہار آ گئی ہے۔''

''بہار......''

''ہاں۔ قہقہوں کی بہار۔''

''اور یہ دونوں کون ہیں۔ ان بہار صاحبہ کے ساتھ۔'' سمیر نے سوال کیا۔

''بہاری۔'' حسن بولا اور ایک بار پھر قہقہے گونجنے لگے۔

''اب سنجیدہ ہو جاؤ اور بتاؤ قصہ کیا ہے؟''

''یار قصہ کیا ہونا تھا۔ یہی وہ مہمان ہیں جو دارالحکومت سے آئے ہیں۔''

''مگر میں نے تو سنا تھا۔ بلکہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی ہم سب بات کر رہے تھے کہ انہیں وزارت داخلہ کی طرف سے بھیجا گیا ہے اور یہ انکل کے معاملات کو دیکھیں گے۔''

''تو پھر......'' حسن نے کہا اور ایک بار پھر ہنس پڑا۔

''نہیں ہنسو نہیں وہ انتظار کر رہے ہیں ان کا۔''

''چلو تو پھر لے کر چلو ان کو ہم تو پھر بعد میں باتیں کر لیں گے بلاوجہ انکل کا غصہ مول لینا پڑے گا۔'' وہ تینوں ان تینوں کے قریب پہنچ گئے۔

''عجب سی بات ہے آپ لوگ وہاں پر جا کر لطیفہ گوئی فرما رہے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے اور ہم یہاں احمقوں کی طرح کھڑے ہوئے ہیں۔''

''نہیں۔ آپ احمقوں کی طرح تو نہیں کھڑے ہوئے احمقوں کے کھڑے رہنے کا تو انداز ذرا تبدیل ہوتا ہے۔ آیئے۔'' نصرت نے کہا اور وہ تینوں چل پڑے پھر وہ انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں پہنچے تھے جہاں ہاشم درانی بیٹھا ہوا انکا انتظار کر رہا تھا اس کے ہاتھ میں اخبار تھا اس نے انہیں دیکھا اور پھر چونک کر حسن نصرت کی طرف دیکھ کر کہا۔

''نہیں آئے۔''

''یہی ہیں۔''

''کیا......؟'' ہاشم درانی نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس طرف دیکھا اور پھر دونوں لڑکوں کی طرف۔ سمیر پیچھے ہی رہ گیا تھا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''یہ انہی سے پوچھ لیجیے۔''

''آپ لوگ دارالحکومت سے آئے ہیں۔''

''درویشوں کی دعاؤں سے مگر آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟''

''نہیں میرا مطلب ہے شاہ میر صاحب سے آپ......''

''جی ہاں ہمیں انہوں نے ہی بھیجا ہے۔'' ہاشم درانی سکتے کے عالم میں کھڑا انہیں گھورتا رہا پھر ایک دم چونک کر بولا۔

''آپ تینوں......تعارف نہیں ہوا آپ کا؟''

''خود بہ خود تو اس دنیا میں کچھ بھی نہیں ہوتا جناب عالی! آپ اگر حکم فرمائیں گے تو ہم اپنا تعارف پیش کر دیں گے......درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''کس کی دعاؤں سے۔''

''دو......دو......درویشوں کی دعاؤں سے جن کا سایہ اس کائنات کے سارے عیب ڈھکے ہوئے ہے۔''

''آپ یہاں کسی مذہبی پروگرام میں تشریف لائے ہیں۔''

''ہر پروگرام میں اگر مذہب کو شامل کر لیا جائے تو برکت ہی برکت ہوتی ہے۔ آپ کبھی قوالیاں نہیں کراتے اپنے گھر میں۔'' ہاشم درانی کا پارہ چڑھ گیا اس نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اب کراؤں گا۔ ذرا بات کر لوں شاہ میر صاحب سے۔'' ہاشم درانی غصیلے لہجے میں باہر نکل گیا تھا۔ صوفی پریشان نگاہوں سے ان سب کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے اپنی چگی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''کچھ عجب رویہ نہیں ان لوگوں کا معقولیت سے خارج درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''ہائے ہائے تیرے درویش ارے اس سے زیادہ اور تمہاری عزت کیا ہو سکتی ہے موئے شکل سے جوکر لگتے ہیں۔''

''اور آپ جوکری۔'' معشوق نشیلے نے کہا۔

''تو تو بس بولا ہی مت کر کوے جیسی آواز ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے کم از کم آواز تو تم سے میل کھاتی ہے۔''

''آیئے آپ لوگ آپ کو رہنے کی جگہ دے دی جائے۔'' حسن نے کہا حالانکہ معزز مہمان کے لیے خوب صورت حویلی کے ایک بغلی حصہ میں ایک بہت اچھا کمرہ منتخب کیا گیا تھا اور اسے ہر طرح سے سجا دیا گیا تھا لیکن ہاشم درانی کا رویہ بھی دیکھ لیا گیا تھا چنانچہ لوگ انہیں حویلی سے باہر نکال کر مہمان خانے میں لے آئے جو ملازموں کے کوارٹروں کے نزدیک تھا اور ایک کمرے میں اپنی دانست میں تینوں کو ہانک دیا۔

♥......♥......♥

ہاشم درانی ایک ادھیڑ عمر کا قوی الجثہ اور پُر رعب چہرے والا آدمی تھا۔ مونچھیں گھنی اور نیچے کی طرف ڈھلکی ہوئی تھیں۔ بار بار اپنے شانوں کو اس طرح جھٹکا دیتا جیسے اسے خدشہ ہو کہ اس کا کوٹ کاندھوں سے ڈھلک کر نیچے آ جائے گا۔ یہ اس کی بہت پرانی عادت تھی۔ کم از کم ہر پانچ منٹ کے بعد اپنے شانوں کو اس طرح ضرور جنبش دیتا تھا۔ وہ شدید غصے کے عالم میں ادھر آیا تھا لیکن ناظمہ نے دور سے اس کی کیفیت کو دیکھ لیا تھا۔ دروازے میں ناظمہ کھڑی ہوئی تھی۔

''کیا بات ہے انکل؟''

''ایسی تیسی۔''

''جی۔''

''شاہ میر یہ مسخرے پن کرے گا مجھے پتا نہیں تھا۔''

''مگر ہوا کیا ہے؟''

''دیکھو تو سہی کون آیا ہے؟''

''وہ شاہ میر صاحب نے جس شخص کو بھیجا تھا۔''

''شخص نہیں اشخاص۔ ایسا لگتا ہے جیسے انہوں نے......انہوں نے۔'' ہاشم درانی کوئی برا سا جملہ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر خاموش ہی ہو گیا۔

''آپ کیوں اتنے الجھے ہوئے ہیں۔''

''میں سوچ رہا تھا کہ اتنا سنجیدہ مسئلہ تھا اور شاہ میر غیر سنجیدہ نہیں تھا۔ اس نے بڑی دل سوزی سے مجھ سے کہا کہ ایک ایسے آدمی کو بھیج رہا ہوں جس سے کام بن جائے گا۔''

''میں دیکھوں کہاں ہیں وہ لوگ۔''

''دیکھ لو بھئی۔ میرا تو دماغ بالکل ہی گھوم کر رہ گیا ہے۔'' ناظمہ ان لوگوں کو دیکھنے چل پڑی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوا تھا یہ کہنے کی بات نہیں ہے۔ ناظمہ بھی ان تینوں کے ساتھ شریک ہو گئی تھی لیکن وہ تھوڑی سنجیدہ تھی۔ اس نے کہا۔

''دیکھو ایک بات میں کہوں جب تک انکل شاہ میر سے بات نہ کر لیں ان کے ساتھ کسی قسم کی کوئی بدتمیزی نہیں ہونی چاہیے۔''

♥......♥......♥

''شکریہ۔''

''ارے تم بھی آ جاؤ۔ تم کیا وہاں کھڑے اونٹ کی طرح جگالی کر رہے ہو۔'' عورت نے بے تکلفی سے صوفی کو دیکھ کر کہا اور صوفی کا منہ ایک دم بند ہو گیا۔ پھر وہ غم غم کرتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ راستے میں اس نے پان منہ میں رکھ لیا تھا اور رابعہ کو کسی بات کا کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ رابعہ نے اندر داخل ہو کر کہا۔

''آپ اپنے شوہر سے بالکل مختلف لگتی ہیں۔ وہ اس قدر بداخلاق آدمی اور آپ۔''

''کیا بتاؤں بہن! بس مقدر پھوٹ گیا جو قسمت میں لکھا ہو پورا ہو کر رہتا ہے۔ چودہ سال ہو گئے گزر کرتے ہوئے۔ ایسے شکی مزاج آدمی کے ساتھ کہ پتا کھڑکے تو پوچھے کیا ہوا۔ کیا مجال کہ اس کی موجودگی میں کوئی پڑوسن بھی اندر آ جائے۔ کیوں آئی...... کیا کہہ رہی تھی۔ جان عذاب میں آ جاتی ہے ہاں۔ بھلا بتاؤ۔''

''آ غم...... آ غم...... آ غم۔'' صوفی کے منہ سے آواز نکلی تو عورت چونک کر بولی۔

''یہ گونگے ہیں۔''

''نہیں۔''

''پھر آ غم...... آ غم کیوں کر رہے ہیں۔''

''نہیں۔ وہ پان کھایا ہوا ہے۔''

''اے خدا کی پناہ پیک سے منہ بھرا ہوا ہوگا۔ میاں...... جاؤ پان تھوک کر آؤ باہر، برا لگتا ہے۔''

''غم غم، غم غم۔'' صوفی نے جواب دیا۔ عورت نے چونکہ کھلے الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ باہر جائے اور پان تھوک کر آئے۔ چنانچہ پان تھوک کر آنا ہی پڑا۔ عورت رابعہ سے کہہ رہی تھی۔

''تو پھر تم بتاؤ کیا میں محلے داروں سے میل و مروت بھی نہ رکھوں تو کس سے رکھوں۔ پورے دنوں سے ہوں۔ کسی وقت اسپتال جانے کی ضرورت پیش آئی تو کون کام آئے گا۔ یہی محلے والے نا۔ کوئی چھوٹے موٹے کام تو آ سکتا ہے۔ غلام علی تو مدرسے چلا جاتا ہے۔ اچھا خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ چائے بناؤں تمہارے لیے۔''

''ارے نہیں نہیں۔ بہت بہت شکریہ۔ اصل میں وہی آپ کے پڑوسیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے آ گئی تھی۔''

''پتا نہیں کیا ہے یہ سب کچھ، مصیبت پڑی بے چاروں پر، برے حال ہو گئے۔ میں نے غلام علی کے ابا سے کہا تھا کہ ذرا مدد کر دو ان کی پتا نہیں بے چارے کس مصیبت کا شکار ہیں۔ مگر بس انہیں تو اللہ ہی عقل دے۔ اب میں تو اس حالت میں جا نہیں سکتی۔ پورے دنوں سے ہوں۔ اب کون بتائے کہ ان مصیبت کے ماروں کا کیا حال ہے، مگر تم ان کے بارے میں اتنی چھان بین کیوں کر رہی ہو تمہارا کوئی رشتہ ناتا ہے ان سے۔''

''نہیں نہیں...... بس میرا تعلق اخبار سے ہے۔ میں ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔''

''ارے...... اخبار میں لڑکیاں بھی کام کرتی ہیں؟''

''ہاں۔ کیوں نہیں ہم دنیا بھر سے رپورٹیں حاصل کرتے رہتے ہیں۔''

''دنیا بھر کی۔'' خاتون آہستہ سے بولیں۔

''ہاں ہاں۔''

''اے بی بی! مجھے بتا سکتی ہو اسامہ کہاں چھپے ہوئے ہیں۔'' عورت نے سوال کیا اور صوفی کے منہ سے ایک پھنکاری نکلی۔

''دو...... درویش...... درویش...... درویش رحم کریں۔''

''میں تو کہوں انہیں کہیں دور بھاگ جانا چاہیے۔ یہ اللہ مارا بش تو پیچھے ہی لگ گیا ہے ان کے۔''

''ہاں۔ اللہ مالک ہے دیکھا جائے گا۔ جو کچھ بھی اللہ کرے گا بہتر کرے گا۔ وہ میں یہ پوچھ رہی تھی کہ وہ لڑکی دردانہ......''

''ہاں ہاں۔ میں نے کہا نا اب میں تو جا نہیں سکتی۔ وہ ابھی واپس بھی نہیں آئیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ کہیں دور چلی گئی ہوں۔''

''لیکن آپ کو ان کے بارے میں کچھ اور معلومات حاصل ہوں تو مجھے بتائیے۔''

''نہیں نہیں۔ مجھ سے ویسے تو بڑے اچھے تعلقات تھے لیکن یہ ساری باتیں میرے پلے نہیں پڑی تھیں۔ بڑا لین دین تھا ہمارا ان کا۔ ابھی کچھ دن پہلے کی بات ہے ایک پیالی چینی منگوائی تھی فوراً بھیج دی انہوں نے واپس ہی نہیں ہوئی۔ ارے تم میرا پہلے ایک کام تو کر دو۔'' خاتون نے کہا۔

''جی فرمائیے۔'' رابعہ نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''حکومت سے کہو کہ چینی ذرا سستی کر دے۔ ابھی تھوڑے دن پہلے تو بڑی مناسب قیمت پر مل رہی تھی۔ غلام علی کے ابا حلوے کے بڑے شوقین ہیں۔ بس ایک دن حلوہ بناؤ تو پندرہ دن چائے نہیں چلتی، مگر کیا کریں۔''

''بہتر...... میں کوشش کروں گی، ان لوگوں سے تو بہت گہرے تعلق ہوں گے آپ کے۔''

''ہاں بھئی غلام علی کے ابا سے چھپ چھپا کر ایک چکر ضرور لگا آتی تھی۔''

''لیکن میں نے سنا ہے کہ دردانہ کا کردار اچھا نہیں تھا۔ گھر میں اس بات پر جھگڑا بھی ہوتا رہتا تھا۔''

''ارے ستیاناس ہو۔ ان لگائی بجھائی کرنے والوں کا۔ میرے آگے بچے نہیں ہیں مگر خدا لگتی کہتی ہوں جو بھی اس کے بارے میں یہ سب کچھ کہتا ہے جھوٹ کہتا ہے۔ خدا ان کے آگے لائے۔'' بیگم صاحبہ جذباتی ہو گئیں۔

''تو کیا آپ کے خیال میں یہ افواہ غلط ہے۔''

''ایسی ویسی غلط۔ ایک دو سال سے نہیں دس بارہ سال سے دیکھ رہی ہوں میری آنکھوں کے سامنے جوان ہوئی ہے بچی اور اس بات سے میں اچھی طرح واقف ہوں کہ اس کا کردار کیسا تھا۔''

''درویش آپ کو خوش رکھیں۔ کسی مرنے والے پر الزامات لگانا تو بہت آسان کام ہے لیکن آپ جو نیکی کر رہی ہیں اس کا صلہ آپ کو ضرور ملے گا درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے بھی اس معاملے میں مداخلت کرنا ضروری سمجھا تھا۔ پھر وہ ان خاتون سے بہت دیر تک معلومات حاصل کرتے رہے تھے اور خاصی

GREEN FORCE
2
گرین فورس
ایم اے راحت

بہر حال صوفی یہاں بے مقصد تو نہیں آیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اب اس کے اندر بھی ایک عجیب و غریب فطرت پیدا ہوگئی تھی اور ایسا اس لڑکی کی موت کے بعد ہوا تھا جس کے بارے میں اب تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ صوفی کے دل کے دروازے پر دستک دینے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

اس وقت رات کا ایک بجا تھا۔ وہ بستر سے اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ چاروں طرف سناٹا تھا لیکن حویلی کے کسی بھی کمرے کی روشنی نہیں بجھائی گئی تھی۔ برآمدے میں رک کر اس نے آڑ لی اور پھر تیر کی طرح اس کمرے کی طرف بڑھا جس میں تیز روشنی ہو رہی تھی۔ یہ بہت بڑا کمرہ تھا اور یہاں کرنل کے خاندان والے اکٹھے تھے۔ ایک حیرت انگیز منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ جتنے افراد موجود تھے سب کے آگے ایک ایک رائفل رکھی ہوئی تھی۔ حسن وغیرہ شدت سے بور نظر آرہے تھے۔ ناظمہ آنکھیں بند کیے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور ہاشم درانی اس طرح صوفے پر ایک طرف بیٹھا تھا جیسے وہ کوئی بت ہو اس کی پلکیں تک نہیں جھپک رہی تھیں۔ صوفی احمقوں کی طرح سیدھے چلتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ اسے دیکھ کر سب اچھل پڑے تھے۔ ہاشم درانی کے چہرے پر شدید غصے کے آثار پیدا ہوئے۔

''کیا بات ہے تم بغیر اجازت اس طرح کمرے میں کیوں داخل ہوگئے۔''

''اصل میں ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔''

''تمہارا دماغ خراب ہے کیا تم جانتے ہو کہ طریقہ کار کیا ہوتا ہے کسی جگہ آنے سے پہلے اجازت لی جاتی ہے اور پھر میرا ذہن ابھی تمہاری طرف سے صاف نہیں ہوسکا ہے۔''

''حق اللہ ہمیشہ درویش قسم کے لوگوں کے ساتھ یہی سلوک ہوتا چلا آیا ہے۔ ہم اس کے عادی ہیں لیکن ہمارا سوال اپنی جگہ ہے۔''

''کیا سوال......؟''

''اگر آپ چند نامعلوم افراد سے خوف زدہ ہیں تو یہ بتایئے پولیس کو اس کی اطلاع کیوں نہیں دیتے۔''

''پولیس......'' ہاشم درانی کا منہ بگڑ گیا۔

''ہمیں تو یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ نامعلوم لوگوں کو آپ اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں۔ کیا واقعی

وہ لوگ آپ کے لیے نامعلوم ہیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''ہاں۔مگر یہ درویش۔''

''جانے دیجیے جناب! بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''کیوں......؟''

''سیدھی سی بات ہے اگر آپ ان کو جانتے نہیں تو ان سے خوف زدہ ہونے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔'' ہاشم درانی جواب دینے کے بجائے صوفی کو گھورتا رہا۔ پھر بولا۔

''آؤ بیٹھو! میں تمہیں بتاتا ہوں۔''

''شکریہ۔شکریہ۔'' صوفی بیٹھ گیا۔ باقی لوگ کڑی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس وقت شیروانی اتری ہوئی تھی۔ صرف قمیص تھی اور ڈھیلے پائنچوں کا پاجامہ۔ وہ عجیب وغریب چیز لگ رہا تھا۔ ہاشم درانی نے اسے نظرانداز کر کے کہا۔

''میں انہیں جانتا ہوں۔''

''تب پھر پولیس ظاہری بات ہے۔''

''کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔''

''جی ہاں مم......مم......مطلب در......در......درویش۔''

''بکواس کرنے سے پہلے منہ پر قابو نہیں پا سکتے تم۔ جانتے ہو کہ تم کس کے سامنے ہو۔''

''بیٹھ جایئے۔'' صوفی نے بے پروائی سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ میں نے یہ بات اس لیے کہی کہ آپ لوگ کسی بھی وقت ان کی گولیوں کا نشانہ بن سکتے ہیں۔'' ہاشم درانی اسے گھورتا رہا۔ صوفی نے پھر کہا۔

''وہ کسی بھی وقت اس عمارت میں داخل ہو سکتے ہیں۔''

''نہیں داخل ہو سکتے۔ باہر کئی پہاڑی پہرہ دے رہے ہیں۔''

''پھر اس طرح رائفلیں سامنے رکھ کر بیٹھنے کا کیا مطلب ہے؟'' صوفی نے کہا اور پھر ادھر ادھر دیکھتا ہوا بولا۔

''دیکھیے میں یہاں قوالیاں کرنے نہیں آیا ہوں درویشوں کی دعاؤں سے۔ آپ کا رویہ میرے ساتھ اچھا نہیں ہے لیکن مجھے اس کی پروا نہیں ہے جہاں سے مجھے بھیجا گیا ہے وہاں سے مجھے یہ ہدایت دی گئی تھی کہ یہ مسئلہ حل کرنا ہے۔ ہاشم درانی کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے لیکن اس کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ آپ مجھے مکمل طور پر تفصیل بتایئے۔ میں یہاں آپ کے گارڈ کے فرائض انجام دینے نہیں آیا۔ ایک بار پھر ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ صوفی کے چہرے پر موجود مرنجان مرنج کیفیت چھائی رہتی تھی۔ وہ اس وقت نہیں تھی بلکہ اس عجیب وغریب نقوش والے شخص کے لہجے کی کرختگی میں عجیب سی سفاکی تھی۔ وہ بوکھلا کر اسے دیکھ رہے تھے۔ اس نے پھر کہا۔

''آپ مجھے ان آدمیوں کے بارے میں بتایئے۔'' ہاشم درانی تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔

''میں نہیں جانتا کہ کیا بتاؤں؟''

''کیا......آپ نے اس دوران ان میں سے کسی کو دیکھا ہے؟''

''نہیں۔''

''ہوں......کیا......آپ لوگ کھانے میں ثقیل چیزیں کھاتے ہیں۔''

''دیکھو میری شاہ میر صاحب سے بات ہو چکی ہے کیا بات ہوئی یہ میں تمہیں بتانا پسند نہیں کروں گا لیکن اتنا بتائے دے رہا ہوں کہ میں ان لوگوں کے نشان سے واقف ہوں۔ سبز ستارہ ان کا نشان ہے اور یہ نشان میری کوٹھی میں پایا گیا ہے۔ خاص طور سے اس طرح جیسے مجھے اس کی جانب متوجہ کیا گیا ہو۔''

''وہ نشان آپ کو کب ملا درویشوں کے کرم سے۔''

''یار کمال کی بات ہے ایک تو تم نے یہاں درویش درویش کر کے ہمارا دماغ خراب کر دیا ہے۔''

''نہیں جناب! درویشوں کے نام سے دماغ خراب نہیں ہونا چاہیے۔ یہی دماغ کی خرابی ہے کہ درویشوں کا احترام نہ کیا جائے۔ بہرحال آپ مجھے جواب دیجیے۔''

''کیا جواب دوں؟''

''یہ نشان آپ نے کب دیکھا؟''

''مجھے ایسے تین نشان مل چکے ہیں۔ ایک مخصوص عرصے میں۔''

''آخری بار کب؟''

''میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''دیکھو شاہ میر سے میری بات ہوئی ہے۔ شاہ میر نے مجھ سے یہی کہا ہے کہ جو شخص میرے پاس آیا ہے وہ کام کا آدمی ہے ممکن ہے تم شاہ میر کی نگاہوں میں کام کے آدمی ہو لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ کام تمہارے بس کا نہیں ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ تم کل صبح واپس چلے جاؤ۔ تمہارے ساتھ جو لوگ آئے ہیں۔ میری سمجھ میں وہ بھی نہیں آئے۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے تم لوگ......تم لوگ......تم لوگ۔'' ہاشم درانی نے بہ مشکل تمام اپنے آگے کے الفاظ پر قابو پایا تھا۔

''اگر آپ نے مجھے وہ نشان نہ دکھایا تو آپ یہ سمجھ لیجیے کہ پورے سراج پور میں سبز ستاروں کے اسٹیکر لگوا دوں گا۔''

''تم آخر چاہتے کیا ہو۔ میں اصل میں دہری کیفیت کا شکار ہوں۔''

''آپ بے شک دہری کیا آٹھ دس کیفیتوں کا شکار رہیں لیکن میں وہ نشان دیکھنا چاہتا ہوں۔''

ہاشم درانی تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔ اس نے اپنے اندرونی لباس میں ہاتھ ڈال کر ایک بے حد خوب صورت کارڈ نکالا جس پر سبز رنگ کا ایک ستارہ چھپا ہوا تھا۔ صوفی نے وہ کارڈ ہاتھ میں لے لیا۔ اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

''کیا عمدہ پرنٹنگ ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔ پھر اچانک ہی اس کی نگاہیں ناظمہ وغیرہ کی طرف اٹھیں اور اس نے کہا۔

''ہو سکتا ہے درانی صاحب آپ ان لوگوں کے سامنے میرے سوالوں کے جواب دینا پسند نہ کریں۔''

''یار کیوں بور کر رہے ہو؟''

"میں نے احتیاطاً یہ خیال ظاہر کیا تھا۔ یہ بتایئے کہ کیا کبھی آپ کا تعلق منشیات کی ناجائز تجارت سے بھی رہا ہے۔" ہاشم درانی بے اختیار اچھل پڑا۔ وہ صوفی کو اس طرح گھور رہا تھا کہ جیسے اس نے اسے ڈنک مار دیا ہو پھر اس نے جلدی سے اپنے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"جاؤ تم لوگ آرام کرو۔" لڑکوں کے چہرے تو کھل اٹھے لیکن ناظمہ کے انداز سے تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ نہ جانا چاہتی ہو۔

"جاؤ تم بھی جاؤ۔" ہاشم درانی نے کہا۔

"مم...... مم مگر۔"

"جاؤ۔ دفع ہو جاؤ اور اس کے بعد وہ لوگ وہاں نہ رکے تھے۔ تب ہاشم درانی نے صوفی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"کیا بکواس کر رہے تھے تم؟"

"میں یہ پوچھ رہا تھا کہ کیا آپ درویشوں کی دعاؤں سے ناجائز منشیات کا کام بھی کرتے رہے ہیں؟"

"تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟" درانی نے سبز کارڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بہت کچھ درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"کیسے جانتے ہو؟"

"کشف کرتا ہوں اور درویش مجھ پر بہت سے عقدے کشا کر دیتے ہیں لیکن آپ مجھ سے سوال کرنے کے بجائے مجھے میرے سوالات کے جواب دیجیے۔ میرا خیال ہے اصولی طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"نہیں۔ میں نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی۔"

"تو پھر آپ ان لوگوں کے متعلق کچھ جانتے ہیں ورنہ نشان اس کوٹھی میں کیوں آیا؟"

"اوہ میرے خدا، اب کھل رہے ہو تم میرا خیال ہے کھل رہے ہو اس کا مطلب ہے کہ تم کام کے آدمی ہو۔"

"لیکن مجھے آپ کے حکم کے مطابق صبح واپس بھی جانا ہے۔"

"نہیں۔ بس ایسے ہی اصل میں بہت چڑچڑا ہو گیا ہوں میں۔ تم نہیں سمجھتے۔ ارے ہاں کمال کی بات ہے تم تو......"

"اگر میرا خیال غلط نہیں ہے درانی صاحب تو آپ شمیان ہو سے خوف زدہ ہیں ایک بار پھر ہاشم درانی اس طرح اچھلا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس کی آنکھیں خوف زدہ انداز میں پھیل گئی تھیں۔ پھر اس نے کہا۔

"تت...... تت...... تم تو جوتوں سمیت آنکھوں میں گھسے جا رہے ہو۔"

"جوتے اتار دوں۔" صوفی نے کہا۔

"نہیں پلیز او ہو...... تم یہ بتاؤ شمیان ہو کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟"

"بس۔ میں اس کے بارے میں آپ کو بہت کچھ بتا سکتا ہوں۔ اس کا نام بہت قدیم ہے اور ان کے نام سے [illegible] کی ناجائز تجارت ہوتی ہے یعنی اسے آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔"

"اف۔ میرے خدا بہت کم لوگوں کو یہ تفصیل معلوم ہے میں نہیں جانتا کہ تمہیں اس کے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔ آہ! دیکھو، دیکھو مجھے معاف کر دینا۔ اصل میں میں ایک پریشان حال آدمی ہوں، اچانک ہی یہ خیال میرے ذہن میں آیا ہے کہ کہیں تم شمیان ہو سے ہی تو تعلق نہیں رکھتے۔"

"درویش رحم کریں۔" صوفی نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ پھر بولا۔

"اچھا ایک بات بتایئے یہ نشان آپ کے پاس کیوں آیا ہے؟"

"یہی تو میں نہیں جانتا۔"

"درانی صاحب یہ نام بہت پرانا ہے کئی سو سال پرانا۔"

"اور یہ بات صرف شمیان ہو کے گروہ کے لوگ جانتے ہیں۔"

"یہ ہوئی ناں بات۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کا تعلق اس گروہ سے رہ چکا ہے۔"

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔ تم غلط سمجھے۔"

"مجھے بتایئے کہ پھر یہ نشان آپ کے پاس کیسے پہنچا۔ وہ آپ سے کس چیز کا مطالبہ کر رہے ہیں۔"

"تم یہ بھی جانتے ہو۔" ہاشم درانی نے کہا اور پھر ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تمہیں ثابت کرنا پڑے گا کہ تم وہی آدمی ہو، تمہیں شاہ میر سے بات کرنی ہوگی۔"

"دیکھیے میں یہ آپ کو بتا دوں کہ یہ سبز ستارہ ہے اس کے بعد کالا ستارہ آئے گا اور اگر آپ نے اس دوران ان کا مطالبہ پورا نہ کیا تو پھر ستارہ سرخ ہو جائے گا اور جس دن آپ کو سرخ ستارہ ملا اس کے دوسرے دن آپ کا صفایا ہو جائے گا۔ بتا دیجیے مجھے کہ آخر وہ کیا چاہتے ہیں آپ سے۔"

"اتنا کچھ جاننے کے باوجود تم اب تک زندہ کیسے ہو؟"

"بس درویشوں کے کرم سے اب تو آپ کو درویشوں پر یقین آ گیا؟"

"میں نہیں سمجھ سکتا کہ تم کس قسم کے آدمی ہو۔"

"میرے بارے میں سوچنے کے بجائے آپ اپنے بارے میں سوچیے۔ جتنی جلدی آپ مجھے اپنے بارے میں بتا دیں گے اتنا ہی اچھا ہو گا درویشوں کی دعاؤں سے۔" ہاشم درانی کے چہرے پر ایک ہچکچاہٹ سی ہو رہی تھی۔ اسی وقت صوفی نے کہا۔

"شمیان ہو کے بارے میں...... صرف اسی صورت میں اس قسم کی حرکتیں کی جاتی ہیں۔ وہ ایک ایسا گروہ ہے جو منشیات کی ناجائز خرید و فروخت کرتا ہے۔ شمیان ہو کون ہے، کسی کو نہیں معلوم لیکن تجارت کا سارا نفع اسی کو پہنچتا ہے۔ اس کا کوئی ایجنٹ بے ایمانی پر آمادہ ہو جائے تو اسے اس قسم کی وارننگ دی جاتی ہے پہلی دھمکی سبز ستارہ، دوسری سیاہ ستارہ اور تیسری سرخ ستارہ۔ اگر آخری دھمکی کے بعد بھی مطالبات ادا نہ کیے جائیں تو ان ایجنٹوں کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔" ہاشم درانی گہری گہری سانسیں لیتا رہا تھا پھر اس نے کہا۔

"تو تمہارا خیال ہے کہ میں اس کا ایجنٹ ہوں۔"

"آپ مجھے بتایئے کہ میں اور کیا سمجھوں درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔"

''تو پھر......؟''

''میرا خیال ہے میرے پاس شمیان ہو کا سراغ ہے۔'' ہاشم درانی نے کہا۔

''تفصیل......''

''کچھ ایسے کاغذات ہیں جو کسی طرح شمیان ہو کے لیے مخدوش ثابت ہو سکتے ہیں۔''

''سراغ والی بات کریں۔''

''یہ میرا خیال ہے۔''

''کس بنا پر......؟''

''یہ بتانا مشکل ہے۔''

''وہ کاغذات آپ کو ملے کہاں سے؟''

''میں شاہ میر کو بتا چکا ہوں ارے اوہ ہو ہاں۔ بات سمجھ میں آ رہی ہے یہ تفصیل شاہ میر نے ہی شاید تمہیں بتائی ہو۔ لاحول ولا قوۃ میں بلا وجہ پریشان ہو رہا ہوں۔ بہر حال بات وہی ہے جو تمہیں شاہ میر نے بتائی ہے۔ وہ کچھ تجارتی قسم کے کاغذات ہیں لیکن تجارت کی نوعیت صاف ظاہر ہو جاتی ہے شمیان ہو کا نام اس میں کئی جگہ دہرایا گیا ہے۔''

''آپ کو شمیان ہو کی ہسٹری کس طرح معلوم ہوئی۔''

''میں نے ہانگ کانگ میں شمیان ہو کے بارے میں چھان بین کی تھی لیکن یہ نہیں پتا چلا سکا کہ وہ کون ہے اور کہاں ہے۔ اس کے ایجنٹ آئے دن گرفتار ہوتے رہتے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے آج تک شمیان ہو کا پتا نہیں دیا۔ ویسے یہ نام ڈھائی سو سال سے زندہ ہے۔'' صوفی کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔

''یہ لوگ کب سے آپ کے پیچھے لگے ہیں۔''

''یہ......آج کی بات نہیں ہے۔ کاغذات ملنے کے فوراً بعد ہی وہ میرے پیچھے لگ گئے تھے، لیکن میں نے انہیں کاغذات واپس نہیں کیے۔ کتنی بار وہ میری قیام گاہ میں بھی داخل ہوئے لیکن انہیں کاغذات کی ہوا نہیں لگ سکی اور اس کے بعد انہوں نے موت کے یہ نشان دینے شروع کر دیے۔''

''وہ شخص کبھی آپ کو دوبارہ نظر آیا جس نے آپ کو کاغذات کا یہ لفافہ دیا تھا۔''

''نہیں۔ کمبخت نظر نہیں آیا۔''

''اس کا مطلب ہے آپ صرف اس وقت تک زندہ ہیں جب تک کاغذات آپ کے قبضے میں ہیں۔''

''بالکل ٹھیک۔'' ہاشم درانی نے بے خیالی میں کہا اور پھر ایک دم چونک پڑا۔

''بھئی۔ تم تو واقعی بہت ذہین ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کاغذات کو واپس نہیں کرنا چاہتا ورنہ مجھے ان سے ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ میں نے ایک سانپ کا سر پکڑ رکھا ہے، چھوڑتا ہوں تو پلٹ کر ڈس لے گا۔''

''کیا میں ان کاغذات کو دیکھ سکتا ہوں۔''

''ہرگز نہیں۔ تم مجھ سے سانپ کی گرفت ڈھیلی کرنے کو کہہ رہے ہو؟''

''ٹھیک۔ پھر آپ مجھے بتائیے کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''بس۔ اب یہ تم جانتے ہو صورت حال تو تمہارے علم میں آ ہی گئی ہے۔''

''اس طرح رائفلوں کے ساتھ شب بیداری کا کیا مطلب ہے؟''

''بس۔ میں ان بچوں کو بہلانے کے لیے کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ اب میں واپس جانے کی اجازت چاہتا ہوں۔'' صوفی نے کہا۔

''سنو! میں قائل ہو چکا ہوں اس بات کا کہ شاہ میر نے بالکل صحیح بات کہی تھی۔ تم اتنے ہی ذہین اور سمجھ دار آدمی ہو نہ جانے کیوں مجھے ایک آس سی بندھ گئی ہے۔ براہ کرم میری اب تک کی باتوں کا برا نہ ماننا۔''

''حق اللہ، حق اللہ، حق اللہ۔'' صوفی نے کہا اور اس کے بعد وہ کمرے کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ راہ داری طے کر کے سرونٹ کوارٹر یا دوسرے الفاظ میں مہمان خانے پہنچا چونکہ یہاں انہیں ایک ہی کمرا دیا گیا تھا چنانچہ اس ایک کمرے میں آگ اور پانی کہاں رہ سکتے تھے۔ مہابھارت جاری تھی۔ حسینہ کی آواز سنائی دی۔

''جھاڑو پھیرے آنکھیں نکال کر ہتھیلی پر رکھ دوں گی۔''

''کیسے نکالو گی۔'' معشوق نشیلے کی آواز ابھری۔

''میں کہتی ہوں یہ صوفی کو کیا سوجھی ہے مجھے تو یہ کوئی سازش معلوم ہوتی ہے۔''

''ہاں۔ سازش ہے صوفی صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ سلور جوبلی کا نکاح مجھ سے کرا دیا جائے گا۔''

''اے تجھے مروڑ کر لے جائے میں تیرے ساتھ نکاح کروں گی؟ چوڑیاں پیس کر نہ کھاؤں گی اس سے پہلے۔''

''بلا وجہ مشکل کا شکار ہو گی، مرنے کے اور بھی بہت سے نسخے ہیں۔ میں تمہیں ایک آسان نسخہ بتاؤں، مجھ پر مر جاؤ۔'' معشوق نشیلے نے کہا اور حسینہ نے آنکھیں بند کر لیں، غصے سے اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ وہ تو شکر تھا کہ یہ احساس تھا کہ دوسرے کا گھر ہے اس لیے ہاتھا پائی شروع نہیں کی تھی ورنہ امکان تو اس بات کے تھے کہ معشوق نشیلے کی کھوپڑی کھل جائے، کیونکہ پان دان سامنے ہی رکھا ہوا تھا اور اس کے اجزا ایسے تھے کہ ہتھیار کے طور پر استعمال کیے جا سکیں۔ صوفی عین موقع پر اندر پہنچ گیا تھا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہو رہی ہے؟''

''سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔''

''حسینہ بدتمیزی بالکل بند شرافت سے سو جاؤ۔''

''تم شریف......'' حسینہ نے اتنا ہی کہا تھا کہ صوفی اس کے سامنے پہنچ گیا۔ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا کیفیت نظر آئی تھی اس کو ایک لمحے کے لیے منہ کھول کر رہ گئی۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا ہی رہ گیا تھا۔

''سو جاؤ۔'' صوفی کی غراہٹ ابھری اور حسینہ نے لپک کر اپنے بستر کا رخ کیا اور لیٹ کر کمبل اوڑھ لیا۔ معشوق نشیلے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ صوفی نے پلٹ کر اسے دیکھا اور معشوق نشیلے نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو صوفی کی آواز ابھری۔

''کیا گگن شاہ نے یہ بھی بشارت دی تھی کہ تم اس طرح کی حرکتیں کرو۔ لیٹ جاؤ اور خیال رکھو ایک شریف گھرانے میں ہو، عزت بڑی چیز ہوتی ہے کیا فائدہ کہ کان سے پکڑ کر یہاں سے نکال دیے جاؤ اور اگر یہاں سے نکالے گئے تو پھر میرے پاس بھی تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی درویشوں کے کرم سے۔'' معشوق نشیلے کان دبا کر اپنے بستر پر دراز ہو گئے تھے۔

♥......♥......♥

دوسری صبح صحیح طریقے سے سورج بھی نہیں نکلا تھا کہ کئی ملازم مہمان خانے میں پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک نے صوفی سے کہا جو جلدی جاگ جانے کا عادی تھا۔

''معافی چاہتے ہیں جناب! وہ درانی صاحب کا حکم ہے کہ آپ لوگوں کو اندر منتقل کر دیا جائے۔ براہ کرم زحمت کیجیے ہم آپ کا سامان اٹھانا چاہتے ہیں۔'' صوفی نے معشوق نشیلے اور حسینہ کی طرف دیکھا جو آرام کی نیند سو رہے تھے۔ پھر وہ مسکرا کر بولا۔

''اٹھالو۔'' حسینہ شاید جاگ ہی گئی تھی۔ ملازم آگے بڑھ گئے۔ حسینہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''مم...... مم...... مجھے...... مجھے بھی اب اٹھاؤ گے کیا بھیا! میں تو خود اٹھ گئی۔''

''نہیں بڑی اماں اب خود ہی چلیے ہمارے ساتھ۔''

''ب...... ب...... بب بڑی اماں...... اے تو اندھا ہے کیا یا دماغ میں کوئی خرابی ہے۔ میں تجھے بڑی اماں نظر آ رہی ہوں۔''

''بھرم تا دیق من جانم کہ من آنم کہا دل نے۔'' معشوق نشیلے کی آواز ابھری تو صوفی نے اسے گھور کر دیکھا۔

''یہ لوگ سامان اٹھانے کے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔'' تھوڑی دیر کے بعد ان لوگوں کو کوٹھی کے اندرونی حصے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ ہاشم درانی نے ان سے ابھی تک ملاقات تو نہیں کی تھی لیکن بہر حال صوفی کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ہاشم درانی کے دماغ کی برف پگھل گئی ہے، ویسے اس نے ان معاملات کے بارے میں کافی دیر تک سوچا تھا اور اپنے ذہن میں کچھ منصوبہ بندیاں کرتا رہا تھا۔ گرین فورس کے بقیہ ارکان کو ہدایات دے دی گئی تھی کہ پہلے حالات کا جائزہ لے لیا جائے پھر انہیں اطلاع دی جائے گی، پھر وہ سراج پور پہنچ جائیں۔ ویسے سراج پور اس قدر حسین ہوگا اس چیز کا تو صوفی کو خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ پہلے یہاں پر کبھی آنا نہیں ہوا تھا۔

بہر حال معشوق نشیلے اور حسینہ کو لے تو آیا تھا۔ مزہ بھی آ رہا تھا ان دونوں کے آنے سے لیکن حد سے آگے بات نہیں ہونی چاہیے تھی چنانچہ اب اس نے فیصلہ کیا تھا کہ تھوڑا سا سخت رویہ اختیار کرے گا تا کہ دونوں سر میں رہیں۔ پھر ہاشم درانی کے اہل خاندان نے دیکھا تھا کہ ہاشم درانی نے اپنے اور صوفی کے لیے الگ ناشتہ لگوایا ہے۔ ایک انتہائی بے تکا آدمی لیکن اب ہاشم درانی اس کی بڑی عزت کرنے لگا تھا۔ یہ بات بھی ان سب کو معلوم ہو چکی تھی کہ صوفی کو مہمان خانے سے کوٹھی کے اندرونی حصے میں منتقل کر لیا گیا ہے۔ بہر حال ناشتہ خاموشی سے کیا گیا۔ ہاشم درانی نے کہا۔

''صوفی صاحب ہمارے اور آپ کے درمیان اب تک جو صورت حال رہی ہے مجھے امید ہے کہ

آپ اسے ذہن سے نکال دیں گے۔ اصل میں میرا مزاج کچھ تیز ہے اور پھر ان حالات نے مجھے اور زیادہ ابھار رکھا ہے ورنہ میں اتنا برا انسان نہیں ہوں۔''

''درویش رحم کریں۔''

''یہ درویشوں کا کیا قصہ ہے یہ بتائیے آپ۔''

''آپ نے ہمارا حلیہ نہیں دیکھا۔ بس یہ بھی درویشوں ہی کا عطیہ ہے۔''

''آپ کے بارے میں تو اب بہت کچھ جاننے کو جی چاہتا ہے۔''

''جان لیں گے بہت کچھ جان لیں گے۔ ذرا وقت گزرنے دیجیے ہم خود بہ خود آپ کی سمجھ میں آ جائیں گے۔'' صوفی نے کہا اور ہاشم درانی پُر خیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔

♥......♥......♥

صوفی کی فطرت میں واقعی کئی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں مثلاً اب اس وقت حسینہ اور معشوق نشیلے کو ساتھ لے آنا دونوں میں چونچیں چلتی تھیں اور صوفی ان سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ لیکن کسی سنجیدہ جگہ ایسے دو افراد کو لے جانا بھی ایک دلچسپ عمل تھا۔ اس کے علاوہ اس نے گرین فورس کے کارکنوں کو اس بار اپنے ساتھ نہیں لیا تھا۔ خاص طور سے شازیہ جو درحقیقت گرین فورس کی ٹیم میں اپنا ایک الگ مقام رکھتی تھی۔ سراج پور صوفی کے لیے ایک اجنبی جگہ تھی۔ اس سے پہلے وہ یہاں نہیں آیا تھا لیکن یہاں پہنچ کر تو یہ اندازہ ہوا تھا کہ یہ تو کمال کی جگہ ہے۔ اس وقت بھی وہ باہر نکل آیا تھا۔ پہاڑیوں میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور اس کی نگاہیں دور دور تک بھٹک رہی تھیں۔ سراج پور کی شاداب پہاڑیاں گرمیوں میں کافی آباد ہو جاتی تھیں۔ نزدیک اور میدانی علاقوں کی دھوپ سے گھبرائے ہوئے صاحب حیثیت لوگ یہاں نکل آتے تھے اور انہی کی وجہ سے اس چھوٹے سے علاقے میں چھوٹے ہوٹل بنائے گئے تھے۔ ویسے سیزن میں مقامی لوگوں کے چھوٹے چھوٹے مکان بھی بہت عمدہ ہو جاتے تھے۔ وہ ان کی تزئین کرتے اور گرمیوں میں ان کو کرائے پر اٹھا دیتے۔ خود چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنا کر رہتے۔ اپنے کرائے داروں کی خدمات بھی سرانجام دیتے جس کے صلے میں انہیں اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی اور پھر سردیوں کا زمانہ اسی کمائی کے بل بوتے پر گزر جاتا تھا۔ ہاشم درانی ویسے تو ایک سرمایہ کار، سرمایہ دار اور صنعت کار تھا۔ ایک بڑا بزنس مین جس کے ہاتھ پاؤں نہ جانے کہاں کہاں تک پھیلے ہوئے تھے لیکن سراج پور اس کا آبائی گاؤں تھا اور اس کی مستقل رہائش یہی تھی۔ ویسے وہ یہاں کے انتہائی سربرآوردہ لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کی حویلی بھی بہت شاندار تھی اور سراج پور میں شاید اس جیسی بڑی اور شاندار عمارت اور کوئی نہیں تھی۔

بہر حال اس وقت صوفی یہاں کی صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا کہ عقب سے ناظمہ اس کے پاس پہنچ گئی۔ انداز سے یونہی لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اس کے پاس آ رہی ہو۔ صوفی کے پاس آ کر وہ رک گئی اور اسے دیکھنے لگی۔ صوفی نے منہ میں بھری ہوئی پیک رخ بدل کر ایک کیاری میں تھوک دی اور اس کے بعد ناظمہ کی طرف منہ کر کے بولا۔

''خوش آمدید درویشوں کے کرم سے۔'' ناظمہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

''اتنا تو میں جانتی ہوں کہ آپ جو کچھ خود کو ظاہر کرتے ہیں وہ میں نہیں۔''

''نہیں۔ جو ہیں وہ خود کو ظاہر نہیں کرتے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''بات ایک ہی ہو جاتی ہے۔ آپ نے جس طرح انکل کا موڈ بدل دیا اس پر میں ہی نہیں سارا گھر حیران ہے۔''

''ہاشم درانی تو بہت ہی خوش مزاج اور خوش اخلاق انسان ہیں۔''

''آپ یقین کریں صوفی صاحب اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ وہ واقعی ایسے ہیں لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ کچھ الجھنوں نے انہیں گھیر لیا ہے۔ دیکھیے میں آپ کا بے حد احترام کرتی ہوں۔ لازمی بات ہے کہ وزارت داخلہ سے کسی ایسے ویسے شخص کو یہاں نہیں بھیجا گیا ہوگا البتہ بہت سی باتیں میرے ذہن میں الجھی ہوئی ہیں۔''

''اگر ہم انہیں سلجھا سکے تو ہم اس سے گریز نہیں کریں گے درویشوں کے کرم سے۔''

''ایک بات آپ بتائیے صوفی صاحب ویسے تو آپ کا حلیہ واقعی کسی پیر پرست کا ہی ہے لیکن یہ آپ بار بار ہر بات پر درویشوں کے کرم سے اور درویشوں کی دعاؤں سے کیوں کہتے ہیں۔''

''بی بی۔ درویشوں کا سایہ ہے ہم پر۔ بس آپ یوں سمجھ لیجیے کہ عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزری ہے۔ آپ کی یہ جو دنیا ہے نا یہ ایک روایتی دنیا ہے لیکن اس سے الگ ایک اور دنیا ہے ناظمہ صاحبہ جو پیروں، بزرگوں اور ولیوں کی دنیا ہے اور اس دنیا کی بادشاہت کمال کی ہوتی ہے۔ آپ اس کے رمز کیا سمجھیں گی۔ بس یوں سمجھ لیجیے تھوڑا سا سایہ ہم پر پڑ گیا ہے۔''

''کمال ہے۔ اچھا ایک بات بتائیے آپ گورنمنٹ کے کوئی اعلیٰ ذمے دار افسر ہیں؟''

''توبہ۔۔۔۔ توبہ۔۔۔۔ توبہ ہم اس جال کو توڑ چکے ہیں اور اب کوئی افسر وغیرہ نہیں ہیں۔''

''تو پھر شاہ میر صاحب سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟''

''بس ہمارے کسی کے کچھ ہیں وہ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''کسی کے کچھ۔۔۔۔؟''

''ہاں۔ یہ بھی ایک رشتہ ہوتا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے آپ بتانا نہیں چاہتے۔ اچھا یہ چھوڑیئے۔ آپ یہ بتائیے کہ آپ انکل کے لیے کیا کر رہے ہیں؟''

''جو مناسب ہوگا وہ کریں گے۔''

''اس کا مطلب ہے آپ مجھے کچھ بتائیں گے نہیں۔'' ابھی وہ کچھ اور کہنے والی تھی کہ برآمدے سے ہاشم درانی کی آواز سنائی دی۔

''اوہو۔ ناظمہ ایک مصیبت آ گئی ہے مجھ پر اس وقت ان حالات میں۔'' ناظمہ کے ساتھ ساتھ صوفی بھی چونک کر ہاشم درانی کو دیکھنے لگا تھا۔ ہاشم درانی خود ہی اس طرف آ گیا۔ اس نے صوفی کی طرف دیکھ کر گردن خم کی اور پھر ناظمہ سے کہا۔

''جلدی کرو بھئی۔ وقت ہونے والا ہے۔''

''کس کا انکل۔۔۔۔؟''

''یار بس میں کیا بتاؤں ان حالات میں واقعی اس کی آمد میرے لیے بڑی تکلیف دہ ہوگی، حالانکہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔''

''مگر انکل کون کون آ رہا ہے؟''

''فیلکس۔''

''اوہو۔۔۔۔ مسٹر فیلکس۔''

''ہاں۔ اس کے ساتھ اس کی بیٹی لیرا بھی ہے اور اسمشیر۔''

''میں مسٹر اسمشیر کو نہیں جانتی؟''

''اب پوری طرح جاننے کی کوشش مت کرو۔ فون آیا ہے وہ لوگ آ چکے ہیں۔ مجھے سرپرائز دینا چاہتے تھے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مجھے بتائیے میں کیا کروں؟''

''انہیں لینے جانا ہے اور وہ تقریباً آ چکے ہوں گے۔''

''کیا وہ کچھ دن یہاں ٹھہریں گے؟''

''ہاں۔ شاید گرمیاں یہیں گزریں۔''

''واقعی۔ اس وقت تو یہ الجھن کی بات ہے۔''

''یار تم کھڑی ہوئی ہو جلدی کرو۔''

''جا رہی ہوں انکل بے فکر رہیں۔ ہم انہیں ریسیو کر لیں گے۔'' ناظمہ نے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔ صوفی تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

''یہ اسمشیر کچھ عجیب سا نام نہیں ہے۔''

''میرے دوست فیلکس کا گہرا دوست ہے۔ میں بھی اس سے پہلے کبھی نہیں ملا۔ اس سے سنا ہے وہ مصور بھی ہے ایک بار فیلکس نے مجھ سے اس کا تذکرہ کیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ اس بار وہ آئے گا تو اسے ساتھ لے کر آئے گا۔''

''کیا آپ ان لوگوں سے شمیان ہو کے معاملے کا تذکرہ کریں گے؟''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں اسے ڈھول کی طرح تھوڑا ہی گلے میں لٹکائے ہوئے ہوں۔''

''ہوں۔'' صوفی نے پُرخیال انداز میں کہا۔ پھر بولا۔

''معاف کیجیے جناب میں ایک بات سوچ رہا ہوں درویشوں کے کرم سے۔''

''کیا۔۔۔۔؟''

''بقول آپ کے وہ لوگ ابھی تک آپ پر قریب قریب سارے حربے استعمال کر چکے ہیں لیکن کاغذات حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ کاغذات حاصل کیے بغیر وہ آپ کو قتل بھی نہیں کر سکتے کیونکہ ہو سکتا

ہے کہ اس کے بعد وہ کسی اور کے ہاتھ لگ جائیں۔ اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا آپ ناظمہ، حسن یا نصرت وغیرہ کی موت برداشت کر سکیں گے۔''

''کک...... کک...... کیا بک رہے ہو؟'' ہاشم درانی کانپ کر بولا۔

''جو کچھ عرض کر رہا ہوں ٹھیک عرض کر رہا ہوں درویشوں کے کرم سے۔ فرض کیجیے وہ ناظمہ کو پکڑ لیں اور آپ سے کاغذات کا مطالبہ کریں ایسی صورت میں آپ کیا کریں گے۔ کیا آپ یہ فیصلہ کر کے مجھے بتا سکتے ہیں کہ ناظمہ، حسن، نصرت آپ کے لیے زیادہ قیمتی ہیں یا وہ کاغذات...... دیکھیے ناں یہ سوال میں آپ سے اس لیے کر رہا ہوں درویشوں کی دعاؤں سے کہ میری ذمے داری لگائی گئی ہے۔''

''میرے خدا...... میرے خدا۔'' ہاشم درانی لڑکھڑا گیا۔ اس نے ایک ستون سے ٹیک لگائی۔ صوفی جیب میں پانوں کا بٹوا اور ڈبیا تلاش کرنے لگا۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد ہاشم درانی کی آواز ابھری۔

''تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ واقعی بالکل ٹھیک۔ میرے خدا اگر تمہاری آمد سے پہلے وہ یہ قدم اٹھا بیٹھتے تو کیا ہوتا میں نہیں سمجھ پا رہا کہ میں کیا کروں یہ تو ایک نئی مشکل پیدا ہو گئی میرے لیے۔''

''پہلا کام یہ کیجیے کہ ناظمہ کو اسٹیشن نہ بھیجیے۔''

''اب تو میں اپنے بھتیجوں میں سے بھی کسی کو نہیں بھیج سکتا۔''

''ٹھیک ہے آپ خود کیوں نہیں جاتے......؟''

''میں...... میں...... میں بہت زیادہ ڈر گیا ہوں۔ اب تو میں ان لوگوں کو تنہا بھی نہیں چھوڑ سکتا۔''

''اس کی فکر مت کیجیے، میں موجود ہوں۔''

''تم......؟'' ہاشم درانی نے اسے اس طرح دیکھا جیسے اس کا دماغ خالی ہو گیا ہو۔

''تم کسی خطرے کا مقابلہ کر سکو گے......؟''

''میں کیا درویش کریں گے...... درویش۔'' صوفی نے کہا اور پھر بولا۔

''بس تین دافع البلّیات دعائیں پڑھوں گا اور دشمن کا خاتمہ۔ پر ایک شرط ہو گی درانی صاحب۔''

''کیا......؟''

''جب آپ اس مشکل سے نکل آئیں گے تو آپ کو نادر میاں اور ہمنوا کی قوالی کرانا پڑے گی۔''

''قق...... قق...... قق۔ قوالی۔''

''کیوں حلق میں بلغم اٹک گئی کیا؟'' صوفی نے کہا۔

''نہیں۔ مم...... مم...... میرا مطلب ہے۔'' ہاشم درانی بری طرح الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت کبھی پیلی پڑ جاتی اور کبھی اصلی حالت میں آ جاتی۔

''مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟''

''آپ جائیے سیدھے سیدھے اپنے دوستوں کو لینے کے لیے۔''

''تم نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔''

''الجھن سے نکال بھی رہا ہوں آپ کو، یا تو سب کچھ اپنی مرضی سے کیجیے یا پھر......''

''ٹھیک ہے۔'' ہاشم درانی نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

♥......♥......♥

سمیر تیز تیز قدموں سے جا رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور حسینہ بیگم باہر نکل آئیں۔ سمیر ان ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔

''ہائے ہائے ایسے مت چلا کرو آندھی طوفان کی طرح، نظر لگ جائے گی۔'' حسینہ بیگم

''جج...... جی معافی چاہتا ہوں۔''

''میری بات تو سنو! وہ پان کے پتے مل جائیں گے یہاں کہیں۔''

''پپ پان کے پتے......؟''

''ہاں۔''

''مقصد یہ کہ آپ کون سے پان کے پتوں کی بات کر رہی ہیں تاش میں جو ہوتے ہیں۔''

''ہائے مٹی ڈالو تاشوں کو میں کھانے والے پانوں کی بات کر رہی ہوں۔''

''اوہ۔ پپ پتا نہیں مجھے، کسی ملازم سے پتا کر کے بتاتا ہوں۔''

''میرے پاس پان ختم ہو گئے ہیں اور پھر اس طرح ڈھینگے کو بھی پانوں کی ضرورت ہو گی بغیر پانوں کے یوں لگتا ہے جیسے پیاسا کوا۔'' سمیر رک گیا۔ اس نے حسینہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایک بات بتائیں گی مجھے آپ۔''

''بتا دوں گی پوچھو۔ اس وقت تو موت کا لیا بھی موجود نہیں ہے، مجھے ایک بات بتاؤ کوئی ایسی دوا نہیں ہے جو اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا سکے۔''

''کک...... کک کسے۔''

''اوہ۔ وہی۔ بھڑم چوں، بھڑم چوں، بھڑم چوں۔ پتا نہیں کیا کیا بھونکتا رہتا ہے۔ کتیا کا پلا۔''

''آپ کچھ کہہ رہی تھیں مجھ سے۔''

''میں۔ تم ہی کہہ رہے تھے۔''

''ہاں۔ ہاں۔ وہ آپ نے ابھی نام لیا تھا طرڈھینگے۔''

''آئے اسی چھگے کو کہہ رہی ہوں جو اونٹ کا نواسا معلوم ہوتا ہے۔''

''صوفی صاحب۔''

''ہاں۔''

''آپ سے رشتہ ہے ان کا۔''

''توبہ کرو میاں توبہ کرو۔ اللہ سے ڈرو۔ میرا بھلا اس سے کوئی رشتہ ہو سکتا ہے۔ میں پھنسا دی گئی ہوں۔''

''کک کک...... کیا مطلب؟''

''ارے میاں بس زبان بڑی گندی چیز ہوتی ہے اگر اسے سوچ سمجھ کر استعمال نہ کیا جائے تو ایسی گلے پڑتی ہے کہ اللہ معافی۔ کرنل صاحب نے کہا کہ بی حسینہ! میرے ایک اہم آدمی کو آپ کی ضرورت ہے۔

کیا آپ وہاں جانا پسند کریں گی۔ کرنل کی روٹی کھائی، زندگی بھر نہ صرف میں نے بلکہ میرے ماں باپ نے بھی۔ اسی کے ہاں پلی بڑھی، جوان ہوئی بھلا انکار کیسے کرسکتی تھی۔ پر یہ پتا نہیں تھا کہ اس کے سر ماردی جاؤں گی۔ ہائے۔ میں نے تو کرنل صاحب کو کبھی نقصان بھی نہیں پہنچایا تھا۔"

"کون کرنل صاحب؟"

"اوہو اگر تم کچھ نہیں جانتے تو کیا تمہاری پیدائش کی باتیں بھی میں ہی بتاؤں۔ جاؤ پان مل جائیں تو ٹھیک ہے بلاوجہ مغز کھائے جارہے ہو۔" حسینہ بیگم نے کہا اور واپس مڑ کر کمرے میں چلی گئیں۔ سمیر ایک لمحے تک سر کھجاتا رہا۔ اس کے بعد اس کا بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔ سامنے سے ناظمہ اور نصرت چلے آ رہے تھے۔ سمیر ہنستا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔

"خدا کی قسم کمال کی شخصیتیں ہیں۔"

"وہ کالی بلا کیا کہہ رہی تھی۔" نصرت نے پوچھا۔

"یار ہری مرچ بھی اتنی تیز نہیں ہوگی جتنی یہ کالی بلا ہے۔"

"چھوڑو ہم تعزیت کرنے آ رہے تھے۔" نصرت نے کہا۔

"تعزیت......؟"

"ہاں یار۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم اسٹیشن نہیں جا سکے لیرا کو میں نے کوئی پانچ چھ سال پہلے دیکھا تھا۔ اس وقت بھی غضب تھی اور اب تو غضب ناک بن گئی ہوگی۔"

"درویش رحم کریں۔" پیچھے سے آواز آئی۔ وہ چونک پڑے۔ صوفی منہ چلاتا ہوا آ رہا تھا۔

"ارے آپ نہیں گئے صوفی صاحب درانی صاحب کے ساتھ۔" نصرت نے پوچھا۔ ناظمہ بھی صوفی کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔

"ویسے اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ صوفی صاحب نے جس طرح انکل پر قابو پالیا ہے اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔"

"بس درویشوں کی دعائیں ہیں۔"

"مگر آخر آپ نے انکل کو کس طرح شیشے میں اتارا۔ ہمیں بھی کچھ بتا دیجیے۔"

"کوئی خاص بات نہیں بس ایک شیشہ لیا ان کے سامنے کیا ایک وظیفہ پڑھا اور صاحب شیشے میں اتر گئے۔ درویشوں کے کرم سے۔"

"یہ درویشوں کا کرم واقعی ہم پر بھی اگر ہوجائے تو ہمارا بیڑا پار ہوجائے صوفی صاحب۔ ہمیں بھی کچھ بتایئے صوفی صاحب۔"

"چلہ کشی کرنا پڑے گی۔ ویسے اگر آپ لوگوں کو دلچسپی ہے تو تھوڑے دن رک جایئے۔ یہاں محفل قوالی ہوگی بس خلوص دل سے اس میں شریک ہوجایئے اور جو میں بتادوں وہ کرلیجیے کسی بزرگ کا تصور اور اس کے بعد دیکھیے تماشا۔" وہ تینوں ہنسنے لگے اور اس کے بعد نصرت اور سمیر کسی کام سے چلے گئے۔ ناظمہ جان بوجھ کر رک گئی تھی۔

"جی صوفی صاحب! ویسے یہ حسینہ بیگم آپ کی کون ہیں۔ یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔"

"چھوڑیئے حسینہ بیگم کے معاملے کو زیادہ نہ اچھالیے۔ بس اوہو دیکھیے یہ معشوق نشیلے آ رہے ہیں۔ کمال کے شاعر ہیں۔ مشاعروں میں تو خیر ان کا گزر نہیں ہوتا لیکن ویسے آپ بھی ان کے اشعار سنیے۔"

"سنوایئے پھر کبھی کسی وقت۔" صوفی نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی تھی۔ حسینہ بیگم پھر ایک بار باہر نکل آئیں تھیں اور ان دونوں کو دیکھ کر کہا۔

"ارے صوفی صاحب پان ختم ہوگئے ہیں اس کے بعد گھاس میں کتھا چونا لگا کر کھانا پڑے گی۔"

"پان آجائیں گے حسینہ بیگم آپ اندر آرام کیجیے۔"

"بھاڑ میں جائے یہ اندر باہر۔ کمرے میں گھسے گھسے جان نکل رہی ہے۔ اے ہے پھر آمرا کہیں سے" معشوق نشیلے پاس پہنچ گئے تھے۔

"بس حسینہ بیگم آمرے کیا بلکہ مرگئے ہیں آپ پر، وہ جو کہتے ہیں نا کہ مرگئے ہم کھلی رہی آنکھیں وہ پٹاچوں پٹاچوں کاب رکاب۔"

"تیری دھر پٹاچوں کو بھاڑ میں ڈالوں کمبخت کبھی سیدھے راستے بھی چل لیا کر۔" معشوق نشیلے ہنسنے لگے تھے۔ ناظمہ حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی پھر اس نے کہا۔

"آپ نے پہلا مصرعہ تو خیر جو کچھ پڑھا ہی تھا لیکن یہ دھر پٹاچوں کیا ہوتا ہے؟"

"یہی تو سب کچھ ہوتا ہے۔ بیگم صاحب آپ نے زندگی میں کبھی دھر پٹاچوں نہیں کیا۔"

"کک...... کک کیا مطلب؟"

"بس معشوق نشیلے کی شاعری کو سمجھے والے ابھی اس دنیا میں پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں ان کے لیے نصاب کی کچھ کتابیں تیار کرانی پڑیں گی۔ چلیے اندر تشریف لایئے۔ پانوں کے بارے میں کوئی میٹنگ ہوجائے۔" صوفی نے معشوق نشیلے اور حسینہ سے کہا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

♥......♥......♥

تقریباً بارہ بجے تھے جب ڈاکٹر فیلکس، اس کی بیٹی لیرا اور اسمشیر ہاشم درانی کی کوٹھی میں داخل ہوئے لیکن اس وقت ہاشم درانی ان کے ساتھ نہیں تھا۔ ڈاکٹر فیلکس ایک دبلے پتلے جسم کا آدمی تھا۔ آنکھیں نیلی مگر دھندلی تھیں۔ بھری بھری مونچھیں بہت خوب صورت لگتی تھیں۔ اس کی لڑکی نوجوان اور کافی حسین تھی۔ خاص طور سے ہنستے وقت وہ پریتی بن جاتی تھی یعنی اس کے رخساروں میں گڑھے بہت خوبصورت لگتے تھے۔ تیسرا آدمی اسمشیر تھا۔ جو اسمشیر کم اور ریسلر زیادہ لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی بڑی خوب صورت داڑھی تھی۔ چہرہ زیادہ جان دار نہیں تھا لیکن آنکھیں بہت جان دار تھیں۔ ناظمہ نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا تھا۔ ڈاکٹر فیلکس نے ناظمہ کو ماتھے سے چومتے ہوئے کہا۔

"ہیلو۔ ڈارلنگ تم لوگ ہمیں لینے اسٹیشن نہیں آئے۔" اس سے پہلے کہ ناظمہ کوئی جواب دیتی لیرا ناظمہ سے لپٹ گئی تھی۔ پھر تعارف شروع ہوا۔ صوفی بھی وہیں موجود تھا۔ ڈاکٹر فیلکس نے اسے دیکھا اور سوالیہ نگاہوں سے ناظمہ کی طرف دیکھا تو صوفی خود آگے بڑھا۔

''احقر کو صوفی کہتے ہیں۔ میں درانی صاحب کا سیکرٹری ہوں۔''

''ہوں۔ درانی ویسے درانی کہاں ہے۔'' ڈاکٹر فیلکس نے کہا اور صوفی آنکھیں بند کر کے جگالی کرنے لگا لیکن ناظمہ چونک کر بولی۔

''کیا وہ آپ کے ساتھ نہیں ہیں؟''

''میرے ساتھ نہیں تو۔'' ڈاکٹر فیلکس چونک کر بولا۔

''کک...... کک...... کیا مطلب کیا وہ آپ کو اسٹیشن پر نہیں ملے؟'' ناظمہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس نے صوفی کی طرف دیکھا اور صوفی نے اپنی بائیں آنکھ دبا دی لیکن ناظمہ کی پریشانی میں کمی نہیں ہوئی۔

''وہ...... وہ...... وہ تم کیا کہہ رہے ہو میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا۔''

''آیئے پلیز میں آپ کو آپ کا کمرا دکھا دوں۔''

''مگر کیا وہ مجھے لینے اسٹیشن گیا تھا۔''

''صحیح نہیں معلوم کہہ تو یہی رہے تھے بلکہ ہمیں بھی یہ کہہ کر روک دیا تھا کہ وہ خود آپ کو لینے جائیں گے۔''

''تعجب ہے وہ اتنا غیر ذمے دار تو نہیں ہے خیر۔ ان لوگوں کو ان کے کمروں تک پہنچانے کے بعد ناظمہ بری طرح صوفی کی طرف بھاگی تھی۔

''کہاں گئے انکل......؟''

''پتا نہیں۔ درویش ہی جانتے ہیں۔''

''اور آپ اتنے اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہیں؟''

''آپ فکر مت کیجیے۔ میں ذمے دار ہوں۔''

''میں انہیں تلاش کرنے جا رہی ہوں۔''

''کوٹھی سے باہر بھی قدم نہ نکالیے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''آخر کیوں......؟''

''درانی صاحب کا یہی حکم ہے اور انہوں نے خاص طور سے مجھے اس کی ہدایت کر دی ہے۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''آپ عجیب آدمی ہیں۔ کیا آپ کا انداز حکم چلانے والا نہیں ہو گیا ہے؟''

''ذمے داری، ذمے داری ہوتی ہے محترمہ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''اگر میں جانا چاہوں تو آپ مجھے کیسے روکیں گے؟''

''منت سماجت سے درویشوں کا حوالہ دے کر۔'' صوفی نے عاجزی سے کہا اور سخت پریشانی کے باوجود ناظمہ اس کے انداز پر ہنس پڑی۔

''کمال کی بات ہے۔ ویسے آپ مجھے بہت عجیب لگ رہے ہیں اس وقت۔''

''غریب بھی ساتھ ساتھ ہی تجھیے۔ خادم عجیب و غریب ہے درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی نے جواب دیا پھر بولا۔

''دیکھیے کچھ درخواستیں ہیں جنہیں نوٹ فرما لیجیے گا مثلاً موجودہ حالات کا علم مہمانوں کو نہیں ہونا چاہیے۔ اپنے کزن کو بھی منع کر دینا۔''

''ٹھیک ہے میں کہہ دوں گی۔''

''ویسے ڈرنے کی بات نہیں ہے درانی صاحب بالکل خطرے میں نہیں ہیں۔''

''آپ میرا خیال ہے مجھے پریشان کر رہے ہیں صوفی صاحب۔''

''درویش رحم کریں۔'' صوفی نے مغموم لہجے میں کہا۔ شام ہو گئی لیکن ہاشم درانی واپس نہیں آیا تھا۔ ناظمہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس دوران ڈاکٹر فیلکس کئی بار ہاشم درانی کے بارے میں سوال کر چکا تھا۔ پھر اس نے پھیکے لہجے میں کہا۔

''یوں لگ رہا ہے جیسے ہاشم اب اپنے دوستوں سے گھبرانے لگا ہے، اگر ایسی بات تھی تو اس نے صاف صاف ہی کیوں نہ کہہ دیا۔'' پھر جس وقت نصرت اور حسن سے حماقت ہوئی ناظمہ وہاں موجود نہیں تھی۔ وہ کچن میں باورچیوں کو دیکھ رہی تھی۔ صوفی بھی کچن ہی میں تھا۔ ادھر ڈاکٹر فیلکس وغیرہ برآمدے میں تھے اور حسن اور نصرت سے باتیں کر رہے تھے۔ حسن لیرا کے اردگرد پھر رہا تھا اور اسے البم دکھا رہا تھا۔ ادھر خوب صورت برآمدے سے ڈاکٹر فیلکس دور کی پہاڑیوں کی چوٹیوں میں جھانک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسلسل افسردگی کے تاثرات تھے۔ اس نے کہا۔

''درانی سے ایسی امید نہیں تھی۔'' حسن اس وقت لیرا میں کھویا ہوا تھا اور لیرا کے انداز گفتگو سے اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بھی حسن میں دلچسپی لے رہی ہے بس اس وقت کھوپڑی کے لٹو نہ گھوم جاتے تو اور کیا ہوتا۔ اس نے لیرا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس انکل آج کل بڑی مشکل کا شکار ہیں۔''

''مشکل......؟'' ڈاکٹر فیلکس اسے گھورنے لگا۔

''ہاں۔'' وہ تقریباً دس پندرہ دن سے سخت پریشان تھے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے انکل فیلکس کہ اس دوران میں ہم رات رات بھر تک جاگتے رہے ہیں۔ انہیں کسی کا خوف تھا۔ وہ کہتے تھے کہ میں کسی بھی وقت کسی حادثے کا شکار ہو سکتا ہوں۔''

''کیا واقعی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ تم اس پر بھی اتنے اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہو۔'' ڈاکٹر فیلکس اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اسمشیر اور لیرا انہیں گھورنے لگے۔ نصرت نے شاید ان کی گفتگو سن لی تھی۔ وہ حسن کو کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگا حالانکہ اسے اس بات کو مہمانوں سے چھپانے کی ہدایت نہیں کی گئی تھی لیکن اسے کم از کم یہ احساس تھا کہ ہاشم درانی ان باتوں کو راز ہی رکھنا چاہتا ہے۔

''ناظمہ کہاں ہے؟'' ڈاکٹر فیلکس نے حسن سے کہا۔

''شاید کچن میں۔'' ڈاکٹر فیلکس کچن کی طرف بڑھ گیا تھا۔ بقیہ لوگ وہیں بیٹھے رہے تھے۔ ناظمہ

کچن میں باورچیوں کی نگرانی کر رہی تھی اور خود بھی وہیں کچن میں ہی تھیں۔ صوفی بھی وہیں قریب ہی کھڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر فیلکس نے ناظمہ کو آواز دی۔

’’یہ کیا معاملہ ہے ناظمہ کیا قصہ ہے یہ؟‘‘

’’اوہو۔ انکل آپ یہاں تو بہت گرمی ہے میں ابھی آتی ہوں۔‘‘

’’لعنت بھیجو گرمی پر۔ یہ بتاؤ درانی کا کیا معاملہ ہے۔ کیا ہوا ہے اسے۔ کس سے خوف زدہ ہے وہ؟‘‘ صوفی کا جگالی کرتا منہ ایک دم رک گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ ناظمہ کو کھانوں کے بارے میں ہدایت دے رہا تھا اور ناظمہ ہنس رہی تھی۔ بڑا اچھا موڈ تھا اس کا کیونکہ صوفی کی باتیں بڑی مزے دار تھیں۔ وہ کچن کے بارے میں اپنی معلومات کا مظاہرہ کر رہا تھا اور ایسی ایسی بے تکی باتیں بتائی تھیں اس نے مثلاً لہسن کی چٹنی، باجرے کی روٹی کے ساتھ اسی طرح کے اور بہت سے تجربات ناظمہ کے لیے بات بتانا مشکل ہو گیا۔ وہ کہنے لگی۔

’’پتا نہیں انکل ان دنوں کچھ ایسی ہی گزر رہی ہے۔ انکل درانی بغیر کسی کو بتائے ہوئے چلے جاتے ہیں اور جب ان کی مرضی ہوتی ہے تو واپس آ جاتے ہیں۔‘‘

’’تم جھوٹ بول رہی ہو۔ مجھے حسن نے سب کچھ بتا دیا ہے۔‘‘ ناظمہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اسی وقت صوفی بول اٹھا۔

’’حسن صاحب بڑی سنجیدگی سے مذاق کرتے ہیں۔ ویسے ڈاکٹر صاحب ساری باتیں بڑی عجیب وغریب ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔‘‘

’’کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ وہ میرا بہت اچھا دوست ہے اگر وہ کسی پریشانی کا شکار ہے تو کم از کم میں تو خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔‘‘

’’آپ یقین کیجیے انکل کوئی خاص بات نہیں ہے۔‘‘

’’میں مطمئن نہیں ہوا۔ تم برآمدے میں آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔‘‘ ڈاکٹر فیلکس کچن سے باہر نکل گیا۔

’’میری عجیب مصیبت ہے میں کیا کروں؟‘‘

’’آپ نے ان بے وقوفوں کو منع کیوں نہیں کیا درویشوں کی دعاؤں سے۔‘‘

’’مگر یہ تو...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ سخت پریشان ہوں میں۔‘‘

’’میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ میں نے درانی صاحب کو ایک محفوظ جگہ پہنچا دیا ہے۔‘‘

’’مگر میں ان لوگوں کو کیا بتاؤں زبردستی کے مہمان۔‘‘

’’قصور ان دونوں کا ہے۔ حسن اور نصرت۔‘‘

’’خیر ایک کام تو کر لیجیے آپ۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے متعلق ان لوگوں کو کچھ معلوم ہو۔‘‘ ادھر نصرت حسن کو کافی ذلیل کر چکا تھا۔

’’ہاں مجھے بتاؤ کیا قصہ ہے یہ سب۔‘‘ ڈاکٹر فیلکس نے ناظمہ سے کہا۔

’’میں تو کچھ بھی نہیں جانتی۔ مجھ سے زیادہ تو سیکرٹری صاحب کو تفصیلات معلوم ہیں۔‘‘ ڈاکٹر فیلکس صوفی کی طرف گھوم گیا۔

’’جناب عالی میں سیکرٹری ضرور ہوں، محبوبہ نہیں ہوں درانی صاحب کی۔ ویسے مجھے درانی صاحب کی دماغی حالت پر شبہ ہے رنگین ستاروں سے خوف زدہ ہیں۔‘‘

’’رنگین ستارے......؟‘‘

’’جی ہاں۔ بس ایک بات ہی کرتے رہتے ہیں سبز، سیاہ، سرخ۔‘‘

’’تم لوگ مجھے بڑے پراسرار معلوم ہو رہے ہو۔ یوں لگتا ہے جیسے مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔‘‘

’’جی ہاں۔ ہم اپنی عزت چھپاتے رہے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔‘‘

’’دیکھیے میں بتاتی ہوں آپ کو مجھے حالات کا زیادہ علم نہیں ہے۔ انکل کو ایک دن ایک کارڈ ملا جس پر سبز رنگ کا ستارہ بنا ہوا تھا۔ اس وقت سے وہ پریشان نظر آنے لگے۔ اس رات بھی انہوں نے ٹہل ٹہل کر صبح کی اور دوسری صبح انہوں نے آٹھ پہاڑی ملازم رکھے جو رات بھر عمارت کے باہر پہرہ دیتے ہیں۔ ہمیں انہوں نے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ کسی قسم کا خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔‘‘

’’ستاروں والا کارڈ۔‘‘

’’جی اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔‘‘

’’مگر تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی۔‘‘

’’کسی کو بھی نہیں بتائی جا رہی تھی۔ آپ کے بارے میں تو کوئی تذکرہ بھی نہیں ہوا تھا۔‘‘ ناظمہ نے کہا اور ڈاکٹر فیلکس پریشانی کے انداز میں سوچ میں ڈوب گیا۔

♥......♥......♥

جمشید مرزا کی جان نکل گئی۔ آئی جی کی طرف سے بلاوا آیا تھا۔ بہرحال وہ نہ جانے کیا کیا دعائیں پڑھتا ہوا آئی جی صاحب کے کمرے میں داخل ہوا۔ سلیوٹ کیا اور سامنے کھڑا ہو گیا، لیکن حیرت ناک طور پر آئی جی صاحب کا لہجہ نرم تھا۔

’’بیٹھو۔‘‘

’’یس سر! تھینک یو سر!‘‘

’’مبارک باد پیش کرنی چاہیے تمہیں۔ وہ فولادی انسانوں کا مسئلہ حل ہو گیا۔‘‘

’’جی سر! یس سر۔ تھینک یو سر۔‘‘

’’میرا خیال ہے تمہیں گولڈ میڈل ملنا چاہیے اس سلسلے میں۔ تمہیں بھی تو ایک پینل کا انچارج بنایا گیا تھا۔‘‘

’’سر آپ بس یوں سمجھ لیجیے کہ میں بھی معاملے کی تہ تک پہنچنے ہی والا تھا لیکن بعد میں سر! کچھ عجیب سا گھپلا ہو گیا۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے جو پینل پولیس نے بنائے تھے۔‘‘

’’ہاں تم یہ کہنا چاہتے ہو گے کہ وہ مسئلہ ان میں سے کسی نے حل نہیں کیا بلکہ ہوم سیکرٹ سروس کے

کسی ممبر نے۔"

"نہیں سر۔ یہ بات نہیں ہے۔ بات وہی مداخلت بے جا کی آ جاتی ہے، مگر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔"

"کیا مطلب......؟"

"سر! آپ سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اس ایک شخص کے بارے میں جو پہلے کبھی محکمہ پولیس میں رہ چکا ہے۔ نہ جانے کس طرح اس نے وزارت داخلہ کی سرپرستی حاصل کر لی ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے بہ ظاہر وہ کوئی عہدے دار نظر نہیں آتا لیکن مکمل طور پر اسے تحفظ دیا جاتا ہے۔ سر جارحیت کرتا ہے، خاص طور سے پولیس کے ساتھ۔"

"دیکھیے مسٹر جمشید مرزا! آپ ایسا کریں تحریری طور پر مجھے رپورٹ کریں اور اس شخص کے بارے میں تفصیل معلوم کریں جس کا نام صوفی ہے اور جس کی آپ کئی بار شکایت کر چکے ہیں۔ جمشید مرزا کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ یہ بم اس طرح پھٹ جائے گا اسے نہیں معلوم تھا، لیکن پھر تقدیر نے یہ مسئلہ خود حل کر دیا۔

"یہ سب بعد کی باتیں ہیں فی الحال یوں کریں کہ سراج پور چلے جائیں۔ سراج پور میں ایس پی شاہد علی سے ملیں۔ ایس پی شاہد علی آپ کو تفصیل بتائے گا۔ وہاں آپ کو کام کرنا ہے۔ فوری طور پر یہ بندوبست کر لیں۔"

"لیس سر!...... لیس سر!" اور جمشید مرزا نے جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ اگر فولاد کے اس ٹکڑے کے بارے میں بات ہو جاتی اور اسے طلب کیا جاتا تو شاید جمشید مرزا وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑتا۔ بہرحال تیاریاں کیں اور اس کے بعد سراج پور پہنچ گیا۔ سراج پور میں اس نے ایس پی شاہد علی سے ملاقات کی۔ شاہد علی نے پرتپاک انداز میں ان کا خیر مقدم کیا۔

"جمشید مرزا صاحب! یاد ہوں میں آپ کو۔ میری اور آپ کی ملاقات دارالحکومت میں ہی ہوئی تھی۔"

"جی ہاں۔ جی ہاں۔ بالکل مجھے یاد ہے۔"

"ویسے آپ نے خاصی ترقی کی، بہت سے خاص واقعات آپ کے نام سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ آپ کس طرح اتنے الجھے ہوئے واقعات کا سراغ لگا لیتے ہیں۔" جمشید مرزا نے چونک کر ایس پی کو دیکھا۔ اس خیال کے ساتھ کہ کیا شاہد اس کا مذاق اڑا رہا ہے لیکن ایسا کوئی تاثر شاہد کے چہرے پر نہیں ملا تھا۔

"بس محنت میں عظمت ہے۔ خیر آپ مجھے ان واقعات کے بارے میں بتائیے۔"

"ایک نام آج کل بڑی اہمیت اختیار کر چکا ہے۔"

"کیا نام ہے؟"

"شیرٹن۔ یہ نام بڑی پراسرار اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ شیرٹن کے بارے میں علم ہوا ہے کہ یہاں موجود تمام لوگوں کو اس کی طرف سے دھمکی آمیز خطوط ملتے ہیں اور انہیں موت کی دھمکی دے کر کہا جاتا ہے کہ اتنی اتنی رقوم ادا کرنی ہے ورنہ موت کی تیاریاں کر لیں۔"

"جن لوگوں کو یہ دھمکی آمیز خطوط ملے ہیں ان میں سے کوئی ہلاک ہوا......؟"

"نہیں۔ سب زندہ ہیں اور ان میں سے کسی نے ابھی تک یہ اطلاع نہیں دی کہ ان سے کوئی رقم

وصول کر لی گئی ہے۔ دو ہی باتیں ہیں یا تو وہ لوگ اصل بات بتاتے نہیں ہیں یا پھر کوئی شریر طبیعت آدمی خواہ مخواہ سنسنی پھیلانے کے لیے ایسا کر رہا ہے۔ بے شمار افراد کو اس قسم کے خطوط ملے ہیں اور ان سے بڑی رقم کے مطالبے کیے گئے ہیں۔"

"بڑے بڑے لوگ ہیں یقیناً ان کی فہرست ہو گی آپ کے پاس۔"

"ہاں ہے لیکن ایک حیرت انگیز بات اور بھی ہے۔"

"وہ کیا......؟"

"یوں سمجھیے کہ سراج پور کا سب سے بڑا آدمی جو بہت بڑا بزنس مین بھی ہے اور بے پناہ دولت مند بھی۔ اس کا نام ہاشم درانی ہے اس کی طرف سے کوئی ایسی شکایت نہیں ملی۔"

"مطلب......؟"

"نہیں۔ جمشید مرزا صاحب میں کوئی ایسا لفظ نہیں کہوں گا جو میرے لیے مشکل بن جائے۔"

"ہوں۔"

"لیکن مجھے اسی مقصد کے لیے یہاں بھیجا گیا ہے۔ میں ہاشم درانی سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ براہ کرم مجھے اس کے بارے میں تفصیل بتا دیجیے۔" جمشید مرزا نے کہا اور ایس پی شاہد علی جمشید مرزا کو ہاشم درانی کے بارے میں تفصیلات بتانے لگا۔

♥......♥......♥

رات کے کھانے پر فضا بڑی سوگوار سی تھی۔ انہوں نے بڑی خاموشی سے کھانا ختم کیا اور پھر کافی پینے کے لیے برآمدے میں جا بیٹھے فیلکس بری طرح سنجیدہ تھا۔ اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"افسوس مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس بار یہاں آ کر اس صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مجھے اپنے دوست کی پریشانی سے پریشانی ہے باقی اور کوئی بات نہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ سیدھے سیدھے اس بارے میں پولیس کو اطلاع دی جائے۔ آخر ہاشم کہاں غائب ہو گیا، مگر تم لوگ بھی کمال کے لوگ ہو اس طرح بے حس بیٹھے ہو جب کہ میں یہ سمجھتا ہوں۔"

"آپ نہیں سمجھتے انکل فیلکس۔ یہ سب انکل ہی کی خواہش پر ہو رہا ہے۔ میں کیا کر سکتی ہوں؟ وہ اس معاملے کو عام نہیں کرنا چاہتے۔ پولیس کے شروع سے ہی خلاف ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں کبھی اچانک غائب ہو جاؤں تو تم لوگ فکر مند نہ ہونا۔ میں خطرہ دور ہوتے ہی واپس آ جاؤں گا لیکن پولیس کو اس کی اطلاع مت دینا۔"

"حالانکہ میرے خیال میں یہ ایک احمقانہ بات ہے۔" اسمشیر نے رائے دی اور لیرا سر جھکائے خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر فیلکس بولا۔

"وہ ہمیشہ ہی پراسرار رہا ہے ابھی یہ لوگ یہی باتیں کر رہے تھے کہ ایک ملازم نے آ کر اطلاع دی۔

"جناب عالی! ایک پولیس آفیسر ملنا چاہتے ہیں۔ وردی میں ملبوس ہیں۔" ان کی نگاہیں گیٹ کی جانب اٹھ گئیں۔ دور سے انہیں پولیس کی جیپ نظر آ گئی تھی۔ پہلے انہوں نے اس طرف توجہ نہیں کی تھی۔

آنے والا شاید اندر بھی آ گیا تھا۔ برآمدے سے آگے ایک اور برآمدہ تھا۔ وہ وہاں تک پہنچ گیا تھا۔ ناظمہ نے صوفی کی طرف دیکھا۔ صوفی نے ملازم سے کہا۔

”بلاؤ۔“ لیکن جب آنے والا اندر آیا تو صوفی ایک دم سے بھونچکا رہ گیا تھا۔ وہ جمشید مرزا تھا۔ جمشید مرزا نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اور پھر اچانک صوفی کو دیکھ کر وہ اس طرح اچھلا کہ سبھی نے محسوس کر لیا۔ ایک لمحے تک وہ صوفی کو اور صوفی اسے دیکھتا رہا۔ یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے دونوں آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو ہپناٹائز کر رہے ہوں۔ جمشید مرزا کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ صوفی کی کرخت نگاہوں میں ایک پیغام چھپا ہوا ہے۔

بہرحال وہ پولیس کی وردی پہنے ہوئے تھا اور اس وردی پر اس کے عہدے کے بیج لگے ہوئے تھے۔ خاص طور سے ڈاکٹر فیلکس نے اسے دیکھا اور آگے بڑھ کر بولا۔

”میرا نام فیلکس ہے کہیے آفیسر کیسے تشریف لائے آپ۔“ جمشید مرزا نے اب گردن گھمائی۔ ایک ایک کو دیکھا اور بولا۔

”میں ہاشم درانی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ ناظمہ ایک دم آگے بڑھی اور بولی۔

”میں ان کی بھتیجی ہوں آفیسر۔ وہ کسی کام سے گئے ہوئے ہیں۔“

”کب تک واپسی ہوگی۔ کیا میں انتظار کرلوں؟“

”نہیں وہ آؤٹ آف سٹی ہیں۔“

”واپسی کب تک ہو جائے گی؟“

”کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ وہ اپنا پروگرام بتا کر نہیں جاتے۔“

”کیا آپ لوگ اپنا تعارف مجھے کرائیں گے؟“

”درویشوں کی دعاؤں سے پہلے میں اپنا تعارف کرا دوں۔ خادم کو صوفی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ صوفی نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ جمشید مرزا ایک لمحے تک سوچتا رہا پھر اس نے بھی ہاتھ آگے بڑھا کر صوفی سے مصافحہ کیا۔ صوفی کی باچھیں کھل گئی تھیں۔

”یہ ڈاکٹر فیلکس ہیں اور یہ مسٹر اسمشیر ہیں درویشوں کی دعاؤں سے اور یہ محترمہ لیرا باقی سب میرا مطلب ہے یہ خاتون ہیں۔“ صوفی نے ایک ایک کے بارے میں بتایا۔

”مجھے تو ہاشم درانی صاحب سے بڑا ضروری تھا۔ میں دارالحکومت سے آیا ہوں۔ ان سے ایک بہت ضروری کام تھا مجھے۔“

”آپ کام بتا دیجیے ہم انہیں بتا دیں گے۔“ ناظمہ بولی۔

”آپ میں سے کوئی صاحب میرے ساتھ آئیں۔ میں تنہائی میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں بلکہ صوفی صاحب آپ تشریف لے آئیے۔“

”بسر و چشم...... بسر و چشم۔“ صوفی نے کہا اور اس کے بعد جمشید مرزا اسے کوٹھی کے گیٹ سے باہر ہی لے گیا۔ اس نے اسے پولیس جیپ میں بیٹھنے کی دعوت دی۔

”جاؤں گا کہیں نہیں یہاں سے۔“

”تم لوگ جاؤ۔ ہمیں تھوڑی دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دو۔“ جمشید مرزا نے اپنے ساتھ آئے ہوئے لوگوں سے کہا۔ یہ انسپکٹر وغیرہ تھے۔ شاہد علی مصروف تھا اس لیے ساتھ نہیں آیا تھا یا جمشید مرزا اسے خاص طور سے ساتھ نہیں لایا تھا۔ جیپ میں بیٹھ کر جمشید مرزا نے کہا۔

”تمہاری یہاں موجودگی میرے لیے بڑی حیران کن ہے؟“

”یہی کیفیت ہماری بھی ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ کیا آپ کا ٹرانسفر ہو گیا؟“

”صوفی صاحب ایک بڑی عجیب بات ہے۔ آپ بار بار درویشوں کا تذکرہ کرتے ہیں، میری پیری مریدی تو نہیں ہے کسی سے لیکن تھوڑا سا شگون اور بدشگونی پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ بہت سے واقعات تجربات میں آ چکے ہیں۔ میری اور آپ کی ملاقات جب بھی ہوئی غلط انداز میں ہوئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مخالف بن کر سامنے آئے لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ ہم لوگ اکثر سامنے آجاتے ہیں۔“

”حق اللہ۔ درویشوں کا کرم ہے۔ بس کیا کہا جاسکتا ہے۔“

”اور آپ نے بھی یہ ٹھان لی ہے کہ میرے خلاف ہی کام کرتے رہیں گے۔“

یہ خدا ایسی بات نہیں ہے۔ بس آپ ہمارے راستے کاٹتے ہیں اور ہم ان کٹے ہوئے راستوں کو جوڑتے جاتے ہیں۔ مجبوری ہے۔ کیا کیا جائے؟“

”آپ نے وہ لوہے کا ٹکڑا لے جا کر مجھے جس مصیبت میں ڈال دیا تھا آپ تصور نہیں کر سکتے۔ سولی پر چڑھا ہوا تھا میں۔ وہ تو کیس ختم ہو گیا بلکہ جہاں تک میری اطلاع ہے آپ ہی نے ختم کیا تھا وہ کیس۔

”لوہے کا وہ ٹکڑا آپ ہمیں عنایت نہ فرماتے درویشوں کی دعاؤں سے تو شاید ہم بھی اصلیت تک نہ پہنچ پاتے۔“

”دل میں بڑی آرزو تھی کہ آپ سے مل کر کم از کم یہ تو معلوم کروں کہ سارا قصہ کیا تھا؟“

”تو یہی معلوم کرنے آپ یہاں تشریف لائے تھے درویشوں کے کرم سے۔“

”جی نہیں۔ یہاں میں ایک اور مسئلے میں آیا تھا۔ کچھ عجیب وغریب واقعات ہو رہے ہیں یہاں۔ اچھا ایک بات بتایئے۔ کیا آپ بھی شیرٹن کے چکر میں یہاں آئے ہیں؟“

”نہیں۔ ہمیں کسی شیر کی ٹن ٹن سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اصل میں درانی صاحب بہت ہی نفیس انسان ہیں۔ پچھلے دنوں دارالحکومت گئے تھے۔ ہماری پرانی یاد اللہ ہے۔ کہنے لگے صوفی میاں کبھی سراج پور آئے۔ دیکھا ہے سراج پور یا نہیں۔ ہم نے انہیں بتایا کہ حضرت کبھی جانا نہیں ہوا۔ تو کہنے لگے آ کر یہاں کی بہار دیکھو۔ خاص طور پر ایسے موسم میں تو سراج پور انتہائی خوبصورت ہو جاتا ہے۔ حسینہ بیگم کہنے لگیں کہ صوفی مجھے پہاڑ دکھا دو۔ بس کچھ اس انداز میں کہا انہوں نے کہ ہم مجبور ہو گئے۔ اب ساتھ میں معشوق نشیلے بھی چلے آئے۔“ صوفی نے کہا۔

جمشید مرزا اچھل پڑا۔ اس نے یقین نہ کرنے والے انداز میں صوفی کو دیکھا پھر بولا۔ ”وہ...... وہ دونوں بھی ہیں۔ آپ سچ کہہ رہے ہیں صوفی صاحب!“

''ہم آپ سے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔''

جمشید مرزا کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔

''کب تک قیام ہے آپ کا؟''

''اللہ بہتر جانتا ہے۔ حق اللہ۔''

''دیکھیے یہ بڑا سنگین مسئلہ ہے۔ شیرٹن کے بارے میں آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ اتنا میں بھی سمجھتا ہوں کہ آپ اسی سلسلے میں آئے ہیں۔''

''درویش آپ پر رحم کریں۔'' صوفی بولا۔

''پھر بتائیے۔ شیرٹن کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے صوفی صاحب! میں آپ کی طرف مسلسل دوستی کا ہاتھ بڑھاتا رہا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ نے ابھی تک میری دوستی قبول ہی نہیں کی ہے۔''

''قبول کی ہم نے، لیکن شیرٹن کا کیا قصہ ہے ہمیں بھی بتائیے۔''

''کیا واقعی آپ کو نہیں معلوم؟''

''واقعہ یہی ہے درویشوں کے کرم سے۔''

''وہ ایک بلیک میلر ہے۔ لوگوں کو دھمکی آمیز خطوط لکھتا ہے۔ یہاں کے تمام بڑے لوگوں کو اس کی طرف سے خطوط مل چکے ہیں۔ یہ اطلاع تو مل جاتی ہے کہ اس کی طرف سے کسی بڑے آدمی کو کوئی خط موصول ہوا۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا۔ ہاشم درانی صاحب سے بھی میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ انہیں کوئی بھی ایسا خط ملا یا نہیں اور اگر ملا تو کیا انہوں نے اس بلیک میلر کو کوئی رقم ادا کی ہے۔ مجھے اسی تفتیش کے لیے دارالحکومت سے یہاں بھیجا گیا ہے۔''

''بڑے تعجب کی بات ہے، اب ہم آپ کو یقین دلا رہے ہیں کہ ہمیں اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں معلوم۔ ہم تو بس سیر وسیاحت کی غرض سے چلے آئے تھے۔''

''تب تو میں اسے اپنی خوش قسمتی ہی سمجھتا ہوں کہ میری آپ سے ملاقات ہوگئی اور اس بار میں آپ کو مجبور کر ہی دوں گا کہ آپ میری مدد کریں اور میری دوستی قبول کر لیں۔''

''دوستی تو ہم نے قبول کر لی ہے۔ جہاں تک مدد کا معاملہ ہے اس کے بارے میں ذرا غور کرنا ہوگا۔ ویسے یہ سلسلہ کتنے عرصے سے چل رہا ہے۔''

''جہاں تک میری معلومات کا سوال ہے ایک ماہ سے ایک پراسرار آدمی یا گروہ یہاں کے دولت مند لوگوں کو دھمکی کے خطوط لکھ کر ان سے بڑی رقموں کا مطالبہ کرتا ہے۔ دھمکی کے مطابق عدم ادائیگی کی صورت میں انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ ویسے ان سب نے اس کی رپورٹ کی ہے لیکن......''

''لیکن سے آگے کیا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''براہ کرم راز کو راز ہی رکھیے گا۔ ہاشم درانی کی طرف سے اس قسم کی کوئی شکایت موصول نہیں ہوئی۔''

''تو آپ زبردستی شکایت موصول کرانا چاہتے ہیں۔'' صوفی نے کہا۔

''نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ آخر درانی صاحب ہی کو کیوں چھوڑا گیا اور اگر انہیں

کوئی دھمکی ملی ہے تو انہوں نے اس کی رپورٹ کیوں درج نہیں کرائی؟''

''یہ تو کوئی بات نہیں ہے۔ فرض کیجیے کہ انہیں بھی دھمکی کا خط ملا تو ضروری ہے کہ وہ آپ کے محکمے کو اس کی اطلاع دیں۔ ممکن ہے انہوں نے اسے صرف مذاق سمجھا ہو۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو اپنی قوت بازو کے علاوہ کسی پر بھروسا نہیں ہوتا۔''

''میں صرف اتنا معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا ہاشم درانی کو بھی اس قسم کا کوئی خط ملا ہے یا نہیں؟''

''یہ بات ظاہر ہے میں نہیں بتا سکتا۔''

''بتا سکتے ہیں آپ صوفی صاحب! میں بتاؤں میرے دل میں کیا ہے؟''

''نخ...... خدا کے لیے دلوں کی باتیں ہم سے برداشت نہیں ہوتیں، درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''پھر بھی کہے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔ آپ کو اسی سلسلے میں یہاں طلب کیا گیا ہے یا بھیجا گیا ہے اور ہاشم درانی نے آپ کو اسی سلسلے میں اپنا مہمان بنایا ہے۔''

''دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے ہیں میری طرف اور یقین کرتے نہیں ہیں میری بات پر۔''

''ایک بار پھر ایک مودبانہ درخواست کرتا ہوں صوفی صاحب! اگر آپ چاہیں تو اس معاملے میں مجھے شریک کر لیں اور میری مدد کریں۔ بے عزتی کی انتہا ہو چکی ہے۔ اس بات کے امکانات ہیں کہ میرے عہدے میں کمی کر دی جائے۔ کیونکہ بہت عرصے سے مسلسل ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔''

''حق اللہ...... حق اللہ...... حق اللہ۔''

''خدا حافظ۔ اس تکلیف کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ ویسے ہاشم درانی صاحب سے ملاقات ضروری ہے۔ ان کے لیے مجھے یہاں انتظار کرنا ہوگا۔'' صوفی جیپ سے نیچے اتر گیا اور جمشید مرزا کے اشارے پر اس کے ساتھی جیپ میں آ بیٹھے۔ جیپ اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی تھی۔

صوفی واپس اندر آ گیا تھا لیکن اندر تمام لوگ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔

''کیا ہوا...... کیا بات ہے؟''

''عجیب سی کہانی تھی درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''کیا مسٹر صوفی؟''

''وہ دارالحکومت سے آیا ہے ایس پی کا عہدہ رکھتا ہے۔''

''وہ تو ہمیں بھی اندازہ ہو گیا تھا لیکن وہ یہاں آیا کس سلسلے میں ہے؟'' ڈاکٹر فیلکس نے کہا اور صوفی نے پوری بات دہرا دی۔ وہ سب حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے پھر صوفی نے ناظمہ سے پوچھا۔

''کیا درانی صاحب کو بھی شیرٹن کی طرف سے کوئی خط ملا ہے؟''

''نہیں۔ میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''ہو سکتا ہے ایسا ہوا ہو، لیکن ہاشم درانی صاحب نے اس کا تذکرہ نہ کیا ہو۔''

''کیا کہہ سکتی ہوں؟''

''تم نے دوسرے معاملے کا تذکرہ نہیں کیا ایس پی سے۔'' ڈاکٹر فیلکس نے پوچھا۔

''ہرگز نہیں جناب! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''یار! یہ تمہارے درویش کیا چیز ہیں میری سمجھ میں بات ہی نہیں آتی۔''

''درویش آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گے مسٹر فیلکس! ان کے سلسلے میں ایک لفظ بھی الٹا سیدھا نہ کہیں۔''

''جہنم میں جاؤ۔'' ڈاکٹر فیلکس نے غرا کر کہا اور وہاں سے اٹھ گیا۔

''اڑتالیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ ہاشم درانی واپس نہیں آیا تھا۔ باقی تمام لوگوں کو تشویش تھی لیکن صوفی نے ان سے صاف صاف لہجے میں کہا تھا۔

''آپ لوگوں کو علم ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں اور یہ بھی علم ہے آپ کو کہ ہاشم درانی صاحب نے مجھ پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا ہے اور یہ بھی میں آپ کو بتا چکا ہوں درویشوں کی دعاؤں سے کہ وہ خیریت سے ہیں اور میری ہدایت پر روپوش ہوئے ہیں کیونکہ یہ بے حد ضروری ہے اور یہ بھی بتا چکا ہوں آپ کو کہ اس بارے میں ڈاکٹر فیلکس یا کسی اور سے تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے باقی اگر آپ لوگوں کو پریشان ہونے کی خوشی ہے تو پھر خوشی سے پریشان ہوں۔ مجھے اعتراض نہیں ہے۔''

''یار صوفی صاحب! مر جانے کی حد تک بور ہو رہے ہیں۔ ادھر یہ مہمان آئے ہوئے ہیں وہ الگ بور کر رہے ہیں۔ وہ لڑکی لیرا مجھ سے کئی بار کہہ چکی ہے کہ سراج پور کیا صرف اسی کوٹھی تک محدود ہے۔ اب آپ بتائیے میں کیا کروں؟'' صوفی نے ایک لمحے تک کچھ سوچا اور پھر ناظمہ کی طرف رخ کر کے بولا۔

''آپ کیا کہتی ہیں محترمہ! درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''درویش سے تو خیر ابھی تک میرا واسطہ نہیں پڑا ہے نہ ہی میں سمجھتی ہوں کہ ان کی دعائیں میرے لیے بلاوجہ ہو سکتی ہیں لیکن اگر یہ لوگ باہر جانا چاہتے ہیں تو کم از کم ذاتی طور پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر آپ لوگ انہیں سیر کرائیے۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔'' صوفی نے محسوس کیا تھا کہ حسن، نصرت اور سمیر تو بے حد خوش ہو گئے ہیں۔ سمیر نے کہا۔

''تو پھر کیوں نہ آج کا پورا دن سراج پور کے نواحات کی سیر کر کے گزارا جائے اور رات کو کسی عمدہ سے ہوٹل میں ڈنر۔''

''تمہاری طرف سے۔'' ناظمہ نے مسکرا کر کہا۔

''سو بار۔ لیکن لیرا......'' یہ کہہ کر سمیر کھانس کر حسن اور نصرت کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

''ہم میں سے ہر کوئی یہ خرچ اٹھانے کے لیے تیار ہے۔ تم اپنے آپ کو تیس مار خاں نہ سمجھو۔'' حسن نے سینہ ٹھونک کر کہا۔

''اچھا فضول بات بالکل بند ورنہ ہو سکتا ہے انگلینڈ میں بھی جوتے بازی کا رواج پڑ گیا ہو۔'' ان لوگوں کو یہ پیش کش کی گئی تو سب خوشی سے تیار ہو گئے۔ کسی اور نے تو خیر اس وقت تک نہیں کہا تھا سب سے پہلے ڈاکٹر فیلکس نے کہا۔

''دیکھو مسٹر صوفی! میں چاہوں گا کہ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔''

''ان لوگوں کا جو پروگرام ہے جناب من درویشوں کی دعاؤں سے وہ خراب ہو جائے گا۔''

''ہرگز نہیں۔'' ناظمہ نے کہا۔

''دیکھیے میرا یہ لباس آپ کے لیے تماشا بن جائے گا۔''

''پلیز صوفی صاحب! آپ لباس تبدیل نہیں کر سکتے؟''

''لباس تبدیل کر لوں گا لیکن میری باڈی تو تبدیل نہیں ہو گی؟''

''وہ چلے گی۔'' صوفی کو بھی نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے باقاعدہ سوٹ پہن لیا تھا۔ باقی جو کچھ تھا سو تھا ہی لیکن نہ جانے سوٹ کیوں اس پر جچ گیا تھا۔ لیرا نے کہا۔

''ونڈر فل۔ آپ نے بلاوجہ اپنے آپ کو تماشا بنا رکھا ہے۔ میں سمجھتی ہوں اس کی بھی کوئی خاص وجہ ہے سیکرٹری صاحب۔'' صوفی نے گھبرا کر معشوق نشیلے کی طرف دیکھا تھا اور معشوق نشیلے نے ایک آنکھ دبا لی تھی۔

طے یہ کیا گیا تھا کہ معشوق نشیلے اور حسینہ بیگم کو بھی ساتھ لے لیا جائے۔ دن بھر کے پروگرام میں بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ شام کو ڈنر کے معاملے میں ان لوگوں نے صوفی کی خوشامد کی تھی کہ ان لوگوں کو ساتھ نہ لیا جائے اور صوفی مان گیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

دن بھر کی تفریح کے بعد ان کو دوسری گاڑی میں بٹھایا جائے اور یہ کہہ کر حویلی بھیج دیا جائے کہ ہم لوگ بھی آ رہے ہیں اور اس کے بعد کہیں بھی چلا جائے۔ پھر سارا دن حسینہ بیگم کے لطیفے جاری رہے تھے۔ معشوق نشیلے بھی فارسی میں شاعری کرتے رہے تھے اور تو اور یہ باہر سے آنے والے لوگ بھی ان دونوں میں خوب دلچسپی لے رہے تھے۔ ڈاکٹر فیلکس نے ناظمہ سے درخواست کی تھی کہ جو کچھ یہ عورت کہہ رہی ہے اس کا ترجمہ اسے بتاتی رہیں لیکن بہت سی ایسی باتیں تھیں جن کا ترجمہ ناظمہ کو بھی نہیں آتا تھا۔

بہرحال شام تک کی یہ تفریح بہت اچھی رہی۔ اس کے بعد معشوق نشیلے اور حسینہ کے سامنے واپسی کا مسئلہ رکھا گیا۔

''دل نہیں بھرا سراج پور تو بہت اچھی جگہ ہے اس پر تو پورا دیوان لکھا جا سکتا ہے۔''

''گھر چل کر اس مسئلے پر آپ سے گفتگو ہو گی نشیلے صاحب!''

''بالکل بالکل۔ تو اب گھر چل رہے ہیں؟''

''نہیں جانا......؟''

''نہیں نہیں جانا تو ہے۔''

''چلیے بیٹھیے گاڑی میں۔'' حسینہ اُچک کر کار میں بیٹھ گئی تھی۔ ڈرائیور کو خاص طور سے ہدایت کر دی گئی کہ ان دونوں کو لے کر چل پڑے۔ معشوق نشیلے بیٹھے ہی تھے کہ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ حسینہ بیگم بولی۔

''اے موئے! اڑا کر تو نہیں لے جا رہا، باقی لوگ کہاں ہیں؟''

''ارے ڈرائیور صاحب! فارسہ سمجھتے ہیں آپ؟''

''نہیں جناب!''

''یہ جا کہاں رہے ہیں آپ؟''

''گھر جی۔''

''اور باقی افراد۔''

''دوسری گاڑی میں آ رہے ہیں۔''

''جلد بازی نہیں کر دی تم نے۔''

''نہیں جناب! آپ بالکل بے فکر رہیں وہ لوگ بھی ہمارے ساتھ ساتھ ہی اندر داخل ہوں گے۔'' ڈرائیور نے جواب دیا تھا۔

♥......♥......♥

ہوٹل واقعی شاندار تھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ سراج پور جیسی چھوٹی سی آبادی میں ہے۔ اصل میں وہی مسئلہ تھا سیاحوں کی یہاں زبردست آمد و رفت رہتی تھی۔ سراج پور کے خوب صورت پہاڑی علاقوں کو دیکھنے کے لیے باقی اور کچھ ہوا ہو نہ ہوا ہو یہاں لیکن ہوٹل بڑے اعلیٰ درجے کے تعمیر ہوئے تھے اور سیزن میں ان میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ ڈاکٹر فیلکس اور لیرا کو اسی خوب صورت ہوٹل میں لایا گیا تھا۔ ہاشم درانی کے تینوں بھتیجے اور چوتھی بھتیجی صوفی کے ساتھ تھے۔ صوفی اس وقت برا نہیں لگ رہا تھا۔ یہاں آنے کے بعد وہ لوگ کافی خوش نظر آنے لگے۔ دن بھر کی سیر و تفریح نے لیرا کو بھی خوش کیا تھا۔ ہوٹل بہت شان دار تھا۔ ریکر پال میں رقص کا آغاز ہوا تو لیرا نے حیرت انگیز طور پر صوفی کو پیش کش کر دی۔

''آپ میرے ساتھ ڈانس کریں گے۔'' حسن، نصرت اور سمیر کا منہ بگڑ گیا تھا، لیکن صوفی نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''بخدا...... صرف قوالیوں میں ڈانس کیا کرتے ہیں۔ ویسے ہم نے کبھی ڈانس نہیں کیا۔''

''پر قوالیوں کا کوئی کلب ہے؟''

''نہیں۔ اگر ہاشم درانی صاحب کا مسئلہ حل ہو گیا تو آپ کو قوالیاں بھی دکھاویں گے۔''

''پلیز تھوڑی دیر۔''

''عرض کیا نا بغیر شیروانی اور پاجامے کے ہمیں رقص کرنے کا لطف بھی نہیں آتا۔'' یہ لوگ یہاں یہ باتیں کر رہے تھے اور وہاں ایک گوشے میں ایس پی جمشید مرزا، ایس پی شاہد علی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے باقاعدہ سادہ لباس والے یہاں لگا رکھے تھے اور خصوصی طور پر یہاں کے بارے میں رپورٹیں جمع کر رہے تھے۔ شاہد علی جمشید مرزا سے پوری طرح تعاون کر رہا تھا اور جمشید مرزا ہی کے آدمی یہ تعاقب کر رہے تھے۔ سارا دن وہ سیر و سیاحت میں کسی نہ کسی شکل میں ان لوگوں کے پیچھے رہے تھے اور اب اس وقت انہوں نے ایس پی شاہد علی کو اطلاع دی تھی کہ یہ لوگ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی جانب جا رہے ہیں چنانچہ جمشید مرزا ایس پی شاہد علی کے ساتھ تیار ہو کر یہاں آ گیا تھا۔

''وہ صوفی ہے اور یہ لوگ غیر ملکی مہمان اور وہ ہاشم درانی کے خاندان کے لوگ ہیں۔''

''صوفی...... صوفی...... نہ جانے کیوں اس شخص کا چہرہ مجھے جانا پہچانا لگ رہا ہے۔'' شاہد علی پُر خیال انداز میں گردن ہلاتا ہوا بولا۔ اس کی پیشانی پر گہری شکنیں پڑ گئی تھیں۔

♥......♥......♥

حسینہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ان لوگوں کی گاڑیوں کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ تھوڑی دور چل کر اس نے کہا۔

''اے نشیلے ذرا پیچھے تو دیکھو۔''

''نہیں دیکھتا۔'' معشوق نے کہا۔

''اے دیکھو تو سہی۔ کوئی نہیں آ رہا۔''

''تو میں کیا کروں؟''

''اے تم پر نحوست کیوں طاری ہے؟''

''میرا پورا نام کیا ہے۔''

''تمہارا......؟''

''ہاں۔''

''معشوق نشیلے یا کچھ اور بھی ہے؟''

''یہی ہے بالکل یہی ہے۔''

''تو پھر تم آدھا نام کیوں لے رہی ہو؟''

''آدھا نام۔'' حسینہ نے پیشانی پر بل ڈال کر سوچتے ہوئے کہا۔ پھر بولی۔

''اے کیا کھوپڑی گھوم گئی ہے۔ کیا فضول بک بک کر رہے ہو۔ میں کہتی ہوں ان لوگوں نے ہمیں دھوکا دے دیا ہے۔''

''پہلے نام کا مسئلہ حل کرو اگر آدھا نام ہی لینا ہے تو پہلا آدھا نام لو۔''

''پہلا آدھا...... یعنی...... معشوق۔''

''ہاں بالکل وہی۔'' معشوق نشیلے نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

''گھوڑے جیسے منہ والے تو کیا سمجھتا ہے میں نام کا مطلب نہیں سمجھتی۔ تجھے معشوق کہوں گی جسے دیکھ کر ہی شرم آتی ہے۔''

''اور تمہیں اپنی یہ کالی چڑیل جیسی شکل دیکھ کر شرم نہیں آتی۔ بگڑی ہوئی بڑھیا۔''

''بس دیکھ میرے منہ مت لگ یہیں جوتا اتار کر شروع ہو جاؤں گی۔''

''ارے چھوڑ چھوڑ چڑیل کی بچی۔ پتا نہیں کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو۔ وہ تو صوفی کی وجہ سے ذرا سی عزت کر لیتا ہوں۔ درخواست کی ہے انہوں نے مجھ سے ورنہ ایسا فارسہ سناتا کہ تیرے چودہ طبق روشن ہو جاتے۔''

"اے ڈرائیور بھیا ذرا گاڑی روکو اسے اتارنا ہے۔" ڈرائیور نے حسینہ کی بات سنی ان سنی کر دی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں کوٹھی میں پہنچ گئے۔

"ہاں۔ اب بول کالی بھوتنی۔"

"اندر آ بتاؤں تجھے۔"

"شرم نہیں آتی مردوا، سے اندر آنے کے لیے کہہ رہی ہے۔"

"اے تیرا بیڑا غرق جھاڑو پھرے تیرے منہ پر خاک پڑے آگ لگ جائے۔"

"آگ تو تیرے لگی ہوئی ہے حسینہ۔ آ جائیں صوفی صاحب کہوں گا ان سے اس بھنگن کو کیوں ساتھ لے آئے؟"

"بھنگن۔ بھنگن۔" دونوں اسی طرح لڑتے رہے تھے۔ ادھر صوفی ہوٹل میں ان لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا قرب و جوار پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔ اس نے ابھی تک جمشید مرزا اور ایس پی شاہد علی کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ بس ان لوگوں کے ساتھ ہی ان کی تقریب میں حصہ لے رہا تھا اور اسمشیر وغیرہ اس ماحول سے کافی متاثر نظر آ رہے تھے۔ لیرا اسمشیر سے زیادہ دلچسپی نہیں لے رہی تھی جب کہ اسمشیر کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لیرا کی قربت چاہتا ہے۔ اسی وقت اچانک ہی صوفی اس ویٹر کی طرف متوجہ ہو گیا جو ان کے لیے کافی لا رہا تھا۔ اس ٹرے میں ایک گلاس اورنج اسکواش کا بھی تھا جو لیرا نے اپنے لیے منگوایا تھا۔ ویٹر ابھی دور ہی تھا کہ اس کے قریب سے گزرتا ہوا ایک آدمی اس سے ٹکرا گیا۔ ویٹر لڑکھڑایا ضرور لیکن سنبھل گیا۔ اس نے ٹرے بھی سنبھال لی۔ صوفی سامنے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس ایک لمحے اس کے ہونٹوں سے ایک سرسراہٹ نکلی۔

"حق اللہ۔" وہ اس آدمی کی طرف دیکھ رہا تھا جو ویٹر سے ٹکرانے کے بعد اس سے معافی مانگ کر آگے بڑھ گیا تھا لیکن جو کچھ اس نے کیا تھا وہ صوفی نے بہ خوبی دیکھ لیا تھا جیسے ہی ویٹر نے ٹرے میز پر رکھی صوفی اس طرف اس طرح مڑا کہ اس کا ہاتھ اورنج اسکواش کے گلاس پر لگا اور گلاس الٹ گیا۔

"در...... در...... درویش...... درویش...... درویش۔" صوفی کے منہ سے نکلا اور وہ گلاس سیدھا کرنے لگا۔

"افوہ...... یہ...... یہ کیا بے وقوفی ہے۔" ڈاکٹر فیلکس نے ناخوشگوار لہجے میں کہا لیکن اسمشیر صوفی کو عجیب سی نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

"میں ابھی دوسرا لاتا ہوں۔" صوفی نے بوکھلاہٹ کے عالم میں کہا اور گلاس اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ لیرا کچھ نہیں بولی تھی لیکن اس کے چہرے پر بھی ناگواری کے اثرات صاف نظر آ رہے تھے۔ ویٹر نے گلاس صوفی کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

"آپ تشریف رکھیے سر! میں لاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ میز وغیرہ صاف کرنے لگا۔

"اب میں کچھ نہیں پیوں گی۔" لیرا نے کہا۔ ناظمہ اور لیرا کے لباس پر اورنج اسکواش کے دھبے پڑ گئے تھے اس لیے وہ بڑی ہی شدت سے بور نظر آ رہی تھیں۔ ایسی حالت میں وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا تقریباً ناممکن تھا لیکن یہی مشکل پیش آ رہی تھی کہ وہ اٹھتیں کس طرح۔ اسکرٹ اور شلوار کے دھبے کافی بڑے تھے اور دور

سے صاف نظر آ رہے تھے۔

"مجھے معاف کرنا دوست تم انتہائی بے تکے آدمی ہو۔ بالکل بے تکے۔ تم جیسے بدحواس آدمی...... توبہ...... توبہ لڑکیوں کو کتنی مشکل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔"

"معافی چاہتا ہوں جناب عالی درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"کوئی بات نہیں ہے...... کوئی بات نہیں ہے۔ آیئے۔ اٹھیے۔" ناظمہ نے صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی اور پہلے خود اٹھ گئی۔ اس کی شلوار کا دھبا تو لمبے فراک کے نیچے چھپ گیا تھا لیکن لیرا کی سفید اسکرٹ کا دھبا بڑا بدنما معلوم ہو رہا تھا۔ بہرحال بہ مشکل تمام وہ کار تک پہنچی۔ اس واقعے کی وجہ سے جو بے لطفی ہوئی اس کا احساس ہر ایک کو تھا لیکن کوئی کر ہی کیا سکتا تھا۔ گاڑی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئی۔ رات کافی خوشگوار تھی اور لیرا نصرت کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی جب کہ دوسرے لوگوں کے منہ بگڑے ہوئے تھے۔ نصرت البتہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ ڈرائیونگ وہی کر رہا تھا اور اس نے جان بوجھ کر گاڑی کی رفتار ہلکی رکھی ہوئی تھی۔ اچانک ایک سنسان سڑک پر انہیں تین باوردی پولیس والے نظر آئے جو ہاتھ اٹھائے گاڑی رکوانے کا اشارہ کر رہے تھے۔ نصرت نے رفتار کم کر دی اور گاڑی پولیس والوں کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ ان میں ایک سب انسپکٹر تھا اور دو کانسٹیبل۔ سب انسپکٹر آگے بڑھ کر گاڑی کے نزدیک پہنچ کر بولا۔

"اندر کی بتی جلاؤ۔"

"کیوں خیریت؟" نصرت نے کہا۔

"ہمیں اطلاع ملی ہے کہ اس گاڑی میں ایک بے ہوش لڑکی ہے۔" صوفی نے اپنے مخصوص انداز میں منہ چلایا اور بولا۔

"حق اللہ۔" لیکن اتفاق کی بات ہے کہ اس گاڑی میں کوئی بے ہوش لڑکی نہیں ہے۔"

"نیچے اترو سب لوگ۔ لڑکی کہاں گئی۔"

"پتا نہیں۔ دو لڑکیاں تو ہوش میں ہیں۔ تیسری لڑکی ہو سکتا ہے کہ سیٹ کے نیچے ہو۔ ویسے تمہیں یہ اطلاع کس گدھے نے دی ہے۔"

"کیا بے ہودگی ہے جانتے ہو تمہارا کیا حشر کیا جائے گا؟"

"روز حشر سے قبل ہمارا کوئی حشر ہونا ممکن نہیں ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ بس اب جاؤ وہ کوئی دوسری گاڑی ہو گی۔" سب انسپکٹر گاڑی کے پاس سے ہٹ گیا۔ نصرت نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ لیرا ناظمہ سے کہنے لگی۔

"پتا نہیں یہ آدمی کس طرح کا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا میری تو۔ کبھی تو یہ بہت چالاک دکھائی دیتا ہے اور کبھی انتہائی بے وقوف۔" بہرحال اس کے بعد سلسلہ گفتگو ختم ہو گیا تھا۔ ابھی زیادہ رات نہیں گزری تھی کہ سب کے سب کسی نہ کسی تفریح میں مشغول ہو گئے۔ نصرت اور اسمشیر بلیئرڈ کھیلنے لگے اور باقی لوگ بھی اپنی اپنی مصروفیات میں لگ گئے۔ ناظمہ اور لیرا لباس تبدیل کرنے اپنے کمروں میں چلی گئی تھیں۔ نہ جانے صوفی کو کیا سوجھی کہ وہ لیرا کے کمرے کی جانب چل پڑا اور پھر اس نے لیرا کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے؟" اندر سے آواز آئی۔

"احقر کو صوفی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔" قدموں کی آواز آئی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ لیرا نے دروازہ کھولتے ہی پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کے کپڑے خراب ہو گئے۔"

"کوئی بات نہیں ہے۔"

"وہ آپ کا اسکرٹ؟"

"ہاں وہ کرسی پر پڑا ہوا ہے۔ کیوں؟"

"براہ کرم مجھے دے دیجیے۔"

"کیا......؟"

"در...... درویش رحم کریں۔ میرا مطلب ہے کہ میں اسکرٹ دھو دوں گا۔ ورنہ وہ دھبا مستقل ہو جائے گا۔"

"اوہو۔ نہیں کیا بے وقوفی کی بات کر رہے ہیں۔ صوفی صاحب میں آپ سے اسکرٹ دھلواؤں گی۔"

"لائیے پلیز دے دیجیے ورنہ مجھے اور زیادہ افسوس ہوگا۔"

"کمال کے آدمی ہیں آپ۔ آپ بھی یہاں مہمان ہیں۔ میں بھی مہمان ہوں۔ کیا فضول باتیں کر رہے ہیں آپ؟"

"دے دیجیے پلیز۔ دے دیجیے۔" صوفی بڑے جذباتی انداز میں آگے بڑھا اور اس نے اسکرٹ اٹھا لیا۔ اچانک ہی لیرا کی نگاہ اس کے دوسرے ہاتھ پر پڑی۔ اس ہاتھ میں دودھ کی بوتل تھی۔ لیرا نہ سمجھنے والے انداز میں صوفی کو دیکھنے لگی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے حیرت سے سوال کر ڈالا۔

"کچھ نہیں۔ میں ذرا...... میں ذرا ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔ اتنے میں یہ آوازیں سن کر ناظمہ بھی اسی کمرے میں آ گئی تھی۔ اس کا کمرا غالباً لیرا کے کمرے کے برابر میں ہی تھا۔ اس نے حیرت سے صوفی کے ہاتھ میں لیرا کا اسکرٹ دبا ہوا دیکھا۔

"یہ...... یہ کیا ہے صوفی صاحب؟"

"پاجامہ ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ یہ...... یہ یہ کہ میں...... مس لیرا...... لیرا۔"

"کوئی نیا تجربہ کر رہے ہیں آپ۔ دودھ کی بوتل آپ کے ہاتھ میں ہے اور لیرا کا اسکرٹ؟"

"آپ کی...... شش...... شش...... شلوار بھی درکار ہے۔"

"کیا بدتمیزی ہے؟" ناظمہ نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"تخ...... تخ...... خدا کی قسم بدتمیزی نہیں۔ تجربہ...... تجربہ۔ تجربہ۔ براہ کرم آئیے آپ میرے تجربے میں شریک ہو جائیے درویشوں کے کرم سے۔" صوفی نے کہا اور ناظمہ کو وہیں چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ ناظمہ

اور لیرا اس کے پیچھے پیچھے باہر آئی تھیں لیکن ناظمہ نے جب اسے اپنے کمرے میں گھستے دیکھا تو دوڑیں۔"

"کیا بدتمیزی ہے صوفی صاحب! میں کہتی ہوں رکیے...... رکیے پلیز۔" لیکن صوفی اندر گھس گیا تھا۔ ناظمہ کی شلوار بھی صوفے کے ہتھے پر پڑی ہوئی تھی۔ صوفی نے جھپٹ کر اٹھا لیا۔ ناظمہ اس کی طرف لپکی۔

"لائیے...... میں کہتی ہوں لائیے۔"

"مم...... مم...... معافی چاہتا ہوں۔ بعد میں میرے ساتھ آپ جو سلوک کرنا چاہیں کریں لیکن ابھی...... ابھی۔"

"میں کہتی ہوں آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟"

"اگر مجھے کرنے دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔" صوفی نے کہا اور ایک کونے میں دودھ رکھ کر دھبوں کو ملنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دھبے صاف ہو گئے۔ تھوڑے فاصلے پر ناظمہ کی بڑے بالوں والی ایرانی بلی صوفی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ صوفی نے پیالہ اس کی جانب بڑھایا تو وہ جلدی سے آگے بڑھ آئی۔ صوفی نے پیالہ اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ وہ دودھ پر جھپٹ پڑی۔

"آخر یہ کون سا تجربہ ہے آپ کا۔ دودھ سے دھبے دھو کر بلی کو پلا رہے ہیں۔ اچانک ہی ناظمہ کا جملہ ادھورہ رہ گیا۔ بلی نے ابھی دودھ پورا پیا بھی نہیں تھا کہ دفعتاً ہی اس نے اپنے دونوں پاؤں آگے رکھے اور پھر اس طرح اچھلنے لگی جیسے شدید تکلیف میں مبتلا ہو۔ کچھ لمحوں کے بعد اس کے ہاتھ پاؤں تشنج سے اکڑ گئے اور اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"ارے یہ کیا ہوا...... یہ کیا ہو گیا؟" ناظمہ بلی کی طرف جھپٹی۔ صوفی نے بلی کے پاؤں پکڑ کر اسے الٹا لٹکا لیا تھا۔

"کیا ہوا اسے؟"

"نہیں میرا خیال ہے صرف بے ہوش ہوئی ہے درویشوں کا کرم ہوا تو صبح تک ہوش میں نہیں آئے گی۔"

"میں کہتی ہوں آپ یہ سب کیا کر رہے ہیں؟ یہ سب کیا ہے؟"

"محترمہ! اب یہ آپ خود سوچیے کچھ بھی ہے۔ میں خواتین کو ناقص العقل تو سمجھتا ہوں چونکہ یہ ایک مسلم حقیقت ہے لیکن اتنا نہیں کہ کسی کی بات نہ سمجھ سکیں۔ وہ نقلی پولیس والے ایک بے ہوش لڑکی کو ضرور ہماری گاڑی میں پاتے مگر میں اس بے ہوش لڑکی کو اس طرح نہیں لٹکا سکتا تھا۔ ناظمہ نے ایک لمحہ غور کیا پھر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ارے...... بب...... باپ...... بب باپ رے باپ تو یہ دھبے۔"

"جی ہاں۔ یہ امرت دھارا کے دھبے تھے مگر میں اسے امرت دھارا کہتا ہوں درویشوں کے کرم سے۔"

"مم...... مم مطلب یہ ہے۔"

"جی ہاں۔ وہ آپ کو برائے تاوان...... لیکن میں نے ان کی نہیں چلنے دی۔"

"اوہ...... میرے خدا تو آپ نے جان بوجھ کر اس پر ہاتھ مارا تھا۔"

"تت..... تو کیا کرتا۔ آپ کو بے ہوش ہوجانے دیتا۔ بڑی صفائی سے اپنی آنکھوں کے سامنے اغوا ہوجانے دیتا درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"مم..... مم..... مگر صوفی صاحب آپ کو..... آپ کو کیسے معلوم ہوا تھا؟"

"بس درویشوں کا رحم ہے کوئی وظیفہ پڑھ کر بیٹھ جاؤ درویش خود بہ خود راستے منتخب کرتے رہتے ہیں۔ آپ چاہیں گی تو میں آپ کو بھی ایک وظیفہ بتادوں گا۔ آپ کے تمام اعمال درست ہوجائیں گے۔"

"میرے خدا بہ ظاہر تو کوئی شبے والی بات نہیں تھی اس ویٹر کی طرف سے لیکن....."

"کیا.....؟"

"کسی سے اس کا تذکرہ نہ کیجیے گا درویشوں کے کرم سے۔"

"مائی گاڈ..... مائی گاڈ۔"

"اب چلو گے اندر یا یہیں مرتے رہو گے۔ عورتوں کی شلواریں دھونے کا تمہیں بڑا شوق ہے۔ میں کہتی ہوں کرنل صاحب سے شکایت کرنی پڑے گی تمہارے بارے میں۔ جو کچھ نظر آتے ہو وہ ہو نہیں۔ رنگے سیار ہو، رنگے سیار۔" حسینہ کی آواز دروازے میں سنائی دی اور صوفی جل تو جلال تو پڑھنے لگا۔

"چلتے ہو کمرے میں یا میں آؤں اندر۔" حسینہ نے کہا اور صوفی کان دبائے ہوئے باہر نکل گیا۔

لیرا حیرت سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس نے ناظمہ سے کہا۔

"یہاں تو بہت کچھ ہورہا ہے ناظمہ! کیا یہ جگہ ہم لوگوں کے لیے خطرناک نہیں ہوگئی؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں؟" ناظمہ نے پریشان لہجے میں کہا۔ دفعتاً لیرا ہنس پڑی پھر بولی۔

"یہ بگڑا ہوا آدمی ہے کیسا؟"

"بگڑا ہوا آدمی؟"

"ہاں وہی جسے تم صوفا..... صوفا بولتی ہو۔"

"صوفا نہیں صوفی۔"

"ہاں وہی، وہی۔ یہ عورت اس کی بیوی تھی۔"

"نہیں۔" ناظمہ نے کہا اور بے اختیار ہنس پڑی۔

"پھر کون تھی؟"

"نوکرانی۔ ملازمہ۔"

"اوہ مائی گاڈ۔ وہ تو اتنی خوب صورت بھی نہیں ہے کہ اس کی بات اس طرح مان لی جائے۔"

"صوفی صاحب کی کوئی بات اگر کبھی تمہاری سمجھ میں آجائے تو مجھے بھی سمجھا دینا۔" ناظمہ نے کہا اور دونوں ہنسنے لگیں۔

♥.....♥.....♥

جمشید مرزا اور ایس پی شاہد علی سر جوڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آرہے تھے۔ شاہد علی نے کہا۔

"میری سمجھ تو بس ایک ہی بات آئی ہے۔ وہ یہ کہ ہم اسے اٹھا کر لے آئیں۔ تشدد کریں اور اس سے حقیقت معلوم کریں۔"

"یار! اتنا کچھ بتا چکا ہوں اس کے بارے میں۔ اس کے باوجود تم ایسی باتیں کررہے ہو۔ جان مصیبت میں آجائے گی۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ہم لوگ اسے ہلاک بھی کرنا چاہیں تو نہیں کرپائیں گے عذاب الٰہی ہے وہ۔ عذاب الٰہی۔ اس قدر چالاک، اتنا پھرتیلا اور اتنا ذہین کہ تم تصور بھی نہیں کرسکتے۔"

"تعجب کی بات ہے..... تعجب کی بات ہے۔ اس قدر تعریفیں کررہے ہو تم اس کی جمشید مرزا۔ ابھی تک تو میں نے اس میں کوئی خاص بات نہیں دیکھی۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ کوئی چکر چلا رہا ہے یہاں پر، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہاشم درانی کی گمشدگی میں بھی اس کا ہاتھ ہے۔ ویسے میرے آدمی بھی کام کررہے تھے۔ میں نے ہاشم درانی کے نوکروں کو بھی ٹٹولنے کی کوشش کی تھی اور آخر کار ایک نے اُگل دیا۔ مجھے آج ہی رپورٹ ملی ہے۔"

"کیا.....؟" جمشید مرزا نے چونک کر سوال کیا۔

"ہاشم درانی کہیں باہر نہیں گیا بلکہ اچانک ہی غائب ہوگیا ہے۔"

"اوہو۔ یہ بات تمہیں ہاشم درانی کی کوٹھی سے معلوم ہوئی؟"

"ہاں۔ میں نے کہا نا اس کے ایک ملازم سے۔ وہ اپنے مہمانوں کے استقبال کے لیے تنہا اسٹیشن گیا تھا پھر واپس نہیں آیا مگر بہ ظاہر اس کے گھر والوں کو کوئی تشویش نہیں محسوس ہوئی۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اس کے مہمان بھی باہر سے آئے ہوئے ہیں مگر انہیں کوئی تشویش نہیں ہوئی۔"

"واقعی یہ تو حیرت کی بات ہے؟"

"کیا خیال ہے پھر تمہارا؟"

"ابھی تک میں کسی نتیجے پر ہی نہیں پہنچ سکا۔"

"ویسے میرا یہ اندازہ ہے کہ ممکن ہے کہ ہاشم درانی بھی شیرٹن کی دھمکیوں سے نہ بچا ہو لیکن وہ غائب ہوگیا۔ اس نے پولیس کو اطلاع نہیں دی جب کہ دوسروں نے پولیس کو اطلاع دے دی تھی۔ کیا خیال ہے اس لائن پر کیوں نہ سوچیں؟"

"میں سوچ چکا ہوں۔"

"کوئی خاص نتیجہ؟"

"نہیں۔"

"میرا خیال ہے اس سے تھوڑی بہت بات بنتی ہے اور سمجھ میں آتی ہے۔"

"دیکھو! دو ایسے آدمیوں کے نام دھمکیوں کے خطوط لکھو جن میں سے ایک تم سے واقف ہو اور دوسرا ناواقف۔ فرض کرو، تم اپنی موجودہ حیثیت میں دونوں کو لکھو کہ وہ خطرے میں ہیں اور کسی بھی لمحے گرفتار کیے جاسکتے ہیں۔ وہ شخص جو تمہیں نہیں جانتا اسے مذاق سمجھے گا اور یہ سوچے گا کہ کسی نے اسے بے وقوف بنایا ہے، لیکن اس شخص پر کیا اثر ہوگا جو تم سے اور تمہارے عہدے سے بہ خوبی واقف ہے۔"

''بات سمجھ آ رہی ہے۔''

''ٹھیک اسی طرح شیرٹن کے معاملے کو لے لو۔ ہمارے لیے بھی یہ نام نیا ہے اور جن لوگوں کو یہ خط موصول ہوئے ہیں ان کے لیے بھی۔ ہاشم درانی ہمارے پاس شکایت لے کر نہیں آیا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ شیرٹن سے واقف ہے۔ اس طرح غائب ہونے کے یہ معنی ہوئے کہ شیرٹن واقعی خطرناک ہے۔ اتنا خطرناک کہ پولیس بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔''

''ایک بات اور بھی ہے۔ کہیں ہاشم درانی ہی شیرٹن نہ ہو؟''

''فضول بکواس نہیں۔ یہاں سراج پور میں طویل عرصے سے تعینات ہوں، اگر ہاشم درانی اچانک شیرٹن بن گیا ہے تو اس کے احمق ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔'' شاہد علی بولا۔

''وہ کیوں......؟''

''بھئی اگر وہ شیرٹن ہی ہے تو بھی اسے ہمارے پاس ضرور آنا چاہیے تھا تاکہ کوئی اس پر شبہ نہ کرسکتا۔ نہیں ڈیئر جمشید مرزا وہ شیرٹن نہیں ہے ورنہ اس طرح غائب نہ ہوتا۔''

''ہوں۔ پھر اب کیا کیا جائے؟''

''دیکھو! میرا خیال یہ ہے کہ صوفی کے چکر میں پڑنے کے بجائے ہم کیوں نہ ہاشم درانی ہی کو تلاش کریں۔ ویسے یہ صوفی واقعی پراسرار شخصیت کا مالک ہے۔''

''اب کیا کیا جاسکتا ہے جو کچھ بھی ہے لیکن یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ اس پر ہاتھ ڈالنا ایک مشکل کام ہوگا۔''

کمرے میں گہری خاموشی طاری ہوگئی تھی۔ دونوں کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

♥......♥......♥

سراج پور کا موسم ایک دم بھاری ہوگیا تھا۔ تاحد نظر بکھری ہوئی پہاڑیوں میں دھند پھیل گئی تھی۔ سرد، سرد ہواؤں نے اس مہینے کو انتہائی حسین بنا دیا تھا۔ کئی دن سے یہی کیفیت چل رہی تھی اور درحقیقت موسم پُر بہار ہوگیا تھا۔ نصرت، سمیرا اور حسن نے لیرا کو کھلونا بنالیا تھا۔ تینوں قسمت آزمائی کر رہے تھے اور لیرا ان تینوں سے کھیل رہی تھی۔ یورپ کی پروردہ تھی۔ عورت کی اہمیت سے واقف تھی۔ چنانچہ وہ اپنے طور پر تینوں ہی کو رجھائے ہوئے تھی۔ ادھر صوفی بھی موسم کی اس بہار سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ حسینہ اس پر اس طرح حکم چلا رہی تھی جیسے کرنل رحیم شاہ نے اسے صوفی کی خدمت کے لیے نہیں بلکہ صوفی کو اس کی خدمت کے لیے متعین کیا ہو۔

''میں پوچھتی ہوں اس دن کہاں مرگئے تھے تم۔ جب ہم بازار گئے ہوئے تھے گھومنے پھرنے۔''

''زندہ تھا محترمہ بزرگوں کی دعاؤں سے۔''

''یہی تو افسوس ہے کہ تمہارے لیے بھی بزرگ جینے کی دعائیں کرتے ہیں۔''

''آپ کے خیال میں مجھے مرجانا چاہیے؟''

''بالکل مرجانا چاہیے۔''

''آپ کے اوپر......؟''

''کیا مطلب......؟''

''وہ جو کہتے ہیں ناکہ مرتے ہیں ہم تم پر درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''جھاڑو پھرے تمہارے منہ پر۔ تمہیں تو کوئی چیل کوا بھی قبول نہ کرے۔ مرگئے تو گدھ تک لاش کھانے سے گریز کریں گے۔ سوچیں گے کہ اپنے کسی رشتے دار کی لاش بھی بھلا کھائی جاتی ہے۔''

''ٹھیک ہے میں پھر انہیں آپ کی لاش پیش کردوں گا۔ گدھ تو کیچڑ میں بھی اتر جاتے ہیں۔''

''مطلب میں سمجھی نہیں۔''

''میں سمجھاتا ہوں آپ کو فارسہ میں۔'' معشوق نشیلے دروازے پر کھڑے ان کی گفتگو سن رہے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہوئے بولے۔

''لو دوسرا جھڑوس آگیا۔ نہ بابا نہ، اب کے جیسے ہی کرنل رحیم شاہ مجھے ملے میں کہہ دوں گی کہ بھیا نکالو مجھے ان دو وحشیوں کے جال سے۔''

''بی بی بات اصل میں یہ ہے کہ ہم ٹھہرے خدا ترس اور کہا یہ جاتا ہے کہ دل توڑنا سب سے بڑا گناہ ہے۔ آپ کی اس کالی منحوس صورت کی پذیرائی زندگی میں کسی نے نہ کی ہوگی۔ وہ جو ایک شعر کہا ہے نا، فارسہ میں...... درمعشوق دوش آنم درمعشوق موچھ آنم تشاتم تم نہ شانم ہم نہ شانم وہ نہ می شانم۔''

''اسے باہر نکال دو صوفی ورنہ یقین کرو لکڑی کے کھڑاؤں سے منہ پیٹوں گی۔''

''آپ شوق فرمائیے۔ ہم خود ہی باہر چلے جاتے ہیں۔'' صوفی نے کہا اور باہر نکل آیا۔ ناظمہ سامنے ہی نظر آ رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

''صوفی صاحب! براہ کرم اوپر آئیے۔''

''جی۔ جی۔ جی۔'' ناظمہ اسے عمارت کے سب سے اوپری حصے میں لے گئی تھی۔

''یہاں سے دھکا دیجیے گا درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''نہیں۔ صوفی صاحب! بات پریشانی کی حد میں داخل ہوگئی ہے۔ یہ شخص فیلکس بار بار مجھ سے ہاشم درانی کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ میں تو عجیب سی الجھن کا شکار ہوگئی ہوں۔ آپ بھی میری کچھ مدد نہیں کررہے۔ دو تین بار انکل سے بھی ملنے کی کوشش کرچکی ہوں لیکن ان سے رابطہ ہی قائم نہیں ہوتا۔''

''انکل......؟'' صوفی نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''ہاں۔ انکل شاہ میر کی بات کر رہی ہوں۔ ان سے بھی میرا رابطہ نہیں ہوسکا۔ آپ یقین کیجیے صوفی صاحب! سخت پریشان ہوں اب تو۔''

''واقعی بات پریشانی کی ہے۔'' صوفی نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پہاڑوں پر اترتی ہوئی دھند بہت ہی خوب صورت لگ رہی تھی۔ وہ لوگ باتیں کر ہی رہے تھے کہ دفعتاً قدموں کی چاپ سنائی دی۔ آنے والا اسمشیر تھا۔ اس نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔

''وہ ادھر ان پہاڑیوں میں...... ان پہاڑیوں میں وہ جو اوپر سے کالی نظر آتی ہیں اور جن پر ایک اکیلا درخت کھڑا ہوا ہے۔''

''کیا ہواان پہاڑیوں میں درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''میں نے...... میں نے ہاشم درانی کو دیکھا ہے۔''

''کیا......؟'' ناظمہ اچھل پڑی۔

''یہ دیکھیے دور بین ۔ میں دور بین سے ان پہاڑیوں کا نظارہ کر رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ مسٹر ہاشم درانی آہستہ قدموں سے ایک پہاڑی سے دوسری طرف جا رہے ہیں۔ آپ یقین کیجیے۔ میں نے انہیں فوراً پہچان لیا حالانکہ میں پہلے ان سے نہیں ملا لیکن یہاں میں نے ان کی تصویریں دیکھی تھیں اور پھر مسٹر فیلکس کے پاس بھی ان کی تصویر موجود ہے۔''

''اوہ! میرے خدا یہ نصرت اور سمیر وغیرہ۔'' ناظمہ نیچے کی طرف بھاگی تو صوفی نے دوڑ کر اس کا راستہ روک لیا۔

''میں بھی چل رہا ہوں۔'' اسمشیر نے کہا اور اس کے بعد تینوں نیچے اتر آئے۔ صوفی کے چہرے پر حماقتیں ہی حماقتیں برس رہی تھیں۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ گھر میں نہ تو نصرت موجود تھا، نہ سمیر اور حسن تینوں باہر نکل آئے۔ صوفی تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ ناظمہ اس کے پیچھے دوڑ رہی تھی اور اسمشیر ان سب سے آگے تھا اور ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔

''کتنی دور اور جانا ہے بھائی درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے چیخ کر سوال کیا۔

''چلے آیئے کیا تھک گئے؟'' ابھی فاصلہ ہی کتنا طے ہوا ہے۔'' اسمشیر نے تیز رفتاری سے دوڑتے ہوئے کہا۔ ناظمہ ان کی رفتار کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر بعد وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ اسمشیر ان چٹانوں کے درمیان اس طرح دوڑ رہا تھا جیسے اس نے صحیح راستے کا انتخاب پہلے ہی سے کر لیا ہو۔ صوفی بھی اس سے پیچھے نہیں تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ وہ جان بوجھ کر پیچھے دوڑ رہا تھا اور اس طرح دوڑ رہا تھا جیسے اس کی ٹانگیں اسمشیر کی رفتار کا ساتھ نہ دے پا رہی ہوں۔ ناظمہ کا اب دور دور تک پتا نہیں تھا۔ چاروں طرف چٹانیں بکھری ہوئی تھیں اور بلندیوں پر کہر چھائی ہوئی تھی۔ ہر طرف اس کہر سے اندھیرا اندھیرا سا پھیلا ہوا تھا۔ انتہائی بھیگا بھیگا اور خوشگوار موسم، کافی فاصلہ طے ہوگیا اور پھر اس طرح کی چٹانیں درمیان میں حائل ہوگئیں کہ کوٹھی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ فاصلہ بہت زیادہ ہوگیا تھا۔ تب صوفی رک گیا۔

''در...... در...... درویش رحم کریں۔ آپ تو ایسا لگتا ہے جیسے مسٹر اسمشیر ان پہاڑیوں کے دوسری طرف جا رہے ہو۔'' صوفی کی تیز نگاہیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ دفعتاً ہی اس نے بائیں سمت والی چٹان کے عقب سے تین سر ابھرتے دیکھے۔ اسمشیر کی نگاہیں اب بھی دور دور تک بھٹک رہی تھیں۔ پھر کچھ اور افراد چٹانوں کی اوٹ سے نکلے اور صوفی نے محسوس کیا کہ اب وہ اور اسمشیر ان کے نرغے میں ہیں۔ چٹانوں سے نمودار ہونے والوں نے اپنے چہرے کالی نقابوں میں چھپا رکھے تھے۔ دو ایسے بھی تھے جن کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ دفعتاً اسمشیر کے منہ سے نکلا۔

''یہ...... یہ کیا ہوا؟ یہ کون ہیں؟''

''فقیران ملت معلوم ہوتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔ اماں بھائی ان چٹانوں میں کیوں بھیک مانگ رہے ہو تم؟''

''کیا چاہتے ہو تم لوگ اور یہ ریوالور تمہارے ہاتھ میں۔'' اسمشیر کی آواز ابھری۔ وہ سب کے سب آہستہ آہستہ قریب آتے جا رہے تھے۔ اچھے تن و توش کے مالک تھے اور بہت مستعد نظر آ رہے تھے۔

''مم...... مم...... میں کہتا ہوں کہ آخر تم...... آخر تم۔'' اسمشیر بھی بولا اور دفعتاً ہی اس کے قریب والے نے سر کی ایک بھرپور ٹکر اس کی پیشانی پر ماری۔ اسمشیر کے حلق سے ایک شدید کراہ نکلی اور وہ تیورا کر اس طرح گرا کہ پھر اس سے نہ اٹھا گیا۔ شاید وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔

''پکڑلو اسے۔'' ان لوگوں نے صوفی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''نن...... نن...... نا پیارے بھائی ایسے نہ پکڑو جیسے آج کے اخبار میں ایک لومڑی کی تصویر چھپی ہے جسے عقاب پکڑ رہا ہے اخبار پڑھتے ہو روزانہ۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''سس...... سس...... سچ کہہ رہا ہوں۔ یقین نہ آئے تو دیکھ لو۔ لومڑی بڑے پیارے انداز میں بیٹھی ہوئی ہے اور عقاب اس پر جھپٹ رہا ہے بلکہ اس نے لومڑی کی کھوپڑی پر چونچ شفقت رکھی ہوئی ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''پکڑو اسے۔'' ایک اور شخص نے پھر اپنے ساتھیوں کو للکارا۔

''ایک منٹ ایک منٹ تم میں سے کوئی پان کھاتا ہے۔'' صوفی نے کہا اور جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔

''خبردار ورنہ گولی سینے کے پار ہو جائے گی۔'' جواب میں صوفی نے بٹوہ اور پانوں کی ڈبیا نکال لی تھی۔ ''چھینو اس سے شاید اس میں بم ہے۔''

''حق اللہ...... حق اللہ!...... پیارے بھائی اس میں صرف پان ہے اور اس میں چھالی اور تمباکو۔ مناسب سمجھیں تو ایک پان نکال لینے دیں۔'' تین آدمی صوفی پر ٹوٹ پڑے اور صوفی اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ تینوں اپنے ہی زور میں ایک دوسرے ٹکرا گئے تھے پھر ان میں سے ایک نے اچھل کر صوفی پر دوبارہ چھلانگ لگائی۔

''ارے...... ارے صرف ایک پان صرف ایک پان...... صرف ایک پان کا سوال ہے۔'' صوفی نے کہا اور جلدی سے نیچے بیٹھ گیا۔ وہ شخص صوفی سے الجھ کر اس بری طرح دوسری جانب جا کر گرا کہ اس کے حلق سے زوردار چیخ نکل گئی۔ صوفی نے پانوں کی ڈبیا سے پان نکالا اور پھر کھلی ہوئی ڈبیا باقی لوگوں کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''گلوریاں ہیں پیارے بھائی، صرف گلوریاں ہیں۔'' درویشوں کی دعاؤں سے۔ اتنی سی ڈبیا میں بھلا بم کیسے ہوسکتا ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ ایک چھوٹی سی چیخ بم ہی کا درجہ رکھتی ہے۔ صوفی نے ڈبیا سے پان نکال کر منہ میں رکھا۔ تمباکو کا بٹوہ کھولا۔ اس میں سے چھالی تمباکو کو نکال کر ہتھیلی پر رکھے اور ان کی بھی پھنکی لگا دی۔ پھر قوام کی شیشی نکالنے لگا۔

''الو کے پٹھو، تم لوگ ایک اس آدمی کو نہیں پکڑ پا رہے اور ادھر سے ادھر گھوم رہے ہو۔ اچانک ہی

صوفی نے پانوں کی ڈبیا پوری فرسی کی طرح اچھالی اور تانبے کی بنی ہوئی نقشین ڈبیا پوری قوت سے اس شخص کی پیشانی سے ٹکرائی۔ وہ چیخ مار کر الٹ گیا اور پھر ریوالور والے ایک دوسرے ساتھی نے بے اختیار صوفی پر فائر جھونک مارا۔ صوفی کے حلق سے ایک چیخ نکلی اور وہ زمین پر گر کر ایک نشیب میں لڑھکنے لگا۔

''اوہ......اوہ......اوہ یہ کیا کیا تو نے۔'' وہ آدمی چیخا جس کی پیشانی پر پانوں کی ڈبیا لگی تھی۔ وہ اپنا ایک ہاتھ ماتھے پر رکھے ہوئے تھا پھر دوسرے ہاتھ سے اس نے فائر کرنے والے کو دھکیلا اور تیزی سے آگے بڑھا۔ چٹان کے سرے پر آ کر اس نے نیچے کی طرف دیکھا۔ اسے صوفی کی ٹانگیں دکھائی دیں بقیہ جسم بڑے سے پتھر کی اوٹ میں تھا۔ وہ تیزی سے نیچے اترنے لگا پھر جیسے ہی وہ پتھر پر ہاتھ ٹکا کر صوفی کی لاش پر جھکا۔ لاش نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن پکڑ لی۔ حملہ آور نے بڑا زور مارا تھا مگر اس کی گردن صوفی کی گرفت سے نہ نکل سکی۔ اب صوفی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ ادھر دوسرے حملہ آور بھی چٹان کے سرے پر آ گئے۔ ان میں سے ایک نے چیخ کر کہا۔

''خبردار! چھوڑو اسے ورنہ گولی ماردوں گا۔'' ادھر صوفی نے اپنے شکار پر اتنا دباؤ ڈالا ہوا تھا کہ اس کی آنکھیں بھی بند ہونے لگی تھیں چنانچہ صوفی نے یہی مناسب سمجھا کہ اب اسے اپنی ڈھال ہی بنا لے۔

''مار دو گولی پیارے بھائی، لیکن پیش گوئی کیے دیتا ہوں کہ گولی اس کا سینہ چیرتی ہوئی میرے سینے سے پار ہوگی۔ اب ایسا کرو اپنے دونوں ریوالور ادھر میرے پاس پھینک دو ورنہ میں اسے جنت الفردوس کی جانب روانہ کردوں گا درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''صوفی کی گرفت سے جکڑے ہوئے نقاب پوش کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے ہوگئے تھے۔ اوپر سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صوفی نے پھر ہانک لگائی۔

''حق اللہ! تم لوگ فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھادو، ہر چیز فانی ہے۔ ہر ذی روح کو اس دنیا سے جانا ہوتا ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''ٹھہرو......ٹھہرو۔'' اوپر سے آواز آئی۔

''ابے کتنی دیر ٹھہروں، ٹھہرا ٹھہرا کر تم نے میری جان نکال دی ہے۔''

''گولی مار دو اسے۔ پروامت کرو۔'' دوسرے نے کہا لیکن اچانک ہی ایک فائر ہوا اور وہ سب بوکھلا گئے۔ کیونکہ یہ فائر سامنے والی چٹانوں سے ہوا تھا اور اس کے بعد مزید دو تین فائر ہوئے۔ انہوں نے دوڑ کر ایک پتھر کی آڑ لی اور سامنے والی چٹانوں پر فائر کرنے لگے۔ صوفی نے ایک نگاہ اپنے شکار دیکھا۔ اس وقت صوفی بالکل مستعد نظر آ رہا تھا۔ وہ ڈھیلا ڈھالا پن جو اس کی فطرت کا ایک حصہ تھا بالکل دور ہوگیا تھا۔ اس نے برق رفتاری سے اپنے شکار کا جائزہ لیا اور اسے وہیں چھوڑ کر خود ایک پتھر کی اوٹ میں ہوگیا جو دوسری طرف سے چلنے والی گولیوں کی زد سے باہر تھا۔ ایک لمحے تک تو یہ اندازہ ہی نہیں ہوسکا کہ فائر کرنے والے کون ہوسکتے ہیں۔ کیا اسے بچانے کی کوشش ہے۔ دفعتاً ہی اسے اسمشیر یاد آیا جو اوپر ہی رہ گیا تھا لیکن ظاہر ہے اس وقت اسے بھی دیکھنے کا موقع نہیں تھا۔ دونوں طرف گولیاں چلتی رہیں اور صوفی بہ دستور پتھر کی اوٹ میں چھپا رہا۔ اس کا منہ جگالی کی طرح چل رہا تھا اور پان کی پیک اس کے منہ میں بھرتی جارہی تھی۔ ویسے اسے اندازہ تھا کہ ذرا بھی سر ابھارتا تو کسی طرف کی گولی اس کے سر کے پرخچے ضرور اڑا دیتی۔ کچھ دیر کے بعد فائرنگ بند ہوگئی۔ صوفی تین چار منٹ دیکھتا رہا پھر سامنے کی طرف سے ایک اور فائر ہوا لیکن اس کے بعد خاموشی ہی طاری رہی۔ شاید کوئی فائر کرکے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ دوسری طرف سے جواب دیا جاتا ہے یا نہیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ صوفی رینگتا ہوا پتھر کی اوٹ سے نکلا پھر اس طرف بڑھا جہاں اس نے اس آدمی کو چھوڑا تھا لیکن اب وہ وہاں نہیں تھا۔ دفعتاً ہی صوفی کو اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنائی دی اور وہ کسی سانپ کی طرح پلٹا لیکن جو شخص سامنے نظر آیا اسے دیکھ کر صوفی کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ نظر آئی لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور اس کے منہ سے آواز نکلی۔

''غم......غم......کم کم عم قم۔''

''سلام عرض کرتا ہوں جناب صوفی صاحب!''

''مغم، مم، مم۔''

''جی نہیں مذہب کا حکم ہے کہ سلام کا جواب ضرور دیا جائے۔ خدا کے فضل سے آپ بھی مسلمان ہیں اور میں بھی مسلمان۔'' صوفی نے پان کا ملغوبہ ایک چٹان پر اُگل دیا اور پھر بڑے صاف ستھرے لہجے میں بولا۔

''وعلیکم السلام! کہیے مرزا جی کہاں سیاحت ہو رہی ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''یہ سوال میں آپ سے بھی کرسکتا ہوں صوفی صاحب۔''

''تو کر ڈالیے۔ ہم جواب دینے کی کوشش کریں گے۔''

''آپ یہاں کیا تلاش کررہے ہیں؟''

''سکون حیات نو۔ آپ ان چٹانوں کی خاموشی دیکھ رہے ہیں۔''

''جی ہاں۔ یہ ابھی چند لمحے قبل خاموش ہوئی ہیں۔''

''جی نہیں۔ یہ تو صدیوں سے خاموش ہیں درویشوں کی دعاؤں سے اور نہ جانے کب تک خاموش رہیں گی البتہ آپ کیا کررہے ہیں یہاں یہ نہیں معلوم؟''

''آپ کی خیریت معلوم کرنے آیا ہوں کہیں چوٹ تو نہیں لگی۔''

''درویشوں کی دعائیں ہیں درویشوں کا کرم ہے ہم چوٹ پروف ہیں۔''

''اب غرور کے الفاظ نہ کہیے صوفی صاحب! کسی بھی وقت کسی بھی جگہ ڈھیر ہوسکتے ہیں۔''

''ان ہڈیوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ ہڈیوں کا ایک ڈھیر ہے جو چل پھر رہا ہے۔'' صوفی نے کہا اور پھر اچانک اسے اسمشیر یاد آیا اور وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ جمشید مرزا اس طرح اس کے پیچھے لپکا جیسے اسے صوفی کے بھاگ جانے کا خدشہ ہو لیکن صوفی اس جگہ پہنچ گیا جہاں اسمشیر اب بھی بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی ریوالور کے بہت سے خالی کارتوس بھی پڑے ہوئے تھے۔ صوفی نے اسے غور سے دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا۔

''اتنی دیر کی یہ خاموشی کہیں آپ اللہ کو پیارے تو نہیں ہوگئے۔'' اس نے بیٹھ کر اسمشیر کی نبض اور سینے کا جائزہ لیا۔ جمشید مرزا پھر اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔

''گولیاں کون چلا رہا تھا؟''

''بچے شرارت کر رہے ہوں گے اور شرارت میں یہ پٹاخوں کے خول بھی یہاں پڑے ہوئے ہیں۔''

''تو آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ گولیاں میں نے چلائی ہیں یا اس بے ہوش شخص نے۔''

''صوفی صاحب! آپ نے واقعی قانون کو مذاق بنا ڈالا ہے دیکھیے۔''

''واہ اچھا مذاق ہے۔ میں آپ سے یہ سوال کر رہا ہوں جناب مرزا صاحب کہ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ کیا خرگوشوں کی تلاش میں نکلے ہیں؟''

''جی نہیں۔ آپ سے ملنے کوٹھی گیا تھا لیکن آپ کے بارے میں پتا چلا کہ آپ ادھر آئے ہیں۔ یہاں آیا تو گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ مجبوراً مجھے بھی گولیاں چلانی پڑیں۔''

''اوہو۔ شکریہ، لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔''

''کیا......؟'' جمشید مرزا نے کہا۔

''کوٹھی یہاں سے بہت فاصلے پر نہیں ہے۔ کیا وہاں فائروں کی آوازیں نہیں پہنچی ہوں گی؟''

''ضرور پہنچی ہوں گی۔ کوئی ادھر آیا نہیں۔ حیرت کی بات ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' ابھی جمشید مرزا کے منہ سے الفاظ ادا ہی ہوئے تھے کہ اسمشیر نے کراہ کر کروٹ بدلی اور پھر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور چاروں طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا پھر ایک دم وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''وہ......وہ......وہ لوگ؟''

''بس شرارتیں کر کے چلے گئے۔''

''پپ......پپ پتا نہیں کون تھے؟''

''پتا نہیں، بتا کر نہیں گئے۔'' صوفی نے کہا اور کوٹھی کی طرف واپس مڑا تو اسمشیر نے کہا۔

''براہ کرم مجھے سہارا دیجیے۔ میں شدید قسم کی اعصابی کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔ صوفی خاموش ہو گیا تھا۔ اسمشیر اس کے ساتھ لنگڑاتا ہوا چلنے لگا۔ جمشید مرزا نے کہا۔

''انہیں کیا ہو گیا تھا۔'' صوفی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کوٹھی کے قریب پہنچ کر دفعتاً ہی صوفی اپنی جگہ رکا اور پھر اچانک ہی جمشید مرزا کی طرف مڑ کر بولا۔

''مرزا جی سنبھالیے۔ کیا آپ کچھ محسوس کر رہے ہیں؟''

''ہاں ایک عجیب سی بو ہے۔''

''ایک منٹ، ایک منٹ۔'' صوفی نے کہا اور اس کے بعد اس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور کوٹھی کی طرف دوڑتا ہوا چلا گیا لیکن اس نے سامنے کی طرف رخ نہیں کیا تھا بلکہ وہ کوٹھی کے عقبی حصے کی طرف پہنچا تھا اور پھر وہاں سے دروازے میں داخل ہوا تھا۔ جمشید مرزا اور اسمشیر نے بھی اس کا تعاقب کیا تھا۔ جمشید مرزا کی آواز ابھری۔

''کیا ہوا۔ کیا بات ہے۔ اندر کچھ گڑبڑ ہے۔ میرا خیال ہے کسی قسم کی خواب آور گیس؟

درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''گیس بھی درویشوں کی دعاؤں سے پھیلتی ہے؟''

''اماں آخر تم لوگ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ کیوں اڑاتے ہو۔'' دفعتاً ہی انہوں نے ایک چیخ سنی اور ساتھ ہی ڈاکٹر فیلکس عمارت کے عقبی حصے سے نکل کر باہر آ گیا۔ وہ زمین پر گر پڑا تھا اور کرب کے عالم میں اپنے ہاتھ پاؤں پٹخ رہا تھا۔ چہرہ سرخ تھا اور ناک سے پانی بہہ رہا تھا۔ جمشید مرزا نے اس سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن صوفی نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''نہیں۔ مرزا جی اس وقت نہیں۔ ہمیں اندر والوں کی خبر لینی چاہیے ورنہ ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی مر ہی جائے۔ مسٹر اسمشیر آپ یہیں ٹھہریں اور پھر اس نے جمشید مرزا کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور بے تحاشا دوڑنے لگا۔ دونوں چکر کاٹ کر کوٹھی کے بیرونی برآمدے میں آئے۔ یہاں بو اور زیادہ تیز تھی۔ صوفی نے اپنی ناک دبائی اور تیزی سے اندر گھس گیا۔ جمشید مرزا نے اس کی تقلید کی لیکن تھوڑی دور چلنے کے بعد اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ پلٹنے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے صوفی کو دیکھا جو کسی کو پیٹھ پر لادے ہوئے واپس آ رہا تھا۔ یہ نصرت تھا۔ صوفی نے اسے باہر باغ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''آپ بھی تشریف لائیے جناب اور آپ بھی۔ اندر موجود تمام لوگوں کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ کیا آپ لوگ سانس نہیں روک سکتے۔'' بہرحال صوفی کے ساتھ جمشید مرزا اور اسمشیر بھی مصروف ہو گیا تھا۔ انہوں نے ایک ایک کر کے ان سب کو کوٹھی سے نکالا۔ ناظمہ ان میں نہیں تھی۔ بعد میں صوفی نے کوٹھی کا پورا چکر لگا ڈالا لیکن ناظمہ اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ جمشید مرزا بڑا الجھا ہوا نظر آ رہا تھا پھر اس نے صوفی کو ایک طرف لے جا کر کہا۔

''دیکھیے میں آپ سے عرض کروں صوفی صاحب! یہ بھی بڑا ضروری ہے ہم لوگ یہاں کا خاص طور سے جائزہ لیتے رہے ہیں۔ محترمہ ناظمہ بڑی اہم حیثیت کی حامل ہیں۔ خود ہاشم درانی صاحب کا بھی کہیں پتہ نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آخر یہ ہو کیا رہا ہے گھر میں؟''

''آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ سب کچھ ہنگامہ ہم نے برپا کیا ہے؟''

''نہیں۔ میں آپ سے ایک عرض کروں۔ براہ کرم شیرٹن کے بارے میں آپ کو جو معلوم ہے مجھے بتا دیجیے۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار رہوں گا۔''

''شیرٹن سے آپ کی کیا رشتے داری ہے جمشید صاحب!''

''کچھ نہیں۔ دیکھیے آپ نے پہلے شیرٹن سے بے پروائی اور لاعلمی ظاہر کی تھی۔''

''میں اب کیا خالہ کا ممانی زاد بھائی بتا رہا ہوں درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''نہیں۔ آپ صورت حال کو الجھا رہے ہیں۔''

''اور اس پر آپ کہہ رہے ہیں کہ میں آپ کی مدد کروں۔''

''وہ دیکھیے۔ بات اصل میں یہ ہے......اب کیا کہوں؟''

''کچھ کہہ دیجیے ہم لکھ کر رکھ لیں گے۔''

"میں کم از کم اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ہاشم درانی صاحب شیرٹن کے شکار ہیں۔ ایس پی شاہد صاحب کا بھی یہی خیال ہے۔" بہر حال یہ کیفیت دیر تک طاری رہی۔ اچانک ہی اسمشیر نے کہا۔

"میں تم لوگوں کو ایک بات یاد دلاؤں۔ جب ہم اس دن ڈنر سے واپس آ رہے تھے تب ہم ناظمہ پر اٹیک کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور کچھ لوگ اسے حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ساری کارروائی اسی لڑکی کے لیے کی گئی ہے اور اب وہ لوگ اسے اغوا کر کے لے گئے۔"

اچانک ہی صوفی کی نظر ایک طرف پڑی اور پھر وہ اپنی جگہ سے آگے بڑھ کر کیاریوں کی طرف پہنچ گیا۔ یہاں ایک زنانہ سینڈل پڑا ہوا تھا۔ اسمشیر بھی ساتھ ہی تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔

"سو فی صدی ناظمہ ہی کا ہے۔" صوفی کچھ نہ بولا۔ اس کی نظر سینڈل سے ہٹ کر کسی دوسری چیز پر جم گئی پھر وہ اچانک ہی جمشید مرزا کی طرف مڑا اور بولا۔

"ذرا ادھر آؤ۔" جمشید مرزا نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے صوفی کے پاس پہنچ گیا۔ صوفی ایک جگہ پر زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے زمین پر پڑی ہوئی کوئی چیز اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کیا یہاں کوئی ایسا علاقہ ہے جہاں اس طرح کی بجری پائی جاتی ہو۔"

"اوہو.....اوہو۔" جمشید مرزا نے جلدی سے اس بجری کو دیکھا اور مدھم لہجے میں بولا۔

"یہ بات ایس پی شاہد بتا سکے گا اگر آپ تھوڑی سی کوشش کریں تو۔"

"میں.....صوفی صاحب! میں ہر طرح آپ کے ساتھ تعاون کے لیے تیار ہوں۔" تھوڑے ہی فاصلے پر حسینہ اور نشیلے بھی بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ صوفی نے تشویش بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا اور اس کے بعد جمشید مرزا سے بولا۔

"کوئی سواری ہے تمہارے پاس؟"

"میں موبائل فون پر طلب کر لیتا ہوں۔"

"اور وہاں ان چٹانوں پر آپ بہ ذریعہ ہیلی کاپٹر پہنچے تھے؟"

"بس بتا دوں گا اس بارے میں تفصیلات آپ کو۔" جمشید مرزا نے کہا اور موبائل فون پر ایس پی شاہد کو صورت حال کے بارے میں بتانے لگا پھر موبائل فون بند کر کے بولا۔

"صرف دس منٹ دیں گے آپ مجھے۔"

"ہم آپ کو محبت سے تو ساری زندگی دے سکتے ہیں۔"

صوفی کی تشویش زدہ نگاہیں معشوق نشیلے اور حسینہ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ہوش میں آنے کے بعد ان لوگوں کا کیا حشر ہوگا۔ بہر حال یہ بعد کی باتیں تھیں۔ ایس پی شاہد علی نے پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اسے کوئی تفصیل اس وقت نہیں بتائی گئی۔ یہ لوگ جیپ میں بیٹھ کر جا رہے تھے کہ جمشید مرزا نے اسے تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔

"گڈ۔ صوفی صاحب کیا کہتے ہیں اس بارے میں۔" ایس پی شاہد نے مسکراتی نگاہوں سے صوفی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"حق اللہ! درویش ہم سب پر رحم کریں گے۔ ویسے مرزا جی آپ نے ایس پی صاحب کو اس سرخ مٹی کے بارے میں نہیں بتایا جس کی تلاش میں ہم جا رہے ہیں۔"

"سرخ مٹی.....؟"

"میرا مطلب ہے وہ بجری جو بھوری مائل سرخ یا سرخی مائل بھوری تھی۔ آخر یہ کون سے علاقے میں ہے؟"

"بھوری مائل سرخ یا سرخی مائل بھوری بجری۔" ایس پی شاہد علی نے کہا۔

"ہاں۔ میں تمہیں بتاؤں کوٹھی میں ایک جگہ اس طرح کی بجری نظر آ رہی تھی۔"

"یار تمہیں کوٹھی پر دکھانا چاہیے تھا مجھے۔ ویسے..... ویسے۔" شاہد علی کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ جمشید مرزا اور صوفی اس کی صورت دیکھتے رہے۔ کچھ لمحوں کے بعد شاہد علی نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ میں ایک ایسی جگہ کو جانتا ہوں لیکن کاش تم وہ بجری مجھے وہیں عمارت میں دکھا دیتے۔ خیر چلو چلتے ہیں۔" پھر شاہد علی انہیں لیے ہوئے ایک ایسے علاقے میں پہنچا جو سراج پور کا نواحی علاقہ تھا۔ یہاں خوب صورت کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ بالکل اتفاقیہ طور پر ایک ایسی کوٹھی میرے علم میں آئی ہے جہاں مصنوعی طریقے سے بجری کو رنگوا کر ایک روش بنوائی گئی ہے۔ میں کسی کام سے ادھر سے گزر رہا تھا کہ مجھے ایک جگہ بڑی خوب صورت نظر آئی۔ میں نے رک کر اسے دیکھا تھا۔"

"کہاں ہے وہ.....؟"

"بالکل الگ تھلگ۔ ابھی ہم جس موڑ سے مڑیں گے وہاں سے گہرائی میں وہ نظر آتی ہے۔" ایک پہاڑی موڑ مڑتے ہوئے اچانک ہی ایک حادثہ رونما ہو گیا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا اور اگر ایس پی شاہد ایک ماہر ڈرائیور نہ ہوتا تو یقینی طور پر جیپ گہرائیوں میں گر پڑی ہوتی۔ بڑی خوف ناک جگہ تھی۔ دھواں ایک عظیم الشان بادل فضا بلند ہوا اور ایس پی شاہد علی اور جمشید مرزا بری طرح کھانسنے لگے۔ دھویں میں وہ یہ بھی نہیں دیکھ سکے تھے کہ اچانک صوفی جیپ سے اترا ہے اور ایک طرف دوڑتا چلا گیا ہے۔

♥......♥......♥

ناظمہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ کمرا اعلیٰ پیمانے پر آراستہ تھا اور وہ ایک آرام دہ بستر پر تھی۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر اٹھ نہ سکی۔ یوں لگا جیسے بدن کی ساری جان نکل گئی ہو۔ ذہن بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ ذہن پر زور دینے سے اچانک ہی سر میں درد اور پھر تاریکی کا احساس ہوا اور غالباً دوبارہ غنودگی طاری ہو گئی اور پھر دوسری بار جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کی نگاہ سامنے دیوار پر لگی گھڑی پر پڑی۔ آٹھ بجے تھے اور سامنے رکھا ہوا ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ اس مرتبہ کیفیت پہلے جیسی نہیں تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر سر پکڑے بیٹھی رہی پھر کھڑی ہو گئی لیکن پھر شدت سے چکر آیا اور سنبھلنے کے لیے اس نے میز کا کونا پکڑا۔ سامنے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ باہر جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا۔

"آپ کو درانی صاحب یاد کر رہے ہیں؟" اس نے مودب لہجے میں کہا۔

"کیا......؟" ناظمہ اچھل پڑی۔

"جی ہاں۔"

"کک......کہاں ہیں وہ؟"

"آیئے میرے ساتھ۔" نقاہت کے باوجود اس کی رفتار خاصی تیز تھی اور اس آدمی کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ محض اس کی وجہ سے تیز تیز چل رہا ہو۔ وہ کئی راہداریاں پار کر کے اس بڑے سے کمرے میں آئے اور پھر وہاں اس نے جو کچھ دیکھا وہ اسے بری طرح نروس کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس نے ہاشم درانی کو دیکھا جو ایک کرسی سے بندھا ہوا تھا اور اس کے گرد چار آدمی کھڑے اسے قہر آلود نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ دفعتاً ہاشم درانی کی نگاہ ناظمہ پر پڑی اور اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے ایک دہشت بھری آواز نکلی۔

"تم......تم۔" لیکن اسکی کرسی سے اٹھنے کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ وہ بندش بہت مضبوط تھی۔ اس کے بعد خاموشی ہی طاری رہی تھی۔ ناظمہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے تھے۔ اچانک ایک شخص نے آگے بڑھ کر کہا۔

"ایک بار پھر تمہیں بتایا جا رہا ہے مسٹر درانی کہ تم نے غلط آدمی سے ٹکرانے کی کوشش کی۔ شمیان ہو کے بارے میں اگر تم معلوم کر لیتے تو شاید تم یہ ہمت نہ کر پاتے۔ شمیان ہو......ایک عظیم رہنما! جسے آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔" ہاشم درانی کے منہ سے آواز نہ نکلی۔ اس کی آنکھیں ناظمہ کے چہرے سے ہٹ کر نیچے جھک گئی تھیں۔ اس نے پھر کہا۔

"اور اگر تم نے وہ کاغذات واپس نہیں کیے تو اب ہمیں مجبوراً دہشت گردی پر اترنا پڑے گا۔ ہم تمہارے سامنے اس لڑکی کے بدن کی بوٹیاں الگ کر دیں گے۔ کیا تم اس کے تڑپنے کا منظر دیکھ سکو گے مسٹر درانی!"

"نہیں......نہیں۔" ہاشم درانی بے ساختہ چیخ پڑا۔ اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں پھوٹ آئی تھیں۔ ناظمہ کے پورے بدن میں بھی تھرتھری دوڑ رہی تھی۔ اس کا سر دوبارہ چکرانے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کمرے کی روشنی پر غبار کی تہیں چڑھتی جا رہی ہوں اور پھر اس آدمی نے جو اس کے ساتھ آیا تھا اسے سنبھال لیا۔ ایک بار پھر ناظمہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

"اسے آرام سے کرسی پر ڈال دو۔" بھاری جبڑے والے آدمی نے کہا اور پھر وہ ہاشم درانی سے بولا۔

"اور اگر اب بھی تمہیں ہوش نہ آئے تو اسے تمہاری بدبختی سمجھنا چاہیے۔" ہاشم درانی تھوڑی دیر تک اسے گھورتا رہا پھر اپنے ہونٹ بھینچ کر بولا۔

"ٹھیک ہے تمہیں جو کرنا ہے کر لو سمجھے! میں تم پر کاغذات کا سایہ تک نہیں پڑنے دوں گا۔" بھاری جبڑے والے نے خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر بولا۔

"مسٹر ہاشم درانی! تم شمیان ہو کی قوتوں سے واقف ہو چکے ہو۔ اس کے باوجود بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ شمیان ہو کی قوت نے تمہیں کہاں سے کھوج نکالا ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تم ایسی جگہ چھپے تھے جہاں فرشتے بھی پر نہیں مار سکتے، لیکن شمیان ہو جب باعمل ہوتا ہے تو ایسے ہی کارنامے سرانجام دیتا ہے۔ آخر تمہیں کھوج نکالا گیا اور یہ شمیان ہو ہی کی قوت تھی جو دن دھاڑے اس لڑکی کو یہاں اٹھا لائی حالانکہ

ہم میں سے سب جانتے ہیں کہ کاغذات تمہارے لیے بے کار ہیں۔ تمہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ ویسے تم عقل مند ضرور ہو کہ تم نے ابھی تک وہ کاغذات پولیس کے حوالے نہیں کیے۔ ان کاغذات کو اپنی تحویل میں رکھ کر تم کیا کرنا چاہتے ہو......بتاؤ تو سہی۔"

"میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا۔ اب تمہارا جو دل چاہے کر لو۔ چاہو تو تم اس لڑکی کی بوٹیاں کر دو۔ تم دیکھو گے کہ میرے منہ سے آواز بھی نہیں نکل سکے گی۔"

"ہوں......" اس شخص نے اس انداز میں گردن ہلائی جس سے یہ احساس ہوتا تھا کہ جیسے وہ اب کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے پھر اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اس لڑکی کے پیر کا انگوٹھا کاٹ دو۔" اس آدمی نے میز پر سے ایک چمک دار کلہاڑی اٹھائی اور بے ہوش ناظمہ کی جانب بڑھا لیکن اسی وقت ایک دھماکا ہوا اور سامنے والے شیشے کے پرخچے اڑ گئے۔ یہ ایک پتھر تھا جو شیشے پر پڑا تھا۔ اس کے ساتھ ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔

"یو پاؤ، چوچاؤ، ہو ہاشمیان ہو درویشوں کے کرم سے۔" ساتھ ہی ایک اور دھماکا ہوا لیکن یہ دھماکا اس بڑے پلیٹڈ بلب کا ہوا تھا جو اس وسیع و عریض کمرے کو روشن کیے ہوئے تھا۔ بلب ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی افراتفری پھیل گئی۔ دھڑا دھڑ فرنیچر لڑھکنے لگا۔ ہاشم درانی کی بھی کرسی الٹ گئی لیکن اسے اتنا ہوش تھا کہ اس نے اپنا سر فرش سے نہ لگنے دیا۔ کمرے کے دوسرے لوگ کتوں کی طرح شور مچا رہے تھے۔ اچانک ہاشم درانی کی بندشیں کھلنے لگیں اور پھر اسے کسی نے بازو سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ چند لمحوں کے بعد اس کا ہاتھ پکڑا گیا اور اسے ایک طرف کھینچا جانے لگا۔ ہاشم درانی کچھ اس قدر بدحواس ہو رہا تھا کہ وہ اس نامعلوم آدمی کے ساتھ کھنچتا چلا گیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے خود کو تازہ ہواؤں میں محسوس کیا۔ اس کے سر پر تاروں سے بھرا آسمان تھا۔ اس نے اندھیرے میں اس آدمی کو پہچاننے کی کوشش کی جو اس کے ہاتھ کو پکڑے ہوئے تیزی سے نشیب میں اتر رہا تھا۔ اس نے اپنے کندھے پر بھی کسی انسانی جسم کو لاد رکھا تھا۔ اس کے باوجود اس کے قدم اس تیزی سے اٹھ رہے تھے کہ بیان سے باہر ہے۔ ہاشم درانی کو اتنا ہوش تو تھا ہی کہ وہ ان الفاظ پر غور کر سکتا جو یو پا اور چوچا کی شکل میں ادا کیے گئے تھے اور آخر میں درویشوں کے کرم سے۔ ان الفاظ نے اس آدمی کی پول کھول دی تھی۔ ایک لمحے میں اس نے پہچان لیا کہ یہ صوفی ہی ہے پھر اس کے منہ سے لرزتی ہوئی سی آواز نکلی۔

"صص......صص، صوفی صاحب!"

"ابھی نہیں چپ چاپ چلے آیئے۔ درویشوں کے رحم کے سائے میں۔ صوفی کی آواز سنائی دی۔ وہ جلد ہی چٹانوں میں ایک محفوظ جگہ پہنچ گئے۔ چٹانیں کچھ اس طرح کی تھیں کہ ان میں کسی کو تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تب ہاشم درانی نے ناظمہ کو دیکھا جو صوفی کے کاندھے سے لٹکی ہوئی تھی۔ پھر اس کے بعد صوفی نے بڑے اہتمام سے اسے اتار کر ایک پتھر پر لٹا دیا۔ ہاشم درانی نے کہا۔

"ارے......ابھی ہم زیادہ دور نہیں آئے۔ وہ محل یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔"

"اسی لیے تو میں رک گیا ہوں ذرا یہ تماشا تو دیکھ لوں کہ یہ لوگ کرتے کیا ہیں؟"

"مگر تم اف میرے خدا تم تو واقعی ایک عظیم شخصیت نکلے صوفی!"

"نن......نن...... نکلے۔ جناب عالی! یہاں آپ اردو کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔" جواب میں ہاشم درانی ہنس پڑا تھا پھر اس نے کہا۔

"مگر آپ یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

"بس صوفی صاحب! میں ایسی جگہ چھپا تھا کہ وہاں پرندہ بھی پر نہ مار سکے لیکن انہوں نے مجھے وہاں سے نکال لیا۔ قرب و جوار میں گیس کے بم پھینکے پھر آخر کار مجھے غار سے باہر نکلنا پڑا۔ اچانک ہی صوفی اس طرح آواز سننے لگا جس طرح کوئی آ رہا ہو پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"جمشید مرزا واقعی احمق نہیں ہے۔"

"یہ...... یہ...... یہ آوازیں تو شاید گاڑیوں کی ہیں۔ وہ لوگ ہمیں تلاش کر رہے ہیں۔"

"نہیں۔ وہ لوگ نہیں تلاش کر رہے، آیئے۔"

"مم...... مم...... مگر یہ گاڑیاں۔"

"ہاں میں نے کہا ناں آجایئے۔" یہ کہہ کر صوفی نے ناظمہ کو پھر اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔

"لاؤ اسے مجھے دے دو۔"

"نہیں۔ آپ اسے میرے کندھوں پر ہی رہنے دیجیے۔" صوفی نے کہا۔ اترائی بڑی مخدوش تھی اور بڑے سنبھل سنبھل کر یہاں سے اترنا پڑ رہا تھا۔ پھر انہیں پتلی سی بل کھاتی سڑک نظر آئی۔ مطلع ابر آلود نہ ہونے کی وجہ سے تاروں کی چھاؤں میں سڑک صاف دکھائی دے رہی تھی اور پھر ایک تیز روشنی چٹانوں میں پھیل گئی اور پھر جلد ہی پانچ چھ آدمی ان کی مدد کے لیے اوپر چڑھ آئے جن میں ایس پی جمشید مرزا اور ایس پی شاہد علی بھی تھے۔"

"وہ عمارت ہے مرزا جی ذرا اس کا جائزہ لے لیجیے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"اس نے ہاشم درانی کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔" آپ پولیس کو کوئی بیان نہیں دیں گے۔" لیکن یہ الفاظ شاہد علی نے سن لیے تھے۔ وہ بولا۔

"یہ آپ کیا باتیں کر رہے ہیں؟"

"پپ...... پتا نہیں۔" پولیس کے آدمی اس عمارت کی طرف دوڑ گئے تھے جس کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ تعداد اچھی خاصی تھی۔ جمشید مرزا نے صوفی کے غائب ہوتے ہی بہترین انتظامات کر لیے تھے۔ بہرحال وہ عمارت میں داخل ہو گئے تھے۔ وہاں سے کچھ لوگوں کو گرفتار کر کے باہر لے آئے۔ وہ سب پسینے میں نہائے ہوئے تھے اور بری طرح ہانپ رہے تھے۔ صوفی نے کہا۔

"یہ شیرٹن کے آدمی ہیں۔"

"بکواس مت کرو۔ تم...... م...... تم کون ہو؟" ایک قوی ہیکل آدمی نے جس کے جبڑے بہت بھاری تھے چیخ کر کہا۔

"کوئی بات نہیں میں جو کوئی بھی ہوں تمہیں پتا چل جائے گا۔"

"دیکھو اگر تم نے ہم پر ہاتھ ڈالا تو گہری مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔"

"میں تو بچپن سے بڑی گہری مصیبتوں میں پھنسا ہوا ہوں درویشوں کے کرم سے۔" صوفی نے جواب دیا اور پھر ان سب کے ہتھکڑیاں لگا دی گئیں۔ جب وہ گاڑی میں بٹھائے جا چکے تو ایس پی شاہد علی نے صوفی سے کہا۔

"جی صوفی صاحب! میرا آپ سے براہ راست کوئی تعارف نہیں ہوا ہے لیکن اس وقت آپ نے جو کچھ کیا ہے اس کی قدر کی جا سکتی ہے آپ براہ کرم شیرٹن والے معاملے میں مجھے اپنے اعتماد میں لے لیجیے۔"

"گود لینے کے بارے میں تو ہم نے سنا ہے درویشوں کی دعاؤں سے یہ اعتماد میں کیا لیا جاتا ہے۔" یہ ساری باتیں ہو رہی تھیں بہرحال ہاشم درانی اپنی کوٹھی میں پہنچ گیا۔ ناظمہ کو بھی وہیں پہنچا دیا گیا اور پھر نہ جانے کتنے وقت تک ہاشم درانی اور صوفی کمرے میں بند رہے تھے اور صوفی نے ہاشم درانی کو آگے کے بارے میں بہت سی تفصیلات بتا دی تھیں۔

جمشید مرزا اور ایس پی شاہد علی گرفتار شدگان کو لے کر چلے گئے تھے۔ ان کے ذہن میں شیرٹن ہی تھا۔ بعد میں وہ ان لوگوں کا بیان لینے کے لیے آئے۔ ہاشم درانی سے سوال کیا گیا کہ وہ کہاں غائب ہو گیا تھا تو اس نے بتایا کہ اسے شیرٹن کا خط موصول ہوا تھا اور اس سے بہت بڑی رقم کا مطالبہ کیا گیا تھا چنانچہ وہ اسی کے خوف سے روپوش ہو گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اس سے پہلے بھی ایک بار شیرٹن کا شکار ہو چکا ہے اور اسے پچیس لاکھ روپے کا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔

بہرحال شمیان ہو اور اس کے معاملات کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دی گئی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ روپوش تھا کہ شیرٹن نے اس کے آدمیوں کو تلاش کر لیا اور پھر اس کی بھتیجی کو بھی اغوا کر لیا گیا اور ان دونوں پر تشدد کر کے رقم کا مطالبہ کیا گیا چونکہ صوفی صاحب پہلے ہی سے ان لوگوں کی تلاش میں مصروف تھے اس لیے وہ بھی اس جگہ پہنچ گئے۔ جمشید مرزا صوفی کی شکل دیکھ رہا تھا جو اس سارے ماحول سے لاتعلق بے تاثر پان کی جگالی کر رہا تھا۔ ادھر ناظمہ بھی کافی خوف زدہ تھی اسے بیان دینے کے ناقابل قرار دے دیا تھا۔ دوپہر کے بعد اچانک ہی ہاشم درانی نے صوفی سے رابطہ قائم کیا اور اسے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں ایک خنجر پڑا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک کاغذ کا ٹکڑا بھی۔

"واہ! درویش ہم سب پر رحم کریں یقیناً شمیان ہو کی طرف سے کوئی دھمکی دی گئی ہے۔"

"ہاں اور اب تو میں واقعی شاہ میر صاحب کا معتقد ہو گیا ہوں۔ بڑا صحیح انتخاب کیا ہے انہوں نے تمہارا صوفی صاحب!" صوفی نے آگے بڑھ کر میز سے خط اٹھا لیا۔ لکھا ہوا تھا۔ "آخری موقع دیا جا رہا ہے تمہیں ہاشم درانی! اور اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ تم نے میرے کاغذات مجھے واپس نہ کیے تو تمہارے گھر کا ایک شخص کل شام تک قتل کر دیا جائے گا اور اس پر بھی تمہیں ہوش نہ آیا تو پھر تمہاری بھتیجی اگر تم کاغذات واپس کرنے پر تیار ہو تو آج رات کو آٹھ بجے اپنی کوٹھی کے گیٹ پر ایک سرخ رنگ کا بلب روشن کر دینا۔"

"گیٹ بڑا ڈرامائی انداز ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے پر خیال انداز میں کہا۔

"ادھر ڈاکٹر فیلکس میری جان کھائے جا رہا ہے۔ وہ حقیقت کو جاننا چاہتا ہے ویسے یہ شیرٹن تو

میری سمجھ میں واقعی نہیں آیا۔ پتا نہیں اس کا کیا قصہ ہے؟''

''شیرٹن کچھ بھی نہیں ہے اسے آپ شمیان ہو کی ایک چھوٹی سی چال کہہ لیجیے۔ اس نے یہ حرکت اس لیے کی ہے کہ آپ پولیس کی مدد نہ کر سکیں درویشوں کی دعاؤں سے۔ ذرا سوچیے شہر کے سارے بڑے لوگ پولیس سے شیرٹن کی شکایت کرتے ہیں اور اچانک آپ بھی پولیس کی مدد طلب کرتے ہیں اور آپ دوسری داستان سناتے ہیں نتیجہ یہ کہ پولیس شیرٹن اور شمیان ہو دونوں کو بکواس سمجھے گی اور آپ کی مدد کے بجائے یہی جواب ملے گا کہ شہر سے کسی شریر نوجوان نے لوگوں کو پریشان کرنے کی کوشش ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر میری عقل اب جواب دیتی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر فیلکس میرا بہت اچھا دوست ہے۔ ہمارے درمیان کوئی راز راز نہیں رہا، لیکن......''

''میرا خیال ہے کہ اب آپ سب کچھ اسے بتا دیجیے تاکہ ہم سب لوگ مل کر آپس میں مشورہ کر سکیں۔''

''اس سے کیا ہوگا؟''

''کوئی نہ کوئی تو کچھ سوچے گا۔''

''اگر یہ کاغذات پولیس کے حوالے کر دیے جائیں تو۔'' ہاشم درانی نے کہا۔

''اس صورت میں آپ شمیان ہو کے انتقام سے نہ بچ سکیں گے۔''

''یہی سوچ کر تو خاموش ہو جاتا ہوں۔''

''میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کو یہ ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔''

''تو پھر مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟''

''جو کچھ میں کہوں وہ کیجیے گا۔ میں نے درویشوں سے رہنمائی طلب کی ہے۔''

''بتاؤ۔''

''فی الحال خاموشی، میں باقی لوگوں سے بھی مشورہ کر لوں۔'' اور اسی دن رات کو آٹھ بجے سرخ رنگ کا ایک بلب گیٹ پر لگوا دیا گیا۔ ان سب کو شمیان ہو کی داستان سنا دی گئی تھی اور سب نے ایک ہی رائے دی تھی کہ اس خطرناک آدمی کے کاغذات واپس کر دیے جائیں۔ ڈاکٹر فیلکس نے کہا۔

''ایک بار پہلے بھی یہ نام سن چکا ہوں اور یقینی طور پر جرم کے کسی بڑے سلسلے میں یہ نام سنا گیا تھا۔

بہرحال یہ سرخ بلب شمیان ہو کے لیے اشارہ تھا اور شمیان ہو کی طرف سے بالکل توقع کے مطابق اس کا جواب بھی آ گیا۔ نصرت نے ایک دروازے کی چوکھٹ میں ایک خنجر پیوست دیکھا جس کی نوک کاغذ کے ٹکڑے کو چھیدتی ہوئی دروازے میں گھس گئی تھی۔ یہ شمیان ہو کا خط تھا جس میں ہاشم درانی کو تاکید کی گئی تھی کہ وہ دوسرے دن ٹھیک نو بجے ان کاغذات کو ایک ایسی جگہ پہنچا دے جہاں گھوڑے کے سر جیسی چٹان بنی ہوئی ہے۔ اس چٹان کے کسی رخنے میں یہ کاغذات رکھ دیے جائیں۔ اس میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر ہاشم درانی کو کسی قسم کا خوف ہو تو وہ اپنے ساتھ جتنے بھی آدمی لانا چاہے لا سکتا ہے البتہ کسی فریب کی صورت میں اس کے بعد اسے کوئی وارننگ نہیں دی جائے گی۔ سب لوگ اس بات پر خوف زدہ تھے کہ شمیان ہو کے خط اور خنجر وغیرہ اس طرح آسانی سے کوٹھی میں کیسے پہنچ جاتے ہیں جبکہ اس وقت ہر شخص مستعد تھا۔

''ایک تجویز میرے ذہن میں ہے۔'' اسمشیر نے ہاشم درانی سے کہا۔

''بتاؤ''

''نہیں۔ سب کے سامنے نہیں، خاص طور پر بچوں کے سامنے نہیں۔''

''میں اپنی عمر کا سرٹیفکیٹ پیش کر سکتا ہوں درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی نے کہا۔

''تم......تم تو سب کے بزرگ ہو مسٹر صوفی!'' اسمشیر بے اختیار مسکرا کر بولا۔

''بہت بہت شکریہ۔ درویش آپ پر اپنی عنایتوں کی بارش کریں۔''

''یہ تو نہ کہیے صوفی صاحب کہ میں ان درویش صاحب کو جانتا بھی نہیں ہوں۔''

''جان بھی نہیں پاؤ گے۔'' ڈاکٹر فیلکس بالکل خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ بہرحال باقی لوگ وہاں سے اٹھ گئے۔ ہاشم درانی اسمشیر مشورے کا انتظار کر رہا تھا۔ اسمشیر نے کہا۔

''میں نے پوری زندگی آرٹ کی خدمت کرتے ہوئے گزاری ہے۔ بنیادی طور پر میں ایک آرٹسٹ ہوں بہ ظاہر بھی اس طرح کے معاملے میں کوئی مشورہ کسی کو نہیں دے سکا ہوں لیکن اس وقت جو کچھ میرے سامنے ہو رہا ہے اور جس انداز میں ہو رہا ہے اس نے مجھے بھی بہت متاثر کیا ہے حالانکہ میں مسٹر فیلکس کے ساتھ یہ سوچ کر آیا تھا کہ پراسرار مشرق کو قریب سے دیکھوں اور اسے اپنے ذہن میں محفوظ کر لوں بہرحال اگر میری حقیر سی رائے معلوم کرنا چاہیں تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ شمیان ہو اس وقت سراج پور میں موجود ہے۔''

''اوہ!......اس بات کے امکانات تو ہمارے ذہن میں بھی ہیں۔''

''تو ہمیں اس موقع پر فائدہ اٹھانا چاہیے۔''

''کیسے......؟''

''اگر ہم اسے پکڑ سکیں تو یہ انسانیت کی ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔'' اسمشیر بولا۔

''یار کمال کی باتیں کر رہے ہو۔ کون پکڑے گا اسے، جسے کوئی بھی نہیں دیکھ سکا ہے۔ آج تک کوئی بھی نہیں جانتا۔ وہ جس وقت چاہے ہم سب کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے۔'' اسمشیر نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ شمیان ہو کوئی مافوق الفطرت قوت کا مالک ہوگا۔ میں معاف کیجیے گا بہت بڑی بات کہنے جا رہا ہوں میں دعوے سے کہہ رہا ہوں کہ اس وقت گھر کا کوئی شخص اس سے ملا ہوا ہے۔ کمرے میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ ہاشم درانی سانس روکے ہوئے اسمشیر کو دیکھ رہا تھا۔

''درویش......درویش رحم کریں مسٹر اسمشیر کی بات میں وزن ہے؟'' صوفی نے کہا۔

''مم......مم مگر کون ہو سکتا ہے وہ؟''

''کوئی بھی ہو۔'' اسمشیر نے بے پروائی سے اپنے شانوں کو جنبش دی۔ ''ہمیں کسی پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔''

''کمال ہے آپ اتنی دیر سے کیوں خاموش تھے مسٹر اسمشیر۔''

''بہت عجیب و غریب بات ہے میری سمجھ میں نہیں آتا آخر ان کاغذات میں کیا ہے؟''

''اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے شمیان ہو کی شخصیت پر روشنی پڑ سکے۔ کمال کی بات ہے۔ بہرحال میں طے کر چکا ہوں کہ وہ کاغذات شمیان ہو کو پہنچا دوں گا۔''

''آپ انسانیت پر ظلم کریں گے۔'' اسمشیر نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''بہتر یہ ہوگا کہ آپ خود کو پولیس کی تحویل میں دے دیں اور کاغذات ان کے حوالے کر دیں۔''

''نہیں۔ میں بچہ نہیں ہوں۔ کاغذات عرصہ دراز سے میرے پاس محفوظ ہیں اگر مجھے پولیس کی مدد حاصل کرنی ہوتی تو کبھی کی حاصل کر لیتا۔''

''پھر آخر انہیں آپ کیوں رکھے ہوئے ہیں؟''

''بھئی سیدھی سی بات ہے ہاشم درانی ابھی تک اسی لیے زندہ ہے کہ وہ کاغذات اس کے قبضے میں ہیں۔ اگر شمیان ہو کا ہاتھ ان پر پڑ گیا ہوتا تو ہاشم درانی ہم میں نہ ہوتا۔''

''ہوں۔'' اسمشیر نے پرخیال انداز میں گردن ہلائی۔

''تمہاری اسکیم کیا تھی؟'' ہاشم درانی نے کہا۔

''شمیان ہو بتائی ہوئی جگہ پر تنہا آئے گا اگر وہاں کچھ لوگ پہلے سے چھپا دیے جائیں تو۔''

''بات تو ٹھیک ہے لیکن یہ بتایئے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی پہلے کون باندھے گا۔ ہاشم صاحب اس معاملے میں پولیس کو ڈالنا نہیں چاہتے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ وہاں چپ چاپ گلے میں گھنٹی بندھوا ہی لے گا۔ تم مجھے وہ جگہ دکھا دو پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ گھنٹی کون باندھے گا۔'' اسمشیر نے اکڑ کر کہا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر وہ سرگوشیوں کے سے انداز میں مشورہ کرنے لگے۔ آخر یہ طے پایا کہ یہ لوگ اسی وقت چل کر اس گھوڑے کے منہ جیسی چٹان کا جائزہ لیں۔ ہاشم درانی ہچکچا رہا تھا لیکن صوفی کی سرگرمی دیکھ اسے بھی ہاں میں ہاں ملانا پڑی۔ صوفی پر اب وہ بہت زیادہ اعتماد کرنے لگا تھا۔

♥.....♥.....♥

رات تاریک تھی۔ ہاشم درانی، ڈاکٹر فیلکس سمشیر اور صوفی دشوار گزار راستوں پر چکراتے ہوئے اس طرف بڑھ رہے تھے جہاں وہ گھوڑے کے منہ جیسی چٹان موجود تھی۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی ٹارچیں تھیں جنہیں وہ اکثر روشن کر لیتے تھے۔ ڈاکٹر فیلکس، اسمشیر اور ہاشم درانی مسلح تھے۔ صوفی کے پاس شاید کوئی اسلحہ نہیں تھا البتہ وہ بہت زیادہ مستعد تھا۔ چٹان کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ چٹان بہت بڑی تھی اور اندھیرے میں بہت زیادہ خطرناک نظر آ رہی تھی۔ اس کی بناوٹ گھوڑے کے منہ جیسی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک اسمشیر اس کا جائزہ لیتا رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''بہت آسان...... بہت آسان ہے۔ ذرا ان غاروں کو تو دیکھو ان میں ہزاروں آدمی چھپ سکتے ہیں۔ ہمیں اس کے لیے یہ غار استعمال کرنے چاہئیں۔''

''اس کے لیے صرف ایک آدمی کافی ہوگا۔'' اچانک صوفی نے کہا۔

''یار میری سمجھ میں تم آ ہی نہیں سکے کہ تم ہو کیا چیز۔ ایک آدمی اتنے خوف ناک آدمی کا کیا بگاڑے گا؟''

''تو ہزار آدمی کیا آپ کے اپنے ہی خاندان سے ہوں گے ورویشوں کی دعاؤں سے۔''

''چونکہ میں تمہیں جانتا ہی نہیں ہوں اس لیے تمہاری فضول باتوں کا جواب نہیں دے سکتا۔ میری

رائے ہے کہ پولیس کو اس سلسلے میں شامل کر لینا چاہیے۔''

''تمہاری رائے آخر حیثیت کیا رکھتی ہے۔'' صوفی نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تم کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''دانت توڑ دوں گا ایک گھونسے میں۔ سمجھتا کیا ہے تو اپنے آپ کو۔'' صوفی بے تکے انداز میں بولا اور سب ششدر رہ گئے۔

''پاگل کے بچے بکواس کیے جا رہا ہے درویشوں کے کرم سے۔ ابے تو درویشوں کو نہیں جانتا۔'' صوفی کی کیفیت عجیب سی ہوتی جا رہی تھی اور کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ''تھوکتا ہوں میں تم لوگوں پر، لعنت بھیجتا ہوں ایک ہزار، دو ہزار، تین ہزار، چار ہزار...... ہاہا۔ ہاہا۔'' صوفی کا قہقہہ فضاؤں میں بلند ہوا اور وہ سب ششدر رہ گئے پھر صوفی نے ایک طرف چھلانگ لگا دی اور دوڑتا چلا گیا۔

''ارے...... ارے...... یہ اسے کیا ہوا اس کا دماغ کیوں خراب ہو گیا۔'' بہرحال اس کے بعد صوفی کی تلاش میں نہ جانے کتنی دیر وہاں گزاری گئی لیکن وہ نظر نہیں آیا تھا۔

دوسری صبح سب لوگ بڑی بے چینی کا شکار تھے۔ آخرکار یہ طے کر لیا گیا تھا کہ ہاشم درانی ہی کاغذات کا وہ پیکٹ لے کر اس چٹان تک جائے۔ اب وہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ صوفی بھی غائب تھا اور شامت آ گئی تھی حسینہ اور معشوق نشیلے کی۔

''تم دونوں حرام خور یہاں کیا کر رہے ہو۔ آخر صوفی ہے کہاں؟''

''ارے...... ارے آپ تو بالکل فارسہ ہو گئے۔ آپ کو پتا ہے کہ ہمیں صوفی صاحب کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوتا۔''

''تو پھر تم یہاں مرے کیوں ہوا کر؟''

''زندہ ہیں اس طرح کہ غم زندگی نہیں اور اگر اس شعر کو فارسہ میں کہا جائے تو حسینہ کیا کہیں گے۔''

''تیرا منہ، مری کے کتے میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ اے بڑے صاحب مجھے ریل میں بٹھا دو۔ یہاں لا کر ان لوگوں نے میری مٹی پلید کر دی ہے۔'' وہ لوگ اپنی ہی سنانے لگے۔ ہاشم درانی کی کیفیت کافی خراب تھی۔ اس نے طے کیا تھا کہ اب وہ شمیان ہو کے کاغذات کا پیکٹ لے کر تنہا ادھر جائے گا اور اس نے کسی کی نہیں مانی تھی۔ سب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اس کا تنہا جانا ٹھیک نہیں ہے مگر ہاشم درانی کسی کو اپنے ساتھ لے جانے پر رضامند نہیں ہوا تھا۔ صوفی کی گمشدگی نے اس پر نہ جانے کیا اثرات مرتب کیے تھے۔ خود ناظمہ بھی صوفی کی اس حرکت پر حیران تھی۔ تقریباً نو بجے ہاشم درانی چلا گیا تھا پھر اس کی واپسی کوئی ساڑھے دس بجے کے قریب ہوئی۔ اس کے چہرے سے تھکن ظاہر ہو رہی تھی۔ اس نے کرسی پر گر کر اپنا جسم پھیلاتے ہوئے انگڑائی لی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر فیلکس نے ہی اس سے پوچھا تھا۔

''کیا رہا......؟''

''کچھ نہیں ہوا بالکل سناٹا تھا۔ میں ایک پیکٹ محفوظ پر رکھ کر واپس آ گیا۔ وہاں سے صحیح سلامت آنے کا مطلب یہ ہے کہ اب مجھے یا میرے خاندان والوں کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔'' ابھی وہ کچھ اور بھی کہنا

چاہتا تھا کہ اچانک ہی دروازے سے صوفی کی آواز سنائی دی۔

''درویش رحم کریں۔ حق اللہ!'' وہ کمرے میں داخل ہوگیا۔ بڑی عجیب سی صورت حال تھی۔ ملگجا لباس، منہ میں پان کے ملغوبے کا فضلہ، پان کی پیک ہونٹوں سے نیچے ٹھوڑی کو رنگین کیے ہوئے۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''حق اللہ...... حق اللہ...... حق اللہ! درانی صاحب خوب بے وقوف بنایا آپ نے شمیان ہو کو۔ واقعی آپ بہت ذہین آدمی ہیں۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو اور کہاں مر گئے تھے سب لوگوں کو بے وقوف بنا کر۔ میں صرف شاہ میر صاحب کی وجہ سے تمہارے ساتھ رعایت برتتے ہوئے ہوں۔ کیا سمجھ رکھا ہے تم لوگوں نے اور یہ کسے لے کر آئے ہو تم۔ ساتھ یہ عورت اور مرد کون ہیں؟''

''ایک فارسہ ہے اور دوسری فارسی ہے۔ ویسے یہی پیکٹ رکھا تھا نا آپ نے۔'' صوفی نے جیب سے ایک براؤن رنگ کا پیکٹ نکال کر ان کے سامنے میز پر ڈال دیا۔

''ارے یہ کیا کیا تم نے؟'' ہاشم درانی اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ صوفی آگے بڑھا اور اس نے پیکٹ پھاڑ کر اس کے کاغذات اس کے سر پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''شمیان ہو سے مذاق کرتے ہوئے آپ کو کچھ سوچنا چاہیے تھا درانی صاحب! اس شریف آدمی کو دیکھو کہ اس نے اس کے باوجود آپ کو زندہ رہنے دیا۔ فرش پر بہت سارے کاغذ بے ترتیبی سے بکھر گئے۔ ہاشم درانی نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کاغذات کو دیکھا اور پھر ان پر جھک پڑا۔

''ارے مگر وہ...... وہ میں نے تو کاغذات رکھے تھے۔ اوہ! مگر تم نے اسے اٹھایا ہی کیوں؟''

''اس لیے کہ میں ہی شمیان ہو ہوں۔'' صوفی نے گرج کر کہا اور سب پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔

''تت...... تت...... تم۔'' ان سب کے منہ حیرت سے کھل گئے تھے۔ انہوں نے صوفی کے چہرے کو دیکھا لیکن اب صوفی کے چہرے پر وہ کیفیت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک عجیب بھیانک چہرہ نظر کے سامنے تھا۔ آنکھیں پھٹی ہوئی اور چہرے پر سفاکی قابل دید۔ دفعتاً ہی ناظمہ کے حلق سے چیخ سی نکل گئی۔ اچانک ہی صوفی نے اپنی جیب سے ریوالور نکالا اور اسے اسمشیر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اور تم نے...... تم رات کو مجھے پکڑنے کی اسکیم بنا رہے تھے۔ اب بتاؤ میرا خیال ہے سب سے پہلے تمہیں ہی ختم کرنا چاہیے۔''

''یہ کیا بدتمیزی ہے۔ ہاشم درانی صاحب! میں اسے برداشت نہیں کر سکتا اور آپ کمال کے آدمی ہیں ڈاکٹر فیلکس، نہ جانے کیا کیا کہانیاں سنائی تھیں آپ نے مجھے ان لوگوں کے بارے میں کہ وہ کس قدر ملنسار، مخلص اور خوش اخلاق ہیں۔ یہ تماشا دکھانے کے لیے لائے تھے آپ مجھے یہاں۔ بہتر ہے کہ میں کسی ہوٹل ہی میں قیام کروں اور پھر یہ آدمی...... یہ آدمی تو مجھے زہر ہی لگتا ہے۔''

''درانی واقعی اسمشیر کہہ تو ٹھیک ہی رہے ہیں۔ کیا ہو رہا ہے یہ ہمارے ساتھ اس آدمی سے کہو کہ معافی مانگے اسمشیر سے۔''

''مسٹر اسمشیر میں معافی چاہتا ہوں مگر تم اصل کاغذات کا پیکٹ ہضم نہیں کر سکو گے۔ بہتر یہی ہوگا کہ اسے میرے حوالے کر دو۔'' صوفی نے ریوالور کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب!'' ہاشم درانی ایک بار پھر اچھل پڑا۔ اسمشیر کا ہاتھ بڑی تیزی سے جیب کی طرف گیا لیکن دوسرے ہی لمحے صوفی کے ریوالور سے ایک فائر ہوا اور اسمشیر چیخ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے ہاتھ سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا تھا پھر دفعتاً ہی اس نے صوفی پر چھلانگ لگائی اور صوفی نے اسے اس طرح بیچ کر لیا جیسے کوئی بڑا ریسلر کسی چھوٹے کو رسوں پر کودنے کی وجہ سے کیچ کر لیتا ہے اور اس کے بعد اس نے گھما کر زمین پر دے مارا پھر اس کے سینے پر گھٹنا رکھ کر بولا۔

''ریفری گنتی گنو درویشوں کی دعاؤں سے۔'' اسمشیر نے پلٹ کر صوفی کو دولتی مارنے کی کوشش کی اور پھر الٹی قلابازی کھا کر کھڑا ہوگیا پھر اس کے بعد اس کا رخ دروازے کی طرف تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' ہاشم درانی حلق پھاڑ کر چیخا اور ٹھیک اسی وقت جمشید مرزا اور شاہد علی اندر داخل ہوئے۔ جمشید مرزا نے بھاگتے ہوئے اسمشیر کی کمر پکڑ لی۔ حالانکہ اسمشیر شدید زخمی ہوگیا تھا لیکن پھر بھی اس کا جھٹکا اتنا زوردار تھا کہ جمشید مرزا اچھل کر دور جا گرا۔ صوفی نے چھلانگ لگائی اور اسمشیر کے بال پکڑ لیے۔

''ابے جاتا کہاں ہے درویشوں کے کرم سے۔ ہم سے تو مل لے۔'' یہ کہہ کر صوفی نے اسمشیر کی ٹانگوں پر ٹانگیں ماریں اور پھر اسے اس طرح زمین پر دے مارا کہ اسمشیر کا سر زمین سے ٹکرا دیا۔

''حضرات بلکہ خواتین و حضرات کیا آپ شمیان ہو کی شکل دیکھنا پسند کریں گے۔ اس نے صدیوں سے دنیا کو چکر میں ڈال رکھا ہے۔''

''تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟'' ڈاکٹر فیلکس چیخ کر بولا۔

''اور مسٹر جمشید مرزا اس کے پاس سے اصلی کاغذات کا پیکٹ برآمد کرو اس دوران پیچھے سے بہت سے پولیس کانسٹیبل، سب انسپکٹروں کی سرکردگی میں اندر داخل ہو گئے۔ صوفی نے اسمشیر کو ایک کرسی پر دھکیل دیا۔ پھر جمشید مرزا نے اس کے کپڑوں کی تلاشی لی۔ اس کے پاس سے ایک لفافہ برآمد ہوا جسے جمشید مرزا نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ اسمشیر کے زخم سے خون کافی حد تک بہہ گیا تھا۔ اس پر غشی سی طاری ہونے لگی تھی پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

''مگر تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ شمیان ہو ہے؟''

''بس جناب عالی درویشوں نے رہنمائی کی۔ کل رات اس نے کیا کہا تھا؟ یہی نا کہ شمیان ہو کاغذات خود حاصل کر لے گا آپ دیکھ لیجیے کاغذات اسی کے پاس سے برآمد ہوئے ہیں۔ ویسے ہاشم درانی صاحب آپ نے اسی کے سامنے کاغذات کا پیکٹ بنایا تھا نا۔''

''سبھی موجود تھے۔''

''بہر حال یہ جمشید مرزا کا کارنامہ ہے۔ ہمارے دارالحکومت کے ایس پی جمشید مرزا صاحب! جن کی رہنمائی میں میں نے یہ سب کچھ کیا ہے اور انہی کی نشان دہی پر مجھے یہ پتا چلا کہ یہ شخص شمیان ہو ہو سکتا ہے۔'' جمشید مرزا کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ صوفی نے اسے آنکھ ماری پھر جمشید مرزا نے اسمشیر کے

ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی تھیں۔ سب لوگ بڑے حیران تھے۔ صوفی پھر پہلے جیسی کیفیت میں آ گیا تھا۔ ادھر شاہد علی حیرانی سے جمشید مرزا کو دیکھ رہا تھا۔ بعد میں جمشید مرزا نے اس سے کہا۔

''یار مائنڈ مت کرنا صوفی میرا ہی آدمی ہے۔ میری ہدایت پر کام کر رہا تھا۔''

''مگر مرزا صاحب کم از کم آپ کو مجھے تو لاعلم نہیں رکھنا چاہیے تھا؟''

''بھئی ہم پولیس والے اپنے علاوہ کسی پر بھروسا نہیں کرتے اور کرنا بھی نہیں چاہیے۔ بعض اوقات ہم ایسے لوگوں سے دھوکا کھا جاتے ہیں جن کے بارے میں ہمیں شبہ بھی نہیں ہوتا کہ یہ کسی طور ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔''

''جمشید مرزا نے صوفی سے ملاقات کی اور اسے الگ لے گیا۔''

''صوفی صاحب! یہ سب کچھ......؟''

''سر! آپ ہی کی راہنمائی میں میں نے یہ سب کچھ کیا ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں شاید آپ نے میری درخواست قبول کر لی تھی۔''

''چھوڑیے۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے مرزا صاحب! درویشوں کی دعاؤں سے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ ہم نے آپ کے کہنے پر کچھ نہیں کیا۔ پیر ڈھکن شاہ کی طرف سے بشارت ہوئی تھی کہ اس کیس کا سہرا جمشید مرزا کے سر بندھوا دو۔ شادی شدہ ہو جائیں گے۔'' جمشید مرزا ہنسنے لگا تو اس نے کہا۔

''آپ کی ذہانت کا لوہا تو میں مانتا ہی ہوں لیکن یہ بتائیے کہ میں رپورٹ کیا تیار کروں شمیان ہو کے بارے میں۔ ذرا مکمل تفصیل مجھے بتا دیجئے۔

یہ شخص دو سال سے مشہور ہے۔ بہرحال یہ ایک جرائم پیشہ آدمی ہے۔ ایک ایسا شخص جو گم نام زندگی گزار رہا ہو، جو کچھ کر سکتا ہے وہ کامیاب ہو سکتا ہے کیونکہ لوگوں کو اس کے بارے میں کچھ علم ہی نہیں ہوتا۔''

''مگر دو سو سال پرانی بات......؟''

''دو سو سال تو بہت کم ہیں جو طریقہ کار شمیان ہو نے اختیار کر رکھا تھا اس کے تحت اس کا نام ہزاروں سال تک زندہ رہتا۔ شمیان ہو صرف ایک نام ہے جسے نسلوں سے لوگ اختیار کرتے چلے آ رہے ہیں۔ طریقہ بڑا عجیب ہے۔ کسی شمیان ہو نے کبھی اپنی اولاد کو اپنا وارث نہیں بنایا۔ وہ دراصل شمیان ہو کا اپنا انتخاب ہوتا تھا۔ وہ اپنے گروہ کے کسی معزز آدمی کو اپنی وراثت سونپ کر دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے اور یہ انتخاب وہ اس وقت کرتا ہے جب اسے یقین ہو جائے کہ وہ بہت جلد مر جائے گا۔ پھر دوسرا شمیان ہو بالکل اسی کے نقش قدم پر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ بہرحال اب نئے شمیان ہو کا انتخاب نہیں ہو سکا۔''

''لیکن اس کا گروہ......؟''

''بالکل نہیں۔ یوں سمجھ لو گروہ ٹوٹ گیا۔ اصل میں ان پر شمیان ہو کی دہشت سوار رہتی تھی اور وہ اس کے غلاموں سے بھی بدتر تھے۔ دہشت کی وجہ آپ جانتے ہیں شمیان ہو کا وجود تاریکی میں ہوتا تھا۔''

''اب ایک بات بتائیے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''اخبارات کو اس سلسلے میں رپورٹ دے دی جائے۔ ان کاغذات کے بارے میں یہ کہا جا سکتا

ہے کہ یہ اس کے بارے میں تفصیلی رپورٹ تھی جس سے اس کی شخصیت منظر عام پر آ گئی تھی۔ سمجھ رہے ہیں؟''

''اور آپ کا شکریہ میں کس طرح ادا کروں گا؟''

''بس ہمارے اور آپ کے درمیان ملاقاتیں ہوتی ہی رہیں گی۔ کسی مناسب وقت پر یہ کر ڈالیے گا۔''

''بعد میں شاہ میر صاحب نے کرنل رحیم شاہ اور صوفی کو براہ راست خفیہ طریقے سے اپنے گھر میں دعوت دی تھی۔

''بس میرے ہاں کی تقریب بڑی سنسنی خیز ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ اسی چکر میں پڑ جاتے ہیں کہ اس تقریب کا مقصد کیا تھا۔ بس بہت زیادہ شہرت بھی بعض اوقات مشکل کا باعث بن جاتی ہے۔ ہم اپنی گھریلو تقریبات کو بھی دوسروں سے چھپاتے پھرتے ہیں۔ خیر اب ان باتوں کو چھوڑیے کرنل رحیم شاہ صاحب! آخر کار صوفی صاحب نے ایک اور خطرناک مجرم کو نیست و نابود کر دیا۔ مجھے ساری رپورٹ حاصل ہو چکی ہے۔'' کرنل رحیم شاہ نے مسکرا کر فخریہ انداز میں صوفی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''گوشت اور ہڈیوں کے اس پنجر میں خداوند عالم نے وہ دماغ محفوظ کیا ہے کہ بس کیا کہا جائے اس کے بارے میں!''

''صوفی صاحب! ایک بات بتائیے بلاتکلف، کیا میں آپ کے لیے ایک محکمہ ترتیب دے دوں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ آپ طویل عرصے کے بعد پھر فارم میں آ گئے ہیں۔''

''حضور اعلیٰ! ہمیں فارم میں ہی رہنے دیجیے۔ یونیفارم میں آئے تو سمجھ لیجیے کہ سارا کام بھنڈ۔''

''یعنی آپ......''

''جی ہاں۔ ہمیں کرنل رحیم شاہ کی رہنمائی میں ہی کام کرنے دیجیے۔'' ''ویسے ایک بات بتائیے یہ جمشید مرزا کو آپ نے اس طرح عروج پر کیوں پہنچا دیا؟''

''نہیں جناب! بس درویشوں کا کرم ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے کسی اچھے مزار پر منت مان لی اب مزارات پر مانی جانے والی منتیں تو پوری ہوتی ہیں۔ ہم کیا اور ہماری اوقات کیا کہ ہم منتوں کو پورا ہونے سے روک دیں۔ حق اللہ، حق اللہ۔''

''یار کرنل صاحب! اب تو میرا بھی دل چاہتا ہے کہ پیری مریدی اختیار کر لی جائے۔ کسی اچھے سے پیر کو میرے بھی منتخب کر دیں۔'' کرنل رحیم شاہ نے ہنس کر وعدہ کیا کہ شاہ میر صاحب کو اب کسی قوالی کی محفل میں ضرور بلائے گا۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔ محفل تو کہیں بھی ہو سکتی ہے درویشوں کے کرم سے کیوں نہ شاہ میر صاحب کے ہاں۔''

''نہیں بھئی نہیں۔ میں افسوس کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں کہ میرے اس عہدے نے مجھے بہت سے ایسے معاملات سے الگ کر دیا ہے۔''

''حق اللہ...... حق اللہ...... حق اللہ۔'' صوفی نے اپنی چگی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''شمیان ہو کا معاملہ نمٹ چکا تھا۔ ہاشم درانی بہت خوش تھا۔ اس کا پورا خاندان جس میں ناظمہ بھی

شامل تھی۔ اکثر صوفی کے بارے میں باتیں کرتا رہتا تھا۔ ناظمہ نے کہا۔

''بڑا عجیب و غریب کردار تھا۔ بالکل کیچلی میں لپٹا ہوا سانپ۔''

''جس طرح بھی چاہو کہہ لو۔ شخصیت بڑی عجیب تھی۔''

''انکل کیوں نہ ہم انہیں ایک بار پھر اپنے ہاں بلائیں۔''

''پتا نہیں بھئی۔ یہ لوگ خفیہ اداروں سے تعلق رکھتے ہیں کسی کیس کے سلسلے میں تو سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن ویسے ذرا مشکل پیش آ جاتی ہے۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' ادھر جمشید مرزا بھی خوشیوں کے گہوارے میں جھول رہا تھا۔ شمیان ہو کے خاتمے کا ذمے دار اسے ہی قرار دیا جا رہا تھا اور اسے اس واقعے کے سلسلے میں کافی شہرت ملی تھی۔ اتنے خطرناک مجرم کو اس نے گرفتار کیا تھا۔ بہت بڑی بات تھی یہ، اس کے قرب و جوار کے لوگ اسے مبارک بادیں دے رہے تھے اور جمشید مرزا ان سے خوشی خوشی مبارک بادیں وصول کر رہا تھا۔ ایک دن بیوی نے کہا۔

''سچ بتاؤ، کیا واقعی تم اتنے خراب ہو گئے ہو؟''

''خ...... خراب؟'' جمشید مرزا نے حیرت سے کہا۔

''تو اور کیا آج کل مبارک باد کے بے شمار ٹیلی فون آتے ہیں۔ اگر تم نے کام کرنا شروع کر دیا تو میرا کیا ہوگا؟''

''طنز کر رہی ہو مجھ پر......؟'' جمشید مرزا نے کہا اور بیوی منہ پھاڑ کر ہنس پڑی۔

''سچ سچ بتادو۔ اصل قصہ کیا ہے؟'' جمشید مرزا ان دنوں خوش تھا۔ موڈ میں آ کر کہنے لگا۔

''اصل میں میں نے پیری مریدی کا کام شروع کر دیا ہے۔ اب پولیس کے کیس حل کرنے کے لیے چلہ کشی ہوا کرے گی۔ ایک پیر صاحب سے دوستی کر لی ہے۔''

''ہوں۔ کبھی چکر میں مت پڑنا ایسے پیروں کے۔ گھن چکر ہو جاؤ گے۔''

''ارے تمہارے چکر میں ہی تو گھن چکر ہوئے ہیں۔ اس کے بعد بھلا کس بات کی گنجائش ہے۔''

جمشید مرزا کو صوفی یاد آ گیا جو بات بات میں درویشوں کا کرم درویشوں کی دعائیں وغیرہ کے الفاظ استعمال کیا کرتا تھا۔ یہ بھی معلوم تھا اسے یا معلوم ہو گیا تھا کہ صوفی بزرگوں وغیرہ سے بڑی عقیدت رکھتا ہے۔ جمشید مرزا چونکہ بہت خوش تھا ان دنوں اس لیے اس نے صوفی کو فون گھما ہی ڈالا۔ دوسری طرف سے کالی مرچ کی آواز آئی تھی۔ یعنی حسینہ بیگم نے فون اٹھایا تھا۔

''ہیلو!'' اس کی بھاری آواز سنائی دی۔

''صوفی صاحب سے ملنا ہے؟''

''بلاتی ہوں۔'' کچھ دیر کے بعد صوفی فون پر آ گیا۔

''کون صاحب......؟''

''آپ کا خادم صوفی صاحب!''

''درویش رحم کریں۔ ہم نے تو کبھی خادم نہیں رکھے۔ بلکہ ہم تو خود خادم قوم ہیں۔''

''بے شک ہیں! بھلا اس کی گواہی مجھ سے زیادہ اور کون دے سکتا ہے؟ آپ کا خادم جمشید مرزا بول رہا ہے!''

''مم...... مم...... مذاق فرما رہے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''بالکل نہیں صوفی صاحب! آپ نے جس طرح مجھے متاثر کیا ہے میں جانتا ہوں کہ میں آپ کی کس قدر قدر کرنے لگا ہوں۔''

''درویش ایک بار پھر ہم پر رحم کریں۔ فرمائیے!''

''صوفی صاحب! آپ کے ساتھ درویشوں کی پناہ میں آنا چاہتا ہوں۔''

''بہ خدا سچ فرما رہے ہیں۔ اصل میں ہم نے اپنا حلقہ احباب وسیع نہیں کیا ہے، لیکن اگر کوئی درویشیت کی جانب متوجہ ہوتا ہے تو ہم اس کی بڑی پذیرائی کرتے ہیں۔''

''تو پھر مجھے اپنے حلقے میں قبول فرمائیے۔''

''قبول فرمایا ہم نے...... میرا مطلب ہے قبول کیا ہم نے۔''

''اے جھاڑو پھرے کیا ٹیلیفون پر نکاح کر رہے ہو؟'' حسینہ جو کمرے میں موجود تھی۔ بولی۔ دوسری طرف سے جمشید مرزا کے ہنسنے کی آواز سنائی دی تھی۔ صوفی نے گھبرا کر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور حسینہ سے بولا۔

''چلی جاؤ یہاں سے!''

''نہیں جاؤں گی۔ بتاؤ مجھے نکاح کر رہے ہو تم!''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا قبول کر رہے تھے؟''

جمشید مرزا کی آواز ابھری۔ ''یہ کالی مرچ کیا چیز ہے یار! میری تو سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ صوفی صاحب آپ نے بہت سے جھگڑے پال رکھے ہیں۔''

''ہاں۔ کسی نے تحفے میں دی ہے۔ بعد میں تفصیل بتادوں گا۔ اچھا پھر یہ بتائیے کہ کیا کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے اپنے گھر میں قوالی کرائیے۔ اس میں شرکت کریں گے۔ اس کے بعد کچھ ہوگا۔''

''وہ تو جیسا آپ حکم دیں گے میں کر ڈالوں گا۔ لیکن پہلے مجھے ذرا ان سارے معاملات سے روشناس تو کرا دیجیے۔''

''آپ اطمینان رکھیے! جیسے ہی کہیں محفل ہوئی ہم آپ کو اطلاع دیں گے۔''

''وعدہ......!''

''ہاں بالکل۔'' صوفی نے فون بند کیا تو حسینہ کڑی نگاہوں سے اسے گھور رہی تھی۔

''ہاں۔ اب بولو کون تھی وہ حرام زادی!''

''ہیں...... ہیں۔ فون تو تم نے ہی ریسیو کیا تھا؟''

''اے بڑی چالاک ہوتی ہیں یہ۔ میں سمجھتی ہوں اچھی طرح۔''

''حسینہ بیگم اپنے کام سے کام رکھیے۔ صبح شام آپ کی صورت نظر آجاتی ہے بس کافی ہے، بھلا اب کسی اور کی گنجائش ہے۔''

''کیا..... کیا مطلب ہے؟'' حسینہ کی آواز میں لڑکھڑاہٹ محسوس ہونے لگی۔

''مم..... مم..... مطلب یہ ہے درویشوں کی دعاؤں سے کہ آپ اس گھر میں موجود ہیں۔ لوگ تو اکثر پوچھتے ہیں کہ حسینہ عالم آخر ہیں کون اور اب ہم انہیں کیا جواب دیں۔ شرما کر چپ ہو جاتے ہیں درویشوں کے کرم سے۔'' حسینہ نے صوفی کو گہری نگاہوں سے دیکھا اور اس کے بعد ہنستی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ صوفی آنکھیں پٹپٹا پٹپٹا کر کمرے کے دروازے کو دیکھتا رہا تھا اور غور کرتا رہا تھا کہ کون سے اپنے الفاظ کہہ دیے جس سے حسینہ عالم کا موڈ بدل گیا، لیکن اس دن کے بعد سے حسینہ بیگم کا موڈ واقعی بدل گیا۔ صبح کے ناشتے میں بادام اور اخروٹ کا حلوہ آیا تو صوفی نے کہا۔

''ایں! یہ حلوہ..... حلوہ کہاں سے آیا؟''

''میں نے بنایا ہے اور سنو! جو کچھ میں کہوں خاموشی سے کرتے رہا کرو۔ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ گالوں میں گڈھے پڑے ہوئے ہیں۔ موا منہ پچکا ہوا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ گال بھر جائیں اس لیے تمہیں میری بنائی ہوئی خوراک کھانا پڑے گی۔''

''بب..... بب باپ رہے باپ رہے، مگر یہ ہے کہ ہمارے گال بھرنے سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟''

''اب فائدہ نقصان سب بعد کو دیکھیں گے جو میں کہوں وہ کرتے رہا کرو۔'' حسینہ بیگم نے واقعی اس دن سے غضب ہی ڈھا دیا۔ ایک سے ایک شاندار کھانا پک رہا ہے۔ یہ بھی نہیں پتا چلا کہ یہ سب کھانا کہاں سے رہا ہے۔ بہرحال صوفی کو سب زہر مار کرنا پڑتا تھا۔ ادھر معشوق نشیلے مسلسل صوفی پر نازل تھے۔ کھانے میں وہ بھی شریک ہو جایا کرتے تھے۔ حسینہ بیگم نے ایک دن کھانا کھاتے ہوئے ہنگامہ برپا کر دیا۔

''صوفی صاحب! اس کتے کو کہاں سے پال لیا ہے آپ نے۔ چپڑ چپڑ کر کھائے جا رہا ہے۔ میں کرتی ہوں محنت اور دیکھتی ہوں کہ کھا جاتا ہے یہ۔''

''آپ اپنے کام سے کام رکھیے حسینہ بیگم!''

''ارے واہ! کیسے کام رکھوں جو کچھ میں کر رہی ہوں، اس کا ایک مقصد ہے؟''

''کیا مقصد ہے؟''

''نہیں بتاؤں گی۔ بس یہ دسترخوان پر آپ کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے۔''

''نہیں حسینہ بیگم ہم آپ کی یہ شرط قبول نہیں کرتے۔''

''لیجیے پھر کل سے کھلاؤں گی باسی روٹی اور چنے کا ساگ۔''

''بہ خدا اس میں بھی وہی لطف آئے گا۔'' صوفی نے کہا۔

''ہاں ہونا جنگل کے جانور۔ اس کم بخت کو دیکھو پھول، پھول کر کپا ہوا جا رہا ہے۔ بناتی ہوں سب کچھ تمہارے لیے کھا یہ جاتا ہے۔''

''حسینہ بیگم معشوق نشیلے یہاں صرف تمہاری وجہ سے آتے ہیں۔ تم ان کی اس قدر بے عزتی کیا کرو کہ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''میرے لیے..... میرے لیے کیوں آتے ہیں یہ۔''

''اماں کیا مرواؤ گے صوفی صاحب! سرور پھاڑ دے گی میرا۔ اس جنگلی بلی کو پتا نہیں تم نے کیوں پال رکھا ہے؟'' حسینہ پاؤں سے جوتی نکال کر معشوق نشیلے کی طرف دوڑی تو معشوق نشیلے نے باہر چھلانگ لگا دی۔ حسینہ بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل گئی تھی۔

''کرنا پڑے گا کچھ کرنا پڑے گا۔'' صوفی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

♥......♥......♥

کرنل رحیم شاہ گرین ہاؤس میں موجود تھا یہ تمام ہی لوگ اس کے سامنے موجود تھے۔ خاموشی چھائی ہوئی تھی اور شاید کسی کا انتظار ہو رہا تھا۔ آنے والا صوفی کے علاوہ کون ہو سکتا تھا۔ صوفی اپنی مخصوص سج دھج میں اندر داخل ہوا تو سب نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے گہری نگاہوں سے سب کا جائزہ لیا اور بولا۔

''کوئی بہت ہی سنجیدہ مسئلہ زیر غور ہے؟''

''آیئے صوفی صاحب! تشریف رکھیے۔ یہ سب لوگ آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''درویش رحم کریں۔ میں حاضر ہوں۔ فرمایئے!'' کرنل رحیم شاہ نے ان کی طرف دیکھا۔ سب خاموش تھے۔ تب اس نے کہا۔

''صوفی صاحب! اصل میں انہیں یہ شکایت پیدا ہو گئی ہے کہ گرین فورس تشکیل تو پا گئی ہے لیکن آج تک اس سے کوئی ایسا کام نہیں لیا گیا جو یہ بات ظاہر کرتا کہ گرین فورس بھی ملک کی بہتری کے لیے اپنی ذمے داری پوری کر رہی ہے۔ ہم سب یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی سربراہی میں گرین فورس کی تشکیل نو کی جائے۔ آپ ان کی تربیت کریں۔ شاہ میر صاحب سے میری بات ہوئی تھی۔ انہوں نے بڑی ضد کی کہ گرین فورس کو باقاعدہ محکماتی شکل دے دی جائے۔ لیکن میں آپ کی بات سے سو فی صدی اتفاق کرتا ہوں کہ اس کے بعد ہم سرکاری ملازم ہو جائیں گے۔ میں خود بھی یہی چاہتا ہوں اور آزادانہ طریقے سے جس طرح ہم اب تک کام کرتے رہے ہیں کام کرتے رہنا چاہتا ہوں، لیکن اس کے باوجود میری یہ خواہش ہے کہ اب گرین فورس کا چولہ بدل لیا جائے۔''

''چچ..... چچ چولہ۔'' صوفی اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

''میرا مطلب ہے کہ اب یہ فیضان اور عادل ہیں۔ میرے بچے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ اپنی صلاحیتیں دکھائیں، اگر آپ سے پوچھا جائے صوفی صاحب کہ کیا طریقہ ہو تو آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟'' صوفی تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔

''کسی پہنچے ہوئے بزرگ کی بیعت کرا دی جائے ان سب کی پھر ایک مزار شریف کے برابر میں ایک حجرہ تشکیل دیا جائے اور وہاں یہ سب جاروب کشی کریں۔'' کرنل رحیم شاہ بے اختیار ہنس پڑا تھا پھر اس نے کہا۔

''بہ خدا اگر آپ ایسا کرنا بھی چاہیں تو ہم میں سے کسی کو اعتراض نہیں ہوگا، لیکن بات وہی آجاتی ہے کہ اس کے بعد.....؟''

''خیر۔ میں اس بارے میں غور کروں گا۔''

''صوفی صاحب! ضرور کیجیے گا۔ میں خود بھی بہت سی تجاویز آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ یہ شازیہ تو آپ سے بہت ہی ناراض ہے۔''

''ہیں...... خیریت مس شازیہ درویش آپ پر رحم کریں۔''

''نہیں۔ چھوٹے بابا میں سچ مچ آپ سے ناراض ہوں۔ آپ بہت تبدیل ہوگئے ہیں۔ خاص طور سے اس وقت سے جب سے رابعہ سلطان والا کیس ہوا ہے۔'' صوفی نے ایک نگاہ شازیہ کو دیکھا اور بولا۔

''آپ جو کچھ چاہیں کہہ لیجیے۔ میں کیا عرض کرسکتا ہوں۔''

''صوفی صاحب! میرا خیال ہے کہ ان لوگوں کی بات مان لیجیے۔''

''کیا مطلب......؟'' صوفی نے سوال کیا۔

''آپ تھوڑا سا تبدیل ہوجایئے۔ ان لوگوں کا ایک تربیتی کورس شروع کردیجیے۔''

''میں بہت جلد اس سلسلے میں آپ لوگوں کو اپنی تجاویز پیش کروں گا درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''کیوں بھئی! تم لوگ مطمئن ہو......؟''

''چھوٹے بابا غلط بات نہیں کرتے۔ یقینی طور پر کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔'' فیضان نے کہا۔

''بس تو پھر مجھے اس کے لیے تھوڑا سا وقت دیجیے۔ میں طے کرلوں کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟'' صوفی نے جواب دیا۔

♥......♥......♥

جمشید مرزا نے چائے کی پیالی سے ایک گھونٹ لے کر پیالی ایک طرف رکھ دی اور ساتھ میں بستر پر لیٹی ہوئی بیوی سے بولا۔

''یار اٹھو یہ ملازم کبھی کبھی ایسی چائے بنا دیتا ہے ایک پیالی پینے سے دل سیراب نہیں ہوتا۔ مجھے چائے کا ایک اور کپ بنا کردو۔''

''بیڈ ٹی ایک پیالی کافی ہوتی ہے اٹھو جاؤ غسل خانے میں جاؤ۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر آ جاؤ میں بھی باہر جا رہی ہوں موسم بہت خوشگوار ہے۔'' بیوی نے جواب دیا۔

''حرام خوری کررہی ہو، چلو میں خود ہی بنا لیتا ہوں۔ تم پیوگی۔''

''نہیں بابا، میرے لیے ایک ہی پیالی کافی ہوتی ہے۔'' جمشید مرزا نے کاہلوں کے انداز میں کھڑکی سے باہر کے موسم پر نگاہ ڈالی اور بولا۔

''نوکری چاہے وزیراعظم کی کیوں نہ ہو۔ نوکری ہی ہوتی ہے اب بھلا اس موسم میں غسل خانے میں جا کر نہانا وردی پہننا اور اس کے بعد ڈیوٹی پر نکل جانا کس قدر بدذوقی ہے۔''

''ہو کیا رہا ہے آج تمہیں۔''

''نہیں کچھ نہیں، بس ویسے ہی واقعی، موسم بہت خوشگوار ہے۔'' جمشید مرزا نے باہر بادلوں کے

پرے آسمان پر اڑتے ہوئے دیکھ کر کہا اور ٹھنڈی سانس لے کر اٹھ گیا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی تھی اور اس نے کہا تھا۔

''لاحول ولاقوۃ۔ یہ ایجاد جس قدر فائدہ مند ہے اسی قدر نقصان دہ بھی دیکھو کس کا فون ہے۔''

''ارے ہر کام مجھ سے کہہ رہے ہو اٹھ کر بیٹھ گئے ہو اٹھ کر ایک فون بھی نہیں سن سکتے۔''

''غلط کہا ہے کسی نے بیوی نصف بہتر ہوتی ہے اسے نصف بدتر تو کہا جا سکتا ہے نصف بہتر نہیں۔''

جمشید مرزا اسی وقت فون کے پاس پہنچا اور اسے کان سے لگا لیا......''

''ہیلو کون بول رہا ہے بھائی۔'' لیکن دوسری طرف سے جس کی آواز سنائی دی تھی۔ اسے سن کر وہ ایک دم الرٹ ہوگیا۔

''یس سر! یس سر! معافی چاہتا ہوں سر! جی سر! جی، جی جی ہاں، جی، سر یس بیس منٹ کے اندر اندر ٹھیک ہے سر! پندرہ منٹ ہی صحیح بس سر میں پہنچ رہا ہوں براہِ کرم آپ مجھے پتا نوٹ کرا دیجئے۔ ہاں، ہاں، ہاں، جی، جی، پیڈ اور قلم پاس ہی رکھا ہوا تھا۔ جمشید مرزا دوسری طرف سے بتائے جانے والے پتے کو نوٹ کرنے لگا پھر بولا۔

''یس سر! میں پہنچ رہا ہوں۔ یس سر! یس سر! اور اس کے بعد اس نے فون کا ریسیور کریڈل پر پٹخا اور غسل خانے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ بیوی ارے، ارے ہی کرتی رہ گئی تھی۔ جمشید مرزا نے غسل خانے ہی سے آواز لگائی۔

''وردی، فوراً وردی ساری چیزیں نکال دو۔'' بیوی غسل خانے کے پاس پہنچ گئی اور دروازے کے قریب کھڑے ہو کر بولی۔

''ہوا کیا ہے۔''

''جو پولیس کو ہوتا ہے وہی ہوا ہے۔'' جمشید مرزا نے اندر سے جواب دیا۔

''پولیس کو سب کچھ ہوتا ہے تمہیں کیا ہوا ہے۔''

''ڈی آئی جی صاحب کا فون تھا۔ کوئی قتل ہوگیا ہے وہاں جا رہے ہیں مجھے فوراً پہنچنے کی ہدایت کردی ہے۔'' جمشید مرزا نے کہا۔ بیوی مستعد رہتی تھی وردی وغیرہ سب تیار تھی جوتے، موزے، سب کچھ موجود تھے۔ اس وقت بھلا غسل کرنے کی کیا گنجائش تھی پندرہ منٹ میں پہنچنے کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ اس نے جلدی جلدی شیو کھرچا اور اس کے بعد باہر نکل آیا۔ وردی تبدیل کرتے ہی اس نے کہا۔

''بالکل سچ کہا ہے بزرگوں نے افسر کی اگاڑی اور گھوڑے کی پچھاڑی ہمیشہ غلط ہوتی ہے۔ ڈی آئی جی صاحب کی مہربانی اگر اسی طرح رہی تو مصیبتوں میں گرفتار رہوں گا۔''

''ہوا کیا ہے۔''

''یار بتایا ناں کوئی قتل ہوگیا ہے، جا رہے ہیں تفتیش کے لیے اصل میں پچھلی بار ایک کیس سرانجام دے لیا ہے نا بس! ان کی گڈ بک میں آ گئے اور افسر اعلیٰ کی گڈ بک میں آ جانے کا مطلب یہ ہے کہ مصیبتوں کا نزول شروع ہوگیا...... آج کل ڈی آئی جی صاحب بہت مہربان ہیں کیونکہ پچھلی بار ایک انتہائی خطرناک مجرم

کا تیا پانچہ کیا ہے بس بھائی سرٹیفکیٹ مل گیا اور اس کے ساتھ ہی مصیبتوں کا نزول۔''

''ناشتہ نہیں کرو گے۔'' بیوی نے پوچھا۔

''توبہ کرو۔ بھلا ناشتے کی کیا گنجائش ہے ڈی آئی جی صاحب انتظار کر رہے ہیں۔'' جمشید مرزا نے کہا اور پھر جلدی جلدی تیاریاں کر کے وہ بادل ناخواستہ باہر نکل آیا اور جیپ لے کر چل پڑا جو پتا ڈی آئی جی صاحب نے ذہن نشین کرایا تھا۔ اس کا اسے پوری طرح علم تھا بریگیڈیئر شیر خان کی اس کوٹھی پر وہ پہلے تو کبھی نہیں گیا تھا۔ لیکن اس نے یہ کوٹھی دیکھی تھی۔ چنانچہ اس کی گاڑی برق رفتاری سے اس طرف دوڑ رہی تھی۔ شمیان ہو کے بارے میں صوفی نے اس پر بڑی مہربانی کی تھا اور یہ کیس مکمل طور پر جمشید مرزا کے کریڈٹ پر آ گیا تھا۔ جمشید مرزا جو خود متنوع مزاج آدمی تھی صوفی کی اس مہربانی سے بہت متاثر ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ اسے باقاعدہ محکمہ پولیس کی ایک میٹنگ میں سرٹیفکیٹ دیا گیا تھا اور تعریفی کلمات سے نوازا گیا تھا۔ اس کے بہت سے ساتھیوں نے اسے مبارک باد بھی دی تھی۔ کیونکہ شمیان ہو کا کیس بہت بڑا کیس تھا۔

لیکن اس کی سو فی صدی ذمے داری صوفی پر جاتی تھی۔ صوفی ہی نے یہ کرم کیا تھا۔ ڈی آئی جی نادر حیات کافی سخت گیر آدمی تھے اور جمشید مرزا کی ان سے جان نکلتی تھی۔ عام طور سے کوئی ایسا کیس جمشید مرزا کے کریڈٹ پر نہیں تھا جس میں اسے کامیابی حاصل ہوئی ہوتی اور اس کی وجہ سے اکثر اسے سرکاری لعن طعن بھی سننا پڑتی تھی یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے ایک بہت بڑا کام سرانجام دے دیا تھا۔ یہی تمام باتیں سوچتا ہوا وہ وہاں پر پہنچا تھا۔ جہاں پولیس کا ایک باقاعدہ گروہ نظر آ رہا تھا۔ کئی موبائل گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ چھوٹے پائے کے افسران بھی ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ وہ باہر ہی سے نگرانی کر رہے تھے۔ ڈی آئی جی کی جیپ بھی کھڑی ہوئی نظر آئی۔ جمشید مرزا کے بارے میں شاید ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ وہاں پہنچ جائے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ اور ہوا تھا جو جمشید مرزا کے لیے نئی بات تھی۔

♥ ...... ♥ ...... ♥

بریگیڈیئر شیر خاں ہی کے سلسلے میں کرنل رحیم شاہ کو بھی اطلاع دے دی گئی تھی کرنل رحیم شاہ بریگیڈیئر کے گہرے دوستوں میں سے تھے اور اس کے کسی عزیز نے کرنل رحیم شاہ کو بریگیڈیئر شیر خان کے قتل کی اطلاع دی تھی۔ ریٹائرڈ بریگیڈیئر شیر خان فوج میں ڈاکٹر تھا اور اب ریٹائر ہو چکا تھا۔

بہر حال اس کا قتل کرنل رحیم شاہ کے لیے بھی دکھ کا باعث تھا۔ بس اتفاق ہی سے کرنل دارالحکومت میں موجود تھا کیونکہ بریگیڈیئر رحیم شاہ کرنل کا بہت ہی گہرا دوست تھا اس لیے اسے خصوصی اطلاع دی گئی تھی اور کرنل رحیم شاہ نے فوراً ہی صوفی سے رابطہ قائم کیا تھا۔ چنانچہ اس وقت صوفی قدرے بہتر حالت میں وہاں موجود تھا۔ کرنل رحیم شاہ ڈی آئی جی نادر شاہ صاحب سے باتیں کر رہا تھا کہ جمشید مرزا نے سامنے پہنچ کر سلیوٹ کیا اور پھر ڈی آئی جی صاحب اسے الگ لے جا کر ساری باتیں بتانے لگے۔ بریگیڈیئر شیر خان کی لاش ان کے بیڈ روم میں تھی اور شاید انہیں سوتے وقت قتل کیا گیا تھا۔ کیونکہ لاش مسہری پر تھی اور ایک خنجر دستے تک ان کے بائیں پہلو میں پیوست تھا۔ شاید اسے نپٹنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ کیونکہ بستر شکن آلود نہیں تھا۔

لاش داہنی کروٹ پر پڑی ہوئی تھی۔ صوفی بالکل ابھی پہنچا تھا۔ کرنل رحیم شاہ سے ابھی اس کی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ ڈی آئی جی نادر حیات نے فوراً ہی کرنل سے رابطہ کیا تھا اور اس سے ہاتھ ملا کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا تھا۔ جمشید مرزا نے صوفی کو دیکھا ضرور تھا۔ لیکن ڈی آئی جی کی وجہ سے شناسائی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ بس اس کے دل کا چور تھا۔ ورنہ کوئی ایسی بات بھی نہیں تھی۔ کچھ دیر اسی طرح گزر گئی۔ پھر ڈی آئی جی نادر حیات صاحب جمشید مرزا کی طرف متوجہ ہوئے۔

''ہاں آؤ، بریگیڈیئر شیر خان نیک نام شخص تھا اور اس کی موت کے سلسلے میں براہ راست دفتر خارجہ سے ہدایت ملی ہے۔''

''دفتر خارجہ سے بریگیڈیئر صاحب کا کیا تعلق تھا۔''

''یار کمال کرتے ہو یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔''

''نن......نن نہیں بس۔''

''لاش کا جائزہ لو اور تمام ضروری کارروائیاں کرو۔ تم سب سے بعد میں پہنچے ہو۔''

''سر......وہ......میں۔''

''کام کرو، کام کرو۔'' اور جمشید مرزا کام کرنے لگا۔ یہ بات اس کی سمجھ سے باہر تھی کہ وہ کام کیا ہوگا جو اسے کرنا چاہیے۔ ادھر کرنل رحیم شاہ نے صوفی کو ایک طرف بلا لیا تھا۔ انہوں نے کہا۔

''صوفی صاحب بریگیڈیئر شیر خان کا اپنا ایک ماضی ہے اور سچ بتاؤں کہ ان کے میرے پر احسانات بھی تھے۔ میری اس ٹانگ کا علاج انہوں نے ہی کیا تھا اور حقیقت یہ کہ اگر بروقت یہ ٹانگ کاٹ نہ دی جاتی تو زہر میرے پورے جسم میں پھیل جاتا۔ بڑی جرات سے کام لے کر انہوں نے میرا یہ علاج کیا تھا۔ مجھے ان کی موت کا بے پناہ افسوس ہے۔''

''درویش رحم کریں۔''

''کیا کہتے ہیں آپ اس قتل کے بارے میں۔''

''قاتلوں نے کچھ تھوڑی سی غلط حرکتیں کی ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔'' کرنل رحیم شاہ نے اس کے بے تکے جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب۔''

''بس اپنوں نے ایک ڈھونگ رچایا ہے۔''

''براہِ کرم آپ وضاحت کیجیے۔'' کرنل رحیم شاہ بولا۔

''بریگیڈیئر شیر خاں کا قتل اس کمرے میں نہیں ہوا۔'' صوفی نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب، کیا کہنا چاہتے ہیں آپ۔''

''آپ نے بتایا کہ بریگیڈیئر صاحب کا براہِ راست تعلق محکمہ خارجہ سے ہی تھا۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ اس وقت موضوع نہیں ہے۔''

''نہیں میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا۔ البتہ آگے چل کر اس کی ضرورت ضرور پیش آئے گی۔''

"میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا براہ کرم وضاحت کرنا پسند نہیں کریں گے۔" کرنل رحیم شاہ نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں صرف اتنا ہی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ بریگیڈیئر صاحب تو فوجی آدمی تھے کوئی نہ کوئی براہ راست واسطہ محکمہ خارجہ سے ضرور تھا۔"

"پتا نہیں آپ اس بات پر کیوں زور دے رہے ہیں۔ بہر حال یہ بات معلوم کرنا پڑے گی ویسے آپ نے یہ کس بناء پر کہا کہ قتل اس کمرے میں نہیں ہوا۔"

"لاش کی حالت سے جناب! جناب اعلیٰ۔ آپ ذرا لاش کی کیفیت دیکھیے وہ داہنی کروٹ سویا ہوا ہے۔ یا سویا ہوا تھا...... لہٰذا قاتل نے نہایت آسانی سے بائیں پہلو میں خنجر اتار دیا اور اس کے بعد بریگیڈیئر صاحب کو کروٹ بدلنے تک کی مہلت نہ مل سکی۔ آپ ذرا ان کی جسمانی حالت دیکھیے۔ وہ اتنے کمزور تو نہیں ہیں کہ خنجر لگنے کے بعد سیدھے بھی نہ ہو سکیں۔ کرنل رحیم شاہ پراسرار انداز میں گردن ہلانے لگے پھر بولے۔

"ایک بات میں آپ کو بتاؤں صوفی صاحب بریگیڈیئر شیر خان بہت زیادہ پینے کے عادی تھے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ نشے کی حالت میں سوئے ہوں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ نشے میں قتل ہونے والے دوسری سانس بھی نہ لے سکے۔"

"درویش رحم کریں۔" صوفی نے کہا اور چاروں طرف نگاہیں دوڑانے لگا۔ ایک بار پھر وہ لاش کے قریب بھی گیا۔ ابھی فوٹو گرافر وغیرہ کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ لاش کے قریب پہنچ کر اس نے جھک کر مقتول کے پیروں کے تلوے دیکھے۔ کرنل رحیم شاہ بہت غور سے...... صوفی کا جائزہ لے رہا تھا۔ صوفی کی اعلیٰ ترین ذہانتوں کا تو وہ دل سے قائل تھا۔ صوفی جہاں جسمانی طور پر ایک فٹ آدمی تھا۔ وہاں اس کی ذہنی کیفیت بھی بہت اعلیٰ تھی۔ پیری مریدی کے مسئلے کے علاوہ اس کی شخصیت میں کوئی ایسا سقم نہیں تھا۔ کرنل رحیم شاہ نے کچھ لمحوں کے بعد صوفی صاحب سے کہا۔

"جی صوفی صاحب۔" "اگر بریگیڈیئر صاحب نشے میں تھے تو، مگر ٹھیک ہے کیا یہ پتا چل سکتا ہے کہ بریگیڈیئر صاحب پچھلی رات کہاں کہاں رہے تھے۔"

"آپ کے ذہن میں ضرور کوئی خاص بات ہے صوفی صاحب آپ براہِ کرم مجھے بتائیے۔"

"میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بریگیڈیئر صاحب کچھ عجیب و غریب فطرت کے مالک معلوم ہوتے ہیں۔ وہ زمین پر پاؤں نہیں رکھتے تھے اور ہواؤں میں اڑتے تھے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ صوفی صاحب بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔"

"جناب اعلیٰ۔ اگر بریگیڈیئر صاحب ننگے پاؤں نہیں پھرتے تھے تو ان کے سلیپر اور جوتے کہاں ہیں۔ آپ بتائیے یہاں اس کمرے میں۔ ان کے پاؤں کا کوئی جوتا وغیرہ نظر آتا۔" کرنل رحیم شاہ نے بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر صوفی کی طرف دیکھنے لگا۔

"واقعی ایسی کوئی چیز یہاں ہے تو نہیں۔"

"وہ کسی وقت رات جہاں سے [illegible] تک آئے ہوں گے۔ ننگے پاؤں ہی یہاں آئے ہوں

گے کیونکہ یہاں جوتے نہیں ہیں۔ لیکن آپ دیکھ لیجیے۔ ان کے تلوؤں پر ذرا بھی گرد نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ان کے پاؤں زمین پر پڑے ہی نہ ہوں۔ کرنل رحیم شاہ پورے غور کے ساتھ چاروں طرف شیر خان کے جوتے تلاش کرنے لگے۔ اور اس کے بعد وہ سیدھے ہو گئے۔ اس دوران صوفی لاش کے قریب جا کر خنجر کے دستے پر جھک گیا تھا۔ پھر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"واہ، کمال کی بات ہے۔"

"کچھ اور کمال ہو گیا صوفی صاحب۔" کرنل رحیم شاہ نے مسکرا کر کہا۔

"بس درویشوں کا کرم ہو رہا ہے۔ ذرا اس خنجر کو دیکھیے۔ اس پر ایک نام کندہ ہے۔"

"نام۔" کرنل رحیم شاہ خنجر پر جھک گیا۔ خنجر کے خوب صورت دستے پر سائرہ حمید لکھا ہوا تھا۔

"اوہو...... سائرہ حمید۔"

"آہستہ جناب! آہستہ لیکن اب ذرا ایک بات بتائیے کیا سائرہ حمید اس طرح اپنی پبلسٹی چاہتی ہیں درویشوں کے کرم سے۔"

"مطلب۔"

"ذرا غور سے دیکھیے۔ انہوں نے اپنے نام والا خنجر استعمال کیا قتل کے لیے اور پھر بڑے اطمینان سے اسے لاش کے بدن میں چھوڑ گئیں۔"

"ہو سکتا ہے وہ اسے نکالنے میں کامیاب نہ ہوئی ہوں۔" کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"وہ اسے دستے تک گھونپنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکیں۔ ٹھنڈی لاش میں تو خنجر با آسانی دستے تک اتارا جا سکتا ہے۔"

"ٹھنڈی لاش۔" کرنل رحیم شاہ پھر چونک پڑا۔

"میں یہ عرض کر رہا تھا کہ درویشوں کی دعاؤں سے کہ کسی ایسی لاش کے پہلو میں جو ٹھنڈی ہو چکی ہو۔ دستے تک خنجر اتار دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔"

"گویا تمہارا مطلب ہے......"

"درویش ہم سب پر رحم کریں حق اللہ...... حق اللہ...... اندازہ یہی ہو رہا ہے کہ یہ خنجر لاش ٹھنڈی ہونے کے بعد گھونپا گیا ہے اور ظاہری بات ہے کہ اصل مجرم سائرہ حمید کو پھنسانا چاہتا ہے۔"

"لیکن صوفی صاحب آپ اس خون کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ کیا لاش ٹھنڈی ہو جانے کے بعد اس طرح خون نکل سکتا ہے۔"

"پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اس کی کہانی بھی سنا دے گی جناب اعلیٰ۔ میرا دعویٰ ہے کہ اس خون کا تعلق اس لاش سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

"خدا کی پناہ۔" کرنل رحیم شاہ نے گہری سانس لی۔ ادھر جمشید مرزا شدید بے چین نظر آ رہا تھا۔ صوفی اور کرنل رحیم شاہ جو باتیں کر رہے تھے اس کا بے چینی سے دل چاہ رہا تھا کہ وہ انہیں سنے کرنل رحیم شاہ کو وہ نہیں جانتا تھا۔ لیکن یہ اندازہ اسے ہو گیا تھا کہ کرنل رحیم شاہ کوئی بڑی شخصیت ہے۔ ڈی آئی جی صاحب

سے یہ بات پوچھنے کی ہمت بھی نہیں پڑ رہی تھی۔ صوفی کی پہنچ بھی دیکھ چکا تھا کہ شاہ میر خان صاحب بھرپور طریقے سے صوفی کی پشت پناہی کرتے تھے۔ صوفی کے ساتھ اچھے تعلقات کی خواہش کا اظہار بھی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ڈی آئی جی صاحب کی توجہ اس وقت اسی طرف کی مبذول تھی۔ چنانچہ یہ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ البتہ ایک دو بار کھیسیں نکال کر صوفی کی طرف دیکھا تھا۔ مگر صوفی جیسے ٹھس آدمی سے کسی جوابی کوشش کی توقع نہیں تھی۔ یہی شکر تھا کہ وہ ڈی آئی جی کے سامنے جمشید مرزا کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ کوئی ایسی ویسی بات کہہ دیتا تو ساری پول ہی کھل جاتی۔

بہر حال ڈی آئی جی صاحب نے محکمے کے جن لوگوں کو طلب کیا تھا وہ پہنچ گئے فوٹو وغیرہ بنائے گئے۔ تمام تر معلومات اکٹھا کی گئیں۔ پولیس روزنامچے کی ترتیب بھی کی جانے لگی اور اس کے بعد لاش اٹھوانے کا بندوبست کیا جانے لگا۔ کرنل رحیم شاہ ایک بار پھر ڈی آئی جی نادر حیات صاحب سے بات چیت کرنے لگا۔ وہ لوگ غالباً اس موضع پر بات کر چکے تھے کہ کرنل رحیم شاہ یہاں کس طرح پہنچا ہے جب تمام کارروائیاں ہوگئیں تو ڈی آئی جی صاحب نے جمشید مرزا سے کہا۔

''میں چاہتا ہوں تم آخری نگرانی کر کے واپس آجاؤ۔'' جمشید مرزا نے بے بسی سے ہاتھ ملے یہ کام اس وقت ہوا تھا جب صوفی کرنل رحیم شاہ کے ساتھ چلا گیا اب یہ سب کچھ سوچنا بے کار تھا۔ چنانچہ اس نے اپنا کام مکمل کیا پھر جب وہ دفتر پہنچا تو ڈی آئی جی نادر حیات نے اسے فوراً ہی طلب کر لیا۔''

''بریگیڈیئر شیر خان کا تعلق براہِ راست وزارت خارجہ سے تھا۔ اب کیا تعلق تھا، اس کی تفصیل اتنی آسانی سے معلوم نہیں ہوسکتی۔ تاہم تم اس سلسلے میں بھرپور کارروائی شروع کردو۔ مجھے یقین ہے کہ جس طرح تم نے اپنی فطرت میں تبدیلیاں پیدا کی ہیں اور کام کے موڈ میں آگئے ہو اس بار بھی تم اسی ذہانت کا ثبوت دو گے۔ شمیان ہو جیسی تاریخی شخصیت کو گرفتار کرنا آسان کام نہیں تھا۔ میں تم سے بہت زیادہ امید رکھتا ہوں۔''

''سر! اگر گستاخی نہ تصور فرمائیں تو ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔'' جمشید مرزا نے کہا۔

''ہاں پوچھو۔''

''وہ صاحب کون تھے جن کی ایک ٹانگ نہیں تھی۔''

''کرنل رحیم شاہ جانتے نہیں ہو تم؟ آرمی کی ناک رہ چکے ہیں وہ، ایسے ایسے اعلیٰ کارنامے ان کے نام سے منسوب ہو چکے ہیں کہ اگر ان پر ایک کتاب لکھنے بیٹھا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے گی بیچارے ایک ٹانگ سے محروم ہونے کے بعد مجبوری کی حالت میں ریٹائر کیے گئے ورنہ نجانے کتنے تمغے اپنے سینے پر سجا لیتے۔''

''اور ان کے ساتھ جو ایک عجیب و غریب شخصیت تھی۔''

''صوفی، کسی زمانے کا انسپکٹر صوفی ایک عجیب و غریب شخصیت جس کی زیادہ تفصیل مجھے معلوم نہیں لیکن اب وہ محکمہ پولیس میں نہیں ہے۔'' جمشید مرزا ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگیا تھا۔ رحیم شاہ اس سے زیادہ اور کیا معلومات حاصل کرتا۔

♥......♥......♥

گھر واپس جانے کا کیا سوال تھا۔ کرنل رحیم شاہ ساتھ تھا چنانچہ دونوں گرین ہاؤس میں پہنچے تھے۔ کرنل رحیم شاہ کے چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ گرین ہاؤس میں تمام لوگ موجود تھے۔ کرنل رحیم شاہ اپنے مخصوص کمرے میں پہنچ گیا پھر اس نے دلاور کو بلا کر ناشتے کے لیے کہا اور دونوں ناشتے کا انتظار کرنے لگے۔

''آپ براہِ کرم ابھی پان نہ کھائیے گا صوفی صاحب! اس سلسلے میں ذرا تفصیلی بات چیت کریں گے۔ آپ نے بڑے انوکھے انکشافات کیے ہیں۔ ویسے کیا آپ کو یقین ہے کہ قتل اس کمرے میں نہیں ہوا۔''

''جو کچھ بھی فرمایا ہے شواہد کی روشنی میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے پتہ چل ہی جائے گا۔ ویسے بریگیڈیئر شیر خان کی شخصیت پر مزید کچھ روشنی ڈالیے گا۔

''بس ایک نیک نام آدمی تھا۔ ریٹائر ہو چکا تھا۔ بہت عرصے سے اس سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ خنجر پر جو نام ہے سائرہ حمید کا، تو ہوسکتا ہے ایسی کسی سائرہ حمید کا وجود ہی نہ ہو لیکن پھر قاتلوں نے یہ سب کیوں کیا۔ اس کے علاوہ کیا یہ ضروری تھا کہ وہ اس لاش کو خواب گاہ میں پہنچا کر اس کا لباس تبدیل کراتے ویسے آپ دیکھ لیجیے گا کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے یہ بات بھی پوشیدہ نہیں رہ سکے گی کہ موت خنجر لگنے سے واقع نہیں ہوئی درویشوں کے کرم سے اور ایسی صورت میں یہی عرض کیا جاسکتا ہے کہ یا تو قاتل بہت ہی اناڑی تھا یا بے پناہ چالاک۔ چالاک اس لیے کہ اس نے یہ سب کچھ پولیس کو الجھانے کے لیے ہی کیا ہو۔''

''ہوں...... بہر حال معلومات تو حاصل ہو ہی جائیں گی میں خود بھی اس سلسلے میں اپنے اختیارات سے کام لوں گا۔ اس نام کے بارے میں معلومات حاصل ہونا ضروری ہیں۔''

''جی سر! ڈی آئی جی صاحب براہ راست اس کیس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ میں نے وہاں جمشید مرزا صاحب کو بھی دیکھا تھا۔ یہ وہی ہیں جو مجھ سے مخاصمت رکھتے ہیں۔''

''مگر شمیان ہو کے کیس میں تو آپ نے سہرا اس شخص کے سر باندھ دیا تھا۔''

''جی ہاں بس درویشوں کا حکم تھا ورنہ میں کیا اور میری اوقات کیا البتہ آپ ذرا ڈی آئی جی صاحب سے رابطہ رکھیے گا۔ مجھے پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بارے میں بھی پتا چلنا چاہیے ویسے اگر اور کوئی گفتگو نہ فرما رہے ہوں تو میں ذرا شازیہ وغیرہ کو طلب کر لوں''

''ہاں ہاں ضرور اگر آپ ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ شازیہ آئی تو پیچھے پیچھے دلاور بھی ناشتہ لیے ہوئے آ گیا۔

''غلام قادر کو بھی بلا لیجیے گا آپ لوگوں کو شکایت تھی ناں کہ آپ کے سپرد کوئی ذمے داری نہیں کی جا رہی۔ ذرا تفصیلی گفتگو سنیے گا اور اس کے بعد تربیتی کورس کا پہلا مرحلہ شروع کر دیجیے گا۔'' کرنل رحیم شاہ نے ناشتہ اپنے سامنے سرکا لیا تھا۔ صوفی نے کہا۔

''آج رات کو شازیہ اور دلاور غلام قادر کے ساتھ بریگیڈیئر شیر خان کے گھر کی تلاشی لیں گے۔ میں ساری تفصیلات انہیں بتائے دیتا ہوں۔ انہیں ایسی شہادتیں تلاش کرنا ہوں گی جن سے اس واردات پر

روشنی پڑ سکے۔ خاص طور سے سائرہ حمید کے بارے میں معلومات۔'' شازیہ خوش ہو کر بولی۔

''یہ ہوئی نا بات! چھوٹے بابا آپ بے فکر رہیں ہم اس طرح کام کریں گے کہ ایک بار پھر آپ پر ہماری ساکھ قائم ہو جائے گی۔''

''درویش آپ لوگوں کو اپنی پناہ میں رکھیں۔ اگر اجازت ہو تو اب میں جاؤں۔''

''ہاں میں ابھی یہیں ہوں تم سے رابطہ رکھوں گا۔'' کرنل رحیم شاہ نے کہا پھر اسی شام کرنل رحیم شاہ نے صوفی سے رابطہ قائم کیا اور کہا۔

''صوفی صاحب آپ کے لیے ایک اہم اطلاع ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ تو ابھی تک نہیں ملی ہے لیکن ڈی آئی جی صاحب سے رابطہ کرنے پر مجھے اطلاع ملی ہے کہ ایک اتفاقیہ اور غیر متوقع شہادت نے واقعات کا رخ ایک بالکل ہی مختلف سمت موڑ دیا ہے مجھے پتا چلا ہے کہ بریگیڈیئر شیر خان ان دنوں کسی عورت کے معاملے میں الجھے ہوئے تھے اور یہ عورت سائرہ حمید بھی ہو سکتی ہے۔ ویسے یہ سب کچھ بڑا ضروری ہے کیونکہ وہ میرا گہرا دوست تھا۔ محکمہ پولیس جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ کرتا رہے میں اس کے بارے میں مکمل تحقیقات چاہتا ہوں۔''

''بہت بہتر جناب آپ اطمینان فرمایئے گا۔ میں اس مسئلے میں پوری توجہ کے ساتھ کام کروں گا۔'' صوفی نے جواب دیا۔

♥......♥......♥

حسینہ نے پہلے ان لڑکیوں کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بہت سا ساز و سامان لے کر آئی تھیں اور انہوں نے کہا تھا کہ وہ لڑکے والوں کی طرف سے آئی ہیں۔ یہ بات حسینہ کو معلوم تھی کہ اس کی شادی ہو رہی ہے بہر حال آنے والوں نے کہا۔

''ہم تمہیں دلہن بنانے آئے ہیں بس سمجھو تھوڑی دیر کے بعد بارات آ جائے گی۔''

''ہائے میرے مولا۔ میں دلہن بنی کیسی لگوں گی۔''

''بننے کے بعد آئینے میں دیکھ لینا۔'' آنے والیوں میں سے ایک نے کہا اور اس کے بعد وہ حسینہ کو سجانے لگیں۔ انہوں نے اس کے جسم پر ابٹن ملا، چہرہ دھلایا اور اس کے بعد اسے ایک انتہائی خوبصورت دلہنوں کا لباس پہنا کر اس کی آرائش کرنے لگیں۔ بال ایک خاص انداز میں گوندھے گئے اور پھر چہرے پر لیپا پوتی کی جانے لگی۔ خاصی دیر میں وہ اس کام سے فارغ ہوئی تھیں۔ پھر انہوں نے آئینہ حسینہ کے سامنے کر دیا اور حسینہ اسے دیکھ کر حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

''مم...... مم میں...... میں کہاں ہوں۔'' وہ بولی۔

''یہ تم ہی تو ہو۔''

''اے اللہ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی۔'' حسینہ نے شرمائے ہوئے انداز میں کہا۔ اسی وقت باہر سے بینڈ باجے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

''بارات آ گئی، بارات آ گئی۔'' آنے والیوں نے کہا اور دروازے کی طرف دوڑ گئیں۔ حسینہ

کمرے میں تنہا رہ گئی اس نے ایک بار پھر آئینہ اٹھا کر اپنے آپ کو غور سے دیکھا۔ اور پھر حیرت سے منہ کھول کر رہ گئی۔

''ہوں تو میں ہی مگر میرا رنگ یہ ایسا صاف کیسے ہو گیا۔'' پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ وہ حجلہ عروسی میں پہنچ گئی۔ مسہری پھولوں سے سجی ہوئی تھی۔ چاروں طرف لڑیاں لٹک رہی تھیں اور اس کے بعد دولہا اندر آ گیا۔ یہ شیروانی اور پاجامے میں ملبوس تھا۔ اس نے پھولوں کی لڑیاں ہٹائیں اور پھر حسینہ کا گھونگھٹ اٹھا دیا۔ حسینہ نے شرمائی ہوئی نگاہوں سے اپنے شوہر کا چہرہ دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اس کے حلق سے ایک ڈری ڈری چیخ نکل گئی۔

''یہ تم ہو...... تم'' اس کے سامنے جمشید مرزا کھڑا ہوا تھا۔

''تیرا بیڑہ غرق ہو کتے کے پلے ارے میری تجھ سے شادی کر دی گئی۔ ہائے ایسا نہیں ہو گا خودکشی کر لوں گی۔ کتے کی موت مر جاؤں گی۔ پر تیری بیوی بن کر زندہ نہیں رہوں گی۔ ارے مجھے پولیس والوں سے تو ویسے ہی نفرت ہے۔'' حسینہ نے اپنا زیور نوچ پھینکا۔ رگڑ رگڑ کر چہرہ صاف کیا اسی وقت گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی اور وہ بری طرح اچھل پڑی۔ کون آ گیا اس نے سوچا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مزید دو تین بار گھنٹی بجی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اے میرے مولا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ خواب تھا اگر یہ خواب نہ ہوتا اور میری شادی واقعی اس پولیس والے سے ہو گئی ہوتی تو میرا کیا ہوتا۔ گھنٹی پھر بجی اور وہ زور سے دھاڑی۔

''ارے سب مر گئے کیا کوئی گھنٹی سننے کی کوشش ہی نہیں کر رہا۔ ایک میں ہی رہ گئی ہوں۔ مصیبت کی ماری۔'' وہ بکتی جھکتی باہر آئی اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی ڈی ایس پی جمشید مرزا موجود تھا اس کے ساتھ دو آدمی تھے جو کچھ ٹوکرے اٹھائے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ پھلوں کے ٹوکرے تھے اور ایک شاید مٹھائی کا تھا۔ حسینہ نے جمشید مرزا کو دیکھا اور دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے۔''

''جان دے دوں گی۔ قسم اللہ کی، تجھ سے شادی نہیں کروں گی ارے تیرا ستیاناس کہاں سے میری جان کے پیچھے پڑ گیا واپس چلا جا نہیں چاہیے مجھے تیری مٹھائی اور یہ...... یہ......''

''کیا بکواس کر رہی ہو، صوفی صاحب کہاں ہیں۔'' جمشید مرزا کی گرج دار آواز سنائی دی۔

''اے...... پیچھے ہٹ کیا بدتمیزی کر رہی ہے یہ۔'' ساتھ آنے والے پولیس والوں میں سے ایک نے کہا۔

''ہیں...... ارے زبردستی ہے کیا؟ نہیں کرتی تم سے شادی کیوں لائے ہو میرا رشتہ۔''

''ہوں، رشتہ لایا ہوں میں تمہارا۔'' جمشید مرزا نے آگے بڑھ کر اسے زور سے دھکا دیا اور حسینہ بیگم گرتے گرتے بچی۔

''مار دیا...... مار دیا...... مار دیا ختم کر دیا ارے بچا لو کوئی بچا لو میرے مولا۔'' اسی وقت صوفی دوڑتا ہوا باہر نکل آیا تھا صوفی کا حلیہ دیکھ کر دونوں پولیس والے جو ٹوکرے اٹھائے ہوئے تھے بڑی مشکل سے ہنسی دبانے کی کوشش کرنے لگے۔ کپڑے کی بنڈی اور نیچے چھوٹا سا تہبند جو گھٹنوں تک تھا۔ کھلے ہوئے بازو، کھلی ہوئی ٹانگیں، اونٹ جیسی لمبی گردن چگی داڑھی۔ دیکھنے کے قابل شخصیت تھی۔ جمشید مرزا نے بھی بمشکل تمام منہ

پر ہاتھ رکھ ہنسی دبائی۔ پھر آگے بڑھ بولا۔

''صوفی صاحب یہ آپ کی ملازمہ غالباً خواب دیکھ رہی ہے مجھ سے کہہ رہی تھی کہ یہ میرے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔''

''دو...... دو...... درویش درویش رحم کریں شش...... شادی۔ تت...... تت تو کیا یہاں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔''

''اے کچھ نہیں ہو رہا۔ پاگل خانے میں آ پھنسی ہوں جسے دیکھو پاگل پن کی باتیں کر رہا ہے ارے ہاں۔'' حسینہ نے وہاں سے بھاگ جانا ہی مناسب سمجھا صوفی نے چونک کر کہا۔

''مگر مرزا صاحب یہ سب کچھ کیا ہے۔''

''بس آپ سوال نہیں کریں گے چلو اندر رکھو یہ ساری چیزیں۔'' جمشید مرزا نے پولیس والوں سے کہا اور وہ اندر چلے گئے۔ صوفی ہائیں...... ہائیں ہی کرتا رہ گیا۔ جمشید مرزا نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''اب آپ مجھے عمدہ سا ناشتہ کرائیں گے اور میں آپ کو تمام صورت حال بتاؤں گا۔''

''جج...... جج...... جی درویش رحم کریں۔'' صوفی نے کہا اور پھر جمشید مرزا کو لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا پھر بولا۔

''اگر اجازت ہو تو کچھ لباس وغیرہ تبدیل کرلوں۔''

''ہاں...... ہاں اجازت...... اجازت۔'' جمشید مرزا نے کہا اور صوفی کمرے سے باہر نکل گیا۔ دونوں پولیس والے باہر چلے گئے تھے۔ جمشید مرزا ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگا۔ بہر حال یہ گھر خاصی بہتر حالت میں تھا۔ صوفی نے اپنے گھر کو اپنے مزاج کے مطابق ہی رکھا تھا یہ کرنل رحیم شاہ کی طرف سے عطیہ تھا اور کرنل ہی اس کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد صوفی ڈرائنگ روم میں واپس آ گیا۔ ڈھیلا ڈھالا پاجامہ اور قمیص پہنے ہوئے تھا۔ قمیص کی جیب میں پانوں کی ڈبیا اور بٹوہ صاف نظر آ رہا تھا۔ جمشید مرزا نے اسے دیکھا اسی وقت صوفی کی آواز ابھری۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام، بیٹھیے صوفی صاحب سوچ تو رہے ہوں گے کہ صبح ہی صبح میں کیسے نازل ہو گیا۔''

''جج...... جج جی ہاں بالکل یہی سوچ رہا تھا میں۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''ناشتے کے لیے کہہ دیا ہے۔ حسینہ لاتی ہی ہوگی۔''

''یار صوفی صاحب ایک بات کہوں آپ سے میں آپ کو دو ملازمائیں گفٹ کر سکتا ہوں آپ اس بھتنی کو نکال دیجیے گا۔''

''یہ بھی ہمارے لیے ایک گفٹ ہی ہیں، درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے جواب دیا اور جمشید مرزا خوب ہنسا پھر بولا۔

''ویسے آپ کی شخصیت لاجواب ہے حقیقت یہ ہے کہ پچھلے دنوں کسی اور کی وجہ سے ہمارے درمیان جو ذرا سی چپقلش پیدا ہوئی تھی۔ میں آج تک اس پر شرمندہ ہوں۔''

''حق اللہ۔'' صوفی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ناشتے کے بعد بات چیت ہوگی۔ میں بھی بس موڈی آدمی ہوں آپ سے ملنا تھا۔ تو میں نے سوچا کہ مل ہی لیا جائے۔ آج کا کام کبھی کل پر نہیں چھوڑتا۔ ویسے صوفی صاحب حقیقت یہ ہے کہ آپ نے میری عزت بنا دی ہے لیکن اس سے تھوڑا سا نقصان بھی ہوا ہے۔''

''درویش رحم فرمائیں میں شرمندہ ہوں۔'' صوفی نے کہا۔

''نہیں نہیں غلط نہ سمجھیے نقصان یہ ہوا ہے کہ اب کسی بھی الجھے ہوئے بڑے معاملے میں سیدھا سیدھا مجھے طلب کرلیا جاتا ہے۔ جب کہ پہلے اگر کوئی کیس دے بھی دیا جاتا تھا۔ تو زیادہ سے زیادہ ڈانٹ پڑ جاتی تھی۔ اللہ...... اللہ خیر صلہ۔ یہ توقع نہیں ہوتی تھی میرے اعلیٰ افسران کو کہ میں یہ مسئلہ حل کرلوں گا۔ اس لیے وہ میرے بارے میں پریشان ہی نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی میں کسی کیس کے بارے میں پریشان ہوتا تھا۔'' جمشید مرزا نے کہا اور پھر ہنس پڑا اسی وقت حسینہ ناشتے کی ٹرے اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوئی تھی۔ دو پیالیوں میں چائے تھی ایک پلیٹ میں پاپے رکھے ہوئے تھے۔ جمشید مرزا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ناشتے کو دیکھا۔ صوفی نے ایک پیالی جمشید مرزا کے سامنے رکھی۔ ایک اپنی طرف کھسکالی اور پلیٹ میں سے ایک پاپا نکال کر آدھے کے قریب چائے کی پیالی میں بھگو دیا۔ پاپا کچھ زیادہ بھیگ گیا تھا۔ اوپر اٹھایا تو وہ آدھا ٹکڑا ٹوٹ کر چائے کی پیالی میں گر پڑا۔

''صوفی نے بڑے اطمینان سے پیالی میں انگلیاں ڈال کر پاپا اٹھایا اور اپنے ناپ دان میں رکھ لیا۔ جمشید مرزا کے منہ سے اب بھی کوئی آواز نہیں نکل سکی تھی۔ صوفی نے گھلا ہوا پاپا حلق میں اتارا اور پھر جمشید مرزا کی طرف دیکھ کر بولا۔

''بسم اللہ فرمائیے آپ انتظار کر رہے ہیں۔''

''یہ...... یہ...... یہ ناشتہ ہے۔'' جمشید مرزا نے کہا۔

''وہ...... جج...... جی ہاں بخدا اس سے بہتر ناشتہ روئے زمین پر آپ کو کہیں اور نہیں ملے گا۔ صبح ہی صبح طبیعت بوجھل ہونے سے بچاتا ہے۔ لیجیے...... لیجیے تکلف نہ فرمائیے۔'' جمشید مرزا جس مقصد کے لیے آیا تھا۔ اس میں کسی بھی مسئلے میں ناک بھوں نہیں چڑھانا چاہتا تھا۔ زندگی میں کبھی اس نے ایسا ناشتہ نہیں کیا تھا۔ اس نے پاپا اٹھایا اور صوفی ہی کے انداز میں اسے چائے میں ڈبو کر حلق میں اتارنے لگا۔ صوفی اتنی دیر میں تین پاپے ہڑپ کر گیا تھا۔ جمشید مرزا نے بمشکل تمام ایک پاپا لیا اور چائے کی پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگالی۔

''اور لیجیے...... اور لیجیے تکلف نہ فرمائیے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''نہیں شکریہ...... میں صبح کو عموماً ناشتہ کرتا نہیں ہوں بس یہ ایک ہی کافی ہے۔''

''کوئی بات نہیں ہے اچھا اب یہ فرمائیے کیسے زحمت کی۔''

''صوفی صاحب ممنون کرم تو میں آپ کا پہلے ہی ہو چکا ہوں اب بریگیڈیئر شیر خان کے قتل کے سلسلے میں ایک بار پھر سے ملاقات ہوگئی۔ ڈی آئی جی صاحب نے بڑے پُر اعتماد انداز میں یہ کیس میرے سپرد کیا ہے۔ ویسے صوفی صاحب کرنل رحیم شاہ کے بارے میں بھی مجھے معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ لیکن

آپ لوگ وہاں کیسے پہنچ گئے۔ مطلب یہ کہ کیا اس سلسلے میں آپ دلچسپی لے رہے ہیں۔"

"بس درویش راہنمائی کرتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا ہے۔"

"آپ نے کچھ اندازے لگائے۔" جمشید مرزا نے سوال کیا۔

"جی ہاں مقتول واقعی قتل ہوا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔" جمشید مرزا نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی اور بولا۔

"وہ بھی درویشوں کی دعاؤں سے قتل ہوا ہے۔"

"نن......نن......نہیں ہمارا مطلب ہے کہ......کہ......کہ۔"

"صوفی صاحب آپ سے کچھ ایسی محبت ہوگئی ہے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کا مرید بن جاؤں۔"

"ارے نہیں ہم گناہگار کل ہیں آپ ایسی بات کہہ کر ہمیں شرمندہ نہ فرمایئے گا۔"

"نہیں واقعی صوفی صاحب کیا ذہانت پائی ہے آپ نے کیا اعلیٰ سوچ ہے۔"

"شکریہ......شکریہ، حق اللہ۔" صوفی نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ میں بھی آپ سے کچھ فیض حاصل کروں۔"

"میں نے عرض کیا ناں کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ صرف عاشق درویش ہوں اپنے مسائل لے کر مزارات پر چلا جاتا ہوں اور یہ سمجھ لیجیے رحمتیں، برکتیں اور محبتیں سمیٹ کر لے آتا ہوں جو میرے راستے متعین کرتی ہیں۔ آپ بھی اگر ایسی کوئی چیز چاہیں تو مزارات پر تشریف لے جایا کریں۔ قوالیاں کرالیا کریں۔ پھر دیکھیے چار چاند لگ جائیں گے آپ کی کارکردگی میں۔"

"کیا واقعی! تو پھر ٹھیک ہے صوفی صاحب ابتداء میں آپ ہی کو میری رہنمائی کرنا ہوگی۔"

"بسر و چشم......بسر و چشم درویشوں کے کرم سے۔"

"بات طے ہوگئی بس آپ کی سربراہی میں میں یہ سب کچھ کروں گا۔ ویسے صوفی صاحب کیا خیال ہے آپ کا بریگیڈیئر شیر خاں کے قتل کے سلسلے میں ابھی تک کوئی بصیرت افزائی ہوئی۔"

"نہیں بس وہ خنجر قابل توجہ ہے اس کے علاوہ یہ بات بھی طے ہے کہ شیر خان کو وہاں قتل نہیں کیا گیا جہاں ان کی لاش پڑی ہوئی ملی ہے۔"

"کیا" جمشید مرزا اچھل پڑا۔

"ہاں حالات و شواہد......صوفی نے بڑے خلوص کے ساتھ جمشید مرزا کو وہ پوائنٹ بتائے جو اس نے خود نوٹ کیے تھے اور کرنل رحیم شاہ کے ساتھ ان کے بارے میں بات چیت ہوئی تھی۔

"بخدا آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ واقعی میں ان لائنوں پر غور کروں گا، پھر کافی دیر تک جمشید مرزا صوفی کے پاس رہا تھا اور صوفی اسے بہت سے نکتے سمجھا تا رہا تھا۔

♥......♥......♥

جمن خان نے معشوق نشیلے کا چہرہ دیکھا اور ساتھ بیٹھے ہوئے قدوس بیگ سے کہا۔

"یہ معشوق کو کیا ہوگیا ہے۔"

"کیوں کیا آج کل توجہ نہیں دے رہی۔" قدوس بیگ نے بے اختیار پوچھا۔

"کون۔" جمن خان چونک کر بولے۔

"نن......نن......نہیں میرا مطلب ہے کونسی معشوق کی بات کر رہے ہو۔"

"اماں قدوس بیگ سچی سچی قسم کھا کر بتا دینا کتنی عمر ہوگئی ہے۔"

"کک......کس کی۔" قدوس بیگ غالباً کوئی اوپری نشہ کرتے تھے۔

"تمہاری اور کس کی۔"

"پپ......پپ پتا نہیں کون کم بخت عمر کو یاد کرتا ہے عمر کو یاد کرلو اور بوڑھے ہو جاؤ۔"

"تم پر تو جوانی چھا رہی ہے ناں۔ اماں ساٹھ سے اوپر کے ہوگئے ہو لکھ لو میری بات بالکل سٹھیا گئے ہو۔ معشوق کو نہیں جانتے تم۔ معشوق نشیلے کی بات کر رہا ہوں۔"

"ہاں......لل لاحول ولا قوۃ یار! اس شخص کو گولی مار دینے کو جی چاہتا ہے جس نے اس بے تکے شخص کا نام معشوق رکھا ہے۔ بھلا اس بلائے دے درماں کا معشوقیت سے کیا تعلق۔

"اوہ بھائی میں تجھ سے افسانہ نگاری نہیں کرا رہا۔ معشوق نشیلے کی بات کر رہا ہوں سنا ہے صوفی صاحب کے پاس رہنے لگا ہے مگر اس قدر بجھا بجھا سا پہلے تو نہیں تھا۔"

"ایں، ہاں کہہ تو ٹھیک رہے ہو یہ کمبخت دبئی سے کیا کما کر لایا ہے یہ آج تک سمجھ میں نہیں آسکا۔ رہتا تو وہی پھٹے حال میں ہے۔"

"آؤ ذرا بات چیت کرتے ہیں اس سے۔"

"چلو۔" قدوس بیگ اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ جمن خان بھی ہوٹل کے کاؤنٹر سے باہر نکل آئے۔ معشوق نشیلے ایک میز پر سر جھکائے ماچس کی تیلی سے میز پر بے نام لکیریں ڈال رہے تھے۔ یہ دونوں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے تو انہوں نے چونک کر دونوں کو دیکھا اور ماچس کی تیلی دانتوں میں دبا لی۔"

"کیا آپ نے تخلص بدل دیا ہے نشیلے صاحب۔" قدوس بیگ نے پوچھا۔

"شاعری کون کم بخت کر رہا ہے آج کل۔"

"او، ہو، ہو پہلے تو آپ مشاعرہ کرتے تھے آخر کار شاعری پر اتر آئے۔" جمن خان نے کہا۔

"مذاق نہ اڑائیں بھائی۔"

"نہیں اڑا رہے ہم تو صرف یہ کہنا چاہتے تھے کہ آپ اپنا تخلص بدل کر مغموم رکھ لیں۔" معشوق نشیلے ہی اچھا ہے، قدوس بیگ بولے۔

"میں سمجھ گیا آپ لوگ میرا مذاق اڑانے آئے ہیں۔"

"بالکل نہیں بلکہ غمگساری کرنے آئے ہیں۔ ہوا کیا ہے میرے بھائی دوستوں سے بھی چھپاؤ گے ویسے تو آج کل تم درحقیقت ترچھی نظر بن گئے ہو نظر ہی نہیں آتے۔ صوفی صاحب کا کیا حال ہے انہیں بھی شاید وہ کوٹھی راس آگئی۔ کہتے تھے کہ یاروں کو کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ پتا نہیں کتنے ہفتے سے ادھر کا چکر نہیں لگا۔"

"مصروف ہیں آج کل یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔"

''آپ سنائیے اپنی یہ صورت پر بارہ کے بجائے تیرہ کیوں بجنے لگے ہیں۔'' معشوق نشیلے اداس نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھا پھر گردن جھکا کر بولے۔

''ڈرتے تھے جس بات سے وہی ہوگئی۔''

''ارے..... ارے کیا ہوا۔''

''محبت، عشق۔''

''اللہ، اللہ۔'' قدوس بیگ نے غلام صابری کی آواز میں کہا۔

''اڑا لیجیے اڑا لیجیے مذاق ہم تو یہی کہیں گے کہ خدا تجھے دوست طوفاں سے آشنا کر دے۔''

''اماں بھائی طوفان گزر چکا ہے اب تو ساحل کی خشک ریت ہے بقول جمن خان کے ساتھ اوپر چلے گئے ہیں۔ پتا نہیں عمر کی تیز رفتاری کے لیے کوئی بریک کیوں نہیں ایجاد ہوئے۔'' مگر تمہیں کیا ہوا بتادو تمہیں یاروں کی قسم۔''

''اچانک ہی پتا چلا ہے کہ عشق ہوگیا ہے۔''

''معشوق تو آپ خود ہیں معشوق دلنواز کون ہے آخر۔''

''حسینہ۔'' نشیلے صاحب نے کہا۔

''سوفی صدی وہ حسینہ ہی ہوگی۔ مگر کون ہے کہاں رہتی ہے۔''

''نام ہی حسینہ ہے صوفی صاحب کے ہاں نوکری کرتی ہے۔''

''ایں۔'' دونوں اچھل پڑے۔

''ہاں ہری مرچ کی طرح تیز، لیلیٰ کی طرح کالی، نقوش کے بارے میں کیا بتائیں نمک کی بوری ہے۔''

''سبحان اللہ..... سبحان اللہ، آپ نے تو واقعی شاعری کا حق ادا کردیا۔ کیا نقشہ کھینچا ہے معشوقہ دلنواز کا۔''

''یار کچھ تو خیال کرو۔'' معشوق نشیلے نے افسردگی سے کہا۔

''کس سلسلے میں۔''

''مسلسل اسے معشوقہ دلنواز کہے جارہے ہو جبکہ میں اس سے جذباتی رشتہ رکھتا ہوں۔''

''ارے ارے نہیں۔ مطلب یہ کہ معشوقہ دل نواز تو آپ کی اور بھابی ہماری۔''

''خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔''

''مگر پوری واردات تو سنائیے معشوق صاحب۔''

''بس زندگی میں پہلی بار عشق ہوا اور یہ پتا چل گیا کہ عشق کا تعلق شکل وصورت سے نہیں ہے بلکہ عشق وہ آگ ہے معشوق جو لگائے نہ لگے اور بجھائے بھی نہ لگے۔'' معشوق نشیلے نے حسب عادت شعر کے ساتھ ظلم کرتے ہوئے کہا۔

''واہ..... واہ..... واہ..... واہ..... یہ فارسہ میں کہا ہے آپ نے۔''

''قطعی، قطعی ہم جو کچھ کہتے ہیں فارسہ ہی میں کہتے ہیں۔'' معشوق نشیلے نے کہا۔

''تو پھر شادی کب کر رہے ہیں۔''

''یہی تو بدنصیبی ہے دوستو کہ شادی تک بات نہیں پہنچ سکتی۔''

''کیوں؟''

''بس ذرا مزاج کی تیکھی ہیں ذرا سی بات پر جوتا ہاتھ میں اٹھالیتی ہیں۔''

''اماں، واللہ آپ کی تو عاقبت سنور گئی معشوق صاحب۔''

''بھلا وہ کیوں۔''

''سنا ہے بیوی کا جوتا جہاں پڑے وہاں دوزخ کی آگ حرام ہوجاتی ہے سو پچاس جوتے روز کھالیا کریں سمجھ لیں جنتی ہوگئے۔''

''..... اڑا لیجیے..... اڑا لیجیے وقت آئے گا آپ کا بھی مذاق اڑے گا۔''

''تو وہ محترمہ مان نہیں رہیں کیا۔''

''ہم تو ایک بات جانتے ہیں کہ اگر کبھی اظہار دل کردیا تو ہسپتال میں ملاقات ہوسکتی ہے۔''

''حل ہے..... حل ہے اس کا یقین کیجیے بہتوں کی مشکل حل ہوچکی ہے۔'' قدوس بیگ نے کہا۔

''کیسے بھائی آپ سے بڑھ کر ہمارا دوست اور کون ہوسکتا ہے۔''

''یہ بتائیے پیر جلالو کا نام سنا ہے کبھی۔''

''پیر جلالو۔'' معشوق نشیلے نے کہا۔

''جی، صوفی صاحب تو اچھی طرح جانتے ہیں انہیں۔''

''مطلب کیا ہے۔''

''ایسے ہی ایک غم نصیب کو وظیفہ بتایا تھا پیر جلالو نے۔ تین دن وظیفہ پڑھا اور آج وہ اپنی محبوبہ کے تین بچوں کا باپ ہے۔''

''یہ..... یہ یعنی بیک وقت۔''

''اماں نہیں یار چار سال ہوگئے شادی ہوئے۔''

''انہی خاتون سے۔''

''سوفیصدی۔''

''گویا وظیفے نے کام دکھایا۔''

''بچوں کے سلسلے میں نہیں بیوی کے سلسلے میں۔'' اچانک ہی معشوق نشیلے اپنی جگہ سے اٹھے اور قدوس بیگ کے قدموں میں بیٹھ گئے انہوں نے ان کے پاؤں پکڑ لیے تھے۔

''ارے ارے اماں..... بیٹھے بیٹھے اماں بیٹھے ہمارے پاؤں میں گدگدی ہوتی ہے۔''

''خدا کی قسم نہیں چھوڑوں گا۔ پیر جلالو کا پتا بتا دیجیے۔ نہیں چھوڑوں گا پاؤں جب تک آپ پیر جلالو کا پتا نہیں بتا دیں گے۔''

''پاؤں تو چھوڑیئے بتاتے ہیں بتاتے ہیں آیئے بیٹھیے یہ شارع عام ہے لوگ دیکھ رہے ہیں کہیں ہماری پوجا شروع ہوجائے۔

''بتائیے پیر جلالو کا پتا بتائیے۔''

''پیر جلالو کا پتا تو خیر بتا ہی دیں گے آپ کو لیکن وہ وظیفہ ہمیں معلوم ہے جسے پڑھ کر ہمارے شناسا کو کامیابی حاصل ہوئی تھی۔''

''اوہو تو پھر وہ وظیفہ ہی بتا دیجیے...... مجھے اگر وظیفے کا پتا چل جائے تو پھر پیر جلالو کے پاس جانے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔''

''ویسے بھی وہ یہاں سے جا چکے ہیں اور کہیں چلے گئے ہیں لیکن وظیفہ ہمیں معلوم ہے انہوں نے یہ وظیفہ ہمیں بخش دیا تھا۔''

''سبحان اللہ''...... معشوق نشیلے نے پھر ایک مرتبہ اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن جمن خان نے ان کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر گردن پر پنجے جما دیے اور بولے بیٹھے رہیے بیٹھے رہیے میرے ہوٹل کی ریپوٹیشن خراب ہو رہی ہے۔''

''چھ۔ چھ...... چھوڑیے تو سہی بیٹھے ہوئے ہیں ہم۔''

''ایسے نہیں چھوڑیں گے ہم وعدہ کریے کہ اب اس کے بعد قدوس بیگ پر جھپٹا نہیں ماریں گے۔''

''نہیں ماریں گے بخدا چھوڑ دیجیے شانے درد کرنے لگے ہیں۔ قدوس بیگ صاحب وظیفہ بتائیں گے آپ۔''

''کیوں نہیں بتائیں گے۔ دوست ہی دوستوں کے کام آتا ہے۔'' قدوس بیگ نے جواب دیا اور پھر قدوس بیگ بڑی تفصیل کے ساتھ وظیفے کے الفاظ بتانے لگے۔ جمن خان نے کہا۔

''ٹھہر میں کاغذ قلم لے آتا ہوں۔ لکھ کر دے دو یاد کر لیں گے بے چارے فارسہ کے علاوہ انہیں آتا ہی کیا ہے۔'' وظیفہ لکھ لیا گیا۔ قدوس بیگ صاحب نے مزید بتایا۔

''یہ وظیفہ آپ کو تین دن پڑھنا پڑے گا کسی قبرستان میں چلے جایئے گا اور کسی بھی قبر کے کنارے بیٹھ کر وظیفہ پڑھیے گا۔ بس تین دن کے بعد آپ دیکھیے معشوق کے رویے میں کیا فرق آتا ہے۔''

''حسینہ، حسینہ معشوق تو میں خود ہوں۔'' معشوق نشیلے نے کہا۔

''مقصد وہی ہے ویسے صوفی صاحب سے فرمائش کریں گے کہ کبھی ان حسینہ بی بی کو لے کر یہاں تک آئیں۔ ظاہر ہے ان کے ہاں ملازمت کرتی ہیں وہ، ہم بھی تو ذرا بھابی کی زیارت کر لیں۔''

''بعد میں...... بعد میں...... ذرا وظیفہ مکمل ہو جانے دو۔'' معشوق نشیلے نے کہا۔

بہر حال وظیفے کی پرچی جیب میں رکھ کر معشوق نشیلے تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے چل پڑے۔ درحقیقت حسینہ کا عشق دل میں پیدا ہو گیا تھا۔ ان دنوں کرتا ہی کیا تھا۔ صوفی کا گھر ہوتا یا پھر کوچہ بازار۔ سیدھا سے صوفی کے گھر پر ہی پہنچے تھے۔ صوفی گھر پر موجود نہیں تھا۔ بیل بجانے پر دروازہ حسینہ نے ہی کھولا اور ان کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

''کہیں اور رزق موت تو ہے ہی نہیں جب دیکھو کتے بلی کی طرح دروازے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔''

''اب راستہ عطا فرمائیں گی آپ۔''

''کیا اتا پتا لگا رکھا ہے چلو اندر...... آ جاؤ صوفی نہیں ہے یہاں گھس کر کیا کرو گے۔''

''محترم صوفی صاحب نے ہمیں اجازت دی ہے کہ ہم یہیں رہا کریں آپ کہیں تو آج شام کو آپ کے سامنے کہلوا دیں گے۔''

''تو بس دفع ہو جاؤ شام کو کہلوا دو گے تو پھر آ جانا۔''

''ایک بات عرض کریں آپ سے۔ تین دن کی بات ہے اس کے بعد دیکھنا آپ کس طرح بھیگی بلی......''

''کون میں۔ اے کم بختوں تم نے سمجھ کیا رکھا ہے مجھے۔ وہ تو بس کرنل صاحب کی مہربانی ہے بات کروں گی ان سے کہ کہاں بکروں کے بیچ میں بھیج دیا ہے مجھے۔ زندگی عذاب ہو کر رہ گئی ہے۔ پتا نہیں کمبخت کیسے کیسے منہ اٹھائے چلے آتے ہیں یہاں پہ۔'' حسینہ بیگم کا موڈ بہت خراب تھا۔ رات کے خواب نے ان کی طبیعت کافی خراب کر دی تھی۔

بہر حال رویہ اس وقت بھی ایسا تھا کہ معشوق نشیلے کو وہاں سے آتے ہی بن پڑی پھر دن پتا نہیں کہاں گزارا۔ رات کا انتظام کیا پھر قبرستان کا انتخاب کیا۔ اچھے صاف...... ستھرے علاقے میں یہ قبرستان واقع تھا۔ پوش لوگوں کے قبرستان بھی پوش ہی ہوا کرتے ہیں چنانچہ انتظار کرنے لگے ایک ہوٹل میں کھانا کھایا نلی والی نہاری اور خمیری روٹیاں خوب شکم سیر ہو کر کھائیں اور اس کے بعد قبرستان کی طرف چل پڑے۔ قبرستان میں داخل ہوتے ہوئے دل پر ایک عجیب سا احساس پیدا ہو گیا تھا۔

بہر حال ایک قبر منتخب کی اور اس کے کنارے جا بیٹھے وظیفے کے لیے بتایا گیا تھا کہ جب رات گہری ہو جائے تو وظیفے کا آغاز کرنا ہے لیکن...... بیٹھنے کے لیے انہوں نے ایک کتبے کے عقب میں جگہ بنا لی تھی۔ پھر جب تاحد نظر ہو کا عالم طاری ہو گیا صرف جھینگروں کی ٹرٹراہٹ یا ہوا چلنے سے سوکھے پتوں کی سرسراہٹ کے علاوہ اور کوئی آواز نہ سنائی دی تو انہوں نے وظیفے کا آغاز کر دیا۔ کوئی...... سوا گھنٹے وظیفہ پڑھا تھا کہ اچانک ہی برابر کی قبر پر روشنی ہو گئی بری طرح چونکے تھے۔ گردن گھما کر روشنی کو دیکھا چراغ جل رہا تھا۔ پھر کسی انسانی ہاتھ نے دوسرا چراغ پھر تیسرا چوتھا پانچواں چراغ جلایا اور اس کے بعد وہاں بہت سے چراغ روشن ہو گئے۔ ماحول قدرے روشن ہوا تو وہ شخصیت نظر آئی جو چراغ روشن کر رہی تھی۔ جھاڑ جھنکار نما ایک خوف ناک شکل و صورت کا آدمی تھا۔ جو یہ چراغ روشن کر رہا تھا۔ اس کے پاس پھولوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ چراغ روشن کرنے کے بعد اس نے پھول اس قبر پر ڈالنا شروع کیے جس پر اس نے چراغ روشن کیے تھے اور اس کے بعد اس نے قبر کو پھولوں سے ڈھک دیا پھر اس کی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ وہ سسک سسک کر رو رہا تھا۔ معشوق نشیلے عالم جو اس کی شخصیت سے بہت خوف زدہ ہو گئے تھے۔ اب اس کے لیے اپنے دل میں ہمدردی کے جذبات پانے لگے وہ شخص بہت دیر تک روتا رہا۔ کچھ بڑبڑاتا بھی جا رہا تھا۔ معشوق نشیلے اپنی جگہ سے اٹھے اور اس کے پاس پہنچ گئے۔ دوسرے لمحے وہ شخص اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''تم...... کون ہو تم؟'' کسی کے خلوت کدے میں داخلے کی ہمت کیسے کی تم نے۔''

''خ...... خ...... خ...... خلوت، پپ...... پپ پیارے بھائی یہ قبرستان ہے۔''

''مگر یہ قبر اس کا علاقہ میرا ہے۔''

''یقیناً آپ کا ہے جناب، ہم تو بس برابر کی قبر پر فاتحہ خوانی کر رہے تھے۔''

''کون ہو تم، کون ہو۔''

''مم...... مم...... معشوق نشیلے۔''

''یہاں کیا کر رہے ہو۔''

''بب...... بب بس قبر پر فاتحہ خوانی......''

''کس کی قبر ہے یہ......'' اس بھیانک آدمی نے قبر کی طرف اشارہ کر کے کہا جس پر معشوق نشیلے فاتحہ خوانی کر رہے تھے۔

''میری ماموں زاد ممانی کی قبر ہے۔''

''ماموں کہاں مر گئے۔''

''سس...... سعودی عرب میں ہیں۔''

''ماموں سعودی عرب میں ہیں اور تم ممانی کی قبر پر فاتحہ خوانی کر رہے ہو۔''

''جج...... جج جی ہاں ڈیوٹی ہے میری۔'' معشوق نشیلے نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کرتے کیا ہو۔'' وہ شخص بولا۔

''شش...... شاعری...... فارسہ میں۔''

''فارسہ میں شاعری۔''

''ہاں۔''

''فارسی تو سنا ہے یہ فارسہ کیا ہوتی ہے۔''

''فارسہ ہوتی نہیں ہوتا ہے فارسی مونث اور فارسہ مذکر سمجھ رہے ہونا آپ۔'' معشوق نشیلے نے کہا۔

''اچھا، فارسی کا بھی مونث اور مذکر بن گیا۔''

''جی ہاں جناب اور آپ نے یہ قبر خوب سجائی ہے یہ کس کی قبر ہے۔'' معشوق نشیلے نے سوال کیا اور وہ شخص ایک دم نرم پڑ گیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

''ہم اپنی کہانی کس سے کہیں۔ خود ہم کو جھوٹی لگتی ہے یہ کون تھا کس کو چاہا تھا اے عمر گریزاں بھول گئے۔''

''اماں تمہیں واللہ ارے مروا دیا...... مار دیا ہائے ہائے۔'' معشوق نشیلے سینہ پیٹنے لگے۔

''کک کیا ہوا بچھو نے کاٹ لیا۔''

''نہیں شعر نے کاٹ لیا۔ کیا شعر کہا ہے۔''

''شعر و شاعری سمجھنے والے لگتے ہو۔ یہ میری محبوب کی قبر ہے بس کیا کیا جائے ذرا سی بات ہے ہی اس کا یاد آ جانا۔ مگر ذرا سی بات بہت دیر تک رلاتی ہے۔''

''یہ بھی شعر تھا۔''

''ہوش میں ہو۔'' وہ شخص غرایا۔

''نن...... نہیں میرا مطلب ہے کیا شعر تھا۔''

''بس یوں سمجھ لو کہ کون آتا ہے مگر آس لگائے رکھتا عمر بھر درد کی شمعوں کو جلائے رکھتا۔''

''خدا قسم...... خدا قسم...... خدا قسم......'' معشوق نشیلے قبر پر قلابازیاں کھانے لگے۔ وہ شخص حیرت سے منہ دیکھتا رہا اور پھر اس نے آگے بڑھ کر معشوق نشیلے کو گریبان پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

''پاگل ہو گئے ہو کیا۔''

''کیا شعر تھا...... کیا شعر تھا۔ کاش یہ فارسہ میں ہوتا۔''

''بے تو بھی تو کوئی شعر فارسہ میں سنا مجھے۔''

''اس وقت یاد نہیں آ رہا۔''

''تو جہنم میں جا۔'' اس شخص نے زور سے معشوق نشیلے کو دھکا دیا اور معشوق نشیلے جو پہلے ہی قلابازیوں کے سلسلے میں خاصے زخمی ہو چکے تھے منہ کے بل زمین پر آ رہے۔ ناک چھل گئی سر میں چوٹ لگی اور خون نکل آیا رخساروں پر بھی ایک دو جگہ نشان پڑ گئے تھے۔ وہ شخص وہاں سے چلا گیا معشوق نشیلے خوف زدہ نگاہوں سے اسے دیکھتے رہے۔ اندازہ یہی ہوا تھا کہ کوئی پاگل دیوانہ ہی ہو سکتا ہے اس قبر میں اس کی کوئی زندگی سو رہی ہو۔ بہرحال اچھی خاصی درگت بن گئی تھی۔ قبر کے پاس سے اٹھے وظیفہ تو یاد ہی نہیں رہا تھا۔ چوٹیں کسک رہی تھیں۔ قبر کے نزدیک سے گزرے کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آئی۔ جھک کر دیکھا تو ایک خنجر تھا۔ معشوق نشیلے نے ادھر ادھر دیکھ کر خنجر اٹھا لیا اور لباس میں چھپا لیا۔ دو چار سو کی تو چیز تھی جتنا وہ خوب صورت تھا اور اس کے بعد وہ قبرستان سے باہر نکل آئے۔ حلیہ بری طرح خراب ہو رہا تھا۔ چوٹیں لگی ہوئی تھیں۔ رات بہت زیادہ نہیں گزری تھی لیکن قبرستان کا ماحول بالکل سنسان اور خاموش تھا۔ وہ بچتے بچاتے چلتے رہے اس وقت صوفی کے گھر کے علاوہ اور کہاں جاتے۔

چنانچہ وہ تھوڑی دیر کے بعد صوفی کے گھر کی بیل بجا رہے تھے۔ صوفی اس وقت گھر پر ہی موجود تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور معشوق نشیلے کا حلیہ دیکھ کر چونک پڑا پھر بولا۔

''دۃ...... دۃ...... درویش رحم کریں۔ کیا کتے پیچھے لگ گئے تھے۔ نشیلے صاحب۔''

''اندر آنے کی اجازت عطا فرمائیں تو دل کا حال عرض کریں۔''

''آ جاؤ...... آ جاؤ حسینہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ درویشوں کے کرم سے۔''

''حسینہ۔'' معشوق نشیلے اچھل پڑے۔

''ہاں، کہہ رہی تھی کہ معشوق نہیں آئے۔''

''اماں صوفی صاحب مذاق فرما رہے ہیں کیا۔ خدارا ایسا دل آزاری کا مذاق نہ فرمائیے گا۔''

''یہ ہوا کیا ہے تمام تھوبڑا شفتالو بنا ہوا ہے جائیے منہ ہاتھ دھو کر میرے پاس آئیے۔''

''کچھ کھانے پینے کو مل جائے گا۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں آپ جائیے حلیہ درست کیجیے۔ میں خود باورچی خانے میں جاتا ہوں جو ملے گا لے آؤں گا حسینہ کو اس وقت جگانا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

معشوق نشیلے نے غسل خانے میں جا کر اپنا حلیہ دیکھا اور دل ہی دل میں رونے لگے۔ وظیفے کا پہلا ہی دن

خراب ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد کمرے میں پہنچے تو صوفی کھانا لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔ ٹرے میں کھانا لگا ہوا تھا۔ روٹیاں آلو گوشت وغیرہ تھے۔ معشوق نشیلے بھکاریوں کی طرح ٹرے اپنے سامنے رکھ کر کھانے میں مصروف ہو گئے۔ صوفی نے جیب سے پانوں کی ڈبیا نکالی۔ گلوری منہ میں رکھ لی اور بٹوے سے تمباکو اور چھالیہ وغیرہ نکال کر پھانکنے لگا۔

''ویسے یہ حلیہ میرے لیے باعث حیرت ہے ہوا کیا۔''

''بخدا صوفی صاحب آپ دوست ہیں محسن ہیں سب کچھ ہیں آپ سے چھپائیں گے تو بھلا کیا پائیں گے۔''

''فارسہ میں۔''

''بھاڑ میں گیا فارسہ ہم اس وقت جو کچھ کہہ رہے ہیں اردو میں کہہ رہے ہیں۔''

''ارشاد......ارشاد۔'' صوفی نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''صوفی صاحب وعدہ کیجیے کہ ناراض نہیں ہوں گے۔ گھر سے نکال نہیں دیں گے ہماری درد بھری داستان نرم دلی سے سنیں گے۔''

''اماں واللہ یہ بھی فارسہ میں ہے یا فارسی میں۔''

''مگر یہ تو منہ سے نکل رہی ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''جی ہاں۔ درویشوں کی دعائیں ہی درکار ہیں۔ ورنہ باقی کیا رکھا ہے۔''

''حق اللہ آپ معاملے کو بہت پراسرار بنا رہے ہیں۔''

''نہیں جناب صوفی صاحب بس یوں سمجھ لیجیے گھائل ہو گئے ہیں۔''

''وہ تو نظر آ رہے ہیں۔''

''چہرہ نہیں دل زخمی ہے۔''

''پھر فارسہ میں۔''

''ہم نے عرض کیا نا کہ فارسہ بھاڑ میں جائے۔ اماں اب ہم آپ سے کیا کہیں حسینہ بیگم پر دل ایسا مائل ہوا ہے کہ بس تڑپ رہے ہیں ان کے لیے۔''

''درویش رحم کریں۔'' صوفی نے ایک ڈکار سی لیتے ہوئے کہا۔

''ان کے حصول کے لیے کوشش کر رہے ہیں قدوس بیگ کو تو آپ جانتے ہیں جمن خان کے ساتھی ہیں۔ ویسے وہ لوگ آج کل آپ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ صوفی صاحب کو شاید نیا گھر پسند آ گیا ہے۔ اب ادھر کا رخ نہیں کرتے۔''

''شرمسار ہیں۔ آپ ان سے کہہ دیجیے گا کہ فرصت ملتے ہی حاضری دیں گے مگر اپنی واردات تو سنائیے۔''

''بس قدوس بیگ نے ایک وظیفہ بتایا تھا کہا تھا کہ قبرستان میں بیٹھ کر کرنا ہے آج سے شروع کیا تھا۔ تو یہ حلیہ ہو گیا۔

''وظیفہ الٹا ہو گیا کیا اماں پوچھ لیتے کم از کم۔ حسینہ جانے اور آپ۔ ہمیں اس سے کیا غرض لیکن

وظیفے کے لیے کسی کی ضمانت ضروری ہوتی ہے۔''

''وظیفہ پیر جلالو نے قدوس بیگ کو بخشا تھا۔''

''ہا، قدوس بیگ اور وظیفہ۔ زمانے بھر کے لچے لفنگے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔ وہ کسی کو کیا وظیفہ بتائیں گے ویسے ہی الٹا سیدھا بتا دیا ہوگا، تو اور کیا۔ وظیفے کے موکل نے آپ کی پٹائی لگائی۔''

''نہیں حضور والا پٹائی وغیرہ تو کسی نے نہیں لگائی۔ بس وظیفہ پڑھ رہے تھے کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

''وہ کیا۔''

''برابر کی قبر پر روشنی ہو رہی تھی۔ وہاں ہم نے ایک دیوزاد کو دیکھا۔ چہرے ہی سے بھیانک۔ یہ بڑی بڑی آنکھیں جن میں خون کی سرخی لہرا رہی تھی۔ مگر اشعار واقعی بہت عمدہ تھے۔ کاش ہمیں یاد رہ جاتے۔ وہ اس کی محبوبہ کی قبر تھی۔ اور وہاں اس نے بے شمار چراغ جلا دیے تھے۔ اور قبر کو پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ مگر ایک بڑی حیرت کی بات ہے۔''

''وہ کیا۔''

''جب وہ چلا گیا تو ہم نے اس قبر کی طرف دیکھا تو وہاں ایک خنجر رکھا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے دو چار سو یا پھر ہزار بارہ سو کا ہوگا۔ بڑا خوب صورت بنا ہوا ہے ہم اٹھا لائے ہیں۔ اسے ذرا ملاحظہ فرمائیے۔

معشوق نشیلے نے خنجر نکال کر صوفی کے سامنے کیا اور صوفی ایک دم چونک پڑا یہ خنجر بالکل اسی ساخت کا بنا ہوا تھا۔ جس ساخت کا خنجر بریگیڈیئر شیر خان کی لاش میں پیوست ملا تھا۔ وہ خنجر صوفی نے بڑی اچھی طرح دیکھا تھا اور وہ اس وقت جمشید مرزا کی تحویل میں تھا۔ لیکن یہ خنجر تو وہی تھا یا پھر بالکل اسی جیسا تھا۔ صوفی نے خنجر اٹھا کر اس کا دستہ روشنی میں دیکھا اور ایک بار پھر چونک پڑا خنجر کے دستے پر سائرہ حمید لکھا ہوا تھا۔ لیکن یہ خنجر جمشید مرزا کے پاس سے کسی ایسے شخص کے پاس کس طرح پہنچا صوفی کے ذہن میں شدید قوت پیدا ہو گئی۔ معشوق نشیلے سے وہ باقی تفصیلات سنتا رہا اور اس کے بعد بولا۔

''اگر آپ کا عشق صادق ہے تو ہم بھی آپ کے لیے دعائیں ہی کر سکتے ہیں لیکن اس کا ثبوت دینا ہوگا آپ کو۔''

''بخدا جان دے سکتے ہیں۔''

''پہلے مجھے وہ قبر دکھائیے۔ ابھی چلیے۔''

''ہاں چلتا ہوں۔'' صوفی نے لباس وغیرہ تبدیل کیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ معشوق نشیلے کے ساتھ اس قبرستان پہنچ گیا جہاں کی نشان دہی معشوق نشیلے نے کی تھی۔ معشوق نشیلے کا بیان بالکل درست تھا۔ قبر پر جلتے ہوئے چراغوں کا تیل تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ ایک آدھ چراغ کی بتی ٹمٹما رہی تھی۔ صوفی اپنے ساتھ طاقت ور ٹارچ بھی لے کر آیا تھا۔ قبر کے نزدیک پہنچ کر اس نے ٹارچ کی روشنی قبر کے کتبے پر ڈالی اور پھر اس کے منہ سے ایک آواز نکل گئی۔

''درویش رحم کریں۔'' قبر کے کتبے پر سائرہ حمید لکھا ہوا تھا۔

♥......♥......♥

شازیہ کی پھرتی کا اندازہ توان لوگوں کو پہلے ہی سے تھا۔لیکن کبھی کبھی تو وہ قیامت ڈھا دیتی تھی۔ ویسے بھی انہیں یہ بات معلوم تھی کہ گرین ہاؤس کے لان میں شازیہ طرح طرح کی مشقیں کرتی رہتی ہے ہر وقت تو وہ کاموں میں مصروف نہیں رہتے تھے۔ جب کوئی کیس ہوتا تو صوفی انہیں اس طرف متوجہ کر دیا کرتا تھا اوران سے کام لیتا تھا۔ ورنہ آزادی تھی عیش وعشرت سے زندگی بسر کرنے کی۔ دلاور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوب مزے سے زندگی گزار رہا تھا۔غلام قادران میں سے تھا جن کے آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔مست مولا تھا۔ وہ بھی گردش کرتا رہتا تھا۔ باقی دوسرے لوگ بھی اپنے اپنے طور پر تپڑی ہاتھ میں رہتے تھے اوراس بات کے خواہش مند رہتے تھے کہ کوئی کام ان کے سپرد کیا جائے اس وقت شازیہ نے اس مکان میں داخل ہوتے ہوئے جس پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔وہ قابل دید تھی اور دلاور اور غلام قادر حیران رہ گئے تھے۔

''اڑے ماں قسم یہ میرے کوتو لڑکی معلوم ہوتا ہی نہیں۔ابی دیکھوناں یاراس طرح اوپر چڑھ کر دکھا دوتم۔''

''بہن ہے ہماری ابی آؤ اوپر چلو۔'' اور تھوڑی دیر کے بعد وہ تینوں کافی اونچی دیوار عبور کر کے یوار کے سرے پر پہنچے غلام قادراور دلاور تو سوچتے ہی رہ گئے لیکن شازیہ نے نیچے چھلانگ لگا دی تھی۔اور یہ چھلانگ بھی بڑی مہارت سے لگائی گئی تھی اور پھر غلام قادراور دلاورایک درخت کے سہارے نیچے پہنچے تھے۔

''آؤ'' شازیہ بولی اور وہ اس کا تعاقب کرنے لگے۔عمارت سائیں سائیں کر رہی تھی۔ بڑا خوف ناک ماحول تھا۔وہاں کی ہرطرف سے سرسراہٹیں سی ابھر رہی تھیں۔یوں لگ رہا تھا جیسے بہت سی آوارہ روحیں عمارت میں گردش کر رہی ہوں شازیہ کی رہنمائی میں وہ لوگ آگے بڑھنے لگے۔باہر کا جائزہ پہلے سے لے چکے تھے۔ دروازوں کو سیل بے شک کر دیا گیا تھا۔لیکن وہاں پولیس کا پہرہ بالکل نہیں لگایا گیا تھا۔ چنانچہ انہیں آسانی ہوئی۔سیل شدہ دروازوں سے تو اندر داخل نہیں ہو سکتے تھے۔لیکن عقبی راستے وہ اندر پہنچ گئے تھے۔صوفی کی ہدایت پرانہیں بریگیڈیئر شیر خان کے اس بنگلے کی تلاشی لینی تھی اوراس کے بعد وہ اندر داخل ہوتے چلے گئے۔کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔شازیہ کے پاس دروازے کھولنے کے کئی اوزار تھے جو عمدگی سے اپنا کام کر رہے تھے۔ وہ مختلف کمروں کی تلاشی لینے لگے الماریاں میزوں کی درازیں خفیہ تجوریوں کی تلاش لیکن ایک گھنٹے کی کوششوں کے باوجود انہیں کوئی ایسی چیز نہیں ملی جو کسی خاص بات کی نشان دہی کرتی۔ لیکن پھر شازیہ کو ایک کارآمد چیز مل ہی گئی یہ ایک وزٹنگ کارڈ تھا۔ جو کافی پرانا معلوم ہوتا تھا۔ یہ ایک الماری کے نچلے حصے میں پڑا ہوا تھا۔شازیہ نے ٹارچ کی روشنی میں کارڈ پڑھا اس پر''ڈائینوسار'' ساتھ ہی جمال الدین خان بھی لکھا ہوا تھا۔

''ڈائینوسار، یہ کیا ہے جمال الدین خان بھی لکھا ہوا ہے مگر ڈائینوسار نامی کسی کمپنی وغیرہ کا نام پہلے کبھی سننے کونہیں ملا۔''

''ایک منٹ...... ایک منٹ۔'' دلاور نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا اور پھر وہ ٹارچ ہی کی روشنی میں کارڈ دیکھنے لگا اوراس کے بعد اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

''میں جانتا ہوں ڈائینوسار کیا ہے۔''

''اڑے خدا قسم میٹرے کوبھی یہ نام کچھ جانا پہچانا سا لگتا ہے کدر سنا تھا کدر دیکھا تھا۔ اڑے ہاں

یاد آ گیا۔ بندرگاہ کے علاقے میں ایک ہوٹل کا نام ڈائینوسار ہے۔''

''بالکل ٹھیک ہے...... بالکل ٹھیک سمجھے تم یہ وہی ڈائینوسار ہے۔'' دلاور نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

''خیراس کے بارے میں ہم بعد میں گفتگو کریں گے اب یہ بتاؤ کہ کیا کوئی ایسی جگہ رہ گئی جس کی تلاشی ہم نے نہ لی ہو۔''

''میرے خیال میں تو ایسی کوئی جگہ نہیں ہے۔''

''تو پھر واپس۔''

''ہاں، چھوٹے بابا کو رپورٹ بھی تو دینی ہے۔آؤ واپس چلتے ہیں۔'' تھوڑی دیر کے بعد وہ تینوں عمارت سے باہر نکل آئے تھے۔

♥......♥......♥
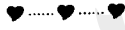
صوفی آنکھیں بند کیے جگالی کر رہا تھا۔ دلاور نے اسے ڈائینوسار کے بارے میں تفصیل بتاتے ہوئے کہا تھا۔

''جمال الدین خاں کوئی باقاعدہ غنڈہ نہیں ہے لیکن جس طرح کا وہ آدمی ہے آپ سمجھ لیجیے کہ اس قسم کے کام وہی کر سکتا ہے مگر صوفی صاحب بات بہت پرانی ہوگئی ہے دس بارہ سال پہلے میرا اس سے کچھ واسطہ رہا تھا۔ وہ باقاعدہ ڈرگ کا کاروبار بھی کرتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے اپنے ہوٹل کے نیچے ایک تہ خانہ بنا رکھا ہے اس تہ خانے میں باقاعدہ ایک نیا ہوٹل ہے جہاں ہر طرح کی منشیات مل جایا کرتی ہیں اور یہاں داخلہ بڑے پراسرار ذریعے ہوتا ہے۔ کچن سے نیچے جانے کا راستہ ہے اب یہ معلوم نہیں کہ موجودہ وقت میں ڈائینوسار کی کیا کیفیت ہے۔

''پہلے تو یہ بہت اچھا چلتا تھا۔'' بہرحال یہ کارڈ حیثیت تو رکھتا ہے کیونکہ ایک غلط جگہ سے منسوب ہے خیراس کا جائزہ لیں گے۔''

''آپ وہاں جائیں گے چھوٹے بابا۔'' شازیہ نے پُراشتیاق لہجے میں کہا۔

''ہاں جانا تو ہوگا درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''چھوٹے بابا میں بھی چلوں۔''

''نہیں بے بی، وہ جگہ شریف بچیوں کے جانے کی نہیں ہے۔''

''مگر کام کے معاملے میں کوئی ایسی بات تو نہیں ہوئی۔''

''مطلب یہ ہے کہ اگر وہاں ریڈ کرنا ہے تو ضرور ریڈ کرنا ورنہ باقی سب ٹھیک ہے۔تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں ہوگا۔'' شازیہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگئی تھی۔ صوفی اپنے ذہن میں منصوبہ بندی کرتا رہا۔غلام قادر کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ ہوا تھا۔ لیکن طے یہ ہوا تھا کہ غلام قادر بھی الگ جائے گا۔ دلاور، شازیہ، عادل اور فیضان ان لوگوں کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی کہ وہ ڈائینوسار سے باہر حالات کا انتظار کریں اور اگر اندر کوئی صورت حال غلط رخ اختیار کر جائے تو پھر اس میں مداخلت بھی کریں۔ وقت طے ہوگیا اوراس کے

بعد صوفی ڈائنوسار پہنچ گیا۔ اچھی بڑی عمارت تھی۔ ہال میں مختلف قسم کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اسنیک اور کولڈ ڈرنک وغیرہ اور چائے چل رہی تھی۔ کھانے کا بھی انتظام تھا شاید لیکن یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ میزوں پر کھانا لگایا جا سکے۔ رش بھی زیادہ نہیں تھا ویسے بندرگاہ کا علاقہ تھا زیادہ تر یہاں خلاصی وغیرہ نظر آ رہے تھے۔
غلام قادر ایک میز پر جا کر بیٹھ گیا صوفی نے بھی اپنی میز سنبھال لی۔ صوفی اس وقت پتلون اور بش شرٹ میں تھا اور اس میں وہ جو کچھ بھی لگتا تھا وہ بھی قابل دید ہی بات تھی۔ اس نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے بھاری بدن والے آدمی کو دیکھا دلاور نے یہی حلیہ بتایا تھا اس کا۔ ویسے دلاور اندر نہیں آیا تھا کیونکہ جمال الدین خاں اسے پہچانتا تھا۔ دلاور نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا تھا کہ وہ کچھ عرصے تک جمال الدین خان کے لیے کام کرتا رہا ہے وہ شخص بہ ذات خود تو کچھ نہیں تھا کہ اس نے تعلقات بہت اچھے بنا رکھے تھے۔ ہر طرح کے لوگوں سے اس کے تعلقات تھے اور وہ کسی نہ کسی طرح روپیٹ کر اپنا کام نکلوا ہی لیتا تھا۔ صوفی نے ایک میز پر بیٹھ کر چائے کا آرڈر دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ ویٹر وغیرہ گاہکوں سے بے پروا ہوتے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ ہوٹل بس برائے نام چلایا جا رہا ہے۔ جمال الدین خاں کا اصل دھندہ اپنے طور پر کام کر رہا ہے۔
بہرحال چائے سرو کر دی گئی۔ صوفی جائزہ لیتا رہا اور اس نے چند افراد کو ہوٹل کے دوسرے حصے سے کچن کی طرف جاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ اندازہ ہو گیا کہ جمال الدین خان کا ڈرگ کا کاروبار بدستور جاری ہے۔ چائے وغیرہ پینے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پرس نکال کر کاؤنٹر [illegible] بڑھا۔ ویٹر نے اس کے بل کی رقم بتائی اور صوفی نے وہ پیسے نکال کر کاؤنٹر پر رکھے اور پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔
"اچھا ہوٹل ہے، کیسا چل رہا ہے۔"
"کیوں خیریت کیا شیئر خریدنے کا ارادہ ہے۔"
"جمال الدین خاں ہے ناں تمہارا نام درویشوں کی دعاؤں سے۔"
"میرا نام درویشوں کی دعاؤں سے نہیں بلکہ ماں باپ کی دعاؤں سے رکھا گیا ہے۔ جمال الدین خاں نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔
"بس کیا کہا جا سکتا ہے ویسے سنا ہے کہ لاکھوں کما رہے ہو بیوی بچے کتنے ہیں۔"
"پاگل ہو بھائی کیا بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو۔ چائے پی لی تم نے پیسے دے دیے اب پھوٹ لو۔"
"نہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے وہ اصل میں سائرہ حمید کا مسئلہ پھر سے سامنے آ گیا ہے اور بھولی بسری یادیں پھر سے تازہ ہو گئی ہیں۔ جمال الدین خاں تیکھی نگاہوں سے صوفی کو دیکھنے لگا۔ لیکن پھر ایک دم چونک کر پڑا اب اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے تھے۔"
"کیا نام لیا تم نے۔"
"سائرہ حمید ظاہر ہے تمہارے علاوہ سائرہ حمید کے بارے میں اور کون جان سکتا ہے۔"
"نجانے کیا بکواس کر رہے ہو......"
"نہیں دوست زبان خراب مت کرو ورنہ میں حلیہ خراب کر دیا کرتا ہوں۔"
"ویٹروں کو بلاؤں۔"

"بلا لو تمہارا انڈر گراؤنڈ کام بند ہو جائے گا۔ درویشوں کے کرم سے صوفی نے کہا اور اس بار جمال الدین خاں بری طرح چونک پڑا۔
"کک...... کیا مطلب ہے تمہارا۔"
"انڈر گراؤنڈ کام کی بات کر رہا ہوں بھائی وہ جو اس فرش کے نیچے چل رہا ہے۔" جمال الدین خاں گول گول آنکھوں سے اسے گھورتا رہا پھر بولا۔
"خیر میرا کام تو چل رہا ہے یا نہیں چل رہا لیکن تمہارا کام آسانی سے تمام ہو جائے گا۔"
"یہی تو دلی خواہش ہے اب ایسے کرتے ہیں کہ تبادلہ کر لیتے ہیں معلومات کا۔ طویل عرصے سے تمہارا یہ کاروبار جاری ہے اور لازمی بات ہے کہ پولیس کی ملی بھگت سے ہو رہا ہوگا۔ لیکن باہر ایک پورا گینگ موجود ہے، کہو تو اشارہ کر کے دکھاؤں میرے اشارے پر وہ اندر آ جائے گا۔ تمہاری اچھی طرح مرمت کرے گا اور اس کے بعد تمہارا یہ کام منظر عام پر آ جائے گا۔ بولو تو میں انہیں نیچے جانے کا پتا بھی بتا سکتا ہوں۔ یعنی تمہارا کچن جس سے اب بھی لوگوں کی آمد و رفت جاری ہے۔"
"کک...... کک...... کون ہو تم۔"
"کوئی نہیں مجھے سائرہ حمید کے بارے میں تفصیل درکار ہے۔"
"یقین کرو اب سائرہ حمید کا کوئی مسئلہ نہیں رہا ہے، وہ مر چکی ہے اور یہ بہت پرانی بات ہے۔"
"دیکھو میری بات سنو، وہ مر چکی ہے یا زندہ ہے میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا لیکن تم مجھے اس کے بارے میں تفصیلات تو بتاؤ۔"
"میں آپ کو ایک ایسی عورت کا پتا بتا سکتا ہوں جو سائرہ حمید کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے۔"
"تم کہتے ہو کہ سائرہ حمید مر چکی ہے۔"
"یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔"
"کیسے مری تھی وہ۔"
"یہ میں نہیں جانتا ویسے وہی عورت آپ کو بتائے گی۔ وہ سائرہ کی سب سے گہری دوست تھی اور اس کی راز دار بھی تھی۔ مگر اس زمانے میں اس کا منہ بند کر دیا گیا تھا۔"
"آپ کو علم نہیں کہ وہ لوگ کون تھے۔"
"خدا...... خدا کی قسم میں انہیں نہیں جانتا۔"
"کیسے موت واقع ہوئی تھی اس کی۔" صوفی نے سوال کیا۔
"کچھ لوگ اسے زبردستی اٹھا کر لے گئے تھے۔ دوسرے دن گلی میں بے ہوش پائی گئی اور پھر اسی دن ہسپتال میں دم توڑ دیا۔"
"ایک اور سوال۔ کیا کرتی تھی وہ کیا برے راستوں کی راہی تھی؟"
"نہیں صاحب وہ صرف ناچنے والی تھی اپنا جسم نہیں بیچتی تھی جس جگہ وہ رقص کرتی تھی آپ سمجھ لیجیے کہ وہاں بیٹھنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی۔"

''ایک نام جس سے تمہارا گہرا تعلق تھا۔ میں وہ نام لے رہا ہوں اور اب بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ سب بولنے میں ہی فائدہ ہے۔''

''جی سر! آپ نام لیجیے۔ مگر آپ ہیں کون؟''

''فضول بات بالکل نہیں۔'' صوفی اس وقت بالکل بدلے ہوئے انداز میں بات کر رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''بریگیڈیئر شیر خان۔''

''جی ہاں وہ بھی سائرہ حمید کو پسند کرنے والوں میں سے تھے۔ لیکن آپ نے اخبار میں ان کی موت کی خبر تو پڑھی ہوگی۔''

''ہاں، سنا ہے ان کی لاش میں خنجر پیوست پایا گیا تھا اور اس خنجر پر سائرہ حمید کا نام لکھا ہوا تھا۔''

''اگر کسی نے انہیں انتقامی جذبے کے تحت قتل کیا ہے تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھی سائرہ حمید کے چاہنے والوں میں شامل رہے ہوں گے۔''

''تو تمہیں اس بات کا علم ہے کہ وہ ایک عیاش طبع آدمی تھے۔''

''جی سر! میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں مگر میں نے کبھی انہیں سائرہ حمید کے گرد گھومتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

''ہوں۔'' اس عورت کے بارے میں ذرا بتایئے۔''

''اس کا نام ڈائنا ہے سمجھے آپ ڈائنا گولڈ......''

''واہ دلچسپ نام ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''ڈائنا گولڈ اس کی رازدار اور ہم پیشہ بھی تھی۔ وہ ایک ہوٹل میں ملازمت کرتی تھی۔ ایک بار اس نے مجھ سے اشارۃً کہا بھی تھا کہ اگر وہ چاہے تو کئی سربرآوردہ ہستیوں کو پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتی ہے۔ لیکن اس کا منہ بند کر دیا گیا تھا۔''

''کس نے بند کیا تھا۔''

''ان کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم۔ اگر آپ ڈائنا گولڈ کی زبان نکلوانے میں کامیاب ہو گئے تو وہ آپ کو بہت کچھ بتا سکتی ہے۔''

''کہاں ملے گی وہ۔''

''نیوروڈ پر اس کا اپنا چھوٹا سا خوب صورت ریستوران ہے جو ڈائنا گولڈ کے نام ہی سے مشہور ہے۔''

''ہوں ٹھیک ہے۔''

''لیکن جناب وہ میں...... میرا مطلب ہے۔''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے جب تک کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہو جاتی میں اپنی زبان بند رکھوں گا۔''

''دیکھیے میرا اور آپ کا کوئی جھگڑا نہیں ہے لیکن ایک سوال میں بھی آپ سے کر سکتا ہوں۔''

''پوچھو، درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''کس کی دعاؤں سے۔''

''پوچھو، پوچھو'' صوفی نے کہا۔

''آپ کا تعلق پولیس سے ہے۔''

''نہیں۔'' صوفی نے جواب دیا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ وہ اسے دیکھتا رہ گیا تھا جمال الدین کا کہنا بالکل ٹھیک تھا۔ ڈائنا گولڈ بہت خوب صورت بنا ہوا تھا۔ صاف ستھرا شفاف چھوٹے سے علاقے میں یہ ایک پسندیدہ ترین جگہ تھی۔ متوسط طبقے کے خوشحال لوگ یہاں آنا فخر سمجھتے تھے اور اس کی وجہ ڈائنا کی دلکشی بھی تھی۔ بے شک وہ پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی لیکن صاحب نظر اور صاحب ذوق لوگ جانتے ہیں کہ یہ عمر کیا ہوتی ہے۔ یہ صحیح معنوں میں تکمیل کی عمر ہوتی ہے۔ اور اس وقت جو کچھ نظر آتی ہے نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔ ڈائنا بھی اس وقت ایک مکمل وجود تھی۔ صوفی جس وقت وہاں داخل ہوا ایک بھی میز خالی نہیں ملی۔ چنانچہ وہ کاؤنٹر کی طرف چلا گیا اور ڈائنا گولڈ اسے چونک کر دیکھنے لگی۔ یہ صوفی کی خوبی تھی کہ وہ جب چاہے جس شکل کو اختیار کر لے۔ چہرے کے نقوش میں اس وقت جو سفاک کیفیت پیدا ہوئی تھی شاذ یہ یا دیکھنے والے اسے دیکھ لیتے تو دھک سے رہ جاتے۔ یہ صوفی کا چہرہ تو نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں کسی قبرستان میں جلتے ہوئے مدھم دیوں کی مانند روشن تھیں۔ ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور چہرے کے عضلات کچھ اس طرح تبدیل ہوئے تھے کہ دیکھنے والی نگاہ ایک نظر میں اس سے خوف زدہ ہو جائے۔

ڈائنا گولڈ نے اسے غور سے دیکھا اور اس کے ہونٹ خشک ہو گئے۔

''جج...... جج جی فرمایئے۔''

''کرسی منگاؤ میرے لیے ایک۔'' صوفی نے بھاری لہجے میں کہا۔ نجانے کیوں ڈائنا اس قدر مسحور ہو گئی کہ اس نے فوراً ہی ویٹر کو کرسی لانے کا اشارہ کیا۔ صوفی اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

''ہاں بولو مجھ سے کوئی کام ہے یا میزیں خالی نہ دیکھ کر ادھر آ گئے ہو۔''

''مجھے تم سے ایک بہت ضروری کام ہے۔ اور یوں سمجھ لو کہ میں اس وقت صرف تم سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔ مجھے کچھ وقت دو۔''

''ابھی۔'' ڈائنا نے کسی قدر پریشانی سے کہا۔

''ہاں، ابھی۔''

''اٹھو آؤ میرے ساتھ۔'' ڈائنا گولڈ نے کہا اور صوفی کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتی ہوئی کاؤنٹر کے عقب میں ایک کمرے میں چلی گئی۔ بہت سی آنکھیں کسی قدر حیرانی سے انہیں گھور رہی تھیں۔

''تم ہو کون کیا تم ہپناٹزم کے ماہر ہو۔''

''کیوں۔'' صوفی غرایا۔

''مجھے پتا نہیں ہے کہ میں اس وقت کاؤنٹر چھوڑ کر کیوں چلی آئی ہوں۔''

''یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔'' صوفی نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بتاؤ تو سہی آخر تم لوگ ہو کون۔''

"میں جو کوئی بھی ہوں تم مجھے سائرہ حمید کی کہانی سناؤ گی۔

"ڈائنا گولڈ بری طرح چونک پڑی۔

"سس...... سس سائرہ حمید۔"

"اور یہ نہیں کہو گی کہ تم کسی سائرہ حمید کو نہیں جانتی۔"

"نہیں میں ایسا کیوں کہوں گی۔"

"تو پھر اس کے بارے میں بتاؤ۔"

"اگر میں اس کے بارے میں جانتی بھی ہوں تو تم کون ہوتے ہو مجھ سے پوچھنے والے آخر تم کہاں سے آئے ہو۔"

"پٹری سے مت اترو اگر تم نے میرے ساتھ تعاون نہیں کیا تو تم یہ سمجھ لو کہ بہت جلد پولیس سائرہ حمید کے سلسلے میں تم تک پہنچ جائے گی۔"

"تمہارا تعلق پولیس سے ہے۔"

"کہا ناں نہیں۔"

"تو تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو۔"

"دیکھو میں واقعی تم سے ہمدردی رکھتا ہوں تم اپنے جرم سے بخوبی واقف ہو اور تمہارے جرم سے دو آدمی اور بھی واقف ہیں ایک جمال الدین خان دوسرا میں۔"

"جج...... جج جمال الدین خان او ہو تو اس نے پھر ہوا میں تیر چھوڑنے کی کوشش کی۔"

"میڈم ڈائنا گولڈ میں دوسری قسم کا آدمی ہوں اگر میں پٹری سے اتر گیا تو تم یہ سمجھ لو کہ تمہاری جگہ صرف پھانسی کا پھندہ ہو گی۔"

"تم چاہتے کیا ہو۔" ڈائنا نے خوف زدہ آواز میں کہا۔

"ان آدمیوں کے نام جنہوں نے تمہارا منہ بند کیا تھا۔ حالانکہ تم سائرہ حمید کے بارے میں سب کچھ جانتی تھیں" ڈائنا کچھ نہ بولی۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ شدید خوف زدہ ہو گئی ہے۔

"اس سے بہتر موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ ان آدمیوں کے نام بتا کر تم اپنی گردن بچا سکتی ہو۔ میں تمہارا نام منظر عام پر نہیں آنے دوں گا۔"

"مگر میری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"کیوں۔" صوفی نے سوال کیا۔

"ان لوگوں سے صرف میں ہی واقف ہوں اور وہ جانتے ہیں کہ اگر کسی اور کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہی ہو گا کہ میں نے اسے بتایا ہے۔"

"تمہاری حفاظت کا ذمہ میں لیتا ہوں۔" صوفی نے کہا۔

"حالانکہ تم نے یہ تک نہیں بتایا کہ تم ہو کون۔"

"میں جو کوئی بھی ہوں تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے بس اب یہ آخری بار کہہ رہا ہوں کہ

اگر مجھے اس کا جواب نہیں ملا تو آدھے گھنٹے کے اندر اندر پولیس تمہارے اس ڈائنا گولڈ کو چائنا چوک۔ بنا دے گی۔" صوفی نے ایک بار بھی درویشوں کا حوالہ نہیں دیا تھا اور نہ ہی اس کے لہجے میں ہکلاہٹ پیدا ہوئی تھی۔

ڈائنا گولڈ چاروں طرف دیکھنے لگی پھر بولی۔

"مگر یہ باتیں اس جگہ نہیں کی جا سکتیں۔ آؤ میرے ساتھ۔" شاید اس کمرے کے علاوہ بھی یہاں کوئی جگہ تھی۔ صوفی تیار ہو گیا۔ اور ڈائنا دروازے کی طرف بڑھی۔ لیکن ٹھیک اسی وقت ایک آدمی کمرے میں گھس آیا۔ وہ لمبے چوڑے بدن کا مالک ایک دیسی عیسائی تھا۔ اس کے گلے میں لٹکی ہوئی صلیب اس کے مذہب کا پتا دیتی تھی۔ اس کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔

"ارے کیا کر رہی ہے یہاں۔" اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی۔ جیسے ڈائنا گولڈ اس کی ماتحت ہو۔"

"کیوں؟ تمہیں اس سے کیا مطلب ہے۔"

"بہت اونچی اڑ رہی ہے آج کل۔ کون ہے یہ گدھا۔"

"شٹ اپ۔" ڈائنا گولڈ بولی۔ وہ آدمی آگے بڑھا اور اس نے ڈائنا کی کلائی پکڑ لی۔

"سنو...... سنو والد صاحب کو بھول گئے۔ دد...... در...... درویشوں" صوفی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ادھر ڈائنا اس سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی لیکن کامیاب نہیں ہو سکی۔ آنے والے کا چہرہ حد درجے خونخوار نظر آنے لگا تھا۔

"تم نے ابھی تک اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا، چھوڑو۔ میری بات مانو ورنہ اپنے ہاتھ سے محروم ہو جاؤ گے۔" جواب میں قوی ہیکل آدمی نے ڈائنا کو اس زور سے دھکا دیا کہ وہ صوفی پر آ رہی۔ صوفی نے بڑے ماہرانہ انداز میں اسے اپنے بازو پر روکا اور پھر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔"

"رکو...... رکو...... رک جاؤ یہاں یہ نہیں ہو سکتا۔" ڈائنا دونوں کے درمیان آ گئی لیکن آنے والے خونخوار شخص نے بڑی بے دردی سے اس کی کمر پر ایک لات رسید کی اور ایک بار پھر صوفی پر دھکیلنا چاہا۔ صوفی نے اپنے آپ کو سنبھالا تو اس نے سر جھکا کر اس کے سینے پر بڑی زوردار ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ یہ ایک ایسا داؤ تھا کہ اگر صوفی کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو لازمی طور پر چکر میں آ گیا ہوتا۔ لیکن صوفی نے نہ صرف اس کا داؤ خالی دیا۔ بلکہ پلٹ کر ایک الٹی لات اس کے بدن پر رسید کر دی اور قوی ہیکل آدمی نے دونوں ہاتھوں سے اپنے آپ کو سنبھالا ورنہ وہ بری طرح دیوار سے ٹکرایا ہوتا۔ وہ کسی زخمی بھیڑیے کی طرح غرا کر پلٹا لیکن غصے کی زیادتی اس کا دماغ پلٹ گئی تھی۔

دوسرے لمحے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ایک ایسا گھونسا پڑا کہ وہ زمین سے دو فٹ اونچا اچھل گیا۔ اس دوران ڈائنا گولڈ شدت حیرت سے دیوار سے جا لگی تھی۔ نو وارد جیسا دیو ہیکل آدمی بالکل ہی آؤٹ آف کھوپڑی ہو گیا تھا۔ وہ پھر صوفی پر جھپٹا۔ صوفی نے اس کی گردن بغل میں دبا کر اس کے پیٹ میں کئی زوردار گھونسے رسید کیے اور پھر اچانک ہی اس کی گردن کو ایک طرف موڑ کر اس کے کندھوں پر ایک ضرب لگائی۔

قوی ہیکل آدمی کے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور وہ زمین پر اوندھا جا پڑا۔ صوفی نے اس کے دوسرے شانے پر ایڑھی رکھ کر ایک بل دیا اور اس کے حلقے سے پھر ایک کراہ نکل گئی۔

اب وہ اس طرح اپنے ہاتھ اور پاؤں ادھر ادھر پھینک رہا تھا جیسے اندھا ہو گیا ہو۔ آہستہ آہستہ ہاتھوں کی حرکت بھی سست پڑتی گئی اور پھر فرش سے جا لگا وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ ڈائنا گولڈ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ صوفی نے اس کی طرف دیکھ کر جیبیں ٹٹولیں۔ اس مشقت کے بعد پانوں کی ایک گلوری تو منہ تک جانی ہی چاہیے تھی۔ لیکن یہاں آتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو بالکل تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی۔

اور یہ کوشش پانوں کے بغیر ہی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ بٹوہ وغیرہ اس کی جیب میں موجود نہیں تھا۔ ڈائنا سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔

"میرے خدا...... میرے خدا۔ اب کیا ہوگا۔"

"چھوڑو جہنم میں جائے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ تم مجھے کہاں لے جا رہی تھیں۔"

"کک...... کک کیا یہ مر جائے گا، ڈائنا اس شخص پر جھک پڑی۔ جو آنکھیں بند کیے گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔"

"دیکھو میڈم تم وقت برباد کر رہی ہو۔ میں تمہیں صرف تین منٹ اور دے سکتا ہوں اور اس کے بعد میں خود یہاں سے چلا جاؤں گا اور یہاں جو کوئی آئے گا وہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔"

"ارے مگر اس کا کیا ہوگا۔ یہ جو مصیبت تم نے میرے لیے کھڑی کر دی ہے ڈائنا نے بے ہوش آدمی کی طرف اشارہ کیا۔"

"اس کی فکر مت کرو ہوش میں آتے ہی یہاں سے چپ چاپ اٹھ کر چلا جائے گا۔"

"اور اس کے بعد کیا ہوگا۔ اس کا تمہارے فرشتوں کو بھی پتا نہیں ہوگا۔"

"چلو پھر ٹھیک ہے پہلے تم مجھے اس کے بارے میں بتا دو یہ ہے کیا چیز جو تم اس سے اس قدر خوف زدہ ہو رہی ہو۔"

"یہ وہ ہے جس نے شاید اپنی زندگی میں کسی کو اونچا بھی نہیں بولنے دیا مگر جواب اس کے ساتھ رہا ہے وہ اسے بالکل پاگل کر دے گا۔"

"ٹھیک ہے تم ایسا کرو پاگل خانے والوں کو ایڈوانس فون کر دو۔"

"اوہ تم حالات کی سنگینی سے ناواقف ہو۔"

"دیکھو میں تمہیں دو تین بار وارننگ دے چکا ہوں مگر تم اس پر توجہ نہیں دے رہیں۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ اسے گردن دبا کر ختم کیے دیتا ہوں تا کہ تمہارا یہ خوف بھی ختم ہو جائے۔

"اسے نہیں نہیں...... نہیں۔" ڈائنا گولڈ کانپتے ہوئے بولی۔

"پھر تم کیا چاہتی ہو۔"

"دیکھو تم فی الحال یہاں سے چلے جاؤ ورنہ تمہاری زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہ بہت بڑا گروہ ہے اور اس کے ساتھی۔ انتہائی خطرناک قاتل۔" صوفی غصیلی نگاہوں سے ڈائنا گولڈ کو گھورنے لگا

پھر اس کے بعد بولا۔

"ٹھیک ہے میں یہاں سے چلا جاؤں اور تم اس کے ہوش میں آنے کے بعد اس سے کہو کہ میں ایک بلیک میلر تھا۔ البتہ میں اب تمہیں اس کے بارے میں بتائے دیتا ہوں۔ یہ تمہارے گروہ کا آدمی ہے اور تم لوگ گندہ کاروبار کرتے ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم لوگ ان آدمیوں کو جن کا تعلق سائرہ حمید کی موت سے ہے بلیک میل ہی کر رہے ہو۔ اور مجھے لگ رہا ہے کہ تم شرافت سے نہیں مانو گی۔"

"صوفی نے آگے بڑھ کر دروازے کی چٹخنی چڑھا دی اور پھر ڈائنا گولڈ کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

"اب معاملہ پولیس کے ہاتھ میں دینے کے بجائے مجھے اپنے ہی ہاتھ میں لینا پڑے گا۔" اچانک ہی ڈائنا گولڈ کا رویہ بدل گیا۔ وہ ایک خونخوار عورت نظر آنے لگی اور دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے بلاؤز سے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا پستول نکال لیا اور اس کا رخ صوفی کی طرف کر کے بولی۔

"چلو اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔" صوفی نے اسے دیکھا اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر بڑبڑایا۔

"دد...... دد درویش رحم کریں تم تو بہت خطرناک عورت ہو جو عورتیں اپنے پاس پستول رکھتی ہیں مجھے ان سے بڑی دہشت محسوس ہوتی ہے۔" صوفی نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے تھے۔ ڈائنا گولڈ نے پھنکارتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں اب بتاؤ تم کون ہو۔"

"مم...... مم میں ایک مظلوم آدمی ہوں۔ سو پچاس روپے دے کر کوئی بھی مجھے کسی کام سے لگا دیتا ہے۔ جمال الدین خاں نے مجھے یہاں بھیجا ہے اس کا کہنا ہے کہ تم۔"

"ایک منٹ...... ایک منٹ مجھے لگ رہا ہے کہ تم مجھے باتوں میں لگا رہے ہو۔ تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے تو اسے نکال کر باہر پھینک دو۔"

"ارے توبہ کرو بس ایک چھوٹا سا چاقو ہے اسی سے کام چلا لیتا ہوں۔" صوفی نے جیب کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

"رک جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی اور اس نے صوفی کی جیبوں کی تلاشی لینا شروع کی۔ لیکن پھر وہ ہو گیا جس کا ڈائنا گولڈ نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ صوفی کے اٹھے ہوئے ہاتھ نیچے جھکے اس نے ڈائنا گولڈ کی دونوں کلائیاں پکڑ کر انہیں پیچھے موڑ دیا اور ڈائنا گولڈ اس کے سینے سے آ لگی۔ صوفی نے ہاتھ کا ایک جھٹکا دیا اور پستول ڈائنا گولڈ کے ہاتھ سے نکل کر صوفی کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس کے بعد اس نے ڈائنا گولڈ کو زور سے دھکا دے دیا تھا کہ وہ گرتے گرتے بچی۔

"ہاں۔ چلو اب تم دوسری کارروائی پر غور کرو۔ یہاں تو تم ناکام ہو گئیں۔" ڈائنا گولڈ خاموش ہی رہی اب وہ اس بے ہوش آدمی کی طرف دیکھ رہی تھی جس کے جسم میں کچھ حرکت پیدا ہو رہی تھی لیکن وہ پوری طرح ہوش میں نہیں آیا تھا۔

"اب بتا دو وہ لوگ کون تھے جنہوں نے سائرہ حمید......"

"کچھ نہیں جانتی میں سمجھے...... کچھ نہیں جانتی۔" صوفی نے پستول اندرونی جیب میں رکھا اور بولا۔

"قتل کرنے کے لیے گردن دبا کر مارنا سب سے آسان چیز ہوتی ہے اور وہ بھی کسی عورت کی گردن چلو ٹھیک ہے تین تک گنتی گنتا ہوں۔ اگر تم نے زبان نہیں کھولی تو سمجھ لو اس کے بعد تمہاری زندگی آخری لمحات سے دوچار ہو جائے گی درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"میں نے کہا ناں میں...... میں۔"

"ایک بات کا مجھے جواب دو کچھ لوگ سائرہ حمید کے قاتل ہو سکتے ہیں لیکن وہ وہ کون ہے جو اس کا انتقام لینا چاہتا ہے۔"

"کون سائرہ حمید، میں کسی سائرہ حمید کو نہیں جانتی۔"

"دیکھو پچھلے کچھ عرصے سے میرے دماغ کی کوئی رگ ڈھیلی ہو گئی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ دنیا کی ساری عورتوں کو مار دوں۔ بس درویشوں کا حکم نہیں ہے۔ اب بھی میں تم سے کہتا ہوں۔"

"بکواس مت کرو کتے۔ میں تمہاری کوئی اوقات نہیں سمجھتی لیکن"...... پھر وہ فوراً ہی اپنی اوقات سمجھ گئی۔ چونکہ جو تھپڑ اس کے رخسار پر پڑا تھا اس نے جبڑے ہلا دیے تھے۔ اور وہ قریب ہی کسی دیوار سے جا ٹکرائی تھی۔ صوفی نے آگے بڑھ کر اس کے بال مٹھی میں جکڑے اور اس کی گردن مروڑ کر دہرا کر دیا۔

"اب میرا سیدھا ہاتھ تمہارے نرخرے پر پڑے گا اور دنیا تمہاری آنکھوں میں تاریک ہو جائے گی۔" بمشکل تمام آخر کار وہ زبان کھولنے پر آمادہ ہو گئی۔ صوفی کو بڑی محنت سے اس کی تمام باتیں سننا اور اس میں سے حقیقتیں نکال لینی تھیں۔ وہ اس کی باتیں غور سے سنتا رہا۔ اس نے کئی نام نوٹ بھی کیے پھر داستان کے اس حصے پر پہنچی جہاں سے سائرہ حمید کے ایک محبوب کا وجود شروع ہوتا تھا۔

"اس کا نام ڈار کر تھا۔ ایک دیسی عیسائی وہ سائرہ حمید سے محبت کرتا تھا۔ جن دنوں سائرہ حمید کو قتل کیا گیا وہ شہر میں موجود نہیں تھا۔ اس نے سائرہ حمید کی موت کی خبر سنی۔ یہاں میرے پاس آیا اور مجھ سے اس بارے میں معلومات حاصل کیں۔"

"کیا وہ جانتا تھا کہ تم سائرہ حمید کی دوست ہو۔"

"اچھی طرح جانتا تھا میری اور اس کی کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔"

"اور تم نے اس پر ان چھ آدمیوں کے نام ظاہر کر دیے۔"

"بالکل نہیں میں خونریزی نہیں چاہتی تھی۔ ڈار کر کوئی معمولی آدمی نہیں تھا وہ ایک عجیب و غریب شخصیت تھی۔"

"ہوں، اس کے بعد تمہاری ملاقات ڈار کر سے ہوئی۔"

"آج تک نہیں دیکھا میں نے اسے۔ وہ لاابالی سا آدمی تھا جرائم پیشہ دنیا یعنی یہ کہنا چاہیے آدھی دنیا کی سیر کر چکا تھا۔"

"تم نے ان افراد کو بلیک میل کیا ہوگا۔"

"نہیں مجھے زندگی سے پیار ہے میں زندگی کھونا نہیں چاہتی اور میں یہ جانتی ہوں کہ اس طرح

کوئی دشمنی دوست تو دے دیتی ہے مگر زندگی نہیں۔"

"مگر تم نے پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دی۔"

"کس سلسلے میں اطلاع دیتی وہی بات جو میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ میں مرنا نہیں چاہتی تھی۔ زندگی گزارنے کے لیے اگر تھوڑے سے کم پیسے بھی ہوں تو میرے خیال میں ان پر گزارہ کر لینا چاہیے اور پھر اگر میں سائرہ حمید کے قتل کی اطلاع پولیس کو دیتی تو پولیس کے جوتے کو غرض پڑی تھی کہ وہ میرا تحفظ کرتی۔ میں جانتی تھی کہ میرا بھی یہی انجام ہوگا جو سائرہ حمید کا ہوا۔ وہ بہت اچھی تھی۔ بہت نیک فطرت وہ اپنا جسم نہیں بیچتی تھی جس کی وجہ سے اس کا یہ انجام ہوا۔"

"اور تم۔" صوفی نے سوال کیا۔

"نہیں اگر میں شریف اور نیک ہوتی تو میرے بلاؤز سے آٹومیٹک پستول کے بجائے گلاب کے پھول نکلتے۔ لیکن میں زندگی سے پیار کرتی ہوں اور بلیک میلنگ جیسا گندہ کام نہیں کرنا چاہتی۔"

"ہوں ٹھیک اب یہ بتاؤ اس کے بعد کیا کرو گی۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں آج تم آئے ہو کل کوئی دوسرا آئے گا اور میرے ساتھ یہی سب کچھ سلوک کرے گا۔ مگر ٹھیک ہے میں سب سے تعاون کروں گی۔ میں کیوں کسی کے لیے جان دوں۔"

"مگر میں جو تم پر جان دیتا ہوں اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔ صوفی نے کہا۔ اور اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔

"تم، تمہارے بارے میں سچی بات ہے میں ابھی تک کوئی اندازہ نہیں لگا سکی۔ نہ تو تم پولیس کے آدمی معلوم ہوتے ہو اور نہ ہی...... نہ ہی۔" صوفی نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور آہستہ سے بولا۔

"میرے قریب آنا پسند کرو گی۔"

"کیوں مذاق کر رہے ہو مجھ سے۔ میرے لیے یہ کوئی انوکھا کام نہیں ہوگا۔ وہ آگے بڑھی اور صوفی کے قریب پہنچ گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے صوفی کے ہاتھ اس کی گردن تک پہنچے پھر وہ اس کی گردن پر گرفت تنگ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ڈائنا گولڈ بے ہوش ہو کر اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔ اس نے آہستہ سے اسے ایک طرف ڈالا اور پھر خاموشی سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ باہر کا کمرہ حسب معمول گاہکوں سے آباد تھا۔

♥......♥......♥

جمشید مرزا صوفی کے گھر پہنچ گیا اتفاق سے دروازہ معشوق نشیلے نے کھولا تھا۔ جمشید مرزا کو پہچانتا تھا۔ احترام کے ساتھ اندر لے آیا۔ صوفی بھی فوراً اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ جمشید مرزا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا پھر اس نے مسکراتے ہوئے صوفی کو سلام کیا اور بولا۔

"جب بھی یہاں آتا ہوں ایک دعا مانگتا آتا ہوں کہ دروازہ وہ خوفناک عورت نہ کھولے جس کے آگے میری دو کوڑی کی عزت ہو جاتی ہے نہ پولیس کی وردی کام آتی ہے اور نہ میری شخصیت صوفی صاحب ایک پیش کش کرنا چاہتا ہوں۔"

''درویش آپ پر رحم کریں۔فرمائیے۔''

''اگر آپ ان خاتون کو نکال دیں تو ان کی جگہ تین ملازمائیں آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں تنخواہ میری جیب سے یا اگر یہ نہ کریں تو کم از کم دروازے پر ایک ایسے چوکیدار کو تعینات کر دیں جو دروازہ کھولے اور آنے والے سے عزت اور احترام کے ساتھ پیش آئے۔''

''درویش آپ پر رحم کریں ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں۔''

''آپ نے تو پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔''

''جی۔''

''جی ہاں، میں نے آپ سے کچھ درخواستیں کی تھیں۔ میں مانتا ہوں کہ آپ خاموش نہ بیٹھیں ہوں گے خیر آپ اس بارے میں مجھے کوئی اطلاع دیں یا نہ دیں میں اپنی معلومات آپ تک ضرور پہنچاؤں گا۔'' صوفی نے سرد نگاہوں سے جمشید مرزا کو دیکھا اور بولا۔

''فرمائیے پہلے یہ بتائیے کیا پئیں گے آپ۔''

''اگر وہ خاتون لائیں گی تو سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ ہاں ان کے علاوہ ہمارے کچن کی ذمہ داری کسی پر نہیں ہے اگر آپ حکم دیں تو آپ کے لیے خود کچھ بنا کر لے آؤں۔

''ارے نہیں نہیں بالکل نہیں بہرحال پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی ہے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق لاش پر خنجر کا زخم تقریباً اڑتالیس گھنٹے کے بعد لگایا گیا تھا۔''

''گویا وہ لاش دو دن پہلے کی ہو سکتی ہے۔''

''جی یہی رپورٹ ہے۔''

''مگر اس کی ظاہری حالت ایسی نہیں تھی درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اسے برف میں رکھا گیا تھا۔''

''اوہو......'' صوفی پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔

''اس کے علاوہ ہمیں سائرہ حمید کے بارے میں بھی خاصی معلومات حاصل ہو گئی ہیں۔''

''نہیں۔ یہ معلومات بھی ہمارے پاس موجود ہیں۔اس کے علاوہ......''

''میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ یقیناً ہر طرح کی معلومات آپ کے پاس ہوں گی۔آپ کو یقیناً یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ چند نامعلوم افراد کے مظالم کا شکار ہو کر مر گئی تھی۔''

''ہاں وہ ایک رقاصہ تھی جو صرف رقص کرتی تھی درویشوں کی دعاؤں سے خیر تھوڑی سی معلومات کا اضافہ میری طرف سے اور کر لیجیے گا۔یا پھر اس کے علاوہ بھی کچھ معلومات آپ کے پاس موجود ہوں گی۔''

''نہیں نہیں آپ فرمائیے۔''

''ایک قبرستان کا حوالہ دیتا ہوں آپ کو جہاں اس کی قبر ہے اس قبر پر اکثر ایک شخص کو دیکھا جاتا ہے جس کے پاس ویسے ہی خنجروں کا ایک ذخیرہ ہے اور وہ خنجر قبر پر چھوڑ جاتا ہے یہ سائرہ حمید کا کوئی ایسا عاشق تھا جو اس کی موت کے وقت ملک میں موجود نہیں تھا۔آپ ایک کام کریں جمشید مرزا صاحب۔''

''حکم دیجیے صوفی صاحب واقعی یہ انکشاف اضافی ہے میرے لیے۔''

''آپ یوں کریں کہ یہ رپورٹ تفصیلی طور پر کسی اچھے اخبار کے حوالے کر دیں آپ کو اس پراسرار اور گمنام آدمی کا پورا حلیہ بتاتا ہوں یہ حلیہ بھی من وعن شائع ہونا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے صوفی صاحب آپ کے ہر حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہوں'' جمشید مرزا نے کہا اندر سے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ صوفی کی گردن پر الٹی چھری پھیر دے کیا کمبخت شخصیت ہے اور کس طرح اسے نچا رہا ہے۔

''کل صبح کے اخبار میں یہ تفصیل آ جانی چاہیے'' صوفی نے کہا۔

''آپ بالکل فکر نہ کریں۔ایسا ہی ہوگا۔ میں بس آپ کی نظر عنایت چاہتا ہوں۔''

''حق اللہ درویش آپ پر رحم کریں آپ یہ رپورٹ یہیں پر تیار کر لیں اور اس کا پورا حلیہ بھی۔''

جمشید مرزا خوش دلی کے ساتھ اس کام کے لیے تیار ہو گیا تھا۔اندر کی کیفیت جو بھی تھی اس کا دل ہی جانتا تھا۔ لیکن بہرحال وہ جانتا تھا کہ اگر صوفی سے بنا کر رکھے گا تو نیک نام رہے گا۔

صوفی کے اندر واقعی کچھ تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ پہلے وہ ایک مخصوص لباس اور ایک مخصوص انداز میں رہتا تھا۔لیکن اب اس کے جسم کا لباس بھی بعض اوقات تبدیل نظر آتا تھا۔ ویسے اکثر وہ اپنی اصلیت ہی میں رہتا تھا۔لیکن کبھی کبھی یہ لوگ محسوس کرنے لگتے تھے کہ چھوٹا بابا کچھ بدل گیا ہے۔ فیضان تو کھلے کھلے الفاظ میں کہتا تھا۔

''نہیں بھئی تم لوگ مانو یا نہ مانو عورت انسان کی شخصیت بدل دیتی ہے اور وہ کچھ سے کچھ بن جاتا ہے۔رابعہ سلطان کی موت کے بعد چھوٹے بابا میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ وہ صاف محسوس ہوتی ہیں۔ پہلے ان کے اندر ایک نرمی تھی۔لیکن اب ایک وحشت پیدا ہو گئی ہے، کسی بھی کام میں وہ انتہائی سخت قدم اٹھا لیتے ہیں۔''

''یہ بھی عشق کا ایک انداز ہے۔''

''کیوں نہیں۔'' گرین فورس کے ممبر اس طرح کی باتیں کرتے رہتے تھے۔اب پتا نہیں صوفی کے اندر کیا تھا۔ یہ تو کبھی سامنے آیا ہی نہیں تھا۔ بہرحال معمول کے مطابق شب و روز گزر رہے تھے۔ ان دنوں صوفی کی تمام تر توجہ بریگیڈیئر شیر خان کے قتل پر لگی ہوئی تھی اور اس سلسلے میں وہ بھرپور طریقے سے کام کر رہا تھا۔ کرنل رحیم شاہ کی بھی یہی خواہش تھی کہ بریگیڈیئر شیر خان کے قاتل کو جلد از جلد منظر عام پر لایا جائے۔گرین ہاؤس میں شازیہ کو صوفی کی کال موصول ہوئی۔

''کوئی مصروفیت تو نہیں ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''درویش میرے لیے دعا کہاں کرتے ہیں۔چھوٹے بابا مصروفیت نہیں بوریت اچھی خاصی ہے۔''

''درویش رحم کریں۔رات کو میرے ساتھ کہیں چلنا ہے۔''

''کس وقت چھوٹے بابا ٹائم بتا دیجیے تاکہ تیار ہو جاؤں۔''

''تقریباً دس بجے۔''

''میں آپ کو تیار ملوں گی۔'' صوفی جس وقت وہاں پہنچا تھا۔اس وقت دس بجنے میں دس منٹ رہ

گئے تھے۔شازیہ بالکل تیار تھی۔صوفی کا لباس دیکھ کر اس نے خوش دلی سے گردن ہلائی۔

''چھوٹے بابا آپ کو سچ بتاؤں اگر آپ تھوڑی سی تبدیلی پیدا کرلیں اپنے اندر تو آپ کی شخصیت انتہائی دل کش ہوسکتی ہے۔''

''درویش تم پر رحم کریں۔اصل میں شازیہ انسان اگر خود اپنی شخصیت سے مطمئن ہو تو باقی سب ٹھیک ہوتا ہے اور میں درویشوں کے کرم سے اپنے آپ سے بالکل مطمئن ہوں۔''

''پھر بھی چھوٹے بابا کبھی کبھی دوسرے لوگوں کے لیے بھی کچھ کرنا ہوتا ہے۔''

''ہاں کرنا تو ہوتا ہے۔بہر حال تیار ہو تم۔''

''ہاں آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہو رہی ہوں۔'' شازیہ نے کہا اور صوفی اپنی چگی داڑھی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔شازیہ صوفی کے ساتھ باہر نکل آئی تھی۔ایک چھوٹی سی کار باہر کھڑی ہوئی تھی جو شازیہ نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔صوفی نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا تو شازیہ بولی۔

''چھوٹے بابا یہ گاڑی خریدی ہے۔''

''نہیں کسی سے ادھار لی ہے۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''آپ کے پاس اپنی گاڑی بھی تو ہے۔'' صوفی نے گردن گھما کر شازیہ کی طرف دیکھا۔شازیہ جلدی سے بولی۔

''سوری چھوٹے بابا.....سوری۔'' صوفی سامنے دیکھنے لگا تھا۔کار راستے طے کرتی رہی پھر شازیہ نے ایک دم پوچھا۔

''کیا ہم بریگیڈیئر شیر خان کے بنگلے پر جا رہے ہیں۔''

''ہاں۔''

''ویسے ایک بات کہوں چھوٹے بابا پولیس بعض اوقات میں بڑی بے پروائی سے کام کرتی ہے۔''

''کیوں؟''

''اس بنگلے پر کوئی چوکیدار نہیں ہے۔میرا مطلب ہے ابھی تو وہ زیر تفتیش ہے وہاں گارڈ ہونا چاہیے تھا۔''

''طریقہ کار ہے اپنا اپنا اور پھر اس سلسلے میں تفتیش جس شخص کے سپرد کی گئی ہے۔وہ اس قدر ذہین آدمی نہیں ہے۔''

''جمشید مرزا۔'' شازیہ ہنس کر بولی۔

''ہاں۔''

''شخصیت بڑی مزے دار ہے ایک بات بتاؤں چھوٹے بابا! آپ اس کی طرف سے کبھی مطمئن نہ ہوں۔''

''ہم اپنی طرف سے مطمئن نہیں ہیں درویشوں کی دعاؤں سے تو دوسروں سے کیا مطمئن ہوں گے۔''

''یہ آپ کیا بات کہہ رہے ہیں چھوٹے بابا، آپ مجھ سے مطمئن نہیں ہیں۔''

''حق اللہ.....حق اللہ.....حق اللہ، انسان ہمیشہ نامکمل رہتا ہے شازیہ، اوہو......ہم اپنی مطلوبہ جگہ پہنچ گئے۔صوفی نے بریگیڈیئر شیر خان کے گھر سے کافی فاصلے پر ایک جگہ اپنی گاڑی روک دی جہاں وہ عام نگاہوں سے محفوظ رہے۔اس کے بعد دونوں نیم تاریک ماحول میں گاڑی سے اتر کر آگے بڑھ گئے۔رات سرد اور تاریک تھی۔وہ دونوں شیر خان کے گھر کے سامنے پہنچ گئے۔گھر مقفل تھا۔اسے سرکاری طور پر بند کر دیا گیا تھا۔

بہر حال ساری تفصیلات نگاہوں کے سامنے تھیں۔یہ پتا چل چکا تھا کہ بریگیڈیئر شیر خان لاش ملنے سے دو دن پہلے غائب ہوگیا تھا۔وہاں موجود ملازموں نے یہ بات بتائی تھی کہ وہ کئی کئی دن تک گھر سے غائب رہتا تھا اور پھر کسی صبح وہ اسے گھر نہیں پاتے تھے۔بہر حال ملازموں کو اس سے زیادہ اور کچھ پتا نہیں تھا۔یہ بات وہ نہیں جانتے تھے کہ دروازے سے آنے کے بجائے شیر خان کون سے راستے سے اندر آجایا کرتا تھا۔صوفی شازیہ کے ساتھ عمارت کی پشت پر پہنچ گیا۔'' چھوٹے بابا کوئی باقاعدہ راستہ نہیں ہے اندر جانے کا ہمیں یہ دیوار کود کر ہی اندر جانا ہوگی۔''

''تھوڑی سی تلاش اگر کرلی جائے تو کبھی کبھی دیواریں نہیں کودنی پڑتیں درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''کیا مطلب؟''

''آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ اندر آنے کا کون سا راستہ ہے۔'' یہ کہہ کر صوفی آگے بڑھا دیوار سے کچھ فاصلے پر ایک تناور درخت تھا۔جس کی شاخیں چھت پر پھیلی ہوئی تھیں۔صوفی بے اختیار بول پڑا۔

''ملازموں نے بتایا تھا کہ بریگیڈیئر شیر خان اچانک ہی گھر میں نظر آتا تھا۔اس سے بہتر راستہ اور کون سا ہوسکتا ہے۔''

''ہاں بابا آپ ٹھیک کہتے ہیں۔یہ تو ہماری نگاہوں میں بھی نہیں آیا تھا۔''

''اسی لیے شیر خان کے آنے جانے کا راستہ بھی محفوظ تھا۔وہ درخت کے ذریعے اوپر پہنچے۔لیکن یہاں صوفی کو یہ خیال ترک کرنا پڑا۔کیونکہ یہ چھت نہیں صرف دیوار تھی۔ایک فٹ چوڑی، نیچے اندھیرا تھا۔اس لیے وہ زمین سے اس کی اونچائی کا اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔

''یہاں ٹارچ بھی نہیں روشن کی جاسکتی یہ دوسری صورت تھی کہ وہ دیوار پر لیٹ کر ٹارچ جلا کر ہاتھ نیچے لٹکا دیتا اور اس نے یہی کیا۔دیوار تقریباً بیس فٹ اونچی تھی۔ایک سرے سے دوسرے سرے تک کہیں بھی نیچے اترنے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی اسے یاد آیا کہ اس دیوار پر آگے بڑھ کر ذرا نیچی جگہ نظر آئی تھی اور یہی وہ جگہ تھی۔جہاں سے شازیہ اندر کودی تھی۔

بہر حال شازیہ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔وہ دیوار، دیوار پر سے گزرتے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے جہاں دیوار کم اونچی تھی۔

''چھوٹے بابا آپ نیچے کود سکیں گے۔''

''میں تو خیر کود ہی سکتا ہوں لیکن۔تم......''

''میں سب سے پہلے نیچے کودی تھی۔بالکل اسی جگہ سے اور اسی جگہ سے ہماری واپسی بھی ہوئی تھی۔''

''ویری گڈ اس کا مطلب ہے کہ گرین فورس کے ممبر مجھ سے زیادہ ہوشیار ہیں۔'' صوفی نے کہا اور دیوار سے نیچے کود گیا۔ شازیہ نے تعریفی نگاہوں سے صوفی کو دیکھا تھا۔ صوفی بالکل سیدھا پنجوں کے بل نیچے گیا تھا اور آرام سے کھڑا ہوگیا تھا پھر اس نے شازیہ کو بھی سہارا دیا تھا اور اس کے بعد وہ عمارت میں داخل ہوگئے۔ وہ اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں شیر خان کی لاش نظر آئی تھی۔ صوفی جگہ جگہ کا جائزہ لیتا رہا۔ کوئی خاص بات نہیں ملی تھی لیکن نہ جانے کیوں صوفی کا ذہن کہتا تھا کہ یہاں کے معاملات اس قدر صاف ستھرے نہیں ہیں۔ ضرور کہیں نہ کہیں گڑبڑ ہے اور پھر وہ اسی کمرے کے غسل خانے میں داخل ہوگیا۔ جو شیر خان کی رہائش گاہ کے طور پر تھا۔ غسل خانہ ضرورت سے زیادہ وسیع تھا۔ اس میں تمام انگلش فٹنگ تھی۔ ہر چیز جدید۔ دیر تک اس کا جائزہ لیتا رہا اور یہاں تک کہ سوئچ بورڈ پر اس کی نگاہ پڑی۔ ہر طرح کے سوئچ اس پر لگے ہوئے تھے۔ لیکن ایک سوئچ غیر ضروری تھا۔ بے حد خوب صورت اور سب سے الگ تھلگ۔ صوفی نے اس کا جائزہ لیا اور پھر پر انگوٹھا رکھ دیا۔

غسل خانے کی ایک دیوار اپنی جگہ سے کھسک گئی تھی اور اس کے دوسری طرف سیڑھیاں نظر آئی تھیں۔ یہ ایک شاندار دریافت تھی۔ وہ لوگ ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہے صوفی نے ٹارچ روشن کر کے اس کی روشنی سیڑھیوں پر ڈالی اور پھر شازیہ سے بولا۔

''آؤ۔'' چودہ سیڑھیاں تھیں اور اس کے بعد ایک وسیع و عریض تہ خانہ، تہ خانے میں میز اور کرسیاں الٹی پڑی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کچھ ہنگامہ آرائی ہوئی ہو۔ ورنہ تہ خانہ اچھا خاصا صاف ستھرا تھا۔ اس میں قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ شراب کے تین چار گلاس ٹوٹے ہوئے پڑے تھے۔ صوفی نے گہری سانس لی اور بولا۔

''یہاں روشنی تلاش کرو۔'' کچھ ہی دیر بعد تہ خانہ جگمگا اٹھا۔ تیز روشنیوں نے سارے ماحول کو منور کر دیا تھا۔ صوفی وہاں ایک ایک چیز کی تلاشی لے رہا تھا اور اس کے چہرے پر غور و فکر کے آثار نظر آنے لگے۔ شازیہ بھی حیران تھی۔ صوفی اس وقت شیر خان کے متعلق سوچ رہا تھا۔ شیر خان واقعی ایک پراسرار آدمی تھا۔ عام آدمیوں کے یہاں تہ خانے نہیں ہوتے۔

بہرحال یہاں کی ابتری ظاہر کر رہی تھی کہ یہاں بہت ہی سخت قسم کی جدوجہد ہوئی ہے۔ کئی آدمی رہے ہوں گے کیوں کہ ٹوٹے ہوئے برتنوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی صوفی نیچے جھک کر کچھ دیکھنے لگا اور پھر کھڑے ہو کر دیواروں پر روشنی ڈالی۔ جن کا پلاسٹر کئی جگہوں سے ادھڑا ہوا تھا۔ پلاسٹر نوعیت کے اعتبار سے پرانا ہی معلوم ہوتا تھا لیکن یہ تہ خانہ بھی اتنا ہی پرانا تھا۔ جتنی کہ خود عمارت پلاسٹر میں سیمنٹ کے بجائے سرخی مائل چونا اور ریت استعمال کی گئی تھی۔ صوفی سوچنے لگا کہ اگر یہاں ہونے والی کش مکش ہی شیر خان کی موت کی ذمے دار تھی۔ تو خنجر والی کہانی کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتی۔ شیر خان اپنے دشمنوں کو تہ خانے میں کیوں لاتا۔ دشمن نہیں بلکہ دشمنوں کو۔

کیونکہ ایک آدھ آدمی کے ساتھ اتنے سارے گلاس نہیں ہوتے اور پھر کرسیاں بھی کافی تعداد میں تھیں۔ ان کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ زیادہ دنوں تک کسی جگہ پر نہیں رہیں۔ اس کے خلاف میز اور ایک کرسی

کی سیلی ہوئی لکڑی بتاتی تھی کہ وہ اس تہ خانے میں کافی عرصے سے پڑی ہوئی ہے۔ صوفی ان گری ہوئی چیزوں کو ٹٹول رہا تھا۔ پھر وہ اس میز کے پاس پہنچا جس کی لکڑی پرانی اور معمولی تھی۔ بے خیالی میں اس نے اسے اٹھانے کی کوشش کی ارادتاً نہیں بلکہ یونہی، میز کی اوپری سطح پایوں سے الگ ہو کر اس کے ہاتھوں میں آ گئی۔ صوفی نے حیرت سے اسے دیکھا اور اس کے منہ سے مدھم سی آواز نکلی۔

درویش رحم کریں۔'' دفعتاً اس کی نگاہ ایک اور چیز پر پڑی۔ یہ ایک دراز تھی۔ جو سطح کے نچلے حصے میں تھی لیکن اس وقت غلط طریقے سے میز اٹھانے سے وہ کھل گئی تھی اور پھر بہت سے کاغذ ادھر ادھر بکھر گئے۔ صوفی نے تختے کو دوبارہ اٹھا کر ایک طرف کھڑا کر دیا۔ اوپر سطح گہری نہیں بلکہ دہری تھی۔ جب کہ بناوٹ سے یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ بہرحال دراز نکل جانے سے کاغذات باہر آ گئے تھے۔ صوفی جھک کر ان کا جائزہ لینے لگا اور پھر اس کے چہرے پر حیرت کے نقوش پھیل گئے۔ شازیہ بھی کاغذات کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے کوئی سوال نہیں کیا تھا لیکن اسے ایک دم یوں محسوس ہوا جیسے صوفی بہت زیادہ جذباتی ہوگیا ہو۔

پھر وہ آہستہ سے کھڑا ہوگیا اور بولا۔

''آؤ شازیہ چلیں۔''

''چھوٹے بابا۔''

''باہر، باہر۔'' صوفی نے کہا اور پھر وہ تیزی سے باہر نکل آئے تھے۔ باہر نکلنے کے بعد وہ اپنی گاڑی کی طرف چل پڑے اور کچھ دیر کے بعد گرین ہاؤس میں داخل ہوگئے۔ شازیہ جانتی تھی کہ اگر بتانے والی کوئی بات ہوتی تو صوفی اسے ضرور بتاتا۔ ان کاغذات کے بارے میں اسے خود بھی تجسس تھا۔ لیکن بہرحال وہ خاموش ہی رہی۔

♥......♥......♥

جمشید مرزا نے صوفی کی ہدایت کے مطابق کام کیا تھا۔ بہرحال صاحب حیثیت اور صاحب اختیار تھا۔ کسی اخبار میں کوئی تفصیل چھپوا دینا کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ چنانچہ دوسرے دن کے اخبار میں وہ پوری خبر آ گئی تھی اور اس آدمی کا حلیہ بھی شائع کیا گیا تھا۔ ایک پراسرار اور دلچسپ کہانی تھی۔ جمشید مرزا نے بڑے سخی انداز میں کہا۔

''میں نے تعمیل حکم کی ہے صوفی صاحب یہ کام میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ اب آگے بتائیے کیا کروں۔''

''بس آنکھیں کھلی رکھیے گا۔ درویشوں کی دعاؤں سے اور ہو سکے تو قوالی کروا دیجیے گا۔ برکت ہی برکت ہوتی ہے۔''

''مگر نادر حیات صاحب جو میری قوالی کیے دے رہے ہیں اس کا کیا کروں۔''

''صبر کرنے سے فائدے ہی فائدے ہوتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے کہا اور فون بند کر دیا۔ پھر چند ہی لمحوں کے بعد اسے کرنل رحیم شاہ کا فون موصول ہوا۔

''صوفی صاحب کیا کر رہے ہیں۔''

''صوفی صاحب تو اس وقت کچھ بھی نہیں کر رہے درویشوں کی دعاؤں سے [illegible]''

"وہ شاہ میر صاحب نے فوراً ہم دونوں کو بلایا ہے۔ بہت بے چین نظر آتے ہیں۔"

"ڈاکٹر کے بجائے ہمیں بلایا ہے۔"

"گھر پر جانا ہے بہت بڑی شخصیت ہیں۔ گھر پر بلانے کا مقصد یہی ہے کہ وہ ہم سے ہی کچھ بات، چیت کرنا چاہتے ہیں۔"

"خوشی کی بات ہے پھر کیا حکم ہے۔"

"ڈائریکٹ پہنچ جاؤ۔ میں بھی پہنچ رہا ہوں۔"

"جو حکم۔" فون بند کرنے کے بعد صوفی نے تیاریاں کیں۔ اس کا ذہن گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے تیار ہونے کے بعد وہ کاغذات سنبھال کر رکھے اور پھر تیار ہو کر چل پڑا چونکہ شاہ میر صاحب سے ملنے جا رہا تھا اس لیے حلیہ بھی مناسب ہی رکھا۔ البتہ پانوں کی ڈبیہ اور بٹوہ تو اس کے وجود کا ایک حصہ تھا۔ شاہ میر صاحب نے اپنی کوٹھی میں ان دونوں کا استقبال کیا خاصے الجھے نظر آ رہے تھے۔ جب یہ لوگ بیٹھ گئے۔ تو انہوں نے اخبار کرنل رحیم شاہ کی طرف کر دیا۔

"یہ خبر پڑھی آپ نے سائرہ حمید والی۔"

"جی۔"

"یہ تو کمال ہے خاصا الجھ گیا ہوں۔"

"کیا مطلب ہے سائرہ حمید سے آپ کا کیا تعلق۔"

"افوہ تم سمجھتے نہیں میں ان کاغذات کی بات کر رہا ہوں یہ کاغذات کافی عرصے پہلے غائب ہو گئے تھے اور اس سلسلے میں سائرہ حمید کا نام سامنے آیا تھا۔ بس یوں سمجھ لو بہت ہی اہم معاہدے کے کاغذات تھے۔ جو غائب کر دیے گئے تھے۔ سائرہ حمید نامی رقاصہ کو اس سلسلے میں باقاعدہ ملوث سمجھا گیا تھا اور بڑی لے دے ہوئی تھی اس بات پر۔"

"پھر۔"

"کچھ نہیں وہ کاغذات دوبارہ نہیں حاصل ہو سکے البتہ ریکارڈ روم میں صرف ان کی نقل موجود ہے۔ کرنل یہ ذمے داری سو فی صدی مجھ پر آتی ہے۔ بہت سے ایسے معاملات ہوتے ہیں جو ہم سینے میں چھپائے ہوتے ہیں۔ میں نے آج تک ان کاغذات کے بارے میں کوئی سرکاری عمل نہیں کیا۔ لیکن شاید تم یقین نہ کرو۔ کرنل رحیم شاہ اور صوفی صاحب کہ میں سولی پر لٹکا رہتا ہوں۔ کئی بار تو اس قدر ذہنی بے بسی کا شکار ہوا کہ دل چاہا کہ خودکشی کر لوں اگر کبھی اس معاہدے کی کچھ شقیں منظر عام پر آ گئیں تو ذمے داری سو فی صدی مجھ پر ہی عائد ہو گی اور اس وقت میں تمہیں بتاؤں۔ میں ملک کی ایک بڑی شخصیت نہیں بلکہ ایک مجرم قرار دیا جاؤں گا آسانی سے کوئی بھی مجھ پر الزام لگا سکتا ہے کہ خود میں نے اس عظیم معاہدے کو دشمنوں کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"ایک سوال جناب درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"جی، جی پوچھیے...... پوچھیے۔"

"سائرہ حمید سے آپ کا کوئی تعلق رہا ہے۔" صوفی نے کہا اور شاہ میر صاحب کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ پھر انہوں نے کہا۔

"صوفی صاحب آپ میری بات پر یقین کر لیں گے۔"

"جی کر لوں گا۔"

"اتنی آسانی سے۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"وجہ بتائیں گے آپ۔"

"تھوڑی سی اسی کائنات میں جھک ماری ہے۔ درویشوں نے رہنمائی کی ہے ہمیشہ۔ انسان روشن ہوتے رہے ہیں معلومات حاصل ہوتی رہی ہیں۔ آپ کی شخصیت میں سچ ہے یہ میں جانتا ہوں درویشوں کے کرم سے۔"

"آپ کا بے حد شکریہ، یہاں ایک ایسا لمحہ گزرا تھا جب وہ میرے اردگرد چکراتی رہی تھی۔ لیکن بہ خدا میں نے اسے کسی بھی حیثیت سے اپنے ذہن میں جگہ نہیں دی۔ لیکن یہ بات مجھے بہت جلد معلوم ہو گئی کہ کچھ حلقوں میں میری اور اس کی قربت کی کہانیاں سنائی جانے لگی تھیں۔ میں نے اسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ لیکن کم بخت بڑی ڈھیٹ تھی۔ میرے اردگرد چکراتی رہی اور یہ تاثر دیتی رہی کہ وہ مجھ سے متاثر ہے اور وہ میرے زیادہ قریب آنا چاہتی ہے۔ کاغذات اسی دوران گم ہوئے تھے اور اس وقت میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ سائرہ حمید اس معاملے میں کوئی حیثیت رکھتی ہے۔ البتہ کاغذات کی گمشدگی کے بعد میرے ذہن میں اس کا خیال آیا اور میں دنگ رہ گیا۔ لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد وہ قتل کر دی گئی۔ آپ یوں سمجھ لیجیے کہ کاغذات کی گمشدگی کے علم کے بعد شاید ہی کوئی رات ایسی گزری ہو۔ جو میں سکون کی نیند سویا ہوں۔"

"آپ نے ان کی تلاش کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔" صوفی نے سوال کیا۔

"صوفی صاحب ذاتی طور پر میں زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتا تھا۔ آپ خود مجھے بتا دیجیے بس اپنے طور پر ٹامک ٹوئیاں مارتا رہا ہوں۔ تقدیر بعض اوقات ایسے ہی انوکھے کھیل دکھاتی ہے۔"

"اور اگر وہ کاغذات نہ ملے تو کیا ہو گا۔"

"بتا چکا ہوں صوفی صاحب میری عزت خطرے میں پڑ جائے گی بلکہ خطرے میں کیا پڑے گی۔ خدانخواستہ میں اگر ان کاغذات کے لیے کچھ نہ کر سکا تو پھر دو ہی باتیں ہی یا تو ملک چھوڑ کر بھاگ جاؤں گا اور غدار اور وطن فروش کہلاؤں گا۔ جب کہ نہ میں غدار ہوں اور نہ وطن فروش یا پھر دوسری صورت میں مجھے خودکشی کرنا ہو گی۔"

"مگر تعجب کی بات ہے کہ آپ نے کرنل صاحب کے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی کرنل صاحب سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ صوفی نے کہا۔

"بس اتنا باہمت نہیں ہوں میں۔" صوفی نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ کاغذات نکال کر شاہ میر صاحب کے سامنے رکھ دیے۔ شاہ میر صاحب ہی نہیں خود کرنل رحیم شاہ بری طرح چونک پڑا تھا۔ وہ

پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان کاغذات کو دیکھنے لگا اور پھر شاہ میر صاحب کی آواز ابھری۔

''یہ...... یہ...... یہ کیا ہے۔''

''دیکھ لیجیے درویشوں کی دعاؤں سے لیکن ایک شرط ہے شاہ میر صاحب آپ کو اپنی اس کوٹھی میں قوالیاں کرانی پڑیں گی۔'' صوفی نے اتنا ہی کہا تھا کہ شاہ میر نے ان کاغذات پر جھپٹا مارا اور پھر ان کا بدن کپکپانے لگا۔ حلق خشک ہوگیا۔ ان کے منہ سے آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ کرنل رحیم شاہ نے فوراً ہی سامنے پڑے ہوئے جگ سے پانی کا ایک گلاس نکالا اور ان کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا۔

''سنبھالیے شاہ میر صاحب اپنے آپ کو۔'' شاہ میر نے پانی کا گلاس خالی کر دیا۔ ان کا پورا چہرہ پسینے میں ڈوب گیا تھا۔''

''نہیں میں کہہ رہا ہوں خود کو سنبھالیے۔''

''کاغذات...... یہ...... یہ کہاں سے آ گئے۔''

''مم...... مم...... میرے کوٹ کی جیب سے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''صوفی صاحب یہ پلیز...... یہ آپ نہیں سمجھتے ان میں تو میری زندگی چھپی ہوئی ہے، آپ نے مجھے زندگی دی ہے۔ یہ آخر...... یہ آپ کو کہاں سے مل گئے۔''

''شیر خان صاحب کی کوٹھی کے نچلے حصے میں بنے ہوئے تہ خانے میں ایک میز کی دراز سے۔''

''خدا کی پناہ...... خدا کی پناہ۔'' شاہ میر نے کہا اور اس کے بعد وہ ان کاغذات کو دیکھتے رہے۔ صوفی نے کسی قدر ناخوش گوار لہجے میں کہا۔

''مجھے ان کاغذات کی اہمیت نہیں معلوم تھی حالانکہ اگر کوئی ایسا مسئلہ تھا تو میرے علم میں آنا چاہیے تھا۔ لیکن کبھی کبھی کرنل رحیم شاہ صاحب ایک عجیب سا احساس ہوتا ہے دل میں۔'' کرنل رحیم جو خود بھی بہت زیادہ متاثر نظر آ رہا تھا۔ صوفی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا صوفی صاحب۔''

''یہی کہ خلوص کہیں نہیں ملتا۔ آپ جتنا چاہیں کسی سے مخلص ہو جائیں۔ اپنی اہمیت اور اپنی بڑائی کا احساس ہر ذہن میں باقی رہتا ہے، بس اور کیا کہا جائے۔''

''نہیں صوفی صاحب آپ ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کیجیے یہ ایک ایسا اہم راز تھا جس پر میری زندگی کا دارومدار ہے میں کیسے آپ کو اس کے بارے میں تفصیل بتا دیتا اگر غور کریں گے تو میری بے گناہی آپ کی سمجھ میں آ جائے گی آپ نے اتنا بڑا احسان کیا ہے مجھ پر بس یہ سمجھ لیجیے کہ آپ نے مجھے ایک نئی زندگی عطا کر دی ہے اور اس کے لیے صرف میں ہی نہیں میرا پورا گھرانہ آپ کا شکر گزار ہے۔ آپ نے ان سب کو دوبارہ عزت کی زندگی دے دی ہے۔ میں کیا کہوں۔ شاہ میر صاحب بہت زیادہ ممنون کرم تھے وہ بار بار کاغذات دیکھے جا رہے تھے۔ پھر دفعتاً انہوں نے کہا۔

''صوفی صاحب اس میں دو صفحات موجود نہیں ہیں۔ یہ کاغذات نامکمل ہیں۔''

''جس جگہ سے یہ کاغذات برآمد ہوئے تھے۔ وہاں ان کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔''

''اب بھلا میں آپ سے کیا چھپاؤں گا آپ یوں سمجھ لیجیے کہ اگر وہ دو شقیں کسی کے ہاتھ لگ گئیں تو ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔ ہمارے لیے وہ دو صفحات بڑے کام کے ہیں۔ اگر وہ کسی کے ہاتھ لگ گئے۔ تو بڑی مشکل پیش آ جائے گی۔''

''میں جانتا ہوں جناب! کاغذات سے فائدہ اٹھانے سے پہلے ہی وہ قتل کر دیا گیا۔''

''کک...... کون؟'' کرنل رحیم شاہ اور شاہ میر جلدی سے بولے۔

''میں شیر خان کی بات کر رہا ہوں یہ دونوں شقیں ان کے پاس بھی نہیں تھیں۔''

''ہاں، ہوسکتا ہے بالکل ہوسکتا ہے۔''

''اچھا ایک بات بتایئے۔'' صوفی نے کہا۔

''ہاں بولو۔''

''یہ بتایئے شاہ میر صاحب آپ کی اور بریگیڈیئر شیر خان کی ملاقاتیں ہوتی تھیں میرا مطلب آپ کے اور ان کے درمیان شناسائی تھی۔''

''گہری شناسائی...... گہری شناسائی۔ جو کچھ آپ کہنا چاہتے ہیں ناں صوفی صاحب میں خود بھی اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔''

''کیا؟''

''اب آپ سے کیا چھپانا، سائرہ حمید شیر خان ہی کے ذریعے مجھ تک پہنچی تھی۔'' شاہ میر صاحب نے گہری سانس لے کر کہا اور صوفی بے اختیار جیب میں پانوں کی ڈبیہ اور بٹوہ تلاش کرنے لگا۔ پھر ایک دم سنبھل گیا۔

''نہیں آپ پان کھا سکتے ہیں۔''

''شش...... شش شکریہ درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے کہا اور پانوں کی ڈبیا نکال کر سامنے رکھ لی۔ پھر اس نے بڑے اہتمام سے گلوری منہ میں رکھی چھالیہ اور تمباکو کو پھانکا قوام چاٹا اور اس کے بعد ڈبیہ شاہ میر صاحب کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔

''نوش فرمایئے۔''

''نہیں میں نے زندگی میں کبھی پان نہیں کھایا۔''

''اوہ، حالانکہ پان ذہن کے دروازے کھولتا ہے۔ دماغ کے ہر شعبے کو منور کرتا ہے۔ شعور، لاشعور تحت الشعور اور اس کے بعد دماغ کی ہر سطح درویشوں کی دعاؤں سے جہاں تجسس آمیز سوالات پیدا ہوتے ہیں اور یہ بارہ نمبر کا قوام اور زردہ بس آپ یوں سمجھ لیجیے کہ کسی خوش ذوق حسینہ کا اسکرٹ بلاؤز ہوتا ہے۔ جس کی میچنگ اگر درست نہ ہو تو سب کچھ چوپٹ ہو جائے درویشوں کے کرم سے۔ کرنل رحیم شاہ اور شاہ میر حیرت سے صوفی کو دیکھتے رہے تھے۔ صوفی کے منہ سے آواز نکلی۔

''حق اللہ...... حق اللہ'' اور اس کے بعد اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ شاہ میر کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ بہرحال بہت بڑی شخصیت تھی۔ ان کے سامنے تو بڑے بڑے لوگ اتنے ادب سے بیٹھا

کرتے تھے کہ سانس تک بے ترتیبی سے نہ لی جائے۔ لیکن صوفی اس وقت بے خود ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور گردن جھکی ہوئی تھی۔ پھر یہ گردن آہستہ آہستہ ہلنے لگی وہ جھومنے لگا تھا۔ خاموشی اس قدر طویل ہوگئی تھی کہ خود کرنل رحیم شاہ جی بے چین نظر آنے لگا۔ شاہ میر نے اشارے سے پوچھا کہ یہ صوفی کو کیا ہوا کرنل رحیم شاہ نے شانے اچکا دیے۔ جب اس خاموشی کو تین سے چار منٹ گزر گئے تو کرنل رحیم شاہ ہی نے صوفی کو پکارا۔

''صوفی صاحب۔''

''حق اللہ۔'' صوفی کے منہ سے نکلا وہ تو شکر تھا کہ پان کی پیک ابھی بہت زیادہ نہیں بنی تھی ورنہ نہ جانے کیا ہو جاتا صوفی نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔

''حق اللہ، حق اللہ۔'' پھر اس نے مڑ کر دیکھا قریب ہی ایک بہت خوب صورت گلدان رکھا ہوا تھا۔ اس نے گل دان اٹھایا اس کے پھول گلدان سے نکالے اور گلدان میں پیک تھوک دی۔ شاہ میر صاحب اور کرنل رحیم شاہ کا منہ بن گیا تھا۔ شاہ میر صاحب کی ناک سکڑ گئی۔ صوفی نے بڑے اطمینان سے پھول گلدان میں دوبارہ لگائے کرنل رحیم شاہ نے معذرت طلب نگاہوں سے شاہ میر کو دیکھا۔ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ صوفی بولا۔

''اس کے بارے میں مجھے تفصیل سے بتایئے۔ ضروری ہے شاہ میر صاحب۔''

''کس کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ کہاں کھو گئے تھے آپ صوفی صاحب!''

''کہیں نہیں کھوئے تھے درویشوں کی دعاؤں سے حقیقتوں کی جانب سفر کر رہے تھے اور حقیقتیں درویش منکشف کر رہے تھے۔ مجھے اس عورت کا پتا چاہیے شاہ میر صاحب، جس نے آپ کی اور شیر خان کی دوستی کرائی تھی۔'' شاہ میر صاحب ایک لمحے کے لیے ہونق سا ہو گیا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے صوفی اور پھر کرنل کو دیکھا اور بولا۔

''یہ کیا ہو گیا انہیں اچھے خاصے تھے۔''

''حق اللہ...... حق اللہ...... حق اللہ...... اللہ ہو...... اللہ ہو...... اللہ ہو......'' صوفی زور زور سے گردن جھٹکنے لگا۔ کرنل رحیم شاہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''صوفی صاحب! یہ کیا...... یہ کیا ہو گیا۔ سنبھالیے اپنے آپ کو......''

''ٹھیک ہے سنبھالے لیتے ہیں۔ آپ کے حکم سے لیکن آپ یہ سمجھ لیجیے کہ کام کی بس وہ دو ہی شقیں تھیں اگر وہ ضرورت مندوں کے ہاتھ لگ گئیں۔ تو آپ جانیے اور آپ کا کام میرا خیال ہے اس کے بعد شاہ میر صاحب کے لیے خودکشی سب سے زیادہ موزوں رہے گی۔''

''آپ کیا کہہ رہے ہیں صوفی صاحب! آپ کو شاہ میر صاحب کا رتبہ پتا ہے۔''

''درویشوں کا رتبہ ان سب سے اونچا ہے۔ ہمیں اجازت دیجیے آپ لوگ بیٹھیے۔'' صوفی نے کہا۔

''آخر ہوا کیا ہے آپ بتایئے تو صحیح کچھ۔''

''اس عورت کا پتا جس نے شاہ میر صاحب اور شیر خان کو قریب کیا تھا۔ اگر اس کا پتا نہ ملا تو سمجھ لیجیے میں ان ساری چیزوں سے دست بردار ہو گیا اور درویشوں کے کرم سے۔''

''یہ کیا لگا رکھا ہے آپ نے۔'' شاہ میر نے طیش میں آ کر کہا۔

''خدا حافظ اور معافی چاہتے ہیں آپ سے گستاخی کی۔'' صوفی نے کہا اور پلٹ کر دروازے کی طرف چل پڑا۔

''رکیے صوفی صاحب رکیے۔ میں کہتا ہوں رک جایئے۔ کرنل رحیم شاہ نے کہا اور صوفی کرنل کی طرف مڑ کر بولا۔

''ہمارے درمیان صرف دوستی کا رشتہ ہے صاحب! آپ نے پیار محبت سے بلایا ہم آ گئے۔ حکم نہ دیجیے گا درویشوں کے علاوہ ہم کسی کا حکم نہیں مانتے اس کے بعد شاید ہماری ملاقات کبھی نہ ہو۔''

''ارے ارے آپ بلاوجہ اس حد تک ناراض ہو گئے ہیں صوفی صاحب! بات ایسی نہیں ہے۔ آیئے۔ پلیز بیٹھ جایئے۔''

''آپ کی اور شیر خان کی دوستی کیسے ہوئی تھی؟'' صوفی نے وہیں کھڑے کھڑے سوال کیا۔

''میں بتائے دیتا ہوں۔ بتا دیتا ہوں سب کچھ۔ آپ...... واقعی کمال شخصیت ہیں۔ کرنل رحیم شاہ معافی چاہتا ہوں میں۔ بس انسان اپنی کمزوریوں کو چھپاتا ہے۔ ہاں شیر خان کی رنگین مزاجی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ وہ لڑکی بھی بس اسی طرح میرے قریب آئی تھی۔ یعنی سائرہ حمید لیکن اسے میں نے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ جہاں تک شیر خان کی میرے قریب آنے کی بات ہے تو میں نے غلط کہا تھا کہ میری اس کی قدیم دوستی تھی ہمارے درمیان دوستی کی ایک اور شخصیت ذمے دار تھی۔''

''نام؟''

''روزانہ پارکر۔''

''پتا؟''

''پاسٹ اسٹریٹ نمبر 11۔'' صوفی نے جیب سے نوٹ بک نکال کر یہ دونوں نام لکھے اور کرنل رحیم شاہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

''اگر آپ تشریف رکھنا چاہیں تو رکیے۔ ہم چلتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔'' کرنل رحیم شاہ نے شاہ میر کی طرف دیکھا تو شاہ میر نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''تم بیٹھو۔ صوفی صاحب کو جانے دو۔'' صوفی سلام کر کے باہر نکل گیا تھا۔

♥......♥......♥

معشوق نشیلے کا معاملہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ قبرستان میں وظیفہ پڑھنے گئے تھے مگر پتا نہیں وہ کم بخت کہاں سے مل گیا تھا۔ بہر حال اس بات سے ذرا سے مطمئن ہوئے تھے کہ بات صوفی کے کام کی تھی۔ صوفی سے ضرورت سے زیادہ ہی محبت ہو گئی تھی۔ ہر مشکل کا حل اس کے پاس مل جاتا تھا لیکن جس مشکل میں وہ اس وقت گرفتار تھے۔ وہ بڑا مشکل کام تھا اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ بہر حال ممن خان کے ہوٹل پہنچ گئے۔ قدوس بیگ سے وہیں ملاقات ہوا کرتی تھی۔ بس ایسے ہی حرام خور قسم کے آدمی تھے۔ نکمے اور ناکام حالانکہ بیوی بچے والے آدمی تھے۔ لیکن ایسے لوگوں کے بیوی بچے بھی بس فاقہ کشی ہی کرتے ہیں جاننے والے مدد کر دیا کرتے تھے۔ صوفی نے کئی بار نوکری لگوانے کے لیے کہا تھا لیکن ان کا نظریہ یہی تھا کہ اللہ دے کھانے کو

تو بلا جائے کمانے کو اس وقت بھی وہیں بیٹھے ہوئے چائے سڑپ رہے تھے کہ معشوق نشیلے پہنچ گئے۔

''اخاہ...... وہ جو کہتے ہیں نا کہ شیطان کو یاد کرو اور شیطان حاضر ابھی تھوڑی دیر پہلے من
سے یہی بات ہو رہی تھی کہ معشوق نشیلے کی دال گلی یا نہیں۔''

''دال چڑھی ہی نہیں تو گلے گی کہاں سے۔''

''کیا مطلب؟''

''یار! گڑبڑ ہوگئی۔ تمہارے کہنے کے مطابق وظیفہ پڑھنے کے لیے گیا تھا۔ مگر وہاں ایک کم بخت
مل گئی۔ بس یوں سمجھ لو کہ زندگی ہی بچ گئی۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی خونی یا قاتل ہے۔ خنجر بکف تھا۔''

''خدا کی پناہ۔ خدا کی پناہ۔ پھر کیا ہوا؟''

''بھاگ آیا بھائی! پھر ہوتا کیا۔ جان تو نہیں دینی تھی۔''

''بس یہی تو غلط کیا تم نے۔ چھوڑو یار! عشق صادق نہیں ہے عشق صادق ہوتا ہے تو زندگی
وقعت ہو جاتی ہے۔ بھلا ڈر خوف سے کیا تعلق۔ حقیقت کھل گئی۔ نشیلے صاحب وہ بے چاری بے گناہ آپ
جیسے بے قدر کے ہاتھوں نہ ہی لگے تو اچھا ہے۔''

''اماں، کیا کہہ رہے ہو۔ یہاں جان پر بنی ہوئی ہے۔ دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہے
اس کے اندر کوئی لچک نہیں پائی جاتی اور آپ دل توڑ رہے ہیں ہمارا۔''

''میاں! ہمت سے کام لینا پڑتا ہے۔''

''مگر اب تو بتاؤ کیا کریں۔''

''نہیں مجھے لگتا ہے کہ یہ تمہارے بس کی بات ہے نہیں۔ نہیں کر پاؤ گے ننھے!...... نہیں کر پاؤ گے۔''

''تو پھر کیا کروں؟''

''زندگی کی بازی لگانی پڑتی ہے کوئی معمولی بات نہیں ہے کیا سمجھے ہم پڑھ دیں گے وظیفہ تمہارے
لیے لیکن صاف صاف کہے دیتے ہیں۔ کوئی کام بغیر پیسوں کے نہیں ہوتا سوا پانچ ہزار روپیہ خرچ ہو جائیں
گے۔ دو چار سو ہمارے ہوں گے باقی تم یہ سمجھ لو کہ اپنے گرد جو حصار قائم کرنا ہوگا۔ اس پر خرچ ہوں گے۔
جانے کہاں کہاں کیا کیا کچھ کرنا ہوتا ہے۔''

''سسس سوا پانچ ہزار۔''

''اماں کیا دوبئی میں جھک مارتے رہے تھے زندگی بھر۔ سوا پانچ ہزار نہیں خرچ کر سکتے۔ نہ خرچ
کرو بھائی! ہم مانگ تو نہیں رہے تم سے خلوص دل سے بتا دیا تھا وظیفہ کامیابی یا ناکامیابی تمہارا مقدر ہاں اگر
ہم نے پڑھا تو بے فکر رہو کام ہونا ہی ہونا ہے۔''

''تو پڑھ دو قدوس بھائی! پیسوں میں کچھ کمی بیشی کر لو۔''

''دماغ خراب ہو رہا ہے کیا۔ کوئی بنیے کی دوکان تو نہیں لگائی ہم نے کہا، کہ خود ہمارے ہاتھ تو
تین سو روپے ہی لگیں گے باقی حصار وغیرہ بنانے میں کام آئیں گے تمہیں کیا پتا زعفران آج کل کیا تولہ ہے
ڈھائی ہزار روپے تولہ سمجھے اور ہمیں چاہیے تقریباً ڈیڑھ تولہ زعفران اور اس کے بعد دوسری کئی قیمتی چیزیں۔''

''دے دوں گا دے دوں گا تم شروع تو کرو۔''

''دماغ خراب ہے نا میرا کہ بغیر لات کے وہاں جا بیٹھوں اور اس کے بعد اس شیطان کا خنجر
میرے سینے میں اتر جائے۔ نہیں بھائی! ایک بار خود تم یہ برائی کر لو۔''

''مم...... میں خدا کی قسم اب وہاں کا رخ نہیں کروں گا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے خرچہ کرو۔''

''دے دوں گا نا یار! کل لے لینا۔''

''بھائی! پہلے اس کے آس پاس کے کام کرنا ہوں گے۔''

''بینک سے نکالنے ہیں پیسے۔''

''تو چیک دے دو مجھے میں خود نکال لوں گا۔''

''چیک بک تو اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔''

''تو بس پھر کل آ جاؤ۔''

''میں رات کو آ جاؤں گا۔''

''تو اور اچھی بات ہے۔'' مرزا قدوس بیگ نے کہا۔ معشوق نشیلے اسی رات وہ رقم لے کر پہنچ
گئے۔ تو مرزا قدوس بیگ کہنے لگے۔

''ٹھیک ہے۔ تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کوئی دوست ملا تھا وظیفے پڑھنا بھی کوئی عام لوگوں کا کام نہیں
ہے۔ بڑا دل گردہ چاہیے۔ موکل ڈراتے ہیں۔''

''ہاں وہ تو مجھے معلوم ہے۔'' معشوق نشیلے نے افسردگی سے کہا۔ رقم تو تھی ان کے پاس اچھی
خاصی مگر پائی پائی دانتوں سے پکڑ کر خرچ کرتے تھے۔ جانتے تھے کہ دوبارہ یہ رقم ہاتھ نہیں آئے گی اور پھر اگر
حسینہ تیار ہو بھی گئی تو ہو سکتا ہے کہ الگ گھر کا بندوبست کرنا پڑے بہر حال رقم دے کر واپس آ گئے۔ مرزا
قدوس بیگ نے کہہ دیا تھا کہ کام تین دن میں مکمل ہو جائے گا۔ چوتھے دن وہ خود اظہار عشق کر دے گی۔ یہ
تین دن معشوق نشیلے نے جیسے گزارے تھے ان کا دل ہی جانتا تھا۔ چوتھے دن کا انتظار تھا اس دن صوفی کے
بنگلے پر ہی رہے تھے۔ صبح ہی صبح اٹھ کر لان پر نکل آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد حسینہ بھی نظر آئی تھی۔ اسی طرف آ
رہی تھی معشوق نشیلے کا دل باہر نکلنے لگا پھر وہ اچانک ہی حسینہ کے سامنے آئے تھے۔ تصور یہ تھا کہ وہ مسکرائے
گی۔ آنکھوں میں محبت پیدا کرے گی اور ان سے پیار بھری باتیں کرے گی۔ لیکن اچانک باہر نکلنے تو حسینہ سہم
کر چیخ پڑی۔ پھر اس نے معشوق نشیلے کا چہرہ دیکھا اور اس کا چہرہ بھیانک ہو گیا۔

''خدا کرے کیڑے پڑیں تیرے سارے بدن میں کم بخت منحوس مارے۔ صبح ہی صبح تیری صورت
دیکھ لیتی ہوں تو سارا دن بھوک پیاس میں گزرتا ہے۔ تیرا بیڑا غرق بتاتی ہوں تجھے بڑی شرارتیں کر رہا ہے
بڈھے۔'' حسینہ کے ہاتھ میں جھاڑو تھی وہ کیاریوں کی صفائی کرنے کے لیے نکلی تھی اس نے پہلے تو جھاڑو
معشوق نشیلے پر پھینک ماری۔ جو اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ جھاڑو منہ پر پڑی۔ پھر حسینہ ان کی طرف
دوڑی تو معشوق نشیلے نے چھلانگ لگا دی۔ حسینہ نے جھاڑو اٹھائی اور گیٹ تک معشوق نشیلے کو دوڑاتی چلی آئی۔

معشوق نشیلے گیٹ سے بھی باہر نکل بھاگے تھے۔ کافی دور جا کر انہوں نے دم لیا اور ایک جگہ کھڑے ہو کر کھجانے لگے۔

''ابے...... قدوس بیگ! یہ تو کچھ بھی نہیں ہوا ابھی تک۔ بیٹا! سوا پانچ ہزار روپے دیے ہیں اگر کام نہ ہوا تو جو کچھ ہوگا وہ تجھے بتاؤں گا۔ پھر وہ گھر واپس نہیں گئے تھے بلکہ سیدھے ممن خاں کی گلی کی جانب چل پڑے تھے۔ راستے بھر دل ہی دل میں جلتے بھنتے رہے تھے۔ یہ بھی سوچا تھا کہ تین دن کے وظیفے کے بعد شاید مزید کچھ وقت لگتا ہو کام ہونے میں لیکن اس کے بارے میں قدوس بیگ ہی بتا سکتے تھے۔ ہانپتے کانپتے ممن خان کی گلی میں داخل ہوئے تھے اور پھر ہوٹل پہنچ گئے تھے۔ اس وقت اتفاق سے زیادہ لوگ تھے۔ ممن خان بھی مصروف تھے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ لیکن قدوس بیگ کا کہیں پتا نہیں چل سکا تھا۔ ایک میز پر جا بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ممن خان کو فراغت حاصل ہوگئی تھی۔ وہ معشوق نشیلے کے پاس آگئے اور مسکرا کر بولے۔

''ہاں بھئی۔ عشق آج کل کون سی ڈگری پر چل رہا ہے۔''

''اماں تقدیر کے فیصلے ہیں ابھی تک کچھ کام نہیں ہوا یہ قدوس بیگ نظر نہیں آرہے۔''

''ارے ہاں۔ بے چارے سسرال گئے ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے تین دن ہوگئے گئے ہوئے کہہ کر گئے تھے کہ اب ذرا اطمینان ہی سے آئیں گے۔''

''کیا؟'' معشوق نشیلے اچھل کر کھڑے ہوگئے۔

''ارے ارے۔ بیٹھو اچھل کیوں رہے ہو۔''

''قق...... قق...... قدوس بیگ۔''

''ہاں ہاں...... یہ قق...... قق کیا ہے۔'' ممن خان نے کہا۔

''سس سسرال گئے ہیں۔''

''ابے بھائی! اپنی سسرال گئے ہیں تمہاری تو نہیں گئے۔''

''چچ...... چوٹ دے گئے۔ چچ...... چوٹ دے گئے۔''

''کیا مطلب؟'' ممن خان نے حیرت سے پوچھا۔

''پانچ ہزار روپے لے گئے ہیں سوا پانچ ہزار...... پانچ ہزار دو صد پچاس...... پورے پانچ ہزار دو سو پچاس۔''

''کیا مطلب؟''

''کہہ رہے تھے کہ وظیفہ پڑھیں گے۔ دو تین سو روپے خود پر خرچ کریں گے۔ باقی کی لاگت لگائیں گے۔ میرے کام کے لیے وظیفہ پڑھیں گے۔ میری محنت کی کمائی میں سے سوا پانچ ہزار لے گئے جب وظیفہ پڑھنا تھا سسرال کیوں گئے۔''

''ایں......'' ممن خان کا منہ بھی حیرت سے کھل گیا۔ بہت دیر تک خاموش رہے پھر بولے۔

''قدوس بیگ ایسے ہو سکتے ہیں ایسے تھے تو نہیں پچھلے دنوں سے گھر والی تنگ کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی میکے جانا ہے پریشان تھے بے چارے کچھ کرتے دھرتے تو ہیں نہیں۔ یہ تو تمہیں معلوم ہے۔ معشوق

مجھ سے کہہ رہے تھے کہ تھوڑے بہت کرائے کے پیسے دے دو۔ مگر میں تمہیں سچ بتاؤں تین دفعہ انہیں پیسے دے چکا ہوں۔ میں بھی غریب آدمی ہوں اب اتنے تو نہیں دے سکتا۔ ویسے بھی ہر طرح مدد کرتا رہتا ہوں۔ نقد رقم تین دفعہ دی ہے ایک دفعہ بارہ سو دیے تھے۔ ایک مرتبہ پانچ سو دوسری مرتبہ پانچ سو واپسی کا کیا تصور ہے۔ پچھلے دنوں سے بیوی تنگ کر رہی تھی کہ میکے جاؤں گی خود بھی پریشان تھے کہہ رہے تھے ممن خان کہیں سے بندوبست ہو ہی نہیں پا رہا۔ بس اچانک ہی سامان باندھا اور چل پڑے۔ مجھ سے کہنے آئے تھے کہ سسرال جا رہا ہوں۔ کچھ دن لگ جائیں گے۔ واپسی میں ذرا آرام ہی سے آؤں گا۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہارے پیسے لے کر رفو چکر ہوگئے۔''

''انتڑیاں نکال لوں گا قسم اللہ کی۔ میری محنت کی کمائی کھانا آسان بات نہیں ہے۔ ارے ممن خان دیکھو تو اس دنیا کو لوگ کس طرح محبتوں کی چٹنی بنا دیتے ہیں۔ یہاں اس گلی میں تو صرف ایک دوسرے سے محبت کرنے والے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی آجاتے ہیں ہمارے درمیان۔ پر چھوڑوں گا نہیں قسم ایمان کی میرا نام بھی معشوق نشیلے ہے فارسہ میں ماروں گا ایسا فارسہ ماروں گا کہ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔ واہ ری میری پھوٹی تقدیر سالی کالی کلوٹی کے نخرے آسمان پر پہنچے ہوئے ہیں۔ ارے سمجھتی کیا ہے خود کو دو کوڑی کا کرکے رکھ دوں گا آجائے ذرا ایک بار میرے قابو میں بتاؤں گا اسے کہ معشوق نشیلے کیا چیز ہیں۔'' معشوق نشیلے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''بیٹھو...... بیٹھو...... چائے منگوائی ہے۔''

''کچھ نہیں پیوں گا قسم اللہ کی خون پی رہا ہوں اپنا اندر ہی اندر سے۔'' معشوق نشیلے نے کہا۔ ممن خان اسے دیکھتے رہ گئے لیکن معشوق نشیلے کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ ہوٹل سے نکلے گلی میں آئے اور پھر گلی ہی سے باہر نکل گئے۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ سیدھے قدوس بیگ کی سسرال پہنچیں۔ مگر سسرال کا پتا تو ان کے پاس تھا ہی نہیں کسی کو بھی نہیں معلوم ہوگا بے کار تھا پوچھنا۔ سڑک پر نکل آئے اور آوارہ گردوں کی طرح مارے مارے پھرتے رہے۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ باہر گھومتے رہے۔ دل و دماغ بے سکون تھے۔ غم کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔ ایک فٹ پاتھ کی سڑک سے گزر رہے تھے۔ تو زمین پر کتابوں کا ڈھیر نظر آیا ایک کتاب پر نگاہ پڑی۔ لکھا ہوا تھا محبوب کے دل میں اترنے کا طریقہ ایک دم سے رک گئے۔ اٹھا کر کتاب دیکھی اور بیچنے والے سے پوچھا۔

''کتنے کی ہے؟''

''ویسے تو ڈیڑھ سو روپے کی ہے صاحب! آپ سے اسی روپے لے لوں گا۔''

''پچاس روپے ہیں میرے پاس دینا چاہو تو دے دو۔''

''لے لیجیے۔ باقی بیس روپے کبھی بعد میں دیتے جایئے۔'' کتاب والے نے کاروباری گر میں کہا۔

''پچاس روپے۔ بعد میں ایک پیسہ نہیں دوں گا یہ میں نے بتا دیا ہے۔''

''تو لے جایئے بھائی! ناراض کیوں ہو رہے ہیں۔'' پچاس روپے دے کر کتاب اٹھا لی پھر کسی جگہ بیٹھ کر پڑھنے کا سوچا ایک چھوٹا سا پارک سامنے نظر آیا۔ وہاں جا بیٹھے اور کتاب پڑھنے لگے۔ سامنے ایک

پٹھان لڑکا چائے کے برتن لے کر جا رہا تھا انہیں خیال آیا کہ صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں
لڑکے سے چائے طلب کی اور کہا کہ کچھ بسکٹ وغیرہ بھی لے آئے۔ پھر وہ کتاب پڑھنے لگے جیسے جیسے
کتاب کے صفحات طے کرتے جا رہے تھے۔ ان کے چہرے پر اطمینان کی لہریں بکھرتی جا رہی تھیں۔ ہونٹ
پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ چائے بسکٹ ختم کیے چائے والے کو پیسے دیے۔ کتاب کو سینے میں چھپایا اور اپنی
سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی کام کا گر مل گیا ہے۔"

♥......♥......♥

پاسٹ اسٹریٹ کے فلیٹ نمبر 11 کے دروازے پر رک کر صوفی نے ادھر ادھر کا جائزہ لیا فلیٹوں
ایک طویلہ سلسلہ تھا اور راہ داری سنسان پڑی ہوئی تھی۔ ویسے فلیٹ بہت اعلیٰ درجے کے تھے۔ چند لمحے انتظ
کرنے کے بعد صوفی نے کال بیل پر انگلی رکھ دی اندر کہیں گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ کوئی دو منٹ کے ب
دروازے کے قریب آہٹ ہوئی ایک ادھیڑ عمر عورت نے دروازہ کھولا تھا۔ اس نے سر سے پاؤں تک صوفی
دیکھا اور سرد لہجے میں بولی۔

"کیا بات ہے۔"

"سلام عرض کرتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"ابھی معاف کرو اللہ بھلا کرے گا۔" عورت نے کہا اور دروازہ بند کرنے لگی لیکن صوفی نے آ
بڑھ کر دروازے میں پاؤں اڑا دیا تھا۔

"میری بات تو سنیئے گا۔ پتا نہیں آپ مجھے کیا سمجھے ہیں درویشوں کے کرم سے۔"

"بابا میں تمہارے کو بولا نا معاف کردو۔ یہ بھیک مانگنے کا طریقہ ہے کہ پاؤں گھسیڑ دیا
پولیس کو بلائے گا تو تمہیں پتا چلے گا۔"

"بب...... بھیک توبہ توبہ کیا فرما رہی ہیں آپ۔ میں میڈیم روزانہ پارکر سے ملنا چاہتا ہوں۔"
وہ گھر پر موجود نہیں ہیں۔"

"ارے تو ایسا بولو نا بابا! آپ تو پتا نہیں کیا بولتا ہے۔ پیش کرنا، پیش کرنا۔ ابھی میرے کو نہیں معلو
کہ آپ ان سے ملنے کو آیا۔ سوری میں معافی مانگتا۔ ابھی ادھر رکو کیا بولوں ان کو، کون آیا ہے۔" درو
کھولنے والی کسی قدر شرمندہ نظر آنے لگی تھی۔

"آپ ان سے فرمائیے گا کہ صوفی صاحب آئے ہیں۔" دروازہ کھولنے والی عورت صوفی صا
کی گردان کرتی ہوئی۔ اندر چلی گئی اور صوفی انتظار کرتا رہا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ واپس آئی اور بولی۔

"آیئے۔" اندر داخل ہو کر اس نے صوفی کو ایک ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور باہر نکل گئی۔ صو
ایک صوفے پر بیٹھ کر چاروں طرف کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اچانک ہی اس کی نگاہ مینٹل پیس کی جانب اٹھ گ
جہاں ایک تصویر رکھی ہوئی تھی۔ صوفی بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھا اور اس تصویر کے قریب پہنچ گیا۔ اس
تصویر کو دیکھا ایک انتہائی خوبصورت عورت اور ایک خوبصورت آدمی کی تصویر تھی۔ دونوں دولہا دلہن کے لبا
میں تھے۔ بہت ہی حسین جوڑا تھا۔ صوفی چند لمحے اس تصویر کو دیکھتا رہا۔ پھر واپس آ کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔"

ہی لمحوں کے بعد ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ اور اسے دیکھ کر صوفی نے دل ہی دل میں ٹھنڈی سانس لی۔
تصویر والی عورت ہی تھی وہ چہرے سے غم زدہ نظر آتی تھی آنکھوں میں غم کی پرچھائیاں تھیں۔ اس نے مدھم
آواز میں ہیلو کہا۔

"سلام عرض کرتا ہوں۔"

"پلیز فرمائیے۔ مجھ سے کیا کام ہے آپ کو۔"

"آپ مس روزانہ پارکر ہیں۔"

"مس نہیں۔ میں شادی شدہ ہوں۔"

"اوہو پارکر آپ کے......"

"نہیں پارکر تو میرے ڈیڈی کا نام ہے۔"

"آئی ایم سوری۔ وہ اصل میں میڈم روزانہ پارکر آپ سے کچھ ضروری کام تھے۔"

"جی فرمائیے۔"

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ محکمہ داخلہ کے ایک اہم شخص مسٹر شاہ میر سے کیا تعلق رکھتی ہیں۔"
روزانہ پارکر کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پھیل گئے اس نے کہا۔

"آپ کس طرح کے آدمی ہیں اور کون ہیں آپ اور ان باتوں کے لیے آپ کو یہاں آنے کی
جرات کیسے ہوئی۔"

"شش...... شاید طریقہ کار میں کچھ غلطی ہوگئی۔"

"دیکھیے۔ میں بہت شریف عورت ہوں۔ فضول قسم کے لوگوں کو میں ایک لمحے برداشت نہیں
کرسکتی۔ اس سے پہلے کہ آپ کو یہاں پر کچھ نقصان پہنچ جائے۔ میں آپ کو ایک اچھا مشورہ دیتی ہوں کہ
آپ فوراً یہاں سے نکل جایئے۔"

"وہ بات دراصل یہ ہے۔"

"کوئی بات دراصل نہیں ہے۔ آپ جاسکتے ہیں۔"

"مم...... مگر......"

"میں پوچھتی ہوں کہ آپ آخر ہیں کون؟"

"فدی کو صوفی کے نام سے مخاطب کیا جاتا ہے۔"

"ہاں۔ یہ میری ملازمہ نے بتایا تھا مجھے۔ آپ کون ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں اور کیوں آئے
ہیں؟ میں تو آپ سے یہ بھی نہیں پوچھوں گی۔ میں ان دنوں جو زندگی گزار رہی ہوں۔ اس میں، میں ہوں اور
میری تنہائیاں ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی بھی میرے پاس آئے آپ جایئے پلیز پلیز جایئے۔" وہ جھلائے
ہوئے انداز میں باہر نکل آئی۔ اور صوفی گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور
وہاں سے باہر نکل آیا۔ اصل میں روزانہ پارکر کو ایک نگاہ دیکھنا تھا اسے اپنے قابو میں لانے کے لیے کوئی خاص
طریقہ کار اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ وہاں سے باہر آ گیا۔ اور اس کے بعد گرین ہاؤس کی جانب چل پڑا۔

ذہن میں لاتعداد سوچیں تھیں پھر اسی رات اس نے معشوق نشیلے کو اس وقت چھاپ لیا جب وہ کسی کتاب ورق گردانی میں مصروف تھے۔

''فارسہ کی کوئی کتاب ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے سوال کیا۔

''نہیں۔ صوفی! بس اب تو غم نصیبہ انتہا کو پہنچ گیا ہے۔''

''دو......دو...... درویش رحم کریں یہ فارسہ کے بعد اب غم نصیبہ۔''

''دیکھو مرد ہوں، مرد کی زبان میں بات کرتا ہوں۔ میری فطرت میں عورت پرستی نہیں ہے۔ گھائل ہو گیا ہوں۔''

''گگ......گھائل بھی ہو گئے ہیں۔ کک...... کہاں چوٹ آئی ہے۔'' صوفی نے کہا۔

''دل پر۔ دل پر۔''

''کون سی کتاب ہے میرا خیال ہے خاصا متاثر کیا ہے اس نے تمہیں۔'' صوفی نے کتاب کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ کتاب کا عنوان ہی قابل توجہ تھا۔ ''محبوبہ کے دل میں کیسے اترا جا سکتا ہے۔''

''اس سے بہتر یہ نہیں کہ تم کسی کنوئیں میں اتر جاؤ۔ یا پھر پاتال کی گہرائیاں تلاش کرو۔''

''دوسرا حملہ بہت اچھا کیا تم نے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے دل کے پاتال میں کون ہے۔''

''کس کی بات کہہ رہے ہو۔''

''حسینہ، صوفی صاحب حسینہ۔'' معشوق نشیلے نے کہا اور صوفی اسے گھورنے لگا پھر بولا۔

''میرے گھر میں یہ سب کچھ نہیں ملے گا۔ معشوق نشیلے۔''

''صوفی تمہیں خدا کا واسطہ ساری زندگی میں ایک ہی آرزو کی ہے۔''

''یار! سچی بات تو یہ ہے کہ کسی اچھی لیبارٹری میں تمہارا تجزیہ کرایا جائے یا پھر قدرت کی کارگزاری کا قائل ہو جایا جائے کہ وہ جو کچھ بھی بنا دیتی ہے اس کے لیے راستہ ضرور رکھتی ہے۔ ورنہ حسینہ جیسی عورت محبت کے قابل ہو سکتی ہے۔''

''ہائے لیلیٰ بھی تو کالی تھی۔''

''ابے اتنی کالی نہیں تھی۔ کہیں بھی نہیں لکھا ہوا۔''

''پھر بھی تمہیں میری مدد کرنا ہو گی۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا۔''

''بب......بس۔''

''کان پکڑ کر یہاں سے باہر نکال دوں گا۔ دروازے پر چوکیدار رکھ دوں گا اور اسے ہدا کر دوں گا کہ کتا بھی گھر میں گھس آئے تو کوئی حرج نہیں لیکن معشوق نشیلے کو اندر نہ آنے دیا جائے۔''

''یہ ظلم کرو گے تم مجھ پر اتنے عرصے کی روشنی نظر انداز کر دو گے۔''

''حرکتوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے سمجھے۔ سڑک چھوڑو تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔''

''کہاں؟''

''اسی قبرستان میں جس کا تم نے تذکرہ کیا تھا۔''

''اوہو خیریت کیوں؟''

''میں اس آدمی کو دیکھنا چاہتا ہوں جو قبر کے پاس نظر آیا تھا۔''

''بڑا خوف ناک آدمی تھا ایک بار جان بچ گئی۔ تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ دوبارہ ادھر جانے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔'' معشوق نشیلے نے کہا۔

''تب پھر ٹھیک ہے۔ حسینہ ہی تمہارا دماغ درست کرے گی۔ درویشوں کے کرم سے۔ میرے تو خیر تم دوست ہو۔ میں تو تمہیں یہاں سے نہیں نکال سکتا۔ کان پکڑ کر باہر نکالنے کا عمل حسینہ زیادہ بہتر طریقے سے کر سکے گی۔''

''نہیں صوفی صاحب! ایسا نہ کہیں وہ جو فارسہ میں کہا۔''

''نہیں۔ بالکل کچھ نہیں کہا ہے۔''

''مگر میری بات تو سنیے۔''

''بالکل نہیں...... میں فوراً حسینہ سے بات کرتا ہوں۔'' صوفی نے کہا۔

''نہیں نہیں۔ خدا کے لیے نہیں۔ وہ ویسے ہی قاتل حسینہ ہے اور ٹھیک ہے میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔ پھر سورج ڈھلے صوفی معشوق نشیلے کے ساتھ چل پڑا۔ قبرستان پر گہرا سناٹا طاری تھا۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج معشوق نشیلے نے اس قبر کی نشان دہی کی جہاں اس نے اس خوف ناک آدمی کو دیکھا تھا۔ وہ لوگ ایک ایسی جگہ بیٹھ گئے۔ جہاں سے اس قبر کی نگرانی کی جا سکتی تھی اور پھر اس وقت کوئی پونے آٹھ بجے کا وقت ہو گا۔ جب انہوں نے اس شخص کو دیکھا جھاڑ جھنکار چہرے والا خوف ناک آدمی قبر کے کنارے آ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ ایک اچھا خاصا تنومند آدمی تھا اور عجیب سی دیوانگی کی سی کیفیت کا شکار نظر آ رہا تھا۔ صوفی اسے دیکھتا رہا وہ قبر پر سر رکھ کر بیٹھ گیا تھا اور پھر اس کی سسکیاں ابھرنے لگی تھیں۔ لیکن اس وقت وہ بری طرح چونکا جب صوفی ایک دم سے اس پر جا پڑا تھا۔ وہ فوراً کھڑا ہوا اس نے صوفی کو زور سے دھکا دیا۔ کافی طاقت ور آدمی معلوم ہوتا تھا صوفی کئی قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ ساتھ ہی اس شخص نے کسی بھینسے کی طرح گردن جھکا کر صوفی پر وار کیا تھا ٹکر صوفی کے سینے پر لگی اور صوفی نیچے گر پڑا اس شخص نے صوفی پر چھانے کی کوشش کی لیکن صوفی نے اسے دونوں پاؤں پر اٹھا کر پیچھے پٹخ دیا اور پھر خود بھی الٹی قلابازی کھائی۔ معشوق نشیلے حیرت کے عالم میں صوفی کو دیکھ رہے تھے پھر اس کی آواز ابھری۔

''اماں خدا قسم صوفی صاحب! یہ کون سی کاری گری ہے فارسہ میں۔'' لیکن صوفی کو اس سے مقابلہ کرتے ہوئے دانتوں پسینے آ رہے تھے بہ مشکل تمام وہ اسے زمین پر رگڑ رگڑ کر قابو کرنے میں کامیاب ہوا۔ اور وہ شخص بے ہوش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد صوفی اسے ساتھ لے کر چل پڑا۔ معشوق نشیلے کو اس نے ایک ایسی جگہ اتارا جہاں سے وہ گھر واپس جا سکتا تھا اور اس شخص کو لے کر گرین ہاؤس کی جانب چل پڑا۔

''اب کیا آپ اس کے کباب بنا کر کھائیں گے۔'' معشوق نشیلے نے ازراہ مذاق کہا تھا لیکن صوفی گاڑی آگے بڑھا لے گیا تھا۔

گرین ہاؤس میں پوری گرین فورس موجود تھی۔ صوفی کے شکار کو اس مخصوص حصے میں پہنچا دیا گیا۔ جو کمرا تفتیشی تھا اور پھر اس شخص سے معلومات حاصل کرنے کی تیاریاں کی جانے لگیں۔

♥......♥......♥

بہت سے راز منکشف ہوئے تھے اور صوفی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ صورت حال کیا ہے لیکن بہر حال اس سلسلے میں روزانہ پارکر سے مزید گفتگو کرنی تھی اور اس کے بعد بہ قول صوفی کے اس کیس کا خاتمہ۔

''ہاں...... لوگ کہتے ہیں کہ گرین فورس نام کی گرین فورس ہے اس کا کوئی کارنامہ تو ہے نہیں۔ سوائے اس کے کہ مجرموں کو پکڑ کر گرین ہاؤس لے آتی ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ کسی بھی مسئلے میں لوگ اپنی پسند کی کارروائی چاہتے ہیں۔ درویشوں کے کرم سے حالانکہ واقعات کی شکل جو بھی ہوتی ہے۔ کام اسی کے مطابق ہو سکتا ہے۔ لیکن بس دنیا کا سب سے آسان کام تنقید ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''ویسے چھوٹے بابا! آپ بے شک پیر پرست ہیں۔ لیکن کیا ہر کام درویشوں کی مدد سے ہو جاتے ہیں۔''

''عزیزہ! یہ بھی ایک اعتراض ہے لیکن اپنا اپنا خیال ہے بعض لوگ ان بزرگان دین کی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے جو اللہ تعالیٰ کے بہت قریب ہیں۔ دیکھو نا نیکی اور برائیوں کا ایک تصور تو موجود ہے نا نیکیاں کرنے والے نیک اور برائیاں کرنے والے برے اور کچھ نیکیوں میں اس قدر آگے نکل جاتے ہیں کہ وہ اللہ کی بے پناہ قربت حاصل کر لیتے ہیں۔ یہی ولی اور درویش ہوتے ہیں۔ حق اللہ...... اللہ حق ہے اور سب کچھ اسی کے حکم کے مطابق ہوتا ہے۔ درویش وہ ہیں جو اللہ کی حمد و ثنا کر کے اس کی قربت حاصل کر چکے ہیں۔ اگر ہم ان کا طفیل اپنے معاملات میں شامل کر لیتے ہیں۔ تو یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے۔ اس سے ہم درویش پرست نہیں ہو جاتے یا ایسا نہیں ہوتا کہ نعوذ باللہ ہم اللہ کے وجود کو نظر انداز کر کے درویشوں سے کچھ مانگ رہے ہوں۔ میرا تکیہ کلام میری ان سے عقیدت کی وجہ سے ہے ورنہ باقی کچھ نہیں ہے۔''

''سمجھ رہی ہوں۔''

''اور اب ہمیں روزانہ پارکر کو یہاں پر لانا ہے اور اس کام کی ذمے داری میں تم لوگوں کے سپرد کرتا ہوں۔''

''میں خلوص دل سے اس ذمے داری کو قبول کرتی ہوں۔ چھوٹے بابا!'' شازیہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا۔ اپنے ساتھ اس نے عادل اور فیضان کو لیا تھا اور پھر وہ روزانہ پارکر کی رہائش گاہ پر جا پہنچی تھی۔ اسے صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ روزانہ پارکر کو یہاں لے آئے۔ اس سلسلے میں کسی گہری کارروائی کے بارے میں نہیں بتایا گیا تھا۔ عادل اور فیضان کو اس نے اپنا منصوبہ بتایا تھا اور دونوں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے مس شازیہ! اس سلسلے میں آپ کو ذمے داری دی گئی ہے۔ آپ ہر طرح سے اختیار رکھتی ہیں۔ ہم آپ کی ہدایت پر عمل کریں گے۔'' شازیہ نے پاسٹ اسٹریٹ کے فلیٹ نمبر 11 کا بیل بٹن دبایا تو اسی ملازمہ نے دروازہ کھولا۔

''کیا بات ہے کس کو مانگتا ہے۔''

''نیچے دو آدمی گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ مسٹر ڈارکر کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ نہیں فوراً میڈم روزانہ پارکر کو اپنے ساتھ لے جانا ہے آپ انہیں یہ بتا دیجیے۔'' جتنی سادگی سے یہ بات کہی گئی تھی۔ وہ ہزاروں پرکار باتوں سے زیادہ کارگر رہی روزانہ فوراً ہی باہر نکل آئی۔

''آپ ہی روزانہ پارکر ہیں۔''

''ہاں۔''

''آپ عادل اور فیضان کو جانتی ہیں۔''

''بالکل نہیں۔ کون ہیں یہ۔''

''نیچے گاڑی میں موجود ہیں۔ غالباً مسٹر ڈارکر کو آپ کی ضرورت ہے۔''

''ڈے...... ڈے ڈارکر وہ کہاں ہے۔'' روزانہ نے بے خودی کے عالم میں کہا۔

''یہ پلیز میں نہیں جانتی اگر آپ چاہیں تو ان لوگوں سے معلوم کر سکتی ہیں۔''

''مگر تم کون ہو۔''

''میں فیضان کی کزن ہوں۔''

''اوہو۔ مگر فیضان کون ہے۔''

''دیکھیے پلیز۔ مجھے صرف ایک میسج دیا گیا ہے۔ ویسے ہم شریف لوگ ہیں۔ ہماری ذات سے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ آپ اگر چاہیں تو نیچے چل کر معلومات حاصل کر سکتی ہیں۔'' شازیہ نے اس قدر معصومیت سے کہا کہ روزانہ الجھ سی گئی۔ اس نے اپنی ملازمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں ابھی آئی۔'' اور پھر شازیہ کے ساتھ نیچے آ گئی تھی۔ کار میں فیضان اور عادل موجود تھے۔

''یہ عادل ہیں اور یہ فیضان۔''

''براہ کرم۔ آپ اندر آئیے بیٹھیے۔ سڑک پر بات کرنا مناسب نہیں لگتا۔ آپ مسٹر ڈارکر کو جانتی ہیں۔''

''شوہر ہے وہ میرا، میرا محبوب ہے۔''

''آپ آئیے پلیز۔''

''مگر کہاں۔''

''بیٹھیے۔'' اور روزانہ بادل نخواستہ بیٹھ گئی۔ فیضان نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ شازیہ روزانہ کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ عادل بھی فیضان کے پاس ہی جا بیٹھا۔

''مگر ہم کہاں جا رہے ہیں۔؟''

''بس زیادہ دور نہیں۔ آپ ایک بات ذہن میں رکھیے۔ ہم آپ کے ہمدرد ہیں۔ ہمارے ہاتھوں سے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

''ارے نقصان تو جو مجھے پہنچ چکا ہے میری زندگی کے لیے کافی ہے۔'' شازیہ خاموشی سے سامنے دیکھتی رہی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ لوگ گرین ہاؤس میں داخل ہو گئے۔

''یہ کون سی جگہ ہے۔ میں نے پہلے نہیں دیکھی۔''

"آیئے اندر آیئے۔" عادل نے کہا یہ دونوں شکل وصورت سے بھی شریف لگتے تھے اور ایک نگاہ دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ برے لوگ ہیں۔ لیکن صوفی نے مزید کچھ انتظامات کر رکھے تھے۔ غلام قادر اس وقت ایک جلاد کی شکل میں تھا۔ گرین ہاؤس کے ایک مخصوص کمرے میں جہاں ایک کٹہرہ بنا ہوا تھا اور سامنے کی سمت ایک کشادہ جگہ شازیہ کو لے جایا گیا۔ سلاخوں والے جنگلے کی دوسری طرف وہ دیکھنے لگی اور دوسرے لمحے اس کے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی۔

"ڈارکر....." کمرے کے پیچھے بیٹھا ہوا شخص جو گھٹنوں میں سر دیئے خاموش بیٹھا تھا چونک پڑا!!! اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کا لباس بری طرح خون آلود تھا۔ جسم کے کچھ کھلے ہوئے حصوں پر بھی خون نظر آ رہا تھا۔ روزانہ پارکر دہشت بھرے انداز میں چیخنے لگی۔ ڈارکر سلاخوں کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"تو یہاں کیسے آمری۔"

"تم سے ملنے آئی ہوں۔ کیا تم نے مجھے نہیں بلایا تھا۔ جواب میں ڈارکر کے منہ سے گالیوں کا طوفان امنڈ پڑا۔ اس نے کہا۔

"کتیا کی بچی! تو ہے ہی اس قابل، جا مر میرا کیا جاتا ہے۔ اسی وقت غلام قادر چمڑے کا بنا ہوا ایک ہنٹر لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے صوفی بھی تھا روزانہ نے اسے دیکھا اور اچھل پڑی۔

"تم وہی ہونا۔"

"درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"مم..... مگر یہ..... یہ سب کیا ہے۔"

"کچھ نہیں..... محترمہ! یہ ڈارکر ہے آپ کا شوہر اور جہاں تک میرا اندازہ ہے آپ کا محبوب۔ حلیہ دیکھ رہی ہیں آپ اس کا۔ یہ شخص ماضی میں جلاد رہ چکا ہے۔ ایک سو بیس افراد کو پھانسیاں دی ہیں اس نے۔ زندگی اس کی نگاہوں میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی اس کے ہاتھ میں جو ہنٹر ہے وہ کھال اتارنے کے کام آتا ہے۔ شکل تو دیکھ ہی رہی ہیں آپ اپنے شوہر کی اگر آپ چاہتی ہیں کہ اس کی پوری کھال اس کے بدن کا ساتھ نہ چھوڑ دے۔ تو آپ سے جو کچھ پوچھا جا رہا ہے وہ آپ صاف صاف بتا دیجیے۔"

"کچھ نہیں بتانا ہے تجھے، کچھ نہیں بگڑا ہے میرا۔ ان لوگوں نے میرے کپڑوں پر نقلی خون ڈالا ہے۔ ایک ہاتھ نہیں لگایا گیا ہے مجھے۔"

"غلط فہمی کا شکار ہیں محترم اندھیرے صاحب! میرا مطلب ہے ڈارکر صاحب! یہ صرف ماڈل ہے اور مستقبل میں یہی آپ کے ساتھ کیا جانا ہے۔ روزانہ نے گہری نگاہوں سے صوفی کو دیکھا اور بولی۔

"آپ مجھ سے کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں نا۔ میں ایک لفظ نہ بتاتی آپ کو چاہے آپ میرے بدن کی بوٹیاں نوچ کر اڑا دیتے اگر آپ ڈارکر کو ایک تھپڑ بھی مارتے لیکن اب میں سمجھتی ہوں کہ مجھے زبان کھولنی پڑے گی ڈارکر زندگی بھر تمہارے لیے ایثار کرتی رہی ہوں کافی ہے۔ انسان ہوں انسان ہی رہ کر مرنا چاہتی ہوں۔ نہ فرشتہ بن سکتی ہوں اور نہ فرشتہ ہوں۔"

"اگر تو نے زبان کھولی کتیا کی بچی۔"

"چھوڑو ڈارکر سلاخوں کے پیچھے بند ہو۔ پتا نہیں کیا سمجھتے رہے ہو خود کو اور کیا سمجھتے آئے۔ میرے لیے نہ پہلے کچھ تھا نہ اب کچھ ہے اور نہ مستقبل میں کچھ ہوگا۔ ہاں میں ان لوگوں سے یہی درخواست کروں گی۔ کہ یہ تمہیں معاف کر کے ملک سے باہر نکال دیں اور بس۔ میں یہ بھی نہیں کہوں گی ان سے کہ یہ تمہیں میرے حوالے کر دیں کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تمہارے پاس میرے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔"

"ایک منٹ کے لیے سلاخوں کے پاس آ جا۔ پھر تو کبھی زبان نہیں کھول سکے گی۔"

"وہ سلاخوں کے پاس آئے گی ہی کیوں مسٹر ڈارکر؟" آؤ بی بی میرے ساتھ آؤ۔" صوفی نے کہا اور روزانہ کو بازو سے پکڑ کر اس جگہ سے باہر نکال لے گیا۔ ڈارکر زور زور سے چیخنے لگا تھا اس نے سلاخوں سے سر بھی مارا تھا۔ اس بار اس نے سلاخوں سے سر مارا تو غلام قادر نے اس کے بال پکڑ لیے اور غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"یہ جو سلاخیں نظر آ رہی ہیں ناں تجھے ان کو چوڑا کر کے تیری گردن باہر کھینچ لوں گا اور انہیں چھوڑ دوں گا اور اس کے بعد کیا ہوگا تجھے خود اس کا اندازہ ہے۔ غلام قادر کا لہجہ اس قدر سفاک تھا کہ ڈارکر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ صوفی روزانہ پارکر کو لئے ہوئے دوسرے کمرے میں آ گیا تھا۔

"آپ کی ہدایت پر عمل کیا جائے گا۔ آپ براہ کرم ڈارکر کے بارے میں مجھے ساری حقیقت بتا دیجیے۔"

"ہم دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے وہ کالج کا ایک ذہین ترین اسٹوڈنٹ تھا۔ میں اس سے محبت کرتی تھی۔ اس نے بھی مجھ سے محبت کا اظہار کیا اور میں نے دنیا کو ٹھکرا کر اس سے شادی کر لی۔ میرے ڈیڈی نے میری ماں کی موت کے بعد میری پرورش کی تھی وہ مجھے بہت چاہتے تھے لیکن انسان کتنا خود غرض ہوتا ہے میں اپنے ڈیڈی کی تمام محبت کو نظر انداز کر کے ڈارکر کی زندگی میں شامل ہو گئی۔ لیکن ڈارکر اوباش طبع فطرت کا مالک تھا۔ یہ بعد میں مجھے معلوم ہوا اس کی زندگی میں دو ہی چیزیں تھیں۔ خوبصورت لڑکیاں اور دولت کی طلب۔ دولت حاصل کرنے کے لیے وہ نہ جانے کیا کیا جتن کرتا رہتا تھا اور پھر اسے ایک رقاصہ سے محبت ہو گئی۔ رقاصہ کا نام سائرہ حمید تھا۔ وہ ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں میں رقص کیا کرتی تھی۔ ڈارکر اس کا دیوانہ ہو گیا۔ اس نے سائرہ حمید سے اپنی محبت کا اظہار کیا تو وہ ہنس پڑی اور اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ اسے صرف دولت کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ڈارکر کے پاس دولت نہیں تھی۔ وہ سائرہ حمید کے حصول کے لیے جرم کے راستوں پر چل پڑا۔ ہر وقت وہ ایسی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا جن سے اسے دولت حاصل ہو۔ اس پر مجھے بھی بہت سی جگہ استعمال کیا اور پھر اسے کہیں سے آفر ملی اسے کچھ کاغذات درکار تھے۔ جو سرکاری حیثیت کے حامل تھے حکومت کے کسی خفیہ معاہدے کی دستاویز تھے۔ وہ ان کاغذات کے حصول کے لیے سرگرداں ہو گیا۔ کیونکہ ان کے بدلے اسے ایک بھاری رقم حاصل ہونے والی تھی لیکن معاملہ بہت سے لوگوں میں بٹ گیا۔ سائرہ حمید کو بھی براہ راست ان کاغذات کے حصول میں شامل ہونا پڑا اور میں، مجھے خصوصی طور پر ایک بہت بڑے آدمی تک پہنچنے کی ہدایت کی گئی۔ یہ شخص بڑی حیثیت کا حامل تھا۔ صوفی سمجھ گیا اشارہ شاہ میر صاحب کی طرف ہی ہے اس نے خاموشی اختیار کیے رکھی روزانہ پارکر نے بتایا۔

"پھر ایک فوجی افسر کے علم میں یہ بات سائرہ حمید کے ذریعے آئی سائرہ حمید نے اس فوجی افسر

پر ڈورے ڈالنا شروع کر دیے تھے اور ڈارکر کے منصوبے پر کام کر رہی تھی لیکن فوجی آفیسر محب وطن نکلا کاغذات جیسے ہی سائرہ حمید کے قبضے میں پہنچے فوجی آفیسر نے ان پر قبضہ کرلیا۔ بے شک وہ ریٹائرڈ زندگی گزار رہا تھا لیکن وہ عورت پرست سے زیادہ وطن پرست تھا کاغذات اپنے قبضے میں کر کے اس نے سائرہ حمید کو قتل کر دیا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کاغذات کا راز باہر جائے۔ اس نے سائرہ حمید کو ہی ختم کر دیا تاکہ کسی کو پتا نہ چلے کہ کاغذات اس کی تحویل میں آ چکے ہیں۔ وہ غالباً اس بات کا منتظر تھا کہ بات ٹھنڈی ہوتے ہی کاغذات متعلقہ محکمے کو واپس کر دیئے جائیں۔ مگر اسے اس کا موقع نہیں مل سکا ڈارکر کو کسی طرح یہ معلوم ہو گیا کہ شیر خان نے سائرہ حمید کو قتل کیا ہے اس نے شیر خان کو اغوا کرلیا اور اسے کسی جگہ قید رکھا وہ سائرہ حمید کے قاتل کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا جس کا اس کے پاس کوئی عینی ثبوت نہیں تھا۔ شیر خان اس کی تحویل میں مر گیا۔ بعد میں ڈارکر نے احمقانہ حرکتیں شروع کر دیں۔ سائرہ کے غم میں وہ نیم دیوانہ ہو گیا۔ اس نے شیر خان کی لاش میں خنجر پیوست کیا۔ یہ سائرہ حمید کے نام کا خنجر تھا اس نے بہت سے خنجر بنوائے اس کے دل میں اور بھی بہت سے خیالات تھے وہ سائرہ حمید کے نام پر بہت سے لوگوں کو قتل کرنا چاہتا تھا اور ایسی ہی جنونی کیفیات کا شکار تھا۔ کاغذات اسے حاصل نہیں ہو سکے تھے۔

بہرحال یہ ہے میرے شوہر میرے محبوب کی داستان۔''

''صوفی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اس کے بعد اس نے روزانہ پارکر سے کہا۔

''افسوس۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ تمہیں واپس تمہاری رہائش گاہ پہنچا دیا جائے گا اور جہاں تک رہا ڈارکر کا معاملہ۔''

''نہیں پلیز نہیں۔ اس کے لیے تھوڑی سی رعایت دو میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔'' لیکن ظاہر ہے۔ صوفی اس بارے میں کیا کر سکتا تھا۔ کرنل رحیم شاہ سے مشورہ کیا تو رحیم شاہ نے کہا۔

''بات صرف یہ ہے صوفی صاحب کہ ہم کسی مجرم کو تو معاف نہیں کر سکتے۔ شاہ میر صاحب کو کاغذات مل گئے ہیں اور وہ بھی اس کی تشہیر نہیں چاہیں گے۔ البتہ ظاہر ہے کہ کسی قاتل کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ آپ اسے تھوڑی سی رد و بدل کے بعد جمشید مرزا کے حوالے کر دیں۔ وہ عموماً آپ کی طرف آس لگائے بیٹھا ہوتا ہے۔ صوفی نے ایسا ہی کیا۔ روزانہ پارکر کو اس کے فلیٹ پر واپس پہنچا دیا گیا۔ اسے گرین ہاؤس کی بھنک بھی نہیں لگنے دی گئی تھی۔ جمشید مرزا کو مکمل رپورٹ کے ساتھ جو ذرا سی تبدیل شدہ تھی شیر خان کا قاتل سونپ دیا گیا اور جمشید مرزا کی خوشیاں آسمان تک پہنچ گئیں۔ صورت حال معمول پر آ گئی تھی۔

♥......♥......♥

وہ ایک دراز قامت اور انتہائی خوب صورت نوجوان تھا۔ تیکھے نقوش زندگی سے بھرپور تھے بھرے بھرے بدن کا مالک اخروٹی رنگت کے بالوں والا اور سبز نیلی آنکھوں والا اپنے رنگ و روپ بال اور آنکھوں کی نیلاہٹ سے کوئی بھی اسے دیکھ کر یورپ کا باشندہ کہہ سکتا تھا لیکن اس کے نقوش خالص مشرقی تھے دل کش اور ملیح ان میں یورپ کا کھردرا پن شامل نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس کے چہرے پر بچوں جیسی معصوم اور شوخ مسکراہٹ پھیلی ہوئی لگتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مسلسل مسکراتے رہنے کا عادی ہو۔ اس کے

ساتھ ہی ایک اور شخص بھی تھا۔ دبلے پتلے بلکہ ضرورت سے زیادہ دبلے جسم کا مالک لیکن اس کی آنکھیں بس...... ایسی جاندار آنکھیں کبھی کبھی ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ بہت ہی نفیس اور جدید تراش کا لباس پہنے ہوئے بالکل خاموش دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان کے درمیان آپس میں کوئی ربط ہوگا۔ بس دونوں اجنبی مسافر معلوم ہوتے تھے۔ طویل ترین سفر کے دوران بھی ایک بار انہیں ایک دوسرے کی جانب مخاطب نہیں دیکھا گیا تھا۔ طیارہ رن وے پر اترنے ہی والا تھا۔ اناؤنس منٹ ہو چکی تھی اور سارے مسافر تیار بیٹھے تھے۔ آخر کار طیارے کے پہیوں نے رن وے چھولیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ مطلوبہ جگہ رک گیا۔ دوسرے مسافروں کی طرح وہ دونوں بھی خاموشی سے طیارے سے باہر نکل آئے اور کسٹم کی عمارت میں داخل ہو گئے۔ سردی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تھی اور سارا ماحول اس سردی سے متاثر لگ رہا تھا۔ کسٹم کے افسران اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے دراز قامت آدمی بھی اپنے سامان کے ساتھ کسٹم آفیسروں کے سامنے پہنچ گیا ایک معمر اور تجربے کار افسر نے اس سے سوٹ کیس کھولنے کی درخواست کی اور اس نے سوٹ کیس کھول دیا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس سوٹ کیس میں سارے کا سارا زنانہ سامان بھرا ہوا تھا۔ زنانہ لباس میک اپ کٹس اعلیٰ اقسام کے فیس پاؤڈر اور ایسی دوسری چیزیں۔''

''یہ سوٹ کیس آپ کا ہے؟'' افسر نے سوال کیا۔

''سوفی صدی۔'' نوجوان نے اردو میں جواب دیا اور آفیسر چونک کر اسے دیکھنے لگا شاید وہ اسے غیر ملکی سمجھا تھا۔

''آپ کی مسز ساتھ ہیں؟''

''جی نہیں۔ میں ابھی کنوارہ ہوں۔''

''تو پھر یہ سامان؟''

''میرا ہی ہے۔''

''یہ زنانہ سامان ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میرا شوق ہے۔''

''کیا مطلب...... کیا آپ یہ زنانہ لباس استعمال کرتے ہیں۔''

''قابل اعتراض ہے کیا۔ جرائم میں شمار ہوتا ہے۔'' نوجوان نے سنجیدگی سے پوچھا اور کسٹم آفیسر اس سوال سے کسی قدر حیران ہو کر جواب پر غور کرنے لگا۔ پھر اس نے گردن ہلا کر کہا۔

''نہیں۔ جرم تو نہیں لیکن بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''اگر کوئی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی تو کیا یہ میرا فرض ہے کہ آپ کو اسکول ماسٹر کی طرح پڑھانے بیٹھ جاؤں۔ ان میں اگر کوئی غیر قانونی چیز ہے تو آپ ضرور اسے گرفت میں لیں۔ میں زنانے کپڑے اپنے سوٹ کیس میں رکھتا ہوں۔ یہ میرا اپنا مسئلہ ہے ان میں کوئی لباس ایسا نہیں ہے جو میرے بدن پر فٹ نہ ہو آپ تجربہ کر کے دیکھ سکتے ہیں۔'' کسٹم آفیسر نے گہری نگاہوں سے نوجوان کا جائزہ لیا اور پھر یہ سوچ کر کہ آج کل کی نسل اسی قسم کی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتی ہے۔ دوسرے سوٹ کیس کی طرف متوجہ

ہوگیا۔لیکن اس کا سامان پہلے سوٹ کیس سے مختلف نہیں تھا۔ کسٹم آفیسر کو نہ جانے کیوں ایک جھلاہٹ کا سا احساس ہوا۔ یہ عمل اگر صرف دوسرے کا مذاق اڑانے کے لیے ہے تو مناسب نہیں ہے اس نے کہا۔

''میرا خیال ہے آپ کو یہ زنانہ قیمتی لباس لے جانے کی اجازت اعلیٰ افسران سے لینی پڑے گی۔''

''لیکن کیوں؟ کیا یہ جرم ہے؟''

''جی نہیں۔ یہ جرم نہیں ہے لیکن یہ بات مشکوک ہے اور ہم اپنے شک کو رفع کیے بغیر آپ کو جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ اپنا شک دور کرلیں۔'' نوجوان نے شرافت سے کہا اور کسٹم افسر نے اپنے افسر بالا سے رابطہ قائم کرلیا۔ بات دلچسپ حدود میں داخل ہوگئی تھی افسر بالا نے بھی نوجوان سے سوالات کیے اور وہ دلچسپ پیرائے میں ان سوالات کے جواب دیتا رہا۔ دونوں افسران نے آپس میں مشورہ کیا۔ اپنے سوٹ کیسوں میں زنانہ سامان لے کر جانے کا عمل کوئی جرم نہیں تھا۔ چنانچہ نوجوان کا سامان کلیئر کردیا گیا۔ اس نے مسکرا کر ان کا شکریہ ادا کیا پھر بولا۔

''میں دراصل اسمگلنگ کے سائنسی اور نفسیاتی اصولوں پر ریسرچ کررہا ہوں۔ گھٹیا قسم کے اسمگلر، اسمگل کی جانے والی اشیاء چھپانے میں شدید محنت کرتے ہیں اور پکڑے جاتے ہیں اگر یہ لوگ ان چیزوں کو نمایاں کردیں تو شاید باآسانی نکل جائیں۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹا سا واقعہ ہے کسی ملک کی سرحد پر ایک شخص جو غریب سا آدمی تھا روزانہ سڑک پار کرکے اس طرف جایا کرتا تھا اور واپس آجایا کرتا تھا۔ سپاہیوں نے اسے مہلت دے رکھی تھی۔ وہ ایک سائیکل پر ریت کی ایک بوری رکھ کرلے جاتا تھا اور تھوڑے وقت کے بعد واپس آجاتا تھا۔ سپاہیوں نے اسمگلنگ کے شبہ کے پیش نگاہ درجنوں بار ریت کی اس بوری کو چیک بھی کیا تھا۔ ریت کا کیمیاوی تجزیہ بھی کرایا گیا تھا۔ سائیکل کے پائپ اور ہر چیز کو دیکھ لیا گیا تھا لیکن کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی تھی۔ جو اسمگلنگ کے زمرہ میں آتی۔ سپاہیوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ریت کی اسمگلنگ کیا معنی رکھتی ہے۔ ایک دن انہوں نے اس شخص سے کہا۔

''دیکھو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ جب تک ہماری یہاں ڈیوٹی ہے تمہیں یہ ریت لے جانے سے بھی نہیں روکیں گے۔ یہ تو ہمیں پتا ہے کہ تم اسمگلنگ کرتے ہو۔ لیکن اسمگلنگ کی ہوئی کوئی چیز آج تک پکڑی نہیں جاسکی۔ نہ تمہارے لباس میں کچھ ہوتا ہے نہ ریت میں کچھ ہوتا ہے۔ نہ بوری میں کچھ ہوتا ہے۔ نہ سائیکل کے پائپوں وغیرہ میں کوئی چیز چھپی ہوتی ہے پھر یہ کیا قصہ ہے تم کیا اسمگل کرتے ہو دیکھو ہمیں بتادو۔ ورنہ دوسری صورت میں ہم تمہارا آنا جانا بھی بند کردیں گے اور ماریں گے الگ۔ پہلے یہ بتاؤ تم اسمگلنگ کرتے ہو۔''

''جی سر! کرتا ہوں۔''

''مگر کیا؟ اگر کوئی چیز لے جاتے ہو تو آج تک پکڑی کیوں نہیں جاسکی۔''

''جی میں سائیکل اسمگل کرتا ہوں۔ آپ نے کبھی اس طرف غور ہی نہیں کیا۔ میں جب بھی جاتا ہوں ایک برینڈ نیو چمچاتی سائیکل لے جاتا ہوں اور واپس آتا ہوں تو ایک پرانی کھٹارہ سائیکل لے کر۔ یہاں

ے میں جو سائیکل لے جاتا ہوں وہ تو قیمتی پیسوں میں بک جاتی ہے وہاں سے پرانی اور بوسیدہ سائیکل سو پچاس میں مل جاتی ہے۔ تو بات اصل میں وہی ہوئی کہ سپاہیوں نے سائیکل پر رکھی اشیاء کو تو تلاش کیا۔ سائیکل پر غور ہی نہیں کیا۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو۔''

''کہنا میں اسمگلنگ کے سائنسی اور نفسیاتی اصولوں پر ریسرچ کررہا ہوں۔''

''تو......تو......''

''جی ہاں۔ اب دیکھیے نا آپ اس وقت کتنی آسانی سے دھوکا کھا گئے۔ ان سوٹ کیسوں میں رکھے ہوئے سامان میں الجھ کر آپ نے ان سوٹ کیسوں پر توجہ ہی نہیں دی ذرا غور کریں۔ دونوں سوٹ کیسوں کی تہ ڈبل ہے اور ان تہوں میں چار چار کلوگرام ہیروئن موجود ہے۔ بہر حال شکریہ خدا حافظ۔ ''نوجوان نے سوٹ کیس اٹھائے اور آگے بڑھ گیا۔ کسٹم آفیسر سکتے میں رہ گئے تھے لیکن اس کے بعد وہ نوجوان پر جھپٹ پڑے اور چاروں طرف سے اسے گھیر لیا گیا۔ اس کے ہاتھوں سے سوٹ کیس چھین لیے گئے اور پھر ان کا بھرپور جائزہ لیا گیا۔ ذرا سی دیر میں نوجوان کے بیان کی تصدیق ہوگئی۔ سوٹ کیس کی تہ ڈبل تھی اور اس دوسری تہ میں سفید رنگ کا پاؤڈر موجود تھا۔ چاروں طرف سنسنی پھیل گئی۔ نوجوان کو تحویل میں لے لیا گیا۔ لیکن دونوں افسران کی عقل ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس نے انہیں کامیابی سے دھوکا دینے کے باوجود اپنا راز خود کیوں کھول دیا۔ اسے پولیس کے حوالے کردیا گیا اور پولیس ہیڈ کوارٹر میں اس نے دوسرا انکشاف کیا۔

''میں اپنی ضمانت کے لیے ایک خاص شخص کا نام لینا چاہتا ہوں۔ براہ کرم میرے سلسلے میں آپ ان سے رابطہ قائم کرلیجیے۔''

''کون ہے وہ؟''

''سیٹھ احمد عالم بارودوالا۔'' دونوں افسران بری طرح چونک پڑے۔

''بارودوالا۔''

''جی براہ کرم میری ان سے بات کروادیں یا مجھے ان کے پاس لے چلیں۔''

''بارودوالا سے تمہارا کیا تعلق ہے۔'' ایک افسر نے پوچھا۔

''آپ نے میرے پاسپورٹ پر میرا نام نہیں دیکھا۔ میرا نام سہیل عالم بارودوالا ہے۔ اختر سہیل عالم بارودوالا۔''

''کیا آپ بارودوالا کے بیٹے ہیں۔'' پولیس آفیسر نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ درحقیقت سیٹھ احمد عالم بارودوالا بہت بڑی شخصیت کا مالک تھا اربوں پتی بلکہ کھرب پتی بڑے بڑے ادارے اس کے نام سے چل رہے تھے۔ اخبارات اس کی دولت اور اس کی حیثیت کے چرچوں سے بھرا ہوا کرتے تھے۔ حکومت کے اعلیٰ ترین عہدے دار اس کے دوست تھے۔ وزیراعظم سے اس کی قریبی رشتے داری تھی۔ اس پائے کے سرمایہ دار ملک میں چند ہی تھے حکومت اور عوام کی نگاہوں میں سیٹھ احمد عالم بارودوالا کا اتنا بڑا مقام تھا کہ وہ جب بھی چاہتا

الیکشن میں کھڑے ہو کر بڑے سے بڑے عہدے تک پہنچ سکتا تھا۔ خود پولیس افسران پریشان ہو گئے تھے۔

"آپ سچ بول رہے ہیں یا جھوٹ۔"

"یار! کمال ہے میں نے پاسپورٹ کا حوالہ دیا ہے آپ لوگ پاسپورٹ پر دیکھ لیجیے۔"

"آپ نے پہلے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" بہر حال دیکھتے ہیں جس پولیس افسر کی تحویل میں نوجوان کو دیا گیا تھا وہ بدحواس ہو گیا تھا جس شخصیت کا نام لیا گیا تھا اس کا نام سن کر بھلا کس کی مجال تھی کہ آخر کو پولیس کی تحویل میں رکھ سکے یا کوئی گڑبڑ کر سکے۔ بہر حال اس نے اسے دوسرے لوگوں کی تحویل میں چھوڑ کر افسر کی طرف دوڑ لگا دی۔ ایس پی جمشید مرزا نے انسپکٹر سے ساری تفصیل سنی تو حیران رہ گیا اس نے کہا۔

"اب تک تم لوگ اس سلسلے میں کیا کیا کچھ کرتے رہے ہو۔"

"نہیں جناب! بس کیس ایئر پورٹ کسٹم سے ہمارے سپرد کیا گیا ہے۔"

"جاؤ اسے لے کر آؤ۔ میں اسے خود سیٹھ احمد عالم کے پاس لے جا کر تصدیق کروں گا۔ بار معمولی آدمی کی نہیں ہے ہمیں سوچ سمجھ کر کام کرنا ہوگا۔"

"بہت بہتر ہے جناب!" اصغر نے کہا اور باہر نکل گیا۔

"بہر حال جمشید مرزا احمق نہیں تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ جو تفصیلات اس کے سامنے لائی گئی تھیں بڑی عجیب وغریب تھیں۔ نوجوان نے خود ہی ہیروئن کی نشان دہی کی تھی اور اس کے بعد اپنے باپ کا حوالہ تھا۔ جمشید مرزا یہ تو جانتا تھا کہ نوجوان کو ایک منٹ بھی پولیس کی تحویل میں نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن کچھ نمبر بنانے کے چکر میں بھی تھا احمد عالم سے اگر کوئی بات بن جائے تو وارے نیارے ہو سکتے ہیں۔ بہر حال نوجوان جمشید مرزا کے پاس پہنچا دیا گیا۔ جمشید مرزا نے کہا۔

"آپ کا نام اختر سہیل عالم ہے۔"

"تعجب ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک درجن افراد مجھ سے میرا نام پوچھ رہے ہیں اور میں انہیں اپنا نام بتایا ہے لیکن آپ کیسے ایس پی ہیں افسر صاحب آپ تک میرا نام نہیں پہنچا۔"

"ہاں ٹھیک ہے آیئے میرے ساتھ۔" جمشید مرزا نے اس نوجوان کا بھرپور جائزہ لیا۔ شکل صورت، رنگ وروپ بالکل غیر ملکیوں جیسا تھا لیکن چہرے کے نقوش سے مشرقیت جھلکتی تھی۔ بہت خوبصورت آدمی تھا۔ بہر حال وہ مختلف رابطے کرنے کے بعد ایک انتہائی قیمتی آفس پہنچ گیا جہاں سیٹھ احمد عالم اس وقت موجود تھے۔ انہوں نے ایک پولیس آفیسر کا نام سن کر اسے بلا لیا۔ کچھ اور لوگ بھی اس وقت سیٹھ بارودوالا کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ جمشید مرزا نوجوان کے ساتھ اندر داخل ہو گیا اور بارودوالا نے اسے سنجیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ لیکن اسی وقت اختر سہیل، جمشید مرزا کے پیچھے سے نکل کر آگے بڑھا اور سیٹھ بارودوالا سے لپٹ گیا۔

"ڈیڈی...... ڈیڈی...... آخر میں آپ تک پہنچ ہی گیا۔ ڈیڈی!" نوجوان خاصا جذباتی نظر آ رہا تھا۔ لیکن سیٹھ بارودوالا بری طرح بوکھلا گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ نوجوان کے سینے پر رکھ کر اسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی اور بولا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے کون ہے یہ آفیسر! اسے ہٹاؤ۔" بارودوالا کی گھٹی گھٹی آواز ابھری اور جمشید مرزا

بری طرح چونک پڑا۔

"سر! یہ آپ کے صاحبزادے۔ میرا مطلب ہے ان صاحب نے یہی کہا ہے۔" جمشید مرزا نے پریشان لہجے میں کہا۔

"میں کہتا ہوں یہ کیا بدتمیزی ہے ہٹاؤ اسے پیچھے ہٹو۔ ہٹتے ہو یا نہیں۔"

"ڈیڈی میں سہیل ہوں سہیل آپ کا بیٹا! ڈیڈی آپ مجھے نہیں پہچانتے کیا۔ میں آپ کا بیٹا ہوں آپ کی سونیا کی اولاد۔ مجھے پہچانیے ڈیڈی بڑے جتن کر کے آپ کے پاس پہنچا ہوں۔ نوجوان نے گلوگیر لہجے میں کہا اور بارودوالا کا چہرہ ایک لمحے کے لیے فق ہو گیا۔ لیکن یوں محسوس ہوا جیسے اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا ہو۔ اس نے غور سے نوجوان کی صورت دیکھی تھی اور اس کے چہرے کے نقوش کئی بار ابھرے تھے۔ تمام لوگ حیرانی کے عالم میں اس دلچسپ ڈرامے کو دیکھ رہے تھے۔ پھر اس کے بعد بارودوالا کی سرد آواز ابھری۔

"پولیس آفیسر! تم نے غیر ذمے داری کا ثبوت دیا ہے۔ میں نے صرف تمہارے عہدے کے بارے میں سن کر تمہیں اندر بلا لیا تھا۔ میرا کوئی بھی دشمن اس طرح مجھے نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ اگر تمہیں کوئی بے وقوفی کرنا تھی تو تم فون پر بھی کر سکتے تھے۔ ایسے کسی بیٹے کے بارے میں مجھ سے معلوم تو کر لیتے۔ میرا خیال ہے میرے خلاف کوئی سازش کی گئی ہے۔ میں اس سازش کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ بارودوالا کا لہجہ ایک دم خشک ہو گیا تھا۔

"سر یہ...... یہ آپ کا بیٹا نہیں ہے۔" جمشید مرزا کو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔

"بکواس کیوں کرتے ہو ضرورت سے زیادہ۔ میرے بیٹے کیا سڑکوں پر اس طرح مارے مارے پھرتے ہوں گے۔ میں پوچھتا ہوں یہ ہے کون آخر اور مجھ سے کیا چاہتا ہے۔"

"آئی ایم سوری سر! اس کے پاسپورٹ پر بھی آپ کا نام درج ہے اور......"

"گیٹ آؤٹ۔ میں نے غلطی کی کہ تم جیسے غیر معیاری افسر کو اس طرح طلب کر لیا میں اس وقت میٹنگ میں ہوں۔ میں اس بارے میں ہوم سیکرٹری سے بات کروں گا اور تمہاری غیر ذمے داری کی وجہ بھی معلوم ہو جائے گی۔ یہ کہاں سے آیا ہے سمجھے۔ تمہیں یہ کہاں سے ملا۔" بارودوالا نے سوال کیا۔

"سر! یہ یورپ سے آیا ہے اور اس کے سامان سے چار کلوگرام ہیروئن بھی برآمد ہوئی ہے۔" جمشید مرزا نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"خوب۔ گڈ ویری گڈ۔ دیکھ رہے ہیں آپ لوگ، میں نے غلط تو نہیں کہا تھا کہ میرے خلاف کوئی سازش کی گئی ہے۔ پولیس مجھے ہیروئن کا اسمگلر ثابت کرنا چاہتی ہے۔ چلو یہاں سے دفع ہو جاؤ آفیسر اس سے پہلے کہ میرا ٹمپر لوز ہو جائے۔" سیٹھ بارودوالا نے کہا اور جمشید مرزا نے نوجوان کی کلائی پکڑ لی۔ نوجوان نے ایک تلخ مسکراہٹ سے بارودوالا کو دیکھا اور بولا۔

"ٹھیک ہے ڈیڈی! بہت عرصہ مجھے آپ نے اپنے آپ سے دور رکھا ہے۔ لیکن اب میں یہیں آ گیا ہوں۔ اب تو آپ سے ملاقات ہوتی ہی رہے گی۔ خدا حافظ۔" جمشید مرزا نے اسے زور سے دھکا دیا اور خود بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آیا وہ غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ باہر جیپ میں اس کے ماتحت بھی بیٹھے

ہوئے تھے۔ اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہتھکڑی ڈال دو اس کے ہاتھوں میں۔''

''اس کی ضرورت نہیں آفیسر میں چل رہا ہوں آپ کے ساتھ۔'' نوجوان نے سلیقے سے کہا۔

''ہتھکڑی ڈال دو۔'' جمشید مرزا دھاڑا اور اس کے ماتحتوں نے نوجوان کے ہاتھوں میں ہتھ[کڑی]
ڈال دی۔ جمشید مرزا کے اشارے پر جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی گئی۔ لیکن جمشید مرزا کے حوا[س]
ہوئے جا رہے تھے۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے واقعی جلد بازی سے کام لیا تھا نوجوان کو اس طرح
بارود والا کی طرف لے جانے کے بجائے اسے پوری سنجیدگی سے پہلے معلومات حاصل کرنا چاہیے تھیں۔
وہ اپنے نمبر بنانے کے چکر میں تھا اور اسی تصور سے نقصان اٹھا گیا اب یہ مسئلہ مصیبت بن جائے گا۔
مشکل سے نادر اعجاز صاحب کی نگاہوں میں اپنا مقام بنا رہا تھا۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ تقدیر کو اس کا یہ مقام
نہیں ہے اور ایسے خوف ناک حادثے اسے واپس اس کی جگہ پہنچا دیں گے۔ جمشید مرزا کو شدت سے اس
کا احساس تھا کہ اس کی ایسی تیسی ہو سکتی ہے۔ بات بہت بڑے آدمی کی تھی۔ اس کی نگاہیں نوجوان کی طر[ف]
پڑیں۔ ان آنکھوں میں شدید نفرت چھائی ہوئی تھی۔ لیکن نوجوان کافی مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں [پر]
ایک شرارت بھری مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر غیر ملکی سگریٹ کا پیکٹ نکا[لا]
ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی اور پیکٹ بڑے دوستانہ انداز میں جمشید مرزا کی طرف بڑھا[دیا]
جمشید مرزا نے گردن جھٹک کر رخ بدل لیا تھا۔ لیکن دوسرے لمحے وہ بری طرح چونک پڑا۔ نوجوان
ہاتھوں سے ہتھکڑی کہاں گئی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر ہتھکڑیوں کے جوڑے کی طرف دیکھا۔ ہتھکڑیاں
کے ماتحت کے گود میں رکھی ہوئی تھیں۔ دوسرے لمحے جمشید مرزا خوف ناک انداز میں دھاڑا۔

''یہ ہتھکڑیاں کیوں نہیں لگائیں تم نے۔'' جمشید مرزا کا ماتحت بری طرح چونک پڑا تھا اس
پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہتھکڑیوں کو اپنی گود میں رکھے دیکھا اور اس کی حالت خراب ہو گئی۔

''سس سر! یہ تو میں نے لگائی تھیں اس کے ہاتھوں میں۔'' وہ ہکلا کر بولا۔

''تو پھر کیسے کھل گئیں۔'' جمشید مرزا نے پوچھا۔

''آپ بلاوجہ فکر مند ہو رہے ہیں آفیسر! چل رہا ہوں آپ کے ساتھ آرام سے بیٹھا ہوا ہوں
پریشان ہونے کی بات نہیں اس بے چارے نے ہتھکڑی میرے ہاتھوں میں لگائی تھی۔ لیکن میں ان چیزوں [کا]
عادی نہیں ہوں۔'' نوجوان نے نرم لہجے میں کہا اور جیب سے لائٹر نکال کر سگریٹ سلگانے لگا۔

♥......♥......♥

شاہ میر اور کرنل رحیم شاہ کے درمیان یہ گفتگو ہوئی تھی۔ شاہ میر صاحب نے کہا۔

''حکومتیں بدلتی رہتی ہیں کرنل شاہ! میں اپنے بارے میں کبھی کوئی پائیدار بات تو نہیں کہہ سک[تا]
وقت کسی بھی وقت تبدیل ہو سکتا ہے یا پھر یوں سمجھ لو کہ حکومت اپنی مدت پوری کر لیتی ہے۔ الیکشن ہو[تے]
ہیں۔ نئی حکومت بن جاتی ہے۔ اس میں ضروری تو نہیں ہے کہ میرے پاس میرا عہدہ قائم رہے لیکن ملک
اور ملت کے سپاہی اقتدار یا عہدوں کا انتظار نہیں کرتے اس کی سب سے اعلیٰ مثال تم خود ہو۔ تم

بارے میں کیا کہوں فوج سے ریٹائر ہو گئے۔ ایک پاؤں سے محروم ہو گئے۔ لیکن وہ جذبے نہ سو سکے جو ملک و
[وط]ن کے لیے تھے اور انہی جذبوں نے تمہیں مجبور کر دیا کہ کام کرتے رہو۔ کرنل جو جدوجہد تم اس عالم میں کر
رہے ہو۔ تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر تاریخ نہ بھی بنے۔ تب بھی اگر وطن
[پر]ستوں اور محب وطنوں کا کوئی مقام اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے تو تم ان کی فہرست میں کسی بھی طرح کہیں نیچے نہیں
رہو گے۔ میں اس شخص کے بارے میں شاید کبھی کچھ نہ کہہ سکوں جس کا نام صوفی ہے۔ وہ ایک سرمایہ ہے
وطن کے لیے کاش! میں اس کے ماضی میں جھانک سکتا۔ مجھے پتا چل سکتا کہ اس کا پس منظر کیا ہے۔
تمہیں نہیں معلوم تو مجھے کیا معلوم ہو سکتا ہے لیکن یہ پیش منظر جو ہے اس کی تو بس کوئی مثال نہیں دی جا سکتی خیر
تم نے یہ گروپ بنایا ہے اور اب تک اس نے جو کچھ کیا ہے اس کی مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہے میں اپنے
محکمے کی طرف سے چاہتا ہوں کہ تم اس کے تحت آگے بڑھو کام کرو۔ ملک کے کسی بھی گوشے میں کوئی غلط کام ہو
رہا ہو کوئی جرم ہو رہا ہو۔ اس کی چھان بین کرو مجرموں کو منظر عام پر لاؤ۔ کرنل جذبوں کو محدود کر دینا ناانصافی
ہے اپنے ساتھ، اپنی سوچوں کے ساتھ اس سلسلے میں ہر طرح کی مالی مدد بلکہ مدد کیوں کہا جائے اسے مالی
ضروریات پوری کرنا حکومت کا فرض ہے اور میں اس میں پیش پیش رہوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسی
آرگنائزیشن جیسے تمہاری گرین فورس ہے اس کو اتنی وسعت دے لو اور اس کے لیے ہر طرح کے وسائل
استعمال کرو کہ گرین فورس ملک کے گوشے گوشے میں کام کرے۔ نہ صرف ملک بلکہ ملک سے باہر۔''

''اچھا خیال ہے لیکن اس کے لیے۔''

''نہیں۔ تمہارے ذہن میں جو کچھ بھی تصور ہو اس کی تکمیل کے لیے میں موجود ہوں۔''

''میں کھل کر ایک بات کہوں صوفی سے بات کیے بغیر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''اس سے بات کر کے مجھے اطلاع دو میں انتظار کروں گا۔'' صوفی نے اگال دان میں منہ کا ملغوبہ
الٹتے ہوئے کہا۔

''غم غم...... قم قم...... پم پم......''

''اردو میں بات کیجیے یہ پان کی زبان نہیں چلے گی۔'' صوفی مسکرا دیا۔ پھر بولا۔

''جناب عالی تجویز اچھی ہے مگر منصوبہ کیا ہے۔''

''منصوبہ یہ ہے صوفی صاحب! کہ سب سے پہلے گرین فورس کی توسیع کی جائے اس میں اعلیٰ
ترین دماغ رکھے جائیں ان کی چھان بین اور انتخاب آپ ہی کریں گے۔''

''کتنے افراد کی گنجائش نکالی جائے۔''

''آپ پر منحصر ہے۔ ایک اعلیٰ درجے کی عمارت جہاں گرین فورس کے تمام ممبر ضرورت پڑنے پر
[اکٹھے] کیے جا سکیں۔ ممبروں کے لیے رہائش گاہیں جو بالکل محفوظ ہوں اور کوئی یہ نہ جانے کہ ان رہائش گاہوں
[می]ں جو لوگ رہتے ہیں۔ ان کا اصل پیشہ کیا ہے۔ کام مشکل ہے میں جانتا ہوں۔ لیکن فرصت کے دنوں میں
[ا]یسا کیا جائے تو کیا حرج ہے۔ کیا کہتے ہیں آپ۔''

''حق اللہ...... حق اللہ...... حق اللہ......'' صوفی نے پُر خیال انداز میں گردن ہلائی اور پھر بولا۔

''نہیں...... بات اصل میں یہ ہے کہ دلاور بیوی بچوں والا آدمی ہے۔ ہمارے معاملات میں بے شک بڑا کارآمد ہوتا ہے اسے گرین ہاؤس میں ہی رکھا جائے۔ غلام قادر سے اس کی قربت بھی بہت اچھی ہوگی۔ شازیہ اپنے چھوٹے سے خاندان کے ساتھ یہاں خوش ہے۔ وہ اگر چاہے تو اسے الگ جگہ دی جاسکتی ہے۔ کیونکہ گرین فورس میں اس کا مقام بڑا ہی رہے گا۔ عادل اور فیضان تو خیر میرے بچے ہیں اچھے راستے پر چلے ہیں۔ میں چاہتا ہوں صوفی صاحب کہ انہیں بھی آگے بڑھایا جائے۔ ان کے سینوں میں وطن پرستی کے جذبے ہیں۔ لیکن ان کی کارکردگی کو ذرا مستحکم کیا جائے۔ اس کے علاوہ نئے افراد کا انتخاب کریں۔ یہ لوگ اگر چاہیں تو اسی طرح گرین ہاؤس میں رہ سکتے ہیں۔ آپ براہ کرم اس سلسلے میں پلاننگ کیجیے۔ کام کا جو بھی بندہ آپ کو نظر آئے۔ آپ اسے ضرور طلب کرلیجیے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کرتا ہوں کوشش۔'' صوفی نے جواب دیا اور کرنل رحیم شاہ پُرخیال نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔

♥......♥......♥

جمشید مرزا کے سارے وجود میں آگ لگی ہوئی تھی۔ جو بے عزتی اسے اٹھانی پڑی تھی۔ اس نے اسے بری طرح برافروختہ کردیا تھا وہ اختر سہیل عالم کو لیے ہوئے اپنے دفتر میں پہنچ گیا۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش کررہا تھا لیکن جنون ابھرا آرہا تھا۔ تاہم اس وقت اس نے کسی قدر عقل مندی سے کام لیا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ نوجوان کی بوٹیاں اڑا دے۔ لیکن کچھ احساسات راستہ روکے ہوئے تھے۔ مثلاً نوجوان کے نقوش جو خاصی حد تک بارودوالا سے ملتے جلتے تھے۔ پھر بارودوالا کے چہرے کے کچھ تاثرات۔ بہرحال اس نے سہیل کو کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر اپنے آپ کو سنبھال کر بولا۔

''تم نے غلط بیانی سے کام کیوں لیا۔''

''کون سی غلط بیانی ایس پی صاحب۔''

''یہی کہ تم بارودوالا کے بیٹے ہو۔''

''ایس پی صاحب! بات چونکہ آگے بڑھتی ہے اور کہیں نہ کہیں سے بڑھتی ہے چنانچہ آپ پورا پورا یقین کرلیجیے کہ میں احمد عالم بارودوالا کا بیٹا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ انہوں نے مجھے پہچاننے کے باوجود اپنا بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ میں اس بات سے بددل نہیں ہوں۔ کیونکہ وہ دن ضرور آئے گا۔ جب وہ مجھے اپنا بیٹا مان لیں گے۔ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ میں انہی کا بیٹا ہوں۔ میری ماں برٹش تھی۔ ایک بہت اچھی فیملی سے اس کا تعلق تھا سیٹھ بارودوالا نے میری ماں کو مسلمان کرکے اس سے شادی کی تھی۔ پھر حالات میں کچھ تبدیلیاں ہوئیں۔ جن کی تفصیل آپ کے سامنے نہیں عرض کرسکوں گا۔ سیٹھ بارودوالا نے میری ماں کو طلاق دیے بغیر چھوڑ دیا اور اپنے وطن واپس آگئے۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔ میری والدہ نے اس کے بارے میں مجھے تفصیلات بڑے ہونے پر بتائیں اور میں خاصی ذمے داریاں پوری کرنے کے بعد یہاں پہنچا لیکن افسوس وہ بات بالکل سچ نکلی جو میری ماں نے مجھ سے کہی تھی۔ میری ماں نے مجھے یہی بتایا تھا کہ بارودوالا صاحب دوسری شادی کرچکے ہیں اور وہ اپنے اہل خاندان کے ساتھ مزے کی زندگی گزار رہے

ہیں۔ مجھے اپنے آپ کو ان کا بیٹا ثابت کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کرنا پڑے گی اور وہی ہوا آپ تو محکمہ پولیس سے تعلق رکھتے ہیں۔ انسان شناسی آپ کے کام کا ایک حصہ ہے۔ کاش! آپ اس وقت بارودوالا کے چہرے کے نقش ونگار دیکھتے جب میں ان کے سامنے پہنچا تھا۔ بہرحال انہوں نے مصلحت کے تحت اپنے آپ کو سنبھال لیا اور مجھے اپنا بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ ایس پی صاحب یہ بات اپنے ذہن سے نکال دیں کہ میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔''

''ہوں...... اور آپ باپ سے ملاقات کے لیے آتے ہوئے تم اپنے ساتھ چار کروڑ روپے کی ہیروئن بھی لائے تھے بھلا وہ کیوں؟'' نوجوان کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے آنکھیں بند کرکے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایس پی صاحب! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس مذاق کی بری عادت پڑی ہوئی ہے۔ ہر ایک سے چھیڑ چھاڑ کرنے کو دل چاہتا ہے میں نے کسٹم کے حکام سے تھوڑا سا مذاق کیا تھا اور اس مذاق کی بھی ایک وجہ تھی۔ وہ یہ کہ میں اپنے ڈیڈی کے موجودہ پتے سے واقف نہیں تھا۔ البتہ اس بات کا مجھے علم تھا کہ وہ اپنے وطن میں بہت بڑی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر میں وہ پسا ہوا پتھر ساتھ نہ لاتا تو پولیس مجھے میرے ڈیڈ تک پہنچانے میں کوئی امداد نہ دیتی اور مجھے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔''

''کیا......؟'' جمشید مرزا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

اختر سہیل بڑے دل آویز انداز میں مسکرا رہا تھا۔

''جی ہاں وہ ہیروئن نہیں ہے۔ اگر وہ آپ کے پاس محفوظ ہے تو اس کا تجزیہ کرالیں۔ میں نے کہا کہ وہ تو صرف ایک مذاق تھا۔''

''بکواس کررہے ہو تم۔'' جمشید مرزا نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''آپ کی مرضی ہے اگر آپ کسی کام کی بات کو بکواس کہتے ہیں تو میرا خیال ہے کہ مجھے اتنی اردو نہیں آتی۔ آپ ہی زیادہ بہتر کہہ رہے ہوں گے۔''

''میں کہتا ہوں تم ہوش میں آؤ گے یا نہیں۔''

''عالم ہوش ہی میں ایسی باتیں کی جاتی ہیں۔ ایس پی صاحب آپ کو اپنے لہجے اور انداز پر آخرکار شرمندہ ہونا پڑے گا۔ بلکہ اگر آپ نے اس سے بھی برا لہجہ اور لفظ استعمال کیے تو ممکن ہے آپ کو ان کا نقصان بھی اٹھانا پڑے۔ اس لیے میرے ساتھ بہتر سلوک کریں اور اس طرح بات کریں جس طرح دو شریف آدمی کرتے ہیں۔ جمشید مرزا بھنائے ہوئے انداز میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ لیکن پھر بیٹھ گیا۔ ضرورت سے زیادہ جذباتیت بھی کبھی کبھی شدید نقصانات کا باعث بن جاتی ہے۔ پھر اس نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

''تمہاری چالاکی کا مجھے اندازہ ہوچکا ہے۔ ہر لمحہ تم ایک نیا رخ بدل لیتے ہو ہیروئن میرے قبضے میں ہے اور میں اسے ٹیسٹ کے لیے بھی بھجوا سکتا ہوں۔''

''اصولی طور پر میرے اس انکشاف کے بعد ایس پی صاحب آپ کو ایسا ہی کرنا چاہیے تاکہ اس کی رپورٹ آنے کے بعد میری گرفتاری کا جواز ختم ہوجائے اور آپ مجھے باعزت طریقے سے رہا کردیں

اصل میں جو کام میں نے آپ سے لینا تھا وہ میں لے چکا ہوں۔ میں اپنے منحرف باپ سے ملاقات کرنا
تھا۔ تو وہ ہو چکی ہے کچھ مستند لوگوں کے سامنے جیسے آپ اب یہ دوسری بات ہے کہ خود کو تسلیم کرانے کے
مجھے مشکل مرحلوں سے گزرنا ہوگا۔"

"احمد عالم بارودوالا کے ساتھ کوئی بدتمیزی کرنے کا مطلب جانتے ہو تم۔"

"ایس پی صاحب یہ بات آپ کے کانوں تک پہنچ چکی ہے کہ وہ میرے ڈیڈی ہیں اور آنے
وقت اس بات کی تصدیق کردے گا۔ پھر یہ باتیں کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں ہے اس کے باوجود آپ
فرائض سرانجام دیں اور میں اپنا کام کروں گا۔ آپ نے ایک بات پر غور نہیں کیا اور نہ ہی کسی اور نے
احمد عالم بارودوالا کے انکار پر آپ مجھے یہاں پکڑ تو لائے ہیں لیکن میں قانونی طریقے سے یہاں آیا ہوں
برطانیہ کے ایک شہری کی حیثیت رکھتا ہوں۔ اب ایک بات آپ ذہن میں رکھیے۔ اگر آپ نے ایک گھنٹہ
اپنی تحویل میں رکھا تو برطانوی سفارتخانے کو آپ کو جواب دینا ہوگا۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ پسا ہوا پتھر
ایک ضرورت ہے اور اگر یہ ہیروئن نہ نکلا تو آپ سوچ لیجیے کہ آپ کے ساتھ کیا ہوگا میں تو کہہ دوں گا کہ
نے آپ کو پوری تفصیل بتا دی تھی۔

جمشید مرزا پُرخیال نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اوّل تو اس سے ایک حماقت ہو چکی تھی جو بہت
بڑی حماقت تھی۔ وہ احمد بارودوالا کے پاس دوڑے جانے کی اور پھر اس لڑکے کی بکواس لیکن لڑکے کی چمک
آنکھوں پر اعتماد مسکراہٹ پشیمانی کی بناوٹ سے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ معمولی شخصیت کا مالک نہیں ہے
کہیں ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں لیکن جمشید مرزا خود بھی ایک ضدی آدمی تھا۔ ہر چند کہ کسٹم وا
بھی اس معاملے میں ملوث تھے لیکن ذمے داری اس پر بھی آتی تھی۔ اگر احمد عالم نے ڈی آئی جی صاحب
سے رابطہ قائم کرلیا تو خاصی جھاڑ پڑے گی اس پر اور ممکن ہے کچھ اور بھی مشکلات پیش آجائیں۔ کیونکہ
احمد عالم کے پاس دوڑا چلا گیا تھا۔

اور احمد عالم نے نہایت نفرت کے ساتھ اس لڑکے کو اپنی اولاد ماننے سے انکار کردیا تھا
جھنجھلاہٹ میں اس نے بیل بجائی اور متعلقہ افسروں کے آنے کے بعد اس نے کہا۔

"اسے لاک اپ کردو۔" سہیل نے چونک کر جمشید مرزا کو دیکھا پھر بولا۔

"دیکھیے ایس پی صاحب میں آپ کو پھر وارننگ دے رہا ہوں کہ میرے ساتھ اس طرح کا کوئی
سلوک نہ کیا جائے۔ آپ مجھے کس جرم میں لاک اپ کررہے ہیں میں ایک معزز آدمی ہوں۔ ایئرپورٹ
اترا تو کسٹم والوں نے ایک ایسے پاؤڈر کو ہیروئن قرار دے دیا جو دراصل پسا ہوا پتھر ہے۔ یہ پاؤڈر میں
ایک اہم ضرورت کے لیے لایا تھا۔ اس کا وزن چار پونڈ ہے اور اس میں کوئی بھی ایسی چیز شامل نہیں ہے جو
قسم کے نشے کے لیے استعمال ہوتی ہو۔

یہ سب کچھ بتانے کے بعد بھی اگر آپ نے مجھے لاک اپ کیا تو پھر میں آپ کو کبھی معاف نہیں
کروں گا۔ آپ ایسا کیجیے عزت و احترام کے ساتھ مجھے اپنے پاس بٹھائیے سر! کھل کر بات کیجیے کیونکہ
ایک بہت بڑے آدمی کا بیٹا ہوں۔ کچھ کولڈ ڈرنک وغیرہ پلائیے اور اس دوران آپ اس پاؤڈر کا تجزیہ کر

کے بعد میری گلوخلاصی کردیجیے۔ جمشید مرزا نے ایس آئی کی طرف دیکھ کر غراتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہارے کان بند ہیں، میں نے کیا کہا تھا ابھی۔"

"یس سر! یس سر! ایس آئی نے سلوٹ کیا اور ایک لمحے کے اندر باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ
کچھ سپاہیوں کے ساتھ اندر آیا اور اختر سہیل کو بازوؤں سے پکڑ لیا گیا۔

"گویا اعلانِ جنگ، آپ نے میرے ساتھ تعاون نہیں کیا۔ آنے والے وقت میں آپ کے
ساتھ بھی کوئی تعاون نہیں کیا جائے گا۔ چلیے۔" سہیل بولا اور سپاہیوں کے ساتھ چل پڑا۔ سپاہی اسے لاک
اپ کے پاس لائے اور اسے اس کے اندر بند کردیا گیا۔ سہیل اطمینان سے لاک اپ کے فرش پر جا بیٹھا تھا۔
ادھر جمشید مرزا چند لمحات سوچتا رہا پھر اس نے ٹیلیفون پر کسی سے رابطہ قائم کیا۔ یہ اس کے ماتحتوں میں سے
ایک آدمی تھا۔ جو اس کے لیے خصوصی کام سرانجام دیا کرتا تھا۔ پھر اس نے ایک اردلی کو بلا کر اس کے ساتھ
اس پاؤڈر کی تھوڑی سی مقدار روانہ کردی۔ اس نے حکم دیا تھا کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر اسے اس پاؤڈر کا
کیمیاوی تجزیہ کرکے اس کی رپورٹ بھیج دی جائے۔ ابھی وہ ٹیلیفون رکھ کر فارغ ہی ہوا تھا کہ دفعتاً ہی
دروازے میں اس نوجوان کی صورت نظر آئی۔

"میں حاضر ہوسکتا ہوں۔" اس نے سوال کیا اور جمشید مرزا بری طرح اچھل پڑا۔ وہ متحیرانہ انداز
میں نوجوان کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اس کے عقب میں ان لوگوں کو دیکھنے کی کوشش کی جو اسے لے کر یہاں
آئے تھے۔ نوجوان اندر آگیا اور اس نے کہا۔

"معافی چاہتا ہوں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ مجھے یہاں کتنی دیر لگ جائے گی۔ اصل میں کچھ
دوسرے لوگوں سے بھی مجھے ملاقات کرنی تھی۔"

"تم...... تم...... تم کون ہو اندر آؤ۔" جمشید مرزا نے کہا لیکن کوئی اندر نہیں آیا تو وہ بولا۔

"تمہیں لاک اپ میں بند نہیں کیا گیا۔ میں نے تو یہ حکم دیا تھا کہ تمہیں لاک اپ میں بند کردیا جائے۔"

"جن لوگوں کو آپ نے حکم دیا تھا یہ سوال آپ میرے بجائے ان سے کیجیے؟ ہاں اگر آپ مجھے
کچھ حکم دیتے تو میں ضرور مانتا۔" اور جمشید مرزا کا ہاتھ گھنٹی پر چلا گیا۔

اردلی اندر آیا اور نوجوان کو دیکھ کر چونک پڑا۔

"ایس آئی بیگ کو بلاؤ۔ میرے حکم کی تعمیل کیوں نہیں کی گئی۔" جمشید مرزا نے کہا اور چند لمحات
کے بعد ایس آئی اندر آگیا۔ لیکن نوجوان کو دیکھ کر اس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

"اسے بند نہیں کیا تم نے۔"

"سس...... سس...... سر ہم نے تو اس کو سر لاک اپ میں بند کردیا تھا۔ پھر اس کو کس نے کھول
دیا" ایس آئی نے کہا۔

"یہ سوال تم مجھ سے کررہے ہو۔" جمشید مرزا غرایا اور ایس آئی گڑاپ سے باہر نکل گیا اور اس
کے بعد ان سپاہیوں کو لے کر اندر آیا جو اسے لے کر لاک اپ میں گئے تھے۔ وہ ایس آئی کے حکم پر نوجوان کی
طرف لپکے لیکن سہیل اپنی جگہ سے پیچھے ہٹ گیا اور بولا۔

”میں آخری وارننگ دے رہا ہوں ایس پی صاحب اگر آپ نے پھر مجھے لاک اپ میں بند کیا تو میں پھر واپس آپ کے پاس نہیں آؤں گا۔ بلکہ یہاں سے نکل جاؤں گا اور سیدھا اپنے سفارتخانے جاؤں گا۔ اس کے بعد جو کچھ بھی کروں گا اس کی ذمے داری مکمل طور پر آپ کی ہوگی۔ میں کہتا ہوں تم لاک اپ سے نکل کیسے آئے۔ جمشید مرزا نے کہا۔

”کیا اتنے بڑے تعلقات کے بعد اس بات کا جواب دینا مجھ پر فرض ہے۔ سمجھ لیں جیسے آپ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا کر لا رہے تھے۔ لیکن میں نے اطمینان سے سگریٹ پینا شروع کر دیا اسی طرح لاک اپ سے نکلنا میرے لیے مشکل نہیں تھا اور ایک بات اور عرض کروں آپ سے جو کہہ رہا ہوں اسے کان کھول کر سن لیں۔ آپ کے پاس ابھی کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں آپ مجھے بند کر سکیں میں آپ کو چیلنج کرتا ہوں۔“ جمشید مرزا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر اسے اس چیلنج کا خیال آیا اور وہ غصے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”یہ بات ہے۔“ اس نے اختر سہیل کو خونی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

”جی بالکل یہی بات ہے۔“

”ہتھکڑیاں لے آؤ۔“ جمشید مرزا نے جواب دیا اور ایس آئی باہر دوڑ گیا۔ اس کی حالت خراب تھی۔ چند ساعت کے بعد ہتھکڑیوں کا جوڑا جمشید مرزا کے پاس پہنچ گیا۔ اختر سہیل نے دونوں ہاتھ آگے کر دیے تھے۔

”ہاتھ پیچھے کرو۔“ جمشید مرزا بولا اس بار اس نے ہتھکڑیاں اپنے ہاتھ سے اس نوجوان کے ہاتھوں میں لگائی تھیں اور ایسی بندش کی تھی کہ ہاتھوں میں جنبش بھی نہ ہو سکے۔ پوری طرح اس کے ہاتھوں کو کسنے کے بعد وہ نفرت بھرے انداز میں مسکراتا ہوا اپنی میز کی طرف بڑھ گیا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

”جی میرے لیے کیا حکم ہے ایس پی صاحب!“ اختر سہیل نے ہتھکڑیوں کا جوڑا جمشید مرزا کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا اور جمشید مرزا کو چکر آ گئے۔ ناممکن بات تھی وہ پولیس کا آدمی تھا۔ بے شمار آدمیوں کو اس نے اپنے ہاتھوں سے ہتھکڑیاں لگائی تھیں اور اس وقت بھی جو کچھ اس نے کیا تھا اس کے بعد یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ یہ ہتھکڑیاں چند سیکنڈ میں کھولی جا سکتی ہیں۔ لیکن یہ ناممکن ممکن ہو کر اس کے سامنے موجود تھا۔ سپاہی اور ایس آئی بھی ابھی تک دفتر میں موجود تھے اور اسی کی طرح چکرا رہے تھے۔ دفعتہً ہی جمشید مرزا نے کہا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“

”یس...... یس سر!“ وہ سب دروازے کی طرف مڑتے ہوئے بولے اور بدحواسی کے سے انداز میں باہر نکل گئے۔ جمشید مرزا کچھ دیر تک سوچتا رہا اس کی عقل اس کی کھوپڑی سے ایک انچ اوپر ناچ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سر پھرے نوجوان کے ساتھ کیا سلوک کرے اور اب اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ اپنے رویے میں نرمی پیدا کرے اور اس وقت تک اسے باتوں میں لگائے رکھے جب تک ہیروئن کی کیمیاوی رپورٹ نہ آ جائے۔ چنانچہ اس نے موڈ بدل لیا اور بولا۔

”ہوں...... بیٹھو۔“

”شکریہ...... بہت پیاس محسوس کر رہا ہوں۔ کچھ منگوا دیجیے جمشید مرزا نے ساتھ رکھے ہوئے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا اور بولا۔

”کولڈ ڈرنک لاؤ۔ میرے لیے اور مہمان کے لیے۔“ پھر اس نے فون رکھ کر کہا۔

”اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تم بہت بڑے فنکار ہو۔ کیا کیا کاریگری کر لیتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ جب تم اس طرح لاک اپ سے باہر نکل سکتے ہو ہتھکڑیاں کھول سکتے ہو تو تجوریاں بھی کھول لیتے ہو گے۔ ڈاکے بھی ڈال لیتے ہو گے۔“

”بہت کچھ بہت کچھ لیکن ظاہر ہے ایس پی صاحب اپنے بارے میں آپ کو زیادہ نہیں بتاؤں گا۔ ویسے بھی آپ نے شروع سے ہی میرے ساتھ غیر دوستانہ رویہ رکھا ہے۔ آپ یقین کیجیے کہ لاک اپ سے نکلنے کے بعد میں باہر بھی جا سکتا تھا۔ لیکن آپ یقین کریں کہ میں نہیں چاہتا کہ میں کسی غیر قانونی حرکت میں ملوث ہو جاؤں۔ آپ کو اس پاؤڈر کی رپورٹ مل جائے اس کے بعد آپ مجھے رہا کر دیں اور میرے ساتھ اپنا رویہ سنبھال لیں۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت بھی پیش آ جائے۔ اپنے باپ کو باپ ثابت کرنے کے لیے۔“

”تمہیں کیسے معلوم کہ میں نے وہ پاؤڈر تجزیے کے لیے بھیج دیا ہے۔“

”عام سی بات ہے ایس پی صاحب آپ کو بھی آخر اپنی بیلٹ کمر میں باندھے رکھنی ہے اپنے پھول کاندھوں پر سجائے رکھنا ہے۔ ظاہر ہے آپ اپنی تسلی کیے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں۔ اختر سہیل نے کہا اور بے پروائی سے پاؤں پھیلا کر سر کرسی سے ٹکا لیا۔ بہت دیر کے بعد جمشید مرزا کو ٹیلیفون کی گھنٹی سنائی دی اور نے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف لیبارٹری انچارج بول رہا تھا۔ اس نے اپنا تعارف کرایا تو جمشید مرزا نے کہا۔

”کیا رہا۔“

”کچھ نہیں جناب! پسا ہوا سنگِ مرمر ہے اور اس میں کوئی نشہ آور چیز شامل نہیں ہے۔“ جمشید مرزا نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ واقعی چکر سے جھوم رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

”رپورٹ تیار کر لی ہے تم نے۔“

”جی سر! ابھی روانہ کر رہا ہوں اس سے پہلے میں نے آپ کو اطلاع دینا مناسب سمجھا تھا۔“

”رپورٹ بھیجو۔“ جمشید مرزا نے کہا اور ریسیور رکھ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ چند ساعت سوچتا رہا پھر بھاری لفظوں میں بولا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو اختر سہیل وہ ہیروئن نہیں ہے لیکن ابھی تم اپنے اوپر سے فرد جرم زائل نہیں کر سکے۔ تم نے ایک اور حرکت کی ہے یعنی احمد عالم بارود والا جیسے باعزت آدمی کا بیٹا ہونے کی کوشش کی ہے۔ میں تمہیں حراست میں تو نہیں رکھ سکتا۔ لیکن تم جہاں بھی کہیں ہو گے پولیس والوں کو اپنی موجودگی سے آگاہ رکھو گے۔ ویسے تمہارا قیام کہاں ہو گا۔“

”یقینی طور پر ابھی آپ کے شہر کے کسی فٹ پاتھ پر، ویسے آپ کی پولیس یہ تو جانتی ہو گی کہ کون کون سے فٹ پاتھ انسانوں سے آباد ہیں۔“

''کیا مطلب۔'' میں یہاں کی زندگی کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں ہوٹل کے اخراجات شاید میں ادا نہ کرسکوں۔ کیونکہ میرے باپ نے مجھے اپنا بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور میں اتنے پیسے نہیں لے کر آیا کہ یہاں ہوٹلوں میں زندگی گزار سکوں وہاں میری کوئی آمدنی نہیں تھی۔ چنانچہ میری ابتدا کسی فٹ پاتھ سے ہی ہوگی۔ اس کے بعد کوئی ذریعہ حاصل ہوسکا تو شاید کسی ہوٹل وغیرہ میں چلا جاؤں۔''

''تم جہاں بھی جاؤ میں نے تم سے ایک کہہ دی ہے کہ پولیس سے رابطہ قائم رکھنا اور اب سب سے پہلے تم اپنی آمد درج کردو۔''

''کیوں نہیں کیوں نہیں یہ قانونی کارروائی میں یقیناً کروں گا اور اگر آپ میرا اتنا وقت ضائع نہ کرتے تو اب تک کر چکا ہوتا۔ بہرصورت خدا حافظ میرا سامان مجھے منگوادیا جائے۔'' اختر سہیل نے کہا اور جمشید مرزا نے دوبارہ اردلی کو بلا کر اس کے احکامات دے دیے۔ اب تو اس دل چاہ رہا تھا کہ جلدی ہی اس بلا سے جان چھڑائے۔ اگر احمد عالم بارود والا کی طرف سے کوئی شکایت ہوئی اور اس سلسلے میں کوئی باز پرس کی گئی تو وہ یہ تو کہہ سکے گا کہ ایک برطانوی شہری کو وہ قید نہیں رکھ سکتا تھا۔ جبکہ وہ کسی جرم میں ملوث نہیں ہے۔ اس طرح ممکن ہے کہ آگے کے حالات کچھ بہتر ہوجائیں۔

چنانچہ اس نے فوری طور پر یہی مناسب سمجھا تھا کہ نوجوان کو رہا کردے۔

♥......♥......♥

ممن خان کے ہوٹل پر پھپھوندی وگرد جمی ہوئی تھی۔ شکایتوں کے دفتر کھول دیے گئے تھے اور صوفی ہکلا ہکلا کر سب کو جواب دے رہا تھا۔ مرزا قیوم بیگ نے کہا۔

''اماں صوفی صاحب بدل گئے قسم اللہ کی کہتے تھے کہ زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد''

''میرے کو کچھ کہا۔'' گل محمد سبزی فروش نے سر اٹھا کر کہا۔

''ارے نہیں بھائی۔ فارسہ میں بات ہو رہی ہے۔'' معشوق نشیلے جو اس نشست میں موجود تھے۔ جلدی سے بول پڑے۔

''یار ایک تو تیرے فارسہ نے ہمارا ناک میں دم کر رکھا ہے صوفی صاحب ایک خطرے سے آپ کو خبردار کر دینا ضروری ہے۔'' کسی اور نے کہا۔

''خ...... خ خطرہ، درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''خطرے درویشوں کی دعاؤں سے نہیں ہوتے۔ درویشوں کی دعاؤں سے تو برکتیں ہی برکتیں ہوتی ہیں۔''

''پھر کون سے خطرے کی بات کر رہے ہیں آپ۔''

''گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔''

''فارسہ میں کچھ اور کہا ہے۔'' معشوق نشیلے نے جلدی سے لقمہ دیا۔

''تیرے ہی بارے میں کہہ رہا ہوں یار، صوفی صاحب آپ کی آبرو پر ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے۔''

''آبرو۔'' صوفی نے جلدی سے شیروانی کے کھلے ہوئے بٹن لگانا شروع کر دیے۔

''وہ مطلب یہ...... کہ آپ کے گھر میں۔''

''اماں کیوں مذاق کرتے ہو۔ میرے گھر میں کیا رکھا ہوا ہے۔''

''یہاں تو نہیں رکھا۔ لیکن وہ گھر جس کو آپ نے آباد کرایا ہے اور غریبوں کا محلہ چھوڑ دیا ہے اس کی بات ہو رہی ہے۔''

''وہاں کون ڈاکہ ڈال رہا ہے۔''

''گھر کا بھیدی۔''

''یہ کون ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''معشوق نشیلے۔ حسینہ کون ہے آپ کی کوئی رشتے دار ہے اس کے لیے تعویذ گنڈے کراتے پھر رہے ہیں۔''

''ابے کیا تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔'' معشوق نشیلے نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''نہیں بھائی صوفی صاحب سے بڑی پرانی محبت ہے ہماری'' صوفی کا گھن گرج قہقہہ فضا میں گونج اٹھا تھا۔

''آپ ہنس رہے ہیں صوفی صاحب میں سچ بتا رہا ہوں کہ یہ معشوق نشیلے پتا نہیں کیا کیا تعویذ گنڈے کراتے پھر رہے ہیں۔''

''معلوم ہے...... معلوم ہے ہمیں۔ درویش ہماری رہنمائی کرتے رہتے ہیں لیکن معشوق نشیلے کے برے اعمال ان کے سامنے آرہے ہیں۔''

''کیا مطلب برے اعمال۔'' کسی نے سوال کیا۔

''تو اور کیا جن خاتون سے یہ مرحوم اظہار محبت فرما رہے ہیں وہ اٹھارہ سو چوہے کھا چکی ہیں۔ یعنی نو سو دو دفعہ درویشوں کی دعاؤں سے وہ انہیں بھی چوہا سمجھ کر کھا جائیں گی۔ یہ ہماری پیشین گوئی ہے۔ یاد رکھنا۔''

''اماں نشیلے صاحب کیوں موت آرہی ہے بھائی میاں آپ کے کوئی آگے پیچھے تو ہے نہیں۔ مارے جاؤ گے بن موت۔''

''تو مارے ہی تو جانا چاہتے ہیں۔'' معشوق نشیلے نے غمزدہ لہجے میں کہا اور پھر اس شخص کی طرف دیکھ کر بولے جو معشوق نشیلے کے بارے میں بتا رہا تھا۔

وہ غیبت کر رہے ہو سیدھے جہنم میں جاؤ گے بغیر...... کہ وہ جو کسی نے فارسہ میں کہا ہے۔''

''دیکھیے فارسہ میں کسی نے کچھ نہیں کہا۔ یہ ہم آپ کو بتائے دے رہے ہیں۔''

''بہر حال بات صوفی صاحب کی تھی جو صوفی صاحب کے علم میں ہے یہ سب کچھ تو ہمیں کیا مصیبت پڑی ہے۔''

''ہاں معشوق نشیلے کے لیے فاتحہ خوانی کا بندوبست کرلیا جائے۔ ٹھیک ہے معشوق صاحب قربان ہوجایئے ہم آپ کا عرس کردیا کریں گے۔'' بہرحال صوفی بہت دن کے بعد یہاں آیا تھا۔ دوستوں کی شکایت تو ہونی ہی تھی۔ لیکن بہرحال وہ ان لوگوں سے کبھی الگ نہیں رہ سکتا تھا۔ ہر اچھے برے وقت کے ساتھی

تھے۔ پچھلے دنوں کرنل رحیم شاہ نے تجویز پیش کی تھی کہ گرین فورس میں اضافہ کیا جائے اور اسے بہتر بنایا جائے۔ صوفی اس پر غور کر رہا تھا۔ دونوں صورتیں تھیں ایک تو یہ کہ کرنل رحیم شاہ معذرت کرلی جائے اور کہا جائے کہ اس کی اپنی زندگی کا ایک سیٹ اپ ہے وہ اس سیٹ اپ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا۔ جو کچھ کر رہا ہے بس وہیں تک محدود رہنے دیا جائے۔

لیکن کرنل کی شخصیت ایسی مسحور کن تھی، اس کے جذبے اس قدر بلند تھے کہ اس سے کوئی دوٹوک بات کرنا دنیا کا مشکل ترین کام تھا۔ خوب دولت مند اور گھر گرہستی والا آدمی تھا۔ ایک اچھے خاندان میں گھرا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اپنی اکلوتی ٹانگ کے ساتھ وہ ہر مسئلے میں آگے آگے رہتا تھا اور اسی چیز نے صوفی کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ صوفی خود بھی قومی جذبوں سے مالا مال تھا۔ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ اس کے اپنے اندر کی سلطنت بہت وسیع اور مضبوط تھی۔ اپنا حلقہ احباب اسے ہر طرح کی آسائشیں دیتا تھا۔ ہر قسم کے ذہنی تعاون سے مالا مال تھا۔ اسے بھی کیا پڑی تھی کہ ان چکروں میں پڑتا۔

لیکن...... بس جذبے انسان کو کیا کیا کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ وہ انہی جذبوں سے متاثر تھا۔ زندگی کی گاڑی بڑی خوش اسلوبی سے چل رہی تھی۔ حسینہ اور معشوق نشیلے کا کردار بھی باعث دلچسپی تھا اور فرصت کے لمحات میں دونوں کی چونچیں صوفی کو بڑی دلکش لگتی تھیں۔ حسینہ تو خود اسے بھی نہیں چھوڑتی تھیں۔ ایک زبان سے ہزاروں سنا دیتی لیکن صوفی کو بھلا ان باتوں کی کہاں پروا ہوتی تھی وہ زندگی کے مزے لے رہا تھا اور کرنل رحیم شاہ کی باتوں پر غور بھی کر رہا تھا۔ اب تک اس نے کوئی واضح فیصلہ نہیں کیا تھا۔ کرنل رحیم شاہ بھی ان دنوں گرین ہاؤس میں موجود تھا۔ خاصے دن سے یہیں وقت گزار رہا تھا۔ اس کی اپنی دوسری مصروفیات بھی ہوا کرتی تھیں۔

وسیع و عریض زمینیں تھیں اور ان زمینوں کے اپنے مسائل تھے۔ بہرحال ممن خان کے ہوٹل کی یہ میٹنگ ایک قرارداد کے بعد ختم ہوگئی۔ جس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ جمعرات کی شام کو صوفی یہاں آجایا کرے گا اور جمعہ کا پورا دن گزارے گا۔ اگر جمعے کی شام کا یا رات کا کوئی پروگرام نہ ہوا تو پھر وہ واپس چلا جائے گا۔ جمعرات کی رات یا تو محلے میں قوالی ہوگی یا محفل مشاعرہ۔ یا کوئی بھی نشست کھانے پینے کی۔ صوفی نے اس بات کا بھرپور وعدہ کرلیا تھا۔

♥......♥......♥

آئی جی نادر حیات کو فون موصول ہوا۔ یہ ڈی آئی جی صاحب کا خاص فون تھا جس کے بارے میں آپریٹر کو ہدایت تھی کہ اہم ترین شخصیتوں سے اس فون پر بات کرائی جائے۔ عام آدمی کے لیے دوسرے فون موجود تھے جن کا تعلق ماتحتوں سے تھا اور اگر کوئی بہت ہی اہم مسئلہ ہوتا تھا تو ماتحت نادر حیات صاحب کو اطلاع دیتے تھے۔ نادر حیات صاحب نے فون موصول کیا۔

''ہاں کون صاحب۔''

''نادر حیات میں احمد عالم بارودوالا بول رہا ہوں۔''

''اوہو...... بارودوالا صاحب کیسے مزاج ہیں۔ بڑی خوشی ہوئی آپ کی آواز سن کر۔ ورنہ ہم جیسے لوگوں کو آپ کی آواز کہاں سننے کو ملتی ہے۔''

''ارے بھائی اگر ایسی بات ہے تو میں اپنے ایک لیکچر کو کیسٹ میں ریکارڈ کرکے تمہارے پاس بھیج دیتا ہوں۔ یہ کیا بات ہوئی پہلے بھی کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ آؤ کبھی ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔ زندگی کے دوسرے کھیل تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ ہماری تمہاری تو بہت پرانی دوستی ہے۔''

''بہت بہت شکریہ۔ ویسے میں جانتا ہوں کہ آپ کی مصروفیات کیا چل رہی ہیں۔''

''مصروفیات تو خیر جو کچھ بھی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ایسی الجھنیں پیدا ہوجاتی ہیں کہ ذہن پریشان ہو کر رہ جاتا ہے۔''

''خیریت...... خیریت ہم کس مرض کی دوا ہیں بتائیے کیا الجھن ہے۔''

''معاف کرنا یہ تمہارا محکمہ پولیس جو ہے نا اسے بہت ایڈوانس ہونا چاہیے۔ کم از کم اس میں اعلیٰ عہدے داران تو ایسے ہوں جو صورت حال کو سمجھیں یہ محسوس کریں کہ ملک میں کس شخص کی کیا اہمیت ہے۔ یا کیا کہ دوڑے چھوٹے اور اس طرح تحقیق کرنے پہنچ گئے جیسے کسی سڑک چھاپ شخص سے......''

''کوئی خاص بات ہوگئی ہے کیا۔'' نادر حیات نے پوچھا۔

''ہاں، یہ غالباً آپ کے محکمے کے ایس پی صاحب ہیں۔ جمشید مرزا کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ یہ صاحب کچھ ضرورت سے زیادہ اچھل کود کے عادی ہیں۔''

''خیریت...... خیریت'' نادر حیات نے تعجب سے پوچھا ان دنوں جمشید مرزا کا ریکارڈ بہت اچھا چل رہا تھا۔ ایسے دو تین کیس پکڑ چکے تھے کہ نادر حیات کے دل میں ان کے لیے ایک گنجائش پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن اس بات کی ٹوہ میں خود نادر حیات بھی تھا کہ جمشید مرزا کی سرپرستی کون کر رہا ہے۔ وہ خود جس قدر اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اس کا نادر حیات صاحب کو اندازہ تھا۔ آخر آئی جی کے عہدے تک پہنچے تھے۔ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

بہرحال بارودوالا نے کہا۔

''جمشید مرزا صاحب ایک نوجوان شخص کو لے کر میرے پاس پہنچے تھے جو منشیات کی اسمگلنگ کے کیس میں گرفتار کیا گیا تھا اور پولیس نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس شخص نے آپ کے ایس پی صاحب کو بتایا کہ وہ احمد عالم بارودوالا کا بیٹا ہے حالانکہ وہ لڑکا یورپین ہے غالباً لندن سے آیا ہے اس کے نقوش تک یورپین ہیں لیکن ایس پی صاحب کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ میرا بیٹا ہے تو انہوں نے مجھ سے فون پر بھی تصدیق کی ضرورت نہیں سمجھی اور اسے لے کر میرے پاس دوڑے چلے آئے نمبر بنانے کے لیے۔ آپ مجھے خود بتائیے کہ کیا میری شخصیت آپ لوگوں کی نظروں میں اتنی ہی معمولی ہوگئی ہے کہ ایک شخص کوئی فضول بات کہہ دے اور آپ کا آفیسر میرے پاس چڑھ دوڑے اول تو ایسے کسی شخص کو میرے پاس لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ دوئم اگر لے بھی آئے تھے تو ایسے الفاظ میرے کانوں میں نہیں پڑنے چاہیے تھے۔ میں اعصابی مریض ہوں بہرحال میں نے انہیں حقیقت حال بتائی اور اس کے بعد سے اب تک مسلسل ذہنی ہیجان کا شکار ہوں۔ آپ تصور نہیں کرسکتے کہ میرے دل و دماغ پر کیا گزری ہے۔ نادر حیات تھوڑی

دیر تک تو سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ احمد عالم بارودوالا کی ملک میں کیا حیثیت ہے ایسا کوئی آدمی اگر محکمہ پولیس کی شکایت کرے اور اس طرح کی بات جو جمشید مرزا جیسا بے وقوف آدمی کرے تو یہ تو محکمے کی بدنامی تھی اور اس کی جواب دہی براہ راست نادر حیات صاحب پر آجاتی تھی۔ باقاعدہ وزیراعلیٰ صاحب اس سلسلے میں باز پرس کر سکتے تھے۔ نادر حیات نے خود کو سنبھال کر کہا۔

''بارودوالا صاحب آپ نے اس سے پوچھا نہیں کہ وہ کون شخص تھا اور ایسا کیوں کرنا چاہتا تھا۔''

''یار کمال کرتے ہو۔ میں اس ایس پی سے اس طرح سے سوالات کرتا۔ البتہ میں نے اسے سختی سے منع ضرور کر دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ میں آپ سے شکایت کروں گا۔ بات یہ ہے کہ نادر صاحب کہ ہمارے بے پناہ دشمن ہوتے ہیں۔ دوست کم اور دشمن زیادہ اور دشمنی بھی ان کی اپنی ذات تک محدود ہوتی ہے آپ کو اس بات کا اندازہ ہے کہ یہ دشمن نہ صرف ملک بلکہ ملک سے باہر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ میرے کاروباری حریف بھی مجھے ہر طرح کی زک پہنچانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ وہ کچھ بھی نہیں ہیں میرے سامنے اور دس ہزار گناہ زیادہ ریشہ دوانیاں کر لیں۔ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ لیکن آپ خود دیکھ لینا یہ تصور ہی کیا کم ہے کہ کوئی میرے خلاف سازش کرنے کے لیے خود میرے سر پر پہنچ جائیں۔''

''واقعی...... آپ مجھے بتائیے کہ میں اس سلسلے میں کیا کروں۔''

''پہلی بات تو یہ کہ ان ایس پی صاحب کے ذرا کان کھینچ دیجیے گا۔ اس کے علاوہ آپ انہیں ہدایت کریں کہ ذرا اس شخص کا شجرہ نسب معلوم کریں۔ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے اور کس مقصد کے تحت آیا ہے۔ اگر اسمگلر ہے تو میرے نام سے کیا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اور مجھے باپ بنانے پر کیوں تلا ہوا ہے۔''

''ویسے بات ذرا کچھ عجیب سی ہے باپ بنانے میں کوئی حرج تو نہیں ہے بڑا متبرک رشتہ ہے۔''

''جی ہاں۔ متبرک تو ہے لیکن ان کے محرکات سے آپ واقف نہیں ہیں۔ احمد عالم بارودوالا نے بھی خوشگوار لہجے میں کہا۔

''بالکل فکر نہ کریں احمد عالم ویسے وہ نوجوان کیا ابھی تک جمشید مرزا کی تحویل میں ہے۔''

''ارے آپ یہ سوال مجھ سے کر رہے ہیں۔ جناب اعلیٰ محکمہ پولیس کے انسپکٹر جنرل آپ ہیں میں نہیں ہوں۔'' احمد عالم بارودوالا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ہاں...... ہاں جی بہت بہت شکریہ۔ اس یاد دہانی کا۔ آپ مطمئن رہیں مجھے خود افسوس ہے اس بات کا اور میں ابھی اس سلسلے میں معلومات حاصل کیے لیتا ہوں۔ ویسے ایک بات آپ اپنے ذہن سے نکال دیجیے۔ زبردستی کون کسی کو باپ بنا سکتا ہے۔ ٹھیک ہے۔''

''یار میری بات سنو ذرا توجہ سے اس مسئلے کا حل سوچو۔ میں ہمیشہ اپنی عزت سے ڈرتا رہتا ہوں اچھا ٹھیک ہے آؤ کسی وقت کھانا کھاؤ میرے ساتھ۔''

''ہر بڑا آدمی کسی کو ٹالنے کے لیے ایسی ہی بات کہتا ہے۔'' نادر حیات نے کہا اور احمد عالم بارودوالا نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ فون بند کر دیا۔ آئی جی نادر حیات کافی دیر تک ان واقعات پر غور کرتا رہا۔ بات واقعی ذرا تعجب خیز تھی۔ کوئی غیر ملکی نوجوان اس طرح آ کر احمد عالم بارودوالا سے اپنی واقفیت کا ذکر کیوں کر رہا ہے ویسے اس کے بہت سے عوامل ہو سکتے ہیں۔ احمد عالم بارودوالا کی دولت کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس طرح کوئی اس کے بیٹے کی حیثیت سے سامنے آ کر ہو سکتا ہے بارودوالا کو بلیک میل کرنا چاہتا ہو۔ بہرحال صحیح فیصلہ اس نوجوان سے ملاقات کر کے ہی کیا جا سکتا ہے وہ خود بھی اس نوجوان سے ملنے میں اشتیاق محسوس کر رہے تھے جو اس طرح کا کوئی کھیل کھیل رہا ہو۔ چنانچہ انہوں نے ڈی آئی جی سے رابطہ قائم کیا اور انہیں مختصر تفصیل بتاتے ہوئے اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ وہ اس نوجوان سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ اسے ان کے آفس میں لے آیا جائے۔ ڈی آئی جی صاحب نے کہا کہ وہ بہت جلد اس نوجوان کو خود لے کر حاضر ہوں گے۔

''لیکن آدھے گھنٹے بعد نادر حیات کو ڈی آئی جی کا فون موصول ہوا۔

''سر! ذرا سی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ جمشید مرزا نے اس شخص کو رہا کر دیا ہے۔''

''کیا۔'' نادر حیات حلق پھاڑ کر چیخے۔

''وہ سر! دراصل جمشید مرزا نے عجیب و غریب کہانی سنائی ہے اس نے بتایا کہ کسٹم حکام نے اس کے سامان سے ایک سفید رنگ کا پاؤڈر برآمد کیا تھا۔ جس پر انہیں ہیروئن کا شبہ ہوا تھا اور اصل میں اسے اسی سلسلے میں پولیس کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔ جہاں اس نے یہ ڈراما کیا اور بتایا کہ وہ احمد عالم بارودوالا کا بیٹا ہے اور جمشید مرزا اسے لے کر بارودوالا کے پاس پہنچ گئے۔ بارودوالا صاحب نے بھی جمشید مرزا کو کافی ڈانٹ ڈپٹ کی تھی اور کہا تھا کہ وہ اسے اس طرح کیوں لے کر آیا۔

لیکن بہرحال جمشید مرزا کا نظریہ غلط نہیں تھا۔ وہ ایک ایسے آدمی کا نام سن کر احترام کے طور پر اسے لے کر گیا تھا۔ واپسی پر جمشید مرزا خود بہت پریشان تھا۔ تب نوجوان نے اس سے کہا کہ اسے گرفتار رکھنا حبس بے جا کے مترادف ہوگا۔ کیونکہ اس نے کوئی ناجائز حرکت نہیں ہے۔ وہ سفید پاؤڈر پسا ہوا سفید پتھر ہے جسے وہ کسی خاص ضرورت کے طور پر اپنے ساتھ لایا ہے بہرصورت اس کے اس دعوے پر جمشید مرزا نے لیبارٹری سے اس پاؤڈر کی رپورٹ حاصل کر لی اور اسے یہ رپورٹ موصول ہو گئی کہ وہ صرف پسا ہوا پتھر ہے جس میں کوئی نشہ آور چیز بھی شامل نہیں ہے۔ نوجوان نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر اسے حبس بے جا میں رکھا گیا تو وہ اپنے سفارت خانے کے ذریعے ان لوگوں سے جواب طلبی کرے گا۔ چنانچہ جمشید مرزا نے اسے غیر ملکی ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا۔

''چھوڑ دیا۔'' نادر حیات نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''سر بات تو ٹھیک ہی تھی کیونکہ اس کے بعد اس کے گرفتار رہنے کی کوئی وجہ نہیں تھی صرف یہ بات اسے زیر حراست نہیں رکھوا سکتی تھی کہ وہ خود کو ایک بڑے آدمی کا بیٹا بتاتا ہے۔''

''پھر بھی بات ایک بہت بڑے آدمی کی تھی۔ جمشید مرزا کو اس سلسلے میں اپنے محکمے سے رابطہ قائم کرنا چاہیے تھا۔''

''سر! میں نے عرض کیا ناں کہ وہ خود بھی بوکھلا گیا تھا۔ نادر حیات تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

''جمشید مرزا انتہائی احمق اور ناکارہ انسان ہے۔'' ڈی آئی جی صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا

تھا۔ بہر حال آئی جی نادر حیات نے فون بند کر دیا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

♥......♥......♥

نوجوان اختر سہیل کو چھوڑ دیا گیا۔ پولیس ہیڈ کوارٹر سے نکل کر وہ بڑے مست انداز میں سیٹی بجاتا ہوا اپنے سامان کے ساتھ پیدل چل پڑا ایک کھلنڈرا اور لا ابالی نوجوان معلوم ہوتا تھا وہ۔ شکل وصورت انتہائی دیدہ زیب، قد وقامت بہت ہی خوبصورت، بدن ورزشی، گہری نیلی آنکھیں جن میں مشرق ومغرب کا امتزاج تھا۔

بہر حال وہ پیدل چلتا رہا۔ اس کی نگاہیں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ پھر تھوڑی دیر میں ایک ٹیکسی اس کے پاس آ کر رک گئی۔ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر ایک اور شخص بیٹھا ہوا تھا۔ انتہائی دھان پان سوکھے اور دبلے بدن کا مالک عمر اچھی خاصی تھی۔ گال پچکے ہوئے تھے اور چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ لیکن آنکھیں قیامت کی تھیں بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھیں یوں لگتا تھا کہ اس کے سارے بدن کی جان ان آنکھوں میں ہی ہو۔ اس کا قد بہت ہی چھوٹا تھا۔ بمشکل تمام چارفٹ کا رہا ہوگا۔ یہ شخص بھی جہاز کے سفر میں اختر سہیل کا ساتھی تھا۔ بظاہر دونوں کے درمیان کوئی ربط نہیں معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ اس طرح اس کے قریب آ کر رکا تھا۔ جیسے مسلسل اس کے پیچھے لگا رہا ہو۔ اس نے مشفقانہ انداز میں کہا۔

''ہیلو جان۔''

''ہیلو ٹارزن'' نوجوان نے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ٹیکسی ڈرائیور اب تک نیچے اتر گیا تھا۔ اس نے اختر سہیل کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے کر پیچھے کی ڈگی کھولی ڈگی میں شاید اور بھی سامان تھا۔ عمر رسیدہ شخص جسے ٹارزن کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔ منتظر نگاہوں سے اختر سہیل کو دیکھ رہا تھا اور جب اختر سہیل پچھلی نشست پر اس کے ساتھ بیٹھ گیا تو ٹارزن نے کہا۔

''ہوٹل میرینو'' ڈرائیور نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں فائیو اسٹار ہوٹل میرینو کے سامنے رک گئے جیسے ہی سامان اتارا گیا۔ ایک پورٹر نے آگے بڑھ کر نوجوان کا سامان اٹھا لیا۔ اس کے بعد وہ لفٹ کے ذریعے اوپر کی منزل پر پہنچ گئے۔ جہاں ایک خوبصورت کمرہ ان کا منتظر تھا۔ چارفٹے ٹارزن کے سامان میں اس نوجوان کے لباس وغیرہ موجود تھے۔ چنانچہ اس شخص نے کسی فرض شناس ملازم کی طرح ایک لباس نکال کر واش روم میں لٹکایا اور پھر اس سے کہا۔

''لباس تبدیل کر لو۔'' اختر سہیل باتھ روم میں داخل ہو گیا تھا۔ اندر سے پانی گرنے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور جو شخص ٹارزن کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھ کر پاؤں ہلاتا رہا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اختر سہیل لباس تبدیل کر کے باہر آ گیا۔ وہ اب باہر آیا تو ٹارزن خود بھی باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ اختر سہیل ٹیلی فون کے پاس پہنچا اور اس نے روم سروس کے لیے زیرو ڈائل کیا اور اس کے بعد کھانے پینے کی چیزیں نوٹ کرانے لگا۔ پھر جس وقت عمر رسیدہ شخص باہر نکلا تو دو ویٹر کھانے پینے کی چیزیں لے کر پہنچ گئے اور انہیں سرو کر کے باہر چلے گئے۔

اس دوران مکمل طور پر خاموشی طاری رہی تھی۔ دونوں کھانے میں مصروف ہو گئے یوں لگتا تھا جیسے

کہ کافی بھوکے ہوں۔ لوازمات بھی اچھے خاصے منگوائے گئے تھے۔ بہر حال چارفٹا آدمی اپنی خوبصورت آنکھوں سے اختر سہیل کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

''ہیلو۔''

''ہاں انکل ٹارزن میں سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ سوری۔''

''یہ بتاؤ کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے۔''

''نہیں انکل آپ جانتے ہیں کہ جس چیز سے ہمیں پریشانی ہوتی ہے ناں وہ میرے قریب سے بھی نہیں گزرتی۔''

''دیکھو میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ بڑا بول مت بولا کرو۔ ہمیشہ سامنے آتا ہے۔ بزرگ احمق نہیں تھے اور پھر یہ تو مذہبی بات ہے کہ غرور کا کوئی لفظ اپنے منہ سے مت نکالا کرو اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ اجنبی ملک ہے اور ہم اس کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ ہمیں یہاں کسی طور بھی غیر محتاط نہیں ہونا چاہیے۔''

''نہیں انکل ٹارزن اجنبی نہیں ہے یہ ملک میرے باپ کا ملک ہے یا آپ یوں سمجھ لیجیے کہ میرا آبائی وطن ہے یہ اجنبی کیسے ہو گیا میرے لیے۔ میری ماں نے مجھے اس سے اچھی طرح روشناس کرایا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے ابھی اپنوں میں جگہ نہیں ملی اور مستقبل میں اس کا کوئی امکان بھی نہیں ہے۔''

''یہی تو میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا رہا۔''

''کچھ نہیں میرے باپ نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا ہے۔ یہاں مجھے تھوڑی سی غلط فہمی ہوئی ہے، انکل ٹارزن! میرا خیال تھا کہ ممکن ہے احمد عالم بارودوالا کو اپنی حماقتوں کا احساس ہو چکا ہو۔ وہ مجھے دیکھ کر جذباتی ہو جائیں اور انہیں یاد آ جائے کہ انہوں نے ماضی میں کیا کچھ کیا ہے۔ وہ مجھے اپنا بیٹا تسلیم کر لیں لیکن یوں لگتا ہے کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔''

''ٹھیک ہے انگلیاں ٹیڑھی کر لی جائیں گی۔''

''کرنا پڑیں گی انکل ٹارزن کرنا پڑیں گی۔ لیکن اس کے لیے ہمیں کافی جدوجہد کرنا ہوگی۔ کیونکہ میں بھی اور آپ بھی بارودوالا کی حیثیت کو جانتے ہیں۔''

''میں ہر طرح کی جدوجہد کے لیے تیار ہوں۔ تم بتاؤ ابتدا کہاں سے کرو گے۔''

''سب سے پہلے ہمیں یہاں اپنے قدم جمانے ہوں گے۔ ہمارا سفارت خانہ یقیناً ضرورت پڑنے پر ہماری مدد کرے گا۔ لیکن میرا خیال ہے ہمیں اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ ہمیں سب سے پہلے کسی مکان کا بندوبست کرنا ہے یہ ہوٹل ہمیں سوٹ نہیں کرتے۔ کسی ہوٹل میں رہ کر ہم ہمیشہ ان کی نگاہوں کے سامنے رہیں گے۔ اگر کوئی پرائیویٹ گھر ہوگا تو ہم اس میں گم ہو جائیں گے اور اس کے بعد اپنی کارروائیوں کا آغاز کرنا ہمارے لیے زیادہ مناسب ہوگا۔''

''ویسے میں اس دوران تمہارا تعاقب ہی نہیں کرتا رہا بلکہ میں نے بھی یہاں کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں۔ تمہیں پولیس اسٹیشن چھوڑنے کے بعد میں کچھ دیر کے لیے تم سے دور ہو گیا تھا۔

ویسے تو میں تمہیں مستقل نگاہوں میں رکھنا چاہتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ پولیس ہیڈکوارٹر سے تمہاری گلوخلاصی اتنی آسانی سے نہیں ہوگی۔

خیر ہمیں پرائیویٹ مکان بڑی آسانی سے مل جائے گا۔ پراپرٹی ڈیلر یہ کام بڑی برق رفتاری سے کر دیتے ہیں۔ میں نے کئی پراپرٹی ڈیلروں کے بورڈ دیکھے ہیں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے انکل ٹارزن آپ جائیں اور کسی مکان بندوبست کرلیں تاکہ ہم اپنے کام کا آغاز کریں۔''

''ٹھیک ہے میں اٹھ جاتا ہوں'' چار فٹے ٹارزن نے کہا۔ یہ نام شاید مضحکہ اڑانے کے لیے رکھا گیا تھا۔ کیونکہ انکل ٹارزن کا پورا وزن چالیس پینتالیس کلو ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ تھوڑا بہت زیادہ ہو بہر حال وہ بڑی مستعد اور جاندار شخصیت کے مالک تھے۔ اور یہ اندازہ نہیں ہوسکتا تھا کہ ان کی صحیح عمر کیا ہے؟ جو کام ان کے سپرد کر دیا گیا تھا اسے بھی انجام دینے میں انہوں نے انتہائی برق رفتاری کا مظاہرہ کیا اور ایک انتہائی خوبصورت اور چھوٹا سا گھر انہیں کرائے پر حاصل ہوگیا۔ ہر طرح کی ضرورتوں سے آراستہ تھا۔ سوائے اس کے کہ بس فریج خالی تھا۔ ظاہر ہے کھانے پینے کی چیزیں خود ہی حاصل کرنا ہوتی ہیں۔ اس مکان کو دیکھ کر اختر سہیل نے سیٹی بجائی اور مسکرا کر بولا۔

''آپ ٹارزن سے زیادہ پھرتیلے اور مستعد ہیں۔ انکل لوگ آپ کو دیکھ کر نہ جانے آپ کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ اپنے اصل قد سے دس گنا زیادہ ہیں اور ہر چھوٹا اور بڑا کام چٹکی بجا کر کر لیتے ہیں۔ اس طرح کہ بعض اوقات مجھے بھی یقین نہیں آتا۔''

''اچھا اب میری تعریف چھوڑو۔ یہ بتاؤ اپنے کام کی ابتدا کب کرو گے۔''

''آج آرام کل سے کام۔''

''او کے میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ اپنے بیڈ روم میں جانا چاہتا ہوں۔''

''خدا حافظ انکل خدا حافظ'' اختر سہیل نے کہا اور چھوٹا سا ٹارزن اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب چل پڑا۔

♥......♥......♥

حسینہ نے ایک ٹی وی پروگرام دیکھا تھا۔ اس پروگرام میں ایک خاتون بیوٹی ٹپس دے رہی تھیں۔ انہوں نے کہا۔

''بے شمار معاملات میں دوائیں اس قدر کارگر نہیں ہوتیں جتنا انسان کی اپنی ذات کا عمل۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کا چہرہ خوب صورت نظر آئے۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کا سیاہ رنگ سفید ہوجائے تو اس کے لیے آپ کو ایک معمولی سی کوشش کرنا ہوگی۔ اپنے چہرے کو مسکراہٹوں سے سجائے رکھیں۔ اپنی آنکھوں کو محبت کی روشنی دیں۔ اپنے ہر عمل کو اس طرح سے دوسروں کے سامنے ظاہر کریں کہ دوسرا آپ کے بارے میں اچھے انداز میں سوچے اور پھر کچھ ہی دنوں کے اندر اندر آپ اپنی ذات میں ایک ایسی تبدیلی دیکھیں گی جس پر آپ کو خود بھی یقین نہیں آئے گا آپ کا سیاہ رنگ سفید ہونے لگے گا۔ لوگ محبت سے آپ سے گفتگو کریں گے۔ پیار سے آپ کو دیکھیں گے۔ آپ بس تھوڑا سا تجربہ کر کے میری اس بات کو آزمائیں

ہیں۔ حسینہ کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔''

''ہائے میرے مولا اتنی معمولی سی بات لیکن وہی ہے نا کہ جب تک حکیم صاحب سے بات نہ کرو پتا کہاں چلتی ہیں ایسی باتیں یہ تو کوئی بڑی بات ہی نہیں۔ پھر پہلا اتفاق صوفی کے ساتھ ہی ہوگیا۔ لباس وغیرہ تبدیل کر کے کہیں باہر جا رہا تھا۔ کمرے سے نکلتے ہی حسینہ نظر آگئی۔ صوفی کو دیکھ کر مسکرائی اور صوفی تھوک نگلنے لگا۔

''کپڑے مجھے دے دیا کرو استری کرنے کے لیے میلے کپڑے تو یوں لگتے ہیں جیسے پتلون بانس پر ٹانگ دی ہو۔ اے میں تو کہتی ہوں جب تم شیروانی اور پائجامہ پہنتے ہو تو شہزادے ہی لگتے ہو پورے کے پورے اپنا لباس چھوڑ کے دوسروں کے لباس کے پیچھے بھاگنا کوئی عقلمندی بات تو نہیں ہے۔ صوفی حیرت سے منہ پھاڑے یہ زریں الفاظ سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''در......درویش رحم کریں آج آپ کا لہجہ بڑا عجیب ہے حسینہ بیگم۔''

''لو عجیب لہجے ہی نے تو مجھے فائدہ دیا ہے۔''

''اچھا کیا۔''

''یہی کہ تم نے مجھے کالی کلوٹی بینگن لوٹی کے بجائے حسینہ بیگم کہا ہے اس سے پہلے تو مجھے تم یہ بتاؤ تم نے کبھی بیگم کہا۔

''بیگم تو میں نے آج تک کسی کو نہیں کہا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''اے تو مجھے تو کہا، دیکھا ناں کیا فائدہ ہوا مجھے ویسے سچ کہہ رہی ہوں اب بغیر استری کے کپڑے مت پہنا کرو، لو بھئی، میں گھر میں موجود ہوں اور میرے سامنے تمہاری یہ حالت ہو۔ نہ بابا نہ اللہ کو بھی منہ دکھانا ہے۔

''جج......جج جی ضرور دکھایئے'' صوفی نے کہا اور غڑاپ سے باہر نکل گیا۔ حسینہ بیگم کی مسکراہٹ بڑی گہری تھی۔

''لو بھیا پہلے ہی مرحلے پر دیکھو کتنا فائدہ ہوا ہے'' حسینہ بیگم نے کہا اور اس کے بعد اپنے کاموں میں مصروف ہوگئیں۔ سارے تجربے آج ہی ہوجانے تھے۔ بالکل اسی وقت اتفاقیہ طور پر معشوق نشیلے بھی ادھر آنکلے تھے۔ بیل بجائی دروازہ تو حسینہ بیگم کو ہی کھولنا تھا۔ معشوق نشیلے نے جیسے ہی دروازے کو دیکھا ایک دم سے ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔''

''ارے پھدک کیوں رہے ہو۔ اندر آؤ۔'' حسینہ بیگم بولیں۔

''مم......مم ماروگی تو نہیں'' معشوق نشیلے نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''تمہیں اللہ مارے گا۔ میں بھلا کسی کو کیا مار سکتی ہوں۔ اب کھڑے کھڑے منہ ہی دیکھتے رہو گے۔ یا اندر بھی آؤ گے۔'' آج حسینہ بیگم کے لہجے میں کرختگی نہیں تھی جو ہمیشہ ہوا کرتی تھی۔'' اندر بلانے کے بجائے وہ باہر بھگانے میں زیادہ دلچسپی لیتی تھیں معشوق نشیلے نے حیرت سے حسینہ بیگم کو دیکھا پھر بولا۔

''کک......کوئی سازش تو نہیں کر رہی ہو فارسہ میں۔''

"اب یہ فارسہ اور پارسہ تو میں جانتی نہیں ہوں اور میں بھلا کیا سازش کروں گی تمہارے بارے میں اب دیکھو خواہ مخواہ غصہ دلا رہے ہو۔ دروازے پر کھڑے ہو گے کوئی دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔"

"کیا سوچے گا۔" معشوق نشیلے مسکراتے ہوئے اندر آ گئے۔

"سوچے گا لڑکا، لڑکی باتیں کر رہے ہیں۔ پتا نہیں کیا چکر ہے۔" حسینہ نے شرماتے ہوئے انداز میں کہا اور معشوق نشیلے کئی فٹ اونچے اچھل پڑے۔

"لل...... لل...... لڑکا...... لل...... لل...... لڑکی۔"

"یہ لل...... لل کیا ہوتا ہے آؤ اندر آؤ۔ آج میں تمہیں اپنے ہاتھ سے کھانا بنا کر کھلاؤں گی۔"

"ارے مم...... مرگیا...... مرگیا...... پپ...... پہلے ہی سے مرگیا۔" معشوق نشیلے نے اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"کہاں مرے۔ بول تو رہے ہو۔ حسینہ نے کہا۔ معشوق نشیلے اندر پہنچ گیا تھا۔

"حسینہ بیگم تمہیں خدا کا واسطہ بتا تو دو کیا کرنے والی ہو۔"

"میں کچھ نہیں کرنے والی۔ اچھا یہ بتاؤ چائے پیو گے۔" معشوق نشیلے دھم سے فرش پر بیٹھ گیا۔

"ارے...... ارے آ گئے ناں اوقات میں۔ صحیح جگہ بیٹھے ہو۔"

"حسینہ بیگم...... حسینہ بیگم آج تم اتنی نرم کیسے ہو رہی ہو۔"

"نرم ہو رہی ہوں......" حسینہ نے کہا۔

"کمال ہے...... کمال ہے اس وقت تو ایک شعر یاد آ رہا ہے۔ فارسہ میں۔"

"سناؤ" حسینہ بولی اور معشوق نشیلے اوندھے ہو گئے۔ حسینہ اور شعر سننے کی فرمائش کرے بہر حال ان پر بری بیت رہی تھی۔ حسینہ واقعی خوبصورت بننے کے چکر میں کچھ زیادہ ہی خوبصورت بنتی جا رہی تھی۔

♥......♥......♥

احمد عالم بارودوالا اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ انتہائی وسیع و عریض میز پر بہت سے ٹیلیفون رکھے ہوئے تھے۔ انٹرکام بھی موجود تھا اور اس وقت وہ انٹرکام پر اپنی سیکرٹری کو کچھ ہدایت دے رہے تھے۔ خوبصورت اور صحت مند بدن کے مالک تھے۔ چہرے کے نقوش میں ہر وقت ایک پر سکون کیفیت طاری رہتی تھی۔ لیکن اس وقت اس چہرے پر ہلکی سی پیلاہٹ پھیلی ہوئی تھی اور آنکھوں میں بے چینی صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی پریشانی کا شکار ہیں۔ انٹرکام رکھ کر وہ کچھ سوچنے ہی لگے تھے کہ اچانک پھر اشارہ موصول ہوا اور انہوں نے انٹرکام کا سوئچ آن کر دیا۔

"ہاں بولو۔" انہوں نے سیکرٹری سے کہا۔

"باس! ایک ٹیلی فون آیا ہے وہ شخص کہتا ہے کہ صرف آپ ہی سے بات کرے گا۔ بہت ضروری کام ہے لیکن نام نہیں بتا رہا اپنا۔"

"بات کراؤ۔" احمد عالم بارودوالا کے ہاتھوں میں ہلکی سی لغزش پیدا ہو گئی تھی پھر قریب رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجی اور اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو، کیا احمد عالم صاحب بات کر رہے ہیں۔"

"ہاں بول رہا ہوں کون ہو تم۔" بارودوالا نے بھاری لہجے میں کہا۔

"آپ کا لخت جگر، نور نظر اور خادم کو سہیل عالم بارودوالا کہتے ہیں۔ دوسری طرف سے آواز آئی اور احمد عالم کرسی کی پشت سے لگ گئے۔ ان کے چہرے کے رنگ میں سرخی نمودار ہوتی جا رہی تھی اور بدن میں ہلکی ہلکی تھرتھری ہو گئی تھی۔ کچھ لمحات تو وہ کچھ نہ بول سکے لیکن دوسری طرف سے پھر آواز سنائی دی۔

"ہیلو بارودوالا صاحب" اور وہ چونک کر سیدھے ہو گئے۔

"کیا چاہتے ہو تم اور کیوں مجھ سے یہ فضول باتیں کر رہے ہو۔"

"ڈیڈی، ممی کے پاس آپ کی تصویر نہ ہوتی تو آپ یقین کیجیے کہ بلاشبہ میں آپ کی اداکاری کا شکار ہو جاتا۔ لیکن بد قسمتی سے جو تصویر مجھے میرے بچپن سے آج تک میرے باپ کی حیثیت سے دکھائی گئی ہے وہ میں بھول نہیں سکتا۔ لمبی کہانی ہے ڈیڈی اگر آپ کے دل میں کبھی میرے لیے نرمی پیدا ہو۔ تو میری یہ کہانی ضرور سن لیجیے۔ تھوڑی سی تفصیل چند الفاظ میں بتائے دیتا ہوں۔ ڈیڈی ممی کا انتقال ہو چکا ہے اور اب اس بھری دنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔ ڈیڈی میں نے یورپ کے ماحول میں تعلیم حاصل کی ہے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ میری اردو کتنی صاف ہے اور اس کی بنیادی وجہ پتا ہے کیا ہے ڈیڈی بنیادی وجہ یہ کہ میں نے ہمیشہ آپ سے محبت کی ہے۔ آپ کی قومیت اور آپ کے وطن سے پیار کیا ہے۔ بچپن میں مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ مر چکے ہیں۔ لیکن جب میں بڑا ہوا تو اور باتیں بھی سنیں مجھے پتا چلا کہ میں بھی یورپ کی اسی نسل کا ایک فرد ہوں جن میں بن باپ کا ہونا کوئی بری بات نہیں ہوتی۔ ڈیڈی، ممی نے جب سے آپ کا مذہب اپنایا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ اس کی اچھی باتوں کو اپنے آپ پر حاوی رکھا اور آپ جو کچھ کر کے آئے تھے اسے بھی بھلا دیا۔ مجھے علم ہے کہ آپ کے بارے میں ہمیشہ یہ ہی بتاتی رہیں کہ آپ مر چکے ہیں۔ ورنہ شاید ہم بہت پہلے حساب کتاب کر لیتے۔

جب ممی نے مجھے ساری حقیقت سے روشناس کرایا یہ وہ وقت تھا جب ممی جان کنی کی کیفیت میں مبتلا تھیں۔ انہوں نے مرتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ سے انتقام نہ لوں۔ بلکہ کوشش یہ کروں کہ آپ مجھے اپنے سائے میں لے لیں اور ڈیڈی یہی جذبہ لے کر میں یہاں آیا ہوں۔ آپ نے جو کچھ کہا اب تک تو میں نے اسے برداشت کر لیا لیکن اگر آپ نے اسے جاری رکھا تو میں پھر ممی سے کیے ہوئے وعدے کو نبھا نہیں سکوں گا۔"

"تم مجھے ایک بلیک میلر معلوم ہوتے ہو جو ایک من گھڑت کہانی لے کر میرے پاس آئے ہو۔ لیکن بے وقوف لڑکے تم جو کوئی بھی ہو میری حیثیت سے واقف نہیں ہو۔ میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ پہلے یہاں رہ کر میرے بارے میں معلومات حاصل کرو۔ جب تمہیں علم ہو جائے کہ میں کیا ہوں اس کے بعد فیصلہ کرنا۔ اگر تم مجھے بلیک میل ہی کرنا چاہتے ہو تو میں تمہارا خیر مقدم کروں گا۔"

"احمد بارودوالا صاحب! آپ اپنے لہجے کو پر سکون رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اندر سے آپ کی حالت بہت خراب ہے بہتر یہ ہوگا کہ ہم دونوں ایک بات کا فیصلہ کر لیں۔ میں یہ

چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اپنے حلقہ احباب میں اپنا بیٹا کہہ کر روشناس کروائیں مجھے آپ کی دولت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بس مجھے اپنے نام کے ساتھ وہ داغ مٹانا ہے جو ہر بن باپ کے بیٹے پر لگ جاتا ہے اور اگر اس سلسلے میں آپ نے کوئی دلچسپی نہ لی تو میں آپ کا جینا مشکل کر دوں گا۔ بلیک میلنگ کر کے تو ڈیڈی رقومات حاصل کی جاتی ہیں۔ یا کوئی ایسا مفاد حاصل کیا جاتا ہے جو انسان کے ذہن میں ہو۔ میں صرف اپنی شخصیت کا تعین چاہتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے بعد آپ سے کچھ نہیں لوں گا۔ جواب دیجیے ڈیڈی ہاں یا نہیں کہیں گے کہ میں آپ کا بیٹا ہوں دیکھیں صرف ہاں یا نہیں میں جواب دیں۔ فیصلہ ابھی اور اسی وقت ہو جائے گا۔"

"کچھ بھی نہیں کر سکتے تم سمجھے۔ بکواس کرتے رہو۔ تم اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے کہ اپنی زندگی خراب کر بیٹھو۔" احمد عالم بارود والا نے کہا اور ٹیلیفون بند کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید دوبارہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجے گی لیکن پھر گھنٹی نہیں بجی ٹیلیفون بند کرنے کے بعد وہ کرسی سے ٹک گئے تھے۔ ان کا چہرہ پیلاہٹ سے بدل کر اب گہرا سرخ ہو گیا تھا اور آہستہ آہستہ یہ سرخی، زردی میں تبدیل ہونے لگی۔ آنے والے وقت کے احساس سے وہ بے چین ہو گئے تھے۔ چند لمحات سوچنے کے بعد انہوں نے دوبارہ ٹیلی فون اٹھایا۔ وہ ٹیلی فون جس کی ڈائریکٹ لائن تھی اور اس بار وہ فون پر محکمہ داخلہ کے شاہ میر کے نمبر ڈال کر رہے تھے۔

♥......♥......♥

وقت مل گیا تھا اور اس وقت گلی میں شامیانہ لگا ہوا تھا۔ من خان نے اپنے ہوٹل میں تمام اہل محلہ کے لیے چائے مفت کر دی تھی۔ بڑا زبردست اہتمام کیا گیا تھا۔ شامیانہ لگا ہوا تھا۔ دری بچھی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ حقے رکھے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے اگالدان رکھے گئے تھے۔ تانبے کے نقشین پاندان قلعی کیے ہوئے موجود تھے۔ پانوں کے ٹوکرے رکھے ہوئے تھے۔ انتہائی نفیس قسم کی تھالی پانوں کے لیے موجود تھی۔ شعراء میں تصدق حسین بارہ بنکوی، ابن بلبل عبدالرؤف آتش، گاؤ تکیے لگائے بیٹھے ہوئے تھے اس کے علاوہ فارسہ کے شاعر معشوق نشیلے بھی موجود تھے۔ درمیان میں صوفی صاحب کے لیے ایک بڑا سا گاؤ تکیہ لگا ہوا تھا۔ کیونکہ وہ صاحب صدر تھے۔

شعرا آ رہے تھے اور جوتیاں اتار، اتار کر مسند پر پہنچ رہے تھے۔ صوفی صاحب کے قریب اگالدان رکھا ہوا تھا۔ دونوں پچکے ہوئے گال درمیان میں سے پھولے ہوئے تھے۔ شاید خوشی میں ایک کے بجائے دو گلوریاں گالوں میں دبالی گئی تھیں۔ پیک سے اگالدان آدھے کے قریب بھر چکا تھا۔ تمباکو بھرا بلکہ قوام بھرا پان منہ میں موجود تھا اور شعرا کی گوہر افشانیاں ہو رہی تھیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اچھے اشعار سنائے جا رہے تھے۔ ہر ایک کو اجازت تھی کہ اپنی پسند کا شعر سنائیں اور داد وصول کریں عبدالرؤف آتش صاحب نے ایک بہت ہی خوبصورت شعر سنایا۔

اچھی نہیں نزاکت احساس اس قدر
شیشہ اگر بنو گے تو پھر بھی آئے گا

ابن بلبل صاحب جو صحیح معنوں میں بلبل کی طرح تھے انہوں نے شعر پڑھا

کہ وہ بدنصیب ہوں میں جسے دنیا والوں نے
وفا کے نام پر لوٹا مٹا کر چھوڑ دیا۔

اس کے بعد ایک اور شاعر نے شعر سنایا......

پتھر کو جانتے تھے مگر پوجتے رہے
اہل وفا تھے اور مروت کی بات تھی

داد ملتی رہی صوفی صاحب خوب جھومتے رہے اور اس کے آگے محفل اچانک بگڑ گئی۔ گڑ بڑ لکھنوی نے شعر سنایا۔

بوقت تنگ دستی آشنا بیگانہ می گردد
صراحی چوں شود خالی دے پیمانہ می گردد
وہی بیوی کہ جوڑا جس کا ریشم سے دیا کڑھوا
وہی بیوی کہ گہنا جس کو سونے کا دیا جڑوا
وہی بیوی مجھے اب مفلسی میں کہتی ہے
بوقت تنگ دستی آشنا می گردد

آہ اور واہ کا ایسا طوفان اٹھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ بڑی داد ملی بڑا شور ہنگامہ ہوا اور اس کے بعد اسی طرز کے ایک دوسرے شاعر میدان میں آ گئے۔ فرمانے لگے۔

ایک بے وفا نے پھیر لیں آنکھیں تو کیا ہوا
ہم نے بھی دل لگایا ہے دو، تین، چار سے
چرچا یہ ہو رہا تھا کہ کلو کی لونڈیا
ملنے کو روز جاتی ہے نتھو لوہار سے
کل مے کدے میں شیخ کے کپڑے اتر گئے
یا رب ہمیں بچائیو ایسے ادھار سے

شور و غوغا کا طوفان آسمان کو چھونے لگا۔ پھر معشوق نشیلے کی باری آئی اور معشوق نشیلے صاحب نے فارسہ میں بہت کچھ سنایا۔ غالب، اقبال، تمام اساتذہ کے مشہور شعر اس وقت معشوق نشیلے کی ملکیت بن گئے تھے اور وہ خوب زبان کی صفائی دکھا رہے تھے۔ وہ ہر شعر میں مونث کو مذکر کر کے پڑھ رہے تھے اور اس کا مفہوم کچھ بھی نکلے کوئی بگاڑے ان کا اعتراض ہوتا تو کہہ دیا جاتا کہ فارسی میں نہیں بلکہ فارسہ میں ہے۔ یہ طوفان بدتمیزی چل رہا تھا کہ صوفی کو موبائل فون پر کال ملی۔ کرنل رحیم شاہ کی کال تھی۔

"ہیلو صوفی صاحب کہاں ہیں۔"

"مسند صدارت پر درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"اتر آیئے۔"

"بہتر حکم۔"

"ملنا ہے۔"

"فوراً"

"نہیں اگر کوئی مصروفیت ہے تو دوسری بات ہے۔"

"غزل سنا کر ابھی آتا ہوں۔"

"غزل سنا کر؟"

"مم......مم......میرا مطلب ہے در......در......درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"میں انتظار کر رہا ہوں۔" کرنل رحیم شاہ نے کہا اور فون بند ہو گیا۔ صوفی اب کسی قدر بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ کرنل رحیم شاہ کے لہجے کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ ضرور کوئی ایسی ہی اہم بات تھی۔ بہر حال......

♥......♥......♥

ندا سب سے چھوٹی اور لاڈلی تھی۔ بے پناہ دولت مند باپ کی بیٹی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ احمد عالم بارود والا کو خود بھی اپنی دولت کے بارے میں صحیح طور پر علم نہیں تھا کہ کتنی ہے ماہانہ آمدنی اتنی تھی کہ لوگوں کی کل دولت اتنی نہیں ہوتی۔ لیکن بہ ذات خود اب وہ زندگی کی ہنگامہ خیزیوں سے کنارہ کش ہو گئے تھے البتہ اولاد بڑے ناز و نعم میں پرورش پا رہی تھی۔ خود ندا کا خرچ اتنا تھا۔ جتنی بے شمار افراد کی سالانہ آمدنی۔ روپے پیسے کی کبھی کوئی تکلیف تصور میں بھی نہیں آئی تھی۔ بہت سے اداروں کی سرپرست تھی۔ نرم دل اور خوشامد پسند واقع ہوئی تھی اس لیے ضرورت مند بڑی آسانی سے اس کی گردن پر چھری پھیر لیا کرتے تھے۔

باپ کبھی بیٹی کے کام میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔ خود بھی جدید دور کے دلدادہ تھے۔ اس لیے کبھی بیٹی اور دوسرے بیٹوں کی مصروفیات میں دخل اندازی کی کوشش نہیں کی تھی۔ ندا کو رقص و موسیقی سے بڑی دلچسپی تھی اور شہر کے اعلیٰ ترین ہوٹل اور کلب اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ شام کی نشست گاہوں میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کے ہوٹل اور کلب موجود تھے۔ وہ کسی ایک پر گزارہ نہیں کرتی تھی۔ نت نئی دلچسپیاں اس کے دل میں ہوا کرتی تھیں جہاں بھی پہنچ جاتی وہاں ویٹرز کے وارے نیارے ہو جاتے اور وہ کوشش کرتے کہ وہ انہیں طلب کرے اس نے کبھی اپنے لیے ریزرویشن نہیں کرائی تھی جہاں بھی داخل ہوتی وہاں فوراً ہی اس کی میز بچھ جاتی اور اس پر ریزرویشن کا کارڈ لگ جاتا۔

بہر حال خوب عیش کر رہی تھی وہ۔ صاف ستھری طبیعت کی مالک تھی اس لیے کبھی کوئی اسکینڈل مشہور نہیں ہوا۔ ہاں رقص و موسیقی کے حوالے سے وہ کافی لوگوں سے واقف تھی اور بہت سے فنکار اس کے پسندیدہ فنکار تھے۔ ان دنوں وہ نوجوان اس کی توجہ کا مرکز تھا۔ جسے اس نے تین دن قبل ہی دیکھا تھا۔ کمال کا رقاص تھا اور نہ صرف ندا بلکہ دوسرے لوگ اس کے بارے میں گفتگو کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ خود ندا اپنے حلقہ احباب میں اس کی بے پناہ تعریف کر چکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس نے خود آگے بڑھ کر اس نوجوان سے تعارف حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کیونکہ یہ اس کی فطرت نہیں تھی۔ وہ خود کسی سے بے تکلف ہونے کی عادی نہیں تھی لیکن اگر کوئی خود اپنے آپ میں جرات پیدا کرے تو اسے ندا کے اخلاق سے مایوسی نہیں ہوتی تھی۔

اتفاق سے آج اسے وہی نوجوان گیٹ کے پاس کھڑا ہوا مل گیا۔ ندا اپنی کار سے اتری تو وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر موجود تھا۔ ندا اسے پسند تو کرنے ہی لگی تھی۔ اس وقت اس نے کچھ اس طرح اسے دیکھا کہ ندا کے ہونٹوں پر ایک شناسا مسکراہٹ پھیل گئی۔ نوجوان نے بھی بڑے شائستہ انداز میں اسے "ہیلو" کہا تھا۔ ندا اس کی جانب بڑھ گئی اور نوجوان پُر تپاک انداز میں اس کے خیر مقدم کے لیے تیار ہو گیا۔

"ہیلو۔ کیسے ہیں آپ" ندا نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہوں، آپ کیسی ہیں خاتون۔"

"شکریہ، کسی کا انتظار کر رہے تھے۔" ندا نے پوچھا۔

"نہیں، وقت سے پہلے آ گیا تھا اس لیے شغل کے طور پر یہاں کھڑا ہو گیا۔"

"آپ مقامی تو نہیں معلوم ہوتے۔"

"جی ہاں، باہر سے آیا ہوں۔ لیکن مذہباً مقامی ہوں۔ میرا خیال ہے آپ کا ہم مذہب" وہ ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"کیا مطلب" ندا نے دلچسپی سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ مسلمان ہوں اور آپ کے بارے میں بھی میرا اندازہ غلط تو نہیں ہے۔" نوجوان نے کہا۔

"نہیں بالکل نہیں، میں بھی مسلمان ہی ہوں اور ندا عالم میرا نام ہے۔ یہ جان کر تو مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ غیر ملکی ہونے کے باوجود میرے ہم مذہب ہیں۔"

"آپ مجھے لغوی طور پر دوغلا کہہ سکتی ہیں۔ فطری طور پر میں بالکل دوغلا نہیں ہوں۔ مطلب یہ کہ میری ماں برٹش تھی اور میرے باپ کا تعلق آپ کے وطن سے ہے۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"ویری گڈ، ان دونوں رنگوں کی آمیزش آپ کے چہرے پر نظر آتی ہے۔ کیا نام ہے آپ کا۔" ندا نے سوال کیا۔

"مجھے سہیل کہتے ہیں۔"

"بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر مسٹر سہیل۔ ویسے آپ کی اردو بے حد شاندار ہے اور یقین نہیں آتا کہ آپ اہل زبان نہیں ویسے آپ کو شاید پتا بھی نہ ہو کہ ہم آپ کو کئی دن سے دیکھ رہے ہیں مختلف جگہوں پر۔ آپ بھی غالباً یکسانیت کے قائل نہیں ہیں۔ میرا مطلب ہے کسی ایک جگہ کو پسند نہیں کرتے۔"

"نہیں، اصل میں طویل عرصے کے بعد اپنے وطن آیا ہوں میرا مطلب ہے اپنے باپ کے وطن میں اور اندازہ لگا رہا ہوں کہ یہاں کیا کیا ہوتا ہے۔"

"آپ رقص میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ میرے حلقے میں آپ کے رقص کے بڑے چرچے ہو رہے ہیں آپ بلاشبہ ایک عظیم فنکار ہیں اور مجھے یوں لگ رہا ہے کہ جیسے آپ میرے برسوں کے شناسا ہوں۔"

"بے حد شکریہ ویسے آپ یقین کریں کہ میں نے آپ کو کئی بار مختلف جگہوں پر دیکھا ہے اور تعجب ہوتا ہے مجھے کہ کس طرح ہم بار بار مختلف جگہوں پر ملتے رہے ہیں۔ ویسے کسی شہر میں اجنبی اپنے قرب و جوار

کے لوگوں کو گہری نگاہوں سے دیکھتا ہے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ انہیں افراد میں سے کوئی اس کا شناسا بن جائے۔ معاف کیجیے گا مجھے مشرقی اصولوں کے بارے میں معلومات حاصل ہیں۔ چنانچہ میں خود آپ کی طرف متوجہ ہونے کی جرات نہیں کرسکتا تھا۔ نوجوان کے چہرے کی شائستگی نے ندا کو بہت متاثر کیا تھا۔

''آیئے اندر چلتے ہیں۔ پلیز'' نوجوان نے پہلے اسے آگے بڑھ کر اشارہ کیا اور دونوں ہال میں داخل ہوگئے۔ ندا کو دیکھتے ہی ویٹروں نے ایک میز لگا دی اور ندا اس کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے دوسرے شناساؤں نے بھی اس سے ہیلو، ہائے کیا تھا۔ لیکن ندا نے ان پر توجہ نہیں دی تھی۔ اس طرح کچھ نگاہوں میں خفگی کچھ میں معنی خیزی اور کچھ میں سادگی نظر آئی تھی۔ لیکن ندا اس طرح کے معاملات میں کسی کو اہمیت دینے کی قائل نہیں تھی۔ وہ صاف ستھرے اور بے داغ کردار کی مالک تھی اور ایسے لوگوں کا قرب بھی نہیں چاہتی تھی جو دوسرے لوگوں کو شک کی نگاہ سے دیکھیں۔ اس لیے وہ ان افراد پر توجہ بھی نہیں دیتی تھی۔

جوان مسکراتی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

''ویسے آپ یقین کیجیے مجھے بڑا اچھا لگ رہا ہے یہاں مختلف انداز کے لوگ خاص طور سے ایک دوسرے پر توجہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔''

''ہاں آپ اسے اچھا کہیں یا برا۔''

''دونوں صورتیں ہیں۔ اچھا اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ بہرحال ایک دوسرے کی طرف توجہ ہونی چاہیے۔ گویا اس لیے کہ توجہ میں کوئی خاص مقصد چھپا نہیں ہونا چاہیے۔''

''بڑی اچھی باتیں کرتے ہیں آپ، میرا خیال ہے ہمیں ملتے رہنا چاہیے۔'' ندا نے قطعی طور پر نوجوان کا شجرۂ نسب پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بہرحال وہ کافی دیر تک وہاں بیٹھے۔ ندا اس سے خاصی بے تکلف ہوچکی تھی۔ جب نوجوان نے اس سے اجازت مانگی تو وہ خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آیئے باہر چلتے ہیں۔ گاڑی ہے آپ کے پاس'' ندا نے سوال کیا۔

''نہیں گاڑی تو نہیں ہے لیکن آپ بالکل تعجب نہ کریں میں ٹیکسی سے چلا جاؤں گا۔''

''قیام کہاں ہے آپ کا۔''

''ہوٹل میرینو میں ہے۔''

''اوہو...... مرینو تو زیادہ دور نہیں ہے آیئے میں آپ کو ڈراپ کردوں۔'' ندا نے پیش کی۔

''شکریہ۔'' وہ بولا۔ اور دوسری طرف سے آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا رات کافی گہری ہوگئی تھی، سڑکیں سنسان تھیں۔ ندا خاموشی سے خود ڈرائیو کر رہی تھی۔ دفعتہً نوجوان کے منہ سے ایک ہلکی سی آواز نکلی اور ندا کا پاؤں بریک پر جا پڑا۔

''کیا ہوا...... کیا بات ہے۔''

''نہیں نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے معذرت چاہتا ہوں۔ اصل میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن آپ نے فوراً ہی بریک لگا دیے۔ پلیز ذرا گاڑی ایک سائیڈ پر کر کے روک دیجیے میں یہیں اتروں گا۔''

''ہوٹل نہیں جائیں گے۔'' ندا نے سوال کیا۔

''جی...... ایک کام یاد آ گیا ہے۔''

''چلیے کوئی حرج نہیں ہے۔'' ندا نے گاڑی سڑک کے کنارے ایک طرف کر کے روک دی۔ لیکن وہ اس شائستہ نوجوان سے ایسی کسی بات کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ اچانک ہی نوجوان کا ہاتھ اس کے گلے پر آ کر پڑا اور اس نے کوئی ایسی رگ دبائی کہ ندا کو اپنے ذہن میں چیونٹیاں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ صرف ایک لمحہ، نوجوان شاید رگوں کا ماہر تھا۔ ندا کو سوچنے کا موقع بھی نہ ملا اور اس کا سر اسٹیرنگ سے جا ٹکا۔ اس کی ذہنی قوتیں جواب دے گئیں۔ نوجوان کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے انتہائی پھرتی سے ندا کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے ڈرائیونگ کی برابر والی سیٹ پر گھسیٹ لیا اور پھر دروازہ کھول کر نیچے اترا چند لمحوں بعد اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر کار آگے بڑھا دی تھی۔

♥......♥......♥

ایک بے نام سا خوف ایک انوکھی وحشت ان دنوں احمد عالم بارود والا پر طاری تھی۔ اس کے اہل خاندان بھی اس کی اس کیفیت سے واقف ہوچکے تھے۔ لیکن ابھی تک کسی کو یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ اس کیفیت کی وجہ کیا ہے۔ حالانکہ ندا احمد عالم بارود والا کی لاڈلی بیٹی تھی۔ لیکن وہ یہ تک نہیں جان سکی تھی کہ باپ ان دنوں الجھا الجھا کیوں رہتا ہے۔

ویسے بھی جو بچے اتنے تعیشات کے عالم میں پلتے ہیں اور جن کے اتنے وسائل ہوتے ہیں وہ والدین پر کم ہی غور کرتے ہیں ندا ہر طرح آزاد تھی۔ گھر میں وہ ہمیشہ رات کو دیر سے گھستی تھی۔ کتنی ہی بار احمد عالم نے کہا تھا کہ بیٹا ڈرائیور کو ساتھ لے جایا کرو جہاں جی چاہے جاؤ۔ جس طرح جی چاہے جاؤ، جب جی چاہے آؤ۔ ڈرائیور تمہارا غلام رہے گا۔ تھوڑی سی حفاظت بھی رہے گی۔ لیکن ندا نے اس بات کو منظور نہیں کیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

''ڈیڈی خود ڈرائیونگ کرنے میں جو مزہ ہے اس کی بات ہی الگ ہے۔'' احمد عالم نے اسے پیار سے سمجھایا تھا کہ بیٹا وہ اس کے اکیلے آنے جانے پر اعتراض نہیں کرتے۔ لیکن بیٹی کی ضد نے ان کی ایک بھی نہیں چلنے دی تھی۔ وہ رات کو خوب دیر سے گھر میں گھستی تھی اور اب یہ بات اس کی عادت بن چکی تھی۔ اس لیے آہستہ آہستہ احمد عالم صاحب بھی اس کے عادی ہوگئے۔ اکثر یہ بھی ہوتا کہ وہ سو جاتے اور صبح کو ناشتے کی میز پر ہی ندا سے ملاقات ہوتی۔ لیکن آج صبح وہ ناشتے کی میز پر موجود نہیں تھی۔ احمد عالم صاحب انتظار کرنے لگے ان کے تینوں بیٹے میز پر آ بیٹھے تھے۔ لیکن ندا ابھی تک نہیں آئی تھی۔

''کیا بات ہے ندا کہاں ہے رفعت...... رفعت ذرا جاؤ دیکھو ندا کو جا کر دیکھو اسے دیر کیوں ہوگئی۔ اس سے کہو کہ ہم ناشتے پر انتظار کر رہے ہیں۔ فوراً آ جائے۔'' رفعت نامی ملازم چلا گیا۔ لیکن چند ہی منٹ بعد وہ گھبرایا ہوا اندر آیا۔

''صاحب وہ اندر نہیں ہیں۔''

''کیا مطلب'' احمد عالم نے تعجب سے کہا۔

''صاحب ان کا بستر بھی بے شکن پڑا ہوا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے رات کو واپس ہی نہ آئی ہوں۔''

''دماغ خراب ہے تمہارا۔'' احمد عالم صاحب بوکھلا کر کھڑے ہو گئے۔ پھر انہوں نے کہا۔

''تم نے چوکیدار سے کچھ پوچھا۔''

''جی نہیں صاحب۔'' ملازم نے جواب دیا۔

''تو جاؤ چوکیدار سے پوچھو۔ ٹھہرو میں چلتا ہوں۔'' احمد عالم صاحب بوکھلائے ہوئے کمرے سے نکل آئے۔ ان کے پیچھے ہی پیچھے ان کے تینوں بیٹے بھی باہر آ گئے تھے۔ چوکیدار سے سوال کیا تو اس نے کہا۔

''نہیں صاحب ندا بی بی رات کو گھر واپس نہیں آئیں۔'' احمد عالم صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ انہوں نے خونخوار لہجے میں چوکیدار کو گھورتے ہوئے کہا۔

''تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی۔''

''صاحب میرے کو کیا معلوم تھا میں تو یہی سمجھا تھا کہ ندا بی بی اپنی کسی سہیلی کے ہاں چلی گئی ہوں گی۔ کبھی کبھی وہ چلی بھی جاتی ہیں صاحب! کیا ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ آج نہیں آئیں گی۔'' چوکیدار نے جواب دیا۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا وہ۔ اکثر ندا اپنی سہیلیوں کے گھر میں رک جاتی تھی اور گھر میں ٹیلیفون کر دیا کرتی تھی۔ پھر انہوں نے کوٹھی کے دوسرے ملازموں سے ٹیلیفون کے بارے میں پوچھا تو پتا چلا کہ ندا کا کوئی ٹیلیفون نہیں آیا۔ احمد عالم صاحب بری طرح بدحواس ہو گئے تھے۔ فوری طور پر انہوں نے کئی جگہ ٹیلی فون کیے۔ ان کے بیٹے بھی سخت پریشان تھے۔ پھر سب کے سب گاڑی لے کر ندا کی تلاش میں نکل گئے۔ احمد عالم کے بدن سے پسینہ بہہ رہا تھا وہ بدحواس ہوئے جا رہے تھے۔ بار بار وہ ٹیلی فون کے پاس جاتے اور کوئی کوئی نمبر ملا کر اس سے ندا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگتے۔ پولیس کو ابھی تک انہوں نے اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی تھی اور اپنے بیٹوں کو بھی منع کر دیا تھا کہ جب تک اس بات کا ثبوت نہ مل جائے کہ ندا اپنی مرضی سے کہیں نہیں گئی ہے۔ پولیس سے رابطہ قائم نہ کیا جائے۔ دن کے تقریباً گیارہ بجے انہیں ایک ٹیلی فون موصول ہوا اور احمد عالم صاحب نے جھپٹ کر ریسیور اٹھا لیا اور کان سے لگا لیا۔

''ہیلو۔''

''کون صاحب بول رہے ہیں؟'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''احمد عالم۔ آپ کون ہیں؟''

''خادم ہوں آپ کا۔ قبلہ والا بزرگوار آپ نے کا نور نظر سہیل عالم بارود والا۔'' دوسری طرف سے آواز آئی اور احمد عالم صاحب کے ہاتھ سے ریسیور گرتے گرتے بچا۔

''اب کیا بات ہے کیوں فون کیا ہے مجھے۔''

''وہ اصل میں آپ کو بتانا چاہ رہا تھا ڈیڈی کہ ندا میرے پاس موجود ہے۔'' دوسری طرف سے جواب ملا اور احمد عالم صاحب کو غش آنے لگا۔

''تت...... تمہارے پاس۔''

''جی ڈیڈی! میرے پاس میں نے کہا تھا نا کہ مجبوری ہے۔ عرض کر دیا تھا آپ سے لیکن آ

نے میری بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ڈیڈی جس شخص نے ایک طویل سفر اس مقصد کے لیے کیا ہو کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی شناخت حاصل کرے۔ وہ اتنی آسانی سے کیسے پیچھے ہٹ سکتا ہے۔ آپ تصور نہیں کر سکتے کہ میں کیا کیا جذبات لے کر آپ کے وطن آیا تھا۔ ڈیڈی! میں وہ ساری باتیں بھولنے کو تیار تھا جو گزر چکی ہیں۔ مگر اس وقت جب آپ مجھے بیٹا کہہ کر سینے سے لگا لیتے۔ آپ اس بدنصیب کی محرومیوں کا تصور کریں ڈیڈی جس کا باپ اس کے سامنے ہو اور لوگ اسے حرامی کہہ کر پکارتے ہوں ڈیڈی میں اپنے نام سے یہ بدنما داغ دھوئے بغیر نہیں رہوں گا اور اگر آپ نے اس سلسلے میں مجھ سے کوئی تعاون نہ کیا تو اس بات کا یقین کر لیں ڈیڈی! کہ آپ ساری زندگی اپنی اولادوں کے لیے روتے رہیں گے۔ اگر میں آپ کا بیٹا نہ ہوا تو پھر آپ کی کوئی بیٹی اور کوئی بیٹا نہ ہوگا۔ ابھی تو صرف یہ بات ندا کی ہے لیکن اس کے بعد آپ کے تینوں بیٹوں کا نمبر ہے آپ پھر سے لاولد ہو جائیں گے۔ اگر میں آپ کو ڈیڈی نہیں کہوں گا تو پھر کوئی آپ کو ڈیڈی کہنے والا اس روئے زمین پر نہیں ہوگا۔ یہ میرا عہد ہے سمجھے آپ کسی مناسب وقت پر پھر آپ سے بات کروں گا خدا حافظ۔''

''دوسری طرف سے ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع ہو گیا احمد عالم صاحب کے دل کی دھڑکن بند ہوئی جا رہی تھی۔ وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ ندا ان سے جدا کر دی جائے گی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ شخص اتنا خطرناک قدم اٹھائے گا۔ وہ بھول کر بھی یہ نہیں سوچ سکتے تھے کہ وہ کوئی جرائم پیشہ ہوگا۔ لیکن جو کچھ ہو چکا تھا اسے جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے انہوں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر دل کی دھڑکنوں کو بحال کرنے لگے جو بند ہوئی جا رہی تھیں۔ ان کے ذہن میں سناٹے بھر گئے تھے۔ عقل نے ساتھ دینا چھوڑ دیا تھا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور پریشانی سے کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ پھر انہیں کوئی خیال آیا اور انہوں نے ٹیلیفون پر شاہ میر صاحب کے نمبر ڈال کئے۔ ڈی آئی جی نادر حیات سے ان کی اچھی خاصی دوستی تھی۔ لیکن اپنی حیثیت سے وہ بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ بات معمولی پیمانے پر نہیں ہونی چاہیے تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد شاہ میر کا نمبر مل گیا اور دوسری طرف ان کی آواز سنائی دی۔

''کون؟''

''میں احمد عالم بول رہا ہوں میر صاحب! احمد عالم بارود والا۔''

''ہاں احمد عالم صاحب کیسے مزاج ہیں آپ کے۔''

''ٹھیک ہوں جناب۔''

''مجھے آپ ٹھیک نہیں لگ رہے۔ آپ کی آواز سے کچھ ایسا ہی احساس ہو رہا ہے۔ جیسے آپ کسی پریشانی کا شکار ہوں۔''

''میں ایک مشکل میں پھنس گیا ہوں شاہ صاحب! ڈی آئی جی نادر حیات سے اس بارے میں بات چیت کی تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔''

''کس بارے میں ذرا تفصیل بتائیے۔'' اور احمد عالم بارود والا نے مختصر تفصیل بتائی اور پھر کہا۔

''اور اب اس بدبخت نے میری بیٹی کو اغوا کر لیا ہے۔''

''اوہو..... کب کیسے؟''
''رات کو وہ معمول کے مطابق کسی ہوٹل یا کلب وغیرہ گئی تھی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے ا...
کا ٹیلیفون موصول ہوا ہے اور اس نے بتایا ہے کہ ندا اس کے پاس ہے۔''
''آپ میرے پاس آسکتے ہیں احمد عالم صاحب۔''
''اس وقت میں کہیں بھی جاسکتا ہوں۔'' احمد عالم نے کہا۔
''تو پھر آجائیے میں انتظار کر رہا ہوں۔''
''میں پہنچ رہا ہوں۔'' احمد عالم نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور ریسیور رکھ کر کپڑے تبدیل کر...
چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کی کار وزارت داخلہ کے دفتر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بہت بڑی شخصیت...
ان کی خاص طور سے انہیں شاہ میر صاحب نے ان کے مسئلے میں دعوت دی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ وزار...
داخلہ کے دفتر میں پہنچ گئے۔ ان کے بارے میں مکمل طور پر ہدایت جاری کر دی گئی تھی۔ اس لیے چند ہی...
کے بعد انہیں شاہ میر کے پاس پہنچا دیا گیا۔ شاہ میر صاحب نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور بولے۔
''مجھے بہت افسوس ہے کہ اس طرح آپ سے ملاقات ہو رہی ہے۔ حالانکہ کتنی بار میں نے...
کہ آپ سے ملاقات کروں۔ بیٹھیے پلیز۔'' احمد عالم صاحب بیٹھ گئے شاہ میر صاحب نے کہا۔
''ہاں۔ ایک بار پھر مجھے پوری تفصیل بتائیے۔'' اور احمد عالم نے سہیل نامی نوجوان کی آمد...
گرفتاری اور رہائی۔ جمشید مرزا ایس پی کی ان سے ملاقات ساری تفصیل بتا دی۔
''گھبرائیے نہیں مسٹر احمد عالم! کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔ لیکن میں آپ سے ایک سوال...
چاہتا ہوں۔ براہ کرم آپ دوسرے لوگوں سے ہٹ کر مجھے اس کا جواب دیجیے گا۔''
''ہاں پوچھیں۔ میری حالت کافی خراب ہو رہی ہے۔''
''میں دیکھ رہا ہوں۔ سن بھی رہا ہوں۔ لیکن بہرحال آپ کو ہمت سے کام لینا چاہیے۔ مل...
سوال آپ سے کرنا چاہ رہا ہوں۔ ممکن ہے آپ کو ناگوار گزرے لیکن صحیح صورت حال کا علم بھی مشکل کا...
بن سکتا ہے۔ حالات میرے ذہن میں بہت الجھ گئے ہیں۔ وہ آدمی آپ سے صرف اتنا چاہتا ہے کہ آ...
اسے اپنا بیٹا تسلیم کرلیں۔ آخر کیوں؟'' شاہ میر صاحب نے احمد عالم کے چہرے پر نگاہیں جما دیں اور ا...
لمحے کے اندر اس نے محسوس کرلیا کہ احمد عالم ان سے نگاہیں چرا رہا ہے۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر کے کر...
سے پیٹھ ٹکا کر کہا۔
''میں نہیں جانتا شاہ میر صاحب! آپ یقین کریں میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ ک...
کون ہے۔ لیکن آپ خود بھی سوچ سکتے ہیں وہ یقیناً ایسا ہی شخص ہوگا جو مجھے بلیک میل کرنے کے چکر میں...
ہے یورپ سے یہاں آیا ہو یا پھر میرا بیٹا بن کر عظیم الشان دولت میں سے کچھ حصہ چاہتا ہو۔ آپ خود...
سکتے ہیں میری جو حیثیت ہے اس کے تحت میرے خلاف کوئی گہری چال چلی جاسکتی ہے۔'' شاہ میر صا...
نے بے یقینی کی صورت میں احمد عالم کی طرف دیکھا پھر بولے۔
''احمد عالم صاحب! آپ کافی عرصہ غیر ممالک میں رہے ہیں کیا یہ غلط ہے۔''

''نہیں۔ میں تو اب بھی جاتا رہتا ہوں۔''
''دیکھیے میری بات کا برا نہ مانیے گا۔ نوجوانی کی عمر یا کوئی بھی عمر کسی بھی لمحے بھٹک جانے سے
گریز نہیں کرسکتی۔ ہم لوگ بعض اوقات اس طرح کوئی عمل کر بیٹھتے ہیں کہ خود بھی اس کے بعد کے معاملات
ہمارے ذہن میں نہیں ہوتے۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا۔ میں اس سے زیادہ وضاحت اور کیا کروں
آپ ایسے کسی وقت کو یاد کیجیے جب نوجوانی کی عمر کسی لغزش میں کسی زندگی کو آپ نے۔''
''نہیں شاہ میر ایسی کوئی شخصیت نہیں تھی اور پھر نوجوانی کی عمر میں اگر کوئی لغزش ہو بھی جاتی ہے تو
بھلا اسے یاد رکھنے کا کیا سوال ہے شاہ میر کے لبوں پر ایک لمحے کے لیے مسکراہٹ آئی اور انہوں نے کہا۔
''ہاں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات بھی نہیں ہوتی۔ لیکن بعض اوقات دوسرے لوگوں کے لیے
ہو جاتی ہے۔ ایک ہی لغزش کے دو شکار بعض اوقات دو مختلف کیفیتوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آپ یاد کیجیے اور
یاد آجائے تو مجھے اس کے بارے میں ضرور بتا دیجیے۔ ویسے آپ کی بیٹی میری بیٹی کی مانند ہے۔ میں اس کے
لیے جس قدر کوشش کرسکتا ہوں ضرور کروں گا آپ مطمئن رہیں اور ایک بات جو حقیقت ہے وہ یہ سمجھ لیجیے کہ وہ
آپ سے کچھ چاہتا ہے تو ندا کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔''
''آہ لیکن میں نے تو کبھی ایک لمحے کے لیے اسے خود سے جدا نہیں کیا۔''
''وہ ایک الگ بات ہے لیکن مجھے معاف کیجیے گا۔ میں نے آپ کے جواب پر اطمینان کا اظہار
نہیں کیا۔ ممکن ہے کوئی آپ کے ذہن سے نکل گیا ہو۔ حالانکہ ایسا کوئی عمل ذہن سے کبھی محو نہیں ہوتا۔ یہ بہت
زیادہ بڑے لوگوں کے معاملات ہیں کہ انہیں اپنی برائیاں یاد نہیں رہتیں۔ آپ اتنے بڑے آدمی نہیں ہیں۔
براہ کرم ضرور یاد کیجیے۔ یہ انتہائی ضروری ہے۔'' شاہ میر صاحب نے کہا اور احمد عالم پریشانی کے لمبے لمبے
سانس لینے لگا۔ اس کی حالت بہت خراب نظر آرہی تھی پھر اس نے کہا۔
''میری بچی! وہ بے شک آزاد فطرت کی مالک ہے لیکن بھلا وہ کسی کی قید میں کیا رہ سکے گی وہ بھی
ایک اجنبی کی قید میں، پتا نہیں اس بدبخت نے کس طرح اسے غائب کیا ہوگا۔''
''آپ اس کے لیے فکر مند نہ ہوں میں اس سلسلے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گا۔''
''میں...... میں اسے اپنی زندگی سے زیادہ چاہتا ہوں۔''
''میں بتا رہا ہوں نا...... کہ بے فکر رہیں۔'' احمد عالم نے رومال نکال کر آنکھیں خشک کیں اور بولا۔
''اب میں کیا کروں؟''
''کچھ نہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ کسی طرح ندا کا پتا چل جائے۔''
''میں بے حد شکر گزار ہوں۔''
''اب میں چلتا ہوں۔''
''افسوس یہ آفس ہے اس لیے کوئی خاطر مدارات نہیں کرسکوں گا۔'' تمہیں تکلیف دینے کے لیے
معافی چاہتا ہوں۔''
''نہیں میں تو خود مجبور ہوں۔'' احمد عالم نے کہا۔ شاہ میر صاحب نے اسے ہاتھ ملا کر رخصت کیا

اور پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ تھوڑی دیر تک سوچتے رہے اور پھر کسی خیال کے تحت انہوں نے ٹیلیفون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ریسیور اٹھا کر نمبر ڈال کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک آواز سنائی دی۔

''شازیہ اسپیکنگ کون صاحب۔''

''اوہو۔ شازیہ بے بی! میں شاہ میر بول رہا ہوں وزیر داخلہ۔''

''سر! السلام علیکم سر!''

''وعلیکم السلام! یہ بتاؤ کرنل رحیم کہاں ہے۔''

''سر! موجود ہیں۔''

''بات کراؤ میری۔'' شاہ میر صاحب نے کہا اور چند لمحات کے بعد کرنل رحیم کی آواز ابھری۔

''جی سر! خیریت سے ہیں نا آپ۔''

''ہاں۔ میں تو خیریت سے ہوں۔ لیکن کچھ لوگ خیریت سے نہیں ہیں اور ان کی نگاہیں میری طرف ہیں اور میری نگاہیں تمہاری طرف اور میں جانتا ہوں کہ اس وقت تمہاری نگاہیں کس طرف اٹھیں گی۔'' کرنل رحیم ہنسنے لگا پھر بولا۔

''ہاں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں شاہ میر صاحب! کہ تقدیر نے مجھ سے میرا ایک پاؤں چھین لیا ہے۔ لیکن میرے چار ہاتھ ہیں۔ دو میرے اور دو صوفی کی شکل میں اور یہی میرے کار آمد ہاتھ ہیں۔''

''خدا کرے تم لوگوں کا معاملہ بڑی خوش اسلوبی سے چلتا رہے۔ ہمارے لیے تو فرشتہ ثابت ہوتے ہو تم۔ بس اب یہ سمجھ لو کہ میں یہ مکھن اسی لیے لگا رہا ہوں تمہیں کہ ایک مشکل آ پڑی ہے میرے پاس آ جاؤ۔''

''یہ سر و چشم کس وقت حاضری دینی ہے۔''

''میں آفس سے جلدی اٹھ جاتا ہوں۔ گھر پر ملاقات کریں گے شام کی چائے میرے ساتھ پیو۔''

''پانچ بجے پہنچ جاؤ۔''

''ساڑھے پانچ بجے۔''

''ٹھیک ہے۔'' ساڑھے پانچ بجے کرنل رحیم شاہ۔ شاہ میر صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ سیکیورٹی کو ہدایت کر دی تھی کہ کرنل رحیم صاحب آنے والے ہیں۔ کرنل کو دروازے سے ہی تعظیم دی گئی اور اس کے بعد انہیں شاہ میر صاحب کے پاس پہنچا دیا گیا۔ شاہ میر نے کرنل رحیم شاہ سے بہت پر خلوص مصافحہ کیا تھا۔ پھر وہ کہنے لگے۔

''اور میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ میرے لیے تو گرین فورس میری ہاؤس فورس ہے حقیقت یہ کہ رحیم شاہ کہ اب بہت سے معاملات میں میرا ذہن کہیں اور نہیں جاتا بلکہ میں صرف تم دونوں کے بارے میں سوچتا ہوں جو ایک مکمل فورس ہے اور اسی لیے میں نے ہزار بار یہ کوشش کی ہے کہ گرین فورس کو اتنا مضبوط بنا دو کہ ملکی معاملات میں وہ ایک اہم ستون ثابت ہو۔ اس کے لیے ہر طرح کے سرکاری عہدے مخصوص کیے جائیں گے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر میں نے ایسا کوئی کام کر دیا تو وہ میرا کارنامہ ہوگا۔ بہت سے ذاتی معاملات میں

بھی تم لوگوں نے جس طرح میری مدد کی ہے۔ میں اسے کبھی نہیں بھولوں گا میں ایک محکمے کا سربراہ ہوں۔ بے شمار افراد میرے لیے ہر کام سرانجام دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے لیکن ایسا محکماتی طور پر ہوگا۔ جبکہ گرین فورس میری پرائیویٹ فورس ہے۔''

''بالکل ہے شاہ میر! میں خلوص دل سے تمہیں تمہاری ہر مشکل میں شریک ہونے کی پیش کش کرتا ہوں۔''

''بے حد شکریہ۔ خیر ہمیں مطلب پر آ جانا چاہیے۔''

''ہاں بالکل۔''

''احمد عالم بارود والا کو جانتے ہو۔''

''جی بالکل۔''

''وہ ایک عجیب و غریب مشکل کا شکار ہو گئے ہیں۔''

''تھوڑی بہت تفصیل میرے علم میں ہے۔'' غالباً اس نوجوان کی کہانی جو ایئر پورٹ سے تماشا کرتا ہوا اندر داخل ہوا ہے اور اس کے بعد غالباً اس نے احمد عالم بارود والا کو یہ بات بتائی ہے کہ وہ اسی کی اولاد ہے۔''

''ارے بالکل بالکل۔ خیر حیرت کا اظہار نہیں کروں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم لوگوں نے بہت سی ذمے داریاں اپنے شانوں پر سنبھال رکھی ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ مزید کچھ۔''

''نہیں بالکل نہیں۔ اس سے آگے نہیں۔''

''اس سے آگے میں بتاتا ہوں۔'' شاہ میر صاحب نے کہا اور ساری تفصیل کرنل رحیم کو بتا دی۔

''ہاں یہ نئی باتیں ہیں جو غالباً صوفی کو بھی نہیں معلوم۔ خیر کیا کہتے ہو اس بارے میں۔''

''گڑبڑ ہے۔'' شاہ میر نے کہا۔

''بالکل۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ آپ نے احمد عالم کو یہ مشورہ کیوں نہیں دیا کہ وہ اسے اپنی اولاد مان لیں اور اولاد ماننے کے بعد اس سے نمٹ لیں۔ یہ ترکیب کی جا سکتی ہے۔''

''وہ بہت چالاک آدمی معلوم ہوتا ہے کرنل! وہ یقینی طور پر اپنا اطمینان کرنے کے بعد ہی ندا کو واپس کرے گا۔''

''میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے اور آپ نے کہا تھا کہ ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ وہ کسی کو اپنا باپ کیوں بنانا چاہتا ہے۔ عموماً ایسے واقعات کم ہی ہوتے ہیں۔ اگر بات صرف دولت کی ہے تو ظاہر ہے احمد عالم صاحب اسے اتنی آسانی سے دولت نہیں دے دیں گے ان کے اور بھی بیٹے ہیں۔ اگر اس شخص کو تھوڑی بہت رقم درکار تھی تو وہ کوئی اور طریقہ کار اختیار کر سکتا تھا بہر طور گنجائش تو ہے۔ اس لڑکے کی تصویریں مل سکیں گی۔''

''میرا خیال ہے ملنی چاہئیں۔ پاسپورٹ وغیرہ یا پھر ہو سکتا ہے جمشید مرزا کے پاس اس کی تصویریں بھی ہوں۔''

''آپ کوشش کر لیں۔ ورنہ میں ہی کرتا ہوں کچھ نہ کچھ معلومات حاصل ہونا چاہئیں کہاں قیام ہے اس کا۔ کیسی شکل و صورت ہے کس مزاج کا نوجوان ہے۔ ویسے احمد عالم سے بھی ملاقات کرنا پڑے گی۔''

''ہاں۔ جس طرح سے بھی دل چاہے میں نے اس سے وعدہ کرلیا ہے کہ میں اس کی مشکل کا حل دریافت کروں گا۔ میں اسے تمہاری آمد کی اطلاع دے دوں گا۔ ان دنوں کافی پریشان ہے۔''

''ٹھیک ہے میں وہاں جاتے ہوئے آپ کو ٹیلی فون کرلوں گا۔''

''بہت بہت شکریہ کرنل!''

''ٹھیک ہے۔ چائے ہوجائے۔'' کرنل نے بے تکلفی سے کہا اور اس کے بعد چائے وغیرہ سے فراغت حاصل کی گئی۔ تب اس نے صوفی کو فون کیا اور صوفی نے مشاعرے والی بات کہی۔ کرنل نے اسے طلب کرلیا تھا۔ پھر صوفی جس طرح بھی پہنچا وہ ایک الگ بات تھی لیکن شازیہ سے اس کی ملاقات ہوئی تو اس نے فوراً ہی کہا۔

خود اپنے خون میں نہائے ہوئے مگر چپ ہیں
یہ لوگ ہیں کہ چٹانیں ہیں سرخ پتھر کی

درویشوں کی دعاؤں سے۔ شازیہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے تعجب سے کہا۔

''چھوٹے بابا! یہ شعر آپ کا ہے۔''

''خدا نہ کرے۔'' صوفی نے کہا۔

''تو پھر؟''

''مشاعرے سے آرہا ہوں۔ دماغی کیفیت درست نہیں ہے۔ کرنل صاحب کہاں ہیں۔''

''ہائے اتنا اچھا شعر۔''

''کچھ زیادہ اچھا ہوگیا کیا۔''

''چھوٹے بابا! پلیز پھر سے۔''

''ہرگز نہیں۔ ورنہ یہیں مشاعرہ شروع ہوجائے گا درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی نے کہا اور اندر چل پڑا۔ شازیہ اس کے پیچھے پیچھے آئی تھی کرنل رحیم شاہ اسی کا انتظار کررہا تھا۔

''آیئے صوفی صاحب! کہیے کیسے مزاج ہیں۔''

''اندازہ لگالیجیے جناب۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

میری پلکوں کے دریچے میں بنجر آنکھیں
میرا اجڑا ہوا چہرہ میری پتھر آنکھیں

صوفی نے کہا اور کرنل رحیم شاہ حیرت سے منہ کھولے کبھی شازیہ اور کبھی صوفی کو دیکھنے لگا۔

''بڑے بابا! کیا ہوگیا ہے ہمارے چھوٹے بابا کو ہائے کیسے اچھے اچھے شعر پڑھ رہے ہیں۔ کہتے ہیں مشاعرے سے آئے ہیں۔''

''تو بی بی اس میں ہائے ہائے کرنے کی کیا بات ہے۔ انسان ہیں کچھ غلطی ہوگئی ہوگی۔'' کرنل رحیم شاہ نے بھی برجستگی سے کہا۔ صوفی گردن جھکا کر بیٹھ گیا تھا۔ شازیہ نے کہا۔

''چھوٹے بابا کچھ اور ایک شعر اور''

''شعر اگر اپنی مرضی سے کہا جائے تو شعر ہوتا ہے ورنہ ہر شعر ہوجاتا ہے شازیہ درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے کہا اور شازیہ ہنس پڑی پھر بولی۔

''کسی وقت آپ سے۔ بس چھوڑوں گی نہیں چھوٹے بابا آپ کو سنوں گی بہت کچھ سنوں گی۔''

''صلواتیں ہی سنو گی۔ ساتھ میں حسینہ کو بھی ملالوں گا جو کرنل صاحب نے تحفے کے طور پر مجھے دی ہے سنانے پر آئے تو ایسا سناتی ہے کہ بس انسان سنتا ہی رہ جائے۔''

''اُسے بھی سنوں گی کسی دن، بہت دیر تک یہ تفریحی باتیں چلتی رہیں اور اس کے بعد شازیہ وہاں سے چلی گئی۔ تو کرنل رحیم نے کہا۔

''بھئی واقعی اچھے شعر سنائے پتا نہیں یار تم اندر سے کیا ہو۔''

''جونیر یہ تو نہیں سنا آپ نے مرحوم نے کہا تھا۔

کہ ہر گھڑی بولتا ہی رہتا ہوں
کتنا خاموش ہوں میں اندر سے

خدا کی قسم تم بہت باصلاحیت ہو۔ کرنل رحیم شاہ نے کہا اور پھر ہنس پڑا۔

''میری صلاحیتوں پر ہنس رہے ہیں آپ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''نہیں شاہ میر صاحب کی بات پر کہنے لگے کہ اسی لیے مکھن لگا رہا ہوں کہ میرے اوپر ایک مشکل آن پڑی ہے، مجھے بھی اس وقت ایسا ہی لگ رہا ہے کہ میں جیسے تمہیں مکھن لگا رہا ہوں۔'' کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

''نہیں جناب! خادم ہوں آپ کا۔ تابعدار ہوں شاہ میر صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔''

''ہاں اس سلسلے میں میرا مطلب ہے تم نے انہیں تھوڑی بہت تفصیل بتائی تھی ناں۔ جمشید مرزا ایئرپورٹ سے آنے والے نوجوان کی۔''

''ہاں ہاں...... ہاں وہ ایک دلچسپ قصہ تھا۔ بعد میں پتا چلا تھا کہ وہ کوئی ہیروئن پاؤڈر نہیں بلکہ پسا ہوا پتھر تھا۔ وہ وہ نوجوان مجھے کافی ستم ظریف معلوم ہوتا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''اب ایک نیا مسئلہ چل نکلا ہے۔''

''ارشاد...... ارشاد''

''نہیں بھائی یہاں ارشاد صاحب کا کوئی دخل نہیں ہے مشاعرہ ذہن سے نکال دو اور بیٹھ کر سنجیدگی سے مجھ سے سنو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ کرنل رحیم شاہ نے کہا اور صوفی جیب میں پانوں کی ڈبیا تلاش کرنے لگا۔ لیکن یہ چیزیں نکالنے کے بعد اس نے انہیں استعمال نہیں کیا تھا۔ بلکہ واپس جیب میں رکھ لیا تھا۔ کرنل رحیم شاہ کا وہ بہر حال احترام کرتا تھا۔ کرنل رحیم شاہ نے بھی یہ بات محسوس کی لیکن خاموش ہی رہا پھر اس کے بعد اس نے اب تک کی موصول شدہ تفصیلات صوفی کو بتادیں۔ صوفی پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا پھر بولا۔

''گویا اب اس نے بارود والا کی بیٹی کو اغوا کرلیا ہے میرے خیال میں اس نے یہ جرم کر ڈالا۔''

''کہا بھی جاسکتا ہے اور نہیں بھی ویسے وہ لڑکا بہت چالاک معلوم ہوتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔''

کیا وہ بارود والا ہی کی اولاد ہے۔''

''اولادوں کے بارے میں مجھے ابھی کوئی تجربہ نہیں ہے جناب درویشوں کے کرم سے لگ
حالات چیخ چیخ کر یہی کہہ رہے ہیں۔''

''تو اب تمہارا کیا ارادہ ہے میرا مطلب ہے کام تو شروع کرنا ہے۔''

''جی۔'' جمشید مرزا اس سلسلے میں بہترین ثابت ہوسکتا ہے۔''

''بالکل...... بالکل یہی میں بھی کہنا چاہتا تھا۔'' کرنل رحیم شاہ نے کہا۔ کافی دیر تک صوفی کرنل
رحیم شاہ کے پاس بیٹھا رہا پھر اس کے بعد گھڑی میں وقت دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور وہاں سے چل پڑا اس کی
گاڑی سیدھی جمشید مرزا کے گھر پر جا کر رکی تھی۔ یقین تو نہیں تھا کہ جمشید مرزا گھر پر ہی ہوگا۔ لیکن کوشش
کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ دروازہ ایک ملازمہ نے کھولا اور بولی۔

''جی فرمائیے۔''

''مرزا جی سے ملنا ہے۔''

''کیا نام بتا دوں آپ کا۔'' ابھی ملازمہ یہ کہہ رہی تھی کہ جمشید مرزا کی بیوی ٹہلتی ہوئی باہر آ گئی۔

''یہ صاحب بڑے صاحب سے ملنے آئے ہیں۔'' جمشید مرزا کی بیوی نے صوفی کو دیکھا صوفی
نے اسے سلام کر ڈالا۔

''جی فرمائیے۔ کون ہیں آپ۔''

''احقر کو صوفی کہتے ہیں۔''

''اوہو...... اوہو...... آپ ہیں صوفی صاحب آئیے...... آئیے...... آئیے۔''

''در...... درویش رحم کریں۔ آپ ہمیں کیسے جانتی ہیں۔''

''ارے...... آپ آئیے تو سہی۔'' جمشید مرزا کی بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا اور صوفی اندر داخل
ہو گیا۔ پھر جمشید مرزا کی بیوی اس سے بڑی دیر تک باتیں کرتی رہی۔ اسی دوران جمشید مرزا اندر داخل ہو گیا۔
اس کی بیوی نے صوفی کو آنکھ ماری اور صوفی گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جمشید مرزا نے اندر داخل ہوتے
ہوئے پوچھا۔

''کون آیا تھا بھئی بتایا نہیں تم نے مجھے۔'' پھر صوفی پر نگاہ پڑتے ہی وہ بری طرح اچھل پڑا۔

''آپ...... آپ...... آپ''

''ارے کیا آپ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔'' جمشید مرزا کی بیوی نے شرارت سے کہا۔

''کک...... کک کیا مطلب کیا تم بھی ان کو جانتی ہو۔''

''یہ میرے کزن ہیں۔ بہت پہلے میں نے تم ان کا ذکر کیا تھا۔ پہلے محکمہ پولیس میں تھے۔ بعد میں
نجانے کہاں چلے گئے۔ پھر اطلاع ملی کہ فرید پور میں ہیں۔ پھر اطلاع ملی کہ فرید پور سے ٹرانسفر ہو کر یہاں
آ گئے ہیں۔''

''ارے...... بب بب باپ رے، کزن ہیں یہ تمہارے تب تو یہ ہمارے سالے

ہوئے'' جمشید مرزا نے کہا۔ صوفی بوکھلائی ہوئی نگاہوں سے جمشید مرزا کی بیوی کو دیکھتا رہا۔ اس نے کئی بار
صوفی کو آنکھ ماری تھی۔ جمشید مرزا نے کہا۔

''چلیے صوفی صاحب اب تو ہمارے اور آپ کے درمیان رشتے داری بھی نکل آئی۔ اس کا
مطلب ہے کہ میں اب آپ سے دل کی ہر بات کہہ سکتا ہوں۔''

''بے شک۔ بے شک درویشوں کی دعاؤں سے، صوفی نے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے کہا۔

''میں صوفی صاحب کے لیے کچھ لاتی ہوں۔ میرے بڑے پیارے بھائی ہیں یہ۔'' جمشید مرزا
کی بیوی نے کہا۔ جب وہ باہر نکل گئی تو جمشید مرزا بولا۔

''صوفی صاحب آپ صوفی ہیں غلط بیانی نہیں کریں گے۔ کیا واقعی آپ اس کے کزن ہیں۔''

''تت...... تت توبہ کیجیے جمشید مرزا صاحب اتنی تیز طرار لڑکیاں...... میرا مطلب ہے خواتین کا
کزن ہونا تو بڑی خطرناک بات ہے۔''

''نہیں ہیں نا۔'' جمشید مرزا نے قہقہہ لگایا۔ پھر بولا۔

''میں جانتا ہوں یہ اس طرح کی شرارتیں کرتی رہتی ہیں لیکن بہرحال رشتہ برا نہیں ہے میرے تو
فائدے ہی فائدے تھے۔ مگر آپ غریب خانے پر بخدا خوشی سے پھول کر کپا ہوا جا رہا ہوں۔''

''کک...... کک کیا۔'' صوفی کے منہ سے بمشکل تمام نکلا۔

''ہاں بس یوں سمجھ لیجیے کہ آپ کی وجہ سے ایک بار پھر میری گرتی ہوئی عزت کو سہارا مل گیا ہے۔''

''مم...... مم میری وجہ سے۔''

''ہاں صوفی صاحب اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ نے ان دو کیسوں میں میری جس طرح
مدد کی ہے میں تو بھائی سیدھی سیدھی سی بات ہے کہ ذہنی ورزش کر ہی نہیں سکتا۔ آپ نے کمال کر دکھایا ہے اور
اگر اس طرح آپ کی نظر عنایت مجھ پر رہی تو میرا عہدہ بڑھتا ہی چلا جائے گا۔''

''درویش رحم کریں......'' صوفی نے آہستہ سے کہا پھر بولا۔

''ایک کام تھا۔''

''کھاتے پیتے ہیں اس کے بعد یہاں سے باہر نکلیں گے پھر بات کریں گے۔'' جمشید مرزا نے
کہا۔ بیوی نے واقعی بہت زبردست انتظامات کر ڈالے تھے پھر وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''آپ کو پتا چل گیا ہوگا میرے کزن کے بارے میں۔''

''جی ہاں پتا چل گیا ہے وہ ایک شریف آدمی ہے آپ جیسی خاتون کا دور کا رشتہ دار بھی نہیں
ہوسکتا۔''

''ارے...... ارے تو کیا میں اتنی بری ہوں۔'' جمشید مرزا کی بیوی نے کہا پھر بولی۔

''صوفی صاحب اگر ہمارے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے تو آج سے قائم ہو جانا چاہیے بتائیے کہ کیا
آپ مجھے اپنے کزن کی حیثیت سے قبول کریں گے۔''

''قبول کیا ہم نے درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے کہا اور کمرے میں ایک قہقہہ گونج اٹھا۔

تھوڑی دیر کے بعد جمشید مرزا صوفی کے ساتھ باہر نکل آیا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''آیئے کسی اچھے سے ہوٹل میں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

''اب ہوٹل میں بیٹھنے کی کیا گنجائش ہے۔''

''آپ ایک کپ چائے منگوالیں گے اور پھر باتیں کریں گے۔ صوفی صاحب ایک بار پھر آپ کی مدد کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ اچھا یہ بتایئے کہ آپ کا میرے پاس کیسے آنا ہوا۔''

''گزر رہے تھے یہاں سے سوچا سلام کرتے چلیں۔'' صوفی نے کہا۔

''واہ، وعلیکم سلام۔ آیئے وہ سامنے ریسٹورنٹ ہے بڑا اچھا ہے چھوٹا سا پرسکون، زیادہ رش نہ ہوتا۔ ریسٹورنٹ کے ایک گوشے میں بیٹھ کر جمشید مرزا نے صوفی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''آج کل ایک نئی الجھن آگئی ہے تھوڑا بہت تو آپ کو اس بارے میں بتایا تھا میں نے۔''

''ہاں وہ کیا نام تھا اس کا اختر سہیل بارودوالا۔''

''بالکل...... بالکل یار کمال کا شخص ہے وہ اور بڑا سنسنی خیز مسئلہ پیدا ہوگیا۔ جمشید مرزا نے صوفی کو خوشی ہوئی کہ بات خود بخود نکل آئی۔ اسے خود کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ وہ سوالیہ نگاہ سے جمشید مرزا کو دیکھتا رہا جمشید مرزا نے کہا۔

''تفصیل تو آپ کے علم میں ہوگی صوفی صاحب وہ ایئرپورٹ پر اترا اور اسے ہیروئن لانے کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا اور اس کے بعد مختلف مراحل سے گزر کر وہ مجھ تک پہنچا اس نے مجھے بتایا کہ احمد عالم بارودوالا کا بیٹا ہے اور پھر احمد عالم نے اس کو اپنا بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ بس صوفی صاحب یہیں سے بات بگڑ گئی۔

''حق اللہ...... حق اللہ...... حق اللہ'' اور اس کے بعد آپ نے اس ہیروئن کا کیمیائی تجزیہ کرایا وہ اصل میں پسے ہوئے پتھر تھے۔ وہ شرارتاً پاؤڈر اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس کے بعد آپ نے اسے چھوڑ دیا۔ لیکن اس کے بعد کی تفصیل ابھی تک آپ کے علم میں نہیں آئی۔ جمشید مرزا صاحب۔ جمشید مرزا شدت حیرت سے گنگ رہ گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے صوفی کی شکل دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

''یہ...... یہ لیکن آپ کو اس بارے میں کیسے علم ہوا۔''

''حق اللہ...... درویشوں کا مذاق اڑانے والے یہی سوال کرسکتے ہیں۔ آگے کی بات سنئے اس نے احمد عالم بارودوالا کی بیٹی ندا کو اغوا کرلیا اور اس کے بعد اس نے بارودوالا کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے اسے اپنا بیٹا تسلیم نہیں کیا تو ندا کو ہلاک کردیا جائے گا۔ جمشید مرزا صاحب بہت بڑی ذمے داری آپڑی آپ پر، چنانچہ احمد عالم بارودوالا نے ہوم منسٹر سے اس سلسلے میں براہ راست بات چیت کی ہے سمجھ رہے ناں آپ'' جمشید مرزا کی روح فنا ہوگئی تھی۔ وہ سراسیمہ نگاہوں سے صوفی کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

''اگر یہ بات ہے تو...... تو میں تو مارا گیا۔ میں...... میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔ لیکن مجھے یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ محکماتی طور پر میری شامت آجائے گی۔ مجھ سے بڑی حماقت ہوئی تھی۔ یہ تو ہیروئن کے بجائے پتھر نکلا اس لیے بند رکھنے کا کوئی جواز نہ تھا میرے پاس اس کے علاوہ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اسے نہ چھوڑا تو وہ اپنے سفارتخانے سے رجوع کرے گا۔ سب سے بڑی حماقت مجھ سے یہ ہوئی تھی کہ میں اس کو لے کر احمد عالم کے پاس پہنچ گیا۔ پہلے مجھے دوسرے ذرائع سے اس کے بارے میں چھان بین کرلینی چاہیے تھی۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں ہے صوفی صاحب آپ خود بتایئے آخر ہم اسے کس جرم میں قید رکھ سکتے تھے۔ اگر وہ واقعی اپنے سفارت خانے سے رجوع کرلیتا تب بھی مجھے ہی پریشانیوں کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ ویسے میں آپ کو ایک بات بتادوں صوفی صاحب وہ بڑا سخت ثابت ہوگا احمد عالم بارودوالا کے لیے۔ میری گردن تو خیر پھنسی ہی ہے اللہ میری مدد کرے گا لیکن احمد عالم بارودوالا جس عذاب میں گرفتار ہوجائے گا۔ میں آپ کو بتاؤں کہ وہ اس قدر صلاحیتوں کا مالک ہے کہ آپ بھی اسے دیکھتے تو حیران رہ جاتے۔

میں نے اس کے ہاتھ ہتھکڑیوں میں کسوا دیے تھے لیکن جب میں کرسی پر بیٹھا تو اس نے اپنی ہتھکڑیوں کا جوڑا میز پر رکھ دیا۔ لاک اپ میں بند کیا تو مجھے یہ پتا نہیں چل سکا کہ کس طرح لاک اپ سے نکل کر باہر آگیا۔ بڑا ہی پراعتماد اور خطرناک آدمی معلوم ہوتا تھا۔ صوفی کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے ایک انوکھی لہر بے دار ہوئی۔ پھر اس نے کہا۔

''کوئی تصویر ہے اس کی۔''

''تصویر کہاں سے آتی۔ ویسے سفارتخانے وغیرہ سے اس کے بارے میں معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔''

''شکل وصورت کیسی تھی اس کی۔''

''ہاں میں آپ کو اس کا حلیہ بتلا سکتا ہوں۔ بہت ہی خوب صورت شکل وصورت کا تروتازہ نوجوان تھا۔ طویل القامت، جوان العمر، رنگ انگریزوں کی طرح سرخ وسفید تھا۔ لیکن چہرے پر انگریزوں جیسا کھردرا پن نہیں تھا۔ بلکہ ایک ملائمت ہے اس کے چہرے پر اور ہاں ایک خاص بات میں اور بتادوں یہ میری ذاتی رائے ہے اس کے چہرے کے نقوش بارودوالا سے ملتے جلتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اردو اہل زبان ہی کی طرح بولتا ہے۔''

''ہوں، درویش اس بھی پر رحم کریں۔''

''صوفی صاحب میں مصیبت میں گرفتار ہوگیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، درویش رحم کریں گے۔ ویسے اس کی تصویر کا انتظام ہوجائے۔''

''میں بھرپور کوشش کرتا ہوں۔'' جمشید مرزا نے جواب دیا اس کے بعد وہ دونوں ہوٹل سے اٹھ گئے تھے۔

♥......♥......♥

صوفی کے جوہر اس طرح کھلتے تھے کہ سب ششدر رہ جاتے تھے۔ کرنل رحیم شاہ کی ہدایت کے بعد اختر سہیل کی تلاش بہت بڑی حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ اس سلسلے میں بھرپور طریقے سے کارروائی ہو رہی تھی۔ سہیل عالم بارودوالا کی تصویر کہیں سے حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لیکن پھر صوفی نے مصوری کا کمال دکھایا تھا جمشید مرزا سے سہیل کا حلیہ معلوم کرنے کے بعد صوفی نے گرین ہاؤس میں اس کی تصویر بنائی تھی۔ پھر اس

تصویر کے پرنٹ نکلوائے گئے تھے اور اس کے بعد جب اسے جمشید مرزا کے سامنے پیش کیا گیا تو جمشید مرزا
شدت حیرت سے گنگ رہ گیا۔"

"یہی ہے بالکل یہی ہے مگر یہ تصویر آپ کو کہاں سے حاصل ہوئی صوفی صاحب۔"

"عزیزی آپ کی ہدایت کے مطابق بنائی ہے۔"

"نح...... خدا کی قسم کوئی شخص بلا وجہ اتنی شہرت اور اختیارات حاصل نہیں کر لیتا بہرحال شاہزیب
دلاور، فیضان، غلام قادر سبھی ان دنوں اس تصویر کے پرنٹ جیب میں لیے پھر رہے تھے۔ خود صوفی بھی اب
اس کی تلاش میں سرگرداں تھا اور پھر اس دن صوفی ایک سینما ہاؤس کے سامنے سے گزر رہا تھا جس میں ایک
بہت مشہور انگریزی فلم چل رہی تھی کہ اسے ایک ایسا چہرہ نظر آیا جسے دیکھ کر وہ اچھل پڑا تھا۔ ڈارک گرین کلر
کے سوٹ میں ملبوس وہ سرخ وسفید رنگت والا نوجوان شاہانہ انداز میں چلتا ہوا ایک لمبی کار کی جانب بڑھ رہا
تھا۔ بہت اعلیٰ درجے کی کار تھی۔

صوفی رک کر اسے دیکھتا رہا۔ وہ خود بھی ایک ایسی کار میں تھا جو اس کی نئی رہائش گاہ میں رہا کرتی
تھی۔ نوجوان اس کار میں بیٹھا تھا اور صوفی نے اس کا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ سینما ہال کے پاس اچھی خاصی
بھیڑ بھاڑ تھی لیکن اچھا خاصا دور جا کر رش ختم ہو گیا تھا اور اب صوفی بڑی باقاعدگی سے اس کار کے پیچھے لگا ہوا
تھا اور تھوڑی دیر کے بعد اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ آگے جانے والی کار کو تعاقب کا اندازہ ہو گیا ہے پھر اس کی
رفتار ایک دم تیز ہو گئی تھی۔ اگر یہ سہیل عالم بارود والا ہی تھا تو آج اونٹ پہاڑ تلے آیا تھا اور لازمی طور پر کسی
دلچسپ صورت حال کا آغاز ہونے والا تھا۔

♥......♥......♥

آگے جانے والی کار کی رفتار بڑھتی رہی۔ لیکن صوفی کی کار اس سے کسی بھی طرح پیچھے نہیں تھی۔
رفتار بتانے والی سوئی حدود توڑ رہی تھی اور آگے جانے والی کار نے سنسان سڑکوں کا رخ کیا تھا تاکہ اس تیز
رفتاری کی وجہ سے کوئی حادثہ رونما نہ ہو جائے۔ صوفی محسوس کر رہا تھا کہ آگے جانے والا شخص انتہائی مشاق
ڈرائیور ہے لیکن صوفی کی اپنی صلاحیتوں کے بارے میں کسی کو کوئی علم نہیں تھا۔

پھر ایک موڑ پر وہ کار نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ دوسرے لمحے صوفی بھی تیز رفتاری سے اس موڑ سے
گزرا اور پھر اگر وہ انتہائی مہارت کا ثبوت نہ دیتا تو ایک بہت ہی بڑا حادثہ ہو گیا تھا۔ کار موڑ کے بالکل نزدیک
سڑک کے بیچ میں کھڑی ہوئی تھی۔ صوفی نے اپنی کار سائیڈ سے نکالی اور آگے چل کر اس کی رفتار ایک دم کم کر
دی۔ اس کے بعد وہ کار کو ریورس میں پیچھے کی طرف لایا لیکن اسی وقت وہ کار تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔

ڈرائیونگ کرنے والا اپنی ہلیٹ سے ہٹا نہیں تھا جب کہ صوفی نے ایک لمحے کے لیے یہ سوچا تھا
کہ وہ کار کو ایک لمحے کے لیے سڑک پر چھوڑ کر یقیناً نیچے کود گیا ہوگا۔ ایک بار پھر صوفی کو بریک لگانے پڑے
لیکن اس کی کار کا پچھلا حصہ کار سے ٹکرا ہی گیا تھا۔ صوفی کا خیال تھا کہ یہ صرف اتفاقیہ بات ہے لیکن تھوڑا سا
آگے ہٹ کر ایک بار اس نے پیچھے سے زوردار ٹکر صوفی کی کار میں لگائی اور اس کے بعد اس کی کار سائیڈ سے

گزرتی ہوئی آگے بڑھ گئی لیکن وہی بات تھی کہ اونٹ پہاڑ تلے آیا تھا۔ صوفی نے اپنی کار بھی آگے بڑھا دی
اور آن کی آن میں وہ اس کے عقب میں پہنچ گیا۔

لیکن اب وہ پوری طرح ہوشیار تھا۔ وہی ہوا جس کا خدشہ تھا آگے جانے والی کار کو یک دم بریک
لگے لیکن صوفی اس بار نہایت آسانی سے اس کی سائیڈ سے ہوتا ہوا آگے نکل گیا۔ اس کی کار کا بمپر صوفی کی کار
سے ٹکرایا تھا اور کار سڑک پر لہرا کر رہ گئی تھی پھر اس نے ایسا یوٹرن لیا کہ صوفی کو بھی اس کی اعلیٰ ترین مہارت کا
قائل ہونا پڑا البتہ یہ الگ بات تھی کہ کچھ ہی دور پہنچ کر صوفی نے بھی اپنی کار کو واپس موڑ لیا تھا اور سائے کی
طرح اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔

لیکن وہ شخص بھی شیطان ہی تھا۔ وہ اب اپنی کار کے دوسرے رخ کو صوفی کی کار کے اس سمت
سے آیا جو ڈرائیونگ سائیڈ تھا اور پھر اس نے صوفی کی کار کو سائیڈ ماری، لیکن صوفی صاف بچ گیا۔ اس کے
بعد وہ بار بار کوشش کرتا رہا تھا لیکن اسے بھی قائل ہی ہونا پڑا ہوگا کہ کس ڈرائیور سے واسطہ پڑا ہے۔ اس طرح
آگے پیچھے دونوں کاریں شہر میں داخل ہو گئیں۔ پھر کچھ دیر کے بعد انہیں ایک سگنل کے پاس رکنا پڑا۔ صوفی
نے اپنی کار اسکی کار کے بالکل برابر لا کر کھڑی کر دی اور پھر گردن نکال کر بولا۔

"سلام عرض کرتا ہوں حضور والا!" ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے بھی مسکرا کر گردن
خم کی تو صوفی نے کہا۔

"اگر محسوس نہ فرمائیے تو اس سگنل سے نکلنے کے بعد مجھ سے گفتگو کیجئے، نہ جانے کیوں آپ کی
صورت آشنا معلوم ہوتی ہے۔" صوفی نے کہا۔

"ضرور...... ضرور جناب! مجھے بھی آپ اپنے اپنے سے لگ رہے ہیں۔" اس نے برجستگی سے
کہا، پھر سگنل کے بعد صوفی نے ہوشیاری سے کار آگے بڑھائی۔ اسے خدشہ تھا کہ وہ شخص پھر کوئی حرکت کرے
گا لیکن سگنل کے کچھ دور جا کر اس نے کار سڑک کے ایک طرف روک دی اور صوفی اس کے برابر پہنچ گیا پھر
دونوں دروازے کھول کر نیچے اتر آئے۔ نوجوان نے مصافحے کے لیے صوفی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

"افسوس میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔"

عزیزم زمانہ قدیم میں میری ایک خالہ زاد ممانی ہوا کرتی تھیں۔ ان کے سالے کی سگی بہن کا ایک
بیٹا تھا جو بالکل آپ کا ہم شکل تھا۔ درویشوں کی دعاؤں سے میں عرصے سے آپ کی تلاش میں ہوں۔"

"ارے کیا واقعی!" نوجوان کے چہرے پر مسرت کے آثار پھیل گئے۔ "تو وہ تم ہو آہ...... کتنے
عرصے کے بعد ملے ہو۔" یہ کہہ کر وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر صوفی کی جانب لپکا اور صوفی نے بھی ہاتھ پھیلا
دیئے۔ دوسرے لمحے دونوں بغل گیر ہو گئے۔ لیکن نوجوان کی تقدیر ہی خراب تھی۔ ہڈیوں کے اس فولادی
ڈھانچے میں اس قدر قوت تھی کہ جب بھی اس کے اظہار کا موقع آیا مد مقابل کی چیخیں نکل گئیں۔ گلے ملنے کا
تو ایک بہانہ تھا۔ صوفی کے ہاتھوں کا مخصوص دباؤ اس کی گردن پر آ پڑا اور گرفت اتنی خطرناک ہو گئی کہ نوجوان
ایک لمحے کے لیے بوکھلا کر رہ گیا۔ اس نے خود کو صوفی کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس میں

کامیاب نہیں ہوسکا۔

پھر نوجوان نے پھرتی سے زمین پر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن لگتا تھا کہ لوہے کے بنے ہوئے کسی کھ
کے کھمبے سے ٹکرا گیا ہو اور پھر چند ہی لمحوں بعد اس کے چہرے کی رنگت تبدیل ہونے لگی۔ اس کا چہرہ گہرا سرخ ہوگیا تھا اور گردن کی رگیں پھول گئی تھیں۔ صوفی نے ایسی رگوں پر دباؤ ڈالا تھا جو دماغ کا بدن سے رابطہ منقطع کر دیتی ہیں۔ اس طاقت ور نوجوان کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں ہوگی کہ کسی ایسی بلا سے واسطہ پڑسکتا ہے۔

چنانچہ وہ اپنی ساری خوش اخلاقی بھول گیا اور صوفی کے جسم کے مختلف حصوں پر گھونسے مارنے لگا لیکن یہاں بھی اسے عجیب وغریب تجربہ ہوا تھا۔ خود اس کے ہاتھوں کی ہڈیوں میں چوٹیں لگنے لگی تھیں اور رفتہ رفتہ اس کے ہوش وحواس جواب دینے لگے۔ صوفی نے جب محسوس کیا کہ اس کے بدن میں جان نہیں ہے تو بڑی محبت سے اسے اٹھا کر اپنی کار تک لایا اور دروازہ کھول کر اسے پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ بہر حال اس کے بعد اس نے ایک نگاہ اس نوجوان پر ڈالی اور پھر اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ دوسرے لمحے اس کی کار تیزی سے گرین ہاؤس کی جانب جارہی تھی۔ گرین ہاؤس میں ظاہر ہے اور بھی بہت سے افراد تھے۔ غلام قادر اور دلاور نے صوفی کے اس شکار کو اٹھا کر صوفی کے اس مخصوص کمرے تک پہنچایا جسے صوفی نے خصوصی تیاریوں کے بعد ایک عجیب وغریب چیز بنا دیا تھا۔

کرنل رحیم شاہ نے بھی اس کی بڑی تعریف کی تھی کیونکہ اس کا میکنزم صوفی کا ہی نصب کردہ تھا۔

کرنل رحیم شاہ نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔

''صوفی صاحب! پتا یہ چلا کہ آپ انجینئر بھی ہیں؟''

''بس میں کیا اور میری اوقات کیا۔ سب درویشوں کا کرم ہے۔ درویشوں کا دامن پکڑ لیا جائے تو یوں سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہر مشکل آسان کر دیتا ہے۔ اس کے بعد باقی لوگ تو اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے اور صوفی اس نوجوان کی نگرانی کرنے لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ہوش میں آیا تھا۔ صوفی نے اطمینان سے ایک کرسی سے پشت لگائی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں بند تھیں اور جگالی جاری تھی۔ نوجوان متحیرانہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ خاموش اور پرسکون کمرے میں ان دونوں کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا اور سامنے بیٹھا شخص اس قدر بے پروا نظر آرہا تھا کہ اسے حیرت ہورہی تھی اس کا ہاتھ بغلی ہولسٹر کی طرف بڑھا۔ یہاں پستول لگا ہوا تھا یہ بات بھی تعجب خیز تھی۔

اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر بے ہوش رہا ہے۔ اس بے ہوشی کے درمیان اس کی تلاشی بھی جاسکتی تھی اور کوئی بھی ذی ہوش آدمی اس کے پاس پستول نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ پتا نہیں اس شخص نے اس کی تلاشی کیوں نہیں لی۔ لیکن یہ ہے کون اور اسے اس طرح یہاں لانے کا مقصد کیا ہے؟ پھر اس کا ذہن اپنی بے ہوشی کے اسباب کی طرف چلا گیا اور اس کا چہرہ حیرت سے سکڑ گیا۔ وہ شخص انسان تھا یا جونک مگر جونک لجلجی اور بڑی عجیب وغریب کیفیت کی حامل ہوتی ہے۔

یہ شخص..... اسے وہ لمحات یاد آ گئے جب وہ اس کی گرفت میں تھا اور اسے بالکل یہی لگ رہا تھا جیسے لوہے کے آنکڑے اس کے گرد پھنس گئے ہوں۔ وہ معنی خیز نگاہوں سے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کو دیکھتا رہا۔ عجیب وغریب شخص تھا۔ بہر حال نوجوان نے ایک لمحے کے اندر فیصلہ کیا اور پستول نکالنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس سے دوسرے انداز میں بات کرنی ہے پھر اس کی آواز ابھری۔

''ہیلو.....!'' سامنے بیٹھا ہوا شخص چونک کر سیدھا ہوگیا اور پھر اس کے منہ سے آواز نکلی۔

''درویش رحم کریں۔'' نوجوان گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سامنے والے کے چہرے سے کوئی صحیح اندازہ نہیں ہو پاتا تھا کہ وہ ہے کیا مصیبت؟''

''مم..... مم معافی چاہتا ہوں کہ آپ کو یہاں آنے کی زحمت گوارا کرنی پڑی۔'' نوجوان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

''ہمارا تعارف نہیں ہوسکا۔''

''تو کرا دیجئے۔'' سامنے والا شخص بولا۔

''احقر کو سہیل احمد بارود والا کہتے ہیں۔''

''ب..... بب..... بارود!'' سامنے والے کے حلق سے آواز نکلی۔

''جی ہاں۔ یہ میرے والد کا سر نیم ہے۔''

''اچھا۔ اچھا۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ ہمیں آپ صوفی کے نام سے یاد کر سکتے ہیں۔''

''صرف صوفی.....!''

''صوفی صرف نہیں ہوتا۔ بہت کچھ ہوتا ہے۔''

''اس کا تو مجھے اندازہ ہوگیا ہے۔ بہر حال آپ ایک آئیڈیل شخصیت کے مالک ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت کم لوگ ایسے اس دنیا میں موجود ہیں جو مجھے بے بس کر سکتے ہیں بلکہ میں تو یہی کہوں گا کہ موجود نہیں ہیں۔ اگر موجود ہوتے تو آپ سے پہلے مجھے ضرور ملتے۔''

''موجود اور نا موجود پر میں کوئی مدلل بحث نہیں کرسکتا درویشوں کے کرم سے۔''

''یہ درویش آپ کی گفتگو میں کہاں سے آجاتے ہیں۔''

''درویشوں کا کرم ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو میرے دوست۔ یہ درویش اللہ تعالیٰ کے احکام کے تحت دنیا کے بہت سے کام سنبھالے ہوئے ہیں اور یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ یہ نیکیوں کے نمائندے ہوتے ہیں جو اپنا کام ازل سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔''

''مگر ایک بات بتائیے جناب کہ کیا آپ نے مجھے درویشوں کی مدد سے ہی بے ہوش کیا تھا۔''

''ہم نے کہاں بے ہوش کیا تھا۔ بیچ سڑک پر کھڑے ہو کر آپ ہم سے گلے ملے اور رونے لگے۔ بے شمار گاڑیاں رک گئی تھیں۔ لوگ پوچھنے لگے تھے کہ تم لوگ کیوں رو رہے ہو اور پھر تم روتے روتے بے ہوش ہو گئے تھے۔''

''ظاہر ہے کہ ایک کہانی کے سوا کچھ نہیں ہے؟ لیکن کیا یہ ٹھیک نہیں ہوا کہ اب ہم کہانیوں کی دنیا

سے نکل آئیں۔''

''نکل آئے درویشوں کی دعا سے۔''

''ویسے میں آپ کو بتاؤں کہ میں آپ سے بہت متاثر ہوا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، اگر متاثر ہوئے ہیں تو ہمیں اس بات کی بہت خوشی ہوئی۔''

''اور یہ بھی آپ کو بتا دوں کہ میں دھوکے سے آپ کا شکار ہوا، اگر ذرا بھی یہ اندازہ ہوتا کہ آپ فوراً ہی ایسا کوئی عمل کر ڈالیں گے تو شاید میں آپ کے قابو میں نہ آتا۔ آپ مجھے بے ہوش کر کے یہاں لائے ہیں۔ یقین فرمائیے کہ اب تک کوئی ایسی جگہ نہیں بنی جہاں مجھے میری مرضی کے خلاف ایک لمحہ بھی رکھا جائے۔''

''ہم سمجھے نہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''آسانی سے سمجھ لیجئے کہ آپ یہاں مجھے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں روک سکتے، اگر میں نہ چاہوں تو۔'' صوفی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

''نہیں میرے دوست اس کمرے سے نکلنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہاں صرف میں ہی کسی کو لا سکتا ہوں اور میں ہی اسے جانے کی اجازت دے سکتا ہوں۔'' سہیل عالم مسکرا دیا پھر بولا۔

''نہیں جناب! تقدیر نے مجھے یہی تو ایک خوبی بخشی ہے کہ میں قید رہنے کے لیے نہیں ہوں۔''

''اگر یہ بات ہے تو ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو۔ دیکھو یہ دروازہ میں تمہارے سامنے کھول رہا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ باہر سے بند نہیں کروں گا۔ میں اس دروازے کی سیدھ میں ایک کمرے میں بیٹھا ہوا ہوں۔ تم اگر یہاں سے نکل سکو اور مجھ سے دوستی کرنا چاہو تو سیدھے میرے کمرے میں آ جانا اور اگر نہیں نکل سکتے تو تمہیں میرے احکامات پر عمل کرنا ہوگا۔'' نوجوان مسکراتی ہوئی نگاہوں سے صوفی کو دیکھنے لگا پھر بولا۔

''وعدے کی پابندی کرنا بھی پسند کرتے ہیں آپ!''

''ہاں۔'' صوفی نے کہا اور اس کمرے سے باہر نکل آیا۔ بہر حال جمشید مرزا کی بتائی ہوئی باتیں بھی اس کے علم میں تھیں۔ جمشید مرزا نے کہا تھا کہ وہ اسے ہتھکڑی ڈال کر لایا تھا لیکن ہتھکڑیاں اس نے بڑے اطمینان سے ایک لمحے کے اندر نکال کر اپنی گود میں رکھ دی تھیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

بہر حال چند ہی لمحے گزرے تھے۔ نوجوان مسکراتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ صوفی کے جبڑے ایک دوسرے پر بھینچ گئے تھے اس نے نوجوان کو دیکھا اور بولا۔

''گڈ...... ویری گڈ۔ بیٹھو۔''

''نہیں۔ شرط جیت چکا ہوں اس لیے اب تمہیں میرے احکامات پر عمل کرنا ہوگا۔'' نوجوان نے کہا اور اچانک ہی اس کا لہجہ تبدیل ہو گیا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال لیا اور صوفی نے اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ لیا جو اس سے پہلے اس کی بغلی ہولسٹر میں موجود تھا۔

''یہ کیا؟ وہ جو کہتے ہیں نا کہ اپنی خو نہیں بدلنی چاہیے۔ کاش اس وقت ہمارے محبوب دوست معشوق نشیلے یہاں ہوتے تو فارسہ میں تمہیں وہ شعر سناتے، جو حسب حال ہوتا درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''یہ پستول ہے حضور والا اور اس سے گولیاں نکلتی ہیں اور وہ گولیاں بدن میں روشن دان کھول دیتی ہیں۔''

''ان روشن دانوں سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آتی ہوگی۔'' صوفی نے مسکرا کر کہا۔

''نہیں۔ ان سے گاڑھا خون باہر آتا ہے۔'' نوجوان سفاک لہجے میں بولا اور اس نے صوفی پر پستول تان لیا۔

''نہیں۔ ایسا مت کرو بلدوو والا۔ تم اپنے فن سے مجھے متاثر کر چکے ہو۔''

''ایک اور فریب ایک اور دھوکا۔ بوڑھے گدھ! چلو سامنے والی دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔''

''دیکھو میری بات مان لو۔ اب ہم خوشگوار ماحول میں بات کریں گے۔''

''ہاں بے شک یہ میرا وعدہ ہے۔ میں تم پر گولی نہیں چلاؤں گا البتہ جو کچھ میں تم سے پوچھوں گا وہ تمہیں بتانا ہوگا۔''

''واہ، واہ...... حق اللہ، حق اللہ! اب تم الٹے مجھ سے سوالات کرو گے، وہ بھی میرے گھر میں۔''

''وقت وقت کی بات ہے، اگر تم اس آدھے گھنٹے میں جب میں بے ہوش تھا مجھے اپنے قابو میں کر لیتے تو شاید اس وقت سوالات تم کر رہے ہوتے۔ لیکن بدقسمتی ہے کہ تم اب میرے قابو میں ہو اور مجھے یوں لگتا ہے کہ تم یقیناً پولیس کے آدمی ہو۔ کیا نام ہے تمہارا۔''

''ارے...... واہ! تمہیں میرے نام پر شک کیوں ہو رہا ہے۔ صوفی نے کہا۔

''اس لیے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

''کیوں کیا میں تمہیں صورت سے صوفی نظر نہیں آتا۔''

''صورت سے تو تم مجھے کوئی نامعقول بکرے نظر آتے ہو۔ بہر صورت میں تم سے تمہاری صورت کی بجائے تمہارے اپنے بارے میں گفتگو کرنا پسند کروں گا۔ میرا تعاقب کیوں کیا تم نے اور میری وجہ سے اپنی کار کیوں تباہ کر دی اور پھر مجھے یہاں تک کیوں لائے۔ ان سوالات کے جواب دو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تمہیں ان سوالات کے جوابات دے رہا ہوں تم نے ایک لڑکی کو اغوا کیا اور وہ احمد عالم بارود والا کی بیٹی ہے۔''

''ندا احمد۔ ویسے بارود والا سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اس شہر کا بہت بڑا بدمعاش ہوں۔''

''بدمعاش......!'' نوجوان نے کہا اور بے اختیار قہقہہ لگایا پھر بولا۔

''یہاں اس ملک میں بدمعاش اس طرح کے ہوتے ہیں؟''

''جس طرح کے بھی ہوتے ہوں میں اسی طرح کا ہوں، درویشوں کے کرم سے۔''

''خیر کچھ اور بھی پوچھنا چاہتا ہوں، میں تم سے۔''

''بس جتنا بتا دیا ہے اتنا کافی سمجھو۔ یعنی تھوڑے بتائے کو بہت جانو۔''

''دیکھو دوست میں تمہارے اس ملک میں اجنبی ہوں۔ تم جو کوئی بھی ہو صورت حال ایسی ہو گئی ہے کہ میں اپنے دشمنوں میں گھر گیا ہوں۔ یہاں تک کہ پولیس اور دوسرے افراد بھی میرے خلاف دشمنی پر کمربستہ ہیں۔ لیکن کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تم جیسے شان دار آدمی کو بھی

معاف نہیں کر سکتا۔ حالات ہی ایسے ہیں، میں کیا کروں اس لیے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس پر خاموشی سے عمل کرو اور مجھے اس کے لیے مجبور نہ کرو کہ میں تم کو ہلاک کر دوں۔''

''ارے واہ......'' صوفی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا پھر بولا۔

''ڈائیلاگ خوب بولتے ہو۔''

''میں تمہیں آخری وارننگ دے رہا ہوں۔ خاموش ہو جاؤ۔''

''آؤ۔ دوسرے کمرے میں چلتے ہیں۔ دوستانہ ماحول میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ مذاق بہت ہو چکا۔'' صوفی نے کہا اور اپنی جگہ سے جنبش کی لیکن نوجوان کے فرشتے بھی نہیں سمجھ سکتے تھے کہ یہ کون سا عمل تھا۔ اس کا پاؤں آگے بڑھ کر اس کی ران پر پڑا اور نوجوان نے فوراً ہی پستول کا ٹریگر دبا دیا۔ گولی نہیں نکلی اور پستول سے ٹچ کی آواز نکل کر رہ گئی تھی۔ نوجوان نے کئی فائر کیے لیکن گولی نہیں نکلی۔ تب اس نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔

''غلطی ہو گئی دوست! غلطی ہو گئی۔ مجھے اس کے وزن کا اندازہ کر لینا چاہیے تھا۔ میں حیران ہوں کہ تم نے پستول میرے ہولسٹر میں کیوں رہنے دیا۔ اب پتا چلا کہ اصل معاملہ یہ تھا۔''

''چل گیا ناپتا درویشوں کی دعاؤں سے۔ اس کے بعد اب مجھے زیادہ مجبور نہ کرو کہ میں بھی سفاک ہو جاؤں۔ آؤ میں تمہیں چائے پلاتا ہوں۔'' صوفی اس طرح کمرے سے باہر نکلا کہ نوجوان کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔''

''آیئے۔'' اور پھر اس کے بعد وہ دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔ صوفی نے شازیہ کو بلا کر چائے کے لیے کہہ دیا تھا۔ اب نوجوان کے انداز میں ڈھیلا ڈھالا پن نظر آ رہا تھا۔ اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ یقین کریں گے کہ اس ملک میں پہلی بار مجھے کسی شخص نے متاثر کیا ہے۔''

''اماں چھوڑو اب تو سارے جھگڑے ختم ہو گئے۔ آزادی سے بیٹھے ہو میرے ساتھ بات کرتے ہو۔ جب دل چاہے یہاں سے اٹھ کر چلے جاؤ۔ مجھے اعتراض نہیں ہے بس چند باتیں کرنی ہیں تم سے۔''

''میں آپ سے بہت متاثر ہوں صوفی صاحب آپ نے واقعی کمال کیا۔ میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ کوئی اس طرح میرے بدن کی رگوں پر دباؤ ڈال کر مجھے بے ہوش کر دے گا۔ میں یہ کبھی نہیں بھول سکوں گا۔''

''بخدا ہم تو بڑے معمولی سے آدمی ہیں۔ اچھا اب یہ بتاؤ احمد عالم بارود والا کی بیٹی کہاں ہے؟''

''وہ میرے پاس ہے اور بے حد پر سکون ہے۔''

''تم نے اسے اغوا کیوں کیا ہے؟''

''صوفی صاحب! ایک عرض کروں آپ سے! آپ مجھے ان خطرناک جلادوں کے سپرد کر دیں جو انسان کے جسم سے کھال کھینچ کر اس میں نمک لگا دیتے ہیں۔ میں جو خود کو اذیت رسانی کا سب سے بڑا سمجھتا ہوں چیلنج کرتا ہوں کہ میری زبان سے کوئی ایک لفظ بھی نہیں سن سکے گا اگر پسند کریں تو مجھ پر ہر

آزما دیکھیں لیکن دوسری ایک شرط یہ ہے کہ میں آپ کی بڑائی تسلیم کر چکا ہوں۔ مجھے ایسے شاندار لوگوں سے مل کر نہایت مسرت ہوتی ہے اور میں ان کا بے حد قدردان ہوتا ہوں جو کسی ایسے فن کا مظاہرہ کر ڈالتے ہیں جو میرے دل میں اتر جائے۔ میں آپ کو بتاؤں صوفی صاحب میرے دوست نہ ہونے کے برابر ہیں۔ صرف چند ہی افراد ہیں جن کی میں نے دل سے قدر کی ہے اور انہیں اپنا دوست بنانے کے لیے شدید محنت بھی کی ہے۔ جب میں کسی شخصیت سے متاثر ہو جاتا ہوں تو اپنے آپ کو ان کے قدموں میں ڈال دیتا ہوں اور اپنے مکمل خلوص کا یقین دلا دیتا ہوں پھر میری کوئی بات اپنی انا کی بات نہیں رہتی۔ میری تمام تر شخصیت اس پسندیدہ شخص کے لیے وقف ہو جاتی ہے۔ ابھی تک میرے ایسے دوست صرف تین ہیں۔ صرف تین۔ ایک نارزن جس سے آپ ملے تو آپ دنگ رہ جائیں گے۔ چھوٹے سے قد کا ایک بونا ہے لیکن وہ کیا ہے میرا خیال ہے کہ آپ اس کے قد کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔

اس کے علاوہ ایک اور شخص ہے جس کا نام سبحان فرزانی ہے۔ یہ شخص قدیم زبانوں کا بہت بڑا ماہر ہے۔ آثار قدیمہ کے سلسلے میں اس کی تفتیش آسمانی حیثیت رکھتی ہے اور وہ اس سلسلے میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا۔ ایک اور شخص ڈاکٹر نائیڈو جو ایک جرمن ڈاکٹر ہے اور ایک خطرناک مہم جو، خاموشی سے اپنی زندگی مختلف مہمات میں گزارتا رہا ہے لیکن اس کی اپنی مہمات کی کہانیاں دنیا کے سامنے نہیں آ سکیں۔ بہر حال یہ تین افراد جو آج تک میرے لیے محترم اور دوست تھے۔ آج چوتھی شخصیت ان میں شامل ہو گئی ہے۔ جس نے مجھے بھرپور طریقے سے متاثر کیا ہے۔ آپ واقعی ماہرین فن ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟ ممکن ہے آپ کا تعلق پولیس سے ہو۔ مجھے اس سے غرض نہیں ہے۔ میں نے اپنی تمام زندگی میں کبھی انسان کی دولت یا مرتبے کی قدر نہیں کی۔ ہاں اگر اس کی ذات میں کوئی صفت ہے تو میں اسے نظر انداز نہیں کر سکا۔ صوفی صاحب! میری خواہش ہے کہ میرے چوتھے دوست آپ ہوں اور میں اپنے دوستوں کے حصول کے لیے اپنے عظیم تر مفاد کو کبھی مد نظر نہیں رکھتا۔ صرف آپ کی شخصیت سے متاثر ہو کر میں آپ کو اپنی دلی کیفیت سے آگاہ کر سکتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ آپ میرے کسی لفظ کو غلط نہ سمجھیں۔ وہ جذبہ جو میرے سینے میں پوشیدہ ہے اور وہ قسم جو میری ماں نے مجھے دلائی ہے۔ میرے دل و دماغ میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ صرف یہ دو چیزیں ہیں جو میری اپنی ملکیت نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق میری ماں سے ہے۔ میں یہ دو چیزیں آپ کے سپرد نہیں کر سکوں گا۔ اس کے علاوہ میری ذات میں جو کچھ پوشیدہ ہے وہ آپ کے ایک اشارے پر کھل سکتا ہے۔''

نوجوان کی آواز میں ایک ہلکی سی بھراہٹ پیدا ہو گئی۔ اس کے چہرے پر ایک دبے دبے جوش کا اظہار پھیل گیا تھا۔ صوفی کے چہرے کے تاثرات بھی تبدیل ہو گئے اور وہ نوجوان کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

اس وقت اس کی کیفیت میں وہی بات ابھر آئی تھی جو کبھی کبھی ابھرتی تھی اور اس کے مد مقابل حیران رہ جاتے تھے۔ کچھ دیر مکمل خاموشی طاری رہی۔ اس کے بعد صوفی نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں تمہاری دوستی کی قدر کرتا ہوں اور اب میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری ہر بات پر یقین کروں گا اور تم بھی مجھ پر اعتبار ہی رکھنا۔ مجھے بتاؤ تم نے اس بچی کو اغوا کیوں کیا ہے اور جو کھیل تمہاری ذات سے وابستہ ہے وہ کیا ہے؟''

''احمد عالم بارود والا میرے باپ ہیں۔ تقریباً پچیس چھبیس سال قبل انہوں نے جرمنی میں میری ماں سے شادی کی تھی۔ میری ماں نسلاً جرمن تھی اور میرے باپ سے یعنی احمد عالم بارود والا سے محبت کرنے لگی تھی۔ اس نے اپنا مذہب تک تبدیل کرلیا اور مسلمان ہوگئی۔ ایک مسلمان عالم نے اسے مسلمان کیا اور اس کا نام مریم رکھا۔ احمد عالم بارود والا اس وقت کچھ بھی نہیں تھے۔ زمانہ طالب علمی سے گزرنے کے بعد کاروبار کے لیے سرمار رہے تھے اور جس کام کے لیے وہ جرمنی گئے تھے اس میں انہیں شدید ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ میرے نانا روڈلی فاسٹر بھاری مشینری کے ایک بہت بڑے کارخانے کے جنرل منیجر تھے۔ جب میری ماں احمد عالم صاحب سے متاثر ہوئی تو میرے نانا بھی ان کی مدد کرنے پر آمادہ ہوگئے اور احمد عالم بارود والا کے راستے کی تمام مشکلات آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئیں۔ انہوں نے میری ماں سے شادی کرلی اور میرے نانا نے انہیں تمام تر سہولتیں مہیا کردیں جو ان کے تصور میں بھی نہیں تھیں۔ انہوں نے باقاعدہ تجارت شروع کردی اور نہایت کامیابی سے کروڑوں روپے کی بھاری مشینری باہر بھجوائی۔ یہ تمام تر مشینری قرضوں خریدی گئی تھی اور یہ قرض تقریباً ایک یا دو ارب ڈالر تک پہنچ گیا تھا۔ میرے نانا یہ تمام کام اپنے ذمے داری بلکہ اپنے ہی نام سے کروا رہے تھے اور اس سلسلے میں احمد عالم بارود والا قطعاً ملوث نہ تھے۔ پھر نانا کی ریٹائرمنٹ کا وقت آ گیا اور انہوں نے احمد عالم صاحب سے ان تمام حسابات کو صاف کرنے کی درخواست کی جنہیں اب تک صاف نہیں کیا گیا تھا۔ احمد عالم صاحب کی پوزیشن اب ایسی نہیں تھی کہ وہ فرم کی ادائگی نہ کر سکتے لیکن ان کے دل میں بے ایمانی آ گئی تھی اور انہوں نے مکمل طور پر معلومات حاصل کرلیں کہ فرم کے معاملات یا کارخانوں کے لین دین میں ان کی اپنی ذات تو کہیں ملوث نہیں ہے۔ یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد انہوں نے میرے نانا کو قتل کردیا اور اس قتل کو خودکشی کا روپ دینے کے لیے ایک خوب صورت سا پلان تیار کیا۔ لیکن ان کی بدقسمتی کہ یہ قتل میری ماں نے اپنی آنکھوں سے ہوتے دیکھ لیا اور وہ شدت غم سے بے ہوش ہوگئی۔ احمد عالم بارود والا وہاں سے بھاگ نکلے۔ میری ماں ہوش میں آنے کے بعد نیم پاگل سی ہو گئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ احمد عالم کچھ عرصے بعد ضرور اس سے رابطہ قائم کریں گے اور اس سے اپنی اس حرکت کی معافی مانگیں گے لیکن احمد عالم صاحب اس طرح غائب ہوئے کہ ان کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔ میری ماں نے کسی کے سامنے زبان نہیں کھولی۔ باپ تو مر ہی چکا تھا، شوہر کو عذاب کا شکار بنا کر وہ اسے بھی نہیں کھونا چاہتی تھی۔ اس دوران، میں پیدا ہو چکا تھا۔ میری ماں میری پرورش کرتی رہی اور اس نے اس اہم راز کو سینے میں دبائے رکھا۔ نانا صاحب کی جائیداد سے کارخانے کی رقم وصول کرلی گئی اور ہماری حیثیت معمولی لوگوں جیسی رہ گئی۔ میں پرورش پاتا رہا لیکن کسی سرپرست کی غیر موجودگی اور ماں کا یہ نیم پاگل پن مجھے صحیح راستے کی طرف نہ لے جا سکا اور میرے دوستوں میں خطرناک لوگوں کے تعداد بڑھتی گئی۔ انہوں نے مجھے چھوٹے موٹے جرائم کرنا سکھا دیے اور یہ جرائم ہی میری زندگی بن گئے۔ دنیا کے مختلف شہروں میں میرا دورہ ہوتا رہتا تھا اور پھر میں نے اپنی مالی حالت خاصی مستحکم کرلی۔ مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی لیکن میری ماں اچانک ہی شدید بیمار ہوئی اور مرتے وقت اس نے مجھے زندگی کے اس اہم راز سے آگاہ کردیا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں صوفی صاحب کہ بچپن ہی سے مجھے اپنے باپ کی غیر موجودگی سے شرمندگی ہوتی تھی۔ باہر کی زندگی میں بن باپ

ہونا کوئی معیوب بات نہیں ہے، لیکن قدیم لوگ اب بھی ان لڑکوں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے جن کے باپ نہ معلوم ہوں۔ میری ماں ساری زندگی ایسی شدید ذہنی اذیتوں کا شکار رہتی تھی۔ حالات خراب ہونے کے بعد ہم نے اپنی حیثیت بھی بدل لی تھی اور اس بدلی ہوئی حیثیت سے ہمیں جاننے والے یہی سمجھتے تھے کہ میں اپنی ماں کی کسی لغزش کا شکار ہوں۔ صوفی صاحب! بچپن ہی سے میری ماں نے میرے باپ کے مذہب پر ہی مجھے ڈالا تھا۔ اس نے انتہائی کوشش کر کے کچھ ایسے عالموں کا تعاون حاصل کر کے دیا تھا جو مجھے میرے باپ کی زبان سکھائیں اور اسی کے مذہب کی تعلیم دیں۔ میں اس مذہب اور زبان سے بہت متاثر تھا اور میں نے شوق کی خاطر یہ زبان اچھی طرح سیکھ لی تھی۔ میری ماں نے بھی میرا نام سہیل عالم بارود والا رکھا تھا لیکن ان تمام چیزوں کو میں نے اس وقت تک کوئی اہمیت نہیں دی جب تک ماں نے اپنی زندگی کے اہم راز کا انکشاف نہیں کیا۔ اسی نے مجھے احمد عالم بارود والا کے بارے میں تمام تفصیل بتائی اور اس نے یہ بھی بتایا کہ احمد عالم بارود والا اب اپنے ملک میں ہیں اور ایک اچھی شخصیت کے مالک ہیں۔ ماں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ احمد عالم بارود والا کا پتا معلوم کرنے کے بعد اس نے ان سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن بارود والا نے اسے دھتکار دیا۔ اس نے کہا کہ اگر میری ماں اس کے ملک میں داخل ہوئی تو وہ اسے اور اس کے بیٹے کو قتل کروا دیں گے۔ میں ان تمام انکشافات پر پاگل ہوگیا تھا۔ صوفی صاحب! میں نے اپنی ماں کی زندگی میں یہ تہیہ کیا کہ میں اس ظالم انسان کو ایسی اذیتیں دے کر ماروں گا کہ یادگار رہے، لیکن صوفی صاحب اس مذہب کی تعلیمات احمد عالم سے زیادہ میرے دماغ پر اثر انداز تھیں۔ ماں نے مجھے قسم دی اور کہا کہ اس کے سائے میں زندگی گزارنے کی کوشش کرو۔ یہ قسمیں دینے کے بعد میں ماں سے احتجاج بھی نہ کرسکا تھا کہ وہ مرگئی اور اس کے بعد صوفی صاحب میں نے اپنے باپ کے ملک کا رخ کیا۔ میں آپ کو ٹارزن کے بارے میں مختصراً بتا دوں۔ ساڑھے تین یا پونے چار فٹ کا نوجوان زمانے کا ستایا ہوا انسان تھا۔ اس کے ساتھ بھی شدید ناانصافیاں ہوئی تھیں اور اس کی آدھی زندگی جیل میں گزری تھی لیکن پھر اس نے دنیا سے انتقام لینے کا فیصلہ کیا اور اپنے اندر وہ قوتیں پیدا کرنے لگا جو اسے دنیا سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار کرسکتی تھیں پھر اس کی ملاقات جیل میں مجھ سے ہوئی اور اس نے مجھے اپنے بیٹوں جیسی محبت دی اور اس بات کا اعتراف کیا کہ میری وجہ سے اس کی زندگی کا رخ بدلتے بدلتے رہ گیا۔ وہ بے پناہ صلاحیتوں کا مالک ہے۔ آپ اس کے بدن کی رگ رگ کو ناخنوں میں کس دیں۔ لیکن وہ قید ہونے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔ ان قوتوں کے حصول کے بعد اس نے جیل سے نکلنے کا فیصلہ کرلیا تھا کہ مجھ سے ملاقات ہوگئی اور اس نے اپنا ارادہ ترک کردیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ قانونی طور پر ہی جیل سے باہر نکلے گا اور پھر ہم دونوں ساتھ ہی ساتھ رہا ہوئے تھے۔ ٹارزن کی لاتعداد خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ زمین سونگھ سونگھ کر انسانوں کا کھوج لگا لیتا ہے۔ اس کی نگاہ سے کسی کا چھپنا ناممکن ہے میں اس کی آپ سے ملاقات کراؤں گا۔ آپ کو ایک حیرت انگیز آدمی لگے گا ہو۔''

صوفی متحیرانہ انداز میں یہ کہانی سن رہا تھا اور صحیح معنوں میں وہ اس شخص سے کافی متاثر ہو چکا تھا۔ ٹارزن کے بارے میں بھی اسے جو معلومات حاصل ہوئیں اسے سن کر اس کا جذبہ اشتیاق بڑھ گیا اور اس نے دل میں یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ اس بونے سے ضرور ملاقات کرے گا جو اس قدر صلاحیتوں کا مالک ہے۔ سہیل

عالم نے اپنی کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''پھر میں یہاں پہنچا تو طبیعت میں شرارت ابھری تھی، اس لیے اپنے ساتھ پسا ہوا سفید پتھر لے آیا اور اسے ہیروئن پاؤڈر بنا کر پیش کر دیا۔ اس طرح مجھے اپنے باپ تک رسائی حاصل ہو گئی لیکن میرے باپ نے انتہائی سنگ دلی سے مجھے ٹھکرا دیا۔ صوفی صاحب میری ماں پر ظلم کیا گیا۔ میرے نانا جو ہمیشہ میرے باپ پر مہربانیاں کرتے رہے تھے اور جنھوں نے تمام تر خلوص کے ساتھ اس کے مستقبل کی تعمیر میں اس کی مدد کی تھی اسی کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ میری ماں نے تمام عمر پاگلوں کے سے انداز میں گزار دی۔ میں نے فطرت کے تحت ہمیشہ اس کرب کو اپنے سینے میں محسوس کیا ہے کہ لوگ مجھے بن باپ کا بیٹا کہتے ہیں مگر میں ان کی زبانیں بند نہیں کر سکتا تھا اور جب مجھے اپنی ماں کی زبانی اس بات کا علم ہوا کہ میں بن باپ کا نہیں ہوں تو یقین کریں مجھے بے پناہ مسرت ہوئی تھی۔ اس کے باوجود کہ میرے باپ نے میری ماں کے ساتھ ظلم کیا تھا اور میں یہ سوچتا رہا تھا کہ اگر اب بھی میرا باپ مجھے سینے سے لگا لے تو میرے دل کی ایک بہت بڑی خلش مٹ جائے گی لیکن یہاں آ کر میں نے دیکھ لیا کہ احمد عالم بہت سنگ دل انسان ہے۔ میری آمد اس کے حواس پر بجلی بن کر گری ہو گی، لیکن اس آہنی اعصاب کے مالک شخص نے فوری طور پر یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ مجھے اپنا بیٹا تسلیم نہیں کرے گا بلکہ اگر ممکن ہو سکا تو کسی نہ کسی طرح مجھے ہلاک بھی کروا دے گا۔ صوفی صاحب اس کے بعد میرے لیے کوئی اور چارہ نہیں رہ گیا ہے کہ میں اسے مجرمانہ کارروائیوں کے ذریعے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دوں۔ میں اب اپنے سینے میں انتقام کا جذبہ رکھتا ہوں۔

ٹھیک ہے وہ میرا باپ ہے مگر اس باپ کی موجودگی میں بھی میں بن باپ کا کہلاتا رہا ہوں اور اب بھی وہ میری یہ شخصیت برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ آپ یقین کریں میں اسے ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ میں نے اس کی بیٹی کو اغوا کر لیا ہے، وہ میرے پاس محفوظ ہے اور ٹارزن اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ صوفی صاحب وہ میری بہن لگتی ہے، میں اتنا بدفطرت نہیں ہوں کہ اپنے ہاتھوں سے اپنی بہن کو نقصان پہنچاؤں، لیکن بارود والا کو میں اس کی اولاد سے ضرور محروم کر دوں گا۔ ابھی تو صرف لڑکی کی بات ہے، اس کے بعد لڑکوں پر بات آئے گی۔ اگر میں بھی اسے دنیا میں اسی طرح تنہا نہ کر دوں جس طرح میری ماں تنہا رہ گئی تھی تو میں اس کی اولاد ہونے کا دعویٰ نہیں کروں گا۔'' وہ سخت جذباتی ہو رہا تھا اور صوفی پرخیال انداز میں گردن ہلاتا رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔

''نہیں عزیزم! ایسا کرنا بے مقصد رہے گا درویشوں کی دعاؤں سے۔ اس کے بجائے کوئی حل تلاش کرو جس سے تمہاری خواہش پوری ہو جائے اور تمہیں مجرم بھی نہ بننا پڑے۔''

''یہ میرے باپ کا وطن ہے۔ اسے یہاں اختیارات حاصل ہیں اور مجھے نہیں۔ آپ خود غور کر لیں کہ میری ذہنی کیفیت کیا ہے۔ ساری زندگی کی محرومیوں کے بعد یہ خواہش پایہ تکمیل کو پہنچنے والی تھی لیکن اس شخص نے زندگی کی اس آخری خواہش کو بھی ملیامیٹ کر دیا۔ اب میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات نہیں۔ میں اسے صرف اذیتیں دینا چاہتا ہوں، اسی کے لیے کارروائی کر رہا ہوں۔ مجرمانہ زندگی تو گزارتا ہی رہا ہوں صوفی صاحب! زیادہ سے زیادہ کسی اہم جرم کے سلسلے میں موت کی سزا ہو جائے گی،

زندگی سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ ایک تنہا انسان کی زندگی اس قدر دل کش نہیں ہوتی۔'' صوفی نے گردن ہلائی اور پھر بولا۔

''نہیں دوست! تم اس ملک میں اجنبی ہو۔ کیا سمجھے، اب میں تمہارے ساتھ ہوں۔ لاؤ، ہاتھ لاؤ۔ دونوں مل کر حالات کا رخ موڑیں گے۔'' صوفی نے ہاتھ بڑھایا اور سہیل احمد نے آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے اس کی صورت دیکھی پھر اس کا لرزتا ہوا ہاتھ آگے بڑھا اور دونوں کے ہاتھ مضبوطی سے مل گئے۔

♥......♥......♥

کرنل رحیم شاہ اس بار کچھ زیادہ ہی یہاں رک گیا تھا۔ یہاں اس کے لیے بے شمار ٹھکانے موجود تھے۔ لیکن گرین ہاؤس وہ اکثر آتا رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ صوفی کی اسی نئی رہائش گاہ میں پہنچا تھا جہاں وہ بہت کم ہی آتا تھا۔ ان دنوں حسینہ اور نشیلے کا معاملہ کچھ ٹھنڈا سا پڑ گیا تھا۔ معشوق نشیلے پتا نہیں کس چکر میں تھے اور حسینہ بہ دستور خوش اخلاق بننے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ بہر حال کرنل رحیم شاہ کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد حسینہ صوفی کو اطلاع کرنے چلی گئی۔ صوفی بھی کرنل رحیم شاہ کے پاس پہنچ گیا۔

''جی صوفی صاحب! شاہ میر صاحب سہیل عالم کے بارے میں خاصے الجھے ہوئے ہیں۔ خاص طور پر نداحمد کی گمشدگی کے بعد۔''

''بڑا سنگین مسئلہ ہے کرنل صاحب درویشوں کے کرم سے۔ اصل میں احمد عالم بارود والا ایک انتہائی گھناؤنی شخصیت کا مالک شخص ہے۔ جھوٹی عزت برقرار رکھنے کے لیے اس نے اپنی اولاد کو ٹھکرا دیا ہے۔ اتنا حق تو سب کو ہوتا ہے کہ اپنے جائز حق کے لیے لڑیں۔ میرے خیال میں اس جیسے شخص کو اس طرح کی تکلیفیں پہنچنی ہی چاہئیں۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا۔ کیا یہ بات بالکل سچ ہے کہ وہ بارود والا ہی کی اولاد ہے۔''

''ہاں۔ بارود والا نے اپنی ابتدائی زندگی ویسٹ جرمنی میں گزاری ہے۔ کیا یہ بات آپ کے علم میں ہے؟''

''ہاں مجھے پتا چل گیا ہے۔''

''نوجوانی کی عمر میں اس سے ایسی لغزش ہوئی ہے اور یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔ ابتدائی زندگی تھی اور وہ زیادہ پکی طبیعت کا مالک بھی نہیں تھا اور وہ جو اس نے سرمایہ حاصل کیا اس کی بھی کوئی وجہ ہو گی کہ کہاں سے حاصل کیا۔ بے شک اس نے یہاں بھاری مشینری کے کارخانے لگائے اور اس سلسلے میں ایک عظیم نام حاصل کیا۔ لیکن کرنل صاحب اس کارخانے کو لگانے کے لیے اور بھاری مشینری کو حاصل کرنے کے لیے اس نے کیا کیا اس کے بارے میں کوئی تفصیل آپ کے یا شاہ میر صاحب کے پاس موجود ہے۔ اتنی بڑی دولت آخر اس نے کہاں سے کمائی آخر کوئی تو ذریعہ ہو گا۔''

''ہاں یقیناً کیوں نہیں۔''

''آپ شاہ میر صاحب کے ذریعے یا کسی بھی ذریعہ سے یہ سوال اس سے ضرور کریں کہ اتنی دولت اس نے کہاں سے کمائی اور اس کا ذریعہ کیا تھا؟''

''اس کے علاوہ......؟'' کرنل رحیم شاہ نے پوچھا۔

''وہ طویل عرصے کے بعد اپنے باپ کو تلاش کرتا ہوا یہاں پہنچا اور باپ کی شفقت سے محروم رہا اس نے دوسری کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔''

''کیا یہ بات بالکل طے ہو چکی ہے۔''

''کرنل صاحب! اگر میں یہ الفاظ کہہ رہا ہوں اور ٹھوس لہجے میں کہہ رہا ہوں تو میرا خیال ہے آپ کو کم از کم میری ذات پر اس قدر اعتماد ضرور ہوگا۔''

''نہیں بھئی ظاہر ہے کیوں نہیں، مکمل اعتماد ہے مگر اب......''

''اب صرف یہ کہ احمد عالم بارود والا کو زبان کھولنے پر مجبور کیا جائے۔ شاہ میر صاحب سے کہیں کہ وہ صحیح حقیقت بتائے اور حقیقت بتائے بغیر اس کی بیٹی کا ملنا ممکن نہیں ہے اور میں پیش گوئی کیے دیتا ہوں اس وقت کہ بیٹی تک ہی بات نہیں رہے گی بلکہ اس کے بعد اس کے بیٹوں پر بھی بات آئے گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے بیٹوں سے بھی محروم ہو جائے گا۔''

''کیا صوفی صاحب آپ اسے تلاش کر چکے ہیں؟''

''ہاں۔ میری اس سے ملاقات ہو چکی ہے اور ہم دونوں کے درمیان ایک معاہدہ بھی۔''

''کیا......؟'' رحیم شاہ چونک پڑا۔

''ہمارے درمیان معاہدہ ہو چکا ہے میں مکمل طور پر اس کی پشت پناہی کروں گا۔''

''ارے...... ارے...... صوفی صاحب اس کا مطلب ہے کہ...... اچھا کام کریں پہلے ندا احمد واپس کرا دیں اور اس کے بعد باقی کام میں کرنے کی کوشش کروں گا۔'' صوفی نے عجیب سی نگاہوں سے کرنل رحیم شاہ کو دیکھا اور پھر کہا۔

''سوچ لیجیے ندا واپس پہنچ جائے گی لیکن آپ کو بھی اپنے وعدے کا پاس کرنا ہوگا۔''

''بے فکر رہیں۔ میں کسی نہ کسی طرح یہ کام کر ہی لوں گا۔ ابھی جا کر شاہ میر صاحب سے بات کرتا ہوں۔''

''بہت بہتر۔'' صوفی نے جواب دیا۔

♥......♥......♥

اس کے بعد صوفی نے سہیل عالم سے رابطہ قائم کیا تھا۔

''تم مطلوبہ پتے پر پہنچ جاؤ۔ مجھے تم سے بے حد ضروری کام ہے درویشوں کے کرم سے۔''

''پتا بتایئے۔'' سہیل عالم نے کہا۔ صوفی نے اسے اپنی نئی رہائش گاہ کا پتا بتا دیا۔ سہیل عالم جب وہاں پہنچا تو حسینہ ہی نے دروازہ کھولا تھا۔

''مجھے صوفی صاحب سے ملنا ہے۔''

''نئے آئے ہو سوہنے، پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''آپ صوفی صاحب کی کون ہیں؟'' سہیل عالم نے سوال کیا۔

''اے اللہ نہ کرے۔ میرا تعلق اونٹوں کی نسل سے لگتا ہے تمہیں۔'' حسینہ نے حسب عادت کہا۔

''نہیں البتہ دریائی گھوڑے کی مادہ ضرور معلوم ہوتی ہیں آپ!''

''دریائی گھوڑا...... مادہ، بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی ہے میرے۔''

''صوفی صاحب ہیں۔''

''ہاں۔ ہاں بیٹھے ہیں اپنے کمرے میں۔ جاؤ جاؤ اندر جاؤ۔ ارے مگر سنو تو سہی۔ بتانا پڑے گا جا کر ہو کون؟'' سہیل عالم نے دلچسپی سے حسینہ بیگم کے حدود اربعہ کا جائزہ لیا تو حسینہ نے شرمائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ایک تو ان کم بخت سارے مردوں کی عادت ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔ لگتا ہے بدن میں ٹھس جائیں گے۔ آؤ بھئی۔'' سہیل عالم چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ صوفی سامنے نظر آ گیا۔ سہیل عالم کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ سہیل عالم سے کہا۔

''آ جاؤ، آ جاؤ۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' سہیل عالم آگے بڑھا۔ اس نے صوفی سے ہاتھ ملایا اور پیچھے سے حسینہ کی آواز آئی۔

''اس وقت کچھ کرنے کی نہیں ہوں بوتلیں لا کر رکھ دیتی ہوں ٹھنڈی۔ بس انہیں پر گزارہ کرنا۔ میرا آرام کرنے کا وقت ہے۔'' صوفی نے حسینہ کو دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

''بوتلیں ہی لے آؤ۔'' سہیل عالم نے صوفی کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''بھائی جان ہیں۔'' صوفی ایک دم اچھل پڑا پھر غصیلے لہجے میں بولا۔

''دوستی کا یہ حق ادا کر رہے ہیں، جناب سہیل عالم صاحب!''

''نن...... نن...... نہیں معافی چاہتا ہوں، پھر آخر یہ ہیں کون؟''

''اس گھر کی مالکہ...... ملازم ہیں، ہم ان کے......''

''نہیں مانتا۔''

''عزیزم یہاں کام کرتی ہیں۔ گھر کی صفائی کھانا وغیرہ پکا دیتی ہیں مگر رویہ یہی ہوتا ہے ان کا۔''

''ویسے صوفی صاحب ایک بات بتاؤں۔ بہت کچھ سوچتا رہا ہوں آپ کے بارے میں۔ آپ یقین کریں ٹارزن سے میری بات چیت ہوئی تو ٹارزن نے بھی یہی کہا کہ کوئی بہت ہی اونچی شخصیت ہو گی۔ اصل میں بات وہی آ جاتی ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو عظیم بنانے کی کوشش کرتا ہے لیکن جو درحقیقت عظیم ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو چھپائے رکھتے ہیں۔''

''بیٹھو۔'' صوفی نے کہا اور وہ بیٹھ گیا۔

''ندا احمد کو ٹھیک شام چار بجے اس کی کوٹھی پر پہنچنا ہے۔ میں نے وعدہ کر لیا ہے۔'' سہیل عالم نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور بولا۔

''دو بجے ہیں، ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ بتایئے کیا پہلے پہنچانا ہے؟'' صوفی نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولا۔

''کوئی اعتراض تو نہیں ہے تمہیں۔''

"براہ کرم آئندہ یہ سوال نہ کریں صوفی صاحب! میرے پاس مزید کچھ کہنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔" صوفی خاموش ہوگیا۔ سہیل عالم کے ان الفاظ نے اس کے کاندھوں پر ایک بھاری بوجھ ڈال دیا تھا۔ اسے احساس ہوا تھا کہ اسے اب خود ہی سب کچھ کرنا ہے۔"

"ندا کو حقیقت تو نہیں معلوم ہوئی۔" صوفی نے سوال کیا۔

"نہیں۔ اسے اغوا کرنے کے بعد میں نے اس سے ایک بار ہی ملاقات کی تھی مگر وہ گرجتی برستی رہی اور میں نے خاموشی اختیار کر لی۔"

"اچھے آدمی ہو۔"

"شکریہ صوفی صاحب! آپ میرے لیے انتہائی قیمتی انسان ہیں۔ خدارا ان معاملات کے بعد مجھے نظر انداز نہ کریں۔ اور ہاں اس شہر میں اگر مجھے کچھ وقت رہنا پڑ گیا تو لحہ لحہ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت پیش آئے گی۔"

"بے فکر رہو۔" صوفی نے جواب دیا۔

"سہیل عالم کہنے لگا۔" خدا کی قسم صوفی صاحب! بڑا خوب صورت ملک ہے۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔ برے لوگ کہاں نہیں ہوتے۔ میری زندگی، پوری زندگی ہی ہلکی پھلکی مجرمانہ کارروائیوں میں گزری ہے۔ قتل و غارت گری سے ہمیشہ گریز کیا ہے بلکہ یہ سمجھ لیجیے کہ اب تک کبھی کسی کو زخمی تک نہیں کیا۔ لیکن اب شاید ایسا کرنا پڑ جائے۔"

"نہیں۔ تم یہ الفاظ نہیں کہو گے۔"

"ایک شرط صوفی صاحب! مجھے آپ کی سرپرستی درکار ہے۔ امتحان لے لیجیے میرا، میں نہیں جانتا کہ آپ کیا ہیں اور جب تک خود نہیں بتائیں گے جانوں گا ہی نہیں۔"

"ٹھیک ہے یہ معاملہ ختم ہو جانے دو۔ میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا۔"

"کیا یہ ہماری مرضی کے مطابق ختم ہو جائے گی۔"

"یہ سوچنا اب تمہارا کام نہیں ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"آپ کا تکیہ کلام ہے یہ۔"

"ہاں۔ پیر پرست آدمی ہوں، بس میری اپنی فطرت کا معاملہ ہے۔" صوفی نے جواب دیا۔

بہر حال اسی دن شام کو چار بجے ندا، احمد عالم کی کوٹھی پر پہنچ گئی اور صوفی اس سلسلے میں گرین فورس کے ممبروں کو ہدایت جاری کرنے لگا۔ شازیہ ان کی ہیڈ تھی اور ذمے داری اسی کے سپرد کی گئی تھی۔ لیکن فیضان، عادل، دلاور اور غلام قادر وغیرہ اس کی پوری پوری معاونت کر رہے تھے۔ اسی شام صوفی صاحب کرنل رحیم شاہ کے ساتھ شاہ میر صاحب سے ملاقات کی۔ کرنل رحیم شاہ نے ہی اسے بتایا تھا کہ شاہ میر اس سے بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ صوفی ان کے پاس پہنچ گیا۔

"صوفی صاحب! آپ سے بہت کم ملاقاتیں ہوتی ہیں، لیکن آپ یقین کریں کہ میں آپ کے مداحوں میں سے ہوں۔ آپ نے اپنے آپ کو اس قابل ثابت کر دیا ہے کہ آپ کو کسی بھی محکمے میں کوئی شاندار

داری جگہ دی جا سکتی ہے۔ لیکن مجھے یہی پتا چلا ہے کہ آپ کو یہ باقاعدہ ملازمت پسند نہیں۔"

"اصل میں باقاعدہ ملازمتوں میں اس قدر بے قاعدگی ہے کہ ہمارے راستے جگہ جگہ روکے جائیں گے، اس لیے بے قاعدہ کا سہارا زیادہ ضروری ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔ اب آپ ہمیں کچھ اور اجازت دیجیے۔ میں کرنل رحیم شاہ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا آپ کی ملاقات احمد عالم بارود والا سے ہوئی۔"

"ہاں میں نے شاہ میر صاحب کی وساطت سے ان سے ملاقات کی تھی۔"

"کیا کہتے ہیں وہ؟"

"تسلیم نہیں کرتے ہیں وہ اور کہتے ہیں کہ وہ لڑکا جھوٹ بولتا ہے۔ یہ سب فراڈ ہے۔"

"اوہو۔ اس کا مطلب ہے کہ احمد عالم کے ساتھ واقعی زیادتی ہوئی ہے۔"

"ہاں بالکل۔"

"میں آپ سے درخواست کرتا ہوں صوفی صاحب! کہ آپ اس کمینے شخص کو گرفتار کر لیجیے۔ اس نے ہمارے ملک کے ایک معزز شخص کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کی بیٹی کو اس نے اغوا کیا تھا، باقی معاملات میں خود سنبھال لوں گا۔ کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں؟"

"کوشش کروں گا؟"

"بس پلیز صوفی صاحب! اسے گرفتار کر لیجیے۔ یہ میری ذمے داری ہے کہ میں جرمن سفارت خانے کے معاملات سنبھال لوں گا۔"

"بہتر ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں۔" صوفی نے یہ کہا پھر تقریباً ایک ہفتے تک صوفی نے خاموشی اختیار کیے رکھی تھی۔ کرنل رحیم شاہ نے اس سے اس بارے میں سوال کیا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔ چلاکشی کر رہا ہوں اور درویشوں کی راہنمائی کا منتظر ہوں پھر ٹھیک ایک ہفتے کے بعد جرمنی سے انٹرپول کے تین افراد یہاں پہنچے اور انہوں نے وزارت داخلہ سے اس شخص کی گرفتاری کی درخواست کی۔ شاہ میر صاحب کے پاس یہ درخواست پہنچی تو جس شخص کی گرفتاری کی خواہش ظاہر کی گئی تھی اس کا نام سن کر وہ دنگ رہ گئے۔

"وجہ.....؟" انہوں نے وفد کے ممبران کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مغربی جرمنی کی ایک فرم نے ستائیس سال قبل کے ایک جرم کی تصدیق کی ہے۔ جس شخص کی گرفتاری کے وارنٹ لے کر ہم یہاں آئے ہیں اس کا نام احمد عالم بارود والا ہے۔ اس نے ایک فرم کے جنرل منیجر کی معرفت اس فرم سے بھاری مشینری خریدی اور اسے یہاں منتقل کر دیا۔ فرم کے واجبات پورے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ذمہ دار شخص کو ہلاک کر دیا گیا اور اس وقت اس خاندان کے ایک نوجوان نے جو مقتول کا نواسہ ہے اس قتل کا انکشاف کیا اور ثبوت پیش کیے تو فرم نے حکومت سے قاتل کو قتل اور جعل سازی کے جرم میں گرفتار کرنے کی درخواست کی ہے۔ یہ تمام کاغذات تفصیلاً حاضر ہیں؟"

"شاہ میر صاحب کی آنکھوں میں تاریکی سی پھیلنے لگی تھی۔ انہوں نے فائل کھول کر دیکھی۔ تمام حوالوں کی نقلیں موجود تھیں۔ سب کی سب ناقابل تردید۔ ایک ایک چیز ٹھوس تھی جس میں پولیس رپورٹ بھی

شامل تھی۔ یہ تمام کاغذات ڈپلی کیٹ تھے۔ انہوں نے سوال کیا۔

"ان کاغذات کی اصل کہاں ہے؟"

"فرم کے مالک، موجودہ مالک مسٹر اینڈریو اوون کے پاس۔"

"مجھے بتایئے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"ہم آپ سے تعاون کی درخواست کرتے ہیں۔"

"میں آپ لوگوں سے فوراً رابطہ قائم کروں گا۔ آپ کو مطمئن کرنا میری ذمہ داری ہے۔ یہ فائل رکھ سکتا ہوں میں۔"

"ہاں۔ یہ ڈپلی کیٹ آپ ہی کے لیے لائی گئی تھی اور اس کے بعد شاہ میر صاحب نے کپکپاتے لہجے میں فون پر کرنل رحیم شاہ کو ساری تفصیل بتائی اور انہیں طلب کر لیا۔ کرنل رحیم شاہ نے صوفی کو ساتھ لے لیا تھا اور شاہ میر صاحب کے پاس پہنچ گئے تھے۔ صوفی کو دیکھ کر شاہ میر صاحب کے انداز میں ہچکچاہٹ پیدا ہوئی تو کرنل رحیم شاہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"آپ جانتے ہیں شاہ میر صاحب کہ میں نے اپنے ناکارہ وجود کو کارآمد بنانے کے لیے اپنا آپریشن کر کے ایک انسانی جسم اپنے آپ سے جوڑ لیا ہے۔ اس انسانی جسم کے بارے میں آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کون ہے۔ وہ صوفی صاحب ہیں۔ چنانچہ کوئی بھی معاملہ ہو۔ میں صرف یہ سمجھتا ہوں کہ صوفی صاحب کے بغیر میری کسی معاملے میں شمولیت بے مقصد ہے۔" شاہ میر صاحب فوراً سنبھل گئے پھر انہوں نے کہا۔

"میں جانتا ہوں اور اس اعتماد کی وجہ بھی جانتا ہوں۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ بہر حال یہ تمام تفصیلات حاضر ہیں۔ میں ان پر آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ احمد عالم بارود والا نے ایک فرم کے جنرل منیجر کی معرفت اس فرم سے بھاری مشینری خریدی تھی اور اسے یہاں منتقل کر دیا تھا۔ فرم کے واجبات پورے نہیں ہوئے کہ جنرل منیجر کو ہلاک کر دیا گیا اور اب جنرل منیجر کے خاندان کے ایک فرد نے جو ان کا نواسہ ہے، اس قتل کا انکشاف کیا ہے اور ثبوت پیش کیے تو فرم نے حکومت سے رابطہ قائم کر کے احمد عالم کے خلاف تفصیلات مہیا کر دیں اور حکومت سے مسٹر احمد عالم بارود کو قتل اور جعل سازی کے جرم میں طلب کر لیا۔ یہ تمام کاغذات کی تفصیلات حاضر ہیں اور ہماری حکومت سے درخواست کی گئی ہے کہ مجرم کو اس کے حوالے کیا جائے۔" ساری تفصیلات کے بعد شاہ میر صاحب نے کہا۔

"اب آپ یہ بتایئے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" "صوفی صاحب کیا کہتے ہیں آپ!"

"صرف ایک بات؟" صوفی نے سرد لہجے میں کہا اور کرنل رحیم شاہ چونک کر صوفی کو دیکھنے لگے۔ صوفی کی یہ آواز کبھی کبھی ہی سننے کو ملا کرتی تھی اور اس آواز میں جو کچھ ہوتا تھا اس سے یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ بہ ظاہر مرنجان مرنج نظر آنے والا یہ شخص جب اپنی اصل میں ہوتا ہے تو اس کا لہجہ بدلا ہوا ہوتا ہے۔ بہر حال یہ سب شاہ میر صاحب کے علم میں تھا۔ انہوں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اسے گرفتار کر لو۔"

♥......♥......♥

رات کے تقریباً آٹھ بجے تھے جب ندا احمد کا فون موصول ہوا اور انہوں نے بھاری لہجے میں کہا۔ "کیا بات ہے ندا بیٹے!"

"انکل ہم لوگ سخت پریشانی میں پھنس گئے ہیں۔ براہ کرم آپ فوراً آ جائیں۔"

"کیا پریشانی ہے؟"

"کچھ لوگ ڈیڈی کو گرفتار کرنے آئے ہیں؟"

"کیا ان کا جرم ثابت ہو گیا ہے ندا!"

"مم...... مم مجھے تو کچھ پتا نہیں انکل! کیا ہو رہا ہے؟ براہ کرم آپ جلد آ جائیں۔" ندا نے معصومیت سے کہا۔

"دیکھو ندا! تمہارے ڈیڈی نے جرم کیا ہے تو میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

"انکل پلیز...... میرے لیے آپ آ جائیں۔ میں آپ سے کوئی ایسی درخواست نہیں کروں گی۔ آپ صرف ہمیں ڈھارس دینے کے لیے آ جائیں۔ خدا کے لیے۔" ندا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی اور شاہ میر صاحب پریشانی سے گردن ہلا رہے تھے پھر انہوں نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں، پھر جب وہ احمد عالم کی کوٹھی پر پہنچے تو وہاں انہوں نے صوفی کو بھی دیکھا۔ کوٹھی میں ہل چل مچی ہوئی تھی۔ احمد عالم کے بیٹے منہ لٹکائے ہوئے بیٹھے تھے۔ ندا نے رو رو کر آنکھیں سرخ کر لیں تھیں۔ وہ شاہ میر صاحب سے لپٹ گئی۔

"انکل، ڈیڈی...... ڈیڈی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"کیا تم لوگوں کو حقیقت معلوم ہو گئی۔" شاہ میر صاحب نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"ہاں انکل! ہمیں گمان بھی نہیں تھا کہ ہمارے ڈیڈی قاتل ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے بہت بڑا جرم کیا ہے۔ ایک قتل نہیں کیا انہوں نے کئی قتل کیے ہیں۔ افسوس جس نے ان کی زندگی کی تعمیر کی وہ ان کے ہاتھوں مارا گیا۔ مریم ان کے ظلم کا شکار ہوئی اور ان کا بیٹا۔ آپ یقین کریں انکل! یہ جرم ہم سب کو اپنا جرم محسوس ہو رہا ہے۔" احمد عالم کے بڑے بیٹے مسعود عالم نے کہا اور اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

"صوفی میرے ساتھ آؤ۔" شاہ میر صاحب نے کہا اور اس کمرے میں داخل ہو گئے جہاں وہ سب افسران موجود تھے۔ یہاں انہوں نے ان تمام لوگوں کو دیکھا جن میں سے کچھ غیر ملکی تھے اور باہر سے آئے تھے۔

"احمد عالم صاحب نے اعتراف جرم کر لیا ہے۔"

"اگر یہ اعتراف تم کچھ عرصے پہلے کر لیتے احمد تو شاید تمہارے لیے کچھ کیا جاتا۔"

"ہاں۔ شاہ میر صاحب! میں مجرم ثابت ہو چکا ہوں۔ اس لیے اب بے حیا بھی ہو گیا ہوں۔ اس وقت ایک بدکردار شخص آپ سے مخاطب ہے۔ خدا کی قسم اب مجھے کسی رعایت کی ضرورت نہیں ہے۔ جرم انسان کے سینے میں پوشیدہ ہوتا ہے تو وہ اپنے بچاؤ کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے میں اپنے جرم کو چھپا نہیں سکا۔ اس جرم میں کوئی مجبوری نہیں تھی۔ بس میں کچھ بننا چاہتا تھا۔ ہر مجرم کسی نہ کسی مقصد کے تحت جرم کرتا ہے۔ مریم کے والد بہت نیک انسان تھے اور میں نے انہیں ان کی نیکی کا صلہ یہ دیا کہ انہیں قتل کر دیا۔ مریم ایک نیک فطرت عورت

تھی۔ مجھے بہت چاہتی تھی لیکن اس کی چاہتوں کا صلہ میں نے یہ دیا کہ اسے زندگی کی اذیتوں میں گرفتار کر کے چھوڑ دیا۔ سہیل عالم میرا بیٹا ہے لیکن ایک ذلیل باپ کی اولاد۔ کاش میں یہ سب کچھ نہ کرتا۔
سب خاموش تھے۔ کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی اور پھر احمد عالم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں اعتراف جرم کرتا ہوں کہ میں نے یہ سب کچھ کیا ہے، اگر ایک رعایت میرے ساتھ ہو سکے تو آپ لوگ میرے ساتھ تعاون کریں۔''

''وہ کیا احمد عالم؟''

''سہیل اگر کہیں مل جائے تو میری اس سے ملاقات کرا دیں۔ میں اسے ایک بار سینے سے لگانا چاہتا ہوں۔ آنکھوں سے ہوس کا غلاف اتر جائے تو انسان کو بہت سے احساسات ہونے لگتے ہیں۔ وہ میری اولاد ہے، میرا بچہ، میرا بیٹا!'' اچانک ہی احمد عالم بے اختیار ہو گیا۔ اس کی سسکیاں ہچکیوں میں بدلیں اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ شاہ میر صاحب نے بے چین نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ کرنل رحیم شاہ اس وقت موجود نہیں تھے البتہ صوفی انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاہ میر صاحب نے ایک بار پھر صوفی کی طرف دیکھا تو صوفی نے کہا۔

''وہ باہر موجود ہے۔''

''کک...... کک...... کیا......؟'' شاہ میر صاحب اچھل پڑے۔ صوفی صورت حال جان کر باہر نکل گیا تھا اور کچھ دیر بعد وہ سہیل عالم کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ سب کے چہرے پر سنسنی کے آثار تھے۔ احمد عالم کے دونوں بیٹے اور بیٹی بھی اندر آ گئے تھے۔ احمد عالم سہیل کو دیکھ کر بے اختیار ہو گیا۔ پھر وہ سہیل کی طرف جھپٹا اور اس نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

''سہیل میرے بچے......! میرے بیٹے......! مجھے معاف کر دے۔ تیرا باپ بے حد ذلیل ہے، انتہائی قابل نفرت مگر تو مجھے معاف کر دے۔'' سہیل نے جلدی سے احمد عالم کو بازو پکڑ کر اٹھا لیا۔ وہ خود بھی جذباتی ہو گیا۔ احمد عالم نے اپنے بچوں کی طرف رخ کر کے کہا۔

''سنا تم نے میرے بچو! یہ تمہارا بھائی ہے۔ خدا کی قسم یہ میرا بیٹا ہے۔ اس کی ماں سے میں نے اسلامی طور پر نکاح کیا تھا۔ وہ ایک مسلمان عورت تھی۔ میرے بچو! تمہارا مجرم باپ تم سے درخواست کرتا ہے کہ اگر مجھے پھانسی ہو جائے یا میرا ہارٹ فیل ہو جائے تو تم اسے اپنا بھائی سمجھنا۔ یہ تمہارا بڑا بھائی ہے۔'' احمد عالم کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ سہیل کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے اس نے بھی بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''آپ سب لوگ گواہ رہیں۔ میری ماں نے تمام زندگی اس کرب کے عالم میں گزاری کہ لوگ اسے فاحشہ عورت سمجھتے تھے۔ ایک کنواری ماں اور مجھے حرامی کے لقب سے نوازا جاتا تھا۔ جہاں میں رہتا ہوں وہاں یہ بات معیوب نہیں ہے۔ لیکن ہم جس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اس میں یہ لفظ بدترین حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کرب میری ذات سے چمٹا ہوا تھا۔ آپ گواہ رہیں کہ میں حرامی نہیں ہوں۔'' سہیل کی آواز بلند ہو گئی۔

''نہیں میرے بیٹے، میں ہوں تیرا باپ! میں گرفتار ہو کر جرمنی جاؤں گا تو وہاں کی عدالتوں میں اس بات کا اعتراف کروں گا، اخبارات کو یہ بیان دوں گا۔''

''اور آپ لوگ اس بات کے بھی گواہ رہیں کہ میں احمد عالم کی دولت سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ یہ دولت میری نہیں میرے بھائیوں کی ہے۔ میں اسے خود پر حرام سمجھتا ہوں۔ اگر میں نے اس میں سے کچھ قبول کیا تو یہ میری ماں کی روح پر بوجھ ہو گا۔''

''نہیں، سہیل ہرگز نہیں۔ تم میرے بیٹے ہو۔'' بڑی رقت آمیز صورت حال تھی۔ وہاں موجود تمام ہی لوگ متاثر نظر آ رہے تھے۔ شاہ میر صاحب نے انٹرپول گروپ کے چیف سے بات شروع کی۔ انہوں نے کہا۔

''ہمیں آپ تھوڑی مہلت دے سکتے ہیں۔''

''میں آپ سے تفصیل عرض کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے آپ ہمیں معاف کر دیں گے۔'' انٹرپول گروپ کے سربراہ نے کہا۔

''میں سمجھا نہیں۔''

''ہمارا تعلق نہ تو انٹرپول سے ہے اور نہ ہم اس سلسلے میں کوئی ایکشن لینے آئے ہیں۔ بے شک ہم لوگ جرمنی سے یہاں پہنچے ہیں لیکن ہم بالکل غیر متعلق لوگ ہیں۔ یہ کاغذات اور یہ تمام چیزیں ہم نے صوفی صاحب کی ہدایت پر تیار کرائی ہیں اور ہم نے یہ سب کچھ جو کیا ہے وہ صرف احمد عالم سے اعتراف جرم کرانے کے لیے کیا ہے۔ ہم معافی چاہتے ہیں کہ آپ جیسے اتنے بڑے شخص کو ہم نے غلط بیانی سے پریشان کیا۔'' شاہ میر صاحب پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ ان لوگوں کو لے کر کمرے سے باہر نکل آئے۔ باقی تمام افراد اندر ہی موجود تھے۔ باہر نکل کر انہوں نے صوفی کو دیکھا اور کہا۔

''صوفی صاحب......! کک...... کک کیا یہ سچ ہے؟''

''درویشوں کی دعاؤں سے یہ ضروری تھا اور آپ بے فکر رہیں یہ تمام تفصیل بے شک معلومات کر کے حاصل کی گئی تھیں اور یہ کاغذات اسی شکل میں تیار کرائے گئے تھے۔ حکومت جرمنی کو کبھی اس کی خبر نہیں ہو گی کہ اصل واقعہ کیا تھا۔ باقی معاملات آپ سنبھال لیے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔'' شاہ میر صاحب اس قدر بے اختیار ہوئے کہ انہوں نے صوفی کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا اور کہنے لگے۔

''آپ ہمارے ملک کا سرمایہ ہیں صوفی صاحب!''

''د...... در...... درویش رحم کریں۔ خدا کے واسطے یہ نہ کہیے کل ہی لوٹ لیا جاؤں گا۔'' صوفی نے کہا اور شاہ میر صاحب ہنس پڑے۔

''آپ نے جو کیا ہے صوفی صاحب اس کے بارے میں بعد میں بات ہو گی ابھی نہیں۔''

''میرا فرض تھا جناب! دیکھیے کتنی خوشی کی بات ہے کہ اتنا بڑا کام ہو گیا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آگے کیا کروں؟''

''کرنل صاحب آنے ہی والے ہیں۔ وہ اس ڈراپ سین میں شریک نہیں ہونا چاہتے تھے۔ میں چلتا ہوں۔'' صوفی نے کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد کرنل رحیم شاہ طے شدہ پروگرام کے تحت وہاں پہنچ گئے۔ شاہ میر صاحب کرنل رحیم شاہ کے پاس پہنچے اور انہوں نے متاثر لہجے میں کہا۔ ہر انسان کے اندر ایک فطری کمزوری ہوتی ہے کہ وہ اپنوں کے لیے اپنی شخصیت بھول جاتا ہے۔ میں بھی اسی کمزوری کا شکار ہوں۔ کرنل رحیم شاہ یہ

جو کچھ ہوا ہے یقین کرو میں نے بھی زندگی میں بہت سے الٹ پھیر دیکھے ہیں لیکن یہ جس انداز میں ہوا ہے میں اسے نظر انداز نہیں کرسکتا۔ بہر حال اور کیا کہوں اس بارے میں، تم جو داستانیں رقم کر رہے ہو۔ میں ان کی اس قدر خاموشی برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ شخص جس کا نام صوفی ہے جن اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہے ان کی مثال ناممکن ہی محسوس ہوتی ہے۔

چنانچہ اب بات تمہاری اجازت کی نہیں رہ گئی بلکہ میری کوتاہی کی ہے جو مقام تم لوگوں کو چاہیے اب اس کا تعین کرنا تمہارا نہیں میرا کام ہوگا۔'' کرنل رحیم شاہ نے مسکرا کر گردن ہلا دی تھی۔

بہر حال وہ لوگ تو چلے گئے جن کے بارے میں خیال تھا کہ وہ احمد عالم بارود والا کو گرفتار کرکے جرمنی لے جائیں گے اور جرمنی کی حکومت بارود والا پر مقدمہ چلا کر اسے سزا دے گی۔ بارود والا کا سارا سرمایہ ضبط کرلیا جائے گا۔ یہ بات سب کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ احمد عالم نے کافی دیر کے بعد سوال کیا۔

''شاہ میر صاحب میری گرفتاری میں دیر کیوں ہو رہی ہے؟ اگر وقت ہے تو مجھے اپنے بچوں سے تھوڑی سی باتیں کرلینے دیں۔''

''ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔ تم اطمینان سے باتیں کرو۔''

''میں نے اپنے بچوں کی بات کہی ہے سہیل اور اب کم از کم کچھ وقت کے لیے مجھ سے گریز نہ کرو۔ میرے بچوں کے درمیان ہی آ کر بیٹھ جاؤ۔'' باقی لوگ باہر چلے گئے تھے۔ احمد عالم کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔

''ہاں۔ میرے بچو! بدنصیبی ہے میری کہ آج میں اس عالم میں تم سے ہم کلام ہو رہا ہوں۔ پتا نہیں کون کون انسان اس دنیا میں رہنے والے میری ہی طرح گناہ کرتے ہیں اور اپنے بچوں کے لیے عذاب بن جاتے ہیں۔ میں بھی انہی لوگوں میں سے ایک ہوں۔ میرا گناہ تم لوگوں کے علم میں آچکا ہے اور اب میں سزا کے دور سے گزر رہا ہوں۔ حکومت جرمنی مجھے لازمی بات ہے کہ موت کی سزا دے گی اور اس کے ساتھ ہی میرے تمام اثاثے ضبط کرکے اس کمپنی کے نام منتقل کردیے جائیں گے اور تم قلاش ہو جاؤ گے۔ میں تم تینوں بھائیوں کو کوئی حکم نہیں دے سکتا اس لیے کہ میں ایک مجرم ہوں اور میں نے تم لوگوں کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ خاص طور سے سہیل کے ساتھ۔ سہیل دیکھا کبھی کبھی کی طلب کس قدر تکلیف دہ ہوتی ہے اب تم پر ایک بہن کی کفالت کا بوجھ آ پڑا ہے۔ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ میرے گناہوں کو معاف کرکے تم میری بچی کا خیال رکھو گے اور تم بھی کہو مجھ سے کہ تم نے مجھے معاف کردیا۔

''بات ختم ہوگئی ڈیڈی! آپ نے مجھے میری شناخت دے دی، یہی آپ کا ورثہ ہے باقی جو کچھ بھی ہوتا ہے ہونے دیں، آپ فکر نہ کریں ہم سب آپ کے لیے لڑیں گے۔''

''نہیں بیٹے! سزا مکمل ہونے دو۔ موت کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ بہت دیر تک احمد عالم روتا رہا اور اس کے بچے بھی روتے رہے پھر شاہ میر نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

''ارے بھائی! اب تم لوگ روتے پیٹتے ہی رہو گے یا ہمیں اجازت بھی دو گے۔''

''وہ لوگ کہاں ہیں، میں گرفتاری کے لیے تیار ہوں۔''

''احمد عالم تمہیں گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ تمہیں کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ تم اپنے بچوں کے ساتھ پرسکون زندگی گزارو۔ اصل میں تم کسی طرح مان ہی نہیں رہے تھے۔ تم سے حقیقت اگلوانے کے لیے اور سچائی کو مضبوط قدموں سے نصب کرنے کے لیے یہ سارا کھیل کھیلا گیا۔ جرمنی سے کوئی وفد نہیں آیا۔ مجبوری تھی یہ سب کچھ کرنا۔ آرام سے اپنے بچوں کے ساتھ زندگی گذارو جو ہنگامہ ہوا تھا وہ ناقابل یقین تھا۔ بے پناہ خوشیاں اس گھر کو مل گئی تھیں اور اس کے روح رواں صوفی اور کرنل رحیم شاہ تھے۔ لیکن شاہ میر صاحب اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے نہ جانے کیا کیا کاروائی کر ڈالی اور اس کارروائی کے نتیجے میں کرنل رحیم شاہ کو ملٹری ہائی کمان کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا اور ایک میٹنگ کے لیے کال کرلیا گیا کرنل رحیم شاہ بیساکھی ٹیکتے ہوئے جب ہال میں داخل ہوئے جہاں ملٹری ہائی کمان سے لے کر اور وزیراعظم سے لے کر صدر مملکت تک موجود تھے تو انہیں ایک خوشگوار حیرت سے دو چار ہونا پڑا۔ یہاں موجود بے شمار جرنل، کرنل سب کے سب کرنل رحیم شاہ کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے تھے اور تالیوں کی گونج میں ان کا استقبال کیا گیا تھا۔

یہ اعزاز یہ بلندی کرنل رحیم شاہ کے تصور میں بھی نہیں تھی۔ وہ سکتے کے عالم میں کھڑے کے کھڑے رہ گئے تھے۔ تب اس پروگرام کو کمپیئر کرنے والے جنرل غلام حسین نے کہا۔

''کرنل رحیم شاہ آپ نے اپنی دوران ملازمت جو بیش بہا کارنامے سرنجام دیے وہ فوج کی تاریخ میں سنہرا باب ہیں۔ آپ درحقیقت ایک قابل فخر ہستی ہیں ملک اور فوج کا سرمایہ ایک فوجی اپنا عضو عضو اپنے ملک کو دے دیتا ہے۔ آپ کو صرف اس لیے آپ کی ذمہ داریوں سے ہٹایا گیا کہ آپ اپنے فرض سے کہیں زیادہ فرائض سرانجام دے چکے تھے اور ہم نہیں چاہتے تھے کہ اپنے جسم کی ایک چھوٹی سی معذوری کے بعد آپ کو مصروف عمل رکھا جائے اس لیے آپ کو آرام کرنے کا حکم ملا لیکن کرنل رحیم شاہ ہم میں سے ہر شخص آپ کی کاوشوں پر سربلند ہے اور فخر سے یہ بات کہنے پر مجبور ہے کہ دیکھو یہ ہے ہماری فوج اور یہ ہیں ہمارے فوجی افسران جو اپنا فرض کسی طرح نہیں بھولتے۔ وزیر داخلہ شاہ میر صاحب نے سبک دوشی کے بعد آپ کی خدمات کی تفصیل پیش کی۔ آپ نے اپنے معاونین کا ایک گروپ بنا کر ملک کے لیے جو جو کچھ کیا ہے اس کی رپورٹ ہمارے پاس پہنچ چکی ہے۔ ہائی کمان نے بہ نفس جنرل کا عہدہ تجویز کیا ہے۔ آپ ایک بار پھر فوج میں فعال ہوگئے ہیں۔

ہم آپ کو ملٹری انٹیلی جنس کے خفیہ سیل کا سربراہ مقرر کرتے ہیں اور آج سے یہ عہدہ آپ کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی آپ کو یہ ہدایت کی جاتی ہے ہائی کمان کی طرف سے ہی کہ ایک فوجی کی حیثیت سے آپ کو تاحیات اپنا یہ عہدہ سنبھالنا ہوگا۔ آپ اپنے گروپ میں جتنا چاہیں اضافہ کریں۔ ملکی اور غیر ملکی معاملات میں آپ کو اپنی ذمہ داریاں ادا کرنی ہوں گی۔ کرنل رحیم شاہ نے گردن جھکا لی۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے نکلے اور زمین پر ٹپکے۔ ایک لمحے کی خاموشی اختیار کرنے کے بعد چاروں طرف سے مبارک باد کی صدائیں بلند ہوئیں اور پھر صدر مملکت نے خود اپنے ہاتھوں سے کرنل رحیم شاہ کے لباس پر جنرل کے بیج لگائے اور انہیں مبارک باد دی۔ یہ چھوٹی سی رسمی تقریب تھوڑی دیر کے بعد اختتام پذیر ہوگئی۔ کرنل رحیم شاہ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ شاہ میر صاحب خود انہیں لے کر آئے، اپنی رہائش

گاہ پر پہنچے پھر انہوں نے صوفی کو بھی طلب کر لیا۔ صوفی فوراً پہنچ گیا تھا۔ تب شاہ میر صاحب نے کرنل رحیم شاہ کے نئے عہدے اور ان کے سپرد کی گئی ذمہ داریوں کی تفصیل صوفی کو بتائی اور صوفی کی باچھیں کھل گئیں۔

''میں بھی مبارک باد پیش کرتا ہوں جناب والا!'' کرنل رحیم شاہ بے ساکھیوں کے بغیر بے اختیار اٹھے اور صوفی سے لپٹ گئے۔

''اور میں انتہائی شرمندہ ہوں صوفی کہ تمہارے طفیل یہ عہدہ وصول کر کے میں خود تمہاری مبارک باد لے رہا ہوں لیکن فوج میں تمہیں ایک اعلیٰ عہدہ دلوانا میری ذمہ داری ہے۔'' صوفی اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے کہا۔

''میرا ایک ماضی ہے جناب! اور ماضی کو میں نے اپنے بدن میں موجود روح کی طرح پوشیدہ رکھا ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ میرا ماضی میری روح ہے اور شاید میں کبھی کسی کو اس کے بارے میں نہ بتا سکوں۔ بزرگ درویش میرا سب کچھ ہیں۔ بچپن ہی سے کچھ اس طرح کی فطرت تشکیل پائی کہ میں بزرگوں، پیروں اور ولیوں کا معتقد رہا۔ مجھے علم ہے کہ اس کائنات میں جسے اللہ کی قربت حاصل ہوئی۔ اس نے اپنے آپ کو زندگی کی ان چیزوں سے دور رکھا جو انسانی ذہن کو تقسیم کر دیتی ہیں۔ وہ تیتر رہتا ہے نہ بٹیر، سادگی کی زندگی میں جو مزہ پھلکاری کی زندگی میں نہیں ہے، اپنی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ سرکاری عہدوں میں آ کر میں نے محسوس کیا کہ اس میں لاتعداد پابندیاں فطرت اور مسلط کر دی جاتی ہیں جب تک اپنی مرضی پر قائم رہ سکا۔ قائم رہا اور اس کے بعد میں نے ریڑھی پر سامان تک بیچا۔

آپ یقین کیجیے انسان اگر اپنی اصل کو پہچان لے تو سکون کے سمندر میں موجزن ہو جاتا ہے اور اصل دو روٹی اور بدن ڈھانپنے کے لیے کپڑا ہے باقی سب چلتا ہے۔ کرنل رحیم شاہ صاحب نے انسانی مفاد کے لیے انسانی بہتری کے لیے مجھے آواز دی اور مجھ سے جو کچھ ہو سکا وہ کر رہا ہوں۔ مجھے کوئی عہدہ نہیں چاہیے اگر یہ عہدہ کرنل صاحب ﷺ کے پاس ہے بلکہ اب میرے جنرل کے پاس ہے تو مجھ سے زیادہ خوش اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

البتہ میں عہدوں کا حلف اٹھاتے ہوئے یہ کہتا ہوں کہ میرا جنرل مجھے جو حکم دے گا جب تک زندہ ہوں آنکھیں بند کر کے اس حکم کی تعمیل کرتا رہوں گا۔'' صوفی نے کہا۔ وہ بہت کم بولتا تھا۔ اس نے بھی بڑی جذباتی کی تھیں۔ کرنل رحیم شاہ شدت جذبات کی وجہ سے مزید کچھ نہ بول سکا تھا۔

بہر حال ادھر یہ تمام معاملات چل رہے تھے اور ادھر ایک نئی کہانی جنم لے رہی تھی۔ احمد عالم بارود والا ہر ممکن طریقے سے کوشش کر رہا تھا کہ سہیل عالم کے ساتھ ہونے والی تمام ناانصافیوں کا خاتمہ کر دے اس نے آخری حد تک کوشش کر ڈالی تھی کہ سہیل اس کے ساتھ اس گھر میں قیام کرے لیکن سہیل نے ان سے بڑی محبت سے کہا تھا۔

''آپ اگر حکم دیں گے ڈیڈی تو اپنے بدن کا سارا گوشت کاٹ کر آپ کے سامنے ڈال دوں گا لیکن ایک عہد ماں کے سامنے کیا تھا اور وہ یہی تھا کہ اگر مجھے آپ کی طرف سے کوئی ورثہ ملا تو وہ صرف آپ کی ولدیت ہو گی اور اس کے علاوہ کچھ قبول کرنا ڈیڈی میرے لیے حرام ہو گا۔ میری بہن اور میرے بھائی مجھ

پر ہر طرح کا حق رکھتے ہیں۔ اب یہ میرا وطن ہے میں یہاں رہوں گا۔ آپ کی خدمت میں مسلسل حاضری دیتا رہوں گا لیکن آپ کی دولت میں سے ایک پیسہ بھی استعمال کرنا میری مری ہوئی ماں کی توہین ہو گی۔ ڈیڈی آپ بھی میری مدد کیجیے اور مجھے بھی موقع فراہم کیجیے کہ میں اپنی ماں کی توہین نہ کر سکوں۔ بارود والا خاموش ہو گیا تھا۔ ندا اور باقی دونوں افراد نے بھی بھرپور کوششیں کر لی تھیں لیکن وہ تیار نہیں ہوا تھا۔ ابھی اس کا قیام ایک ہوٹل میں ہی تھا۔ ٹارزن بھی اس کے ساتھ ہی تھا البتہ وہ صوفی کا بڑا معتقد ہو گیا تھا۔

اور ایک دن جب گرین فورس کے تمام ممبران گرین ہاؤس میں ہی موجود تھے وہ اچانک گرین ہاؤس پہنچ گیا تھا۔ وہ سب اسے دیکھ کر ششدر رہ گئے۔

''کیوں اس میں حیرت کی کیا بات ہے صوفی صاحب! آپ مجھے بے ہوشی کے عالم میں یہاں لائے تھے لیکن میری واپسی ہوش ہی کے عالم میں ہوئی تھی پھر میں دوبارہ کیوں نہ پہنچتا البتہ باقی معلومات میں نے اپنی محنت سے حاصل کی ہیں۔''

''معلومات۔'' کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

''جناب عالی! آپ کا ماضی مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ اس دوران یہی کچھ تو کرتا رہا ہوں اور بات یہی تھی یعنی صوفی صاحب پر عقیدت۔ میں صوفی صاحب کے بارے میں ساری تفصیلات معلوم کر چکا ہوں۔ مجھے معاف کیجیے کرنل صاحب! یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ آپ فوج سے ریٹائر ہونے کے باوجود ملکی معاملات میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس عمارت میں موجود چند افراد مخصوص گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو ملکی مفادات کے لیے کام کرتا ہے اور یہ ٹیم گرین فورس کہلاتی ہے۔'' صوفی نے کرنل رحیم شاہ کی طرف دیکھا۔ کرنل رحیم شاہ کے چہرے پر سنگین تاثرات نمودار ہو گئے تو سہیل نے جلدی سے کہا۔

''نہیں۔ میرے بارے میں برے انداز میں نہ سوچیے۔ یہ بات مجھے شاہ میر صاحب سے معلوم ہوئی ہے اور میں نے اپنی ذہانت سے یہ سب کچھ معلوم کیا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ کرنل رحیم شاہ کو جنرل کا عہدہ عطا کیا گیا ہے۔ سر! آپ لوگوں نے میرے لیے جو کچھ کیا ہے اس کا صلہ تو میں خیر زندگی بھر نہیں دے سکتا۔ میں نے ایک معمولی سے چوراچکے کی حیثیت سے زندگی گزاری ہے لیکن ایک بات آپ سے عرض کیے دیتا ہوں کہ اگر مجھے آپ کے قدموں میں جگہ مل گئی تو میں آپ کی ٹیم میں ایک عظیم سرمایہ ثابت ہوں گا۔ میں اپنے آپ کو اس کے لیے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں آخری حد تک کوشش کرتا رہوں گا کہ آپ مجھے اپنے درمیان جگہ دے دیں لیکن ایک وعدہ کرتا ہوں کہ اگر یہ بات کہیں اور میرے منہ سے نکل جائے تو ایک بار پھر مجھے حرامی کہنا شروع کر دیا جائے۔

بات اس قدر ہولناک تھی کہ وہ لوگ لرز کر رہ گئے۔ ایک شخص جس نے اپنی ماں کے اوپر سے یہ الزام ہٹانے کے لیے اپنی دنیا ترک کر دی تھی۔ وہ بھلا کس طرح اپنے آپ پر یہ گندگی مسلط کر لے گا؟ ناممکن تھا اور اس سے اس کی سچائی ظاہر ہوتی تھی۔ کرنل رحیم شاہ نے ایک لمحہ توقف کیے بغیر کہا۔

''گرین فورس میں اس وقت صرف پانچ افراد ہیں۔ میں سمجھتا ہوں صوفی صاحب! ہمارے درمیان ایک اور ممبر کا اضافہ ہو گیا ہے اور اس کا نام سہیل بارود والا ہے۔''

''ایک نہیں سر دو۔ دوسرا ٹارزن ہے۔''

''قبول کیا ہم نے درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی نے مسخرے پن سے کہا پھر بولا۔

''اب اس کے لیے کچھ نئے انتظامات کرنا پڑیں گے۔'' جنرل رحیم شاہ نے سہیل عالم اور اس کے ساتھی ٹارزن کے لیے ایک خوب صورت فلیٹ کا بندوبست کیا تھا اور سہیل عالم کی خوشیوں کا ٹھکانا نہیں تھا۔ اس نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کی رپورٹ صوفی کو پیش کر دی تھی۔ اس طرح ایک ایسی آرگنائزیشن وجود میں آ گئی تھی جو ملک کی بقا کے لیے ایک اہم درجہ رکھتی تھی اور یہ بھی ملکی بقاہی کا کوئی اہم کام تھا جس میں صوفی اپنی نئی سج دھج کے ساتھ شازیہ کو اپنے ساتھ لے کر نادر پور چل پڑا تھا جو ایک بہت ہی مختلف علاقہ تھا۔ بہت ایسی خصوصیات کا حامل جو سرکاری نوعیت کی حامل تھیں اور یہاں ایک نئی کہانی کا آغاز ہوا تھا۔

یہ آغاز نادر پور کی سب سے بڑی بلند پہاڑی چوٹی گینزہ سے شروع ہوا تھا۔ اس وقت گینزہ کی پانچ ہزار چھ سو ستاسی فٹ بلند چوٹی اپنی پرشکوہ روایات کے ساتھ سینہ تانے کھڑی تھی۔ اوپر سے پہاڑی سلسلہ بالکل مسطح اور وسیع و عریض میدانوں کی مانند تھا۔ یہاں دو جنگیں ہو چکی تھیں اور ان چوٹیوں کو پڑوسی ملک میں ایک اہم حصے کی حیثیت حاصل تھی۔ عام طور سے یہ چوٹیاں سنسان ہی رہا کرتی تھیں اور کبھی کبھی ان کا استعمال ہوا کرتا تھا ورنہ یہاں عموماً تاریکی اور سناٹے کا راج ہی رہا کرتا تھا۔

شازیہ نے انتہائی کوشش کر کے صوفی کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ اس مہم میں اسے اپنے ساتھ رکھے۔ صوفی کی پراسرار شخصیت کے اتنے روپ سامنے آتے تھے کہ اسے جاننے والے حیران رہ جاتے تھے۔ خود کرنل رحیم شاہ جو اب جنرل بن چکا تھا لیکن اس نے صوفی سے یہی کہا تھا کہ اس کا عہدہ صیغہ راز میں رکھا دیا جائے چنانچہ وہ لوگ اسے کرنل رحیم شاہ ہی کہہ کر پکارتے تھے۔ بہر حال اس وقت وہ چاند کی مدھم روشنی میں گینزہ کی یہ چوٹیاں خاموشی سے آسمان کو تک رہی تھیں۔ تاحد نگاہ گہرا بے کراں سناٹا چھایا ہوا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے یہاں زندگی کا کوئی وجود نہ ہو۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔

زندگی تو کائنات کے چپے چپے میں پھیلی ہوئی ہے۔ کہیں چٹان کے رخنے سے کسی نے آہستہ سے گردن نکال کر جھانکا اور اس کی کئی شاخہ زبان دو تین بار باہر نکلی اور پھر سازگار، ٹھنڈی چاندنی اور خنک ہواؤں کے موسم سے لطف اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا نرم سیاہ چمکیلا بدن رخنے کے سوراخ سے ابلنے لگا اور باہر ڈھیر ہوتا گیا۔ مدھم چاندنی میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے درمیان اس کا چوڑا شان دار پھن آہستہ آہستہ بلند ہوا اور چکی کے پاٹ کی مانند پھیل گیا۔ اس کے منہ سے ٹلل، ٹلل کی ہلکی آوازیں نکلنے لگیں اور سرخ آنکھیں گردش کر کے ماحول کا جائزہ لینے لگیں۔

پھر غالباً اس نے جگہ مناسب نہ سمجھ کر چمپا کے درختوں کی ان جھاڑیوں کا رخ کیا جن سے چمپا کے پھولوں کی مست خنک خوشبو فضا میں پھیل رہی تھی۔ اس کے بدن کی چمکیلی لکیر گھاس کے اس قطعے کی جانب بڑھنے لگی جہاں چمپا کے جھاڑ اگے ہوئے تھے۔ چمپا کی جھاڑیوں کے نزدیک پہنچ کر اس کا بدن آہستہ آہستہ اٹھا اور وہ اپنی پسند کی اس خوشبو کو خود میں جذب کرنے کے لیے درختوں کی جھاڑیاں سونگھنے لگا۔ دفعتاً ہی اس کے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہاں اسے کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا تھا اور غالباً اپنی

خلوت میں کسی اور کی موجودگی اسے پسند نہیں آئی تھی۔

چنانچہ اس نے اپنے بدن کا ایک گھیرا بنایا اور ایک بار پھر اس کا چوڑا پھن فضا میں بلند ہو کر اس تحریک کو تلاش کرنے لگا جس نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ اس سے چند گز کے فاصلے پر ایک انسانی وجود جو خود بھی اس جانب نگراں تھا۔ کالے سیاہ ناگ کو اس انسانی وجود پر غصہ آنے لگا۔ بھلا اس حسین ماحول اور پرفضا منظر میں اس مکروہ مخلوق کی کیا گنجائش ہوتی ہے جو صرف اپنے مقاصد کے لیے جیتی ہے اور کسی بھی موسم سے لطف اندوز ہونا نہیں جانتی۔ اس خیال سے وہ اپنے مدمقابل کے سامنے ڈٹ گیا اور اس کی غفلت تلاش کرنے لگا لیکن مدمقابل جسمانی طور پر اس جیسا نہیں تھا البتہ ذہنی طور پر اس سے کہیں زیادہ تھا۔

دفعتاً ایک ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دی اور سفید رنگ کا ایک اور انسانی وجود کے ہاتھ میں دبے ہوئے ایک سلنڈر سے خارج ہوا اور سانپ اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ انسانی کارستانیوں سے بے خبر اس مخلوق کو اندازہ بھی نہیں ہو سکا کہ وہ کسی عذاب میں گرفتار ہو گئی ہے۔ چمپا کے پھولوں سے کہیں زیادہ حسین خوشبو نے اسے لپیٹ میں لے لیا اور اس پر ایک عجیب سا سرور طاری ہو گیا لیکن اس کیفیت کا احساس اسے ایک لمحے سے زیادہ نہ ہو سکا۔ دوسرے لمحے اس کا پھن سکڑا اور بدن زمین پر آ رہا۔ جب چمپا کی جھاڑیوں میں چھپا ہوا وہ انسانی وجود آگے بڑھا اور ایک انگلی سے اس نے سانپ کے زمین پر پڑے ہوئے پھن کو کھٹکھٹایا۔ جب سانپ میں کوئی تحریک نہ پائی تو اس کے دونوں ہاتھ آگے بڑھے اور اس نے سانپ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ پھر اپنے لباس سے اس نے ایک چیز نکال کر سانپ کو اس میں لپیٹ لیا اور اس کی بڑی سی پوٹلی اپنے نزدیک ہی رکھ لی۔ نہ جانے یہ وحشی مخلوق کون تھا۔ اس کے نقوش نظر نہیں آ رہے تھے۔

کیونکہ وہ سیاہ رنگ کے نقاب میں چھپے ہوئے تھے۔ اپنے اس کام سے فارغ ہونے کے بعد جیسے ہی اسے گہرا سکون ملا۔ وہ پاؤں پھیلا کر گھاس کے قطعے پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ کی کلائی پر بہت ہی اعلیٰ درجے کی گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے گھڑی کے ہندسوں کو دیکھا اور ایک لمحے کے بعد چمپا کے جھاڑ کے نیچے رینگ گیا۔

بہت دور سے کسی مشین کے انجن کی گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی دو لکیریں گینزہ کی ڈھلانوں کی جانب سے اوپر ابھر رہی تھیں۔ سفید روشن لکیریں جن کا رخ گینزہ کے آخری پہاڑی گھٹاؤں کی جانب تھا۔ سیاہ پوش ساکت ہو گیا۔ اتنا ساکت کہ چمپا کی جھاڑ میں ہلکی سی جنبش بھی نہیں رہی۔ آنے والی لکیریں آہستہ آہستہ گینزہ کے اس کٹاؤ کے سامنے پہنچ گئیں جس کے بعد ہزاروں فٹ گہری کھائیاں شروع ہو جاتی تھیں اور یہ گہرائیاں ایسی تھیں کہ یہاں سے کسی پتھر کے ٹکڑے پر بھی قدم نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ نیچے کی دنیا تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ لوگ جو اس انتہائی طاقت ور اور دیوہیکل لینڈ کروزر کے ذریعے اوپر آ رہے تھے لازمی طور پر شان دار صلاحیتوں کے مالک تھے۔ بہر حال یہاں پہنچنے کے بعد روشن لکیریں بجھ گئیں اور دیوہیکل لینڈ کروزر سے دو افراد نیچے اتر آئے۔ مدھم چاندنی میں ان کے خاکے دیکھے جا سکتے تھے۔ ان میں سے ایک دراز قامت اور کسی قدر بے تکے بدن کا مالک عجیب سی شخصیت والا صوفی تھا اور دوسری ایک شان دار جینز میں ملبوس شازیہ دونوں لینڈ کروزر سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔

لینڈ کروزر صوفی نے ڈرائیو کی تھی۔ شازیہ تو ان بلندیوں کو دیکھ کر ہی وحشت زدہ ہوگئی تھی اور اس نے سرسراتی آواز میں کہا تھا۔

"چھوٹے بابا یہاں تو کوئی باقاعدہ سڑک بھی نہیں ہے۔"

"بے قاعدہ تو ہے درویشوں کی دعاؤں سے، ویسے شازیہ ان بلندیوں پر باقاعدہ سرکاری نگرانی رہتی ہے۔ اس کے کچھ حصوں میں ہمیشہ فوجی جوان پوشیدہ رہتے ہیں جو ان بلندیوں سے سرحد پار کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ ان کے اوپر آنے جانے کا بھی تو کچھ نہ کچھ ذریعہ ہے ہی۔"

"ٹھیک ہے چھوٹے بابا! میں بھلا آپ سے کیا کہہ سکتی ہوں لیکن رات کی تاریکیوں میں؟"

"پتا نہیں بچپن کے کسی دور میں الوؤں سے میری بڑی دوستی رہی ہے۔ رات میں مجھے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی نظر آتا ہے۔" صوفی نے چہکتے ہوئے لہجے میں کہا تھا اور شازیہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہوگئی تھی۔ صوفی نے آہستہ سے کہا۔

"تم ڈر رہی ہو شازیہ! اور بس۔ ان الفاظ نے شازیہ کو دہلا دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔

کچھ دیر تک وہ اسی طرح ساکت رہے پھر شازیہ چند قدم آگے بڑھ کر کٹاؤ کے آخری حصے پر پہنچ گئی لیکن یہاں کا منظر دیکھ کر ایک بار پھر اس کے بدن پر کپکپی سی طاری ہوگئی تھی جب کہ صوفی اپنی جگہ کھڑا مسکراتا رہا تھا۔

پھر اس نے بھی کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی وہ کچھ بول بھی نہیں سکا تھا کہ آسمان سے ہلکی ہلکی آوازیں ابھریں۔ یہ آوازیں بھی روشنیوں کے ساتھ ساتھ ہی تھیں۔ ایک ہیلی کاپٹر تھا جس کے نیچے کی روشنیاں روشن تھیں اور وہ غالباً اسی طرف آرہا تھا۔ شازیہ دوڑ کر صوفی کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ دونوں مستعد ہوگئے تھے اور پھر انہوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے گھاس کے اس قطعے کے پاس پہنچ گئے جہاں چمپا کے جھاڑ اگے ہوئے تھے۔

ہیلی کاپٹر نے دو تین چکر لگائے اور چند لمحات کے بعد جگہ کا تعین کر کے نیچے اتر آیا۔ چمپا کے جھاڑ سے اس کا فاصلہ کوئی دو سو گز کے قریب تھا۔ صوفی اور شازیہ ہیلی کاپٹر کی روشنی میں نمایاں ہوگئے تھے۔

ہیلی کاپٹر سے بھی دو ہی آدمی اترے تھے۔ ان دونوں کا تعلق کسی یورپی ملک سے تھا۔ بہت ہی اسمارٹ اور اچھی شخصیت کے مالک تھے۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"ہیلو ڈیئر مجھے آپ کے پاس پہنچنے میں دیر تو نہیں ہوئی۔"

"نہیں۔ میں آپ کو کس نام سے مخاطب کروں۔"

"آپ مجھے کربی کوسٹر کہہ سکتے ہیں۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر کوسٹر۔"

"آپ یہ بتایئے۔ کیا ہماری امانت لے آئے؟"

"ہاں۔" صوفی نے شازیہ کو اشارہ کیا اور شازیہ لینڈ کروزر کی جانب بڑھ گئی۔ صوفی مستعدی

سے خاموش کھڑا رہا تھا۔ پتا نہیں یہ سارا گیم کیا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس وقت صوفی اپنی شخصیت سے بالکل مختلف نظر آرہا تھا۔ شازیہ ایک بریف کیس لے کر صوفی کے پاس پہنچ گئی اور صوفی نے ہاتھ بڑھا کر بریف کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا۔"

"آپ کے حکم کے مطابق دو ملین ڈالر۔" صوفی نے کہا۔

"ویری گڈ۔"

"کاغذات۔" صوفی کی آواز ابھری۔

"ہاں، ہاں بالکل۔ ظاہر ہے ہم ایک باعزت سودا کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں اور یہ رقم وصول کر کے مجھے یہ کاغذات آپ کے حوالے کرنے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی میں کچھ اور بھی بات کرنا چاہتا ہوں آپ سے۔ میں آپ کو کس نام سے مخاطب کروں سر!"

ہیلی کاپٹر سے آنے والے نے سوال کیا۔

"ناموں کی ضرورت نہیں پیش آتی اس طرح کے سودے بازی میں پھر بھی آپ مجھے ایکس کہہ سکتے ہیں۔" صوفی نے کہا۔

"ٹھیک ہے مسٹر ایکس! میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ایک ذہین ترین انسان اس سودے کے لیے منتخب کیا گیا ہے تو ہمارے ذہن میں کچھ اور تجاویز پیدا ہوئیں۔ ہمارے پینل نے مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ کیوں نہ آپ کو ہم اس سلسلے میں اپنے ساتھ شمولیت کی دعوت دیں۔ مسٹر ایکس آپ جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ آپ سے تعلق نہیں رکھتا اور نہ ہی آپ کا ملک اس سلسلے میں کسی قسم کی ذمہ داریاں قبول کرتا ہے اور ہم یہ بات بھی جانتے ہیں کہ آپ ذاتی طور پر اس طرف متوجہ ہوئے ہیں چنانچہ کیوں نہ ایک نیا معاہدہ کر کے ہم اور آپ دوستی کا ایک نیا قدم اٹھائیں۔"

"ہمارے درمیان یہ طے ہوا تھا مسٹر کربی کوسٹر کہ پہلے ہم اس سودے کو مکمل کرلیں اور کسی قسم کی چالاکی کا مظاہرہ نہ کریں۔ آپ نے درمیان میں یہ گفتگو کر کے مجھے اس بات کا احساس دلایا ہے کہ آپ شاید اپنے طور پر کوئی اور منصوبے لے کر آئے ہیں۔"

"ہاں۔ میں آپ سے خود اس کا اعتراف کر چکا ہوں۔ کاغذات میرے پاس موجود ہیں اور ڈاکٹر آپ کے پاس۔ ان کا سودا آپ کی خواہش کے مطابق ہی کیا جائے گا لیکن یہ تجویز جس کے بارے میں مجھے بھی ہدایت کی گئی ہے کہ میں آپ کے سامنے پیش کروں اور اگر آپ اسے منظور کریں تو ہم از سر نو اس پر کام شروع کردیں۔"

"کیا تجویز ہے؟" صوفی نے سوال کیا۔

"مسٹر ایکس! آپ کے پاس ان کاغذات کا بقیہ حصہ موجود ہے اور آپ یقینی طور پر ان کے بارے میں تحقیقات بھی کر رہے ہیں اگر یہ ایک جگہ مکمل ہو جائیں اور ہم آپ بھی یکجا ہو جائیں تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہم اس فارمولے کی تکمیل آپ کے تعاون سے کرلیں گے اور اس کے لیے آپ کو ہر طرح کی سہولتیں مہیا کی جائیں گی جو بھی سائنٹسٹ آپ اس فارمولے کی تکمیل کے لیے مقرر کریں

گے ہم ہر طرح کے وسائل سے ان کی مدد کریں گے اور اپنے بھی چھ سائنس دان آپ کے سپرد کریں گے۔ آپ خود سمجھتے ہیں مسٹر ایکس کہ اگر ہم نے مل جل کر یہ فارمولا مکمل کر لیا تو دنیا ہماری مٹھی میں ہوگی۔ وہ بڑے بڑے ملک جو دنیا کو اپنی انگلیوں پر نچا رہے ہیں ہمارے قبضے میں ہوں گے اور ہم انہیں بلیک میل کر کے کھربوں ڈالر کمائیں گے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ فارمولا مکمل ہو کر کسی بھی بڑے ملک کے ہاتھوں فروخت کیا جا سکتا ہے اور اس وقت ہر ملک کی طاقت اس فارمولے کے سامنے ختم ہو جائے گی جس کے پاس یہ فارمولا ہوگا۔ وہ اپنے حریفوں کو نیچا دکھا سکتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے ملکوں کو تو خیر کہنا ہی کیا ہے۔ آپ کو اندازہ ہے کہ ایٹمی توانائی کس شکل میں استعمال ہو رہی ہے۔ تخریب اور صرف تخریب میں تعمیری امور میں تو اسے استعمال ہی نہیں کیا جا رہا جب کہ ہر ملک ایک ہی کہانی سناتا ہے کہ اس کا ایٹمی پروگرام پرامن ہے۔ ہر شخص ایک ہی انداز میں سوچ رہا ہے جب دنیا یہی کر رہی ہے تو ہم اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں۔ یہ فارمولا جہاں ایک طرف دنیا کو تباہی کے غار تک لے جا سکتا ہے وہیں اس سے بڑے بڑے کام بھی لیے جا سکتے ہیں۔ ہم کم از کم کسی کو تباہ تو نہیں کریں گے لیکن اس کے بل پر اس کے چھوٹے چھوٹے مظاہرے کر کے ہم ان تمام بڑے ممالک کو بیک میل کر سکتے ہیں۔"

"سوری...... ! اسے دہشت گردی کہا جاتا ہے اور ہم دہشت گرد نہیں ہیں بلکہ ہم نے دہشت گردی کے خلاف ایک عظیم محاذ کھول رکھا ہے۔ جب کہ تم لوگ اسے گندے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہو۔ بڑے بڑے ممالک میں کم از کم کچھ اقدار ہیں بین الاقوامی معاہدوں کا پاس کرتے ہیں وہ لوگ، لیکن تمہارا مقصد صرف دولت کا حصول اور دنیا بھر میں دہشت گردی پھیلانا ہے۔"

صوفی کے لہجے کی صاف گوئی پر شازیہ بھی حیران رہ گئی۔ صوفی نے ایک بار بھی درویشوں کا نام نہیں استعمال کیا تھا۔ شازیہ نے ایک لمحے کے اندر اس سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ صوفی اپنے تکیے کلام کو ان لوگوں کے علم میں نہیں لانا چاہتا کیونکہ اس سے ان کی شناخت ہوتی ہے اور اسی وقت کربی کوسٹر کی آواز ابھری۔

"سوچنے کا فرق ہے مسٹر ایکس! صرف سوچنے کا فرق ہے ورنہ دنیا یہی کر رہی ہے۔ انسانی زندگی اب کمپیوٹر کے قبضے میں ہے۔ آپ خود سوچیے کہا جاتا ہے کہ کمپیوٹر ذرا سی غلطی سے تیسری جنگ عظیم کا آغاز کر سکتا ہے۔ کیا انسانی زندگی اس سے نازک موڑ پر نہیں پہنچی ہے۔ یہ فارمولا اگر آپ کی مدد سے اس ملک سے مل جائے جس نے اسے آپ کو اس کے لیے تیار کیا ہے تو کیا یہ ملک دوسرے ممالک کو دھمکی نہیں دے گا کیا یہ اس فارمولے کی تکمیل نہیں کرے گا؟"

"سوری مسٹر کربی کوسٹر! یہ سوچنا ہمارا کام نہیں ہے۔ آپ اپنا کام کیجئے اور مجھے میرا کام کرنے دیں۔"

"لیکن ہم سے کہا گیا ہے کہ آپ کو ہر قیمت پر اس کے لیے تیار کر لیا جائے۔ کربی کوسٹر اپنی اصلی شکل میں آ گیا اور صوفی چونک پڑا اور اس نے شازیہ کی طرف دیکھا لیکن اس دوران کربی کوسٹر اور اس کا دوسرا ساتھی ریوالور نکال چکے تھے۔ صوفی نے سرد نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھا اور پھر بولا۔

"جس باعزت طریقے سے آپ لوگوں نے سودے کا یقین دلایا تھا اس کا مظاہرہ نہیں کر رہے ہیں مسٹر کربی کوسٹر!"

"ہاں۔ ہم سے کچھ غلطیاں ہو رہی ہیں لیکن مجبوری ہے۔ ہم نے تو بڑے دوستانہ انداز میں آپ کو یہ پیشکش کی تھی۔ آپ نے اسے قبول نہیں کیا۔ براہ کرم اب آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ رقم وغیرہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہمیں اس رقم سے زیادہ آپ کی ضرورت ہے اور مسٹر ایکس براہ کرم اس سلسلے میں کسی قسم کا تعرض نہ کیجئے گا۔ ہمیں ہدایت ملی ہے کہ اگر آپ اس کے لیے آمادہ نہ ہوں تو دو صورتیں ہیں یا تو آپ کو ہلاک کر دیا جائے یا پھر ساتھ لے آیا جائے۔ آپ ہیلی کاپٹر کی طرف دیکھیے اس میں دو افراد اور موجود ہیں اور ان کے ہاتھوں میں مشین گنیں دبی ہوئی ہیں جن کا رخ آپ ہی کی طرف ہے۔ تجربہ چاہتے ہیں تو میں اس کا مظاہرہ کیے دیتا ہوں۔ کربی کوسٹر نے کہا اور پستول کا رخ ان کے جانب کیے کیے اپنا ایک ہاتھ فضا میں لہرایا۔ دوسرے لمحے مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ سے پہاڑیاں گونج اٹھیں۔ چاروں طرف ایک خوف ناک سنسناہٹ پھیل گئی تھی۔ مشین گنوں کا رخ آسمان کی جانب رکھا گیا تھا کیونکہ آسمان کی طرف لپکتے ہوئے شعلے یہی بتا رہے تھے۔ صوفی نے ایک نگاہ شازیہ کو دیکھا اور آہستہ سے گردن ہلا دی۔ کربی کوسٹر کی نگاہیں ان دونوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں مسٹر ایکس! کوشش کارگر نہیں ہو سکتی کوئی بھی آپ کی۔ آپ کو پھر ایک بار یہی دعوت دی جاتی ہے اور دوسری بار......" ابھی یہ جملے کربی کوسٹر پورے ہی نہیں کر پایا تھا کہ دفعتاً ہی ایک لمبی سیاہ لکیر فضا میں بلند ہوئی اور اس کے اوپر آ گری کربی کوسٹر سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ کیا ہوا ہے؟ لیکن اس کے ساتھی کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی تھی۔ وہ خوف ناک آواز میں چیخا تھا۔

"فلائنگ دی اہنیک۔" لمبا سیاہ چمکیلا سانپ ان دونوں پر آ گرا اور صرف ایک لمحہ صوفی اور شازیہ کے لیے کارآمد ثابت ہوا۔ انہوں نے فوراً ہی زمین پر چھلانگ لگا دی۔ ہیلی کاپٹر میں بیٹھے ہوئے لوگ نہ سمجھ پائے کہ صورت حال کیا ہوئی ہے البتہ انہوں نے اندھا دھند مشین گنوں سے فائرنگ شروع کر دی تھی۔ اس دوران زمین پر گرے ہوئے صوفی اور شازیہ نے اپنے لباس سے ریوالور نکال لیے اور دوسرے لمحے ان کے ریوالوروں سے چلی ہوئی گولیوں نے کربی کوسٹر اور اس کے ساتھی کے جسموں میں سوراخ کر دیے۔ ہیلی کاپٹر میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو شاید یہ احساس ہو گیا تھا کہ ادھر صورت حال گڑبڑ ہو گئی ہے چنانچہ وہ انتہائی وحشیانہ انداز میں مشین گنوں سے فائرنگ کرنے لگے لیکن اول تو وہ بوکھلائے ہوئے تھے اور صورت حال کو سمجھ نہیں پائے تھے۔ دوسری بات یہ کہ فاصلہ خاصا تھا پھر جس جگہ صوفی اور شازیہ نیچے زمین پر گرے تھے وہاں کا صحیح طور پر نشانہ نہیں لیا جا سکتا تھا چنانچہ ان کی یہ کوشش بے مقصد ثابت ہوئی اور چند لمحات کے بعد ہیلی کاپٹر کی جانب سے فائرنگ رک گئی۔ وہ لوگ غالباً صورت حال کا جائزہ لگا رہے تھے۔

صوفی اور شازیہ خاموشی سے اپنی جگہ کھڑے رہے لیکن اس وقت انہیں چوکنا ہونا پڑا جب دفعتہً ہی ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہوا۔ صوفی نے سانپ کی طرح پلٹ کر ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول سے ہیلی کاپٹر پر فائرنگ کی لیکن بے مقصد ہیلی کاپٹر فضا میں اٹھتا چلا گیا تھا۔ اب صورت حال سنگین ہو گئی تھی، چونکہ بلندی سے ان دونوں کو نشانہ بنایا جا سکتا تھا چنانچہ صوفی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہیلی کاپٹر ایک مخصوص بلندی پر پہنچنے کے بعد تیرتا ہوا انہی کی جانب آ رہا تھا اور ایک بار پھر مشین گن سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ صوفی اور شازیہ

نے ایک بار پھر ایک سمت چھلانگ لگائی۔ ہیلی کاپٹر فائرنگ کرتا ہوا دور نکل گیا تھا لیکن صوفی کو یقین تھا کہ وہ پھر پلٹے گا اور انہیں پھر اپنا نشانہ بنانے کی کوشش کرے گا چنانچہ اس کی نگاہیں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ ایک ابھری ہوئی چٹان اسے بہتر پناہ گاہ نظر آئی اور اس نے شازیہ کو پکارتے ہوئے کہا۔

''شازیہ اس طرف۔'' اور دوسرے لمحے وہ دونوں چٹان کی طرف دوڑ پڑے تھے۔ ان کا اندازہ بالکل ٹھیک نکلا۔ ہیلی کاپٹر پلٹ کر واپس آ رہا تھا اور اس کے بعد وہ بے تحاشا گولیاں برساتا ہوا اس جگہ سے آگے نکل گیا۔ پتا نہیں ان لوگوں کی سوچ کیا تھی لیکن صوفی اب خود بھی کوئی عمل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے شازیہ سے کہا۔

''جب تک وہ پلٹ کر واپس آئیں ہمیں ان دونوں آدمیوں کی تلاشی لے ڈالنی چاہیے۔''

''چھوٹے بابا......!''

''آؤ۔'' صوفی نے اس کی بات پوری نہ ہونے دی اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ زمین پر پڑی ہوئی دونوں لاشوں کے قریب پہنچا اور اس نے پھرتی سے ان کی تلاشی لے ڈالی۔ ہیلی کاپٹر ایک بار پھر واپس پلٹ رہا تھا۔ صوفی نے اچھی طرح ان دونوں کی تلاشی لی اور پھر اس بیگ کی جانب جھپٹا جس میں اس کے بیان کے مطابق رقم موجود تھی لیکن ہیلی کاپٹر سر پر پہنچ گیا تھا اور اس سے ایک بار پھر فائرنگ ہونے لگی تھی۔ صوفی بیگ نہ اٹھا سکا۔ اس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور کسی چیتے کی طرح دوڑتا ہوا چٹان کے عقب میں پہنچ گیا جہاں شازیہ بہ دستور موجود تھی۔ پھر اس نے کہا۔

''نہیں شازیہ ہمیں نکلنا ہوگا۔''

''جی چھوٹے بابا......!'' شازیہ نے کہا۔

''لینڈ کروزر کی طرف۔'' صوفی بولا۔ انہوں نے نگاہیں اٹھا کر بلندی کی طرف دیکھا۔ ہیلی کاپٹر کافی لمبے لمبے چکر لے رہا تھا اور ایک بار پھر وہ پلٹ رہا تھا لیکن اتنی دیر میں وہ لینڈ کروزر کے قریب پہنچ گئے تھے پھر صوفی نے خود ہی لینڈ کروزر کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اسے اسٹارٹ کر کے طوفانی رفتار سے آگے بڑھا دیا۔ لینڈ کروزر کا رخ بھی بڑے خوف ناک انداز میں تبدیل کیا گیا تھا کیونکہ وہ کٹاؤ زیادہ دور نہیں تھا جس پر پہنچنے کے بعد زندگی کا تصور ایک مذاق رہ جاتا ہے۔ ہیلی کاپٹر اب بھی گولیاں برسا رہا تھا۔ وہ چند لمحات کے بعد سے لینڈ کروزر پر سے گزرتا چلا گیا۔ نہ جانے کیوں اوپر سے گولیاں برسنا بند ہو گئی تھیں۔ لیکن ہیلی کاپٹر نے لینڈ کروزر کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ مسلسل اس کے ساتھ سفر کرتا رہا۔ لینڈ کروزر اس خوف ناک پگڈنڈی پر جس کے دونوں جانب گہرائیاں تھیں دوڑتی رہی۔ صوفی اس وقت ڈرائیونگ کا ایک ایسا مظاہرہ کر رہا تھا کہ یقین نہ آئے۔ شازیہ اس کے ساتھ سانس روکے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ شازیہ بہ ذات خود انتہائی مضبوط اعصاب کی مالک تھی اور اس وقت اس کا صوفی کے ساتھ ہونا اس بات کی دلالت کرتا تھا کہ گرین فورس میں وہ شازیہ کو سب سے اول حیثیت دیتا تھا۔

بہر حال جس انداز میں لینڈ کروزر سفر کر رہی تھی اس نے شازیہ کے بھی حواس خراب کر دیے تھے اور اس نے آنکھیں بھینچ لی تھیں۔ اندازہ یہ ہوا کہ ہیلی کاپٹر سے فائرنگ شاید اس لیے بند ہو گئی تھی کہ اب ان کے پاس ایمونیشن نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کی تقدیر ہی تھی ورنہ دوڑتی ہوئی لینڈ کروزر کو نشانہ بنانا بھی مشکل نہ ہوتا۔

صوفی بہ دستور اسی رفتار سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ خوفناک پہاڑیوں میں ڈرائیونگ ناقابل یقین تھی۔ لینڈ کروزر نہایت خوف ناک انداز میں ڈھلان عبور کرتی رہی۔ اس کے بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں تھوڑے فاصلے پر ایک پل بنا ہوا تھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ لینڈ کروزر انہی شہتیروں سے بنے ہوئے مضبوط پل سے گزر کر آئی تھی لیکن لینڈ کروزر پل کے نزدیک پہنچی بھی نہیں تھی کہ دفعتاً پل پر خوف ناک دھماکے ہونے لگے اور لکڑی کے شہتیر آگ کے شعلوں کے درمیان فضا میں بلند ہونے لگے۔ صوفی نے پوری قوت سے بریک لگائے اور لینڈ کروزر تیز چرچراہٹ کے ساتھ رک گئی۔ صوفی پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس تباہ شدہ پل کو دیکھ رہا تھا۔ جو آگ اور شعلوں کے لپیٹ میں تھا اور اب راستے بند ہو گئے تھے لیکن ان کا یہ خیال غلط تھا کہ وہ لوگ ناکام ہو گئے ہیں۔ وہ مسلسل کوششوں میں مصروف تھے۔ ابھی صوفی کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ پل کے دوسری جانب سے ایک بار پھر ہولناک فائرنگ شروع ہو گئی۔ یہ فائرنگ بھی لمبی رینج کی مشین گن سے کی جا رہی تھی۔ صوفی نے کسی چونکے ہوئے چیتے کی طرح ادھر ادھر دیکھا۔ اس جگہ لینڈ کروزر کو موڑنا ناممکن نہں تھا چنانچہ اس نے لینڈ کروزر کو ریورس گیئر میں ڈالا اور ایکسیلٹر دبا دیا۔ لینڈ کروزر ریورس ہی میں یہ پتلا سا راستہ طے کرنے لگی۔ یہ بھی کسی انتہائی مشاق ڈرائیور کا کام ہی ہو سکتا ہے ورنہ اس پتلی سی جگہ میں لینڈ کروزر کو ریورس میں اتنی دور لے جانا ممکن نہیں تھا۔ شازیہ کے چہرے پر اب دہشت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ خوف زدہ نگاہوں سے اور بدحواسی کے عالم میں ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ صوفی کے ہونٹ بھنچ گئے۔ اس کی آنکھ میں ایک نیم غنودگی کی سی کیفیت می پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اسی عالم میں ریورس گیئر میں لینڈ کروزر کو دور تک لیتا چلا گیا پھر ایک ایسی جگہ نظر آ گئی جہاں سے وہ اسے موڑ سکتا تھا۔ اس نے فوراً اس جگہ رک کر لینڈ کروزر کو واپس موڑ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس پھر اسی جگہ پہنچ گئے جہاں اس سارے ڈرامے کا آغاز ہوا تھا۔ شازیہ خاموشی سے صوفی کو دیکھ رہی تھی اس کے حلق سے آواز تک نہیں نکل پا رہی تھی اچانک ہی صوفی نے کہا۔

''نہیں شازیہ! ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے تم اپنی اسی حیثیت میں آ جاؤ جس میں تم نظر آتی ہو۔ مجھے تمہارے اوپر مکمل اعتماد ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم میرے اعتماد کو دھوکا نہیں دو گی۔'' شازیہ کو یوں لگا جیسے اس کے بدن میں نئی توانائی ابھر آئی ہو۔ صوفی کیا کرنا چاہتا ہے یہ اسے نہیں معلوم تھا۔

صوفی کو سطحی طور پر جاننے والے بس اس کا مذاق ہی اڑایا کرتے تھے۔ اگر کبھی اس کا کوئی کارنامہ کسی کے علم میں آ جاتا تو یا تو اسے جھوٹ تصور کر لیا جاتا یا پھر یہ بھی کہا جاتا کہ کچھ پراسرار قوتیں صوفی کی مدد کرتی ہیں۔ وہ جو درویش چیختا رہتا ہے اس کی کوئی خاص وجہ ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ، لیکن جو لوگ صوفی کو بہت زیادہ قریب سے جاننے لگے تھے انہیں بہ خوبی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس ہڈیوں کے بدنما ڈھیر میں ایک ایسا خزانہ چھپا ہوا ہے جس کی صحیح تفصیل شاید کوئی کبھی نہ جان سکے۔

شازیہ، دلاور، غلام قادر، عادل اور فیضان وغیرہ صوفی سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے اور رحیم شاہ تو خیر تھا ہی اس کے دیوانوں میں۔ اس کی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر لیتا تھا۔ نہ صرف بھروسا کر لیتا تھا بلکہ اس کی راہنمائی میں ہر وہ کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتا تھا جسے اس کی اپنی عقل تسلیم کرنے کے

لیے تیار نہیں ہوتی تھی، لیکن وہ جانتا تھا کہ صوفی کا دماغ یقینی طور پر الگ راستوں پر چل رہا ہوگا۔ شازیہ کو اس بات پر ناز تھا کہ بعض مہمات میں صوفی نے اسے مردوں سے زیادہ اہمیت دی تھی اور اس مہم میں بھی یہی پوزیشن تھی۔

اس وقت شازیہ صوفی کے جس روپ کو دیکھ رہی تھی وہ طلسماتی روپ تھا۔ صوفی وہ کچھ کر رہا تھا جو تصور میں بھی نہ آئے اور اس وقت اس بھیانک پہاڑی مقام پر جو کھیل کھیلا جا رہا تھا، وہ انتہائی سنسنی خیز تھا۔ اچانک ہی صوفی کی آواز ابھری۔

''شازیہ! پچھلے حصے میں دو پیراشوٹ رکھے ہوئے ہیں نکالو۔'' شازیہ نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پچھلے حصے کا رخ کیا اور اسے پیراشوٹ نظر آ گئے۔

''سنو تمہیں کبھی کوئی ہوابازی کا کوئی تجربہ رہا ہے۔''

''نن......نن نہیں چھوٹے بابا۔'' شازیہ نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

''شازیہ یہ آواز مجھے دکھ دے رہی ہے۔''

''سس......سس......سوری چھوٹے بابا۔''

''لو۔ یہ پیراشوٹ اس طرح اپنے بدن پر کس لو۔'' صوفی نے شازیہ سے کہا اور شازیہ اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگی۔ اس کا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا صوفی کے الفاظ نے بے شک اس کے حوصلے بہت بڑھا دیے تھے لیکن جو کچھ نظر آ رہا تھا وہ اس کی روح فنا کر دینے کے لیے کافی تھا۔ صوفی نے دوسرا پیراشوٹ اپنے بدن پر کس لیا اور پھر اس نے مسکرا کر شازیہ کو دیکھا اور اسے ہدایات دینے لگا۔ اس کے بعد اس نے لینڈ کروزر کا اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور ایک پھر لینڈ کروزر ریورس گیئر میں پیچھے کی جانب جانے لگی۔ اس دوران ہیلی کاپٹر دو مرتبہ ان کے سروں پر سے گزر چکا تھا غالباً اب وہ یہ جائزہ لینے کی کوشش کر رہے تھے کہ اب ان کا دوسرا قدم کیا ہوگا۔

لینڈ کروزر ریورس گیئر میں چلتی ہوئی پیچھے کی جانب دور تک نکل آئی اور اس کے بعد صوفی نے اسے بریک لگایا پھر فرسٹ گیئر میں ڈال کر اسے پوری قوت سے آگے بڑھایا۔ تھوڑا سا آگے بڑھنے کے بعد اس نے سکینڈ پھر تھرڈ گیئر لگایا اور لینڈ کروزر کی رفتار بے پناہ تیز ہوگئی۔ شازیہ نے دانت بھینچ لیے تھے لیکن وہ کچھ بول نہیں پا رہی تھی پھر دفعتاً ہی لینڈ کروزر کے ٹائروں نے زمین چھوڑ دی۔ وہ جس تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی اسی تیز رفتاری سے زمین چھوڑ کر خلا میں دور تک چلی گئی اور اس کے ساتھ ہی صوفی کے حلق سے تیز آواز نکلی۔

''شازی! دروازہ کھولو اور لینڈ کروزر چھوڑ دو۔ کود جاؤ۔'' اس نے ان الفاظ کے ساتھ اپنی طرف کا دروازہ کھول لیا تھا۔ شازیہ نے پوری قوت سے دانت بھینچے آنکھیں بند کیں اور اس کے بعد اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے چھلانگ لگا دی۔ وہ خلا میں کسی پتھر کی طرح نیچے اتر رہے تھے اور لینڈ کروزر بھی اس کے ساتھ ہی نیچے جا رہی تھی لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان کے اور لینڈ کروزر کے درمیان کا فاصلہ زیادہ ہونے لگا۔ پیراشوٹ کھل گئے تھے اور لینڈ کروزر برق رفتاری سے نیچے کی طرف جا رہی تھی۔ شازیہ نے بھی اب

آنکھیں کھول لی تھیں اور مدھم چاندنی کی روشنی میں لینڈ کروزر اسے نیچے گرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

صوفی کوشش کر رہا تھا کہ لینڈ کروزر سے زیادہ فاصلے پر نکل جائے۔ ہوائیں ان دونوں کی مدد کر رہی تھیں۔ شازیہ نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ پیراشوٹ سے کودنے کا اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھیوں میں جکڑ لیا ہو۔ حلق بند ہو گیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے تمام اندرونی اعضا منہ کے راستے باہر نکل آئیں گے۔

لینڈ کروزر تھوڑی دیر بعد نیچے وادیوں کی گہرائیوں میں پہنچ گئی اور اس کے بعد چٹانوں میں شعلے بکھر گئے۔ گہرائی اب بھی اتنی تھی کہ لینڈ کروزر کے دھماکے کو یہاں تک نہیں سنا جا سکا تھا لیکن شعلوں کا طوفان انہیں برابر نظر آ رہا تھا۔ جو دور دور تک بکھر گئے تھے۔ صوفی نے یہ دیکھ کر گہری سانس لی کہ وہ اس جگہ سے خاصے فاصلے پر تھے جہاں لینڈ کروزر گری تھی اور اس کے ٹکڑے دور دور تک پھیل گئے تھے۔ شازیہ بھی اب انتہائی کوشش کر رہی تھی کہ وہ صوفی سے دور نہ رہے اور اس کوشش میں اسے کامیابی بھی حاصل ہوگئی تھی۔

بہت دیر تک خلا سے زمین کا سفر جاری رہا اور پھر شازیہ بے تکے انداز میں نیچے گری تھی جب کہ صوفی پیروں کے بل پر ہی نیچے اترا تھا۔ تاہم گرنا اتنا خطرناک نہیں ثابت ہوا۔ شازیہ نے خود بھی کوشش کر کے احتیاط کے ساتھ زمین چھوئی تھی۔ پیراشوٹ ان کے سروں پر پھیلے ہوئے تھے۔ صوفی نے جلدی سے پیراشوٹ کی رسیاں کھولیں اور اس کے نیچے سے نکل آیا۔ شازیہ بھی یہی کوشش کر رہی تھی۔ یہ صرف ذہانت کی بات تھی ورنہ تربیت کے بغیر پیراشوٹ کے ذریعے نیچے کودنا آسان کام نہیں تھا۔ غالباً صوفی نے اسی لیے شازیہ کا انتخاب کیا تھا۔ کہ شازیہ بے پناہ صلاحیتوں کی مالک تھی تاہم دونوں ایک دوسرے کے قریب پہنچ گئے لینڈ کروزر ان سے بہت فاصلے پر گری تھی شازیہ گہری سانسیں لے رہی تھی۔ صوفی نے کہا۔

''ٹھیک ہو نا تم؟''

''درویشوں کی دعاؤں سے۔'' شازیہ نے شگفتگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''آؤ'' صوفی اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ چاند کی مدھم روشنی میں ماحول بے حد عجیب نظر آ رہا تھا۔ شازیہ کو کچھ معلوم نہیں ہوا تھا کہ آگے کیا ہوگا۔ وہ جتنا فاصلہ طے کر کے یہاں تک پہنچے تھے اتنا فاصلہ پیدل عبور کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک دو بار اس نے زبان کھولنا بھی چاہی تھی لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش ہوگئی کہ صوفی محسوس نہ کرے۔

تھوڑا فاصلہ عبور کرنے کے بعد صوفی رک گیا۔ کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا اور اس کے بعد ایک اونچی چٹان پر چڑھ گیا۔ وہاں کھڑے ہو کر وہ گردن لمبی کر کے ادھر ادھر دیکھنے لگا اور اس کے بعد شازیہ نے اس کے منہ سے نکلنے والی ایک آواز سنی۔ وہ انتہائی برق رفتاری سے چٹان سے نیچے کود آیا۔ شازیہ حیرت بھری نگاہوں سے اس وقت صوفی کی پھرتی دیکھ رہی تھی۔ صوفی کی عمر کا کوئی صحیح اندازہ لگانا کم از کم شازیہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ کبھی تو یہ ایک ایسا بچہ نظر آتا جو صرف زمین پر رینگ [illegible]۔ بچوں سے بھی زیادہ سست رفتار اور کبھی جب اس کی دوسری شخصیت کا روپ سامنے آتا تو صرف شازیہ ہی کیا بڑے بڑے حیران رہ جاتے تھے۔ اس وقت جو کام اس نے شازیہ سے کروایا تھا لاکھ نڈر اور بے باک ہونے کے باوجود شازیہ اس

قدر اعلیٰ کارکردگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے پیراشوٹ سے کودنے کی کوئی مشق نہیں تھی۔ بس صوفی کی ہمت افزائی پر اس نے یہ انوکھا کام سرانجام دے دیا تھا اور خود اپنے اس کارنامے پر حیران تھی۔

صوفی اس کے قریب پہنچ کر بولا۔

''آؤ'' اور شازیہ اس کے ساتھ چل پڑی۔ صوفی نے جس انداز میں راستہ تبدیل کیا تھا اس سے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ کسی مخصوص حصے کی طرف جا رہا ہے۔ بہرحال شازیہ نے اب اس کے بعد زبان کھولنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ کوئی دس گیارہ منٹ کا یہ سفر بڑا دشوار گزار تھا۔ کیونکہ راستے ناہموار تھے لیکن اس کے بعد شازیہ کو نیم تاریک ماحول میں ایک جیپ کا ہیولا نظر آیا اور وہ حیران رہ گئی۔ اس ویرانے میں بھلا اس جیپ کا کیا تصور تھا۔ وہ صوفی کے ساتھ اس جیپ کی جانب چل پڑی۔ جیپ خالی تھی آس پاس بھی کوئی موجود نہیں تھا لیکن جیپ کے قریب پہنچ کر صوفی نے آواز دی۔

''ٹارزن!''

''میں آپ کو دیکھ چکا ہوں سر! آ جائیے۔'' جیپ سے آواز ابھری اور شازیہ نے چونک کر دیکھا۔ ٹارزن اسٹیئرنگ پر ہی موجود تھا لیکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا ننھا سا وجود سیٹوں کے درمیان چھپا ہوا تھا۔ صوفی جیپ کے قریب پہنچ کر بولا۔

''ٹارزن تم پچھلی سیٹ پر آ جاؤ۔''

''یس سر!'' شازیہ کے ہوش و حواس اڑے ہوئے تھے۔ بھلا ٹارزن اور جیپ کی یہاں موجودگی کیا معنی رکھتی تھی۔ اس کا مقصد ہے کہ صوفی کو ہی سب کچھ کرنا تھا جو اس نے کیا تھا یا حالات کے تحت ہوگیا تھا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ انتہائی قیمتی لینڈ کروزر جس پر لگے ہوئے ایک مونوگرام سے شازیہ کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ملٹری کی لینڈ کروزر ہے البتہ وہاں سے چلتے ہوئے جہاں سے یہ سفر اسٹارٹ ہوا تھا صوفی نے دو آدمیوں کو اشارہ کر کے یہ مونوگرام اتروا دیا تھا۔ بڑا سنسنی خیز عمل تھا اور شازیہ کو لگ رہا تھا کہ کوئی بہت ہی پراسرار کام ہو رہا ہے لیکن ظاہر ہے وہ صوفی سے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کر سکتی تھی۔

صوفی نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور شازیہ اچک کر اس کے برابر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد ڈرائیونگ بھی بے مثال ہی تھی، کیونکہ کوئی سڑک کوئی ایسی جگہ نہیں تھی۔ انتہائی ناہموار چٹانیں ٹیڑھے میڑھے راستے لیکن جیپ کی رفتار ناقابل یقین تھی اور پھر تقریباً سینتیس منٹ کا سفر شازیہ کے انجر پنجر ہو گئے تھے لیکن اسے ہنسی بھی آ رہی تھی کیونکہ پچھلی سیٹوں پر بیٹھا ہوا ٹارزن کسی گولی کی طرح ادھر سے ادھر لڑھک رہا تھا۔ اس کے منہ سے بار بار آوازیں نکل جاتی تھیں اور وہ مختلف چیزوں کو پکڑ کر اپنا توازن برقرار رکھے ہوئے تھا۔ اس کی تو کھچڑی ہی پک گئی تھی۔ خدا خدا کر کے یہ سفر طے ہوا اور صوفی نے انتہائی مہارت کے ساتھ جیپ ایک اونچی دیوار پر چڑھا دی جو گزر کر سڑک تک جاتی تھی۔ اسے دیوار ہی کہا جا سکتا تھا سپاٹ اور سیدھی۔ اس پر جیپ چڑھانا بھی ایک مہارت ہی کا کام تھا۔ لیکن شازیہ کو اب یہ اندازہ اچھی طرح ہو چکا تھا کہ یہ شخص جو بظاہر ایک بے ضرر کیچوا نظر آتا ہے درحقیقت کینچوی سے نکلا ہوا ایک سانپ ہے۔ برق رفتار اور بجلی کی طرح عمل کرنے والا سانپ۔ جیپ ہموار سڑک پر دوڑنے لگی اور صوفی نے کہا۔

''ٹارزن تمہارا کیا حال ہے؟''

''تھوڑی دیر پہلے میری کھوپڑی سیٹوں کے نیچے تھی اور ٹانگیں آپ دونوں کے سر کے قریب لیکن اب خیریت ہے؟'' ٹارزن نے مسخرے پن سے کہا۔

''درویش رحم کریں۔'' صوفی گہری سانس لے کر بولا۔

♥......♥......♥

گینزرا کی بلند و بالا پہاڑی پر شروع ہونے والا ڈراما ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ لوگ غالباً اس بات کی توقع خواب میں بھی نہیں رکھتے کہ آنے والے حالات سے مجبور ہو کر اس طرح خودکشی کر لیں گے۔ وہ خود بھی بدحواسیوں کا شکار نظر آ رہے تھے۔ پل اڑا دینا اور پھر لینڈ کروزر پر اندھا دھند فائرنگ کرنا۔ بدحواسی ہی کی حالت تھی۔ انہیں اس بات کی امید نہیں تھی کہ وہ لوگ واپس اس طرح پل کی جانب آ سکتے ہیں۔ اس دوران ہیلی کاپٹر والوں کے پاس ایمونیشن بھی ختم ہو گیا تھا اور اب غالباً پیٹرول بھی ختم ہوتا جا رہا تھا جب کہ انہوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ لینڈ کروزر اور اس کے ساتھ ہی اس میں آنے والے دونوں افراد گینزر کی گہرائیوں میں گر کر فنا ہو چکے ہیں اور اب ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔

چنانچہ انہوں نے ہیلی کاپٹر کا رخ موڑا اور وہاں سے کافی دور نکل آئے۔ ہیلی کاپٹر میں بیٹھے ہوئے ایک شخص نے وائرلیس پر کسی سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر دی تھی۔

''ہم آپ کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں جب ایک انسانی وجود اور ایک سانپ کے درمیان تھوڑی دیر کی آنکھ مچولی ہوئی تھی۔ سیاہ لباس میں ملبوس یہ انسانی وجود سہیل تھا۔ احمد عالم بارود والا کا بیٹا سہیل عالم بارود والا جو صوفی کی شاگردی میں آ چکا تھا اور کرنل رحیم شاہ اور صوفی نے مشترکہ طور پر اسے اور ٹارزن کو گرین فورس میں قبول کر لیا تھا۔

سہیل کی یہ پہلی مہم تھی جس میں وہ صوفی کے ساتھ کام کر رہا تھا اور صوفی نے بڑے اطمینان کے ساتھ ٹارزن اور سہیل کو دو الگ الگ ذمے داریاں سونپ دی تھیں۔ سہیل اس وقت بھی وہیں موجود تھا۔ جب اسٹین گن سے گولیاں برسائی جا رہی تھیں اس نے رینگ کر ایک ایسی چٹان کے نیچے پناہ لے رکھی تھی جو اوپر سے سائبان کی مانند جھکی ہوئی تھی پھر جب یہ سارا کھیل ختم ہوا تو وہ اپنی جگہ سے باہر نکل آیا۔ اس کھیل کی ابتدا اس نے خود ہی کرائی تھی۔ اس بے ہوش سانپ کو ان دونوں پر پھینک کر جو اس کے قبضے میں آ چکا تھا اور بے ہوش ہونے کے بعد کسی قابل نہیں رہا تھا۔

سیاہ لباس میں چھپا ہوا سہیل اس سانپ سے بھی زیادہ خطرناک اور پھرتیلا تھا۔ آخر میں جب ہیلی کاپٹر لینڈ کروزر کے خاتمے کے بعد واپس پلٹا تو سہیل اپنی جگہ سے نکلا اور اس نے برق رفتاری سے اس طرف چھلانگ لگا دی۔ جدھر وہ دونوں لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ سب سے پہلے اس نے بیگ پر قبضہ کیا جس میں لاکھوں ڈالر کے نوٹ بند تھے اور جو لاوارث پڑا ہوا تھا۔ اس بریف کیس کو بغل میں دبا کر وہ پھر اس چٹان کے نزدیک آ بیٹھا اور اس نے بریف کیس کھول لیا۔

بریف کیس میں رکھے ہوئے نوٹوں کا جائزہ لینے کے بعد وہ تیزی سے ان لاشوں کے قریب آیا

جوخون میں لتھڑی ہوئی پڑی تھیں۔ اس نے ان کا تنفس وغیرہ چیک کیا۔ دونوں مرچکے تھے۔ سہیل نے کچھ
دیر کچھ سوچا اور اس کے بعد نگاہیں اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ ہیلی کاپٹر کا اب کوئی پتا نہیں تھا۔ اس نے
خیال انداز میں گردن ہلائی اور پھر جھک کر ایک مردہ شخص کا لباس اترنے لگا۔ یہ لباس اس نے آن کی آن
میں اپنے بدن پر پہن لیا اور اس کے بعد وہ اس مردہ شخص کو ہاتھوں پر اٹھا کر چمپا کی جھاڑ کے نزدیک پہنچا اور
اس نے اسے چمپا کے درختوں کی آڑ میں ڈال دیا۔ یہ لباس پہننے کے بعد اس نے بڑے نوٹوں کے بنڈل
لباس میں چھپائے اور پھر دوسری لاش کا خون اپنے ہاتھ پر لے کر اپنے لباس پر لگانے لگا۔ ویسے بھی
والے کا یہ لباس خود آلود تھا۔

لیکن سہیل نے کچھ اور خون اس لباس پر لگایا اور اس کے بعد اس نے اپنا چہرہ بھی خون میں
لیا۔ اپنے لباس سے چھٹکارا پانے کے بعد اس نے اس مختصر سے کام سے فراغت حاصل کی اور اس کے بعد
دوسری لاش کے پاس زمین پر لیٹ گیا۔ اس کی نگاہیں بہ دستور آسمان کا جائزہ لے رہی تھیں۔ خاصے فاصلے
اسے روشنیاں نظر آئیں تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی اور
روشنیوں پر نگاہیں جمائے رہا۔ ہیلی کاپٹر کی مشین کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد
کاپٹر بھی عین اسی جگہ نیچے اتر گیا جہاں وہ تھوڑی دیر پہلے اترا تھا۔ وہ دونوں آدمی بے چارے جو اس دوران
عجیب وغریب مصیبت کا شکار رہے تھے۔ ہیلی کاپٹر سے نیچے اتر آئے اور ان لاشوں کی طرف بڑھنے لگے۔
ان کے ساتھیوں کی تھی۔ نہ جانے ان کی ذہنی حالت کیا تھی۔ لاشوں کے قریب پہنچ کر ایک لمحے کے لیے
پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

"اٹھاؤ۔ ایک ایک کر کے اٹھاؤ۔"

"ہاں۔" دوسرے آدمی نے کہا اور وہ پہلے سہیل کی ہی لاش کی جانب جھکے۔ انہوں نے اس کے
پاؤں سیدھے کیے اور پھر بازوؤں میں ہاتھ ڈالنے لگے لیکن اسی وقت ان کے چہروں پر ایک تیز پھوار پڑی
بہت ہی جان لیوا قسم کی پھوار۔ جس نے ان کے سانس آن کی آن میں بند کر دیے۔ نوجوان کی ٹانگیں پکڑ
والے شخص کے ہاتھوں سے اس کی ٹانگیں نکل گئیں اور جس نے اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھانے
کوشش کی تھی۔ اس نے فوراً ہی اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیے لیکن کوشش کے باوجود وہ سانس
پا رہے تھے۔ ان کے سر بری طرح چکرا رہے تھے۔ آکسیجن بالکل بند ہو گئی تھی۔ ایک لمحے تک وہ اپنی
کھڑے ڈولتے رہے اور پھر اوندھے منہ نیچے آ رہے۔

سہیل پھرتی سے کھڑا ہو گیا اور اس کے بعد اس نے جھک کر ان دونوں کی تلاشی لی اور جو کچھ
کی جیبوں میں ملا اپنی جیبوں میں منتقل کر لیا اور پھر ہیلی کاپٹر کی جانب بڑھ گیا۔ ہیلی کاپٹر کی مشین اسٹارٹ
اور اس کے پنکھے چل رہے تھے۔ سہیل نے جھک کر پائلٹ سیٹ سنبھالی اور کچھ لمحوں کے بعد ہیلی کاپٹر فضا
بلند ہو رہا تھا۔ بلندی پر پہنچنے کے بعد اس نے ہیلی کاپٹر کا رخ پہاڑی چٹانوں کی جانب کر دیا۔ جدھر
وادی کے اوپر سے گزر سکتا تھا۔

ہیلی کاپٹر وادی پر پرواز کرنے لگا۔ سہیل اسے نیچے جھکاتا جا رہا تھا۔ پھر کافی نیچے آنے کے

اس نے ایک سیدھ اختیار کر لی۔ وہ بہت مطمئن نظر آ رہا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد اس نے لباس کی جیبوں کو تلاش
کیا۔ اوپری جیب میں رومال مل گیا اور اس سے وہ اپنے چہرے کا خون صاف کرنے لگا۔ چہرہ رگڑ رگڑ کر
صاف کرنے کے بعد اس نے اپنے بال سنوارے اور پھر پرسکون انداز میں سامنے کی سمت دیکھنے لگا۔

ہیلی کاپٹر برق رفتاری سے شہر کی جانب سفر کر رہا تھا۔ سہیل تھوڑی دیر تک ہیلی کاپٹر اڑاتا رہا اور
تھوڑی دیر کے بعد شہر کی عمارتیں نظر آنے لگیں۔ تاحد نگاہ بلند و بالا عمارتیں پھیلی ہوئی تھیں اور رات کے
سناٹے میں کچھ عجیب سی لگ رہی تھیں۔ بہت کم جگہیں ایسی تھیں جہاں تیز روشنیاں اور انسان نظر آ جاتے
تھے۔ سہیل نے نیچے دیکھا اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک گہری مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ہیلی کاپٹر کو ایک
مخصوص سمت میں کر دیا اور آن کی آن میں ایک بلند و بالا عمارت کے قریب پہنچ گیا۔ سوفی صدی کی یہ رہائشی
عمارت تھی۔ اور اس علاقے کی سب سے بلند و بالا عمارت تھی۔ اس کے اطراف میں دوسری عمارتیں بھی تھیں
لیکن سب کی سب اس سے نیچی تھیں۔ سہیل نے ہیلی کاپٹر کو اس عمارت کے اوپر سے گزارا اور پھر اسے ایک
لمبا چکر دینے کے بعد اسے بالکل نیچے جھکا لیا۔ اب وہ اس عمارت کی سیدھ میں آہستہ آہستہ نیچے اتر رہا تھا۔
تھوڑی دیر کے بعد ہیلی کاپٹر کے پہیوں نے عمارت کی چھت کو چھو لیا۔ سہیل نے فوراً ہیلی کاپٹر کی مشین بند کر
دی اور برق رفتاری سے اس سے نیچے اتر آیا۔

ایک رہائشی عمارت کی چھت پر ہیلی کاپٹر کا اترنا ایک انتہائی حیرت انگیز بات تھی۔ عمارت کے مکین
سو رہے تھے لیکن ہیلی کاپٹر کی کان پھاڑ دینے والی آواز اور اس کے بعد اس کا عمارت پر اترنا کوئی عام بات
نہیں تھی۔

چنانچہ بہت سے فلیٹوں کے مکین جاگ اٹھے۔ نوجوان سہیل نے ایک لمحے کے لیے بھی چھت پر
رکنا پسند نہیں کیا تھا۔ وہ تیزی سے ایک ایسے حصے کی جانب بڑھ رہا تھا جہاں سے اتر کر پہلی منزل کی راہ داری
میں پہنچا جا سکے۔ فلیٹوں کی روشنیاں جلنے لگی تھیں اور بعض فلیٹوں سے ڈری ڈری آوازیں سنائی دے رہی
تھیں۔ سہیل برق رفتاری سے اٹھارہویں منزل کے رہائشی علاقے میں پہنچا اور پھر وہاں سے دوڑتا ہوا لفٹ
میں داخل ہو گیا۔ چند ہی لمحات کے بعد لفٹ اسے نچلی منزل پر لے جا رہی تھی۔ لیکن وہ جس منزل سے بھی
گزرا اس نے لوگوں کو دروازوں سے جھانکتے ہوئے دیکھا۔ سب ہی ایک دوسرے سے سوالات کر رہے تھے
اور اس کے بعد ایک اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔

لفٹ گراؤنڈ فلور پہنچ گئی۔ سہیل آرام سے اس سے اترا اور پھر راہداریوں سے ہوتا ہوا بیرونی حصے
کے احاطے کی اس دیوار کے پاس پہنچا جہاں سے وہ دوسری طرف کود سکتا تھا۔ نیچے غالباً پہرے داروں کا بھی
انتظام تھا اور وہ ہیلی کاپٹر کی موجودگی کو محسوس کر چکے تھے۔ ایک کیبن سے پولیس کو ٹیلی فون کیا جا رہا تھا ایک
رہائشی عمارت پر ہیلی کاپٹر کا اتر جانا کسی خطرناک حادثے کا پیش خیمہ بھی ہو سکتا تھا۔ اس بات کے امکانات بھی
تھے کہ وہ جرائم پیشہ افراد ہوں اور عمارت میں ایک جدید ترین طریقے سے لوٹ مار شروع ہونے والی ہو۔

چنانچہ عمارت کے مکینوں کو ہوشیار کرنے کے لیے الارم بجا دیا گیا اور آن کی آن میں زبردست
ہنگامہ ہو گیا۔ فلیٹوں کی روشنیاں دھڑا دھڑ جل رہی تھیں نہ صرف ان فلیٹوں کی بلکہ آس پاس کی دوسری عمارتوں

میں بھی اس کی وجہ سے روشنی ہوتی جا رہی تھی اور بھاگ دوڑ شروع ہوگئی تھی۔ سہیل آہستگی سے سڑک عبور کرنے کے بعد دوسری عمارت کے پاس پہنچ گیا جو اس عمارت کے بالکل سامنے تھی۔ اس عمارت کے فلیٹوں میں بھی روشنیاں ہونے لگی تھیں اور اندر سے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کچھ فلیٹوں کے دروازے بھی کھل گئے تھے۔

سہیل ان تمام کارروائیوں کو دیکھتا ہوا پھرتی سے اس دوسری عمارت کی لفٹ میں پہنچا۔ لفٹ نے اسے چوتھی منزل پر پہنچا دیا۔ چوتھی منزل پر پہنچنے کے بعد اس نے جیب سے ایک چابی نکالی اور اس فلیٹ کا تالا کھولنے لگا۔ اس کام میں بھی اسے چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اندر پہنچنے کے بعد اس نے فلیٹ کا دروازہ بند کرلیا اور روشنی جلا دی۔ فلیٹ تین کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک چھوٹا سا لاؤنج سہیل نے اطمینان سے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور باتھ روم میں داخل ہوگیا۔

یہاں اس نے لباس اتارا اور ایک دوسرا لباس پہن لیا جو ایک ڈریسنگ الماری کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ اپنے اتارے ہوئے لباس کو اس نے اطمینان کے ساتھ لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور سیٹی بجاتا ہوا بیڈ روم کی جانب بڑھ گیا۔ بیڈ روم میں پہنچ کر اس نے روشنی جلائی اور پھر کھڑکی کی ریلنگ سے پردہ ہٹانے لگا۔ پردہ ہٹا کر اس نے باہر کا منظر دیکھا۔ وہ عمارت جس کی چھت پر اس نے ہیلی کاپٹر اتارا تھا۔ یہ خوبی نظر آرہی تھی۔ باہر پولیس سائرنوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور تیز بریکوں کے ساتھ گاڑیاں رکتی جا رہی تھیں۔ کئی پیٹرولنگ کاریں یہاں پہنچ چکی تھیں اور اس میں سے پولیس کے افراد نکل نکل کر عمارت میں داخل ہو رہے تھے پوری عمارت میں ہنگامہ مچا ہوا تھا۔

سہیل پرخیال انداز میں ان لوگوں کی بھاگ دوڑ دیکھتا رہا۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں بھی سائرن بجاتی ہوئی پہنچ گئی تھی۔ ایک شدید افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ سہیل نے آسمان کی طرف دیکھا اور کھڑکی بند کر دی اور ایک گہری سانس لے کر ایک بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔ اس نے سائڈ لیمپ کی روشنی بجھائی اور آنکھیں بند کرلیں۔

♥......♥......♥

شاہ میر صاحب نے یہ کیس جنرل رحیم شاہ کو دیا تھا۔ انہوں نے جنرل کو تفصیل بتاتے ہوئے کہا تھا۔

''رحیم شاہ صاحب! اصل میں کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جنہیں فوری طور پر سرکاری نوعیت کا حامل نہیں بتایا جا سکتا، جب تک کہ اس کے بارے میں کچھ ٹھوس ثبوت موجود نہ ہوں۔ میں نے اب تک اس سلسلے میں نہایت خفیہ کارروائی کی ہے اور ملٹری انٹیلی جنس کے سربراہ جنرل رفیق سے براہ راست رابطہ رکھا ہے۔ جنرل صاحب نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ اس معاملے کو مکمل طور پر خفیہ رکھا جائے۔ اصل میں آپ کے علم میں یہ بات آئی ہوگی کہ پچھلے دنوں دہشت گرد کی ایک واردات میں بڑی تباہی پھیلی تھی، لیکن ملٹری انٹیلی جنس کے کچھ خفیہ کارکنوں نے ایک دہشت گردی کو گرفتار کیا تھا اور وہ دہشت گرد ایک تنظیم کا رکن تھا۔ اس دہشت گرد کے پاس سے کچھ کاغذات دستیاب ہوئے تھے جو نامکمل تھے۔ ہمارے لیے یہ کاغذات انتہائی دلچسپی کا باعث بن گئے تھے۔ میرا مطلب ہے جنرل رفیق کے لیے۔ جنرل رفیق نے بڑی راز داری کے

ساتھ ان کاغذات پر کچھ سائنس دانوں کی مدد سے کام کیا تھا لیکن وہ کاغذات نامکمل ہیں اور ان کا بقیہ حصہ نہیں اور ہے جس دہشت گرد کے ہاتھوں یہ کاغذات موصول ہوئے تھے وہ دم توڑ چکا تھا۔

چنانچہ ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں رہا تھا۔ جس سے ہمیں کاغذات کے بارے میں مزید کچھ معلوم ہو سکے۔ کاغذات کے اندر جو موضوع تھا وہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ بہر حال انہی دنوں غیر ملکی ایجنسی سے رابطے پر یہ معلوم ہوا کہ ایک غیر ملکی ایجنسی بھی ان کاغذات میں دلچسپی لے رہی ہے۔ جنرل رفیق نے میرے ذریعے تمام انتظامات کیے اس غیر ملکی ایجنسی کے سربراہ نے جو کہانی سنائی وہ یوں تھی۔

کہ ایک بہت بڑے ملک کے سائنسی شعبے کا سربراہ ڈاکٹر شارگن کچھ ایسے مہلک جراثیمی ہتھیاروں پر کام کر رہا تھا جن کی تکمیل کے بعد ایک بہت بڑا جراثیمی ہتھیار تیار کیا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر شارگن حکومت کی مدد سے اس فارمولے پر کام کر رہا تھا لیکن وہ مخلص نہیں تھا۔ اس نے ایک جرائم پیشہ تنظیم کے رہنما سے رابطہ قائم کیا اور ایک خفیہ منصوبے کے تحت اس جراثیمی ایجاد کی تکمیل کے بعد وہ اسے کسی جنگ باز ملک کے ہاتھوں فروخت کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے لیکن تجربے کے لیے ان کے پاس دولت نہیں تھی۔

ڈاکٹر شارگن نے یہ دولت حکومت سے حاصل کی تھی اور اس نے آخر کار یہ جراثیمی محلول تیار کرلیا پھر وہ فرار کے لیے تیار ہوگیا۔ تنظیم کا سربراہ مل ماسکر ہر طرح سے اس کا شریک کار تھا۔ فرار کا جو وقت مقرر کیا گیا تھا اس وقت ڈاکٹر شارگن وہاں سے چل پڑا لیکن جب فرار کا منصوبہ تکمیل پا گیا تو شارگن نے مل ماسکر کو زخمی کر دیا۔ وہ اسے ہلاک کرنا چاہتا تھا لیکن مل ماسکر خود بھی ایک چالاک اور توانا آدمی تھا۔ اس نے زخمی ہوتے ہوئے بھی شارگن کو زخمی کر دیا اور فارمولے کے کاغذات اس سے جھپٹ لیے، چونکہ دونوں ہی مجرم تھے۔ ڈاکٹر شارگن تو وہ محلول لے کر فرار ہوگیا اور کاغذات مل ماسکر کے ہاتھ آ گئے لیکن وہ واپس اپنے ٹھکانے پر نہیں گیا بلکہ اس نے اپنے طور پر سوچا کہ فارمولے کے ان کاغذات ہی سے کام چلائے گا۔ وہ زخمی حالت میں کسی جگہ پوشیدہ ہوگیا۔

لیکن جس جگہ وہ پوشیدہ ہوا تھا اس جگہ ایک اور دہشت گرد تنظیم کے افراد پوشیدہ تھے۔ جنہوں نے آخر کار مل ماسکر کو ہلاک کر کے فارمولے کے وہ کاغذات اپنے قبضے میں لے لیے، البتہ ان کے اپنے درمیان بھی پھوٹ پڑ گئی اور ان میں سے ایک شخص کاغذات کا ایک بڑا حصہ لے کر فرار ہوگیا۔ تنظیم کے آدمی اپنے ساتھی کو تلاش کرتے رہے اور وہ آدمی بھی مارا گیا بہر حال اس کے بعد اس دہشت گرد تنظیم کے افراد نے رابطے قائم کیے اور بات مجھ تک پہنچ گئی۔ ہمیں یہ پیش کش کی گئی کہ یا تو فارمولے کے باقی کاغذات جو اندازے کے مطابق جنرل رفیق کے ایک کارکن کے پاس تھے انہیں فروخت کر دیے جائیں یا ان باقی کاغذات کا سودا کرلیا جائے جو ان کے پاس ہیں۔ اب آپ خود بتایئے ایسے کام براہ راست حکومتی بنیاد پر تو نہیں ہو سکتے اس کے لیے پہلے ہمیں اپنے طور پر کام کرنا ہوگا اور خوش قسمتی سے مجھے اپنے جیسے لوگوں کا تعاون حاصل ہے۔''

''گویا اس تنظیم نے یہ پیشکش فراخ دلی سے کی ہے کہ ان آدھے کاغذات کو خلوص کے ساتھ ہمارے ہاتھوں فروخت کر دیں گے۔''

''خلوص کی بات تو میں نہیں کرسکتا جنرل! لیکن بہر حال بات قابل غور ہے اور میں چاہتا ہوں کہ

ڈاکٹر شارگن کا بھی پتا لگایا جائے کہ وہ کہاں ہے اور فارمولے کے بقیہ کاغذات کہاں مل سکتے ہیں؟"

"ٹھیک۔ بڑا دلچسپ مسئلہ ہے۔ میرا خیال ہے صوفی صاحب اس میں دلچسپی لیں گے۔"

"اندازہ میرا بھی یہی ہے۔"

"لیکن دہشت گرد تنظیم کی اپنی تفصیل کیا ہے۔ کیا یہ بات معلوم ہو سکی؟"

وہی دولت کا حصول آدھے کاغذات اس کے لیے بھی بے کار ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ انہیں کار آمد بنایا جائے جہاں تک ڈاکٹر شارگن کا تعلق ہے تو اسے نہ صرف دہشت گرد تنظیم کے افراد تلاش کررہے ہیں بلکہ اس کی اپنی ملکی حکومت بھی تلاش کررہی ہے اس کے جتنے شناسا ہیں وہ سب اس کی تلاش میں ہیں۔ بہر حال اگر ہم لوگ اصلی کاغذات حاصل کرنے کی کوشش کریں تو شاید ہمیں کامیابی حاصل ہو جائے۔"

"تنظیم کا مطالبہ کیا ہے؟ وہ باقی کاغذات فروخت کرنا چاہتی ہے یا بقیہ کاغذات خریدنا چاہتی ہے؟"

"دونوں ہی صورتیں قابل قبول ہیں اس کے لیے۔"

"ہوں...... تو بہتر یہ ہوگا کہ بقیہ کاغذات تنظیم سے حاصل کر لیے جائیں کیونکہ ڈاکٹر شارگن اگر فارمولے کو سنبھالے پھر رہا ہوگا۔ اس کے لیے یہ کام بہت مشکل ہوگا، بہر حال دیکھتے ہیں کہ کیا کیا جا سکتا ہے۔ صوفی تک یہ بات پہنچی اور اس نے بہ خوشی یہ کام قبول کر لیا اور اس کے بعد برق رفتاری سے کام شروع کر دیا گیا۔ وہ دولت مہیا کی گئی جو تنظیم کے افراد کو دینی تھی اور سارا کام نادر پور گینز کی عظیم الشان چوٹی پر طے کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ تنظیم کی طرف سے بھی یہی جگہ مخصوص کی گئی تھی اور اس کے بعد تمام انتظامات ہوئے تھے۔ صوفی نے اس بار جن افراد کا انتخاب کیا تھا ان سے بھی رحیم شاہ نے اتفاق کیا تھا۔ شازیہ سہیل عالم اور ٹارزن پھر ساری کارروائی اسی انداز میں ہوئی تھی۔ اب یہ صوفی کو طے کرنا تھا کہ کس انداز میں کام کیا جائے اور کام جس انداز میں ہوا تھا اس کے ایک ایک عمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ صوفی نے کتنی دور اندیشی سے سب کچھ کیا ہے۔ غرض یہ کہ ایک طرف صوفی اور شازیہ نے اپنا کام کیا تھا تو دوسری طرف سہیل عالم نے بھی کمال ہی کر دکھایا تھا اور اپنی اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ کچھ کر دکھایا تھا جس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ ہر کام بڑی عمدگی سے کر سکتا ہے۔

ادھر شازیہ گرین ہاؤس پہنچ چکی تھی اور چھوٹے بابا کی تعریفیں کرتے کرتے وہ دیوانی ہوگئی تھی کہ چھوٹے بابا کی شخصیت کے نہ جانے کتنے روپ ہیں۔ بہت خطرناک ہو جاتے ہیں اس وقت جب دشمن مدمقابل ہو۔ اس وقت کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ یہ وہی عام حالت میں نظر آنے والے چھوٹے بابا ہیں، لیکن یہ انکشاف بھی صوفی ہی کے ذریعے ہوا تھا اور اس انکشاف پر جنرل رحیم شاہ ہی نہیں بلکہ خود شاہ میر صاحب بھی دنگ رہ گئے تھے۔ پتا یہ چلا تھا کہ یہ جو تنظیم ڈاکٹر شارگن اور مل ماسکر سے متعلق بتائی جاتی تھی اس کا ماسٹر برین کوئی اور ہی تھا۔ یہ تنظیم اس طرح کے سنسنی خیز کیسز بناتی تھی کہ حکومتیں اس میں ملوث ہو جائیں اور اس کے بعد وہ انوکھے کھیل کھیلے جاتے تھے جو ناقابل یقین ہوتے تھے اور اس طرح حکومت سے دولت بٹوری جاتی تھی۔ بات بڑی دلچسپ تھی۔ نہ ڈاکٹر شارگن کا کوئی وجود تھا نہ اس محلول کا اور نہ ہی وہ کاغذات بلکہ اس سلسلے میں پلاننگ بنائی جاتی تھی اور حکومتوں کو ایسے راستے دکھائے جاتے تھے جس سے وہ غلط فہمیوں کا شکار ہو

جائیں اور پھر ان سے دولت بٹوری جاتی تھی۔ یہ منصوبہ بھی گینزہ کی پہاڑی پر ہی منظر عام پر آیا تھا۔ جس کے بعد میں تفصیلات معلوم ہوئی تھیں اور سب ششدر رہ گئے تھے۔ جنرل رحیم شاہ نے جب شاہ میر صاحب کو یہ بات بتائی تو شاہ میر صاحب کی بری حالت ہوئی۔

"اس طرح تو یہ سمجھ لیا جائے کہ میری ساری کوششیں داؤ پر لگ گئیں کیونکہ میں نے جس اعتماد کے ساتھ کام شروع کیا تھا۔ اس میں بہت بڑے بڑے لوگ ملوث ہو گئے تھے۔ جنرل رفیق بھی اسی میں شامل ہیں۔ میں کیا کروں، یہ ایسا مرحلہ آ گیا تھا کہ اب تو صوفی شاہ میر صاحب کی بھی مدد نہیں کر سکتا تھا اور اس کے بعد ایک سنسنی خیز انقلاب کا آغاز ہو گیا یعنی شاہ میر صاحب کو استعفیٰ دینا پڑا اور ان کا استعفیٰ منظور بھی کر لیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی جو رپورٹیں ملٹری انٹیلی جینس کی طرف سے موصول ہوئی تھیں ان میں جنرل رحیم شاہ کا نام بھی سامنے آیا تھا۔

بس جب انقلاب آتے ہیں تو اس طرح آتے ہیں جنرل صاحب کو ان تمام کارروائیوں پر سخت سرزنش کی گئی تھی اور انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ فوری طور پر ملک چھوڑ دیں۔ یہ سارے کام اس قدر تکلیف دہ تھے کہ ہر چہرہ شدت غم سے سکڑ گیا تھا۔ اب تک جو ہو رہا تھا وہ سب کا سب ختم ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ صوفی کو بھی طلب کر لیا گیا۔

"آپ جو کوئی بھی ہیں اور جس طرح بھی کام کرتے ہیں آپ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ اپنی حد میں رہیں۔ ملک کے معاملات میں کسی سویلین کا اس قدر داخل ہو جانا ملک کے لیے کس قدر خطرناک ہو سکتا ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ اگر آپ نے اس کے بعد ملکی معاملات میں اپنی ٹانگ پھنسائی تو آپ کو گرفتار کر کے ساری زندگی کے لیے جیل میں ڈال دیا جائے گا۔ آپ کو وارننگ دی جاتی ہے۔" ظاہر ہے صوفی اس بارے میں کیا جواب دے سکتا تھا۔ بس خاموشی ہی اختیار کر رکھی تھی لیکن جب جنرل رحیم شاہ اپنے اہل خاندان کے ساتھ ملک سے باہر جا رہے تھے تو صوفی نے ان سے کہا تھا۔

"گرین فورس قائم رہے گی سر! اور ہم اس وقت کا انتظار کریں گے جب آپ کو باعزت طریقے سے ملک کے اندر بلایا جائے گا جو کچھ ہوا یہ ملکوں کی تاریخوں میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہر ایک کا اپنا انداز فکر ہوتا ہے درویشوں کے کرم سے۔" جنرل رحیم شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا البتہ کچھ دیر کے بعد انہوں نے مسکرا کر کہا تھا۔

"یہ عہدہ مجھے راس نہیں آیا۔ بہت عرصے پہلے ایک نجومی نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ اگر میں ریٹائر نہ ہوا تو اپنے بدن کے کسی حصے سے محروم ہو جاؤں گا۔ ظاہر ہے کسی نجومی کے کہنے سے میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسی نجومی نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں اپنے عہدے کے بڑھ جانے کی فکر میں ہوں تو عہدہ بڑھتے ہی یا تو میں اس دنیا سے چلا جاؤں گا یا پھر اپنے منصب سے۔ بعض لوگ واقعی بڑی صحیح پیش گوئی کر دیتے ہیں۔"

"نہیں۔ جنرل رحیم شاہ! بہت جلد واقعات میں تبدیلی رونما ہوگی اور ہم آپ کو اسی ائیر پورٹ پر خوش آمدید کہیں گے۔" شدید سوگواری پھیل گئی تھی اور اس کے بعد بہت سے سوالات بہت سے خیالات منہ پھاڑ کر آ کھڑے ہوئے تھے اور یہ سوچنا پڑ گیا تھا کہ آئندہ کیا ہوگا۔ فیضان اور عادل کو تو فوراً ہی گرین فورس

سے نکل جانا پڑا تھا۔ جنرل رحیم شاہ کے ساتھ ہی انہیں بھی ملک چھوڑنا پڑا تھا کیونکہ وہ ان کے ساتھ ہی رہا کرتے تھے۔

غرض ایک بھیانک تبدیلی رونما ہوئی تھی جس کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ نئے وزیر داخلہ کبیر احمد شاہ صاحب نے صوفی کو طلب کر لیا۔ یہ صوفی کے بہت پرانے شناسا تھے اور اس کے مخالفوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ انہوں نے خفیہ طور پر اس بنگلے میں طلب کیا تھا۔

''ہوں۔ صوفی صاحب! آپ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آ رہے؟''

''درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''دیکھیے ملکی معاملات میں آپ کی مداخلت پسند نہیں کروں گا۔ آپ کو وارننگ تو مل ہی چکی ہے لیکن مجھے خطرہ ہے کہ آپ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئیں گے۔''

''تو ہمیں جیل میں ڈال دیجیے درویشوں کی دعاؤں سے۔ ہمارے لیے تو یہ ساری دنیا ہی ایک جیل ہے باہر نہ سہی اندر ہی سہی۔''

''نہیں۔ میں ایسا نہیں کروں گا لیکن آپ پر نگاہ رکھی جائے گی۔''

''معشوق نشیلے اور حسینہ بیگم کی موجودگی میں ایک میٹنگ ہوئی۔ صوفی نے حسینہ بیگم سے کہا۔

''اب اگر آپ چاہیں تو جا سکتی ہیں کیونکہ جنرل صاحب بھی اپنے اہل خاندان کے ساتھ ملک سے باہر چلے گئے ہیں۔''

''دھوبن نے کبھی کوئی کتا نہیں پالی۔'' معشوق نشیلے صاحب نے اعتراف کیا۔

''اے تم تو چپ ہی رہنا۔ تمہاری تو شکل دیکھ کر مجھے غصہ آتا ہے۔''

''فارسہ میں ایک شعر کہا ہے۔ میں نے اس موضوع پر۔''

''اس وقت معشوق نشیلے صاحب نہ فارسہ کے کسی شعر کی گنجائش ہے اور نہ آپ لوگوں کی چھیں چھیں کی۔ ہم لوگ ایک سنجیدہ مرحلے پر گفتگو کر رہے ہیں، اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ ہمیں اس کی اجازت دیں اور یہاں سے چلے جائیں۔''

''بڑے بے آبرا ہو کر کہاں سے ہم نکلے حسینہ بیگم!''

''بھاڑ میں سے...... اور یہ بے آبرا کیا ہوتا ہے؟''

''فارسہ میں آبرو کو برا ہی کہا جاتا ہے۔'' معشوق نشیلے نے کہا اور سنجیدہ ماحول کے باوجود ہر طرف قہقہے بکھر گئے۔ پھر حسینہ اور معشوق نشیلے دونوں ہی کو اس محفل سے برخاست کر دیا گیا۔ دلاور نے پوچھا۔

''صوفی صاحب! ہمارا رواں رواں آپ کے ساتھ ہے۔ ہمیں بتائیے ہمیں کیا کرنا ہے؟''

''دلاور میاں غلام قادر اور شازیہ جہاں معاملہ ہمارا آپس کا ہے تو اب تم لوگ تو دل و جان کے ساتھ ہو۔ بھلا تم سے علیحدگی کیا معنی رکھتی ہے۔ گرین ہاؤس والی عمارت ہماری اپنی ہے اور یہ بنگلہ بھی کرنل رحیم شاہ نے خرید لیا تھا ہمارے پاس ہی رہے گا جہاں تک آگے کے معاملات کا تعلق ہے، ہم اس سلسلے میں کام کریں گے۔''

''جی۔''

''فی الحال کچھ وقت آرام اس کے بعد یہ فیصلہ کہ آگے کیا کیا جائے گا؟ گرین ہاؤس میں شدید اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ گو بہت سے انتظامات کر دیے تھے لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ کبیر احمد شاہ صاحب اینٹی صوفی تھے اور انہوں نے سیدھی بات کر لی تھی کہ وہ صوفی کی نگرانی کریں گے۔ ایسے حالات میں بڑی احتیاط کی ضرورت تھی۔ صوفی نے ایک بار پھر گرین ہاؤس میں ایک میٹنگ منعقد کی اور کہا۔

''درویشوں کی دعائیں شامل حال رہنی چاہیں۔ زندگی میں یہ الٹ پھیر تو آتے ہی رہتے ہیں۔ فی الحال حالات ہمارے لیے سازگار نہیں ہیں لیکن بہت مختصر وقت کی بات ہے آپ لوگوں کو ذرہ برابر فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ جیسے معاملات یہاں چل رہے ہیں میں ذرا کھل کر بات کر لینے کا عادی ہوں۔ اخراجات کا جو سلسلہ ہے آپ لوگ بالکل فکر ہی نہ کریں یہ اخراجات یونہی چلتے رہیں گے۔

جنرل رحیم شاہ نے بہت کوشش کی تھی کہ وہ اپنے اثاثے مجھے دے جائیں لیکن میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا اور انہیں بھی اطمینان دلایا ہے کہ پیسے کی کمی ہمیں کبھی منتشر نہیں کرے گی، درویشوں کی دعاؤں سے...... تو میرے دوستو! ہم لوگ خود کمائیں گے خود کھائیں گے اور بلکہ میرے پاس بھی اچھے خاصے پیسے بے کار پڑے ہوئے ہیں اور میں ان کا اس سے بہتر مصرف اور کوئی نہیں سمجھتا کہ ہم لوگ آپس میں انہیں صرف کریں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی ان لوگوں کی تجوریاں کس کام آئیں گی جو جرائم کرتے ہیں اور عیش کرتے ہیں۔ ہمارے اخراجات ان کی تجوریوں سے چلیں گے۔

انداز بے شک تبدیل ہو جائے گا لیکن ضرورت ایجاد کی والدہ ہوتی ہے، درویشوں کے کرم سے۔ چنانچہ ہماری ضرورت وہ پوری کریں گے۔ ہاں ایسے جرائم پیشہ افراد کو کبھی معاف نہیں کیا جائے گا جو ہمارے ضمیر کے خلاف کام کر رہے ہوں۔ انہیں سرکاری تحویل میں پہنچنا ہوگا۔ سمجھ رہے ہیں ناں...... آپ لوگ! طریقہ کار میں بعد میں منتخب کروں گا۔ بہت عرصے سے پرانی بات ہے، جب میں نے ایک ادارہ قائم کیا تھا، اس کا نام ڈی جی ٹی لمیٹڈ تھا۔ بڑی کامیابی سے وہ ادارہ چل رہا تھا مگر اس پر بھی اسی طرح بم بلاسٹ کیا گیا۔ میں اس ادارے کو دوبارہ تو منظر عام پر نہیں لا رہا۔ لیکن اس سے ملتا جلتا ایک ادارہ ضرور قائم ہونا چاہیے۔ جس کے تحت ہم لوگ کام کریں گے۔

گرین ہاؤس میں تم لوگ اسی طرح رہو گے۔ یہاں کی ذمہ داریاں اپنی طرح پوری ہوتی رہیں گی اور ادھر ہمارا وہ دوسرا گھر وہ اسی طرح قائم رہے گا۔ حسینہ اور معشوق نشیلے اس گھر میں رہیں گے اور معاملات اسی طرح جاری رہیں گے۔ ویسے میں آپ لوگوں کو یہ بات بتا دوں کہ بہت مختصر وقت میں اس قسم کے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔''

جنرل رحیم شاہ واپس آئیں گے اور اسی طرح اپنی ذمہ داری سنبھالیں گے۔ وہ مستقل طور پر ہمارے سربراہ رہیں گے۔ یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں ہوئی ہے۔ بس یوں سمجھو کہ قدیم تاریخوں میں بھی ایسے معاملات ملتے رہتے ہیں، درویشوں کی دعاؤں سے۔ چنانچہ آپ لوگ اپنے اپنے طور پر آرام سے زندگی بسر کیجیے۔ میں بھی کچھ دن تک ممن خان کے ساتھ وقت گزاروں گا کیا خیال ہے؟''

"جیسا آپ پسند کریں چھوٹے بابا! ویسے آپ نے ایک جملہ کہا تھا میں تو اس پر غور کر رہی تھی۔"

"کیا......؟" صوفی نے سوال کیا اور شازیہ ایک لمحے تک خاموش رہی پھر بولی۔

"آپ نے کہا تھا ناں چھوٹے بابا ہم خود کھائیں گے، خود کمائیں گے، میرا خیال ہے کہ ہم میں سے ہر شخص یہ صلاحیت رکھتا ہے اور میرے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اس وقت دنیا کا بہترین کاروبار بھیک مانگنا بن چکا ہے۔ بھکاریوں کی ایک سائنس ہے چھوٹے بابا اگر میں چاہوں تو بھکاری آرگنائزیشن کی چیئر مین بن سکتی ہوں۔ بھیک مانگنے کے ایسے ایسے گر بتاؤں گی ان لوگوں کو کہ وہ لوگ اپنی ساری فن کاری بھول جائیں گے۔"

"نہیں شازیہ! یہ کام بڑے دکھ کا باعث ہے اور پھر ضرورت نہیں ہے۔"

"اور سر! میرا نام دلاور خان ہے۔ آپ حکم کریں کتنی رقم جمع کر دوں۔"

"ارے ماں قسم غلام قادر کو تم لوگ کیا سمجھتے ہو۔ گدھا گاڑی ایسوسی ایشن بنا کر لاکھوں کما سکتا ہوں۔" صوفی کے ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ نظر آئی۔ اس نے کہا۔

"سب لوگ اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے مگر مجھے ان میں سے کسی کی فن کاری نہیں چاہیے۔ تم لوگوں کو اخراجات کی کمی نہیں ہوگی۔ ایک وظیفہ پڑھوں گا۔ چلہ کاٹوں گا اور درجنوں مؤکل میرے گرد آ کھڑے ہوں گے۔ بھلا سوچو اس کے بعد پیسوں کی کیا کمی ہے؟ درویشوں کی دعاؤں سے۔ بہر حال وہ لوگ خوشگوار گفتگو کر رہے تھے۔ کیونکہ ذہنوں پر بوجھ تو تھا ہی لیکن حالات جب کروٹ بدلتے ہیں تو اسی طرح بدلتے ہیں۔ اس کے بعد صوفی نے نئے بنگلے میں آ کر حسینہ اور نشیلے کو بریف کیا۔

"ہمارے حلقے میں شادیوں کا کوئی رواج نہیں ہے۔ جب میں نے شادی نہیں کی تو معشوق نشیلے تم بھی شادی نہیں کرو گے، بشرطیکہ تم اس بنگلے سے تعلق رکھنا چاہو؟"

"میں کہتی ہوں اس موٹے مئے سے شادی کرے گا کون؟"

"حسینہ بیگم نہ چھیڑو آگ لگا دوں گا آشیانے کو؟"

"اے جا تیرا ستیاناس، آگ لگا اپنے منہ میں۔ ہمارے آشیانے کو آگ کیوں لگائے گا؟" اسی وقت دروازے کی بیل بجی تھی اور صوفی نے پر خیال انداز میں کہا تھا۔

"یہ کون آ گیا؟"

"میں دیکھتی ہوں۔" حسینہ باہر گئی اور الٹے قدموں میں واپس آ گئی۔

"وہی کھگا ہے؟"

"کھگا...... یہ کون ہے ہماری تو کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی درویشوں کے کرم سے۔"

"ارے وہی جمشید مرزا؟"

"اوہو...... اچھا کہاں ہیں؟"

"میں نے صورت دیکھ کر دروازہ دھڑ سے بند کر دیا۔ باہر کھڑا ہوا ہے۔" بیل پھر بجی تھی۔ صوفی نے گہری سانس لے کر کہا۔

"جاؤ۔ معشوق نشیلے تم دروازہ کھولو اور ذرا عزت کے ساتھ انہیں اندر لے جاؤ۔" کچھ لمحوں کے بعد صوفی ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ جمشید مرزا کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔

"صوفی صاحب! کیا میں آپ سے یہ سوال کر سکتا ہوں کہ آپ نے اس عورت کو یہاں کیوں رکھا ہوا ہے؟"

"تت...... توبہ کیجیے مرزا جی درویشوں کی دعاؤں سے۔ ہماری عزت پر انگلی نہ اٹھائیے۔"

"بہت بدتمیز عورت ہے۔ آپ میرا یقین کریں کہ جس دن میرا پارہ چڑھ گیا تو......"

"نہیں ہرگز نہیں۔ اگر آپ کا پارہ چڑھ گیا تو اسے شادی کا پیغام بالکل نہ دیجیے گا، کیونکہ اس کے بعد جو کچھ ہوگا میں اس کی ذمہ داری قبول نہیں کروں گا درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں۔"

"ہم بھی تو آپ سے سچ عرض کر رہے ہیں۔ جمشید مرزا صاحب!"

"گویا یہ اسی طرح بدتمیزی کرتی رہے گی؟"

"نہیں۔ اسے سمجھا دیں گے۔ آئندہ آپ کے ساتھ ذرا خیال رکھا کرے۔"

پانی پلوا دیجیے ذرا مجھے

"ہم خود لاتے ہیں۔" پانی پینے کے بعد جمشید مرزا نے صوفی کو دیکھا اور کہا۔

"یہ بات تو میرے علم میں تھی کہ آپ کا براہ راست تعلق شاہ میر صاحب سے تھا اور وہ کرنل رحیم شاہ صاحب جنہیں ملک بدر کر دیا گیا۔ اصل میں دیکھیے قانون کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی طور اپنے اوپر کسی کو قابو نہیں پانے دے سکتا۔ آپ لوگ قانون کے دائرہ اختیار سے نکل گئے تھے۔"

"جی ہاں۔ قانون کو ہم پر اختیار حاصل نہیں رہا تھا، درویشوں کی دعا سے۔" صوفی نے الفاظ سے کھیلتے ہوئے کہا اور جمشید مرزا صوفی کے الفاظ پر غور کرنے لگا، پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے کہا۔

"دلچسپ باتیں کرتے ہیں آپ صوفی صاحب!"

"درویشوں کا کرم ہے بس اور محبت ہے آپ کی مرزا جی!"

"ایک پیش کش ہے آپ کے لیے۔ ظاہر ہے یہ ذریعہ معاش ختم ہونے کے بعد آپ کو کسی ملازمت وغیرہ کی ضرورت ہوگی۔" صوفی نے غور سے جمشید مرزا کو دیکھا پھر بولا۔

"یہ باتیں صرف محبت کرنے والے ہی سوچ سکتے ہیں مرزا جی! آپ کے مزاج کو میں اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔ آپ اوپر سے سخت ہیں اندر سے نرم، آپ کی محبت کا بے حد شکریہ۔"

"نہیں۔ میں نے شکریہ کے الفاظ نہیں کہے ہیں۔ آپ کا کہنا درست ہے صوفی صاحب! محبت کرنے والے ہی کسی کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ ویسے میں آپ کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ آپ ذہین آدمی ہیں اور آپ نے دو تین معاملات میں میری مدد بھی کی ہے۔ جس کی وجہ سے میرے دل میں آپ کے لیے جگہ موجود ہے۔"

''شکریہ نہ ادا کروں تو اور کیا کروں درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے نیاز مندی سے کہا۔

''آپ میرے لیے کام کریں صوفی صاحب! مجھے محکمے سے کیس ملتے ہیں ہر طرح کے واقعات ہو[تے] ہیں آپ میرے ایجنٹ کے طور پر کام کریں۔ میں آپ کو آپ کے کام کا معاوضہ دوں گا۔ ایک اچھا معاوضہ۔''

''غور کرنے کا موقع مرحمت فرمایئے۔'' صوفی نے کہا۔

''بھلا اس میں غور کرنے کی کیا بات ہے؟ آپ یوں سمجھئے کہ آج سے آپ میرے ملازم ہو[گئے] ہیں۔ میں آپ کو ایک بہتر معاوضہ ادا کروں گا۔''

''آپ تو کانٹوں پر گھسیٹ رہے ہیں۔'' جمشید مرزا تھوڑی دیر تک صوفی کو مختلف ہدایات دیتا رہا اور اس کے بعد چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سہیل احمد اور ٹارزن بھی آ گئے تھے۔ سہیل عالم نے مسکرا[تے] ہوئے کہا۔

''آپ یقین کریں صوفی صاحب! میں منحوس نہیں ہوں یہ نہ سمجھیں کہ میری آمد......''

''درویش تم پر رحم کریں۔ ہم سے بڑا منحوس تو اس دنیا میں آیا ہی نہیں۔ بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہیں آپ سہیل عالم صاحب!''

''نہیں واقعی دیکھیے۔ دو عجیب واقعات ایک ساتھ ہوئے ایک تو وہ تنظیم فراڈ نکلی اور ہم [بڑے] خاصے چکر میں آ گئے، لیکن صوفی صاحب! میں یہ آپ کے لیے لے کر آیا ہوں۔'' سہیل نے کہا اور ٹارزن کی طرف رخ کیا۔ ٹارزن نے وہ بریف کیس سہیل کے سامنے کر دیا جو گینترا کی پہاڑیوں سے سہیل عالم نے اٹھایا تھا۔

''یہ وہی سوٹ کیس ہے جو؟''

''ہاں، ہاں مجھے معلوم ہے۔ یہ میرے ذہن میں تھا، لیکن میں نے سوچا کہ شاید وہیں ضائع ہو گیا''

''اچھی رقم ہے، خاصے دن تک ساتھ دے جائے گی لیکن صوفی صاحب آپ اگر حکم دیں تو احمد عالم صاحب سے رجوع کر لوں۔ ان کی طرف سے مجھ پر مسلسل دباؤ بڑھ رہا ہے کہ میں ان کی خد[مت] میں آ جاؤں، ایک اچھا ذریعہ ہاتھ آ جائے گا۔''

''کیوں بھئی کیوں؟ ہمارے لیے کیوں؟ ارے بابا پوری زندگی گزارنی ہے۔ اسی دشت کی [سیاحت] میں اور وہ جو ایک مقولہ ہے درویشوں کی دعاؤں سے کہ چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جا[تا]۔ تھوڑا سا انتظار کر لو۔ کچھ کر لیں گے اب ہم اس قدر بے دست و پا بھی نہیں ہیں درویشوں کا سایہ چاہی[ے] ہے۔ ویسے لگتا ہے کہ تم درویشوں سے متاثر نہیں ہو۔''

''ایسی بات نہیں ہے صوفی صاحب! میں آپ سے متاثر ہوں۔ سو آپ سے متعلق ہر شخصیت [سے] متاثر ہوں۔''

''درویش تمہیں اپنی پناہ میں رکھیں۔ بے فکر رہو، تھوڑا سا وقت گزار لو۔ رابطے تو ہمارے [درمیان] رہیں گے ہی، کریں گے کچھ نہ کچھ۔ بے فکر ہو جاؤ۔'' صوفی نے مستانہ وار کہا اور سہیل عالم خاموش ہو گیا۔

♥......♥......♥

''خوب ہنگامہ آرائیاں ہو رہی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کرنل رحیم شاہ کا ملک سے باہر چلے جانا بڑا المیہ تھا۔ لیکن صوفی نے سب کو یقین دلایا تھا کہ بہت جلد رحیم شاہ واپس آ جائیں گے۔ وہ کوئی ایسا الٹا چکر پھیرے گا کہ سارے کام ٹھیک ہو جائیں گے اور پھر ممن خان والی گلی اور گرین فورس کے تینوں ممبران...... لطف ہی آ گیا تھا۔ قوالیاں ہوتی تھیں غلام قادر کا رقص دیکھنے کے قابل ہوتا۔ اب تو شازیہ کو بھی ان محفلوں میں مزہ آنے لگا تھا۔ دلاور بھی مدھم مدھم سی مسکراہٹوں کے ساتھ شریک رہتا تھا۔ صوفی کی اپنی حرکتیں بھی اپنے عروج پر پہنچی ہوئی تھیں۔ اکثر شازیہ، غلام قادر اور دلاور سے کہتی۔

''تم لوگ یقین کر لو، اگر گینترا کی پہاڑیوں میں تم چھوٹے بابا کا عمل دیکھ لیتے تو یقین کرو کہ دنگ رہ جاتے۔ کیا دلیری تھی ان کے انداز میں۔ ساتھ تو میں نے بھی دیا لیکن اس یقین کے ساتھ کہ میری زندگی کا اختتام یہیں ہو مگر چھوٹے بابا، ان کے انداز سے یوں لگتا تھا کہ جیسے ماحول پر ان کی حکمرانی ہو اور اس وقت دیکھو کیسا شیروانی اٹھا اٹھا کر ناچ رہے ہیں۔ کافی دیر تک صوفی کی یہی کیفیت رہی۔ ادھر باقی تمام افراد بھی اپنے اپنے طور پر زندگی گزار رہے تھے۔ معشوق نشیلے کو خاص طور سے اب اس کوٹھی میں رکھ دیا گیا تھا جو رحیم شاہ صاحب نے خرید کر دی تھی۔ حسینہ کی معشوق نشیلے سے جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں اور اس سے ایک دلچسپ ماحول بن جاتا تھا۔ معشوق نشیلے نے اب حسینہ سے عشق لڑانا چھوڑ دیا تھا اور حسینہ کو اس بات پر بھی غصہ تھا۔

''یہ تم چوبیس گھنٹے گھر میں کیوں رہتے ہو، کچھ کام دھندا کرو۔''

''کیا تم میرے بچوں کی ماں ہو؟'' معشوق نشیلے نے غصیلے لہجے میں کہا اور حسینہ اس بات پر غور کرنے لگی پھر اچانک ہی اس نے جھک کر پاؤں سے جوتی نکال لی۔

''شادی نہ بیاہ بچوں کی ماں کیسے کہا تم نے مجھے۔''

''بچے کہاں ہیں؟'' معشوق نشیلے نے حسینہ بیگم کے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا اور حسینہ بیگم بھی بے اختیار پیچھے کی جانب مڑ گئیں معشوق نشیلے غڑاپ سے دروازے سے باہر نکل گئے تھے۔ حسینہ بیگم کو پھر خیال آیا تو وہ جوتی لیے لیے باہر نکلیں لیکن باہر معشوق نشیلے کا کوئی پتا نہیں تھا۔

♥......♥......♥

آخر کار صوفی نے کچھ سوچ لیا۔ ایک بھری پری سڑک پر ایک دکان لی گئی۔ اس میں الماریاں بنوائی گئیں۔ خواتین کے لیے پردے کا انتظام کیا گیا اور الماریوں میں بوتلیں سجا دی گئیں۔ کسی پر معجون، کسی پر خمیرہ، کسی پر بنفشہ سفید، کسی پر عرق بلبل، چاروں طرف لیبل لگی بوتلیں سج گئی تھیں۔ باہر ایک بورڈ لگا تھا جس پر لکھا تھا۔ ''حکمت۔''

سب سے پہلے سہیل عالم نے ہی وہ دکان دیکھی تھی۔ صوفی اپنی قدیم شیروانی اوڑھے ڈھیلے پاجامے میں ملبوس پان کی گلوری منہ میں دبائے، میز کے پیچھے رکھی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میز پر ایک چھوٹی سی تختی رکھی ہوئی تھی جس پر لکھا تھا۔ جناب قبلہ حکیم صاحب! سہیل عالم کار روک کر ٹارزن کو کار میں بیٹھنے کا اشارہ کر کے دکان میں داخل ہو گیا۔ صوفی کے گالوں کے گڑھے پان کی گلوری سے بھرے ہوئے تھے۔ سہیل عالم نے میز کے نیچے جھانک کر دیکھا اور پھر تانبے کا اگال دان سامنے کرتے ہوئے بولا۔

''تمام ساز وسامان اس میں الٹ دیجئے۔''

''قم قم...... بم بم...... غم غم۔''صوفی نے عاجزی سے کہا۔

''میں کہتا ہوں یہ کیا ہے سب کچھ؟''

''قم قم...... بیم بیم۔''

''آپ براہ کرام پلیز! نکالیے سب کچھ۔''سہیل عالم نے اگال دان آگے کرتے ہوئے کہا اور پھر غلاظت کا آتش فشاں پھوٹ پڑا اور پان کی ساری پیک مع اس کے ملغوبے کے اگال دان میں منتقل ہوگئی۔''

''یہ دکان حکمت کیا ہے۔''

''عزیزی دکان حکمت ہے۔ ہم نے باقاعدہ حکمت پڑھی ہے۔ وہ دیکھو ہمارے سٹرفکیٹ لٹکے ہوئے ہیں۔ صوفی نے ایک طرف اشارہ کیا۔ تین فریم لٹکے ہوئے تھے جن میں صوفی کے لیے سندیں تھیں۔ ں نے واقعی حکمت کے بڑے بڑے امتحانات پاس کیے تھے۔

''صوفی صاحب! آپ کیا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا لیکن یہ بات پ ضرور ذہن نشین کرلیں۔ میں یہ سب کچھ آپ کو نہیں کرنے دوں گا۔''

''احمق ہو...... نامعقول ہو...... بے وقوف ہو...... درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''اگر درویشوں کی دعاؤں سے یہ سب کچھ ہے تو مجھے اعتراض نہیں ہے۔''سہیل عالم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اگر تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ میں مالی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے یہ سب کچھ کررہا ہوں تو میرے عزیز یہ خیال دل سے نکال دو۔ مجھے تمہاری محبتوں کا سہارا کافی ہے۔ دولت ہمیشہ میری جوتوں سے چمٹی رہی ہے اور میں نے کبھی اس کی نہ پروا کی نہ ضرورت محسوس کی۔ جب بھی مجھے جتنی بھی رقم کی ضرورت ہوتی ہے بس یوں سمجھ لو کہ درویشوں کی دعاؤں سے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ اس وقت صوفی کے چہرے سے ایک نقاب سی سرک گئی تھی اور سہیل عالم اسے غور سے دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

''مجھے یقین ہے صوفی صاحب۔''

''ہم سارے کام کریں گے سہیل واقعات کی نوعیت پر غور کرو۔ کبیر احمد شاہ صاحب میرے دیرینہ مخالف ہیں۔ اس وقت بھی انہوں نے مجھے بدترین نقصانات پہنچائے تھے۔ بس ہوتا ہے، اگر یہ الٹ پھیر نہ ہو درویشوں کی دعاؤں سے تو پھر زندگی میں مزہ ہی کیا رہے۔ ہم ایک یکساں لکیر پر چلتے رہیں۔ تم اطمینان سے اپنی زندگی گزارو۔ لاتعداد دلچسپیاں ہیں اس ملک میں تمہارے لیے اور سنو! میں بالکل یہ بات نہیں کہوں گا کہ تم اپنے والد سے اس لیے رابطہ کرو کہ ان کے ذریعے تمہاری ضروریات پوری ہوں، لیکن باقی سب ٹھیک ہے۔ دولت کی اگر تمہیں جب بھی ضرورت پیش آئے چونکہ تم گرین فورس کے ممبر ہو اس لحاظ سے تم مجھ سے کہہ سکتے ہو۔''سہیل عالم مسکرا دیا تھا۔ اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے صوفی صاحب!''

دکان حکمت کو باکمال ہونا ہی چاہیے تھا، کیونکہ صوفی اسے چلا رہا تھا۔ مریض آتے تھے۔ صوفی

ان کا جائزہ لیتا تھا۔ دوا دیتا تھا۔ اور وہ ٹھیک ہو جاتے تھے پھر تھوڑی سی تبدیلی یہ ہوئی معشوق نشیلے دکان پر بیٹھنے لگے۔ وہ دوا ساز تھے۔ حکیم صاحب قبلہ نبض دیکھتے تھے۔ دوائیں تجویز کرتے تھے نسخے لکھتے تھے اور معشوق نشیلے یہ نسخے تیار کرتے تھے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا پھر جمشید مرزا کو صوفی کی ضرورت پیش آ گئی اور معلومات حاصل کرتا ہوا وہ یہاں تک آ گیا۔

''یہ کیا لغویت ہے؟''اس نے دکان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''دکان حکمت ہے، اگر آپ کو کوئی تکلیف ہو تو بتایئے؟''

''توبہ، توبہ۔ میں جانتا ہوں کہ آپ سے علاج کرا کے نہ مرض رہے گا نہ مریض۔ خیر میں سمجھ گیا یہ چکر کیوں چلایا ہے آپ نے۔ بات میرے علم میں آ گئی ہے۔ صوفی صاحب!''

''ہمارے علم میں نہیں آئی دویشوں کی دعاؤں سے۔ پان نوش فرمایئے گا۔''صوفی نے پانوں کی ڈبیا کھولتے ہوئے کہا۔

''بند کیجئے اسے۔ میں آپ کو یاد دلاؤں کہ آپ میری ماتحتی میں کام کررہے ہیں۔''

''جی۔''صوفی حیرت سے بولا۔

''جی ہاں۔ مجھے علم ہے کہ آپ کو باقاعدہ حاضری کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ آڑ بنائی ہے آپ نے اور یہ اچھا کیا میرے ذہن میں ایسا کوئی خیال نہیں آیا تھا۔ اچھا خیر آپ کو میرے ساتھ چلنا ہے۔ ایک کیس ملا ہے۔''

''کک...... کہاں چلنا ہے۔''

''آپ ذرا وہاں سامنے جا کر بیٹھے۔''جمشید مرزا نے معشوق نشیلے سے کہا۔

''وہ...... جج...... جناب! اصل میں فارسہ میں کہا ہے۔''

''جاتے ہو یا تمہیں فارسہ میں ہتھکڑیاں لگا دوں۔''

'ایک تو پولیس کا یہ رویہ بہت ہی دل سوز ہے۔ آپ لوگ مجرم کے ساتھ تو خیر جو سلوک کرتے ہیں وہ کرتے ہی ہیں، لیکن سخت گیری آپ کا مزاج بن گئی ہے فارسہ میں۔''

''جمشید مرزا اپنی جگہ سے اٹھا اور معشوق نشیلے جلدی سے باہر نکل گئے۔ جمشید مرزا نے صوفی کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بہت سے منصوبے بنائے ہیں میں نے اس دوران۔ بات اصل میں یہ ہے صوفی صاحب کہ دنیا اس وقت ایک ہی ڈگر پر چل رہی ہے۔ دولت، دولت، دولت۔ رقم بناؤ زندگی عیش سے گزارو۔''

''حق اللہ......''صوفی نے کہا۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم پرائیویٹ کیس لیں گے، یعنی ایسے کیس جو آئیں گے تو پولیس کے پاس لیکن ہم ان کے وہ پہلو دیکھیں گے جہاں سے وہ دوسرا راستہ اختیار کریں اور اس طرح دولت بنائیں گے۔ جہاں پولیس کی مداخلت کی ضرورت پیش آئے گی، میں آپ کی مدد کروں گا۔ کہیے کیسا......''

''در...... درویش رحم کریں۔''

''درویش بالکل رحم کریں گے۔ آپ دیکھئے اب تک آپ جو کرتے رہے ہیں یہ سب کچھ اس

سے کہیں زیادہ بہتر رہے گا۔ آپ یہ لیجئے یہ موبائل فون رکھئے۔ یہ میری طرف سے آپ کا تحفہ ہے۔ اس کا نمبر نوٹ کر لیجئے آپ کے ذہن میں رہے گا۔"

"نن...... نہیں ہمارے ہمارے پاس......"

"صوفی صاحب! یہ میرے اور آپ کے درمیان معاہدے کی پہلی شق ہے۔" جمشید مرزا نے کہا۔

"درویش رحم کریں۔"

"بس دیکھئے تو سہی ہوتا کیا ہے؟ بھول جائیں گے آپ کرنل رحیم شاہ کو۔"

"جنرل...... جنرل۔"

"ارے بابا! ایسے خود ساختہ عہدے آپ جتنے کہیں میں آپ کو دے دوں، کیا سمجھے آپ" جمشید مرزا نے کہا پھر بولا۔

"میں آپ سے فوراً رابطہ کروں گا۔ ہمیں عادل نگر چلنا ہوگا۔ یہ بالکل پرائیویٹ کیس ہے۔ فی الحال اس کا پولیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بس سمجھ لیجئے ایک ذاتی سا معاملہ ہوگا۔ او کے میں چلتا ہوں۔ اللہ حافظ۔" جمشید مرزا نے کہا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنی پولیس کار تک پہنچ گیا۔ وردی میں تھا، قرب و جوار کے لوگ ان قبلہ حکیم صاحب کے بڑے معتقد ہو گئے تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ ان میں سے کچھ نے ان سے علاج بھی کرایا تھا اور بڑے فائدے حاصل کیے تھے پھر وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ بہت بڑے بڑے لوگ کاروں میں آتے ہیں اور قبلہ حکیم صاحب کی حکمت سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

بہرحال معشوق نشیلے واپس آ گئے۔ منہ پھولا ہوا تھا۔ کہنے لگے۔

"صوفی صاحب! ہماری نگاہوں میں تو آپ اتنے ہی بڑے آدمی ہیں فارسہ میں کوئی پولیس والا ہو یا کوئی اور یہ سب آپ پر رعب کیوں جما لیتے ہیں۔"

"درویشوں کی مرضی ہم کیا کہیں؟"

"یہ تو بے عزتی ہوتی ہے؟"

"ہمارا خیال ہے ہماری کوئی عزت نہیں ہے جو چیز نہیں ہے اس کی کیا پروا کی جائے۔ آرام سے اپنا کام کرو۔ یہ جو صاحب ہیں ناں پولیس افسر بے فکر رہو اگر واقعی ضرورت پیش آ گئی تو پھر......" صوفی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

بہرحال معاملات جیسے بھی تھے صوفی نے کبھی کسی مرحلے پر کسی بات کی پروا کی ہی نہیں تھی۔ دکان حکمت، ممن خاں کا ہوٹل، پان گھر، گرین ہاؤس، حسینہ بیگم پہلے تو سب کچھ محدود تھا لیکن اب اس کے بعد بہت سے مسئلے پھیل گئے تھے اور صوفی جانتا تھا کہ ان مسائل سے کس طرح نمٹنا ہے۔ دکھ تھا رحیم شاہ صاحب کا جن کے ساتھ شدید ناانصافی ہوئی تھی۔ مگر ایسا ہی ہوتا ہے۔ بھولنے والے لمحوں میں بہت کچھ بھلا دیتے ہیں۔ رحیم شاہ اگر چاہتے تو اسے پچھلے عہدے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر طرح کی مراعات حاصل کر سکتے تھے لیکن وہ خود بھی صاحب ظرف آدمی تھے اور پھر ہر چیلنج کو قبول کرنا ان کی فطرت کا ایک حصہ تھا۔ اگر خود ہی پسند نہ کرتے تو بھلا کس کی مجال تھی۔ جو انہیں ملک سے باہر بھیج دیتا، لیکن صوفی سے انہوں نے یہی کہا تھا

کہ زندگی میں اگر تبدیلیاں ہوتی رہیں تو زندگی کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ ایک ہی ڈگر پر چلتے رہنا سمجھ کے بہت سے راستے روک دیتا ہے۔ میں خود بھی جاننا چاہتا ہوں یہاں کی صورت حال آپ کس طرح سنبھالیں گے؟ صفی صاحب! یہ بات مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔ آ جائیں گے تھوڑے عرصے میں واپس اور اس کے بعد وہی شب و روز۔"

صوفی بھی یہ بات اچھی طرح جانتا تھا اس وقت دکان بند کر کے وہ گرین ہاؤس ہی پہنچا تھا۔ شازیہ، دلاور، گلام قادر اور ان کا خاندان گرین فورس میں خوش حال زندگی گزار رہا تھا۔ شازیہ نے کہا۔

"چھوٹے بابا! کچھ کرنا چاہیے؟ زندگی ذرا بے کیف سی ہو گئی ہے۔"

"یہ صرف احساس ہے تمہارا شازیہ! زندگی کبھی بے کیف نہیں ہوتی۔ ہر بدلتی ہوئی شب، ہر بدلتا ہوا دن، نئی کیفیتوں کا حال ہوتا ہے۔ تھوڑا سا وقت سکون سے گزار لو اس کے بعد پھر وہی ہنگامہ پرور زندگی۔ زندگی تو ہے ہی ہنگاموں کا نام درویشوں کی دعاؤں سے۔ ویسے جمشید مرزا صاحب میرا خیال ہے مجھے پھر سے عامل کرنا چاہتے ہیں۔ سوچا تھا کچھ عرصے اپنی حکمت کی پریکٹس کو بڑھاؤں گا لیکن انہوں نے زبردستی مجھے اپنا ملازم بنا لیا ہے۔"

"ایس پی صاحب!"

"ہاں۔" صوفی نے کہا اور شازیہ کو ساری تفصیل بتا دی۔ شازیہ ہنس پڑی تھی۔ صوفی نے اسے موبائل دکھاتے ہوئے کہا۔

"یہ موبائل بھی عنایت فرمایا گیا ہے۔" کافی دیر تک شازیہ ہنستی رہی تھی پھر اس نے گردن جھٹک کر کہا۔

"چھوٹے بابا! ایک کام کریں آپ ان کی ملازمت قبول کر لیں اور اس کے بعد ان کی وہ درگت بنائیں کہ وہ زندگی بھر یاد رکھیں۔"

"حق اللہ، حق اللہ، حق اللہ۔" موبائل پر جمشید مرزا کا فون موصول ہوا۔

"آپ تیار ہیں صوفی صاحب!"

"کشتی لڑنی ہے کسی سے؟"

"نہیں۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ عادل پور چلنا ہوگا۔ بس میں ذرا انتظار کر رہا تھا۔ آپ ایسا کریں کہ دکان سے اٹھ جائیں۔ گھر جا کر تیاریاں کریں۔ میں آپ کو گھر سے ہی پک کر لوں گا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر پہنچ رہا ہوں۔"

"در...... درویش رحم کریں۔" صوفی نے کہا۔ پھر دوسری طرف سے فون بند ہو گیا تھا۔ دکان پر بیٹھا ہوا تھا۔ معشوق نشیلے ایک کونے میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ صوفی نے انہیں آواز دی تو وہ چونک پڑے۔

"جی۔"

"میرا خیال ہے مجھے کچھ دن کے لیے شہر سے باہر جانا ہوگا اس دوران آپ دکان سنبھالیں گے۔"

"یہ کوئی سوال ہے فارسہ میں۔"

"خیال رکھیے گا، مریض آئیں تو ان سے کہہ دیجئے گا کہ حکیم صاحب کام سے گئے ہوئے ہیں۔"

معشوق نشیلے نے گول مول انداز میں گردن ہلا دی تھی۔

بہر حال صوفی جو یہاں اپنی مشہور زمانہ موٹر سائیکل پر آیا کرتا تھا۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے چل پڑا۔ حسینہ نے دروازہ کھولا تھا اور مسکراتے ہوئے صوفی کو اندر آنے کا راستہ دیا تھا۔

"کہیے حسینہ بی بی! کیسی گزر رہی ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے مئوے مردودوں سے نجات مل گئی ہے اور ایک کام تو تم نے بہت بڑا کیا ہے مرزا صاحب! وہ یہ کہ اس فارسہ کو یہاں سے لے گئے۔ اس کا یہاں سے چلے جانا سمجھ لو میری نئی زندگی بن گیا ورنہ کم بخت خون کرنا پڑتا۔"

"خون خرابے سے گریز کیا کیجیے۔" صوفی نے کہا اور اندر پہنچ گیا پھر اس نے اپنے طور پر تیاریاں کیں۔ دو تین جوڑے کپڑے بیگ میں رکھے اور ذرا قدرے صاف ستھری شیروانی اور پاجامہ نکال لیا۔ پان دان کھول کر گلوریاں بنائیں اور ڈبیا میں رکھ لیں۔ اس کے بعد وہ کچھ اور تیاریاں کرنے لگا۔ ایک گھنٹے بعد بیل بجی اور جمشید مرزا اندر داخل ہوگیا۔

"آپ تیار ہیں؟"

"درویشوں کے کرم سے۔"

"وہ صوفی صاحب کوئی سوٹ وغیرہ نہیں ہے آپ کے پاس بہتر ہوتا کہ سوٹ پہن لیتے۔ اس میں...... میرا مطلب ہے اس لباس میں؟"

"ہمیں تو صرف اس بات کا افسوس ہے ایس پی صاحب کہ ہم اس لباس میں پیدا کیوں نہ ہوئے۔ بس اسی پر آج تک شرمندہ ہیں۔ باقی سب خیریت ہے درویشوں کے کرم سے۔"

"میں سمجھتا تھا آپ بھی ضدی آدمی ہیں، بہر حال آیئے۔"

"ہمارا یہ سفر خاصا پرائیویٹ معلوم ہوتا ہے؟" صوفی نے جمشید مرزا کے لباس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

جمشید مرزا نے اپنا حلیہ ہی بدل لیا تھا۔ ایک خوب صورت سفاری سوٹ میں ملبوس تھا اور لگتا تھا کہ چہرے کی بھی خاصی مرمت کرائی ہے۔ بالوں کا اسٹائل بھی خاصا تبدیل ہوگیا تھا۔ ایک نگاہ میں دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو چھلانسپر و بنانے کی کوشش کی ہے۔ کار بھی نئی اور خوب صورت تھی۔ پتا نہیں اس کی اپنی تھی یا کسی سے ادھار مانگ لایا تھا۔ بہر حال اس سج دھج میں وہ صوفی کے پاس پہنچا تھا۔

"ڈرائیونگ میں کروں گا اور آپ پچھلی سیٹ پر بیٹھ جایئے۔" جمشید مرزا نے رعونت کا مظاہرہ کیا۔ صوفی کو وہ اپنے برابر جگہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ صوفی ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پیچھے بیٹھ گیا۔ جمشید مرزا اسی زمانے کا انسان تھا۔ کچھ دن پہلے جب صوفی نے اس کے لیے ایک دو مسئلے حل کیے تھے، وہ صوفی کے قدموں میں بیٹھنا پسند کرنے لگا تھا لیکن اب اسے پتا چل گیا تھا کہ صوفی کا اقتدار ختم ہو چکا ہے چنانچہ شاید وہ اپنے پرانے بدلے لے رہا تھا چونکہ شاہ میر صاحب کی وجہ سے اسے کئی بار صوفی کے سامنے پست ہونا پڑا تھا لیکن صوفی اس طرح کا انسان ہی نہیں تھا۔ درویشوں سے عقیدت نے اس کے اندر بڑی حلیمی پیدا کر دی تھی اور وہ معمولی معمولی باتوں کو اہمیت نہیں دیتا تھا۔ جمشید مرزا پہلے تو صوفی کے بولنے کا منتظر رہا پھر اس نے خود ہی کہنا شروع کر دیا۔

"عادل پور میں ہم لوگ ایک بہت بڑے رئیس آدمی کے ہاں جا رہے ہیں۔ رائے راحیل عادل پور کے نواحات میں پھیلی ہوئی ہزاروں ایکڑ زمین کا مالک ہے۔ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اس نے دنیا کے بیشتر ممالک میں گزارا ہے۔ بڑی اچھی عزت اور حیثیت والا آدمی ہے۔ کسی مشکل میں گرفتار ہے پھر پولیس سے براہ راست مدد نہیں لینا چاہتا، کسی ذریعے سے اسے میرے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں اور یہ پتا چلا کہ میں خصوصی ذہانتوں کا مالک ہوں اور اس کا مسئلہ حل کر سکتا ہوں چنانچہ اس نے ایک پیش کش کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ پچاس لاکھ روپے تک خرچ کرنے کو تیار ہے اگر اس کی مشکل حل کر دی جائے تو صوفی صاحب! میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ کے مسائل کا حل میں دوں گا۔ آپ سمجھ لیجیے یہ اس حصے کی پہلی کڑی ہے۔ آپ ذرا غور کیجیے پچاس لاکھ میں سے دس لاکھ آپ کو مل جائیں تو آپ کے تو سالہا سال کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔"

"درویش رحم کریں۔"

"ذرا اپنے آپ کو سنبھالے رکھیں۔ انسان کو اپنی حیثیت بنانے کے لیے خود کو لیے دیے رکھنا پڑتا ہے۔ آپ کو بھی صوفی صاحب میرے خیال میں یہی کرنا چاہیے۔"

"یعنی خود کو لیے دیے رکھنا ہے ہمیں۔"

"بالکل بالکل، اسی میں بہتری ہوتی ہے۔"

"بہت بہتر۔ جیسا آپ کا حکم ہوا ویسا ہی کریں گے۔"

"نہیں نہیں حکم کی بات نہیں ہے۔ میں نے ایک مناسب بات بتائی ہے آپ کو۔"

"مشکل کیا ہے رائے صاحب کو۔"

"تفصیل تو وہیں جا کر پتا چلے گی۔"

"وہ آپ کے بھی شناسا نہیں ہیں۔"

"ہاں۔ صورت آشنائی نہیں ہوئی ہے لیکن ٹیلی فون پر ان سے تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ انہوں نے اپنی مشکل بتا دی ہے۔"

"ٹھیک۔ اچھی بات ہے مشکل کیا ہے؟"

"میں نے کہا نا بس یہ کہا ہے انہوں نے کہ انہیں خفیہ طور پر مدد درکار ہے اور کوئی ذہین پولیس آفیسر ہی ان کی یہ مشکل حل کر سکتا ہے۔ صوفی خاموش ہو گیا کہنے کو تو بہت کچھ دل چاہ رہا تھا لیکن خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔

بہر حال عادل پور تک کا سفر جاری رہا تھا۔ تین ساڑھے تین گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک جمشید مرزا خود گاڑی چلاتا رہا اور اس کے بعد اس نے کہا۔

"سیدھی سڑک ہے اور میرا خیال ہے آپ کی ڈرائیونگ اتنی بہتر تو ہو گی۔"

"جی۔" صوفی نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ اس بار جمشید مرزا سامنے ہی بیٹھا ہوا تھا یعنی صوفی کے

برابر۔ کوئی آدھے گھنٹے کا سفر مزید طے ہوا تھا کہ سامنے سڑک پر ایک کار کھڑی ہوئی نظر آئی۔ اس کے سائیڈ گارڈ سے ٹیک لگائے ایک لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔

''ارشاد فرمائیے۔ کیا کروں نکل چلوں درویشوں کی دعاؤں سے۔'' جمشید مرزا نے سامنے چونک کر دیکھا پھر جلدی سے بولا۔

''نہیں نہیں۔ روکیے، روکیے کوئی خاتون ہیں۔ خواتین کی مدد کرنا ہمارا اخلاقی فرض ہے۔'' جمشید مرزا جلدی سے چیخا۔ دور ہی سے اس اسمارٹی کا جائزہ لے لیا تھا۔ چست پتلون، گلابی رنگ کا اپر اخروٹی رنگ کے بال، سرخ وسفید چہرہ، آنکھوں پر جدید ساخت کی عینک، ایسی کوئی شکل نظر آجائے تو بھلا جمشید مرزا کو قرار رہ سکتا تھا۔ جوں جوں کار قریب پہنچتی جارہی تھی۔ لڑکی کے دل کش نقوش نمایاں ہوتے جارہے تھے۔ وہ زور زور سے کار روکنے کے لیے ہاتھ ہلا رہی تھی۔ صوفی نے کار اس کی کار سے آگے نکال کر دس قدم پر روک دی اور بولا۔

''آپ صورت حال دریافت فرمالیجیے گا درویشوں کی دعاؤں سے۔'' جمشید مرزا نے کار کا دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی۔ وہ بہت زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ لمحے کے بعد وہ لڑکی کے قریب پہنچ گیا۔

''ہیلو'' اس نے کہا اور لڑکی اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور بڑے ناز سے بولی۔

''ہیلو''

''خیریت کیا ہوا؟''

''خیریت ہوتی تو میں آپ کو یہاں کھڑی نظر آتی۔''

''کیا ہوا ہے؟''

''ریڈی ایٹر جل گیا ہے۔ کار اسٹارٹ نہیں ہورہی۔''

'اوہو۔ اوہو۔ ذرا بونٹ کھولیے۔'' جمشید مرزا نے زبردستی کی۔ وہ بھلا جلے ہوئے ریڈی ایٹر کا کیا کر سکتا تھا۔ لڑکی نے اندر جا کر بٹن دبایا اور بونٹ کھل گیا۔ جمشید مرزا نے ہاتھ سے صوفی کو بھی اشارہ کیا تھا۔ صوفی اتر کر جمشید مرزا کے پاس پہنچ گیا۔

''ان کا ریڈی ایٹر جل گیا ہے۔ بتائیے کیا کریں؟'' جمشید مرزا نے صوفی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ لڑکی بھی بونٹ کا بٹن کھول کر ان کے برابر آ کھڑی ہوئی تھی۔

''یہ ریڈی ایٹر سے چلتی ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے سوال کیا اور جمشید مرزا ایک دم سنبھل گیا، البتہ لڑکی نے چشمہ ناک پر رکھ کر صوفی کو غور سے دیکھا تھا پھر بولی۔

''ڈرائیور خاصا حاضر جواب معلوم ہوتا ہے آپ کا۔''

''دیکھیں بھئی کیا کرنا ہے؟'' جمشید مرزا نے صوفی سے کہا اور صوفی بونٹ کی طرف جھک گیا۔

''میں ایک گھنٹے سے پریشان ہورہی ہوں یہاں''

''اکیلی نکلی ہی کیوں تھیں آپ!'' جمشید مرزا بولا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا۔''

''نن، نہیں میرا مطلب ہے کہ لانگ ڈرائیو پر کسی کو ساتھ تو ہونا چاہیے تھا۔ اصل میں ڈرائیور بیمار ہوگیا تھا۔ میں اس سے پوچھے بغیر گاڑی نکال لائی۔ یقیناً ریڈی ایٹر میں پانی نہیں تھا۔ لڑکی نے کہا۔

''آپ فکر مند نہ ہوں ہم کچھ نہ کچھ کریں گے آپ کے لیے۔''

''ایک گھنٹے سے کھڑے کھڑے دماغ خراب ہوگیا اس طرف سے تو ٹریفک گزرتا ہی نہیں۔ اکا دکا ٹرک نظر آیا تھا مگر میں نے انہیں روکنا پسند نہیں کیا۔ ٹرک ڈرائیور بہت بدتمیز ہوتے ہیں۔''

''بالکل بالکل۔'' صوفی ریڈی ایٹر پر جھکا ہوا تھا۔ لڑکی نے کہا۔

''پینے کا پانی ہوگا آپ کے پاس۔''

''میں لاتا ہوں۔'' جمشید مرزا نے رخ بدل کر کہا تو لڑکی نے جلدی سے کہا۔

''نہیں پلیز! آپ میری گاڑی پر توجہ دیجیے۔ ڈرائیور سے کہیں کہ جلدی کچھ کرے مجھے دیر ہورہی ہے۔ پانی میں خود پی لیتی ہوں۔'' لڑکی نے کہا اور جمشید مرزا ٹھٹک کر رک گیا۔ صوفی ریڈی ایٹر کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

''پانی ختم ہوجانا ایک الگ بات ہے۔ لیکن اس کے تو تمام پائپ وغیرہ جل گئے ہیں۔''

''کچھ کریں صوفی صاحب! ویسے آئی ایم سوری اس نے آپ کو دوبارہ ڈرائیور کہا ہے۔''

''ڈرائیور گاڑی چلانے والے کو کہتے ہیں اور میرا خیال ہے اس میں معذرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی صوفی نے اتنے ہی الفاظ ادا کیے تھے کہ دفعتہً آگے گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی اور صوفی کے ساتھ جمشید مرزا بھی بری طرح اچھل پڑا۔ انہوں نے اپنی کار کو تیز رفتاری سے آگے بڑھتے ہوئے دیکھا۔ لڑکی کار لے کر ہوا ہوگئی تھی۔

''ارے ارے...... ارے ارے...... ارے......'' جمشید مرزا کئی قدم دوڑا۔ صوفی اطمینان سے کمر پر ہاتھ رکھے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ جمشید مرزا رک گیا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

''کتیا کی بچی!'' اس نے ہتھیلی پر گھونسا مارتے ہوئے کہا۔

''درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''یار جان مت جلاؤ کیا زبردست چوٹ ہوئی ہے۔''

''در...... درویش رحم کریں۔'' صوفی نے کہا اور جیب میں پانوں کی ڈبیا تلاش کرنے لگا۔

''پان نہ کھایا کریں آپ میرے سامنے۔'' جمشید مرزا نے چیخ کر کہا اور صوفی مضحکہ خیز نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا پھر اس نے اطمینان سے پانوں کی ڈبیا ایک گلوری نکال کر منہ میں رکھی۔ چھالیوں کے ہوئے تمباکو اور چھالی نکالنے لگا اور اس کی پھنکی لگا کر بولا۔

''اب کیا حکم ہے؟'' جمشید مرزا بری طرح پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ دفعتہً اس نے چیخ کر کہا۔

''ذرا نمبر دیکھیے۔ میں اس لڑکی کو ٹھیک نہ کردوں تو میرا نام نہیں ہے۔''

''تجربہ تو نہیں ہے مرزا صاحب! درویشوں کی دعاؤں سے لیکن سنا ضرور ہے کہ لڑکیوں کو ٹھیک

کرنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے اور آپ ٹھہرے شریف آدمی!"

"نمبر دیکھیے آپ!"

"دیکھ لیا ہے۔" صوفی نے جواب دیا اور جمشید مرزا کو نمبر بتانے لگا۔ جمشید مرزا نے اپنا موبائل نکال لیا تھا اور پھر وہ اپنے محکمے کے لوگوں کو طلب کرنے لگا۔ چند لمحات کے بعد رابطہ قائم ہو گیا تو اس نے اپنے کسی ماتحت سے کہا۔

"عادل پور کے راستے میں ایک کار کھڑی ہوئی ہے نمبر نوٹ کرو۔ اس کا ریڈی ایٹر جل گیا ہے۔ تمام انتظامات کر کے مکینک کے ساتھ آؤ۔ کار کو پولیس ہیڈ کوارٹر لے جاؤ اور رجسٹریشن آفس سے اس کے مالکان کے بارے میں معلومات حاصل کر کے مجھے میرے موبائل فون پر اطلاع دو۔ یہ ہدایت جاری کرنے کے بعد جمشید مرزا پھر کار کی جانب متوجہ ہو گیا اور صوفی سے بولا۔

"کچھ امکانات ہیں؟"

"نہیں۔ جلے ہوئے ریڈی ایٹر کو ٹھیک کرنے کی کوئی ترکیب ہمیں نہیں آتی درویشوں کے کرم سے۔"

"یار! ایک تو تمہارے یہ درویش......"

"مرزا صاحب! ساری باتیں اپنی جگہ، درویشوں کے بارے میں اگر آپ نے ایک لفظ غلط کہا تو نقصان اٹھائیں گے آپ!" جمشید مرزا نے یا تو صوفی کی بات پر توجہ نہیں دی تھی یا توجہ دی بھی تھی تو کچھ بولنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"بہر حال وہ انتظار میں کھڑے ہو گئے۔ شہر سے مدد آنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ویسے بھی جمشید مرزا اس وقت کسی پرائیویٹ مشن پر جا رہا تھا۔ ظاہر ہے اپنے آپ کو نمایاں کرنا پسند نہ کرتا۔ وہ دونوں سڑک پر آ کھڑے ہوئے۔ صوفی نے غم زدہ لہجے میں کہا۔

"ہمارے کپڑے بھی لے گئی۔"

"یار! اس میں اسلحہ بھی تھا۔ سرکاری اسلحہ! میں تو عذاب میں گرفتار ہو جاؤں گا۔" جمشید مرزا بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کچھ کھانے پینے کا سامان بھی ہو گا؟"

"ہاں بہت کچھ تھا۔" جمشید مرزا نے کہا۔

"سبزیوں سے لدا ہوا ایک ٹرک اس سمت سے آتا ہوا نظر آیا جہاں سے وہ لوگ آ رہے تھے۔ جمشید مرزا سڑک کے بیچوں بیچ آ کھڑا ہوا۔ ٹرک رک گیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"نور آباد صاحب جی!" ٹرک ڈرائیور نے جواب دیا۔

"ہمیں عادل پور چھوڑ دو۔ تمہیں معاوضہ دیں گے۔" ڈرائیور اپنے کلینر کی طرف دیکھنے لگا تو کلینر نے کہا۔

"کتنے پیسے دو گے؟"

"کتنے پیسے لو گے۔"

"پانچ سو روپے۔ دونوں الگ الگ راستے ہیں۔ ہم پہلے آپ کو عادل پور چھوڑیں گے اور اس کے بعد واپس آ کر اپنی منزل پر جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"پیچھے بیٹھ جاؤ۔"

"یار! پیچھے تو سبزیاں لدی ہوئی ہیں۔ کپڑے خراب ہو جائیں گے۔"

"ادھر ہی بیٹھنا ہو گا صاحب جی اور کوئی جگہ نہیں ہے ہمارے پاس۔"

"تم اپنے کلینر کو پیچھے بھیج دو، ہم دونوں آگے بیٹھ جاتے ہیں۔"

"نہیں صاحب جی! آپ کو بیٹھنا ہے تو پیچھے جا بیٹھو۔"

"مجبوری تھی۔ جمشید مرزا نے صوفی کا سہارا لیا اور ٹرک پر چڑھ گیا۔ صوفی بھی ٹرک پر جا کر بیٹھ گیا۔

"تازہ سبزیاں ہیں۔ یہ گاجریں تو بالکل تازہ معلوم ہوتی ہیں۔" صوفی نے ٹرک میں رکھی سبزیوں کی طرف نظر دوڑاتے ہوئے جمشید مرزا سے کہا۔

سبزیوں سے ان کے کپڑوں پر دھبے پڑ گئے تھے۔ جمشید مرزا کی ساری محنت خاک میں مل گئی تھی پھر جب وہ عادل پور میں رائے راحیل کی حویلی میں اترے تو شکل و صورت سے نہ جانے کیا لگ رہے تھے۔ ٹرک والے کو پانچ سو روپے دیے اور وہ مڑ کر واپس چلا گیا۔ حویلی کے دروازے پر کھڑے ہوئے دربان نے نہایت حقارت سے پوچھا۔

"کیا ہے...... کس سے ملنا ہے؟"

"رائے راحیل صاحب کے مہمان ہیں؟"

"تم لوگ مہمان ہو......"

"ہاں۔ جا کر راحیل صاحب سے کہو کہ جمشید مرزا آیا ہے۔"

"ادھر ہی رک جاؤ۔ وہ اجازت دیں گے تو اندر بلاؤں گا۔" چوکیدار نے کہا۔ جمشید مرزا منہ ہی منہ میں گالی بک کر خاموش ہو گیا۔ چوکیدار اندر گیا اور پھر واپس آ گیا لیکن اب اس کا انداز بدلا ہوا تھا۔

"آ جایئے صاحب! باہر کیوں کھڑے ہوئے ہیں؟" جمشید مرزا نے خون خوار نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولا۔

"بتاؤں گا تجھے کہ باہر کیوں کھڑا ہوا تھا۔"

"صوفی بالکل خاموش رہا تھا۔ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ جمشید مرزا کی حالت بری طرح خراب تھی۔ صوفی کی شیروانی پر بھی دھبے لگے ہوئے تھے۔ سفید پاجامے پر کئی ہرے ہرے اور لال لال نشان بنے ہوئے تھے۔ اس حلیے میں رائے راحیل کے سامنے جانا جمشید مرزا کو بہت ہی کھل رہا تھا، لیکن مجبوری تھی۔ رائے راحیل نے شان دار سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں ان کا استقبال کیا اور ان دونوں کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

"تم لوگ کون ہو؟"

"رائے صاحب! رائے صاحب میرا نام ایس پی جمشید مرزا ہے اور یہ میرے دست راست صوفی صاحب ہیں۔"

"اوہو۔ کیا آپ لوگ بھیس بدل کر نکلے ہیں اور کسی خاص حیثیت سے یہاں پہنچے ہیں۔"

"پہنچے تو خاص حیثیت میں ہی ہیں لیکن ہمارا بھیس خود بہ خود بدل گیا ہے۔" جمشید مرزا نے جواب دیا۔

"مطلب میں سمجھا نہیں۔"

"راستے میں ایک حادثہ پیش آ گیا ہماری کار کو۔ ہم لوگوں کو سبزی کے ٹرک میں یہاں تک آنا پڑا۔ راستے میں یہ حلیہ بن گیا۔"

"اوہو۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کا لباس وغیرہ۔"

"جی ہاں۔ مجبوری ہے کچھ کریں گے یہاں آپ کے شہر میں رہ کر۔"

"نہیں، میرا خیال ہے آپ کے سائز کا لباس تو میں مہیا کر سکتا ہوں، لیکن یہ آپ کے ماتحت اس طرح کی شیروانیاں تو میرا خیال ہے کم از کم ہمارے ملک میں نہیں سلتیں۔ کوئی درزی اس ڈیزائن کی شیروانی سینے کو تیار نہیں ہو سکے گا۔"

"میں ٹھیک ہوں۔ اوپر شیروانی ہے لیکن اندر پریشانی نہیں قمیص موجود ہے۔ پاجامہ لوگوں کو دوں گا، درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے کہا اور راحیل اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

رائے راحیل تقریباً چھ فٹ دو انچ قد و قامت کا مالک اور اسی تناسب سے چوڑا بدن رکھنے والا ایک پُراثر شخص تھا۔ اس نے کہا۔

"مجھے آپ کے آنے کی اطلاع مل چکی تھی جمشید مرزا صاحب! مہمان خانے میں آپ کے لیے بندوبست کر دیا گیا ہے۔ آپ یہاں رکیں، لباس بھی آپ کو پہنچا دیا جائے گا۔ میں کچھ گھنٹوں کے لیے آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔ ایک ضروری کام میں مصروف ہوں، اس کے بعد آپ سے تفصیلی بات چیت ہو گی۔"

"بے شک! میری آپ سے ملاقات پہلے نہیں ہوئی لیکن جس شخصیت نے آپ کے سلسلے میں میری خدمات حاصل کی ہیں۔ اس نے آپ کو میرے عہدے وغیرہ کے بارے میں بھی بتا دیا ہو گا۔"

"جی جی جی۔ آپ محکمہ پولیس میں ایس پی کا عہدہ رکھتے ہیں لیکن مجھے یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ میری مشکل کے حل کے لیے آپ دو ہفتے کی چھٹی لے کر آئیں گے اس لیے معذرت کے ساتھ آپ کو یہاں تھوڑا وقت انتظار کرنا ہو گا۔ دوسری صورت میں اگر آپ بہت زیادہ مصروف ہیں تو مجبوری ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کروں گا اور آپ کو واپس پہنچوا دوں گا۔" رائے راحیل بھی اکھڑ مزاج معلوم ہوتا تھا جمشید مرزا نے فوراً پینترا بدلا اور بولا۔

"آپ ہمیں کب وقت دے سکیں گے۔ اصل میں یہ فیصلہ بھی کرنا ہو گا کہ میں کس حد تک آپ کو وقت دے سکتا ہوں اور آپ کے لیے کام کر سکتا ہوں۔" رائے راحیل نے عجیب سی نگاہوں سے جمشید مرزا کو دیکھا پھر صوفی کی طرف، پھر بولا۔

"جانا ضروری ہے واپسی آٹھ گھنٹے میں بھی ہو سکتی ہے، اور چوبیس گھنٹے بھی لگ سکتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد لازمی طور پر میری آپ کے ساتھ نشست رہے گی۔ یہ آپ کو کرنا ہی ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔" جمشید مرزا بولے اور رائے راحیل نے ملازم کو بلا کر ان لوگوں کو مہمان خانے بھجوا دیا۔ صوفی اپنے کمرے میں چلا گیا تھا مہمان خانے میں بہت سے کمرے تھے لیکن مہمان ہی دونوں ہی تھے۔ جمشید مرزا کو عجیب سی گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے لیے لباس آ گیا اور وہ اسے لے کر غسل خانے میں چل گیا لباس واقعی اس کے بدن پر فٹ تھا اور خاصا اچھا سلا ہوا تھا۔ جمشید مرزا صوفی کا انتظار کرتا رہا اور جب صوفی دیر تک نہ آیا تو اس نے صوفی کے کمرے میں دروازے پر دستک دی۔ جواب میں صوفی نے دروازہ کھولا اور جمشید مرزا اچھل پڑا جو نمونہ اس نے دیکھا تھا وہ انتہائی عجیب و غریب تھا۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ سرخ جانگیے میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جمشید مرزا بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"یہ...... یہ...... یہ کیا۔"

"پپ...... پاجامہ سوکھ رہا ہے۔ ہم نے قمیص بھی ساتھ ہی ساتھ دھو ڈالی ہے۔ اب شیروانی پہن کر تو جانگیے میں عجیب سا لگے گا۔ آپ تھوڑا سا توقف فرما لیجیے۔ ہم جھولا جھلا کر پاجامہ سوکھا رہے تھے کہ آپ نے طلب فرما لیا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ پاجامہ کیا جلدی سوکھ جائے گا۔"

"کوشش کر رہے ہیں کوئی حکم ہے ہمارے لیے۔"

"یار! کپڑے وغیرہ پہن کر آؤ۔ عجیب مصیبت بن گئی ہے۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں نے غلطی کی ہے۔" صوفی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اندر ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ جمشید مرزا دیر تک وہیں کھڑا رہا تھا۔ اسے واقعی بڑی شرمندگی کا سا احساس ہو رہا تھا۔ ایک تو یہ افتاد آ پڑی تھی۔ دوسرے رائے راحیل نے اسے کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی، بہر حال اس کی اپنی ایک حیثیت تھی، ایک عہدہ تھا۔ جمشید مرزا سوچنے لگا کہ کہیں معاملہ ٹائیں ٹائیں فش ہی نہ ہو جائے لیکن بہر حال اب چھٹی لے کر باقاعدہ ایک پرائیویٹ کیس کو نمٹانے آ گیا تھا جس کے بارے میں اس نے بہت کچھ سوچا تھا۔ چنانچہ تھوڑا سا وقت گزار لیا جائے۔ آدھے گھنٹے کے بعد صوفی بھی آ گیا۔ جمشید مرزا نے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کیا محسوس کر رہے ہیں صوفی صاحب!"

"بھوک اور پیاس، کتنے گھنٹے ہو گئے ہیں کچھ کھائے پیے ہوئے۔" صوفی نے جواب دیا اور جمشید مرزا خود بھی چونک پڑا۔ واقعی یہاں تو حد ہی ہو گئی تھی۔ اس نے ملازم کو بلانے کے لیے گھنٹی کا بٹن دبایا اسی وقت ملازم دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں میں بڑی سی ٹرے دیکھ کر جمشید مرزا نے سکون کی سانس لی تھی۔ چائے کے برتنوں کے ساتھ ساتھ کچھ اور اشیاء بھی موجود تھیں جو ملازم نے احترام سے ان کے سامنے رکھ دیں اور بولا۔

"جناب والا! کوئی اور شے درکار ہو تو گھنٹی کا یہ بٹن دبا دیجیے۔ میں ان تمام چیزوں کی تیاری کے لیے کچن گیا ہوا تھا لیکن اس کے بعد مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ آپ ہی کی خدمت میں حاضری دوں۔" صوفی ان باتوں کو سنے بغیر ٹرے میں رکھے ہوئے برتنوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ چائے کی دو پیالیاں بنا کر اس نے ایک جمشید مرزا کے سامنے کی اور دوسری اپنے سامنے...... پھر پلیٹوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ اسی وقت

موبائل فون کی گھنٹی بجی اور جمشید مرزا نے فون اٹھا کر دیکھا پھر جو نمبر اسے نظر آئے تھے اسے دیکھ کر اس نے جلدی سے موبائل فون آن کیا اور بولا۔

"ہیلو۔"

"یس سر! ابراہیم شاہ بول رہا ہوں۔ ہم اس کار کو وہاں سے لے آئے تھے۔ رجسٹریشن آفس سے اس کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔"

"ہاں بتاؤ۔"

"سر! کار عادل پور کی رجسٹرڈ ہے اور وہاں کے ایک صاحب رائے راحیل کے نام کی ہے۔" دوسری طرف سے جواب دیا گیا اور جمشید مرزا حیرت سے اچھل پڑا۔

"رائے راحیل!...... عادل پور۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"جی سر!"

"اچھا...... کار کہاں ہے؟"

"ہیڈ کوارٹر پہنچا دی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اسے تحویل میں رکھو۔ اگر کوئی اس کے لیے رابطہ کرے تو معلومات حاصل کر کے مجھے اس کے بارے میں تفصیل بتاؤ۔"

"یس سر!" جواب ملا اور جمشید مرزا نے فون بند کر دیا پھر اس نے صوفی کی طرف دیکھا جو ہر چیز سے بے نیاز کھانے میں مصروف تھا۔

"صوفی صاحب!" جمشید مرزا نے اسے آواز دی۔

"نکال دیا ہے، نکال دیا ہے، درویشوں کے کرم سے۔" صوفی جلدی سے بولا۔

"کسے نکال دیا ہے۔"

"حلوہ۔ آپ کا حصہ۔"

"میں حلوے کی بات نہیں کر رہا۔"

"یہ کٹلس بھی موجود ہیں۔"

"کیوں فضول باتیں کر رہے ہو یار!...... تم پہلے پیٹ بھر لو پھر باتیں کریں گے۔" جمشید مرزا نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نوازش......!" صوفی نے کہا اور کھانے میں مصروف ہو گیا۔ جمشید مرزا اس وقت تک خاموش رہا جب تک صوفی خوب اچھی طرح شکم سیر نہ ہو گیا۔ پھر اس نے پانوں کی ڈبیاں اور چھالی وغیرہ کا بٹوا نکال لیا۔

"اب آپ یہ غلاظت منہ میں ٹھونس کر بیٹھ جائیں گے۔ مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔ صوفی صاحب اس کے علاوہ ایک اور بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔"

"ارشاد......!"

"دیکھئے میں پولیس کا آدمی ہوں۔"

"بے شک، بے شک درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"جی نہیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے نہیں اپنی محنت سے۔"

"ہم تائید نہیں کریں گے بلکہ ایک پیش گوئی کریں گے" صوفی نے کسی قدر ناخوشگواری سے کہا۔

"میری بات سنیں آپ! پیش گوئی نہ کریں۔"

"آپ نے درویشوں کی توہین کی ہے، ان سے انحراف کیا ہے۔ اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا آپ کو، خیر فرمایئے! آپ پولیس کے آدمی ہیں۔"

"تھوڑا سا ڈسپلن ضرور ہوتا ہے۔ آپ میرے لیے کام کر رہے ہیں، چنانچہ بہتر ہوگا کہ آپ میرے سامنے پان کھانے سے بھی گریز کریں۔" جمشید مرزا نے کہا۔

"آپ نے پانوں کی بھی توہین کی ہے۔ اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑے گا آپ کو۔" صوفی نے کہا۔

"عجیب باتیں کر رہے ہیں آپ!" جمشید مرزا بولا۔

"اس کے بعد آپ پر لازم ہے کہ اپنے حواس قابو میں رکھیں اور لغو باتوں سے گریز فرمائیں۔ میرے سامنے درویشوں کی شان میں گستاخی کا ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالیں۔ پانوں کے بارے میں کوئی فضول بات نہ کریں، ورنہ آپ کی بقا خطرے میں پڑ جائے گی۔"

جمشید مرزا کا منہ ایک لمحے کے لیے حیرت سے کھلا اور پھر بند ہو گیا۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتا اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر گھس آیا۔

پھر تین چیخیں ایک ساتھ ابھری تھیں۔

♥......♥......♥

آنے والی وہی لڑکی تھی جو ان کی کار لے کر بھاگی تھی۔ اس نے ان دونوں کو پہچان لیا تھا اور صوفی اور جمشید مرزا نے بھی۔ لڑکی چیخ کر ایک دم باہر نکل گئی اور صوفی کے منہ سے نکلا۔

"درویش رحم کریں۔"

"یار بعض اوقات......" جمشید مرزا کہتے کہتے رک گیا۔ صوفی نے اپنی چھوٹی سی چگی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"حق اللہ...... حق اللہ۔" دروازہ ایک بار پھر کھلا اور اس بار لڑکی اندر آ گئی اور تیز نگاہوں سے انہیں گھور رہی تھی پھر اسکی آواز ابھری۔

"تم لوگ...... تم لوگ میری شکایت لے کر یہاں آئے ہو۔" جمشید مرزا اسے ہونٹ بھینچ کر گھورنے لگا صوفی نے بھی پہلی بار لڑکی کو غور سے دیکھا۔ مشرقی نقوش، مغربی رنگ مشرق و مغرب کا ملا جلا امتزاج تھی چہرے پر بے پناہ ملاحت تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی تیزی بھی تھی وہ کمر پر دونوں ہاتھ رکھے کھڑی ہوئی تھی اور اس کے دلکش نقوش ضرورت سے زیادہ جاذب نگاہ لگ رہے تھے۔ جمشید مرزا کا جو حال ہوا تھا وہ الگ ہی تھا۔ ساری ریپوٹیشن ختم ہو گئی تھی اس نے اپنے آپ کو بڑا بنایا سنوارا تھا۔ جس ذریعہ رائے راحیل سے رابطہ قائم ہوا تھا۔ وہ بہت ہی معتبر تھا اور جمشید مرزا کو بتایا گیا تھا کہ رائے راحیل بہت ہی نفاست

پسند آدمی ہے پچاس لاکھ روپے کی پیش کش اس نے خود کر دی تھی کہ اس کا مسئلہ حل ہو جائے۔ وہ پولیس کو اپنے معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں دینا چاہتا تھا بلکہ پرائیویٹ طریقے سے سارا کام کرانا چاہتا تھا حالانکہ کام کی نوعیت اسے نہیں معلوم تھی۔ لیکن بہرحال اسے صوفی پر اعتماد بھی تھا اور اپنی دانست میں اس نے صوفی کو خرید لیا تھا۔

''یہاں لڑکی کی وجہ سے وہ جس حال میں پہنچا تھا۔ اس سے اس کی ساری حیثیت ختم ہو گئی تھی اور اس کا اسے احساس بھی ہو گیا تھا۔ رائے راحیل کے روپے سے۔ لیکن حسن پرستی کو کیا کرتا۔ لڑکی کو دیکھ کر اس کے سارے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ لڑکی نے پھر کہا۔

''کار کہاں ہے؟'' جمشید مرزا نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''گیراج میں ہے۔ میں نے بند کر دی ہے تاکہ کوئی دیکھ نہ سکے۔ چھپا کر رکھی ہوئی ہے میں نے۔''

''اور اس میں موجود سامان؟''

''دیکھا تک نہیں میں نے۔''

''بس بے بی...... پولیس یہاں پہنچنے والی ہی ہو گی۔''

''پپ...... پولیس۔'' لڑکی کے چہرے پر سہمے ہوئے نقوش نظر آنے لگے۔ پھر وہ بولی۔

''دیکھو...... میرے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ مجھے یہاں پہنچنا ضروری تھا۔ مجھے معاف کر دو کیا تم نے پولیس میں میری شکایت کر دی ہے؟''

''تمہاری کار بھی پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ چکی ہے۔ رجسٹریشن آفس سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ کار رائے راحیل کے نام رجسٹرڈ ہے اور پولیس چھان بین کرتی ہوئی عادل پور آنے ہی والی ہے۔''

''مم...... مم...... میں بتائے دیتی ہوں میں گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں گی اور پھر واپس نہیں آؤں گی۔ ساری ذمہ داری تم پر ہو گی وہ روہانسے لہجے میں بولی اور اسی وقت صوفی کی آواز ابھری۔

''حق اللہ......'' لڑکی نے چونک کر صوفی کو دیکھا اور پھر بولی۔

''یہ ٹوئنٹی سکس کون ہے؟'' جمشید مرزا بے اختیار ہنس پڑا پھر اس نے صوفی کو طرف دیکھ کر کہا۔

''بتائیے مسٹر ٹوئنٹی سکس آپ کون ہیں؟''

''درویش رحم کریں۔'' صوفی نے کہا۔

''نہیں کریں گے؟'' ہاں بے بی بتاؤ کہ تم پولیس کو کیا جواب دو گی؟

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

''چلو چھٹی ہوئی۔ جب سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تو جواب کیسے پیدا ہو گا درویشوں کے کرم سے۔''

''یار درویشوں کے کرم سے تو سب کچھ ہو سکتا ہے چلو چھوڑو ٹھیک ہے ہم تمہاری شکایت نہیں کریں گے۔ مگر بے بی تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔''

''اور پولیس کا کیا کرو گے؟'' وہ بولی۔

''پولیس کو بھی روک دیں گے تم ہو کون؟''

''میرا نام سیمل رائے ہے۔''

''اوہو...... رائے راحیل کی بیٹی ہو۔'' جمشید مرزا نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... میں ان کی بیٹی نہیں ہوں سمجھے تم۔''

''ارے...... بب...... باپ رے باپ۔''

''تو پھر کیا بیوی ہو؟'' جمشید مرزا بولا۔

''اے کھوسٹ میں اس کی بیوی بننے کے قابل ہوں میری اور اس کی عمر کا اندازہ لگایا ہے تم نے۔'' لڑکی تیز لہجے میں بولی اور صوفی کے حلق سے ایک قہقہہ نما آواز نکل گئی۔ جمشید مرزا نے چونک کر صوفی کو دیکھا آواز قہقہہ جیسی نکلی تھی۔ لیکن چہرے کے تاثرات بالکل سنجیدہ تھے۔

''ہم دونوں کے ناموں کا ترجمہ کرا لیں تو زیادہ اچھا ہو گا درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''صوفی صاحب ایک بار پھر آپ کو وارننگ دیتا ہوں کہ اپنے اور میرے مرتبے کا خیال رکھیے۔''

''حق اللہ...... حق اللہ...... حق اللہ۔'' صوفی نے تین بار گردن جھٹکی اور مراقبے کے انداز میں گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔

''بیٹھو...... کیا نام بتایا تھا تم نے سیمل رائے۔''

''تمہارا انداز تحکمانہ کیوں ہے آخر؟''

''اس لیے کہ تم نے جرم کیا ہے؟''

''معافی بھی تو مانگ لی ہے۔''

''کیا ہم نے تمہیں معاف کر دیا؟''

''دیکھو پلیز میری شکایت مت کرنا ویسے ہی رائے صاحب سے ہمارے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ اگر تم نے شکایت کی تو انہیں ممی سے لڑنے کا موقع مل جائے گا میری ممی بہت دکھی ہیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''ہم سوچنا بھی نہیں چاہتے'' جمشید مرزا نے جواب دیا۔

''یہ ظلم ہے۔''

''ارے واہ...... اچھی کہی تم نے ہمارا سب کچھ لے کر وہاں سے فرار ہو گئیں ہمیں سبزی کے ایک ٹرک میں یہاں تک آنا پڑا اور تم الٹا کہہ رہی ہو کہ ظلم ہے۔''

''سس...... سس...... سبزی کے ٹرک میں۔'' لڑکی بے اختیار ہنس پڑی پھر بولی۔

''کدو لگ رہے ہو گے۔''

''کیا؟''

''نہیں میں ان کے بارے میں کہہ رہی ہوں۔''

''کدو...... حق اللہ۔'' صوفی نے گردن اٹھائی اور پھر جھکا لی پھر گردن جھکائے جھکائے بولا۔

''کھوسٹ...... کدو...... چھبیس۔'' جمشید مرزا دانت پیس کر رہ گیا تھا لڑکی بولی۔

''تو پھر مجھے...... امید ہے کہ تم میری شکایت نہیں کرو گے؟''

''اگر تم ہم سے دوستی کرلو تو......'' جمشید مرزا نے کہا اور لڑکی اسے چونک کر دیکھنے لگی۔

''دوستی؟''

''ظاہر ہے۔''

''یہ بتاؤ تم یہاں آئے کیوں ہو؟''

''رائے صاحب کے مہمان ہیں۔''

''ارے بب...... بب باپ رے تم رائے صاحب کے مہمان تھے۔''

''تھے کیا مطلب؟''

''نن...... نہیں میرا مطلب ہے مجھے اندازہ نہیں تھا ورنہ میں تمہارے ساتھ کم از کم وہ سلوک نہ کرتی ویسے واقعی کار تو خراب ہو ہی گئی تھی۔ اب یہ بتاؤ پولیس ہیڈ کوارٹر سے میری کار کیسے آئے گی۔''

''صرف ایک ہی شکل ہے اس کی۔'' جمشید مرزا بولا۔

''کیا؟''

''دوستی کرلو مجھ سے۔''

''ارے بابا...... دوستی کیسے کروں۔''

''قریب آؤ ہاتھ ملاؤ۔'' جمشید مرزا صوفی کو نظر انداز کر کے بولا اور لڑکی کچھ دیر سوچتی رہی پھر آگے بڑھی اور اس نے اپنا ہاتھ جمشید مرزا کے ہاتھ میں دے دیا۔ ہاتھ جمشید مرزا سے چھڑانے میں اسے کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ پھر وہ صوفی کی طرف مڑ کر بولی۔

''انکل ہدہد...... آپ بھی تو گردن سیدھی کرلیں۔''

''اس بار جمشید مرزا کو ہنسنے کا موقع ملا تھا۔ صوفی ایک دم اپنی جگہ سے اٹھا لڑکی اچھل کر پیچھے ہٹ گئی لیکن صوفی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا تھا۔ لڑکی گہری گہری سانسیں لینے لگی پھر اس نے اپنا ہاتھ صوفی کے ہاتھ میں دیا اور بولی۔

''یہ آپ نے پہن کیا رکھا ہے؟''

''شرپھپھوندا۔''

''کیا؟''

''بول کر دکھاؤ۔''

''عجیب لوگ ہیں آپ اور مجھے تعجب ہے کہ رائے صاحب نے آپ کو اپنا مہمان کیوں بنایا ہے'' تو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے؟''

''بس بنا لیا ہے مہمان۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سمجھتا میں ہوں کہ انہوں نے بہت نیک کام کیا ہے کم از کم اس طرح تم سے ملاقات تو ہوگئی۔''

''دیکھو پلیز! میری کار واپس منگوا دو میں تمہارا شکریہ ادا کروں گی اور ویسے بھی اب ہماری دوستی ہو چکی ہے؟''

''پھر بیٹھو ابھی تو تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔''

''ابھی نہیں ایسا کرتے ہیں۔ رات کو سامنے والے پارک میں ملاقات کریں گے، ویسے بھی آج چاند کی چودہ تاریخ ہے مجھے پورا چاند بہت پسند ہے۔ انکل ڈنڈی آپ بھی آئیں گے۔''

''تم نام رکھنے کی ماہر معلوم ہوتی ہو۔ کتنے سارے نام رکھ دیے تم نے۔''

''پھر رات گیارہ بجے مائی ڈیئر کھوسٹ۔'' لڑکی بولی اور اٹھ کر باہر تک گئی صوفی پھر ہنس پڑا تھا۔

''یار! تم ہنستے ہوئے بڑے عجیب لگتے ہو۔ ویسے مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

''جی ارشاد......'' صوفی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ جمشید چند لمحے خاموش رہا۔ پھر بولا۔

''دیکھئے صوفی صاحب میں چور دروازے سے محکمہ پولیس میں نہیں آیا ہوں اور باقاعدہ ٹریننگ ہوئی ہے میری اور اس ٹریننگ میں ڈسپلن کو اول مقام دیا جاتا ہے اب جب آپ نے ہنسی خوشی میری ملازمت قبول کرلی ہے تو آپ کو کم از کم اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ میں آپ کا افسر ہوں۔ میرے سامنے نہ تو آپ مذاق فرمانے کی کوشش کریں گے۔ نہ پان کھائیں گے بعد میں آپ کا جو جی چاہے کیجئے گا۔ لیکن جو بنیادی چیزیں ہیں وہ میں نے آپ کو بتا دیں۔

''استعفیٰ۔'' صوفی نے بڑی سادگی سے کہا۔

''جی۔''

''مطلب یہ کہ استعفیٰ...... استعفیٰ پیش کیا جاتا ہے آپ کو...... جس طرح آپ نے بغیر اپائمنٹ لیٹر کے ہمیں ملازم تو فرما لیا ہے اسی طرح ہمارا زبانی استعفیٰ بھی قبول فرمایئے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''آپ کو شاید یاد نہیں کہ میں نے آپ کو کیا آفر کی تھی؟''

''حق اللہ......''

''دس لاکھ روپے صوفی صاحب دس لاکھ روپے حلیہ بدل دیتے ہیں اور میں نے جو کہا ہے غلط نہیں کہا۔ سنجیدگی اختیار کیجئے۔''

''ہم نے عرض کیا نا کہ ہم نے آپ کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔''

''تو پھر ایسا کریں کہ کم از کم اس مسئلے میں میرے ساتھ کام کرلیجئے۔ بعد میں ہم طے کرلیں گے۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا میں آپ کو وارننگ ہی دے رہا تھا کہ وہ بدبخت گھس آئی درویشوں کا نام لیتے ہوئے آپ کے لہجے میں پاکیزگی آنکھوں میں شرم اور گردن جھکی ہوئی ہونی چاہیے نیز یہ کہ اس کیس پر صحیح کام کرنے کی دوسری شرط یہ ہے کہ ابھی میرے سامنے آپ ایک پان تناول فرمایئے درویشوں کے کرم سے۔''

''کیا!'' جمشید مرزا اچھل پڑا اور صوفی نے جیب سے پانوں کی ڈبیا نکال لی۔

''نہ صرف پان بلکہ تمباکو اور قوام بھی۔''

''اماں آپ کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔''

''پانوں کی تعداد دگنی ہوگئی۔ دونوں گلوریاں ایک ساتھ تناول فرما لیجئے یا پھر تھوڑے وقفے

ے اور پھر مزید کوئی بدکلامی فرمائی تو دو سے یہ تعداد چار ہو سکتی ہے۔"

"تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو۔"

"چار پان۔" صوفی نے آنکھیں نکال کر کہا۔

"لعنت ہو۔"

"چھ ہو گئے۔ اب دو دو کر کے بڑھیں گے۔ تو پان پیش کیا جائے اس شرط کی ابتدا فرما دیجیے اور پہلے مرحلے میں دو گلوریاں اٹھائیے گا۔" جمشید مرزا اسے گھورتا رہا پھر ادھر ادھر دیکھا اور پانوں کی ڈبیا سے دو پان اٹھا کر منہ میں ٹھونس لیے۔

"زردہ...... اور قوام۔"

"یار! چکر آ جائے گا۔ مر جاؤں گا۔"

"کفن دفن کا وعدہ کیا جاتا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"دیکھو بس اتنا ہی رہنے دو چھالیہ دے دو۔"

"جی...... نہیں شرط تو شرط ہوتی ہے آدھی شرط تو قابل اعتنا ہوتی ہی نہیں ہے۔" صوفی نے کپڑے کا بٹوہ کھول دیا۔ اور پھر باقاعدہ جمشید مرزا کو پان کھانے کا طریقہ بتانے لگا۔ جمشید مرزا نے زردہ اور قوام چھالیہ کے ساتھ منہ میں رکھا اور ابکائیاں لینے لگا۔ صوفی نے کہا۔

"ایک اہم کام آپ بھول گئے۔ کار باہر نکلوائیے اور اس سے کم از کم اپنے لباس نکلوا لیجیے گا ورنہ"

"غم...... غم...... قم...... قم...... اح چھو...... اخ...... چھو۔" جمشید مرزا کے منہ سے ساری چیزیں بہ یک وقت نکل پڑیں۔

♥......♥......♥

"ماما آپ نے یہ دو جل گرد دیکھے جو مہمان خانے میں آ کر ٹھہرے ہیں۔"

"جل گر؟ عورت چونک کر بولی یہ ایک دراز قامت عورت تھی قد کوئی پانچ فٹ گیارہ انچ لیکن انتہائی موزوں چہرے کے نقوش جاذب نگاہ تھے۔ رنگ دودھ جیسا سفید...... شخصیت خاصی دلکش تھی۔

"ماما آپ کو تو کچھ خبر ہی نہیں ہوتی۔"

"سیمل! تم جانتی ہو کہ میں پریشان ہوں۔ کیا کہانی سنا رہی ہو مجھے۔"

"ماما دو آدمی آئے ہیں یہاں دونوں عمر رسیدہ ہیں۔ ایک آدمی کی عجیب و غریب شخصیت ہے دوسرا ایک چالاک سا آدمی ہے پتا نہیں دونوں کون ہیں۔ ماما! ایک گڑبڑ ہو گئی تھی اصل میں۔"

"گڑبڑ......" عورت نے لڑکی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... ماما...... میں اپنی گاڑی میں آ رہی تھی۔ راستے میں میری گاڑی خراب ہو گئی۔ ذریعہ ہی نہیں تھا اسے ٹھیک کرنے کا اور یہاں تک لانے کا مجبوراً ماما...... میں نے ان لوگوں کو ہاتھ دے وہ ادھر ہی آ رہے تھے۔ پھر ماما میں ان کی گاڑی لے کر بھاگ آئی۔ گاڑی میں نے گیراج میں لاک ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ یہاں آ رہے ہیں وہ کہتے ہیں ماما...... کہ وہ رائے صاحب کے مہمان...... وہ ماما وہ ادھر ہی ہیں مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اور وہ بتاتے ہیں کہ میری گاڑی پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچا دی گئی ہے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ تو کر لیا ہے کہ وہ میری گاڑی واپس منگوا دیں گے مگر ماما کیا ان پر بھروسا کیا جا سکتا ہے؟"

"سیمل! رائے صاحب پچھلے دنوں ہمارے خلاف کچھ کارروائیاں کر رہے تھے ہو سکتا ہے کہ آنے والے پرائیویٹ جاسوس ہوں یا پھر ایسے لوگ جو میرے خلاف کوئی کارروائی کرنا چاہتے ہوں۔ تم جانتی ہو رائے راحیل کے سامنے اس وقت صرف ایک ہی مقصد ہے زندگی کا وہ یہ کہ وہ مجھے مجرم ثابت کر دے اور مجھے نقصان پہنچا دے۔ وہ مسلسل اپنی کوشش میں مصروف ہیں۔ اگر ہمارے پاس موزوں انتظامات نہ ہوتے تو مجھے قتل بھی کرا دیتا۔ یہ اس کا ملک ہے۔ اس کے لیے کوئی مشکل نہیں ہوتی۔"

"ماما...... میں عجیب مصیبت میں پھنس گئی ہوں یہ ملک اتنا خوب صورت ہے کہ میں کہ آپ کو بتا نہیں سکتی۔ رائے راحیل نجانے کیوں ہمارے دشمن بن گئے ہیں۔ ماما آپ تو کہتی تھیں کہ وہ بہت ہی ڈیسنٹ آدمی ہیں۔"

"ہو گئی ہے گڑبڑ سیمل...... بس ہو گئی ہے لیکن اب ہمیں صرف اپنا بچاؤ کرنا ہے کہیں بھی چوکے تو بن موت مارے جائیں گے۔ بے بی میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ کوئی ایسا کام مت کرنا جو میرے لیے مصیبت بن جائے۔ کہاں ٹھہرے ہیں یہ دونوں۔"

"ماما...... وہ وہاں مہمان خانے میں ہیں۔"

"ہوں! چلو میں دیکھتی ہوں لیکن تم ایسا کرو ان کی کار تو باہر نکالو۔"

"جی ماما پلیز...... آپ میری ہیلپ کیجیے۔"

"تم کار نکال کر باہر کھڑی کرو میں دیکھتی ہوں۔" عورت نے کہا اور سیمل باہر نکل گئی۔" عورت آئینے کے سامنے جا کر اپنا حلیہ درست کرنے لگی بلاشبہ وہ ایک جوان بیٹی کی ماں تھی۔ لیکن انتہائی دلکش...... لباس وغیرہ بھی بہت سلیقے سے استعمال کیا گیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک آئینے میں اپنا جائزہ لیتی رہی اور پھر کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس کی چال بھی بے حد دلکش تھی۔ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی وہ مہمان خانے کی طرف بڑھ گئی۔ باہر کھڑے ہوئے ملازم نے اسے دیکھا تو دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر جھک گیا۔

یہ کوئی مخصوص انداز تھا عورت نے پاٹ دار آواز میں پوچھا۔

"مہمان کون سے کمرے میں ہیں؟" اور خادم نے سامنے کی جانب اشارہ کر دیا عورت دروازے پر رکی اس نے انگلی سے دراز ہ کھٹکھٹایا تو آواز آئی۔

"درویش رحم کریں۔" اور اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا صوفی سامنے ہی کھڑا تھا عورت نے گردن خم کر لی اور بولی۔

"میرا نام راشیل رائے ہے۔"

"تت...... تشریف لائیے...... را...... رائے صاحب چشم ماہ روشن دل ماشاد درویشوں کی دعائیں ہیں۔" صوفی ایک ہاتھ ہلا کر بولا۔ عورت نے اسے سرد نگاہوں سے دیکھا اور اندر داخل ہو گئی۔ جمشید مرزا ڈرائنگ روم میں تھا۔ نسوانی آواز سن کر فوراً باہر نکل آیا اور پھر عورت کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے وہ ساکت رہ گیا تھا

عمر بے شک نوخیزیت کی نہیں تھی۔ لیکن دلکشی ایسی کہ اس پر ہزار نوعیت قربان کر دی جائے۔ ایک لمحے تک
اسی کیفیت کا شکار رہا۔ پھر اس کے چہرے پر خوش اخلاقیت کے آثار نظر آنے لگے۔

"لگتا ہے یہ جگہ شاید ماضی میں جنت کا کوئی حصہ رہی ہو۔"

"حق اللہ......" صوفی نے کافی زور سے آواز نکالی عورت ان دونوں کو دیکھنے لگی پھر بولی۔

"آپ لوگ کسی سرکس میں ملازمت کرتے ہیں۔"

"جج......جی۔" جمشید مرزا بولا۔

"جوکر ہیں۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر خاتون اور یہ جان کر مزید کہ رائے راحیل صاحب کی کوٹھی پر
کوئی کسی کی عزت کرنا نہیں جانتا۔"

"اوہ جو حرکتیں آپ کر رہے ہیں اس کے بعد آپ عزت کے خواہش مند بھی ہیں خیر یہ آپ کا
ذاتی معاملہ ہے آپ سلیقہ سیکھیں کہیں مہمان بن کر جانے کا جب اس طرح کے تماشے کریں گے تو جوکر ہی
سمجھے جائیں گے۔ وہ آگے بڑھی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی جمشید مرزا کی مسلسل بے عزتی ہو رہی تھی اس نے کہا۔

"بہرحال ہم رائے راحیل کے مہمان ہیں۔"

"جانتی ہوں یقیناً آپ لوگ پرائیویٹ جاسوس ہوں گے اس ملک کے جاسوسوں کو بھی ایسا ہی
ہونا چاہیے۔"

"توہین نمبر 2......حق اللہ۔" صوفی نے کہا اور جمشید مرزا نے قہر آلود نگاہوں سے صوفی کو گھورا اور
دانت پیس کر ہی رہ گیا تھا۔ عورت نے کہا۔

"دیکھئے...... سنیے میں کسی سے نہیں ڈرتی آپ لوگ جو کچھ یہاں کرنے آئے ہیں شوق سے کیجئے
میں جانتی ہوں کہ رائے صاحب نے آپ کو معقول معاوضے پر یہاں بلایا ہوگا۔ یہ میرا اپنا وطن نہیں ہے ورنہ
میں بھی آپ کو یہ پیشکش کرتی کہ صرف سچ تلاش کیجئے۔ معاوضہ رائے راحیل سے دگنا ہوگا۔ خیر انسانیت کا نام
لے کر میں اپنا مذاق نہیں اڑانا چاہتی لیکن پھر بھی آپ کو یہ بتائے دیتی ہوں کہ آپ کو میرے سفارت خانے کا
سامنا کرنا ہوگا۔ اگر میرے خلاف کوئی کارروائی ہوئی تو پھر میرا بھی فرض بنتا ہے کہ اپنا تحفظ کروں۔" یہ الفاظ
ادا کر کے وہ باہر نکل گئی۔ صوفی آہستہ سے بولا۔

"درویش رحم کریں۔" جمشید مرزا نے اسے دیکھا اور دانت پیس کر رہ گیا چند لمحات وہ دروازے کو
دیکھتا پھر اس نے کہا۔

"الجھنیں شروع ہوگئی ہیں صوفی صاحب! اب آپ درویشیت کے دائرے سے باہر نکل آئیں۔"

"کاش! میں آپ کو انسان بنا سکتا۔" صوفی نے سرد لہجے میں کہا اور جمشید مرزا اچھل پڑا۔

"کیا مطلب...... کیا ہوں میں...... انسان نہیں ہوں......؟"

"مرزا جی! اگر درویشوں کی طرف سے ہدایت ہوئی تو میں آپ کی زبان نکال کر آپ کی جیب
میں رکھ دوں گا اس بات کو نوٹ کر لیجئے گا۔" جمشید مرزا کا منہ حیرت سے کھلا پھر بند ہو گیا۔ بہرحال یہ صورت

حال کافی دلچسپ تھی اور جمشید مرزا چاہتا تھا کہ صوفی اس کیس میں کافی دلچسپی لے پھر طے یہ کیا گیا کہ محدود نہ
رہا جائے باہر بھی نکل کر دیکھتے ہیں کیا صورتحال ہوتی ہے۔

"آپ کو خدا کا واسطہ صوفی صاحب موڈ میں آجایئے اس کیس پر کام کیجئے میں وعدہ کرتا ہوں کہ
آپ کو دس لاکھ روپے ادا کروں گا کیوں کہ اس سلسلے میں مجھے پچاس لاکھ کی پیش کش کی گئی ہے ایک معقول رقم
مجھے کہیں اور بھی دینا ہوگی باقی میرا اپنا معاوضہ ہوگا۔ اور میں تو پہلے ہی طے کر چکا ہوں کہ جو پینل آپ نے
بنایا ہے اور جو اس سلسلے میں کام کرتا رہا ہے وہ قائم و دائم رہے اور آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہو۔"

"حق اللہ......حق اللہ۔" صوفی نے تین بار کہا تھا۔

♥......♥......♥

سیمل رائے نے اس وقت صوفی کو تاکا جب وہ ایک کیاری کے پاس کھڑا ہو کر کیاری سے کچھ
پتیاں توڑ کر انہیں مسل کر سونگھ رہا تھا۔

"ان میں تو بڑی بری بو ہوتی ہے۔" سیمل کی آواز ابھری اور صوفی چونک کر اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔

"فارسہ پڑھی ہے آپ نے؟"

"فارسہ؟"

"جی ہاں۔"

"کوئی بات ہے یہ؟"

"جی نہیں زبان ہے؟"

"آپ نے پڑھی ہے۔"

"بالکل نہیں، صرف معشوق نشیلے کو اس پر عبور حاصل ہے۔"

"میں نے کہا تھا یہ پتیاں آپ کیوں سونگھ رہے تھے کہ یہ بھی جاسوسی کی کوئی قسم ہے۔"

"درویش رحم کریں ہم آپ کو شکل سے جاسوس نظر آتے ہیں۔" صوفی نے کہا۔

"پتا نہیں کیا نظر آتے ہیں آپ؟"

"سیمل رائے ہے تمہارا نام؟"

"ہاں مجھے یہ نام اچھا لگا جب کہ رائے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"یہی سوال ہم کرنا چاہتے تھے کہ جب تم رائے راحیل کی بیٹی نہیں ہو تو اپنے نام کے ساتھ اس کا
نام کیوں لگاتی ہو؟"

"میں نے کہا نا کہ رائے کا لفظ مجھے اچھا لگتا ہے ایک ردھم بن جاتا ہے سیمل رائے۔"

"ویسے تمہارے ڈیڈی کا نام کیا تھا...... یا کیا ہے؟"

"جاسوس صاحب میں بھی بہت چالاک ہوں۔ آپ کو بہت ساری باتیں نہیں بتائی جاسکتیں۔"

"تو ٹھیک ہے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ
بڑھایا جائے۔"

"مجھے فضول باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے میری اپنی ایک لائف ہے۔ ماما جانیں اور ان کا کام اور وہ صاحب جن کا نام رائے راحیل ہے یہاں آنے کے بعد اتنے اکڑے ہوئے نظر آتے ہیں جب کہ وہاں ایسا نہیں تھا۔"

"کہاں؟" صوفی نے سوال کیا اور سیمل رائے پھر اسے گھورنے لگی۔

"کہا نا میں کوئی جواب نہیں دوں گی۔"

"تو پھر کیوں آ گئیں ہیں یہاں۔"

"یہ معلوم کرنے کہ آپ ان پتیوں کو کیوں سونگھ رہے تھے؟"

"آپ کو علم ہے اس پودے کے بارے میں؟"

"یہ پودا...... بھلا اس کا کیا علم ہوگا؟"

"یہی تو خرابی ہے نوجوان نسل میں ذرا بھی جنرل کالج نہیں ہے۔ آپ نے رکو کہ ایمویا کا نام سنا ہے۔ کبھی۔"

"کیا!" سیمل رائے بولی۔

"یہ بھی نہیں جانتیں خدا کی پناہ تاریخ کے اتنے بڑے حادثے کے بارے میں آپ کو کچھ نہیں معلوم۔"

"آپ نے نام ہی عجیب لیا ہے۔ کیا ہے یہ حادثہ۔"

"میں کیوں بتاؤں آپ کو؟"

"آپ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں آخر...... ہونہہ، اپنی شکل دیکھو میں تم سے بات کر رہی ہوں یہ ہی کافی ہے۔" سیمل رائے نے کہا اور پاؤں پٹختی ہوئی ایک طرف چلی گئی صوفی شیروانی کی جیب میں پان کی ڈبیہ تلاش کرنے لگا تھا۔

رات کا کھانا انہوں نے مہمان خانے ہی میں کھایا پھر چہل قدمی کے لیے باہر نکل آئے جمشید مرزا صوفی سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"اصل میں پہلا امپریشن ہی غلط ہو گیا۔ بات یہ ہے صوفی صاحب! کہ آپ نے تو جو اپنا حلیہ بنا رکھا ہے آپ اس سے مطمئن نظر آتے ہیں ظاہر ہے ہر انسان اپنی زندگی سے مطمئن ہوتا ہے مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ فی زمانہ اگر آپ ٹیپ ٹاپ سے نہیں ہیں......" ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک لینڈ کروزر اندر داخل ہوئی اور اس سے رائے راحیل نیچے اترا دونوں کو دیکھ کر وہ انہی کی طرف آ گیا تھا۔

"ہیلو...... کیسے ہیں آپ لوگ۔"

"ٹھیک ہیں رائے صاحب! آپ نے ہمیں مہمان بنایا ہے۔ کھا رہے ہیں، پی رہے ہیں جب تک چاہیں مہمان رکھیں، جب چاہیں خدا حافظ کہہ دیں۔" جمشید مرزا بولا۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے میں سمجھ رہا ہوں آپ مجھ پر طنز کر رہے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ میں بڑی الجھنوں میں گھرا ہوا ہوں کیا خیال ہے کہیں بیٹھا جائے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔"

"ویسے ایک بات میں آپ سے کہوں۔ کھلی جگہ ہر طرح سے محفوظ ہوتی ہے۔ میں مختصر الفاظ میں
کو بتانا چاہتا ہوں میں مصروف بھی رہوں تو براہ کرم آپ اسے محسوس نہ کریں میری ذمہ داریاں ہی کچھ
مختصر لفظوں میں آپ کو تھوڑی سی تفصیل بتا دوں۔
نا ہیں
اس طرح چہل قدمی کرتے ہوئے باہر کھلی فضا میں آ گئے۔

"ہاں۔"

"بتائیے پھر بتائیے۔"

"بس یوں سمجھ لیجئے ملک کا نام نہیں لوں گا۔ اپنے ملک سے باہر تھا بہت سارے بزنس میں نے
پھیلا رکھے ہیں۔ میں کام کر رہا تھا سچ بتاؤں آپ کو میں نے شادی نہیں کی تھی کیونکہ بچپن ہی سے میری فطرت
میں کچھ تبدیلیاں تھیں۔ ایک مقولے کا قائل تھا میں، کہ جب بازار سے دودھ مل جاتا ہے تو گھر میں بھینس پالنے
کا کیا فائدہ میری زندگی اسی انداز میں گزری۔ آزاد رہا۔ آزادی سے وقت گزارا ایک دن پھر ایک لغزش ہو گئی۔
اسی ملک کے ایک خوبصورت کیمپنگ میں میری ملاقات راشیل سے ہو گئی راشیل اس قدر دلکش
عورت ہے میرے ساتھ بھی یہ ہی ہوا۔ راشیل مجھ سے بہت زیادہ بے تکلف ہو گئی اور اس بے تکلفی کے نتیجے
میں مجھے اس سے شادی کرنا پڑی مجھے بعد میں یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ ایک ارب پتی عورت ہے بہر حال
ایک اضافی بات تھی۔
اس کا کہنا تھا کہ وہ بیوہ ہے ایک جوان بیٹی تھی اس کی۔ اس نے بیوگی کی زندگی گزاری تھی میں
نے سوچا کہ چلو سودا گھاٹے کا نہیں رہا اس کی دولت میرے کاروبار میں کام آئے گی اس کے کہنے پر میں نے
بہت بڑی بڑی رقمیں مختلف جگہوں پر لگا دیں آپ یوں سمجھ لیجئے کہ کوئی ڈیڑھ ارب روپیہ میں نے اس کے
کہنے پر کئی فرموں میں لگا دیا۔ لیکن بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ فرمیں جعلی تھیں اور ان کے دفاتر بھی عارضی طور پر
بنائے گئے تھے۔ آپ کا نام جمشید مرزا ہے نا؟"

"جی ہاں......" جمشید مرزا نے کہا۔

"جمشید مرزا صاحب یہ سارا جال مجھے پھانسنے کے لیے بچھایا گیا تھا مجھے مزید یہ معلوم ہوا کہ
راشیل کئی بڑی بڑی پارٹیوں کو کنگال کر چکی ہے یہ اس کا کام ہے اور پھر ایک اور انکشاف ہوا جو بڑا روح فرسا
تھا وہ یہ کہ راشیل بذات خود ایک...... قلاش عورت تھی اس نے اپنے منہ سے مجھ سے کبھی نہیں کہا تھا کہ وہ کوئی
دولت مند عورت ہے مجھے دوسری جگہوں سے ہی معلوم ہوا تھا۔ لیکن یہ بھی ایک چال تھی اس کی...... بڑی
زبردست پبلسٹی کرا رکھی تھی اس نے اپنی، میں بے موت مارا گیا اور اس کے بعد اور بھی بہت سے مسئلے ہوئے
میں زندگی کے ایک بہت بڑے عذاب میں گرفتار ہو گیا۔ راشیل کو ہر طرح سے قانونی تحفظ حاصل تھا۔ مجھے
کچھ اس طرح جال میں پھانس لیا گیا کہ میں اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا پھر مجھے احساس ہوا کہ وہ اس کا وطن
ہے وہاں اسے ہر طرح کی مراعات حاصل ہیں۔ تو میں نے یہی بہتر سمجھا کہ اپنے آپ کو سمیٹ کر اپنے وطن
میں واپس آ جاؤں کم از کم مجھے تھوڑا سا تحفظ تو حاصل ہوگا اور اس طرح میں نے اپنے وطن کا رخ کیا۔
یہاں آ گیا۔ حالانکہ یہاں میرے عزیز و اقارب نہیں تھے لیکن پھر بھی مجھے اس بات کی امید تھی

کہ یہاں وہ اپنے پنجے نہیں پھیلا سکے گی۔ لیکن صاحب غضب کی عورت ہے میں نے بے پناہ کوشش کی کہ اس
کے ذرائع اور اس کے وسائل تلاش کر سکوں لیکن ناکام رہا۔"

"ذرائع وسائل کس سلسلے میں؟" جمشید مرزا نے بڑا برمحل سا سوال کیا تھا۔ صوفی نے تعریفی
نگاہوں سے اسے دیکھا تو جمشید مرزا کا سینہ فخر سے پھول گیا۔

"میں وہ ہی بتانے جا رہا تھا مجھے مسلسل یہ لگ رہا ہے کہ کچھ لوگ میری تاک میں ہیں کوئی ایسا
پلان بن رہا ہے جو یقینی طور پر میرے خلاف ہوگا۔ مختصر سی تفصیل بتا رہا ہوں متعلقہ اداروں سے بینکوں اور
دوسرے ذرائع سے یہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے میرے پاس کتنی دولت ہے اور کہاں
کہاں محفوظ ہے مزید یہ کہ میری جائیدادیں کہاں کہاں ہیں؟"

"آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟"

"کچھ اداروں سے۔"

"ان اداروں نے یہ تو نہیں بتایا ہوگا کہ یہ معلومات حاصل کرنے والے کون لوگ ہیں؟"

"دو جگہ سے پتا چلا ہے مجھے، وہ غیر ملکی ہیں اسی ملک سے ان کا تعلق ہے جس ملک سے ہم لوگ
یہاں آئے ہیں۔"

"یعنی میڈم...... کیا نام بتایا ان کا آپ نے۔"

"راشیل۔"

"ہاں میڈم راشیل کے ملک سے۔"

"جی۔"

"خطرناک بات ہے۔"

"مزید معلومات مجھے یہ حاصل ہوئیں کہ وہ دونوں افراد جو معلومات حاصل کر رہے ہیں اس ملک
کے سفارت خانے کے لوگ ہیں۔"

"اوہ......" جمشید مرزا نے گردن ہلائی۔

"میں پولیس سے مدد لے سکتا تھا۔ لیکن آپ بتایئے کیا پولیس میری اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکتی
ہے ویسے بھی بیوی کا معاملہ ہے ایک شریف آدمی ہوں۔ میں نے ابھی......" رائے راحیل نے ابھی یہ ہی
الفاظ کہے تھے کہ صوفی کی آواز ابھری۔

"حق اللہ......" اور رائے راحیل چونک کر اسے دیکھنے لگا اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات نظر
آئے پھر اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟"

"کک...... کیوں میں نے کیا مذاق اڑا ہے۔"

"تم نے جس انداز میں حق اللہ کہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہیں میری اس بات پر اعتراض ہے۔"

"خدانخواستہ حضور من ہم بھلا اعتراض کا کیا حق رکھتے ہیں۔ لیکن آپ نے اپنے بیان میں فرمایا تھا

شادی آپ نے اس لیے نہیں کی کہ آپ دنیا کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے درویشوں کے کرم
کے علاوہ اس کے بعد اصل میں غلطی آپ کی نہیں ہے شرافت کا معیار بدل گیا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"تم تو مجھے صورت ہی سے چغد نظر آتے ہو۔ یہ شخص کیا بکواس کر رہا ہے۔"

"صوفی صاحب! آپ خاموش رہیے۔ براہ کرم خاموش رہیے۔" جمشید مرزا نے غصیلے لہجے میں
کہا۔ دل تو اس کا یہ چاہا کہ صوفی کو کان سے پکڑ کر باہر نکال دے لیکن جو بیان رائے راحیل دے رہا تھا۔ وہ
بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ جمشید مرزا چاہتا تھا کہ صوفی کے سامنے ہی ساری باتیں ہوں اس نے کہا۔

"معافی چاہتا ہوں اصل میں یہ درویش منش آدمی ہیں، بڑے کام کی شخصیت ہے ان کی۔"

"تو کیا یہاں آپ کوئی چلہ کشی کرانے لائے ہیں انہیں۔"

"یہ میرے معاون ہیں۔ میں ان کی طرف سے آپ سے معافی چاہتا ہوں۔"

"سارا موڈ چوپٹ کر دیا اس شخص نے۔ تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ کچھ نہ کرنے کے باوجود وہ اتنا
کچھ کر رہی ہے کہ میں حیران ہوں۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی بہت ہی تجربے کار آدمی میرا یہ کام کرے۔ مجھے یہ
بات بھی معلوم ہے کہ آپ کا پولیس میں ایک اہم عہدہ ہے اور آپ مصروف آدمی ہیں لیکن میری شخصیت بھی
بہر حال اس ملک کے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ میں بڑے بڑے منصوبے لے کر یہاں آیا ہوں۔ آگے چل کر
مجھے بہت سے کام کرنے ہیں جس کی اطلاع میں نے گورنمنٹ کو دے دی ہے۔ چنانچہ میرے لیے تحفظ
ضروری ہے۔"

"کیوں نہیں...... کیوں نہیں۔" جمشید مرزا نے کہا اور چور نظروں سے صوفی کو دیکھا۔ صوفی
آنکھیں بند کیے آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ جمشید مرزا کو بعض اوقات خوب اس کی شخصیت پر غصہ آتا تھا۔ لیکن
صوفی نے اس کی جو اوقات بدلی تھی اسے بھی نگاہ میں رکھنا تھا۔ جمشید مرزا کو یہ بات معلوم تھی کہ صوفی انتہائی
ذہین آدمی ہے اور اس نے بڑے موقعے سے صوفی کو پکڑا تھا جو کام وہ کر رہا تھا اسے بھی صوفی کے کندھے پر
بندوق رکھ کر ہی کرنا تھا تاکہ اپنی پوزیشن بھی محفوظ رہے۔ اپنی دانست میں وہ بڑی چالاکی سے کام لے رہا تھا
لیکن اب یہ تو آگے کی بات تھی کہ اس کی چالاکی صوفی کے مقابلے میں کس قدر کارگر ہے۔ اچانک ہی جمشید
مرزا نے کہا۔

"ایک بات بتایئے رائے صاحب۔"

"ہاں پوچھیے...... پوچھیے۔"

"آپ کہتے ہیں کہ محترمہ راشیل گھر پر ہی رہتی ہیں لیکن ان کے کام ہو جاتے ہیں۔"

"ہاں...... بے شک!"

"ان کی ایک صاحبزادی بھی تو ہیں جن کا نام سیمل ہے۔"

"ہاں کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

"کیا سیمل ان کا ذریعہ نہیں ہیں؟"

"میں جائزہ لے چکا ہوں وہاں اس کے اپنے ملک میں بھی اور یہاں بھی میں نے بھرپور طریقے

سے سیمل کا جائزہ لیا ہے وہ بالکل معصوم سی بچی ہے۔ شوخ شریر اپنی عمر کے مطابق وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتی۔ کر ہی نہیں سکتی وہ...... وہ بس ایک کھلنڈرے مزاج کی لڑکی ہے۔"

"آپ کو اس پر مکمل بھروسا ہے۔"

"ہاں بس یوں سمجھئے کہ وہ قطعی طور پر کوئی مشکوک شخصیت نہیں ہے۔"

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس نے اپنی ذہانت سے آپ کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی ہو کہ وہ معصوم ہے اور درپردہ وہ کام کر رہی ہو؟" رائے راحیل نے عجیب سی نگاہوں سے جمشید مرزا کو دیکھا اور بے یقینی کے انداز میں گردن ہلاتا ہوا بولا۔

"ایک نیا خیال آپ نے میرے ذہن میں ڈال دیا ہے۔ آپ یقین کریں کہ اگر ایسا ہوا تو میں اپنے آپ کو پرلے درجے کا گدھا سمجھوں گا۔"

"حق! ام۔" صوفی کے منہ سے نکلنے ہی والا تھا کہ میں نے اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھ دیا۔

"اس شخص کو باہر نکال دیجئے۔ یہ میرا بلڈ پریشر ہائی کر رہا ہے۔" رائے راحیل نے کہا۔ صوفی اپنی جگہ سے اٹھا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔

"کمال کی بات ہے آپ اچھے خاصے اسمارٹ آدمی ہیں اور آپ نے معاون کے در پر اس آدمی کو رکھا ہے۔ جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔"

"اصل میں میں نے آپ سے کہا تھا آپ نے تسلیم نہیں کیا وہ بہت کام کا آدمی ہے۔ بس ذرا پیر پرست ہے، ولیوں اور درویشوں سے عقیدت رکھتا ہے اور ابھی جمشید مرزا اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ دفعتہً دو زوردار دھماکے ہوئے اور جمشید مرزا نے پھرتی کے ساتھ رائے راحیل کو ایک زوردار ٹکر ماری اور دونوں نیچے آرہے۔ گولیاں سنسناتی ہوئی ان کے سروں پر سے گزر رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی بہت سے شیشیوں کے ٹوٹنے کی آوازیں ابھری تھیں۔ پھر مزید فائرنگ ہوئی تھی۔ غالباً مسلسل گولیاں برسانے والی رائفل سے فائرنگ کی جارہی تھی۔ رائے راحیل اوندھا پڑا رہا۔

باہر سے آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ نوکر بھاگ دوڑ کرنے لگے تھے اور اچھی خاصی بھگدڑ مچ گئی تھی۔ رائے راحیل بالکل ساکت پڑا ہوا تھا۔ خود جمشید مرزا کی بھی حالت خراب تھی۔ گولیاں جس انداز میں اس کے سر پر سے گزری تھیں اگر ذرا سی بھی چوک ہو جاتی تو خود اس کی کھوپڑی بھی اڑ گئی ہوتی۔ زبردست قسم کا قاتلانہ حملہ تھا۔ پھر ملازموں کی آوازیں آس پاس سنائی دینے لگیں اور اسی وقت ایک آواز دروازے سے سنائی دی۔

"حق اللہ...... کیا آپ دونوں زندہ ہیں۔" جمشید مرزا خود بھی آپے سے باہر ہو گیا تھا۔

"ہاں زندہ ہیں۔ آپ باہر مر رہے ہیں۔"

"نہیں ہم بھی زندہ ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔" اسی وقت راشیل اور سیمل بھی بھاگی بھاگی آگئیں۔ سیمل نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"انکل آپ ٹھیک ہیں...... انکل...... انکل...... ماما دیکھئے انکل کو کیا ہو گیا...... انکل!"

"راحیل!" راشیل کی تیز چیخ ابھری اور اس نے راحیل کی طرف تیز چھلانگ لگائی لیکن راحیل خود اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ٹھیک ہوں۔ ٹھیک ہوں۔ ابھی کافی عرصے تک ٹھیک رہوں گا تم بالکل بے فکر رہو ڈارلنگ۔ دیکھئے جمشید صاحب! کون ہے؟" راحیل کے الفاظ بڑے احمقانہ تھے۔ اس کا مقصد یہ ہی تھا کہ باہر دیکھئے حملہ کرنے والا کون ہے۔ لیکن جمشید مرزا یہ بات جانتا تھا کہ بھلا حملہ آوروں کا اب کوٹھی میں کیا وجود ہوگا۔ رائے راحیل نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اب یہ بھی شروع ہو گیا۔ ہونا ہی تھا۔ میں تو نہ جانے کب سے اس کا منتظر تھا۔"

"حق اللہ" صوفی نے کہا اور تیزی سے وہاں سے کھسک گیا۔ رائے راحیل بری طرح چڑ گیا تھا لیکن اب صوفی کا وہاں کوئی وجود نہیں تھا۔

♥......♥......♥

دکان حکمت ظاہر ہے معشوق نشیلے ہی کی تحویل میں تھی۔ خوب رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ان دنوں دو تین مریض بھی آگئے تھے اور معشوق نشیلے ان کے مرض کا علاج کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ نہ جانے کیا کیا دوائیں دی جا چکی تھیں۔ بہت سی باتیں بتا چکے تھے جن کا تعلق حکمت سے تھا بہر حال پیسے بھی اچھے خاصے کما رہے تھے۔ گھر سے باہر ہی کھانا کھایا جاتا تھا۔ ایک دن تو ممن خان کے پاس پہنچے تھے۔ ممن خان نے انہیں دیکھ کر کہا۔

"آیئے۔ معشوق صاحب! آج کل فارسہ میں کچھ نہیں ہو رہا۔"

"بھائی! بس یہ جو شعر و شاعری ہے نا۔ یہ ایک ذرا الگ صیغہ ہے۔ آج کل ذرا دوسری طرف توجہ دی ہوئی ہے۔ اصل میں آپ لوگوں کو یہ بات معلوم نہیں کہ حکمت ورثے میں ملی ہے اور اندر ہی اندر زور مار رہی تھی کہ صوفی صاحب نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔"

"دکان حکمت کھول کر۔"

"ہاں۔ اصل میں بڑا حکیم وہاں میں ہی ہوں۔"

"خدا خیر کرے۔ کوئی بہت برا وقت آنے والا ہے صوفی صاحب پر۔" کسی نے کہا۔

"یار! دیکھو فارسہ میں بکواس مت کیا کرو۔" معشوق نشیلے برا مان کر بولے۔ بہر حال اس دن انہوں نے وہاں سب کو چائے پلائی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی مریض سے اچھی خاصی رقم مار لی تھی۔ دوا بے چارے کو جو کچھ بھی دی تھی وہ الگ بات تھی۔ وہ صوفی کے گھر میں رہتے تھے۔ حسینہ اور ان کا آگ اور پانی کا معاملہ تھا۔ عشق تو خیر ہوا ہو گیا تھا کیونکہ حسینہ ہی نے گھاس نہیں ڈالی تھی۔

معشوق نشیلے بھی ذرا دوسری طرف متوجہ ہو گئے تھے لیکن حسینہ سے چونچیں چلتی رہتی تھیں۔ اس دن بھی صبح ہی صبح اٹھے۔ پہلے مسواک کی پھر زور زور سے غرارے کرنے لگے۔ حسینہ کہیں سے نمودار ہوئی تھی۔ معشوق نشیلے کو دیکھ کر بولی۔

"بیڑہ غرق جس دن بھی صبح ہی صبح تمہاری شکل دیکھ لی سارا دن برا گزرا۔ اے میں کہتی ہوں کہ

اس وقت تو کہیں دوسری طرف جا کر مر جاؤ۔ جب تک صوفی صاحب گھر پر نہیں ہیں۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ گویا فارسہ میں آپ یہ فرمانا چاہتی ہیں۔"

"غرق ہو اپنی فارسہ سمیت۔ یہ کر کیا رہے تھے صبح ہی صبح۔ لگ رہا تھا جیسے کتے کی گردن پر چھری پھیر دی گئی ہو۔ بکرے کی آواز تو پھر بھی الگ ہوتی ہے۔"

"کالی کلوٹی بینگن لوٹی۔ میں خود صبح ہی صبح تیری شکل دیکھنے سے گریز کرتا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ جس دن صبح ہی صبح تیری شکل نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے بس دن بھر برا گزرتا ہے۔"

"تو مرتے کیوں نہیں ہو کہیں جا کر، کیوں یہیں مرے ہوئے ہو۔"

"کیوں کیا رخصت ہو کر اس گھر میں آئی ہو؟ باپ نے جہیز میں گھر دیا ہے۔"

"دیکھو باپ تک مت پہنچنا، اچھا نہیں ہوگا۔"

"اچھا تو کبھی ہوتا ہی نہیں ہے۔ چلو ناشتہ دو دکان پر جانا ہے۔"

"نوکر ہوں کیا تمہارے باپ کی جو ناشتہ دوں۔ رات سے سر میں درد ہے۔ میں نے ناشتہ نہیں تیار کیا۔"

"جانتا تھا...... جانتا تھا۔ کون سی بات چھپی ہوئی وہی نا کہ صبح کو تیری شکل دیکھ لی تو ناشتا تک نہیں ملے گا۔"

"ہاں ہاں جاؤ نہیں ملے گا۔ مفت خورے کم بخت ڈیرہ ڈال کر پڑ جاتے ہیں۔ یہ صوفی بھی کمال کا آدمی ہے خواہ مخواہ گندگی گھر میں جمع کر رکھی ہے۔"

"ہاں۔ اس میں کوئی شک نہیں کالی کیچڑ گھر میں جمع کر رکھی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حسینہ بیگم کہ تمہارے ہاتھ کا کھانا پینا بھی کھاتے ہوئے طبیعت پر ایک عجیب سی اکتاہٹ سوار ہو جاتی ہے۔ پتا نہیں ہاتھوں کا رنگ ہی چھوٹتا ہو کھانے میں۔"

"دیکھو...... دیکھو میرے منہ مت لگو۔"

"توبہ...... توبہ۔" تمہارے منہ لگنے کا مطلب یہ ہے کہ کم از کم تین گھنٹے تک مسواک کر کے اپنا منہ صاف کرلوں۔" حسینہ خود ہی چلی گئی تھی۔ معشوق نشیلے نے گردن ہلائی اور بولے۔

"چلو نشیلے آج صبح کا ناشتہ دکان پر ہی چل کر کریں گے۔ سامنے حلوہ پوڑی بنتی ہے۔ لیکن اس کم بخت کا منہ واقعی دیکھ لیا۔ صورت حال خراب نہ ہو جائے کہیں۔ انہوں نے لباس وغیرہ تبدیل کیا اور اس کے بعد باہر نکل آئے۔ بس میں سوار ہو کر اس علاقے کی طرف چل پڑے جہاں دکان حکمت تھی۔ بس سے اترے تو پاؤں مڑ گیا۔ لچک کھائی۔ وہ تو شکر ہے باقاعدہ موچ نہیں آئی تھی۔ دل ہی دل میں کئی بار لاحول پڑھی اور کہنے لگے۔

"خداوند کریم تیرا جس قدر شکر ادا کروں کم ہے۔ میں تو اس نامعقول عورت سے شادی کرنے جا رہا تھا۔ خدانخواستہ اگر شادی ہو جاتی تو صبح ہی صبح کس کا منہ دیکھنا پڑتا۔ اس کا پھر اور دن جو گزرتا۔"

"دکان پر پہنچے۔ دکان کھولی۔ جھاڑو لگائی۔ چیزیں قرینے سے رکھیں اور پھر یہی سوچ رہے تھے

ناشتہ لے آئیں کہ ایک گاڑی سامنے آ کر رکی۔ اس میں سے چار افراد اترے۔ تین غندوں جیسی شکل کے لگ رہے تھے۔ ایک کسی قدر شریف صورت آدمی تھا۔ چاروں کچھ اس طرح دکان کی طرف بڑھے کہ معشوق نشیلے کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔

"یہی تھا وہ۔" شریف صورت نظر آنے والے آدمی نے غندوں سے کہا۔

"چل بے باہر نکل۔ تیری حکیمی کی ایسی تیسی۔"

"ہیں...... ہیں...... ایں۔ کیا مطلب ہوا؟"

"کاہے کی دوا دی تھی تم نے مجھے۔" اس شخص نے کہا۔

"غالباً آپ نے فرمایا تھا کہ معدے میں درد ہے۔"

"ہاں۔ معدے میں درد تھا۔ تو نے کیا کہا تھا۔"

"میں نے یہی کہا تھا کہ معدہ آنتوں کی زد میں آگیا ہے اور آنتوں نے کنکھجورے کی طرح معدے پر پنجے گاڑ دیے ہیں۔"

"آنتوں میں پنجے ہوتے ہیں۔"

"نہیں۔ فارسہ میں محاورہ......"

"اور تو نے دوا جو دی تھی وہ کیا تھی؟"

"آپ کا کیا خیال ہے۔ آپ مجھے بتائیے کہ کیا ہوا؟"

"وہ دوا میرے لیے نہیں تھی۔ میں نے تجھ سے کہا تھا کہ میرے چھوٹے بھائی کو یہ تکلیف ہے۔"

"ہاں۔ ہاں...... پھر؟"

"اس کو ہیضہ ہو گیا۔"

"ارے واہ...... گویا دوا نے بھرپور کام کیا۔"

"کام کے بچے بری حالت ہے اس کی۔ اسپتال میں داخل کرانا پڑا ہے۔"

"یہی تو آپ لوگوں کی بدعقیدگی ہے۔ ارے بابا آنتوں کو معدے پر سے ہٹانے کے لیے جلاب ہونا ہی تھا...... فارسہ میں۔"

"مار واسے...... میرے بھائی کی جو حالت ہوگئی وہ اسی کی وجہ سے ہوئی ہے۔"

"نکل بے تیرے حکیم کی۔"

"دیکھیے...... دیکھیے...... حکمت کو گالی نہ دیجیے۔ بڑے بڑے لوگوں کے علاج کیے ہیں ہم نے۔ پمفلیٹ تک پیش کر سکتے ہیں۔ بہر حال آپ نے غلطی کی کہ انہیں اسپتال میں داخل کرا دیا۔ اللہ تعالیٰ شفا دے گا فارسہ میں۔"

"یار یہ تو پاگل آدمی لگتا ہے۔ تم آ کہاں سے گئے تھے۔" غندوں میں سے ایک نے کہا۔

"بس غلطی ہوگئی۔"

"غلطی ہوگئی...... ارے بھائی۔" معشوق نشیلے نے کہنا چاہا لیکن غندوں نے ایک تھپڑ اس کے منہ

پڑ دیا۔ اس کے بعد بہت سے تھپڑ، گھونسے اور لاتیں معشوق نشیلے پر پڑیں۔ اچھی خاصی پٹائی کرنے کے بعد لوگ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے اور معشوق نشیلے کا حلیہ بری طرح بگڑ گیا۔ ان کے منہ سے نکلا۔

''حسینہ تو غارت ہو جائے فارسہ میں۔ کیڑے پڑ جائیں تیرے بدن میں۔ ارے باپ رے بختوں نے بہت مارا ہے۔ حلیہ ہی خراب کر دیا۔'' اب اس کے بعد دکان پر بیٹھنا کس کے بس کی بات انہوں نے دکان بند کی اور لنگڑاتے ہوئے آگے بڑھ گئے پھر ممن خان کا ہوٹل یاد آیا اور وہ اس کی جانب پڑے۔ ہوٹل میں پہنچے تو بہت سے ہمدردوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

''ارے معشوق بھائی یہ کیا ہو گیا؟''

''یارو...... بس گر پڑے تھے۔ بڑی بری حالت ہے پورا بدن درد کر رہا ہے۔''

''آنکھ پر نیلا نشان ہے۔ رخسار پر نیلا نشان ہے۔ یہ بس سے گرنے کا تو نہیں ہو سکتا۔''

''معشوق ہیں بھائی کسی عاشق نے پٹائی کر ڈالی ہو گی۔''

''یارو! اس وقت اگر مناسب سمجھو تو ناشتہ کرا دو۔ سخت بھوک لگ رہی ہے۔ صبح ہی صبح یہ حلوہ کھا لیا۔'' معشوق نشیلے نے کہا اور کرسی پر بیٹھ کر ناشتے کا انتظار کرنے لگے۔

♥......♥......♥

صوفی اپنے مخصوص انداز میں پان چباتا ہوا باہر نکل آیا تھا اور اس کے بعد وہ ایک درخت نیچے جا کر کھڑا ہوا تھا۔ درخت کے پیچھے احاطے کی دیوار تھی۔ جس کے ساتھ ساتھ چوڑی کیاری بنی ہوئی صوفی ابھی تک اس صورت حال پر صحیح طریقے سے غور نہیں کر سکا تھا۔ سوچنے کے انداز میں نمایاں تبدیلی ہوئی تھی اور اب وہ بالکل پہلے جیسا صوفی نہیں تھا۔ گرین فورس کو باقاعدگی سے چلانا اس نے اپنی ذمہ سمجھ لی تھی۔

جنرل رحیم شاہ سے بھی اس کے بعد سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ رحیم شاہ نے خود اس سے کہا صوفی صاحب میں خود بھی ایک لمبے عرصے ریسٹ کرنا چاہتا ہوں۔ میری درخواست ہے کہ آپ میرے بالکل پریشان نہ ہوں اور پوری دل جمعی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہیں کسی دن میں خود آپ سے آ کر کر لوں گا۔ یہ میری شہر بدری جو ہے نا...... ایک طرح سے آپ یہ سمجھ لیجئے کہ میری مرضی سے ہے۔ ... میں اپنے لیے کچھ تھوڑا بہت کر بھی لیتا۔

''میں جانتا ہوں جنرل!'' صوفی نے اسے سلیوٹ کرتے ہوئے کہا تھا۔ بہر حال وہ ... کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ دفعتہ ہی اسے دھپ دھپ کی دو آوازیں سنائی دیں اور صوفی فوراً چونکا یقینی طور پر احاطے کی دیوار سے کوئی اندر کودا تھا اور اس نے چوڑی کیاریاں بہ آسانی عبور کر لی تھیں کو دو سائے نظر آئے اور صوفی درخت کے تنے کی آڑ میں سمٹ گیا۔

صورت حال کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ سائے سیاہ لباس میں ملبوس تھے اور انتہائی برق رفتاری دوڑتے ہوئے اندر کوٹھی میں داخل ہو گئے تھے۔ صوفی کو ایک دم کچھ احساس ہوا وہ ابھی یہ فیصلہ بھی نہ تھا کہ کیا کرے کہ اندر سے زبردست فائرنگ کی آواز سنائی دی۔

اور ظاہر ہے فائرنگ کرنے والے وہ دونوں سائے ہی ہو سکتے تھے۔ صوفی ایک لمحے تک سوچتا رہا۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ وہ دونوں بدحواسی میں واپس پلٹے اور اسی طرف آنے لگے۔ صوفی مستعد ہو گیا۔ دوڑنے والے بالکل اسی جگہ پہنچے تھے جہاں سے انہیں وہ دیوار عبور کرنی تھی۔ اچانک ہی صوفی زمین پر بیٹھا اور اس نے وہ داؤ مارا جو کبڈی میں کبڈی دینے والے کو گرانے کے لیے ہوتا ہے۔ ایک ہی ہاتھ آیا تھا۔ دوسرا پھرتی سے نکل گیا تھا۔ ہاتھ آنے والے کو اس نے ٹانگ سے پکڑ کر اسے نیچے گرا لیا اور اچھل کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔

''ب...... بہ خدا خود کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ زندگی سے محروم ہو جاؤ گے۔'' اس نے جھک کر اس شخص کی شکل دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ کھلا ہی ہوا تھا۔ مقامی ہی آدمی تھا۔ بالکل نوجوان لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ مارشل آرٹ کا ماہر بھی معلوم ہوتا تھا۔ صوفی چونکہ اس کے سینے پر چڑھا ہوا تھا۔ اس نے پیچھے سے اپنے دونوں پیر اٹھائے اور صوفی کی گردن میں لپیٹ کر پوری قوت سے نیچے کی جانب موڑ دیئے۔ صوفی الٹ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ شخص پھرتی سے قلابازی کھا کر اٹھا اور اس کے بعد اس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی لیکن اس بار وہ کیاری کی کیچڑ میں گرا تھا اور اس کے حلق سے ایک کریہہ آواز نکل گئی تھی۔ اس کے بعد وہ شاید پھرتی سے اٹھ کر دیوار کود گیا تھا۔

صوفی جب تک وہاں پہنچا وہ دونوں دیوار سے کود کر غائب ہو گئے تھے۔ صوفی نے اس کیاری کو دیکھا کوئی چھ فٹ چوڑی کیاری تھی لیکن دیوار کود کر آنے والے یقینی طور پر اس کیاری اور اس کے بعد اس جگہ جہاں انہیں جانا تھا اس کے بارے میں جانتے تھے کیونکہ اگر اجنبی لوگ دیوار سے نیچے کودتے تو کیاری میں گرتے لیکن انہیں کیاری کے بارے میں معلوم تھا اور انہوں نے اتنی لمبی چھلانگ لگائی تھی کہ کیاری کو عبور کر گئے تھے۔

بہر حال دونوں بہترین جمناسٹر تھے۔ اب صوفی کو اندر کی فکر ہوئی کیونکہ اندر جمشید مرزا بھی تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہنگامہ شروع ہو گیا تھا۔ ملازم اور کوٹھی کے رہنے والے تمام ہی افراد دوڑ پڑے تھے۔ صوفی نے جمشید مرزا اور رائے راحیل کو دیکھا اور اس کے بعد گہری سانس لی۔ بہر حال جو بھی ہنگامہ آرائی ہوتی رہی۔ صوفی اس سے لاتعلق ہی رہا تھا۔ البتہ جب یہ ہنگامہ ختم ہو گیا اور جمشید مرزا مہمان خانے کے بیڈ روم میں پہنچا تو صوفی بھی آ گیا تھا۔

''یار صوفی صاحب کیا کر رہے ہیں آپ؟''

''ارشاد فرمائیے کیا کریں؟ ہم آپ کے حکم سے انحراف نہیں کریں گے۔''

''مایا! حکم مجھے دینا ہے اگر میں اتنا ہی بڑا حاکم ہوتا تو آپ کو تکلیف کیوں دیتا۔''

''تو پھر بتایئے ہمارے لیے کیا حکم ہے۔''

''پھر وہ ہی...... آپ نے یہاں کی صورت حال کا جائزہ لیا۔''

''جی ہاں۔ ویسے آپ کا کیا خیال ہے گولی آپ پر چلائی گئی تھی یا رائے راحیل پر۔''

''یار دونوں ہی مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ وہ تو یوں کہو کہ قدرت کی نگاہ سیدھی تھی ورنہ ڈھیر ہو گئے تھے۔''

"ہاں۔ واقعی بات تو افسوس کی ہوئی پھر پتا نہیں پچاس لاکھ روپے ملتے یا نہ ملتے۔ میرے دل لاکھ بھی جاتے۔ آپ نے وہاں جو چکر چلا دیا تھا اس کا کیا مقصد تھا؟"

"پتا نہیں کیوں آج کل ہم بالکل بے مقصد ہو کر رہ گئے ہیں درویشوں کے کرم سے۔"

"نہیں صوفی صاحب! یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں جانتا ہوں آپ بے پروائی سے کام لے رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے ہمیں نوکری سے نکال دیجئے۔" صوفی نے جواب دیا اور جمشید مرزا اسے گھورنے لگا۔

"آپ اس سلسلے میں کوئی تبصرہ آرائی نہیں کریں گے؟"

"کریں گے۔" صوفی نے جواب دیا۔ جمشید مرزا پھر چونک پڑا۔

"وہ خاتون بہت خوب صورت ہیں۔ اللہ انہیں طویل زندگی عطا فرمائیے۔"

"چڑا رہے ہیں مجھے آپ؟"

"نہیں۔ ویسے یہ بتائیے کہ یہ فائرنگ کرنے والے کون تھے۔ باہر دیوار کود کر آئے تھے۔ کیاری میں ان کے پیروں کے نشانات بھی ہوں گے۔ ویسے وہاں کا جائزہ لینا صبح ہی کو زیادہ مناسب ہوگا۔ اس وقت آرام کرنا چاہیے۔ دوسروں کو متوجہ کرنا اچھا نہیں ہوگا درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"آپ کو یقین ہے کہ وہ احاطہ کود کر آئے تھے اور باہر ہی کے لوگ تھے۔"

"بالکل اسی طرح جیسے آپ کے منہ پر یہ ناک۔" صوفی نے جواب دیا۔

"بے تکلفی نہیں، بے تکلفی نہیں، ڈسپلن قائم رکھئے گا۔" اور صوفی لیٹے لیٹے اٹینشن ہو گیا۔ جمشید مرزا نے رخ بدل لیا تھا۔ دوسری صبح صوفی ہی نے جمشید مرزا کو بتایا۔

"محترم رائے راحیل صاحب صبح ہی صبح کہیں نکل گئے ہیں! اور وہ لڑکی پوری کوٹھی میں دندناتی پھر رہی ہے۔"

"غالباً یہی جملہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ویسے دن اور دنا یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ یا آپ اس کی کچھ وضاحت فرمائیں گے۔"

"یار دندناتی پھر رہی ہے سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"انگریزی میں اسے جوگنگ کہتے ہیں۔" صوفی نے جواب دیا اور جمشید مرزا اسے گھور کر رہ گیا۔ اس کی جھلاہٹ عروج کو پہنچتی جا رہی تھی۔ ابھی وہ کوئی جواب نہیں دینے پایا تھا کہ دروازے سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"اندر آ سکتی ہوں؟" انہوں نے راشیل کی آواز صاف پہچان لی تھی۔ جمشید مرزا نے جلدی سے بدن پر گاؤن ڈال لیا اور صوفی نے لمبی چھلانگ لگا کر شیروانی پر جھپٹا مارا تھا۔ راشیل اندر آ گئی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ پھر اس نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

"دیکھ لیا آپ نے وہ ڈراما اپنی آنکھوں سے۔" جمشید مرزا راشیل کو دیکھ کر موم کی طرح پگھل جاتا تھا۔ کہنے لگا۔

"آپ آیئے۔ تشریف رکھئے، آیئے آیئے پلیز۔" اور راشیل کرسی پر بیٹھ گئی جمشید مرزا نے کہا۔

"آپ کے الفاظ بڑے عجیب ہیں۔"

"آپ لوگ جب تک مجھے یہ نہیں بتائیں گے کہ آپ لوگ کون ہیں تو میرا خیال ہے ہمارے درمیان کوئی مناسب گفتگو ہو ہی نہیں سکتی۔"

"فدوی کو صوفی کے نام سے نوازا جاتا ہے۔ درویشوں کی رہنمائی میں زندگی گزاری ہے۔ بہت سے ایسے مرحلے آئے ہیں جب زندگی سے گریز کیا، لیکن زندگی نے ہم سے کبھی گریز نہیں کیا۔ بس کیا بتائیں آپ کو یوں سمجھ لیجئے کہ زندگی زیادہ اچھی نہیں گزری۔"

"صوفی صاحب! براہ کرم خاموش ہو جایئے۔" صوفی ایک دم چونک کر خاموش ہو گیا تھا۔ بالکل یوں لگا جیسے وہ بے خیالی کے عالم میں بولتا رہا ہو۔ جمشید مرزا نے کہا۔

"ہاں محترمہ! آپ نے رات کے واقعے کو ڈرامے کا نام دیا ہے۔"

"آپ اسے کیا نام دیتے ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"گویا آپ کے خیال میں یہ صرف ایک ڈراما تھا۔"

"جی ہاں۔ میں نے کہا نا کہ آپ کا خیال تو اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے جب مجھے آپ کے بارے میں پتا چل جائے۔"

"ہم صرف مہمان ہیں اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔"

"خیر آپ جو کچھ بھی ہیں میں آپ کو صرف اتنا بتانا چاہتی ہوں کہ یہ حملہ رائے راحیل نے آپ کے سامنے خود پر کرایا تھا۔ حملہ آور باہر کا کوئی شخص نہیں تھا بلکہ انہی کے اپنے آدمی تھے۔"

"پورے وثوق سے کہتی ہیں آپ یہ بات؟"

"جی ہاں۔"

"آپ نے کہا ہے کہ وہ رائے راحیل کے آدمی تھے۔" صوفی بولا اور راشیل چونک کر اسے دیکھنے لگی پھر بولی۔

"جی ہاں یہی کہا ہے میں نے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ ان میں سے کسی کو جانتی ہیں۔ رائے راحیل کے ان آدمیوں کے بارے میں بتایئے جو آپ کے خیال میں ان کی طرف سے یہ ڈراما کر سکتے ہیں؟"

"اتنا نہیں جانتی میں۔ یہ رائے راحیل کا وطن ہے اور یہاں اس کے بے شمار گرگے ہیں ویسے بھی ایک بڑے آدمی کے بہت سے ساتھی ہوتے ہیں۔"

"دولت کے بل پر۔" لقمہ دے کر صوفی خاموش ہو گیا۔

دروازے کی بیل بجی تو حسینہ معمول کے مطابق دروازے پر پہنچ گئی۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو ایک خوب صورت سا نوجوان نظر آیا جس کے پیچھے چھوٹے قد کا ایک بونا تھا۔ نوجوان کی شکل صورت دیکھ کر ہی نیز خوشی سے کھل اٹھی۔ حسن کسے نہیں بھاتا۔ اب یہ ضروری نہیں ہے کہ دل میں برے ارادے ہی ہوں۔

حسینہ نے فوراً ہی کہا۔

''چشمہ ماہ روشنی اور وہ کہتے ہیں کہ دل ماشادی۔ ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔''

''اے...... اے...... اے کالی بھوتنی فارسہ کا بیڑہ غرق مت کرو۔ پیچھے سے معشوق نشیلے کی آواز سنائی دی۔

''جھاڑو پھرے تیرے منہ پر کم بخت صبح سے آنکھیں بند کیے کیے پھر رہی ہوں کہ کہیں پہلی شکل تیری نظر نہ آ جائے۔ خدا نے میری سن لی تو جل کر کباب ہو گیا۔ دیکھ تو سہی چاند جیسی صورت اسے کہتے ہیں۔

حسینہ نے سامنے کھڑے ہوئے نوجوان کو دیکھتے ہوئے کہا جو حیرت سے آنکھیں پٹپٹا رہا تھا۔''

''اور کالی مائی کلکتے والی اسے کہتے ہیں بھائی صاحب!'' معشوق نشیلے نے سامنے کھڑے ہوئے شخص کو دیکھ کر کہا۔

''صوفی صاحب یہیں رہتے ہیں؟'' اس شخص نے سوال کیا۔

''پہلے آپ اس سے کہیے کہ فارسہ کی ٹانگ توڑنے پر معافی مانگے۔ میں یہاں فارسی کا عالم بیٹھا ہوا ہوں۔''

''کم بخت کو فارسی کا ایک لفظ نہیں آتا۔ اپنے ابا کے نام پر فارسہ فارسہ رگڑتا پھرتا ہے۔ میں کہتی ہوں فارسہ کون سے ملک کی زبان ہے رے۔''

''آپ لوگوں نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ صوفی صاحب یہاں رہتے ہیں نا۔''

''ارے رہتے تھے۔ آج کل نہیں ہیں۔''

''تم کہہ کیا رہی تھیں حسینہ بیگم!...... یہ بتاؤ پہلے۔''

''وہ جو اچھی شکلوں کو دیکھ کر کہا جاتا ہے۔ چل کوے!'' حسینہ نے پلٹ کر معشوق نشیلے سے کہا۔

''یعنی آپ شاید کہنا چاہتی تھیں کہ چشم ماہ روشن...... دل ماشاد''

''وہ تو کہہ فارسہ میں اپنی میرے جو دل میں آئی میں نے کہہ دیا۔''

''صوفی صاحب کہاں ہیں پلیز۔''

''ارے آؤ...... اندر آؤ۔ گھر تو انہی کا ہے۔ بتا دیں گے۔'' حسینہ نے کہا اور دروازہ چھوڑ دیا۔

نوجوان اندر داخل ہو گیا پھر اس نے کہا۔

''میرا نام سہیل عالم ہے اگر صوفی صاحب اندر ہیں تو براہ کرم انہیں اطلاع دیجیے کہ سہیل عالم اور ٹارزن آئے ہیں۔'' ٹارزن کے نام پر معشوق نشیلے بری طرح اچھل پڑے تھے۔

''آؤ، آؤ، آؤ...... اندر آؤ۔ قسم اللہ کی چائے پیے بغیر نہیں جانے دوں گی۔'' حسینہ نے کہا۔

سہیل عالم آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ ایک خوبصورت ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اس نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ صوفی سے ملاقات ہوئے کئی دن گزر گئے ملتا رہتا تھا۔ صوفی کی طرف سے کوئی رابطہ نہ ہوا تو اس دکان حکمت پر جا کر دیکھا۔ دکان بھی بند ملی تو اس پتے پر آ گیا جس کے بارے میں اسے معلوم تھا وہ گرین ہاؤس میں جا سکتا تھا۔ لیکن اس نے سوچا پہلے یہاں دیکھ لیا جائے۔ بہر حال حسینہ

نے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور بولی۔

''اچھا اب یہ بتا دو چائے کے ساتھ کچھ کھاؤ گے بھی۔''

''ارے نہیں، نہیں۔ آپ چائے کی تکلیف نہ کیجیے بس یہ بتایئے صوفی صاحب کہاں ملیں گے۔''

''ایک منٹ...... ایک منٹ کہہ دو بھائی صاحب کہ چائے کے ساتھ کچھ کھاؤ گے بھی مجھ بدنصیب کو صبح سے ناشتہ تک نہیں ملا ہے۔ ہمارے لیے ناشتہ بھی نہیں اور غیروں کے لیے وہ جو کہا ہے کسی نے کہ

سنا ہے غیر کی محفل میں تم نہیں جاؤ گے
کہو تو آج سجا لیں غریب خانے کو

فارسہ میں پتا ہیں اس شعر کا ترجمہ کیسے ہوگا۔ آپ اردو ہی میں برداشت کر لیجیے جناب!''
معشوق نشیلے نے سہیل عالم سے کہا۔

''اے...... تجھے تو ایک پیالی چائے بھی نہیں دوں گی مجھے سمجھا کیا ہے تو نے؟''

''معشوق نشیلے صاحب آپ تو دکان حکمت پر بیٹھے تھے؟''

''آئے ہاں...... مار کر بھگا دیے گئے۔ یہ دیکھیں آنکھ ابھی تک نیلی ہو رہی ہے۔ سنا ہے جوتے ہی جوتے پڑے تھے۔''

''حسینہ بیگم یہ آنکھ پر جوتا نہیں گھونسا پڑا ہے۔''

''لو قبول دیا۔'' حسینہ منہ پھاڑ کر ہنس پڑی۔

''ایسا کیجیے آپ مجھے صوفی صاحب کا پتا بتا دیجیے کہاں گئے ہیں؟''

''آئے بھیا! ہم ملازم ٹھہرے ہمیں کون بتا کر جاتا ہے۔''

''تو پھر مجھے اجازت دیجیے۔ میں انہیں کہیں اور تلاش کر لیتا ہوں۔'' سہیل عالم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''چائے نہیں پیو گے؟''

نہیں میں چائے نہیں پیتا

''اور یہ ٹارزن صاحب! یہ تو مجھے لگتا ہے کہ جنگل میں شیر اور چیتوں کا گوشت کھاتے رہے ہوں گے۔'' معشوق نشیلے نے کہا۔

''جی، جی، جی۔ افسوس یہ آدم خور بھی ہو چکے ہیں۔ آیئے ذرا چلتے ہیں۔'' سہیل عالم نے کہا۔

''مم...... میرا کیا دماغ خراب ہے؟''

''نہیں۔ تین دن سے بھوکے ہیں بے چارے۔ اصل میں ہم کسی ایسے انسان کی تلاش میں ہی نکلے تھے جو لاوارث ہو اور ٹارزن کی غذا بن سکے۔''

''اماں...... دماغ خراب ہوا ہے کیا۔ کک...... کیا کہتے ہیں فارسہ میں...... میں ہی رہ گیا تھا کیا۔ معشوق نشیلے نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آپ پوچھ لیں ٹارزن صاحب...... کیوں ٹارزن کیسا رہے گا یہ شخص۔'' ٹارزن نے نگاہیں گھما کر معشوق نشیلے کو دیکھا اور لمحوں کے اندر اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اس کے چہرے پر ایک خون

خوار تاثر پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ حسینہ بیگم نے ایک چیخ ماری اور دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی۔ معشوق نشیلے بھی اس کے پیچھے ہی لپکے تھے۔

''اے...... اے برے وقت میں کہاں ساتھ چھوڑے جا رہی ہو۔ بیڈ ٹائم اسٹوری...... بیڈ ٹائم اسٹوری فارسہ میں۔'' معشوق نشیلے نے کہا۔

''آؤ۔'' سہیل عالم بولا اور اس کے بعد وہ ٹارزن کے ساتھ عمارت کے گیٹ سے باہر نکل آیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ صوفی کہاں غائب ہو گیا۔ بہرحال گرین ہاؤس سے ہی چل سکے گا۔ ٹارزن نے کہا۔

''عجیب مسخرے لوگ تھے۔''

''ہاں۔ یہ ایک بڑی مزے دار جوڑی ہے۔ صوفی صاحب مجھے اس کے بارے میں بتا چکے ہیں لیکن پتا نہیں صوفی صاحب گئے کہاں؟'' پھر سہیل عالم اپنی رہائش گاہ پر ہی واپس آ گیا تھا لیکن ابھی وہ کوئی اور فیصلہ نہیں کر سکا تھا صوفی کی تلاش کے بارے میں کہ اسے گھر کی ٹیلی فون پر کال موصول ہوئی۔

''ہیلو۔''

''ہیلو...... پہچانے؟'' ایک آواز سنائی دی اور سہیل عالم غور کرنے لگا اور پھر وہ ایک دم چیخ پڑا۔

''نک کارسن!''

''ہاں۔ یار دماغ خراب ہو گیا تمہیں تلاش کرتے کرتے۔ عجیب ہے یہاں کا ماحول بھی۔ ہوٹل بمبینو میں کمرا نمبر 270 میں ہوں۔ آ جاؤ اور مجھے لے جاؤ۔''

''پہنچ رہا ہوں۔'' سہیل عالم نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ نک کارسن ایک خوف ناک نام تھا۔ بڑی سنسنی خیز شخصیت کا مالک نوجوان آدمی تھا۔ زبردست قسم کا جرائم پیشہ، چار سو بیسی اور قتل و غارت گری اس کا کام تھا۔ بہت ہی سفاک قسم کا آدمی تھا، لیکن سہیل عالم سے بری طرح مار کھائی تھی اس نے۔ سہیل نے اسے ایک ایسے جنجال میں پھنسا دیا تھا کہ اس کے بعد موت ہی اس کی گلوخلاصی کر سکتی تھی لیکن اس نے سہیل عالم کے قدموں پر سر رکھ دیا تھا اور کہا تھا:

''سہیل میں نے زندگی میں کبھی کسی کے سامنے ہار نہیں مانی، اگر تم معاف کر دو تو زندگی بھر تمہارا غلام بن کر رہوں گا۔'' اور سہیل عالم نے اسے معاف کر دیا تھا۔ اس کے بعد دونوں کی گہری دوستی ہو گئی تھی اور سہیل جب اپنے وطن آیا تھا تو نک کارسن نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ چاہے تو اسے اپنے ساتھ لے چلے، لیکن سہیل نے اس سے کہہ دیا تھا کہ حالات غیر یقینی ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے وطن میں اس کی کیسی پذیرائی ہو، اس لیے وہ پھر کبھی آ جائے اور شاید اسی وجہ سے وہ آ بھی گیا تھا۔

بہرحال اس کی شخصیت کافی دل کش تھی۔ سہیل نے فوراً ہی ٹارزن کو تیار کیا اور ایک بار پھر باہر نکل آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد سہیل کی کار ہوٹل بمبینو پر پارک ہو رہی تھی۔ کار کو پارک کرنے کے بعد دونوں باہر نکلے اور تھوڑی دیر کے بعد مطلوبہ کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ ناک کرنے پر اندر سے آواز آئی۔

''آ جاؤ'' سہیل اور ٹارزن اندر داخل ہو گئے۔ کرسی پر نک کارسن بیٹھا ہوا تھا لیکن اسے دیکھ کر سہیل دنگ رہ گیا۔ نک کارسن ایک تر و تازہ شخصیت کا مالک تھا۔ انتہائی پھرتیلا اور شان دار شخصیت کا نوجوان

لیکن سامنے جو شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے گال پچکے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے، ہونٹ خشک بال منتشر، بدن انتہائی لاغر لیکن چہرے کے نقوش سے سہیل نے اسے فوراً پہچان لیا۔ نک کارسن اسے دیکھ کر مسکرایا پھر بولا۔

''آؤ...... تماشا دیکھ رہے ہو نا۔''

''نک...... یہ کیا ہو گیا؟''

''بس یار وقت ہماری مٹھی میں تو نہیں ہوتا، وقت کی اپنی قوت ہے۔ ہم چاہے اپنے طور پر کتنا ہی آگے بڑھ جائیں، وقت سے نہیں لڑ سکتے۔ اصل میں بس سوچنے کے انداز میں فرق ہوتا ہے۔ صحیح راستہ انسان اسی وقت تلاش کر سکتا ہے جب اس پر کوئی مصیبت پڑ جائے۔''

''مگر نک......!''

''کچھ نہیں...... اعمال کی سزا ہے۔ ایک غلط جگہ پہنچ گیا تھا۔ ایڈز کی بیماری مول لے لی۔''

''ہیں! اچھا خیر...... ہاں تو سنو میرے دوست! اچھا خیر ذرا یہ بتاؤ فادر سے کیسے تعلقات چل رہے ہیں اور جو کچھ ہم کرتے رہے ہیں وہ سلسلہ جاری ہے یا نہیں؟''

''نہیں۔'' سہیل نے جواب دیا۔

''اوہو...... مجھے معلوم ہے کہ تمہارے ڈیڈی بہت دولت مند آدمی ہیں۔''

''نہیں۔ میں اپنے باپ کے ساتھ نہیں ہوں۔ بڑی مشکل سے میں نے ان سے یہ تسلیم کرایا کہ میں ان کی اولاد ہوں اور اس کے بعد میں نے ان کی کوئی پیش کش قبول نہیں کی۔''

''تو پھر ذریعہ معاش کیا ہے۔ تمہاری شہ خرچی کے بارے میں میں جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ دولت تمہارے قدموں تلے ہوتی ہے لیکن اب کیا پوزیشن ہے؟''

''آرام سے زندگی بسر ہو رہی ہے۔''

''کچھ کیے بغیر؟''

''یار! یہ میرا وطن ہے۔ میں اپنے اہل وطن کے ساتھ اچھے انسان کی حیثیت سے رہنا چاہتا ہو۔ اس لیے جرم کی راہ نہیں اپنائی۔ ضرورت کی ہر چیز میرے پاس موجود ہے۔''

''پر میرے دوست! میرے لیے تمہیں ایک کام کرنا ہو گا۔ میں پورے وثوق کے ساتھ اور اعتماد کے ساتھ یہاں تمہارے پاس پہنچا ہوں براہ راست۔ کوئی جرم نہیں ہے لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر تمہیں کوئی جدوجہد کرنی پڑ جائے۔''

''قتل کرنا ہے کسی کو؟''

''وہ نہ میں نے کیا اور جانتا ہوں کہ تم بھی نہیں کرتے۔''

''کام بتاؤ؟''

''بس اتنی سی بات ہے کہ کسی کو زندگی کی سولی پر نہ لٹکایا جائے اور اگر ایسا ہوا تو میں اپنے وطن میں برا نہیں ہونے دوں گا۔ نہ خود کروں گا نہ تمہیں کرنے دوں گا۔''

"کام کی نوعیت سمجھ لو اس کے بعد جیسا کہو گے ویسا کریں گے۔ تمہارے لیے میں وہ ایک لاکھ ڈالر چھوڑ دوں گا جن کی مجھے آفر کی گئی ہے۔ کیا خیال ہے۔"

"ہاں، ہاں......ضرور۔"

"یہاں کہیں آس پاس ہی ایک آبادی عادل پور کے نام سے جانی جاتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"عادل پور میں ایک شخص رائے راحیل کے نام سے رہتا ہے۔"

"ممکن ہے۔" سہیل نے جواب دیا۔

"یہ شخص کچھ عرصے پہلے وہاں تھا جہاں ہم لوگ موجود تھے۔ وہیں یہ اپنا کوئی بزنس کرتا تھا۔ ہمارے ہاں ایک عورت راشیل کے نام سے جانی جاتی تھی۔ راشیل کا اپنا ایک بزنس تھا۔ وہ دولت مند لوگوں سے رابطے قائم کرتی تھی اور انہیں اپنے چنگل میں پھانس کران کی دولت اپنے قبضے میں کرلیا کرتی تھی۔ اپنے طور پر اس نے اپنے آپ کو ایک بہت دولت مند عورت شو کر رکھا تھا۔ اس نے طرز زندگی بھی ایسا ہی اپنایا ہوا تھا۔ کیونکہ بہر حال اسے خاصے لوگوں سے بہت کچھ حاصل ہوا تھا۔ لیکن اتنا نہیں کہ وہ اس قدر دولت مند ہو جاتی جتنا اس نے خود کو ظاہر کر رکھا تھا۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات۔"

"ہاں...... بالکل۔"

"پھر اس نے رائے راحیل سے شادی کر لی۔ رائے راحیل کے بارے میں یہ بات سب ہی جانتے تھے کہ وہ اربوں کی دولت کا مالک ہے۔ رائے راحیل نے اس عورت سے شادی کر لی۔ اس کے ساتھ اس کی ایک بھتیجی سیمل بھی ہے۔ سیمل کو وہ اپنی بیٹی ظاہر کرتی ہے جب کہ سیمل اس کی بیٹی ہے نہیں، بھتیجی ہے۔ یہ بات منظر عام پر نہیں ہے۔ کچھ خاص ذرائع سے بس مجھے ہی معلوم ہوئی ہے۔ خیر، یہ کوئی اہم پوائنٹ نہیں ہے۔ وہاں شادی کرنے کے بعد رائے راحیل کو اچانک اپنے وطن آنے کی سوجھی اور وہ راشیل اور سیمل کے ساتھ یہاں آ گیا۔ عادل پور اس کی آبائی رہائش گاہ ہے۔ یہاں اس کا کافی وسیع کاروبار، دولت اور جاگیر پھیلی ہوئی ہے لیکن یہاں آنے کے بعد شاید اسے اس بات کا علم ہو گیا کہ راشیل ایک عام عورت ہے اور اس کے پاس کوئی بڑی دولت نہیں ہے۔ ظاہر ہے دونوں کے درمیان ایسا کوئی معاہدہ نہیں تھا جس کے تحت دولت کی کوئی شق آئی ہو۔ راشیل کو یہاں آ کر یہ احساس ہوا کہ راحیل کو یہ بات معلوم ہونے کے بعد کہ وہ ایک قلاش عورت ہے رائے راحیل اس کی زندگی کا دشمن ہو گیا ہے۔ وہ ایک چالاک عورت ہے۔ اس نے فوری طور پر اپنے سفارت خانے سے رابطہ قائم کر لیا۔

اور وہاں شاید تھوڑی سی تفصیل بھی بتا دی اور کہا کہ اب اسے اپنے شوہر سے زندگی کا خطرہ ہے۔ بہر حال ایک طرف تو اس نے اپنی پوزیشن مضبوط کر لی۔ دوسری طرف وہ شاید رائے راحیل سے کچھ رقم کا مطالبہ بھی کرنا چاہتی ہے۔ اب وہ رقم کچھ تو نہیں ہوگی بہت کچھ ہوگی۔ اس نے مجھے ایک لاکھ ڈالر کی پیشکش کی ہے اور مجھے اپنی مدد اور تحفظ کے لیے بلایا ہے غالباً اس رقم کے حصول کے لیے وہ مجھ سے کوئی کام لینا چاہتی ہے۔"

"کیا کام......؟" سہیل عالم نے سوال کیا۔

"یہ اس سے ملاقات کے بعد ہی معلوم ہوگا۔ بہر حال میں بہت زیادہ تمہید نہیں باندھوں گا۔ مختصراً الفاظ میں تفصیل تمہارے علم میں آ گئی ہے۔ میرا خیال ہے میں اسے پوری طرح مطمئن نہیں کر سکوں گا کیونکہ میری کارکردگی صفر ہو گئی ہے۔ پھر میری حالت بھی ایسی نہیں ہے چنانچہ میرے دوست یہ کام میں تم سے چاہتا ہوں۔ تم میری جگہ یہ کام سرانجام دو گے۔ لیکن میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا اگر تمہارا دل گواہی دے جہاں تک رقم کا مسئلہ ہے یہ رقم میری ضرورت ہے۔ میں اسے اپنے علاج کے لیے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن پھر بھی اگر تم چاہو تو......"

سہیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا اور بولا۔

"اتنے اعتماد کے ساتھ آئے ہو نک کارسن! تو میری بے عزتی مت کرو اور سنو! تمہارے علاج کے لیے وہ ہی رقم ضروری نہیں میں تمہیں......"

"اگر تمہارے پاس کچھ بندوبست ہو سکے تو ضرور دے دینا مجھے۔ کبھی انکار نہیں کروں گا لیکن اگر یہاں سے یہ رقم حاصل ہو جائے تو پھر میں یہاں سے سیدھا جاپان جاؤں گا اور وہاں اپنا علاج کراؤں گا۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے، مگر وہاں کرنا کیا ہوگا مجھے؟"

"کچھ نہیں، نک کارسن کے نام سے تم راشیل سے ملو گے۔ راشیل نے تمہیں میرا مطلب ہے مجھے سیمل کا منگیتر ظاہر کیا ہے۔"

"سیمل اس منصوبے میں اس کے ساتھ ہے؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔"

"ہوں۔ یہ تو واقعی دلچسپ معاملہ ہے۔ ٹھیک ہے میں چلا جاؤں گا۔ تم یہاں آرام سے رہو۔ تارزن تمہاری ہر طرح دیکھ بھال کرے گا۔ تمہیں یہاں سے میرے گھر منتقل ہونا ہوگا۔"

"کوئی ایسی بات نہیں ہے میں ہوٹل......"

"بالکل نہیں یار! کیسی باتیں کرتے ہو۔ میرے گھر آئے ہو تو پھر ہوٹل میں کیوں ٹھہرو گے۔ ویسے مجھے کب جانا ہے۔"

"بس راشیل انتظار کر رہی ہوگی۔ تم نک کارسن کی حیثیت سے اس کے پاس پہنچو گے۔"

"میک اپ......؟"

"ہاں بالکل یقینی طور پر اس نے کہیں نہ کہیں نک کارسن کو دیکھا ہوگا تب ہی اس نے بڑے اعتماد سے مجھ سے رابطہ قائم کر لیا ہے اور یہ بات میں جانتا ہوں کہ میرا میک اپ تم کس طرح کر لیتے ہو پہلے بھی کئی بار کر چکے ہو۔" سہیل ہنسنے لگا پھر بولا۔

"یہاں آ کر میں نے یہ سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ خیر ٹھیک ہے، ہو جائے گا۔" سہیل نے جواب دیا اور پھر تارزن کو نک کارسن کے بارے میں ہدایت دینے لگا۔

♥......♥......♥

رائے راحیل نہ جانے کہاں غائب رہتا تھا آتا تھا اور پھر چلا جاتا تھا۔ بہرحال صوفی نے ابھی تک اس بارے میں کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ حالانکہ یہ ایک عجیب سی بات تھی کہ رائے راحیل نے خود ہی بلایا تھا اور اس کے بعد ان کے ساتھ اس طرح سلوک کر رہا تھا۔ اس پر صوفی اور جمشید کے درمیان گفتگو ہو گئی۔ جمشید مرزا نے سیمل کی کار واپس منگوا دی تھی۔ اس نے اپنے خاص ماتحت کو ہدایت کی تھی کہ اسے ٹھیک کرا لیا جائے اور عادل پور پہنچا دیا جائے۔ کار آنے سے سیمل بہت خوش ہوئی تھی اور اس نے جمشید مرزا کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر کہا تھا۔

''کوئی نہ کوئی واقعہ دوستی پکی کر دیتا ہے۔ ہماری دوستی پکی۔'' جمشید مرزا نے دیر تک اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔

''میرا ہاتھ چھوڑو۔''

''دوستی جب پکی ہو جاتی ہے تو ہاتھ آسانی سے نہیں چھوڑے جاتے۔'' جمشید مرزا نے رومانی شکل بنا کر کہا۔

''فی الحال تو چھوڑ دو مجھے جانا ہے۔'' صوفی کی موجودگی یا غیر موجوگی ایسے موقعوں پر کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ ہاں جب وہ چلی گئی تو جمشید مرزا نے کہا۔

''صوفی صاحب! بس تقدیر کی بات ہے ویسے تقدیر نے ہمیشہ ہی میرا ساتھ دیا ہے۔ اب آپ دیکھ لیجئے کہ کیا عیش ہو رہے ہیں۔''

''اس میں کوئی شک نہیں ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔'' جمشید مرزا اب سنبھل گیا تھا۔ یہ اندازہ اسے ہو گیا تھا کہ صوفی پان اور درویشوں کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں سن سکتا۔ وہ بڑے کام کا آدمی تھا اس لیے جمشید مرزا اسے ہاتھ سے نکالنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسے یاد تھا کہ پانوں کی ڈبیا کے سلسلے میں صوفی نے اس کا کیا حشر کر دیا تھا۔ بہرحال اس وقت سیمل کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔

''ایک عجیب سا حسن ہے اس کی شخصیت میں۔''

''حق اللہ......''

''یار ویسے ایک بات بتاؤ صوفی صاحب! یہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے خوف زدہ ہیں۔ شوہر کہتا ہے کہ بیوی فراڈ ہے اور بیوی شوہر کو ظالم ظاہر کرنا چاہتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے اگر رائے راحیل کوئی غلط کردار کا ہے تو ان حالات میں وہ کیا کر سکے گا؟''

''عورت کے معاملے میں کوئی بھی...... آہیں بھرنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا۔''

''ایک سوال میں آپ سے کرتا ہوں صوفی صاحب! فرض کیجئے راشیل اگر کوئی گہرا منصوبہ لے کر آئی ہے تو کیا یہ لڑکی سیمل...... میرا مطلب ہے اس کی بیٹی اس کی راز دار ہے۔''

''سو فیصدی۔'' صوفی نے جواب دیا۔ جمشید مرزا اچھل پڑا۔

''کک...... کیا مطلب؟ آپ کا مطلب ہے کہ اگر کوئی مجرمانہ کارروائی ہو رہی ہے تو سیمل بھی اپنی ماں کی ساتھی ہوگی؟''

''سو فیصدی۔''

''وجہ......؟''

''اگر وہ اس کے ساتھ نہ ہوتی تو اس طرح یہاں نہ آ جاتی۔''

''کیا بات بنی؟''

''درویش بہتر جانتے ہیں۔''

''بھائی آپ کیا جانتے ہیں اور دوسری بات کہ آپ کر کیا رہے ہیں یہاں۔ صوفی صاحب! میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ یہاں بالکل ڈل ہوئے بیٹھے ہیں۔ میں نے آپ کو ایک بہت بڑی رقم کی پیشکش کی ہے۔ وہ بلاوجہ تو نہیں دوں گا۔''

''تقدیر میں ہوگی تو مل جائے گی۔ نہیں ہوگی تو آپ کے فرشتے تک نہیں دے سکتے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔'' جمشید مرزا جھلا گیا تھا۔ عموماً ایسا ہی ہوتا تھا لیکن اس وقت اس کی جھلاہٹ سیمل کی آمد نے ختم کر دی۔

''گڈ...... آپ لباس بدل کر بیٹھے ہیں۔ آیئے میں آپ کو سیر کرانے لے چلوں۔''

''ارے واہ...... آپ کہاں تکلیف کریں گی۔''

''اپنے کندھوں پر بٹھا کر نہیں لے جاؤں گی میں آپ کو گاڑی میں لے چلوں گی آیئے۔''

''ٹھیک ہے صوفی صاحب! ہم لوگ ذرا جا رہے ہیں۔'' جمشید مرزا نے جوش سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور صوفی منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ جمشید مرزا سیمل کے ساتھ باہر نکل گیا تھا۔ صوفی نے ایک گہری سانس لی اور اس کے بعد ادھر ادھر دیکھنے لگا پھر ایک کاغذ کی شیٹ اور بال پوائنٹ اسے حاصل ہو گیا تھا۔ غالباً اس کی نگاہیں اسی کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ اس نے کاغذ کی شیٹ کو ایک سینٹر ٹیبل پر پھیلایا۔ اس کے کونے دبائے اور پھر اس پر کچھ بنانے لگا۔ انسانی شکل کی ایک تصویر تھی جو صوفی نے کاغذ پر بنائی تھی۔ تقریباً بیس منٹ تک وہ اس پر محنت کرتا رہا تھا اور پھر اس وقت چونکا جب اس نے عقب میں ایک سایہ سا محسوس کیا۔

تصویر میں وہ کچھ اس طرح منہمک ہو گیا تھا کہ اسے راشیل کی آمد کا بھی پتا نہیں چلا پھر جب اس نے چونک کر دیکھا تو اسے راشیل نظر آئی اور صوفی کے حلق سے ایک آواز نکل گئی۔

''در...... در...... درویش رحم کریں۔'' راشیل کی آنکھیں صوفی کی بنائی ہوئی تصویر پر جمی ہوئی تھیں پھر اس کی آواز ابھری۔

''تم اسے کیسے جانتے ہو؟'' صوفی نے چونک کر راشیل کو دیکھا پھر مدھم لہجے میں بولا۔

''درویش رحم کریں۔ یہ ہماری خالہ زاد پھوپھی کا خالہ زاد سالا لگتا ہے۔ درویشوں کے کرم سے۔''

''مجھے بتاؤ گے نہیں تم اسے کیسے جانتے ہو؟''

''بتائیں گے، ضرور بتائیں گے...... لیکن ایک شرط پر۔''

''شرط؟''

''ہاں۔''

''اچھا شرط بھی رکھو گے اب تم مجھ سے کیا شرط ہے۔''

''پہلے آپ یہ بتائیے کہ آپ اسے کیسے جانتی ہیں۔''

''یہ اکثر رائے صاحب کے پاس آتا رہتا ہے۔''

''کون ہے، کہاں رہتا ہے کچھ نہیں معلوم۔''

''رائے صاحب! اسے جمشید کہہ کر بلاتے ہیں اور ایک مرتبہ انہوں نے اس کے گھر کے بارے میں بات کی تھی۔ غالباً ایاز ہوٹل ہے جہاں یہ رہتا ہے۔ اب یہ نہیں بتاؤ گے کہ تم اس کی تصویر کیوں بنا رہے تھے۔'' صوفی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور مدھم لہجے میں بولا۔

''یہ ہمارا بچھڑا ہوا پھوپھی زاد سالا ہے۔''

''یہ کیا رشتہ ہوا؟''

''ہمارے سارے رشتے ایسے ہی آگے پیچھے ہوا کرتے ہیں درویشوں کے کرم سے۔ پان نوش فرماتی ہیں آپ؟''

''پان......؟''

''یہ......یہ......یہ۔''

''چھی......کیا ہے یہ؟'' وہ ناک چڑھا کر بولی۔ ایک ملازم آیا اور اس نے کہا۔

''رائے صاحب آ گئے ہیں آپ کو تلاش کر رہے ہیں۔''

''اوہو......چلو ٹھیک ہے تم سے پھر بعد میں بات کروں گی۔'' راشیل یہ کہہ کر پلٹی ہی تھی کہ رائے راحیل اندر گھس آیا۔ صوفی ایک دم سے سینٹر ٹیبل پر بیٹھ گیا تھا۔

''ان لوگوں کو کیوں تنگ کر رہی ہو تم؟ میں پوچھتا ہوں یہاں کیوں آئیں۔''

''راحیل...... راحیل یہ کیا ہے؟ کیا اب میری یہی اوقات رہ گئی ہے تمہاری نگاہوں میں کہ اجنبیوں کے سامنے مجھے ڈانٹ رہے ہو۔'' راشیل کا لہجہ نرم تھا۔

''یہ جیمس کون ہے جو یہاں آیا ہے۔''

''جیمس۔''

''ہاں، تمہیں پوچھتا پھر رہا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کون ہے یہ۔''

''آہ......کیا جیمس آیا ہے اطلاع دی تھی اس نے مجھے کہ وہ آ رہا ہے میں نے تمہیں بتایا تھا کہ سیمل کا منگیتر ہے۔ ایک مہم جو، جو مہم جوئی پر گیا ہوا تھا کافی عرصے کے بعد آیا ہے۔''

''مجھے تو تم نے ایسی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔''

''میں نے تمہیں سیمل کے منگیتر جیمس کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ کیا اب تمہاری یادداشت بھی تمہارا ساتھ چھوڑتی جا رہی ہے۔''

''آؤ میرے ساتھ۔ آؤ میں بتاتا ہوں کہ میری یادداشت ساتھ چھوڑتی جا رہی ہے اور سنو۔''

کوئی بھی ہے اسے زیادہ عرصے یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ سمجھیں۔''

''آؤ تم سب کے سامنے میری بے عزتی کر کے شاید کوئی بڑی خوشی محسوس کر رہے ہو۔'' راشیل نے کہا اور اس کے بعد دونوں باہر نکل گئے۔ صوفی نے ایک مدھم سی آواز حلق سے نکالی تھی۔

''حق اللہ، اللہ۔'' اور اس کے بعد وہ تصویر سے اٹھ گیا تھا پھر اس نے تصویر کی طرف رخ کر کے کہا۔

''حمیدو...... ایاز ہوٹل۔'' اور اس کے بعد اس نے تصویر اٹھائی اور اسے تہہ کر کے شیروانی کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔

♥......♥......♥

سہیل نک کارسن کے میک اپ میں عادل پور پہنچ گیا۔ نک کارسن نے اسے بتا دیا تھا کہ راشیل اس کا اصل نام جانتی ہے لیکن وہ اسے جیمس کہہ کر مخاطب کرے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی نک کارسن نے سہیل عالم بارود والا کو اور بھی بہت سی تفصیلات بتائی تھیں۔ یہ بھی بتایا تھا اس نے کہ نک کارسن کی حیثیت سے رائے راحیل اسے نہیں جانتا، یعنی اس ملک میں جہاں راشیل اور رائے راحیل رہائش پذیر تھے۔

راشیل تو یہ بات جانتی تھی کہ نک کارسن اس طرح سے لوگوں کے لیے کام کر دیا کرتا ہے لیکن رائے راحیل کو کبھی اس سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ بہر حال وہ اس عالی شان کوٹھی میں داخل ہو گیا جس وقت وہ گیٹ پر پہنچا اور ٹیکسی سے اترا اسی وقت ایک شان دار لینڈ کروزر بھی گیٹ پر آ کر رکی تھی۔ نک کارسن کی حیثیت سے وہ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس ہاتھ میں لیے ہوا تھا جس میں نک کارسن کے تمام تر کاغذات جو جیمس ہی کے نام سے بنے ہوئے تھے موجود تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے کچھ لباس وغیرہ۔

چوکیدار نے اس سے سوال کیا کہ وہ کون ہے تو اس نے بتایا کہ اس کا نام جیمس ہے اور وہ میڈم راشیل کی دعوت پر یہاں آیا ہے۔ چوکیدار نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ لینڈ کروزر وہاں پہنچ گئی تھی۔ رائے راحیل اس میں موجود تھا۔ اس نے سہیل کو دیکھا اور بولا۔

''ہیلو ینگ مین خیریت کس سے ملنا چاہتے ہو۔''

''سر! میڈم راشیل کا مہمان ہوں باہر کے ملک سے آیا ہوں۔'' سہیل نے اس ملک کا نام لیا جہاں راشیل رہتی تھی۔

''میڈم نے تمہیں بلایا ہے؟''

''نہیں سر! سیمل میری منگیتر ہے۔''

''کیا!!!......؟ آؤ...... بیٹھو۔'' رائے راحیل نے ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والا دروازہ کھول دیا اور اسے بٹھا کر پورچ تک لایا پھر بولا۔

''ہاں۔ اب بتاؤ کیا کہہ رہے تھے تم۔'' اس نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے پوچھا۔

''آپ شاید رائے راحیل ہیں۔''

''ہاں۔ کوئی اعتراض ہے تمہیں۔''

''سر میں سیمل کا منگیتر ہوں اس سے ملنے آیا ہوں۔ میڈم راشیل نے مجھے یہاں کا پتا دیا تھا۔''

بہت عرصے سے میری منگیتر سے ملاقات نہیں ہوئی جب سے وہ یہاں آئی ہے۔ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ کا رویہ تو زیادہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔'' رائے راحیل نے فوراً ہی اپنا موڈ بدلا اور بولا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے، آؤ میرے ساتھ۔'' یہ کہہ کر وہ اسے اندر لایا۔

''پلیز تمہیں تھوڑی دیر بیٹھنا پڑے گا میں ابھی آتا ہوں۔'' اس نے کہا اور سہیل کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر باہر نکل گیا۔ سہیل کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھر رہی تھی۔ واقعات اب ایک دلچسپ صورت میں داخل ہو گئے تھے اور سہیل یہ سوچ رہا تھا کہ نک کارسن کی حیثیت سے اسے یہاں خاصی دلچسپیوں سے واسطہ پڑے گا۔ یہ شخص رائے راحیل ذرا بدمزاج اور اکھڑ قسم کا آدمی معلوم ہوتا ہے محتاط بھی رہنا پڑے گا۔

بہر حال یہ پچوئیشن دلچسپ تھی لیکن رہ رہ کر اسے صوفی یاد آ رہا تھا۔ پتا نہیں صوفی صاحب کس چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس نے سوچا پھر اچانک ہی اسے باہر آہٹیں سنائی دیں اور اس کے بعد جو عورت اندر داخل ہوئی اسے دیکھ کر سہیل نے دل ہی دل میں اعتراف کیا تھا کہ ایسی خوب صورت عورتیں کم ہی نگاہوں سے گزرتی ہیں۔ وہ خود بھی کھڑا ہو گیا راشیل کے ساتھ رائے راحیل بھی تھا اور اب یقیناً کوئی دلچسپ معرکہ ہونے والا تھا۔

سہیل کا اپنا بھی کوئی تجربہ تھا۔ ایک لمحے کے اندر اندر اسے اندازہ ہو گیا کہ رائے راحیل انتہائی شاطر آدمی ہے اس کی تیز اور گہری نگاہیں راشیل اور سہیل کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں دماغ میں گھس جانے والی قوت تھی۔ لیکن راشیل بھی انتہائی چالاک عورت تھی اس کے چہرے پر پھوٹنے والی محبت دیکھنے کے قابل تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور سہیل کی طرف دوڑی۔

''اوہ جیمس...... مائی ڈیئر جیمس...... جیمس...... تم۔'' سہیل خاموشی سے گردن جھکائے کھڑا رہا۔ راشیل نے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔ پھر اس نے سہیل کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''رائے...... یہ میرا بیٹا ہے۔ مجھے اپنے اصلی بیٹوں کی طرح عزیز ہے سیمل کا منگیتر ہے یہ اور راحیل تم نہیں جانتے کہ اس کے لیے میرے دل میں کتنا پیار ہے۔''

''اسی لیے آنٹی بغیر کسی اطلاع کے یہاں آ گئی تھیں اور مجھے اپنا پتا تک نہیں دیا۔'' سہیل نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''سوری مائی ڈیئر جیمس...... سوری۔ اصل میں حالات ہی ایسے تھے کہ مجھے اتنی ہی خاموشی سے یہاں آنا پڑا لیکن بس کچھ وقت کی بات اور تھی میں تمہیں یہاں کے بارے میں اطلاع دیتی۔'' راحیل اس دوران خاموش کھڑا رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد اس نے کہا۔

''سیمل کہاں ہے؟''

''باہر نکلی ہوئی ہے تمہارے اس مہمان کے ساتھ۔''

''ہوں! میرا خیال ہے۔ تمہیں جیمس کی خاطر مدارت کرنی چاہیے۔ اگر اسے یہاں رکنا ہے تو پھر کہیں اس کے لیے بندوبست کرنا ہوگا۔'' راشیل نے چونک کر رائے راحیل کو دیکھا اور بولی۔

''کہاں بندوبست کرنا ہوگا۔ اتنی بڑی کوٹھی میں کیا میرے بیٹے کے لیے جگہ نہیں ہے۔''

''نہیں تمہیں اندازہ تو ہے راشیل! کہ اس وقت ہمارے ہاں خاصے مہمان ہیں اور پھر۔''

''تم جاؤ میں اس کا بندوبست خود کرلوں گی۔ جاؤ...... آرام کرو۔'' راشیل کا لہجہ انتہائی سخت ہو گیا رائے راحیل نے اسے چونک کر دیکھا۔ پھر اس نے اپنے چہرے کے نقوش بدل لیے۔

''اوکے...... اوکے...... میں تو صرف اس لیے کہہ رہا تھا کہ کہیں تمہارے مہمان کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ ویسے کیا سیمل بتا کر گئی ہے کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔''

''مجھے نہیں بتا کر گئی۔ پلیز...... تم جاؤ۔'' راشیل نے کہا اور رائے راحیل باہر نکل گیا۔ سہیل دلچسپی سے اس ماحول کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ راشیل خاصی اپ سیٹ ہو گئی ہو۔ وہ بالکل خاموش کھڑی رہی اور چند لمحات کے بعد وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔ سہیل ایک گہری سانس لے کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ راشیل اندر آئی اور اس نے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا۔

پھر وہ سہیل کے سامنے صوفے پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

''تمہیں یہاں تک پہنچنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی۔ نک کارسن۔''

''نہیں میڈم! آپ نے مجھے مکمل تفصیل بتا دی تھی۔ میں آرام سے یہاں پہنچ گیا۔''

''آہ...... میں تمہیں فوراً ہی ساری حقیقتیں بتائے دیتی ہوں۔ پلیز میری مدد کرو۔ میں نے انتہائی مجبوری کے عالم میں تمہیں یہاں بلایا ہے۔''

''جی...... میڈم جی! آپ بتائیے مجھے اور راشیل مدھم لہجے میں اسے اپنی کہانی بتانے لگی۔ سہیل دلچسپی سے اس کی روداد الم سن رہا تھا۔

♥......♥......♥

جمشید مرزا بہت خوش تھا۔ سیمل جیسی حسین لڑکی کا التفات معمولی بات تو نہیں تھی۔ سیمل اسے نیپال پور کے نواحات کی سیر کراتی پھر رہی تھی۔ دونوں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے حالانکہ ابھی تک سیمل نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جو جمشید مرزا کو ساتویں آسمان پر پہنچا دے۔ لیکن جمشید مرزا جیسا حسن پرست آدمی اس کی قربت سے ہی سیراب ہو گیا تھا۔ البتہ سیمل کی گفتگو کا انداز بڑا محبت بھرا تھا۔ اس نے کہا۔

''حالانکہ یہ وطن تمہارا ہے۔ میں نے تو باہر کی دنیا میں زندگی گزاری ہے اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے ممالک دیکھے ہیں میں نے لیکن میں یہ بات کہنے میں حق بہ جانب ہوں کہ یہاں کی فضا مختلف ہے۔ یہاں ایک ندرت ہے۔ بے شک باہر کی دنیا بہت ترقی یافتہ ہے۔ یہ پہاڑ، یہ برفانی چوٹیاں اور یہ وسیع و عریض میدان اور جنگل ہیں۔ یہاں انسانی ہاتھوں کی عمل داری نہیں ہے اور یہی شاید ان کی خوب صورتی ہے۔ ہوائیں بھی یہاں اپنی مرضی سے ہی چلتی ہیں۔

''آپ تو اچھی خاصی شاعری کر لیتی ہیں سیمل!''

''ہاں...... جب قدرت کے حسن کا تاثر دل میں ہو تو ہر بات شعر بن جاتی ہے۔''

''خدا کی پناہ...... خدا کی پناہ...... اگر آپ لکھنا شروع کر دیں تو میرا خیال ہے کہ آپ کی تحریریں بہترین ہوں۔ ویسے مس سیمل! شاعری کا حق تو ہر ایک کو پہنچتا ہے۔''

"شعر......! یہی ہے حقیقتوں کے اظہار کا نام۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں کچھ بندشیں ہیں۔ لیکن یہ دیکھ لیجئے کہ باہر کی دنیا کی شاعری بھی بندشوں سے آزاد ہے۔"

"قیامت ڈھا رہی ہیں آپ سیمل......اور اگر شعر کی آزادی ہر شخص کو ہے تو میں بھی ایک شعر کہنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں......ہاں ضرور......ضرور......" سیمل نے کہا۔

"وہ شعر یہ ہے سیمل......کہ

آپ کے بدن کی خوشبو آپ کی قربت زندگی کی شام ہے
اس کے بعد کوئی اور آرزو دل میں باقی نہیں رہ جاتی

"ارے واہ......آپ نے تو مجھ پر ہی شعر کہہ دیا۔"

"ان پر فضا مقامات پر اور ان حسین فضاؤں میں۔ طبیعت پر جو بھی کیفیت نہ طاری ہو جائے کم ہے وہ دیکھئے کیا خوب صورت جگہ ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے قدرت نے کسی دلہن کی سیج سجا دی ہو۔ جمشید مرزا اس وقت زمین آسمان ایک کر دینا چاہتا تھا۔ اشارہ ایک ایسے پھولوں بھرے ٹیلے کی طرف تھا۔ جو تھا تو مٹی کا تودہ لیکن اس پر اس طرح پھول کھلے ہوئے تھے کہ ان پھولوں نے پورا ٹیلہ ڈھک لیا تھا اور واقعی ایک دیوار سی بنی ہوئی تھی۔ جمشید مرزا کا اشارہ اسی طرف تھا۔ سیمل نے گاڑی کا رخ اسی طرف کر دیا اور جمشید مرزا مسکرا دیا۔

"واقعی بہت حسین جگہ ہے۔" کچھ دیر کے بعد وہ اس ٹیلے کے قریب پہنچ گئے اور سیمل نے گاڑی روک دی۔

"آیئے......سر! دلہن کی اس سیج سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ بولی اور جمشید مرزا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ان الفاظ کے بہت سے معنی نکل سکتے تھے۔ جمشید مرزا کا سانس پھولنے لگا۔ سیمل نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ وہ ان پھولوں کو دیکھ رہی تھی اور اس کے انداز میں بڑی اپنائیت تھی۔ جمشید مرزا سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے یہ تو بات بالکل اتفاقیہ طور پر بہت آگے بڑھ گئی۔ ابھی اس کے حواس پوری طرح ساتھ نہیں دے پا رہے تھے کہ اچانک ہی اسے کچھ قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی اور دوسرے لمحے وہ پلٹا۔

وہ تین افراد تھے۔ جنہوں نے چست لباس پہنے ہوئے تھے اور ان کے چہرے نقابوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ تینوں کے ہاتھوں میں پستول نظر آ رہے تھے۔ جمشید مرزا ہونقوں کی طرح منہ پھاڑ کر رہ گیا تھا۔

"چلو آگے آؤ۔" ان میں سے ایک کی بھاری آواز ابھری۔

"کک......کک......کون......کون ہو تم۔" جمشید مرزا نے کہا۔ اسی وقت ان میں سے ایک نقاب پوش آگے بڑھا۔ جمشید مرزا بری طرح بدحواس ہو گیا تھا۔ اس کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے ہاتھ پیروں میں جان ہی نہ رہ گئی ہو۔ اس طرح اچانک وہ تینوں نظر آئے اور ایک ایسے ماحول میں جس میں جمشید مرزا کسی بھی مداخلت کے لیے تیار نہیں تھا۔

چنانچہ وہ ان لوگوں سے مقابلہ نہیں کر سکا اور ان میں سے آگے بڑھنے والے نے ایک رومال جمشید مرزا کی ناک پر رکھ دیا۔ کلورو فارم کی بو ایک لمحہ میں محسوس ہو گئی تھی جمشید مرزا نے ہاتھ پاؤں چلائے

چاہے۔ اسی وقت اسے سیمل کی زوردار چیخ سنائی دی۔ بس یہ آخری احساس تھا۔ جو جمشید مرزا کو ہوا اور اس کے بعد اس کے حواس تاریکی میں کھو گئے۔ دوبارہ جاگا تو ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں تھا۔ جس میں اسپتال کی طرح چار پانچ بستر لگے ہوئے تھے۔ پلنگ بھی اسپتال جیسے ہی تھے۔ ایک لمحے کے لیے تو اس ماحول کو دیکھ کر جمشید مرزا کو بھی احساس ہوا کہ وہ اسپتال میں ہے۔ لیکن پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کے اپنے خیال کی تردید ہو گئی۔

دو افراد اندر آئے ہیں۔ ان کے چہرے نقابوں ہی میں چھپے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے جمشید مرزا کے پلنگ کے قریب پہنچ کر کہا۔

"اٹھو۔"

"س......سنو......تت......تمہیں کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔" ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر جمشید مرزا کا گریبان پکڑا اور پوری طاقت سے اسے کھڑا کر دیا۔

"چلو آگے۔" اس نے ریوالور کی نال جمشید مرزا کی پیٹھ سے لگاتے ہوئے کہا۔ اور جمشید مرزا آگے بڑھ گیا۔ ایک لمحے کے لیے اسے غصہ آیا تھا۔ لیکن دو ریوالور سامنے تھے ایک پیچھے ایک آگے۔ کوئی بھی کوشش نقصان اٹھانے کے علاوہ کچھ نہیں دے سکتی تھی۔ وہ لوگ اسے اس بڑے ہال سے نکال کر چھوٹے کمرے میں لائے اور یہاں آتے ہی انہوں نے اس پر لاتوں، گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔

"اچھی خاصی مرمت کی گئی تھی جمشید مرزا کی اور جمشید مرزا کے منہ سے بے مقصد آوازیں نکلتی رہی تھیں۔ وہ لوگ جیسے مارنے کی مشین بنے ہوئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے جمشید مرزا کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اور جمشید مرزا زمین پر گر پڑا تھا۔ ان میں سے ایک نے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

"ہاں......اب اپنے بارے میں جو کچھ بھی ہے۔ صاف صاف بتا دو۔" ان میں سے ایک نے کہا اور جمشید مرزا کی ران پر ایڑی سے دباؤ ڈالا۔ جمشید مرزا کے حلق سے ایک زوردار چیخ نکل گئی تھی۔ پھر اس نے بمشکل تمام کہا۔

"آدمی کے بچے بنو۔ یہ جو تم جنگلی بھیڑیئے بن گئے ہو۔ اس کی ضرورت نہیں ہے کیا پوچھنا چاہتے ہو۔ مجھے بتاؤ۔" انہوں نے جمشید مرزا کو سیدھا کر کے بٹھا دیا پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"جمشید مرزا۔"

"کہاں سے آئے ہو یہاں؟"

"دارالحکومت سے؟"

"کیوں آئے ہو؟"

"رائے راحیل نے بلایا ہے۔"

"کیوں؟"

"وہ کچھ مشکل حالات کا شکار ہے۔ ہمارا تعلق محکمہ پولیس سے ہے۔ وہ اپنی بیوی راشیل کے

بارے میں تحقیقات کرانا چاہتا ہے۔"

"کیوں؟ سی آئی ڈی والے ہو۔"

"نہیں...... اسپیشل پولیس سے تعلق ہے۔"

"اور وہ دوسرا...... گدھا؟"

"کچھ نہیں، وہ صرف گدھا ہے۔ میرے ساتھ آ گیا ہے۔ عام طور سے میرے پیچھے پیچھے لگا پھرتا ہے۔ میرا دوست ہے۔"

"پولیس میں ہے۔"

"نہیں بھائی میں نے کہا ناں...... بس یوں سمجھئے میرے حاشیہ برداروں میں سے ہے۔ نہ جانے کس طرح جمشید مرزا کی عقل کام کر گئی تھی۔ اس نے کم از کم صوفی کو چھوڑ دیا تھا۔

"ہوں...... تو کیا معلومات حاصل کیں تم نے راشیل کے بارے میں۔"

"ابھی آئے ہوئے وقت ہی کتنا گزرا ہے...... وہ لڑکی میرا مطلب ہے راشیل کی بیٹی کہاں ہے۔" براہ کرم مجھے اس کے بارے میں بتا دو۔"

"وہ ہمارے لیے بے مقصد تھی۔ اسے چھوڑ دیا گیا ہے۔ لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم نے راشیل کے بارے میں کیا معلومات حاصل کیں۔"

"جو دل چاہے قسم لے لو۔ یا جس طرح جی چاہے تحقیقات کر لو۔ میں نے تو ابھی اپنے کام کا آغاز بھی نہیں کیا ہے۔"

"ہوں...... اب کیا چاہتے ہو۔ زندگی یا موت......"

"ظاہر ہے زندگی چاہتا ہوں۔"

"تو جاؤ اپنا سامان اٹھاؤ اور یہاں سے دفع ہو جاؤ...... لیکن ایک بات غور سے سن لو۔ اگر کوئی ذرا برابر گڑ بڑ...... کی تو یہ صرف آخری موقع ہو گا تمہاری زندگی کے لیے ہم کسی کو بے مقصد نہیں مارنا چاہتے۔ اس لیے ہم تمہیں زندہ چھوڑ دے رہے ہیں۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا اسے بھول جاؤ اور صرف زندگی بچ جانے پر خوشی مناؤ۔ ابھی تھوڑی دیر بعد تمہیں رائے راحیل کی کوٹھی پہنچا دیا جائے گا۔ سمجھ رہے ہو۔ لیکن جو کیا جا رہا ہے اس کے خلاف نہیں کرتا ہے۔"

"ٹھھ...... ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔" جمشید مرزا نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے کہا [illegible] میں سے ایک شخص نے آگے بڑھ کر ایک بار پھر جمشید مرزا کی ناک پر کلورو فارم میں بھیگا ہوا رومال رکھ دیا [illegible]

اور اس کے بعد پھر جمشید مرزا کو ہوش آیا تھا۔ لیکن ہوش آنے کے بعد اس نے قرب و جوار کے ماحول کو دیکھا۔ بہت دیر تک سوچنے سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ ایک درخت کے نیچے پڑا ہوا تھا اور [illegible] ایک عمارت نظر آ رہی تھی۔ قرب و جوار میں حیران تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا [illegible] اس نے اپنے لباس پر نگاہ ڈالی۔ ظاہر ہے زمین پر پڑا رہنے سے جو حالت ہو سکتی تھی یا پھر ان لوگوں نے اس کی [illegible] پٹائی کی تھی اس کے بعد لباس کی یہی کیفیت ہونی چاہیے تھی۔

مگر یہ جگہ کون سی ہے؟ جمشید مرزا اندازے لگاتے رہا اور پھر اس کے بعد وہ اٹھ کر عمارت کی جانب چل دیا۔

عمارت کی بغلی سمت سے گھوم کر وہ سامنے آیا تو ایک دم اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ رائے راحیل کی عظیم الشان کوٹھی ہے۔ جہاں ان دونوں کا قیام تھا۔ جمشید مرزا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ بدن کی جو کیفیت تھی۔ اس پر تو ابھی غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ لاتوں، تھپڑوں اور گھونسوں نے جو حلیہ بنا دیا تھا۔ قابل دید تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس حالت میں وہ کوٹھی میں داخل ہو گا تو کیا ہو گا"

اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ سیمل ساتھ نہیں تھی۔ جب کہ یہاں والوں کو معلوم تھا کہ وہ سیمل کے ساتھ ہی گیا ہے۔ کافی دیر تک کھڑا سوچتا رہا۔ بدن کی کیفیت کہہ رہی تھی کہ جلد ہی کچھ نہ کچھ ہو جانا چاہیے ورنہ وہیں زمین پر گر پڑے گا۔ بہر حال وہ لڑکھڑاتے قدموں سے گیٹ تک پہنچا۔ چوکیدار نے دروازہ کھول دیا اور پھر حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

جمشید مرزا کو وہ اچھی طرح پہچانتا تھا۔ لیکن جمشید مرزا رکے بغیر آگے بڑھتا رہا۔ پھر اس کی نگاہیں اس جیپ پر پڑیں جو سامنے ہی کھڑی تھی۔ اسی جیپ میں وہ دونوں باہر گئے تھے۔ سیمل کے بارے میں ان لوگوں نے بتایا کہ وہ ان کے لیے بے کار شخصیت تھی اس لیے ان لوگوں نے اسے چھوڑ دیا۔ اس کا مطلب ہے سیمل اندر موجود ہے۔ پتا نہیں اس کی کیا کیفیت ہے؟ لازمی بات ہے کہ یہاں آنے کے بعد اس نے جمشید مرزا کے بارے میں بتا دیا ہو گا کہ اسے اغوا کر لیا گیا ہے۔

جمشید مرزا اپنی شخصیت بڑی مخدوش سمجھ رہا تھا۔ بے شک اس کے ذہن میں ایک منصوبہ تھا وہ یہ کہ صوفی کی ذہانت سے فائدہ اٹھائے۔ اس کی کارکردگی کو کیش کرے۔ اور اس طرح کے پرائیویٹ کیس لے کر صوفی کو ان کے لیے استعمال کرے اور دولت کمائے۔ لیکن یہاں تو الٹی آنت گلے پڑ گئی تھی۔ اس طرح کے واقعات میں ایسی مشکلات کا سامنا پڑ سکتا ہے۔ اس نے سوچا نہیں تھا لیکن اگر اس طرح زندگی خطرے میں پڑ جائے تو سب سے پہلے اپنے بچاؤ کا بندوبست کرنا چاہیے۔

بہر حال مہمان خانے میں داخل ہو گیا۔ صوفی کو تلاش کیا مگر صوفی یہاں موجود نہیں تھا۔ سب سے پہلے اس نے لباس تبدیل کیا۔ بدن کی جو کیفیت تھی اس کا تو کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ کوئی ایسی دوا بھی نہیں تھی جو فوری طور پر بدن کی اس دکھن کو دور کر دے۔ بس اس کا دل چاہ رہا تھا کہ لیٹ کر سو جائے۔ لیکن وہ سب کافی خطرناک معلوم ہوتے تھے اسے اور اس نے سوچا تھا کہ اگر اس طرح وہ لیٹ کر سو گیا تو ہو سکتا ہے دوبارہ اٹھنا اسے نصیب نہ ہو۔

چنانچہ باہر نکلا کچھ ملازموں سے صوفی کے بارے میں معلوم کیا تو پتا چلا کہ وہ کوٹھی سے باہر گیا ہوا ہے۔ یہ تو بڑی گڑ بڑ ہو گئی۔ اب کیا کروں؟ یہ بھی دل چاہا کہ راشیل سے یا گھر کے کسی اور فرد سے اس سلسلے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ لیکن پھر عقل نے ساتھ دیا اور اس نے سوچا کہ سیمل جب ملے گی تو اس طرح کے سوالات کیے جائیں گے بلکہ ہو سکتا ہے کہ کچھ اور بھی کہا جائے۔ پولیس کو اس بارے میں اطلاع دینے کی کوشش کی جائے۔ جمشید مرزا کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ اگر وہ ایسی کوششوں میں پڑا تو زندگی سے

ہاتھ دھونے پڑ جائیں گے۔

چنانچہ بہتر یہ ہے کہ یہیں سے کھسک لیا جائے۔ بعد میں صوفی کو اس بارے میں کوئی نہ کوئی اطلاع دے دی جائے گی۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ یسمل نے واپس آنے کے بعد صوفی کو اس بارے میں بتایا ہو۔ تو صوفی اسے تلاش کرنے نکل پڑا ہو۔ ابھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔ اس خیال کے تحت کہ ہوسکتا ہے کہ صوفی نے اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی ہو۔ لیکن دوسری طرف سے ایک اجنبی آواز سنائی دی۔

''جمشید مرزا؟''

''کک......کک......کون؟''

''تم کوٹھی پہنچ چکے ہو۔ لیکن ابھی تک کوٹھی سے باہر نہیں نکلے سامان وغیرہ یہیں چھوڑ دو۔ ضروری چیزیں ساتھ لے لو اور خاموشی سے باہر نکل آؤ۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے ورنہ تمہیں گھاس کی طرح کاٹ دیا جائے گا۔'' لائن بے جان ہوگئی۔ جمشید مرزا کے بدن میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس وقت یہ ہی ضروری تھا کہ ان کی ہدایت پر عمل کیا جائے۔ لباس وغیرہ جہنم میں جائیں۔ جو بہت ہی ضروری چیزیں تھیں وہ اس نے اپنے ساتھ رکھیں صوفی سے بعد میں رابطہ قائم کر لیا جائے گا۔ بلکہ کوشش کی جائے گی کہ جلد ہی صوفی سے رابطہ قائم ہو جائے یہی غنیمت تھا کہ ابھی تک یسمل راشیل یا خود رائے راحیل اس سے نہیں ٹکرائے تھے۔ جمشید مرزا کو ایک دم یہ احساس ہوا کہ یہ ہنگامہ اس وقت زندگی کو لاگو بن گیا ہے۔ نکل لو یہاں سے تو بہتر ہے اور اس کے بعد وہ مہمان خانے سے باہر نکل آیا اور ٹہلنے کے سے انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ اس کی گاڑی بھی موجود نہیں تھی۔ ظاہری بات ہے کہ صوفی اسے لے کر گیا ہوگا۔

بہر حال صوفی گاڑی کہاں لے جائے گا۔ سب کچھ پہنچ ہی جائے گا۔ اس خطرے سے نکلا جائے اور اس کے بعد صوفی سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ وہ گیٹ سے باہر نکل آیا اور پیدل چل پڑا۔ بدن کی کیفیت اسے آگے بڑھنے سے روک رہی تھی۔ چنانچہ ایک گزرتے ہوئے آٹو رکشہ کو روکا اور اس میں بیٹھ گیا۔ چند لمحے سوچتا رہا کہ کہاں جائے۔ آٹو رکشہ ڈرائیور نے اس سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ وہ بس رکشا ڈرائے جا رہا تھا۔ چند ہی لمحوں کے بعد جمشید مرزا کو خیال آیا کہ آٹو رکشا ڈرائیور نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا ہے۔ اس نے کہا۔

''کہاں لے جا رہے ہو بھائی؟''

''ریلوے اسٹیشن جناب! آپ کے حق میں یہی بہتر ہے کہ دارالحکومت جانے والی کسی بھی ٹرین میں بیٹھ جائیں اور یہاں سے رفو چکر ہو جائیں۔ زندگی اس طرح کھونے کی چیز تو نہیں ہے۔'' رکشہ ڈرائیور نے کہا اور جمشید مرزا کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پھر وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگیا۔ اس وقت اتنی سکت نہیں تھی کہ آٹو رکشا ڈرائیور سے الجھا جائے۔

ڈرائیور نے اسے ریلوے اسٹیشن پر اتارا اور کچھ لیے دیے بغیر آگے بڑھ گیا۔ جمشید مرزا نے دل ہی دل میں سوچا بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ ایک ایک لمحہ اس کی نگرانی کر رہے ہیں واقعی ان حالات میں

یہاں رکنا زندگی کھونے کے مترادف تھا۔ چنانچہ وہ ٹکٹ گھر کی جانب بڑھ گیا۔

♥......♥......♥

صوفی اپنے مخصوص حلیے میں ایاز ہوٹل میں داخل ہوگیا۔ ہوٹل میں قدم رکھتے ہی ایک لمحے کے اندر اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ ہوٹل...... ہوٹل کم اور جرائم کا اڈہ زیادہ ہے باہر سے اس کی کنڈیشن کافی بہتر تھی لیکن اندر سے حال بری طرح خراب ہو رہا تھا۔ سگریٹوں کے خالی ڈبے مختلف کھانے پینے کی اشیاء کے ریپر جابجا بکھرے ہوئے تھے۔ بعض ٹیبلوں پر باقاعدہ تاش کی بازی جمی ہوئی تھی۔ صوفی کی نگاہوں نے ایک لمحے میں اندازہ لگا لیا کہ یہاں منشیات کا دھواں بھی چکرا رہا ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ یہ باقاعدہ جرائم کا اڈہ ہے۔

صوفی نے ادھر ادھر دیکھا اور ایک خالی میز کی جانب بڑھ گیا۔ میز پر بیٹھ کر اس نے ایک نگاہ پورے ہال پر ڈالی۔ لمبے چوڑے بدمعاش ٹائپ کے کچھ لوگ ہال میں چکراتے پھر رہے تھے دروازہ بے شک کھلا ہوا تھا لیکن وہاں بھی دو تین افراد چکر لگا رہے تھے۔ اس کا مقصد ہے کہ یہاں باقاعدہ منشیات کا استعمال ہوتا ہے خرید و فروخت بھی ہوتی ہوگی۔ باہر کا ماحول بھی سنبھال لیا گیا تھا۔ صوفی کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ جگہ اس قدر خطرناک ہوگی۔

بہر حال جب آ گیا تو درویشوں کا حکم۔ ایک ویٹر اس کے پاس آ گیا اور اس نے کہا۔

''ہاں......کیا چاہیے؟''

''ایک چائے ملے گی درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''کیا؟'' ویٹر نے چونک کر اسے دیکھا۔

''چچ......چائے پیارے بھائی صاحب''

''یہاں چائے نہیں بکتی۔''

''تت......تت......تو پھر؟''

''بغیر پوچھے اندر گھس آئے ہو۔''

''نہیں وہ حمید بھائی نے بلایا تھا اور کہا تھا کہ میز پر بیٹھ کر ان کا انتظار کریں۔'' ویٹر ایک دم سنبھل گیا اور بولا۔

''حمیدو نے بلایا ہے تمہیں۔''

''جج......جی بھائی صاحب! یہ ایاز ہوٹل ہی ہے نا؟'' ویٹر اسے گھورتا رہا اور اس کے بعد خاموشی سے واپس چلا گیا۔ خاصی دیر تک وہ نہیں آیا تھا۔ صوفی بدستور بیٹھا الوؤں کی طرح نظریں گھماتا رہا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد وہی ویٹر چائے کے برتن لیے ہوئے آ گیا اور اس نے برتن صوفی کے سامنے رکھ دیئے۔

''درویش تمہارا بھلا کریں۔ چائے کی بڑی طلب ہو رہی تھی۔ ویسے ایک بات بتاؤ۔ حمیدو بھائی سے ملاقات نہیں ہوگی۔''

''تمہارا پیغام پہنچا دیا گیا ہے۔ آتے ہوں گے وہ تھوڑی دیر کے بعد۔ یہ چائے انہوں نے ہی تمہارے لیے بھجوائی ہے۔'' ویٹر نے جواب دیا۔

"درویش تم سب کا بھلا کریں۔" صوفی نے کہا اور چائے کے برتن اپنی جانب سرکا لیے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی نگاہیں قرب وجوار کا جائزہ لینے لگیں۔ یہ چائے بے معنی نہیں ہوسکتی۔ اس ماحول میں واقعی آنے جانے والے پر نگاہ تو رکھی جاتی ہی ہوگی۔ بہر حال وہ پیالی میں چائے بنانے لگا۔ یہ چائے لازمی طور عام چائے نہیں ہوگی۔ بلکہ اس میں کوئی کارروائی ہونا ضروری ہے۔ صوفی نے چائے بنا کر اسے ہونٹوں کے قریب کیا۔ لیکن اصل میں اس کی لمبی ناک چائے پر جھک گئی تھی اور ایک لمحے کے اندر اندر اس نے اندازہ لیا کہ چائے میں ایک مختلف طرح کی بو موجود ہے اور یہ بو کسی نشہ آور دوا کی تھی۔ صوفی نے اس طرح چائے کی پیالی کو دو تین بار چہرے کے قریب کیا۔ جیسے وہ باقاعدہ چائے پی رہا ہو۔

قرب وجوار میں کوئی جگہ ایسی نہیں تھی۔ جس میں چائے انڈیلی جاسکتی۔ چنانچہ چار پانچ سپ لینے کے بعد اس نے بڑی احتیاط سے چائے دانی کا ڈھکن کھولا اور آدھی چائے اس میں انڈیل دی۔ یہی ایک ذریعہ ہوسکتا تھا۔ پھر چائے کی پیالی پلیٹ میں رکھ کر وہ اس طرح آنکھیں پھاڑنے لگا۔ جیسے آنکھوں میں نیند گھسی چلی آرہی ہو۔ دیر تک وہ اسی طرح آنکھیں پھاڑتا اور کھولتا رہا۔ اور پھر اس کے بعد اس نے اپنا سر پر لٹکا دیا۔ یہ ایک ضروری کوشش تھی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اسے نشہ آور دوا دے کر وہ لوگ کیا کرنا چاہتے ہیں۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ چار آدمی اس کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھالیا۔ یہاں نشہ آور ادویات استعمال کر کے کوئی بھی شخص اس طرح بے ہوش ہوسکتا تھا۔ چنانچہ یہاں والوں کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ لوگ صوفی کو اس طرح بغل میں لٹکائے باہر لے گئے۔ صوفی کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن ان میں سے کسی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ دزدیدہ نگاہوں سے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا اور پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

ان لوگوں کو اسکی گاڑی کے بارے میں بھی پتہ چل گیا تھا۔ لازمی بات ہے کہ جب اس کے بارے میں تحقیقات ہوئی ہوگی تو یہ پتا چل گیا ہوگا کہ وہ کون سی گاڑی میں آیا ہے۔ وہ جمشید مرزا ہی کی گاڑی تھی اور اس گاڑی میں صوفی کو دوبارہ ڈال دیا گیا۔ ایک شخص نے ڈرائیونگ سنبھال لی۔ دو صوفی کے دائیں بائیں بیٹھ گئے اور ایک ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر اور اس کے بعد کار اسٹارٹ ہو کر چل پڑی۔

بہر حال صوفی یہاں آیا ہی اس مقصد کے تحت تھا کہ کوئی کام شروع ہو سکے اور اب اس کی دانست میں اسے زبردست کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ گاڑی کوئی پینتیس منٹ سفر کرتی رہی اور اسکے بعد رک گئی۔

"اٹھو......" کسی نے کہا اور دروازہ کھول کر صوفی کو باہر نکال لیا گیا۔ صوفی نے اس طرح اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑے ہوئے تھا۔ جیسے بالکل ہوش وحواس میں نہ ہو۔ ابھی صورت حال ایسی ہی تھی۔ چنانچہ وہ لوگ اسے لیے ہوئے اسی عمارت میں داخل ہوگئے۔ جس کے احاطے میں گاڑی کھڑی کی گئی تھی اور پھر اسے بڑی بے دردی سے ایک خالی کمرے کے فرش پر ڈال دیا گیا۔ صوفی بے حس وحرکت زمین پر لیٹا رہا تھا کسی نے کہا۔

"آدھے گھنٹے میں ہوش میں آجائے گا۔ آؤ......" اور اس کے بعد وہ لوگ کمرے سے باہر نکل گئے۔ صوفی کے منہ سے آہستہ سے نکلا۔

"حق اللہ...... درویش رحم کریں۔" یہ الفاظ ادا کرنے کے بعد وہ اطمینان سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

جیب میں پانوں کی ڈبیا اور بٹوہ تلاش کیا۔ دونوں چیزیں نکال کر سامنے رکھیں پھر ایک گلوری منہ میں دبائی۔ قوام، چھالیہ، تمباکو وغیرہ تمام لوازمات منہ میں ڈالے اور جگالی کرنے لگا۔ آنکھیں بند تھیں۔ لیکن اسے یہ احساس نہیں ہوسکا کہ چند ہی لمحات کے بعد کسی نے دروازے سے اندر جھانکا تھا اور صوفی کو اس طرح بیٹھے دیکھ کر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ پھر اس کے بعد وہ خاموشی سے واپس پلٹ گیا اور چند لمحوں کے بعد پانچ افراد بھرا مار کر اندر داخل ہوگئے۔ صوفی نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور پھر زور زور سے جگالی کرنے لگا۔ وہ سب حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر ان میں سے کسی نے پوچھا۔

"تمہیں ہوش آگیا؟"

"قم...... قمبا...... قم...... قم۔" صوفی نے اپنی زبان سے کہا۔ وہ سب شدید حیرانی کا شکار تھے۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

"کوئی گڑبڑ لگتی ہے چلو اٹھاؤ اسے۔" وہ صوفی کے قریب آئے اور اس کے بعد انہوں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے کھڑا کر دیا۔ پھر ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر صوفی کی جیبوں کی تلاشی لے ڈالی۔ اس میں ایک پرس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ جس میں تھوڑی سی رقم کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ پانوں کی ڈبیہ اور بٹوہ باہر ہی رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے اسے بھی کھول کر دیکھا اور کسی ہتھیار کو موجود نہ پا کر وہ صوفی کو اسی طرح سنبھالے ہوئے ایک بڑے کمرے میں لے آئے۔ یہاں ایک اور شخص موجود تھا اور وہ حمیدو تھا۔ جو اسے سخت نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ اس نے بہ غور صوفی کو دیکھا اور بولا

"نہیں، میں نہیں جانتا۔ پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ بٹھاؤ اسے۔" صوفی کو ایک کرسی پر حمیدو کے سامنے بٹھا دیا گیا۔

"کون ہے تو؟ کیا نام ہے تیرا؟"

"غلغل...... بفل......"

"اسے باتھ روم میں لے جاؤ اور اس کا یہ اگال دان صاف کرو۔ حمیدو نے بگڑی ہوئی آواز میں کہا۔ اور ان لوگوں نے پھر صوفی کو اٹھالیا۔ باتھ اس بڑے کمرے سے ملحق ہی تھا۔

واش بیسن میں صوفی نے پان تھوکا کلیاں کیں اور پھر بولا۔

"خدا کی لعنت ہو تم پر۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔ ابھی تو قوام کا سرور چڑھا ہی تھا۔ مرو...... کیوں مر رہے ہو۔ کیا بھونکنا چاہتے ہو کتے کے پلو۔" ان میں سے ایک نے پیچھے سے صوفی کی گردن پر ہاتھ مارا اور اسے کھینچتے ہوئے باہر لے آئے۔ حمیدو نے اسے دیکھا اور بولا۔

"ہاں...... کون ہے رے تو۔"

"کسی حجام کی اولاد معلوم ہوتے ہو۔ طریقہ گفتگو بالکل نہیں جانتے درویشوں کے کرم سے۔"

"بتاؤں میں تجھے طریقہ گفتگو اس کی یہ کھال اتار دو۔" حمیدو نے صوفی کی شیروانی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اے...... اے...... اے دیکھو۔ عزت سے بات کرو۔ ورنہ بخدا ہم بھی جلال میں آجائیں گے۔"

درویشوں کے فرستادے ہیں۔ بزرگوں سے یہ انداز گفتگو نہ اختیار کرو۔ ورنہ تباہی تمہارا مقدر بن جائے گی۔"

"ابھی بتاتا ہوں...... ابھی بتاتا ہوں۔" حمیدو نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک الماری کی طرف بڑھ گیا۔ پھر الماری سے اس نے چمڑے کا ایک ہنٹر نکال لیا تھا۔ اس دوران ان لوگوں نے صوفی کی شیروانی اتار کر ایک طرف ڈال دی تھی۔

"پپ...... پپ...... پان چھالیہ۔ اسے احترام سے ایک طرف رکھ دو۔"

"قمیص بھی اتار دو اس کی۔" یہ بھی تعمیل کی گئی اور حمیدو نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس ڈھانچے کو دیکھا پھر بولا۔

"اگل دے شرافت سے کون ہے کیوں میری تلاش میں آیا تھا ورنہ...... دو چمڑے کے ہنٹر ماروں گا اور یہ ساری پسلیاں ادھر ادھر بکھر جائیں گی۔"

"ور...... در دیکھو...... ہم پھر کہہ رہے ہیں تم سے ہم تمہیں اپنے بارے میں بتا دیں گے۔"

"ہاں...... بول...... بول مجھے کیوں تلاش کرتا ہوا ہوٹل میں آیا تھا۔"

"اصل میں جمشید مرزا کو جانتے ہو؟"

"کون جمشید مرزا۔"

"بڑے پائے کے پولیس آفیسر ہیں۔ ایس پی جمشید مرزا۔ دارالحکومت میں بڑا نام کمایا ہے انہوں نے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"میں نہیں جانتا آگے بول۔"

"رائے راحیل کو جانتے ہو؟ وہی جن کی کوٹھی میں گھس کر تم نے گولیاں چلائی تھیں۔" صوفی نے کہا اس بار حمیدو کا منہ بھی حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"کیا؟"

"ہاں...... ہم نے تمہیں دیکھا تھا۔ وہیں پہچان لیا تھا۔" حمیدو نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ تمام ساتھی حیران تھے۔ پھر حمیدو نے کہا۔

"تو وہاں کیا کر رہا تھا؟"

"وہ ہی بتانے جا رہے ہیں۔ جمشید مرزا کو اسٹ کر رہے تھے۔ درویشوں کے کرم سے۔"

"اسٹ؟"

"ہاں......"

"اس کی کوئی بات سمجھ میں آ رہی ہے۔" حمیدو نے اپنے ساتھیوں کی طرف رخ کر کے کہا۔

"ہم سمجھا رہے ہیں۔ رائے راحیل نے جمشید مرزا کو اپنی بیوی کے خلاف تحقیقات کرنے کے لیے بلایا تھا۔ پچاس لاکھ کی پیشکش کی تھی۔ جمشید مرزا ہمیں ساتھ لے آئے اور ہم اس کوٹھی کے مہمان خانے میں مقیم ہو گئے اس کے بعد ہم نے آپ کو اس وقت دیکھا جب آپ کوٹھی میں گولیاں چلا کر بھاگ رہے تھے۔ ہم نے آپ کی شکل دیکھ لی اور اس کی تصویر بنا کر بیگم صاحبہ کو پیش کی۔ تو انہوں نے کہا کہ آپ کا نام

...ہے اور آپ ایاز ہوٹل میں ہوتے ہیں۔ بس ہم آپ سے ملنے چلے آئے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آپ نے وہاں گولیاں کیوں چلائی تھیں۔" حمیدو نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"الو کے پٹھے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے تو یہاں چلا آیا۔"

"دیکھیے آخری بار کہہ رہے ہیں آپ سے کہ آپ زبان کو لگام دیجیے۔"

"ورنہ تو کیا کرے گا؟" حمیدو نے آنکھیں نکال کر کہا۔

"آپ نے ہم سے کچھ سوالات کیے ہم نے آپ کو اس بارے میں تفصیل بتا دی کہ ہم کون ہیں اور یہاں کیوں آئے ہیں؟ اب ہم آپ سے آپ کے بارے میں پوچھیں گے اور آپ ہمیں تفصیل بتائیں گے۔"

"اچھا...... اچھا تو کیسے پوچھے گا بھئی۔"

"یار! لگتا وہی نائی کی اولاد ہے۔" صوفی نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ لوگ ایک دم سے منتشر ہوئے تھے لیکن حمیدو نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔ صوفی نے دروازے کے قریب پہنچ کر دروازہ اندر سے بند کیا اور پھر ان سب کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اب ہم فلم "ڈنڈا تے بھگوان" کے کچھ مناظر پیش کریں گے اس شکل میں کہ اگر حمیدو صاحب نے زبان نہ کھولی۔ وہ پانچوں صوفی کی بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ حمیدو کی آواز ابھری۔

"اب تم اسے بھگوان بنا دو۔ بغیر ڈنڈے کے۔" حمیدو نے مسکرا کر اپنے ساتھیوں سے کہا اور وہ سب تیار ہو گئے۔ پھر ان میں سے ایک نے صوفی کے پیچھے آ کر اس کے دونوں ہاتھ پیچھے سے پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن صوفی کی ٹانگ چلی اور پیچھے کھڑا ہوا شخص پیٹ دبائے او...... اوکرنے لگا۔ پاؤں آہستہ نہیں پڑا تھا اور بدن کے جس نازک مقام پر پڑا تھا۔ اس کے بعد وہ شخص تو چت ہی ہو گیا تھا۔ باقی چاروں نے بھرا مار کر صوفی پر حملہ کیا اور صوفی بیٹھ گیا۔ وہ چاروں ایک دوسرے سے ٹکرائے تھے۔ اور انہوں نے ایک دوسرے کے سینوں پر ہاتھ رکھ کر دھکا دے کر اپنے آپ کو زور سے ٹکرانے سے تو بچایا تھا لیکن صوفی نے اسی پر بس نہیں کیا۔ وہ ایک دم سے کھڑا ہوا اور اس کے بعد اس کے دونوں بازو پھیل گئے۔ صوفی کی جسمانی قوت کا صحیح اندازہ شاید ابھی تک کسی کو نہیں ہو سکا تھا۔ وہ چاروں صوفی کے بازوؤں کی زد میں آ کر سیدھے گر پڑے لیکن پھر اس کے بعد انہوں نے اپنی بے عزتی محسوس کر کے بڑی احتیاط کے ساتھ صوفی پر حملے کرنے شروع کر دیئے۔ لیکن صوفی نے انہیں گھونسوں پر رکھ لیا تھا۔ وہ ایک ماہر باکسر کی طرح ان پر گھونسے برسا رہا تھا اور ہاتھ تیلے کر کر کے اس طرح مار رہا تھا کہ جس کے بھی اس کا ہاتھ پڑتا۔ وہ کم از کم یہ اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکتا کہ کوئی فولادی چیز اس سے ٹکرائی ہے۔ انسانی ہڈیوں میں اتنی جان نہیں ہو سکتی۔ صوفی بھی اس وقت عجیب قلندرے موڈ میں آ گیا تھا اور ایسے جما جما کر ہاتھ رسید کر رہا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ان لوگوں کے حواس درست ہو گئے۔

ان میں سے تقریباً سب ہی کی ناک اور ہونٹ زخمی ہو گئے تھے اور ان سے خون ابل پڑا تھا۔ حمیدو یہ منظر دیکھ کر جلدی سے کھڑا ہو گیا اور اس نے ایک طرف چھلانگ لگائی۔ غالباً ان لوگوں کو اس بات کا

اندازہ نہیں تھا کہ صرف ایک آدمی ان کے لیے اتنا بڑا عذاب بن سکتا ہے۔ اس لیے انہوں نے ہتھیار وغیرہ ساتھ نہیں رکھے تھے۔ لیکن حمیدو نے جس الماری کی طرف چھلانگ لگائی تھی اس میں یقیناً پستول ہوگا اور صوفی نے ایک لمحے میں اس کا اندازہ لگا لیا تھا۔

چنانچہ اس نے حمیدو پر چھلانگ لگائی اور پھر اسے پوری قوت سے الماری کی جانب دھکیل دیا۔ حمیدو بری طرح اس الماری سے ٹکرایا تھا۔ وہ چاروں آدمی پھر صوفی کی طرف بھاگے اور صوفی نے ان میں سے ایک کی گردن پکڑ کر اسے حمیدو کی طرف اچھال دیا۔ حمیدو اس شخص کی ٹکر سے بری طرح دوبارہ الماری سے ٹکرایا تھا۔ پہلے تو بچت ہوگئی تھی لیکن اس بار الماری اس کے سر میں لگی اور اس کا سر پھٹ گیا۔ اس کے منہ سے ایک موٹی سی گالی نکلی اور اس نے اپنے ساتھی کو گریبان سے پکڑ کر گھمایا اور دیوار میں دے مارا۔

ادھر صوفی نے پھر ان تینوں کو سنبھال لیا تھا اور اس کے زبردست گھونسے چل رہے تھے اس وقت وہ شان دار باکسنگ کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ یہ ہی نہیں بلکہ جیسے ہی حمیدو اپنے اس ساتھی کو دیوار پر مارنے سے فارغ ہوا۔ صوفی نے ایک دوسرے آدمی کی گردن پکڑ کر حمیدو کی طرف اچھال دیا۔ انداز پہلے سے مختلف نہیں تھا۔ وہ شخص بھی حمیدو سے ٹکرایا۔ اور حمیدو نے غراتے ہوئے گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

"میرے ہی اوپر آ کر گر رہے ہو؟" اس دوسرے آدمی کو بھی اس نے بری طرح مارنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دوسرا آدمی ہکلائے ہوئے انداز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ پھر تیسرا آدمی بھی حمیدو پر جا کر لگا۔ تو حمیدو آپے سے باہر ہو گیا صوفی ہاتھ جھاڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ حمیدو اب اپنے ہی ساتھیوں کو مار رہا تھا۔ صوفی کے گھونسوں نے انہیں ویسے ہی ادھ مرا کر دیا تھا۔ اب پتا نہیں وہ سچ مچ بے ہوش ہو گئے تھے یا پھر اس وقت انہوں نے آنکھیں بند کر کے پڑ جانے ہی میں عافیت سمجھی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ چاروں لمبے ہو گئے۔ ادھر وہ شخص اکڑوں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر مردنی چھائی جا رہی تھی۔

"تجھے کیا ہو گیا کتیا زادے۔" لیکن کتیا زادے نے کوئی جواب نہیں دیا تھا تب صوفی حمیدو کی جانب متوجہ ہوا۔

"ہاں...... ہمارا ادھار تم پر باقی ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"یار تو ہے کیا چیز۔"

"اب مزید کچھ نہیں بتائیں گے اپنے بارے میں اب صرف آپ کو بھونکنا ہوگا۔ ورنہ آپ یہ سمجھ لیجئے کہ شاید آپ کی موت کی گھڑی آ پہنچی ہے۔" صوفی حمیدو کی طرف بڑھا تو حمیدو نے سر جھکا کر اس کے سینے پر ٹکر مارنا چاہی لیکن صوفی نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر اسے اپنی بغل میں دبا لیا اور اس کے بعد دباؤ ڈالنے لگا۔ حمیدو کے حلق سے بھیانک چیخیں نکلنے لگی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھوں سے صوفی کے پیٹ اور کمر پر مار رہا تھا۔

لیکن سر پر جو دباؤ تھا وہ اس کے ہوش حواس چھینے لے جا رہا تھا۔ آخر اس نے کہا۔

"رک جاؤ...... رک جاؤ۔ چھوڑ دو...... میں نے ہار مان لی ہے۔"

"وری گڈ...... ویڈ گڈ...... اچھے بچے ہمیشہ ہار مان لیا کرتے ہیں کیونکہ ہار ماننے میں ہی عافیت چھپی ہوتی ہے درویشوں کے کرم سے۔"

"یہ درویش کیا ہیں یار۔"

"خبردار...... خبردار...... درویشوں کی شان میں ایک لفظ غلط کہا تو سمجھ لو سارے کام غلط ہو جائیں گے۔" صوفی نے کہا۔ اور پھر اس نے دو چار گھونسے حمیدو کے لگائے اور حمیدو کو کرسی پر دھکیل دیا۔

"شروع ہو جاؤ۔" اور حمیدو شروع ہو گیا۔ صوفی دیر تک اس کی بکواس سنتا رہا اور پھر اس نے کہا۔

"اور اگر جو کچھ تم نے بتایا وہ غلط ہوا تو؟"

"تو تم مجھے توپ کے دھانے سے باندھ کر اڑا دینا سمجھے۔ غلط نہیں بتایا میں نے بالکل سچ کہا ہے۔ مگر اب یہ بتاؤ میرا کیا ہوگا۔ میری تو اچھی خاصی آمدنی ماری گئی۔"

"اپنا حلیہ درست کر لو اور اس بات کا بالکل اظہار نہ کرو کہ میری اور تمہاری یہ دلچسپ اور دل کش ملاقات ہوئی ہے۔ اپنا تھوبڑا بھی صحیح کر لو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا اور نہ ہی تمہارا نام ان سارے معاملات میں کہیں شریک ہوگا۔ ایک بار پھر مجھے ذرا پتا دہراؤ۔" صوفی نے کہا اور حمیدو اسے ایک پتا دہرانے لگا۔

♥......♥......♥

جمشید مرزا بری طرح نروس ہو چکا تھا۔ وہ صرف صوفی کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر کار صوفی واپس آ گیا۔ جب وہ مہمان خانے میں داخل ہوا۔ تو جمشید مرزا عجیب سی شکل لیے ہوئے بیٹھا تھا۔ صوفی نے اسے دیکھا۔ جمشید مرزا جلدی سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"کہاں گئے تھے تم۔" اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"وہ...... وہ...... سر...... بس! آوارہ گردی کرنے نکل گیا تھا۔"

"کار بھی لے گئے تھے؟"

"جی ہاں...... کار میں ہی گیا تھا۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

"مجھے علم نہیں تھا حضور والا۔ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ آپ رنگ رلیاں منانے کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔"

"چل رہے ہو۔"

"کک...... کہاں۔" صوفی نے گھوم گھوم کر اپنی شیروانی کو چاروں طرف سے ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"مذاق فرما رہے ہیں آپ۔ خیر فرماتے رہیں۔ میں نے اسٹیج پر کام کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ میرا خیال تھا صوفی صاحب! کہ آپ چٹکیاں بجاتے ہوئے یہ کام سرانجام دے لیں گے۔ لیکن آپ بھی۔"

"ہمیں چٹکیاں بجانا نہیں آتیں...... بدقسمتی سے ورنہ ضرور ایسا ہی کرتے ویسے چٹکیاں بجانا ہمیں اچھا لگتا ہے۔"

"مذاق فرما رہے ہیں آپ؟"

"آج تک مذاق فرمانا نہیں آیا۔ مگر آپ نے اس کیس کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیوں کیا۔"

"اس لیے کہ اس سے کچھ بات نہیں بن رہی۔ میں آج ہی واپس جانا چاہتا ہوں۔ چلیں گے آپ میرے ساتھ۔"

"نہیں۔" صوفی نے جواب دیا اور جمشید مرزا چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

"کیوں؟"

"بس جناب! اب ہمیں احساس ہو چلا ہے کہ ہم بھی بڑے ہو گئے ہیں۔ ہمیں کسی سے عشق کرنا چاہیے۔"

"کیا؟" جمشید مرزا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ج...... ج...... جی ہاں۔ خواب میں دیکھا تھا۔ والدہ صاحبہ سخت ناراض تھیں کہہ رہی تھیں کہ صوفی اونٹ کا اونٹ ہو گیا۔ آج تک شادی نہیں کی۔ اب تک تو تیرے کم از کم چھ بچے ہونے چاہیے تھے۔" ج...... ج...... جناب والا۔ ہم ہمیشہ والدہ صاحبہ! سے ڈرتے رہے۔ ہم نے بدقسمتی سے ان سے ترکیب پوچھ ڈالی۔ آپ یہ سوال نہیں پوچھیں گے کہ کیسی ترکیب؟" جمشید مرزا اسے خاموشی سے گھورتا رہا۔ صوفی نے چند لمحے انتظار کرنے کے بعد کہا۔

"خیر ہم خود بتائے دیتے ہیں کہ ہم نے والدہ صاحبہ سے عرض کیا کہ محترمہ والدہ حضور کوئی ایسی ترکیب بتایئے کہ چھ بچے ہو جائیں اور شادی بھی نہ کرنی پڑے۔ بس جناب چمٹا لے کر پیچھے دوڑیں۔ بڑی مشکل سے بچے۔ ورنہ دو چار رسید کر ہی دیتیں۔ کہنے لگیں ارد گرد لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں اور تو اونٹ کی طرح منہ اٹھائے پھر رہا ہے۔ خیر تو مطلب یہ ہے کہ ہم محترمہ سیمل صاحبہ! سے اظہار عشق کرنا چاہتے ہیں۔ دیکھیں کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ کیا آپ ہماری کچھ مدد فرمائیں گے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"جہنم میں جاؤ...... اس کا مطلب ہے کہ تم ساتھ نہیں چلو گے۔"

"نہیں والدہ صاحبہ! کے حکم کی تعمیل تو کرنی ہی ہے۔"

"ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔"

"مم مگر بات تو سنیے۔ اکیلے ہم کیا کر سکیں گے۔ آپ سے ذرا خاصی بے تکلفی ہو چکی ہے۔ آپ ہماری سفارش فرما دیجیے گا۔"

"صوفی صاحب ہوش و حواس رخصت ہو چکے ہیں آپ کے۔ پڑے رہیے یہاں اور جوتے کھایئے۔"

"مم...... مگر جناب میں پچاس لاکھ...... مم...... مم میرا مطلب ہے۔ آپ نے دس لاکھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں...... تم نے سارا کیس حل کر کے رکھ دیا نا۔ بس میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ چابی لاؤ۔" جمشید مرزا نے کہا۔

"وہ محترمہ بیگم صاحبہ سے آپ کہہ چکے ہیں ناں۔ میرا مطلب ہے بتا دیا ہے انہیں۔"

"بیگم صاحبہ کو نہیں میں نے رائے راحیل کو بتا دیا ہے کہ میں اس کیس پر کام نہیں کر سکوں گا۔ ا

نے مجھے جانے کی اجازت دے دی ہے۔ تم بھی چلو صوفی صاحب! کیوں اپنی بے عزتی کرانے کے لیے یہاں رک رہے ہو۔"

"اصل میں ہماری عزت ہے ہی کہاں جس کا دل چاہا بے عزتی کر دی۔ چنانچہ ہماری بے عزتی نہیں ہوتی۔" جمشید مرزا نے لاپرواہی سے شانے ہلائے اور اپنا بیگ اٹھا کر چابی لے کر باہر نکل گیا۔ صوفی اس کے پیچھے پیچھے آیا تھا۔ جمشید مرزا واقعی اپنی کار میں بیٹھ کر کوٹھی سے باہر نکل گیا تھا۔ صوفی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر گردن جھٹکنے لگا۔ کچھ دیر تک کھڑا سوچتا رہا پھر اس کے بعد مہمان خانے سے نکل کر اندرونی حصے کی جانب چل پڑا۔

❤......❤......❤

سہیل عالم راحیل کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا اور راشیل اسے کچھ بتا رہی تھی۔ سہیل خاموشی سے سنتا رہا اور پھر اس نے کہا۔

"معافی چاہتا ہوں میڈم اس میں کوئی شک نہیں ہے۔" کہ آپ کا مسئلہ واقعی مشکل ہے۔ لیکن دوسرے صورت حال یہ ہے کہ میں ایک خالص پروفیشنل ہوں بے شک آپ نے اب تک میرے معاملے میں جو اخراجات اٹھائے ہیں۔ ان کے بارے میں اتنا اندازہ تو آپ کو ضرور ہو گا کہ وہ بالکل......

"ہاں...... ہاں...... ہاں میں نے تمہیں بتایا نا۔" ایک کروڑ ڈالر میں نے جمع کیے ہوئے ہیں اور وہ یہیں ٹرانسفر کرا لیے ہیں۔ یہ ان کے کاغذات ہیں۔ تم یہ سمجھ لو کہ یہ رقم تمہاری ہے لیکن شرط وہی ہو گی۔ میرا مسئلہ حل کر دو۔"

"میڈم۔ اصل میں ہر کام کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ میں پوری کوشش کروں گا اور آپ جانتی ہیں کہ ٹک کارسن جس مسئلے میں ہاتھ ڈالتا ہے پھر وہ مسئلہ نہیں رہتا بلکہ اسکی عزت کا سوال بن جاتا ہے۔ اگر وہ اسے حل نہ کر پائے تو منہ چھپا کر بھاگتا نہیں ہے۔ بلکہ آخر تک کوشش کرتا رہتا ہے۔ آپ نے جس تفصیل کے ساتھ مجھے اپنے راز میں شریک کیا ہے۔ آپ اطمینان رکھیے گا۔ میں اس پر کام کروں گا لیکن اس وقت جب پچاس لاکھ ڈالر میرے اکاؤنٹ میں منتقل ہو جائیں گے۔

"میں تمہیں پچاس لاکھ ڈالر کا چیک دیتی ہوں تم کام شروع کرو۔" اصل میں میں خود اب اس زندگی سے تنگ آ گئی ہوں اور تم جانتے ہو کہ سہیل بے شک سیمل میری بھتیجی ہے لیکن میں اسے بیٹیوں سے زیادہ چاہتی ہوں اور میں نہیں چاہتی کہ سیمل کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے۔ وہ ہر طرح سے میری مدد کر رہی ہے۔ میرا ساتھ دے رہی ہے۔ لیکن سب یہ جان کر کہ میں ایک مظلوم عورت ہوں۔ آہ...... میں اتنی بری نہیں ہوں جتنا برا مجھے وقت نے بنا دیا ہے۔ کاش مجھے بھی دوسری شریف عورتوں کی طرح شریف زندگی گزارنے کا موقع ملتا۔ مگر کیا ہوں میں؟ تم دیکھ لو کس قسم کی عورت رہی ہوں۔ میں قسم کھاتی ہوں ٹک کارسن کہ میں ایسی عورت نہیں بننا چاہتی تھی۔

"میڈم آپ پچاس لاکھ ڈالر کا چیک مجھے لکھ کر دیجیے۔ ابھی دے دیتی ہوں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ تم چاہو تو اسے اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کرا سکتے ہو۔

"ہاں آپ اوپن چیک دیں گی۔" "لیکن آپ کو ایک بہت بڑا رسک لینا ہوگا۔ ہاں میں جانتی ہوں۔
"بھاڑ میں جائیں پچاس لاکھ ڈالر اور ایک کروڑ ڈالر۔" میری زندگی تو اس عذاب سے بہتر
یقین کرو اگر میں کسی بھی طرح کلیئر ہوگئی۔ تو رائے راحیل کو سب کچھ بتا دوں گی اور ان سے کہوں گی کہ اگر
تمہارے پاس کچھ بھی نہیں ہے تو میں ایک معمولی سی زندگی گزارنے کو تیار ہوں۔ صرف مجھے اپنے قدموں میں
جگہ دے دینا۔ ارے ہاں میں بھی تو انسان ہوں۔ انسانوں کی طرح جینا چاہتی ہوں۔

"پچاس لاکھ ڈالر کا چیک۔" نک کارسن نے کہا اور راشیل چیک بک اٹھا لائی۔ تو اس نے چیک
لکھ کر نک کارسن کے حوالے کر دیا۔

"اس کے ساتھ ہی میڈم ایک چھوٹی سی تحریر بھی لکھ دیجئے گا۔ کہ آپ کسی بھی قیمت پر اسٹاک
پیمنٹ نہیں کرائیں گی۔ اسٹاک پیمنٹ کرانے کی کوشش ایک مجرمانہ عمل ہوگا۔ آپ براہ کرم یہ تحریر لکھ دیجئے۔
جواب میں راشیل مسکرا دی۔ پھر اس نے کہا۔

"حالانکہ یہ میری بے عزتی کے مترادف ہے۔" "لیکن تمہاری ذہانت پر مجھے خوشی ہوئی کیونکہ ذہین
آدمی ہی میری مشکل حل کر سکتا ہے اس نے نک کارسن کو وہ تحریر بھی لکھ کر دے دی اور نک کارسن نے دونوں
چیزیں اپنی جیب میں رکھ لیں اور پھر بولا۔

"آپ بالکل اطمینان رکھیں۔" میں زندگی کی بازی لگا کر آپ کا یہ کام کروں گا۔ اب میں آپ
سے بالکل مخلص ہوں اور میرے خلوص پر یقین کیجئے گا۔" اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور دونوں ایک دم
سنبھل گئے۔

"کون ہے آؤ" راشیل نے کہا۔ اور صوفی اندر داخل ہو گیا۔

"سر اسلام علیکم! اس نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ نک کارسن اسے دیکھ کر چونکا تھا لیکن صرف ایک
لمحے کے لیے پھر اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

"کہو کیسے آنا ہوا؟"

"وہ! بیگم صاحب جمشید مرزا چلے گئے۔"

"بھاڑ میں جائیں وہ میں کیا کروں۔"

"نہیں میرا مطلب ہے کہ میں...... میں۔"

"تم کیوں نہیں گئے ان کے ساتھ۔ اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ جا رہا ہے اور یہی اس کے حق
میں بہتر تھا۔ تم بے وقوف لوگ بھلا یہاں رہ کر کیا کر سکتے ہو۔ سوائے حماقتوں کے جیمس! یہ ان دونوں میں
سے ایک ہیں جن کا سرسری سا تذکرہ میں نے تم سے کیا تھا۔ رائے راحیل نے انہیں میرے خلاف تحقیقات
کے لیے بلوایا ہے اور یہ تحقیقات کر رہے ہیں ذرا حلیہ ملاحظہ فرمائیے۔ نک کارسن نے کوئی جواب نہیں دیا تھا
خاموش بیٹھا رہا تھا۔

"تت...... تم...... مم...... میرا کیا ہوگا اب۔"

"تم اس کوٹھی سے نکل کر باہر سیدھ میں چلے جانا آگے جا کر دو راستے آئیں گے ایک دائیں

جاتا ہے اور ایک بائیں طرف۔ بائیں راستے پر مڑ جانا ایک فرلانگ چلنے کے بعد تمہیں کھیتوں کا
لے گا۔ اس سلسلے کے آغاز پر ایک اندھا کنواں ہے۔ کسی سے بھی اس کے بارے میں پوچھ سکتے ہو
ھی عام طور سے اسی کنوئیں میں کود کر خودکشی کرتے ہیں۔ بس تم بھی یہی کرو میرا نیک مشورہ ہے۔ بہت
فکریہ درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے کہا اور واپسی کے لیے پلٹ پڑا نک کارسن نے حیرت سے
ے کو دیکھا اور پھر راشیل کی طرف رخ کر کے بولا۔

"کہیں یہ سچ مچ ہی اس کنوئیں میں کود کر جان نہ دے دے۔"

"بڑی خوش ہوگی مجھے۔"

"وہ احمق گیا تو اسی انداز میں ہے۔ یہ دوسرا آدمی ہے۔"

"ہاں...... کوئی پولیس کا آدمی تھا۔" رائے راحیل بری طرح کھسک گیا ہے میرے خلاف
قات کرا کے وہ نہ جانے کیا کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ اس کا اپنا وطن ہے۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے اس لیے
ں نہ دے پا رہا ہو کہ میں نے اپنے سفارت خانے سے رابطہ قائم کر کے ایک درخواست دے رکھی ہے۔
مجھے کوئی نقصان پہنچے گا تو رائے راحیل اس کا ذمہ دار قرار دیا جائے گا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے۔

"میں اس احمق کے لیے فکر مند ہوں۔"

"تم نک کارسن...... تم ایک شخص کے لیے اس لیے فکر مند ہو کہ وہ جان دینے جا رہا ہے۔ جب کہ
نے ساری زندگی جان لینے کا کام ہی کیا ہے۔"

"میڈم! میں نے آج تک ایک ایسے شخص کو نہیں مارا۔ جو بے گناہ ہو۔ میں بے مقصد کبھی کسی کو
صان نہیں پہنچاتا۔ آپ کا دل چاہے تو آپ یقین کر لیجئے نک کارسن اپنی جگہ سے اٹھ گیا پھر اس نے کہا۔

"آپ یہ سمجھ لیجئے کہ بس یہ کام اب منٹوں میں ختم ہونے والا ہے۔ میں آپ کو بالکل بھروسے
ساتھ یہ بات کہتا ہوں۔ ذرا چلوں دیکھوں اسے۔"

"عجیب آدمی ہو۔ جاؤ چلو دیکھ لو۔" نک کارسن اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔ باہر نکلنے کے
دہ گردن اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اور پھر مہمان خانے کی جانب چل پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ مہمان
نے کے ایک کمرے کے سامنے کھڑا ہوا تھا جس کے بارے میں اس نے ایک ملازم سے پوچھا تھا اور اسے
بتایا تھا کہ صوفی اندر ہی ہے۔ اس نے دستک دی۔

"آجائیے تشریف لائیے۔ درویشوں کے کرم سے۔" نک کارسن اندر داخل ہو گیا۔ پھر اس نے
ان ٹیڑھی کر کے کہا۔

"ہیلو...... مائی نیم از جیمس۔"

"ہو ہی نہیں سکتا۔" صوفی کی آواز ابھری اور نک کارسن حیرانی سے اسے تکنے لگا۔

"آپ نے کچھ کہا میں سمجھا نہیں اس بار نک کارسن نے خالص انگلش لہجے میں کہا۔

"عزیزم! انگریزی بہت اچھی بول لیتے ہو۔ مگر چہرے پر جو یہ میک اپ ہے نا اس میں تھوڑی سی
تا ہے وہ دیکھو بھنوؤں کا رنگ چہرے کے رنگ سے مناسبت نہیں رکھتا۔ تمہیں ان سیاہ بھنوؤں کو بھی رنگنا

چاہیے تھا۔ تا کہ یہ تمہاری گوری چمڑی سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ انگریزوں کی بھنوئیں ایسی نہیں ہوتیں۔"

"میں نہیں جانتا آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب!"

"چلو ٹھیک ہے۔ نہیں جانتے ہو تو نہ جانو آؤ بیٹھو۔" نک کارسن بیٹھ گیا۔ پھر اس نے انگریزی میں کہا۔

"آپ مسٹر صوفی ہیں۔"

"ہاں۔ ہیں...... اب تم ایک بے وقوفی کے بارے میں کیا کہو گے۔"

"کیسی بے وقوفی؟ نک کارسن نے انگریزی میں پوچھا۔

"میں اردو بول رہا ہوں اور تم انگلش بول رہے ہو۔ لیکن ایک ایک بات سمجھ رہے ہو۔"

"میرے خدا...... میرے خدا...... آدمی کتنا ہی تیز طرار کیوں نہ ہو جائے۔ کوئی نہ کوئی حماقت ایسی کر ڈالتا ہے کہ اب دیکھئے کتنی واضح بات ہے۔" اسی طرح صوفی بھی دل ہی دل میں چونکا تھا۔ کیونکہ نک کارسن اردو میں بولا تھا اور اس لہجے کو صوفی اچھی طرح پہچانتا تھا۔ سہیل عالم کے سوا اور کسی کی آواز نہیں تھی۔ لیکن اس نے ذرا بھی اظہار نہیں کیا کہ پہلے وہ اسے نہیں پہچان سکا تھا۔"

"صوفی صاحب! اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے ہمیشہ آپ کی عظیم صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن کیا واقعی میرے میک اپ میں خامی تھی۔"

"بھنوؤں کی بات کہی نہ میں نے ایک موٹی سی بات تھی بہت ہی موٹی سی بات۔ باقی مجموعی طور پر بڑا اچھا میک اپ ہے۔ مگر تمہاری یہاں آمد میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا تم ہماری تلاش میں آئے ہو۔"

"نہیں صوفی صاحب! بالکل ہی الگ معاملہ ہے۔ ایک منٹ۔" سہیل عالم نے کہا اور باہر نکل آیا۔ دور دور تک کا جائزہ لیا اور اس کے بعد واپس آ کر بیٹھ گیا۔

"یہ میک اپ میرے ایک دوست کا ہے۔ جو اس وقت میری رہائش گاہ میں مقیم ہے اور اس کے بعد سہیل عالم نے نک کارسن کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ صوفی کی پیشانی شکن آلود ہو گئی تھی۔ نک کارسن کی کہانی ختم ہونے کے بعد اور سہیل عالم کا یہاں آ کر راشیل سے ملنے کی تفصیل اور پھر راشیل کی بتائی ہوئی کہانی۔ صوفی بہت دیر تک سوچتا رہا تھا اور پھر اس نے کہا۔

"کیا نام بتایا تم نے اس کا؟"

"زیک لن۔"

"اس شخص کی رہائش گاہ میرے علم میں ہے۔"

"کیا؟" سہیل عالم اچھل پڑا۔

"ہاں۔ جمشید مرزا میدان چھوڑ کر بھاگ چکا ہے۔ میں چونکہ کافی معلومات حاصل کر چکا ہوں اس لیے ظاہر ہے میں نہیں بھاگ سکتا تھا۔"

"آپ کہاں بھاگتے ہیں صوفی صاحب! پھر اب کیا ارادہ ہے۔"

"بتاؤ کیا مشورہ ہے تمہارا۔"

"استاد کے سامنے میں زبان کھولوں گا۔" سہیل عالم نے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں زیک لن پر ہاتھ ڈال دینا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے پھر تیاریاں کریں۔"

"ہاں۔" صوفی نے جواب دیا۔

♥......♥......♥

تاحد نظر تاریکی کا راج تھا۔ یہ عمارت میں ذرا الگ تھلگ مقام پر واقع تھی ویسے بھی عادل پور کی آبادی میں ترتیب نہیں تھی۔ جس نے جہاں مناسب سمجھا تھا گھر بنا لیا تھا۔ اس عمارت کے آس پاس کی زمینیں بھی بالکل خالی پڑی تھیں۔ بجلی کے تار بھی بہت دور سے لائے گئے تھے۔ مکمل خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ احاطے کی دیوار کے پاس کھڑے ہو کر صوفی نے کہا۔

"کتے بھی ہو سکتے ہیں اندر جاؤ وہاں رہائش رکھنے والے مخدوش زندگی نہیں گزاریں گے۔"

"اس نے یہ گھر کرائے پر ہی لیا ہو گا۔ ظاہر ہے وہ مقامی باشندہ نہیں ہے۔ اس لیے کتوں کا انتظام مشکل ہی ہو گا۔"

"نہیں کوئی مشکل نہیں ہے کسی ٹرینز کے ذریعے کتے یہاں رکھے جا سکتے ہیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"میں اوپر چڑھتا ہوں۔"

"آؤ میرے کندھوں پر۔"

"نہیں صوفی صاحب! اگر آپ اوپر چڑھنا چاہتے تو میں اپنا سر آپ کو پیش کرتا۔ میں بھلا استاد کے کندھوں پر چڑھوں گا۔" سہیل نے کہا اور پھر وہ تھوڑا سا نیچے جھکا اور اس کے بعد جو چھلانگ لگائی۔ تو دیوار کے اوپر تھا۔ حالانکہ یہ دیوار تقریباً چودہ فٹ اونچی تھی۔ صوفی نے ایک گہری سانس لی۔ سہیل نے جلدی سے دیوار پر بیٹھ کر اپنا ہاتھ نیچے لٹکایا اور بولا۔

"آپ کو اتنی اونچی چھلانگ تو لگانی ہی پڑے گی۔ صوفی نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ سہیل عالم ایک باکمال شخصیت تھی۔ اس کا علم تو صوفی کو بھی ہو چکا تھا۔ بہر حال چند لمحوں کے بعد وہ بھی اوپر اٹھا دونوں عمارت میں بیٹھے کتوں کی موجودگی کا جائزہ لیتے رہے۔ لیکن حیرت کی بات تھی۔ تحفظ کا کوئی بندوبست نہیں کیا گیا تھا۔ نہ کتے تھے نہ کوئی چوکیدار پتا نہیں زیک لن عمارت میں اس وقت موجود ہے یا نہیں۔ لیکن بہر حال اگر وہ نہ بھی موجود ہوا تو دیکھنا تو ہو گا اس عمارت کو اندر سے، کچھ لمحوں کے بعد دونوں نیچے کود گئے۔ سہیل عالم ایک چوکنے چیتے کی طرح چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر دونوں آگے بڑھ کر اس عمارت کی طرف چل پڑے جس میں کہیں کہیں روشنی جھلک رہی تھی۔ ایک پچھلے دروازے کی راہ داری سے وہ اندر داخل ہوئے اور راہ داری میں سیدھے آگے بڑھتے چلے گئے۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ صرف ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکی سے انہوں نے اندر جھانک کر دیکھا تو انہیں سامنے ایک شخص نظر آیا۔ دبلے پتلے بدن کا مالک یہ شخص انتہائی خوب صورت گاؤن پہنے ہوئے۔ آنکھوں پر ایک حسین عینک لگائے کسی کتاب کی ورق

گردانی میں مصروف تھا۔صوفی ایک لمحے تک سوچتا رہا پھر اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔اس کی آنکھ بہ دستور کی ہول سے لگی ہوئی تھی۔اندر بیٹھے ہوئے شخص نے کتاب بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور بولا۔

''ٹھیک ہے۔تم آرام کرو میں صرف ایک دو صفحے پڑھنے کے بعد کتاب رکھ رہا ہوں صوفی نے کی ہول سے آنکھ ہٹا کر سہیل کی طرف دیکھا اور سہیل نے کہا۔

''اس کا مقصد ہے کہ عمارت میں ایک سے زیادہ افراد موجود ہیں۔''

''کیا یہ شخص زیک لن ہوسکتا ہے۔''

''اگر نہیں بھی ہے تو کچھ بتا سکتا ہے اس کے بارے میں پتا نہیں یہ آہٹیں سن لی گئی تھیں۔یہ سرگوشی کسی طرح اندر بیٹھے ہوئے شخص کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔یا پھر اسے شبہ ہوگیا تھا اس نے نگاہیں اٹھا کر کی ہول کو دیکھا۔راہ داری میں چونکہ اندھیرا تھا۔اس لیے کی ہول کی دوسری طرف کا منظر نظر نہیں آسکتا تھا۔وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور پر اطمینان قدموں سے چلتا ہوا دروازے تک آیا۔صوفی اور سہیل سنبھل گئے تھے۔بڑے اطمینان سے دروازہ کھولا گیا اور دوسرے لمحے صوفی نے دروازہ کھولنے والے کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے اندر دھکیل دیا اور خود سہیل کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔وہ شخص گرتے گرتے بچا تھا۔اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور حیران نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا پھر تعجب سے بولا۔

''کون ہو تم لوگ؟'' صوفی اور سہیل غور سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔بڑی نفیس شخصیت تھی۔بدن سے بھینی بھینی پرفیوم کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔دبلا پتلا جسم تھا عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان ہوگی۔لیکن چہرہ ٹماٹر کی طرح سرخ اور زندگی سے بھرپور اس کی آنکھیں بہت ہی خوب صورت تھیں۔اسی لحاظ سے چہرے کے نقوش بھی تھے۔

''کیسے ہیں آپ زیک لن۔'' صوفی نے مسکراتے ہوئے کہا۔اور اس شخص کے چہرے پر حیرت کے سخت آثار آنے گے۔

''زیک لن......کون زیک لن......میرا نام اسٹیورڈ ہے۔''

''نہیں مائی ڈیئر تم ہمارے لیے جانے پہچانے ہو۔کم از کم مجھے تم ضرور جانتے ہو۔'' سہیل نے آگے بڑھ کر کہا۔اس شخص نے سہیل کا چہرہ غور سے دیکھا ار پھر اس کے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔

''نک کارسن۔''

''گڈ......ہم پیشہ افراد کو ایک دوسرے سے واقفیت ہونی ہی چاہیے۔''

''ن......نہیں میرا مطلب ہے تم مجھے کیسے جانتے ہو۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو ڈیئر زیک لن میں نے کہا نا کہ ہم لوگ ہم پیشہ ہیں۔''

''یہ کون ہے؟''

''ایک مقامی آفیسر۔''

''آفیسر۔''

''ہاں پولیس آفیسر۔''

''زیک لن اگر تم یہ جانتے ہو کہ میں یہاں موجود ہوں اور اگر پہچانتے بھی ہو تو تمہیں اس بات کا تو علم ہوگا ہی کہ ظاہر ہے میں بے مقصد یہاں نہیں آیا ہوں گا۔کوئی کام ہوگا مجھے اور پھر ہم پیشہ افراد کے ساتھ ڈیل کی جاسکتی ہے۔یہ تم پولیس آفیسر کو کیوں لے آئے کیا اس کے ساتھ پولیس کے اور افراد بھی موجود ہیں۔''

''یہ ایک بے مقصد سوال ہے یہ کون ہے کون نہیں ہے۔میں تمہیں اس بارے میں ظاہر ہے نہیں بتا سکتا۔''

''چلو ٹھیک ہے نا بتاؤ۔یہ بتاؤ مجھ تک کیسے پہنچے۔''

''مائی ڈیئر زیک لن اپنا بھی یہی کاروبار ہے۔بس سونگھتے ہوئے آگئے۔اب یہ بتاؤ تم یہاں جو کچھ کر رہے ہو۔اس کی کیا حیثیت ہے ہمیں کتنا مل سکے گا۔''

''اوہو۔اگر یہ پولیس آفیسر بھی سودا کرنے کو تیار ہے اور تم اس طرح مجھے ادائیگی کے لیے مجبور کرنا چاہتے ہو تو آؤ بیٹھو۔میں ہر حالت میں تعاون کا قائل ہوں۔لڑائی جھگڑا مجھے پسند نہیں ہے۔اور نہ ہی میری جسمانی ساخت ایسی ہے کہ میں کسی قسم کا جھگڑا کر سکوں۔میں تو صرف دماغ کا سوداگر ہوں۔دماغ سے سارے سودے کرتا ہوں۔''

''تنہا ہو یہاں۔'' سہیل نے سوال کیا اور زیک لن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ابھی میں نے تم سے سوال کیا تھا کہ کیا تم پولیس کے ساتھ یہاں آئے ہو کیونکہ تم نے بتایا ہے کہ یہ شخص پولیس آفیسر ہے تم نے جواب نہیں دیا۔میرے خیال میں، میں بھی اس سوال کا جواب دینے کے لیے مجبور نہیں ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔کوئی بات نہیں ہے۔''

''دیکھو نک کارسن تم بار بار ایک لفظ دوہرا چکے ہو۔ہم پیشہ ٹھیک ہے جیسا کہ میں نے کہا کہ میں دماغ کا سوداگر ہوں دماغ سے کھاتا ہوں۔ہم لوگ اسی کی روشنی میں بات کریں گے۔تمہیں اگر یہاں میری موجودگی کا پتا چل ہی گیا ہے۔تو پھر اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہاں جو کچھ میں کر رہا ہوں۔اس کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ سودے کی بات تو اسی وقت ہوسکے گی۔ممکن ہے تمہیں کسی طرح یہاں میری موجودگی کا علم ہو گیا ہو اور تم صرف ہوا میں تیر چلانے آگئے ہو۔تمہیں یہ معلوم نہ ہو کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔باقی جہاں تک میرا معاملہ ہے۔پولیس آفیسر میں تمہیں بتاؤں۔میرے ملک کا سفارت خانہ تمہارے ملک کے متعلقہ ادارے اس بات کی تصدیق کریں گے کہ میں یہاں بالکل قانونی طور پر داخل ہوا ہوں جیسا کہ میں نے تم سے کہا کہ میں صرف دماغ کا کھیل کھیلتا ہوں۔چنانچہ اس طرح کے خطرے، میں مول نہیں لیتا۔تم چاہو تو مجھے گرفتار کرلو لیکن گردن پھنس جائے گی تمہاری ایک ایسے شہری کو یا یہ کہا جائے کہ مہمان کو جو غیر ملک سے باقاعدگی کے ساتھ یہاں آیا ہے کسی قسم کا کوئی نقصان پہچانا میرے خیال میں دنیا کے ہر ملک میں جرم تصور کیا جاتا ہے۔تم چاہو تو میں تمہیں اپنے کاغذات دکھا سکتا ہوں۔''

''نہیں مائی ڈیئر زیک لن بات صرف اتنی سی ہے کہ ہم لوگ ہر طرح سے اپنے معاملات خود ہی نمٹایا کرتے ہیں۔اس پولیس آفیسر کے بارے میں تمہیں بتا دوں کہ یہ میرے معاملات میں بلکہ یہ کہا جائے

کہ تمہارے معاملات میں مخل ہو گیا ہے اور میں اس کے لیے مجبور ہو گیا ہوں تو اسے اپنے ساتھ شریک کر لوں۔ تو یہ سمجھ لو کہ بات یہی ہے۔''

''ہوں۔ مگر وہ سوال تشنہ رہ گیا۔''

''ہاں..... اس سوال کے لیے میں تمہیں راشیل رائے کا حوالہ دوں گا۔'' زیک لن کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے کچھ تبدیلی رونما ہوئی پھر اس نے کہا۔

''مزید کچھ آگے۔''

''رائے راحیل کی دولت جس پر تمہاری نگاہ ہے اور تم راشیل کے ذریعے۔''

''بس..... بس..... بس کافی ہے میرے خیال میں کافی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ اس بارے میں یہاں تم میری کیا مدد کر سکتے ہو۔ ویسے تمہاری ذہانت کا تو میں دل سے قائل ہوں ہی۔ چھوٹے موٹے کام بڑی خوش اسلوبی سے کر لیا کرتے ہو۔ خاص طور سے اس پولیس آفیسر کی تمہارے ساتھ شمولیت دیکھو! میں نے اس بات کو خوش دلی سے تسلیم کر لیا ہے۔ کہ یہ شخص واقعی پولیس آفیسر ہے۔ اب تم کہہ رہے ہو تو غلط تو نہیں ہو گا۔ اگر ہمیں یہاں پولیس کا تحفظ بھی حاصل ہو جائے تو ہم اپنا کام خوش اسلوبی سے کر سکتے ہیں۔''

''مجھے بتاؤ ڈیئر زیک لن میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔''

''ہوں..... کہاں قیام ہے تمہارا۔''

''وہ بھی بعد میں بتا دیا جائے گا۔ یہاں تمہارے ساتھ بھی رہ سکتا ہوں۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ تم اکیلے ہی یہاں آ گئے ہو۔ کس طرح اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہو۔''

''بہت سی تفصیلی بات چیت ہو گی تم سے میں تمہیں اتنا تو بتا ہی چکا ہوں کہ بالکل قانونی طور پر یہاں داخل ہوا ہوں اور یہ بات غلط نہیں ہے۔ باقی جہاں تک کام کا تعلق ہے تو مقامی لوگ بھی بڑے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ آپ دولت خرچ کیجیے۔ دولت کمانے کے لیے سارے مسائل خود بہ خود حل ہو جاتے ہیں۔'' زیک لن نے کہا اور اسی وقت اچانک صوفی چونک کر پلٹا اور حیرت زدہ رہ گیا۔ درحقیقت... زمانہء قدیم کا کوئی دیوزاد ان کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ وہ اتنی آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آیا تھا کہ ان دونوں کو ذرا سا بھی احساس نہیں ہو سکا تھا۔ لمبے چوڑے قد و قامت کا مالک یہ سات فٹ شخص سر سے گنجا تھا۔ اس کی قومیت کے بارے میں کوئی صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ سہیل نے بھی پلٹ کر دیکھا اور اس کی کیفیت بھی صوفی سے مختلف نہ ہوئی۔ سہیل سے غلطی ہوئی تھی۔ اندر داخل ہو کر اس نے دروازہ اندر سے بند نہیں کیا تھا۔

دیو قامت... اپنی گول گول آنکھوں سے انہیں گھور رہا تھا۔ زیک لن نے ہنس کر کہا۔

''بس! یہی میرے ساتھ ہے بلکہ تم یہ سمجھ لو کہ یہ میری فورس ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میں تو ایک کمزور آدمی ہوں۔ مگر یہ..... اس کی طاقت کا تم تصور بھی کر سکتے۔ اس کا نام زوس ہے۔ میں نے اس طرح بہت سے مہرے پال رکھے ہیں۔ یہ بھی میرا ساتھ دیتے ہیں کیا سمجھے؟ ٹھیک ہے؟'' اب میں تم سے چند سوال رہا ہوں۔ مائی ڈیئر۔ یہ تو حقیقت ہے کہ تم نے راشیل رائے کا حوالہ بالکل درست دیا۔ لیکن تمہیں یہ بات

یہ معلوم ہوئی۔ کیا خود راشیل رائے نے تمہیں دعوت دی کہ نک کارسن کو راشیل رائے ہی جان سکتی ہے۔''

''اسے باہر بھیج دو۔ ہم لوگ ظاہر ہے کاروباری باتیں کر رہے ہیں۔'' جواب میں نک کارسن ہنس پھر بولا۔

''خیر تفصیلی گفتگو تم سے ذرا بعد میں ہو گی۔ زوس انہیں لے جاؤ اور بند کر دو!'' زوس نے دونوں پھیلائے اور آگے بڑھ کر ان کی گردنیں دبوچنا چاہیں۔ لیکن سہیل نے پلٹ کر سوپ لگائی اور زوس کے اپنے پیروں میں الجھانے کی کوشش کی لیکن ستونوں کو پاؤں سے نہیں گرایا جا سکتا۔ وہ کوشش کر کے رہ گیا۔ زوس نے صوفی پر ہاتھ ڈالا لیکن صوفی نے پلٹ کر ایک زوردار گھونسا اس کی گردن پر رسید کیا اور اس کے بعد اپنا ہی ہاتھ پکڑ کر رہ گیا۔

''درویش رحم کریں حق اللہ..... قوت بھی اللہ تعالیٰ ہی کی بخشی ہوئی ہوتی ہے۔'' وہ لوگ زوس پر مختلف طریقوں سے قوت آزمائی کرتے رہے اور انہیں احساس ہو گیا کہ واقعی انسانی شکل میں یہ سنگی ستون بلا شبہ ناممکن نہیں ہے۔

وہ دروازے پر اس طرح جما ہوا تھا کہ وہ لوگ دروازے کی طرف بھی نہیں جا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کمرے سے باہر نکلنے کے لیے اور کوئی جگہ بھی نہیں تھی۔ دفعتہ ہی سہیل عالم نے زیک لن پر چھلانگ لگائی۔ لیکن زیک لن بھی ناقابل یقین شخصیت نکلی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس بات سے بھی ہوشیار ہو گا۔ اس نے زمین پر لوٹ لگائی اور سہیل عالم کی زد سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد اس نے ہنس کر کہا۔

''یہی ایک کوشش ہو سکتی ہے۔ اس کے معاملے میں ناکام رہ کر تم میری طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔ چنانچہ میں اس کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دوسرے ہی لمحے اس نے ایک میز پر جھپٹا مارا میز کی دراز کھول کر اس نے ریوالور نکال لیا اور اس کا رخ سہیل کی طرف کر کے بولا۔

''میں نے کہا ناں..... کہ میں جسمانی کھیل کا عادی نہیں ہوں۔ اس وقت آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس لیے ریوالور میرے پاس نہیں تھا۔ لیکن اب صورت حال بدل گئی ہے۔ چلو! زوس پکڑ لو ان دونوں کو۔'' صوفی نے غیر محسوس انداز میں سہیل کو اشارہ کیا۔ اور اس کے بعد ان دونوں نے اپنے آپ کو زوس کے حوالے کر دیا۔ زوس نے انہیں گردنوں سے دبوچا اور دروازے کی جانب رخ کر لیا۔ پھر پیچھے سے زیک لن کی آواز سنائی دی۔

''نہیں رسک مت لو زوس میں انہیں ریوالور پر رکھے ہوئے ہوں تم رسی لے آؤ۔''

''دیکھو نک کارسن ایک بات میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ یہ آتشی کھیل جو ہے ناں..... اس نے انسان کو چوہا بنا دیا ہے۔ یہ چھوٹا سا ایک چوہا جو میرے ہاتھ میں دبا ہوا ہے۔ میں نے اس پر بڑی مشق کی ہے۔ میرا نشانہ کبھی خالی نہیں جاتا۔ کیا سمجھے؟'' کوئی جنبش مت کرنا۔ اس کے باوجود کہ میں نے تمہیں اس طرح پکڑا ہے تم یقین کرو۔ میں تم سے بات چیت کروں گا اور کوشش کروں گا کہ ہمارے درمیان کوئی بات طے ہو جائے اس مقامی پولیس آفیسر کو اگر کچھ دینا چاہو تو بے شک دے دینا۔ اگر یہ ہمارے لیے کارآمد ثابت ہو۔ باقی تم میرے ہم وطن ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں وطن سے دور یہاں اس جگہ کوئی نقصان پہنچے اور وہ بھی میرے ہاتھوں..... اوکے۔'' اتنی دیر میں زوس رسی لے آیا پھر اس نے پہلے صوفی کے ہاتھ کس کر پشت

پر باندھے اور اس کے بعد سہیل عالم کے پھر وہ ان دونوں کو دھکے دیتا ہوا باہر نکال لایا اور ایک اور کمرے میں پہنچ کر اس نے انہیں دروازے سے اندر دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ صوفی نے آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی اور مدھم لہجے میں بولا۔

''حق اللہ۔''

''کمال ہے، صوفی صاحب! ساری باتوں کے ساتھ ساتھ ایک بات طے ہے کہ طاقت اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے۔''

''حق اللہ...... حق اللہ...... حق اللہ۔'' صوفی نے کہا اور ایک طرف چل کر جا بیٹھا۔ سہیل عالم نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے میں کوئی جھری کوئی رخنہ نہیں تھا۔ اس نے اچانک ہی صوفی کی طرف رخ کر کے کہا۔

''لایئے آپ کے ہاتھ بھی کھول دوں۔'' صوفی نے چونک کر سہیل کو دیکھا۔ سہیل کے دونوں ہاتھ آزاد تھے اور رسی برابر میں پڑی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے صوفی ششدر رہ گیا تھا۔

''یہ ہاتھ۔''

''نہیں صوفی صاحب بس یوں سمجھ لیجئے کہ مجھے کسی درویش کی دعا ہے۔ کہیں کسی بھی جگہ نہ تو مجھے بند رکھا جا سکتا ہے اور نہ اس طرح قید کیا جا سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے ہاتھ پیر باندھے جا سکتے ہیں۔ یہ دروازہ بھی دومنٹ کے اندر کھل جائے گا۔'' صوفی خاموش نگاہوں سے سہیل کو دیکھتا رہا تھا۔

بہر حال یہ بات تو وہ دل سے مانتا تھا کہ سہیل میں کوئی بات ہے۔

''کیا خیال ہے چلیں باہر یا پھر تھوڑا سا انتظار کر لیں۔''

''بیٹھو...... اب یہ بتاؤ ہمیں کرنا کیا چاہیے؟'' زیک لن ہمارے ہاتھ تو لگ گیا ہے۔ لیکن یہ زدس۔''

''ہاں...... یہ ذرا ٹیڑھی چیز ہے۔ سوچتے ہیں اس کے بارے میں بھی۔''

''میں نے سوچ لیا ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''اگر آپ نے درویشوں کی دعاؤں سے سوچا ہے تو یقیناً کوئی ایسی ہی زبردست بات سوچی ہو گی۔ جس سے کام بن سکتا ہے۔''

''وہ بہت طاقتور ہے۔ لیکن جیسا کہ زیک لن نے کہا کہ وہ دماغ کا سوداگر ہے میں اس بات کو دل سے تسلیم کرتا ہوں کہ دماغ جسم سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ ایک معمولی سی چیز ایسا ہتھیار بن سکتی ہے جو کار آمد رہے۔''

''میں ابھی آیا۔'' سہیل عالم نے کہا اور ملحقہ باتھ روم میں داخل ہو گیا اسی وقت باہر آہٹ سنائی دی تھی اور زدس نے دروازہ کھولا تھا۔ لیکن اندر کا منظر دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا دونوں رسیاں اسے سامنے ہی نظر آ گئی تھیں۔ اس کے حلق سے ایک غراہٹ سی نکلی اور وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر صوفی کی طرف جھپٹا۔ اس نے جھک کر صوفی کو پکڑنا چاہا لیکن اسی وقت صوفی کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اس کی آنکھوں میں لگیں۔ زدس کے حلق سے ایک دھاڑ نکل گئی۔

اس کی دونوں آنکھیں تھوڑی دیر کے لیے اندھی ہو گئی تھیں۔ وہ دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دیوار سے جا لگا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صوفی اگر چاہتا تو باہر نکل سکتا تھا۔ لیکن اسی لمحے سہیل عالم اندر سے نمودار ہوا اس کے ہاتھ میں ایک لوہے کا ایک پائپ دبا ہوا تھا۔ اس نے باہر آتے ہی یہ پائپ زدس کی ایک پنڈلی پر مارا اور زدس کے حلق سے پھر ایک خوفناک دھاڑ نکل گئی۔ اس کے بعد سہیل عالم پے در پے اس پر وار کرنے لگا۔ اس نے زدس کی دونوں پنڈلیاں توڑ دی تھیں۔

اس کے بعد اس نے زدس کے سر پر ایک زوردار ضرب رسید کی اور زدس دونوں ہاتھ سامنے کیے اوندھے منہ زمین پر آ رہا۔ اسی لمحے باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اب یہ اندازہ تو نہیں تھا کہ وہ زیک لن ہی ہو گا۔ لیکن پھر بھی دونوں دروازے پر جا ٹکے۔ زیک لن ہاتھ میں ریوالور لیے اندر داخل ہوا تھا اور سہیل عالم کا وہ ڈنڈا اس کے ہاتھ پر پڑا تھا۔

ریوالور تو نکل کر دور جا گرا زیک لن کی چیخیں اور کراہیں سنائی دینے لگیں۔ چند ہی لمحوں میں انہوں نے رسیوں سے زیک لن کو بھی باندھ لیا تھا۔ زدس زمین پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔

''اس کا کیا کیا جائے۔ مرشد؟'' سہیل عالم نے صوفی سے سوال کیا۔ اردو میں سوال کیا گیا تھا۔ زیک لن جو شدید تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ ایک دم کراہیں روک کر سہیل عالم کو گھورنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

''نک کارسن...... کیا تم نک کارسن ہی ہو۔''

''نہیں مائی ڈیئر میں کون ہوں؟ کیا ہوں۔ فی الحال اس بات کو جانے دو۔'' سہیل بولا اور پھر صوفی کی طرف رخ کر کے کہنے لگا۔

''جی...... مرشد بتایا نہیں...... آپ نے۔'' لیکن صوفی بہ غور زدس کو دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھا اور زدس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کا جائزہ لیتا رہا پھر اس نے کہا۔

''یہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔''

''کیا؟'' زیک لن کے منہ سے ایک آواز نکلی اور پھر اس نے ہونٹ بند کر لیے۔

''یہ باتھ روم کی فٹنگ کا ڈنڈا ہے۔ بڑے کام آیا یہ لیکن ہمیں زدس کی موت منظور نہیں تھی۔ سوری ڈیئر...... زیک لن...... سوری۔'' زیک لن نے کوئی جواب نہیں دیا تھا خاموشی سے زدس کی لاش کو گھورتا رہا۔

♥......♥......♥

وہ دونوں زیک لن کو ساتھ لے کر آئے تھے اور مہمان خانے میں اسے کس کر ڈال دیا تھا۔ اندر آنے کے لیے گیٹ کے بجائے بغلی سمت کی دیوار استعمال کی گئی تھی صوفی کے ساتھ سہیل عالم بھی ناقابل یقین کارنامے سرانجام دیتا تھا۔

بہر حال اس کے بعد انہوں نے بیٹھ کر آپس میں مشورہ کیا اور منصوبے تیار کرتے رہے۔ دوسری صبح ملازم ناشتا لے کر آئے۔ تو صوفی نے ایک ملازم سے پوچھا۔

''رائے صاحب گھر پر موجود ہیں۔ یا کہیں باہر گئے ہیں؟''

''ہیں صاحب جی اندر ہیں ناشتا کر رہے ہیں۔''

"ہوں...... آؤ......" صوفی نے کہا اور اس کے بعد وہ سہیل کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ناشتا اندر ہی رہنے دیا گیا تھا۔ دونوں اندر عمارت میں داخل ہو گئے۔ ملازموں نے ہچکچائی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ لیکن کسی نے انہیں روکا نہیں تھا۔ وہ اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں رائے راحیل، سیمل اور راشیل ناشتا کر رہے تھے۔ رائے راحیل نے کسی قدر ناگوار نگاہوں سے انہیں دیکھا لیکن راشیل جلدی سے بولی۔

"آیئے...... آیئے۔ آئیں ناشتا کریں ہمارے ساتھ۔"

"ہمارا ناشتا مہمان خانے میں پہنچ چکا ہے۔ لیکن ہمیں اس بات کا خدشہ تھا کہ آپ لوگ کہیں نکل نہ جائیں۔ رائے صاحب کچھ بہت ہی اہم انکشافات کرنے ہیں آپ سے بات کر لی جائے تو اچھا ہوگا۔"

"آپ بیٹھے ناشتے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہاں ناشتا کر لیں ہمارے ساتھ۔" راحیل نے کہا۔

"تم کیسی باتیں کرتی ہو ڈیئر! انسان کا ایک اپنا اسٹیٹس بھی ہوتا ہے۔"

"ہاں ہوتا ہے واقعی...... ویسے رائے راحیل صاحب اسٹیٹس کچھ بھی ہو انسان انسان ہی کہلاتا ہے۔ ٹھیک ہے ہم ناشتا نہیں کر رہے۔ مہمانوں کے ساتھ اس شاندار عمارت میں یہی سلوک ہونا چاہیے۔" راشیل کسی قدر ناگواری سے بولی۔

"آپ بیٹھے...... میں جو کہہ رہی ہوں۔ میرا ابھی تو کوئی تعلق ہے اس گھر سے۔" رائے راحیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ راشیل نے خود اپنے ہاتھوں سے انہیں چائے بنا کر پیش کی۔

صوفی نے بسم اللہ کہہ کر چائے قبول کر لی۔ سہیل عالم کو البتہ ان لوگوں کی باتیں کچھ ناگوار گزری تھیں۔ راشیل نے کہا۔

"سوری جیمس"

"نہیں...... نہیں کوئی بات نہیں ہے۔"

"لو ناشتا کرو پلیز۔" سیمل خاموش بیٹھی رہی تھی سہیل نے اپنی چائے کی پیالی اٹھا کر اس کے دو تین سپ لیے اور پھر بولا۔

"میڈم آپ نے مجھے اس لیے بلوایا تھا کہ میں آپ کی مشکل کا حل دریافت کروں اور اس کے عوض آپ نے مجھے ایک کروڑ ڈالر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ راشیل کے ہاتھوں سے چائے کی پیالی چھوٹے چھوٹتے بچی اس نے اسے پلیٹ میں رکھ کر کہا۔

"جیمس۔"

"جیمس...... نہیں نک کارسن...... مسٹر راحیل یا رائے راحیل میں جیمس نہیں ہوں نا ہی میں سیمل کا منگیتر ہوں۔ بلکہ میں ایک کریمنل ہوں۔ جو مختلف قسم کے معاملات سرانجام دے لیتا ہے۔ میڈم نے مجھے میرے وطن سے بلوایا تھا۔ کیونکہ میں وہاں ایک نامی گرامی کریمنل تھا۔ میڈم کی مشکل یہ تھی کہ وہ آپ کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنا چاہتی تھیں میرے ذریعے اور اسی کے لیے انہوں نے مجھے ایک بہتر معاوضہ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

اصل میں میڈم کے بارے میں یہ بات خفیہ حلقوں میں سنی جاتی رہی ہے کہ وہ دولت مند لوگوں

سے شادی کرتی ہیں۔ پھر انہیں قلاش کر کے انہیں چھوڑ دیا کرتی ہیں۔ آپ کے علم میں بھی یہ بات آ چکی ہے۔

"تم کیا بکواس کر رہے ہو؟ میں یہ پیالی تمہارے منہ پر کھینچ کر ماروں گی۔"

"پلیز ایک منٹ خاموش رہیں۔ میری پوری بات سن لیں۔ اس کے بعد جو آپ دل چاہے کریں۔ تو مسٹر رائے راحیل۔ میڈم نے آپ سے بھی اسی لیے شادی کی تھی اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ آپ نے بھی میڈم کی دولت کے قصے سن رکھے تھے چنانچہ آپ بھی اسی دولت کی وجہ سے ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

میڈم نے اب تک کئی شادیاں کیں اور ان کی دولت ہڑپ کر لی اور انہیں چھوڑ دیا۔ یہ بات آپ کے علم میں بھی تھی۔ آپ نے ان معاملات کو نظر انداز کر کے میڈم سے شادی کر لی۔ لیکن بعد میں کچھ اس طرح کے معاملات پیش آئے کہ آپ کو یہ علم ہوا کہ میڈم قلاش ہیں اور آپ اپنے وطن واپس آ گئے۔ البتہ یہ بات طے ہے آپ قلاش نہیں تھے۔

یہاں بھی آپ کے پاس بہت کچھ ہے اور وہاں بھی بہت کچھ تھا۔ اب میں اصل بات بتا رہا ہوں۔ زیک لن ایک خوف ناک کردار جس کے بارے میں یورپ کے کئی ملکوں میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ ماسٹر مائنڈ ہے اور بڑے بڑے جرائم کرتا ہے۔ لیکن یہ جرائم قتل و غارت گری پر مبنی نہیں ہوتے۔ وہ صرف برین ماسٹر ہے اور خود کو دماغ کا سوداگر کہتا ہے۔ اس نے نہ جانے کیا کیا چکر چلا رکھے ہیں لیکن تمام چکروں میں ایک چکر یہ بھی ہے کہ اس نے بے چاری راشیل کو اپنے چنگل میں جکڑ رکھا ہے اور اسے بلیک میل کر کے اپنے کاموں کے لیے مجبور کرتا رہا ہے۔

جو دولت راشیل نے اس کے پلان پر حاصل کی تھی۔ وہ راشیل کے قبضے میں نہیں جاتی تھی بلکہ اسے معمولی سا معاوضہ مل جاتا تھا اس کا۔ اس کی ساری محنت زیک لن ہڑپ کر لیتا تھا۔ یہاں بھی زیک لن اسی چکر میں آیا تھا اور اس نے یہاں آ کر آپ کے خلاف کام شروع کر دیا تھا۔ وہ ہر طرف سے جائزہ لے رہا تھا کہ کس طرح آپ کی دولت کو اپنے قبضے میں کیا جا سکے۔

مگر راشیل کے بارے میں میں آپ کو یہ بتا دوں کہ وہ بس اپنی ایک لغزش کا شکار ہو گئی تھیں۔ جس کی وجہ سے وہ زیک لن کے شکنجے میں کس گئی۔ بہرحال اپنے طور پر وہ ہر طرح سے کوشش کرتی رہیں۔ پھر کسی طرح میں انہیں یاد آ گیا اور انہوں نے مجھے بلا لیا۔ میں یہاں پر اسی لیے آیا تھا کہ زیک لن کو تلاش کر کے میڈم کو اس سے نجات دلا دوں اور اس کے عوض ان کے جمع کیے ہوئے ایک کروڑ ڈالر میرے حوالے کر دیئے جائیں۔ تو میڈم راحیل میں یہ کام سرانجام دے چکا ہوں۔" راشیل کے ساتھ ساتھ راحیل رائے بھی اچھل پڑا تھا۔

"کک...... کک کیا مطلب؟"

"زیک لن کو میں نے گرفتار کر لیا ہے۔ اب وہ میرے قبضے میں ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔"

"حق اللہ...... حق اللہ اور جناب عالی! ہم بھی اپنا کام سرانجام دے چکے ہیں کیا سمجھے آپ۔ ہم

دونوں مل کر زیک لن کو یہاں پکڑ کر لائے ہیں۔"

"یہاں۔"

"ہاں...... اس وقت وہ مہمان خانے میں بندھا ہوا پڑا ہے اور اگر آپ حمید وغیرہ کی تفصیل سننا چاہتے ہیں تو وہ بھی ہم آپ کو بتا دیں لیکن جملہ پورا ہونے سے پہلے راشیل اچھل کر کھڑی ہوگئی اور پھر اس نے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی تھی۔سیمل اسے آواز دیتی رہ گئی۔

"ممی...... ممی...... سنیے تو سہی...... میری بات تو سنیں ممی...... میری بات تو سنیں۔" لیکن راشیل بے قابو ہو چکی تھی۔رائے راحیل بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے بعد صوفی اور سہیل بھی مہمان خانے کی طرف چل پڑے۔انہوں نے دور سے راحیل اور راشیل کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔جو مہمان خانے میں داخل ہو گئے تھے۔

"یہ بات کھلنی نہیں چاہیے کہ تم نک کارسن نہیں ہو۔" صوفی نے کہا۔

"ٹھیک ہے مرشد۔" سہیل عالم مدھم لہجے میں بولا۔اور پھر وہ دونوں ہی مہمان خانے میں داخل ہو گئے۔راشیل بندھے ہوئے زیک لن کو دیکھ رہی تھی اور زیک لن کے چہرے پر بے بسی کے آثار تھے پھر راشیل نے راحیل کی طرف مڑ کر کہا۔

"دیکھ لو راحیل...... اب دیکھ لو۔اچھی طرح دیکھ لو یہ خبیث سامنے موجود ہے۔آہ...... اسی نے میری پوری زندگی کو ایک زخم بنا دیا ہے رائے راحیل تم میرے پانچویں شوہر ہو۔مجھے صرف اپنے پہلے شوہر سے محبت ہوئی تھی۔باقی تم سب میرے لیے دولت حاصل کرنے کا ذریعہ ہو۔سمجھے...... جو کچھ ہوا تھا اس میں میری غلطی نہیں تھی۔اوروں کی وجہ سے میں مشکل میں پھنس گئی۔ایک بلیک میلر نے مجھے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا اور اس کے بعد یہ مجھے اپنے اشاروں پر چلاتا رہا۔

رائے راحیل اسی نے تمہاری نشاندہی کی اور ساری صورت حال مجھے بتائی چنانچہ میں تمہاری تحویل میں آ گئی۔بہت بار تم نے مجھ سے پوچھا تھا ناں کہ میں اس قدر سرد عورت کیوں ہوں۔میں سرد اس لیے تھی کہ تم تک میری رسائی میری اپنی مرضی سے نہیں ہوئی تھی سمجھے۔یہ شخص مجھے مجبور کرتا رہتا تھا اور میں سارے کام کرتی تھی اور اس کے بعد مجھے یہاں تک آنا پڑا۔

رائے راحیل مجرم میں ہوں۔کیونکہ وہ سب کچھ میں نے کیا۔لیکن اصل مجرم یہ موجود ہے۔"

"درویش اس پر رحم کریں۔"

"نہیں درویش اس پر رحم نہیں کریں گے۔میں...... میں پہلی بار آزاد ہوئی ہوں کہ...... یہ بندھا ہوا پڑا ہے میں اسے اپنے دانتوں سے چبا ڈالوں گی۔" راشیل ایک بھوکی بلی کی طرح زیک لن پر دوڑ پڑی اور اس کے بعد جو منظر دیکھنے میں آیا وہ بہت ہی ہولناک تھا۔درحقیقت راشیل نے اپنے دانتوں سے زیک لن کا نرخرہ پکڑ لیا تھا اور اس پر پوری قوت صرف کر رہی تھی۔رائے راحیل سہیل اور خود صوفی بھی دوڑ پڑے پیچھے سے سیمل بھی آ گئی تھی۔جو یہ منظر دیکھ کر بے ہوش ہو گئی تھی۔لیکن وہ سب کے سب مل کر بھی راشیل کو زیک لن سے نہ ہٹا سکے۔

وہ درحقیقت ایک خونخوار شیرنی کی طرح چمٹی زیک لن بری طرح تڑپ رہا تھا۔صوفی اور سہیل کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ راشیل اس قدر بے اختیار ہو جائے گی۔زیک لن کی آنکھیں باہر نکل پڑیں۔اس نے بندھے ہوئے ہاتھوں کی باوجود اوچھل کود مچا کر خود کو راشیل کے چنگل سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔لیکن تین تین افراد راشیل کو ہٹا رہے تھے۔وہ کامیاب نہیں ہو سکے تھے تو زیک لن کیا کامیاب ہوتا۔راشیل نے اپنے ناخنوں سے اس کی آنکھیں نوچ ڈالی تھیں۔

ایسا خوف ناک چہرہ بنا دیا تھا اس کا کہ دیکھنے والا اسے ایک نگاہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔چند لمحوں کے بعد زیک لن سرد پڑ گیا۔راشیل بری طرح ہانپ رہی تھی۔اس کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

"میں نے...... میں نے تم لوگ سوچ بھی نہیں سکتے...... میں نے جو زندگی گزاری ہے۔وہ موت سے بھی بدتر تھی۔آہ...... کاش...... میں تمہیں اپنا دل دکھا سکتی۔بتا سکتی کہ کیا زندگی گزاری ہے میں نے۔کس طرح تڑپ تڑپ کر زندہ رہی ہوں میں۔آج میرا دل سرد ہو گیا ہے۔اے شخص...... نک کارسن میں نے تجھ سے ایک کروڑ کا وعدہ کیا تھا کاش میرے پاس دنیا کی ساری دولت ہوتی۔وہ میں تیرے حوالے کر دیتی۔تو نے میرا دل ٹھنڈا کیا ہے آج۔دل ٹھنڈا کر دیا ہے تو نے۔رائے راحیل آگے بڑھا اور اس نے رومال سے راشیل کے ہونٹ خشک کرتے ہوئے کہا۔

"آؤ راشیل...... آؤ...... باتھ روم میں آؤ۔منہ ہاتھ دھوؤ...... منہ ہاتھ دھوؤ۔"

"مجھے پولیس کے حوالے کر دو راحیل...... مجھے پولیس کے حوالے کر دو میں اب موت کی سزا چاہتی ہوں۔قتل کیا ہے میں نے سمجھے تم سب اس کے گواہ ہو۔میں نے۔قاتل ہوں میں۔سزائے موت چاہتی ہوں۔تنگ آ گئی تھی اس زندگی سے میرا کوئی قصور نہیں تھا۔بس اس بلیک میلر کے جال میں پھنس گئی تھی۔میں نے زندگی میں کچھ بھی نہیں دیکھا۔

"اب تو تم انسان بنی ہوں۔راشیل اور انسان کی موت کون چاہے گا۔آؤ پہلے منہ صاف کر لو۔تم حد سے زیادہ جذباتی ہو گئی تھیں۔رائے راحیل اسے باتھ روم میں لے گیا۔سہیل عالم نے صوفی کی طرف دیکھا اور بولا۔

"جی...... صوفی صاحب۔"

"نہیں۔بے شک اس نے ایک شخص کو قتل کیا ہے لیکن ہم اس کے پیش نظر کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ایک برا آدمی موت کے گھاٹ اترا ہے۔کم از کم میں اس عورت کو کوئی سزا دلوانے کے حق میں نہیں ہوں۔"

"زندہ باد صوفی صاحب! میں بھی انتہا پسندی کا قائل نہیں ہوں۔" آپ کا فیصلہ درست ہے۔یہ باتیں سرگوشی کے انداز ہو رہی تھیں۔رائے راحیل باہر آیا اس کے چہرے پر بے کسی کے نقوش تھے۔پھر اس نے کہا۔

"اگر اجازت ہو تو میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"ارشاد...... ارشاد...... درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"آپ لوگ اگر میرے ساتھ تعاون کریں تو دو زندگیاں بلکہ تین زندگیاں کیونکہ ہمارے ساتھ سیمل بھی شامل ہے۔زندگی پا سکتی ہیں یہ شخص جو تمام فسادات کی جڑ تھا۔مر چکا ہے۔کس طرح مرا یہ بات

آپ لوگ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ راشیل جیسی کسی بھی عورت کا تصور کر لیجیے گا۔ ان حالات میں اس کی دیوانگی اسی حد تک پہنچ جانی چاہیے تھی۔ محترم صوفی صاحب!...... میں نے جمشید مرزا کو پچاس لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میں اپنے وعدے کا پابند ہوں۔ راشیل نے مسٹر نک کارسن کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ انہیں ایک بڑی رقم کا وعدہ کر کے یہاں بلانے کی ذمہ دار ہے۔ اس رقم کا آدھا حصہ انہیں ادا کر دیا ہے۔ مسٹر نک کارسن! میں باقی آدھی رقم ادا کرنے کو تیار ہوں۔ میرا مطلب ہے راشیل کے اس اکاؤنٹ سے۔ آپ براہ کرم اس سلسلے میں اپنی زبان بند رکھیے گا یہ ایک درخواست ہے۔ میں اسے پیش کش بھی نہیں کہہ سکتا۔ ایک لمحے کے اندر اندر صوفی نے فیصلہ کیا اور بولا۔

''ٹھیک ہے۔'' واپسی کے راستے میں سہیل نے صوفی کو نک کارسن کے بارے میں پوری تفصیل بتائی اور صوفی نے حیرانی سے اسے دیکھا اور بولا۔

''تم نے پہلے مجھے یہ نہیں بتایا۔''

''میں نے سوچا تھا صوفی صاحب کہ اونٹ کسی کروٹ بیٹھ جائے اور پھر مجھے معاف کر دیجئے گا کہ وہ میرا دوست ہے۔ میں نے اس سے اس راز کو راز رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ اگر آپ کو مرشد نہ مانتا تو آپ یقین کیجیے کہ آپ کو کبھی نہ بتاتا اس کے بارے میں۔''

''کہاں ہے وہ؟''

''میں اسے اپنے فلیٹ میں چھوڑ کر آیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اپنے اس دوست ڈاکٹر کو اس کی بیماری کی تفصیل بتا دی تھی۔ وہ واقعی خاصا سنگین بیمار ہے اور یہ ہماری رقم اس کی بیماری پر خرچ کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنی بیماری کے علاج کے لیے جاپان جائے۔ جہاں سے اسے کچھ اس قسم کی اطلاعات ملی ہیں کہ اس کی بیماری کا علاج جاپان میں موجود ہے۔''

''بسر چشم...... ویسے یہ پچاس لاکھ روپے ہم گرین فورس فنڈ میں ڈال دیتے ہیں۔ اب ہمیں یہ سب کچھ کرنا پڑے گا درویشوں کے کرم سے۔ ظاہر ہے گرین فورس کو زندہ رکھنا ہے۔ پہلے تو کرنل رحیم شاہ سارے اخراجات چلاتے تھے۔ لیکن اب طریقہ کار تبدیل کرنا پڑ رہا ہے۔''

''خوشی کے ساتھ...... خوشی کے ساتھ۔ میں نے تو آپ سے پہلے بھی کہا تھا۔'' سہیل عالم نے کہا۔ بہر حال دونوں...... سب سے پہلے فلیٹ پر پہنچے۔ جہاں ٹارزن غم زدہ شکل بنائے سہیل عالم کا منتظر تھا۔

''خیریت...... کارسن کہاں ہے؟''

''وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔''

''کیا؟'' سہیل عالم اچھل پڑا۔

''ہاں آپ کے جانے کے بعد بڑا خوش و خرم تھا۔ کل رات کو اچانک حالت بگڑ گئی تھی اور ڈاکٹر تاشیر اسے اپنے ساتھ ہسپتال میں لے گئے۔ میں نے انہیں اطلاع دی تھی۔ آج صبح ساڑھے سات بجے اس کا انتقال ہو گیا۔ اب بھی اس کی لاش سرد خانے میں موجود ہے۔ آپ کو اس کے لیے اطلاع نہیں دی کہ نہیں آپ کی مصروفیت کیا ہوں۔ کیونکہ آپ میک اپ کر کے گئے ہوئے تھے۔''

''اوہ مائی گاڈ......'' بہر حال اس کے بعد صرف رسمی کارروائیاں رہ گئی تھیں۔ سہیل عالم نے ساری رقم صوفی کو دیتے ہوئے کہا۔

''اسے بینک میں جمع کروا دیجئے صوفی صاحب! گرین فورس فنڈ اکاؤنٹ میں۔''

''مگر یہ......''

''نہیں...... آپ جانتے ہیں۔ میرے سامنے دولت کے انبار ہیں میں اس بدبخت چیز سے بچتا ہوں۔ اس طرح میں باعمل رہوں گا۔ ورنہ یہ بدن کو ناکارہ کر دیتی ہے اور انسان کسی قابل نہیں رہتا۔'' سہیل عالم نے افسردگی سے کہا۔

♥......♥......♥

کرنل رحیم شاہ ملک بدر ہو گیا تھا۔ سارا خاندان ایک یورپی ملک میں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ عادل، لقمان اور کرنل کے اہل خاندان خاص طور سے اس کی سب سے چہیتی بیٹی رائنہ بہت افسردہ تھی اور اس کا خیال تھا کہ خوش و خرم رہنے والے کرنل رحیم شاہ کی صحت پر اس ملک بدری کا بڑا برا اثر پڑے گا۔ کیونکہ ایک مخلص اور محب وطن انسان کو اگر اس طرح راندۂ درگار کر دیا جائے تو اس کی ذہنی کیفیت کسی طور بحال نہیں رہ سکتی۔ کرنل رحیم شاہ کے اندر کچھ بھی ہو۔ لیکن اوپر سے وہ ہشاش بشاش تھا۔

''میں ایک فوجی ہوں اور فوجی کے اعصاب اگر فولادی نہ ہوں۔ تو وہ ایک کامیاب فوجی نہیں رہ سکتا۔ بلکہ میں حیران اور خوش ہوں کہ مجھے اس طرح کی تبدیلی کا سامنا کرنا پڑا ہے ورنہ لوگوں کی زندگی سپاٹ گزر جاتی ہے تم لوگ یہ مت سمجھنا کہ بات ختم ہو گئی۔ کہانی نے ایک ٹرن لیا ہے اور اب اس کے بعد آگے بڑھنے کی منتظر ہے۔ تم صوفی کو کیا سمجھتے ہو۔ وہ ایک مملکت ہے۔ لیجنڈ ہے۔ وہ کھیل دکھائے گا کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں گے۔ ایسا اعتماد زندگی میں کبھی کبھی کسی میں پیدا ہوتا ہے اور کم از کم تم لوگوں کو یہ اندازہ ضرور ہو گا کہ میں کسی پر احمقانہ اعتماد نہیں کرتا۔''

''بہت بڑی بات ہے۔ انکل بہت بڑی بات ہے۔''

''میں بس یہ چاہتا ہوں کہ تم لوگ اپنے آپ کو جلاوطن مت سمجھو! بلکہ یہ سمجھو کہ کچھ عرصے کے لیے، تبدیلی آب و ہوا کے لیے یہاں آئے ہو۔ ہمیں واپس اپنے وطن جانا ہے۔ میں تم لوگوں کو مکمل اعتماد دلاتا ہوں اور اس کے بعد ان لوگوں میں واقعی اعتماد پیدا ہو گیا کہ یہ سب کے سب تفریحات میں حصہ لینے لگے۔

جس شہر میں انہوں نے رہائش اختیار کی تھی وہ حسن و جمال کا نمونہ تھا۔ شہری زندگی کہر میں ڈھکی ہوئی۔ ایک حسین ماحول پیش کرتی تھی۔ کہریلی اور بارش میں بھیگی ہوئی سڑکوں پر۔ روشنیوں کی لکیریں۔ زندگی کی لکیریں محسوس ہوتی تھیں اور پھر اس کے اطراف سر سبز و شاداب۔

بل وادی بہت ہی حسین تفریحی علاقہ تھا۔ یہاں کی تفریحات منفرد تھیں۔ بڑے بڑے ٹرالر گردش کرتے رہتے تھے اور جہاں قیام کی ضرورت پیش آتی۔ وہاں قیام کر لیا کرتے تھے۔ رات کی تاریکیوں میں کسی بھی جگہ کیمپنگ ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی کرنل رحیم شاہ جس نے اپنے آپ کو کرنل ہی کہلوانا پسند کیا تھا۔ کیونکہ بہ قول اس کے جرنل کا عہدہ اسے راس نہیں آیا تھا۔ کرنل رحیم شاہ ایک ٹرالر میں مقیم تھا۔ بہت بڑی

جھیل کے کنارے یہ ٹرالر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے خاندان کے اور افراد بھی دوسرے ٹرالوں میں تھے۔ رحیم شاہ اپنی ایک بیٹی کے ساتھ اس بڑے ٹرالر میں موجود تھا۔ جسے اگر اندر سے دیکھا جاتا تو ایک کمال کی چیز سامنے آتی تھی۔ ایک خوبصورت کمرہ۔ جس میں دو بیڈ سٹنگ ارینجمنٹ اور اس کے بعد ایک کلرز یورشن کچن کے لیے تھا۔ حسین ترین جگہ تھی اس دن اچانک ہی آسمان بادلوں سے ڈھک گیا تھا اور پھر ایسی چھما چھم بارش شروع ہوئی تھی کہ اس وقت مسلسل چھ گھنٹے گزر چکے تھے اور بارش تھی کہ اس کا زور ٹوٹنے کو نہیں آتا تھا۔

قرب و جوار جل تھل ہو گئے تھے۔ اندر رائنہ اور کرنل رحیم شاہ بیٹھے ہوئے کافی سے شغل کر رہے تھے اور انہوں نے ٹرالر کے شیشے کھولے ہوئے تھے۔ جو باہر کا منظر پیش کر رہے تھے۔ قرب و جوار میں بچے ہوئے ٹرالروں سے روشنیاں جھلک رہی تھیں۔ باقی ہر طرف ہو کا عالم تھا اس تیز بارش میں کوئی زمین پر قدم رکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن وہ دستک ان کے لیے حیرانی کا باعث تھی۔ جو ٹرالر کے دروازے پر ہوئی تھی۔ کرنل رحیم شاہ نے چونک کر اس طرف دیکھا اور بولا۔

''یہ کون ہو سکتا ہے۔''

''دیکھوں۔؟''

''ہاں...... دیکھو!'' کرنل رحیم شاہ نے اپنی بیٹی سے کہا اور رائنہ جو ایک نڈر اور دلیر لڑکی تھی۔ دروازے کے شیشے کی جانب بڑھ گئی۔ شیشے سے اس نے دیکھا کہ ایک سایہ سا باہر موجود ہے۔ کرنل رحیم شاہ بھی بے ساکھی ٹیکتا ہوا آگے بڑھ آیا تھا۔ رائنہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کرنل رحیم شاہ شیشے سے باہر دیکھنے لگا۔ ایک لمحے تک جائزہ لیا رہا اور پھر اس نے رائنہ کو پیچھے ہٹنے کے لیے کہا۔ ساتھ ہی اس نے اشارہ کیا کہ پستول نکال لے۔ رائنہ نے ایک سائیڈ میں ہو کر ریوالور نکال لیا اور کرنل رحیم شاہ نے دروازہ کھول دیا۔ آنے والے نے اپنا ہاتھ اوپر کر دیا تھا تاکہ رحیم شاہ اسے ٹرالر کی سیڑھی سے اوپر بلا لے۔ دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی یہ سیڑھی بھی کھل جاتی تھی۔ جو کمانیوں سے بنائی گئی تھی۔ کرنل رحیم شاہ نے کچھ سوچ کر ہاتھ آگے کیا اور اس شخص نے اپنا ہاتھ رحیم شاہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ رحیم شاہ بڑی دقت کے ساتھ اسے اوپر کھینچنے میں کامیاب ہوا۔ چونکہ اس نے محسوس کیا تھا کہ ہاتھ میں ایک عجیب سی چپچپاہٹ ہے۔ جو لازمی طور پر خون کی ہی ہو سکتی ہے۔ وہ شخص اوپر آ گیا تو کمانی اوپر اٹھ گئی اور دروازہ بند ہو گیا۔ رائنہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ آنے والے کا لباس خون سے تر بتر تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ کوئی ایشیائی تھی۔ اس کے چہرے پر شدید نقاہت تھی۔ اس نے کھڑے رہنے کی کوشش کی لیکن وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

کرنل رحیم شاہ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کون ہو تم؟ کیا چاہتے ہو؟''

''سر...... میں...... ایشیائی ہوں۔ میرا نام سلیم شاہ ہے۔ میں مائیکرو سوفٹ انجینئر ہوں۔ ایک واقعہ پیش آ گیا ہے میرے ساتھ۔ میں نے جان بوجھ کر آپ کے ٹرالر کا رخ کیا ہے آج صبح ساڑھے چھ بجے بھی۔ میں یہاں پہنچا تھا میری کار برسٹ مار کر تباہ کر دی گئی ہے۔ وہ یہاں سے کوئی تین فرلانگ پیچھے ایک سڑک کے نشیب میں پڑی ہوئی ہے۔ اس شخص نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تم زخمی ہو؟''

''جی سر! میری بغل کے پاس تین گولیاں لگی ہیں۔ میں صبح ساڑھے چھ بجے سے ٹرالر کے نچلے ے میں چھپا پڑا ہوا ہوں اور وہ لوگ مسلسل میری تلاش میں سرگرداں ہیں۔''

''کون؟''

''انتہائی خطرناک دشمن! سر میں نے ٹرالر کے نیچے پڑے پڑے آپ کے ٹرالر کو دیکھا ہے مجھے یہ ندازہ ہوا ہے کہ آپ لوگ بھی ایشیائی ہی ہیں۔ آپ کے وطن کا میں اندازہ نہیں لگا سکا۔ لیکن میں۔'' اس شخص نے اپنے وطن کا نام لیتے ہوئے کہا۔ یہ کرنل رحیم شاہ ہی کا وطن تھا۔

''بات کیا ہوئی ہے؟''

''سر یہاں میں تقریباً بارہ سال سے مقیم ہوں۔ مائیکرو سوفٹ ویئر کا کاروبار کرتا ہوں۔ بالکل تفاقیہ طور پر میرے پاس ایک ایسا مائیکرو سوفٹ آ گیا۔ جس میں ایک انتہائی اہم راز پوشیدہ تھا۔ یہ مائیکرو وفٹ بھی ایک ہم وطن نے ہی مجھ تک پہنچایا تھا۔ جو میری ہی طرح زخمی تھا اور اس نے مجھے ساری حقیقت حال بتائی تھی۔ سر! خدا آپ کو محفوظ رکھے میں نہیں جانتا کہ آپ کے ساتھ کیا ہوگا لیکن صرف میری ایک بات مان لیجئے۔ اس مائیکرو سوفٹ ڈسک میں میں نے ایک مائیکرو فلم بنائی ہے۔ یہ میں آپ کے سامنے کر رہا ہوں۔ اس شخص نے ایک چھوٹا سا چوکور پیکٹ نکال کر کرنل رحیم شاہ کو دیتے ہوئے کہا۔

''اس میں وہ مائیکرو فلم محفوظ ہے۔ آپ براہ کرم اسے کسی بھی طرح دیکھ لیجئے۔ آج کل یہ ٹیکنالوجی کوئی مشکل کام نہیں رہی ہے۔ سر! اسے اپنے وطن پہنچانا ہے کیونکہ اس میں وطن عزیز کے خلاف ایک عظیم الشان سازش کی تفصیلات ہیں۔ سر! بہت سے چہرے بے نقاب ہوئے ہیں۔ جو وطن میں بہت بڑا مقام رکھتے ہیں۔ لیکن اصل میں وطن دشمن ہیں۔ سر! کسی بھی طرح ذمہ دار افراد کو یہ مائیکرو فلم منتقل کر دی جائے۔ سر! یہ اتنی ضروری ہے کہ آپ یوں سمجھ لیجئے کہ اس میں وطن کی بقاء چھپی ہوئی ہے۔ آپ پلیز! یہ کام کر ڈالیے میں اگر چاہتا تو یہ مائیکرو فلم متعلقہ لوگوں کے حوالے کر کے اپنی زندگی بچا سکتا تھا۔ لیکن میں نے پوری زندگی کی بازی لگا دی ہے۔ ان لوگوں نے مجھے زخمی کر دیا ہے۔ مگر شاید میں ابھی اسی لیے زندہ ہوں کہ اپنے پیارے وطن کے لیے کچھ کر کے مروں سر! وطن سے دور رہ کر تو وطن کا پیار بے پناہ بڑھ جاتا ہے۔ میں اسی پیار سے سرشار ہوں۔'' کرنل رحیم شاہ اس کے چہرے پر مسلسل نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔ زخمی کے انداز سے الگ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے بالکل سچ کہہ رہا ہے۔

''میں تمہارے زخم دیکھ لوں۔''

''نہیں سر! آپ صرف اپنے تحفظ کا بندوبست کیجئے میں نہیں جانتا کہ آگے کیا ہوگا۔ اگر آپ اس مائیکرو فلم کو وطن تک پہنچانے کا وعدہ کر لیں تو میں ایک منٹ یہاں نہیں رکوں گا۔ میں بالکل نہیں چاہوں گا کہ آپ کو کوئی نقصان پہنچے۔''

''نہیں دوست! یہ مائیکرو فلم تو خیر وطن پہنچ ہی جائے گی۔ لیکن میں تمہیں اس طرح۔''

''سر! جذباتی نہ ہوں پلیز...... میری بات مان لیں۔''

''مگر میں تمہیں اس زخمی حالت میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔''

''چھوڑ دیجیے سر! بڑے مفاد کے لیے چھوٹا مفاد قربان کرنا پڑتا ہے۔''

''خیر پہلے میں تمہاری بینڈیج کروں گا۔ رائنہ چلو۔'' کرنل رحیم شاہ نے کہا۔ وہ شخص منع کرتا رہا لیکن رائنہ نے کرنل رحیم شاہ کے ساتھ مل کر اس شخص کے زخموں کی ڈریسنگ کی۔ گولیاں آر پار ہو گئی تھیں بدن پر زخم تھے۔ جن سے بے پناہ خون بہہ گیا تھا۔ اس شخص کے چہرے کی نقاہت یہ بتاتی تھی کہ اس کی زندگی یہاں رکنے کے لیے تیار نہیں ہوا اور ڈریسنگ کرانے کے بعد اس نے دو پیالے دودھ پیا پھر بولا۔

''آپ کا بے حد شکریہ۔ تو میں چلتا ہوں۔ لیکن اس امید کے ساتھ کہ میرا مشن آپ پورا کریں گے۔''

''ہاں سلیم شاہ۔ تمہارا مشن پورا ہو جائے گا لیکن تم مجھے ایک بہت بڑا دکھ دے رہے ہو۔''

''نہیں سر خدا آپ کو سلامت رکھے۔''

''اپنا پتا دے رہے ہو۔''

''بالکل نہیں۔ بس اتنا کافی ہے۔'' سلیم شاہ نے کہا اور رائنہ کی طرف رخ کر کے بولا۔

''بیٹی! پلیز دروازہ کھول دو بہت ضروری ہے۔ باہر بارش اسی برق رفتاری سے ہو رہی تھی۔ سلیم شاہ نیچے اتر گیا۔ کرنل رحیم شاہ دروازہ کھولے اسے رات کی تاریکی میں گم ہوتے دیکھ رہا تھا۔ رائنہ نے کہا۔

''کچھ بھی تھا۔ ایک بار میرے دل میں خیال آیا تھا کہ اسے کوئی انجکشن دے کر بے ہوش کر دوں۔ تا کہ اس کی ضد ختم ہو جائے۔ لیکن کرنل رحیم شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دیر تک وہ خاموشی سے دروازے میں کھڑا ماحول کو گھورتا رہا۔ اور پھر اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''خدا اس کی حفاظت کرے دراوزہ بند کر دو۔'' رائنہ نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ لیکن شیشے سے وہ بہت دیر تک باہر دیکھتے رہے تھے۔

پھر بھلا نیند کسے آ سکتی تھی۔ مائیکرو فلم کا وہ پیکٹ ایک انتہائی محفوظ جگہ پر چھپا دیا گیا تھا۔ رائنہ نے کہا۔

''کیا پروگرام ہے پپا۔''

''دیکھنا پڑے گا پہلے یہ مائیکرو فلم دیکھنی پڑے گی۔ ہم کل صبح یہاں سے چل پڑیں گے۔ کرنل رحیم شاہ نے کہا۔ اچانک ہی رائنہ چونک پڑی۔ پھر بولی۔

''پپا...... وہ زخمی تھا اور اس کا کہنا یہ ہے کہ وہ سامنے والے ٹرالر میں یہاں تک آیا تھا۔''

''اگر تم سوچ رہی ہو کہ اس کے جسم سے ٹپکتے ہوئے خون کے نشانات باقی رہ جائیں گے تو یہ ممکن نہیں ہو گا۔ کیونکہ اس قدر تیز بارش میں وہ نشانات چند لمحوں کے اندر دھل گئے ہوں گے۔''

''پھر بھی پپا صبح کا پہلا نور پھیلتے ہی ہمیں سیڑھیوں وغیرہ کا جائزہ لے لینا چاہیے۔''

''تمہاری ذہانت پر مجھے خوشی ہوئی رائنہ۔''

''آخر بیٹی کس کی ہوں۔'' رائنہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ دوسری صبح کرنل رحیم شاہ کے بیان کی تصدیق ہو گئی خون کے کوئی نشانات باقی نہیں رہے تھے۔ لیکن کرنل رحیم شاہ وہاں نہیں رکا تھا۔ مائیکرو فلم

دیکھنے کے لیے پروجیکٹر کا انتظام فیضان نے کیا تھا۔ عادل اور فیضان بہرحال صوفی کی صحبت میں رہ چکے تھے اور خاصے ٹرینڈ ہو چکے تھے انہیں ساری صورت حال بتا دی گئی تھی۔ چنانچہ پروجیکٹر کا بندوبست کر لیا گیا اور اس کے بعد رائنہ، عادل، فیضان اور کرنل رحیم شاہ نے وہ فلم دیکھی فلم دیکھ کر کرنل رحیم شاہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جو انکشافات اس فلم میں کیے گئے تھے۔ وہ اس قدر سنسنی خیز تھے کہ کرنل رحیم شاہ ان میں کھو کر رہ گیا تھا۔

اور پھر اس نے جوش جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''خدا کی قسم ان تمام لوگوں کو صفحہ ہستی سے مٹنا ہو گا۔ ہم میں سے کسی ایک شخص کو صوفی کے پاس جانا ہو گا اور یہ مائیکرو فلم احتیاط کے ساتھ اس تک پہنچانی ہو گی۔''

''میں جاؤں گا انکل۔'' فیضان نے مردانہ وار کہا۔

''نہیں تم دونوں جانے پہچانے ہو۔''

''مگر میں نہیں ہوں۔'' رائنہ کی آواز ابھری۔ اور کرنل رحیم شاہ فخریہ انداز میں اپنی اس بہادر بیٹی کو دیکھنے لگا۔

♥......♥......♥

عادل اور فیضان چونک کر رائنا کو دیکھنے لگے۔ پھر فیضان نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔

''نہیں رائنا بھلا تم کیسے واپس جاؤ گی اور ویسے بھی جس انداز میں ہم لوگ وطن سے یہاں آئے ہیں اس میں تمہاری واپسی...... چلو ہم لوگ تو اپنا کچھ نہ کچھ بندوبست کر لیں گے لیکن تمہارے لیے......''

فیضان نے کہا اور جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ رائنا نے تیکھی نگاہوں سے فیضان کو دیکھا اور پھر کرنل رحیم شاہ کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

''ڈیڈی! آپ براہ کرم ان لوگوں کو بتائیے کہ میں کون ہوں، حالاں کہ ان کے یہ الفاظ میری بے عزتی کے مترادف ہیں، لیکن خیر نیک جذبے سے کہے گئے ہیں اور پھر اس وقت کسی بھی بات کا برا ماننے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہمارے سامنے اچانک ایک مشن آ گیا ہے۔ فیضان صاحب میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں کرنل رحیم شاہ کی بیٹی ہوں جنہوں نے اپنی فوجی زندگی میں ایسے ایسے کارنامے سرانجام دیے ہیں جو سونے کے قلم سے لکھنے کے قابل ہیں۔ اس کے علاوہ جسمانی طور پر معذور ہونے کے باوجود انہوں نے......''

''ارے نہیں نہیں بیٹا! بہت برا مان گئیں تم، فیضان کی بات کا، وہ اصل میں جس جذبے کے تحت یہ بات کہہ رہا ہے وہ جذبہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔''

''ڈیڈی! یہ مائیکرو فلم میں وطن لے کر جاؤں گی اگر آپ کے پاس اس سلسلے میں کوئی منصوبہ ہے تو میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گی ورنہ دوسری شکل میں مجھے خود اس کے لیے عمل کرنا ہو گا۔''

''تھوڑا سا سوچنے کا وقت تو مجھے دو گی نا رائنا!''

''آپ بے شک سوچ لیجیے لیکن براہ کرم آپ بھی مجھے صرف ایک لڑکی سمجھ کر نظر انداز نہ کر دیجیے گا۔ بدلے ہوئے وقت کے ساتھ ہم لوگوں میں بھی کافی تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔ میں خود یہ مائیکرو فلم لے کر

جاؤں گی۔" کرنل رحیم شاہ ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا تھا۔ بہر حال اس بارے میں ساری باتیں ایک طرف کی نشان دہی کرتی ہیں۔ وہ یہ کہ اس فلم کو صوفی تک ضرور پہنچنا ہے باقی کرنل رحیم شاہ کو اس بات کا اطمینان تھا کہ بعد کے معاملات صوفی اپنے طور پر کنٹرول کر لے گا۔

دو دن گزر گئے رائنا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے اپنی کچھ مصروفیات بھی بنا لی تھیں اور وہ نہ جانے کیا کیا کرتی پھر رہی تھی۔ کرنل رحیم شاہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کئی سوچیں اس کے ذہن میں تھیں، اس نے یوں غور کیا تھا کہ جن حالات میں وہ ملک سے باہر نکلا ہے اس کے بعد اسی خاندان کے کسی فرد کو خفیہ طور پر وطن واپسی کے سلسلے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ اچانک ہی کچھ اس طرح کی مخالفتیں ہو گئی تھیں جنہیں وہ خود بھی صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا تھا۔

اصل میں اگر سارے اہل خاندان کا معاملہ نہ ہوتا تو یقینی طور پر وہاں فوراً ہی کوئی نہ کوئی کارروائی کی جا سکتی تھی لیکن کرنل رحیم شاہ کوئی سنگین رسک لینے پر تیار نہیں تھا بہ ظاہر اب کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ مائیکرو فلم کو وہ کسی بھی طرح ایسے ذرائع سے وطن نہیں بھیجنا چاہتا تھا جو خطرناک ہوں، کیوں کہ یہ مائیکرو فلم جن رازوں کی امین تھی وہ بڑے سنگین تھے اور انہیں صوفی تک پہنچنا انتہائی ضروری تھا پھر تقریباً پانچویں یا چھٹے دن کی بات ہے کہ رائنا خود ہی اس کے پاس پہنچ گئی۔

"ڈیڈی کیا بات ہے آپ نے مکمل طور پر خاموشی اختیار کر لی ہے۔"

"رائنا میں فیصلہ نہیں کر پا رہا! حالاں کہ میرے ساتھ خاندان کے بہت سے افراد موجود ہیں اور اصولی طور پر مجھے انہی میں سے کسی کو اس کام کے لیے تیار کرنا چاہیے لیکن بات وہی ہے اس دوران میں نے صوفی سے رابطہ تک قائم نہیں کیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں صوفی کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ اصل میں جب تک وہ لوگ سامنے نہ آئیں جنہوں نے مجھے یہاں تک پہنچانے میں شدید ترین محنت کی ہے اور اپنا کردار سر انجام دیا ہے میں نہیں چاہتا کہ کوئی گڑ بڑ ہو۔"

"جی ڈیڈی! میں آپ سے سوال کر رہی ہوں کہ آپ نے اس دوران کیا سوچا جس اہم اور قیمتی راز کو آپ وطن پہنچانا اس قدر ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمیں اس میں دیر بھی تو نہیں کرنی چاہیے۔"

"میں اس اعتراف میں کوئی قباحت نہیں سمجھتا رائنا کہ میں اسے اتنی ہی ذمے داری اور راز داری کے ساتھ وطن بھیجنا چاہتا ہوں کہ کوئی خطرہ باقی نہ رہے ورنہ صورتِ حال اس سے زیادہ سنگین ہو جائے گی کہ یہ راز وطن کو نہ پہنچے۔

"گڈ گویا ابھی تک اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا لیکن ڈیڈی میں یہ کام کرنا چاہتی ہوں۔ فیضان اور عادل کو آپ نے صوفی صاحب کے ساتھ مصروف کر کے انہیں با قاعدہ تربیت دلوائی اور اس دوران میں یہ سوچتی رہی کہ کاش میں آپ کا بیٹا ہوتی اور آپ مجھ پر بھی اتنا ہی اعتماد کرتے۔ ڈیڈی! افسوس کی بات یہ ہے کہ آپ زمانہ جدید سے پوری طرح تعاون کرتے ہیں لیکن ہم لوگوں کا معاملہ ہنوز وہیں کا وہیں ہے۔" کرنل نے چونک کر رائنا کو دیکھا اور بولا۔

"رائنا! تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"ڈیڈی! میں انتظامات کر چکی ہوں اور میں نے ایک لائحہ عمل ترتیب دے لیا ہے۔"

"کیا......؟" کرنل نے سوال کیا۔

"آپ کو پتا ہے کہ یہاں ہمارے بے شمار ہم وطن موجود ہیں۔ میری ایک دوست سمعیہ وزیر علی ہے۔ سمعیہ وزیر علی ایک ریسرچ اسکالر ہے اور کچھ کتابیں ترتیب دے رہی ہے۔ اس کی دو کتابیں پہلے بھی مارکیٹ میں آ چکی ہیں جس میں اس نے ہندوستان کے علاقے آسام کے بارے میں مکمل ریسرچ کی ہے۔ خاص طور سے اس نے عجائبات عالم میں سے اجنتا ایلورا کے بارے میں بڑی تفصیلی ریسرچ کی ہے۔ اس کے علاوہ ڈیڈی! اس نے ایم اے زون کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے اور اب وہ فراعنہ کے بارے میں لکھ رہی ہے اور اس کا خاص موضوع یہ ہے کہ مصر کے احرامین میں جتنی ممیاں پائی گئی ہیں وہ مردوں ہی کی کیوں ہیں۔ عورتوں کی ممیاں ان میں کیوں نہیں ہوتیں۔ وہ اس پر خاص طور سے ریسرچ کر رہی ہے اور دو دن کے بعد وہ مصر روانہ ہونے والی ہے۔

ڈیڈی! میں نے انتظام کر لیا ہے میں سمعیہ وزیر علی کے ساتھ یہاں سے مصر جاؤں گی اور مصر سے خفیہ طور پر اپنے وطن نکل جاؤں گی۔ یہ میرا منصوبہ ہے اور میں اس کے بارے میں آج آپ سے فائنل ڈسکس کرنے آئی ہوں۔" کرنل رحیم شاہ حیران نگاہوں سے بیٹی کو دیکھ رہے تھے، پھر انہوں نے کہا۔

"مگر رائنا تم اپنی اصل حیثیت سے وہاں جاؤ گی؟"

"ہاں۔ بالکل! اصل حیثیت سے، لیکن مصر پہنچنے کے بعد میری یہ اصل حیثیت بدل جائے گی۔ میں نے اس کا بھی انتظام کر لیا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"سمعیہ وزیر علی اپنے اسسٹنٹ کے طور پر مجھے وہاں سے روانہ کرے گی۔ اصل میں مصر میں اس کے بہت ہی قریبی عزیز موجود ہیں۔ وہ انہیں میرے بارے میں بتائے گی، لیکن اس انداز میں کہ میں اپنی اصل حیثیت سے وہاں نہیں جاؤں گی بلکہ وہ مجھے نیا نام دے کر وہاں میرے کاغذات بنوا دے گی۔"

"ترکیب بہت اچھی ہے لیکن......"

"ڈیڈی! آپ بھروسہ تو کریں۔ میں یقیناً آپ کے معیار پر پوری اتروں گی۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔"

"مجھے سوچنے کا موقع دو۔" کرنل رحیم شاہ نے کہا۔

"ضرور۔ میں آپ کو وقت بھی بتا چکی ہوں اپنی روانگی کا اور اپنے منصوبے کو بھی بتا چکی ہوں۔ آپ ضرور سوچیے، لیکن اس وقت کے درمیان، لیکن مجھے یقین ہے کہ مادرِ وطن کا ایک بہادر سپاہی اپنی محبت کو فرض پر ترجیح نہیں دے گا۔" رائنا نے کہا اور کرنل رحیم شاہ نے آنکھیں بند کر لیں۔

♥......♥......♥

معشوق نشیلے نے دکانِ حکمت کا تو بیڑا ہی غرق کر دیا تھا۔ صوفی نے وہاں جا کر جائزہ لینے کے بعد دکان حکمت بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اس جگہ کو اپنا ایک اسٹیشن بنانے کی کوشش

جگہ کار آمد نہیں ثابت ہو سکتی تھی۔ بہر حال باقی سارے معاملات بہ خیر و خوبی چل رہے تھے۔ گرین فورس کا ہر ممبر اپنے طور پر کمانے اور کھانے کے لیے تیار تھا، لیکن صوفی نے ایک بار کہہ دیا تھا کہ جب نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی تو وہ ان لوگوں کو اجازت دے دے گا کہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں چلائیں۔

چناں چہ سب خاموش تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ہی صوفی نے انہیں نئے فنڈ فراہم کر دیے تھے۔ ویسے بھی سہیل عالم نے وہ ساری رقم بھی گرین فورس کے فنڈ میں جمع کرا دی تھی جو در حقیقت کسی اور مقصد کے لیے تھی اور رنگ کارسن کی موت کے بعد پورا نہیں ہو سکا تھا۔

بہر حال صوفی کے اندر جو تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں ان میں کچھ اور زیادہ ہی اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ شیروانی، ڈھیلے پائنچے کا پاجامہ، پان قوام چھالیا، تمبا کو تو صوفی کو زندگی کا حصہ تھا لیکن اس میں بے پناہ کمی واقع ہو گئی تھی اور صوفی اب ڈھنگ کے لباس میں بھی نظر آنے لگا تھا پھر اس دن حسینہ نے جو کچھ دیکھا اسے دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔ اس وقت اور کوئی تو تھا نہیں لیکن معشوق نشیلے باہر باغ میں مٹر گشت کر رہے تھے۔ بھلا وہ یہاں سے کہاں جاتے، ہر آسائش ان کے لیے موجود تھی۔ حسینہ سے بڑے زور و شور سے عشق کا آغاز کیا تھا۔ لیکن اس کالے تل میں کسی بھی طرح کا تیل نہیں تھا چناں چہ آج کل ان کا عشق مدھم پڑ گیا تھا باقی تمام لوازمات جاری تھے۔ حسینہ کو صبر نہ ہو سکا تو وہ انہی کے پاس پہنچی۔

''مر رہے ہو؟''

''چھوڑ دیا ہے۔'' معشوق نشیلے نے جواب دیا۔

''کیا چھوڑ دیا ہے؟''

''تم پر مرنا۔''

''بیڑا غرق ہو تمہارا۔'' حسینہ جل بلا کر بولی۔

''نہیں نہیں، اگر تمہیں یہ بات ناگوار گزری ہے تو پھر سے مرنا شروع کر دوں؟''

''جوتی نکالوں گی پاؤں سے اور دس لگاؤں گی سر پر۔''

''اتنا آسان نہیں ہے۔ کیا تم اسی لیے یہاں آئی تھیں؟''

''آئی تو کسی اور مقصد کے لیے تھی۔''

''کیا مقصد...... وہ بتاؤ؟''

''پیچھے جا کر دیکھا ہے ذرا۔''

''...ں خیریت؟ کیا گائے گوبر کر گئی ہے؟''

''... ذرا چلو تو سہی، مگر اندر آ جاؤ۔ جھانک کر دیکھنا ہماری آہٹ سن لی تو پتا نہیں کیا ہو؟''

''...؟''

''...گیا۔''

...ق نشیلے اچھل پڑا۔

...غی توازن ختم ہو گیا بے چارے کا۔ آؤ ذرا میرے ساتھ۔ معشوق نشیلے نے...

...یا اور تیزی سے حسینہ کے ساتھ دوڑتا ہوا گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہو گیا۔ پچھلا دروازہ پچھلے لان پر کھلتا تھا۔ یہاں پر ایسے روزن بھی بنے ہوئے تھے جن سے باہر جھانکا جا سکتا تھا اور انہی روزنوں میں سے معشوق نشیلے نے بھی ادھر دیکھا۔ صوفی کے جسم پر صرف ایک سرخ جانگیا تھا اور وہ ایک عجیب و غریب قسم کی ورزش کر رہا تھا۔ کبھی وہ دونوں گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل جھک جاتا اور اس وقت وہ بن مانس کی سوکھی ہوئی نسل کا کوئی فرد معلوم ہوتا تھا۔ کبھی دونوں پاؤں کھول کر فضا میں چھلانگ لگاتا۔ یہ ایک عجیب و غریب قسم کی ورزش تھی لیکن معشوق نشیلے کو کچھ یاد آ گیا تھا۔ وہ بڑی حیرت اور دلچسپی سے صوفی کو دیکھ رہا تھا۔ حسینہ کہنے لگی۔

''مجھے پہلے ہی خطرہ تھا۔ اے اللہ مجھے پہلے ہی خطرہ تھا اب میں کیا کروں گی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کرنل صاحب بھی ملک سے باہر چلے گئے۔ میری دیکھ بھال اب کون کرے گا۔''

''کیا تو بیوہ ہو گئی؟'' معشوق نشیلے نے جل کر کہا۔

''خدا نہ کرے، خدا نہ کرے تو خود نہ رنڈوا ہو جائے۔''

''نہیں، میں تمہاری موت نہیں چاہتا حسینہ بیگم!''

''ارے میں اس صوفی کے بارے میں کہہ رہی ہوں۔ کم بخت آدھے دماغ کا مالک تو پہلے ہی تھا اب پورا دماغ چل گیا۔''

''دماغ تیرا چل گیا ہے حسینہ!''

''میرا چل گیا ہے دماغ......؟ ارے تو ادھر نہیں دیکھ رہا......؟''

''تو نہیں جانتی وہ اس وقت دنیا کی بہترین مشقیں کر رہے ہیں۔''

''ہاں۔ تو بھی دنیا کی بہترین مشقیں کر چکا ہوگا، موئے جل کوے!''

''کم بخت تو کسی کیاری میں اگی ہوگی۔ ہری مرچ کے پودے میں، زبان کو تو لگام ہے ہی نہیں۔ بے وقوف عورت! یہ میری کیوری ہے۔''

''اچھا۔ اب تو اس کے بارے میں بھی دعوے کرے گا فارسہ میں۔''

''فارسہ تجھے خوب یاد رہا۔ میں سچ بتا رہا ہوں۔ ایک فلم دیکھی تھی میں نے، ایگل شیڈو، اس میں جیکی چن یہی مشق کرتا ہے۔''

''بکے جا رہا ہے، بکے جا رہا ہے، کیا ایگل شیڈو اور کیا جیکی چن!''

''سچ بتا رہا ہوں یہ مارشل آرٹ کی مشق ہو رہی ہے۔'' اور صوفی کے بارے میں تیرے فرشتوں کو بھی یہ بات معلوم نہیں ہوگی کہ وہ درجنوں ایسے فنون کا ماہر ہے، کوئی کیا جان سکتا ہے اس کے بارے میں۔ یہ ایک طرح کی ورزش ہے۔ کبھی یہ دیکھا ہے کہ باز جب اپنے شکار پر جھپٹتا ہے تو کس طرح وہ اپنے سے زیادہ وزنی شکار کو پنجوں میں دبوچ کر فضا میں پرواز کر جاتا ہے اور شکار اس طرح بے بس ہوتا ہے کہ اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا اور یہ دیکھ یہ بلی کی مشق ہے۔ یہ بلی جب بلندیوں سے گرتی ہے تو ہمیشہ پنجوں کے بل گرتی ہے۔ ذرا دیکھ وہ درخت کے تنے پر کس طرح بغیر ہاتھ ٹکائے چڑھ گئے۔ دیکھ، دیکھ......'' حسینہ نے آنکھیں اور منہ پھاڑ کر دیکھا۔ صوفی دوڑتا ہوا درخت کے تنے پر پاؤں جما کر درخت کے اوپر پہنچ گیا اور کسی شاخ یار

سے وغیرہ کا اس نے سہارا نہیں لیا تھا۔

"دیکھا تو نے بلی بھی اسی طرح درخت پر چڑھ جاتی ہے اور اوپر سے جب گرتی ہے تو پنجوں کے بل ہی گرتی ہے۔ معشوق نشیلے حسینہ کو سمجھاتا رہا اور اب بات حسینہ کو کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی پھر بولی۔

"ارے بھئی میرا تو دماغ ہی خراب ہو جائے گا۔ پتا نہیں یہ انسانوں کی کون سی نسل سے ہے؟"

"اب ذرا ناشتا تو کھلا دو، بہت دن ہو گئے۔" معشوق نشیلے نے نشیلی آنکھوں سے حسینہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ پتا نہیں حسینہ کے دل میں کیا خوفِ خدا آیا کہ اس نے کہا۔

"کیا کھائے گا؟ انڈا پراٹھا یا کچھ اور......"

"برسوں ہو گئے حسینہ......"

"میں بناتی ہوں۔" حسینہ نے کہا اور واپسی کے لیے پلٹ پڑی۔ معشوق نشیلے اسی روزن سے صوفی کی مشقیں دیکھنے لگا تھا۔ صوفی اس وقت چھلاوا بنا ہوا تھا۔ معشوق نشیلے طویل عرصے سے اس سے واقفیت رکھتا تھا۔ ممن خان کے ہوٹل والی گلی میں صوفی کی زندگی کا بہت بڑا حصہ گزرا تھا اور وہ وہاں اس کی پسندیدہ شخصیتوں میں سے رہا تھا۔ محکمۂ پولیس میں اچھا خاصا عہدے دار رہا تھا لیکن طبیعت اور مزاج کے لحاظ سے ہمیشہ مرنجان مرنج ہی رہا تھا اور کبھی اس کے اندر غرور کا شائبہ تک نظر نہیں آیا تھا بہرحال وہ مشقوں سے فارغ ہو گیا۔ اسی دروازے سے اسے اندر آنا تھا۔

چناں چہ معشوق نشیلے اس کا انتظار کرنے لگا پھر صوفی اسی دروازے سے اندر آیا تو اس نے گہری نگاہوں سے معشوق نشیلے کو دیکھا۔

"کمال کر دیا صوفی صاحب! یہ ورزش مجھے بھی بہت اچھی لگتی ہے مگر آپ جیسا بدن میں کہاں سے لا سکتا ہوں۔ صوفی نے ایک گہری نگاہ معشوق نشیلے پر ڈالی اور معشوق نشیلے کو محسوس ہوا کہ یہ وہ آنکھیں ہی نہیں ہیں جس میں عجز وانکسار ہوتا ہے۔ یہ آنکھیں کسی درندے کی آنکھیں تھیں۔ صوفی خاموشی سے اندر چلا گیا اور معشوق نشیلے وہیں کھڑا سر کھجاتا رہا۔

ایک بار پھر صوفی کے اندر کچھ تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں، جن کے بارے میں شازیہ، دلاور اور غلام قادر وغیرہ کے درمیان خاصی گفتگو ہوئی تھی۔

"تم لوگوں کو میں کیا بتاؤں، چھوٹے بابا کے اندر کئی انسان رہتے ہیں۔ میں بہت زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی ان کے بارے میں لیکن اتنا کہتی ہوں کہ بعض اوقات تم لوگ یقین کرو مجھے اس طرح لگتا ہے جیسے چھوٹے بابا اس دنیا کے انسان ہی نہیں ہیں۔"

"اڑے ماں قسم! وہ اپن ایک فلم دیکھا نام میرے کو یاد نہیں آ رہا۔ ہاں یاد آ گیا شانی...... شالی وڑی۔ یار اور آسمان سے ایک ماڑوا اترا اور ادھر......" غلام قادر اپنے طور پر تفصیلات بتانے لگا۔

دلاور نے کہا۔ "ظاہر ہے صوفی صاحب جو کچھ کر رہے ہیں وہ معمولی عمل نہیں ہے۔"

"پہلے دن کے اندر یہ تبدیلی اس وقت رونما ہوئی تھی۔ جب اس صحافی لڑکی کو قتل کر دیا گیا تھا۔ حقیقت چھوٹے بابا کے اندر خاصے دنوں وحشت رہی تھی اور اب پھر ان کے اندر وہی وحشت جاگ رہی ہے۔

ہے کہ بڑے بابا کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔"

"ابھی ان کا کوئی خیر خبر ملا یا نہیں؟"

"نہیں، پابندی ہے۔" صوفی صاحب نے بھی سب کو ہدایت کی ہے کہ ہم لوگ کسی بھی طرح ل صاحب سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ یہ ان کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔"

"بہرحال بڑے بابا کے ساتھ واقعی بڑی ناانصافی ہوئی ہے اور شاید اسی وجہ سے صوفی صاحب کے اندر یہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ احساس ان پر وحشت طاری کیے ہوئے ہے اور یہ سچ بھی تھا۔ بے شک رائے راحیل کے کیس میں صوفی نے اپنے طور پر اپنے مخصوص انداز میں کام کیا تھا مگر وہ بات بالکل مختلف طور تھی۔ دکانِ حکمت کا وجود بھی اس کی تحمل مزاجی کی ایک کڑی تھی لیکن اس کے درپردہ جو عوامل جنم لے رہے تھے وہ کچھ مختلف ہی محسوس ہو رہے تھے جس کا مظاہرہ مارشل آرٹ کے جدید ترین اصولوں کی مشق ہو سکتی تھی۔ جمشید مرزا کو بھی کچھ ایسا ہی احساس ہوا تھا اس وقت جب اسے صوفی کی واپسی کی اطلاع مل گئی تھی اور وہ صوفی سے ملنے جا پہنچا تھا اس نے اپنے طور پر معلومات بھی حاصل کی تھیں۔ جمشید مرزا کی صوفی سے ملاقات ہوئی تو اس نے کڑی نگاہوں سے صوفی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس بات کا تو مجھے یقین تھا صوفی صاحب کہ آپ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیں گے، لیکن مجھے یہ بتائیے کہ کیا وصول کیا آپ نے رائے راحیل سے۔"

"محکمۂ پولیس میں مرزا صاحب آپ جیسے لوگوں کی موجودگی بڑے کرب کا باعث ہے آپ یہ بتائیے آپ وہاں سے بھاگ کیوں آئے؟"

"کک...... کک...... کون بھاگ آیا؟" اصل میں مجھے اطلاع ملی تھی کہ یہاں کچھ ایسے ضروری کام ہیں میرے لیے۔"

"جائیے نوکری کیجیے فضول باتوں میں نہیں پڑا کرتے۔ ایسے کام آپ کے بس کے نہیں ہوتے اگر کبھی کوئی مشکل آئے تو مجھ سے پوچھ لیجیے گا درویشوں کی دعاؤں سے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر آپ کی مدد کروں گا تاکہ آپ کی نوکری قائم رہے اس سے آگے آپ سے بالکل کوئی فضول بات نہیں کریں گے۔"

"یہ آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں۔" جمشید مرزا آنکھیں نکال کر بولا۔ "آپ جانتے ہیں کہ...... کہ آپ مجھے یہ بتائیے کہ جو معاوضہ آپ نے رائے راحیل سے وصول کیا ہے وہ کہاں ہے۔ جمشید مرزا نے خونخوار نگاہوں سے صوفی کو گھورنے کی کوشش کی لیکن اس وقت اس نے صوفی کی آنکھوں میں جو کچھ دیکھا اسے دیکھ کر وہ ایک دم کپکپا سا گیا۔ صوفی نے سرد لہجے میں کہا۔

"جائیے نوکری کیجیے۔" اور جمشید مرزا اس طرح نکل گیا جیسے صوفی نے اسے ہپناٹائز کر دیا ہو۔ صوفی کے اندر ان تبدیلیوں کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا جا رہا تھا اور یقینی طور سے اس کا سبب بھی خاص ہی تھا۔

♥......♥......♥

وسیع و عریض ہال میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ ایک بڑی سی میز کے گرد چودہ نقاب پوش بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے جسموں پر اعلیٰ درجے کے سوٹ تھے۔ ہاتھوں پر دستانے چڑھے ہوئے تھے۔ اور

چہروں پر نقابیں۔ گویا انہوں نے خود کو چھپانے کے لیے نقابوں اور دستانوں کا سہارا لیا تھا۔ ایک طرف پانچ افراد سر جھکائے ہوئے بیٹھے تھے ان کے چہروں پر نقاب نہیں تھے۔ وہ خاصے دہشت زدہ نظر آ رہے تھے۔ پھر مزید تین افراد اندر داخل ہوئے۔ یہ بھی بے نقاب تھے اور ان کے آنے کے بعد وسیع وعریض ہال کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

چودہ نقاب پوشوں میں آپس میں سرگوشیاں ہونے لگیں اور پھر متفقہ طور پر اس میٹنگ کی کارروائی کی صدارت ایک شخص کے سپرد کر دی گئی یا پھر وہ ان سب کا ترجمان ٹھہرایا گیا۔ یہ ایک دراز قامت اور کثرتی بدن کا نقاب پوش تھا۔ تبھی ایک غراتی ہوئی سی آواز فضا میں ابھری۔

''سب لوگ موجود ہیں؟''

''جی مسٹر نیورن!'' نیورن کی عدالت میں کورم پورا ہو چکا ہے۔''

''کام شروع کرو۔'' اور وہ شخص جسے صدر یا کنڈیکٹر بنایا گیا تھا ہاتھ اٹھا کر بولا۔

''نمبر 3'' منہ لٹکا کر بیٹھے ہوئے پانچوں افراد میں سے ایک اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور وہاں سے ہٹ کر میز سے تھوڑے فاصلے پر ایک دیوار کے ساتھ جا ٹکا۔

''ہاں۔''

''ڈسک نمبر 620 غلط طریقے سے ایک ایسی جگہ چلی گئی جہاں اسے نہیں جانا چاہیے تھا جس شخص کے ہاتھ وہ ڈسک لگی اس کا نام سلیم شاہ تھا اور یہ اسی ملک سے متعلق تھا جس کے سلسلے میں یہ پروگرام ترتیب دیے گئے تھے اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ اس کا تعلق بھی کمپیوٹر ٹیکنالوجی سے تھا۔ اسے علم ہو گیا اور وہ اس کے سلسلے میں خفیہ طور پر کارروائی کرنے لگا جس کا فوراً ہی ہمیں اندازہ ہو گیا۔

چنانچہ میں نے اپنے دو ساتھیوں کو ہمراہ لیا اور اس کے بعد سلیم شاہ کو ٹریس کر لیا لیکن وہ ہمارے ہاتھ سے نکل بھاگا اور اس کے بعد ہم اسے نہیں پا سکے، جب ہم اپنی کوششوں میں ناکام رہے تو ہم نے دیانت داری کے ساتھ یو ڈیپارٹمنٹ کو اس کے بارے میں اطلاع دے دی۔''

''ڈسک اتفاقیہ طور پر اس شخص تک پہنچی یا پھر سازشی طور پر اس کے لیے کارروائی کی گئی۔ مقصد صرف دولت اور دولت۔''

''نہیں جناب! ایسی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔''

''وہ دونوں افراد کون تھے جنہیں ساتھ لے کر تم نے سلیم شاہ کو تلاش کیا۔'' بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے دو افراد اٹھ کھڑے ہوئے اور اسی جگہ آ کھڑے ہوئے جہاں پہلا آدمی کھڑا ہوا تھا۔''

''ہوں، چودہ اور اکیس!...... کیا کہا گیا تھا تم لوگوں سے؟''

''سر! ہمیں سلیم شاہ کو تلاش کرنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ ہم نے اسے تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن وہ بہت چالاک آدمی تھا۔''

''اور تم بے وقوف!...... ایسا ہی ہے نا؟'' وہ بھاری بھرکم آواز سنائی دی جسے نیورن کی آواز کہا مخاطب کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کلک کلک کی بہت سی ہلکی دو آوازیں سنائی دیں اور ان تینوں افراد کی

پیشانی کے عین درمیان تین سوراخ ہو گئے۔ جگہ بالکل ایک ہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی آٹومیٹک رائفل سے کام کیا گیا ہو اور نشانے سیٹ ہوں۔ تینوں ایک لمحے تک فضا میں گھورتے رہے اور پھر منہ کے بل نیچے ...ہے۔ یہ سزا انہیں نیورن نے دی تھی، پھر اس کے بعد اسی دراز قامت شخص کی آواز ابھری۔

''ہاں...... یو ڈیپارٹمنٹ!'' اور وہ دونوں افراد بھی اٹھ کھڑے ہوئے جو ان پانچوں لوگوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''ہاں۔ تم لوگوں نے کیا کیا؟''

''ہم نے سلیم شاہ کو ٹریس کر لیا۔ وہ کیپ سٹی کی طرف نکل گیا تھا جہاں ٹرالروں کی دنیا آباد ہے اور ہم وہاں اپنے گروپ کے ساتھ اس کا تعاقب کرنے لگے۔ وہ واقعی چالاک شخص تھا۔ اس نے ٹرالروں میں چھپ کر کافی وقت گزارا اور اس کے بعد غائب ہو گیا۔ ہم اسے تلاش کرنے میں ناکام رہے، حالانکہ ہم نے اسے زخمی کر دیا تھا۔''

''بات صرف اتنی سی ہے کہ ایک بہت ہی قیمتی راز ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے اور اس راز سے پردہ نہیں اٹھنا چاہیے، کیوں کہ اس کی وسعتیں بے پناہ ہیں اور ہمیں آگے بہت سے کام انجام دینے ہیں اور ان کے لیے جو ناکام رہا ہے اسے اپنی زندگی میں بھی ناکام ہو جانا چاہیے۔ نیورن کی خفیہ آواز ابھری اور اس کے ساتھ ہی کلک کی دو آوازیں ابھریں۔ نشانہ پیشانیاں ہی بنائی جاتی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد ان دو افراد کی لاشیں بھی ان لاشوں میں شامل ہو گئیں۔

''ایکس!'' بھاری آواز نے پھر کسی کو پکارا اور ان میں سے ایک شخص آگے آ گیا جو بعد میں داخل ہوئے تھے اور جن کے چہروں پر نقابیں نہیں تھیں۔ اس نے گردن خم کی اور پھر بولا۔

''مسٹر نیورن! سلیم شاہ ٹرالروں کی دنیا میں بھٹکتا رہا اور اس کے بعد وہ ایک ٹرالر کے پاس پہنچا اور اس میں کچھ دیر موجود رہا اس وقت شدید بارش ہو رہی تھی اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ نکل کر کس طرف گیا اس کا اندازہ یہی ہوتا ہے کہ کرنل رحیم شاہ تک وہ مائیکرو ڈسک پہنچ گئی۔ میری رپورٹ یہیں تک ہے۔''

''ایل!'' آواز دوبارہ ابھری اور دوسرا آدمی سامنے آ کھڑا ہوا۔''

''کرنل رحیم شاہ کا تعلق اسی ملک سے ہے جہاں کے متعلق مائیکروسوفٹ میں ہدایات دی گئی تھیں، اس کے علاوہ کرنل رحیم اپنی فوجی زندگی کے دوران بڑا ہی خطرناک شخص رہا ہے۔ اس نے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیے اور اس کے بعد ایک ٹانگ ضائع ہونے کی وجہ سے اسے فوجی زندگی سے دور کر دیا گیا۔ اس کے بعد سے وہ اپنے آبائی وطن میں زندگی گزار رہا تھا۔

کچھ پراسرار سرگرمیوں کے نتیجے میں ملک بدر کر دیا گیا اور وہ اپنے اہل خاندان کے ساتھ یہاں مقیم ہو گیا۔ یہاں اس کی سرگرمیوں کی کوئی رپورٹ نہیں ہے، جن افراد کے ساتھ وہ یہاں تک آیا تھا ان کی تعداد اٹھارہ ہے۔ یہ سب اس کے رشتے ناتے دار ہیں۔ میری رپورٹ یہاں تک ہے۔''

''اوہ۔'' آواز ابھری اور تیسرا آدمی بھی سامنے آ گیا۔ اس نے کہا۔

''کرنل رحیم شاہ! ابھی تک پرسکون زندگی گزار رہا ہے۔ اس کا اپنے اہل وطن سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ مائیکروسوفٹ گم ہونے والی رات کے بعد سے بھی اس کی سرگرمیوں کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکا، لیکن اس کی ایک بیٹی غائب ہے۔ اٹھارہ افراد میں سے ایک فرد کم ہوچکا ہے۔ اس بیٹی کا نام رائنا ہے اور رائنا یہاں ایک دولت مند شخص کی بیٹی سمعیہ وزیر علی کے ساتھ مصر گئی ہے۔ وہ سمعیہ وزیر علی جو مختلف ریسرچ کے بعد کتابیں شائع کراتی ہے۔ مصر کی تاریخ پر کوئی کتاب لکھنے وہاں گئی ہے، لیکن ہم اس بات پر بھرپور زور دے سکتے ہیں کہ اچانک ہی کرنل رحیم شاہ کی بیٹی اس کے ساتھ منسلک ہوگئی؟ یہ چیز قابل غور تصور کی جاسکتی ہے۔''

''ٹھیک، لیکن اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوسکا جس کا نام سلیم شاہ ہے۔''

''جی مسٹر نیورن اس کا ابھی تک کچھ پتا نہیں چل سکا۔''

''ساری رپورٹیں سامنے آنے کے بعد صرف ایک ہی بات قابل غور رہ جاتی ہے۔ وہ یہ کہ سلیم شاہ کو حاصل ہونے والی تفصیلات غیر محفوظ ہاتھوں تک پہنچ چکی ہیں اور کسی بھی وقت وہ وہاں تک جاسکتی ہیں۔ یہ امر شدید تشویش کا باعث ہے۔ ہمیں دو پورشن تشکیل دینے ہیں۔ میں ہمیشہ وقت ضائع کیے بغیر فیصلے صادر کر دیتا ہوں، ہمیں روز میلسی کو ایک ملک روانہ کر دینا چاہیے اور اس کے ساتھ ایک گروپ فوراً مصر روانہ کر دینا چاہیے۔ رائنا اس معاملے میں ملوث ہو یا نہ ہو، لیکن اسے ٹریس کرنا بہت ضروری ہے۔ میری اس ہدایت پر پوری طرح عمل کیا جائے۔''

''یس سر!'' چودہ کے چودہ افراد کی آواز بیک وقت ابھری اور اس کے بعد دیوار میں روشن ایک سرخ بلب اچانک بجھ گیا جس کا مطلب تھا کہ نیورن کی عدالت ختم ہوچکی ہے۔

♥......♥......♥

ٹارزن ایک شان دار جنرل اسٹور میں شاپنگ کر رہا تھا۔ یہاں آنے کے بعد ابھی تک اسے کسی نمایاں کارکردگی کا موقع نہیں ملا تھا۔ سہیل عالم اور وہ برسوں سے گہرے دوست تھے۔ اور صحیح معنوں میں ٹارزن سہیل عالم کی مجرمانہ زندگی کا ساتھی تھا لیکن پھر دونوں کے درمیان کچھ اس طرح کی مفاہمت ہوگئی تھی کہ وہ گہرے دوست اور گہرے ساتھی بن گئے تھے۔ سہیل عالم کے بارے میں تمام تر تفصیلات ٹارزن کو معلوم تھیں۔

یہاں آ کر سہیل عالم کی اپنے باپ کے ساتھ جو ٹسل چلی تھی اس سے بھی ٹارزن بہ خوبی واقف تھا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ سہیل عالم کے بہن بھائی اور باپ اسے ہر طرح کی سہولت دینے کے لیے آمادہ تھا لیکن وہ اس کی فطرت کو بھی جانتا تھا اور وہی ہوا تھا جس کی اسے امید تھی۔ سہیل عالم نے اپنے باپ کی کوئی بات قبول نہیں کی تھی۔ ویسے بھی ٹارزن جانتا تھا کہ سہیل عالم کے لیے ضرورت کی کسی بھی چیز کا حصول ذرہ برابر مشکل کام نہیں ہے۔ وہ اتنی ہی اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک تھا، بہرحال ٹارزن کو اس سے غرض نہیں تھی کہ سہیل عالم کیا کر رہا ہے؟ وہ بس اس کی قربت سے خوش تھا۔

اس کے اپنے بھی معمولات کچھ نہیں تھے۔ خاموشی سے زندگی گزارنے کا عادی تھا۔ اپنے چھوٹے سے قد و قامت کے باوجود وہ کسی قسم کے احساس کم تری کا شکار نہیں تھا جہاں بھی جاتا پورے اعتماد کے ساتھ جاتا اور اس وقت بھی وہ اس جنرل اسٹور میں شاپنگ کر رہا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ دیکھنے والوں کی نگاہوں کی دبی دبی مسکراہٹوں کا مفہوم کیا ہے؟

پھر اس نے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک چہرہ دیکھا اور ایک دم ٹھٹک گیا۔ سامنے والی شخصیت نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے پر نگاہیں ڈالی اور دونوں کے چہرے شناسائی کا مظہر بن گئے۔ سامنے نظر آنے والی عورت دراز قامت تھی اور اس کے چہرے پر حیرت کے نقوش تھے۔ پھر وہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ آئی اور اس نے حیران لہجے میں کہا۔

''ٹارزن......!''

''حالانکہ ہم ایک دوسرے کو بہت دیر کے بعد دیکھ رہے ہیں۔ میڈم روز میلسی آپ کو میڈم کہنا بالکل ٹھیک ہے نا؟''

''اوہ میرے خدا! مگر تم یہاں کہاں؟''

''یہ سوال تو میں بھی آپ سے کرسکتا ہوں میڈم!''

''اور کون ہے تمہارے ساتھ؟''

''نہیں کوئی نہیں۔ اکیلا ہوں۔''

''آؤ کسی اجنبی جگہ اگر پرانے دوست مل جاتے ہیں تو اس سے زیادہ خوشی کی اور کوئی بات نہیں ہوسکتی۔''

''ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ آپ کو دیکھ کر مجھے بھی خوشی ہوئی ہے میڈم روز میلسی!''

''کیا تم نے اپنی شاپنگ مکمل کر لی؟''

''ابھی میں نے کچھ خریدا ہی نہیں ہے۔''

''آؤ پھر کہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

''چلیے۔''

''میری رہائش گاہ کیسی رہے گی؟''

''گڈ! کیا آپ نے یہاں مستقل قیام کیا ہوا ہے؟'' ٹارزن نے پوچھا۔

''آؤ آ جاؤ۔'' روز میلسی واپسی کے لیے مڑ گئی۔ ٹارزن کے اس کے ساتھ چل رہا تھا اور لوگوں کی نگاہوں میں دلچسپی اور مسکراہٹیں تھیں۔ ایک دراز قامت عورت اور ایک انتہائی پستہ قامت شخص کی جوڑی دلچسپی کی نگاہوں سے دیکھی جا رہی تھی۔ باہر ایک قیمتی کار کھڑی ہوئی تھی۔ روز میلسی نے کار کے قریب پہنچ کر ڈرائیور کی طرف دیکھا جو مستعد کھڑا تھا اور مقامی ہی آدمی تھا۔ ڈرائیور نے جلدی سے پچھلا دروازہ کھول دیا۔

''بیٹھو۔'' روز نے کہا اور خود گھوم کر دوسری طرف آ گئی۔ کچھ دیر کے بعد کار وہاں سے چل پڑی۔

''کتنے عرصے کے بعد ہمارا تمہارا سامنا ہوا ہے؟''

''تقریباً سات سال کے بعد۔''

''مگر تم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے ٹارزن!'' جواب میں ٹارزن ہنس پڑا۔

''تبدیلی کی گنجائش ہی کہاں ہے؟ جو تبدیلی قدرت نے مجھ میں میری پیدائش کے بعد سے ہی پیدا کر دی ہے وہ میرے خیال میں بہت کافی ہے۔''

''بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو خود اپنا مذاق اڑاتے ہیں۔تم انہی میں سے ایک ہو۔''

''ہاں۔ میں دوسروں کے لیے کوئی کام باقی نہیں چھوڑتا ہوں۔'' ٹارزن نے کہا۔ کار ایک خوب صورت عمارت میں داخل ہوگئی تھی جو ایک پوش علاقے میں تھی۔ گیٹ پر چوکیدار موجود تھا اور اس نے بڑے ادب سے دروازہ کھولا۔ کار پورچ میں جا رکی۔

''آؤ۔'' روز میلسی نے کہا۔ ٹارزن اس دوران بہت سی کیفیتوں سے گزرتا رہا تھا۔ روز میلسی اسے لیے ہوئے ایک شان دار ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی اور ٹارزن نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے سیٹی بجائی پھر بولا۔

''یوں لگتا ہے میڈم! جیسے آپ عرصے سے یہاں مقیم ہیں۔''

''نہیں، مجھے یہاں آئے ہوئے چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں گزرے لیکن یہاں میرے آدمی موجود تھے جنہوں نے مجھے یہاں ٹھہرانے کا معقول بندوبست کرلیا ہے۔''

''چلیے بڑی خوشی ہوئی۔ ابھی آپ یہاں خاصے عرصے قیام کریں گی؟''

''نہیں، بہت زیادہ وقت نہیں۔ اب تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔''

''بس کسی کام کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا۔ میرے کام مکمل ہونے میں ابھی زیادہ وقت لگے گا۔''

''کہاں مقیم ہو؟'' روز میلسی نے ایک ہاتھ نیچے گرا کر پاؤں کھجاتے ہوئے کہا۔

''ایک ہوٹل ہے۔ اسٹار ونگ اس کے کمرہ نمبر 8 میں رہتا ہوں۔''

''ہوں۔ کیا قصہ تھا کس کا پیچھا کرتے ہوئے آئے ہو؟''

''یہ سوال تو میں نے آپ سے بھی نہیں کیا میڈم میلسی! بس سمجھ لیجیے، ضرورت پتا نہیں کہاں کہاں لیے لیے پھرتی ہے۔ آپ بتائیے کوئی کام میرے سپرد کرنا چاہتی ہوں۔'' روز میلسی غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ٹارزن نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور کہا۔

''بس آپ کا اس طرح دیکھنا مجھے ہمیشہ محرومیوں کا شکار کر دیتا ہے میڈم!''

''کمینے ہو ہمیشہ کے، نیت خراب۔'' میلسی نے کہا پھر بولی۔

''اچھا یہ بتاؤ کیا پیو گے؟''

''کوئی ضرورت نہیں محسوس ہو رہی ہے۔''

''نہیں کچھ نہ کچھ تو ضرور۔'' اس نے کہا اور پھر دوبارہ اس طرح جھکی جیسے پاؤں کھجا رہی ہو، لیکن درحقیقت جس کرسی پر وہ بیٹھی ہوئی تھی اس کے نچلے حصے میں کچھ بٹن لگے ہوئے تھے اور اس نے انہی میں سے ایک بٹن دبایا تھا۔ ایک لمبے قد و قامت کا شخص اندر داخل ہوگیا۔

''ڈرنک۔'' میلسی بولی اور وہ گردن خم کر کے وہاں سے چلا گیا۔ میلسی نے مسکرا کر ٹارزن کو دیکھا اور بولی۔

''میرے ساتھ کچھ وقت گزارو۔''

''جی میڈم! مجھے بھی آپ سے مل کر واقعی خوشی ہوئی ہے، لیکن جو کام میں کر رہا ہوں وہ بھی اہم کا حامل ہے۔ بس ایک شخص کو ٹریس کرتا ہوں یہاں تک پہنچا ہوں اور اس کے لیے کام کر رہا ہوں۔ خا

بھی رقم ہاتھ لگ جانے کی امید ہے۔''

''میری نیک دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔'' میلسی نے کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ شخص دو گلاس لے کر آ گیا جس میں ایک مشروب نظر آ رہا تھا۔ میلسی نے اپنے ہاتھ سے گلاس ٹارزن کو دیا اور ٹارزن نے شکریے کے ساتھ گلاس ہاتھ میں لے لیا۔

میلسی اپنا گلاس لے کر بیٹھ گئی تھی۔ ٹارزن کی تیز نگاہوں نے ایک ایسی جگہ کا جائزہ لیا جہاں وہ گلاس کا مشروب ضائع کرسکتا تھا۔ وہ گلاس ہاتھ میں لیتے ہی باتیں کرتا رہا۔ دو تین بار اس نے گلاس ہونٹوں سے بھی لگایا تھا۔ میلسی اپنا گلاس ہاتھ میں لیے بیٹھی ہوئی تھی اور پچھلی ملاقاتوں کی باتیں کر رہی تھی۔ ٹارزن ایک باکمال شخصیت تھی۔ میلسی کو یہ اندازہ بھی نہیں ہوا کہ گلاس میں جو مشروب کم ہو رہا ہے وہ ٹارزن کے معدے میں نہیں بلکہ اس گملے میں جا رہا ہے جو کرسی کے قریب ہی موجود ہے۔ اس نے ابھی تک اپنے گلاس سے ایک سپ بھی نہیں لیا تھا۔

ٹارزن نے اپنے گلاس کا آخری حصہ ضائع کیا اور اسے میز پر رکھ کر ہونٹ خشک کرنے لگا۔ اچانک ہی اس نے اس طرح جھٹکے کھائے جیسے اسے کوئی تکلیف پہنچی ہو پھر اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن لڑکھڑانے لگا۔ میلسی مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی پھر اس نے کہا۔

''کیا بات ہے؟'' لیکن جواب میں ٹارزن کے چہرے پر جاں کنی کے سے آثار نظر آئے۔ پھر وہ صوفے پر گر کر بے سدھ ہوگیا۔ میلسی نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس میز پر رکھ دیا اور مدہم لہجے میں بولی۔

''ننھے سے آدمی میں جانتی ہوں تم بڑی کام کی شخصیت ہو لیکن......'' اس نے پھر جھک کر ایک بٹن دبایا اور بولی۔

''ہاں رپورٹ......''

''نہیں میڈم! اس نام کا کوئی ہوٹل یہاں پورے شہر میں نہیں ہے۔''

''پورے اعتماد کے ساتھ یہ بات تم نے معلوم کی ہے۔''

''ہاں میڈم!'' اس نے ایک اور بٹن دبایا اور اس بار دو افراد اندر داخل ہوگئے۔ انہوں نے حیرت سے ٹارزن کو دیکھا تھا پھر وہ بولے۔

''میڈم! یہ...... یہ......''

''ہاں۔ اب یہ ایک لاش ہے۔''

''لاش...... مگر کیوں؟''

''اوہ مائی ڈیئر تم نہیں جانتے یہ ایک خطرناک آدمی ہے۔ اس کے چھوٹے سے قد و قامت پر نہ جاؤ۔ یہ اپنے قد سے بیس گنا بڑا ہے۔ اسی طرح اس کی کارکردگی اور اس کی عقل بھی بے مثال تھی۔ میرے لیے کئی کام کیے ہیں اس نے، لیکن یہ بھی مجھے یہاں نظر آیا اور اس نے فوراً مجھے پہچان لیا۔ ابھی مجھے یہاں بہت کچھ کرنا ہے۔ بڑی ذمے داریوں کے ساتھ مجھے یہاں بھیجا گیا ہے۔ ایسے حالات میں کوئی خطرہ مول لینا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

ہم جرم کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور میں یہ بات جانتی ہوں کہ ہر شخص اپنے مفاد کے لیے جھوٹ بولتا ہے، اگر میں اس سے یہ بات معلوم کرتی کہ یہ یہاں کیا کر رہا ہے اور پرانی شناسائی کی بنیاد پر میں اس کو کسی طرح اپنے ساتھ شامل کر بھی لیتی تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے کیا نقصانات ہوتے؟ یہ کس سے وفادار ہوتا اور کس سے نہ ہوتا، حالانکہ مجھے اس کی موت کا افسوس ہے لیکن مجبوری سخت مجبوری۔ میں ان احمقوں میں شامل نہیں ہونا چاہتی، جو صرف اپنے طور پر اس قسم کے رسک لے لیتے ہیں اور یہی رسک ان کی موت کے سبب بن جاتے ہیں سمجھ رہے ہونا میری بات۔"

"یس میڈم لیکن یہ ہلاک کیسے ہوگیا؟"

"ایریڈن ایک خطرناک زہر ہوتا ہے۔ مشروب کے ان گلاسوں میں میں نے اس کی ہلکی سی مقدار شامل کر دی تھی۔ تم اسے سائنائیڈ کا بدل کہہ سکتے ہو۔ بس یہ ذرا سائنائیڈ سے تھوڑی دیر میں اثر کرتا ہے۔ اچھا ٹھیک ہے اب تم ایسا کرو اس کی لاش ٹھکانے لگا دو۔ اس کے بعد اپنے کام میں مصروف ہو جاؤ۔"

"ٹھیک ہے میڈم!" روز میلسی اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر نکل گئی تھی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر ٹارزن کی جیبوں کی تلاشی لینے لگی۔ تھوڑی کرنسی وغیرہ کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ملی تھی جو کسی بھی طرح ان لوگوں کے لیے باعث دلچسپی ہوتی۔

"میں نے کچھ فاصلے پر نہر دیکھی ہے جو شہر کے بیچ و بیچ سے گزرتی ہوئی نہ جانے کہاں جاتی ہے۔ میرا خیال ہے اس لاش کو اس نہر میں پھینک دیتے ہیں۔ فاصلہ بھی زیادہ نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے چلو اٹھو۔" وہ لوگ ٹارزن کو کندھے پر ڈال کر باہر نکل آئے۔ اس بے چارے کا وزن ہی کتنا تھا۔ باہر آ کر انہوں نے اسے ایک کار کی ڈگی میں ڈالا اور اس کے بعد دونوں کار میں جا بیٹھے۔ بہت دیر سے ٹارزن نے حبس دم کیا ہوا تھا جس کی اسے اچھی خاصی مشق حاصل تھی۔ وہ گہری گہری سانسیں لے کر پھیپھڑوں کی قوت بحال کرنے لگا جو فیصلہ ان لوگوں نے اسے ٹھکانے لگانے کے سلسلے میں کیا تھا، وہ ٹارزن کے لیے مسرور کن تھا، اگر کہیں بلندی سے اسے پھینکنے کا منصوبہ بناتے تو پھر ٹارزن کو کچھ اور کرنا پڑتا۔

لیکن نہر کی سیر ہی سہی، تاکہ ان لوگوں کو کوئی شبہ نہ رہے اور وہ مطمئن ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی کار رکی انہوں نے ٹارزن کو کار کی ڈگی سے نکالا اور اس کے بعد اس کے ہاتھ اور پاؤں پکڑ کر اسے نہر میں اچھال دیا۔ چھپاکے کی آواز ہوئی۔ ٹارزن گرا تو ان کی مرضی کے مطابق تھا لیکن پانی میں جاتے ہی وہ سنبھل گیا اور اس نے نہر کی گہرائی میں غوطہ لگا دیا۔ نہر بہت کم گہری تھی۔ وہ نیچے ہی نیچے بہت دور تک نکلا ہی چلا گیا اور پھر کافی فاصلے پر جا کر اس نے سر اٹھایا۔ کار کا دور دور تک پتا نہیں تھا چنانچہ وہ کنارے کی جانب تیرنے لگا۔

♥......♥......♥

سمعیہ وزیر علی سے اچھی خاصی شناسائی تھی۔ وہ درحقیقت ایک عورت تھی بس چونکہ تعلق اسی جگہ سے تھا جہاں کرنل رحیم شاہ رہتا تھا۔ بس یہی رشتہ درمیان میں تھا۔ جس کی وجہ سے رائنا نے سمعیہ کو اپنے دوستوں میں شامل کر رکھا تھا۔ اس پورے سفر کے دوران سمعیہ ایک بور شخصیت ہی ثابت ہوئی۔ اس میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ صرف اپنی پسند کی باتیں کرتی تھی اور کرتے رہنا چاہتی تھی۔

کسی اور کی بات سننے کی اسے فرصت نہیں ہوتی تھی۔ سامنے والے کو اگر اس کی قربت برداشت کرنا ہوتی تھی تو وہ اس کی باتیں سن لیتا تھا ورنہ کسی بھی طرح اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا تھا، لیکن اس سفر کے دوران اس سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا البتہ رائنا ذرا اونچی اڑان اڑنا چاہتی تھی۔ کرنل رحیم شاہ نے گرین فورس تشکیل دیتے ہوئے جن دو افراد کا انتخاب کیا تھا وہ مرد تھے، یعنی پٹھان اور عادل، جنہوں نے حقیقی معنوں میں گرین فورس میں کوئی نمایاں کارکردگی نہیں دکھائی تھی۔ ان سے بدرجہ بلکہ ہزار درجے بہتر شازیہ رہی تھی اور صوفی نے بھی اہم ترین معاملات میں شازیہ ہی کا انتخاب کیا تھا۔ رائنا کی اس وقت بھی یہ خواہش تھی کہ کرنل رحیم شاہ اسے بھی اپنے ساتھ مصروف کرے، لیکن رحیم شاہ نے اسے بیٹی ہی سمجھا تھا اور اس وقت بھی اگر مجبوری نہ ہوتی تو رحیم شاہ کسی بھی قیمت پر اسے اس مشن کے لیے روانہ نہ کرتا۔

لیکن یہی موقع تھا کہ رائنا اپنے آپ کو منوانا چاہتی تھی۔ بے شک حالات وہ نہیں رہے تھے لیکن اس بات کا اسے بھی یقین تھا کہ بہت جلد کرنل رحیم شاہ اپنے وطن واپس لوٹ جائے گا۔ اس کا اپنا ایک مقام تھا۔ کچھ لوگوں کی سازشوں نے اسے بے شک اس کے اہم منصب سے دور کر دیا تھا، لیکن کرنل رحیم شاہ ہر قسم کے حالات پر قابو پانا جانتا تھا۔

رائنا مصر پہنچ گئی۔ سمعیہ نے ایک شاندار ہوٹل میں قیام کیا۔ لیکن موقعے موقعے سے رائنا اپنے لیے وہ انتظامات کرنے لگی جس کے ذریعے اسے وطن واپس پہنچنا تھا۔

وہ سمعیہ کے ساتھ یہاں تک تو آ گئی تھی لیکن اس سے آگے وہ احتیاط کرنا چاہتی تھی اور یہاں سے آگے نکلنے کے منصوبے بنا رہی تھی۔ ادھر سمعیہ تھی کہ اس کے کان کھائے جا رہی تھی اور اس وقت بھی وہ ویلی آف کنگز کی طرف جا رہی تھی۔ ویلی آف کنگز قاہرہ سے تھوڑے فاصلے پر فرائین کا عظیم الشان قبرستان تھا۔ مصر کی قدامتیں دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ کرناک کے اطراف میں فرعون کے مقبرے پھیلے ہوئے تھے۔

بہر حال یہ فاصلے طے ہو گئے اور وہ معبدوں کے قریب پہنچ کر نیچے اتر گئے۔ تاحد نگاہ مصر کے قدیم پراسرار کھنڈرات بکھرے ہوئے تھے۔ ہر طرف ایک عجیب خاموشی طاری تھی۔ فرعون کی ہیبت صدیوں کے بعد بھی ماحول پر مسلط تھی۔ سیاح ہر طرف گھومتے پھر رہے تھے۔ رائنا بھی سمعیہ کے ساتھ ایک سمت چل پڑی۔ بغیر چھت کے ہال میں لاتعداد ستون نظر آ رہے تھے۔ ان کے درمیان فرعون اور ان کی ملکاؤں کے مجسمے سیاحوں کو گھورتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی غیر پراسرار غیر مرئی قوت ذہن کو گرفت میں لے رہی ہو۔ یہاں بے شمار زیر زمین مقبرے بھی موجود تھے۔ وہ لوگ آگے بڑھتے رہے۔ رائنا پر اس وقت خیالات کا طوفان مسلط تھا۔

چنانچہ وہ یہ نہ دیکھ سکی کہ سمعیہ کون سی سمت مڑی ہے۔ وہ اپنے خیالات میں ڈوبی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ پھر وہ ایک ٹوٹے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہوئی تو ایک سرنگ سی نظر آئی۔ سرنگ نما راستہ مسلسل ڈھلان کی شکل میں اترتا چلا گیا تھا۔ تھوڑی سی دیر کے بعد رائنا ایک وسیع و عریض ہال میں پہنچ گئی تھی جس میں چاروں طرف تابوت ہی تابوت رکھے ہوئے تھے۔ صدیوں پرانے بوسیدہ تابوت، ماحول پر ایک

عجیب سی جھنجھناہٹ سی طاری تھی۔ ان تابوتوں میں سینکڑوں سال قبل کے انسان سو رہے تھے۔ موت کی ابدی نیند یہ سونے والے نہ جانے کیسی کیسی پراسرار کہانیوں کے حامل ہوں گے۔ رائنا کو کچھ تھکن سی محسوس ہونے لگی۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گئی۔ ماحول میں ٹھنڈک تھی۔ بدن پر کپکپی سی طاری ہوتی جا رہی تھی۔

پھر اچانک اسے یوں لگا جیسے پلکوں پر بوجھ پڑ رہا ہو۔ نیند کے جھونکے سے آنے لگے تھے۔ قوت ارادی ساتھ چھوڑنے لگی تھی۔ وہ ایک دم سے آنکھیں بند کرکے گردن جھٹکنے لگی۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے ہمت کرکے اٹھنا چاہا، لیکن جیسے زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ بدن بے جان ہونے لگا اور پھر ہوش و حواس رخصت سے ہوگئے۔ نہ جانے کتنی دیر کے بعد دوبارہ آنکھ کھلی تھی۔ فضا میں بے حد ٹھنڈک تھی لیکن آنکھ کیا کھلی تھی ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ ایسی بے پناہ تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ رائنا کے حلق سے ایک چیخ سی نکل گئی۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ کہاں ہے۔

ٹھنڈا مقبرہ جس میں چاروں طرف تابوت بکھرے ہوئے تھے۔ اوہو...... یہ کیا ہوا؟ کیا ہو گیا تھا مجھے، میں تو وہیں اسی بھیانک مقبرے میں موجود ہوں اور رات ہو چکی ہے۔ کالی اور گہری رات اور وہ صدیوں پرانی روحوں کے ساتھ ہے۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک طرف کا رخ کیا۔ راستے کا تعین نہیں کیا جا سکا تھا۔ چند ہی قدم چلی تھی کہ کسی ٹھوس چیز سے ٹکرائی اور اس بری طرح گری کہ آنکھوں میں تارے ناچ گئے۔ جس چیز سے ٹھوکر لگی تھی وہ بھی تابوت تھا اور جس چیز پر گری تھی وہ بھی تابوت ہی تھا۔

رائنا اس زور سے اس تابوت پر گری تھی کہ اس کا ڈھکن ٹوٹ گیا تھا فضا میں ایک پراسرار ارتعاش ہو گیا تھا اور رائنا کو جیسے اپنے دل کی دھڑکنیں بند ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ کچھ لمحے اسی طرح گزر گئے۔ فضا میں اس کے گرنے سے جو ارتعاش پیدا ہوا تھا وہ ختم ہوتا جا رہا تھا لیکن اب کچھ انسانی قدموں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ رائنا ایک دم سے سہم سی گئی۔

رات کی اس تاریکی میں کون ہو سکتا ہے۔ وہ سوچنے لگی پھر اچانک ہی ٹارچوں کی روشنیاں لہرائیں اور ان روشنیوں نے اسے اپنے دائرے میں لے لیا۔

''وہ ہے؟'' تھوڑی دیر کے بعد کچھ انسانی سائے اس کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ رائنا نے اپنے بدن کی جنبش ختم کرلی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ یہ لوگ کون ہیں اور کسے تلاش کر رہے ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو اس طرح بے سدھ کرلیا جیسے وہ بے ہوش ہو۔ ٹارچوں کی روشنیاں اس کے چہرے پر پڑیں اور پھر ایک آواز ابھری۔

''یہی ہے۔''

''سو فیصدی۔'' یہ کرنل رحیم شاہ کی بیٹی ہے اور اس کا نام رائنا ہے۔''

''بے ہوش ہو گئی ہے شاید۔''

''ہاں۔''

''اٹھاؤ۔'' پھر کچھ ہاتھوں نے رائنا کو اٹھا لیا۔ رائنا بری طرح سناٹے میں ڈوب گئی تھی۔ یہ کیا قصہ ہے، کون لوگ ہیں یہ جو اسے تلاش کر رہے ہیں اور اس کے بارے میں اتنا کچھ جانتے ہیں۔ اب ان

کے علاوہ کچھ نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو مائیکرو فلم کے مالک تھے اور جو اس کے وطن کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ بہرحال رائنا مکمل طور پر خاموشی اختیار کر رہی تھی۔ اس خاموشی میں اس نے صرف ان لوگوں کے قدموں کی آوازیں سنیں۔

وہ اسے لے کر مقبرے سے باہر نکل آئے تھے۔ پھر غالباً اسے کسی بڑی گاڑی میں لٹا دیا گیا اور اس کے بعد گاڑی چل پڑی۔ رائنا ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لے رہی تھی۔ یہ سمعیہ کو ویسے بھی چھوڑنا ہی تھا۔ لیکن یہ بڑے افسوس کی بات تھی کہ اس قدر راز داری کے باوجود کچھ لوگ اس تک آ پہنچے۔ ذرا سی ان کے بارے میں معلومات تو حاصل ہونی چاہئیں کہ یہ قصہ کیا ہے؟ رائنا کا سفر جاری رہا اور تھوڑی دیر کے بعد گاڑی رک گئی۔ وہ لوگ اسے اٹھائے ہوئے اس عمارت میں داخل ہو گئے جس میں یہ گاڑی رکی تھی۔ رائنا کو واقعی کرنل رحیم شاہ نے کبھی اس سلسلے میں استعمال نہیں کیا تھا لیکن ایک مہم جو کی بیٹی اپنے باپ کی مکمل تقلید کر رہی تھی۔ اس کامیابی کے ساتھ وہ اپنے فرائض انجام دے رہی تھی کہ اگر کرنل رحیم شاہ کو یہ بات معلوم ہو جاتی تو وہ اس پر فخر کر سکتا تھا اور اس بات پر افسوس کرتا کہ اس نے رائنا کو گرین فورس میں شامل کیوں نہیں کیا۔

فیضان اور عادل سے تو کہیں بہتر ثابت ہوتی وہ۔ غرض یہ کہ رائنا کو ایک کمرے میں لے جایا گیا اور ایک بستر پر لٹا دیا گیا۔ رائنا جانتی تھی کہ ایک معمولی سی چوٹ لگنے کے بعد انسان کتنی دیر تک بے ہوش رہ سکتا ہے چنانچہ اب اسے ہوش میں آ جانا چاہیے تھا وہ لوگ اس کے آس پاس ہی موجود تھے اس دوران رائنا یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے ایک کراہ کے بعد آنکھیں کھول دیں اور خوف زدہ نگاہوں سے اپنے قرب و جوار میں موجود لوگوں کو دیکھنے لگی۔ وہ چاروں شکل ہی سے خطرناک نظر آ رہے تھے ان کے چہروں سے ان کی قومیت کا اندازہ ہوتا تھا پھر ان میں سے ایک نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''تم ٹھیک ہو بے بی!'' رائنا نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر سہمی ہوئی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

اس وقت اس کے چہرے پر دنیا جہان کی معصومیت نظر آ رہی تھی۔ ایک معمولی سی معصوم سی بچی جو سخت خوف زدہ ہو۔ وہ لوگ اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے اس شخص نے پھر وہی سوال کیا۔

''تم ٹھیک ہو بے بی!''

''ہاں مم......مم......مگر......کہاں ہوں؟''

''محفوظ جگہ ہو۔ اپنے لیے فکرمند نہ ہو۔ تمہیں کسی طرح کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

''لیکن سر......سر......میں کہاں ہوں؟''

''میں نے کہا نا ہم تم سے کچھ پوچھنے کے لیے یہاں تک لائے ہیں۔ ویسے بھی ویلی آف کنگز میں رات بھر پڑے رہنے سے تمہاری حالت اور خراب ہو سکتی تھی ہم تمہیں وہاں سے اٹھا کر یہاں لے آئے ہیں۔ تم سے کچھ سوال کرنا چاہتے ہیں ہم۔'' رائنا سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی۔ اس شخص نے کہا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''رائنا رحیم شاہ۔'' رائنا نے بدستور سہمی ہوئی مدھم آواز میں کہا۔

''کہاں رہتی ہو'' جواب میں رائنا نے اس جگہ کا نام بتا دیا جہاں سے وہ یہاں تک آئی تھی۔''

"یہاں کا سفر تم نے کیوں کیا ہے؟"

"میں اپنی دوست سمعیہ وزیر کے ساتھ یہاں تک آئی ہوں۔ مصر دیکھنے کا شوق مجھے بچپن ہی سے تھا۔ سمعیہ وزیر علی مصر کے بارے میں کوئی کتاب لکھ رہی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں اسے اسسٹ کروں۔ سو میں یہاں چلی آئی۔ ویلی آف کنگز کے مقبرے میں سمعیہ مجھ سے بچھڑ گئی اور میں بے خیالی کے عالم میں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی پھر اس مقبرے کی پراسرایت نے مجھ پر بے ہوشی طاری کر دی اور میں بے ہوش ہو گئی۔ پھر جب مجھے ہوش آیا تو رات ہو چکی تھی اندھیرے میں بھٹکنے لگی۔ خوف سے میری جان نکل رہی تھی کہ میں نے کسی چیز سے ٹھوکر کھائی اور نیچے گر پڑی۔ بس اس کے بعد میری یہاں آنکھ کھلی ہے۔"

رائنا کے لہجے کی معصومیت اور اس کے چہرے کے تاثرات نے ان لوگوں کو بری طرح چکرا دیا تھا۔ رائنا محسوس کر رہی تھی کہ وہ کش مکش کا شکار ہیں پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

"تم آرام کرو بے بی!"

"سر آپ مجھے یہاں سے جانے دیں۔ سمعیہ وزیر علی پریشان ہو رہی ہو گی۔"

"ہاں ہاں۔ ہم تمہیں زیادہ وقت یہاں نہیں رکھیں گے۔ بس ایک کام سے یہاں لائے ہیں۔ کیا تم ہمیں اس بات کا موقع دو گی کہ ہم تمہارے سلسلے میں کچھ کریں۔"

"سر آپ جیسا مناسب سمجھیں لیکن آپ یقین کیجیے مم...... مم...... میں میں ایک بے ضرر لڑکی ہوں۔ مجھ سے کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔"

"تھوڑی دیر آرام کرو۔ تھوڑی دیر آرام کرو۔ او کے!" وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور ایک ایک کر کے کمرے سے باہر نکل گئے۔ رائنا سناٹے کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں بڑی الجھن تھی۔ یہ کون لوگ ہیں۔ کیا اس کی یہاں آمد خفیہ نہیں رہی لیکن اس بات کے عام ہونے کے کیا ذرائع ہو سکتے ہیں۔ خدا خیر کرے۔ بے وقوف نہیں تھے وہ لوگ اور رائنا بھی بے وقوف نہیں تھی جو وہ یہ سمجھ لیتی کہ واپسی میں وہ یہ دروازہ کھلا ہوا چھوڑ گئے ہیں البتہ پھر بھی اس نے تھوڑا سا اندازہ لگانے کی کوشش کی اور اس دروازے کے قریب پہنچ گئی۔ دروازہ بے شک باہر سے بند تھا لیکن دوسری طرف سے کچھ آوازیں آ رہی تھیں۔ اندازہ یہ ہوا کہ یہ دروازہ کسی راہ داری وغیرہ میں نہیں کھلتا ہو گا بلکہ ایک دوسرے کمرے میں کھلتا ہو گا اور اسی کمرے سے آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے کی ہول سے کان لگا دیے۔ یوں کہ ہر طرف سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ اس لیے دوسری طرف سے آنے والی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ لوگ باتیں کر رہے تھے۔

"یہ کیا قصہ ہے؟ مجھے تو یہ لڑکی بالکل ہی ایک بے وقوف سی لڑکی محسوس ہوتی ہے۔"

"بہر حال یہ نیورن کا معاملہ ہے ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔"

"نیورن نے صرف ایک مفروضے کی بنا پر ہم لوگوں کو مشکل میں ڈال دیا ہے اب اگر یہ لڑکی وہ نہ نکلی تو کیا ہم سے بڑا گدھا کوئی دوسرا اس روئے زمین پر ہو گا۔ ہم مشکل میں پڑے ہوئے ہیں۔"

"نیورن سے رابطہ قائم کر کے صورت حال بتائی جائے۔"

"میں کرتا ہوں۔" رائنا بدستور کان لگائے ہوئے یہ سنسنی خیز الفاظ سن رہی تھی۔ وہ لوگ کسی خاص

ذرائع سے رابطہ قائم کر رہے تھے پھر ایک آواز ابھری۔

"ہاں، مسٹر نیورن سے بات کراؤ۔"

"ہاں بی آر فور!" چند لمحات کے لیے خاموشی طاری ہو گئی پھر اس کے بعد آواز ابھری۔

"یس سر!...... یس سر! بی آر فور بول رہا ہے۔"

"ہاں۔ کہو کیا بات ہے؟" دوسری طرف سے آنے والی آواز بھی نمایاں تھیں۔

"سر! یہاں ہم نے اسے ٹریس کر لیا اور اس تک پہنچ گئے۔ پھر ہم نے ویلی آف کنگ سے اسے اٹھایا اور اسے پاس لے آئے۔ سر! میں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

"کہو۔"

"سر! لڑکی اس سلسلے میں بالکل ناواقف معلوم ہوتی ہے۔ سمعیہ وزیر علی نامی عورت کے ساتھ جس کے بارے میں ہم نے وہیں مکمل معلومات حاصل کر لی تھیں۔ صرف مصر دیکھنے کے شوق میں آ گئی ہے۔ مائیکرو فلم وغیرہ سے اسے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔"

"میں تمہیں الو کا پٹھا کہنا چاہتا ہوں۔ بی آر فور! سمجھ رہے ہو تم! گدھے کے بچے میں یہاں مکمل طور پر تصدیق کر چکا ہوں کہ سلیم شاہ نے وہ مائیکرو فلم کرنل رحیم شاہ ہی کو دی تھی اور کرنل رحیم شاہ نے اپنی بیٹی کو وہاں بھیجنے کے لیے منتخب کیا ہے۔ تم نے اس لڑکی سے فلم کے بارے میں پوچھا۔"

"نن...... نن نہیں سر! ابھی تک نہیں۔ وہ زخمی ہو گئی ہے اور اس پوزیشن میں نہیں ہے۔"

"بی آر فور! کیا تم یہ بتانا چاہتے ہو کہ تم پر اعتماد کر کے میں نے غلطی کی ہے اور تم دنیا سے اکتا گئے ہو۔ بی آر فور ایسی احمقانہ بات کر کے اپنی زندگی کے لمحات کو مختصر مت کرو۔ تم جانتے ہو کہ میں غلطی کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔"

"سر! معافی چاہتا ہوں میں۔ ہم اس کی کھال ادھیڑ دیں گے۔ اسے اپنی زبان کھولنا ہی ہو گی۔"

"زبان کھولنے سے پہلے اس کی کھال بھی مت ادھیڑنا، ورنہ تمہاری اپنی کھالوں کی بھی خیر نہیں ہو گی سمجھے! ہر قیمت پر مجھے مائیکرو فلم واپس چاہیے۔"

"یس سر! یس سر!" اور اس کے بعد آواز بند ہو گئی۔ رائنا کے بدن پر ہلکی سی کپکپی طاری ہو گئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس قسم کے واقعات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ صوفی کے بارے میں اس نے بہت سی کہانیاں سنی تھیں کہ صوفی صاحب نے یہ کیا ہے صوفی صاحب نے وہ کیا ہے۔ اسے ان کہانیوں سے بھرپور دلچسپی ہوتی تھی اور وہ یہ سمجھتی تھی کہ اس طرح کے کام آسانی سے ہو جاتے ہیں اور کوئی دقت نہیں ہوتی لیکن اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کاموں میں زندگی کو کس طرح داؤ لگانا پڑتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کیا کیا جائے۔ سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا تھا کہ دروازے کی چٹخنی اندر سے لگا دی۔ باہر سے تو اسے کھولا جا سکتا تھا لیکن اب وہ اندر سے بند تھا پھر اس کے بعد اس نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اور پھر کسی خیال کے تحت واش روم میں داخل ہو گئی۔ دوسرے لمحے اس کی باچھیں خوشی سے کھل گئی تھیں۔ باتھ روم میں ایک ایسی کھڑکی موجود تھی جس میں سلاخیں نہیں تھیں اور اس سے

باہر نکلا جا سکتا تھا۔ کموڈ پر کھڑے ہو کر اس نے باہر جھانکا۔ زمین زیادہ نیچی نہیں تھی۔

اب اس کے بعد بھلا رکنے کا کیا سوال تھا چنانچہ وہ برق رفتاری سے کھڑکی پر چڑھی اور کھڑکی سے نیچے کود گئی اور پھر اس نے یہ سوچے سمجھے بغیر دوڑ لگا دی جو پھر اسے راستہ نظر آیا کہ یہ راستہ اسے کہاں لے جائے گا۔ لیکن یہ راستہ اسے اس دیوار تک لے گیا جس پر چڑھ کر دوسری طرف کودنا کوئی مشکل کام نہیں تھا اور چند لمحوں کے بعد وہ ایک سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

♥......♥......♥

سہیل کے ہونٹوں پر تشویش کے آثار تھے۔ وہ تارزن کی داستان سن رہا تھا۔ تارزن نے کہا۔

''ویسے بھی تم جانتے ہو کہ میں غیر محتاط آدمی نہیں ہوں اگر وہ مکمل دوستانہ ماحول میں بھی مجھ سے بات کرتی یا مجھے اس بات کا پورا یقین ہوتا کہ وہ صرف پرانی شناسائی کی بنیاد پر مجھ سے مل رہی ہے تب بھی یقین کرو میں اس طرح کی کوئی مشکوک چیز نہیں پیتا۔ یہ میری فطرت کا ایک حصہ ہے۔ ہم لوگ میرا مطلب ہے اب ہم لوگ وہ نہیں رہے ورنہ جرم کی دنیا سے تعلق رکھنے والے کسی بھی شخص کو اپنے باپ پر بھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے اور میں ہمیشہ سے اسی مقولے کا قائل ہوں۔'' سہیل عالم کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے کہا۔

''اور مجھے تم اپنا باپ سمجھتے ہو یا دادا!'' تارزن جذباتی ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''تمہیں میں اپنے وجود کی تکمیل سمجھتا ہوں۔ تمہارا قد میرے قد کو ملا کر مکمل ہوتا ہے اور اپنے آپ سے محتاط نہیں رہا جاتا۔''

''تھینک یو...... تارزن! مذاق میں یہ بات کہہ گیا تھا محسوس نہ کرنا۔ کیا کہتے ہو اس بارے میں۔''

''سیدھی سیدھی بات ہے، وہ یہاں کسی نیک ارادے سے تو نہیں آئی اور اب جب ہم اس ملک میں رہتے ہیں اس کے باشندے ہیں، اس سے دلچسپی اور محبت رکھتے ہیں تو اس کے مفادات کی نگرانی بھی ہمارے فرائض میں داخل ہوتی ہے۔ اس کی آمد کی وجہ ضرور معلوم ہونی چاہیے اور پھر میں اس کی گفتگو تمہیں بتا چکا ہوں، یقیناً وہ یہاں کسی خاص مقصد کے تحت آئی ہے اور اسی لیے اس قدر محتاط ہے کہ اس نے مجھے ایک کار آمد انسان سمجھتے ہوئے میری زندگی کا رسک نہیں لیا۔''

''دیکھو اس وقت تک جب ہم جرائم پیشہ تھے اپنے طور پر دنیا کا ہر فیصلہ کر سکتے تھے۔ نفع ہوتا نقصان لیکن زندگی میں کوئی راہنما بھی تقدیر ہی سے ملتا ہے اور یہ شخص جس کا نام صوفی ہے، بس میں تمہیں اس کے بارے میں کیا بتاؤں تارزن! یوں سمجھ لو میں ان معاملات میں اسے اپنا راہنما سمجھتا ہوں اور مرشد مانتا ہوں۔ میں یہ تمام تفصیل اس کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں جانتا ہوں سہیل کہ تم جو فیصلہ کرتے ہو اس میں کوئی بات ہوتی ہے۔ کوئی بڑی بات۔''

''ہم یہ تمام تفصیل صوفی صاحب کے پاس لے جائیں گے۔ میں انہیں فون کر لیتا ہوں۔ صوفی کو فون کیا گیا تو وہ وہیں اسی اپنی نئی رہائش گاہ میں ملا جو سہیل عالم کے علم میں آ چکی تھی۔''

''میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''مل لو پیارے بھائی درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''تارزن کو بھی اپنے ساتھ لانا چاہتا ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے درختوں کے ذریعہ آؤ گے۔'' صوفی نے مذاق کیا اور سہیل عالم بھی ہنسنے لگا پھر بولا۔

''بس زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے تک پہنچ جاؤں گا۔''

''آ جاؤ۔'' صوفی نے جواب دیا اور سہیل عالم نے فون بند کر کے تارزن کو اشارہ کیا کہ لباس وغیرہ بدل کر لیا جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ صوفی کی رہائش گاہ کی بیل بجا رہے تھے۔ دروازہ کھولنے والی حسینہ ہی تھی۔ سہیل عالم کو دیکھ کر وہ ہمیشہ خوش ہو جاتی تھی۔

''اے وہ کم بخت مجھے فارسہ نہیں آتا ورنہ فارسہ میں کوئی شعر پڑھتی۔''

''معشوق نشیلے کہاں ہیں؟''

''منہ کا مزہ خراب کر دیا۔ مر رہا ہوگا کسی کونے کھدرے میں۔ تم آ جاؤ ارے یہ کیا لائے ہو۔'' حسینہ نے تارزن کو دیکھ کر کہا جو پہلی مرتبہ اس عمارت میں آیا تھا اور پھر وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر ہنسنے لگی اور تارزن سے بولی۔

''اے بھیا! تم سکڑ کیسے گئے؟'' تارزن کو اچھی خاصی اردو آتی تھی۔ اس نے حسینہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بڑی بی! تمہیں دیکھ کر۔'' اور بس اس کے بعد مزید اور کیا کہنا تھا۔ بڑی بی! کے لفظ نے ہی حسینہ کو سر سے پاؤں تک سلگا دیا تھا۔

''اے یہ کہاں سے پکڑ لائے موا گنگا کہیں کا۔ یہ کاہے کا بچہ ہے آنکھیں وانکھیں اس کی ہیں یا نہیں ہیں۔''

''غلطی ہے اس کی معافی مانگتا ہوں۔ اصل میں اس کا تعلق اس ملک سے نہیں ہے۔ باہر کا بندہ ہے۔ تھوڑی تھوڑی اردو سمجھا دی ہے میں نے اسے، غلطی میری ہے اصل میں ایک دفعہ کسی نے کسی کو بڑی بی کہا تھا تو یہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ بڑی بی کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ میں نے کہا ایک خوب صورت اور حسین عورت! اب مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ یہ تمہارے سامنے تمہیں بڑی بی کہہ دے گا۔ اس سے اس کا مقصد پوچھو۔''

''ہیں...... سچ کہہ رہے ہو؟'' حسینہ نے ایک دم موڈ بدل کر کہا۔

''تم پوچھ سکتی ہو اس سے۔''

''نہیں۔ اس سے کیا پوچھوں گی یہ مجھے کیا بتائے گا۔ اے چل آ جا اندر آ جاؤ۔ آؤ تم بھی آؤ۔ تمہیں دیکھ کر تو دل خوش ہو جاتا ہے۔''

''صوفی صاحب کہاں ہیں؟''

''اندر موجود ہیں۔'' حسینہ نے جواب دیا اور سہیل ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گیا۔ صوفی ڈرائنگ روم میں موجود تھا لیکن سہیل نے اس کے اندر ایک عجیب سی تبدیلی محسوس کی تھی۔ عام طور سے صوفی قنوطیت میں ڈوبا نظر آتا تھا۔ جھکی جھکی آنکھیں پان چباتا ہوا لیکن اس وقت حیرت انگیز طور پر وہ چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔

''ہیلو صوفی صاحب!''

''ہاں آؤ۔ میں انتظار کر رہا تھا تمہارا۔''
''شکریہ۔ ایک بڑا دلچسپ انکشاف لے کر آیا ہوں۔''
''کہو۔'' صوفی نے کہا اور سہیل کچھ لمحے خاموش رہ کر اپنے ذہن میں وہ الفاظ ترتیب دینے لگا۔ جن کے ذریعہ وہ اصل حقیقت صوفی کو بتا سکے۔'' اس نے کہا۔

''صوفی صاحب ہم کچھ عرصے پہلے باقاعدہ جرائم کی دنیا میں متعارف تھے اور جرم کی دنیا سے تعلق رکھنے والے بے شمار افراد ہمیں جانتے تھے۔ یہی کیفیت ٹارزن کی تھی۔ جیسا کہ ان کے بارے میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اپنے ننھے قد و قامت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے لوگوں کو بڑی کامیاب شکستیں دی ہیں جو یہ سمجھتے تھے کہ یہ منحنی سا آدمی کوئی خطرناک چیز نہیں ہو سکتا۔ کچھ ایسے جرائم پیشہ افراد بھی تھے جو ٹارزن کی حقیقت سے واقف تھے اور سمجھتے تھے کہ ٹارزن کیا چیز ہے۔ ایسی ہی ایک شخصیت روز میلسی کی بھی تھی۔ روز میلسی کے بارے میں ہم لوگ اتنا جانتے ہیں کہ وہ ایک انتہائی خطرناک اور جنگ باز ملک کی سکرٹ ایجنٹ ہے۔ اس نے بہت سے زبردست کارنامے بھی سرانجام دیے ہیں۔

کچھ عرصے قبل روز میلسی نے ٹارزن سے بھی کچھ کام لیا تھا اور ٹارزن کی شان دار صلاحیتوں کی قائل ہو گئی تھی، بہرحال یہ مختصر سا تعارف تھا۔ روز میلسی ٹارزن کو یہاں نظر آئی۔ ایک اسٹور میں اس سے ملاقات ہو گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا اور روز میلسی ٹارزن کو اپنے ساتھ ایک علاقے میں لے گئی۔ انداز دوستانہ تھا۔ وہاں بیٹھ کر ایک دوسرے سے تبادلہ خیال ہوا اور اسی دوران روز میلسی نے ٹارزن کے لیے ایک مشروب منگوایا۔ ٹارزن کو کوئی شبہ نہیں تھا کہ روز میلسی اسے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گی۔

بس اس نے اپنے مزاج کے مطابق وہ مشروب ضائع کر دیا اور یہ ظاہر کیا کہ اس نے مشروب پی لیا ہے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے اس طرح کی اداکاری شروع کر دی جس سے روز میلسی کو یہ اندازہ ہو جائے کہ مشروب نے اسے کوئی نقصان پہنچایا ہے، کیوں کہ روز میلسی نے اس مشروب میں ایک انتہائی خطرناک زہر شامل کر دیا تھا۔''

''در...... در...... دریش رحم کریں۔'' صوفی نے عادت کے مطابق جیبیں ٹٹولیں لیکن پانوں کی ڈبیا اور بٹوہ وغیرہ بھی اس وقت پاس موجود نہیں تھا۔ وہ جیبیں ٹٹول کر رہ گیا۔ سہیل نے کہا۔

بعد میں اس نے اپنے آدمیوں کو بلا کر انہیں صورت حال بتائی اور کہا کہ وہ اس شناسائی کا رسک نہیں لے سکتی اور اس نے بہ حالت مجبوری ایک انتہائی کام آدمی ختم کر دیا ہے، کیوں کہ وہ نہیں جانتی کہ یہ شخص یہاں کیا کر رہا تھا۔ بس اس نے حفظ ماتقدم کے طور پر ٹارزن کو زندگی سے محروم کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے آدمیوں کو بلا کر کہا کہ ٹارزن کو کہیں ٹھکانے لگا آئیں۔ انہوں نے اسے نہر میں پھینک دیا اور بہرحال اسے نکل کر آنا ہی تھا۔ ہم روز میلسی کے بارے میں یہ نہیں جانتے صوفی صاحب کہ وہ کس مقصد کے تحت یہاں آئی ہے لیکن جس ملک سے اس کا تعلق ہے وہ ہمارا دوست یا بہی خواہ نہیں ہے۔ ہم اس کی آمد کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

صوفی نے ایک بار پھر جیبیں ٹٹولیں اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

''درویش ہم سب پر رحم کریں۔ بات واقعی قابل غور ہے، کون سا علاقہ تھا جہاں وہ تمہیں لے گئی تھی ٹارزن!'' صوفی نے سوال کیا۔

''سر! وہ ٹارگون کہلاتا ہے۔ ٹارگون ایونیو، وہاں وہ عمارت ہے۔'' ٹارزن صوفی کو اس عمارت کی پوزیشن بتانے لگا۔

''سمجھ گیا، ویسے کیا کہتے ہو سہیل!''

''سر! معلوم ہونا چاہیے کہ وہ یہاں کیوں آئی ہے، کتنے افراد سے اس کا رابطہ ہے؟''

''ہوں۔ اس کے لیے اس عمارت ہی میں داخل ہونا پڑے گا درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے پرخیال انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ اسی وقت حسینہ چائے کے برتن اور کھانے پینے کی کچھ اشیا لے کر اندر داخل ہوئی اور صوفی نے اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔ حسینہ نے مسکراتے ہوئے چائے بنا کر پہلا کپ سہیل عالم کے سامنے رکھا اور باقی دو کپ وہیں چھوڑ کر باہر نکل گئی۔

''حق اللہ...... حق اللہ...... حق اللہ! یہ صرف تمہارا حسن و جمال ہے۔ سہیل کہ تمہاری یہ خاطر مدارات ہو رہی ہے ورنہ یہ محترمہ...... یار ہر انسان ٹھرکی ہوتا ہے اور ہر دور میں اس کی ٹھرک ایسے ہی کارنامے سرانجام دیتی ہے۔ حق اللہ...... حق اللہ...... حق اللہ!''

سہیل مسکرانے لگا۔

♥......♥......♥

رائنا کے پیروں میں پنکھے لگے ہوئے تھے۔ وہ ان لوگوں کو ڈاج دینا چاہتی تھی اور اس کی انتہائی کوشش تھی کہ وہ اس تک نہ پہنچنے پائیں۔ ساری صورت حال اس کی سمجھ آ گئی تھی اور یہ بات اس کے لیے بڑی روح فرسا تھی کہ اس کا راز کھل گیا تھا اور وہ لوگ جن کا تعلق مائیکرو ڈسک سے تھا۔ کامیابی سے اسے ٹریس کر چکے تھے۔ نہ صرف ٹریس کر چکے تھے بلکہ سمعیہ سے پیچھا چھڑانے کے بعد وہ ان کے قبضے میں بہ آسانی آ گئی تھی۔

بہرحال یہ ایک سنگین بات تھی۔ اس بات سے اس کا ذہن خاصا الجھ گیا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ یہ ایک خطرناک عمل ہے۔ بہرحال کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں اچھا خاصا رش تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا، سامنے ایک ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے ٹیکسی کی طرف چل پڑی اور پھر اس نے ڈرائیور سے جھک کر کہا۔

''ڈرائیور چلو گے؟''

''یس میڈم!'' ڈرائیور نے مہذب لہجے میں کہا اور جلدی سے نیچے اتر کر ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھولا۔ رائنا اندر بیٹھ گئی تو اس نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور گاڑی اسٹارٹ کرتا ہوا بولا۔

''میڈم کہاں جانا ہے؟''

''کسی درمیانے درجے کے ہوٹل میں، جہاں کے اخراجات زیادہ نہ ہوں۔'' رائنا نے جواب دیا ٹیکسی ڈرائیور نے گردن موڑ کر اسے دیکھا وہ چھریرے بدن کا ایک عجیب سی شکل و صورت کا آدمی تھا۔

مقامی ہی تھا، لیکن انگریزی بہت اچھے انداز میں بولتا تھا۔
بہرحال اس نے ٹیکسی آگے بڑھادی۔ اسی وقت رائنا نے ایک لمبی ایمپالا دیکھی۔ یہ ایمپالا ٹیکسی سے کچھ فاصلے پر آ کر رکی تھی اور ایمپالا کی ڈرائیونگ سیٹ پر اس نے اسی شخص کو دیکھ لیا جس کی اس سے بات چیت ہوئی تھی۔ رائنا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ انتہائی کامیابی سے اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ آہ...... کچھ بھی ہو، کام کرنا ہے۔ کرنل رحیم شاہ نے اس سے پہلے کبھی ایسے کسی کام میں مصروف نہیں کیا تھا حالانکہ وہ شروع ہی سے اس بات کی خواہش مند تھی کہ گرین فورس میں اسے بھی کوئی مقام دیا جائے۔
لیکن کرنل نے بیٹی کو اس قابل سمجھا ہی نہیں تھا۔ بہرحال اب رائنا اس طرح پیچھے نہیں رہنا چاہتی تھی چاہے کچھ بھی ہوجائے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے تین چار موڑ کاٹے لیکن کار سائے کی طرح پیچھے لگی رہی۔ رائنا کو یہ سمجھنے میں دقت نہ ہوئی کہ دشمن اب پوری طرح مستعد ہیں اور کامیابی سے اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ ایک لمحے کے اندر اندر دل میں کچھ عجیب سی کیفیت بیدار ہوگئیں۔ اگر اس سلسلے میں ناکام رہی تو زندگی موت کی تو اسے کوئی پروا نہیں تھی لیکن کرنل رحیم کے سامنے بڑی بے عزتی ہوگی۔ وہ یہی کہے گا کہ عورت آخر عورت ہی ہوتی ہے۔ کچھ بھی ہوجائے، میں ان لوگوں کے چنگل میں نہیں آؤں گی اور اگر مجھے سختی کا جواب سختی سے دینا پڑا تو پھر یہی سہی۔ گولی کا جواب میں گولی اور تھپڑ کے جواب میں تھپڑ۔ اچانک ہی اس نے ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
''سنو ڈرائیور!''
''یس میڈم!''
''یہ کچھ بدمعاش میرا پیچھا کر رہے ہیں، تم نے وہ ایمپالا دیکھی؟''
''جی میڈم!''
''میں تمہیں ایک بھاری رقم انعام دوں گی۔ اس کو ڈاج دینا ہے۔''
''او کے میڈم! فکر نہ کیجیے۔'' ڈرائیور نے اپنی گاڑی کی رفتار ایک دم بڑھا دی اور پھر اچانک اس نے ایک ٹرن لیا۔ اس کی اس حرکت سے ٹیکسی الٹتے الٹتے بچی تھی۔ پیچھے والی کار کے پہیوں کی تیز چرچراہٹ سنائی دی۔
آخر کار طاقت ور ایمپالا تھی۔ وہ یوٹرن لے کر اس طرف گھوم گئی اور پھر دونوں کاروں میں ریس ہونے لگی۔ رائنا کی نگاہیں بار بار پیچھے اٹھ جاتی تھیں۔ وہ ان لوگوں کو پورے اعتماد کے ساتھ تعاقب کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔
کئی تنگ اور کشادہ سڑکوں پر مڑنے کے باوجود ایمپالا نے پیچھا نہیں چھوڑا جب کہ ٹیکسی ڈرائیور کی گردن پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ ایک موڑ پر تیز رفتاری سے گھومتے ہوئے ٹیکسی بے قابو ہو کر فٹ پاتھ پر چڑھ گئی لیکن ڈرائیور نے اسے سنبھال لیا اور پھر اسے سیدھا کر کے آگے بڑھ آیا۔ اچانک ہی رائنا نے کہا۔
''سنو! ڈرائیور اگلے موڑ پر کار کی رفتار کم کر کے مجھے اتار دینا۔ یہ تمہارے بل اور انعام کی رقم۔''
ڈرائیور نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن آگے اس کا موقع نہیں مل سکا کیوں کہ پیچھے آنے والی کار سر پر پہنچ گئی۔

ی۔ دونوں کاریں مختلف سڑکوں پر تیز رفتاری سے دوڑتی رہی تھیں اور نہ جانے قاہرہ کا یہ کون سا علاقہ تھا جہاں وہ اس وقت نکل آئے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ فاصلے پر ایک تنگ سی سڑک نظر آئی۔ سڑک کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے مکانات اور دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ کار کا فاصلہ کچھ اور کم ہوگیا۔ ٹیکسی ڈرائیور رفتار پر قابو نہیں رکھ سکا تھا کیوں کہ جگہ بہت تنگ تھی لیکن اچانک ہی اس نے ٹیکسی کو ایک چھوٹی سی نہر کے پل کی طرف گھمادی جو شاید پیدل آمد و رفت کے لیے تھا اور یہ ڈرائیور کی بہت بڑی غلطی تھی۔ کار پل کے درمیان پہنچ رہی تھی کہ ایمپالا بھی سر پر پہنچ گئی اور پہلو میں آ کر اس نے زور سے ٹیکسی کو ٹکر ماردی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی سنبھالنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوسکا اور دوسرے ہی لمحے ٹیکسی ریلنگ کو توڑتی ہوئی نہر میں جا پڑی۔ چھپاک کی آواز بلند ہوئی لیکن خوش قسمتی سے کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ ٹیکسی نہر میں بیٹھتی چلی گئی۔ اس میں فوراً ہی پانی بھرا تھا۔
رائنا نے جلدی سے باہر دیکھا اور پھر پوری قوت سے دروازہ کھول دیا۔ پانی کا ریلا اندر گھس آیا اور اس نے رائنا کو واپس سیٹ پر دھکیل دیا۔ دوسری طرف ڈرائیور بھی شاید دروازہ کھول چکا تھا۔ رائنا ہمت کر کے آگے بڑھی اور ٹیکسی کی اندرونی سیٹ سے باہر نکل آئی پھر اس نے اوپر کی جانب تیرنا شروع کر دیا۔ نہر گہری نہیں تھی۔ دوسرے لمحے وہ سطح پر پہنچ گئی۔
لباس وغیرہ کا جو حشر ہوا وہ الگ بات تھی لیکن بہرطور وہ کنارے پر پہنچ گئی۔ لوگ چاروں طرف سے دوڑ پڑے تھے اور پل کے کنارے پر کھڑے ہو کر چیخ رہے تھے۔ کسی نے مدد کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کنارے کی اینٹوں کا سہارا لے کر وہ اوپر چڑھی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی لیکن قرب و جوار میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسی وقت پولیس سائرن کی آواز سنائی دی اور وہ بے تحاشا دوڑنے لگی۔ پولیس کے ہاتھ میں نہیں لگنا چاہتی تھی۔
خوش قسمتی ہی تھی کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے پولیس والوں کو نہر میں گری ہوئی ٹیکسی کے بارے میں بتا رہے تھے۔ اس صورت میں اسے وہاں سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ سارا لباس پانی میں شرابور ہو رہا تھا اور اس تنگ اور سنسان گلی میں چلتے ہوئے رائنا کی نگاہیں کسی پناہ گاہ کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں لیکن ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آئی۔ مکانات کے دروازے موجود تھے لیکن وہ ان میں داخل ہو کر اپنے آپ کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ پولیس بہرحال اسے تلاش کرے گی اور مکانوں کے مکین کو کیا پڑی ہے کہ اسے چھپائیں۔
وہ دوڑتی ہوئی گلی کے دوسرے سرے پر نکل آئی۔ ابھی وہ گلی کے اس سرے سے نکلی ہی تھی اور یہ اندازہ لگا نہیں پائی تھی کہ ادھر کیا ہے کہ دفعتہً اس کی نگاہ ان دو افراد کی جانب اٹھی جو انہی چاروں میں سے تھے۔ ایک بھاری چہرے والا شخص اپنے ہاتھ میں ریوالور لیے رائنا سے چند گز کے فاصلے پر موجود تھا۔ رائنا نے پلٹ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس نے فوراً ہی گولی چلا دی۔ گولی رائنا کے سر سے صرف چند گز کے فاصلے پر سے گزر گئی، اس کے ساتھ ہی اس کے پاؤں لڑکھڑائے اور وہ ٹھوکر کھا کر نیچے جا گری۔ یہ کوشش اس کے حق میں بہتر ہی ہوئی کیوں کہ دوسری گولی اس نے صحیح نشانے پر چلائی تھی البتہ اس کے بعد وہ رائنا کے سر پر پہنچ

گیا۔ اس نے ریوالور کی نال رائنا کے سر پر لگائی اور غرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اٹھو!'' رائنا نے دونوں ہاتھ آہستگی سے زمین پر ٹکائے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ خوں خوار نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ دوسرے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ اس کے اٹھنے سے ریوالور کی نال سر کے پچھلے حصے سے ہٹ گئی تھی اور وہ رائنا کے بالکل قریب آ گیا تھا۔ اچانک ہی رائنا نے دونوں ہاتھ بلند کیے، وہ ہاتھوں کی طرف متوجہ ہوا، لیکن رائنا کا گھٹنا اس کے پیٹ پر پڑا اور اس کے حلق سے ایک زوردار کراہ نکل گئی۔ وہ دوہرا ہو گیا تھا لیکن رائنا نے پیچھے ہٹ کر بالکل اس کے منہ پر اس طرح کک لگائی جس طرح فٹ بال پر زوردار کک لگائی جاتی ہے۔ اسے اپنی اس انوکھی طاقت کا پہلی بار اندازہ ہوا۔ اس کی ٹھوکر اس کی ٹھوڑی کے نیچے پڑی تھی۔ اور اس کا سر پہلے پیچھے ہوا اور پھر دونوں پاؤں اوپر اٹھے اور اس کے بعد وہ فضا میں بلند ہو کر منہ کے بل نیچے گرا۔

جس انداز میں وہ گرا تھا اس سے جو ہونا تھا وہی ہوا یعنی اس کی گردن کی ہڈی کے منکے ٹوٹ گئے۔ وہ کسی ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح بلبلایا اور اس کے کانوں اور منہ سے خون بہہ نکلا لیکن رائنا کو دوسرے آدمی کی طرف متوجہ ہونا پڑا تھا۔ جو فوراً ہی پیچھے سے اس پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس نے زمین پر بیٹھ کر اسے اپنے آپ پر چھا جانے سے روکا لیکن ان دونوں کی شامت ہی آ گئی تھی کیوں کہ وہ رائنا پر سے گزر کر اپنے اس مرتے ہوئے ساتھی پر جا پڑا تھا پھر رائنا بھلا اسے کہاں موقع دے سکتی تھی۔ اس کی زوردار ٹھوکر اس کی پسلیوں پر پڑی اور اس کے بعد وہ اپنے نوک دار جوتے سے مسلسل اس پر ٹھوکریں لگاتی رہی۔

گردن ٹوٹنے والا آدمی تو پہلے ہی جہنم رسید ہو گیا تھا لیکن اس دوسرے آدمی کے منہ سے بھی خون کی موٹی دھار بہہ نکلی تھی۔ اس نے اس بری حالت کے باوجود رائنا کے دونوں پاؤں پکڑ لیے اور زور سے جھٹکا دیا۔ رائنا بری طرح زمین پر گری تھی لیکن پاؤں اس کی گرفت سے نکل گئے تھے۔ لیٹے ہی لیٹے اس نے دونوں پاؤں جوڑ کر پیروں کی ٹھوکر اس کے چہرے پر لگائی اور اس کے بعد اس میں کوئی سکت نہ رہی۔ پتا نہیں وہ زندہ تھا یا مر گیا۔

بہرحال رائنا کے پاس اس وقت یہ جاننے کا وقت نہیں تھا وہ پھرتی سے اٹھی اور ایک بار پھر اس نے وسیع و عریض میدان میں دوڑ لگا دی جو اس گلی کے دوسرے سرے پر واقع تھا اور جس کی لمبائی تقریباً تین سو گز تھی۔ اس کے کنارے پر مکانات بنے ہوئے تھے لیکن ان مکانات میں رہنے والوں کو اس ہنگامے کا کوئی علم نہیں تھا چنانچہ وہاں سکون تھا۔ وسیع و عریض میدان کو عبور کر کے مکانوں کے سرے تک پہنچتے ہوئے رائنا کو کافی وقت لگ گیا۔ اس دوران وہ بار بار گردن گھما کر پیچھے کی طرف بھی دیکھتی جا رہی تھی لیکن اس کے بعد کسی نے تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آخر کار وہ مکانوں کے قریب پہنچ گئی۔ حلیہ دیکھنے کے قابل ہو رہا تھا۔ لباس بری طرح بھیگا ہوا تھا۔ چہرہ بگڑا ہوا تھا، بال سر سے چپک گئے تھے اور وہ عجیب و غریب حلیے میں نظر آ رہی تھی۔

مکانوں کے اس سرے پر ایک وسیع و عریض پارک تھا جس میں گھنے درخت نظر آ رہے تھے۔ پارک کا گیٹ کھلا ہوا تھا اور اس وقت وہ سنسان نظر آ رہا تھا چنانچہ وہ فوراً ہی وقت ضائع کیے بغیر پارک میں

ل ہو گئی اور اس کے بعد اس نے درختوں کے ایک ایسے جھنڈ کو تلاش کیا جو اسے دوسروں کی نگاہوں سے دہ رکھ سکتا تھا۔ بہرحال کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ یہاں پہنچ کر اس نے سب سے پہلے اپنا لباس اُتارا اور سے پانی نچوڑنے لگی۔ جوتوں میں پانی بھرا ہوا تھا اور پاؤں چپ چپ کر رہے تھے اس نے حتی الامکان انہیں ی خشک کرنے کی کوشش کی اور اس کے بعد وہ اپنے جسم وغیرہ پر ہر چیز صاف ستھری کرنے لگی۔ یہاں تنہائی ہر خاموشی اس کی مدد کر رہی تھی۔

چنانچہ اس نے اپنے آپ کو بالکل صاف ستھرا کر لیا۔ لباس خشک ہوا تو اسے پہن لیا اور اس کے دباقی چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ کرنسی نوٹ کافی تعداد میں موجود تھے لیکن خوش بختی یہ تھی کہ وہ جس پرس میں ۂ وہ واٹر پروف تھا۔ گویا تقدیر نے یہاں اس کا ساتھ دیا تھا۔ بہرحال کرنسی کی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ے آگے کے بارے میں صحیح فیصلے کرنے تھے۔ حتی الامکان اپنا حلیہ درست کرنے کے بعد وہ وہاں سے باہر ل اور اس کے بعد نہ جانے کتنا فاصلہ اس نے پیدل طے کیا۔ اس طرف کا اس نے رخ بھی نہیں کیا تھا جس رف سے ٹیکسی آئی تھی۔ پتا نہیں ٹیکسی ڈرائیور اسے کہاں لے جانا چاہتا تھا۔

لیکن تھوڑے ہی فاصلے پر اسے ایک ایسا ہوٹل نظر آ گیا جو درمیانے درجے کا ہوٹل تھا۔ اس نے یہیں قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ہوٹل کے کمرے میں پہنچ گئی۔ دوسرا کوئی لباس وغیرہ تو تھا نہیں جسے تبدیل کیا جاتا تاہم ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر اس نے ایک بار پھر دروازہ اندر سے بند کیا اور اپنے لباس کا صحیح طور پر جائزہ لینے لگی پھر بستر پر لیٹ کر اس نے سوچا کہ اس کے لیے کوئی خاصی مشکل نہیں پیش آئی ہے۔ سمعیہ پتا نہیں کس حال میں ہو گی۔ بظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس پر کوئی برا وقت نہیں آیا ہو گا کیوں کہ اسے اس معاملے سے بے تعلق سمجھا گیا ہے۔

لیکن حیرانی کی بات تھی۔ واقعی شدید حیرانی کی بات تھی کہ ان لوگوں نے اتنے مختصر وقت میں صحیح صورت حال کا اندازہ لگا لیا تھا۔ مائیکرو ڈسک محفوظ تھی۔ سمعیہ سے دوبارہ بھی ملا جا سکتا تھا، یہ کہہ کر کہ وہاں کچھ پراسرار لوگوں نے اسے اغوا کر لیا تھا اور وہ اب ان کے چنگل سے نکل آئی ہے۔ بہرحال جس قدر ہنگامہ آرائی ہوئی تھی اس کے بعد نیند کا نہ آنا تعجب کی بات ہوتی اور پھر نیند بھی عمر کی دین ہوتی ہے، چنانچہ وہ عمر کی دین کا سہارا لے کر گہری نیند سو گئی۔

♥......♥......♥

''کم بخت اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ گیٹ پر کئی آدمی مستعد ہیں۔ کیا کہتے ہیں صوفی صاحب!'' سہیل عالم نے سرگوشی کے عالم میں کہا اور صوفی اس پائپ کی طرف دیکھنے لگا جو بہت کم زور تھا۔ ویسے بھی پلاسٹک کا پائپ تھا۔ اس میں اتنی قوت کہاں ہوتی ہے۔

''میں اسے دیکھ چکا ہوں۔ وہ تو بالکل ہی ناکارہ ہے۔''

''دیکھو، ہمارے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ پائپ کے ساتھ ساتھ ہی وہ لوہے کا ایک انچ پائپ بھی ہے جو یقیناً گیس یا پانی کا ہے۔ وہ بھی ساتھ ساتھ ہی اوپر کی طرف چلا جاتا ہے۔ اصل میں وہ کمرکی ہر لحاظ سے بہتر ہو گی۔ اس کے ذریعے کوشش کی جائے تو اوپر پہنچا جا سکتا ہے۔'' سہیل عالم نے گہری

سانس لے کر صوفی کو دیکھا۔ یہ بات ذرا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کم از کم وہ ایسی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ لوگ اس عمارت پر موجود تھے جس میں ٹارزن کو روز میلسی لے گئی تھی۔

رات کی تاریکی میں عمارت سناٹے میں ڈوبی ہوئی بہت پراسرار لگ رہی تھی۔ صوفی اور سہیل عالم اس عمارت کا جائزہ لینے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن عمارت کا پورا چکر لگا لیا تھا انہوں نے۔ دیواریں ایسی نہیں تھیں جنہیں آسانی سے عبور کیا جا سکے اور اس کے علاوہ یہاں انہوں نے لوگوں کو بھی مستعد دیکھا تھا۔ اچانک ہی سہیل عالم چونک پڑا۔ اس نے اچھل کر صوفی کو پلاسٹک کا پائپ پکڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ صوفی نے جوتے اتار کر وہیں پھینک دیے تھے۔

اس نے پلاسٹک کے پائپ کا سہارا لیا اور پاؤں کے انگوٹھے اور انگلی کی مدد سے اس پتلے پائپ کو پکڑ لیا اور جو جست کا تھا اور پھر سہیل عالم نے اسے پھرتی سے اُوپر چڑھتے ہوئے دیکھا۔ یہ بالکل بندروں کا اسٹائل تھا۔ صوفی صرف پاؤں کے انگوٹھے اور انگلی کی مدد سے اپنا پورا وزن سنبھالے ہوئے تھے۔ صرف سہارے کے لیے اس نے پلاسٹک کا پائپ پکڑا ہوا تھا اور لمحوں کے اندر وہ اس کھڑکی تک پہنچ گیا اور پھر اس کا بدن اس طرح کھڑکی میں داخل ہو گیا جس طرح مقناطیس نے اسے اندر سے کھینچ لیا ہو۔ سہیل عالم حیرت سے منہ پھاڑے یہ حیران کن منظر دیکھتا رہا تھا۔ صوفی نے کھڑکی سے جھانک کر اسے دیکھا اور اس کے بعد ہاتھ ہلا کر اندر کی جانب چل پڑا سہیل عالم پھٹی پھٹی آنکھوں ادھر دیکھتا رہ گیا تھا۔

صوفی نے جو کمال دکھایا تھا در حقیقت وہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''صوفی صاحب! اگر میں یہ تسلیم نہ کرتا کہ آپ مجھ سے بدرجہا برتر ہیں تو آپ یقین کیجیے کہ آپ سے شناسائی کا اظہار تک نہ کرتا۔ اب میں کیا کروں؟ سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔'' وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے اندر کوئی کوشش کی تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ اندر داخل ہونے کے لیے کچھ اور انتظار کیا جائے تاکہ کوئی ترکیب نکل سکے جو بظاہر سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

ادھر صوفی اس کھڑکی سے دوسری طرف کمرے میں اتر گیا تھا۔ یہ ایک سجا سجایا بیڈ روم تھا۔ ایک طرف بستر پڑا ہوا تھا۔ دوسری طرف ایک صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل الماری وغیرہ۔ صوفی یہاں سے اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر نکل آیا۔ عمارت کے بیرونی حصے میں انہوں نے چار افراد کو دیکھا جو مقامی نہیں تھے اور چاروں ہی مستعد نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے ان کے پاس اسلحہ بھی دیکھا تھا۔

دو دو افراد گشت کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اور یہ بات مکمل طور پر کہی جا سکتی تھی کہ ان کی موجودگی میں گیٹ یا کسی اور ذریعہ سے اندر داخل ہونا ناممکن ہے۔ صوفی دروازے کے قریب پہنچا۔ اسے یقین تھا کہ دروازہ باہر سے بند نہ ہو، لیکن غالباً گھر کے مکین اس طرح مطمئن تھے کہ انہوں نے دروازے کو باہر سے بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ پورے گھر میں کتنے بیڈ روم تھے اس کا تو کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا ایک اندرونی کمرے میں تیز روشنی نظر آ رہی تھی۔ صوفی اس وقت ایک خوں خوار چیتے کی مانند محسوس ہو رہا تھا اس نے اپنے بدن پر سیاہ لباس پہنا ہوا تھا اور چہرے پر خاص قسم کی نقاب لگائی ہوئی تھی۔ اس کی چستی مستعدی دیکھ اس وقت کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی صوفی ہے۔

بہرحال اس کی اپنی ایک زندگی تھی اور اس زندگی کے بیش بہا کارنامے تھے۔ وہ آگے بڑھتا ہوا اس کمرے کے نزدیک پہنچ گیا جہاں روشنی ہو رہی تھی۔ قدموں کی ذرا سی بھی چاپ اس نے پیدا ہونے نہیں دی تھی یہ بھی اندازہ اسے ہو گیا تھا کہ اس اوپری منزل میں کوئی موجود نہیں ہے۔ پھر اس نے کمرے میں جھانک کر دیکھا یہ بھی ایک خوب صورت بیڈ روم تھا لیکن خالی تھا یہاں ایسے ہی تیز روشنی جلا کر چھوڑ دی گئی تھی۔

پوری طرح یہ اندازہ کرنے کے بعد کہ بیڈ روم سے ملحق باتھ روم میں بھی کوئی نہیں ہے صوفی وہاں سے آگے بڑھا اور اس کے بعد نیچے سیڑھیاں اترنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد وہ نیچے ایک ڈرائنگ ہال میں کھڑا تھا۔ اس ڈرائنگ ہال میں کئی دروازے تھے اور ان میں سے ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صوفی بے آواز چلتا ہوا اس کھلے دروازے کے پاس پہنچ گیا جہاں سے آوازیں آ رہی تھیں اور پھر اس نے ایک ایسی جگہ منتخب کر لی جہاں سے وہ اندر جھانک سکتا تھا۔ سہیل عالم کو باہر ہی چھوڑنا پڑا تھا اگر وہ خود کوشش کر کے یہاں تک پہنچ جائے تو دوسری بات ہے ورنہ ظاہر ہے اس کو اندر لانے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا پھر اس نے اس اندرونی کمرے کا منظر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے بری طرح اچھل پڑا۔

اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کرسی پر بندھے ہوئے اس شخص کو دیکھا جسے وہ اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ ایک بھاری بھرکم آدمی تھا۔ جسم پر قمیض اور پتلون تھی۔ قریب ہی کوٹ پڑا ہوا تھا۔ اسے کرسی سے باندھ دیا گیا تھا اور اس سے کچھ فٹ کے فاصلے پر ایک دراز قامت عورت کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے حلیے سے یہی لگتا تھا کہ یہی عورت روز میلسی ہے۔ وہ کرسی سے بندھے ہوئے شخص سے کچھ کہہ رہی تھی۔ صوفی نے اس آواز پر کان لگا دیے اور دوسرے لمحے اس نے آنکھیں بند کر کے زور سے گردن جھٹکی اور اس کے حلق سے ایک ہلکی سرسراہٹ نکلی۔

''حق اللہ......''

♥......♥......♥

دراز قامت عورت کرسی سے بندھے شخص سے جو کچھ بھی کہہ رہی تھی۔ وہ الفاظ تو صوفی کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ لیکن بندھے ہوئے شخص کے چہرے پر جو بارہ بج رہے تھے اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ دراز قامت عورت نے اس پر تشدد بھی کیا ہے۔ البتہ یہ بات صوفی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ روز میلسی جس کے بارے میں ٹارزن نے سہیل عالم کو بتایا تھا۔ وہ جمشید مرزا کو کیوں اغوا کر کے لے آئی ہے۔ ویسے جمشید مرزا بھی اپنی طرز کا واحد ہی کردار تھا۔ جو بار بار صوفی کے سامنے آ جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ جمشید مرزا کو ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے کی عادت تھی۔ لیکن روز میلسی کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جمشید مرزا سے کچھ معلومات حاصل کر رہی ہے۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی صوفی کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا۔ پھر اچانک ہی اس نے آگے بڑھ کر ایک زوردار تھپڑ جمشید مرزا کے منہ پر لگایا اور صوفی نے جلدی سے آنکھیں بھینچ لیں۔ تھپڑ کی آواز البتہ اتنی زوردار تھی کہ بآسانی صوفی کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ صوفی نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا کہ اب جمشید مرزا کو مدد کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں ٹانگ اڑا دینی چاہیے۔ ابھی وہ لائن آف ایکشن پر غور کر رہا تھا کہ اچانک ہی باہر گولیاں چلنے لگیں۔ فائرنگ کی آواز خاصی تیز تھی۔ صوفی نے اب توقف نہیں کیا

اور دروازے کی طرف جھپٹا اس نے دروازے کو شانے سے ٹکر ماری لیکن اسی وقت لائٹ چلی گئی۔ گہری تاریکی چاروں طرف پھیل گئی۔ دروازے پر پہنچتے ہی اس نے ایک دم سے اپنی ڈائریکشن موڑ لی پھر ادھر ادھر جسم کو جنبش دیتا ہوا آگے بڑھا جمشید مرزا جہاں پر کرسی سے بندھا بیٹھا تھا۔ وہ جگہ صوفی کے ذہن میں تھی۔

چناں چہ تاریکی میں بھی اس نے اپنے آپ کو جمشید مرزا کو ٹکرانے سے باز رکھا۔ البتہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لائٹ کیسے بند ہو گئی۔ روز میلسی کے بارے میں اسے اندازہ نہیں تھا کہ کمرے میں ہے یا غائب ہو گئی روشنی کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ صوفی ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنی جگہ رک گیا۔ کچھ لمحے سوچتا رہا پھر پھرتی سے آگے بڑھا اور کرسی کے قریب پہنچ گیا اس نے اپنی پوری مہارت کے ساتھ کرسی پر وہ بند ٹٹولے جنہوں نے جمشید مرزا کو جکڑا ہوا تھا۔ وہ بولنے لگا۔ جمشید مرزا کی پھٹی پھٹی آواز ابھری تھی۔

''تم کون ہو...... تم کون ہو بھائی۔ کون ہو تم؟ روشنی دیکھو روشنی۔'' لیکن صوفی خاموش رہا۔ اس نے جمشید مرزا کے سارے بندھن کھول دیے۔ اس کے پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے۔ وہ نیچے جھک کر پاؤں کھول رہا تھا۔ کہ جمشید مرزا نے اس کے شانوں سے پکڑ لیا۔''

''مجھے بتاؤ تو سہی اپنے بارے میں کون ہو تم۔ لیکن صوفی نے اسے زور سے جھٹک دیا اور اس کے بعد پھرتی سے کھلے دروازے سے باہر نکل آیا۔ یہ اندازہ اس نے لگا لیا تھا کہ اگر روز میلسی کمرے ہی میں ہوتی تو یقینی طور پر جمشید مرزا کو کھولنے کے سلسلے میں مداخلت کرتی۔ یقینی طور پر اسے یہاں سے باہر نکلنے کا راستہ مل گیا تھا۔ پھر باہر کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی مزید کئی فائر ہوئے۔ صوفی ایک ٹھنڈی سانس لے کر باہر نکل آیا تھا۔ لیکن اس نے اب بھی اپنے آپ کو اس قدر مستعد رکھا تھا کہ اگر کہیں سے اس پر خاموشی سے فائرنگ کی جائے تو وہ اپنے آپ کو محفوظ رکھے۔ وہ عمارت کے احاطے میں پہنچا تو اسے سہیل کی آواز سنائی دی۔

''کیا آپ آس پاس موجود ہیں؟''

''حق اللہ......'' صوفی نے کہا اور صرف آواز کا اندازہ لگا کر سہیل اس کے پاس پہنچ گیا۔

''خدا کی پناہ...... تاریکی میں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ہمارے اندر داخل ہو گئی ہے۔'' صوفی نے کوئی جواب نہ دیا اور گہری تاریکی میں آنکھیں پھاڑنے لگا۔ پھر بولا۔

''یہاں چند افراد تھے۔''

''نکل گئے۔ ایک کار میں بیٹھ کر گئے۔''

''فائرنگ کس نے کی تھی؟''

''انہوں نے مجھ پر کی تھی۔'' سہیل نے جواب دیا اور پھر ایک دم صوفی کا شانہ دبا کر بولا۔

''کوئی...... کوئی...... آ رہا ہے وہ دم سادھ کر رک گئے۔ صوفی نے آہستہ سے کہا۔

''وہ جمشید مرزا ہے۔''

''کون......'' سہیل حیرت سے اچھل پڑا۔ لیکن صوفی نے خاموشی اختیار کی تھی۔ اب چونکہ ان کی آنکھیں رات کی تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہوتی جا رہی تھیں اس لیے انہوں نے اس سائے کو دیکھا جو بڑھ

انداز میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا گیٹ کی جانب بڑھ رہا تھا اور پھر وہ گیٹ سے باہر نکل گیا۔

تاریکی کے باوجود انہیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کوئی مرد ہی ہے۔ صوفی منتظر تھا کہ روز میلسی بھی باہر آئے۔ لیکن روز میلسی اس قدر بے وقوف نہیں تھی کہ اندر ہی رک کر انتظار کرتی۔ ان کے چاروں ساتھی باہر بھاگے تھے۔ یقیناً اسی وقت بھاگے تھے جب روز میلسی اس کے پاس پہنچ چکی ہو گی۔

''اب......'' سہیل عالم نے پوچھا۔

''کچھ نہیں...... آؤ...... کوئی پناہ گاہ تلاش کریں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے کہا اور سہیل عالم اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ پھر ایک جگہ ایسی نظر آ ہی گئی۔ جہاں رک کر وہ ایک طرف سے کوٹھی کے گیٹ کا جائزہ لے سکتے اور دوسری طرف سے عمارت کے اندر سے باہر آنے والے پر بھی نگاہ رکھی جا سکتی۔ سہیل نے کہا۔

''یہاں رکنا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔''

''کیوں؟'' صوفی نے پوچھا۔

''فائرنگ کی آوازیں باہر بھی سن لی گئی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے آس پاس کسی نے پولیس کو اطلاع دے دی ہو۔''

''تم نے شاید غور نہیں کیا۔ عمارت کا آس پاس ہے نا پاس اور پولیس اگر ہوتی تو آ سکتی تھی۔ اس کا مقصد ہے کہ پولیس بھی آس اور پاس موجود نہیں ہے۔ درویشوں کے کرم سے۔''

''تو پھر آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

''چلہ کشی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ جگہ مناسب ہے موسم اور ماحول بھی اچھا ہے۔ صوفی نے جواب دیا اور سہیل عالم ہنسنے لگا۔ اس کے بعد خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ خاصی دیر خاموشی رہی پھر صوفی نے کہا۔

''تم نے غالباً گیٹ سے اندر گھسنے کی کوشش کی ہو گی۔''

''ہاں۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگر کوئی بہت ہی خفیہ راستہ ہو تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن عمارت میں گیٹ کے سوا داخلے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہاں آپ نے جو راستہ اختیار کیا۔ وہ آپ کی روحانیت کا کرشمہ تھا۔ کوئی عام آدمی اس معمولی سہارے سے اس برق رفتاری سے اوپر نہیں پہنچ سکتا۔ آپ نہ جانے کیا چیز ہیں۔''

''میں ڈارون کا ارتقائی نظریہ ہوں۔ درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی نے جواب دیا۔ سہیل ہنستا رہا پھر بولا۔

''میرا خیال ہے عمارت کا مین سوئچ اڑا دیا گیا ہے۔''

''مین سوئچ کہاں ہو سکتا ہے۔'' صوفی نے کہا۔

''میں تلاش کرتا ہوں۔'' سہیل عالم بولا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر نکل آیا۔ پھر چند لمحات کے بعد عمارت بالکل روشن ہو گئی تھی۔ ان لوگوں کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ نہ تو آس پاس کے کسی فرد نے پولیس کو

اس فائرنگ کی اطلاع دی تھی اور نہ پولیس قرب و جوار میں موجود تھی جس کی وجہ سے وہ ادھر متوجہ ہو جاتی۔ اس کے علاوہ روز امیلیسی بھی عمارت سے نکل گئی تھی اور اب عمارت میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ صوفی نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ سہیل عالم اسے تھوڑے فاصلے پر مل گیا۔

''مین سوئچ آف کرایا گیا تھا۔ غالباً بھاگنے والوں میں سے کسی نے یہ کارروائی کی ہوگی۔ اندازہ یہ ہو رہا ہے کہ اب اس عمارت میں کسی کا وجود نہیں تھا۔''

''اس سے اچھی کیا بات ہے۔ آؤ پھر ہم عالم وجود میں آ جائیں درویشوں کی دعاؤں سے تم یوں کرو داہنی سمت جاؤ۔ میں بائیں سمت سے آغاز کرتا ہوں۔ جتنی پھرتی سے یہاں کی تلاشی لی جا سکتی ہے لے لو مگر کسی چیز کو نظر انداز مت کرنا۔''

''ٹھیک ہے۔'' سہیل نے کہا اور صوفی کے کیے ہوئے اشارے کی سمت چل پڑا۔ صوفی خود بھی مصروف ہو گیا تھا عمارت میں کل پانچ کمرے تھے۔ دو اسٹور تھے بہ ظاہر ان دونوں کو کوئی چیز نہیں مل سکی۔ لیکن صوفی اس بڑے ڈسٹ بن کے پاس رک گیا جس میں بہت سے ڈبے بھرے ہوئے تھے۔ یہ دواؤں کے ڈبے بھی تھے۔ بسکٹوں وغیرہ کے بھی کچھ مڑے تڑے کاغذات بھی تھے۔ جنہیں صوفی نے کھول کر دیکھنے لگا۔ ڈسٹ بن کے پیچھے اسے ایک کاغذ ملا جس پر ایک مخصوص رائٹنگ میں RK099 لکھا ہوا تھا یہ RK099 اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ لیکن کاغذ کو احتیاط سے اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ کوئی چالیس منٹ تک انتہائی باریک بینی سے یہاں کی تلاشی لی گئی۔ لیکن کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ دواؤں وغیرہ کے ڈبے بھی دیکھے گئے اور سہیل عالم نے اس سلسلے میں بہترین انکشافات کیے اس نے کہا۔

''خاص طور سے دواؤں کے یہ دو ڈبے جو زیادہ پرانے نہیں ہیں ایک خاص سمت اشارہ کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ انہیں استعمال کرنے والا کوئی جنونی ہے۔ یہ ہیجان کو ختم کرنے والی انتہائی زود اثر دوا ہے اور یہ ڈبے بھی زیادہ پرانے نہیں ہیں اس کا مطلب ہے کہ کوئی بہت زیادہ مقدار میں انہیں استعمال کرتا ہے۔ ممکن ہے وہ روز امیلیسی ہی ہو۔'' صوفی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر وہ بڑے دروازے سے ہی باہر نکلے تھے۔ لیکن انتہائی محتاط انداز میں اس بات کا شبہ کیا جا سکتا تھا کہ کوئی باہر ان کی تاک میں ہو۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں نکلی تھی۔ پھر سہیل عالم نے صوفی کو اس کی رہائش گاہ پر اتارا اور خدا حافظ کہہ کر چلا گیا یہ بات دونوں کے درمیان راستے ہی میں طے ہو گئی تھی کہ اس سلسلے میں جو بھی معلومات حاصل ہوں۔ ایک دوسرے کو اطلاع دے دی جائے۔ ابھی تک صوفی کے ذہن میں کوئی خاص بات واضح نہیں ہو سکی تھی۔

بہر حال سہیل عالم تو اسے ڈراپ کر کے چلا گیا۔ صوفی نے کال بیل کا بٹن دبایا اور حسینہ شعلہ بنی ہوئی دروازے پر نمودار ہو گئی۔

''آج تم سے دو دو باتیں کرنی ہیں۔''

''درویش رحم کریں۔ اندر تو تشریف لے چلیے حسینہ عالم!''

''سمجھتی ہوں۔ مذاق اڑاتے ہو تم میرا حسینہ کہہ کر، ارے خود بھی کبھی آئینہ دیکھ لیا کرو۔ اوقات میں رہو گے۔''

''اے بدصورت عورت اندر تو چل۔'' صوفی نے کہا۔

''جھاڑو پھرے تمہارے منہ پر بدصورت ہو گے تم، اللہ نے جیسا بھی بنایا ہے میں تو اپنے آپ کو بدصورت نہیں سمجھتی۔''

''کمال کی شخصیت ہے تمہاری بھی حسینہ بیگم! بدصورت کہو تو برا مانتی ہو۔ خوب صورت کہو تو کہتی ہو مذاق اڑا رہا ہوں۔''

''بس بس۔ کیا کہوں کرنل صاحب کو کہاں پھنسا دیا انہوں نے مجھے۔''

''عزیزہ! میرا آپ سے نکاح تو نہیں ہوا ہے۔ جب چاہیں تشریف لے جا سکتی ہیں۔''

''سنکھیا نہ پھانک لیتی اگر تمہارے ساتھ میرا نکاح کیا جاتا تو۔ ارے کوئی کر کے تو دیکھتا ایسا، اپنی اور اس کی جان ایک کر دیتی۔''

''یہیں دروازے پر۔'' صوفی نے کہا اور حسینہ پیچھے ہٹ گئی۔ یہ ڈائیلاگ دروازے پر ہو رہے تھے۔ صوفی نے خود ہی پلٹ کر دروازہ بند کیا۔ تو حسینہ کی آواز سنائی دی۔

''اور یہ کیا آوارہ گردی لگا رکھی ہے تم نے۔ یہ وقت شریفوں کے گھر میں آنے کا ہے۔''

''شریفے اس وقت تو گھر میں نہیں آتے۔ آپ کون سے شریفے کی بات کر رہی ہیں۔'' صوفی نے تیز قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''جواب دے کر جاؤ مجھے ایسے نہیں بھاگنے دوں گی؟''

''معشوق نشیلے کہاں ہیں؟''

''افیم کھانا شروع کر دی ہے بھنگی نے۔ جیسا عمل ویسے کرم اتنا غفیل ہو کر سو جاتا ہے۔ یا پھر سوچتا ہے کہ باپ کی نوکر تو حسینہ ہے۔ مجھے کیا ضرورت ہے راتوں کو جاگنے کی دیکھو صوفی جی کہے دیتی ہوں۔ کل سے اگر اتنی دیر سے آئے تو دروازہ نہیں کھلے گا۔''

''آپ آرام فرمایا کریں میں دیوار کود کر آ جایا کروں گا۔''

''ارے ارے دماغ خراب ہوا ہے کیا۔ چوروں کو راستہ دکھاؤ گے۔ تم دیوار کودو گے تو دوسرے بھی دیکھیں گے اور سوچیں گے کہ بھلا یہ دیوار کودنا کون سا مشکل عمل ہے۔''

''آپ نے پکایا کیا ہے آج۔''

''کچھ نہیں ہے اس وقت کھانے کے لیے۔''

''نہیں میں اپنے کھانے کے لیے نہیں پوچھ رہا۔ میرا مطلب ہے جب بھی آپ ایسی کوئی سخت چیز کھا لیتی ہیں۔ جو معدے پر گراں ہو جاتی ہے تو آپ کی باتیں اتنی ہی کڑوی ہو جاتی ہیں۔ جائیے آرام سے سو جائیے۔''

''ہاں، ہاں اب تو بھلا نیند آئے گی مجھے خود تو جا کر مر جاؤ گے اور مرے ہوئے بھینسے کی طرح خراٹے لو گے۔ میں جاگتی رہوں گی۔''

''آپ کی اطلاع کے لیے مرا ہوا بھینسا خراٹے نہیں لیتا درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے

کہا اس نے کمرے کے اندر چھلانگ لگائی اور دروازہ اس طرح بند کرلیا جیسے کسی بلا کے گھس آنے کا خدشہ ہو۔ بلا خاصی دیر تک دروازے پر تعینات رہی تھی اور اس کے بعد ہلتی جلتی چلی گئی تھی۔ لیکن صوفی بہت دیر تک خاموش بیٹھا اس کاغذ کو دیکھتا رہا تھا جس پر RK099 لکھا ہوا تھا۔"

روز املیسی نکل گئی تھی لیکن جمشید مرزا وہاں کیا کررہا تھا لازمی بات ہے کہ روز املیسی نے اسے کہیں سے اغوا کرایا ہوگا۔ وہ جمشید مرزا سے کیا معلومات حاصل کررہی تھی۔ صوفی کو دس پرسنٹ اس بات کا شبہ تھا کہ ہوسکتا ہے جمشید مرزا اس سے رجوع کرنے کی کوشش کرے۔ وہ یہ سوچ رہا کہ اگر جمشید مرزا نے اس سے رابطہ قائم نہ کیا تو وہ خود جمشید مرزا سے رجوع کرے گا۔ طریقہ کار دریافت کرلینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

♥......♥......♥

کرنل رحیم شاہ نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اس کی بیٹی رائنا، اس قدر شاندار شخصیت کی مالک نکل سکتی ہے۔ وہ خود ایک مہم جو آدمی تھا فوجی زندگی میں اس نے صرف لگے بندھے اصولوں پر کام نہیں کیا تھا بلکہ ملکی مفاد کے لیے جہاں بھی اسے اپنا انداز تبدیل کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ وہاں وہ کسی ہدایت کا انتظار نہیں کرتا تھا۔ بلکہ اپنا کام کرڈالتا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس سلسلے میں وہ تمام تر فوجی اصولوں کا خیال رکھتا تھا اور اپنے اعلیٰ افسران سے بھرپور تعاون کرتا تھا۔ گرین فورس کی تشکیل کے وقت جب اسے اپنے خاندان کے کسی فرد کی اس معاملے میں شمولیت کی ضرورت پیش آئی تو اس نے عادل اور فیضان کو سامنے کر دیا۔ کیوں کہ یہ لڑکے کافی ایکٹیو تھے لیکن گرین فورس میں رہ کر انہوں نے کوئی ایسا کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ جو قابل ذکر ہوتا۔ البتہ صوفی نے انہیں بہت سے معاملات میں استعمال کیا تھا۔ لیکن صرف اس خیال کے تحت کہ وہ کرنل رحیم شاہ کے متعین کردہ لوگ تھے۔ لیکن رائنا نے پہلی بار کرنل رحیم شاہ کو اپنی افادیت کا احساس دلایا تھا اور کرنل رحیم شاہ جو وطن کی محبت اور جنون کا درجہ رکھتا تھا رائنا کو اجازت دے چکا تھا اور جہاں تک رائنا کا تعلق ہے وہ بس ایک فوجی کی بیٹی تھی۔ اس کی رگوں میں باپ کا خون سیماب بن چکا تھا۔ ورنہ اس کی کوئی باقاعدہ تربیت نہیں ہوئی تھی البتہ اپنے باپ کے کارناموں سے اسے عشق تھا اور اپنی یہ ذمے داریاں سرانجام دیتے ہوئے وہ ایک جذبہ ایک نظریہ رکھتی تھی کہ ڈسک کو ہر حالت میں صوفی تک پہنچانا ہے۔ خود کرنل رحیم شاہ کو بھی پانچ فیصد اس بات کا شبہ نہیں تھا کہ وہ لوگ جن کا تعلق اس ڈسک سے تھا اتنے برق رفتار اور فعال ہوں گے کہ فوراً ہی رائنا کے پیچھے چڑھ دوڑیں گے۔ کرنل کی بیٹی جس طرح اپنے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ وہ ناقابل یقین سی بات تھی۔ لیکن بہرحال وہ بڑی خوش اسلوبی سے اپنے دشمنوں کو شکست دے کر اپنا کام کررہی تھی اس نے جو طریقہ کار اختیار کیا تھا وہ ہی بے مثال تھا۔ سمعیہ وزیر علی کا سہارا پکڑ کر وہ مصر پہنچ گئی تھی تاکہ اگر ڈسک کے متلاشی اس کا تعاقب بھی کریں تو یہ نہ سمجھ پائیں کہ وہ کہاں جارہی ہے اور حیران کن طریقے سے وہ لوگ بہرحال رائنا تک پہنچ گئے تھے۔ یہ ان کی ذہانت کی دلیل تھی۔ لیکن رائنا نے انہیں کچھ لمحوں کے لیے چکرا دیا تھا۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ بعد میں اسے کافی کام کرنا پڑا تھا اور اب اس کے اندر ایک انوکھا اعتماد بیدار ہوچکا تھا۔

چنانچہ رات کی ہنگامہ آرائیوں کے بعد وہ اور زیادہ نڈر ہوگئی تھی۔ سمعیہ وزیر علی سے رابطہ تو اب مناسب بھی نہیں تھا۔ اسے جو کچھ کرنا تھا خود ہی کرنا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ یہاں تک پہنچنے میں کامیاب تھی۔ لیکن اب ذرا صورت حال کا صحیح طریقے سے جائزہ لینا پڑے گا۔ قدرت نے بہرحال اس لڑکی کے اندر بے پناہ صلاحیتیں بیدار کردی تھیں۔ چنانچہ دوسرے دن وہ پورا دن ہوٹل میں رہی البتہ دوپہر کو تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلی تھی اور باہر سے کچھ خریداریاں کرڈالی تھیں۔ خاص طور پر لباس وغیرہ کا معاملہ اور یہ لباس اسے ہوٹل کے پچھلے حصے میں ایک شاندار ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے حاصل ہوگئے تھے۔ جہاں سے اس نے خاصی خریداری کرڈالی تھی۔ یہ ہوٹل فی الحال اس کے لیے انتہائی محفوظ جگہ تھی۔ پھر رائنا نے ایک جدید ترین لباس زیب تن کیا۔ کرنل کے گھر کا ماحول بالکل درمیانہ تھا اہل خاندان لباس وغیرہ کے معاملے میں خاصی احتیاط برتا کرتے تھے۔ خاندان کے نوجوان لڑکے لڑکیاں بے شک اپنے طور پر زندگی گزارنے کے خواہش مند تھے لیکن کرنل کے مزاج کو سامنے رکھ کر ہر شخص اپنے طور پر محتاط رہتا تھا۔

بہرحال رائنا نے جو لباس پہنا تھا وہ کرنل کے گھریلو مزاج کی چیز نہیں تھی۔ البتہ اس لباس میں بہت خوبصورت نظر آرہی تھی۔ بالوں کا اسٹائل وغیرہ بھی اس نے چینج کرلیا تھا اور اس کے بعد وہ باہر نکل آئی۔ مصر کے حسین مناظر نگاہوں کے سامنے تھے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں سیر و تفریح میں مصروف تھے مصر کی لڑکیوں کے بارے میں پہلے بھی سن رکھا تھا کہ حسین ترین ہوتی ہیں۔ جب کہ مرد اس قدر خوبصورت نہیں تھے۔ دیدہ زیب دکانیں اور اسٹور پھیلے ہوئے تھے۔ جن کے شوکیسوں میں نرم چمڑے کی مصنوعات چینی اور شیشے کے بنے ہوئے برتن، سلک کی ٹائیاں اور دوسری بہترین اشیا نظر آرہی تھیں۔ کافی دیر تک وہ اطراف میں گھومتی رہی اور پھر اپنے ہوٹل واپس چل پڑی۔ ہوٹل بہت شاندار نہیں تھا لیکن رات کی تفریحات کے سلسلے میں غالباً بہت مشہور تھا کیوں کہ اس وقت اس کے ہال میں تقریباً تمام میزیں بھری ہوئی نظر آرہی تھیں۔

بھانت بھانت کے لوگ موجود تھے۔ کمرے کے لحاظ سے اس کے لیے کوئی چیز بھی مخصوص نہیں تھی۔ لیکن بہرحال وہ ایک میز کی جانب بڑھ گئی۔ جہاں ایک خوب صورت لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس لیے اس طرف نہیں بڑھی تھی کہ لڑکی اس کو بیٹھنے کی آفر کردے لیکن اس نے فوراً ہی مسکراتے ہوئے ہیلو کہا اور رائنا اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"تم غالباً میز کی تلاش میں نگاہیں دوڑا رہی ہو۔"

"ہاں۔ حالانکہ کہ میرا قیام اسی ہوٹل میں ہے۔ لیکن مجھے میز نظر نہیں آرہی۔"

"آؤ...... میرے پاس بیٹھو میرا نام نامیلا ہے۔" نامیلا سلام۔" لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا او

رائنا نے اسے ہیلو کہا اور بولی۔

"اور میں رائنا ہوں۔"

"بیٹھو پلیز۔"

رائنا کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی اور نامیلا کا جائزہ لینے لگی۔ مقامی لڑکی تھی۔ چہرہ بے حد دلکش لیکن اس میں ایک مردانہ پن سا نظر آرہا تھا اور یہ مردانہ پن بھی اس کی کشش میں اضافہ کررہا تھا۔ وہ کہنے لگی۔

"سیاح ہو؟"

"ہاں۔ قاہرہ کی قدیم تاریخ کی دیوانی۔"

"ہاں قاہرہ کیا پورا مصر زمانہ قدیم کی خوبصورت کتاب کی مانند ہے اور اس کی خوبصورت راتیں بے حد حسین۔"

"اسی ہوٹل میں قیام ہے؟"

"ہاں۔"

"اگر میں تمہیں ایک میزبان کی حیثیت دینا چاہوں تو۔"

"تم میری میزبان ہی ہو نامیلا! مصر تمہارا ہے اور میں مصر میں اجنبی۔" رائنا نے بڑے محتاط انداز میں آغاز کیا۔

"تنہا ہو!"

"ہاں یہی سمجھ لو۔ کچھ ساتھی ہیں لیکن ہم لوگ اپنے اپنے طور پر الگ الگ سیاحت کر رہے ہیں۔"

"ویری گڈ...... آرکسٹرا موسیقی بکھیرنے لگا تھا اور ایک مصری رقاصہ مخصوص بیلے رقص کا مظاہرہ کرتی ہوئی اسٹیج پر آ گئی تھی۔ بہرحال یہ ایک اچھا وقت تھا جو گزر رہا تھا۔ رائنا نے ابھی تک ان میں سے کسی شخص کو اپنے قریب نہیں دیکھا تھا اور یہ اندازہ بھی بالکل درست تھا کہ نامیلا کی قربت اس کے لیے فائدہ مند ہو سکتی تھی۔ پھر نامیلا نے کھانا وغیرہ طلب کر لیا اور رات کو تقریباً ایک بجے تک اس کے ساتھ رہی۔ رائنا بھی اٹھنا نہیں چاہتی تھی اسے یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ سمعیہ وزیر علی سے اس نے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا تھا کیوں کہ اسے خدشہ تھا کہ وہ لوگ اردگرد بکھرے ہوں گے اور یہ سوچ رہے ہوں گے کہ رائنا یقینی طور پر سمعیہ وزیر علی تک پہنچنے کی کوشش کرے گی۔ پھر تقریباً ایک بجے نامیلا اٹھ گئی۔ اس نے بل ادا کیا تو رائنا نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ نامیلا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم نے مجھے مصر میں اپنا میزبان تسلیم کیا ہے۔ کیا سمجھیں۔" رائنا کچھ نہیں سمجھ سکی تھی ممکن ہے وہ اس رائنا کی طرح کوئی شخصیت ہو یا پھر وقت سے اکتائی ہوئی کوئی لڑکی جس نے میرا ساتھ غنیمت سمجھا۔ بہرحال وہ دوسرے دن آنے کی بات کہہ کر گزر گئی تھی اور رائنا اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

وہ اعصابی طور پر اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوششوں میں مصروف تھی اور اس میں اسے کافی حد تک کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔ لیکن اب جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اس کے اندر ایک اعتماد ابھرتا جا رہا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ حالات کچھ بھی ہوں۔ وہ ڈسک صوفی تک پہنچا کر رہے گی ہاں یہ الگ بات ہے کہ اس میں تھوڑا سا گھماؤ پھراؤ اختیار کرنا پڑ جائے گا۔ ویسے بھی مصر آنے کے بعد اسے سمعیہ وزیر علی سے الگ ہو جانا تھا اور اپنے طور پر وہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی تھی۔ رات پرسکون گزری دوسرے دن وہ دوپہر تک ہوٹل میں گھسی رہی۔ ویسے ہوٹل بڑے پررونق علاقے میں واقع تھا اس دوران اسے نامیلا بھی یاد نہیں رہی تھی لیکن ٹھیک تین بجے دروازے پر دستک ہوئی اور پھر نامیلا ایک خوبصورت لباس میں اس کے پاس پہنچ گئی۔ رائنا اسے دیکھ کر چونک پڑی تھی۔ نامیلا آج کل سے زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔ اس نے بڑے پرتپاک انداز میں رائنا کو پیار کیا اور بولی۔

"تیار ہو جاؤ۔ ہمیں گھومنے چلنا ہے۔"

"ابھی۔"

"تو کیا ہرج ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد سہی۔" وہ اپنے لمبے ناخنوں سے ہتھیلی کھرچتے ہوئے بولی اور رائنا اٹھ کھڑی ہوئی۔ غسل خانے میں جانے کے بعد اس نے لباس تبدیل کیا اور کچھ لمحے سوچا اور پھر یہ فیصلہ کیا کہ ہوٹل میں محصور رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ نامیلا مقامی عورت ہے ہو سکتا ہے وہ مصر سے نکالنے میں اس کی مدد کرے۔ لیکن یہ اسی وقت کی بات تھی جب اس کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزارا جائے۔

بہرحال کافی دیر تک وہ ساتھ بیٹھے رہے اور اس کے بعد ہوٹل سے باہر نکل آئیں۔ نامیلا نے کہا۔

"آؤ تھوڑی سی چہل قدمی کرتے ہیں۔ اگر تم پسند کرو۔"

"ہاں...... کیوں نہیں۔" خاصی دیر تک وہ پیدل چلتی رہیں۔ مصر کے مناظر میں قدامت اور جدیدیت کا ملا جلا امتزاج تھا۔ وہ ایک خوبصورت علاقے میں پہنچ گئیں۔

جہاں قہوہ خانے نظر آ رہے تھے۔ ہری بھری بیلوں کے جھنڈ میں میزیں لگی ہوئی تھیں۔ جن پر لوگ بیٹھے کھانے پینے کی اشیاء سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہ دونوں بھی ریسٹورنٹ میں پہنچ گئیں اور نامیلا نے کھانے پینے کی کچھ اشیاء طلب کر لیں۔

بہرحال رات تک دونوں ساتھ رہیں۔ رات کا کھانا بھی ایک شاندار ریسٹورنٹ میں کھایا گیا۔ پتا نہیں نامیلا کیا شے تھی۔ مالی طور پر مطمئن محسوس ہوتی تھی۔ کیوں کہ مہنگے مہنگے بل ادا کر رہی تھی۔ پھر اس نے رائنا سے اجازت چاہی اور بولی۔

"مجھے تو آج کا دن بہت ہی خوشگوار محسوس ہوا ہے۔ پتا نہیں تمہاری میرے بارے میں کیا رائے ہے؟"

"نہیں نامیلا! میں تمہاری بڑی شکر گزار ہوں۔"

"ہوں...... بات شکر گزاری کی نہیں ہے یہ رکھو۔" اس نے پراسرار انداز میں کہا اور پھر اپنا پرس کھول کر ایک چھوٹا سا کارڈ نکالا اور رائنا کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"تمہارا کارڈ ہے؟"

"اگر تم سمجھ دار ہو تو اس میں تمہارے لیے بہت کچھ ہے۔ اوکے۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے مڑی اور آگے بڑھ گئی۔ رائنا حیرانی سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ پھر اس نے کارڈ دیکھا۔ سنہرے رنگ کے درمیان صرف ایک پتا لکھا ہوا تھا اور باقی کچھ نہیں تھا۔ رائنا حیرانی سے کارڈ کو دیکھتی رہی اس پتے کے بارے میں بھی ایک خلش کا شکار ہو گئی تھی آخر نامیلا نے یہ کارڈ اسے کیوں دیا ہے۔ وہ شدید حیران ہو گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ نامیلا بلاوجہ اس کے قریب نہیں آئی تھی۔ کوئی چکر ہے کوئی گہرا چکر وہ اپنے ہوٹل میں پہنچ گئی اور پھر اس نے اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا اور کارڈ پر نگاہیں دوڑانے لگی۔ لیکن کارڈ سے کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔

بہرحال اس کا ذہن تیزی سے کام کرتا رہا۔ قدرت نے نہ جانے اس کے ذہن میں یہ وسعتیں کہاں سے پیدا کر دی تھیں۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اپنا کام سرانجام دے رہی تھی پتا نہیں نامیلا کے الفاظ کیا معنی رکھتے تھے۔ یہ کارڈ دینا کیا حقیقت رکھتا تھا۔ بہت کچھ سوچا اس نے اور آخرکار کچھ فیصلے کیے۔ سمعیہ وزیر

علی سے ملنا تو اب بالکل بے کار سی بات تھی۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ خطرہ مول لینے والی بات تھی۔ اب کوشش کر کے مصر سے نکلا جائے۔ یہی اس کے حق میں بہتر تھا۔ اس بات کا تو اندازہ ہو چکا تھا۔ ڈسک کے متلاشی اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور انہوں نے اس کے قیام گاہ کا پتا چلا لیا ہے عارضی طور پر وہ انہیں ڈاج دینے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ لیکن مستقل طور پر کچھ کرنا ایک بہت ہی مشکل بات تھی۔

بہر حال وہ اپنے اس منصوبے پر غور کرنے لگی اس نے آخری فیصلہ کیا تھا کہ ڈسک اب اپنے پاس محفوظ کر لے اور یہاں سے نکل جانے کی کوشش کرے نامیلا کو ٹرائی کرنا بھی بہت ضروری تھا۔ دیکھنا تو چاہیے کہ آخر اس نے کون سی سمجھ داری کی بات کی ہے اور پھر دوسرے دن وہ نامیلا کا انتظار کرتی رہی اور پھر جب دوپہر تک نامیلا اس کے پاس نہیں آئی تو نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ اب اسے اس پتے پر جا کر اس سے ملاقات کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس نے تیاریاں کیں اور پھر باہر نکل آئی۔ مختلف لوگوں سے اس علاقے کے بارے میں پتا چلایا تو علم ہوا کہ اسے دریائے نیل کے دوسرے کنارے پر جانا ہوگا۔ اس طرف بھی بھرپور آبادی تھی اور ایک مخصوص حصہ اس آبادی تک جانے کے لیے محفوظ کر دیا گیا تھا۔ وہ آخر کار اس خوبصورت حصے میں پہنچ گئی۔ لکڑی کے پلیٹ فارم پر کئی سیڑھیاں اوپر تک گئی ہوئی تھیں اور یہ جگہ انتہائی حسین تھی۔ پلیٹ فارم کے کنارے کنارے درخت لگے ہوئے تھے جو پانی میں جھکے ہوئے تھے۔ وہ سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچ گئی۔ پھر اس نے ایک جگہ سے کارڈ پر لکھے پتے کے بارے میں معلوم کیا اور اس راستے پر چل پڑی۔ جہاں کا پتا دیا گیا تھا۔

کمال کی حسین ترین جگہ تھی۔ درختوں کے جھنڈ دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ زمین ایک انچ بھی خالی نہیں تھی۔ چاروں طرف سرسبز گھاس اور اس کے درمیان خوب صورت پھول اور کہیں کہیں درختوں میں چھپی ہوئی حسین عمارتیں۔ جو پتا اسے بتایا گیا تھا۔ وہ عمارت بھی کافی خوب صورت تھی۔ عمارت کے بیرونی حصے میں دو افراد کھڑے نظر آئے۔ ان کی چالوں سے ان کی قومیت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ رائنا ان کے قریب پہنچ گئی۔

''سوری سر! میں نامیلا سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''آیئے۔ ان میں سے ایک نے کہا اور رائنا کو لے کر اندر داخل ہوگیا۔ عمارت کے بیرونی دروازے سے گزرنے کے بعد رائنا ان کے ساتھ بڑے ہال میں پہنچ گئی۔ یہاں وہ دونوں رک گئے اور ان میں سے ایک جو سفید سوٹ میں ملبوس تھا رائنا کو گھورنے لگا۔

''ہاں...... لے آئیں۔'' اس نے بھاری لہجے میں کہا اور رائنا چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر حیرت کے نقوش بیدار ہوئے اور پھر اچانک ہی اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔

''میں نامیلا سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''دماغ خراب ہے تمہارا۔ نامیلا نے تمہیں یہاں کس لیے بلایا ہے کیا تم یہ بات نہیں جانتیں۔''

''دیکھو...... میں'' رائنا نے اتنا ہی کہا تھا کہ ان دونوں میں سے جو اسے یہاں تک لائے تھے ان میں سے ایک آگے بڑھا اور اس نے رائنا کے لباس پر ہاتھ ڈال دیا۔ لیکن رائنا اب ہر طرف سے ہوشیار تھی۔

ن کا الٹا ہاتھ سامنے والے شخص کے منہ پر پڑا اور وہ بری طرح الٹ گیا۔ لیکن اس کے نزدیک کھڑے شخص نے اپنی آہنی انگلیاں شکنجوں کی طرح رائنا کی گردن میں پیوست کر دیں اور رائنا اس کی گرفت سے نکلنے کی بھرپور جدوجہد کرنے لگی۔ پھر اس نے پلٹ کر کہنی اس کے پیٹ میں ماری اور یہ حربہ کارگر رہا۔ اس کی گردن ڈھیلی پڑتے ہی رائنا نے اپنی گردن چھڑا کر اس کی پیشانی پر گھونسہ رسید کر دیا اور جوں ہی نیچے گرا اس نے ایک بھرپور ٹھوکر اس کے پیٹ پر ماری۔ اس کے حلق سے بری طرح آواز نکلی تھی اور منہ سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی۔ پھر اچانک ہی پیچھے سے رائنا کے سر پر ایک زوردار ضرب پڑی اور اس کے دونوں ہاتھ فضا میں پھیل کر گئے۔ ضرب اتنی زوردار تھی کہ وہ آنکھوں کی بینائی بحال نہ رکھ سکی۔ کچھ دیر تک تارے نظر آتے رہے اور اس کے بعد شاید وہ اوندھی زمین پر آ پڑی تھی۔ ہوش و حواس نے نہ جانے کتنی دیر تک کے لیے ساتھ چھوڑا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ آنکھوں سے دھند چھٹنے لگی۔ کافی بلندی پر ایک سوراخ نظر آ رہا تھا جس سے روشنی چھن کر اندر آ رہی تھی۔ جب کہ اس کے اطراف میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ سوراخ سے چھٹنے والی روشنی ایک دیوار پڑ رہی تھی۔ رائنا نے اپنے دکھتے ہوئے سر کو پکڑ لیا اور پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ تاریکی کی وجہ سے اندازہ تو نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ کہاں ہے لیکن بہر طور اس وسیع ہال کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ بلندی سے چمکنے والے سوراخ نے مزید مدد کی تھی اور اس نے اپنے آپ کو ایک بستر پر پڑے پایا تھا۔ اس سے فاصلے پر کوئی وجود بھی تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ ادھر سے مدھم مدھم سرگوشیاں ابھر رہی تھیں۔

''یہاں کون ہے؟ کیا یہاں روشنی نہیں ہو سکتی؟'' رائنا نے چیخ کر کہا اور سرگوشیاں بند ہوگئیں۔ ں کے بعد یوں لگا۔ جیسے وہاں جو کوئی بھی تھا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ رائنا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ب کیا ہو رہا تھا مائکروچپ اس وقت اس کے پاس موجود تھی جب وہ یہاں تک آئی تھی۔ پورا قصہ ہی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نامیلا نے کارڈ دیتے ہوئے اسے کچھ کہا تھا۔ ضرور کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اسے کسی اور کے دھوکے میں پکڑا گیا ہے۔ وہ پھر زور سے چیخ کر بولی۔

''اگر کوئی ہے تو مجھ سے بات کرے میں حقیقت حال بتانا چاہتی ہوں۔'' لیکن جو کوئی بھی تھا خاموشی سے یہاں سے کھسک گیا تھا۔ رائنا نے پھرتی سے مائیکروچپ تلاش کی جو بہ دستور اس کے پاس موجود تھی۔ اس نے اطمینان کی گہری سانس لی اگر ان لوگوں نے اس کی تلاشی لینے کی کوشش کی بھی ہے تو اس کا مقصد ہے کہ ان کا تعلق اس گروپ سے نہیں ہے جو مائیکروچپ کی تلاش میں رائنا کے پیچھے آیا ہے۔ پھر یہ کون ہو سکتے ہیں؟

بہر حال مائیکروچپ موجود تھی۔ رائنا کی زندگی کا تو یہی ایک مشن تھا اور اس وقت وہ جو کچھ کر رہی تھی اگر کرنل رحیم شاہ کو بھی اس کا علم ہو جاتا تو وہ حیرت سے دنگ رہ جاتا کیوں کہ اس نے اپنی بیٹی کو اس کام کی تربیت کبھی نہیں دی تھی۔ لیکن رائنا اس وقت بہتر کارکن ثابت ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے بستر سے اٹھی اور اندازے سے دروازے کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے دروازے کو دھکیل کر دیکھا یہ حیران کن بات تھی کہ دروازہ باہر سے بند نہیں تھا۔ وہ باہر نکل آئی ایک وسیع عریض راہداری اس کے سامنے سنسان پڑی تھی۔ کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ عمارت بھی بہت زیادہ وسیع نہیں تھی۔ ویسے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی ویران

سے مقام پر واقع ہے۔ بڑی حیران کن بات تھی اسے یہاں بند کرنے والے اسی طرح چھوڑ کر چلے گئے تھے وہ باہر نکل آئی۔

ایک طرف دور دور تک قد آدم جھاڑیاں اور درخت پھیلے ہوئے تھے۔ دوسری طرف پتھریلا میدان تھا جو بتدریج بلندی کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ وہاں سے آگے بڑھ گئی اور اس بلندی کی جانب چل پڑی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور یہاں کیا کچھ موجود ہے۔ دفعتہً ہی ایک سرسراہٹ سی سنائی دی اور کوئی چیز رائنا کے سر سے صرف تین انچ کے فاصلے پر سے گزر گئی۔ رائنا کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس پر گولی چلائی گئی ہے۔ اس نے پھرتی سے جھاڑیوں میں چھلانگ لگا دی ایک بازگشت فضا میں گونج گئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ اسے مکان سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا گیا تھا۔

پھر باقاعدہ فائرنگ ہونے لگی گولیاں بارش کی طرح رائنا کے پاس سے گزر رہی تھیں اور وہ بے حس وحرکت جھاڑیوں میں لیٹی مناسب وقت کا انتظار کر رہی تھی وہ یہ سوچ رہی تھی کہ تعجب کی بات ہے کہ ان لوگوں نے دروازہ تو اس طرح کھلا چھوڑ دیا اور اس کے بعد اس قدر شدید فائرنگ کر رہے ہیں۔ پھر فائرنگ ایک لمحے کے لیے رکی تھی کہ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اچھل کر درخت کی آڑ میں چھپ گئی۔ فائرنگ دوبارہ شروع ہو گئی تھی اسے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کون لوگ ہیں۔ کہاں چھپے ہوئے ہیں ان کی تعداد کتنی ہے؟ درخت کے دوسری طرف بھی خطرہ تھا لیکن خطرہ مول لیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ غیر محسوس انداز میں ایک طرف رینگنے لگی۔ اطراف میں کانٹے دار جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ جو اس کے ہاتھوں اور پیروں پر خراشیں لگا رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد فائرنگ رک گئی اور اس نے سر ابھار کر دیکھا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک شخص رائفل سنبھالے متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا رائنا سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ لیکن پھر اچانک اس نے بھی رائنا کو دیکھ لیا اور دوسرے ہی لمحے وہ رائفل سنبھال کر رائنا کی طرف لپکا۔ جیسے ہی وہ رائنا کے قریب پہنچا۔ رائنا نے فوراً زمین پر لیٹ کر سوئپ لگا دی اور وہ اوندھے منہ زمین پر آ رہا۔ رائنا اس کی پشت پر سوار ہو گئی تھی اور اس کے بعد اس نے پوری قوت سے اس کی گردن دبا لی تھی۔ اس کے بڑے ناخنوں والی انگلیاں نیچے دبے ہوئے شخص کے نرخرے میں پیوست تھیں۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

''بتاؤ نامیلا کہاں ہے۔'' لیکن اس نے جواب دینے کے بجائے ایک بھرپور حملہ کرنے کی کوشش کی اس کا ہاتھ رائفل کے ٹریگر پر پہنچ رہا تھا۔ رائنا نے بڑی پھرتی سے رائفل پر ہاتھ ڈال دیا اور ان دونوں کے درمیان کشمکش ہونے لگی۔ پھر اچانک ہی اس نے اس کے گھٹنے پر زوردار ٹھوکر لگائی اور وہ ہلبلا اٹھا۔ رائفل پر اس کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ رائنا کو ساتھ لیے زمین پر آ گرا۔ رائفل کی نالی اس کے نرخرے کو چھو رہی تھی اور پھر گولی چل گئی اور یہ گولی اس کے نرخرے کو چھیدتی ہوئی اندر داخل ہو کر پیچھے سے نکل گئی۔ خون بری طرح اس کی گردن سے اچھل اچھل کر بہنے لگا اور وہ زمین پر تڑپنے لگا۔ چند ہی لمحات کے بعد اس کی آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ رائنا پیچھے ہٹ گئی تھی۔

بہر حال یہ سب کچھ اچھا نہیں تھا۔ یہ نہیں چاہتی تھی وہ۔ پتا نہیں یہ کون کم بخت ہے اور اب کیا ہونے والا ہے۔ لیکن پھر ایک گاڑی کی آواز سنائی دی اور وہ گاڑی برق رفتاری سے دوڑتی ہوئی اس کے

قریب آ کر رک گئی۔ گاڑی سے دو افراد نیچے اترے تھے اور انہوں نے کہا تھا۔

''اوہ...... سوری...... سوری...... سوری...... ڈیئر ایڈنا ویری سوری ہماری غلطی نے تمہیں مشکل میں ڈال دیا۔ آؤ...... ان کے انداز میں کچھ ایسی کیفیت تھی کہ رائنا صرف ایک لمحے سوچنے کے بعد ان کی جانب بڑھ گئی اور تھوڑی دیر بعد وہ اس گاڑی میں بیٹھ کر چل پڑی۔ وہ دونوں بڑے دوستانہ انداز میں اس سے پیش آ رہے تھے۔ یقیناً کوئی بہت بڑی غلط فہمی کام کر رہی تھی۔ گاڑی ایک پہاڑی راستے پر چل پڑی تھی۔ راستہ بہت دشوار گزار تھا۔ پہاڑیوں میں سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئے ایک پگڈنڈی دور تک چلی جاتی تھی۔ راستے میں جگہ جگہ پتھروں کی رکاوٹ تھی۔ رائنا خاموشی سے بیٹھی رہی اور تھوڑی دیر کے بعد گاڑی پہاڑیوں میں ایک علاقے میں رک گئی اور انہوں نے اسے نیچے اترنے کے لیے کہا۔

''پھر اونچی اونچی اور گھنی جھاڑیوں سے گزرنے کے بعد انہوں نے اسے ایک جگہ رکنے کا اشارہ کیا۔ یہاں بھی چٹانیں گھنی جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھیں اور انہی جھاڑیوں کے پیچھے اس غار کا دہانہ تھا جس میں اسے لے جایا گیا تھا۔ غار کی چھت کافی اونچی تھی اور اس میں ایک ڈھلان سرنگ کے کافی اندر تک چلی گئی تھی۔ سرنگ کے اختتام پر مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ رائنا کے ساتھ آنے والوں نے اسے یہاں رکنے کا اشارہ کیا۔ غار میں ایک ہلکی سی گونج سنائی دے رہی تھی۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ روشنی کے لیے جنریٹر استعمال کیا جا رہا تھا۔ سرنگ کے آخری سرے پر چھت سے ایک بلب لٹکا ہوا تھا جس کی روشنی میں لکڑیوں کی پیٹیوں کے انبار نظر آ رہے تھے۔ پھر وہ اندر پہنچی تو اس نے نامیلا کو دیکھا جو ایک میز کے پیچھے بیٹھی غار کے دہانے کی جانب دیکھ رہی تھی۔ نامیلا کو دیکھ کر رائنا کے انداز میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ نامیلا اسے گھورتی رہی پھر اس نے کہا۔

''تمہارا خیال تھا کہ تم چالاکی سے کام لے کر مجھے شکست دے دو گی لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔''

''نامیلا! میں جانتی تھی کہ تم دوست نہیں دشمن ہو۔ میں تو ایک سیاح ہوں اور تم نے مجھے نہ جانے کیا سے کیا بنا ڈالا ہے۔'' پھر نامیلا اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور اس نے ان لوگوں سے کہا۔

''تم جاؤ میں اس سے معلومات حاصل کر لوں گی۔'' وہ لوگ چلے گئے تو نامیلا نے کہا۔ ''ہوں...... اب بتا دو کیا صورت حال ہے؟''

''نامیلا! پلیز تم صرف ایک کام کرو۔ میرے بارے میں پہلے معلومات حاصل کر لو۔ ہو سکتا ہے بعد میں تمہیں میرے ساتھ یہ سلوک کر کے افسوس ہو میں ایک بے ضرر سی شخصیت ہوں۔ تم یقینی طور پر کسی غلط فہمی کا شکار ہو۔''

''غلط فہمی...... اور میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ تم اس قدر گریز کیوں کر رہی ہو۔ دیکھو ہم لوگ تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ تم اگر ہم سے تعاون کرو گی تو تمہیں ہی فائدہ ہو گا۔''

''ٹھیک ہے۔ اب ایسا کرو پہلے تم میرے بارے میں معلومات حاصل کر لو۔ اگر تم مجھ پر تشدد کرو گی تو اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔''

''دیکھو ڈئیر! اگر تم ہمارا مسئلہ حل کر دو......تو ہم تمہیں یہاں سے روانہ کر دیں گے اور تم ایک اور ملک چلی جاؤ گی۔''

''ہاں ذرا یہ سوچنے کی بات ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ تمہارا مسئلہ کیا ہے۔''

''تم ایسے نہیں مانو گی۔چلو ٹھیک ہے تم آرام کرو ہم دیکھیں گے کہ تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ یہ کہہ کر نامیلا اس غار سے باہر نکل گئی۔ رائنا کو اسی طرح چھوڑ دیا گیا تھا اور وہ لوگ یقینی طور پر اب کوئی نیا منصوبہ ترتیب دینے کے لیے چلے گئے تھے۔ پھر نہ جانے کتنا وقت رائنا کو اس غار میں گزارنا پڑا۔ یہ اندازہ تو اسے ہو گیا تھا کہ معاملہ کم از کم ڈسک کا نہیں ہے۔کوئی اور ہی چکر ہے اور اس بات سے وہ خاصی مطمئن تھی۔ نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا کہ ایک بار پھر باہر فائرنگ کی زبردست آواز سنائی دینے لگی اور رائنا نے سر پکڑ لیا۔ وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑائی۔

''جو کام آپ کرتے رہیں نا ڈیڈی! مجھے پہلے اس کا صحیح طور سے اندازہ نہیں تھا میں سمجھتی تھی کہ میں ایک زبردست مہم جو لڑکی ہوں۔لیکن حقیقت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ جو آہستہ آہستہ میری سمجھ میں آ رہی ہے۔'' فائرنگ کافی دیر تک ہوتی رہی پھر چند افراد چہرے پر نقاب لگائے اندر گھس آئے اور ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا۔

''سوری ایڈنا! تمہیں واقعی تکلیف اٹھانی پڑی ہے لیکن بے فکر رہو ہم قاہرہ چھوڑ رہے ہیں اور فوری طور پر ہمیں یہاں سے نکل جانا ہے چلو آؤ جلدی کرو۔ یہ کہہ کر وہ غار کے ایک اور دہانے کی طرف چل پڑے۔ جس کے بارے میں یقینی طور پر انہیں معلومات حاصل تھیں۔ رائنا نے اس وقت یہی مناسب سمجھا تھا کہ ایڈنا بنی رہے۔ وہ خاموشی سے ان کے ساتھ غار سے باہر نکل آئی۔

♥......♥......♥

دورازہ معشوق نشیلے نے کھولا تھا۔ بڑے اچھے موڈ میں معلوم ہوتا تھا۔ جمشید مرزا کو دیکھتے ہی اس نے ایک قلقاری ماری اور آسمان کی طرف منہ کر کے بولا۔

''خدا شکر خورے کو شکر ہی دیتا ہے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے مرزا جی! بڑے عرصے کے بعد ایک شعر تولد ہوا ہے۔ اس کالی مائی کلکتے والی کو شعر سنانے کے مقصد یہ ہے کہ انسان اپنا ہی سر پیٹ لے خدا سے مانگ رہا تھا کہ معبود کریم بھیج کسی کو کوئی تو سننے والا مل جائے۔ سو مرزا جی آپ آ گئے۔ دیکھئے برا نہ مانیے شاعر کی سب سے بڑی تکلیف یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی شعر اس پر نازل ہو جائے تو اسے سنا دے۔ فارسہ میں کہا ہے۔

''سنو! میں تمہارے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کرنا چاہتا۔ جاؤ صوفی صاحب کو اطلاع دو۔ کہ میں آیا ہوں۔'' جمشید مرزا نے سنجیدہ لہجے میں کہا اور معشوق نشیلے کا چہرہ اتر گیا۔ گویا آپ بھی شعر نہیں سنیں گے۔''

''میں تمہیں چرس فروشی کے الزام میں گرفتار کر لوں گا اور کم از کم ایک مہینے تک تمہاری ضمانت نہیں ہونے دوں گا اور اس ایک مہینے میں تمہیں کھانے میں صرف بھوسی ٹکڑے دیے جائیں گے۔ بولو تیار ہو اس کے لیے۔''

''نہیں جناب! معافی چاہتا ہوں تشریف لے آیئے۔'' معشوق نشیلے کو یہ سودا کافی مہنگا معلوم ہوا

پھر عقب سے حسینہ کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔

''اللہ تمہیں خوش رکھے مرزا جی! جی خوش کر دیا ارے صورت حرام کو دیکھو مفت کے ٹکڑے توڑتا ہے اور اوپر سے اس پر شاعری ٹپکتی رہتی ہے۔ خدا غارت کرے اسے اور اس کی شاعری......'' جمشید مرزا جانتا تھا معشوق نشیلے تو قابو میں آ جانے والی چیز ہے۔ لیکن حسینہ دو منٹ میں عزت اتار کر رکھ دیتی ہے۔ معشوق کو بھی صوفی کبھی تھانے نہیں جانے دے گا اور حسینہ...... وہ آگے بڑھا اور بولا۔

''حسینہ بی بی! کیسے مزاج ہیں آپ کے۔''

''ایں......'' حسینہ کو اس قدر مہذب الفاظ پہلی بار سننے کو ملے تھے کوئی اس سے اس کے مزاج پوچھ رہا تھا۔ اس نے مشتبہ نگاہوں سے جمشید مرزا کو گھورا اور بولا۔

''آ رہے ہیں۔ ڈگڈگی کی کسر باقی رہ گئی ہے باقی تو شکل سے ہی بندر نچانے والے معلوم ہوتے ہیں۔ آؤ بیٹھو! چائے پلاؤں گی تمہیں۔ جی خوش کر دیا ہے ارے صبح سے میرے پیچھے لگا ہوا ہے شعر سن لو، شعر سن لو تم ہی بتاؤ مرزا جی میری شعر و شاعری کی عمر ہے۔''

''خیر عمر کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے حسینہ جی! لیکن کم از کم معشوق نشیلے کا اشعار سننا بڑے جگر کی بات ہے۔ آپ بلاوجہ اپنی عمر کے بارے میں غلط فہمی کا شکار رہتی ہیں۔ اتنی زیادہ عمر بھی نہیں ہے آپ کی۔''

''چائے لاتی ہوں۔'' حسینہ نے کہا اور غڑاپ سے اندر داخل ہو گئی۔ معشوق نشیلے بری بری نگاہوں سے جمشید مرزا کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

''اچھا تو نہیں ہے یہ سب کچھ مرزا جی؟''

''دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں تمہاری ٹھکائی کر دوں گا جاؤ باہر نکلو یہاں سے۔'' جمشید مرزا خاصا بددماغ پولیس آفیسر تھا۔ عہدہ بھی معمولی نہیں تھا۔ اچھے اچھوں کے دماغ درست کر کے رکھ دیا کرتا تھا۔ لیکن اس گھر میں آتے ہوئے اسے اپنی آبرو خطرے میں نظر آتی تھی۔ یہ دونوں اور پھر اوپر سے صوفی...... مگر کیا کرتا جو کام پڑا تھا اس کی کوئی باقاعدہ رپورٹ تو نہیں تیار کر سکتا تھا۔ اس سلسلے میں صوفی ہی مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ صوفی کی طرف دوڑا چلا آیا تھا۔ معشوق نشیلے تو باہر نکل آیا۔ حسینہ سے چونکہ اس نے بڑی اچھی باتیں کہی تھیں خاص طور سے اس کی عمر کے بارے میں حسینہ متاثر ہو گئی۔ چائے کے ساتھ بھنے ہوئے کاجو اور بسکٹوں کا ایک پیکٹ بھی تھا جو پلیٹ میں کھول کر رکھ دیا گیا تھا۔

''ارے حسینہ! اتنا تکلف کیوں کرتی ہیں آپ میں تو شرمندہ ہو جاتا ہوں۔ آپ کا یہ اخلاق دیکھ کر۔''

''مرزا جی! آج تو ایسی دل لبھانے والی باتیں کر رہے ہو کہ حیرت ہو رہی ہے ورنہ تو پہلے تمہاری زبان پر بھی مرچیں ہی لگی رہا کرتی تھیں۔''

''دراصل میں حسینہ بیگم، پولیس کی نوکری کرتا ہوں۔ طرح طرح کے لوگوں سے الجھنا پڑتا ہے کبھی کبھی دماغ صحیح نہیں رہتا۔ اگر کبھی میرے منہ سے کوئی غلط بات نکل گئی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔''

''ارے نہیں اب ایسا بھی کیا۔ بلا کر لاتی ہوں صوفی کو۔''

''بتا دیا ہے آپ نے۔''

''نہیں کچن میں چلی گئی تھی تمہارے لیے چائے بنانے۔'' حسینہ نے کہا اور باہر نکل گئی کچھ ہی لمحوں کے بعد دروازے سے آواز ابھری۔

''ایک پیالی چائے فالتو ہو تو میں اندر آ جاؤں مرزا جی؟'' معشوق نشیلے کی آواز تھی۔ جمشید مرزا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر شاید پیچھے سے صوفی یہاں آ گیا تھا۔ معشوق نشیلے کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ صوفی اندر آ گیا تھا۔

''حق اللہ...... حق اللہ...... ایس پی صاحب فرمایئے کیسے مزاج ہیں آپ کے، واہ چائے پی رہے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے لگتا ہے حسینہ بیگم کو کوئی تحفہ دے ڈالا ہے آپ نے ورنہ اتنی جلدی آپ کو چائے نہ پیش کر دیتی۔''

''بھئی صوفی صاحب! آپ کے گھر کو ہمیشہ اپنا ہی گھر سمجھتا ہوں اور بے دھڑک چلا آتا ہوں۔ میرے ساتھ تو کم از کم ان تمام لوگوں کا رویہ برا نہیں ہے اور میں اس کی وجہ بھی آپ ہی کو سمجھتا ہوں۔''

''درویش رحم کریں۔ کوئی گمبھیر معاملہ معلوم ہوتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' جمشید مرزا نے کاجوؤں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''مطلب یہ کہ لہجے کی شیرینی کچھ اور ہی کہانی سنا رہی ہے۔ خیر خدمت بتایئے۔''

''چائے نہیں پئیں گے آپ۔''

''ناشتا کر چکا ہوں اور اب دوپہر تک چائے کی حاجت نہیں ہوگی درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''صوفی صاحب! بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے اختلاف تو خیر رکھا ہی نہیں جا سکتا۔ ہاں کچھ چھیڑ چھاڑ جاری رکھنے میں مزہ آتا ہے جیسے آپ۔ لیکن وقت پر بھی وہی کام آتے ہیں۔ خاص طور سے میں تو اس بات کا بڑا معترف ہوں کہ صوفی صاحب میری گرتی ہوئی ساکھ کو آپ نے کئی بار سنبھالا ہے۔''

''حق اللہ، حق اللہ، حق اللہ۔'' صوفی نے تین بار کہا۔

''اور جب بھی کوئی مشکل پیش آتی ہے۔ میں سیدھا آپ کے پاس دوڑا چلا آتا ہوں۔''

''کس مشکل کا شکار ہیں عزیزی! ارشاد فرما دیجئے گا۔''

''ایک واقعہ پیش آ گیا ہے میرے ساتھ۔''

''اچھا......'' صوفی دانت نکال کر بولا۔

''جی براہ کرم سنجیدگی سے سنیے۔ ہر انسان تھوڑی بہت تفریح تو کرتا ہی ہے زندگی میں، ساحل سمندر کے ایک ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے ایک خاتون نظر آئیں۔''

''ہائے ہائے۔'' صوفی نے عجیب سے انداز میں کہا۔ جمشید جانتا تھا وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے لیکن صورت حال ایسی ہی تھی کہ اسے ہر بات برداشت کرنی تھی۔

''غیر ملکی عورت تھی۔''

''تین دفعہ ہائے۔'' صوفی نے کہا۔

''اچھے نقوش کی مالک۔ صوفی صاحب اس بات کا اعتراف آپ کے سامنے پہلے بھی کر چکا ہوں

...ھوڑا سا حسن پرست واقع ہوں۔ اچھے چہرے میری کمزوری ہیں۔ ان خاتون کی خاص توجہ دیکھی تو ان کی ...متوجہ ہو گیا اور اب تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں ساتھ تھے۔ خاتون نے اپنا نام کیلس بتایا تھا اور آمد ...ت کی غرض سے...... پھر کافی دیر تک ہم لوگ اپنے وطن کے پر فضا مقامات کے بارے میں بات کرتے ...ہے۔ خاتون نے مجھ سے کہا کہ وہ میرے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتی ہے۔ میں نے اپنی اصل حیثیت تو ...ں بتائی تھی۔ لیکن وہ مجھ میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہی تھی اور اس کے بعد ہم لوگ وہاں سے اٹھ گئے اور ...ل پر چہل قدمی کرنے لگے وہ جان بوجھ کر مجھے ایک ویران سے حصے میں لیتی چلی گئی۔ مجھے یہ اندازہ ہو رہا ...کہ وہ ایک بے باک اور جلد باز خاتون ہیں۔ لیکن اس وقت میرے ہوش و حواس جاگے جب چار آدمی ایک ...ڑی چٹان کے عقب سے باہر نکل آئے اور انہوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میری ناک پر کلوروفارم کا رومال رکھا ...یا اور میں ہوش و حواس سے عاری ہو گیا۔ پھر اس کے بعد مجھے ہوش آیا تو میں کسی عمارت میں تھا اور کرسی سے ...رھا ہوا تھا ان خاتون نے مجھ سے جو سوال کیا۔ اس سے میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

''حق اللہ......''

''آپ کچھ بھی کہیں اس وقت میں آپ کی کسی بات کا برا نہیں مانوں گا انہوں نے مجھ سے پوچھا ...کہ کرنل رحیم شاہ جو ایک ریٹائرڈ فوجی ہے اور اس وقت ملک سے باہر ایک خطے میں زندگی گزار رہا ہے اس کی ...رائنا یہاں آئی ہے میں اس کے بارے میں ضرور جانتا ہوں چونکہ کرنل رحیم شاہ کا مجھ سے تعلق رہا ہے اور ...ی معاملات میں، میں اور کرنل رحیم شاہ منسلک رہے ہیں جب کہ ایسی بات نہیں صوفی صاحب! غالباً یہ ...طلاع انہیں آپ کے بارے میں ملی ہوگی۔ ہاں میرا آپ سے ضرور رابطہ رہا ہے۔ ممکن ہے اسی واسطے سے ...ہوں نے مجھے اغوا کیا ہو۔ کرنل رحیم شاہ کی بیٹی رائنا کے بارے میں وہ پوری تفصیل جاننا چاہتی تھی میں نے ...ب انکار کیا تو اس نے کہا کہ وہ میری کھال ادھیڑ کر رکھ دے گی۔ صوفی صاحب کئی بار یہ عمل دوہرایا گیا رات ...کو پھر وہی عمل دوہرایا جا رہا تھا کہ کچھ پراسرار کردار وہاں پہنچ گئے خاص طور پر ایک نقاب پوش۔ جس نے ...یری بندشیں کھولیں۔ باہر فائرنگ بھی ہوئی۔ اس کے بعد اس نقاب پوش نے مجھ سے بھاگ جانے کے لیے ...کہا اور میں اس عمارت سے باہر نکل آیا۔ صوفی صاحب عمارت ہیری لائن کے علاقے میں ہے اور کرائے پر ...حاصل کی گئی تھی۔ عمارت حاصل کرنے والے غیر ملکی تھے۔ عمارت ایک پراپرٹی ڈیلر کے قبضے میں تھی اور چند ...روز قبل اسے حاصل کیا گیا تھا۔ یہ ایک ایسے آدمی کا مکان ہے جو ملک سے باہر رہتا ہیں۔ پراپرٹی ڈیلر اپنے ...ور پر اس عمارت کو کرائے پر اٹھاتا ہے مگر مستقل طور پر نہیں۔ بلکہ عارضی طور پر اس نے اسے گیسٹ ہاؤس ...ٹائپ کی چیز بنا رکھا ہے۔ یہ صورت حال ہے۔ صوفی صاحب میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا ہے اور جب کوئی ...ت میری سمجھ میں نہیں آتی تو میں سیدھا آپ کی طرف دوڑا چلا آتا ہوں اور اس کے علاوہ کرنل رحیم شاہ سے ...آپ کا گہرا رابطہ رہا ہے اس بات کے بھی امکانات ہیں کہ آپ کو کرنل صاحب کی بیٹی کی آمد کے بارے میں ...علم ہو۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ یہ بات آپ کے کانوں تک پہنچا دوں اور آپ سے مشورہ بھی کر لوں کہ مجھے ...کندہ کیا کرنا چاہیے۔

''بابا پیر ڈھکن شاہ عرف جلیلی کے بارے میں کچھ جانتے ہو۔''

"نہیں......مزارات اور بزرگوں کے بارے میں میری معلومات بڑی محدود ہیں۔"

"اسی لیے تمہاری ترقی بھی محدود ہے خیر ان کے بارے میں معلوم کرو گے تو پتا چل جائے گا۔ ساڑھے چودہ دن اور ڈھائی رات چلہ کشی کرنی ہوگی وہاں اس کے بعد سمجھو کہ تمہارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ حق اللہ۔"

"گویا آپ ٹال رہے ہیں مجھے۔"

"اماں کماں کرتے ہو۔ پتا نہیں تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے درویشوں کی دعاؤں سے میرے پاس کوئی جام جمشید ہے کہ اس میں ہر چیز کو دیکھ لوں۔ چھوڑو یار! نام ہے جمشید مرزا اور معلومات کچھ بھی نہیں ہے۔"

"صوفی صاحب! آپ دیکھ لیجیے سوچ لیجیے۔ میرا فرض تھا کہ میں آپ کو کرنل رحیم شاہ کے بارے میں اتنی تفصیل بتا دوں۔ بہرحال چائے اور ان لوازمات کا بے حد شکریہ ہو سکتا ہے مجھے دوبارہ اغواء کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس وقت بہ حالت مجبوری میں ان خاتون کو یہ بتا دوں گا کہ کرنل رحیم شاہ کا گہرا تعلق جس شخص سے ہے اس کا نام صوفی ہے۔ اجازت۔" جمشید مرزا کا خیال تھا کہ صوفی بے اختیار ہو کر اسے روکے گا۔ لیکن صوفی نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور اس کا ہاتھ لباس میں پانوں کی ڈبیہ تلاش کرنے لگا۔

جمشید مرزا منہ بناتا ہوا باہر نکل گیا۔

♥......♥......♥

ان لوگوں نے خاصا فاصلہ پیدل طے کیا تھا اور اس کے بعد ایک کار کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ کار کے پیچھے ایک لینڈ کروزر کھڑی ہوئی تھی۔ یہ دونوں گاڑیاں غالباً ان ہی کی تھیں دو افراد آگے آئے اور انہوں نے رانا کو کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اس کے بعد دونوں اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور کار چل پڑی۔ بہت دیر تک وہ طویل اور تاریک راستوں پر دوڑتی رہی تھی اور اس کے بعد رات کے نہ جانے کون سے حصے میں وہ شہری آبادی میں داخل ہوئی تھی پھر اس کے بعد ایک خوبصورت رہائش گاہ میں وہ لوگ رانا کے ساتھ بہت خوش اخلاقی سے پیش آ رہے تھے اسے اندر لے جایا گیا۔ عمارت زیادہ وسیع نہیں تھی لیکن خوبصورت طرز تعمیر کا نمونہ تھی۔ رانا کو کمرے میں لایا گیا اور ان میں سے ایک نے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"فی الحال آپ کو صرف آرام کرنا چاہیے۔ صبح کو میڈم آپ سے ملاقات کریں گی۔" یہ کہہ کر وہ واپس چلے گئے اور رانا کمرے میں چاروں طرف دیکھنے لگی کمرا بہت مختصر اور آرام دہ تھا۔ اٹیچ باتھ بھی تھا۔ بہرحال اس میڈم کے بارے میں کچھ معلومات حاصل نہیں تھیں۔

رانا ایک کرسی پر بیٹھ کر حالات پر غور کرنے لگی۔ کوئی بہت بڑی غلط فہمی کام کر رہی تھی ویسے اچھی بات تھی کہ معاملہ ڈسک کا نہیں تھا یہ دونوں پارٹیاں یا گروہ جو کچھ بھی تھے ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو ڈسک کی وجہ سے رانا کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ یہ تمام سوالات اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ بہرحال ہمت نہیں ہارنی ہے باپ کے سامنے سینہ ٹھوک کر باہر نکلی تھی اور جو منصوبہ بنایا تھا وہ کرنل رحیم شاہ جیسی شخصیت نے منظور کیا تھا۔ چنانچہ منصوبہ غلط نہیں تھا۔ اب یہ الگ بات تھی کہ جن لوگوں سے مقابلہ تھا وہ ضرورت سے زیادہ ہی باخبر لوگ تھے۔ غرض یہ کہ یہ رات وہاں پر گزاری دوسری صبح بڑی

...کون اور خوش گوار تھی اور صبح میڈم نے ناشتے کی میز پر اس سے ملاقات کی ایک خوش شکل اور دراز قامت خاتون تھیں۔ اپنا تعارف کراتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"میرا نام سنیل رابٹ ہے۔ رابٹ میرے شوہر ہیں اور میں تمہیں اپنے درمیان خوش آمدید کہتی ہوں۔ تمہیں اب تک ایڈنا کے نام سے مخاطب کیا گیا ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ تم ایڈنا نہیں ہو۔ جو کوئی بھی ہو تم نے نادانستہ طور پر ہماری مدد کی ہے اور ہم تمہاری مدد کو فراموش نہیں کر سکتے۔ بہرحال تمہیں جو بھی تکلیف ہوئی ہے۔ میں اس کے لیے معافی چاہتی ہوں کچھ ہی لمحوں کے بعد مسٹر رابٹ بھی اندر داخل ہو گئے۔ وہ ایک خوش مزاج انسان تھے انہوں نے کہا۔

"گو ہم تمہارا اصل نام نہیں جانتے۔ لیکن بہرحال یہ بات ہمیں معلوم ہے کہ تم ایڈنا نہیں ہو۔ ہمیں ان لوگوں نے ایڈنا سمجھ کر جو تکلیف پہنچائی ہے اس کے لیے ہم تم سے معافی کے خواستگار ہیں۔ تمہارے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں گی لیکن کیا تم مجھے اپنا نام بتانا پسند کرو گی۔"

"میرا نام رانا ہے۔"

"گڈ......" مسٹر رابٹ نے کہا اور اس کے بعد ناشتے کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

"پلیز...... ناشتا کرو......" رانا مصروف ہو گئی۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ باہر سے کسی کار کے ہارن کی آواز سنائی دی اور رابٹ نے سنیل سے کہا۔

"سونی! ذرا دیکھو شاید......" یہ کہہ کر انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ سنیل اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ اندر داخل ہوئی یہ لڑکی خاصی خوش شکل تھی روشن آنکھیں بھورے بھورے بال کافی پرکشش اور حسین لڑکی تھی۔ سنیل کے ساتھ قریب آ گئی۔ اس نے مسکراتی نگاہوں سے رانا کو دیکھا اور پھر اپنا خوبصورت سفید ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"معاف کیجیے گا مس رانا! میرا سیدھا ہاتھ زخمی ہے اور اٹھ نہیں سکتا۔"

"شکریہ......" رانا نے مسکراتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا اور سوالیہ نگاہوں سے سنیل کی طرف دیکھنے لگی۔ سنیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایڈنا مرسی!"

"ہیلو......" رانا نے کہا لیکن دوسرے لمحے اچھل پڑی اور پھر اس نے اس لڑکی کو دیکھ کر حیرانی سے کہا۔

"ایڈنا۔"

"ہاں...... وہ...... جو تم نہیں ہو یہ ہے۔ اصل ایڈنا یہ ہے۔"

"اوہ مائی گاڈ......" لڑکی ہنستی ہوئی بولی۔

"میرے دھوکے میں آپ کو ان لوگوں کی قید میں جانا پڑا تھا۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آ سکی کہ آخر ان لوگوں کو آپ پر شبہ کیوں ہوا۔ جب کہ ہم لوگوں کے نقوش بھی آپس میں ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔"

''کیا وہ لوگ آپ کو پہنچانتے نہیں تھے؟'' رائنا نے سوال کیا۔

''ہاں...... ان میں سے کوئی میری صورت سے آشنا نہیں تھا۔''

''گڈ...... بڑی بات ہے۔ بہرحال لعنت ہے ایسے مسائل پر جو عذاب بن جائیں۔ ناشتہ جاری رہا اور پھر مسٹر رابٹ نے جسے سنیل رابی کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''اصل میں ہمارا تعلق سوئٹزر لینڈ سے ہے۔ میں سوئس بینکنگ کونسل کا چیئرمین ہوں اور ڈیئر رائنا یہ بات شاید تمہارے علم میں ہو کہ سوئٹزر لینڈ کے بینکوں میں دنیا بھر کے سرمایہ دار اپنی اپنی دولت رکھتے ہیں۔ ان میں بے شمار ممالک کے افراد ہیں اور سوئس طریقہ کار کے مطابق ان کے تمام اثاثوں کو خفیہ رکھا جاتا ہے اور اس کے لیے مناسب انتظامات کیے گئے ہیں۔ دنیا کے بے شمار بڑے بڑے افراد کے اکاؤنٹ ہمارے یہاں کے بینکوں میں ہیں اور ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک باقاعدہ نظام رائج ہے یہ آرگنائزیشن جس کے بارے میں مجھے کوئی خاص تفصیل نہیں معلوم۔ پچھلے چھ ماہ سے کوشش کر رہی تھی کہ سوئس بینکوں کے بڑے بڑے افراد کو اپنے دام میں پھانس کر کچھ لوگوں کے اثاثوں کی تفصیل معلوم کی جائیں۔ یہ لوگ دنیا کے بڑے بڑے لوگ ہیں۔ مختلف ملکوں سے ان کا تعلق ہے اور ان کے اثاثے خفیہ حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا حق نہیں ہے کہ ہم کسی بھی قیمت پر ان اثاثوں کی تفصیل غیر متعلقہ افراد کو بتائیں۔ اس بارے میں میرے پاس مسلسل رپورٹیں پہنچ رہی تھیں اور بینکوں کے افسران اس بات کا اظہار کر رہے تھے کہ کچھ پراسرار لوگ مختلف طریقوں سے انہیں پریشان کر رہے ہیں اور واقعی یہ انتہائی خطرناک بات تھی ان اثاثوں کی تفصیلات معلوم کر کے ان لوگوں کو بلیک میل بھی کیا جا سکتا تھا اور اس کے نتیجے میں بہت سی الجھنیں بھی پیدا ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ اس کے لیے خاص طور سے انتظامات کیے گئے۔ جن کی وجہ سے ان لوگوں کو کچھ نقصانات بھی پہنچے۔ میری مراد اس گروہ سے ہے جو اس سلسلے میں کام کر رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد انہوں نے مجھے اور میری بیوی کو اغوا کر لیا اس کے لیے انہوں نے ایک شاندار منصوبہ بندی کی تھی اغوا کرنے کے بعد وہ کم بخت نہ جانے ہم دونوں کو کہاں کہاں لیے پھرے اور خوب گھما پھرا کر آخر کار یہاں لے آئے۔ انہوں نے ہمیں چھوڑ دیا تھا لیکن وہ مسلسل ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور آخری بات یہ ہے کہ انہوں نے بینکنگ کونسل کو دوسرے ارکان سے رابطہ قائم کر کے انہیں دھمکی دی تھی کہ اگر انہوں نے ان کی مطلوبہ معلومات فراہم نہ کیں تو ہم دونوں میاں بیوی کو قتل کیا جائے گا اور بینکنگ کونسل کے خصوصی اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ آخر ان لوگوں کے نام ان کے اثاثوں کی تفصیلات ان جرائم پیشہ افراد کو فراہم کر دی جائیں اور اس سے انہیں ہوشیار بھی کر دیا جائے کہ وہ اس سلسلے میں محتاط رہیں یہ فیصلہ بینکنگ کانسل کے ارکان نے کیا تھا۔ وہ میرا احترام کرتے تھے اور میری گلوخلاصی کے خواہاں تھے جب مجھ سے رابطہ قائم کیا گیا تو میں نے اس بات کی شدت سے مخالفت کی کہ سوئس قوانین کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔ لیکن وہ لوگ میری زندگی چاہتے تھے اور اس کام کے لیے تیار ہو گئے تھے جو کہ قانوناً بھی اور اصولاً بھی غلط تھا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں نے بھی کچھ انتظامات کیے تھے اور ان لوگوں کے گرد ایک دائرہ بنا لیا تھا۔ بہرحال ایڈنا اس سلسلے میں ایک اہم کارکن تھی اور ایک حادثے کا شکار ہو کر وہ ایک بالکل ہی گمنام جگہ جا پڑی اور بدنصیبی یا بدقسمتی ہے تم ان کے ہاتھ ایڈنا کی حیثیت سے لگ گئیں اور انہوں نے

تمہیں ایڈنا سمجھ لیا۔

بہرحال بڑی عجیب بات ہے۔ یہ معمولی کام نہیں تھا ہماری کونسل کے افراد جو کارروائی کر رہے ہیں اس کے نتیجے میں وہ وہاں تک پہنچ سکے جہاں سے تمہیں لایا گیا ہے۔ لیکن تم نے دانستہ نہ سہی لیکن ہماری مدد ضرور کی ہے۔ اب تم مجھے اپنے بارے میں بتا سکتی ہو کہ تم کون ہو۔''

''جی سر! میں ایک سیاح ہوں۔ مصر کی سیر کرنے آئی تھی۔ کہ ان حالات کا شکار ہو گئی اور ایسی صورت میں اپنے تمام کاغذات وغیرہ کھو بیٹھی۔ اب میں یہاں ایک بے بس اور بے سہارا مجرم کی حیثیت رکھتی ہوں۔ جس کے بارے میں کچھ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ مصر میں اجنبی ہے یا غیر قانونی طور پر مقیم ہے۔'' رائنا نے فوراً ہی پانسہ پھینک دیا تھا اور نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ مسٹر رابٹ تھوڑی دیر تک سوچتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا۔

''تم فکر مت کرو بے بی! ہم تمہیں یہاں سے سوئٹزر لینڈ لے چلیں گے میں اس کا انتظام کر لوں گا۔ تم خود تو مصر میں قیام کرنا نہیں چاہتیں۔''

''نہیں سر! میں آپ کو بتا چکی ہوں۔ میں ان حالات میں تو خاص طور سے یہاں نہیں رہ سکتی۔ جہاں پر میرے دشمن میری تاک میں لگے ہوئے ہیں۔''

''بالکل فکر مت کرو اور مسٹر رابٹ نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ کاغذات کس طرح بنوائے گئے۔ اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ لیکن بہرحال وہ تقریباً اصلی تھے۔ رائنا کے نام ہی سے اور اس کی تصویر کے ساتھ یہ کاغذات تیار کیے گئے تھے اور دلچسپ بات یہ تھی کہ سوئٹزر لینڈ روانہ ہوتے ہوئے ایمیگریشن کے معاملات اتنی ہی آسانی سے نمٹ گئے۔ جتنی آسانی سے تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بہرحال سنیل رائنا کو اپنی گھریلو زندگی کے بارے میں بتاتی رہی اس نے ایک نوجوان لڑکے کو پالا ہوا تھا جس کا نام ایرس تھا۔ ایرس کے والدین ہلاک ہو چکے تھے اور اس نے انہی دونوں کے ساتھ پرورش پائی تھی۔ ایڈنا بھی ساتھ ہی سفر کر رہی تھی لیکن اسے خاص طور سے الگ رکھا گیا تھا۔ بس مصلحت یہی تھی۔ پھر اس کے بعد رائنا نے دھند میں لپٹے ہوئے برگ کو دیکھا۔ برگ سے آگے بلند و بالا برف پوش پہاڑی چوٹیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ کوہ پیمائی کے لیے، کوہ پیماں اپنی مہموں کا آغاز اسی قصبے سے کرتے ہیں۔ تیز ہوا کے تھپیڑے پہاڑوں پر جمے گلیشئر سے سے پھسلتے ہوئے نیچے آتے ہیں تو ان کے ساتھ ہی برف کے تودے بھی گرنے لگتے ہیں۔ سردی بے پناہ ہوتی ہے یہاں اور سوئٹزر لینڈ کے روائتوں کے حسین ترین مناظر یہاں بکھرے ہوئے ہیں سیبوں کے باغات اور برگ کے بعد برن۔ لیکن برگ سے برن تک کا سفر بھی اتنا طویل نہیں لگتا سرسبز و شاداب وادیاں اور وادیوں کے آخری کناروں پر برف پوش پہاڑوں کی قطاریں اور پھر ان کے ساتھ نیلی پرسکون جھیلیں یہ حسین ترین مناظر چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ یہاں تک کے برن آ گیا۔

ایئرپورٹ پر کافی رش لگا ہوا تھا۔ لیکن اس رش میں تھوڑا سا ٹھہراؤ تھا۔ وقار تھا اور وہ مہذب انداز میں اپنے اپنے معمولات میں مصروف تھے۔ ایئرپورٹ سے آگے بڑھے لیکن اب رات ہو چکی تھی رائنا سوئٹزر لینڈ کے روایتی حسن سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ چلو کم از کم کاغذات تو حاصل ہوئے اب سوئٹزر لینڈ میں آنے کے بعد آگے کے سفر کی کوشش کی جائے گی۔ دیکھیں اس کے کیا نتائج نکلتے ہیں۔ کچھ نہ

کچھ تو ہو ہی جائے گا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک خوبصورت عمارت کے سامنے گاڑی رکی دروازہ بند تھا اور میں نے نیچے اتر کر کال بیل دبائی اور چند لمحات کے بعد ایک دراز قد آدمی نے دروازہ کھول دیا۔ گاڑی بجری کی روش سے گزرتی ہوئی ایک خوبصورت عمارت کے صدر دروازے کے سامنے رک گئی اور سنیل رابٹ وغیرہ نیچے اتر آئے۔ سنیل نے دراز قد آدمی سے پوچھا۔

''کیا ایرس اپنی خواب گاہ میں موجود ہے۔''

سنیل نے کہا۔''آؤ......ہم اسے سرپرائز دیں گے۔''

ایڈنا نے کہا۔''اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں گاڑی سے واپس چلی جاؤں۔''

''جیسا تم مناسب سمجھو۔'' چنانچہ ایڈنا اسی گاڑی سے واپس چلی گئی اور رائنا وغیرہ اندر داخل ہو گئے۔ ان کا مختصر سا سامان اس دراز قد شخص نے اٹھالیا تھا۔ کچھ راہ داریوں سے گزرنے کے بعد مسٹر رابٹ نے اپنے ساتھ آنے والے دراز قد آدمی سے کہا۔

''ہماری معزز مہمان کو نچلی منزل کے کمرے میں لے جاؤ ہم لوگ ابھی پہنچتے ہیں پلیز رائنا ٹھیک ہے نا۔''

''یس سر! رائنا نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دراز قد آدمی نے اسے ایک خوبصورت کمرے میں پہنچا دیا۔ جو خاص کشادہ اور آرام دہ تھا۔ زندگی کے تمام لوازمات یہاں بھی موجود تھے۔ جن کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہرطور اب دیکھنا یہ تھا کہ دنیا کا حسین ترین ملک اور یہ خوبصورت شہر رائنا کی پذیرائی کس طرح کرتا ہے۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد سنیل اور مسٹر رابٹ ایک خوبصورت سے نوجوان کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ بھرے بھرے بدن اور دراز قامت کا یہ شخص کافی پرکشش شخصیت کا مالک تھا اس کی آنکھوں کی بناوٹ عام آنکھوں سے بہت مختلف تھی۔ دونوں طرف سے اٹھی ہوئی یہ آنکھیں خوب صورت بھی تھیں اور پراسرار بھی ان میں بلیوں جیسی چمک تھی اس نے مسکراتے ہوئے رائنا سے ہاتھ ملایا اور اس کے ہاتھ کو دیر تک ہاتھ میں لیے رہا پھر بولا۔

''بہت شکریہ مس رائنا مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ نے کس طرح میری آنٹی کی مدد کی ہے۔ یو آر گریٹ...... میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔''

''شکریہ...... مسٹر ایرس!'' یہاں تمام معاملات بہت دلچسپ تھے لیکن رائنا کے ذہن میں کچھ اور ہی تھا وہ سوچ رہی تھی کہ کب موقع ملے اور وہ یہاں سے نکلنے کا بندوبست کرے۔ بات لمبی ہی ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن ظاہر ہے مصر چھوڑنے میں ان لوگوں نے اس کی مدد کی تھی۔ تھوڑا وقت تو ان کے ساتھ گزارنا ہی ہو گا۔ سنیل نے نہ جانے کس جذبے کے تحت کہا۔

''ڈیئر ایرس! میں رائنا کو تمہارے سپرد کرتی ہوں۔ انہیں سوئٹزرلینڈ کی سیر کرانا تمہاری ذمہ داری ہے۔''

''آپ بالکل فکر نہ کریں آنٹی! میں مس رائنا کو پورے سوئٹزرلینڈ سے واقف کرا دوں گا۔ یہاں رائنا کے لیے ایک شاندار بیڈ روم مہیا کر دیا گیا تھا۔ پھر رائنا اپنے بیڈ روم میں آرام کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور اجازت ملنے پر ایرس اندر آ گیا۔

''سوری رائنا! میں چاہ رہا تھا کہ تم سے تھوڑی بہت بات چیت ہو جائے۔ تمہارے اپنے کیا

مشاغل تھے۔ یہ تو صرف اتفاق تھا کہ انکل اور آنٹی کو مل گئیں۔''

''کوئی خاص مشاغل نہیں۔ بس سیر و سیاحت کا شوق ہے اور والدین کی جانب سے اجازت مل گئی اس لیے آوارہ گردی کرتی پھر رہی ہوں۔''

''کون کون سے ملک دیکھ چکی ہو؟'' ایرس نے سوال کیا۔

''زیادہ نہیں بس چند ممالک! انگلینڈ، ایران، ترکی، مصر اور اب سوئٹزرلینڈ۔''

''ویری گڈ...... میں تمہیں برن ہی نہیں بلکہ اطراف کے علاقے بھی دکھاؤں گا۔ ویسے بھی لمبی ڈرائیونگ میرا بہترین مشغلہ ہے اور میں ایڈونچر پسند ہوں۔ اگر میری بھرپور نگرانی نہ کی جائے تو میں واقعی جرائم پیشہ گروہ میں شامل ہو جاؤں۔ کیا لائف ہوتی ہے۔ ہنگامہ، دھائیں دھوئیں مزے ہی مزے۔'' رائنا نے گہری نگاہوں سے اس جنگ و جدل کے رسیا کو دیکھا اور پھر مسکرا کر بولی:

''میرا مزاج اس کے برعکس ہے۔ میں بلندیوں سے گرتے ہوئے آبشاروں اور اس سے بہنے والی ندیوں کی شیدائی ہوں اور کسی ایسی جگہ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں پرسکون زندگی گزارنے کی خواہاں جہاں ایک احاطے میں سفید سفید بھیڑیں بندھی ہوں۔ دوسری طرف گھوڑے ہوں سامنے کھیت پھیلے ہوں اور جھونپڑے کے پہلو میں گنگناتی ندی جس کی تہہ میں لڑھکتے ہوئے پتھر صاف شفاف نظر آتے ہوں۔''

بہرحال رائنا کافی دیر تک اس سے گفتگو کرتی رہی اور اس کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا۔ دوسری صبح ناشتے کی میز پر صرف ایرس سے ملاقات ہوئی اس نے بتایا کہ سنیل اور رابٹ کسی ضروری کام سے چلے گئے ہیں۔

اوہو...... ان کی واپسی کب تک ہو گی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا موڈی لوگ ہیں۔ بہرحال تم فکر مت کرو۔ میں موجود ہوں نا۔ لباس تبدیل کر لو اور اس کے بعد ہم چلتے ہیں جب رائنا ایرس کے ساتھ باہر آئی تو اس نے ایک بہت ہی خوب صورت کار دیکھی۔ غالباً جیک بار تھی۔ چوڑے ٹائروں والی اسپورٹ جیک بار جس میں دروازے نہیں تھے بلکہ اسے پھلانگ کر اندر جایا جا سکتا ہے۔ وہ اطمینان سے لمبی ٹانگیں کر کے ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا اور رائنا بڑی مشکل سے کار میں داخل ہوئی۔ کار بالکل بے آواز تھی۔ دن نکلا ہوا تھا لیکن کہر چھایا ہوا تھا اور دن کی روشنی پر شام کے دھند لکے کا گمان ہوتا تھا۔ ایرس خود بھی ایک بہت ہی خوبصورت سوٹ میں ملبوس تھا اور بڑا عجیب و غریب نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے کار کی رفتار تیز کرنا شروع کر دی۔ رائنا کی نگاہیں اطراف کے مناظر دیکھنے لگیں۔ سوئٹزرلینڈ کی خصوصیات سے واقف ہوتی جا رہی تھی وہ۔ یہاں ریچھ کا نشان امتیازی سمجھا جاتا تھا۔ ہوٹلوں، دکانوں اور بڑے بڑے چوکوں میں جھنڈے لٹک رہے تھے اور ان پر ریچھ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ دریا کے کنارے، کلیسا فوارے کے گرد ریچھوں کے مجسمے نصب تھے اور پھر پل کے پاس ایک گڑھے میں سچ مچ کے جیتے جاگتے درجنوں ریچھ جنہیں اہل شہر دن رات الا بلا کھلاتے رہتے تھے۔ رائنا کو یہ سب کچھ بہت خوبصورت لگا۔ شہر کی حدود پر نگاہ جمائی تو بلند و بالا عمارتیں بہت کم نظر آئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے سوئٹزرلینڈ کے صدر مقام کے بجائے کسی بڑے پرسکون کسی پہاڑی قصبے میں سفر کیا جا رہا ہو۔ چوک میں پرانی وضع کے خوب صورت فوارے اور نل لگے ہوئے تھے اور پرانے بازاروں

میں دکانیں سڑک سے اونچی اور ان کے سامنے لمبے برآمدے جن کے بارے میں بتایا گیا کہ پرانے زمانے میں یہاں صرف شاہی خاندان کو چلنے پھرنے کی اجازت تھی اور عوام کے لیے نشیبی سڑکیں تھیں پورے سوئٹزر لینڈ میں اور خاص طور سے برن میں یہ رواج ہے کہ ہر مکان یا فلیٹ کی کھڑکی تھی۔ جس میں سفید چوکھٹوں میں مٹی اور کھاد ڈال کر سرخ پھول اگائے جاتے ہیں۔ ان سرخ پھولوں کے بغیر کوئی مکان مکمل قرار نہیں پاتا۔ موسم بہار میں یہ پھول صرف گھریلو باغیچوں یا باغوں میں ہی نہیں کھلتے بلکہ شہر کی ہر کھڑکی میں سے جھانک رہے ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ بہت ہی دلکش لگ رہا تھا رائنا کو، اور وہ یہ سوچ رہی تھی کہ لندن، سوئٹزر لینڈ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے اور پھر بالکل اتفاقیہ طور پر سوئٹزر لینڈ دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ ایرس اسے ان تمام چیزوں کے بارے میں تفصیلات بتاتا جا رہا تھا پھر خاصا وقت گزر گیا تو اس نے ایک عمدہ سے ریسٹورنٹ کے سامنے کار روک دی۔ یہاں کھانا کھایا گیا اور اس کے بعد برن کے نواحی علاقوں کی سیر کے لیے کمر باندھ لی گئی۔ ایرس اس میں کوئی شک نہیں ایک دلچسپ ساتھی تھا لیکن رائنا سوچ رہی تھی کہ یہ سب کچھ غلط ہے اگر کرنل رحیم شاہ کو اس بارے میں معلومات حاصل ہو جائے تو وہ یہ پسند نہیں کرے گا۔ ان کی اپنی ثقافت ہی اپنا مزاج تھا لیکن رائنا چاہتی تھی کہ جس مشن کی تکمیل کے لیے وہ نکلی ہے اسے سرانجام دے لیا جائے اور اس کے لیے یہ تمام چیزیں برداشت کرنا بڑا ضروری تھا۔ ایرس نواحی علاقوں میں خاصی تیز رفتاری سے کار دوڑا رہا تھا۔ پھر شام ہو گئی۔

"پورا دن فضا پر ابر اور کہر چھائی رہی تھی اور اس کہر کے موسم میں یہ سفر کافی دلچسپ رہا تھا۔ رات کا کھانا بھی برن سے چند میل کے فاصلے پر ایک ریسٹورنٹ میں کھایا گیا۔ دریا کے کنارے لگی میزوں کے گرد شام کے لباس میں ملبوس، بے شمار مرد اور عورتیں کھانا کھا رہے تھے۔ ماحول پر ایک سنجیدگی اور اکتاہٹ سی طاری تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں لوگ صرف کھانے کی خاطر آتے ہیں اور انہیں دریا اور ساتھ والے گھنے جنگل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ عجیب سا ماحول تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر واپس پلٹے تو ایرس نے رائنا سے کہا۔

"کیسا لگا؟"

"سوئٹزر لینڈ کے بارے میں یہ سوال غیر ضروری ہے۔ کیوں کہ یہ بہت سے لوگوں کی آرزو ہے کہ وہ سوئٹزر لینڈ دیکھیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہمارا برن تمہیں پسند آیا۔"

"بہت۔"

"اور میں۔" ایرس نے شوخ نگاہوں سے رائنا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ ایک بہت اچھے دوست ہیں۔"

"شکریہ۔" اس نے کہا۔ رہائش گاہ پر واپس پہنچے تو مسٹر رابٹ موجود تھے۔

"ہیلو..... آپ تو بغیر اطلاع کے ہی چلے گئے۔ میڈم سنیل کہاں ہیں۔"

"اوہ بے بی سوری۔ اصل میں تمہیں صورت حال تو بتائی تھی نا۔ تھوڑا سا کام اس سلسلے میں کرنا ہے۔ سنیل ابھی واپس نہیں آئی۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ کل کا دن مصروفیت میں لگ جائے گا۔ ویسے مجھے یقین ہے

کہ ایرس تمہارا بہترین گائیڈ ثابت ہو گا۔"

"میڈم! کہاں ہیں۔"

"وہ ابھی نہیں آئیں۔ مجھے بھی واپس جانا ہے۔"

"او کے....." اور پھر مسٹر رابٹ بھی چلے گئے۔ رائنا اپنے کمرے میں آ گئی تھی اب وہ سوچ رہی تھی کہ کاغذات تو اس کے پاس موجود ہیں اور شاید بالکل اصلی بنا دیے گئے ہیں بڑے لوگوں کے لیے ایسے کام کرنا کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ لیکن اب یہاں سے آگے نکلنے کے لیے کیا کرنا چاہئے۔ کیا مسٹر رابٹ ہی کا سہارا لیا جائے یا پھر..... ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایرس واپس آ گیا۔ وہ ایک خوبصورت سی ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر آیا تھا اور ٹرالی پر بہت ہی خوبصورت شیشیاں رکھی ہوئی تھیں۔ چھوٹے سائز کے گلاس بھی تھے۔ رائنا تعجب بھری نگاہوں سے ان چیزوں کو دیکھنے لگی۔ ایرس نے اطمینان سے ٹرالی صوفے کے قریب کی اور بیٹھ گیا۔ پھر اس نے چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں شیشی کے مختلف رنگ کے سیال انڈیلے اور انہیں مکس کرنے کے بعد ایک گلاس رائنا کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔

"لو بس یوں سمجھ لو کہ اس سے اچھی کوک ٹیل تم نے زندگی میں کبھی نہیں پی ہو گی۔"

"کوک ٹیل..... یعنی شراب۔"

"ہاں ہم اسے آب حیات کہتے ہیں۔"

"افسوس میں زیادہ عرصے نہیں جینا چاہتی۔ اس لیے آب حیات پینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"کیا مطلب؟"

"سوری ڈیئر میں شراب نہیں پیتی۔" رائنا نے کہا۔

"کیا واقعی؟"

"ہاں۔"

"کیا بور باتیں کر رہی ہو۔ موسم کس قدر خوبصورت ہے اور فضا کی ٹھنڈک اس کے بغیر دور ہو ہی نہیں سکتی۔"

"میں کمبل اوڑھ کر ٹھنڈک دور کرتی ہوں۔ آئی ایم سوری ایرس مجھے یقین ہے کہ تم محسوس نہیں کرو گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن تعجب کی بات ہے خیر تمہاری مرضی۔" اور تھوڑی دیر کے بعد وہ چلا گیا۔ رائنا صورت حال کا جائزہ لے رہی تھی۔ اصل میں لندن میں کچھ عرصہ قیام کے ساتھ ساتھ ہی اسے اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ مغرب میں بہت سی چیزیں مشرق سے مختلف ہیں ایرس کا قصور نہیں تھا ایک خوبصورت لڑکی اس کی تحویل میں آ گئی تھی اور بس لیکن رائنا کو محفوظ رہنا تھا اور پھر دوسرے دن سنیل اور مسٹر رابٹ واپس آ گئے۔ سنیل نے رائنا سے بڑی محبت کا اظہار کیا تھا۔ مسٹر رابٹ نے اس سے کہا۔

"سوئٹزر لینڈ میں تم جتنا عرصہ چاہو ہمارے پاس رہ سکتی ہو۔"

"میں کچھ کہنا چاہتی تھی مسٹر رابٹ۔"

"انکل رابٹ کہو۔ تم ہماری بہت بڑی محسن ہو۔ جس مشکل سے تم نے ہمیں نکالا ہے۔ ہم تو سوچ

بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ ہمارے لیے کتنی بڑی مشکل تھی۔ آج میں سرخرو ہوں تمہارے اس عمل کی وجہ سے اور تمہارا شکر گزار ہوں۔"

"خوشی کی بات ہے خود ہمارے لیے۔" رائنا نے کہا۔ مسٹر رابٹ بولے۔

"پھر تم کیا چاہتی ہو مجھے بتاؤ۔" اور جواب میں رائنا نے مسٹر رابٹ کو بتایا کہ وہ کہاں جانا چاہتی ہے۔

"ٹھیک ہے میں تمہیں وہاں پہنچادوں گا۔ مجھے ایک ہفتے کا وقت دے دو۔"

"جی سر۔ آپ براہ کرم میرا یہ کام کر دیجئے میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں گی۔" مسٹر رابٹ نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی تھی۔

♥......♥......♥

صوفی گرین ہاؤس میں تھا اور مصوری کر رہا تھا۔ شازیہ، دلاور، غلام قادر وغیرہ اس کے بارے میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ لیکن پھر صوفی نے ایک بڑی تصویر تیار کرنے کے بعد کیمرے سے اس کے فوٹو گراف بنائے اور یہ فوٹو گراف اس نے شازیہ اور غلام قادر کو دیتے ہوئے کہا۔

"اسے تلاش کرو پورے شہر میں پھیل جاؤ۔ بازاروں میں، ہوٹلوں میں اور جگہ جگہ اسے دیکھو۔"

"یہ کون ہے؟ چھوٹے بابا۔" شازیہ نے سوال کیا۔

"نام ہے روز املیسی ایک بڑے گروہ میں ملوث ہے اگر یہ نظر آ جائے تو فوراً مجھے اطلاع کرنا اور اس سے ہوشیار بھی رہنا اس کے علاوہ ایک اور مسئلہ ہے شازیہ۔"

"کیا۔"

"ایک عمارت تلاش کرنی ہے جس کا نمبر RK090 ہے۔"

"RK090۔ ارے ماں قسم یہ RK تو میں نے دیکھا ہے کہیں۔ ہاں اخبار میں دیکھا ہے مگر کافی دن ہو گئے۔"

"کیا مطلب......" صوفی نے غلام قادر کو دیکھا۔

"میرے کو شوق ہے اخبار میں کرائے کے گھروں کے اشتہاروں کو ضرور دیکھتا ہوں۔ RK090 کرائے پر خالی تھا۔"

"غلام قادر! اخبار سے پتا مل سکتا ہے۔"

"مجھ کو صحیح ٹائم یاد نہیں۔ پرانے اخباروں میں دیکھتا ہوں۔" لیکن وہ پرانا اخبار نہیں ملا تھا۔ البتہ تیسرے دن حسینہ نے معمول کے مطابق صوفی کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"اب انگریز نیں بھی آ کر مرنے لگی یہاں۔"

"انگریز نیں۔"

"ہاں وہ کٹے ہوئے بالوں والی، بھوری چھپکلیاں۔"

"حسینہ بیگم پکایا کیا ہے آج درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"میرا معدہ خراب ہے سمجھ رہے ہوا رے تم لوگوں کی شکلیں دیکھنے کے بعد میرا تو معدہ بلکہ پورا

وجود ہی خراب ہو جاتا ہے۔ ایک انگریز عورت آئی تھی۔ تین دفعہ آ چکی ہے۔"

"انگریز عورت۔" صوفی چونک پڑا۔

"ہاں...... انگریز عورت پوچھ رہی تھی صوفی یہاں رہتا ہے۔ میں نے کہا مرتا تو یہیں ہے۔"

"اردو میں پوچھ رہی تھی۔"

"ہاں...... ٹوٹی پھوٹی اردو میں جو بس سمجھ میں آ رہی تھی۔"

"تم نے کیا کہا؟"

"لو میں کیا کہتی۔ بس وہ آ گئی مجھ سے پوچھا میں نے منع کر دیا کہ اندر نہیں ہے گیا ہوا ہے۔ اوہو...... دیکھو وہ پھر آئی ہے اس گاڑی میں آ چکی ہے۔" صوفی ایک دم سنبھل گیا تھا اس نے وہ نیلے رنگ کی کار دیکھی تھی جو گھر کے گیٹ کے سامنے آ کر رکی تھی اور اس سے ایک دراز قامت عورت نیچے اتری تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی اسی طرف آ رہی تھی۔ صوفی کے ذہن میں عجیب سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ روز املیسی ہی تھی جو اس کی طرف آ رہی تھی۔ صوفی نے ایک لمحے کے اندر اندر اپنا انداز بدل دیا۔ وہ اندر آ گئی اور صوفی کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے بولی۔

"تم...... صوفی ہائے۔"

"ہائے ہائے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"کیا بولا۔"

"خادم کو صوفی کہتے ہیں درویشوں کے کرم سے۔ آپ سنائیے آپ کون ہیں اور کیا چاہتی ہیں؟"

"تم صوفی ہو۔"

"ہائے ہائے۔" صوفی نے کہا اور حسینہ ہنس پڑی پھر بولی۔

"کم بخت کے پیٹ میں درد شروع ہو گیا۔ سفید رنگ کی چھپکلی کو دیکھ کر ہائے ہائے کر رہا ہے۔"

"آپ آیئے میڈم اندر آیئے۔"

"مسٹر صوفی! مجھے آپ سے بے حد ضروری کام ہے۔"

"ہاں، ہاں۔ آیئے اندر آ جائیے۔ صوفی نے ایک نگاہ میں دیکھ لیا تھا کہ کار میں کوئی اور ہے یا نہیں۔ اس میں صرف ایک ڈرائیور نظر آ رہا تھا روز املیسی اس کے ساتھ اندر داخل ہوگئی۔

"آپ کا گھر بہت اچھا ہے۔"

"درویشوں کی دعائیں ہیں۔"

"واٹ...... ڈور...... واش۔"

"یہ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ ڈور...... واش کیا ہوتا ہے۔" صوفی اسے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ روز املیسی مسکرا کر بیٹھ گئی۔

"مسٹر صوفی! میرے پاس آپ کے لیے ایک بہت ضروری میسج ہے۔"

"جی۔"

''اصل میں انگلینڈ میں میری ملاقات کرنل رحیم شاہ سے ہوئی۔ کرنل رحیم شاہ نے میرے کو آپ کے بارے میں بتایا اور بولا کہ صوفی اس کا بہت اچھا دوست ہے۔ کرنل رحیم شاہ نے اپنی بیٹی کے ہاتھ ایک میسج بھیجا ہے آپ کے لیے لیکن کئی دن ہو گئے اس کی بیٹی نے اس کو اپنے کام کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میں اپنے ایک ذاتی کام سے ادھر آ رہی تھی تو کرنل رحیم شاہ نے مجھ سے ریکویسٹ کیا کہ میں اس کی بیٹی کے بارے میں معلوم کر کے آؤں اور صوفی سے ملوں اور پوچھوں کہ جو کچھ کرنل رحیم شاہ نے میسج بھیجا تھا اس کے بارے میں مسٹر صوفی نے کیا کہا۔''

''اوہو...... کرنل رحیم شاہ نے مجھے اس بارے میں کوئی فون وغیرہ نہیں کیا۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''کرنل رحیم شاہ کا دور...... درویش سے کیا رشتہ۔''

''میڈم! آپ نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ میں کرنل رحیم شاہ کی بیٹی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔''

''رحیم شاہ نے آپ کے لیے ایک لیٹر دیا مجھے اور کہا کہ یہ لیٹر میں آپ کو پہنچا دوں۔''

''اوہو...... تھینک یو میڈم، تھینک یو۔ آپ پلیز وہ لیٹر مجھے دیجئے کیا لکھا ہے کرنل رحیم شاہ نے اس لیٹر میں میرے لیے۔''

''ایم سوری، ایم ویری سوری، میرے کو آپ کا ایڈریس معلوم کرنے میں بہت مشکل لگا۔ لیٹر میرے پاس میرے گھر میں موجود ہے۔ آپ میرے کو تھوڑا ٹائم دو، میں وہ لیٹر لے کر آپ کے پاس آؤں گی۔''

''آپ یہاں کہاں مقیم ہیں؟ میڈم میں خود آپ کے ساتھ چلتا ہوں اب یہ سب معلومات حاصل ہونے کے بعد مجھے بڑی فکر ہو گئی ہے کہ اگر کرنل رحیم شاہ کی بیٹی ادھر آئی ہے تو وہ مجھ سے کیوں نہیں ملی اور اس لیٹر میں کیا ہے؟''

''آپ اگر پسند کرو تو میرے ساتھ چلو مسٹر صوفی!''

''ہاں ہاں ضرور یہ بتایئے آپ کیا پئیں گی۔''

''نہیں شکریہ...... آپ ایسا بولو میرے ساتھ کافی پیئے گا۔'' وہ ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولی اور صوفی اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ حسینہ نے دروازے سے منہ نکال کر پوچھا۔

''کیا ٹھونسے گی یہ؟ تمہاری نئی آفت۔''

''درویش رحم کریں گے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ آیئے میڈم!'' صوفی نے کہا اور روز املیسی بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ صوفی گہرے انداز میں سوچ رہا تھا۔ روز املیسی کا یہاں تک پہنچنا حیران کن تھا لیکن پھر بات اس کے ذہن میں آ گئی۔ یقینی طور پر جمشید مرزا نے صوفی سے بدلہ لینے کے لیے روز املیسی کو صحیح صورت حال بتا دی ہو گی اور بہر حال صوفی تو تھا ہی کھسکا ہوا اس کی خود اپنی بھی خواہش تھی کہ جمشید مرزا ایسا عمل کرے اس طرح کم از کم روز املیسی اس کی طرف متوجہ ہو سکتی ہے اور اسے یہ پتا چل سکتا ہے کہ روز املیسی کیا چاہتی ہے اور یہاں کیوں آئی ہے۔ اس نے روز املیسی سے کہا۔

''اجازت ہو تو لباس تبدیل کر لوں۔''

''ہاں ضرور۔''

''کافی آپ ہی پلائیں گی درویشوں کے کرم سے۔''

''میں نہیں جانتی یہ ڈور...... ڈیش کیا ہے۔''

''میں آتا ہوں۔ آپ کو اس بارے میں بھی تفصیل بتانی پڑے گی۔ حق اللہ۔'' صوفی نے کہا۔ روز بلی مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی تھی صوفی پھرتی سے دوسرے کمرے میں آیا اور اس کے بعد اس نے ہائی برق رفتاری سے شازیہ کو کال کیا دوسری طرف سے شازیہ کی آواز سنائی دی تھی۔

''جی چھوٹے بابا!''

''شازیہ! تم دلاور اور غلام قادر انکر روڈ پر پہنچ جاؤ جہاں سے میں پان خریدتا ہوں۔ جتنی جلدی سکے وہاں پہنچ جاؤ روز املیسی مجھے مل گئی ہے اور اس وقت وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہے۔ ہاں سے تم تعاقب کرو گے اور جہاں بھی ہم لوگ جائیں وہاں مستعد رہو گے۔ میں تمہیں اشارہ دوں گا اور تم جگہ موجود جتنے بھی افراد ہوں انہیں سنبھال لینا۔ ہمیں روز املیسی پر ہاتھ ڈالنا ہے۔''

''او کے چھوٹے بابا! ہم انتہائی پھرتی سے وہاں پہنچ جائیں گے۔ رابطہ ختم کر کے صوفی لباس بدیل کرنے لگا۔ پانوں کی ڈبیہ میں جو پان وغیرہ تھے اسے نکال کر ڈسٹ بن میں ڈال دیے اور کوئی دس بارہ ٹ کے بعد وہ پھر روز املیسی کے پاس پہنچ گیا روز املیسی پر اطمینان انداز میں بیٹھی ہوئی پاؤں ہلا رہی تھی وفی کو دیکھ کر مسکرا کر بولی۔

''چلیں......''

''ہاں میڈم! میں گاڑی نکالتا ہوں۔''

''نہیں۔ گاڑی میرے پاس موجود ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' صوفی نے کہا اور آہستہ قدموں سے چلتا ہوا روز املیسی کے ساتھ باہر نکل آیا۔ وہ یادہ سے زیادہ وقت صرف کر لینا چاہتا تھا کہ شازیہ وغیرہ اپنے مرکز پر پہنچ جائیں۔ روز املیسی نے پچھلا روازہ کھولا۔ صوفی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر خود بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ صوفی نے جیب سے خالی پانوں کی بیہ نکالی اور اسے دیکھنے لگا۔

''یہ کیا ہے؟''

''آپ نہیں جانتیں میڈم! میں پان کھاتا ہوں۔ ختم ہو گئے ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے۔ یہ میرا نشہ ہا اور اس کے بغیر مجھے صرف نیند آتی ہے۔''

''اوہو...... میں جانتی ہوں پان کیسے ہوتے ہیں؟'' روز املیسی اپنی مخصوص اردو میں بولی اور ہنس پڑی۔

''آپ ذرا اپنے ڈرائیور سے کہئے کہ چند لمحے کے لیے پان ہاؤس کے قریب گاڑی روک لے۔''

''کیوں نہیں...... کیوں نہیں۔ مگر اس کو بھی پتا نہیں معلوم۔''

''میں بتاتا ہوں اور اس کے بعد صوفی ڈرائیور کو ادھر سے ادھر گھماتا رہا اور مکمل وقت لینے کے بعد انکر روڈ پہنچ گیا۔ جہاں پانوں کی ایک بہت مشہور دکان تھی۔ صوفی اکثر وہاں سے پان بنوایا کرتا تھا۔ کان کے سامنے کار روک کر وہ نیچے اترا۔ اس کی نگاہوں کے دور کھڑی ہوئی وہ گاڑی دیکھ لی تھی۔ جو عام طور

سے شازیہ وغیرہ کے استعمال میں رہتی تھی۔ مطمئن انداز میں اس نے پان بنوائے ایک گلوری منہ میں رکھی اور ڈبیہ جیب میں رکھنے کے بعد واپس کار میں آبیٹھا۔"

"اُکیا...... اُکیا...... یعنی شش...... شش...... شکریہ۔ اصل میں جب منہ میں پان ہوتا ہے تو آواز ویسی ہی نکلتی ہے۔" صوفی نے کہا اور روز امیلسی ہنسنے لگی۔ گاڑی سفر کرتی رہی پھر ایک مخصوص علاقے میں پہنچ کر رک گئی۔ صوفی نے اس مکان پر لکھے ہوئے نمبر کو دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ یہ نمبر 090 تھا اور علاقہ RK کے نام سے جانا جاتا تھا۔ گویا سارا کام بالکل صحیح طور پر جارہا تھا۔ گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوگئی تین آدمیوں نے ان کا استقبال کیا تھا۔ چوتھا غالباً وہی تھا جو ڈرائیونگ کررہا تھا۔ گویا روز امیلسی کے ساتھ صرف یہ چار افراد ہی تھے۔ روز امیلسی نے صوفی سے نیچے اترنے کے لیے کہا اور صوفی بڑی خوش اخلاقی سے مسکراتا ہوا نیچے اتر آیا روز امیلسی اسے اندر لے گئی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"آیئے مسٹر صوفی! میں آپ کو اپنا یہ گھر دکھاؤں۔"

"ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں...... کیوں نہیں۔" صوفی بولا اور روز امیلسی اسے ایک اندرونی کمرے میں لے گئی۔ یہاں ہلکا پھلکا فرنیچر پڑا ہوا تھا۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کمرا کسی باقاعدہ استعمال میں نہیں ہے۔ روز امیلسی نے صوفی کو بیٹھنے کے لیے کہا اور صوفی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اچانک ہی وہ باقی تین آدمی اندر گھس آئے۔ روز امیلسی ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گئی تھی اندر آنے کے بعد انہوں نے دروازہ بند کیا۔ صوفی اب بھی اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔ پھر وہ تینوں صوفی پر ٹوٹ پڑے اور صوفی کے منہ سے ارے ارے ارے کی آوازیں نکلنے لگیں۔

"ہاں مائی ڈیئر مسٹر صوفی! یہ لوگ اسی طرح مہمانوں کو کافی پلاتے ہیں۔"

"غغ...... غغ...... غارت ہو جائیں گے درویشوں کی دعاؤں سے۔ ارے...... ارے...... ابے...... او...... ابے بھائی یہ پانوں کی ڈبیہ ہے...... یہ...... یہ بٹوا ہے اس میں قوام، تمباکو، اور چھالیہ ہے۔ یار تم کیا کرو گے ان تمام چیزوں کا یہ تمہارے مطلب کی چیزیں نہیں ہیں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔" لیکن انہوں نے صوفی کے لباس سے ساری چیزیں نکال لی تھیں۔

"کک...... کمال ہے اگر لوٹنا تھا تو وہاں مجھ سے کہتیں کچھ لے لو تو آتا اپنے ساتھ۔" صوفی نے کہا اور روز امیلسی ہنسنے لگی پھر بولی۔

"جو کچھ تم اپنے ساتھ لائے ہو صوفی ہمیں اس کی ضرورت ہے۔"

"کمال ہے...... کمال ہے۔"

"اب منہ صاف کرلو یہ کمال کو کمال بولنا مجھے پسند نہیں ہے۔" روز امیلسی نے کہا اور صوفی نے پیک کی پچکاری اس کے لباس پر دے ماری۔ روز امیلسی بری طرح نروس ہوگئی تھی۔

"گندے، غلیظ، کمینے ہڈیاں توڑ دوں گی میں تمہاری۔"

"میری ہڈیاں خالص اسٹیل سے بنی ہوئی ہیں۔ آپ انہیں نہیں توڑ سکیں گی۔ درویشوں کے کرم سے۔"

"یہ وقت بتا دے گا میں نہیں چاہتی کہ یہاں کسی کو نقصان پہنچاؤں۔ لیکن ایک بات ذہن نشین کرلو

کہ تم نے میری تمام باتوں کا صحیح طور پر جواب نہیں دیا تو پھر میں دیکھوں گی کہ تمہاری ہڈیاں کیسی بنی ہوئی ہیں۔"

"آپ نہایت نامعقول ہیں۔ گدھی ہیں۔ ذلیل ہیں اور کمینی ہیں۔ میں نے تو آپ کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا تھا اور آپ یہ کام کررہی ہیں۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ بہت اچھا سلوک کروں گی ڈیئر! مجھے صرف ایک بات بتا دو رائنا رحیم کہاں ہے۔"

"کون رائنا رحیم؟"

"کرنل رحیم شاہ کی بیٹی! رائنا!"

"اوہ...... بات بہت دور کی معلوم ہوتی ہے۔ آپ رائنا رحیم کے بارے میں کیا جانتی ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے کہا وہ دیکھ چکا تھا کہ دو آدمی ریوالور تانے کھڑے ہوئے ہیں انہوں نے صوفی کو نشانے پر رکھا ہوا تھا۔ تیسرا ابھی ایک دیوار کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔

روز امیلسی نے کہا۔ "مسٹر صوفی!" میں بہت طویل فاصلہ طے کر کے صرف رائنا کے لیے یہاں آئی ہوں۔ رائنا ہمارا ایک ایسا راز چرا کر یہاں بھاگ آئی ہے جو بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ہم کسی بھی قیمت پر وہ راز مقامی حکومت کے ہاتھ لگنے نہیں دینا چاہتے۔ ہمیں صرف یہ بتایئے کہ رائنا کہاں ہے؟"

"آپ گدھی کے ساتھ ساتھ الو کی پٹھی بھی ہیں۔ کہیئے ہاں۔"

"میں جو کچھ بھی ہوں ڈیئر! لیکن میرا خیال ہے تم اپنے لیے مشکلات خرید رہے ہو۔ ابھی میں جلتی ہوئی ماچس تمہارے سر پر رکھ دوں گی تمہارے سر کے سارے بال جل جائیں گے اور اس کے بعد وہ ماچس تمہارے سر سے تمہارے رخسار پر منتقل ہو جائے گی۔ ویسے ہی تمہاری ہڈیوں پر کھال منڈھی ہوئی ہے۔ سوراخ ہونے میں وقت نہیں ہوگی اور میرا خیال ہے آگ سے جلا ہوا سوراخ کبھی ٹھیک نہیں ہوگا۔"

"اتنی خوف ناک باتیں کر لیتی ہو عورت ہو کر، قبر میں کیڑے پڑیں گے تمہاری، ویسے تمہیں تابوت میں دفن کیا جائے گا۔ مگر کوئی بات نہیں کیڑے تابوت کی لکڑی کو بھی آسانی سے کھالیں گے۔"

میرے ساتھ جو کچھ ہوگا وہ تو ہوگا ویسے تم نے مجھے اچھا آئیڈیا دیا ہے۔ میرا خیال ہے اس گھر میں ایک خالی تابوت بھی پڑا ہوا ہے۔ پتا نہیں کس مقصد کے تحت بنایا گیا تھا۔ اگر تمہیں اس تابوت میں بند کر کے کیلیں ٹھوک دی جائیں اور پھر زندہ زمین میں دفن کر دیا جائے تو کیسا رہے گا۔"

"پتا نہیں۔ جب ایسا ہوگا دیکھا جائے گا درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے پر اطمینان لہجے میں جواب دیا۔

"دوسرا طریقہ میں تمہیں بتا چکی ہوں زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے مسٹر صوفی کہ تم مجھے بتاؤ کہ رائنا رحیم مجھے کہاں ملے گی؟"

"رحمت کدے میں۔ اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں میں۔"

"ساری چرب زبانی دومنٹ میں ہوا ہو جائے گی۔ تم مجھے جانتے نہیں ہو۔"

"ابے اور کیا جانوں گا۔ زمانے بھر کی مکار تو ہو تم کمینے پن میں بے مثال، پتا نہیں اور کیا بنوانا

چاہتی ہو تم مجھ سے۔'' صوفی نے برا سا منہ بنا کر کہا اور روزا میلسی ہنسنے لگی پھر بولی۔

''ٹھیک ہے۔ اب مجبوری ہے جو کچھ میں تمہارے ساتھ کروں گی وہ مجھے خود پسند نہیں ہوگا لیکن بتا چکی ہوں کہ مجبوری ہے۔ چلو انگیٹھی گرم کر کے لاؤ اس میں لوہے کی سلاخیں ہونی چاہئیں۔''

''بہت گھٹیا باتیں کر رہی ہو۔ یہ طریقہ کار تو اب سے دو سو اکیاسی سال پرانا ہے درویشوں کے کرم سے۔ یہ دور جدید ہے ویسے کچھ عرصے سے میں نے عورتوں پر ہاتھ اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ تم میرے ہاتھوں سے پٹنا پسند کرو گی۔'' روزا میلسی نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا اور وہ صوفی کو گھورنے لگے۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

''اوہ...... بندر کی نسل کے آخری فرد کیا زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''ابے یہ بھی کوئی زندگی ہے اور تم لوگ ایک نمبر کے گدھے ہو۔ سب سے پہلے تمہیں یہ چاہئے تھا کہ مجھے رسیوں سے باندھ دیتے۔ کم از کم یہ خطرہ تو نہیں رہتا کہ میں تم پر حملہ کر بیٹھوں گا۔ اب دیکھو میرا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ میں ہوں درویشوں کا عاشق اور اگر میں نے ایک پھونک مار دی تو تم لوگوں کا وہ حشر ہوگا کہ تم لوگ یاد کرو گے۔'' صوفی نے دراصل دروازے کے باہر آہٹیں محسوس کر لی تھیں۔ ان لوگوں کے فرشتوں کو یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ صوفی جیب میں رکھے ہوئے موبائل کا ایک بٹن غیر محسوس طریقے سے دبا چکا ہے اور گرین فورس کے ممبر یقینی طور پر اب عمارت کے قریب ہی ہوں گے۔

دروازے کے باہر اس نے آہٹیں محسوس کر لی تھیں۔ روزا میلسی نے کہا۔

''شکل سے بھی تم سامری جادوگر محسوس ہوتے ہو۔''

''سامری جادوگر کی ایسی کی تیسی وہ پتا نہیں کس طرح کا جادو کرتا ہوگا میرا جادو تو اس طرح بولتا ہے۔'' صوفی نے کہا اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

''یا پیر! چمٹا نصیب! یا ڈھکن شاہ! بھیج دو اپنے موکلوں کو۔'' اور اس کے ساتھ ہی دروازہ پوری قوت سے کھلا تھا۔ غلام قادر اور دلاور نے ان دونوں پر حملہ کر دیا تھا جن کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ تیسرا ریوالور نکالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ صوفی نے لپک کر اس کی گردن پکڑ لی اور پھر وہ کس طرح اڑتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا اس کا اسے خود اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔'' شازیہ برق رفتاری سے اندر داخل ہوئی اور اس نے اس گرے ہوئے آدمی کی کمر پر گھٹنے ٹکا کر اس کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ روزا میلسی ایک لمحے کے لیے تو ہکا بکا رہ گئی تھی۔ لیکن دوسرے لمحے وہ کرسی سے اٹھ کر صوفے پر چڑھی اور اس نے چھلانگ لگانے کی کوشش کی لیکن صوفی نے بالکل اس طرح اسے لپک لیا جیسے کسی گیند کو کیچ کیا جاتا ہے اور پھر اس نے روزا میلسی کو زمین پر دے مارا۔

''کسی غیر عورت کو میں زیادہ عرصہ اپنے ہاتھوں میں برداشت نہیں کر سکتا اب میں پیروں سے کام چلاؤں گا۔ تاکہ میرے اوپر کوئی الزام نہ آسکے درویشوں کی دعاؤں سے یہ کہہ کر اس نے ایک ٹھوکر روزا میلسی کی ران میں ماری اور اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی اور اس کے بعد صوفی نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔ دلاور اور غلام قادر نے ان دونوں آدمیوں کو بری طرح زخمی کر دیا اور شازیہ نے اس شخص کا بھرکس نکال دیا جسے صوفی نے دیوار سے دے مارا تھا۔ ادھر روزا میلسی کے منہ چہرے اور جسم کے مختلف حصوں سے خون بہہ رہا

وفی واقعی بہت تبدیل ہو چکا تھا۔ پہلے جیسے مرنجان مرنج کیفیت اس پر نہیں رہی تھی۔ بلکہ اب وہ خاصا خوار ہو جایا کرتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ان سب کو وہیں سے حاصل ہونے والی رسیوں سے کس لیا گیا اور روزا میلسی بے ہوشی کی کیفیت میں تھی۔ صوفی نے غلام قادر اور شازیہ سے کہا۔

''تم دونوں اس عمارت کی تلاشی لے ڈالو ایسی کسی چیز کو تلاش کرنا ہے جو کسی میسج وغیرہ کے لیے ہو۔''

''ٹھیک ہے چھوٹے بابا! شازیہ نے کہا اور اس کے بعد وہ دونوں اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

ں آدمی بے ہوش پڑے ہوئے تھے صوفی نے ایک دم چونک کر کہا۔

''باہر چوتھا بھی تھا۔''

''ہاں وہ باہر گاڑی میں بے ہوش پڑا ہوا ہے ہم نے اچھے طریقے سے اس کی مزاج پرسی کر ڈالی تھی۔''

ہ نے جواب دیا اور صوفی ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

♥......♥......♥

روزا میلسی اور اس کے چاروں ساتھیوں کو گرین ہاؤس پہنچا دیا گیا تھا۔ شازیہ، دلاور اور غلام قادر پوری طرح ان کی ذمہ داری سنبھال لی تھی اور بڑی احتیاط کے ساتھ اپنا کام سرانجام دے رہے تھے۔ ی روزا میلسی سے معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سہیل عالم ایک بہترین اور ل اعتماد کا رکن تھا لیکن صوفی ان لوگوں کو ضرورت کے مطابق ہی استعمال کرنا چاہتا تھا۔ البتہ یہ خیال بھی کے دل میں تھا کہ سہیل عالم ہر مرحلے میں اس کے ساتھ ہوتا ہے اور بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ل ہی تنہا رہ کر کوئی کام کرنا مناسب نہیں ہے۔ وہ برا مان جائے گا۔ چناں چہ اس نے سہیل عالم سے رابطہ ئم کیا اور دوسری طرف سے فوراً ہی صوفی کی کال وصول کر لی گئی۔

''سہیل میں صوفی بول رہا ہوں۔''

''استاد محترم...... مزاج شریف؟''

''سبحان اللہ کیا خوش بیانی ہے۔ کیا کر رہے ہو؟''

''روزا میلسی کو تلاش کر رہا ہوں۔ ٹارزن بھی اس کام میں میری معاونت کر رہا ہے۔''

''طریقہ کار کیا ہے؟'' درویشوں کی دعاؤں سے صوفی نے پوچھا۔

''بس کوئی خاص طریقہ کار نہیں ہے۔''

''ٹارزن کو لے کر گرین ہاؤس آجاؤ۔''

''بہتر کتنی دیر میں حاضری دوں۔''

''جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔''

''میں پہنچ رہا ہوں۔'' غلام قادر نے گیٹ پر سہیل عالم اور ٹارزن کا استقبال کیا تھا اور انہیں صوفی پاس پہنچا دیا تھا۔ جو گرین ہاؤس کے ایک کمرے میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔

''اس وقت اس کا منہ خشک تھا۔ لباس بھی قاعدے کا پہنا ہوا تھا۔ سہیل اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"یہ لوگ آپ کو چھوٹے بابا کہتے ہیں۔ دل تو میرا بھی یہی چاہتا تھا لیکن...... بہر حال آپ ہر حالت میں میرے استاد ہیں بتائیے کیا حکم ہے۔ کیسے طلب کیا؟"

"روزا میلسی کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔"

"غائب ہو گئی ہے۔ انتہائی شاطر قسم کی جرائم پیشہ عورت ہے۔ اپنے تحفظ کے لیے اس نے یقینی طور پر زبردست انتظام کیے ہوں گے لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ آخر کار ہم اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے سہیل۔ وہ کس سلسلے میں یہاں آئی ہوگی؟"

"ٹارزن کہتا ہے کہ وہ بین الاقوامی مجرم ہے اور کسی بھی دہشت گردی کے منصوبے کو لے کر یہاں آ سکتی ہے۔"

"خیر سہیل میں نے اسے پکڑ لیا ہے۔" صوفی نے جواب دیا اور سہیل سچ مچ اچھل پڑا۔ اس کے منہ سے آواز ہی نہیں نکل پائی تھی۔ ٹارزن بھی شدید حیران نگاہوں سے صوفی کو دیکھ رہا تھا۔ بہ مشکل تمام سہیل نے کہا۔

"مگر...... مگر صوفی صاحب۔"

"ہاں...... بس تم لوگ میرے جملوں کا مذاق اڑاتے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ روحانیت کا مقام بہت بڑا ہے۔ اگر ان اللہ والوں سے لو لگا لی جائے تو یہ اللہ سے قربت رکھتے ہیں اور بندوں کی مدد کرتے ہیں۔ بشرطیکہ لگن سچی ہو۔"

"صوفی صاحب واقعی آپ نے اسے گرفتار کر لیا؟"

"ہاں یار۔ بس ایک طریقہ کار وضع کیا تھا میں نے دیکھو یہ تصویریں بنا کر میں شازیہ، دلاور اور غلام قادر کو دی تھیں۔ یہ صرف اس رات کو روزا میلسی کو دیکھنے کے نتیجے میں وجود میں آئی تھیں۔" صوفی نے اپنی مصوری کا نمونہ سہیل کو پیش کیا اور سہیل دنگ رہ گیا۔ پھر ایک پھیکی سی ہنسی کے ساتھ گردن ہلاتا ہوا بولا۔

"میں نے تو آپ کو مرشد مان لیا ہے صوفی صاحب! اور ہو سکتا ہے کہ آپ ہی کی وجہ سے میں روحانیت کا قائل ہو جاؤں۔ میرا مطلب ہے کسی بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کر لوں۔"

"حق اللہ...... حق اللہ...... حق اللہ......"

"کہاں ہے وہ؟"

"یہیں گرین ہاؤس میں وہ اور اس کے چاروں ساتھی۔"

"میرے خدا...... آپ نے انہیں بھی پکڑ لیا۔"

"ظاہر ہے۔ معلومات تو سب ہی سے مل کر کرنی تھی۔"

"کہاں رکھا ہے انہیں؟"

"گرین ہاؤس میں ایک تہہ خانہ ہے۔ ہر طرح سے محفوظ بنا لیا ہے میں نے اسے۔ تھوڑی سی ڈرامائی کیفیت ہونی چاہیے۔ درویشوں کے کرم سے۔"

"مثلاً" سہیل نے پوچھا اور صوفی اسے آہستہ آہستہ تفصیل بتانے لگا۔

روزا میلسی کے چہرے پر تفکر کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس کے چاروں ساتھی گردن جھکائے ہوئے تھے۔ بہت دیر تک روزا میلسی خاموش رہی۔ پھر اس نے کہا۔

"سیدھی سی بات ہے۔ ہم لوگوں کو یہ تو نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ہم دنیا کے سب سے تیز اور چالاک ہیں۔ دوسرے لوگ بھی اپنے اپنے کام میں چوکس ہو سکتے ہیں۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ وہ لڑکی جو یہاں آنے والی تھی شاید ابھی تک یہاں نہیں پہنچی۔ اصولی طور پر ڈیپارٹمنٹ ہمیں یہ اطلاع دینی چاہیے تھی کہ لڑکی ان کی نگاہوں میں ہے یا نہیں اور اگر وہ یہاں اپنے وطن تک نہیں پہنچی پھر کہاں ہے؟"

"اصل میں ہوتا یہی ہے۔ کرتا کوئی ہے بھرتا کوئی ہے۔ ہم تو یہاں پوری ذمہ داری کے ساتھ پہنچے اور ہم نے ایسے لوگوں کو تلاش بھی کر لیا۔ جن سے کرنل رحیم شاہ اور اس کی بیٹی کے بارے میں معلومات مل ہو سکتی تھیں لیکن اوپر سے ہمیں اطلاعات نہیں دی گئیں جس کی وجہ سے ان حالات کو دیکھنا پڑا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے میڈم لیکن جو لوگ ہمیں یہاں تک لائے ہیں وہ ہماری پوجا نہیں کریں گے۔ یقینی اور پھر ہم سے معلومات حاصل کی جائیں گی۔ ہمیں بتائیے کہ ہم کیا کریں؟ اگر اپنی زبان بند رکھیں تو ہمیں ان تشدد برداشت کرنا پڑے گا۔"

"نہیں زبان کھول دو...... آسانی سے کھول دو...... اور اس کے بعد...... اس کے بعد جانتے ہو کہ ڈیپارٹمنٹ ایسے لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔"

"سوری میڈم...... لیکن دو ہی صورتیں ہوتی ہیں۔ اگر ڈیپارٹمنٹ کے دوسرے لوگ غلطی کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ہمیں سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تو اس میں قصور ہمارا تو نہیں ہوتا لیکن سزا تو ہمیں ہی بھگتنی پڑتی ہے۔"

"بغاوت کی باتیں مت کرو۔ انتظار کرو اور دیکھو کہ وقت کی کہانی کیا ہوتی ہے۔"

"میڈم ہم آپ کی رہنمائی چاہتے ہیں۔"

"اس وقت یہ الفاظ مسخرہ پن لگ رہے ہیں۔ بھلا میں ان حالات میں تمہاری کیا رہنمائی کر سکوں گی۔ میں تو خود کسی راہنما کی تلاش میں ہوں۔" روزا میلسی نے کہا اور وہ خاموش ہو کر ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ پھر ان میں سے ایک نے سرد لہجے میں کہا۔

"اپنی جان بچاؤ اور نکلنے کی کوشش کرو۔ ضروری نہیں ہے کہ ہمارا رزق انہی لوگوں کے ساتھ لکھ گیا ہے۔ جینے کے لیے کچھ اور راہیں تلاش کریں گے۔ جب تحفظ ہی نہ ملے تو کیا فائدہ حماقتیں کرنے کا۔" روزا میلسی نے قہر آلود نگاہوں سے اس شخص کو دیکھا جس نے یہ الفاظ کہے تھے۔ پھر آہستہ سے بولی۔

"اس کے باوجود میں تمہیں کوئی سزا نہیں دوں گی۔ اس طرح کی بددلی بہر طور ہم لوگوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔" ابھی انہوں نے یہی الفاظ کہے تھے کہ دروازے پر آہٹ سنائی دی اور وہ چاروں اچھل کر کھڑے ہو گئے۔

''ہم باہر نکلنے کی جدوجہد کریں گے۔'' انہوں نے کہا اور وہ دروازے کے دونوں طرف دو دو کر کے کھڑے ہو گئے۔ روزا میلسی اب بھی تشویش بھری نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ دروازہ کھلا صوفی اور سہیل اندر داخل ہوئے اور ان چاروں نے بیک وقت ان پر حملہ کر دیا۔ حقیقت یہ تھی کہ یہ حملہ بڑا ہی سنگین اور اچانک تھا۔ کیونکہ وہ اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ لیکن مدمقابل صوفی اور سہیل تھے۔ ابتدا میں تو انہوں نے مار کھائی لیکن اس بات کا خیال رکھا کہ وہ لوگ دروازے سے باہر نہ نکل سکیں۔ اس کے بعد سب سے پہلے صوفی نے دروازے سے ٹک کر اسے روک لیا اور اس کے بعد ان لوگوں کے مدمقابل آ گیا۔ سہیل ان سے بہترین جنگ کر رہا تھا۔

بات صرف گھونسے بازی کی حد تک تھی۔ صوفی نے سنبھالا لیا اور اس کے بعد فولادی گھونسوں نے ان چاروں کو زمین چٹا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے ناک اور منہ خون سے لت پت تھے اور وہ زمین پر الٹے سیدھے ہو رہے تھے۔ روزا میلسی ایک دیوار سے ٹکی خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ جب ان چاروں کا کریا کرم ہو گیا تو صوفی نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ سینے پر رکھے اور جھک کر بولا۔

''مادام کی خدمت میں آداب پیش کرتا ہوں۔''

''میں نے انہیں منع کیا تھا۔ تم لوگ یقین کرو...... میں نے انہیں منع کیا تھا۔ مگر ٹھیک ہے جو کچھ ہوا۔ وہ ان کا اپنا عمل ہے۔''

''ہم جانتے ہیں مادام روزا میلسی کہ آپ بہت نفیس خاتون ہیں۔'' سہیل نے کہا اور روزا میلسی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''تم کون ہو؟ اور تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہو گیا۔''

''بدقسمتی سے آپ نے مجھے میرے ایک ساتھی سے محروم کر دیا۔ میں اس کے لئے انتہائی غم زدہ ہوں۔''

''میں نے؟ کیا بکواس کر رہے ہو۔''

''ہاں...... ہم اسے ٹارزن کہتے تھے اور درحقیقت وہ ٹارزن ہی تھا۔ اس قدر بے خوف اور بے جگر انتہائی پھرتیلا لیکن میڈم آپ نے اسے ہم سے چھین لیا۔'' روزا میلسی کے منہ سے ایک ہلکی سی آواز نکل گئی تھی پھر اس نے سہیل کو گھورتے ہوئے کہا۔

''مگر تم اسے کیسے جانتے ہو؟''

''آہ...... وہ میرا دوست تھا اور میرے ساتھ ہی میرے وطن آیا تھا۔ آپ اس کی قاتل ہیں میڈم۔''

''انکار نہیں کروں گی وجہ یہ تھی کہ میں یہاں اپنے ایک مشن پر آئی تھی اور وہ وقت سے پہلے میری آمد سے واقف ہو گیا تھا میں نہیں جانتی تھی کہ اس کی یہ واقفیت مستقبل میں میرے لئے کیا نقصان دہ ہو گی۔ لیکن میں بے کار گھاس کاٹ دینے کی عادی ہوں اور فضول چیزوں کو درمیان میں نہیں رکھتی۔''

''آپ عظیم ہیں میڈم۔'' بہت عظیم ہیں آپ۔ لیکن اس کی روح مجھ سے تقاضے کر رہی ہے کہ میں آپ سے اس کا انتقام لوں۔''

''اس طرح مجھے قید کر کے۔'' روزا میلسی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''آپ خود اپنی مرضی سے یہاں تک تشریف نہیں لائی ہیں محترمہ، درویشوں کی دعاؤں سے آپ کو یہاں لایا گیا ہے۔ اس سے پہلے آپ نے کیا جدوجہد نہیں کی تھی؟'' صوفی نے کہا۔

''ہاں...... یہ بات تو ٹھیک ہے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ وہ واپس تو نہیں آ سکتا۔''

''آ سکتا ہے میڈم...... آ سکتا ہے...... وہ واپس آ سکتا ہے۔ وہ آپ کو آپ کی ناکامیوں کی تصویر دکھانے آ سکتا ہے۔''

''کیا مطلب۔'' روزا میلسی نے کہا اور سہیل نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ٹارزن اندر آ گیا تھا۔ روزا میلسی نے اسے دیکھا اور دیوار کے ساتھ پھسلتی ہوئی نیچے بیٹھ گئی۔

''تم...... تم...... صوفی ان چاروں کو دیکھ رہا تھا۔ جو اب بری حالت میں تھے۔ ان میں سے دو بے ہوش ہو گئے تھے اور دو اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''سہیل انہیں دیکھو۔'' صوفی نے کہا اور سہیل ان کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ٹارزن آہستہ آہستہ چلتا ہوا روزا میلسی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''جی میڈم! میلسی آپ اپنے آپ کو دنیا کی سب سے چالاک خاتون سمجھتی ہیں۔ آپ نے مجھے گلاس میں جو زہر دیا تھا۔ آپ کی فطرت سے واقفیت کی بنیاد پر میں اس کے لئے پہلے سے تیار تھا۔ وہ زہر میرے معدے میں نہیں اترا بلکہ کہیں اور جذب ہو گیا۔ پھر آپ نے میری لاش ٹھکانے لگا دی لیکن آپ کے نالائق گدھے یہ بھی نہ کر سکے۔''

''اوہ...... میرے خدا...... یہ بہت اچھا ہوا ہے۔ میں نے زندگی میں چند ہی ایسے کام کئے ہیں۔ جن کا مجھے بعد میں پچھتاوا ہوا ہے اور ٹارزن تمہاری موت اسی طرح کا ایک پچھتاوا تھی۔ کیا یہ لوگ تمہارے ساتھی نہیں۔''

''ہاں...... یہ میرا باس سہیل عالم بارود والا ہے اور یہ ہمارے پیر۔'' ٹارزن نے کہا۔

''میں تم لوگوں سے مفاہمت چاہتی ہوں۔''

''ہو سکتی ہے۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''مجھے نکل جانے دو یہاں سے۔''

''یہ بتائے بغیر کہ آپ کی یہاں آمد کس مقصد سے ہوئی تھی اور آپ جو کرنل رحیم شاہ کی بیٹی رائنا کے بارے میں معلومات حاصل کر رہی تھیں۔ وہ کس سلسلے میں تھی؟''

''یہ سب کچھ میں نہیں بتا سکتی۔ یہ اتنا خفیہ ہے کہ اس راز کے منکشف ہونے پر میں بھی زندہ نہیں ہوں گی۔''

''وہ تو آپ ویسے بھی نہیں رہیں گی۔ آپ دیکھئے ذرا سا غور کیجئے آپ کے یہ خوبصورت بال آپ کے سر پر نہ رہیں۔ آپ کی بھنویں بھی صاف کر دی جائیں درویشوں کی دعاؤں سے تو آپ کیا چیز لگیں گی اور ہم یہ انتظام کر کے آئے ہیں۔ یہ ایک چھوٹی سی پہلی سزا ہو گی آپ کے لئے۔''

''کک...... کک کیا بکواس کر رہے ہو؟''

"سچ ......میڈم سچ۔ ہم ایسا ......اب سے دس منٹ کے اندر اندر کر لیں گے۔ ورنہ آپ زبان کھول دیجئے۔" روزا میلسی خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ اس نے ان چاروں کو دیکھا اور اس کے بعد ایک دم ہنس پڑی۔

"سبحان اللہ بہت ہنس مکھ ہیں آپ خاتون۔" صوفی نے جیب سے استرا نکالتے ہوئے کہا۔

"رکو ......رکو ......رک جاؤ۔ میں نے اپنے خیالات میں کچھ تبدیلیاں کر لی ہیں۔ چنانچہ کوئی ڈرامہ مت کرو۔ اصل میں ہوا یہ ہے کہ تھوڑی دیر پہلے یہ لوگ مجھے دھمکیاں دے رہے تھے کہ یہ ہمارے گروپ سے وفاداریاں تبدیل کر دیں گے اور اپنی زندگیاں بچائیں گے۔ ظاہر ہے میں اس بات کی مخالف تھی۔ لیکن اب جو صورتحال نظر آ رہی ہے۔ وہ یہی کہتی ہے کہ مجھے زبان کھول دینی چاہیے۔"

"درویش رحم کریں۔" صوفی نے کہا۔

"ٹارزن جانتا ہے کہ میں دولت کے حصول کے لئے بہت سے جرائم پیشہ گروپوں کے ساتھ کام کرتی رہی ہوں۔ تھوڑا ساتھ میرا اور ٹارزن کا بھی رہا ہے۔ بہر حال ٹارزن کو دیکھ کر میں نے یہی سوچا تھا کہ نہیں یہاں اس کا کس کس سے رابطہ ہو اور یہ میری آمد کو پہلے سے مشتہر کر دے۔ چنانچہ اسے ختم کر دینا ضروری ہے۔ اس وقت میں جس گروپ کے ساتھ کام کر رہی ہوں۔ وہ بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے اور بہت ہی خطرناک اور باخبر گروپ ہے۔ یہاں اس ملک میں کچھ کام کرنے ہیں اور اس سلسلے میں یہاں کچھ لوگوں کو اپنا ہمنوا بنایا گیا ہے۔ یہ مقامی لوگ ہیں اور خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان لوگوں کی ایک فہرست بنائی گئی اور پھر اس کی ایک مائیکرو چپ تیار کر لی گئی۔ یہ مائیکرو ڈسک ہمارے پاس محفوظ تھی کہ بالکل اتفاقیہ طور پر یہ ایک ایسے شخص کے پاس پہنچ گئی جو یہی کام کرتا تھا اور مقامی تھا۔

اس شخص نے وہ ڈسک دیکھی اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ اس کے ملک کے خلاف کوئی سازش ہے تو اس نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر اس ڈسک کو اپنے ملک کے سفارتخانے پہنچانے کا فیصلہ کیا۔

لیکن ہمیں اس کے بارے میں معلومات حاصل ہو گئیں۔ ہم نے اس پر کئی حملے کئے مگر وہ بچ کر نکل گیا اور پھر کسی طرح وہ ایک شخص تک پہنچا جس کا نام کرنل رحیم شاہ تھا۔ اس نے وہ مائیکرو ڈسک اسے دے دی۔ ہمارے گروپ کے جاسوسوں نے یہ معلومات بھی حاصل کر لیں۔ ہم نے کرنل رحیم شاہ کو ٹریس کیا۔ پتا یہ چلا کہ اس کی بیٹی رائنا یہ ڈسک لے کر اپنے وطن نکل چکی ہے۔ مجھے فوراً ہدایت کی گئی کہ میں اس لڑکی سے پہلے یہاں پہنچوں اور اسے ٹریس اپ کروں۔ اس سلسلے میں ہم نے ایک بہت بڑے پولیس افسر کو کڈنیپ کیا جس کا نام جمشید مرزا تھا۔

اور اس سے مسٹر صوفی کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ ہم یہ چاہتے تھے کہ مسٹر صوفی سے کرنل رحیم شاہ کی بیٹی کے بارے میں تفصیلات معلوم کریں اور اپنی آرگنائزیشن کو یہ اطلاع دیں کہ ڈسک یہاں کے ذمہ دار آدمی کے پاس پہنچی یا نہیں۔ باقی کہانی تم لوگوں کو معلوم ہے۔"

"یہ سچ بول رہی ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے سہیل کی طرف رخ کر کے کہا۔ پھر کافی دیر تک وہ اس سے سوالات کرتے رہے تھے۔ روزا میلسی تفصیل کے ساتھ ان کے جوابات دیتی رہی تھی

اور اس کے بعد وہ دونوں باہر نکل آئے تھے۔ سہیل نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے صوفی صاحب مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آپ کے کشف کے زیر اثر بول رہی ہو۔ سارا کچا چھٹا کھول کر رکھ دیا اس نے۔"

"ہمارا یہ خیال نہیں ہے۔ درویشوں کے کرم سے۔ صوفی نے کہا۔

"وہ بہت خطرناک اور چالاک عورت ہے۔ وہ جو کہتے ہیں ناں۔ وقت سے سمجھوتہ کرنے والی۔ اس نے صورتحال کا اندازہ لگانے کے بعد وقت سے تعاون کیا ہے اور تشدد سے بچ گئی ہے۔ مگر میرے ذہن میں ایک سوال بری طرح کھٹک رہا ہے۔"

"کیا؟" سہیل نے پوچھا۔

"ہم اس کا کریں کیا۔ بلاوجہ پانچ انسانوں کی زندگی لینا۔ ایک انتہائی خطرناک عمل ہو سکتا ہے اور اس کے علاوہ یہ جس قدر چالاک ہے۔ اگر ہم نے اسے کسی سرکاری ادارے کے حوالے کر دیا تو کسی نہ کسی طرح یہ یہاں سے نکل جائے گی اور اس کے بعد رائنا خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"بہت چھوٹی سی بات ہے صوفی صاحب۔ یہ کام آپ میرے سپرد کر دیجئے۔" صوفی نے گردن اٹھا کر سہیل کو دیکھا اور بولا۔

"قتل کر دو ان لوگوں کو۔"

"نہیں صوفی صاحب ......بہت سے نسخے ہیں میرے پاس۔ ڈاکٹر سلوان یقیناً یہ نام آپ نے نہیں سنا ہو گا چونکہ اس شخص نے کبھی اپنے آپ کو منظر عام پر نہیں رکھا۔ عجیب سا انسان تھا۔ بس سادہ زندگی گزاری ہے اس نے لیکن بے شمار ایجادات کی ہیں۔ جن میں سے ایک ایجاد میں ان پر استعمال کروں گا۔"

"درویش رحم کریں۔" صوفی نے آہستہ سے کہا۔

"یہ لوگ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھیں گے اور پھر دنیا کا کوئی علاج انہیں ان کی اصل حالت میں واپس نہیں لا سکتا۔ ہاں ......یہ سڑکوں پر مارے مارے نہیں پھریں گے بلکہ ان کی شخصیت بدل جائے گی۔ پلیز انہیں میرے حوالے کر دیجئے۔"

"درویش رحم کریں۔" صوفی آہستگی سے بولا۔

پھر دو واقعات ایک ساتھ ہوئے۔ اخبارات نے ایسے پانچ افراد کی خبر شائع کی۔ جو غیر ملکی تھے اور اپنے بارے میں عجیب وغریب کہانیاں سنا رہے تھے۔ ان میں ایک کا کہنا تھا کہ وہ چنگیز خان کا باورچی ہے۔ دوسرا کہتا تھا کہ وہ دنیا کا سب سے عظیم سائنسدان ہے۔ اسی طرح وہ بھی اپنا تعارف کراتے تھے اور ان کے ساتھ ایک بڑی باوقار سی عورت تھی۔ جو کہتی تھی کہ اصل کوئین وکٹوریہ میں ہوں اور جو عورت اپنے آپ کو ملکہ وکٹوریہ بتاتی تھی وہ نقلی تھی۔

ان کے پاس سے نہ تو کچھ کاغذات برآمد ہوئے تھے اور نہ ہی ان کی قومیت کا کوئی پتا چلتا ہے۔ بہر حال ان لوگوں کو حکومتی تحویل میں لے لیا گیا تھا۔ دوسرا واقعہ رائنا کی آمد تھی اور یہ آمد بھی بڑے دلچسپ طریقے سے ہوئی تھی اور صوفی اس وقت اپنی رہائشگاہ میں ہی موجود تھا کہ دروازے پر بیل ہوئی اور معمول کے

مطابق حسینہ دروازہ کھولنے دوڑی۔ سامنے ایک خوبصورت سی لڑکی کھڑی دیکھ کر اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"جی بی بی کہئے کس سے ملنا ہے؟"

"صوفی صاحب سے۔" حسینہ نے سر سے پاؤں تک لڑکی کو دیکھا اور بولی۔

"اے بی بی...... نظر کمزور تھی تو نظر کا چشمہ لگوانا چاہئے تھا تمہیں۔"

"کیوں خیریت؟ کیا ہوا؟" لڑکی نے سوال کیا۔

"اے میں کہتی ہوں بینائی خراب ہوگئی ہے تمہاری۔ وہ بھی اس قابل ہے کہ اس سے ملا جائے۔ موا بانس کا ٹکڑا۔"

"آپ کون ہیں ان کی؟"

"تمہارے منہ میں خاک۔ میں کون ہوتی۔"

"صوفی صاحب گھر پر ہیں یا نہیں۔"

"ہاں ہیں۔ کیا کہوں ان سے کہ تمہاری وہ چہیتی آئی ہیں۔" معشوق نشیلے کی آواز پیچھے سے ابھری۔ کون ہے حسینہ بیگم؟"

"آ جاؤ...... آ جاؤ خوشبو سونگھ کر آ گئے ہو گے۔ اے میں کہتی ہوں۔ تم مردوں کی ناک عورتوں کے معاملے میں کتنی تیز ہوتی ہے۔"

"آپ ہٹئے اور بدتمیزی مت کیجئے ورنہ میں آپ کو تمیز سکھا دوں گی۔"

"آئے لو...... میرے اوپر کیوں بگڑ رہی ہو۔ میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔"

"ہٹو پیچھے۔" رائنا نے حسینہ کو دھکا دیا اور حسینہ گرتے گرتے بچی۔ معشوق نشیلے کا قہقہہ فضا میں بلند ہوا تھا۔

"سینڈل اتار کر دو چار مار دیجئے سر پر۔ یہ ہے اسی قابل۔"

"تو مار دے...... کمین کے جنے...... اگر صوفی صاحب کی مہمان نہ ہوتی تو میں بتاتی اسے۔"

"صوفی صاحب کہاں ہیں؟" رائنا چیخ کر بولی تو معشوق نشیلے آگے بڑھ کر کہنے لگا۔

"آپ آئیے میرے ساتھ...... میں آپ کو صوفی صاحب سے ملا دیتا ہوں" اور پھر رائنا صوفی تک پہنچ گئی۔ صوفی کو جب علم ہوا کہ کوئی خاتون ملنے کے لئے آئی ہے تو وہ رائنا ہی کے تصور سے وہاں تک پہنچا تھا اور پھر بڑے اخلاق سے اس سے ملا تھا۔

"آپ نے بہت وقت لگا دیا یہاں تک آنے میں۔"

"اوہو...... کیا ڈیڈی نے آپ سے رابطہ قائم کیا تھا۔"

"آپ یہ بتائیے کہ آپ کہاں سے آ رہی ہیں؟"

"رات کو فلائٹ سے آئی تھی۔ لیکن سیدھی آپ تک نہیں آئی۔ کیونکہ خدشہ تھا کہ دشمن پیچھے لگے ہوں گے۔ اب بھی چکر در چکر کر کے یہاں تک آئی ہوں۔"

"مجھے علم تھا۔ آپ کی آمد کا۔ کیونکہ آپ کے دشمن۔ آپ کی تلاش میں یہاں تک آ پہنچے ہیں۔ بلکہ آ پہنچے تھے۔ میں نے درویشوں کی دعاؤں سے انہیں ٹھکانے لگا دیا۔"

"اوہ...... میرے خدا! انکل حقیقت یہ ہے کہ مجھے اپنی زندگی کا سب سے تلخ تجربہ ہوا ہے۔ ڈیڈی اور آپ جو کام کرتے رہے ہیں۔ ان میں سینکڑوں بار میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ آپ لوگوں نے مجھے نظر انداز کر دیا۔ مگر میں نے کبھی ڈیڈی سے شکایت نہیں کی۔ میں جانتی تھی کہ ڈیڈی نے مجھے اس قابل نہیں سمجھا لیکن اب یہ مجبوری ہوگئی تھی۔ عادل اور فیضان کو یہاں نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ زیادہ شناسائی کی پوزیشن میں تھے۔" رائنا نے پیش آنے والے واقعات کے بارے میں پوری تفصیل صوفی کو بتائی اور صوفی خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

"کرنل کی بیٹی کو ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔" اس کے بعد وہ روزا میلیسی کے بارے میں رائنا کو تفصیل بتانے لگا۔ پھر رائنا نے وہ مائیکرو ڈسک صوفی کو پیش کر دی اور اس کے سلسلے میں کارروائی ہونے لگی۔ رائنا کو تو صوفی نے آرام کرنے کے لئے کہہ دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد اس نے مائیکرو ڈسک کو پوری طرح کھنگال ڈالا اور آٹھ، نو گھنٹے کمپیوٹر پر مصروف رہا۔ اس پر لاتعداد انکشافات ہوئے تھے۔ رائنا کی واپسی کے سلسلے میں اسی رات رائنا سے گفتگو ہوئی۔ صوفی نے بہت ہی خفیہ طریقے سے کرنل رحیم شاہ کو اطلاع دی کہ رائنا پہنچ چکی ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ چیزیں بھی ہیں جو اسے روانہ کی گئی ہیں۔ وہ بہت جلد رائنا کی ایسی مناسب واپسی کا بندوبست کر دے گا کہ اسے کوئی دقت نہ ہو۔

پھر اس کے بعد صوفی ساری رات جاگتا رہا تھا اور اس سلسلے میں منصوبہ بندی کرتا رہا تھا۔ دلچسپ بات جمشید مرزا کے ساتھ پیش آئی۔ جب اس نے اخبار میں وہ تصویریں دیکھیں جو چار غیر ملکی مرد اور عورت کی تھیں۔ جب وہ ناشتے کی میز پر پہنچا تو اس کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ ناشتا بھی بڑے اہتمام سے بنایا گیا تھا۔ تازہ اخبار بھی تہہ کیا ہوا رکھا تھا۔ جمشید مرزا نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے اخبار اٹھایا اور خبروں کو سرسری نظروں سے دیکھتے ہوئے اچانک اس کی نظر صفحہ اول کے نچلے حصے میں ایک بڑی خبر پر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی تصویریں بھی تھیں۔ جمشید مرزا اچھل پڑا تھا۔ بیوی سامنے موجود تھی اور اس کے ساتھ ہی ناشتہ کر رہی تھی۔

"خیریت۔"

"ہاں...... خیریت ہی ہے۔ بس کمال ہوگیا۔" اور اس کے بعد اس نے جلدی جلدی ناشتہ ختم کیا اور معلومات کرنے چل پڑا۔

ایک دلچسپ صورت حال تھی۔ جس نے پوری طرح اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا حالانکہ وہ کام کا بندہ نہیں تھا۔ لیکن چونکہ روزا میلیسی نے اسے اغوا کیا تھا اور اس سے اتنی معلومات حاصل کی تھیں۔ اس نے روزا میلیسی کی تصویر کو صاف پہچان لیا تھا۔ اب یہ معلوم نہیں کہ روزا میلیسی اس سے جو معلوم کرنا چاہتی تھی۔ اس کا کیا نتیجہ نکلا۔

تاہم اس نے یہ ضرور معلوم کر لیا کہ ان غیر ملکیوں کو کہاں رکھا گیا ہے جو اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے تھے اور خود کو دنیا کی مشہور ترین شخصیتوں سے منسلک بتاتے ہیں۔ بیوی کہنے لگی۔

''آپ کا تو ارادہ ہی کچھ اور تھا۔ آپ کو یاد ہے۔ یا ناشتہ کر کے کام ختم ہو گیا آپ کا۔''
''نہیں بھئی۔ ذمہ داری کی نوکری اسی کو کہتے ہیں اور تم ایک ذمہ دار پولیس آفیسر کی بیوی ہو۔
میرے ساتھ تعاون کیا کرو۔'' جمشید مرزا نے پر رعب لہجے میں کہا اور بیوی برا سا منہ بنا کر دوسری طرف
دیکھنے لگی۔

رات سر پر جھکتی آ رہی تھی۔ سہیل نے دور دور تک ویران سڑک کی طرف دیکھا۔ پچھلی سیٹ سے
صوفی کے خراٹے نشر ہو رہے تھے۔ بڑا خوفناک راستہ تھا۔ رات کے اوقات میں یہاں کم ہی ڈرائیونگ کی
جاتی تھی۔ اکثر موڑ تو اس قدر خطرناک تھے کہ سہیل جیسے آدمی کو بھی پسینہ آ گیا تھا۔ ان راستوں پر وہ پہلے کبھی
نہیں آیا تھا۔ حالانکہ یہ جگہ ایسی تھی کہ دن کے وقت بھی ان سے گزرتے ہوئے خوف محسوس ہو سکتا تھا۔ لیکن
اب تو رات تھی اور صوفی بھی اپنے مزاج کے خلاف پچھلی سیٹ پر سو رہا تھا۔
حالانکہ وہ اس طرح کا انسان نہیں تھا۔ لیکن نہ جانے اس وقت کیا سوجھی تھی ویسے بھی اس کی فطرت
کی تبدیلیاں سب ہی محسوس کر رہے تھے۔ حالانکہ اگر وہ چاہتا تو ادن پور رک سکتا تھا۔ ادن پور وہ دونوں اپنے
اسی معاملے کے سلسلے میں آئے تھے۔ جس کا ڈسک سے پتا چلا تھا۔ بہر حال سہیل کا ارادہ تو یہ ہی تھا کہ رات
یہاں گزاری جائے اور اس کے بعد کل دن کی روشنی میں واپسی کا سفر اختیار کیا جائے لیکن صوفی نے کہا تھا۔
''بزرگوں نے کہا ہے کہ آج کا کام کل پر نہیں چھوڑنا چاہئے۔'' بہر حال صوفی کے بزرگ اور
درویش اس سے جو کہتے تھے۔ وہ ہی کرتا تھا۔ لیکن اس وقت سہیل کو حیرت ہوئی تھی جب وہ پچھلی سیٹ پر جا لیٹا
تھا اور اس وقت وہ خود مزے سے خراٹے نشر کر رہا تھا اور سہیل کو تنہا ہی اس خوف ناک راستے پر ڈرائیونگ کرنا
پڑ رہی تھی۔ اس نے کار کی رفتار بہت سست رکھی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ تاریکی گہری ہوتی جا رہی تھی اور پھر
اس علاقے میں تو یہ خوفناک تاریکی بہت ہی عجیب لگ رہی تھی۔ کار کی روشنیاں سڑک کے اس چند گز کے حصے
کو بہ مشکل روشن کر پا رہی تھیں۔ ایک موڑ سے گزرتے ہوئے سہیل نے کار کی رفتار بہت سست کر دی اور پھر
ایک گہری سانس لی۔ اسی وقت پیچھے سے آواز سنائی دی۔
''مائی ڈیئر سہیل عالم بارود والا۔ اس وقت تم جن مناظر سے گزر رہے ہو۔ اس میں تمہاری پرکھ ہو رہی
ہے اور اصولی طور پر ہر شریف آدمی کو اس وقت یہ سوچنا چاہئے کہ جس نے تمہیں رات کے اس وقت میں سڑک
مشورہ دیا ہے۔ اسے کسی کھائی میں دھکیل کر خود کسی مناسب جگہ کار روک کر اس میں سو جاؤ۔'' سہیل ہنس پڑا پھر بولا۔
''نہیں جناب پہلی بات تو یہ ہے کہ میں کوئی کاہل آدمی نہیں ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ حکم مرشد
بڑی حیثیت رکھتا ہے۔''
''درویش تم پر رحم کریں۔ کیا کہہ سکتا ہوں۔'' صوفی نے کہا اور سیٹ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔
پھر وہ تاریکی میں جھانکنے لگا اور اس کے بعد بولا۔
''تقریباً دو میل اور چلنا پڑے گا۔ اس کے بعد بائیں سمت ایک سڑک آئے گی ہمیں اس پر مڑنا
ہوگا۔ کچی سڑک ہے۔''
''آپ اس تاریکی میں بھی اس طرح راستوں کا تعین کر سکتے ہیں۔''

''دنیا جسے الو کہتی ہے ناں ...... وہ اصل میں الو نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ رات کو تاریکیوں میں بھی دور تک
دیکھ لیتا ہے۔''
''آپ آگے آ جائیے۔ ذرا الو پر تفصیلی بحث ہوگی۔''
''درویش رحم کریں اور ویسے تم فکر مت کرو۔ اگر گاڑی کسی کھڈ میں بھی گری تو میں دروازہ کھول کر
چھلانگ نہیں لگاؤں گا۔ بہر حال تم کہتے ہو تو آ جاتا ہوں۔'' صوفی نے کہا اور پچھلی سیٹ سے اپنے آپ کو موڑ
کر اگلی سیٹ پر آ گیا۔ اس بات پر بھی سہیل کو ہنسی آئی تھی۔ کیونکہ جگہ اتنی کشادہ نہیں تھی کہ ایک اچھے خاصے
لمبے قد و قامت کا آدمی آگے کی سیٹ پر آ جائے۔ لیکن صوفی پتا نہیں کہاں سے تڑ مڑ کر آگے آ گیا تھا۔ سہیل
ابھی تک صوفی کی بات پر غور کر رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔
''ایسا لگتا ہے کہ آپ ان راستوں سے بہ خوبی واقف ہیں۔''
''وہ آگے موڑ ہے۔ خیال کرنا۔'' صوفی نے کہا اور واقعی سہیل عالم کے پورے بدن میں ایک سرد
سی لہر دوڑ گئی۔ بڑا ہی خطرناک موڑ تھا۔
''آپ اس کے چپے چپے کے بارے میں جانتے ہیں۔''
''دوسری بار گزر رہا ہوں۔ اس وقت جب ہم یہاں آ رہے تھے پہلی بار تھی اور اب دوسری بار ہے۔''
''مگر آپ کو اس ذیلی سڑک کے بارے میں کیسے پتا چلا۔ جس کی ابھی آپ نے نشاندہی کی
ہے۔ سہیل نے تعجب سے پوچھا۔
''اصل میں درویشوں کی خوبیاں ......بس کھوپڑی روشن رکھتی ہیں۔'' صوفی نے جواب دیا اور
سہیل ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا پھر وہ میل کا فاصلہ کافی دیر میں ہی طے ہوا تھا اور اس کے بعد
واقعی ایک ذیلی سڑک نظر آ گئی تھی۔ سہیل نے کہا۔
''یہ تو پہلے سے بھی ویران ہے۔ اس سے گزرنا آسان تو نہیں ہوگا۔''
''آسانیاں ساتھ ساتھ سفر نہیں کرتیں۔ آگے چل کر ایک بڑا ٹیلا ہے اس کا خیال رکھنا۔'' سہیل کو
ایک اونچے ٹیلے کے گرد گھومنا پڑا اور پھر ٹیلے کے دوسری طرف نکل کر انہیں ایک روشنی نظر آئی تو سہیل کو صوفی
کی بات یاد آ گئی اور اس کے منہ سے نکلا۔
''کمال ہے۔ اتنی زبردست معلومات، حالانکہ یہ روشنی۔'' ''فکر مت کرو...... ذرا رفتار بڑھاؤ۔''
صوفی نے کہا اور سہیل عالم نے رفتار تیز کر دی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ اس پتھریلی عمارت کے نزدیک پہنچ
گئے۔ جس کے پتھر قدامت کی وجہ سے کالے ہو گئے تھے۔ اگر اس کے اوپری حصے میں وہ لالٹین نہ جل رہی
ہوتی تو اس کا دور سے دیکھا جانا ناممکن تھا۔ کیونکہ وہ تاریکی میں اس طرح لپٹی ہوئی تھی کہ صرف لالٹین کی
روشنی ہی اس کے وجود کو روشن کرتی تھی۔ عمارت بہت پر اسرار تھی اور یہیں پر سہیل نے کار روکی تھی...... صوفی
بالکل چست اور چالاک نظر آ رہا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور اس نے سہیل عالم کو بھی ساتھ آنے کا
اشارہ کیا وہ دونوں عمارت کے دروازے کی طرف مڑ گئے تھے۔ اندر جانے کے لئے بڑا سا دروازہ تھا لیکن اس
میں کیواڑوں کا نشان بھی نہیں تھا۔ وہ اس دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ تبھی صوفی کی آواز ابھری۔

"کوئی ہے؟" یہ بات بھی حیران کن تھی۔ کیا صوفی کو یہاں کسی کے ہونے کی امید ہے۔ سہیل عالم بولے بغیر نہ رہ سکا۔

"یہاں کون ہو سکتا ہے؟"

"کیوں؟"

"نہیں میرا خیال ہے اندھیرے کی وجہ سے تمہیں نیند بھی آ رہی ہے۔ مائی ڈیئر بارود والا۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ اگر یہاں کوئی نہیں ہوتا تو وہ لالٹین کیا ہمارے اجداد کی روحوں نے روشن کی ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"اوہ......" سہیل کو واقعی شرمندگی ہوئی تھی۔ سیدھی سی بات تھی۔ لیکن اس وقت ذہن عجیب و غریب خیالات کا حامل تھا۔

"ارے بھائی کوئی ہے تو جواب دیجئے۔"

"آ رہا ہوں سرکار۔" دور سے ایک غرغراتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ پھر ایک دور کی راہداری میں ایک روشنی ابھری۔ جوان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ایک سایہ لالٹین ہاتھ میں لیے انہی کی طرف آ رہا تھا۔ پھر وہ قریب آ کر بولا۔

"سلام حضورا!" بوڑھی بوڑھی سی آواز تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ آنے والا کوئی عمر رسیدہ آدمی ہے۔ وہ قریب پہنچا تو سہیل عالم نے دیکھا کہ وہ ایک بوڑھا آدمی ہے۔ صوفی نے کہا۔

"بابا صاحب! ہم یہاں ٹھہرنا چاہتے ہیں۔"

"ضرور سرکار۔ آپ کو یہاں کافی آرام ملے گا۔" بوڑھے آدمی نے کہا۔

"ہم اپنی گاڑی اندر لے آئیں۔"

"جی سرکار۔" بوڑھے نے لالٹین لے کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔

"کیا گاڑی خراب ہو گئی ہے سرکار۔"

"نہیں بابا جی......بس رات زیادہ ہو گئی تھی درویشوں کے کرم سے۔ راستے خطرناک ہیں اس لیے ہم نے سفر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"اچھا کیا سرکار۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ صبح دن کی روشنی میں چلے جانا۔"

"ہاں......" صوفی نے کہا اور اس کے اشارے پر سہیل گاڑی اسٹارٹ کر کے عمارت کے احاطے میں لے آیا۔ بوڑھے چوکیدار نے اس کی رہنمائی کی تھی۔ کار سے اس نے کھانے پینے کا سامان اور کافی کا تھرماس نکال لیا اور پھر وہ بوڑھے کے ساتھ عمارت کے اندر داخل ہو گئے۔ عمارت میں کئی کمرے قابل استعمال تھے۔ بوڑھا انہیں ایک صاف ستھرے کمرے میں لے آیا۔

کمرے میں بانوں سے بنے ہوئے دو پلنگ پڑے ہوئے تھے جن پر کوئی چادر وغیرہ کا بندوبست نہیں تھا۔ بوڑھے نے فوراً ہی کہا۔

"بس سرکار ہم بستر کا انتظام نہیں کر سکتے۔"

"بستر......بستر ایک اضافی چیز ہوتی ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے ایک رات گزارنی ہے [یہا]ں۔" صوفی بولا۔

"کھانا پکا دیں سرکار......دال موجود ہے۔"

"نہیں کھانا ہمارے پاس موجود ہے۔ بس پانی لے آؤ۔"

"لاتے ہیں سرکار ٹھنڈا میٹھا پانی۔" بوڑھے نے لالٹین ایک طرف رکھ دی اور کمرے میں رکھی ئی دوسری لالٹین جلا کر باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد صوفی نے سہیل عالم کی طرف دیکھا اور بولا۔

"ایسے واقعات سے پہلے بھی سامنا پڑا ہوگا۔"

"ہاں ایسے نہیں لیکن بہت سے ایسے غیر متوقع لمحات آئے ہیں۔ ویسے یہ عمارت بڑی پراسرار ہے۔ کیا ہمیں یہاں کسی روح سے واسطہ نہیں پڑے گا۔"

"عشق کرنا چاہتے ہو۔ درویشوں کے کرم سے ویسے اگر واقعی تمہیں کسی روح سے ملاقات کا ن ہے تو اس ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے کنویں میں اتر جاؤ جس کے بارے میں وہ بوڑھا کہہ کر گیا ہے۔ پھر تم ت تک یہیں اس سے عشق کرتے رہنا۔" سہیل ہنسنے لگا پھر بولا۔

"نہیں صوفی صاحب عشق میری منزل نہیں ہے۔" پھر انہیں خاموش ہونا پڑا کیوں کہ بوڑھا پانی لے آیا تھا۔ انہوں نے بوڑھے کو بھی کھانے میں شریک کرنا چاہا لیکن اس نے شکریہ ادا کر کے ایک گوشہ اپنا لیا۔ جب یہ لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے تو اس نے پوچھا۔ "میرے لیے کیا حکم ہے سرکار؟"

"نیند آ رہی ہے۔" صوفی نے پوچھا۔

"نا ہی سرکار۔ اتنی جلدی نہیں سوتے ہم۔"

"تو بیٹھو باتیں کریں گے۔" صوفی بولا اور بوڑھا چوکیدار ان سے تھوڑی دور زمین پر بیٹھ گیا۔ [صو]فی نے کہا۔

"تم کتنے عرصے سے یہاں ملازم ہو۔ بابا صاحب؟"

"سرکار اب تو ٹھیک وقت یاد بھی نہیں رہا۔"

"بہت عرصہ ہو گیا۔"

"ہاں سرکار......جوان تھے اس وقت۔ بدن میں جان تھی۔"

"اچھا......اچھا......کیا تنخواہ ملتی تھی تمہیں اور ملتی ہے۔"

"سرکار گوروں کے زمانے سے نوکری کر رہے ہیں ہم۔ اللہ کا فضل ہے اتنے پیسے مل جاتے ہیں گزارہ ہو جاتا ہے اور پھر زیادہ پیسوں کی ضرورت بھی نہیں ہے ہمیں۔"

"یہ عمارت انگریزوں کے زمانے کی ہے۔"

"جی سرکار۔"

"کیا کرتے تھے وہ یہاں۔ اس عمارت......میرا مطلب ہے یہ ڈاک بنگلہ تو نہیں ہے۔"

"بہت سے گورے سپاہی یہاں رہتے تھے سرکار انہوں نے یہاں ایسی مشینیں لگائی تھیں جن سے

وہ قبائلیوں کو دیکھتے رہتے تھے۔ ادھر کے قبیلے والوں نے گوروں کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔"

"ہوں...... ہوں...... اچھا...... ٹھیک...... تو انگریزوں کے جانے کے بعد بھی حکومت نے اسے سرکاری حویلی میں رکھا ہے۔ بہرحال بڑی خوشی کی بات ہے۔ ویسے بابا صاحب تمہارے بیوی بچے نہیں ہیں۔"

"نہیں سرکار بیوہ بہن ہے اور اس کے بچے ہیں بڑا لڑکا رمضان ہفتے میں ایک آدھ بار آتا ہے۔ مٹی کا تیل، دال، آٹا اور کھانے پینے کی چیزیں دے جاتا ہے۔"

"یہاں تمہارا دل نہیں گھبراتا۔"

"ارے نا ہی سرکار...... ادھر تو بڑا آرام ہے۔"

"ڈر بھی نہیں لگتا یہاں؟" اس بار سہیل نے سوال کیا اور بوڑھا ہنسنے لگا۔

"لو سرکار بڑھاپے میں ڈر کر کیا کریں گے۔ ڈر تو زندگی کا ہوتا ہے۔"

"ان عمارتوں میں جن بھوت بھی تو آ سکتے ہیں۔"

"تو ہم ان سے دوستی کر لیں گے۔ سب بھائی مل جل کر گزارہ کر لیں گے۔ اب تو جن بھوت بھی آ گئے ہیں سرکار یہاں۔"

"کیا مطلب۔" سہیل چونک پڑا۔

"جانے دو سرکار۔ نیند بھی نہیں آوے گی تمہیں ہم تو بوڑھے آدمی ہیں تمہیں بلاوجہ ہی ڈر لگے گا۔"

"نہیں نہیں...... بھوتوں سے ہماری خاندانی دوستی ہے۔ درویشیوں کی دعاؤں سے ہم بھی تمہارے جن بھوتوں سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔" صوفی بولا۔

"ارے بابو جی کہنے کی باتیں ہوتی ہیں سب۔ جب مصیبت سامنے آوے ہے تب پتا چلے ہے۔"

"کہاں ہے یہ مصیبت اور کیا واقعی یہاں جن بھوت رہتے ہیں۔ ہمیں بتاؤ ہم تمہارے مہمان ہیں دوست ہیں تمہارے۔"

"نہیں بابو پہلے یہاں کچھ بھی نہیں تھا مگر پچھلے کچھ دنوں سے ایسا لگتا ہے کہ ہمارے علاوہ کوئی یہاں کوئی رہتا ہے۔ ہم نے کئی بار رات میں کسی کے چلنے پھرنے کی آواز سنی ہے۔ کتنی ہی بار اندھیرے میں سائے دیکھے ہیں۔ سرکار پہلے تو ہم اسے اپنا وہم سمجھتے رہے لیکن کیا بتائیں۔ ہماری دال غائب ہو جاتی ہے، روٹیاں غائب ہو جاتی ہیں۔ پر ہم کہتے ہیں بھیا مانگ کر کھالو ہم کبھی منع نا ہی کریں گے۔ رزق تو اللہ کی دین ہوتی ہے۔ اب ہم یہ کرتے ہیں دال بھی زیادہ پکا لیتے ہیں۔ روٹیاں بھی کیا سمجھے؟ ان کا بھی کام چل جاوے ہے۔" بوڑھے نے کہا اور ہنسنے لگا۔

"دال، روٹیاں مستقل طور پر غائب ہو جاتی ہیں۔" صوفی نے پوچھا۔

"جی سرکار۔"

"کبھی تم نے انہیں پکارا بھی ہے۔"

"ہاں...... سرکار مگر وہ سامنے نہیں آتے۔ اپنے کام دھندوں میں لگے رہتے ہیں۔ پتا نہیں ایک ہیں یا دو ہیں۔ لگتا تو ایک ہی ہے سرکار۔ کئی بار ہم نے کنویں کے قریب پانی بھی گرا ہوا دیکھا ہے۔"

"ہوں......" صوفی ایک گہری سانس لے کر سہیل کو دیکھنے لگا۔ سہیل بھی دلچسپی سے بوڑھے کو دیکھ رہا تھا۔ بہرحال وہ کافی دیر تک بوڑھے سے باتیں کرتے رہے اور پھر صوفی نے کہا۔

"اب جاؤ آرام کرو...... اور سنو صبح ہوتے ہی ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ تمہاری مہمان نوازی کا شکریہ...... یہ رکھ لو...... تمہارے کام آئیں گے۔" صوفی نے کچھ نوٹ نکال کر بڑے میاں کو دے دیئے۔

"اتنے سارے سرکار۔ جیتے رہیں۔ برکت ہو سرکار۔" بوڑھے نے بہت سی دعائیں دیں اور پھر باہر نکل گیا۔ صوفی سہیل کو دیکھنے لگا تھا۔ سہیل نے کہا۔

"حقیقت یہ ہے صوفی صاحب کہ آپ کے ساتھ زندگی کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ دنیا کے کئی ممالک میں بڑی ہنگامہ آرائی کی ہے میں نے لیکن اب یہاں آنے کے بعد ایسا سکون سا لگتا ہے کہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

"بھوت سے ملاقات کرو گے۔" کہہ رہے تھے تم۔"

"واقعی یہ مشرق کا ایک دلچسپ پہلو ہے۔ یہاں میری بہت سی خواہشیں پوری ہو گئی ہیں لیکن یہ خیال دل میں ہے کہ کبھی کسی بھوت وغیرہ سے بھی ملاقات کروں۔"

"چلو تمہاری یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی درویشیوں کی دعاؤں سے۔"

"ویسے کیا خیال ہے۔ صوفی صاحب بوڑھے بابا نے کوئی کہانی ہی سنائی ہے ناں۔"

"لگتا نہیں ہے درویشیوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے کہا اور پانوں کی ڈبیا اور چھالی وغیرہ کا بٹوہ نکال لیا۔

"کیا مطلب اب اس وقت پان کھائیں گے سوئیں گے نہیں۔"

"نہیں کھاؤں گا نہیں۔ احتیاط سے رکھ لیا ہے۔ ہو سکتا اس عمارت میں رہنے والا بھوت پان وغیرہ کا بھی شوقین ہو۔"

"بوڑھے نے کوئی کہانی وغیرہ تو نہیں سنائی۔"

"لگتا تو نہیں ہے۔ چلو آرام کرو۔" صوفی نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ صوفی کی سانسیں بھاری ہوتی چلی گئی تھیں۔

♥......♥......♥

جمشید مرزا جب بھی کبھی تنہا بیٹھ کر صوفی کے بارے میں سوچتا اس کے پورے بدن میں آگ سی لگ جاتی تھی۔ کتنے ہی ایسے مواقع آئے تھے۔ جب صوفی نے اسے ذلیل کر کے رکھ دیا تھا۔ بہرحال اس بار بھی جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا وہ چاہتا تھا کہ صوفی اس کے ساتھ شامل ہو جائے۔ یہ بات تو طے تھی کہ جس خطرناک عورت نے اسے اغوا کیا تھا وہ کرنل رحیم شاہ کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنا چاہتی تھی۔ جمشید مرزا کو کچھ بھی پتا نہیں چل سکا تھا لیکن صوفی نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ کئی بار اس نے یہ بھی سوچا کہ صوفی کو کسی نہ کسی طرح محکمہ پولیس میں شامل کر لے۔ اس کے لیے وہ کافی بھاگ دوڑ کر سکتا تھا لیکن اس بات کے کیا امکانات تھے کہ صوفی اس وقت بھی اس سے تعاون ہی کرے ویسے بھی وہ سن چکا تھا کہ صوفی کئی بار پولیس

ڈیپارٹمنٹ میں رکھا اور نکالا گیا ہے۔

بہرحال پھر اس نے اس عمارت کے بارے میں چھان بین شروع کر دی۔ جو اس کے سامنے آ چکی تھی اور جہاں اس کی صحیح معنوں میں حجامت بن گئی تھی۔ اس نے اپنے ماتحتوں کو اس کام پر لگایا تھا لیکن ماتحتوں سے ملنے والی رپورٹ زیادہ تسلی بخش نہیں تھی۔ نہ اس سے کوئی نتیجہ نکلتا تھا۔ عمارت ایک بڑے سرمایہ دار کی ملکیت تھی اور عام طور سے کرائے پر اٹھی رہتی تھی۔ اس سے پہلے تو یہ عمارت ایک جاپانی فرم کے پاس تھی۔ آج کل بقول اس کے ماتحتوں کے اس میں ایک بوڑھا آدمی رہ رہا تھا۔ بوڑھے کا جو حلیہ بیان کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ سرخ وسفید چہرہ، درمیانہ قد، لمبی سفید گھنی داڑھی، اچھی جسامت، اس کے علاوہ دروازے پر ایک مسلح سنتری بھی رہتا تھا جو دیو قامت تھا۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں معلوم ہو سکا تھا اس بارے میں۔ البتہ یہ ضرور پتا چلا تھا کہ یہ بوڑھا آدمی خاموش طبع اور اپنے آپ کو لیے دیئے رکھنے والا ہے۔

بہرحال جمشید مرزا اس عمارت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ چناں چہ اس نے دو آدمی سادہ لباس میں عمارت کی نگرانی پر تعینات کر دیئے تھے۔ البتہ ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جو قابل تشویش ہو۔ بہرحال جمشید مرزا ہر طرح سے اس عمارت کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ صوفی وہاں کیا کچھ کر چکا ہے۔ پھر اس نے اس عمارت کے فون کو ٹیپ کرنے کی ہدایت کی اور اپنے اختیارات سے کام لے کر یہ کام بھی ہو گیا لیکن اور کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے کیا نہ کیا جائے۔ ایک کوئی بات ابھی تک سامنے نہیں آئی تھی جس کی بنا پر وہ کسی بڑی کارروائی کا آغاز کرتا۔

البتہ یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ صوفی کے بارے میں ان لوگوں کو اطلاع ہونے پر صوفی پر کیا گزری مگر اس کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اس کے پاس۔ صوفی من موجی آدمی تھا۔ اگر رحم دلی پر اتر آئے تو بہت کچھ کر دے ورنہ کوئی دھونس، دھڑلا اس پر کارگر نہیں ہوتا تھا۔ سوائے اس کے کہ اس کی بدتمیزی برداشت کرنی پڑے۔ بہت سوچتا رہا تھا وہ کوئی ایسی ٹھوس چیز ہاتھ میں بھی نہیں تھی جو اسے صوفی کو مجبور کرنے پر آمادہ کرے۔ بہرحال اس نے دل میں سوچا کہ جو گزری اس پر لعنت بھیجی جائے۔ کیا فائدہ بیٹھنے سے پتا تو کچھ چلنا نہیں ہے بس وقت ہی ضائع ہوگا چناں چہ اس نے بات کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی لیکن تجسس انسان کو کب سکون سے بیٹھنے دیتا ہے۔ پچھلی رات بھی ذہن پر سوار رہی تھی اور وہ یہ سوچتا رہا تھا کہ آخر اونٹ کسی نہ کسی کروٹ تو بیٹھا ہوگا۔ لیکن اونٹ سے ملاقات کیے بغیر بھی یہ پتا نہیں چل سکتا تھا کہ وہ کس کروٹ بیٹھا ہے۔

چناں چہ ناشتے وغیرہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اس نے عام قسم کے کپڑے پہنے اور اپنی گاڑی لے کر صوفی کے گھر کی جانب چل پڑا۔ کچھ دیر کے بعد وہ وہاں موجود تھا۔ جانتا تھا کہ بیل دبانے کے بعد کس سے ملاقات ہوگی۔ اس کے لیے تیاریاں کر کے آیا تھا۔ حسینہ بیگم کی صورت ہی نظر آئی تھی۔ دروازہ کھول کر جمشید مرزا کو دیکھا اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑائیں۔ جمشید مرزا کچھ طے کر کے آیا تھا۔ اس بڑبڑاہٹ کے کچھ جملے اس کے کانوں تک پہنچ گئے تھے وہ لاحول پڑھ رہی تھی۔ لیکن جمشید مرزا نے اسے نظر انداز کر کے کہا۔

”کہیے حسینہ بیگم کیسے مزاج ہیں آپ کے؟“ حسینہ کو یہ جملہ بہت اچھا لگا۔ غور سے جمشید مرزا کو دیکھا اور بولیں۔

”وہ اونٹ زادہ تو موجود نہیں ہے گھر پر۔“

”حسینہ بیگم سچ سچ بتلایئے آپ کی تعلیم کتنی ہے۔“

”ایں...... کیا یہ ہی پوچھنے آئے ہو بھیا...... کہ میں کتنی پڑھی لکھی ہوں۔“

”نہیں...... ابھی آپ نے ایک جملہ استعمال کیا۔ یہ تو بڑا ادبی جملہ تھا۔ اونٹ زادہ، کتنی اچھی بات کہی آپ نے۔ واقعی اس شخص کے لیے اس سے زیادہ اچھا جملہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔“ حسینہ خوش ہو گئی اور بولی۔

”اے ادب تو میں سب کا کرتی ہوں پر کیا کہوں جو جیسا ہوتا ہے اسے ویسا تو کہنا ہی پڑتا ہے ناں!“

”بالکل...... اصل میں مسئلہ یہ ہی ہے حسینہ بیگم کہ لوگ قدر نہیں کرتے انسان کی۔ آپ یقین کریں۔ جب آپ کو دیکھتا ہوں تو میرے دل میں یہ خیال گزرتا ہے کہ آپ کو وہ مقام نہیں ملا جو ملنا چاہیے۔“

حسینہ نے ایک بار پھر غور سے جمشید مرزا کو دیکھا۔ جمشید مرزا کی باتیں اسے اس وقت بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ کہنے لگی۔

”تو باہر کیوں کھڑے ہو۔ آؤ...... اندر آ جاؤ۔ آ کر بیٹھو دو منٹ۔“

”ذرا گاڑی لاک کر دوں۔“

”ہاں ہاں کر دو کر دو۔“ جمشید مرزا نے کار کے دروازے لاک کیے اور حسینہ بیگم کے ساتھ اندر آ گیا۔ یہ تو پتا چل چکا تھا کہ صوفی اس وقت موجود نہیں ہے۔ حسینہ بیگم سے ہی تھوڑی بہت بات سہی۔

”اور وہ کہاں ہے؟ صوفی کالے پالک۔“

”ہائے...... ہائے بھیا...... آج تو جوتوں سمیت آنکھوں میں گھسے چلے جا رہے۔ کیا اچھی باتیں کر رہے ہو۔ تم خود بھی تو وہ ہو...... وہ...... جو ابھی کہا ناں تم نے۔ ادبی...... ادبی۔ وہ سچ مچ صوفی کالے پالک ہی ہے۔ کم بخت پڑا اینٹھ رہا ہوگا۔ دس بجے جاگے گا اور شور مچا دے گا کہ حسینہ بیگم ناشتا دو...... ناشتا دو۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ اسے کسی دن دھتورا کھلا دوں کہ لے پیٹ بھر لے تا کہ اس کے بعد کچھ کھانے کی گنجائش ہی نہ رہے۔“

”نہیں حسینہ بیگم ایسا مت کرنا۔ کبھی مت کرنا ایسا۔“

”ارے تو پھر صوفی کو بھی تو دیکھو۔ حرام خوروں کی فوج بنا رکھی ہے پوری۔ آتے ہیں، کھاتے ہیں، اینٹھتے ہیں۔“

”اور بھی کچھ لوگ ہیں۔“ جمشید مرزا نے حسینہ بیگم کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”ہاں آتے ہی رہتے ہیں۔ چلو چھوڑو۔ تم یہ بتاؤ ناشتا بناؤں تمہارے لیے۔“

”ارے نہیں نہیں حسینہ بیگم۔ آپ بھی کیا کہیں گی کہ جو تکلیف سب دیتے ہیں وہ ہی میں بھی دے رہا ہوں آپ کو۔“

”نہیں...... نہیں ہم تو خیر نوکر ہیں ہمارا کام ہی یہ ہے۔“

”مگر میں تو آپ کو نوکر نہیں سمجھتا حسینہ بیگم۔ پتا نہیں کیوں دل چاہتا ہے کہ آپ کے لیے بہت

سے تحفے لے کر آؤں۔ لیکن صوفی صاحب سے ڈر لگتا ہے۔ کہیں برا نہ مان جائیں۔"

"وہ کیا میرا خصم ہے۔ جو برا ماننے لگا۔" حسینہ نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے پھر آپ کے لیے میں...... مگر چھوڑیے پہلے سے بتانا مناسب نہیں ہے۔ بیٹھ جائیے کوئی ناشتا واشتا نہیں کرنا مجھے ویسے صوفی صاحب کہاں گئے ہیں؟"

"کمبخت مارا مجھے کہیں بتا کر جاتا ہے۔ وہ تو کرنل رحیم شاہ نے میری جان کو مصیبت ڈال دی ورنہ۔"

"حسینہ بیگم کرنل رحیم شاہ کی بیٹی آنے والی تھی؟ آئی یا نہیں۔" حسینہ نے ایک دم جمشید مرزا کو دیکھا اور پھر نگاہیں چرا کر بولی۔

"نہیں بھیا وہ تو سنا ہے ملک سے باہر چلے گئے۔"

"میرا مطلب ہے کرنل رحیم شاہ کا کوئی پیغام آیا۔"

"ایسی باتیں پوچھ رہے ہو مجھ سے جن کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم۔" حسینہ نے کہا جمشید مرزا دیر تک حسینہ کو ٹٹولتا رہا تھا لیکن کوئی کام کی بات نہیں معلوم ہوسکی اور وہ آخر کار حسینہ سے رخصت ہو کر باہر نکل آیا۔ صوفی کے بارے میں پتا چلا تھا کہ پچھلے دو دن سے غائب ہے۔ کیا کہا جا سکتا ہے کہاں ہوگا؟ البتہ یہاں سے نکلنے کے بعد وہ اپنے آفس میں پہنچ گیا تھا اور یہاں ایک نئی کہانی اس کی منتظر تھی۔ اخبار سامنے رکھا ہوا تھا اور اخبار پر جو تصویر نظر آ رہی تھی۔ وہ دیکھنے کے قابل تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک تحریر بھی تھی۔ تصویر میں پانچ افراد نظر آ رہے تھے۔

سب سے آگے جو تصویر تھی وہ سو فیصدی اسی عورت کی تھی جو جمشید مرزا کو اغوا کر کے لے گئی تھی۔ جمشید مرزا آنکھیں پھاڑ کر اس تصویر پر جھک گیا۔ تصویر یقینی طور پر روز املیسی کی تھی اور اس کے ساتھ اس کے چاروں آدمی بھی تھے۔ لکھا تھا۔

"پانچ غیر ملکی پاگل سڑکوں پر آوارہ پھرتے ہوئے پکڑے گئے۔ پولیس نے انہیں روک کر ان سے ان کے بارے میں معلوم کیا مگر کوئی صحیح جواب نہ مل سکا۔ یہ بھی نہیں پتا چل سکا کہ وہ کون سے ملک سے تعلق رکھتے ہیں اور یہاں کب اور کس طرح پہنچے ہیں پانچوں کا دماغی توازن درست نہیں تھا۔ وہ ایک قطار بنائے مارچ کر رہے تھے۔ سب سے آگے عورت تھی۔ پیچھے چاروں آدمی لفٹ، رائٹ...... لفٹ، رائٹ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ پولیس نے انہیں پکڑا اور ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا۔ ڈاکٹروں نے معائنہ کر کے بتایا کہ ان کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔ انہیں دماغی ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا ہے اور ملک ملک کے سفارت خانوں سے ان کے بارے میں تحقیقات ہو رہی ہیں کہ وہ کون ہیں؟ اور کہاں سے آئے ہیں؟ ان کے پاس سے کوئی کاغذ تک نہیں دستیاب ہوا جس سے یہ پتا چلے کہ ان کا تعلق کون سے ملک سے ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ وہ شدید قسم کے پاگل ہیں۔ جن کا علاج بھی آسانی سے ممکن نہیں ہوسکتا۔ جمشید مرزا پھٹی پھٹی نگاہوں سے روز میلیسی کو دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

دفعتہً ہی اس کے ذہن میں ایک منصوبہ آیا تھا۔ اس منصوبے کے تحت صوفی کو رگڑا جا سکتا تھا۔ بہت غور کرنے کے بعد اس نے اخبار کی کٹنگ ساتھ لی اور اس کے بعد ڈی آئی جی صاحب کے پاس پہنچ گیا۔

آئی جی نے اسے خشک نگاہوں سے دیکھا۔ محکمے کے نکمے ترین لوگوں میں سے تھا اور اس کے بارے میں پہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ سرکاری نکما ہے۔ ڈی آئی جی احمد جمال نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ بیٹھ گیا۔

"جی فرمائیے...... کیسے آنا ہوا۔ ان کے لہجے میں طنز تھا۔"

"سر یہ تصویر دیکھیے۔" جمشید مرزا نے اخبار کی کٹنگ ان کے سامنے کر دی۔

"یہ تصویر...... ہاں دیکھ چکا ہوں۔ یہ اخبار میرے پاس بھی پڑا ہوا ہے۔"

"سر میں انہیں جانتا ہوں۔" جمشید مرزا نے کہا اور ڈی آئی جی چونک پڑا۔

"کک...... کک...... کیا مطلب؟"

"جی سر! ایک عجیب وغریب واقعہ ہوا ہے۔"

"جلدی بتاؤ۔ یہ تصویر اس وقت محکمہ پولیس کے لیے ایک معمہ بنی ہوئی ہے۔ کیوں کہ ان کا تعلق باہر کے ملک سے ہے۔ ڈی آئی جی صاحب نے کسی قدر تشویش زدہ لہجے میں کہا۔ جمشید مرزا پوری ک کر کے آیا تھا۔ اس نے کہا۔

"سر کچھ عرصہ قبل کی بات ہے۔ میں اپنے معمولات میں مصروف تھا کہ انتہائی جارحانہ انداز میں اغوا کرنے کی کوشش کی گئی اور انہیں اس میں کامیابی حاصل ہو گئی۔

"اغوا۔"

"جی سر۔ مجھے بے ہوش کر کے ایک عمارت میں لے جایا گیا اور وہاں مجھے ایک کرسی پر ہاتھ پاؤں دھ کر بٹھا دیا گیا۔ پھر اس کے بعد جب میں ہوش میں آیا تو یہ عورت میرے سامنے تھی جو اس تصویر میں نظر آ ہے۔ سر یہ ایک سفاک عورت تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتی ہے اور کے لیے مجھے اغوا کیا گیا ہے اور یہ چاروں آدمی اس کے ساتھی تھے۔ انہوں نے مجھ پر تشدد کیا۔ جو سوال اس مجھ سے پوچھا۔ وہ عجیب وغریب سوال تھا۔ آپ کو کرنل رحیم شاہ کے بارے میں تو علم ہوگا۔

"کرنل رحیم شاہ...... ہاں کیوں نہیں۔ بڑی شخصیت تھی۔ لیکن پچھلے دنوں......"

"جی سر...... جی سر...... میں انہی کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔ اس عورت نے مجھ سے کہا۔ کرنل رحیم شاہ کی بیٹی یہاں آئی ہے۔ اس کے بارے میں مجھے معلومات فراہم کرو۔ پھر میرے فرشتوں کو بھی ایسی کوئی بات نہیں معلوم تھی۔ میں نے اسے بتایا تو وہ بولی کہ نہیں یہ بات اس کے علم میں ہے کہ کرنل م شاہ کا تعلق کچھ نہ کچھ مجھ سے رہا ہے۔ سر اس کی معلومات کافی حد تک درست تھی سر آپ صوفی صاحب کو تو نتے ہی ہوں گے۔"

"صوفی۔"

"جی...... محکمہ پولیس میں بھی رہ چکے ہیں اور کرنل رحیم شاہ۔"

"سمجھ گیا...... سمجھ گیا...... آگے کہو۔"

"صوفی صاحب کے ذریعے کرنل رحیم شاہ سے کچھ ملاقاتیں رہیں۔ انہوں نے کچھ ذمہ داریاں کا پر دکیں تھیں جس کی بنا پر اس کا خیال تھا کہ میں کرنل رحیم شاہ کے بارے میں جانتا ہوں۔ بہر حال میں

نے ہر طرح سے معذرتیں کیں اور اسے یقین دلایا کہ کرنل صاحب کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم نہ ہی میں ان کی بیٹی کے بارے میں کچھ جانتا ہوں۔ البتہ میں نے صوفی کا حوالہ دے دیا تھا۔

سر! اس کے بعد میں نے شدید جدوجہد کی اور وہاں سے نکل آیا۔ باہر آ کر میں نے اس عمارت پر تحقیقات شروع کر دی اور مختصراً مجھے اس کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ عمارت کرائے پر حاصل کی گئی تھی اور اب وہ خالی پڑی ہے لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہیں ایک آدمی رہتا ہے جو پراسرار شخصیت کا مالک ہے۔ سر میں اپنے طور پر تحقیقات میں مصروف ہو گیا اور اپنے ماتحتوں کے ذریعے اس عورت کو تلاش کرنے لگا لیکن میں اسے نہیں پا سکا۔ البتہ اب یہ تصویر میں نے دیکھی ہے۔''

''وہ عورت صوفی تک پہنچ گئی؟'' ڈی آئی جی صاحب نے سوال کیا۔

''میں نہیں جانتا سر! صوفی سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ وہ آؤٹ آف سٹی ہے۔''

''تم نے اخبار کی خبر پڑھ لی۔''

''جی سر! بڑی حیرت ناک خبر ہے اور میں اپنے طور پر آپ کو ایک ٹپ دینا چاہتا ہوں۔''

''فرمائیے۔'' ڈی آئی جی صاحب نے اس کے الفاظ کو ناخوش گوار محسوس کیا تھا۔

''سر صوفی بے پناہ پراسرار صلاحیتوں کا مالک ہے۔ شہر سے اس کی گمشدگی اور اس عورت کی دیوانگی دونوں کا آپس میں لنک ہے۔ پورے دعوے سے میں یہ بات کہہ سکتا ہوں۔''

سر! صوفی یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ میرا اندازہ ہے سر! کہ یہ عورت صوفی تک پہنچی اور اس کے بعد کیا ہوا یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن اس کی دیوانگی میں سو فیصدی صوفی کا ہاتھ ہے۔''

''سو فیصدی؟'' احمد جمال صاحب نے سوال کیا۔

''سر میں پورے وثوق سے کہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ ایسا کیجیے اپنی یہ رپورٹ تحریری طور پر مجھے لکھ کر بھجوا دیں اور اس میں خاص طور سے اس بات کا تذکرہ کیجیے کہ اس عورت کی دیوانگی میں آپ کو سو فیصدی صوفی کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ جائیے یہ رپورٹ جا کر بھجوا دیجیے۔'' ڈی آئی جی نے آخری لہجے میں کہا لیکن جمشید مرزا کے پورے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا تھا۔ اس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس رپورٹ کا نتیجہ کیا ہوگا لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

♥......♥......♥
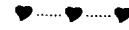
سہیل عالم بارود والا۔ جس قدر خطرناک نوجوان تھا۔ اس کا تجزیہ صوفی کو کتنی ہی بار ہو چکا تھا۔ بہرحال وہ انتہائی باصلاحیت نوجوان تھا۔ صوفی سے اندھی عقیدت رکھتا تھا اور روزا میلسی سے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں صوفی اب انہیں کے مطابق کام کر رہا تھا۔

رائنا کے لیے اس نے انتہائی معقول بندوبست کر لیا تھا اور فی الحال اسے گرین ہاؤس میں پہنچا دیا گیا تھا اور اس کے بعد صوفی نے اس پراسرار عمل کا آغاز کر دیا تھا جس کے نتیجے میں وہ اس وقت اس عمارت میں موجود تھے۔ سہیل چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور صوفی کے طرز زندگی پر عش عش کر رہا تھا۔ واقعی کمال کی بات تھی۔ انسان جس قدر اپنے آپ کو تعیشات کا عادی بنا لیتا ہے اس کی زندگی خود اسی پر مشکل ہوتی چلی جاتی ہے۔

اس بانوں کی چارپائی پر سہیل جتنی تکلیف کی حالت میں لیٹا ہوا تھا صوفی اتنا ہی مزے سے گھٹنوں میں سر دیئے بے فکری کی گہری نیند سو رہا تھا۔ ایک تو جگہ کی تبدیلی اور دوسری تکلیف دہ چارپائی کی وجہ سے سہیل کو کوشش کے باوجود نیند نہیں آئی تھی۔ وہ ان معاملات پر غور کر رہا تھا۔ بس صوفی نے اچانک ہی اس سے کہا تھا کہ سہیل چلنا ہے۔ پھر ضروری انتظامات کے بعد وہ وہاں سے چل پڑے تھے۔ کافی فاصلہ طے کیا گیا تھا اور اس کے بعد وہ آزاد علاقے کی ایک پہاڑی ریاست کے قریب پہنچ گئے تھے۔ یہ ریاست خصوصی پہاڑی روائتوں کی آئینہ دار تھی۔ جہاں قدم قدم پر خونریز ہنگامے جنم لیتے ہیں۔ جہاں پستول اور رائفل کا استعمال بچوں کا کھیل ہوتا ہے۔

بہرحال یہ ساری کارروائی صوفی نے تنہا ہی کی تھی اور اس کے بعد اس نے واپسی کے لیے فیصلہ کر لیا تھا۔ سہیل عالم کو یہ نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ صوفی یہاں کیا کیا کرتا رہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس راستے میں دن کی روشنی میں بھی سفر کرنا مشکل ہوتا ہے اور اب یہ کہ رات کی تاریکی میں لیکن...... ظاہر ہے وہ کسی قسم کی مفاہمت نہیں کر سکتا تھا اور اب اس کے نتیجے میں یہ رات اس ویران عمارت میں بسر ہو رہی تھی۔ سہیل نے ایک گہری سانس لے کر اس آبادی کے بارے میں سوچا۔ ان علاقوں میں خاص قسم کی روایتیں عمل کرتی ہیں۔ یہاں قدیم دشمنیاں بھی بڑی مشہور تھیں۔ اکثر قبیلوں میں آپس میں چلتی رہتی تھیں جس کی وجہ سے راستے بند ہو جاتے تھے۔ لوگوں کو وارننگ دی جاتی تھی کہ وہ ان راستوں سے نہ گزریں جہاں قبیلوں کی جنگ ہو رہی ہے لیکن طویل عرصے سے اس علاقے میں کوئی جنگ نہیں ہوئی تھی۔ پتا نہیں رائنا نے صوفی کو کیا تفصیلات بتائی تھیں جس کی وجہ سے وہ سہیل کو لے کر یہاں تک چلا آیا تھا۔ سہیل اگر چاہتا تو انکار بھی کر سکتا تھا لیکن اس کی دلی خواہش ہوتی تھی کہ صوفی کے ساتھ کارروائی کرے اس وقت ایک بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ سہیل کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند ضروری تھی۔ ورنہ دوسرے دن ڈرائیونگ بھی نہیں ہو سکے گی۔

وہ کروٹیں بدلتا رہا اور پھر اس کی آنکھوں میں غنودگی تیرنے لگی۔

لیکن اچانک اس کے حساس کانوں نے ایک ہلکی سی آواز سنی اور وہ چونک پڑا۔ اس نے گردن گھمائی دروازے میں نظر آنے والے سائے نے چند لمحوں کے لیے آہٹ لی اور پھر اندر داخل ہو گیا۔ سہیل ایک دم سنبھل گیا تھا۔ بظاہر وہ سوتا بن گیا لیکن آنکھوں کی جھری سے وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اندر آنے والا صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے بدن پر سر سے پاؤں تک ایک سیاہ لبادہ تھا۔ آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے۔ اس کے علاوہ جو چیز سہیل نے دیکھی وہ ایک چمک دار خنجر تھا جو سائے کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ سایہ اندر آ کر رکا پھر اس نے دونوں چارپائیوں کی طرف دیکھا اور اس کے بعد اس نے سہیل کی چارپائی کی طرف رخ کیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ سہیل کے سر پر پہنچ گیا۔ چند لمحوں کے لیے رکا اور پھر اس کا خنجر والا ہاتھ بلند ہو گیا اور سہیل کے اعصاب تن گئے۔

جوں ہی سایہ اس پر وار کرنے کے لیے جھکا سہیل تڑپ کر دوسری طرف ہو گیا۔ خنجر چارپائی میں گھس گیا تھا۔ اس سے قبل کہ سایہ سنبھلتا سہیل نے سائے پر سواری گانٹھ لی اور اس کے خنجر والے ہاتھ کو پکڑنے

میں کامیاب ہو گیا لیکن سایہ بھی غضب کا پھرتیلا تھا۔ اس نے سہیل کو پشت پر لاد کر زمین پر دے مارا اور اس کے بعد اس نے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی لیکن اس دوران نہ تو سایہ اور نہ سہیل ہی یہ دیکھ سکے تھے کہ صوفی نے بھی اپنی چارپائی چھوڑ دی ہے۔

جوں ہی سایہ دروازے پر پہنچا صوفی کی آواز سنائی دی۔

''درویش رحم کریں تم پر...... کہاں جا رہے ہو؟'' سایہ بری طرح اچھلا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی صوفی نے اس کے دونوں ہاتھوں پر گرفت قائم کر دی۔ سایہ ایک دم بل کھا گیا اور اس نے بڑی برق رفتاری سے اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے حلق سے ایک کراہ سی نکل گئی۔ غالباً صوفی نے کوئی عمل کیا تھا اور سایہ ٹیڑھا ہو کر اس کے پیروں میں آ رہا تھا۔ خنجر اب بھی اس کے ہاتھوں میں دبا ہوا تھا۔ نیچے گرتے ہوئے پھر پلٹا لیکن صوفی نے اپنا پاؤں اس کی کلائی پر رکھ دیا اور مدہم لہجے میں بولا۔

''اماں...... اس طرح کیا نزاکتوں سے بل کھا رہے ہو۔ درویشیوں کی دعاؤں سے کوئی مردانہ قسم کا ار کرو۔'' سائے نے اب بھی ہار نہیں مانی تھی۔ وہ مارشل آرٹ کا پوری طرح واقف معلوم ہوتا تھا۔ چناں چہ ں نے دونوں ہاتھ دبے ہونے کے باوجود ایک داؤ لگایا اور اس کا پورا جسم اوپر اٹھ آیا۔ اس کی دونوں ٹانگوں نے صوفی کی گردن میں قینچی ڈال دی اور اسی وقت صوفی نے اس کی پسلیوں پر کوئی عمل کیا اور سایہ ایک بار پھر ایک کرب ناک چیخ کے ساتھ نیچے آ رہا۔ صوفی نے اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر تیز لہجے میں کہا۔

''بس جان من اس سے زیادہ گڑبڑ مت کرو۔ اگر خدانخواستہ ہمیں بھی غصہ آ گیا درویشیوں کی دعاؤں سے تو پھر کوئی دعا بھی تم پر کام نہیں کر پائے گی۔'' سایہ نڈھال ہو گیا تھا۔ اسے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ مدمقابل بڑی انوکھی قوتوں کا مالک ہے۔ صوفی نے اس کے ہاتھ سے خنجر نکالا اور اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

''درویشیوں کا کرم تم پر شامل ہے۔ اب بس بھی کرو۔'' سائے کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل سکی تھی۔ صوفی نے اسے اٹھا کر کھڑا کیا۔ اب سایہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ صوفی نے سہیل کی طرف اشارہ کیا۔

''ان کی بندش ختم کر دو۔ ذرا ہم بھی تو دیکھیں کون صاحب ہیں اور ہم تک کیوں زحمت فرمائی ہے۔ درویشیوں کے کرم سے۔'' سہیل آگے بڑھ آیا۔ اس نے سیاہ پوش کے نقاب کو کھینچ لیا لیکن دوسرے ہی لمحے دونوں کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکل گئیں۔ لبادے کے نیچے سے جیسے چاند طلوع ہو گیا ہو۔ لمبے لمبے اخروٹی رنگ کے بال، روشن نیلی آنکھیں، دودھ کی طرح سفید حسین چہرہ۔

♥......♥......♥

جمشید مرزا تقدیر کو ہی کوس رہا تھا۔ اس کے علاوہ بے چارہ کرتا بھی کیا۔ سیدھا قدم اٹھاتا تھا الٹا پڑ جاتا تھا۔ آفس میں واپس آنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو چھتیس گالیاں دی تھیں اور کہا تھا کہ کیا مصیبت پڑی تھی مگر پھر اسے ایک اور احساس بھی ہوا تھا وہ یہ کہ صوفی پیر پرست آدمی ہے۔ درحقیقت بہت سے معاملات میں اس کی شخصیت بہت ہی پراسرار ہو جاتی تھی۔ واقعی کہیں اس پر بزرگوں اور درویشیوں کا سایہ نہ ہو اور اس کے خلاف اٹھنے والا ہر قدم، اس کے مخالف شخص کے خلاف ہو جاتا ہو۔ بہرحال ظاہر ہے احمد جمال صاحب نے یہ رپورٹ تیار کر کے تحریری طور پر دینے کا حکم دیا تھا۔ اب اس حکم کو ٹالنا اس کے بس کی بات نہیں

تھی۔ اس نے اپنی رپورٹ ڈرافٹ کرائی تھی اور اس کے بعد ٹائپسٹ کو دے دی تھی لیکن پھر یہ سوچتا رہا تھا کہ اب جو کچھ کر بیٹھا ہے اس میں صوفی کی جواب دہی کے لیے کیا الفاظ استعمال کرے گا۔ یہ تو صوفی سے کھلی کھلی دشمنی مول لینے والی بات تھی۔

ڈی آئی جی صاحب تو بس اپنی محکماتی کارروائی کرتے لیکن صوفی جمشید مرزا کی ایسی تیسی کر دیتا۔ ان دنوں صوفی ذرا مزاج میں بھی بگڑا ہوا تھا اور اس کے اندر بڑی سخت گیری پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا اندازہ جمشید مرزا کئی مرتبہ لگا چکا تھا۔

بہرحال وہ سر پکڑ کر بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ اب اسے کرنا کیا چاہیے پھر اچانک ہی اس کی کھوپڑی گھوم گئی۔ اپنی زندگی بلاوجہ اجیرن کر رکھی ہے میں نے۔ آخر میں خود بھی تو انسان ہوں۔ دماغ رکھتا ہوں۔ مجھے خود کوئی کارروائی کرنی چاہیے۔ یہ رپورٹ اپنی جگہ دے دی میں نے۔ وہ ایک الگ بات ہے۔ صوفی نے اگر میرے خلاف کوئی عمل کرنے کی کوشش کی تو اس سے جنگ کروں گا۔

بہرحال مجھے اس سلسلے میں خود بھی کام کرنا چاہیے تاکہ کوئی جواز پیدا ہو سکے اور اس کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ گھر آ کر لباس تبدیل کیا۔ وردی اتار دی اور پھر گاڑی لے کر چل پڑا۔ بیوی کو اس نے یہ ہی بتایا تھا کہ ایک سرکاری کام میں تفتیش کرنی ہے لیکن وردی میں نہیں۔ البتہ شناختی کارڈ اس نے اپنے لباس میں رکھ لیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اس عمارت میں پہنچ گیا جہاں روزا میلسی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی اور جس کے بارے میں اس نے اپنے ماتحتوں سے معلومات حاصل کرائی تھیں۔ ہارن دینے پر دروازے پر طویل القامت چوکیدار نظر آیا۔ سرخ و سفید رنگ کے چوکیدار نے گہری نگاہوں سے جمشید مرزا کو دیکھا اور پھر گیٹ کھول دیا۔

جمشید مرزا بڑے اطمینان سے کار پورچ تک لے گیا۔ پھر انجن بند کر کے نیچے اتر آیا۔

چوکیدار بہ دستور گیٹ پر کھڑا ہوا تھا لیکن سامنے برآمدے میں ایک شخص اس انداز میں کھڑا تھا جیسے جمشید مرزا کا استقبال کرنے آیا ہو۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

''تشریف لائیے جناب...... آئیے آئیے۔'' اس کے انداز میں بڑی نرمی اور خوش اخلاقی تھی۔

جمشید مرزا اس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ پھر بولا۔

''ادھر تشریف لائیے انٹرویو روم اس طرف ہے۔'' اس نے کہا اور جمشید مرزا اسے گھورتا ہوا اس کے ساتھ چل پڑا۔ پھر وہ انتہائی خوب صورت ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔ اس شخص نے کہا۔

''آپ یہاں تشریف رکھیں پاشا آنے ہی والے ہوں گے۔'' اس شخص نے کہا اور باہر نکل گیا۔

جمشید مرزا ایک لمحے تک تو چکرا گیا تھا لیکن پھر وہ ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھ کر ان نام نہاد پاشا صاحب کا انتظار کرنے لگا۔ اسے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ جو کچھ بھی چکر ہے وہ بڑے اونچے پیمانے کا ہے۔

وہ تو یہاں کسی اور مقصد کے تحت ہی آیا تھا لیکن یہ پاشا صاحب پھر جو شخص اندر داخل ہوا وہ واقعی ایک اچھی پرسنلٹی کا مالک تھا۔ دبلی پتلی جسامت لمبا قد آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ جمشید مرزا کو دیکھ کر اس نے خوش اخلاقی سے گردن ہلائی اور بولا۔

''مجھے پاشا کہتے ہیں۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی سر! ویسے میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس عمارت میں کوئی غیر قانونی کام نہیں ہوگا۔ میں اپنے کچھ نظریات رکھتا ہوں۔ تھوڑی سی دولت کمائی ہے۔ میرے پاس اسے خرچ کرنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں نے سوچا کچھ رفاہ عامہ کا ہی کام کیا جائے اور بس سمجھ لیجیے میں اسی میں مصروف ہوں۔ آپ کو میں پوری طرح یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا یہ گھر جیسا میں نے آپ سے لیا ہے ویسا ہی واپس ملے گا۔ کرایہ بھی وقت پر پہنچتا رہے گا۔ میرے لائق اور کوئی خدمت ہو تو مجھے بتائیے۔'' جمشید مرزا کے سر میں کھجلی ہونے لگی تھی۔ یہ شخص جو بکواس کر رہا ہے وہ سمجھ میں آ رہی تھی۔ غالباً اس نے یہ گھر کرائے پر لیا تھا اور وہ جمشید مرزا کو شاید مکان مالک سمجھ رہا تھا۔ جمشید مرزا نے کہا۔

''آپ کا پورا نام کیا ہے پاشا صاحب!''

''فاضل حسین پاشا۔''

''پاشا صاحب آپ مجھے جو سمجھ رہے ہیں وہ میں نہیں ہوں۔ غالباً آپ مجھے مکان مالک سمجھ رہے ہیں۔''

''تو پھر؟'' پاشا کا منہ حیرت سے کھل گیا اور جمشید مرزا نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر پاشا کو دیا۔ پاشا نے اسے دیکھا اور شدید حیران ہو گیا۔

''سس...... سس...... سوری...... سوری سر۔ اصل میں یہ مکان میں نے کرائے پر لیا ہے۔ آج دوسرا ہی دن ہے۔ پراپرٹی ڈیلروں نے مجھ سے کہا تھا کہ مکان مالک آج میرے گھر آ کر مجھ سے ملاقات کر لیں گے۔ باقی سارے کام تو طے ہو گئے ہیں۔ ادائیگیاں وغیرہ بھی طے ہو گئی ہیں۔ بس ایک دوسرے سے ملاقات کر لی جائے گی۔ میں مکان مالک کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ آپ کو میں نے یہی سمجھا۔''

''کوئی بات نہیں ہے پاشا صاحب اصل میں چند روز پہلے یہاں ایک غیر ملکی عورت اور اس کے چار ساتھی مقیم تھے۔ انہوں نے ایک شخص کو اغوا کیا اور یہاں لا کر اس پر تشدد کیا۔ ہمارے پاس اس کی رپورٹ موجود تھی۔ چناں چہ ہم تحقیقات کر رہے تھے۔ اس مکان کو جان بوجھ کر سیل نہیں کیا گیا تھا۔ کیونکہ ہم ان لوگوں پر ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے۔ پھر حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہی عورت اپنے چار ساتھیوں کے ہمراہ سڑکوں پر پاگلوں کی طرح پھرتی پائی گئی ہے اور یہ واردات کچھ اس طرح الجھ گئی ہے کہ اس کے سلسلے میں تحقیقات کرنا ضروری ہے۔'' پاشا کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے کہا۔

''اس حرام زادے پراپرٹی ڈیلر نے مجھے ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔ ورنہ میں بھول کر بھی یہ مکان نہ لیتا آفیسر...... کسی بھی طرح کے کسی بھی واقعہ سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ جس طرح چاہیں تحقیقات کر لیں بلکہ اب تو میں آپ سے مدد بھی مانگنا چاہتا ہوں۔ کیا مجھے یہ مکان کرائے پر رکھنا چاہیے یا میں اسے چھوڑ دوں۔''

''نہیں...... مکان پولیس کی کسٹڈی میں نہیں ہے۔ آپ یہاں آرام سے رہیں لیکن خیال رکھیے گا کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوتی ہے تو میرا آپ سے رابطہ رہے گا۔''

''بہت بہتر۔'' جمشید مرزا اپنی جگہ سے اٹھا تو وہ شخص جلدی سے بولا۔

''نہیں آفیسر کچھ ڈرنک وغیرہ؟''

''ڈیوٹی پر ہوں۔ او کے، ضرورت پڑی تو دوبارہ آپ سے ملاقات کروں گا۔ جمشید مرزا وہاں سے نکل آیا۔ بے مقصد رہا تھا۔ یہاں تک آنا اور کوئی صحیح بات نہیں ہو سکی تھی۔

♥...... ♥...... ♥

ایک لمحے کے لیے تو صوفی بھی دنگ رہ گیا تھا۔ لڑکی سے اسے اس خوف ناک جدوجہد کی توقع نہیں تھی۔ جو کچھ لڑکی نے کیا تھا وہ کسی لڑکی کا کام نہیں تھا۔ بہرحال لڑکی نے ان کی اس حیرت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور دوسرے ہی لمحے وہ برق کی طرح کوندی اور دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ سہیل تک بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے کیا کرنا چاہیے لیکن صوفی صنف نازک کی نزاکت اور اس کی حفاظت کا قائل نہیں تھا۔

چناں چہ لڑکی کے ساتھ ہی اس نے بھی دروازے کی طرف چھلانگ لگائی۔ لڑکی دروازے سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور اب ایک راہداری میں دوڑ رہی تھی۔ اس کی پھرتی کو دیکھ کر خدشہ تھا کہ وہ کھنڈر کے کسی حصے میں روپوش نہ ہو جائے لیکن بات صوفی کی تھی اور جو کچھ ہوا وہ بھی صوفی ہی کر سکتا تھا۔ لڑکی کے ریشمی بال اس کے ہاتھ میں آ گئے تھے لیکن اس کے حلق سے غراہٹ نکلی اور وہ ایک پاؤں پر گھومی اور اس کی لات صوفی کے سینے کی طرف چلی۔

لیکن اسی وقت صوفی نے غیر متوقع طور پر اس کے بال چھوڑ دیئے اور دوسرے ہی لمحے لڑکی کی ٹانگ صوفی کے ہاتھ میں تھی۔ لڑکی ایک ٹانگ پر اچھل رہی تھی۔ شاید اسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ مدِ مقابل نابینا ہے اور اس کی بینائی لڑکی کے خوب صورت نقوش سے متاثر نہیں ہو رہی۔ چناں چہ کوئی داؤ کارگر نہیں ہو رہا تھا اور وہ صرف اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

پھر اس کے منہ سے گالیاں ابل پڑیں۔

''غلیظ کتے دیکھتی ہوں تو میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔'' وہ بھر کر بولی۔

''در...... ور...... درویش تم پر بھی رحم کریں اور مجھ پر بھی...... مم...... مگر عزیزہ گرامی۔ آپ خود اس طرح کی حرکتیں فرما رہی ہیں۔ انسان بنیے انسانوں کی طرح گفتگو کیجیے آئیے اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

''بکو...... مت۔ میں کہیں بھی نہیں جاؤں گی۔'' وہ چیخ کر بولی۔

''پپ...... پپ...... پھر۔''

''پھر...... تشریف لے جائیے۔ درویشیوں کی دعاؤں سے۔''

''کیا مطلب؟''

''بھاگ جائیے...... بھاگ جائیے۔'' صوفی نے نڈھال لہجے میں کہا۔

''نہیں بھاگوں گی۔'' لڑکی غصیلے لہجے میں بولی۔

''پپ...... پھر آپ کو مونگ دلنا آتی ہے۔'' درویشیوں کے کرم سے۔''

''بکواس مت کرو۔'' وہ بولی اور پھر چونک کر سہیل کی طرف دیکھنے لگی جو قریب پہنچ گیا تھا۔ صوفی نے کہا۔

"سہیل میاں...... خاتون ہماری بھاگ دوڑ سے ناراض ہو رہی ہیں۔ آپ ذرا انہیں سمجھانے کی کوشش کیجیے کہ ہم تو صرف ان سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔"

"آپ اندر آ جائیے۔" سہیل نے کہا۔

"بکواس مت کرو۔ میں نہیں جاؤں گی۔"

"تو پھر اس غریب بوڑھے کی دال روٹی کا تو انتظام کر دیجیے گا۔"

"لعنت ہے اس پر۔"

"یہ بری بات ہے۔ وہ آپ کے لیے روٹیاں اور دال زیادہ مقدار میں پکا کر چھوڑ دیتا ہے۔ آپ اس پر لعنت بھیج رہی ہیں۔" لڑکی کے چہرے پر الجھن کے نقوش نمودار ہو گئے اور وہ انہیں گھورنے لگی۔ منہ سے کچھ نہیں بولی تھی۔

"محترمہ کم از کم یہ تو بتا دیجیے کہ آپ نے ہم غریبوں کی زندگی لینے کی کوشش کیوں کی تھی۔"

"آہ...... کاش میں تمہیں قتل کر سکتی۔"

"ہر بشر کو ہے یہ لازم، صبر کرنا چاہیے۔"

"جب کھڑی ہو جائے گاڑی۔ تب اترنا چاہیے۔ مم...... مم...... میرا مطلب ہے دوسرا شعر اضافی ہو گیا فارسہ میں۔ معشوق نشیلے ہوتے تو اسی شعر کو فارسہ میں تبدیل کر دیتے۔"

ویسے ایک بار کی ناکامی سے بددل نہیں ہوا کرتے۔ دوبارہ کوشش فرمائیے گا۔ ہو سکتا ہے آپ کو کامیابی حاصل ہو جائے۔"

"مجھے جانے دو۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"آپ ہم سے چند باتیں فرما دیجیے گا۔ اس کے بعد ہماری کیا اوقات کہ ہم آپ کو روکیں۔ حق اللہ۔ آخر تم ہو کون؟"

"اب تو آپ سے پوچھنا پڑے گا۔ چوں کہ آپ نے ہمیں قتل کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ظاہر ہے ہمارے بارے میں آپ ہم سے بہتر جانتی ہوں گی۔"

"مجھے معاف کر دو میں تمہیں غلط سمجھ بیٹھی تھی۔"

"اور اگر تمہارا خنجر کا وار کامیاب ہو جاتا تو پھر کس سے معافی مانگتیں۔" سہیل نے کہا۔

"میں شرمندہ ہوں۔"

"صرف شرمندہ۔ اب آپ یہ فرما دیجیے کہ آپ ہمیں ہلاک کیوں کرنا چاہتی تھیں۔"

"قسم کھاتی ہوں غلط فہمی ہو گئی تھی۔" اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"آپ کتنے دن سے یہاں پوشیدہ ہیں خاتون۔" صوفی نے پوچھا۔

"بس چند روز سے۔"

"بوڑھے چوکیدار کا پکایا ہوا کھانا آپ ہی کھا لیتی ہوں گی ظاہر ہے۔"

"ہاں......"

"کن لوگوں کے دھوکے میں ہم پر حملہ کیا تھا۔"

"یہ نہیں بتا سکوں گی۔"

"کچھ مدد کر سکتے ہیں ہم آپ کی؟"

"بہت شکریہ۔ بس یہی کرم ہوگا تمہارا اگر کسی سے میرا تذکرہ نہ کرو۔" لڑکی نے کہا اور پھر بولی۔

"جاؤں؟"

"تشریف لے جائیے۔" صوفی نے کہا اور لڑکی نے تیزی سے سامنے کی سمت چھلانگ لگا دی۔

سہیل ایک دم اس کے پیچھے لپکنے کے لیے تیار ہوا لیکن صوفی نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"ٹھیک ہے جانے دو۔ اسے یقیناً غلط فہمی ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے ہمیں آرام کرنا چاہیے۔" صوفی نے کہا اور سہیل کا بازو پکڑ کر واپسی کے لیے پلٹ پڑا۔ پھر وہ اطمینان سے جا کر پلنگ پر لیٹ گیا تھا اور سہیل پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ جہاں صوفی ایک کارآمد شخصیت اور اعلیٰ ترین ذہانت کا مالک ہے وہیں کبھی کبھی اس قدر تکلیف دہ ہو جاتا ہے کہ اسے برداشت کرنا ہی مشکل ہو جائے۔ دوسری صبح دونوں کافی دیر سے بیدار ہوئے تھے۔ بوڑھا چوکیدار دروازے کے باہر انتظار کر رہا تھا۔ وہ جاگے تو چوکیدار اندر آ گیا۔

"چائے بنا لی ہے سرکار۔ دودھ نہیں ملا۔ آپ بغیر دودھ کی چائے پی لیں گے۔"

"حق اللہ کیا بات ہے۔ بغیر دودھ کی چائے کی۔" صوفی نے کہا اور بوڑھا خوش ہو گیا۔ کنویں کے تازہ پانی سے ان دونوں نے منہ ہاتھ دھویا۔ پھر چائے کے ساتھ روٹی کھائی۔ ناشتے کے بعد صوفی نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ تمہارا بابا۔ اجازت دو۔"

"سرکار آپ نے ہماری عزت کی ہے۔ خدا آپ کو عزت دے گا۔" صوفی نے کچھ نوٹ جیب سے نکال کر بوڑھے کی جیب میں ٹھونس دیئے اور اس کے بعد وہ لوگ کار کی طرف چل پڑے۔ سہیل نے کار کی ٹنکی چیک کی اس میں کچھ اور پٹرول ڈالا اور پھر اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ کافی فاصلہ خاموشی سے طے ہوا تھا۔ پھر سہیل ہی نے کہا۔

"بہت سی باتیں ذہن میں پھڑک رہی ہیں۔ صوفی صاحب پتا نہیں جواب ملے گا یا نہیں۔"

"ضرور ملے گا درویشیوں کی دعاؤں سے۔"

"آپ کے خیال میں لڑکی اس عمارت میں کیا کر رہی تھی؟"

"اس نے تمہارے سامنے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ پھر مجھے کہاں سے کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔"

"ویسے بڑی پھرتیلی لڑکی تھی۔ پتا نہیں یہاں سے فرار ہو کر کہاں پہنچی ہو گی۔"

"ہاں...... اب وہ اس عمارت میں نہیں ہے درویشیوں کے کرم سے۔"

"ظاہر ہے اب اس کا یہاں رکنا ممکن بھی نہیں تھا مگر پتا نہیں کہاں فرار ہو گئی۔"

"اماں جائے گی کہاں درویشیوں کی دعاؤں سے ہمارے ساتھ ہے۔ پیچھے ڈکی میں چھپی ہوئی بیٹھی ہے۔ اصل میں اسے بھی وہیں جانا ہے جہاں ہم جا رہے ہیں لیکن کوئی موقع نہیں مل سکا ہوگا۔ بھلا اس

سے اچھا ذریعہ سفر اور کیا ہو سکتا ہے۔ مفت سواری درویشیوں کے کرم سے۔"

"کک...... کک...... کیا مطلب۔ ڈکی میں۔ ہماری گاڑی کی ڈکی میں۔"

"ہاں...... ہاں...... اسی کی بات کر رہا ہوں۔"

"آپ کمال کرتے ہیں صوفی صاحب۔ کیا واقعی ایسا ہے۔"

"چاہو تو دیکھ سکتے ہو۔"

"نہیں میرا مطلب ہے اس نے آپ کو یہ بات بتا دی تھی۔"

"یار سہیل عالم بارود والا کبھی کبھی بے وقوفیوں کی باتیں کرنے لگتے ہو۔ اگر ہم سے اجازت لیتی تو ڈکی میں کیوں سفر کرتی۔ ہمارے ساتھ بیٹھی ہوتی۔"

"تو پھر آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"کمال ہے۔ اتنی اتنی سی باتیں پتا چلانے کے لیے کیا کوئی بہت بڑا کام کرنا پڑتا۔"

"آپ زیادہ آگے کی باتیں جانتے ہیں۔"

"ہاں...... بس یوں سمجھ لو کہ یہاں جس معاملے کے لیے آئے تھے۔ لڑکی کا تعلق بھی اسی معاملے سے ہے۔"

"تت...... تت...... تو پھر آپ نے اسے اس طرح کیوں نکل جانے دیا۔"

"تو پھر کیا کرتے۔ کسی لڑکی کو اپنی تحویل میں رکھنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہوتا ہے۔"

"مطلب یہ کہ آپ کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔"

"ضرورت پوری ہو تو گئی۔" صوفی نے جواب دیا۔

"یعنی۔"

"بھئی وہ اپنی خوشی سے ہمارے ساتھ سفر کر رہی ہے۔"

"میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔" سہیل نے کہا۔

"دیکھ لو۔ بے چاری پتا نہیں کب سے بھوکی ہوگی۔ اسے بھی کچھ کھانے کو دو۔ سفر ابھی کافی ہے۔ یقیناً اس نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ حق اللہ۔" صوفی نے کہا اور سہیل نے ایک گہری سانس لے کر گاڑی روک دی۔ پھر اس نے کھانے پینے کا سامان اٹھایا اور نیچے اتر گیا۔ ڈکی پر نظر پڑتے ہی اسے یوں لگا جیسے کوئی اسے اندر سے پکڑے ہوئے ہے۔ سہیل نے ایک جھٹکے سے ڈکی کو اٹھایا۔ لڑکی واقعی اندر موجود تھی۔ دن کی روشنی میں وہ رات سے بھی زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔ سہیل نے اسے دیکھ کر ایک گہری سانس لی اور کہا۔

"میں صرف یہ کھانے پینے کا سامان لے کر آیا ہوں محترمہ اسے کھا لیجیے ورنہ بھوک سے مر جائیں گیں۔ کافی نہیں مل سکے گی کیوں کہ وہ ختم ہو چکی ہے۔ اس نے کھانے کا سامان لڑکی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور لڑکی کا چہرہ حیرت کی تصویر بن گیا۔ صوفی بھی نیچے آ گیا تھا۔ لڑکی چند لمحات خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر بولی۔

"تت...... تت...... تو آپ کو میرے بارے میں معلوم تھا۔"

"دیکھو بی بی یہ چیزیں کھا لو۔ انسانیت کے رشتے سے یہ ضروری ہیں اس کے بعد شہر میں تم جہاں جانا چاہو گی تمہیں حفاظت سے پہنچا دیا جائے گا۔ لڑکی نے ایک گہری سانس لی اور اس کے بعد اس نے کھانے پینے کا سامان ان کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے کھانے لگی۔ کھانے سے نمٹی تو صوفی نے پوچھا۔

"چلیں؟"

"ہیں...... ہاں...... ہاں۔ لیکن میں یہاں ڈکی میں ہی ٹھیک ہوں۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔ کچھ لوگ ڈکی ہی میں ٹھیک رہتے ہیں درویشیوں کی دعاؤں سے۔ صوفی نے کہا اور اس کے بعد وہ کار میں جا بیٹھے۔" سہیل نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی تھی۔ تھوڑا سا سفر کرنے کے بعد اس نے کہا۔

"مرشد! آپ نے صحیح معنوں میں مجھے مرغا بنا کر رکھ دیا ہے۔"

"نہیں صحیح معنوں میں تو مرغے نہیں بنے۔ ورنہ تمہارے منہ سے اذان کی آوازیں نکلنی چاہیے تھیں۔"

"آپ یقین کریں میں شدید حیران ہوں۔ کتنے اعتماد سے آپ نے یہ بتا دیا کہ وہ ڈکی میں موجود ہے۔ ویسے بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ کسی سے خطرہ محسوس کر رہی ہو۔"

"ہاں...... ایسا ہی لگ رہا ہے۔"

"اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے انہی لوگوں کے دھوکے میں ہم پر حملہ کیا ہو۔"

"یہ بھی ممکن ہے۔"

"پھر یہ اندازہ کرنے کے بعد کہ ہم اجنبی ہیں۔ اس نے ہماری گاڑی ہی میں چھپ کر سفر کرنے کا فیصلہ کیا ہو۔"

"درست کہا تم نے درویشیوں کی دعاؤں سے۔"

"مگر وہ ہے کون اور اس کی کس سے دشمنی ہے؟"

"وہ کون ہے؟ اس بارے میں تو ابھی کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا لیکن اس کے دشمن ہم سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ وہ دیکھو سامنے۔" صوفی نے کہا اور سہیل ایک بار پھر چونک پڑا سامنے ہی ایک سیاہ رنگ کا ٹرک سڑک پر اس انداز میں کھڑا ہوا تھا کہ ان کی گاڑی آگے نہیں نکل سکتی تھی۔ سہیل نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کار کی رفتار سست کر دی۔ سیاہ رنگ کے ٹرک پر سفید الفاظ میں پولیس لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کے نزدیک چند لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک لمبی چوڑی جسامت کا آدمی انسپکٹر کی وردی میں نظر آ رہا تھا اور باقی چند افراد کانسٹیبل کی وردی میں۔ انسپکٹر نے گاڑی کو ہاتھ دیا اور سہیل نے گاڑی روک دی۔ اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ انسپکٹر آگے بڑھ آیا۔ اس نے کار کی کھڑکی پر دونوں ہاتھ رکھے اور جھک کر دونوں کو دیکھنے لگا۔

ساتھ ہی اس کی نگاہیں پچھلی سیٹ کا جائزہ بھی لے رہی تھیں۔ پھر اس کا کرخت لہجہ ابھرا۔

"کہاں سے آ رہے ہو؟"

"پچھلی آبادی سے۔"

''کہاں گئے تھے...... کہاں رہتے ہو؟''

''دارالحکومت میں۔''

''وہاں کیوں گئے تھے؟''

''خالو کے انتقال میں۔ خالہ بیوہ ہوگئی ہیں۔ درویشیوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر شدید غم کے آثار ابھر آئے تھے۔

''یہ کون ہے؟ اس بار اشارہ سہیل عالم بارود والا کی طرف تھا۔''

مم...... مم ممانی زاد بھائی ہے۔''

''نیچے اترو۔'' انسپکٹر نے حکم دیا اور صوفی جلدی سے دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ ان دونوں کو ایک طرف کھڑا کر کے انسپکٹر انہیں گھورنے لگا۔ صوفی بہ دستور غم واندوہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ سہیل عالم نے بھی ایسی ہی شکل بنا رکھی تھی۔ سب انسپکٹر نے کہا۔

''ایک لڑکی جس کا رنگ گورا ہے۔ بال سنہری ہیں آنکھیں نیلی ہیں اسے دیکھا ہے تم نے۔'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''ہاں...... ہاں...... دیکھا ہے۔''

''کب...... کتنی دیر ہوئی۔'' انسپکٹر بری طرح چونک پڑا تھا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے ہماری کار کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ہم رکے تو کہنے لگی شہر تک چھوڑ دو۔ مگر جناب ہم ایسے بہت سے قصے سن چکے ہیں درویشیوں کے کرم سے کہ لڑکیاں اس طرح لفٹ مانگتی ہیں اور پھر جان کا عذاب بن جاتی ہیں۔ ہم نے گاڑی بھگا دی۔''

''کہاں دیکھا تھا؟'' انسپکٹر مضطرب لہجے میں بولا۔

''تقریباً تین میل پیچھے۔''

''جھوٹ تو نہیں بول رہے۔''

''پپ...... پولیس سے کون جھوٹ بول سکتا ہے جناب۔'' صوفی خوف زدہ لہجے میں بولا۔

''ڈکی میں کیا ہے؟'' اچانک انسپکٹر نے پوچھا اور سہیل عالم کے جبڑے ایک دوسرے پر بھینچ گئے۔ اس کا مطلب ہے بات ٹلی نہیں۔

''خ...... خ خالی ہے۔'' صوفی بولا۔

''دیکھو......'' انسپکٹر نے اپنے آدمیوں سے کہا اور چار آدمی ڈکی کی طرف بڑھ گئے۔ سہیل نے ایک نظر صوفی کی طرف دیکھا پھر اس کا اشارہ پا کر ڈکی کی طرف پہنچ گیا۔ ڈکی کھلی اور یہ دیکھ کر سہیل دنگ رہ گیا کہ ڈکی خالی تھی۔ لڑکی، کب، کیسے اور کہاں نکل گئی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ انسپکٹر نے گردن ہلا کر پوچھا۔

''کتنی پیچھے ملی تھی وہ؟''

''تقریباً تین میل پیچھے۔''

''پیدل آ رہی تھی۔''

''جی حضور۔ درویشیوں کے کرم سے۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے تم لوگ جا سکتے ہو۔'' انسپکٹر بولا اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ ٹرک کی جانب بڑھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد ٹرک تیزی سے اس سمت روانہ ہوگیا جدھر سے یہ لوگ آ رہے تھے۔ پھر سہیل ناچ سا گیا اس نے کہا۔

''کک...... کک کہاں گئی؟'' صوفی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے ٹرک کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تو صوفی زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا اور بولا۔

''وڈ...... وڈ درویش رحم کریں۔ باہر آ جائیے۔ گاڑی سے تیل ٹپکتا ہے۔ سر میں تیل پڑ جائے گا۔ آ جائیے۔'' سہیل ایک بار پھر چونک پڑا تھا۔ پہلے لڑکی کے دونوں پاؤں باہر نکلے۔ پھر آدھا جسم اور پھر وہ کار کے نیچے سے نکل آئی۔ واقعی اس کے سفید چہرے پر تیل کے چند دھبے پڑ گئے تھے۔ سہیل آنکھیں پھاڑے اس چالاک لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ صوفی نے جیب سے رومال نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''چہرہ صاف کر لیجئے؟'' وہ اطمینان سے رومال لے کر چہرے سے دھبے صاف کرنے لگی۔ پھر اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''اس تعاون کا شکریہ ادا کرنا بیکار ہے ہاں اگر کبھی اس کا صلہ دے سکی تو ضرور دوں گی۔ میں شہر جانا چاہتی ہوں کئی دن سے کوششیں کر رہی ہوں۔ ناکام رہی میرا خیال تھا کہ اب وہ لوگ مایوس ہو چکے ہوں گے لیکن......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''تشریف لائیے۔'' صوفی نے کہا۔ اس بار وہ ڈکی کی طرف نہیں بڑھی تھی۔ اس نے کار کا پچھلا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گئی۔ سہیل نے حسب معمول سٹیرنگ سنبھال لیا اور صوفی اس کے برابر بیٹھ گیا۔ کار چل پڑی تھی۔

''رفتار تیز کرو۔'' صوفی نے کہا اور سہیل نے کار کی رفتار خاصی تیز کر دی۔ اس نے کئی بار عقب نما آئینے میں اس کی شکل دیکھی۔ وہ آنکھیں بند کیے ہوئے اس طرح سیٹ کی پشت سے ٹکی ہوئی تھی جیسے تھک کر سوگئی ہو۔ صوفی بھی خاموش تھا۔ خاصا فاصلہ خاموشی سے گزر گیا۔ پھر اچانک اس کی آواز ابھری۔

''تم نے پوچھا نہیں کہ وہ مجھے کیوں تلاش کر رہے تھے۔''

''پہلے بہت کچھ پوچھ چکے ہیں۔ آپ نے کوئی جواب دیا ویسے یقیناً آپ نے کوئی جرم کیا ہوگا۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چونک کر بولی۔

''ظاہر ہے وہ پولیس والے تھے۔ پولیس والوں کو جرم کرنے والوں کی ہی تلاش ہوتی ہے۔''

''میں تمہیں صورت سے مجرم نظر آتی ہوں۔'' وہ نتھنے پھلا کر بولی۔

''صورت پر نہ جائیے۔ اب آپ مجھے بتائیے۔ کیا میں آپ کو...... مگر چھوڑیئے۔''

''دیکھو...... میری ایک کمزوری ہے۔ بدتمیزی کا بہت جلد برا مان جاتی ہوں اگر تم میرے محسن نہ ہوتے تو میں تمہیں بتاتی۔''

''تو پھر آپ یہ فرما دیجئے کہ انہیں آپ کی تلاش کیوں تھی؟''

"وہ پولیس والے نہیں تھے۔ سمجھے؟" وہ چیخ کر بولی۔

"لیکن وہ سب کے سب پولیس کی وردی میں تھے۔ پولیس کی گاڑی میں تھے۔"

"فراڈ...... بالکل فراڈ۔ میری تلاش بڑے پیمانے پر کی جارہی تھی۔"

"اوہو...... میں سمجھ گیا۔" اس بار سہیل عالم نے کہا اور لڑکی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیا سمجھ گئے؟"

"یقیناً تمہارے سسرال والے ہوں گے۔" سہیل بولا۔

"ہوں...... مذاق کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ بھدا اور بھونڈا۔" اس کے بعد وہ پچھلی سیٹ سے ٹک گئی اور پھر شہر آنے تک کچھ نہیں بولی۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد وہ کئی سڑکوں پر مڑے ایک جگہ صوفی نے سہیل کے شانے پر دباؤ ڈالا اور اس نے کار کی رفتار سست کردی۔

"کیا خیال ہے محترمہ اب جان چھوڑیں گی یا نہیں۔" وہ بولا اور لڑکی نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ چند ساعت وہ ان دونوں کو دیکھتی رہی پھر بولی۔

"شادی ہوگئی ہے تمہاری۔"

"خاندان میں اس کا روج نہیں ہے درویشیوں کے کرم سے۔" صوفی بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تمہاری شادی نہیں ہوئی۔"

"آئندہ بھی کبھی نہیں ہوگی۔ اس خاندان سے شادی کا رواج ہمیشہ کے لیے اٹھ گیا ہے۔"

"تم مجھے اپنے گھر لے چلو۔ میں تمہیں تھوڑی سی تکلیف اور دوں گی ممکن ہے صرف چند گھنٹے یا ایک آدھ دن بڑی مہربانی ہوگی تمہاری۔"

"شش...... شش...... شادی نہیں کروں گا۔ بب...... بب خدا خاندانی روایت کبھی نہیں توڑوں گا۔ درویشیوں کے کرم سے صوفی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"دیکھو میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ مجھ سے بدتمیزی برداشت نہیں ہوگی۔ میں تم سے شادی کروں گی؟"

"ان سے بھی نہیں کروگی؟" صوفی نے سہیل کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"میں تو شادی شدہ ہوں پانچ بچوں کا باپ ہوں۔ صوفی صاحب آپ جانتے ہی ہیں۔ میرے پاس گنجائش کہاں ہے۔"

"ارے تم لوگوں کا دماغ کیوں خراب ہو رہا ہے۔ میں شادی کرنے نہیں جارہی۔ یہ سوال میں نے صرف اس لیے کیا تھا کہ اگر گھر میں خواتین ہوتی ہیں تو جان مصیبت میں ڈال دیتی ہیں۔ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ کیوں آئی ہے؟ میں اس سے بچنا چاہتی تھی۔"

"ہمارے ہاں ایسی خواتین کا مجموعہ ہے اور اس مجموعے کا نام ہے حسینہ بیگم۔" لڑکی نے حسینہ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی خاص خیال میں ڈوب گئی ہو۔ ویسے لڑکی کا کہنا بالکل درست تھا۔ حسینہ کرنل رحیم شاہ کی بھیجی ہوئی تھی اور پھر صوفی کی طبیعت میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ کسی انسان کی تذلیل کرے۔ وہ معشوق نشیلے کو بھی پورا عزت و احترام دیتا تھا جو

زبردستی اس کے گھر آپڑا تھا۔ بہرحال اس وقت حسینہ ہی نے دروازہ کھولا تھا اور جب اس نے ان دونوں کے ساتھ لڑکی کو دیکھا تو اس کی آنکھیں معنی خیز انداز میں گھوم گئیں۔

"وہی ہوا جس سے ڈرتی تھی۔" اس نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑا کر کہا۔ لیکن صوفی یا کسی نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی تھی۔ لڑکی بہ غور اس عمارت کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"بڑی خوب صورت جگہ ہے۔ تم میں سے کس کا ہے یہ گھر۔"

"ارے بھیا گھر والی آگئی اللہ کے کرم سے۔ بی بی تم نے دونوں میں سے کس کو چنا ہے۔" لڑکی نے حقارت سے حسینہ کو دیکھا اور بولی۔

"یہ نوکرانی ہے۔"

"بب...... بب...... بب......" صوفی کوئی جملہ پورا نہیں کرسکا۔ حسینہ نے کہا۔

"میں جو کچھ بھی ہوں بی بی ہر ایک کو اوقات میں رکھنا جانتی ہوں۔"

"تم آؤ......" صوفی نے کہا اور لڑکی کو ساتھ لے کر آگے بڑھ دیا۔ حسینہ نے ہاتھ سیدھا کر کے سہیل کو روک لیا اور سہیل رک کر اسے دیکھنے لگا۔

"تم کہاں چلے پیچھے پیچھے...... آئے...... ایک بات کہوں۔ وہ جو ہے اسے کوئی گھاس نہیں ڈالنے کی۔ میں تو بس تمہاری طرف سے فکرمند رہتی ہوں۔ وہ جو کہتے ہیں ناں کہ بروں کا ساتھ برا۔"

"آپ صوفی صاحب کے بارے میں کہہ رہی ہیں حسینہ صاحبہ۔"

"اللہ تمہیں خوش رکھے۔ بولتے ہو تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ اللہ نے شکل ہی ایسی ہی پیاری بنائی ہے۔ تو بات وہی ہوتی ہے ناں کہ جیسی روح ویسے فرشتے۔"

"جاسکتا ہوں اندر؟"

"کیوں...... میرے پاس کھڑے ہو کر کیا جان نکل رہی ہے۔ آؤ میرے ساتھ آؤ۔ چائے پلاؤں گی۔" حسینہ نے کہا۔ ادھر صوفی لڑکی کو لے کر اندر پہنچ گیا۔ وہ غور سے اس کے سجے ہوئے کمرے کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے سیٹی بجانے والے انداز میں ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا۔

"تم تو اچھے خاصے مال دار آدمی ہو۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔"

"آپ نے ہمیں اٹھائی گیر سمجھا تھا۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"نہیں ایسا بھی نہیں ہے۔ ویسے تم واقعی ایک پراسرار آدمی ہو۔ میں تو اتفاقیہ طور پر تم سے ملی تھی۔"

"مجھے ایک بات کا افسوس ہے۔" صوفی نے کہا۔

"کیا؟"

"تم اس بے چارے غریب چوکیدار کی دال روٹیاں چرالیا کرتی تھیں۔"

"مجھے غصہ مت دلاؤ۔ سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی ٹھونس آئی ہوں اس کے سامان میں۔ اگرچہ چرا کر نہ کھاتی تو اور کیا کرتی۔ اس کے سامنے جاتی اور اس کے علم میں آ کر رہتی اور وہ لوگ ادھر آ نکلتے تو وہ انہیں میرے بارے میں بتا نہ دیتا۔"

''ہاں......اس کا خطرہ تو تھا۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''دیکھئے یہ تم کیا......درویش درویش لگائے رکھتے ہو۔ اس کے بغیر بات نہیں کر سکتے۔''

''یہیں سے میرا اور تمہارا اختلاف شروع ہو جائے گا۔ بی بی درویشوں سے میرا جو رشتہ ہے، میں اس کے درمیان کسی کو برداشت نہیں کر سکتا۔''

''شکل سے بھی مجاور ہی لگتے ہو کسی مزار کے۔''

''آپ اسے معمولی بات سمجھ رہی ہیں محترمہ۔ کسی بزرگ کے مزار کا مجاور ہونا بڑا اعزاز ہے کہ جس کے بارے میں آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ خیر چھوڑیئے......دیکھئے یہ باتھ روم ہے۔ ہاتھ منہ دھو کر حلیہ درست کر لیجئے۔ آپ کے پاس کوئی اور لباس تو نہیں ہوگا۔''

''یہی پہن لوں گی مجھے کون سا کسی پارٹی میں شریک ہونا ہے۔ البتہ پلیز کھانا جلدی لگوا لو۔ مجھے بڑی زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔''

''آپ حلیہ درست کر لیجئے۔'' صوفی باہر نکل آیا۔ حسینہ کو کھانا لگانے کے لئے کہا اور وہ بڑبڑاتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ سہیل عالم نے کہا۔

''صوفی صاحب آپ نے کیا کیا تماشے لگا رکھے ہیں گھر میں، کیسے برداشت کر لیا کرتے ہیں آپ۔''

''نہیں انسان ہر حال میں قابل برداشت ہوتا ہے۔'' تھوڑی دیر کے بعد وہ کھانے کی میز پر تھے لڑکی نے آنے کے بعد سے اب تک کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف تھی۔ باقی لوگ بھی اس کے ساتھ شریک تھے۔ سہیل البتہ گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

ویسے ابھی تک صحیح معنوں میں کوئی صورت حال اس کے ذہن میں واضح نہیں تھی۔ میلسی سے جو معلومات اسے حاصل ہوئی تھیں وہ نہ جانے کیوں اس نے اپنے آپ تک ہی محدود رکھی تھیں اس سلسلے میں سہیل کو کوئی تفصیل نہیں بتائی تھی۔ سہیل نے ایک آدھ بار سوال کیا تھا۔ تو صوفی اس سوال کو ٹال گیا تھا اور سہیل جانتا تھا کہ صوفی اگر کسی سوال کو ٹال جائے تو اس کے پس پردہ کوئی بات ہوتی ہے۔ اس قدر احترام کرتا تھا وہ صوفی کا کہ اس کے بعد اس نے صوفی سے اس موضوع پر کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کے ذہن میں تجسس شدید تھا۔ بہر حال لڑکی نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا اور پھر کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔

''اب کیا ارادہ ہے؟''

''تھوڑی دیر سو جانے کی اجازت دے دو گے۔'' لڑکی نیم غنودہ لہجے میں بولی۔

''ہوں......'' یہاں سونے کی کوشش مت فرمایئے گا۔ ورنہ حسینہ یہاں مستقل بستر لگا دے گی۔
بہر حال لڑکی کو بیڈ روم میں پہنچا دیا گیا اور سہیل ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیا خیال ہے میں رکوں یا جاؤں۔''

''نہیں نہیں بیٹھو۔ یقیناً تمہارے ذہن میں کھچڑی پک رہی ہوگی۔''

''جی ہاں......کھدر......بدر ہو رہی ہے۔ ابھی کچی پکی ہے۔ لیکن آپ اطمینان رکھئے میں آپ سے ایسا کوئی سوال نہیں کروں گا جو آپ کو مجبور کر دے۔''

''نہیں......نہیں......لڑکی کے بارے میں اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے۔ تو اس کا نام ثوبیہ خان ہے۔ اسی آبادی سے تعلق رکھتی ہے۔ جہاں ہم گئے تھے اور یقیناً وہاں کے ایک معزز خاندان کی بیٹی ہے مختصر یہ کہ اس کا باپ ایک دہشت گرد تھا۔ ایک چچا بھی اس کے باپ کا ساتھی تھا۔ باقی سارا خاندان محب وطن ہے اور اس نے میرا مطلب ہے۔ اس لڑکی کے باپ نے باقی لوگوں سے رابطہ توڑ لیا تھا۔ ان میں سے ایک دلیر خان اور دوسرا یوسف خان ہے۔ ثوبیہ خان نے غیر ممالک میں تعلیم پائی ہے۔ اس کی ماں بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔ دلیر خان خود بھی کسی غیر ملک میں تھا۔ البتہ یوسف یہیں تھا۔ لیکن وہ زیادہ تر جیل میں رہا۔ پھر دلیر خان ایک رات سرحد پار کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ لیکن حکومت کوشش کے باوجود اسے تلاش نہ کر سکی۔ پھر ٹھیک آٹھ مہینے کے بعد ایک دہشت پسند تنظیم ابھری۔ جس نے حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔ بڑے نقصانات ہوئے۔ لیکن ایک سال کی سخت جدوجہد کے بعد آخر کار ایک دن حکومت نے دلیر خان کو پالیا اور اسے اس کے بیس ساتھیوں سمیت گولی سے اڑا دیا۔''

صوفی اس طرح یہ واقعات بیان کر رہا تھا۔ جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے فلم چل رہی ہو اور سہیل عالم ایک بار پھر اس کی سحر انگیز شخصیت میں کھویا ہوا تھا۔ کس قدر اعتماد سے صوفی یہ کہانی بیان کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''جو مائیکرو ڈسک کرنل رحیم شاہ نے میرے پاس بھجوائی ہے۔ اس میں ان واقعات کی پوری تفصیل ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ مائیکرو ڈسک کرنل رحیم شاہ نے نہیں بنائی بلکہ اس کا تعلق ان مجرموں سے ہے۔ جنہوں نے یہ تنظیم تشکیل دی تھی اور وہ یہاں اس کی بھرپور حمایت چاہتے تھے۔ چند افراد کو انہوں نے اپنے ساتھ مکمل طور پر شامل کیا ہوا ہے اور انہی لوگوں کے تحفظ کے لئے روزا میلسی یہاں آئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جو ڈسک اس تنظیم نے اپنے لئے تیار کی تھی اور اتفاقیہ طور وہاں کسی کے ہاتھ لگ گئی تھی اور وہاں سے کرنل رحیم شاہ تک وہ یہاں کسی ذمہ دار آدمی تک پہنچے اب میں کس قدر ذمہ دار ہوں اللہ جانتا ہے اور میں حیران بھی ہوں کہ مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے۔ جن لوگوں سے میرے روابط تھے وہ میری اور کرنل رحیم شاہ کی مخالفت پر ہیں۔ لیکن خیر بہر حال میں تمہیں بتا رہا تھا کہ دلیر خان کے مرنے کے بعد امن سکون ہو گیا۔ بہ ظاہر اس کے بھائی یوسف خان کو اس کے ساتھ شریک نہیں پایا گیا تھا۔ لیکن حکومت اس پر نگاہ رکھ رہی تھی۔

پھر یوسف خان نے حکومت سے اجازت مانگی کہ دلیر خان کی بیٹی کو جو اب غیر ملک سے تعلیم حاصل کر کے واپس آ رہی ہے۔ اس کے پاس رہنے کی اجازت دی جائے۔ دلیر خان کی موت کے بعد چونکہ سکون ہو گیا تھا اور اس کے علاوہ ثوبیہ خان لڑکی تھی۔ اس لئے حکومت نے اجازت دے دی۔

پھر خفیہ ذرائع سے حکومت کو معلوم ہو گیا کہ یوسف خان اور ثوبیہ خان باغیوں کی جماعت بنانے میں کوشاں ہیں اور حکومت یوسف خان کی تلاش میں لگ گئی۔ پھر ایک شام ایک پہاڑی علاقے میں چھاپہ مارا گیا۔ وہاں سے پانچ آدمی گرفتار ہوئے جو باغی تھے۔ لیکن یوسف خان اور ثوبیہ خان فرار ہو گئے۔ گرفتار ہونے والوں نے بتایا کہ یوسف اور ثوبیہ خان دارالحکومت پہنچ کر کوئی کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس

لئے ہمارے پولیٹیکل ایجنٹ سے رابطہ قائم کیا گیا اور اسے صورتحال سے بھی آگاہ کیا گیا۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے وزارت داخلہ سے بات کی اور پھر تم سمجھتے ہو......"

"تو آپ سرحدی آبادی میں پولیٹیکل ایجنٹ سے بات کرنے گئے تھے؟"

"ہاں......"

"مگر کس حیثیت سے۔" سہیل نے چبھتا ہوا سوال کیا اور صوفی کے چہرے پر ایک دم تبدیلی رونما ہوئی۔ اس کے اصل چہرے سے جو چہرہ جھانک رہا تھا۔ وہ انتہائی سخت گیر اور سنگین چہرہ تھا۔ کئی بار یہ بات سہیل عالم نے محسوس کی تھی کہ صوفی دوہری شخصیت کا مالک ہے۔ بہ ظاہر مرن جان مرنج لیکن در پردہ کچھ اور۔ دفعتہ صوفی کی پتھریلی آواز ابھری۔

"میں وطن کے معاملات میں کسی حیثیت کو خاص نہیں سمجھتا۔ جو شخص اپنی ذمہ داری پوری کرے کرنل رحیم شاہ کے بارے میں یہ لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں کرنل آج مجھے اشارہ دے کہ میرے لئے راستہ صاف کر دو تو میں اس طرح یہ راستہ صاف کروں کہ اس کے بعد کسی کو کرنل کی راہ میں آنے کی جرات نہ ہو۔ میں یہ کر سکتا ہوں سہیل عالم۔ لیکن بچنا چاہتا ہوں خیر......تو وطن کے معاملات میں کوئی حیثیت......حیثیت نہیں رکھتی میرے اپنے بھی ذرائع نہیں۔"

"سوری......میرا یہ مقصد نہیں تھا۔ اصل میں مجھے بھی اس بات کا غصہ ہے کہ کچھ لوگوں نے وطن پرستوں کے راستے روک رکھے ہیں۔"

"ہمیشہ ایسا ہوا۔ کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

"وہاں پولیٹیکل ایجنٹ سے آپ کو کوئی خاص بات معلوم ہوئی۔"

"نہیں بالکل نہیں وہی سب کچھ جو مجھے پہلے پتا چل گیا تھا۔ یوسف خان کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مارے جا رہے ہیں لیکن وہ ابھی تک ہاتھ نہیں آیا ہے اور نہ ہی ثوبیہ خان کا پتا چل سکا ہے۔"

"مگر آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ لڑکی ثوبیہ خان ہے۔ ویسے صوفی صاحب اگر یہ وہی ہے تو بہت خطرناک بات ہے۔"

"ہاں......یہ غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک ہے۔"

"تو پھر آپ کیا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"سوچ رہا ہوں۔ ویسے ہم لوگوں کے بارے میں اسے حقیقت معلوم نہیں ہے۔ تاہم فی الحال اس نے اپنا ٹھکانہ یہاں بنا لیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے وہ زیادہ دیر تک یہاں نہیں رہے گی۔ سمجھے۔ ہمیں اس کی نگرانی کرنا ہوگی۔"

"میرے لئے کیا حکم ہے۔"

"سہیل آرام کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ میں اس کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے صوفی صاحب آپ مجھے اس معاملے سے الگ نہ کریں۔"

"نہیں کروں گا درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نے جواب دیا۔ پھر سہیل چلا گیا۔ صوفی نے

ایک چکر اس کمرے کے سامنے لگایا جہاں پر ثوبیہ خان سو رہی تھی اور پھر وہ فون والے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہاں سے اس نے گرین ہاؤس فون کیا۔ شازیہ نے فون اٹھایا تھا۔

"شازیہ، دلاور اور غلام قادر کو لے کر میرے گھر پہنچ جاؤ۔ یہاں میرے گھر میں ایک اجنبی صورت لڑکی موجود ہے۔ خوب صورت سی شکل وصورت کی مالک تم مختلف ذرائع سے میری کوٹھی کے آس پاس موجود رہو اور وہ لڑکی اگر وہاں سے باہر نکلے تو اس کا تعاقب کر کے اس کے نئے ٹھکانے کے بارے میں معلوم کرو۔ خیال رہے تم تینوں کو الگ الگ سواریوں پر آنا ہوگا اور کوٹھی کے مختلف حصوں میں گشت کرتے رہنا ہوگا۔ وہ کسی طرف سے بھی نکلے اس کا تعاقب کیا جائے۔"

"ٹھیک ہے چھوٹے بابا۔ ہم دس منٹ کے اندر اندر پہنچ رہے ہیں۔"

"او کے۔ صوفی نے فون بند کر دیا اور جیبوں میں پانوں کی ڈبیا تلاش کرنے لگا۔

♥......♥......♥

معشوق نشیلے مستی کے عالم میں جھومتے پھر رہے تھے۔ پھر انہوں نے ایک کمرے کا دروازہ کھلتے ہوئے دیکھا۔ پتا نہیں کون تھا۔ لیکن جو کوئی اندر سے نمودار ہوا۔ اسے دیکھ کر معشوق نشیلے پتھرا کر رہ گئے۔ بہت خوب صورت لڑکی تھی۔ انتہائی تندرست وتوانا۔ معشوق نشیلے بت بنے اسے دیکھ رہے تھے۔ لڑکی نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا۔ پہلے وہ انہیں اپنی جگہ سے دیکھتی رہی۔ اس کے بعد چند قدم آگے بڑھی اور معشوق نشیلے کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں زبان پر انگلی لگائی اور معشوق نشیلے کی ناک کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ تو وہ چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔

"ارے تم تو زندہ انسان ہو۔ لڑکی کی خوب صورت آواز ابھری۔

"کک......کک......کیا مطلب میں سمجھا نہیں؟" معشوق نشیلے نے کہا۔

"وہی تو میں سوچ رہی تھی کہ کسی انتہائی بدذوق آدمی نے یہ بدصورت مجسمہ بنایا ہے اور یہاں کھڑا کر دیا ہے۔ آخر اس کی یہاں کیا ضرورت تھی۔ شکر ہے کہ تم مجسمہ نہیں بلکہ انسان ہو۔"

"مم......مم......مگر......آپ مجھے وہ یونان......میرا مطلب ہے کہ فارسہ میں کہتے ہیں کہ "حسن کو چاند ستاروں کو چمن کہتے ہیں۔"

"اچھا، حسن کو چاند ستاروں کو چمن۔"

"نن......نن......نہیں کچھ غلط ہو گیا ہے۔ اصل میں فارسہ میں اشعار کی ماہیت......"

"تھپڑ ماروں گی منہ پر منہ ٹیڑھا ہو جائے گا۔ نہ شاعری کی بات کرو نہ فارسی کی۔"

"فف......فف......فارسی۔"

"مجھے پتہ ہے تم میری نگرانی کر رہے ہو۔"

"نن......نہیں......محترم۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ مم......مم میں تو پہلی بار آپ کو یہاں دیکھ رہا ہوں۔"

"کیا تم یہاں ملازم ہو؟" لڑکی نے سوال کیا۔

"جج......جج......جی ہاں......جج......جج......جی نہیں۔ مم......میرا مطلب ہے میں فارسہ میں......"

"پھر فارسہ...... میں کہتی ہوں کہ یہ فارسہ کیا چیز ہے۔"

"نن...... نہیں کچھ بھی نہیں۔"

"ویسے تم مجھے خاصے بہتر آدمی معلوم ہوتے ہو۔ اصل میں تم جس طرح وہاں کھڑے ہو گئے تھے۔ اس پر مجھے غصہ آ گیا۔"

"نن...... نن...... نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مم...... مم...... میں تو آپ کی بڑی عزت کرتا ہوں۔"

"آؤ...... کہیں بیٹھ کر بات کریں گے۔ یہاں کون کون رہتا ہے؟ ایک کالی سی عورت بھی ہے۔"

"ہاں بس اس کے ہی باپ نے اس کے ساتھ بدترین مذاق کیا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"اس کا نام پتا ہے کیا ہے۔"

"مجھے کیا معلوم۔" لڑکی بولی۔

"وہ جو کہا ہے نا کسی نے کہ آنکھوں سے اندھے نام نین سکھ۔ تو محترمہ کی شکل ملاحظہ فرمایئے فارسہ میں اور نام ہے حسینہ...... حسینہ عالم۔"

"ارے واہ......" لڑکی زبردستی ہنس پڑی اور پھر اس نے معشوق نشیلے سے کہا۔

"آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

"اصل میں میرا معاملہ کچھ اور ہے بچپن ہی سے حسینوں کی پسند رہا ہوں۔ نام پتا نہیں ماں باپ نے کیا رکھا تھا۔ لیکن لوگوں نے معشوق کہنا شروع کر دیا اور میں محبت کے نشے میں ڈوب گیا۔ چنانچہ فدوی کو معشوق نشیلے کہتے ہیں۔"

"بڑا ٹیڑھا نام ہے۔ خالی معشوق کہا جائے تو تم کہو گے کہ میں نے بھی تمہیں معشوق کہنا شروع کر دیا اور نشیلے کہا جائے تو......" معشوق نشیلے ہنسنے لگا پھر بولا۔

"آپ جانی کہہ دیا کیجئے۔ میرے بہت سے دوست مجھے پیار میں جانی کہتے ہیں۔"

"لاحول ولاقوۃ۔"

"کک...... کک...... کیوں۔"

"نہیں بس ایسے ہی۔ ویسے تم سارے ہی بڑے اچھے لوگ ہو۔ اس عمارت میں آنے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ بڑی عمدہ جگہ ہے۔ وہ صاحب جو لمبے سے ٹیڑھے ٹیڑھے سے ہیں۔ ان کا نام شاید؟"

"صوفی ہے...... صوفی۔"

"صرف صوفی......"

"شاید انہیں خود بھی نہیں معلوم ہو گا کہ اس سے آگے پیچھے کیا ہے۔ فارسہ میں۔" معشوق نشیلے نے کہا۔

"اور وہ دوسرا جوان کے ساتھ تھا؟"

"وہ ان کے دوست سہیل عالم صاحب ہیں۔"

"اچھا...... وہ کون ہیں؟"

"دوست ہیں بس۔"

"یہ صوفی صاحب کرتے کیا ہیں؟"

"عیش کرتے ہیں۔ دولت مند آدمی ہیں۔ مگر ہیں ذرا مختلف طبیعت کے مالک۔ خیر آپ یہ بتایئے کہ میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔"

"ہاں...... بالکل...... بالکل...... آپ ایسا کریں کہ اردو اور انگریزی کے اخبار لا کر دیں۔ میں آپ کا بہت شکریہ ادا کروں گی۔"

"ابھی لایا۔" معشوق نشیلے نے کہا۔ یہ اخبارات انہیں بازار سے ہی خریدنا پڑے تھے۔ لیکن جتنے بھی اخبارات، انہیں حاصل ہو سکے۔ وہ لے کر لڑکی کے پاس پہنچ گئے اور اخبارات کا بنڈل ان کے سامنے رکھ دیا۔

"اوہو...... آپ کا بے حد شکریہ۔ جانی۔" لڑکی نے کہا اور معشوق نشیلے کا سینہ فخر سے پھول گیا۔

♥......♥......♥

آخری آدمی اس عظیم الشان ہال میں داخل ہوا تو گرین رنگ کا ایک بلب سپارک کرنے لگا اور نیم تاریک ماحول میں سبز رنگ کی روشنی کے جھماکے ہونے لگے۔ اس کے ساتھ ہی لاؤڈ سپیکر پر ایک بھاری آواز ابھری۔

"ہمارا کام پورا ہو چکا ہے۔ دروازے بند کر دیئے جائیں اور ساؤنڈ پروف سسٹم آن کر دیا جائے۔ تھوڑی سی ہلچل ہوئی اپنی اپنی ڈیوٹی پر تعینات لوگ متحرک ہوئے اور اس کے بعد ہلکی ہلکی سرسراہٹیں ابھریں اور دروازے کھڑکیوں پر جست کی سلائیڈنگ پلیٹیں متحرک ہو کر ساکت ہو گئیں۔ اب اندر کی سانسیں بھی باہر نہیں جا سکتی تھی۔ تقریباً تیس بتیس افراد تھے جو اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے ننھے ننھے بلب روشن تھے اور ان بلبوں کے پاس ان کے عہدوں کی پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں جو کوڈ نمبروں میں تھیں پھر وہی آواز دوبارہ ابھری۔

"آغاز کیا جائے۔" چند لمحات کے لیے تاریکی طاری ہو گئی پھر ایک بلب روشن ہوا اور دوسری آواز ابھری۔

"تنظیم دنیا کے مختلف ملکوں میں حکومتوں کے مفادات کے لیے کام کیا کرتی ہے اور ہماری سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سوچ سمجھ کر کام پر ہاتھ ڈالتے ہیں اور اس کے بعد اس کی تکمیل کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ ایشیا کے ایک ملک کے سلسلے میں ہمیں اس کے مخالف ملک کی طرف سے ایک ذمہ داری سونپی گئی اور ہم نے بہت سی وجوہات کو مدنگاہ رکھتے ہوئے وہ ذمہ داری قبول کر لی اور اس کے بعد ہم نے مکمل پلاننگ کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کیا۔ ہماری پہلی غلطی یہ ہوئی کہ ہمارے آدمیوں نے پروگرام ڈسک تیار کی لیکن اس کی حفاظت نہیں کر سکے اور وہ ڈسک اسی ملک کے ایک اہم شخص کے ہاتھ لگ گئی۔ اس نے کسی طرح اسے اپنے ملک بھجوا دیا۔ اس سلسلے میں ذمہ داروں کے خلاف کیا کارروائی ہوئی وہ بتانے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہمارے ہاں ایک مکمل سسٹم موجود ہے جب ہم کسی کو اپنی تنظیم میں جگہ دیتے ہیں تو سب سے پہلے اس کی زندگی بھر کی ضروریات کے بارے میں پوچھا جاتا ہے اور ہم اس سے حلف لینے سے پہلے خود حلف اٹھاتے ہیں کہ

اسے کسی مرحلے پر کسی دوسرے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جائے گا اور اس کی ہر ممکن مدد کی جائے گی لیکن اگر وہ اپنے فرائض کی صحیح طور پر تکمیل نہیں کر سکا تو اسے زندگی سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ یہی ہمارا اصول ہوتا ہے۔

بہرحال غلطی کے ذمے داروں کو سزا تو دے دی گئی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ تشویش پیدا ہوئی کہ اب اس ڈسک کو اس ملک کے ذمے دار لوگوں تک پہنچنے سے کیسے روکا جائے۔ چناں چہ ہر طرح سے کوششیں کی گئیں اور ہمارے بے شمار افراد اس کام پر معمور ہو گئے۔ اس سلسلے میں خصوصی طور پر میڈم روزا میلسی کو وہاں بھیجا گیا اور انہیں مکمل اختیارات دیئے گئے اور اس کے ساتھ ہی جب ہم نے اس ملک میں اپنے کام کا آغاز کرنا چاہا تو ایک اہم کام کیا۔ وہاں کے ایک اعلیٰ عہدیدار کو جن کا نام شاہ میر تھا۔ ان کے عہدے سے ہٹایا گیا اور ایک ایسے نام کو سامنے لایا گیا جو بڑی اعلیٰ حیثیت رکھتا تھا اور اسے وہ عہدہ دے دیا گیا لیکن صرف تھوڑے عرصے کے لیے۔

جب سب نے سارے معاملات پر قابو پالیا تو ہم نے اس کی جگہ اپنا ایک آدمی میک اپ میں وہاں تعینات کر دیا اور وہ اس اعلیٰ عہدے پر فائز ہو گیا۔ اس طرح ہمیں وہاں اہم ترین سرکاری تحفظ مل گیا۔ میڈم روزا میلسی وہاں پہنچ گئیں اور انہوں نے ڈسک کی تلاش کے لیے اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا لیکن اس کے بعد ہم نہیں جانتے کہ کیا ہوا اور کس طرح بات پلٹی۔ سنا یہ گیا کہ میڈم روزا میلسی اور ان کے چاروں ساتھی شہر میں کتوں کی طرح بھونکتے ہوئے پھر رہے ہیں۔

میڈم روز میلسی کے سفارتخانے نے انہیں اپنی تحویل میں لے لیا ہے لیکن وہاں مقامی حکومتی کارروائیاں بھی ہو رہی ہیں اور میڈم روزا میلسی ایک ہسپتال میں مقیم ہیں جہاں ان کا تجزیہ کیا جا رہا ہے۔ ہماری رپورٹوں کے مطابق میڈم روزا میلسی کوئی اداکاری نہیں کر رہی بلکہ حقیقی معنوں میں ان کا اور ان کے ساتھیوں کا ذہنی توازن ختم ہو گیا ہے اور وہ مکمل طور پر ایک پاگل گروپ ہے۔

اب ہم اس طرف سے ہٹتے ہیں۔ جب ہم کسی کام کا آغاز کرتے ہیں اور کام بڑے پیمانے کا ہوتا ہے تو پھر ہم تمام چیزیں تلاش کرتے ہیں اور ایسے کمزور مہروں کو اپنا آلہ کار بناتے ہیں جن کے بارے میں ہمیں پتا چل چکا ہوتا ہے کہ وہ آسانی سے ملک دشمنی پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ ایسا ایک گروپ ہمیں نظر آ گیا۔ یہ پہاڑی علاقوں میں ایک چھوٹا سردار گروپ ہے۔ دو بھائی ہمارے کام کے نکلے ان میں سے ایک کا نام دلیر خان اور دوسرے کا نام یوسف خان تھا۔ دلیر خان تو موت کا شکار ہو گیا لیکن اس کی بیٹی تو... خان اور یوسف خان اب بھی ہمارے ساتھی ہیں۔ دلیر خان چوں کہ حکومت کی نگاہوں میں آ چکا تھا۔ اس لیے حکومت کو یوسف خان پر بھی شبہ تھا لیکن بہرحال یوسف خان اپنی بھتیجی کے ساتھ ہمارا کام کر رہا تھا اور اب بھی کر رہا ہے لیکن وہ ذہنی طور پر اتنا طاقت ور آدمی نہیں ہے کہ جو کام ہم وہاں کرنا چاہتے ہیں اس میں کوئی نمایاں کام سرانجام دے سکے۔ اصل میں ہم تو ابھی پلاننگ ہی کی منزل میں تھے کہ یہ چند غلطیاں ہو گئیں۔ اور تنظیم کا پہلا اصول ہے کہ جب وہ کسی کام میں ہاتھ ڈال دیتی ہے تو ہر طرح کی ذمہ داری قبول کرتی ہے۔ غلطی ہمارے حساب میں ہوتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آگے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔" شخص خاموش ہو گیا اور ایک بار پھر اس پراسرار ہال میں گہرا سناٹا چھا گیا پھر ایک اور آواز ابھری۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ اپنے مشورے اور اپنی تجاویز پیش کریں۔" کچھ لمحے کے لیے پھر خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ایک بلب روشن ہوا اور ساتھ ہی آواز ابھری۔

"میں دو تجاویز پیش کرتا ہوں۔ نمبر ایک روزا میلسی کو جس طرح بھی ممکن ہو سکے واپس لا کر اس کا دماغی تجزیہ کیا جائے کہ اس کے ساتھ کیا کارروائی ہوئی۔

دوسری تجویز میرے ذہن میں یہ ہے کہ یوسف خان کو تبدیل کر دیا جائے اور یوسف خان کی جگہ ہمارا ایک آدمی بالکل اسی طرح میک اپ میں پہنچ جائے جس طرح ایک اعلیٰ عہدے دار کو تبدیل کیا گیا ہے۔ ان دونوں کے درمیان رابطہ ہو جائے اور اس کے بعد ہم اپنے کام کو آگے بڑھائیں۔ یہ طریقہ کار میرے اپنے خیال میں بہت مناسب رہے گا۔"

"کیا؟ اصل یوسف خان کو قتل کر دیا جائے؟"

"بالکل نہیں بلکہ اسے قید کر دیا جائے تا کہ ضروری امور میں اس سے مدد لی جا سکے۔" ایک بار پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ پھر ایک آواز ابھری۔

"کوئی اور تجویز؟"

"میں پہلی تجویز کی تائید کرتا ہوں۔"

"اور کوئی؟"

"ہم سب......اس تجویز کی تائید کرتے ہیں۔ صرف اس اضافے کے ساتھ کہ جس ملک نے ہمیں یہ ذمہ داری سونپی ہے۔ اسے ہماری ان تھوڑی سی ناکامیوں کی بھنک بھی نہیں ملنی چاہیے ورنہ ہماری ساکھ خراب ہو گی۔

"ٹھیک ہے۔ ہم اس تجویز کا مکمل طور پر خیر مقدم کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ نشست برخاست ہو گئی تھی اور میٹنگ کے شرکاء اپنی اپنی جگہ سے اٹھ گئے تھے۔

♥......♥......♥

سہیل عالم کی ہمیشہ سے یہ ہی خواہش رہی تھی کہ صوفی اسے اپنے ہر معاملے میں اپنے ساتھ رکھے۔ بہت سے موقعوں پر صوفی نے اسے بڑی اہمیت بھی دی تھی لیکن ایک تشنگی کا احساس سہیل عالم کے دل میں موجود تھا۔ بہرحال وہ خود جس شخصیت کا مالک تھا اس کے تحت جو چاہتا وہ کر سکتا تھا۔ اپنے باپ کی مدد سے اپنے ملک میں ہر شعبے میں مدد لے سکتا تھا۔ لیکن کچھ عجیب سی فطرت کا مالک تھا وہ بھی الگ تھلگ ٹارزن کے ساتھ زندگی بسر کر رہا تھا۔

بہرحال صوفی نے اسے طلب کیا تو وہ خوشی خوشی اس کے پاس پہنچ گیا۔

"جی صوفی صاحب! میں تو انتظار ہی کر رہا تھا کہ آپ اس سلسلے میں مجھے مزید کچھ بتائیں گے۔"

"میں نے مشورے کے لیے ہی تمہیں بلایا ہے۔"

"محبت ہے آپ کی، حکم کیجئے۔"

"وہ لڑکی ابھی تک یہیں ہے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے وہ کچھ انتظار کر رہی ہو۔ درویشوں کی

دعاؤں سے۔''

''کس طرح کا انتظار آپ کے خیال میں۔''

''اس کا کوئی صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ویسے معشوق نشیلے سے اس کی بڑی دوستی ہوگئی ہے۔ میرا خیال ہے وہ اسے اپنا آلہ کار بنا رہی ہے۔'' سہیل سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بولا۔

''تو آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ صوفی صاحب!''

''ابھی تو کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ تمہاری خواہش تھی کہ میں تمہیں اپنے ہر مسئلے میں شامل رکھوں تو میں نے سوچا کہ تم سے اس بارے میں کوئی مشورہ لیا جائے۔''

''چھوٹا منہ بڑی بات نہیں ہوگی۔''

''میرا خیال ہے کہ تمہارا منہ اتنا چھوٹا بھی نہیں ہے۔ اچھے خاصے جوان ہو چکے ہو درویشوں کی دعاؤں سے، صوفی نے کہا اور سہیل ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔

''شکریہ۔ صوفی صاحب میری ایک تجویز ہے اگر آپ پسند کریں تو......!''

''حق اللہ'' صوفی نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ سہیل چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

''میرا خیال ہے ثوبیہ کی خاموشی کا انتظار کیا جائے اس کے لیے الرٹ رہا جائے یقیناً وہ یہاں پر زندگی گزارنے نہیں آئی۔ اندازہ یہ ہے کہ بہت جلد وہ یہاں سے نکلنے کی کوشش کرے گی۔ ہمیں اس کا تعاقب کر کے یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ کہاں جاتی ہے۔'' صوفی نے آنکھیں کھول دیں اس کے چہرے پر ایک مدھم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ٹھیک جا رہے ہو۔''

''نہیں واقعی صوفی صاحب! کیا آپ میری اس تجویز سے اتفاق کرتے ہیں۔''

''اگر میں کہوں کہ یہی خیال میرے ذہن میں بھی تھا تو غیر مناسب بات ہوگی۔ تم نے وہی خیال پیش کیا ہے جس پر میں غور کر رہا تھا۔''

''واہ...... یہ تو میرے لیے بہت خوشی کی بات ہے کہ کسی ایک جگہ میرے اور آپ کے ذہن میں ایک جیسی بات پیدا ہوئی۔'' صوفی کچھ سوچنے لگا۔ سہیل نے کہا۔

''اس سلسلے میں آپ نے معشوق نشیلے سے کوئی سوال نہیں کیا۔''

''بے کار ہے۔ اصل میں ہمیں کچھ بزرگوں نے جو تعلیمات دی ہیں ہم انہیں کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ بزرگوں کا کہنا یہ بھی ہے کہ معشوق نشیلے جیسے مرد اگر کسی عورت کا التفات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر وہ کچھ بھی نہیں رہتے درویشوں کے کرم سے۔''

''میں سمجھ گیا۔'' سہیل عالم نے کہا اسی وقت حسینہ کمرے میں داخل ہوئی اور سہیل کو دیکھ کر مسکراتی ہوئی بولی۔

''میں صدقے میں واری۔ تمہاری تو خوشبو آ جاتی ہے مجھے۔ کافی بنائی ہے لے آؤں۔''

''لے آیئے حسینہ بیگم، بہت بہت شکریہ کیسی ہیں آپ؟'' سہیل نے پوچھا۔

''بس، تقدیر میں جس طرح سے جینا لکھ گیا ہے۔ جی رہے ہیں۔''

''معشوق نشیلے کا کیا حال ہے؟'' سہیل نے ایک دم سوال کیا۔

''ہوں...... اس کبوتری کا کبوتر بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ کہاں وہ اور کہاں وہ۔ مگر وہ بھی مجھے پاگل ہی لگتی ہے۔ گھنٹوں اس الو کے پٹھے سے باتیں کرتی رہتی ہے اور اس الو کے پٹھے کو دیکھو کبھی اسے چاٹ لا کر کھلا رہا ہے کبھی گاجر کا حلوہ، اے میں کہتی ہوں وہ نکھٹو کرتا دھرتا تو کچھ نہیں ہے۔ پیسے کہاں سے آتے ہیں اس کے پاس۔ بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ صوفی صاحب جو ہیں ناں......''

''کافی خراب ہو جائے گی۔'' سہیل نے کہا اور حسینہ باہر نکل گئی۔ سہیل نے مسکرا کر صوفی کی طرف دیکھا۔ تو صوفی نے کہا۔

''حق اللہ...... حق اللہ'' انتظار کیا جانے لگا۔ اس گفتگو کے تیسرے دن ثوبیہ خان نے معشوق نشیلے سے کہا۔

''کتنی دوستی ہوگئی ہے ہمارے درمیان نشیلے۔ تم نے ایک بار بھی مجھے کہیں باہر گھمانے پھرانے کی دعوت نہیں دی۔''

''کک...... کک...... کیوں نہیں بس ہمت نہیں پڑتی۔ وہ جو فارسی میں کہا ہے کہ......''

''نہیں دیکھو! بات سنو مجھے شعر و شاعری بالکل پسند نہیں ہے۔ چاہے وہ فارسی میں ہو۔ چاہے انگلش میں ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔ تو بات گھومنے پھرنے کی ہو رہی تھی۔ آپ جب دل چاہے۔ چلیں میرے ساتھ۔''

''یار تم سمجھتے کیوں نہیں ہو بات کو۔'' ثوبیہ نے بے تکلفی سے کہا۔ معشوق نشیلے کی تو ان دنوں اڑ کر لگی تھی۔ ثوبیہ خان جیسی حسین و جمیل لڑکی نے اسے اپنا گہرا دوست بنا لیا تھا۔ بڑی باتیں کرتی رہتی تھی اس سے اور ہنستی رہتی تھی۔ معشوق نشیلے کا سیروں خون بڑھ گیا تھا۔ ایک وہ کالی چڑیل ہے۔ کہ اس کے نخرے ہی نہیں ملتے۔ ان دنوں اس نے حسینہ سے کافی اجتناب برتنا شروع کر دیا تھا۔ خرچہ ورچہ بھی چل ہی رہا تھا۔ کوئی خاص پریشانی نہیں تھی۔ پیسے اول تو اس کے پاس تھے۔ ضرورت ہوئی تو کہیں سے مانگ لاتا تھا۔ بہر حال آج ثوبیہ خان نے اس سے باہر گھومنے پھرنے کی خواہش کی تھی۔ معاملات کافی ہموار ہوتے جا رہے تھے۔

اگر یہ خوب صورت لڑکی اس کی زندگی میں شامل ہو جائے تو زندگی دیکھنے کے قابل ہوگی۔ اکثر وہ ثوبیہ خان کی قربت کے خواب دیکھتا رہتا تھا۔

بہر حال اس نے ثوبیہ خان کو باہر گھمانے کا فیصلہ کر لیا۔ ثوبیہ خان بولی۔

''ہمیں احتیاط برتنا ہوگی۔ دروازے سے باہر نکلنا تو ممکن نہیں ہو سکے گا۔ صوفی صاحب نے چوکیدار کو ہدایت کر دی ہوگی۔''

''تو کیا انہوں نے تمہیں قید کر رکھا ہے۔''

''ایک طرح کی قیدی سمجھو۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ صوفی صاحب نے ہمیں آسانی سے نکلنے کا

موقع دینا ہے۔"

"اوہو۔اس کی تو تم پرواہ ہی نہ کرو۔ میں جانتا ہوں کہ ہم باہر کیسے جاسکتے ہیں"

"مجھے تم ویسے ہی کافی ذہین آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کیسے جاؤ گے باہر بتاؤ۔"

"تم فکر ہی مت کرو۔ میرے پاس اس کا انتظام ہے۔ معشوق نشیلے نے پچھلی دیوار کود کر باہر نکل جانے کا فیصلہ کیا اور بولا۔

"بس تھوڑی سی ہمت کرنا پڑے گی۔"

"ہمت تو میرے اندر بہت ہے۔" ثوبیہ خان بولی۔ معشوق نشیلے نے ثوبیہ خان سے وعدہ کیا کہ بس تھوڑی دیر کے بعد وہ لوگ باہر نکل جائیں گے۔

"ہم خوب گھومیں گے پھریں گے یہاں رہتے رہتے میری طبیعت اس قدر خراب ہوگئی ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔

"ہوگئی ہوگی، ہوگئی ہوگی۔ انسان کہاں تک قید رہ سکتا ہے فارسہ میں۔"

"نہیں فارسہ بالکل نہیں۔"

"بالکل نہیں.....تو میں تیار ہو جاؤں۔"

"ہاں۔" ثوبیہ خان نے کہا اور معشوق نشیلے باہر نکل گئے اور اس کے بعد انہوں نے اپنے سب سے اچھے کپڑے نکالے جو بہر حال جیسے بھی تھے انہیں کارٹون بنانے میں بڑے معاون ثابت ہوتے تھے۔ اس سج دھج کے ساتھ وہ باہر نکلے ہی تھے کہ حسینہ سامنے آگئی۔

"لاحول ولاقوۃ" معشوق نشیلے نے کہا۔

"خدا تجھے سمجھے اب اس گھر سے نکلے گا تو لوگ یہ سوچیں گے کہ پورا ہی سرکس بن گیا ہے۔ وہ جو .....سرکس میں ہنسانے والے ہوتے ہیں کیا کہتے ہیں انہیں.....جو کرے سو کر نہ کرے سو بھی کر۔"

"جوکر کہنا چاہتی ہیں شاید آپ۔"

"ہاں وہ ہی۔ جوکر لگ رہا ہے نرا۔"

"تو آپ کو کیوں دکھ ہو رہا ہے۔ اپنا حسن نظر ہے فارسہ میں۔"

"پتا نہیں کیا بک رہا ہے۔ ویسے یہ بھی فرمائش اسی سفید بلی نے کی ہوگی۔"

"کسی کالی کتیا نے نہیں کی۔" معشوق نشیلے نے کہا اور آگے بڑھ گئے۔ حسینہ غور ہی کرتی رہی اور جب اسے احساس ہوا کہ معشوق نشیلے کیا کہہ گیا ہے تو غصے سے آگ بگولہ ہوگئیں۔

"کالی کتیا تیری ماں تیری بہن خود اپنے آپ کو پتا نہیں کیا سمجھتا ہے۔ موا سرکس کا جوکر....."

معشوق نشیلے ثوبیہ خان کے پاس پہنچ گیا اور پھر اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے باہر نکل گیا۔ ثوبیہ خان خود بھی تیار تھی۔ پچھلی دیوار کودنا نہ معشوق نشیلے کے لئے مشکل تھا اور نہ ہی ثوبیہ خان کے لئے۔ ثوبیہ ویسے بھی نہایت پھرتیلی قسم کی لڑکی تھی۔

بہر حال دونوں دیوار کود کر باہر آئے اور معشوق نشیلے اسے ساتھ لے کر ایک طرف بڑھ گیا۔

باقی فاصلہ پیدل طے کیا گیا اور پھر اس کے بعد انہوں نے ایک ٹیکسی کر لی۔ ثوبیہ خان نے کہا۔

"کم از کم یہاں سے دور نکلا جائے۔ تم تو بہت اچھے دوست نکلے۔ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔"

"کک.....کک.....کیا مطلب؟"

"نن.....نن.....نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ تم بھولنے والی چیز نہیں ہو۔"

"میں تو بزرگوں کے مزاروں پر دعائیں مانگتا ہوں۔"

"اچھا.....کیا.....؟"

"یہی کہ اللہ مجھے اور تمہیں کبھی جدا نہ کرے۔" معشوق نشیلے نے ایک عشقیہ جملہ کہا اور ثوبیہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے کھڑکی سے باہر منہ نکال لیا اور ہنسی کو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

"کک.....کیا ہوا.....؟"

"کچھ نہیں.....پھندا لگ گیا ہے۔" ثوبیہ نے کہا۔

"پانی لاؤں۔" معشوق نشیلے بے اختیار بولے۔

"لے آؤ۔" ثوبیہ نے کہا اور معشوق نشیلے ایک دم گڑبڑا کر رہ گئے۔ انہیں یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وہ ٹیکسی میں سفر کر رہے ہیں۔

بہر حال ایک پر رونق جگہ ٹیکسی رکوائی گئی تھی اور ثوبیہ نیچے اتر آئی تھی اور معشوق نے بل ادا کیا اور اس کے بعد بولا۔

"اب کہاں چلنا ہے؟"

"کسی اچھے سے ریستوران میں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔" معشوق نشیلے نے کہا۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو نجانے کیا سمجھ رہا تھا۔ خوشی کے مارے اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لوگ کس طرح رشک بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہے ہوں گے۔ اتنی خوب صورت عورت کے ساتھ اتنی بے تکلفی سے چلنا پھرنا کوئی معمولی بات تو نہیں ہوسکتی۔ ریستوران بھی سامنے ہی موجود تھا۔ وہ لوگ اندر داخل ہوگئے۔ پھر ایک میز پر جا بیٹھے۔

"کیا کھائیں گی.....کیا پئیں گی۔

ذرا واش روم جاؤں گی۔" ثوبیہ خان نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "شاید اس طرف ہے۔" معشوق نشیلے کے فرشتوں نے بھی اس ریستوران کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ثوبیہ نے بھی شاید تکا ہی لگایا تھا۔ لیکن بہر حال وہ اس طرف چل پڑے جہاں واش روم تھے۔ ایک طرف لیڈیز اور ایک طرف جینٹس لکھا ہوا تھا۔ وہ لیڈیز باتھ روم میں داخل ہوگئی۔ یہاں سے اس نے معشوق نشیلے کی طرف نگاہیں دوڑائیں وہ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

ثوبیہ خان باہر نکلی پھر ایک سمت سے ہوتی ہوئی دیوار کے ساتھ ساتھ ریستوران کے دوسرے دروازے سے باہر نکل آئی اور پھر تیز تیز قدموں سے اس پتلی گلی سے گزرتی ہوئی سڑک پر آگئی۔ جہاں اس نے ایک ٹیکسی روکی اور ٹیکسی میں بیٹھ کر چل پڑی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ وہ سفر کرتی رہی۔

ٹیکسی ڈرائیور کو اس نے ایک پتا بتا دیا تھا۔ آخر کار ٹیکسی ایک بہت ہی خوب صورت علاقے میں جا کر رک گئی۔ جہاں فلیٹ ہی فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ جس عمارت کے سامنے اس نے ٹیکسی رکوائی وہ بھی بہت شان دار تھی۔ وہ ٹیکسی سے نیچے اتری اور بولی۔

''ڈرائیور! میں بل کے پیسے ابھی تمہیں دلواتی ہوں۔''

''جی میم صاحب! ڈرائیور اس عمارت کو دیکھ کر ہی معترف ہو گیا تھا وہ سامنے گیٹ پر بنے ہوئے گارڈ کیبن تک پہنچی اور اس نے گارڈ سے جا کر کہا۔

''گارڈ! مجھے پہنچاتے ہو؟''

''کیوں نہیں بیگم صاحب۔''

''ٹیکسی ڈرائیور کو بل کی رقم ادا کر دو۔ اتفاق سے میرے پاس پیسے نہیں ہیں اور میرے فلیٹ کا دروازہ کھلواؤ۔''

''جی بیگم صاب۔'' گارڈ پر ادب انداز میں وہاں سے گردن جھکا کر باہر آیا ٹیکسی ڈرائیور کو بل ادا کیا۔ ایک الماری سے ایک چابی نکالی اور بولا۔

''چلئے بیگم صاب میں دروازہ کھولے دیتا ہوں۔''

''نہیں ٹھیک ہے چابی مجھے دے دو۔'' ثوبیہ خان نے کہا اور گارڈ نے چابی ادب سے اس کے حوالے کر دی۔ ثوبیہ خان شان دار فلیٹوں کے اس سلسلے کے ایک پورشن میں پہنچ گئی۔ جہاں لفٹیں لگی ہوئی تھیں۔ پھر ایک لفٹ نے اسے چھٹی منزل پر اتار دیا اور وہ لفٹ سے باہر نکل آئی۔ چوڑی راہداری میں۔ خوب صورت قالین بچھے ہوئے تھے۔ فلیٹ نمبر ۶۱۵ کے سامنے رک کر اس نے چابی سے دروازہ کھولا۔ انتہائی قیمتی اور لگژری فلیٹ تھا۔ جو بہترین قسم کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ دنیا کی ہر چیز یہاں موجود تھی۔ ثوبیہ خان ایک کمرے میں داخل ہوئی اور وہاں پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگیں۔ پھر اس نے کہا۔

''خدا کی پناہ ...... کتنی لمبی قید گزاری ہے میں نے۔'' اس کے بعد وہ اس فلیٹ میں کچھ اور کارروائیاں کرنے لگی۔ پھر اس نے الماری سے کرنسی نوٹ نکالے اور ٹیلی فون پر پہنچ گئی۔ یہاں سے اٹھ کر اس نے گارڈ سروس کو فون کیا اور گارڈ نے اس کا فون ریسیو کیا۔

''گارڈ میں فلیٹ نمبر ۶۱۵ سے بول رہی ہوں۔ براہ کرم تم اپنے پیسے لے جاؤ۔''

''بیگم صاب پیسوں کی کیا جلدی ہے۔''

''نہیں شکریہ، آ کر لے جاؤ...... پھر میں کسی اور کام میں مصروف ہو جاؤں گی۔''

''میں حاضر ہو رہا ہوں۔'' گارڈ نے کہا اور پھر وہاں پہنچ گیا۔ ثوبیہ خان نے اسے بل کی رقم کے علاوہ اور کافی رقم بھی دی تھی۔ گارڈ نے اسے سلام کیا اور بولا۔

''کوئی ضرورت بیگم صاب؟''

''نہیں شکریہ ...... جا سکتے ہو۔'' وہ بولی اور اس کے بعد اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ پھر ٹیلی فون کے پاس پہنچ گئی اور ریسیو اٹھا کر اس نے ایک نمبر ڈائل کیا اور ریسیور کان سے لگا لیا تھوڑی دیر کے بعد

آواز آئی۔

''یس ......'' یہ ایک زنانہ آواز تھی۔

''بلیک کیٹ۔'' ثوبیہ نے کہا۔

''رنگ سفید ہی اچھا لگتا ہے۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''ٹھیک ہے۔ سفید رنگ میں گلابی رنگ کی آمیزش کر دو۔ بہت خوب صورت کلر بن جائے گا۔''

''جی، حکم۔''

''کہاں ہیں؟''

''نہیں ہیں۔ ایکشن پر گئے ہیں۔''

''کب؟''

''دو دن ہو گئے۔''

''مجھے جانتی ہو ناں۔''

''جی۔''

''واپس آ جائیں تو انہیں اطلاع دینا کہ میں پی آر میں ہوں۔ وہیں رہوں گی مجھ سے رابطہ قائم کریں۔''

''او کے بیگم صاب۔''

''ٹھیک۔'' ثوبیہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس کے بعد وہ کچن کی جانب بڑھ گئی۔

♥......♥......♥

شازیہ اور دلاور بڑی کامیابی سے ثوبیہ کا پیچھا کر رہے تھے۔ صوفی نے ان کی ڈیوٹی لگائی تھی اور انہیں ہدایت دے دی تھی کہ سامنے کے حصے کی پروا نہ کریں اطراف کا جائزہ رکھیں اور اس وقت جب انہوں نے معشوق نشیلے اور ثوبیہ خان کو دیوار کود کر باہر نکلتے دیکھا تو ایک بار پھر وہ صوفی کی ذہانت کے قائل ہو گئے۔ ان کا تعاقب کرتے ہوئے شازیہ نے کہا۔

''چھوٹے بابا معمولی ذہن کے مالک نہیں ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ گیٹ پر تو سبھی کی نگاہ ہوتی ہے۔ ثوبیہ پچھلے راستوں سے نکلنے کی کوشش کرے گی۔'' دلاور نے ہنستے ہوئے کہا۔

''صرف دماغ میں ہی نہیں دلاور بھائی چھوٹے بابا کو اگر تم ایکشن میں دیکھ لو تو حیران رہ جاؤ۔ اس وقت وہ ایک چیتے کی طرح پھرتیلے اور طاقتور ہوتے ہیں اور یقین کرو ان کی آنکھوں میں کسی چیتے ہی کی سی چمک ہوتی ہے۔ جیسا کہ وہ عام حالات میں ایک سوتے ہوئے انسان نظر آتے ہیں۔ بس ایکشن کے وقت جاگتے ہیں وہ۔''

''مجھ سے کہہ رہی ہو شازیہ، بہت سی بار میں دیکھ چکا ہوں۔ صوفی صاحب کو اور پھر جس طرح میں ان کا احسان مند ہوں تم لوگ کوئی بھی نہیں ہو سکتے۔ دلاور نے انہیں ٹیکسی سے اتر کی ایک ریسٹوران میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو شازیہ بولی۔

''یقینی طور پر اب وہ یہاں سے نکل جانے کی فکر کرے گی۔ ایسا کرتے ہیں دلاور بھائی کہ اب

میں ایک ٹیکسی کا بندوبست کر لیتی ہوں ہم لوگوں کو محتاط رہنا چاہئے۔"

"جیسا تم مناسب سمجھو۔ میں ٹیکسی کرلوں ڈرائیونگ تم کرو۔"

"نہیں ٹیکسی میں کرلوں گی۔" شازیہ نے کہا اور ریستوران کے سامنے نظریں دوڑانے لگی سامنے ایک ٹیکسی اسٹینڈ تھا۔ وہ ٹیکسی کی طرف بڑھ گئی۔ ڈرائیور ایک نوجوان آدمی تھا۔ شازیہ نے اسے دیکھا اور بولی۔

"چلنا ہے؟"

"تو چلیے۔ پوچھ کیوں رہی ہیں۔" ڈرائیور بولا اور شازیہ پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

"کہاں چلوں۔"

"فی الحال ٹیکسی اسٹینڈ سے باہر نکالو اور سامنے وہ جو ریستوران ہے اس کی دوسری سمت لے چلو۔"

"وہاں تک جانا ہے؟" ڈرائیور نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں اب اگر تم مجھ سے یہ سوالات کرتے رہو گے تو مجبوراً پھر میں دوسری ٹیکسی دیکھ لوں گی۔"

"چلیے ...... چلیے میڈم ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" ڈرائیور کچھ زیادہ ہی باتونی معلوم ہوتا تھا۔ شازیہ نے احتیاطاً ٹیکسی دوسری طرف رکوائی۔ ڈرائیور اسے تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"قصہ کیا ہے۔ میڈم کچھ ہمیں بھی تو بتا دیجئے۔" شازیہ نے اسے گھور کر دیکھا پھر بولی۔

"اگر میں نے قصہ بتا دیا تو تمہارا دم نکل جائے گا۔"

"ارے ...... ارے ناراض نہ ہوں۔ ایسے ہی پوچھ لیا ہے۔"

"سی، آئی، ڈی سے ہے میرا تعلق، سمجھے؟ اور اس کے بعد اگر تم نے فضول بات کی۔ تو میں موبائل پر پولیس موبائل کو طلب کرلوں گی تمہیں باقاعدہ بل دیا جائے گا۔ بل کی تم پرواہ مت کرنا۔ لیکن جو کہا جا رہا ہے وہ کرو۔" ڈرائیور کی جان نکل گئی تھی۔ اس نے جلدی سے کہا۔

"سوری میڈم ...... سوری۔ دراصل ...... معاف کیجئے گا۔ سڑکوں پر ہمیں ہر طرح کے لوگ ملتے ہیں۔ میڈم مائنڈ نہ کریں تو کہوں کہ کبھی کبھی ایسی خواتین مل جاتی ہیں۔ جن کا کام کچھ اور ہوتا ہے۔ میں ایک شریف ماں باپ کا بیٹا ہوں اور عزت کی روٹی کمانا چاہتا ہوں گریجویشن کیا ہے میں نے لیکن اپنے وطن کے حالات دیکھ لیجئے۔ نوکری ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے ٹیکسی کا دھندہ شروع کر دیا ہے۔"

"عقل کا کام کیا ہے تم نے۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"رشید احمد۔"

"عقل کا کام کیا ہے تم نے رشید۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ ہر نوجوان علم حاصل کرنے کے بعد یہ سوچتا ہے کہ کسی سرکاری یا کسی پرائیویٹ ادارے میں میز کرسی پر بیٹھ کر ...... مجھے معاف کرنا۔ حرام خوری کرے۔ چند کاغذات دیکھے اور اس کے بعد یہ سوچے کہ اس نے ملک وقوم پر بڑا احسان کیا ہے۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ دوسرے کام بھی تو ہیں وطن کی ضرورتیں اور بھی تو ہیں صرف یہ ہی تو نہیں کہ میز پر بیٹھ کر قلم گھسا جائے۔ ہر شعبے کو تمہارے جیسے نوجوان کی ضرورت ہے۔ جو ملک وقوم کی ہر طرح کی ضرورتیں پوری کریں۔ اس تصور کو ذہن میں جگہ دینی ہی نہیں چاہیے۔ اسی تصور نے تو ملکی حالات اس قدر خراب کئے ہیں۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔ میرا بھی بالکل یہ ہی نظریہ ہے۔" ڈرائیور نے کہا۔

شازیہ انتظار کرتی رہی اور اس وقت اس کی باچھیں خوشی سے کھل گئیں۔ جب اس نے دیکھا کہ یہ پچھلے دروازے سے باہر نکل آئی ہے اور راستہ طے کر رہی ہے۔

"ہمیں اس لڑکی کا تعاقب کرنا ہے۔ ڈرائیور۔" اب ضرور یہ کسی ٹیکسی کو تلاش کرے گی تم، اپنی ی کسی ایسی جگہ لے جاؤ جہاں سے اس کی نگاہ تم پر نہ پڑے اس سے پہلے کہ ڈرائیور اپنی ٹیکسی سٹارٹ کرتا۔ یہ کو ایک ٹیکسی مل گئی اور وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر چل پڑی۔ ڈرائیور نے اطمینان سے ٹیکسی آگے بڑھا دی تھی۔ ازیہ تعاقب کرتی رہی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر پہنچ کر اس نے موبائل پر دلاور سے رابطہ قائم کیا۔

"ہاں میں تمہاری ٹیکسی کے پیچھے پیچھے آ رہا ہوں۔ میں نے اسے واش روم کی طرف اور پھر وہاں ے نکل کر پچھلے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔"

"گڈ، میں بس آپ کو یہی بتانا چاہتی تھی دلاور بھائی۔"

"فکر مت کرو۔ میں تمہارے پیچھے ہوں اور تم کسی قسم کا خوف بھی نہ محسوس کرو۔" دلاور نے اب دیا۔ صوفی نے ان لوگوں کو اس قدر ایکسپرٹ کر دیا تھا کہ اب بے شمار باتیں انہیں بتانے کی ضرورت انہیں پیش آتی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں اپنا کام کیسے سرانجام دینا ہے۔ آخرکار دونوں اس عمارت کے ں پہنچ گئے۔ جہاں ثوبیہ نے ٹیکسی رکوائی تھی اور پھر بقیہ کارروائی بھی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی گارڈ نے ٹیکسی ڈرائیور کو آ کر بل کی رقم ادا کی تھی۔ لفٹیں کئی لگی ہوئی تھیں۔

چنانچہ دونوں الگ الگ لفٹوں میں چلے اور دلاور چھٹی منزل پر اتر گیا۔ شازیہ بھی تھوڑی دیر کے لدو ہیں پہنچ گئی تھی۔ اس کے بعد اس کو فلیٹ نمبر ۶۱۵ میں داخل ہوتے دیکھا۔ یہ دونوں وہاں سے آگے بڑھ لئے تھے دلاور نے شازیہ سے کہا۔

"جس انداز میں اس نے فلیٹ کا تالا کھولا ہے اور جس طرح گارڈ نے ٹیکسی کا بل ادا کیا ہے۔ ں سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمارت کا یہ فلیٹ اس کی مکمل رہائش گاہ ہے شازیہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور ب کچھ دیر کے بعد انہوں نے صوفی کو اس بارے میں اطلاع دی تو صوفی نے کہا۔

"دلاور کو وہیں چھوڑ دو اور تم میرے پاس آ جاؤ۔" درویشوں کی دعاؤں سے۔

"کہاں؟"

"گرین ہاؤس۔" صوفی نے جواب دیا اور فون بند کر دیا۔ شازیہ نے گردن ہلا دی تھی۔

♥ ...... ♥ ...... ♥

گرین ہاؤس میں صوفی نے شازیہ کا استقبال کیا تھا۔ دلاور کو وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ تاکہ وہ ثوبیہ خان کی نگرانی کرے۔ صوفی گرین ہاؤس کے ایک خاص کمرے میں شازیہ کا انتظار کر رہا تھا۔ شازیہ نے وہاں پہنچ کر اسے سلام کیا۔

تو صوفی نے بڑی محبت سے اس کا جواب دیا۔ پھر بولا۔

"ہمارا اندازہ بالکل درست نکلا شازیہ۔ لیکن جو فلیٹ تم نے دریافت کیا ہے وہ میرے لئے بڑی

دلچسپ نوعیت کا حامل ہے۔"

"جی چھوٹے بابا۔"

"ایک سوال کرنا چاہتا ہوں تم سے۔"

"حکم کیجئے۔" شازیہ نے کہا۔

"کیا تم ثوبیہ کی آواز اور اس کے انداز کی نقل کر سکتی ہو۔"

"زندگی میں اور سیکھا ہی کیا ہے چھوٹے بابا نقلیں کرنے کے سوا۔"

"خیر اب میں تمہیں خود نہیں بتاؤں گا کہ تم نے زندگی میں اور کیا کیا سیکھا ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ جو کچھ تم نے سیکھا ہے۔ وہ عام لوگ نہیں سیکھتے اور نہ ہی انہیں اس سے دلچسپی ہوتی ہے۔"

"شکریہ چھوٹے بابا۔ آپ کے ان الفاظ کو میں دل کی گہرائیوں میں محسوس کر رہی ہوں۔"

"تمہیں اب ثوبیہ کی جگہ لینی ہے۔" صوفی نے کہا اور شازیہ سنسنی محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی۔

"دلچسپ تجربہ ہوگا میرے لئے۔"

"خیر ایسے تجربات تم بہت سے کر چکی ہو اور ان میں اپنی مہارت کا ثبوت دے چکی ہو۔"

"میری دعا ہے چھوٹے بابا کہ آپ جب بھی کوئی کام میرے سپرد کریں میں اس میں مہارت کا ثبوت ہی دوں۔"

"تب پھر آ جاؤ ہمیں بہت زیادہ وقت نہیں برباد کرنا چاہئے۔" صوفی نے کہا اور شازیہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی پھر بولی۔

"جی چھوٹے بابا۔"

"میں تمہارا میک اپ کروں گا۔"

"اوہ ...... ٹھیک ہے۔" شازیہ نے کہا اور صوفی اسے اس کمرے سے لا کر انڈر گراؤنڈ تہہ خانے میں لے گیا۔ گرین ہاؤس کو اب بہت سی ایسی چیزوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ جن کی مدد سے وہاں بہت سے کام کئے جا سکتے تھے۔ ایسے کمرے بھی بنا لئے گئے تھے اس میں جہاں پہنچنے کے بعد کسی خاص میکنیزم کے علاوہ ان سے باہر نکلنا ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ صوفی نے میک اپ کا سامان نکالا اور شازیہ کے چہرے پر مصروف ہو گیا۔ کوئی سوا گھنٹے تک وہ بڑی محنت اور باریکی کے ساتھ اس کے چہرے پر کام کرتا رہا اور پھر ناقدانہ نگاہوں سے اس کا جائزہ لینے کے بعد اس کے منہ سے آواز نکلی۔

"حق اللہ۔"

"آئینہ دیکھ سکتی ہوں۔ چھوٹے بابا۔" صوفی نے گردن ہلا دی۔ شازیہ نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا اور دنگ رہ گئی۔ اتنے شاندار خدوخال کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میک اپ میں ذرہ برابر بھی خامی نہیں تھی اور وہ بالکل ثوبیہ خان نظر آ رہی تھی۔ صوفی اسے آگے کا پورا منصوبہ سمجھانے لگا اور شازیہ نے گردن ہلا دی۔ صوفی نے کہا۔

"مشکل کام ہوگا شازیہ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ غلام قادر کو بھی میں وہاں بھیج دوں گا۔ دونوں

ہاری نگرانی کریں گے۔"

"آپ نے ہمیشہ مجھ پر بھروسہ کیا ہے چھوٹے بابا اطمینان رکھئے میں ہر قسم کے حالات سے نمٹنے صلاحیت رکھتی ہوں۔"

"یہ کچھ جدید اسلحہ آیا ہے میرے پاس۔ اس وقت تمہاری بہترین ضرورت ہوگی۔" صوفی نے کہا اس کے بعد اس نے جو چیزیں شازیہ کو دیں۔ وہ واقعی شازیہ کے لئے حیران کن تھیں۔ اس میں ایک لپ ک تھی۔ جسے اوپر کے حصے سے کھول کر لپ اسٹک کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا لیکن اگر اسے بند کر کے ا کا دوسرا رخ ڈھکن کی طرف سے کھول دیا جاتا تو یہ ایک چھوٹے سائز کا پستول بھی تھا۔ اس طرح کی اور دو ن چیزیں اس نے شازیہ کے پرس میں رکھ دیں۔ اس کے بعد بولا۔

"آؤ چلتے ہیں۔" کار میں بیٹھ کر سفر کرتے ہوئے اس نے دلاور سے موبائل فون پر رابطہ قائم کیا اور دلاور نے فوراً فون ریسیو کیا۔

"ہاں دلاور۔ کیا صورتحال ہے۔"

"سب ٹھیک ہے۔" صوفی صاحب وہ اپنے کمرے ہی میں ہے۔ شازیہ نے آپ کو سب کچھ بتا ہے ناں۔"

"ہاں۔ تم کہاں ہو؟"

"اسی راہ داری کے آخری سرے پر ایک بالکونی ہے۔ وہاں کھڑا ہوا ہوں۔ یہ بہت خوب صورت بٹ ہیں اور یہاں کے رہنے والے۔ ایک دوسرے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ اس لئے مجھے یہاں کھڑے ہنے میں کوئی دقت پیش نہیں آ رہی۔"

"ٹھیک ...... آرام سے رہو۔" صوفی نے کہا اور اچانک ہی اس نے راستہ بدل دیا۔

"ادھر نہیں چھوٹے بابا۔"

"مجھے پتا ہے۔" صوفی نے کہا۔ پھر بولا۔

"تمہیں یاد نہیں رہا۔ جو کچھ تم نے مجھے بتایا۔ اس میں یہ بھی بتایا کہ گارڈ نے آ کر ٹیکسی کا بل ادا کیا اس کے بعد ثوبیہ کا مزید رابطہ بھی اس سے رہا۔

"جی تو پھر؟"

"گارڈ کو معلوم ہوگا کہ ثوبیہ اپنے فلیٹ میں موجود ہے۔ اگر وہ دوبارہ ثوبیہ کو دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔"

"او مائی گاڈ واقعی۔"

"چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

"تو پھر اب ہم کیا کریں؟"

"کچھ نہیں۔" صوفی نے کہا اور ایک بھرے پرے بازار میں داخل ہو کر ایک دوکان کے سامنے ڑی روک دی، یہاں ہر طرح کے برقعے اور گاؤن وغیرہ دستیاب تھے۔ صوفی نے ایک پرانے طرز کا برقعہ لا اور اس کے بعد شازیہ کو وہ برقعہ پہننے کو دیا۔ شازیہ برقعہ پہن کر خوب ہنسی تھی۔ اس نے کہا۔

''واہ چھوٹے بابا۔ آپ نے برقعہ پچاس سال قدیم قسم کی خواتین کا خریدا ہے۔''

''ساتھ میں ایک سو پچاس سال پرانا آدمی بھی تو تمہارے ساتھ ہے۔'' صوفی نے جواب دیا اور شازیہ خوب ہنسی۔ برقعہ پہن کر وہ صوفی کے ساتھ سفر کرتی ہوئی آخر کار اس عمارت تک پہنچ گئی۔ جہاں اسے اپنا کام کرنا تھا۔ صوفی با آسانی عمارت کے اندر داخل ہوا کسی نے ان کی جانب توجہ نہیں کی تھی۔ فلیٹوں میں رہنے والوں کے مہمان آتے جاتے رہتے تھے اور کوئی خاص چیکنگ نہیں تھی ان کے سلسلے میں۔ صوفی چھٹی منزل پر پہنچ گیا۔ دلاور اب بھی وہیں بالکونی میں موجود تھا۔ صوفی کو دیکھ کر وہ ٹہلتا ہوا اس کے قریب آیا۔

''چھ سو پندرہ......''

''کوئی اور خاص بات تو نہیں؟''

''بالکل نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اور اس کے بعد صوفی نے شازیہ کو اشارہ کیا اور شازیہ آگے بڑھ گئی۔ کچھ لمحوں کے بعد اس نے فلیٹ کی بیل دبائی۔ دوسری اور تیسری بیل دبائی تو دروازہ کھلا اور ثوبیہ خان سلیپنگ سوٹ میں نظر آئی۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے اور آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سو رہی تھی۔ اس نے شازیہ کو بے چین نگاہوں سے دیکھا اور بولی۔

''کیا مصیبت آئی ہے تم پر...... یہاں بھی بھیک مانگنے آجاتے ہیں۔'' جواب میں شازیہ نے برقعہ سے ہاتھ نکالا اور پستول کی نالی ثوبیہ خان کے سینے پر رکھ دی۔ پھر بولی۔

''ایک لفظ منہ سے نکلا تو سینے میں سوراخ ہو جائے گا۔'' اس نے اسے پیچھے دھکیلا اور عقب سے صوفی بھی اندر داخل ہو گیا۔ ثوبیہ کے منہ سے ایک سہمی ہوئی سی آواز نکلی تھی۔

''تم......'' صوفی نے پلٹ کر دروازہ اندر سے بند کیا۔ شازیہ نے پستول سیدھا کر رکھا تھا۔ ثوبیہ چونکہ سوتے سے جاگ کر آئی تھی اس لئے۔ ابھی تک چکرائی ہوئی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس نے خود کو سنبھال لیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے۔ کیا چاہتے ہو تم دونوں؟''

''نہایت غلط قسم کی خاتون ہیں آپ۔ یعنی تہذیب کا تو نام و نشان نہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔ ہم لوگوں نے کتنے احترام سے تمہیں اپنے ساتھ رکھا اور تم......'' اچانک ہی ثوبیہ کے حلق سے ایک آواز نکلی اور اس نے پہلی بار غور سے شازیہ کا چہرہ دیکھا تھا اور اس کی آنکھیں شدت حیرت سے پھیل گئیں تھیں۔

''یہ...... یہ کون ہے؟'' یہ کون ہے۔''

''ثوبیہ خان۔'' صوفی نے جواب دیا۔

''کک...... کک...... کیا...... کیا بکواس ہے۔ ثوبیہ خان تو میں ہوں۔''

''یہ تو تم بتاؤ گی اب کہ تم کون ہو۔ اصل ثوبیہ خان یہ ہے۔''

''دیکھو...... میں جتنے دن تمہارے ساتھ رہی ہوں۔ میں نے تمہیں ایک اچھا انسان پایا ہے۔ اس لئے تمہارا احترام کر رہی ہوں۔ یہ کیا حرکت ہے اور کیوں ہے۔ میں اس بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔

''ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں۔ عزیزہ کہ آپ کرن ہیں اور ثوبیہ خان کی شکل کیوں اختیار کئے

ہوئے ہیں؟''

''تو یہ ثوبیہ خان ہے۔'' ثوبیہ خان نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''سو فیصدی۔ یوسف خان نے یہ ہی بتایا ہے۔''

''تم لوگ جو کچھ کر رہے ہو ناں۔ میں اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ لیکن تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میں کیا کر سکتی ہوں۔''

''یہ ہی اندازہ لگانے کے لئے یہاں حاضر ہوئے ہیں درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی نے کہا اور جیب سے ایک پستول نکال لیا۔ لیکن یہ کھلونا پستول تھا۔ وہ بولا۔

''بجائے اس کے کہ ہم تمہیں زیادہ پریشانی سے دوچار کریں۔ اس پستول کی ایک گولی کھاؤ اور گہری نیند سو جاؤ درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی نے کہا اور پستول کا ٹریگر دبا دیا۔ پستول سے ایک سبز رنگ کا غبارہ باہر نکلا اور ثوبیہ خان گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ غبارے نے اس کے چہرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور آن کی آن میں وہ چکرانے لگی۔

اس کے بعد جیسے ہی وہ گرنے لگی۔ صوفی نے فوراً اسے سنبھال کر زمین پر لٹا دیا۔ شازیہ دلچسپ کی نگاہوں سے صوفی کی یہ کارروائی دیکھ رہی تھی۔ صوفی کے ایک ایک قدم سے اسے عقیدت ہو گئی تھی۔ پھر صوفی ثوبیہ خان کو لے کر کمرے میں آیا اور اس کے بعد اسے بستر پر لٹا دیا۔

''یہ کئی گھنٹوں تک ہوش میں نہیں آئے گی لیکن پھر بھی ہم اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتے ہیں۔ دن کی روشنی میں اسے عمارت سے باہر لے جانا ممکن نہیں ہوگا۔ رات کو یہ جگہ کلیئر ہو جائے گی۔'' شازیہ نے گردن ہلا دی تھی اور پھر صوفی نے اسی فلیٹ میں ثوبیہ خان کو باندھنے کے لئے چیزیں تلاش کیں اور پھر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے وہیں مسہری پر ڈال دیا۔

♥......♥......♥

ٹارزن کا ماضی کافی حد تک سہیل عالم بارود والا کے علم میں تھا۔ چھوٹے سے قد و قامت کا یہ شخص زندگی کے اتنے نشیب و فراز سے واقفیت رکھتا تھا کہ عام لوگ شاید اتنے تجربات زندگی میں نہ حاصل کر سکتے ہوں۔ وہ اپنے ننھے منے قد و قامت کے باوجود کس طرح خطرناک تھا۔ یہ بات البتہ سہیل عالم کو معلوم تھی۔

بہرحال سہیل عالم اپنی شناخت کے لئے یہاں آیا تھا اور آخر کار اس نے اپنے باپ کو قائل کر لیا تھا اس کے اہل خاندان اور خود اس کا باپ جو بہت بڑی شخصیت کا مالک تھا۔ اس سے ملنا چاہتا تھا۔ لیکن سہیل عالم بہت خوددار انسان تھا۔ باپ سے ملاقات ہوتی تو وہ کہتا۔ ''ڈیڈی بات صرف اتنی سی ہے کہ میں آپ کی دی ہوئی کسی مراعات سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا۔ ورنہ دنیا یہ ہی سمجھے گی کہ میں آپ کی دولت کے لالچ میں یہاں تک پہنچا ہوں۔ آپ اپنے اثاثوں کا ایک ایک حصہ اپنے بیٹے اور بیٹیوں کے نام لکھ دیں۔ مجھے ذرہ برابر اس کی ضرورت نہیں ہے۔ جی رہا ہوں اور اپنے طور پر جینا چاہتا ہوں۔ یہ ہی میری ماں کی تربیت تھی اور اب جب آپ مجھے مل چکے ہیں تو میرے لئے اس سے بڑا سرمایہ اور کوئی نہیں ہے کہ میں اپنے باپ کی نشاندہی کر سکتا ہوں۔ کم از کم میرے دل سے وہ بوجھ ہٹ گیا ہے۔ بس یہ ہی میرے لئے سب سے قیمتی سرمایہ ہے اور اس کے علاوہ مجھے اور کسی شے کی ضرورت نہیں ہے۔

ٹارزن کو یہ سب حالات معلوم تھے۔ ویسے بھی وہ دل سے سہیل عالم کی قدر کرتا تھا۔ یہاں آنے کے بعد سہیل عالم صوفی سے بہت زیادہ متاثر ہوگیا تھا۔ ٹارزن کو خود بھی اس بے ڈول سے انسان سے بڑی عقیدت ہوگئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود بھی انتہائی اعلیٰ کارکردگی کا مالک تھا اور صوفی میں بھی اس نے یہ ہی دیکھا تھا کہ بڑی زبردست ذہانت رکھتا ہے اور جو بھی عمل کرتا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔

بہر حال یہ بھی اندازہ اس نے لگا لیا تھا کہ صوفی من موجی سا آدمی ہے۔ سہیل عالم چاہتا ہے کہ صوفی ہر لمحہ اسے اپنے ساتھ رکھے۔ لیکن صوفی شاید ہر لمحہ اسے اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ جب روزا میلسی کا واقعہ پیش آیا تھا۔ روزا میلسی کو ٹارزن اچھی طرح جانتا تھا۔ روزا میلسی نے اس پر قاتلانہ حملہ کر کے اسے قتل کرنا چاہا تھا۔ اب یہ الگ بات تھی کہ ٹارزن اپنی ذہانت سے بچ گیا تھا۔ پھر اس کے بعد مزید کارروائیاں ہوئیں۔ صوفی نے روزا میلسی سے معلومات حاصل کیں اور اس کے بعد سہیل عالم نے اسے مانگ لیا۔ سہیل عالم نے اپنی ذہانت سے کام لے کر روزا میلسی اور اس کے چاروں ساتھیوں کا دماغ خراب کر دیا اور وہ سڑکوں بھٹکتے رہے۔ پھر اس کے بعد انہیں سرکاری تحویل میں لے لیا گیا اور آخر کار ایک ملک کے سفارتخانے نے روزا میلسی کو اپنے ملک کا شہری قرار دے کر اسے اپنی تحویل میں لے لیا اور اب شاید سفارت خانے کے مذاکرات چل رہے تھے۔

روزا میلسی کو ایک ہسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا۔ جہاں اس کا علاج کیا جا رہا تھا۔ لیکن ٹارزن اس بات سے مطمئن نہیں تھا۔ ٹھیک ہے۔ روزا میلسی دماغی طور پر ماؤف ہوگئی تھی اور سفارت خانے نے اس پر ہاتھ رکھ دیا تھا لیکن روزا میلسی ایک چالاک مجرم تھی کون لوگ اس کے پس پشت ہیں یہ بات ابھی سامنے نہیں آئی تھی۔ نجانے کیوں صوفی اور سہیل عالم بارود والے نے یہ بات پس پشت ڈال دی تھی کہ روزا میلسی کے پشت پناہوں کو تلاش کریں یا پھر وہ ڈسک جو انہیں حاصل ہوگئی تھی۔ اس سے انہیں معلومات حاصل ہو چکی تھیں کہ روزا میلسی کون ہے اور کس تنظیم کے لئے کام کر رہی ہے؟ لیکن اس کے بعد وہ روزا میلسی سے کیا کام لیتے ہیں۔ اس بات پر نہ صوفی نے اور نہ سہیل عالم نے غور کیا تھا۔ البتہ ٹارزن اس لئے اس بارے میں سوچتا رہا تھا کہ روزا میلسی اس پر قاتلانہ حملہ کر چکی تھی۔

ان دونوں نے اس بات پر توجہ نہیں دی تھی لیکن ٹارزن بہ دستور روزا میلسی کی تاک میں لگا ہوا تھا۔ چونکہ اس وقت سہیل عالم کی جانب سے اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں کی گئی تھی۔ اس لئے وہ آزادی سے اپنا کام کر رہا تھا۔ اس نے معلومات حاصل کر کے اس جگہ کا پتا لگا لیا تھا جہاں روزا میلسی کو رکھا گیا تھا۔ یہ ایک پرائیویٹ ہسپتال تھا اور بڑی شان وار روایت کے حامل ایک غیر ملکی ادارے نے اسے قائم کیا تھا اور وہی ادارہ اسے انتہائی اعلیٰ پیمانے پر چلا رہا تھا۔ یہاں عام طور پر غیر ملکی داخل ہی ہوا کرتے تھے۔

لیکن ہر شعبے کے بہترین ڈاکٹر یہاں موجود تھے۔ اس کے علاوہ ہسپتال کے اعلیٰ کارکن کسی بھی ضرورت پر دنیا کے کسی بھی ملک سے ڈاکٹرز کا تبادلہ کر لیا کرتے تھے اور اس طرح یہ ہسپتال اپنی نوعیت کا واحد ہسپتال تھا۔ ٹارزن بے پناہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ بعض جگہوں پر اس کا چھوٹا قد اس کے لیے مشکل کا باعث بن جاتا تھا۔ لیکن اس کے پاس ہر چیز کا حل موجود تھا۔ خاص قسم کے فائبر کی مضبوط ٹانگیں اس نے بنوائی

تھیں۔ جنہیں اپنے پیروں میں فٹ کر کے وہ ان سے بہترین کام لے لیا کرتا تھا۔ ہسپتال کے متعلق مکمل معلومات حاصل کرنے کے بعد اس نے کچھ اور کوششیں شروع کر دیں اور آخر کار وہ ایک مناسب قد و قامت کے شخص کی حیثیت سے ہسپتال میں داخل ہوگیا۔

اس نے وارڈ بوائے کا لباس اختیار کیا تھا اور ہسپتال میں باقاعدہ ڈیوٹی سرانجام دیتا تھا۔ چالاکی سے اس نے آج تک اپنی حیثیت کو مشروط نہیں ہونے دیا تھا۔ بہر حال بے شک یہ ایک مشکل کام تھا۔ لیکن ایک ذہین آدمی کے لئے نہیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں اسے اتنا پتا چل گیا کہ روزا میلسی اور اس کے ساتھی کہاں ہیں؟ خصوصی طور پر شاید سفارت خانے کی ہدایت یا کوششوں سے روزا میلسی کو ہسپتال کی بلڈنگ کے اوپر کا حصہ ملا تھا اور ایک بڑے سے ہال میں ان پانچوں کو رکھا گیا تھا روزا میلسی کے بارے میں کوئی صحیح اندازہ لگانا بڑا مشکل کام تھا۔ لیکن بہر حال ٹارزن مسلسل کوششوں میں مصروف تھا اور پھر اس کی یہ کوشش بار آور ہوگئی تقریباً چار یا پانچ دن کی مسلسل کاوشوں کے بعد اس نے ایک دن تین افراد کو ایک ڈاکٹر کے ساتھ روزا میلسی کے اس ہال نما کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ تینوں شکل سے ہی مشکوک نظر آ رہے تھے۔ اچھی شخصیت کے مالک تھے۔ گہری سنجیدگی کے حامل ڈاکٹر انہیں لے کر ہال میں داخل ہوا تو ٹارزن نے وہ جگہ سنبھال لی۔ جہاں سے وہ اندرونی صورت حال کا بھرپور جائزہ لیا کرتا تھا۔ ایک ایسی جگہ منتخب کر لی تھی اس نے، جہاں سے وہ اندر کی آوازیں بھی سن لیا کرتا تھا۔ تینوں افراد اندر داخل ہوئے اور پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

''بے حد شکریہ ڈاکٹر آپ پورے اعتماد کے ساتھ ہمیں یہاں تنہائی دیں ہم اپنے طور پر کچھ کام کریں گے۔''

''آپ کے بارے میں ہمیں جو ہدایتیں ملی ہی ہیں سر! اس کے بعد ہم آپ پر مکمل اعتماد کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ اطمینان سے یہاں قیام کیجئے گا۔ براہ کرم مریضوں کو کسی ایسی کیفیت کے لئے آمادہ نہ کیجئے جو ان کے لئے ذہنی ہیجان کا باعث ہوں۔''

''آپ بالکل مطمئن رہیں۔'' ان میں سے ایک بھاری بھر کم شخص نے کہا۔

پھر اس کے بعد ڈاکٹر تو باہر نکل گیا۔ ان میں سے ایک نے بڑھ کر ہال کا دروازہ بند کر دیا اور اس کے بعد وہ روزا میلسی کے پاس پہنچ گیا جو بستر پر لیٹی سادہ نگاہوں سے ان لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔

''میڈم آپ اس قدر ذہنی قوتوں کی مالک ہیں کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ آپ کو کس طرح ذہنی طور پر معذور کر دیا گیا ہے۔ آپ کے کارنامے اور آپ کی شخصیت پوری طرح ہمارے علم میں ہے۔''

''میاؤں۔'' روزا میلسی نے بلی کی آواز منہ سے نکالی اور اس شخص نے تشویش زدہ نگاہوں سے روزا میلسی کو دیکھا۔

''میرا نام عیشل براؤن ہے۔ عیشل براؤن کے بارے میں آپ نے ضرور سن رکھا ہوگا۔ آپ کے برابر کارنامے تو میں نے نہیں انجام دیئے لیکن پھر بھی عیشل براؤن کو اچھے الفاظ میں یاد کیا جاتا ہے اور تنظیم مجھے۔''

''بھوؤں...... بھوؤں...... بھوؤں۔'' اس بار پیچھے سے آواز آئی تھی۔

''میڈم ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ کے ذہن میں کوئی خاص پروگرام ہے۔ یا پھر صرف اپنے بچاؤ کے لئے آپ نے یہ انداز اختیار کیا ہے۔

''ٹیں، ٹاں، ٹوں......ٹیٹوں، فوں۔'' روزا میلسی نے کہا اور بچوں کی طرح ہاتھ پاؤں چلانے لگی۔

عیشل براؤن تشویش زدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف رخ کر کے کہا۔

''آپ کیا کہتے ہیں ڈاکٹر فوگ۔'' جس شخص کو ڈاکٹر فوگ کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور روزا میلسی پر جھک گیا۔ روزا میلسی کے حلق سے پھر ہلکی سے ''ٹیاؤں'' کی آواز نکلی اور وہ خوف زدہ نظر آنے لگی۔ ڈاکٹر فوگ اسے دیکھتا رہا اور اس کے بعد سیدھا کھڑا ہو گیا۔

''نہیں مسٹر براؤن یہ لوگ آؤٹ آف سینس ہیں۔ یہ صحیح معنوں میں اپنا ذہنی توازن کھو چکے ہیں۔''

''اوہ۔'' ادھر ان لوگوں میں سے کوئی کافی دیر وہ ان لوگوں کا جائزہ لیتے رہے اس کے بعد یہ بات فائنل کر دی گئی کہ یہ پانچوں ذہنی طور پر معذور ہیں۔''

''یہ زیادہ پریشان کن بات ہے۔ اب آپ کی باری شروع ہوتی ہے۔ مسٹر ہیڈن ان لوگوں کے لے جانے کا کیا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ ہم سفارت خانے سے مدد نہیں حاصل کر سکتے۔ چونکہ سفارت خانہ اس سلسلے میں چھان بین کرے گا۔ ہمیں خفیہ طریقے سے تیاریاں کرنی ہیں اور خفیہ طریقہ سے ان لوگوں کو یہاں سے نکالنا ہے۔''

''میں اس سلسلے میں کوئی مناسب منصوبہ بندی کرتا ہوں اصل میں بات وہی آ جاتی ہے کہ ہم غیر جگہ ہیں اور ہمارے وسائل محدود۔''

''میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے۔''

''کیا؟''

''یوسف خان، وہ ہمارا آدمی ہے۔ کیا کہتے ہیں آپ اس سلسلے میں؟''

''نہیں۔ میں یوسف خان کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ آپ کو شاید یہ بات یاد نہیں رہی ہے۔ کہ اس کے سلسلے میں ہمیں ریکارڈ دیا گیا ہے۔''

''نہیں میرے علم میں یہ بات نہیں ہے۔ خیریت، یوسف خان کے سلسلے میں ریکارڈ کیوں دیا گیا ہے۔''

''اس لئے کہ ابھی تک وہ تنظیم کے لئے کوئی نمایاں کارنامہ سرانجام نہیں دے سکا۔''

''ہوں۔''

''میں آپ کو ایک اور نام بتا رہا ہوں جو ہمارے لئے انتہائی کارآمد ہوگا۔''

''کون سا نام؟''

''اطہر جبار خان۔ کیا آپ کے علم میں یہ بات ہے کہ اس ملک کا ایک انتہائی اہم عہدے دار ہمارا اپنا آدمی ہے۔ اصل آدمی کے میک اپ میں۔ ہمارا اپنا کارکن۔''

''ہاں مجھے یہ بات معلوم ہے لیکن کہا گیا ہے کہ اسے اپنے قدم مضبوطی سے جما لینے ہوں گے اور اس وقت تک اس سے کوئی کام نہ لیا جائے۔''

''دیکھئے۔ تنظیم کی طرف سے جو ذمہ داریاں سونپی جاتی ہیں۔ ان کا آغاز اس دن سے ہو جاتا ہے جس دن کسی شخص کو ذمہ دار بنایا جاتا ہے۔ بے شک احتیاط کے پیش نگاہ ہم ایک شخص کو ہم ایک مضبوط بنیاد دینا چاہتے ہیں لیکن اب جب ایسی افتاد پڑی ہے تو پھر تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔''

''ہم نہیں جانتے کہ اطہر جبار خاں نے یہاں اپنے کیا تعلقات بڑھائے ہیں۔''

''یار کیسی باتیں کرتے ہو؟ وہ جس عہدے پر کام کر رہا ہے۔ اس میں تعلقات میں کیا کوئی کمی ہو سکتی ہے۔''

''ہوں۔ تو پھر اس سلسلے میں اطہر جبار خاں سے ہی رجوع کیا جائے۔''

''ہاں، بہ ظاہر اور کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا۔ ہم اس سلسلے میں کوئی مناسب کارروائی ضرور کریں گے۔ تنظیم کی طرف سے جو احکامات دیئے جاتے ہیں۔ وہ ایک باقاعدہ پلاننگ کے تحت ہوتے ہیں۔ لیکن بیشتر مواقع اس طرح کے ہوتے ہیں کہ جو پلاننگ ہم کرتے ہیں۔ ان میں ہمارے راستوں کی رکاوٹیں دور نہیں ہو پاتیں اور ہم مجبوراً اپنا طریقہ کار بدلنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ ساری صورت حال دیکھنے اور سوچنے کے قابل ہوتی ہے۔ ویسے ایک بہت ہی ذمہ دار کارکن کے ساتھ یہ سلوک ہوا ہے۔''

''میں تو آپ سے ایک بات کہتا ہوں مسٹر عیشل براؤن کہ ہمیں انتہائی محتاط رہنا چاہیے۔ بنیادی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے روزا میلسی کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے وہ یقیناً روزا میلسی سے واقف ہو چکے ہوں گے۔''

''ہمارا کام صرف اپنے طور پر احتیاط کرنا اور روزا میلسی کو ہر قیمت پر یہاں سے نکال لے جانا ہے اور تنظیم میں بے شمار افراد ان کاموں کے لئے موجود ہیں۔'' عیشل براؤن نے کہا۔

''تو پھر اب کیا ارادہ ہے؟''

''فی الحال چلتے ہیں۔ ہمارے پاس ایک صرف واحد ذریعہ اطہر جبار ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں سوچی جا سکتی۔ پھر بھی اس سلسلے میں ایک آخری میٹنگ کر لیں گے ہم لوگ۔'' ٹارزن نے اس گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا تھا۔ اس کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ ویسے بھی اس کا تعلق جرم کی دنیا سے رہا تھا۔ اس لئے ہر بات کو صحیح انداز میں سوچ سکتا تھا اور اس کے بارے میں فیصلہ کر سکتا تھا۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے ان لوگوں کا تعاقب کر کے ان کی رہائش گاہ کا پتا لگایا جائے تاکہ ان کے سلسلے میں کوئی موثر قدم اٹھایا جائے۔ ایک اور نام اس کے علم میں آیا تھا اطہر جبار خان جسے اس نے پوری طرح ذہن نشین کر لیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ نام کس کا ہے۔ لیکن بہرحال ان لوگوں نے جس انداز میں اس کے بارے میں گفتگو کی تھی۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اطہر جبار خان کوئی مقامی عہدیدار ہے۔ لیکن ان لوگوں کا آلہ کار بلکہ وہ ہے جو اصل شخص کی جگہ تبدیل کر دیا گیا ہے۔ غرض یہ کہ اطہر جبار خان کا نام اچھی طرح ذہن نشین کر کے ٹارزن وہاں سے باہر نکل آیا۔ یہ لوگ بڑی باقاعدگی کے ساتھ یہاں پہنچے تھے اور یہاں کے ڈاکٹروں نے ان سے تعاون کیا تھا۔ اس لئے ان کے خفیہ طور سے کہیں پر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ٹارزن برق رفتاری سے باہر نکلا اس نے سب سے پہلے اپنی مصنوعی ٹانگیں ایک مناسب جگہ بیٹھ

کر کھولیں۔ انہیں محفوظ کیا اور اس کے بعد باہر نکل آیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ لوگ کون سی کار میں آئے ہیں۔
ہسپتال کے پارکنگ لاٹ پر کئی کاریں کھڑی ہوئی تھیں اس نے ایک کار کو تاڑا جس کا ڈرائیور اس کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ ٹارزن ڈرائیور کے پاس پہنچا اور اس نے کہا۔

"آپ کھرونہ صاحب کے ساتھ آئے ہیں؟" ڈرائیور نے چونک کر اسے دیکھا اور بولا۔

"کون کھرونہ؟"

"دیکھیے آپ کو وہ...... سامنے بلایا جا رہا ہے۔" ٹارزن نے اشارہ کیا کیوں کہ وہ وارڈ بوائے کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ ڈرائیور نے یہ ہی سمجھا کہ اندر سے اسے بھیجا گیا ہے۔ وہ سامنے دیکھتا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گیا۔ ٹارزن نے انتہائی پھرتی سے کار کا دروازہ کھولا اور اس کی پچھلی سیٹوں کے پیچھے رینگ گیا۔ اس نے اپنا کام یہ خوبی کرلیا تھا اور ہر طرح سے تیار تھا۔ تھوڑی دیر بعد ڈرائیور واپس آ گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ لیکن اسے کوئی نظر نہیں آیا تو وہ دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ اس کے منہ سے بڑبڑاہٹ نکل رہی تھی۔

"ہسپتال ہی کا کوئی بندہ معلوم ہوتا تھا۔ پتا نہیں کیا چاہتا تھا۔" لیکن بندہ جو چاہتا تھا وہ کچھ ہی لمحوں میں سامنے آ گیا۔ دفعتہً ہی عقب نما آئینے میں اس نے پچھلی سیٹوں سے ایک سر کو ابھرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ چونکتا یا سنبھلتا۔ انتہائی زوردار ضرب اس کے سر کے پچھلے حصے پر پڑی۔ اس کے حلق سے چیخ سی نکل گئی۔ قرب و جوار میں کوئی موجود نہیں تھا۔ ورنہ چیخ اتنی زوردار ضرور تھی کہ کوئی سن لیتا۔ لیکن دوسری ضرب نے اسے ہوش وحواس سے بے گانہ کر دیا اور پھر ایک ننھے سے وجود نے بڑی آسانی سے اس کا قوی ہیکل جسم گھسیٹ کر پچھلی سیٹوں کے درمیان کر دیا اور اسی کے لباس کو اتار کر اس کے ہاتھ پاؤں کس کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔

اس کام سے فراغت حاصل کر کے ٹارزن ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ اس دوران وہ لوگ غالباً ڈاکٹر سے روزامیلسی کے بارے میں بات چیت کرتے رہے تھے۔ اس لیے ٹارزن کو بھرپور موقع مل گیا تھا۔ تینوں واپس آئے ان میں سے ایک نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور نیلے رنگ کی وہ کار جو یقیناً رینٹ اے کار سے حاصل کی گئی تھی سٹارٹ ہو کر چل پڑی۔

ٹارزن نے بھی اپنی کار سٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی تھی۔ پھر وہ بڑی مہارت سے آگے والی کار کا تعاقب کرنے لگا۔ حالاں کہ سیٹ پر بیٹھ کر وہ بہت نیچا ہو جاتا تھا اور اسے بہت کم نظر آتا تھا لیکن مجبوری کی بات الگ ہوتی ہے۔ وہ کامیابی سے آگے والی کار کا تعاقب کرتا رہا اور پھر آگے والی کار ایک درمیانے درجے کے علاقے میں داخل ہو گئی جہاں فلیٹ ہی فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ کار ایک فلیٹ ایریا میں پارک ہوئی اور اس کے بعد ٹارزن نے ان تینوں کو نیچے اترتے ہوئے دیکھا۔ وہ بڑی کامیابی سے ان کا تعاقب کرتا ہوا پانچویں منزل کے فلیٹ کے دروازے پر پہنچا تھا جسے کھول کر وہ لوگ اندر داخل ہو گئے۔ گویا ان کا اسی فلیٹ میں قیام تھا۔

اس سے زیادہ کوئی کارروائی ان حالات میں حماقت تھی۔ چناں چہ ٹارزن نے واپسی کا فیصلہ کیا لیکن جو کچھ وہ معلوم کر کے آیا تھا وہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ پھر اس نے کار وہیں چھوڑی اور ایک ٹیکسی کر کے

واپس چل پڑا۔

جس وقت وہ اپنی رہائش گاہ میں داخل ہوا تو اسے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ سہیل عالم موجود ہے سہیل عالم ایک صوفے پر نیم دراز مقامی اخبار دیکھ رہا تھا۔ ٹارزن کو دیکھ کر وہ مسکرایا اور بولا۔

"ہیلو ٹارزن کیا جنگل سے واپس آ رہے ہو۔"

"ہاں۔ انسانوں کے جنگل سے۔"

"کیا کرتے پھر رہے ہو۔ آج کل خاصے غائب نظر آنے لگے ہو۔"

"بس، میں تمہاری مصروفیات میں دخل انداز نہیں ہونا چاہتا۔
تھوڑا بہت کام میں خود بھی کرتا رہتا ہوں۔" ٹارزن نے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں جانتا ہوں تم ایک مصروف انسان ہو۔ خاموش بیٹھ ہی نہیں سکتے لیکن کر کیا رہے ہو۔ مجھے بتاؤ گے۔" ٹارزن تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر اس نے پرخیال انداز میں کہا۔

"روزامیلسی نے اپنی دانست میں میرا کام تمام کرا دیا تھا۔ پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تمہارا معاملہ تھا لیکن میں اس بات سے مطمئن نہیں تھا کہ تم نے روزامیلسی کا دماغی توازن خراب کر کے اسے اس طرح چھوڑ دیا۔

"اوہو۔" اگر تم غیر مطمئن تھے ٹارزن تو تمہیں یہ بات مجھے بتانی چاہیے تھی۔"

"کوئی ضرورت نہیں محسوس کی تھی میں نے بلکہ میں یہ سوچتا رہا تھا کہ اب اس کے بعد روزامیلسی کا کیا ہو گا۔ تم نے اپنی دانست میں۔ اس بہت بڑی عورت کو دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا تھا لیکن میں یہ بات جانتا تھا کہ جس تنظیم سے اس کا تعلق ہے وہ اسے اس طرح بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گی۔ جس سفارت خانے نے اس کی ذمہ داری قبول کی اس کے بعد امکانات ہیں کہ اس ملک کے سفارت خانے کو یا اس ملک کو تنظیم کی طرف سے یہ ہدایت دی گئی ہو کہ وہ روزامیلسی کا تحفظ کریں۔
اور اس کے بعد ہمیں یہ بھی تو دیکھنا تھا کہ روزامیلسی کا ہوتا کیا ہے۔"

"ہاں بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو پھر؟"

"میں نے اسی لائن پر کام کیا۔"

"گڈ۔" سہیل نے اخبار ایک طرف رکھ کر دلچسپی سے کہا۔ اور سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"پھر تم نے کیا کیا ٹارزن؟"

"پہلے میں نے اس جگہ کو ٹریس کیا جہاں روزامیلسی کو سفارت خانے کی طرف سے رکھا گیا تھا۔ یہ ایک پرائیویٹ ہسپتال سے۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے اس بارے میں اس کا۔ بہت علاج ہو رہا ہے مگر وہ ناقابل علاج ہو چکی ہے۔ ٹارزن یہ بات تم بھی جانتے ہو جس فارمولے کے تحت ہم نے ان کے دماغ ناکارہ کیے ہیں تم یہ سمجھ لو کہ جب ان کے دماغ کی اسکینگ ہو گی تو انہیں پتا چل جائے گا کہ دماغ اس طرح جل چکے ہیں جیسے تیزاب سے کسی چیز کو جلا دیا جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تیزاب سے چیز جل کر خاکستر ہو جاتی ہے اور جو فارمولا

ہم نے استعمال کیا ہے اس سے دماغ جسم کا ایک ناکارہ حصہ بن کر رہ جاتا ہے۔“

”وہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن پھر بھی ہمیں یہ تو دیکھنا چاہیے تھا کہ وہ کون لوگ ہیں جو روزا میلسی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔“

”حاصل کرنے کی؟“ سہیل عالم نے اچھل کر کہا۔

”ہاں۔“

”کیا کوئی ایسی کوشش کی گئی ہے۔“

”کی جارہی ہے۔ ابھی اس میں کامیابی نہیں حاصل ہوئی اس کے علاوہ میں تم سے ایک سوال اور کرتا ہوں۔“ یہ اطہر جبار خان کون ہیں؟

”اطہر جبار خان، میں نہیں جانتا کیوں؟ خیریت۔“

”اطہر جبار خان نامی شخص تنظیم کا آدمی ہے اور یہاں اس ملک کا کوئی اعلیٰ عہدے دار لیکن وہ اصلی نہیں ہے۔ ایک نقلی آدمی کو اس کی جگہ دے کر اس کام کے لیے رکھا گیا ہے اور اب وہ شخص ان لوگوں کی یہاں سے واپسی کا بندوبست کرے گا۔“

”اوہ...... یہ بات تمہیں کیسے معلوم؟“

”اس لیے کہ میں وارڈ بوائے بن کر اس ہسپتال میں داخل تھا جہاں وہ تین افراد ایک ڈاکٹر کی مدد سے روزا میلسی سے ملنے آئے تھے۔“ ٹارزن نے ساری تفصیل سہیل عالم کو بتائی اور سہیل عالم تحسین آمیز نگاہوں سے ٹارزن کو دیکھنے لگا پھر اس نے کہا۔

”جب تم کام کرنے پر آتے ہو ٹارزن تو واقعی اچھے اچھوں کے کان کاٹ لیتے ہو۔“

”میں نے کسی کے کان نہیں کاٹے۔ صرف اپنا کام کیا ہے۔ روزا میلسی نے مجھے غلط سمجھا تھا۔ اگر اس طرح میں کسی عورت کے ہاتھوں شکار ہو جاؤں تو سچی بات یہ ہے کہ سو مرتبہ مر جانا پسند کروں گا۔“

”اب لے دے کر ہمارے پاس ایک ہی شخصیت رہ جاتی ہے۔“

”صوفی۔“ ٹارزن نے کہا۔

”ہاں۔ معلومات تو کرنی ہیں اور ذرا دیکھنا ہے کہ ساری صورت حال کیا ہے اصل میں ٹارزن ابھی تک ایک بات میں بڑی تشنگی محسوس کر رہا ہوں میں وہ یہ کہ میرے پاس اپنا کوئی سٹاف نہیں ہے۔“

”کرو گے کیا؟“ میرا تو خیال یہ ہے کہ جب تمہارا مقصد حاصل ہو گیا ہے تو ہمیں واپس یورپ کی دنیا میں چلے جانا چاہیے۔“

”یہ بعد کی بات ہے۔ بعد میں سوچیں گے آؤ اٹھو......“ سہیل عالم نے کہا اور اس کے بعد دونوں باہر نکل آئے۔ سہیل عالم کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ صوفی کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ صوفی نے اپنی مخصوص شخصیت کے ساتھ ان کا استقبال کیا تھا اور پھر وہ انہیں اندر لے گیا۔

”خیریت درویشوں کی دعاؤں سے۔“

”ہاں صوفی صاحب درویشوں کی دعاؤں سے تو ہمیشہ خیریت ہی رہتی ہے آپ کے لیے بڑی

دلچسپ اطلاعات لے کر آیا ہوں۔“ صوفی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا اور سہیل عالم ہنس پڑا۔ پھر بولا۔

”بہت کم موقع ایسے آتے ہیں جب آپ اس قدر شگفتہ موڈ میں ہوتے ہیں۔“

”ہاں آج کل موڈ میں واقعی شگفتگی ہے اور اس کی بنیادی وجہ معشوق نشیلے کی چلہ کشی ہے۔“

”معشوق نشیلے کی چلہ کشی؟“

”ہاں...... چالیس دن کا چلہ کھینچنے کے لیے بے چارہ ایک گوشے میں جا بیٹھا ہے اور حسینہ اس سے گن گن کر بدلے چکا رہی ہے۔“ سہیل عالم ہنس پڑا پھر بولا۔

”مگر چلہ کس سلسلے میں ہے۔“

”بس وہ ہمیشہ عشق میں ناکام رہتا ہے۔ درویشوں کی دعاؤں سے جتنے بھی عشق اس نے کیے ہیں ان میں سے ایک میں بھی اسے کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ کسی بزرگ سے تعویذ وغیرہ لے کر آیا ہے اور وہ نئی لڑکی جسے ہم لوگ یہاں لائے تھے معشوق نشیلے کو بے وقوف بنا کر فرار ہو گئی۔ بتائیے سہیل عالم صاحب یہ تو کوئی ایسی بات نہیں ہے۔“ سہیل عالم صوفی کو دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

”بڑی بڑی سنسنی خیز خبریں سننے کو ملتی ہیں جب بھی آپ کے پاس آتے ہیں لیکن آج ایک انتہائی سنسنی خیز خبر ہم بھی آپ کو سنا رہے ہیں۔“

”ارشاد...... ارشاد...... درویشوں کی دعاؤں سے۔“

”ٹارزن نے اس بار واقعی بڑا زبردست کارنامہ سرانجام دیا ہے؟“

”کیا ہوا؟“ کیا جنگلی تیندوے کو ہلاک کر دیا۔

”ایسی ہی کچھ پوزیشن ہے۔ روزا میلسی کو ہم لوگوں نے واقعی غلط نظرانداز کیا تھا جو کام اس سے لیا جا چکا اس کے بعد دو ہی باتیں تھیں یا تو اسے ختم کر دیا جاتا لیکن بہرحال یہ مناسب نہیں تھا۔ البتہ ذہنی طور پر معذور کر کے ہم نے جس طرح اسے چھوڑ دیا اور نظرانداز کر دیا وہ ذرا غلط رہا۔ صوفی خاموشی سے اس کی صورت دیکھتا رہا۔ پھر سہیل عالم نے ساری تفصیل صوفی کو بتائی اور صوفی واقعی سنجیدہ ہو گیا اور جب سہیل عالم اطہر جبار خان کے نام پر پہنچا تو صوفی بے اختیار اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”کک...... کیا نام لیا تم نے۔“

”اطہر جبار خان۔“

”ذرا ایک مرتبہ پھر تفصیل دہراؤ درویشوں کی دعاؤں سے۔“ صوفی نے کہا اور آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ سہیل عالم نے ٹارزن کی سنائی ہوئی پوری تفصیل دوبارہ صوفی کو بتائی لیکن اس دوران صوفی بالکل آنکھیں بند کیے ساکت بیٹھا رہا تھا۔ سہیل خاموش ہوا تو صوفی نے ذرا آنکھیں کھول دیں۔ لیکن اس وقت صوفی کی آنکھیں کسی انسانی آنکھوں کی شکل نہیں لگتی تھیں بلکہ ایک عجیب سی حیوانی کیفیت ان میں پائی جاتی تھی۔ صوفی ان دونوں کو دیکھتا رہا اور ٹارزن اور سہیل عالم خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ اس کے بعد اچانک ہی صوفی کے حلق سے ایک آواز نکلی۔

”حق اللہ“ اور پھر وہ بھاری لہجے میں بولا۔

"میرے خیال میں سہیل عالم تم دونوں نے ایک زبردست کارنامہ سرانجام دیا ہے۔"

"صوفی صاحب آپ یہ بتایئے کیا آپ اطہر جبار خان کو جانتے ہیں۔" صوفی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔" سہیل عجیب سے انداز میں صوفی کو دیکھنے لگا پھر وہ بولا۔

"مجھے نہیں بتائیں گے۔"

"جس افسر اعلیٰ کو شاہ میر صاحب کی جگہ تعینات کیا گیا تھا اور جس نے کرنل رحیم شاہ کو ملک بدر کیا ہے یہ وہی اطہر جبار خان ہے۔" صوفی کے الفاظ بم کے دھماکے سے کم نہ تھے۔ خود سہیل عالم بھی بری طرح چکرا کر رہ گیا تھا۔

♥......♥......♥

یوسف خان پر ان دنوں دیوانگی کے دورے پڑ رہے تھے۔ وہ شدید غصہ ور انسان تھا۔ جب کہ اس کا بڑا بھائی ایک زیرک اور ذہین آدمی تھا لیکن وہ مر چکا تھا۔ البتہ اس کی بیٹی مسلسل چچا کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ یوسف خان کا اپنا ایک مزاج اور اپنا ایک موقف تھا اور اسی موقف کی بنا پر وہ بنیاد پرستوں کی صف میں شامل ہو گیا تھا۔ اپنے بھائی سے بہت مختلف مزاج کا انسان تھا۔ اپنے علاقوں میں کسی بھی طرح کی کوئی گڑبڑ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے حکومت کی بہت سی پالیسیوں سے اختلاف تھا اور اسی اختلاف کی بنا پر وہ ایک باقاعدہ دہشت گرد بن گیا تھا اور پھر اسے ان لوگوں کی مدد بھی حاصل ہو گئی تھی جو جرائم پیشہ ہوتے ہیں اور ان کا کام ہی دنیا بھر میں دہشت گردی پھیلانا ہوتا ہے۔

بہرحال ثوبیہ خان اس کی دست راست تھی اور ان دنوں وہ اسی لیے انگاروں پر لوٹ رہا تھا کہ ثوبیہ خان لاپتا ہو گئی تھی۔ ویسے تو اپنی کارکردگی کے سلسلے میں دونوں چچا بھتیجی الگ الگ ہی مصروف رہا کرتے تھے لیکن پھر بھی ثوبیہ خان کا رابطہ یوسف خان سے ضرور رہتا تھا۔ البتہ کچھ عرصے سے وہ بالکل روپوش ہو گئی تھی اور اس نے یوسف خان کو اپنے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی تھی اور اس کے علاوہ کچھ نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ وہ کسی وجہ سے مشکل میں گرفتار ہو گئی ہے۔ یوسف خان نے اپنے بے شمار افراد اس کی تلاش پر مامور کر رکھے تھے اور یہ بات بھی اس کی دیوانگی میں اضافے کے باعث تھی کہ تمام تر کوششوں کے باوجود اس کے آدمی ابھی تک ثوبیہ خان کا کوئی پتا معلوم نہیں کر سکے تھے اس وقت بھی وہ اپنے ڈیرے کے تہہ خانے میں موجود تھا۔ وہاں اس کی اپنی بستی میں اس نے تہہ خانوں اور سرنگوں کا جال بچھا رکھا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہ سرنگیں اور تہہ خانے غیر ملکی ماہرین سے تیار کروائے گئے تھے اور گنے چنے چند افراد کو ان کے بارے میں معلومات حاصل تھی بلکہ اس کے بڑے بھائی نے ایک غلطی اور بھی کی تھی جس تنظیم میں اس نے شمولیت اختیار کی تھی۔ اس کی زیادہ سے زیادہ وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے اس نے تنظیم کے کچھ افراد کو تہہ خانوں کے کچھ حصے دکھا دیئے تھے۔

جہاں انہوں نے مقامی طور پر بھی کچھ کام کیے تھے لیکن سارے کا سارا سلسلہ انہیں نہیں معلوم تھا۔ اس وقت بھی اس کے سامنے دو آدمی کھڑے ہوئے تھے۔

"سردار آپ یقین کریں اس سلسلے میں جس قدر انسانی کوششیں ہو سکتی ہیں، کر لی گئی ہیں ہم لوگ اتنا ہی پریشان ہیں جتنے آپ...... سردار اور ہم اپنے اوپر کھانا پینا حرام کر چکے ہیں کہ جب تک ثوبیہ خان ہمیں نہ مل جائے ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔"

"اوہ...... مجھے خوف ہے اس بات کا کہ کہیں وہ حکومت کی تحویل میں نہ چلی گئی ہو۔"

"اگر ایسا ہوتا سردار تو کہیں نہ کہیں سے ہمیں اس کی تھوڑی بہت خبر ضرور ملتی لیکن ایسا ممکن نہیں ہے۔"

"ناممکن تو کوئی بھی بات نہیں ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے بہت سے مشکل سوالات ہیں اور تم لوگ اس بات پر یقین کرو کہ اگر ثوبیہ کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو میں اپنے آپ کو بھی معاف نہیں کر سکوں گا۔"

"ہم جانتے ہیں سردار!" بہرحال ہر طرح کی حکمت عملی اختیار کی جا رہی ہے۔ کچھ نہ کچھ پتا چل ہی جائے گا۔"

"میں خوف زدہ ہو گیا ہوں۔ کہیں وہ گمنامی کی حالت میں مر نہ گئی ہو۔"

"نہیں سردار! اس جیسی دلیر لڑکیاں اتنی آسانی سے موت کے چنگل میں نہیں پھنس سکتیں۔ اگر کسی حادثے کا شکار ہوئی بھی وہ تو آپ سنیں گے کہ بے شمار افراد کو اس نے ہلاک کر دیا ہے۔ ہم چلتے ہیں۔ حکمت عملیاں اختیار کی جا رہی ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ ہماری حکمت عملی کے نتیجے میں موثر ذریعہ نکل ہی آئے گا۔"

وہ لوگ یوسف خان سے اجازت لے کر چلے گئے اور یوسف خان بہت دیر تک پریشانی کے عالم میں بیٹھا رہا۔ رات ہو چکی تھی اور نہ جانے کیا وقت ہوا تھا۔ اپنے اہل خاندان سے وہ بری طرح کٹا ہوا تھا اور ان کے پاس جاتا ہی نہیں تھا۔ ان دنوں اس کے ذہن پر ثوبیہ خان کا بھوت سوار تھا۔ اگر اس لڑکی کو کچھ ہو گیا تو وہ جانتا تھا کہ اس کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ ادھر تنظیم اس کے سپرد بے شمار ذمہ داریاں کر چکی تھی۔ ثوبیہ کی غیر موجودگی کی وجہ سے وہ ان ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر پا رہا تھا۔ پھر وہ تھکے تھکے انداز میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے بیڈروم کی جانب چل پڑا۔

بستر پر لیٹ کر وہ غور کرتا رہا ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دروازے پر دستک سنائی دی اور اس کی غراہٹ ابھری۔

"کون ہے، آ جاؤ۔" اس وقت وہ ہر وقت چوکنا رہا کرتا تھا اور اس نے ان تمام لوگوں کو اپنے پاس آنے کی اجازت دے دی تھی جو ثوبیہ کی تلاش پر مامور تھے۔ وہ یہ سمجھا کہ شاید انہی میں سے کوئی آیا ہے۔ ہر طرف سے خبریں آ رہی تھیں۔ آنے والا ایک ملازم تھا۔ ملازموں کے مخصوص لباس میں تھا۔ اندر آ کر اس نے گردن خم کی تو یوسف خان اس کی صورت دیکھنے لگا۔

"تو...... میں تجھے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔"

"آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے یوسف خان۔ میں پہلی بار ہی آپ کی اس رہائش گاہ میں آیا ہوں۔" آنے والے نے غیر ملکی زبان میں کہا اور یوسف خان چونک پڑا۔

"کون ہو تم اور کہاں سے آئے ہو؟" لیکن عقب میں چار پانچ افراد اور اندر داخل ہوئے تھے اور یہ سب کے سب مسلح تھے۔ ان کے ہاتھوں میں دبے ہوئے ریوالوروں میں سائلینسر لگے ہوئے تھے۔ یوسف

خان کو ایک دم کسی سنگین واقعہ کا احساس ہوا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر چاروں طرف دیکھا۔ پھر بولا۔ ''کیا بدتمیزی ہے یہ؟ تم لوگ مجھے اپنے بارے میں نہیں بتاؤ گے۔''

''ہمارا تعلق تنظیم سے ہے یوسف خان۔''

''کوڈ.....کوڈ بتاؤ۔''

''سفید.....دل.....تمہارے لیے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے۔''

''لیکن تمہارے آنے کا انداز بہت عجیب ہے۔''

''تنظیم اپنے ارادے تبدیل کرتی رہتی ہے۔ تمہارے بارے میں بھی تنظیم نے اپنا موقف تبدیل کر دیا ہے۔'' یوسف خان ٹیڑھی نگاہوں سے انہیں دیکھتا رہا۔ تب ایک اور شخص اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ کالے رنگ کی نقاب میں ڈھکا ہوا تھا۔ وہ ایک طرف آ کر کھڑا ہو گیا تو انہی میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔

''باہر سب ٹھیک ہے ناں۔''

''ہاں.....نئے آنے والے نے جواب دیا۔

''ہاں تو مسٹر یوسف خان جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے تمہارے کمرے کے اس عقبی حصے میں وہ جو الماری لگی ہوئی ہے وہ گھوم جاتی ہے اور اس کے پیچھے تہہ خانے کا دروازہ موجود ہے۔ کیا تم ہمیں اس تہہ خانے میں لے چلو گے۔''

''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم تنظیم ہی کے لوگ ہو۔'' یوسف خان نے کہا۔

''اول تو ہم نے کوڈ دہرایا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر ہم تنظیم کے افراد نہیں بھی ہیں تو اس وقت تو تم ہمارے قبضے میں۔ ہم جو کرنا چاہتے ہیں وہ آسانی سے کر سکتے ہیں اور تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔''

''لیکن تم کرنا کیا چاہتے ہو۔ اس طرح یہاں آمد کا مقصد کیا ہے؟''

''مسٹر یوسف خان کیا یہ جگہ ایسی ہے کہ یہاں تک کوئی آسانی سے پہنچ سکتا ہے۔''

''ہرگز نہیں۔ میں اس بات پر حیران ہوں۔''

''حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تنظیم کے سربراہان جن لوگوں کو جس کام پر مامور کرتے ہیں انہیں بھرپور طریقے سے ہر طرح کی تربیت دی جاتی ہے۔ ان کی زندگی کی ضمانت بھی لی جاتی ہے۔ یہ تنظیم کے اصولوں میں سے ایک ہے۔''

''میں جانتا ہوں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تمہیں یہاں تک بھیجا کس لیے ہے اور وہ بھی اس انداز میں اگر مجھ سے کوئی کام تھا تو مجھے بتایا ہوتا۔''

''یہ ہی تو شکایت ہے تنظیم کو تم سے مسٹر یوسف خان کہ تمہیں جو کام دیا گیا تم اسے سرانجام دینے میں مستقل طور پر ناکام رہے ہو۔''

''تو پھر؟''

''پھر یہ کہ تمہیں تھوڑی سی تربیت دینی ہے جو تمہارے لیے ضروری ہے۔''

''کس طرح کی تربیت؟''

''آؤ ذرا تفصیل سے بات چیت کریں گے۔ کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا بے شک یہ تمہاری حویلی ہے۔ ایک محفوظ جگہ لیکن صرف تمہارے خیال میں۔ ہم تمہیں بتا چکے ہیں کہ تنظیم تمہاری کارکردگی سے غیر مطمئن ہے اور تمہارے لیے ایک تربیتی کورس لازمی قرار دے دیا گیا ہے اور یہ بات بھی تم اچھی طرح جانتے ہو بلکہ تمہیں بتا دی گئی ہے کہ تنظیم کے جو اغراض و مقاصد ہوتے ہیں اگر ان میں دخل اندازی کی جاتی ہے تو تنظیم دخل اندازی کرنے والے کی زندگی کو پسند نہیں کرتے۔ چناں چہ تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے نہ کسی کو بلاؤ گے نہ کسی کو ان حالات کی اطلاع دو گے۔''

''میں چوہا نہیں ہوں۔ یوسف خان ہے میرا نام، سردار ہوں اس علاقے کا۔ تم.....چلو ٹھیک ہے آؤ۔'' یوسف خان نے کہا اور دو آدمی تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ باقی یوسف خان کے پیچھے تھے۔

''کیا مطلب؟'' یوسف خان رک کر غرایا۔

''چلتے رہو یوسف خان چلتے رہو۔ جو کام تمہیں کرنا ہے تہہ خانے میں داخل ہونے کے لیے۔ وہ ان لوگوں کو بتاتے رہو۔ وہ یہ کریں گے۔ تمہیں اس طرح کا کوئی کام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''یہ تو ایک ایسا انداز ہو گیا جیسے تنظیم میری خدمات کا سلسلہ منقطع کر چکی ہے جبکہ تم لوگ کہہ رہے ہو کہ مجھے تربیت دینی ہے۔''

''تم سے جو کچھ کہا جا رہا ہے صرف وہی کرو۔ دیکھو میں اس تنظیم میں براؤن گولڈ ہوں براؤن گولڈ سمجھتے ہو۔ ایک اعلیٰ عہدیدار اور تم صرف بلیک گولڈ ہو۔ سمجھ رہے ہو۔ بلیک گولڈ کو براؤن گولڈ کی بات ماننا ہوتی ہے۔'' یوسف خان گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے ان لوگوں کو تہہ خانہ کا دروازہ کھولنے کے سوئچ کے بارے میں بتایا اور انہوں نے کتابوں کی الماری میں ہاتھ ڈال کر کوئی سوئچ آن کر دیا۔ براؤن گولڈ ہنس کر بولا۔

''یہ صرف ایک تجرباتی عمل تھا۔ ورنہ ہمیں یہاں بھیجتے ہوئے تمہاری اس پوری حویلی کا نقشہ ہمیں دکھایا گیا تھا۔ ہم اس کے ایک ایک چپے کے بارے میں ساری تفصیل جانتے ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ کون سا کام کس طرح سے ہو گا۔ چلو اندر چلو۔ دیکھو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس تہہ خانے کا دروازہ کس طرح بند ہوتا ہے۔'' براؤن گولڈ اندر داخل ہوا اس نے چھت میں کوئی چیز تلاش کی اور پھر دروازہ نہ صرف بند ہوا بلکہ اندر روشنی بھی پھیل گئی۔ ایک چھوٹا سا پلیٹ فارم نظر آ رہا تھا۔ چوں کہ یہ حویلی پہاڑی علاقے میں واقع تھی اس لیے یہاں جتنی تعمیرات تھیں، پہاڑی پتھروں کو تراش کر کی گئی تھیں۔ وہ چوڑا سا پلیٹ فارم بھی غالباً کوئی چوڑی پہاڑی چٹان تھی۔ جسے اس طرح تراشا گیا تھا۔ کوئی پچیس گز کی لمبائی چوڑا میں تھا اور اس کے اختتام پر نیچے سیڑھیاں تراشی ہوئی تھیں۔ ایک انتہائی عظیم الشان تہہ خانہ تھا۔ یہ روشنی پھیل جانے کی وجہ سے ہر چیز صاف شفاف نظر آ رہی تھی۔

وہ لوگ یوسف خان کو لیے ہوئے تہہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگے اور پھر کوئی بیس سیڑھیار اترنے کے بعد وہ ایک چوڑے اور وسیع ہال میں داخل ہو گئے جو پتھروں ہی میں تراشا گیا تھا اور یہاں ہ طرح کا فرنیچر اور دوسرا ساز و سامان موجود تھا۔ ایک طرف ٹائلٹ بنا ہوا تھا تو دوسری طرف کچن بھی تھا۔ گو

یہاں رہائش کے مکمل انتظامات تھے۔ یہاں پہنچنے کے بعد ان لوگوں نے چاروں طرف دلچسپی کی نگاہوں سے دیکھا اور بولے۔

''اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ دنیا کی بہترین تراش ہے۔ ان چٹانی پتھروں پر بمباری بھی اثر انداز نہیں ہوسکتی۔ تم لوگ کمال کے لوگ ہوتے ہو۔ پہاڑی علاقوں میں تم نے اپنی محنت اور مشقت سے جو کچھ بنایا ہے وہ ناقابل تسخیر ہے۔ ہمیں تو اس جگہ کے بارے میں صرف فلمیں دکھائی گئی تھیں لیکن اب ان تمام چیزوں کو دیکھ کر بڑا عجیب سا احساس ہو رہا ہے۔ بیٹھو...... مائی ڈیئر یوسف خان بیٹھو۔'' یوسف خان شاید خود بھی نڈھال ہوگیا تھا۔ وہ ایک قیمتی صوفے پر بیٹھ گیا تو براؤن گولڈ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''بہت خوب صورت جگہ ہے۔ بہت ہی خوب صورت۔ اچھا یہ بتاؤ یہاں سے باہر رابطے کا کیا ذریعہ ہے۔''

''اگر ہے بھی تو میں تمہیں بتانا پسند نہیں کروں گا۔''

''بات تمہاری بھی ٹھیک ہے لیکن میں تمہیں بتاؤں اگر تم باہر سے کوئی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرو گے تو ہمارے پاس اس کے لیے پہلے سے بندوبست ہے۔ تم انہیں اپنا چہرہ دکھاؤ۔' اس بار براؤن گولڈ نے اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جس نے ابھی تک اپنا چہرہ نقاب میں چھپایا ہوا تھا۔ پھر جب اس نے اپنا نقاب اٹھایا تو یوسف خان کو چکر آ گیا۔ یہ سو فیصدی اس کا ہم شکل آدمی تھا۔ بالکل اس کا ہم شکل۔ ذرا بھی فرق معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہی جسم وہی قد و قامت، اور پھر یوسف خان ایک دم سنبھل گیا اس نے کہا۔

''خوب اس کا مقصد کیا ہے؟''

''ہم تمہیں یہی بتا رہے تھے کہ اگر تم نے باہر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی بھی تو تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا اب تمہاری جگہ یہ سنبھالے گا۔ اس کا اصل نام ہنٹر ہے لیکن اب یہ یوسف خان ہے۔'' یوسف خان ایک لمحے تک اسے گھورتا رہا پھر ہنس پڑا۔ پھر بولا۔

''یہ پہاڑی زبان بول سکتا ہے؟'' جواب میں اس شخص نے جس لہجے اور جس آواز میں یوسف خان کو مخاطب کیا۔ اس نے یوسف خان کے ہوش و حواس درست کر دیئے تھے۔ آواز تک کی اتنی کامیاب کاپی کی گئی تھی کہ ناقابل یقین ہو۔ براؤن گولڈ نے ہنس کر کہا۔

''تنظیم اس قدر سائنسی بنیادوں پر کام کرتی ہے کہ شاید ابھی تک بڑے بڑے سائنس دان بھی ایسا کچھ نہیں کر سکے۔ جب اس شخص کو تمہاری شکل دی گئی تو مشینی طریقے سے اس کی آواز میں بھی وہی تبدیلیاں کی گئیں اور اس کے ساؤنڈ بکس میں تمہاری آواز ریکارڈ کی گئی۔ یہ ایک جدید ترین طریقہ ہے اور اسی طرح تمہارا لہجہ اور تمہاری زبان اسے سکھائی گئی۔ اب یہ بات مشکل نہیں رہی کہ تم ساری دنیا میں رہنے والوں کی زبان نہ بول سکو۔ سیکھنا تو ایک مشکل عمل تھا۔ ہم نے اس کے لیے ایک بالکل ہی نیا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ اب ہر زبان ہر شخص کو سکھائی جاسکتی ہے مشینی ذرائع سے۔ صرف اس کے دماغ کے خلیے میں وہ یادداشت ڈالنی ہو گی جو اس زبان سے متعلق ہے اور اس کے ساؤنڈ بکس میں تھوڑی سی تبدیلی کرنا ہوگی۔'' یوسف خان نے آنکھیں بند کر لی تھیں پھر اس نے کہا۔

''مگر...... مجھے یہ نہیں بتایا گیا کہ آپ لوگ چاہتے کیا ہیں؟''

''تمہیں اس کارکردگی کے لیے نااہل قرار دیا گیا ہے۔ یوسف خان جو تم کرتے رہے ہو لیکن اس کے باوجود تمہیں زندہ رکھیں گے۔ تنظیم کا یہ ہی ارادہ ہے۔ تم یہاں اس قید خانے میں قید رہو گے تاکہ کبھی ہمارے اس آدمی کو کسی اہم مسئلے میں تمہاری ضرورت پیش آئے تو تم اس کی مدد کر سکو۔ اسے یہ بتا سکو کہ کون سا مسئلہ کیا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا تم۔''

''اور پھر اس کے بعد؟''

''اس کے بعد تو تنظیم ہی فیصلہ کر سکے گی۔ ہم اس بارے میں کیا بتا سکتے ہیں۔ تمہارے لیے تمام انتظامات ہو جائیں گے۔ کھانے پینے کی تمام چیزیں اور وقت گزارنے کا ذریعہ، کیا سمجھے اب ہمیں ایک بات اور بتاؤ۔''

''کیا؟''

''ثوبیہ خان یہاں نہیں ملی۔ وہ کہاں ہے؟''

''اس کے لیے تو میں پریشان تھا۔ وہ کافی دن سے غائب ہے۔''

''کہاں چلی گئی؟''

''یقین کرو۔ ہمیں کچھ نہیں معلوم۔''

''خیر ہمارے لیے یہ سب اتنا اہم مسئلہ نہیں ہے۔ اچھا تو پھر اب ہم چلیں؟''

''میں تنظیم کے اعلیٰ ارکان سے رجوع کرنا چاہتا ہوں۔''

''کم از کم ایک مہینے کے بعد تمہیں اس کا موقع دیا جائے گا۔ فی الحال اس کی گنجائش نہیں ہے۔ آؤ......'' براؤن گولڈ نے دوسرے لوگوں سے کہا اور وہ آہستہ آہستہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ یوسف انہیں سنجیدہ نگاہوں سے دیکھتا رہا تھا۔

تہ خانے کا دروازہ بند ہوگیا۔ یوسف خان یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ تہ خانے کا دروازہ باہر ہی سے بند کیا اور کھولا جا سکتا ہے۔ یہ خاص تکنیک رکھی گئی تھی لیکن اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا اور یوسف خان اس قدر غیر مطمئن نہیں تھا۔ ہاں اسے صرف اس بات کا خیال تھا کہ جو کچھ ہوا ہے۔ غلط ہوا ہے۔ وہ تنظیم کا غلام نہیں تھا بلکہ تنظیم میں شمولیت اس کے بڑے بھائی ہی نے کرائی تھی اور وہی اس تمام معاملات کا کرتا دھرتا تھا۔

بعد میں یوسف خان اقتدار کے حصول کے لیے اپنے بھائی کے ساتھ شامل ہوگیا تھا ورنہ وہ ایک آزاد فطرت آدمی تھا اور اس نے پہلے کبھی اس طرح کچھ کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا لیکن بعد میں جب ان لوگوں کو سبز باغ دکھائے گئے اور یوسف خان کو بتایا گیا کہ بہت کم وقت ایسا ہے جب اسے اس پہاڑی علاقے میں بھرپور اقتدار حاصل ہوگا اور وہ یہاں کے سیاہ و سفید کا مالک ہوگا تو وہ بھی بہک گیا تھا۔ اقتدار کا نشہ ایسی ہی چیز ہوتی ہے لیکن بہرحال ان لوگوں نے ایک احمقانہ عمل کیا تھا اور یہ بھی ایک اچھی بات تھی کہ انہیں وہ بھرپور معلومات حاصل نہیں تھیں جو ان لوگوں کے علم میں تھیں۔ یوسف خان کو بتایا گیا تھا

کہ تنظیم کے اعلیٰ ارکان نے یہ تمام معلومات انہیں ایک دستاویزی فلم کے ذریعے بتائی تھیں۔

تہہ خانہ اسے کھولنے کا طریقہ یہاں حویلی میں داخل ہونے کے راستے جو بے شک انتہائی دشوار گزار اور مشکل تھے اور یہاں یوسف خان کی اجازت کے بغیر کوئی نہیں آ سکتا تھا۔ لیکن وہ لوگ آسانی سے اچھی خاصی تعداد میں یہاں پہنچ گئے تھے اور انہوں نے لازمی بات ہے۔ کوئی ایسا ہی طریقہ کار اختیار کیا ہوگا کہ وہ آسانی سے یہاں تک آ گئے تھے۔

لیکن یوسف خان کے بڑے بھائی نے یہ معلومات انہیں دیتے ہوئے بے شمار چیزیں اپنے تک محدود رکھی تھیں۔ کیوں کہ وہ بے وقوف آدمی نہیں تھا۔ یہ بات یوسف خان بھی جانتا تھا کہ اس تہہ خانے کو جو بہ ظاہر اس بڑے ہال تک محدود معلوم ہوتا تھا۔ ایک سرنگ کے ذریعے باہر کی دنیا سے بھی ملایا گیا ہے اور وہ سرنگ کھولنے کا طریقہ بھی عام طریقہ نہیں تھا۔ اس کے لیے کافی شان دار کام کیے گئے تھے۔

بہرحال یوسف خان جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ لوگ لازمی بات ہے کہ اسے چیک کریں گے۔ وہ فوری طور پر کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتا تھا جو اس کے لیے خطرے کا باعث بن جائے البتہ وہ ثوبیہ خان کے لیے پریشان تھا ثوبیہ اس کی دست راست ہی نہیں تھی بلکہ ایک چچا کی حیثیت سے وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا اور آنے والے وقت میں اس نے ثوبیہ ہی کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔

بہرحال اس نے وقت گزارنا شروع کر دیا۔ ایک رات گزر گئی دوسرا دن بھی گزر گیا۔ تیسری رات کارکردگی کی رات تھی۔ اس دوران اس کے لیے کھانا وغیرہ لایا جاتا رہا تھا اور اس کا بھرپور جائزہ بھی لیا جاتا رہا تھا۔ حویلی میں کیا ہو رہا ہے؟ کس طرح ان لوگوں نے یہاں اپنا اقتدار قائم کیا۔ یوسف خان کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا لیکن وہ معلوم کرنے کی جلد بازی کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے فوری طور پر کیا کرنا ہے۔

کوئی ایک خفیہ ٹھکانہ نہیں تھا بلکہ بہت کچھ تھا اس کے پاس۔ چناں چہ تیسری رات اس نے تمام انتظامات کر لیے تہہ خانے کے دروازے پر انتظامات کیے گئے تاکہ کوئی فوری طور پر تہہ خانے میں داخل نہ ہو سکے۔ اس نے واش روم میں جا کر چھت میں لگے ہوئے ایک مخصوص لیور کو گھمانا شروع کر دیا تھا جو بہ ظاہر باتھ روم کی فٹنگ کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اصل میں وہ سرنگ کے ایک راستے کو کھولنے کا ذریعہ تھا۔ گول ٹکڑا اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ یہ سرنگ میں داخل ہونے کا راستہ تھا اور اس کے بعد ایک کشادہ سرنگ میں روشنی کی جا سکتی تھی۔

سرنگ کی لمبائی کافی تھی۔ حویلی کے نیچے ہوتی ہوئی وہ ایک ویران سے علاقے سے نکل جاتی تھی یہاں سات جگہ الیکٹرک سوئچ لگائے گئے تھے جو یو۔ پی۔ ایس کا کام کرتے تھے۔ چناں چہ سرنگ کا دروازہ واپس بند کرنے کے بعد یوسف خان وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ سرنگ کے آخری حصے میں اسلحہ خانہ بھی تھا جہاں سے اسلحہ لیا جا سکتا تھا۔ یہ ایسی ہی ایمرجنسی کے لیے بتایا گیا تھا جب کہ کوئی بڑی مشکل پیش آ جائے اور سرنگ کے ذریعے باہر بھاگنا پڑے۔ یوسف خان سوئچ آن کرتا رہا۔ ڈبل سوئچ لگے ہوئے تھے۔ جب پچھلا راستہ طے ہو جاتا تو یہیں سے پچھلے راستے کی روشنی بند کر دی جاتی اور آگے کا راستہ روشن کر لیا جاتا۔

آخری حصے میں پہنچنے کے بعد اس نے سوئچ آن رکھا اور پھر بڑی مہارت سے اس نے دو بہترین پستول اپنے ساتھ محفوظ کیے اور ان کا امیگریشن لے کر سرنگ کے آخری حصے میں پہنچ گیا۔ پھر یہاں سے باہر نکلنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ سرنگ میں بے شک گھٹن تھی اور باہر نکل کر تازہ ہوا نے اس کا استقبال کیا تھا۔ ہوا کے سرد جھونکوں کو وہ اپنے پھیپھڑوں میں بھرتا رہا اور جب مکمل طور پر سانس بحال ہو گئی تو اس نے حویلی پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈالی اور اس کے بعد اس کے ہونٹوں سے بڑبڑاہٹ نکلی۔

"تم لوگ نہیں جانتے کہ ہم لوگ کون ہیں؟ میں اس حویلی ہی میں تمہاری قبریں بناؤں گا تاکہ مجھے یاد رہے کہ میرے دشمنوں نے مجھے کن حالات سے دوچار کیا تھا۔" یہ الفاظ ادا کرنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ وہاں سے چلا اور پھر رات کی تاریکی میں گم ہو گیا۔

♥......♥......♥

صوفی کے کام معمولی نہیں ہوا کرتے تھے۔ ثوبیہ کو فلیٹ سے نکال کر گرین ہاؤس کے مضبوط تہہ خانے میں پہنچا دیا گیا تھا اور شازیہ کو اس کی جگہ دے دی گئی تھی لیکن شازیہ کو جو تربیت دی گئی تھی وہ انتہائی غیر معمولی تھی۔ شازیہ اپنی معلومات پر خود ہنستی تھی۔ وہ علاقہ اس نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ جس کے بارے میں اسے تفصیلات بتائی گئی تھیں اور جو پہاڑی علاقہ تھا اور جہاں یوسف خان کی حکومت تھی اور ثوبیہ اس علاقے سے آئی تھی۔

لیکن صوفی نے اس طرح وہ علاقہ اس کے ذہن میں بٹھا دیا تھا کہ اب اگر شازیہ کو وہاں بھیجا جاتا تو وہ ایک ایک گلی سے گزرتی ہوئی مطلوبہ جگہ پہنچ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے ثوبیہ کے باپ چچا اور حویلی میں رہنے والے دیگر افراد کے علاوہ باقی لوگوں کے بارے میں بھی سب کو بتا دیا گیا تھا۔

"مجھے تو حیرت ہے چھوٹے بابا کہ آپ کو یہ معلومات کہاں سے حاصل ہوئی۔"

"بس درویشوں کا کرم ہے۔ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لیا۔ حق اللہ...... حق اللہ......"

"واقعی اگر ایسی بات ہے تو آپ مجھے اپنا مرید بنا لیجیے چھوٹے بابا۔ ویسے تو میں آپ کی مرید ہوں لیکن میں روحانی استاد کے طور پر آپ سے کہہ رہی ہوں۔"

"اگر کبھی اس قابل ہو گئے تو سب سے پہلے تمہیں ہی اپنا مرید بنائیں گے شازیہ یہ ہمارا وعدہ ہے۔ مگر ہم یہ جانتے ہیں کہ ہم جیسا ناچیز درویشوں کا عقیدت مند تو ہو سکتا ہے ان کا ہم اثر نہیں۔ بہرحال شازیہ پورے اعتماد سے اس فلیٹ میں تھی اور صوفی نے اس سے کہہ دیا تھا کہ ہر غیر معمولی بات کا مکمل طور پر خیال رکھا جائے گا اور بالکل بے فکر رہے اور شازیہ جانتی تھی کہ ہزار آنکھوں سے اس کی نگرانی کی جا رہی ہو گی۔ بذات خود بھی وہ ایک بہادر لڑکی تھی اور اپنے آپ کو ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کے لیے تیار رکھنا جانتی تھی۔ فلیٹ میں ماحول بھی بڑا تبدیل ہوا تھا۔ ویسے یہ رہائشی عمارت تھی لیکن فلیٹ بہت ہی قیمتی اور بڑی اچھی اہمیت کے حامل تھے۔ اس دور میں اچھائی یہ ہی سمجھی جاتی ہے کہ کوئی کسی سے متعارف نہ ہو۔

♥......♥......♥

شازیہ کو ایک بھی ایسا شخص نہیں ملا تھا جس نے اس سے ہیلو ہائے کی ہو۔ بہرحال جیسا دیس ویسا

بھیس والا معاملہ تھا۔ شازیہ بھی اپنے طور پر خاموشی سے وقت گزار رہی تھی۔ اسے یہاں آئے غالباً چوتھا دن تھا۔ اس دوران ابھی تک کسی نے اس سے کوئی رابطہ نہیں قائم کیا تھا لیکن چوتھے دن یہ روایت ختم ہوگئی۔ پہلی بار اس کے فلیٹ کے دروازے کی بیل بجی تھی۔ ایک لمحے تک تو شازیہ خاموش رہی اس نے انتظار کیا بیل دوبارہ بجی اور وہ دروازے پر پہنچ گئی اور پھر اس نے کی ہول سے باہر جھانکا۔

تصور میں یہ بھی تھا کہ ممکن ہے کہ گرین فورس کا کوئی ممبر ہو، لیکن وہ چہرہ اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ ایک لمحے تک وہ غور کرتی رہی اور پھر اس نے اپنے دماغ میں ایک عجیب سی کھلبلی محسوس کی یہ چہرہ اجنبی بے شک تھا لیکن اجنبی نہیں تھا یہ تصویرا سے دکھائی گئی تھی۔ دروازے پر موجود شخص یوسف خان تھا۔ ایک لمحے تک تو شازیہ سکتے کے عالم میں رہی۔ بیل تیسری بار بجی تو اس نے دروازہ کھول دیا۔

یوسف خان کے ہاتھ میں ریوالور دبا ہوا تھا جو کی ہول سے شازیہ کو نظر نہیں آیا تھا اس نے کڑی نگاہوں سے شازیہ کو دیکھا اور پھر اس کے منہ سے حیران کن آواز نکلی۔

"پناہ بخدایا...... تو یہاں ہے؟" شازیہ نے فوراً خود کو سنبھال لیا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی پیچھے ہٹی اور اس نے کہا۔ "آیئے خان چاچا"

"یہ خانا سے خان چاچا ہو گیا میں...... میں تو حیران تھا کہ میرے پیچھے فلیٹ میں کون ہے؟ تجھے شرم نہیں آئی تو یہاں موجود ہے اور تو نے مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ تجھے معلوم ہے کہ میں تمہارے لیے کتنا پریشان تھا۔"

"آپ اندر تو آؤ خان چاچا۔"

"کیا خان چاچا...... خان چاچا لگا رکھی ہے۔"

"بس دل چاہتا ہے تمہیں خان چاچا کہنے کو میں تھوڑی سی پاگل ہو چکی ہوں۔" شازیہ نے کہا اور یوسف خان اندر گھس آیا۔ شازیہ نے پلٹ کر دروازہ بند کیا اور ہول کی ٹرپ لاک کر دی۔ پھر وہ واپسی کے لیے مڑی تو یوسف خان نے کہا۔

"بے وقوف لڑکی اگر کسی مجبوری کے تحت بھی یہاں آ گئی تو کیا تجھے مجھے اپنی خبر نہیں دینی چاہیے تھی۔"

"آپ کو پتا نہیں خانا میں کن حالات سے گزری ہوں۔" شازیہ نے دل ہی دل میں یہ بات محسوس کی کہ صوفی نے ساری باتیں بتائی تھیں لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ ثوبیہ خان یوسف خان کو کیا کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ بے شمار باتیں ایسی ہوتی ہیں جو بظاہر کوئی حیثیت تو نہیں رکھتی لیکن انہیں نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

"بہر حال یہ ایک دلچسپ بات تھی۔ یوسف خان اس طرح اچانک آ جائے گا یہ بات اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچی تھی وہ اسے لیے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوگئی۔

"او...... بے وقوف لڑکی تجھے کیا ہو گیا ہے۔ تو مجھے یہاں دیکھ کر حیران بھی نہیں ہوئی۔"

"خانا اگر تم میری داستان سنو گے تو مجھ سے زیادہ سنک جاؤ گے۔"

"لگتا تو یہ ہے کہ تو سنک گئی ہے۔ کیا داستان ہے تیری مجھے بتا۔"

"دشمنوں میں گھری ہوئی ہوں۔ ایک طرف ایک گروپ میرا پیچھا کر رہا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ

وہ کون ہے۔ پانچ چھ بار اس سے زبردست مقابلہ ہو چکا ہے۔ مرتے مرتے بچی ہوں اگر تمہاری تربیت نہ ہوتی تو میں کبھی کا شکار ہو جاتی اور دوسری طرف گورنمنٹ کے لوگ ثوبیہ خان کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ بڑی ہی مشکل سے یہاں پہنچی ہوں کہ تمہیں بتا نہیں سکتی۔ سانس بھی اتنی آہستگی سے لیتی ہوں کہ کہیں کوئی میری جانوں کی آواز کو نہ پہچان لے۔

"اوہ...... ہمارا ستارہ ہی گردش میں آ گیا ہے۔ ان دنوں ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں ہم نے کبھی زندگی میں ان حالات کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

"یہ ہی تو میں جاننا چاہتی ہوں خانا کہ آخر وہ حالات کیا ہیں اور ہم لوگ کن چکروں میں پھنس گئے ہیں۔

"یہ بات تو تجھے معلوم ہے ثوبیہ کہ بھائی کی موت کے بعد گورنمنٹ ہمارے پیچھے لگ گئی ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا ہے اور کبھی اس طرح کے حالات نہیں پیدا ہونے دیئے کہ حکومت براہ راست مجھ پر ہاتھ ڈال سکتی۔ حکومت سے تو میں محفوظ رہا ہوں۔ لیکن...... لیکن......" یوسف خان رکا اور پھر جلدی سے بولا۔ "مگر تو کیا کہہ رہی ہے حکومت کے آدمی بھی تیرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔"

"ہاں خانا وہ بھی میرے پیچھے ہی لگے ہوئے ہیں۔ انہی سے بچنے کے لیے میں صحیح معنوں میں ادھر ادھر چھپتی پھر رہی ہوں۔ دوسری پارٹی کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتی لیکن وہ غیر ملکی لوگ ہیں۔"

"سمجھ گیا وہ ہی کتے ہوں گے...... وہی کتے ہوں گے۔ پتا نہیں کم بختوں کو کیا مصیبت پڑ گئی ہے۔ ہم نے تو تنظیم کے ساتھ ہمیشہ ہی وفاداری کا ثبوت دیا ہے لیکن وہ لوگ وہ لوگ ...... وہ لوگ......"

یوسف خان خوں خوار انداز میں بولتا ہوا خاموش ہو گیا۔ پھر چونک کر بولا۔

"اور گورنمنٹ کے آدمی تیرے پیچھے اس لیے پڑے ہوں گے کہ اب وہ مجھ سے تو مایوس ہو گئے ہیں مگر وہ جانتے ہیں کہ تو کس کی بیٹی ہے۔ وہ تجھے اپنے قبضے میں لا کر تیری زبان سے اگلوانا چاہتے ہیں۔ سمجھ گیا میں اچھی طرح سمجھ گیا۔ ثوبیہ! کوئی کچھ بھی کر رہا ہے مگر میں صرف ایک بات کہتا ہوں۔ ستاروں پر مجھے بڑا بھروسہ ہے اور اس وقت ہمارے ستارے گردش میں ہیں۔ ہمیں خاموشی اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ تمام سرگرمیاں ترک کرنی ہوں گی یہ تو شکر ہے کہ اس فلیٹ کے بارے میں کسی کو نہیں معلوم وہ لوگ یہاں کا پتہ کبھی نہیں پا سکتے میں سمجھتا ہوں ہمیں کافی عرصے تک یہاں قیام کرنا پڑے گا۔ تو نے بہت اچھا کیا کہ یہاں آ گئی۔ کتنے دن ہوئے تجھے یہاں آئے ہوئے۔

"تین چار دن خانا...... تین چار دن۔"

"ہوں تجھے معلوم ہے میرے ساتھ کیا ہوا۔"

"لو...... مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ اچھا اب یہ بتاؤ کیا بنا کر لاؤں تمہارا تو حلیہ بہت خراب ہو رہا ہے؟"

"بیس کلومیٹر کا فاصلہ میں نے پیدل طے کیا ہے اور اس کے بعد جنگل میں چھپا رہا ہوں۔ پھر ایک کار والے کو ختم کر کے اس کی کار لے کر بھاگا ہوں اس کی لاش وہیں جنگل میں پڑی ہوئی ہے۔ پتہ نہیں کون بے چارہ تھا گاڑی میں نے سٹیشن پر کھڑی کر دی اور پھر وہاں سے ٹیکسی کر کے یہاں تک پہنچا ہوں۔

حلیہ خراب نہیں ہوگا تو کیا ہوگا۔ ڈھنگ سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ بہت بھوک لگی ہے جا میرے لیے کھانے پینے کا بندوبست کر۔ میں غسل کرلوں۔''

''تمہارے کپڑے یہاں موجود ہیں خانا...... میں نکال دوں۔''

''ہاں۔'' شازیہ نے تکا ہی مارا تھا۔ یہاں ایک الماری میں اس نے لباس دیکھے تھے جو کسی قوی ہیکل آدمی کے لباس تھے اور مردانہ تھے۔ اب جب اس فلیٹ کے بارے میں اس طرح کا تذکرہ یوسف خان نے کیا تو شازیہ سمجھ گئی کہ یہ لباس اس کے ہوسکتے ہیں۔

بہرحال اس نے لباس نکال کر غسل خانے میں ٹانگا۔ یوسف خان کو اطلاع دی اور خود کچن کی جانب چل پڑی۔

کچن بھرا ہوا تھا خشک ترکاریاں، ہرطرح کے ٹن پیک کھانے وہاں موجود تھے چوں کہ یوسف خان بتا چکا تھا کہ وہ شدید مشقت کرکے یہاں تک پہنچا ہے چنانچہ اسے شدید بھوک بھی لگ رہی ہوگی۔ اس وقت اسے قابو میں کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اس کا پیٹ اچھی طرح بھر دیا جائے تاکہ وہ شازیہ پر خاص طور سے غور نہ کرسکے۔ اس نے بہترین کھانا تیار کیا اور انتظار کرنے لگی اور پھر جب یوسف خان کی آواز اسے سنائی دی تو وہ کھانے کی ٹرے سجائے ہوئے اندر داخل ہوگئی۔ کھانا دیکھ کر یوسف خان کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔

''شابخدایا...... جی خوش کردیا تو نے مجھے معاف کرنا جب میرے سامنے کھانا آجاتا ہے تو میں ساری دنیا کو بھول جاتا ہوں۔''

''آپ آرام سے کھانا کھاؤ خانا میں آپ کے لیے کافی بنا کرلاتی ہوں۔''

''خدا تجھے خوش رکھے۔'' یوسف خان نے کہا اور شازیہ پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ یوسف خان کو کسی شبہے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی اب اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ فوری طور پر صوفی کو یوسف خان کی آمد کے بارے، میں اطلاع دے لیکن خطرہ تھا۔ اگر یوسف خان کو کسی طرح پتہ چل گیا تو پھر سارا کھیل چوپٹ ہوجائے گا حالاں کہ شازیہ اس سے خوف زدہ نہیں تھی۔ اسے ہرطرح کے حالات سے نمٹنا آتا ہے۔ یوسف خان بے شک ایک قوی ہیکل پہاڑ تھا لیکن شازیہ صوفی کی تربیت یافتہ تھی اور وہ جانتی تھی کہ اگر حالات سنگین نوعیت اختیار کرجائیں تو پھر کس طرح اپنا بچاؤ کیا جاسکتا ہے لیکن پھر بھی اس نے فوری طور پر کوئی کارروائی نہیں کی۔

یوسف خان کن حالات میں یہاں تک پہنچا ہے۔ اس کے بارے میں معلومات حاصل ہوجائے تو اچھا ہے۔ پھر صوفی کو تفصیل سے سب کچھ بتادے گی یا اگر صوفی نے رابطہ قائم کیا تو بھی اسے حالات سے آگاہ کردے گی۔ حالاں کہ وہ جانتی تھی کہ گرین فورس کے افراد اس کے آس پاس ہی کہیں موجود ہوں گے۔ ہوسکتا ہے انہیں یوسف خان کے آنے کے بارے میں بھی اطلاع مل گئی ہو اور اب تک صوفی تک یہ خبر پہنچ گئی ہو کہ شازیہ کے فلیٹ میں یوسف خان داخل ہوا ہے۔ بس اس نے کافی بنائی اور پھر یوسف خان کے پاس پہنچ گئی۔ وہ بہ دستور کھانے میں مصروف تھا اور بڑے وحشیانہ انداز میں انگلیاں چاٹ رہا تھا یا تو

مجھے کھانا بہت وقت کے بعد ملا ہے یا پھر یہ کھانا واقعی اتنا اچھا ہے کہ میں اس کی تعریف نہیں کرسکتا۔ شازیہ مسکرا کر خاموش ہوگئی۔ کافی کی سوندھی سوندھی خوشبو فضا میں پھیل رہی تھی۔ یوسف نے کہا۔

''تو نے اپنے لیے کافی نہیں بنائی۔''

''بنائی ہے مگر آپ کے ساتھ ہی پیوؤں گی۔''

''ایک بار پھر خدا تجھے خوش رکھے۔'' یوسف خان نے کہا اور ٹرے کی طرف متوجہ ہوگیا۔ پھر جب تک پوری ٹرے خالی نہ ہوگئی۔ اس نے پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔

''خانا...... اور لاؤں۔''

''نہیں بابا...... کھانا اتنا اچھا تھا کہ میں نے ضرورت سے زیادہ کھالیا اور پھر بہت دیر بعد کھایا تھا۔ اس لیے پیٹ بھی زیادہ ہی بھر گیا۔ چل مجھے کافی دے، شازیہ نے اپنے لیے کافی بنائی اور ایک پیالی کافی یوسف خان کے سامنے رکھ دی وہ اس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا۔

''تو میں ستاروں کے بارے میں بتا رہا تھا کہ اب ہمارے ستارے گردش میں آگئے ہیں۔''

''ہوا کیا خانا میں تو تمہاری بات سننے کے لیے بری طرح بے چین ہوں۔''

''ہونا کیا ان خدائی خواروں نے مجھ سے میرا بھائی چھین لیا اور اس کے بعد ہمیں غدار قرار دے دیا۔''

''غدار!''

''ہاں۔'' یوسف خان نے کہا اور پھر پوری تفصیل شازیہ کو بتادی۔ شازیہ کے ذہن میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ یوسف خان نے کہا۔

''بڑی مشکل سے میں بچتا بچاتا یہاں تک آیا ہوں اور اب میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کروں۔''

''یہ جگہ محفوظ ہے۔ خانا میرے اور تمہارے سوا اس کے بارے میں کسی کو نہیں معلوم۔ میں سمجھتی ہوں ہمیں یہاں کافی وقت گزارنا چاہیے اور اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ ہم کیا کرسکتے ہیں۔''

''ہاں واقعی بڑا خوف ناک ماحول پیدا ہوچکا ہے۔ میں ان سب کو بھون کر رکھ دوں گا اگر وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میری ہی مملکت میں، میرے ہی وطن میں میرے خلاف سازشیں کرکے میری حویلی پر قابو پاسکتے ہیں تو یہ نہیں ہونے دوں گا میں۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے حکومت سے بغاوت کی ہے لیکن یہ بات اگر میں کسی کو بتاؤں گا تو کوئی بھی نہیں مانے گا کہ اصل آدمی میں نہیں میرا بھائی تھا جو ہلاک ہوگیا مگر خیر...... کوئی بات نہیں ہے ثوبیہ ہمیں ایک سبق ملا ہے۔ اور اچھا سبق ملا ہے ہمیں۔ سوچنا پڑے گا بہت کچھ سوچنا پڑے گا۔''

''کون سے سبق کی بات کرتے ہو خانا۔''

''ثوبیہ وطن سے غداری کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اقتدار تو آنی جانی چیز ہے آج ہوتا ہے۔ کل نہیں ہوتا اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ہمارے پاس جو اقتدار تھا وہ تو ناقابل شکست تھا۔ ہم اپنی مملکت کے بے تاج بادشاہ تھے اور ہمیں اپنے گھر میں کوئی پریشانی نہیں تھی لیکن ثوبیہ اس کے بعد جو کچھ ہوا ہے وہ سب غلط ہوا ہے میں اپنے بھائی سے عقیدت کی حد تک محبت کرتا تھا اور جب میرے بھائی نے کسی کام کے لیے مجھ سے کہا تو بھلا میری کیا مجال تھی کہ میں اس سے انکار کرتا۔

وہ تو چلا گیا لیکن ہمیں اس عذاب میں چھوڑ گیا تو بیہ میرے دل میں ہمیشہ یہ بات رہی کہ اپنے وطن سے غداری کرنا اچھی بات نہیں ہوتی مگر میں اگر اس بات کا اعلان کرتا کہ میں غدار نہیں ہوں اور ایک وفادار شہری کی حیثیت سے زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ تو میری بات کبھی نہیں سنی جاتی۔ ہم گردن گردن تک دلدل میں پھنس چکے ہیں۔ کوئی ایک سمت نہیں ہے ہمارے لیے۔"

"خان...... آپ بہت زیادہ پریشان معلوم ہوتے ہیں میرا خیال ہے کہ آپ نیند کی گولیاں لے کر سو جائیں۔"

"نیند کی گولیاں۔"

"نہیں...... میں نے زندگی میں کبھی نیند کی گولیاں نہیں کھائیں۔ کیا ایسی گولیاں یہاں موجود ہیں۔"

"نہیں میں باہر سے لا سکتی ہوں جا کر۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک میڈیکل سٹور ہے۔"

ضرورت نہیں ہے تو بس میرے لیے آرام کا بندوبست کر دے میں واقعی سونا چاہتا ہوں چوں کہ بہت دیر سے سخت پریشانی کی زندگی گزار رہا ہوں۔"

"آپ آرام کریں خان۔" شازیہ نے کہا اور اس کے بعد اس نے محبت بھرا انداز میں یوسف خان کو بیڈ روم تک پہنچایا۔ وہ بستر پر لیٹ گیا تو اسے کمبل اوڑھایا اور آہستہ قدموں سے باہر نکل آئی۔ دروازہ اس نے بند کر دیا تھا لیکن باہر سے نہیں تا کہ یوسف خان کو کوئی شبہ نہ ہو سکے۔ اس کے دل میں پنکھ لگے ہوئے تھے اور اب وہ صوفی کو اس بارے میں بتانا چاہتی تھی۔

♥...... ♥...... ♥

صوفی چوتھی چیک پوسٹ سے بھی گزر گیا اور پھر اس کی جیپ ایک شان دار عمارت کے سامنے رک گئی۔ چار جگہ اسے اپنی شناخت کرانا پڑی تھی۔ بریگیڈیئر سکندر رانا نے چیک پوسٹوں پر ہدایت کر دی تھی کہ اس نمبر کی جیپ اور اس حلیے کے آدمی کو اس تک آنے دیا جائے۔

البتہ جو ضروری کارروائیاں ہو سکتی ہیں ان میں کسی قسم کی رعایت برتنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی فوجی اصطلاح میں رعایت نام کا کوئی لفظ قابل حیثیت نہیں ہوتا۔ وہاں صرف اصول سب سے بڑی رعایت ہوتے ہیں۔ آپ اصولوں کی پابندی کیجیے، آپ کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔ غیر اصولی زندگی بالکل بے مقصد اور بے کار ہوتی ہے۔

بہر حال صوفی عمارت کے سامنے اپنی جیپ سے اترا۔ یہاں بھی ملٹری پولیس کے دو آدمیوں نے اس سے اس کی شناخت طلب کی اور پھر اسے ایک شخص کی رہنمائی میں ایک ڈرائنگ روم جیسی جگہ پر پہنچا دیا گیا جہاں مکمل خاموشی طاری تھی۔ اعلیٰ درجے کا فرنیچر موجود تھا۔ صوفی یہاں آنے کے بعد ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ پھر وہ بھاری بھر کم شخص اندر داخل ہوا جو اس وقت غیر فوجی لباس میں تھا لیکن اس کی اعلیٰ شخصیت سے ایک لمحے میں یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی اعلیٰ فوجی عہدیدار ہے۔

بریگیڈیئر نے صوفی کو دیکھا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آپ نے مجھے خوب یاد رکھا صوفی صاحب بڑی خوشی ہوئی آپ سے دوبارہ ملاقات کر کے۔

ٹیلی فون پر مجھے آپ کا میسج ملا آپ دیکھ لیجیے میں بھی آپ کو نہیں بھلا پایا۔ سکندر رانا نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ صوفی کے ہاتھ میں دے دیا اور صوفی نے احترام سے اس سے مصافحہ کیا۔

"براہ کرم تشریف رکھیے۔" بریگیڈیئر سکندر رانا نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ پھر ہنس کر بولا۔

"ویسے صوفی صاحب معافی چاہتا ہوں۔ مجھے آپ کی شخصیت پر تبصرہ کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے لیکن دوستانہ طور پر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ جو ایک مصرعہ کہا جاتا ہے۔" کہ

زمین جُمد نہ جُمد گل محمد

آپ آج بھی بالکل ویسے ہی ہیں بلکہ لگتا ہے کہ وقت آپ پر ٹھہر گیا ہے۔ آپ کی شخصیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی مجھے فارچون والا کیس یاد ہے۔ جب آپ نے تن تنہا ایک خطرناک گروہ کو قابو میں کر لیا تھا اور ہم سب ششدر رہ گئے تھے۔ وہ سارے کا سارا ایکشن ملٹری کے خلاف تھا اور آپ نے اس وقت ملٹری کے لیے بہترین کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ صوفی صاحب میں آج بھی اس کارنامے کو یاد کرتا ہوں۔ تو آپ کی شخصیت میری نگاہوں میں گھوم جاتی ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ جب ٹیلی فون پر میرے پی اے نے بتایا کہ صوفی نامی ایک صاحب آپ سے ذاتی ملاقات کرنا چاہتے ہیں تو مجھے فوراً یاد آ گیا اور میں یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ وہی صوفی ہیں؟"

"جی ہاں حضور والا میں وہی صوفی ہوں۔"

"ارے واہ...... یاد آیا۔ آپ پیر پرست بھی ہیں۔ بھئی آپ کی پیر پرستی کا تو میں اس وقت ہی قائل ہو گیا تھا جب ایک بار کرنل رحیم شاہ نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا کہ آپ چلہ کشی کر کے بڑے بڑے مجرموں کی گردنیں دبوچ لیتے ہیں۔"

"درویشیوں کی نظر عنایت ہو تو سب کچھ ہو جاتا ہے جناب۔"

"بڑی بات ہے بھائی، بڑی بات ہے۔ اچھا یہ بتائیے کیا پئیں گے آپ؟"

"سر کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتا آپ کو۔"

"بھئی یہ میری رہائش گاہ ہے۔ ملٹری کا آفس نہیں ہے۔ میں آپ کے لیے چائے منگواتا ہوں۔"

"اگر آپ کا یہ خیال ہے تو جو درویشوں کی مرضی۔" صوفی نے جواب دیا اور بریگیڈیئر نے اپنے ملازم کو بلانے کے لیے گھنٹی بجا دی۔

ملازم آیا تو اس نے "چائے کا کہا" اور ملازم گردن خم کر کے چلا گیا۔

"صوفی صاحب ویسے آپ کی آمد میرے لیے سنسنی خیز بھی ہے۔"

"جی سر کچھ حقائق آپ کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں...... ہاں...... ضرور بتائیے بتائیے میں بالکل فرصت سے ہوں۔ میں نے آپ کے لیے خاصا وقت محفوظ کیا ہے۔"

"شکریہ جناب عالی...... ذرا سی تفصیل میں جاؤں گا۔"

''بالکل بے فکری سے، جو کچھ ہے وہ مجھے بتایئے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ محب وطن ہیں اور آپ نے بارہا فوج کا ساتھ دیا ہے۔ ہم لوگ آپ کی بے پناہ عزت کرتے ہیں اور قدر کرتے ہیں۔''

''بے حد شکریہ جناب عالی آپ نے خود کرنل رحیم شاہ کا نام لیا۔ کرنل صاحب معذوری کی بناء پر فوج سے علیحدہ ہوئے تھے۔''

''ہاں ان کی ایک ٹانگ ضائع ہو چکی تھی۔ جس کی وجہ سے انہیں وقت سے پہلے اپنا عہدہ چھوڑنا پڑا۔''

''کیا آپ کے علم میں یہ بات ہے کہ اپنا عہدہ چھوڑنے کے بعد انہوں نے مجھے طلب کیا اور مجھ سے کہا کہ بے شک وہ فوجی خدمات سرانجام نہیں دے سکتے لیکن ان کی تشنگی دور نہیں ہوئی ہے۔ وہ ملکی بقاء کے لیے کام کرتے رہنا چاہتے ہیں اور میں ان کا ساتھ دوں۔''

''جی......جی تفصیلات میرے علم میں نہیں ہیں لیکن کرنل رحیم شاہ یقیناً ایسی ہی شخصیت کے مالک تھے۔''

''اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ انہیں ایک طرح سے ملک بدر کر دیا گیا ہے۔''

''زیادہ تفصیل میرے علم میں نہیں آ سکی۔''

''جی ہم دونوں نے مل کر یہاں کام شروع کیا تھا۔ کرنل صاحب بذات خود اس قدر صاحب ثروت انسان تھے کہ انہیں دولت وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اپنی جیب سے اخراجات خرچ کر کے وہ ان لوگوں کو چلاتے تھے جو ملکی مفادات کے لیے ان کے احکامات کے تحت کرم کرتے تھے درویشوں کی دعاؤں سے جن میں میں بھی شامل تھا۔ شاہ میر صاحب ہمارے ہاں کی ایک اہم ترین شخصیت ہیں سرکاری معاملات الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی بنیاد پر شاہ میر صاحب کو ان کے عہدے سے ہٹا کر جو کچھ بھی کیا گیا ظاہر ہے یہ ہمارا مسئلہ نہیں تھا لیکن اس کے بعد شاہ میر صاحب کی جگہ ایک اور صاحب کو تعینات کیا گیا ان کا نام اطہر جبار خان ہے۔ اطہر جبار خان نے فوری احکامات کے تحت کرنل رحیم شاہ صاحب کو ان کے اہل خاندان کے ساتھ ملک بدر کر دیا۔ ان پر جو الزامات لگائے گئے۔ ان کے بارے میں جناب آپ خود بھی اندازہ لگا سکتے ہیں لیکن بہرحال میں اس پر تنقید کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ درویشوں کے کرم سے یہ خالص سرکاری معاملات ہیں۔ اونچی سطح کے لوگ اونچے فیصلے کرتے ہیں لیکن میں جو انکشاف آپ پر کرنا چاہتا ہوں وہ الگ ہی سنسنی خیز نوعیت کا حامل ہے۔'' بریگیڈیئر سکندر رانا توجہ اور دلچسپی سے صوفی کی بات سن رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔

بات اصل میں یہ ہے صوفی صاحب کہ ہم فوجی لوگ زیادہ تر اپنے معاملات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ذاتی طور پر ہم کسی مسئلے میں مداخلت نہیں کرتے جب تک کہ ہمیں ہائی کمانڈ کی طرف سے احکامات نہ ملیں۔ تاہم ملک، محب وطن لوگ اور قابل احترام شخصیتیں ہمارے لیے بھی اتنی ہی قابل احترام ہوتی ہیں۔ جتنی دوسرے لوگوں کے لیے......شاہ میر صاحب کا مسئلہ کیا ہے۔ آپ یقین کیجیے تفصیلی طور پر ہمارے علم میں کوئی بات نہیں آئی۔ صرف اس حد تک جس حد تک اخبارات کو اس سلسلے میں رپورٹ دی گئی۔ ذاتی طور پر ہمیں اجازت نہیں ہے کہ ایسے کسی مسئلے سے ذاتی دلچسپی رکھ کر اس کی چھان بین کریں۔''

''جی......سر میں جانتا ہوں۔''

''آپ اگر کوئی اہم بات مجھے بتانا چاہتے ہیں تو براہ کرم ضرور بتایئے۔ اصل میں آپ کا مسئلہ

بالکل مختلف ہے۔ میں ان واقعات کو زندگی میں فراموش نہیں کر سکتا۔ جن میں آپ نے میری بھرپور مدد کی تھی۔ اور آپ کی وجہ سے ہم لوگ بڑی سرخروئی حاصل کر سکے تھے۔ صوفی صاحب میں ہمیشہ اس بات کا خواہش مند رہا ہوں کہ اگر کبھی آپکو مجھ سے کوئی کام ہو۔ تو اسے انجام دے کر آپ کی اس محبت کا صلہ دے سکوں جو آپ نے میرے لیے استعمال کی تھی۔''

''بے حد شکر گزار ہوں۔ جناب جو انکشاف میں کر رہا ہوں وہ آپ کے لیے یقیناً باعث دلچسپی ہوگا۔''

''آپ براہ کرم مجھے بتایئے۔''

''ایک ایسی تنظیم کسی ملک کے اشارے پر ہمارے خلاف ایک بدترین سازش کر رہی ہے میں یہ ڈسک سرکاری طور پر کسی کے حوالے تو نہیں کر سکتا لیکن ذاتی طور پر ایک محب وطن شخص جسے میں اچھی طرح جانتا ہوں یعنی ''سکندر رانا'' میں اسے اپنے وطن کا ایک اہم ترین راز دے رہا ہوں۔'' صوفی نے تمام انتظامات کیے اور بریگیڈیئر سکندر رانا کو ایک ایک تفصیل بتا دی۔ بریگیڈیئر کا چہرہ فق ہو گیا انہوں نے کہا۔

''سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ اطہر جبار خان ایک اہم عہدیدار ہیں ان کی جگہ کوئی نقلی آدمی کام کر رہا ہے۔ وہ جگہ تو ملک کے اہم رازوں کا مرکز ہے۔

''درویشوں کی دعاؤں سے صوفی نے کہا۔''

بریگیڈیئر سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ پھر انہوں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''ہمیں فوری ایکشن لینا ہو گا صوفی صاحب مجھے ہائی کمانڈ سے مطلب نہیں اور اس پورے مسئلے کو آپ ہی ڈیل کریں گے۔''

''دل و جان سے جناب۔''

''آپ سے اجازت چاہتا ہوں اب میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کر سکتا۔'' صوفی وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ یہ سب کچھ کر کے وہ سکون محسوس کر رہا تھا۔ ویسے ہی بس پرانے محلے کا خیال آیا تھا بہت دن ہو گئے تھے وہاں آئے ہوئے۔ چنانچہ اس طرف چل پڑا۔

گلی کے حالات جوں کے توں تھے۔ امین ممن خان کے ہوٹل کے سامنے ایک شاندار کیڈلک دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ پھر انس وگل داؤدی اسے دیکھ لیا۔

''اماں صوفی صاحب۔ آیئے آپ کو کسی نے خبر دی؟''

''کیسی خبر درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''آپ کے مہمان آئے ہیں۔''

''کون مہمان......؟''

''ممن خان کے ہوٹل میں ہیں۔''

صوفی حیران رہ گیا۔ یہ کون ہو سکتا ہے پھر اس نے دور سے آغاز الدین کو دیکھا۔ اس کے بہترین کرم فرماؤں میں سے تھے اکثر اس کے کام آئے تھے۔ بہت محبت کرتے تھے اس سے۔ پرکھوں کے نواب تھے بہت دور تک رسائی تھی بلکہ کئی جگہ وہ صوفی کے کام بھی آ چکے تھے۔ بلکہ ایک بار تو وہ صوفی کے سلسلے میں بہت آگے بڑھ گئے تھے۔ طویل عرصہ معطل رہنے کے بعد صوفی کو تھانے داری ملی تھی۔ جو لوگ اسے اچھی

طرح جانتے تھے۔ انہیں کف افسوس ملے تھے۔ اس تعیناتی پر تبصرے کئے تھے۔

ان کے خیال میں یہ صوفی کی توہین تھی۔ صوفی بڑے بڑے عہدوں پر رہ چکا تھا۔ اس کے بعد تھانے داری۔

نواب آغاز الدین تو اتنے جذباتی ہوئے کہ آئی جی صاحب سے ملاقات کا وقت لے ڈالا۔ ان کی شخصیت اس پائے کی تھی کہ آئی جی صاحب نے فوراً ان سے ملاقات کی۔"

"فدوی کو آغاز الدین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔"

"تعارف کرانے کی ضرورت نہیں نواب صاحب۔" آئی جی صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بے حد شکریہ دخل در معقولات کے لئے شرمسار ہوں لیکن جس مسئلے میں حاضر ہوا ہوں وہ ناگزیر تھا۔ انتہائی معذرت کے ساتھ سمع خراشی کی اجازت چاہتا ہوں۔"

"جو کچھ بھی ذہن میں ہے بے دھڑک ارشاد فرمایئے۔" آئی جی صاحب نے کہا۔

ایک شخص بنام صوفی کے بارے میں گفتگو کرنے حاضر ہوا ہوں اسے ایک تھانے میں انسپکٹر کی حیثیت سے تعینات کیا گیا ہے۔"

"جی ہاں...... صوفی صاحب! آپ انہیں جانتے ہیں نواب صاحب؟"

"آنسو نکل آئیں گے آئی جی صاحب اگر آپ نے ایسے سوالات کیے جس پائے کا وہ شخص ہے کاش اس کی صحیح شناخت ہو جاتی۔ بڑے بڑے عہدوں پر رہ چکا ہے پھر یہ تنزلی کی انتہا کیوں؟"

آئی جی صاحب نے نرم انداز میں آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور بولے۔

"انہیں ازسرنو محکمہ پولیس میں خوش آمدید کیا گیا ہے میرے پاس بھی ان کی سابقہ خدمات کا ریکارڈ موجود ہے لیکن اس وقت اس کے علاوہ کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت جلد انہیں خصوصی ترقیاں دی جائیں گی۔ اس کا میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔"

"میں صوفی سے پوچھے بغیر اس کی سفارش لے آیا ہوں میری کیا عزت رکھی جا سکتی ہے۔" نواب آغاز الدین نے کہا اور آئی جی صاحب سوچ میں ڈوب گئے پھر انہوں نے کہا۔

"اگر آپ ان کے بارے میں اس قدر سنجیدہ ہیں تو صرف آپ کے ارشاد فرمانے سے میں ذاتی طور پر کوشش کر سکتا ہوں۔ امکان اس بات کا ہے کہ صوفی کو فوری طور پر ڈی ایس پی کے عہدے پر ترقی دے دی جائے لیکن حتمی فیصلہ نہیں کر سکتا لیکن آپ کو آپ کے جذبات کے تحت یہ یقین دلاتا ہوں کہ اگر فوری طور پر نہ سہی تو، تو کچھ وقت کے بعد یہ کام ضرور کر ڈالوں گا۔"

"نہایت رنج ہوا تھا یہ سب کچھ سن کر اس لئے بغیر کسی ذاتی شناسائی کے حاضر ہو گیا معذرت خواہ ہوں۔"

"قطعی نہیں آپ کی آمد ہمارے لئے باعث عزت ہے۔ صوفی سے براہ راست رابطہ رہے گا اور کسی بھی وقت آپ کو یہ خوش خبری سنا دی جائے گی۔"

"بے حد شکریہ۔" نواب آغاز الدین نے کہا۔

"ادھر صوفی سے محبت کرنے والے اس انداز سے سوچ رہے تھے اور ادھر صوفی تھا کہ اپنے آپ

مگن اپنی دھن کا رسیا۔ جو شخص کسی کنجوس ترین شخص کی دوکان پر بیٹھ کر کھاتے لکھ سکتا ہو اسے بھلا اس سے کیا غرض کہ تھانے داری کیا ہوتی ہے اور ڈی ایس پی کا عہدہ کن فوائد کا حامل ہے۔ ممن خان کا ہوٹل اور ان کی گلی میں صوفی کا جھونپڑا بس اس کے سوا صوفی کو زندگی میں کچھ درکار نہیں تھا۔ انسپٹر شہباز کو بھی اپنے ساتھیوں میں جواب دہی مشکل ہو گئی تھی۔ نگاہیں جھکائے جھکائے پھرتا تھا۔ مگر صوفی کی سرمستیوں کا وہی عالم، نہ کسی بات سے گریز نہ کسی عمل سے، اب ممن خان جیسے لوگوں کو کیا معلوم کہ عہدے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ ممن خان نے تو باقاعدہ قوالی کر ڈالی تھی اور قوالوں سے باقی قوالیوں کے علاوہ ایک خصوصی قوالی کی فرمائش کی گئی تھی جس کا مطلع یہی تھا۔

سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کا ہے کا ہے۔

جس طرح بھی بن پڑا ممن خان اور اہل محلہ نے صوفی کو تھانیدار ہونے کی مبارک باد دی تھی صوفی کی سرمستیاں کچھ زیادہ ہی آگے بڑھ گئی تھیں۔ چنانچہ اس کا نتیجہ اس تھانے میں بہت ہی دلچسپیوں کی شکل میں نمودار ہوا۔ مثلاً شہباز کو سروے پر لگایا گیا کہ مختلف علاقوں کے تھانوں میں ایسے سپاہیوں کو تلاش کرے جو رشوت ستانی میں دلچسپی نہ لیتے ہوں اور صرف اپنے کام سے کام رکھتے ہوں کوئی بھی محکمہ ہو اچھے برے لوگوں کی کمی نہیں ہوتی محکمہ پولیس کے بارے میں بہت سی روائتیں زبان زد عام ہیں لیکن یہ محکمہ بھی ایسے لوگوں سے خالی نہیں تھا۔

شہباز کے سروے نے صوفی کو ایک اچھا خاصا حلقہ مہیا کر دیا اسے ایس آئی نیک محمد، حوالدار شریف خان اور ہیڈ محرر شرافت حسین جیسے لوگ صوفی کو مل گئے تھے۔ تھانے کا حلیہ ہی بدل گیا کسی کو رشوت لینے کی اجازت نہیں تھی صوفی نے اسی پر بس نہ کیا تھانے کی دیواروں پر جہاں انسانیت کا مذاق اڑانے والے نعرے لکھے جاتے تھے۔ اب کچھ اس طرح کے نعرے آویزاں تھے۔ جن میں نہایت خوشخط الفاظ میں لکھا تھا۔

"جرم کیا ہے تو سزا ملے گی، بے گناہ ہے تو اللہ مدد کرے گا"

رشوت اور سفارش لے کر اندر آنا منع ہے۔"

بحکم صوفی وغیرہ وغیرہ

یہ فقرے بہت سے لوگوں کے لئے باعث حیرت ہوتے تھے۔ بہت سوں کے لئے باعث دلچسپی۔ لیکن صوفی کو نہ کسی حیرت سے دلچسپی تھی اور نہ کسی کے تبصرے سے غرض یہ کہ تھانے کے ماحول میں خاصی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ جو قیدی لاک اپ میں لائے جاتے۔ ان کے ساتھ ایسا سلوک ہوتا جیسے پولیس نے انہیں یہاں لا کر غلطی کی ہے اور اب ان غلطیوں کا ازالہ کر رہی ہے ہر شخص کی رپورٹ درج کی جاتی کسی کو مایوسی نہ ہوتی۔ یہی حالات چل رہے تھے کہ آئی جی صاحب نے طلب کر لیا اور صوفی سے گفتگو کرتے ہوئے نواب آغاز الدین کی آمد کے بارے میں بتایا۔ پھر بولے۔

"میاں صوفی! ہم نے وعدہ کر لیا ہے۔ نواب صاحب سے کہ تمہیں ڈی ایس پی کے عہدے تک پہنچا دیں گے۔ لیکن نواب صاحب سے تمہاری ملاقات ہو جائے تو تم خود ہی انہیں سمجھا دینا کہ آئی جی غیر مخلص نہیں ہیں۔ وہ پوری پوری کوشش کریں گے۔"

''حضور انور، جناب عالی، بندہ پرور، نواب آغاز الدین کی محبت اپنی جگہ لیکن اس عاجز کی ایک درخواست بھی ہے۔ درویشوں کے کرم سے۔''

''ہاں ہاں کہئے صوفی صاحب۔''

''میں نے تھانے کو ترتیب دینے کے لئے بڑی محنت کی ہے۔ خدارا مجھے میری جنت سے نہ نکالا جائے۔ میں وہاں ہر طرح سے خوش ہوں اگر میرا عہدہ تبدیل کیا گیا تو میں استعفیٰ پیش کر دوں گا۔'' آغاز الدین صاحب کی عنائتیں اپنی جگہ میں ذاتی طور پر کچھ کرنے کا خواہاں ہوں۔ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

آئی جی صاحب بے اختیار مسکرا پڑے پھر کہنے لگے۔

''تمہارے بارے میں جو کچھ سنا تھا۔ صوفی حقیقت یہ ہے کہ تم اس سے مختلف نہیں، بہر حال آغاز الدین کے سامنے یہ الفاظ ادا کر کے میری عزت بھی رکھ لو۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم خود ان سے اس بارے میں کہہ دو۔ میں اگر کہوں گا تو سمجھیں گے کہ عذر کر رہا ہوں۔''

''جہاں خاطر فرمایئے درویشوں کے کرم سے میں مدعائے دل عرض کر دوں گا۔ البتہ ایک عرض داشت آپ کی خدمت میں بھی ہے درویشوں کی دعا سے آغاز الدین صاحب کے تعلق کو اگر اس طرف منتقل فرما دیں تو حضور کے اقبال کیلئے دعائیں کرتا رہوں گا۔''

''ہاں، ہاں کہئے صوفی صاحب کیا بات ہے؟''

حضور انور زمانہ گزرا ہے اس دشت کی سیاحی میں درویشوں کی دعاؤں سے تھانوں پر ایک نادیدہ ہاتھ مسلط رہتا ہے تعلقات کا حیثیت کا اختیار کا میری آرزو ہے کہ مجھے ہر مجرم کے خلاف کاروائی کرنے کی اجازت دی جائے قانون کی رکھوالی کا کام سونپا جائے۔ قانون کی قوالی نہ کرائی جائے میرے ہاتھ سے۔ بس اتنی سی فرمائش کرنا چاہتا ہوں درویشوں کی دعا سے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ اگر صاحب اختیار لوگ مجرم ہوں تو آپ ان پر با آسانی ہاتھ ڈال سکیں اور قانون مداخلت نہ کرے؟''

''درست سمجھا آپ نے درویشوں کے کرم سے۔''

''ٹھیک ہے صوفی صاحب! جب تک میں اس سیٹ پر موجود ہوں آپ کو اس سلسلے میں مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ لیکن کوشش کیجئے گا کہ کہیں سہو نہ ہو جائے۔''

''درویشوں نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔ صوفی نے پر مسرت انداز میں کہا اور اس کے بعد آغاز الدین سے دست بستہ ٹیلی فون پر عرض کیا کہ اسے اس کے عہدے پر برقرار رہنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔

''آغاز الدین صاحب ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔

''میاں جانتے تھے کہ ایسا ہی ہوگا بس اپنے دل کی بھڑاس نکالنی تھی، سو نکال لی جب تم نے ایک بہتر رہائش گاہ قبول نہیں کی تو عہدہ کیا قبول کرو گے خدا تمہیں خوش رکھے۔''

یوں صوفی کی تھانے داری پکی ہوگئی۔ البتہ اس بات کی اسے خوشی تھی کہ اسے قانون کا رکھوالا ہی تسلیم کر لیا گیا تھا۔ قانونی قوال نہیں بنایا گیا تھا۔

نیک محمد، شریف خان، شرافت حسین جیسے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے اور آنے والوں کو بعض اوقات حیرت ہوتی تھی کہ وہ کسی دینی مدرسے میں پہنچ گئے ہیں۔ یا سچ مچ پولیس تھانے میں ہی آئے ہیں۔ پھر آئی جی صاحب نے ایک بار صوفی کو طلب کیا اور صوفی دست بستہ ان کے سامنے پہنچ گیا۔ تو آئی جی صاحب نے ایک درخواست اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''ملاحظہ فرمایئے صوفی صاحب۔''

صوفی درخواست پر جھک گیا۔ شمیم احمد نام کے کسی نوجوان کے والد نعیم احمد نے آئی جی صاحب کی خدمت میں درخواست روانہ کی تھی۔ ان کا بیٹا شمیم احمد ایک لڑکی کے قتل کے الزام میں گرفتار ہوا تھا اور پولیس نے اس پر سختی کر کے اس سے اقبال جرم کروا لیا تھا۔ نعیم احمد کا کہنا تھا کہ ان کا بیٹا مجرم نہیں ہے اگر اس قتل کی تحقیقات صحیح طور پر کی جائے تو ان کے بیٹے کی بے گناہی ثابت ہو سکتی ہے۔ نعیم نے براہ راست آئی جی صاحب سے درخواست کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ایک غریب اور بے بس آدمی ہے۔ نہ اس کے پاس وسائل ہیں کہ اعلیٰ درجے کے وکیل کر سکیں اور نہ ہی وہ کوئی پہنچ رکھتے ہیں۔ اگر از راہ کرم ان کے بیٹے کی مدد کی جائے تو شاید اس کی زندگی بچ جائے اور نعیم احمد کے گھر کا اکلوتا چراغ نہ بجھنے پائے نعیم احمد نے لکھا تھا کہ اگر شمیم احمد کو سزائے موت ہوئی تو یہ ایک بے گناہ انسان کی موت نہیں ہوگی بلکہ اس کے ساتھ مزید چار افراد موت کے گھاٹ اتریں گے۔ جن میں دو بہنیں ایک ماں اور ایک باپ بھی ہے ہاں اگر صحیح تفتیش سے بھی ان کا شمیم احمد مجرم ثابت ہو جائے تو پھر ایک مجرم اور قاتل کی بے گناہی کی کوشش نہیں کی جائے گی۔

آئی جی صاحب نے کہا ''درخواست پڑھ لی صوفی صاحب؟''

''درویشوں کے کرم سے۔''

''اصل میں آپ نے مجھ سے اس دن یہ بات کہی تھی کہ میں قانون کے راستوں کے صحیح سفر کے لئے آپ کو اجازت دوں یہ کیس بھی ایک ایسا ہی کیس ہے۔ ایک دوسرے تھانے میں اس کی تفتیش ہو رہی ہے حالانکہ قتل اس علاقے کا ہے آپ اگر پسند کریں تو میں یہ تفتیش آپ کے تھانے میں ٹرانسفر کرا سکتا ہوں۔''

''بہ خوشی درویشوں کی دعا سے، احقر حاضر ہے۔''

''ٹھیک ہے آپ کے پاس اس کی فائل پہنچ جائے گی اور اگر آپ پسند کریں تو ملزم کو بھی اپنی ہی تحویل میں لے لیں۔ یا اگر آپ اس کا جیل ریمانڈ چاہتے ہیں تو ایسا کر لیں جیسا آپ پسند کریں۔''

''حضور انور مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ آپ اس کے بھی احکام صادر فرما دیجئے درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''ٹھیک ہے ہو جائے گا۔ ویسے آپ مجھ سے رابطہ رکھیے گا اگر کوئی مشکل پیش آئی میں دیکھ لوں گا۔''

دوسرے دن صوفی کو سرکاری حکم نامہ مل گیا ایس آئی نیک محمد اور حوالدار شریف خان کو لے کر وہ متعلقہ تھانے پہنچ گئے۔ جہاں ایک روایتی قسم کا تھانہ انچارج حکمران تھا۔ صوفی کا شناسا بھی۔ صوفی کو دیکھ کر اس نے قہقہہ لگایا۔

''بابائے پولیس کہئے عہدے کی ترقی پسند آئی۔ اماں صوفی تمیں مار خاں بنے رہتے تھے۔

تھانے داری کرر ہے ہو؟‘‘

’’درویشوں کا کرم ہے تھانیدار صاحب کا ہم پلہ ہو گیا۔ اچھا نہ لگتا تھا آپ جیسوں پر حکمرانی کرتے ہوئے۔‘‘

جواب میں متعلقہ تھانیدار نے قہقہہ لگایا پھر بولا۔

’’کہئے کیسے آنا ہوا؟‘‘

’’اگر اس نوجوان کی ہڈیاں باقی بچ گئی ہوں تو انہیں ہمارے سپرد کر دیجئے گا۔ درویشوں کی دعاؤں سے جس کا آپ نے سارا تیل نکال لیا ہے۔‘‘

’’کس کی بات کرر ہے ہو؟‘‘

’’شمیم احمد ولد نعیم احمد۔‘‘

’’تمہارا اس سے کیا واسطہ؟‘‘

’’ہمارا تو نہیں ہے۔ یہ قبلہ آئی جی صاحب! کا اس سے کوئی خاص واسطہ ہے۔ ذرا یہ حکم ملاحظہ فرما لیجئے درویشوں کی دعاؤں سے۔‘‘

آئی جی صاحب کی طرف سے جاری ہونے والے آرڈر پڑھ کر تھانہ انچارج کا منہ بگڑ گیا۔ غراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

’’ایک تو یہ اوپر سے تھانے کے معاملات میں بڑی مداخلت ہوتی ہے۔ بھئی اب نجانے کیسے کیسے تو اس سے اقبال جرم کرایا ہے ہم نے اماں صوفی میاں یہ چکر کس کا چلایا ہوا ہے؟‘‘

’’قانون قدرت ہے۔ تھانے دار صاحب! وقت ضائع کرر ہے ہیں آپ اور اس کی جواب دہی آپ کو آئی جی صاحب کے سامنے کرنا ہوگی۔‘‘

’’صوفی صاحب لونڈے کو تو لے جاؤ مگر بعد میں مجھ سے بات کر لینا توڑ کی امید ہے جسے کرلیں گے سمجھے۔؟‘‘

’’یہ الفاظ لکھ کر عطا فرمائیں گے۔ آپ درویشوں کی دعاؤں سے؟‘‘

’’اماں کیا اول فول بک رہے ہیں کیا لکھ کر دیں گے؟‘‘

’’یہی کچھ جوڑ توڑ والی بات۔‘‘

رہے صوفی کے صوفی نا۔ لے جاؤ بھائی کاہے کو ہمارے ماتھے لگ رہے ہو چل بھئی اللہ دتا نکال لو اس لونڈے شمیم احمد کو۔ صوفی صاحب رسید لکھ دو۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔‘‘

شمیم احمد کو صوفی نے اپنے تھانے میں منتقل کر لیا۔ اس کا جسم داغدار تھا۔ لباس تار تار تھا۔ چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ شکل وصورت ہی سے ایسا نہیں لگتا تھا کہ قتل جیسے بھیانک جرم کا مرتکب ہوا ہو۔ صوفی نے سب سے پہلے اسے ایک سپاہی کا لباس پیش کیا۔ اس کے بعد کھانے پینے کی اشیاء پھر ڈاکٹر کو بلا کر اس کے زخم دکھائے جن کی کسی نہ کسی شکل میں مرہم پٹی کر دی گئی ان تمام عنایات سے نوجوان شمیم احمد شدید حیران تھا کہ یہ پذیرائی ہو رہی ہو۔ اور وہ بھی ایک تھانے میں جب صوفی اس کے سامنے پہنچا تو دہشت بھرے انداز میں بولا۔

’’نہیں تھانیدار صاحب، نہیں تھانیدار جی وقت سے پہلے مت مارو پھانسی دلوا دو۔ کہہ تو چکا ہوں جو کچھ تم لوگوں نے کہلوانا تھا۔ یہ جو عنایات مجھ پر ہو رہی ہیں میں جانتا ہوں کہ اس کے بعد کیا ہوگا پہلے بھی یہ ہی ہوا تھا کھلا پلا کر مارا تھا ان کم بختوں نے معافی چاہتا ہوں۔‘‘ نوجوان نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

’’بہ خدا تمہیں کوئی انگلی بھی چھو جائے تو ہم اس انگلی کو کاٹ کر باہر پھینک دیں گے قانون کا ایک معیار ہوتا ہے درویشوں کی دعاؤں سے مجرم کے بارے میں تفتیش کرو اور اگر وہ مجرم ہے تو اسے عدالت کے سپرد کیا جاتا ہے اور سزا دینے کی مجاز صرف عدالت ہوتی ہے۔ ہم ان لوگوں کے سخت خلاف ہیں جو سزا کا شعبہ بھی سنبھال کر بیٹھ کاتے ہیں۔ درویشوں کی لعنت ہو ان پر میاں بس ہمیں یہ بتا دو قتل کیا ہے؟‘‘

’’نہیں تھانیدار جی۔‘‘

’’سچ بولنا پسند کرتے ہو۔‘‘

’’کرتا ہوں مگر میرے سچ کو سچ ماننے والا کوئی نہیں ہے اس دنیا میں۔‘‘ نوجوان نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’گویا تمہارے بارے میں ہم تفتیش کریں تو اس انداز میں اس کا آغاز کریں کہ تم مجرم نہیں ہو۔‘‘

’’جناب یہی بات ہے میں بھلا اسے قتل کیوں کروں گا۔ جسے میں نے اپنی زندگی میں اپنے مستقبل کے لئے ایک مقام دیا تھا۔ اور پھر قتل جیسا بھیانک جرم تھانیدار صاحب آپ مانیں یا نہ مانیں۔ جو میری تقدیر میں لکھا ہے میں اسے کہاں ٹال سکوں گا۔ لیکن اگر واقعی اللہ نے میری مدد فرمانا منظور کر لی ہے تو آپ کی رہنمائی صرف اس طرح کر سکتا ہوں کہ میں نے نسرین کو قتل نہیں کیا۔ آپ اس کی تفتیش مناسب انداز میں کریں۔‘‘

’’کرنے ہی جار ہے ہیں درویشوں کے کرم سے۔ البتہ میاں اتنا بتاتے جاتے ہیں تمہیں کہ اگر تم نے ہم سے ان تمام حوالوں کے ساتھ جھوٹ بولا اور یہ بات ثابت ہوگئی کہ تم قاتل ہو تو بہ خدا شدید نفرت کریں گے تم سے اور ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد دوسرے بے گناہوں کی دادرسی بھی نہ ہو سکے۔ درویشوں کے کرم سے۔‘‘

صوفی باہر نکل آیا۔ اس کے بعد ہی اس نے اس کیس کی فائل کی ورق گردانی کی تھی۔

نسرین کو تیرہ ستمبر کی رات قتل کیا گیا تھا۔ اس کی آبروریزی بھی کی گئی تھی اور اس کے بعد اس کی لاش جھاڑیوں میں ڈال دی گئی تھی۔ دوسرے دن صبح صبح سڑک پر جھاڑو لگانے والے خاکروب نے یہ لاش دیکھی اور محلے کے سرپنچ اختیار پہلوان کو سب سے پہلے اس کی اطلاع دی تھی۔ اختیار پہلوان نیلم نگر میں اس علاقے کے سرپنچ تھے اور سوشل ورکر بھی تھے۔ آئندہ الیکشن میں حصہ لینے کی زور وشور سے تیاریاں کر رہے تھے۔ بس اس کے بعد اختیار پہلوان نے پولیس کو خبر کی اور پولیس نے لاش اپنی تحویل میں لے لی۔

ابتدائی تفتیش سے پتہ چلا کہ قتل کا شبہ شمیم احمد نامی نوجوان پر ہے۔ جو بی اے کرنے کے بعد کوئی دو سال سے بے روزگاری کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ شمیم احمد پر شبے کا اظہار اختیار پہلوان نے بھی کیا تھا اور اس کی تفصیلی وجوہات بتائی تھیں کہ شمیم اور فرقان نامی نوجوان آپس میں دوست تھے اور انہوں نے نیلم نگر کے اس

محلے میں جنم لیا تھا۔

بچپن کی دوستی جوانی تک ساتھ رہی اور اس کے بعد نسرین درمیان میں آ گئی۔ نسرین بھی اس محلے میں رہنے والے ایک شریف شخص جمیل احمد کی بیٹی تھی۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی اور اس کے بعد پردہ نشین ہو گئی تھی۔ لیکن وہ شمیم سے محبت کرتی تھی اور شمیم اس سے جبکہ فرقان کے دل میں بھی نسرین کا پیار تھا۔ جب اسے یہ علم ہوا کہ نسرین شمیم احمد کی طرف مائل ہے تو پھر اس کے دل میں رقابت پیدا ہو گئی۔ فرقان البتہ کسی حد تک کھاتے پیتے گھرانے کا بیٹا تھا۔

اس کا باپ سبزی منڈی میں آڑھت کا کام کرتا تھا اور اچھے خاصے پیسے کما لیتا تھا فرقان بھی اس کام میں اس کا دست راست تھا۔ جبکہ شمیم احمد تعلیم حاصل کرنے کے باوجود نوکری پانے میں ناکام رہا تھا۔ انہی حالات کو مدنگاہ رکھتے ہوئے فرقان نے فوراً اپنا رشتہ اپنے ماں باپ کے ذریعے جمیل احمد کے پاس بھجوا دیا۔ جمیل احمد کے خیال میں فرقان برا لڑکا نہیں تھا۔ لیکن جب نسرین کی ماں نے اس سلسلے میں نسرین سے بات کی تو نسرین نے صاف کہہ دیا کہ وہ شمیم سے شادی کرنا چاہتی ہے اور اگر اس کی شادی فرقان سے کی گئی تو وہ خودکشی کر لے گی۔

یہ سادہ سے لوگوں کی بستی تھی۔ بدنامی کے خوف سے جمیل احمد صاحب ! نے خاموشی اختیار کر لی۔ البتہ انہوں نے کچھ دنوں کے بعد فرقان کے والدین سے اس رشتے کے لئے منع کر دیا۔ فرقان کے دل میں انتقام کی آگ بیدار ہو گئی اور اس نے شمیم احمد سے رابطہ توڑ لیا۔ وہ خاموشی سے اپنے اس انتقام کی آگ میں جلتا رہا۔ ادھر شمیم بے روزگار نوجوان تھا۔ بھلا اس سے نسرین کو کیا حاصل ہوگا۔ یہاں تک کہ اس سلسلے میں نعیم احمد صاحب سے بھی گفتگو ہو گئی۔ جمیل احمد نے ان سے کہا کہ اگر ان کا بیٹا کسی قابل ہو گیا تو وہ نسرین کی شادی اس سے کر دیں گے۔ لیکن بدقسمتی نے شمیم کا ساتھ نہیں چھوڑا اور جب سال ڈیڑھ سال گزر گیا تو جمیل صاحب نے نہایت نفرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”شمیم ایک پیسہ تو کما نہیں سکتا اور نسرین سے شادی کرنے چلا ہے۔ فرقان کا رشتہ ٹھکرا کر انہوں نے غلطی کی ہے۔“ ادھر فرقان کا رابطہ اختیار پہلوان سے ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ ان کے لئے الیکشن میں کام کر رہا تھا۔ جب اختیار پہلوان کو اس بات کا علم ہوا کہ صرف نسرین کی ہٹ دھرمی ہے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ نسرین کو بلا کر سمجھائیں گے اور اسے صورتحال بتا کر کہیں گے کہ وہ شمیم احمد کے چکر میں نہ پڑے۔

اختیار پہلوان کا بیان تھا کہ نسرین خود بھی صورتحال سے دل برداشتہ تھی اور اس نے اختیار پہلوان کے سامنے اپنی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہر چند کہ وہ شمیم سے شادی کرنا چاہتی ہے لیکن اپنے والدین کو کتنے عرصے تک روکے گی۔ اس کا گھر اس کے لئے عذاب بنا ہوا ہے۔ سارے گھر والے اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تب اختیار پہلوان نے اس سے کہا کہ حماقت میں نہ پڑے ایک طرف فرقان کے ساتھ ایک پرسکون زندگی اس کی منتظر ہے تو دوسری جانب شمیم احمد کا مسرت زدہ گھرانہ ہے۔ جس میں کھانے پینے تک کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔

نسرین نے کہا کہ وہ سوچ کر جواب دے گی اور اس کے بعد پولیس کے مفروضات تھے۔ یعنی یہ

کہ نسرین، شمیم احمد کے سامنے کوئی مستقبل تو تھا نہیں بیروزگاری اور مسلسل پریشانیوں سے جھلایا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ برفروختہ ہو گیا اور پھر اس نے نہایت دھوکے سے کسی طرح نسرین کو اپنے پاس بلایا۔ اس کے ساتھ زیادتی کی اور پھر اسے قتل کر کے اس کی لاش تھوڑے فاصلے پر پڑی جھاڑیوں میں پھینک دی گئی۔

اس کا کوئی ایسا حتمی ثبوت نہیں ملا تھا۔ جس سے شمیم احمد کے خلاف ٹھوس انداز میں ثبوت پیش کیا جا سکے۔ لیکن اختیار پہلوان نے کچھ ایسے شواہد پولیس کو پیش کئے جن کی بنا پر شمیم احمد ہی اس سلسلے میں سب سے زیادہ مشکوک پایا گیا اور بالآخر پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ اس کے جسم کے لاتعداد زخموں نے اپنے آپ کو مجرم گرداننا شروع کر دیا اور بالآخر شمیم احمد نے وہی بیان دیا۔ اس نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ نسرین کا حصول اس کے لئے ناممکن ہو گیا تھا اور اختیار پہلوان کے سمجھانے بجھانے سے نسرین کچھ بھٹکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ بلکہ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ خواہ مخواہ اس نے شمیم کی خاطر خود کو بدنام کر لیا۔

اور اب پتہ نہیں فرقان اسے قبول کرے گا یا نہیں؟ اس نے یہ بھی کہا کہ فرقان نے اسے اپنے قدموں میں جگہ دینا پسند کیا تو وہ بالآخر ہاں کر دے گی۔ کیونکہ شمیم کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ ان تمام باتوں نے شمیم کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ وہ اپنی محبت کا مقصد حاصل کر لے اور نسرین کو ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سلا دے تاکہ وہ اسے کسی اور کی بیوی کے روپ میں نہ دیکھ سکے۔ فرقان کا بیان تھا کہ شمیم اس رشتے کے بعد جو فرقان کے گھر سے نسرین کے گھر بھیجا گیا تھا۔ فرقان سے بالکل کٹ گیا تھا اور اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا بلکہ ایک دو بار اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر نسرین اس کی نہ ہو سکی تو کسی کی بھی نہیں ہو سکے گی۔ اسے موت کے گھاٹ اتار کر خودکشی کر لے گا۔ یہ حلفیہ بیان فرقان نے پولیس کو دیا تھا۔ ان تمام بیانات کی روشنی میں پولیس نے شمیم کو گرفتار کیا تھا اور اب اپنے طور پر حتمی چالان پیش کرنے کی تیاریاں کر رہی تھی۔

یہ تفصیلات پڑھنے کے بعد صوفی نے موقعہ واردات کا نقشہ اور آس پاس کے لوگوں کے بیانات دیکھے اور اس کے بعد گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وردی کی چھوٹی چھوٹی جیب سے پانوں کی ڈبیہ اور قوام کا بٹوہ نکال کر اس نے پان کی گلوری منہ میں رکھی اور اس کے بعد نیم غنودہ ہو گیا۔ یہ مراقبے کی سی کیفیت تھی۔ نیک محمد ایس آئی اور حوالدار شریف خان، صوفی کے اس انداز سے بہ خوبی واقف تھے۔ اس لئے آنے والے ایک شخص کو باہر ہی روک لیا۔ جو صوفی سے ملاقات کرنے آیا تھا۔

”اماں بھائی انچارج صاحب ! سے بات کرنی ہے۔ مجھے ایک سلسلے میں آپ لوگ جانے کیوں نہیں دیتے مجھے ان کے پاس۔“ آنے والے نے کہا۔

”انچارج صاحب مراقبہ کر رہے ہیں اس وقت ان کے پاس جانا مناسب نہیں ہے۔“

”یہ پولیس تھانہ ہے یا کسی پیروں کی خانقاہ۔ یہاں اب مراقبے ہونے لگے ہیں۔“

”جاؤ بھائی پھر کسی وقت آ جانا۔ اب اگر ہمارا نام نیک محمد اور ان کا شریف خان ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم پولیس کے فرائض بھی سرانجام نہ دیں۔ کھوپڑی گھوم گئی تو تم بھی گھومتے ہی گھر جاؤ گے۔“

آنے والا بڑبڑاتا ہوا چلا گیا تھا صوفی ان تمام حالات سے بے خبر مراقبے میں مصروف تھا۔ نجانے کیا کیا تصورات اس کے ذہن میں آ رہے تھے شمیم احمد کو دیکھ چکے تھے۔ فرقان اور اختیار پہلوان کو ابھی تک

نہیں دیکھا تھا۔ بالآخر فراغت حاصل ہوئی تو اس نے ایس آئی نیک محمد کو طلب کر لیا۔ شریف خان اور شرافت حسین بھی ساتھ ہی آئے تھے۔ اس کیس پر گفتگو ہونے لگی۔ صوفی نے کہا۔

”وہ ہماری جیپ میں پٹرول موجود ہے۔ درویشوں کے کرم سے سرکاری کام سے جا رہے ہیں اس لئے موٹر سائیکل تو مناسب نہیں رہے گی۔“

”آپ کی موٹر سائیکل کے تو پلگ ہی شارٹ ہیں۔ صوفی صاحب جیپ سے ہی چلنا پڑے گا اور پھر سرکاری کام کے لئے تو سرکاری اخراجات ہی مناسب ہوتے ہیں۔“

”غیر ضروری اخراجات سے گریز کرنا موزوں ہوتا ہے۔ درویشوں کے کرم سے۔“

”جا کہاں رہے ہیں آپ؟“ ایس آئی نے پوچھا۔

”میاں وہی عزیزی فرقان احمد سے ملنے اختیار پہلوان سے بھی ملاقات کر لیں گے۔ ذرا صورتحال کا جائزہ لے لیں اب یہ کیس ہمارے ہاتھ میں آیا ہے تو تفتیش تو کرنا ہی ہوگی۔“

”تو پھر وہاں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ صوفی صاحب! فرقان اور اختیار پہلوان کو یہیں تھانے میں بلا لیں۔“

”کچھ غیر اخلاقی حرکت نہیں ہو جائے گی درویشوں کی دعاؤں سے؟“

”صوفی صاحب کی باتیں عجیب ہیں۔ اماں یہاں تو بڑے بڑوں کو آنا پڑتا ہے۔ میں جاتا ہوں آپ اپنا وقار رکھیں خواہ مخواہ محلے میں چکراتے پھریں گے جا کر دیکھتا ہوں“

ایس آئی چند کانسٹیبلوں کے ساتھ چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ فرقان احمد کے ساتھ واپس آیا۔ اختیار پہلوان کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ مصروف تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ شام کو پانچ بجے تھانے پہنچیں گے۔ انچارج سے کہہ دیا جائے کہ انتظار کرے ایس آئی کہنے لگا۔

”بڑا مغرور آدمی معلوم ہوتا ہے۔ صوفی صاحب! پہلوانی کرتا ہے اکھاڑا بنا رکھا ہے۔ شادی نہیں کی ہے گھر بار اچھا خاصا ہے بہت سے پٹھے رکھ چھوڑے ہیں ان دنوں الیکشن کا شوق چڑھا ہوا ہے اور پہلوانی کے ساتھ ساتھ سیاسی کشتی بھی لڑنے کی فکر میں سرگرداں ہے۔“

”درویش رحم کریں اس ملک کی سیاست پر۔“ صوفی نے آہستہ سے کہا پھر فرقان کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کے بعد بڑے نرم لہجے میں بولا۔

”بیٹھ جایئے میاں! کچھ روشنی ڈالنا پسند فرمائیں گے۔ ان واقعات پر درویشوں کے کرم سے؟“

”آپ مجھے حکم دیجئے انچارج صاحب کیا کرنا ہے مجھے؟“

میاں دیکھو بچپن کی دوستی ہے تمہاری شمیم احمد سے چلو ٹھیک ہے مان لیا کہ زر، زن اور زمین بنائے مخاصمت بنے رہے ہیں۔ ابتدائے آفرینش سے درویشوں کے کرم سے لیکن دوستیاں اور محبتیں بھی انسان کی ازلی ساتھی ہیں۔ کیا تمہیں شمیم احمد کی موت کا دکھ نہیں ہوگا۔ اگر پورے وثوق سے یہ بات کہہ سکتے ہو کہ شمیم ہی نسرین کا قاتل ہے تو ہمیں اس کی ذرا تفصیلی وجوہات بتاؤ اور اگر ذرا بھی شبہ ہے تمہیں تو اس بات پر تو کچھ روشنی ڈالو۔ شمیم احمد نعیم احمد کے گھر کا اکلوتا چراغ ہے بجھ گیا تو تنہا رہ جائے گا یہ گھرانہ۔ ہم تمہیں دعوت دیتے

ہیں عزیزی کہ دل سے وہ بغض نکال دو اور ہمیں تفصیلات بتاؤ۔

”مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ یہ بات میں جانتا تھا کہ نسرین شمیم سے محبت کرتی ہے لیکن جناب میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن یہ بہت افسوس ناک حادثہ ہوا ہے شمیم کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”کیا نسرین اختیار پہلوان کے سمجھانے سے کسی حد تک راضی ہو گئی تھی۔؟“

”اس نے کہا تھا کہ سوچ کر جواب دے گی۔“ اس کے چہرے پر پشیمانی کے آثار تھے اور وہ سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ اختیار پہلوان نے اس کے بعد مجھ سے کہا تھا کہ اب کام بن جائے گا بچی کو سمجھ آ گئی ہے۔ یقینی طور پر نسرین نے شمیم سے رابطہ قائم کر کے کوئی تلخ گفتگو کی ہوگی۔“

”ہوں۔ اس کے علاوہ اور کوئی ایسی بات جو تم ہمیں بتا سکو۔؟“

”نہیں جناب آپ یقین فرمائیں مجھے کچھ اور معلوم ہوتا تو میں آپ کو بتا دیتا۔“

فرقان کو جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کے بعد صوفی نہ مانا کیوں کہ شام پانچ بجے تک اختیار پہلوان نہیں آیا تھا۔ صوفی نے ایس آئی نیک محمد سے کہا۔

”میاں نیک محمد کام ہمارا ہے اور پھر یہاں ایک ایک کو بلاتے رہیں گے تو بہت سی باتوں کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکے گا۔ ذرا موقع واردات کا جائزہ بھی لے لیا جائے۔ درویشوں کے کرم سے ہو سکتا ہے اصل جگہ پہنچنے کے بعد درویش رہنمائی کر دیں۔“

”جیسا آپ پسند کریں صوفی صاحب! میں گاڑی تیار کرتا ہوں۔“

”صوفی اپنی وردی میں ہمیشہ احمق لگتا تھا بلکہ شبہ پولیس کی وردی پر تھا لیکن اب صوفی کے جسم کو کیا کیا جائے جس پر صرف کپڑے ہی ڈھو کر ٹانگے جا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ وردی کی جیبیں پھولی ہوا کرتی تھیں۔ یہاں مطلق العنانی تھی۔ کسی کا خوف نہ ڈر چناں چہ پانوں کی بھی محفل جمی رہتی تھی۔ اکثر قوالیوں کی باتیں ہوا کرتی تھیں اور تھانے کا ماحول درحقیقت اس شخص کے کہنے کے مطابق کسی خانقاہ کا ماحول معلوم ہوتا تھا۔

پولیس کی جیپ نیلم نگر میں داخل ہوگئی اور پھر اس جگہ جا کر رک گئی جہاں کی نشان دہی نقشے میں کی گئی تھی۔ جھاڑیوں کا ایک طویل سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ ان پر چھروں کے غول اڑ رہے تھے سامنے کی سمت میں گھروں کا سلسلہ تھا۔ نیلم نگر کچی بستی تھی اور یہاں کے رہنے والے بس ملی جلی کیفیات کے حامل تھے۔ مجموعی طور پر غریبوں کی تعداد زیادہ تھی۔ چھوٹے سے بازار بھی کھلے ہوئے تھے لیکن یہ باقاعدہ نہیں تھے، بس جسے جگہ ملی تھی اس نے دکان بنا ڈالی تھی۔

صوفی کی جیپ جھاڑیوں کے پاس جا کر رک گئی اور صوفی موقعہ واردات کا معائنہ کرنے لگا۔ آس پاس کے چند لوگوں کو طلب کر لیا گیا تھا اور ان سے معلومات حاصل کی جا رہی تھیں۔ نسرین کے قتل کے سلسلے میں لوگ حیران تھے کہ قاتل تو گرفتار ہو چکا ہے پھر یہ تفتیش کس لیے ہو رہی ہے۔ صوفی نے نسرین کا گھر، شمیم احمد کا گھر، اختیار پہلوان کا مکان سب کے بارے میں تفصیلات معلوم کیں اور پھر جائزہ لینے میں مصروف ہو گیا۔ کوئی بھی حتمی بات سامنے نہیں آئی تھی کہ اگر آبرو ریزی کی واردات ہوئی تو کہاں۔ لاش کو اگر جھاڑیوں میں پھینکا تو کس طرح پھینکا گیا جس جگہ یہ جھاڑیاں تھیں وہاں سے نعیم احمد کا مکان کافی فاصلے پر تھا اور درمیان

میں اچھے خاصے پررونق علاقے تھے۔ البتہ اس بات کی گنجائش تھی کہ رات کو یہ واردات کرنے کے بعد لاش کو رات ہی کے کسی حصے میں طویل فاصلہ طے کر کے جھاڑیوں تک لایا گیا ہو اور یہاں ٹھکانے لگا دیا گیا ہو۔

صوفی پوری طرح جائزہ لیتا رہا نعیم احمد کے گھر جا کر اس نے اس گھر کا نقشہ بھی دیکھا، چھوٹا سا مکان تھا، نسیم احمد کی دو بیٹیاں، خود نعیم احمد اور ان کی بیوی اس چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ ایسی کوئی بھی جگہ نہیں تھی جہاں ایسی کوئی واردات کی جا سکے۔

ان پانچ افراد کے لئے یہ مکان ناکافی تھا۔ اب ظاہر ہے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ شمیم احمد کے والدین شمیم احمد کو اس بدکاری کے لئے گھر میں موقع دیں۔ اس کے بعد دوسری جگہوں کا جائزہ لیا گیا اور آخر میں ایک شخص ایک پیغام لے کر پہنچا۔ اختیار پہلوان نے اطلاع بھجوائی تھی کہ تھانیدار صاحب کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ چائے تیار ہے ایس آئی نیک محمد نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"دیکھا آپ نے صوفی صاحب کتنا مغرور ہے یہ اختیار پہلوان خود نہیں آیا۔ چائے پر پولیس کو بلوایا ہے۔"

"اگر وہ مغرور ہے۔ درویشوں کے کرم سے تو ہم غرور کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔ چلیں گے اس کے پاس۔"

بازار سے گزرتے ہوئے صوفی نے ادھر ادھر دیکھا اور دل ہی دل میں کچھ سوچتا بالآخر اختیار پہلوان کے مکان پر پہنچ گیا۔ نیلم نگر جیسی کچی بستی کا جائزہ لیتے ہوئے جب اس خوبصورت مکان پر نظر پڑی تو صاف اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ اختیار پہلوان ہی کا گھر ہو سکتا ہے۔ بڑے سے دروازے سے اندر داخل ہو کر وسیع و عریض اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ جس میں مٹی پڑی ہوئی تھی، اور چار چھ مسٹنڈے مٹی میں لوٹیں لگا رہے تھے۔ اختیار پہلوان ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے حقے کو منہ میں لگائے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔

جوان آدمی تھا بڑی بڑی مونچھیں، سرخ و سفید پھولا ہوا چہرہ، بدن واقعی شاندار تھا، لیکن توند نکلی ہوئی تھی۔ جو غالباً کھانے پینے کے شوق کی وجہ سے تھی۔ کھڑے ہو کر اس طرح صوفی کا استقبال کیا جیسے کوئی بہت عزیز دوست ملنے کے لئے آیا ہو۔ بیٹھنے کیلئے کرسیاں اور مونڈھے لگوا دیئے گئے تھے۔ صوفی سے مصافحہ کر کے اسے بیٹھنے کی پیشکش کی۔

"معاف کرنا تھانیدار جی، بڑی مصروفیات ہیں، بھئی الیکشن کی تیاریاں زور و شور سے ہو رہی ہیں۔"

"اس اکھاڑے میں درویشوں کے کرم سے؟" صوفی نے اکھاڑے کی طرف اشارہ کیا اور اختیار پہلوان نے قہقہہ لگایا۔

"نہیں جی یہ تو اپنا ذاتی شوق ہے، سیاست کا ڈپارٹمنٹ گھر کے پچھلے حصے میں ہے۔"

"اچھا اچھا تو آپ سیاست میں حصہ لے رہے ہیں۔؟"

"لو جی اپنے نیلم نگر کے لوگ اپنے علاوہ کسی اور پر بھروسہ ہی نہیں کرتے۔ سب نے مل جل کر کہا۔ اختیار پہلوان تم سے اچھا بھلا نیلم نگر کے لئے اور کون ہو سکتا ہے۔ ہم میں سے ہر گھر کا ایک ایک آدمی تمہیں ووٹ دے گا بس جی یاروں کی خوشی کے لئے فیصلہ کر لیا کہ کھڑے ہو جائیں گے الیکشن۔ میں ہمارے

لئے کون سی مشکل ہو گی۔"

"یقیناً یقیناً۔"

"ہم نے سنا ہے اس لونڈے کا معاملہ پھر سے کھڑا ہو گیا ہے ارے بھئی جمیل احمد بہت شریف آدمی ہے برا ہوا اس کے ساتھ اور ہم تو ذمے دار قرار دیتے ہیں شمیم احمد کے باپ نعیم احمد کو۔ بیٹے کی صحیح تربیت نہیں کی۔ تھانیدار جی اس نے اور پھر آج کل تو یہ دیکھو لگتا ہے لونڈیوں اور لونڈوں کو عشق و محبت کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں رہ گیا۔ بھئی پہلے بھی انسان زندگی گزارتے تھے شادی بیاہ ہوتے تھے لیلیٰ مجنوں ہوتے تھے مگر کہیں کہیں۔ اب تو آج کل ہر گلی کونے پر چار چھ مجنوں کھڑے ہوتے ہیں اور لیلائیں ہیں کہ ہاتھوں میں جھاڑو لئے کبھی ادھر سے جھانک رہی ہیں۔ کبھی الگنی پر کپڑے ٹانگنے جا رہی ہیں۔ طرح طرح کے بہانے اور پھر یہ ہندوستانی فلمیں توبہ توبہ جی توبہ، توبہ انہوں نے تو ہر گھر میں لیلیٰ مجنوں کی بھرمار کر دی ہے، تھانیدار جی توبہ توبہ۔" اختیار پہلوان نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

صوفی خاموشی سے اختیار پہلوان کی لن ترانیاں سنتا رہا تھا اس نے کہا۔

"شمیم اور فرقان نسرین سے محبت کرتے تھے؟"

"ہاں جی محبت تو کرنی تھی انہوں نے کسی نہ کسی سے نسرین سے ہی کرنے لگے۔"

"شمیم کی بے روزگاری سے تنگ آ کر فیصلہ کیا گیا کہ نسرین کی شادی فرقان سے کر دی جائے۔ درویشوں کے کرم سے۔"

"اس کی تو ہمیں معلوم نہیں جی، مگر جمیل احمد صاحب ملے ضرور تھے ہم سے کہا تھا انہوں نے کہ ان کی لونڈیا کو سمجھائیں۔ ہم نے کہا بھئی بھیج دو ہمارا تو کام ہی سماجی خدمت کرنا ہے۔"

"بچی سے بات کی ہم نے کچے ذہن کی بچیاں ہیں۔ فیصلوں میں عقل سے کام تو لیتی نہیں ہیں۔ سوچ میں ڈوب گئی بس کہنے لگی کہ سوچ کر جواب دوں گی۔ پہنچی ہو گی تھانیدار صاحب! سیدھی شمیم کے پاس اب کیا پتہ اسے نتیجہ کیا ہو گا۔ بس جی شمیم سے برداشت نہ ہو سکا۔ اور اس نے اپنا کام کر دکھایا۔"

چائے کی پیشکش کی گئی لیکن صوفی نے معذرت کر لی۔

"اماں بھائی تھانیدار صاحب کوئی رشوت کی چائے تھوڑی پلا رہے ہیں۔ ہم الیکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں تم لوگوں کے بل ہی پر تو اتنا بڑا کام کریں گے۔ چائے تو ویسے بھی ہر آنے جانے والے کے لئے ہوتی ہے۔"

"ہم ڈیوٹی پر کبھی کسی کی کوئی پیشکش قبول نہیں کرتے درویشوں کی دعاؤں سے۔"

"آپ کی مرضی ہے بڑی مایوسی ہوئی مجھے۔ تھانے پہنچوں گا کسی وقت آپ نے بلایا تھا، مگر ذمہ داریاں اتنی ہیں کہ اس وقت نہیں آ سکا۔"

صوفی اختیار پہلوان کے مکان سے باہر نکل آیا سارے محلے میں تفتیش کرنا چاہتا تھا۔ اب جب ادھر آیا ہے تو کچھ نہ کچھ کام کی بات معلوم ہونی چاہئے۔ شمیم احمد سے گفتگو ہوئی تھی وہ دل کو لگی تھی۔ بس ایک اندازہ تھا اس کا کہ قاتل شمیم احمد نہیں ہو سکتا۔ تو پھر کون ہے؟ فرقان پر بھی شبہ کیا جا سکتا تھا مگر جو حالات

نگاہوں کے سامنے آئے تھے وہ ذرا مختلف ہیں۔فرقان نے بڑی سادگی سے تھانے میں بیان دیا تھا۔

مگر اب صوفی سوچ رہا تھا کہ ذرا گہرائیوں میں جانا پڑے گا۔صوفی جمیل احمد صاحب کے گھر پہنچ گیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ نسرین کی ماں سے ملنا چاہتا ہے نسرین کی ماں آ گئی تو صوفی نے جمیل احمد کو سامنے سے ہٹا دیا اور کہنے لگا۔

''ہمشیرہ عزیزہ بچی کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا۔اس نے یقینی طور پر آپ کا دل ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہوگا۔درویشوں کی دعاؤں سے۔مم میرا مطلب ہے کہ آپ کو بلاشبہ دکھ ہوا ہوگا۔درویشوں کے کرم سے،لل، لیکن آپ قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے میں پولیس کی مدد کیجئے گا۔''

''بتایئے میں کیا کروں، بدنامی الگ ہوئی پلی پلائی بچی خاک میں مل گئی۔'' بیگم جمیل نے زاروقطار روتے ہوئے کہا۔

صوفی نے افسردگی سے گردن ہلائی پھر بولا۔

''آپ لوگوں میں سے کوئی بچی کے ساتھ اختیار پہلوان کے گھر نہیں گیا تھا۔''

''نہیں انہوں نے اسے تنہا ہی بلایا تھا۔بڑے اچھے آدمی ہیں بے چارے۔''

''نسرین وہاں سے سیدھی گھر ہی واپس آئی تھی۔''

''جی ہاں۔''

''پھر وہ شمیم کے گھر گئی تھی؟''

''یہاں سے یہ کہہ کر نہیں گئی تھی بس پریشان تھی، بہت دیر تک اپنے کمرے میں بند رہی پھر جب اٹھ کر جانے لگی تو میں نے پوچھا کہ اب کہاں جا رہی ہو جھلا کر بولی جہنم میں اور اس کے بعد چلی گئی۔''

''درویش کرم کریں۔'' صوفی نے آہستہ سے کہا۔'' پھر......اور اس کے بعد واپس نہیں آئی۔''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''دراصل وہ اپنی سہیلیوں کے گھر بھی آتی جاتی رہتی تھی اور بعض اوقات وہ دیر سے بھی گھر آیا کرتی تھی۔'' میں نے سوچا کہ وہ مہتاب علی کی بیٹی صفیہ سے ملنے گئی ہوگی۔وہی اس کی راز دار سہیلی تھی۔

صوفی یہ نیا نام سن کر چونک پڑا اس نے کہا۔'' مہتاب علی کون ہیں؟''

''دھوبی ہیں وہ جو چھٹے گھر پر دکان نظر آتی ہے نا جس کے دروازے کے سامنے گدھا بندھا ہوا ہے وہی مہتاب علی کا گھر ہے ان کی بیٹی صفیہ سے نسرین کی دوستی تھی۔''

''یہ اچھی بات بتائی آپ نے اچھا بس اتنا ہی پوچھنا تھا آپ سے۔'' اب اجازت دیجئے گا۔

ایس آئی نیک محمد نے صوفی کے باہر نکلنے کے بعد کہا۔

''صوفی صاحب اب کیا اس محلے سے واپسی کا ارادہ نہیں ہے۔اس طرح گھر گھر جا کر معلومات حاصل کرتے نہ تو کسی کو دیکھا اور نہ ہی سنا......''

میاں آرام سے بیٹھو درویشوں کی دعاؤں سے کسی شے کی حاجت ہو تو گاڑی لے کر چلے جاؤ۔

میں ذرا کام کر رہا ہوں، مجھے کام کرنے دو۔''

''چائے پی آئیں ذرا بازار جا کر۔؟''

''ہاں ہاں بہ خوشی درویشوں کے کرم سے۔'' نیک محمد چلا گیا صوفی معلومات حاصل کرتا ہوا مہتاب علی دھوبی کے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔

مہتاب علی گیسو دراز تھے۔لمبے لمبے بال شانوں تک بکھرے ہوئے۔سر پر لمبی سی ٹوپی لگائے ہوئے۔چغہ جیسا لباس پہنے ہوئے لنگی میں ملبوس دوکان پر بیٹھے ہوئے کپڑوں کا حساب کتاب کر رہے تھے۔

صوفی نے سوال کیا تو گردن اٹھا کر دیکھا بڑا ہی وحشیانہ انداز تھا۔جواب دے کر بولے۔''حق اللہ۔'' صوفی کے دانت باہر نکل آئے بڑی محبت سے مصافحہ کیا گردن ہلانے لگے پھر بولے۔

''میاں بلند شہر کے بھانڈ معلوم ہوتے ہو۔وہ جو بہروپ بدل کر دوکان دوکان جاتے ہیں، پہلے رعب جھاڑتے ہیں اور اس کے بعد انعام مانگتے ہیں سچ سچ پولیس والے ہو یا پورے محلے کو الو بنا دیا ہے۔؟'' مہتاب علی نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''آپ مہتاب علی ہیں؟'' درویشوں کے کرم سے۔

''اماں سبحان اللہ کیا انداز ہے کیا واقعی پولیس والے ہو بتا دو تمہیں اللہ کی قسم۔''

''جج......جی ہاں ہوں تھانیدار ہی مگر مہتاب علی صاحب آپ کا یہ حلیہ دیکھ کر میرا اس قدر جی خوش ہوا کہ نا قابل بیان کون سے سلسلے ہیں؟''

''بس جی کرم ہے بزرگوں کا پیر جمال شاہ کے عقیدت مند ہیں کیا بات تھی پیر کی، حق اللہ حق اللہ۔حق اللہ۔''

صوفی نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اٹھائیں اور شانے اچکانے لگا۔پھر وہ اطمینان سے دکان میں گھس کر لکڑی کے ایک چھوٹے سے اسٹول پر بیٹھ گیا۔

''پیر جمال شاہ کا شجرہ کہاں جا کر ملتا ہے؟'' مہتاب علی نے بھی کام دھندہ چھوڑ دیا اور پیر جمال شاہ کا شجرہ بتانے لگ گیا اور اس کے بعد جو درویشوں ولیوں اور بزرگوں کا سلسلہ شروع ہوا تو نہ جانے کہاں سے کہاں تک پہنچا۔صوفی سب کچھ بھول گیا تھا بہت دیر کے بعد بات اس موضوع پر آئی۔مہتاب علی نے کہا۔

''سنا ہے جمیل احمد صاحب کی لونڈیا کے بارے میں تحقیقات کرنے آئے ہو، پہلے تو دوسرے پولیس والے آئے تھے، یہ تو نہ یہ موچھیں تم جیسا تھانیدار صوفی پہلا پہلا ہی دیکھا ہے۔''

اماں مہتاب علی حلیے سے کیا ہوتا ہے۔درویشوں کی دعاؤں سے بس تھانیداری کر لی ہے۔روٹی پانی کا خرچہ چل جاتا ہے۔درویشوں کے کرم سے۔''

''حق اللہ......حق اللہ۔''

''یہ نسرین کا کیا قصہ ہے کچھ تھوڑی بہت معلومات حاصل ہو سکے گی۔'' مہتاب علی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے کچھ دیر مشکوک نگاہوں سے صوفی کو دیکھتے رہے، پھر آہستہ سے بولے۔

''کہتے ہیں کہ پولیس کی نہ اگاڑی اچھی نہ پچھاڑی دور ہی رہتا ہوں بھیا پولیس والوں سے۔''

''ہمارا آپ کا پولیس والوں کا رشتہ کہاں ہے مہتاب علی صاحب درویشوں کی دعاؤں سے ہمارا تو مسئلہ ہی روحانی ہوگیا ہے بس یہ تو ڈیوٹی پوری کرنے والی بات ہے۔''

''قاتل چاہئے۔'' مہتاب علی نے درویشانہ انداز میں کہا۔

''عنایت فرما دیجئے، درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ مہتاب علی صاحب چند لمحات سوچتے رہے پھر اپنی جگہ سے اٹھے اسٹول ایک کونے میں لے جا کر رکھا ادھر ادھر دیکھا اسٹول پر چڑھ گئے اوپر سے کوئی چیز اتاری ایک لکڑی کی صندوقچی تھی اس میں سے ایک پڑیا نکالی اور پھر پڑیا کھول کر صوفی کے سامنے رکھ دی۔ پڑیا میں ایک چھوٹا سا سونے کا بندہ ٹکا ہوا تھا۔

''لیجئے صوفی میاں! قاتل حاضر ہے۔''

صوفی نے بندہ ہاتھ میں لے لیا اسے بہ غور دیکھا پھر مہتاب علی کی صورت دیکھنے لگا بہ خدا سمجھے نہیں درویشوں کے کرم سے۔''

''عزیزی اس سلسلے میں زندگی بھر زبان بند رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر تم ہو ہی درویش زادے کہ زبان کھلوا لی تم نے مہتاب علی کی۔ بس آرام سے بیٹھو تفصیل بتاتے ہیں تمہیں کیا سمجھے۔ اصل میں پولیس کا رویہ لوگوں کے ساتھ اتنا برا ہوتا ہے کہ اگر کسی کو کوئی سچی بات معلوم بھی ہوتی ہے تب بھی وہ نہیں بتاتا اور کان پکڑ کر کونے میں گھس جاتا ہے وجہ یہی کہ پولیس کو بتاؤ اور مصیبت میں پھنس جاؤ۔ ایسی ایسی پٹخنیاں کھانی پڑتی ہیں کہ رہے نام اللہ کا۔ میں نے بھی اپنی لونڈیا سے کہا کہ بیٹا خبردار جو کسی کے سامنے زبان کھولی زبان کھینچ کر ہتھیلی پر رکھ دوں گا۔ وہ بے چاری تو چپ ہوگئی۔ مگر تم نے ہماری زبان کھلوا لی صوفی میاں اماں پکے ہو قسم اللہ کی پکے پولیس والے ہو، آنکھوں میں گھس کر کلیجے میں گھس جانے والوں میں سے ہو، ورنہ مجال تھی کسی کی جو ہم سے ایک لفظ بھی پوچھ لیتا۔''

''اب جو معلومات آپ کو حاصل ہیں ہمیں مرحمت فرما دیجئے درویشوں کے کرم سے۔''

''قاتل اختیار پہلوان ہے۔ ان گناہگار آنکھوں نے کیا نہیں دیکھا۔ اس محلے میں اماں زندگی گزر گئی صوفی میاں۔ وہ عیاشیاں کرتا ہے، پیسے کے بل پر، لونڈے پھانس رکھے ہیں۔ محلے کے بچوں کو بگاڑتا ہے۔ رات کی تاریکیوں میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔ اکثر لوگ جانتے ہیں مگر گریز کرتے ہیں۔ قصور خود جمیل احمد کا ہے، فیصلے کے لئے لونڈیا کو اکیلے بھیج دیا۔

معلوم تھا اسے اختیار پہلوان کیا چیز ہے۔ بس چلی گئی نسرین اس کے ہاں۔ فرقان تو آج کل اس کے الیکشن کے لئے کام کر ہی رہا ہے۔ اس لئے ناک کا بال بنا ہوا ہے۔ اختیار پہلوان نے پہلے تو اس پر دباؤ ڈالا کہ وہ مان جائے فرقان کے رشتے پر نسرین بولی اسے وقت دیا جائے تو کہا کہ خاموشی سے اس بات کا جواب لے کر اختیار پہلوان کے پاس پہنچ جائے یہ بات شاید فرقان کو بھی نہیں پتہ چلی۔ اب وہ بے چاری لونڈیا میری بیٹی کی دوست سیدھی اس کے پاس آئی اور اس سے باتیں کرتی رہی۔ صفیہ نے کہا دیکھو نسرین اگر سچی محبت ہے تجھے شیم سے تو صاف منع کر دے کہ نہیں کرنی تو نے شادی وادی فرقان سے۔

جب ماں باپ کے سامنے زبان کھول ہی دی۔ تو اب اس زبان پر قائم رہ، فرقان سے تیری

شادی ہو بھی گئی تو کیا فرقان یہ بات بھول جائے گا کہ یہ شیم سے محبت کرتی رہی ہے، ساری زندگی جھلسا جھلسا کر مارے گا۔ اطمینان ہو گیا تھا لونڈیا کو اور اس کے بعد جانتے ہو کہاں گئی وہ سیدھی اختیار پہلوان کے گھر یہ بتانے کے لئے کہ وہ کسی بھی قیمت پر فرقان سے شادی نہیں کرے گی، کیا سمجھے بس اس کے بعد آگے کا کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہوا۔

اماں تم تو تھانیدار ہو ہم جیسے کوڑھ مغزوں سے پوچھو تو ہم بتا سکتے ہیں کہ کیا ہوا ہوگا اور بس جو ہونا تھا اس بے چاری کے ساتھ وہ ہوا۔ قتل نہ کر دیتا وہ ظالم تو کیا دنیا سے یہ کہلواتا کہ وہ بدکار ہے۔ آخر اسے الیکشن میں کھڑے ہونا ہے پھنس گیا بے چارہ نعیم احمد کا لونڈا دعا کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے بھیا! ہم، پولیس سے بھی ڈر لگے ہے اور غنڈہ گردی سے بھی مگر اماں کہاں سے مصیبت بن کر آ گئے ہمارے سر پر۔''

''درویش کرم کریں گے واقعی آپ نے بڑا عجیب و غریب انکشاف کیا ہے لیکن بے فکر رہیں پولیس کے ہاتھوں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا آپ کو یہ میرا وعدہ ہے درویشوں کی دعاؤں سے اس بندے کا کیا قصہ ہے،؟''

''نسرین کا ہے میاں ہمیں اس قصے کا اور یقین ہو گیا۔ اختیار پہلوان کے کپڑے ہمارے ہی ہاں دھلنے آتے ہیں پتہ ہے بندہ کہاں ملا۔؟''

''کک کہاں درویشوں کے کرم سے۔'' صوفی نے منہ پھاڑ کر پوچھا۔

''اختیار پہلوان کی قمیض کی بغل کے پاس اٹکا ہوا تھا، بندے کا کانٹا۔

نہیں دیکھا ہوگا۔ کپڑے آ گئے دھلنے کے لئے ہم تلاشی وغیرہ لے لیتے ہیں کپڑوں کی بندہ اٹکا ملا جمیل احمد کی لونڈیا کا قتل ہو چکا تھا دماغ ہمارا اس طرف لگا ہوا تھا۔ اپنی بیٹی صفیہ کو بندہ دکھایا تو اس نے صاف پہچان کر لیا کہ نسرین کا ہے۔ اب ماں باپ تو ظاہر ہے بے چارے لگے ہوئے ہیں۔ بیٹی کی مصیبت پر غور ہی نہیں کیا ہوگا گر در گیا ہوگا کہیں یا جھاڑیوں میں پڑا ہوگا۔ ایک تو کان ہی میں مل گیا تھا۔ سوچا تھانیدار جی یہ بندہ اختیار پہلوان کے کرتے کی بغل میں کیسے اٹکا ہوا تھا۔ کچھ تو ہوگا۔''

صوفی نے آنکھیں بند کر لیں اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بدبدانے لگا پھر اپنے سینے پر پھونک ماری اور جیب سے پانوں کی ڈبیا نکالی اس نے دیکھ لیا تھا کہ مہتاب علی بھی پان کھانے والوں میں سے ہیں۔ مہتاب علی پانوں کی ڈبیا دیکھ کر خوش ہو گئے۔

''یہاں ایک بات ہے، ہو وضعدار قوام کون سا کھاتے ہو؟''

''تین سو نمبر کا درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''اے سبحان اللہ۔ سبحان اللہ یہ ہے ذوق کی بات ذرا چٹاؤ ہمیں بھی۔'' صوفی نے بڑے ادب سے پان کی گلوری پیش کر دی اور اس کے بعد چھالیہ تمباکو پھر کہنے لگا۔

''یہ بندہ آپ اپنی تحویل میں رکھنا چاہتے ہیں درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''کیا کرنا ہے..... کیا کرنا ہے، ہمیں مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں میاں اگر واپس کرتے جمیل کو تو بات الگ بگڑتی پھنستے الگ مصیبت میں بس حلق میں اٹکا ہوا تھا، رکھ چھوڑا تھا کہ سوچ لیں گے آگے چل کے آپ کو چاہیے آپ لے جائیں۔''

"پولیس کی تفتیش میں کام آئے گا آپ بالکل مطمئن رہیں۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے مگر ایک بات سن لو بھائی کسی بھی رشتے ناطے سے درویش اور ولیوں کے ناطے سے ہمیں مصیبت میں مت پھنسانا، جوان لونڈیا کے باپ ہیں کہاں لڑتے پھریں گے۔ ان غنڈوں سے بس میاں ہاتھ جوڑتے ہیں تمہارے سامنے۔"

"مطمئن رہیں قبلہ مہتاب علی بالکل مطمئن رہیں آپ نے تو مسئلہ ہی حل کر دیا ہے۔" صوفی نے خوشی کے عالم میں کہا اور وہاں سے باہر نکل آیا جیپ کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی، نیک محمد اور حوالدار شریف محمد وغیرہ کانسٹیبلوں کے ساتھ موجود تھے اور چائے پی کر آ چکے تھے صوفی جیپ میں جا بیٹھا اور اس نے ڈرائیور سے کہا۔

"پھر سے اختیار پہلوان کے گھر چلو۔"

جیپ دوبارہ اختیار پہلوان کے گھر کے سامنے جا کر رکی۔ اختیار پہلوان باہر آ گیا تھا، صوفی نے سروس پستول نکال کر اس کے سینے کی جانب تان دیا اور اپنے ساتھ کانسٹیبلوں کی جانب رخ کر کے بولا۔

"ہتھکڑیاں ڈال دو پہلوان صاحب کی کلائیوں میں درویشوں کی دعاؤں سے۔"

اختیار پہلوان صاحب ہکا بکا رہ گئے تھے۔ کانسٹیبلوں نے صوفی صاحب کے حکم کی فوراً تعمیل کی تھی۔ اختیار پہلوان نے خوب ہی اچھل کود مچائی۔

"اماں یہ، کیا کر رہے ہیں تھانیدار جی جانتے ہو میں کون ہوں اختیار پہلوان ہے میرا نام پولیس کی وردی میں نہ ہوتے تو اولاد کی قسم ہڈیاں پیس کر رکھ دیتا۔ اماں سن رہے ہو یہ بدتمیزی مت کرو نہیں تو یہ وردی اتار کر سامنے آ جاؤ اولاد کی قسم ٹکڑے ٹکڑے کر کے نہ بیچوں تو میرا نام اختیار پہلوان نہیں ہے۔ اماں محلے والو! تم دیکھ رہے ہو کیا زیادتی ہو رہی ہے میں ہمیشہ تمہارے کام آنے والوں میں سے ہوں ساتھ دیا ہے میں نے ہمیشہ تمہارا جلوس تیار کرو تھانے پہنچ جاؤ جلوس بنا کر نعرے لگاؤ کہ اختیار پہلوان کو رہا کرو دیکھو! تھانیدار حشر کر دوں گا تمہارا۔ کیا بدتمیزی ہے یہ۔؟"

"قبلہ تشریف لے چلیئے کیا فائدہ ہم اس ڈنڈے سے آپ کی ساری پہلوانی اس اکھاڑے میں ہار دیں گے اور اس کے بعد آپ کو گھسیٹتے ہوئے لے چلیں گے جو کچھ کہنا ہے تھانے چل کر کہیئے گا۔ چلو انہیں اپنی گاڑی میں بٹھاؤ درویشوں کے کرم سے۔" اور تھوڑی دیر کے بعد اختیار پہلوان کو لئے ہوئے تھانے کی جانب جا رہی تھی۔

محلے بھر میں ہنگامہ ہو گیا بہت سے گرگے تھے اختیار پہلوان کے انہوں نے راستہ روکنا چاہا لیکن کانسٹیبلوں نے بندوقیں تان لیں تھیں اختیار پہلوان چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"سازش ہوئی ہے میرے خلاف الیکشن میں میرے مخالف امیدواروں نے یہ سازش کی ہے منشی صاحب کو فون کرنا جلوس کی تیاری کرنا۔"

پولیس جیپ اختیار پہلوان کو لے کر تھانے میں داخل ہو گئی اور انہیں لاک اپ کر دیا۔

نیک محمد، شریف خان اور شرافت حسین حیران تھے۔ انوکھا تھانیدار تھا پہلی تفتیش کے لئے نکلا اور مجرم کو ہتھکڑی لگا کر لے آیا تھا۔ شرافت حسین نے شریف خان کے کان میں کہا۔

"صوفی صاحب! نے بہت بڑے آدمی پر ہاتھ ڈال دیا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔"

"میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سوچ سمجھ کر کام کرنا چاہیئے تھا۔ محلے میں جو گڑبڑ ہو رہی تھی وہ رنگ لائے گی تم دیکھ لینا شراف حسین۔"

شرافت حسین گردن ہلا کر خاموش ہو گیا تھا۔ صوفی نے سارا دن اختیار پہلوان سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اختیار پہلوان تھانے میں اچھل کود مچاتا رہا۔ ادھر دس بارہ گرگے اکٹھے ہو کر تھانے کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ اور اختیار پہلوان کی رہائی کے لئے نعرے لگا رہے تھے مگر صوفی نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی۔ البتہ یہ کہہ دیا تھا اس نے اگر ذرا بھی بدتمیزی کی تو گولی چلوا دی جائے گی، خیال رکھا جائے۔

رات ہو گئی صوفی اطمینان سے اپنے کاموں میں مصروف رہا تھا کوئی عمل نہیں کیا تھا اس نے البتہ اختیار پہلوان کو شور مچانے سے بھی نہیں روکا تھا۔ لاک اپ میں اچھلتا کودتا پھر رہا تھا کئی بار صوفی کو چیلنج کر ڈالا تھا۔

دوسرے دن گیارہ بجے کے قریب چند افراد پہنچے جن میں ایک شخص نمایاں حیثیت کا حامل تھا۔ بڑے کڑے تیوروں کے ساتھ صوفی کے سامنے پہنچا۔

"تم اس تھانے کے انچارج ہو؟"

"درویشوں کے کرم سے۔" صوفی نے مؤدبانہ انداز میں کیا۔

"کسی پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس کی حیثیت کا اندازہ کرنا ضروری نہیں ہے کیا؟"

"حضور انور کا اسم گرام؟"

"میں جہاں سے آیا ہوں بس اس کے بارے میں بتا دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ فوراً اختیار پہلوان کو لاک اپ سے نکالو اور میرے ساتھ روانہ کر دو ورنہ خواہ مخواہ تمہاری نوکری خطرے میں پڑ جائے گی۔ ابھی ہم نے یہ کام غیر سرکاری پیانے پر کیا ہے۔ اگر بات زیادہ اوپر تک پہنچا دی تو تمہیں نقصان پہنچ جائے گا۔ یہی نہیں ہتک عزت میں تمہیں سزا بھی ہو سکتی ہے۔"

"حضور کا اسم شریف درویشوں کی دعاؤں سے۔" صوفی نرم لہجے میں سوال کیا۔

"میں نے کہا ناں جس شخص کا نام میں نے تمہارے سامنے لے لیا ہے، اسی پر اکتفا کرو۔" صوفی نے شریف خان کو بلایا اور کہنے لگا۔

"عالی حضرت تشریف لائے ہیں۔ اسم شریف نہیں بتاتے اس لئے شریف خان انہیں اندر لے جاؤ اور بند کر دو۔" وہ شخص اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا...... شریف خان نے کانسٹیبلوں کو اشارہ کیا۔ آنے والا آپے سے باہر ہو گیا مگر صوفی نے اسے اندر کر دیا۔

تقریباً ڈھائی بجے ایک صاحب تشریف لائے یہ غالباً ان لوگوں کے اشارے پر پہنچے تھے جو پہلے آدمی کی گرفتاری کے بعد واپس چلے گئے تھے۔

اچھل کود انہوں نے بھی بہت مچائی صوفی کو طرح طرح کی دھمکیاں دی گئیں اور نتیجے میں پہلے آدمی کے پاس پہنچ گئے تھانے کا سارا عملہ ششدر تھا اور اس بات کا یقین کر چکا تھا کہ اب کم از کم اس پورے سٹاف کو تبدیل ہونا پڑے گا۔

بہر حال تن بہ تقدیر تھے۔ نئے انچارج صاحب جو کچھ بھی کریں یہ ان کا اپنا عمل ہے۔

کوئی چار بجے کا وقت تھا، صوفی کو اس دوران کوئی ٹیلی فون موصول نہیں ہوا تھا۔ جو لوگ دھمکیاں دینے آئے تھے وہ غالباً ذاتی بنیاد پر ہی یہ سب کچھ کر رہے تھے لیکن جو نام وہ اپنے ساتھ لائے تھے وہ بڑے بڑے نام تھے، صوفی نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ آئی جی صاحب نے جو اختیار دیا ہے ذرا دیکھنا ہے کہ خود اس سلسلے میں کس قدر با اختیار ہیں بہر طور شام کے وقت صوفی نے اختیار پہلوان کو تھانے کے عقبی حصے میں جہاں درختوں کی چھاؤں میں کچی زمین کا ایک بڑا ٹکڑا تھا، طلب کر لیا۔ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ صوفی اطمینان سے ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اختیار پہلوان کو بیٹھنے کی پیش کش کی گئی تو وہ خونی نگاہوں سے صوفی کو دیکھنے لگا اور پھر اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''دیکھ بھئی تھانیدار بڑا تیس مار خان بنا ہوا ہے ابھی تو لیکن آنے والے وقت کو تقدیر کا لکھا سمجھ لے نہیں چھوڑوں گا...... نہیں بچے کا حساب کتاب تو میں تیرا وہیں اپنے محلے میں کر دیتا، اگر پولیس کی وردی میں نہ ہوتا۔''

''اختیار پہلوان بات مردوں والی ہونی چاہیے۔ درویشوں کے کرم سے پہلا سوال اگر ہم تم سے یہ کریں کہ تم باپ دادا کی شناخت رکھتے ہو۔ درویشوں کی دعاؤں سے یا نہیں تو برا مت ماننا، سوال تو سوال ہی ہوتا ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اختیار پہلوان نے کہا۔

''اپنے باپ کے بیٹے ہونا۔''

''مجھے گالی دے رہے ہو؟''

''ابھی یہ گالی گالی نہیں ہے درویشوں کی دعاؤں سے ہاں اگر جو کچھ زبان سے کہو اور اسے پورا نہ کرو تو پھر یہ پکی گالی بن جائے گی۔'' ''میں پوچھتا ہوں مطلب کیا ہے تمہارا۔''

''اگر تمہارا غرور ٹوٹ جائے تو سچ بولنا پسند کرو گے درویشوں کے کرم سے؟''

''کیا مطلب؟''

''پہلوان ہو تم اور تم نے کہا تھا یہ وردی میرے بدن پر نہ ہو تو میری ہڈیاں چور چور کر دو گے۔''

''تمہارا مطلب میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھانیدار جی؟''

''میاں کشتی لڑو ہم سے...... پچھاڑو ہمیں تو قسم ایمان کی چھوڑ دیں گے تمہیں۔ پٹ گئے ہم سے تو پھر سچ بول دینا اور اگر اس پر بھی جھوٹ بولا تو پھر مرحومہ کی شخصیت داغدار ہو جائے گی۔ درویشوں کی دعاؤں سے ہمارا مطلب تمہاری والدہ سے ہے۔''

اختیار پہلوان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر صوفی کو دیکھنے لگا۔ پھر ہیجانی انداز میں ہنس پڑا۔

ایک بات سنو تھانیدار جی کیا جو گالی تم نے مجھے دی ہے اس پر تم بھی عمل کر سکتے ہو؟''

''مطلب؟''

''اگر اپنے پیروں سے کھڑے ہو گئے تو سچ بول دیں گے، اگر کھڑے نہ ہو سکے تو پھر نوکری چھوڑ دینا، ہمیں تو چھوڑنا ہی پڑے گا تمہیں۔''

''وعدہ ہے مگر بات سچائی کی ہو گی۔''

''ہاں بات جب ماں کی عزت پر آ پڑی ہے تو پھر سچ ہی بولیں گے لیکن شرط وہی ہو گی۔''

صوفی نے وردی اتارنا شروع کر دی اور ایس آئی نیک محمد شرافت حسین، شریف خان اور تھانے کے دوسرے سپاہیوں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ ایک طرف اختیار پہلوان پلے پلائے جسم کا مالک جو دیکھنے ہی میں دیو قامت...... دوسری طرف لمبا، پھٹا ہوا بانس جس کے بارے میں بس یہی کہا جاتا تھا کہ اپنے پیروں پر چل لیتا ہے۔ تو بہت ہے پھر وردی کے نیچے سے جو جسم برآمد ہوا تھا۔ اس نے کانسٹیبلوں کو منہ دبا کر ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ایک عجیب و غریب منظر نگاہوں کے سامنے تھا اقبال جرم کرانے یا کرنے کا جو نیا طریقہ سامنے آیا تھا وہ ناقابل یقین تھا اور اگر اس کے بارے میں کہیں اور معلوم ہوتا تو لطیفہ ہی بن جاتا۔ کشتی کے اصولوں کے مطابق دونوں فریق آمنے سامنے آ گئے ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈالا گیا۔

اختیار پہلوان نے فوراً ہی گردن دبوچ کر کلا جنگ مارنے کی کوشش کی لیکن صوفی نے اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے سر سے اونچا اٹھا لیا اور کمر پر لاد لیا۔ پھر ایک دم چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا، اختیار پہلوان زور سے زمین پر گرا تھا۔

اور صوفی دیسی پہلوانی داؤ کے تحت اس کے اوپر چھا گیا تھا۔ اختیار پہلوان نے فوراً ہی پلٹی کھائی اور سینہ زمین پر ٹکا لیا لیکن صوفی نے اس کی پشت پر ایک قلابازی کھا کر پیچھے سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا۔

یہ بھی ایک ناقابل یقین منظر تھا ہڈیوں کے اس ملغوبے نے اختیار پہلوان کو ایک بار پھر اسی انداز میں اٹھایا، اختیار پہلوان زمین پر گرنے کے بجائے پلٹی کھا کر سیدھا ہوا تو صوفی نے اس کی گردن پر ہاتھ ڈال کر دھوبی پاٹ لگایا اور اختیار پہلوان اس بار اپنے آپ کو نہ بچا سکا۔ اس کے منہ سے کھکھیائی ہوئی آواز نکلی۔

''اماں خلیفہ زمین پکی ہے روک روک کے۔''

لیکن صوفی نے دیسی کے ساتھ ساتھ انگریزی داؤ بھی استعمال کرنا شروع کر دیئے اور فوراً ہی اختیار پہلوان کی ٹانگوں پر گرہ باندھ کر بوسٹن کریب لگایا اور اختیار پہلوان کے حلق سے دہاڑیں نکلنے لگیں۔

''اماں قسم سے مر جاؤں گا اماں تھانیدار جی، اماں چھوڑو اماں وعدہ پورا کرنے کو تیار ہوں، اماں خلیفہ، اماں بھائی صاحب چھوڑیو، چھوڑیو، بھیئے، ریڑھ کی ہڈی گئی، تمہیں اللہ کی قسم چھوڑ دو پہلوان چھوڑ دو۔''

چاروں طرف سے قہقہے ابھر رہے تھے، اب بھلا اس کا کیا سوال تھا کہ وہ اپنی ہنسی روک سکیں۔

صوفی نے اسے چھوڑ دیا۔

اختیار پہلوان کمر پر ہاتھ رکھے کراہ رہا تھا۔ اس نے صوفی کو گھورتے ہوئے کہا۔

''اماں کس کے پٹھے ہو؟''

''بس یہ ہی سوال نہ کرنا درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

اس کیس کا اختتام بھی ناقابل یقین انداز میں ہوا۔ اختیار پہلوان جیسے اس کے بعد فرشتہ بن گیا تھا۔

اس نے اعتراف کیا کہ نسرین کا قاتل وہی ہے۔

اپنی ہوس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے دوسری چال چلی۔ اصل میں نسرین کو دیکھ کر وہ بے اختیار

ہو گیا تھا۔ پہلی بار جب وہ سمجھانے بجھانے سے چلی گئی تو اختیار پہلوان نے اسے دوبارہ طلب کیا تھا کہ اگر اسے قائل کر سکی تو اس کی شادی شمیم سے ہی کرائی جائے گی۔

لیکن اصل میں اختیار پہلوان نے دھوکے سے اسے اپنے پاس بلوایا تھا اور پھر جب وہ نسرین کو دھوکہ دے چکا تو اس کی زندگی مناسب نہ سمجھی اور اسے قتل کر کے لاش جھاڑیوں میں پھینک دی۔

غرض یہ کیس حل ہو گیا تھا جن لوگوں کو بند کیا گیا تھا انہیں تیسرے دن ہی رہائی نصیب ہوئی۔

صوفی نے انہیں یہ کہہ کر چھوڑا تھا کہ اگر آئندہ سرکاری معاملات میں مداخلت کی تو مجرموں کے ساتھ ہی پھانسی کے تختے پر پہنچنا پڑے گا۔ کم از کم اس تھانے میں آنے والے کسی کیس کے بارے میں سفارش نہ لائی جائے۔

بورڈ پڑھ لیا جائے جس پر لکھا ہے کہ

رشوت اور سفارش لے کر اس تھانے میں مت آنا ورنہ واپس نہیں جاؤ گے، درویشوں کے کرم سے۔

''بحکم صوفی''

آغاز الدین کے نام کے ساتھ پوری کہانی یاد آ گئی تھی۔ گزارے ہوئے وقت کی بہت سی ایسی داستانیں تھیں جن کے خصوصی کردار وقت کے ساتھ ساتھ بہت دور ہو گئے تھے۔ بہر حال وہ ممن خان کے ہوٹل کی جانب بڑھ گیا، آغاز الدین وہاں موجود تھے اور ان کے گرد مجمع لگا ہوا تھا۔ کیڈلک تو ویسے بھی شان دار تھی اور آغاز الدین بھی اتنے ہی شان دار تھے اور کسی نواب کو صوفی کی تلاش میں آتے دیکھ کر ممن خان اور ساتھیوں کے سینے فخر سے پھول گئے تھے، پھر صوفی بھی اچانک ہی پہنچا تھا۔ ایک عجیب سا منظر پیدا ہو گیا تھا۔ آغاز الدین بڑی محبت اور پیار سے اس سے ملے اور بہت سی باتیں ہوتی رہیں، وہ صوفی کے ساتھ اس کے گھر میں آ گئے تھے اور صوفی سے اس کے حالات پوچھتے رہے تھے۔

صوفی نے تمام تفصیلات بتا دی تھیں۔ آغاز الدین نے کہا۔

''تم اتنے ہی فعال ہو جتنا ہونا چاہیے تھا۔''

''یہ سب کچھ تو زندگی کے ساتھ ہے جناب! درویشوں کی دعاؤں سے۔'' صوفی نے جواب دیا تھا۔

''خیر چھوڑو! میں تمہارے پاس بہت ہی اہم کام سے آیا ہوں۔''

''حکم فرمائیے میں دل و جان سے حاضر ہوں۔''

''یہاں نہیں یا تو تم اگر ابھی فرصت سے ہو تو میرے ساتھ چلو یا پھر فرصت ملتے ہی میرے پاس ہوٹل کنگ پہنچو۔ کنگ کے روم نمبر تیئس (23) میں میرا قیام ہے۔''

''جیسا آپ پسند کریں درویشوں کے کرم سے۔''

''تو پھر ابھی چلو۔'' نواب آغاز الدین صوفی کو لے کر اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔ کمرے میں پہنچنے کے بعد انہوں نے کچھ مشروبات طلب کیے اور اس کے بعد صوفی کے سامنے بیٹھ گئے۔

''ایک الجھن پیش آ گئی تھی میں نے کسی سے وعدہ کر لیا کہ میں اس کی مدد کروں گا۔ اصل میں یوسف خان میرا بہت ہی قدیم دوست ہے بے شمار معاملات میں ہم دونوں نے ایک ساتھ وقت گزارا ہے۔ وہ ایک پہاڑی علاقے کے سردار کا بیٹا ہے۔ دو بھائی تھے ایک اینٹی اسٹیٹ سرگرمیوں میں ملوث ہو گیا اور

آخر کار موت کا شکار ہو گیا۔ یوسف خان اپنے بھائی کی وجہ سے ان سارے معاملات میں الجھا اور ایک تنظیم کے چکر میں پڑ گیا جو بین الاقوامی طور پر شدید مجرمانہ کارروائیاں کرتی رہتی ہے اور بہت ہی خوف ناک تنظیم ہے۔ یوسف خان اس کے جال میں جکڑ گیا۔ اس کے بھائی کی بیٹی ثوبیہ خان بھی اس کے ساتھ تھی۔ ان واقعات میں ملوث ہو گئی تھی۔ بہر حال وہ بڑے مشکل حالات سے گزرے اور اس کے بعد مختلف واقعات سے ہوتے ہوئے نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان لوگوں نے یوسف خان کو قتل کر کے اس کی جگہ اپنے ایک آدمی کو ہم شکل بنا کر وہاں پہنچا دیا اور یوسف خان کو اپنی دانست میں قتل کر دیا۔

مگر یوسف خان بچ گیا یہاں اس کا ایک فلیٹ ہے وہ اس فلیٹ میں پہنچا اور اس کے بعد اس نے مجھ سے رابطہ قائم کیا یہ تفصیلات اس نے مجھے بتائیں اور مجھ سے کہا کہ وہ ہر قیمت پر ملک دشمن سرگرمیوں سے گریز کرنا چاہتا ہے اور مدد کا خواہش مند ہے۔ صوفی میں تمہارے پاس چلا آیا۔ بتاؤ اب کیا کرنا چاہیے۔''

''درویشوں کو رحم کرنا چاہیے۔'' صوفی نے جواب دیا اور نواب آغاز الدین مسکرانے لگے۔

''تم آج بھی پیر پرست ہو۔''

''مرتے دم تک رہوں گا درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''ضرور رہو بھلا کون تمہیں روک سکتا ہے لیکن اب بتاؤ آگے کیا کرنا ہے۔''

''آگے تو بہت کچھ کرنا ہے جناب! آپ کو تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔'' صوفی نے کہا۔

''مگر میں یہاں تمہارے پاس اسی مقصد کے تحت آیا ہوں۔''

''میں مکمل طور پر آپ سے رابطہ رکھوں گا ہر کام کے لیے کوئی نہ کوئی گراؤنڈ بنانا پڑتا ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ مجھے یہ گراؤنڈ بنانا ہے۔''

''تو کیا میں یہیں قیام کروں؟''

''میرا ایک گھر ہے اگر اسے اس قابل سمجھیں تو!...... خیر چھوڑیئے یہی جگہ آپ کے لیے مناسب ہو گی۔'' صوفی مضطرب ہو گیا تھا اسے تعجب تھا کہ شازیہ نے ابھی تک یہ کیوں نہیں بتایا کہ یوسف خان اپنے فلیٹ پر پہنچ چکا ہے وہ فوری طور پر شازیہ سے رابطہ قائم کرنا چاہتا تھا۔

نواب آغاز الدین کے پاس سے واپس آ کر اس نے سب سے پہلا کام یہ ہی کیا تھا۔ ٹرانسمیٹر پر شازیہ کی آواز سنائی دی۔

''چھوٹے بابا میں شدید سنسنی کا شکار تھی اور بس آپ کو مخاطب کرنا ہی چاہتی تھی۔''

''ہوا کیا ہے درویشوں کی دعاؤں سے۔'' ثوبیہ نے بھی وہ ہی کہانی سنائی تھی جو آغاز الدین صاحب نے سنائی تھی یعنی شازیہ نے ثوبیہ کی حیثیت سے۔''

''اسے تم پر شبہ تو نہیں ہوا؟''

''بالکل نہیں...... میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ وہ خاصا پریشان ہے، اس کا کہنا ہے کہ اب وہ ان تمام سرگرمیوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے لیکن جو کچھ اس کے ہاتھوں ہو چکا ہے وہ مٹ نہیں سکتا اور چھوٹے بابا جو اہم بات مجھے معلوم ہوئی ہے اس نے تو میرے اعصاب مفلوج کر دیئے ہیں۔''

''کیا؟'' صوفی نے پوچھا اور شازیہ نے اسے وہی اظہر جبار والی کہانی سنائی تھی۔

❤......❤......❤

بریگیڈیئر سکندر رانا نے ایک لمحے کے لیے کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ اعلیٰ ترین حکام تک بات پہنچائی گئی تھی چوں کہ معاملہ ایک ایسے محکمے کا تھا جس میں اگر کوئی غلط آدمی آ بیٹھے تو تباہی پھیل جائے اسی رات پوری فورس کے ساتھ اظہر جبار خان کے گھر پر چھاپہ مارا گیا تھا بریگیڈیئر سکندر رانا نے صوفی کو اپنے ساتھ رکھا تھا اظہر جبار خان کو اس کی خواب گاہ سے گرفتار کیا گیا۔ اس کے اہل خاندان سخت پریشان تھے کچھ ذمہ دار لوگوں کو ساتھ لیا گیا۔ ملٹری ہیڈ کوارٹر میں جب اظہر جبار خان کی رونمائی کی گئی تو سب دنگ رہ گئے اس کے پیچھے ایک سفید غیر ملکی چہرہ تھا لیکن اظہر جبار خان کا میک اپ جس خوبصورتی سے کیا گیا تھا وہ ناقابل یقین سا تھا اور اس کی اردو اور خود اظہر جبار کا لہجہ اختیار کرنا بے حد کام کی بات تھی۔

جس شخص کو گرفتار کیا گیا تھا اس کا نام ڈیوڈ الفانسو تھا۔ بہر حال اس سلسلے میں تو مقامی پولیس اور فوج اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی ڈیوڈ الفانسو نے ساری کہانی ان کے سامنے پیش کر دی۔ یوسف خان کا نام بھی سامنے آیا اور اس نے سب سے بڑا انکشاف جو کیا وہ یہ تھا کہ اصلی اظہر جبار کو قتل کر دیا گیا ہے ان لوگوں نے کسی طرح کا کوئی رسک نہیں لیا۔

بہر حال اس کی نشاندہی پر شہر میں جگہ جگہ چھاپے مارے گئے اور تقریباً تیرہ ایسے افراد کو گرفتار کر لیا گیا جن کا تعلق اسی تنظیم سے تھا۔ یہ ایک اعلیٰ ترین کارنامہ سرانجام دیا گیا تھا۔ ادھر شازیہ ثوبیہ خان کی حیثیت سے اپنا کام سرانجام دے رہی تھی۔ یوسف خان واپس آیا تو یہاں بھی فوجی جوان موجود تھے اور ان کی سرکردگی میں یوسف خان کو بھی گرفتار کر لیا گیا لیکن صوفی نے آغاز الدین کو بھی اطلاع دے دی تھی اور ان سے معذرت کرتے ہوئے کہا تھا کہ بس یوسف خان سے تھوڑی سی معلومات حاصل کی جائے گی اور اسے سرکاری گواہ کے طور پر پیش کر دیا جائے گا۔ صوفی نے اپنی تاریخ کے مطابق یہ کارنامہ بھی سرانجام دیا تھا اور اس کے نتیجے میں جو خوش گوار اقدامات ہوئے تھے وہ یہ تھے کہ شاہ میر کو ان کے عہدے پر واپس بلا لیا گیا تھا معذرت کے ساتھ...... خاص طور پر کرنل رحیم شاہ کو انتہائی شان دار فوجی اعزازات کے ساتھ بیرون ملک سے ان کے خاندان سمیت واپس لایا گیا تھا اور ایک فوجی اجتماع میں ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا تھا اور ان سے معذرت کی گئی تھی کہ انہیں اس طرح کی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اس دوران صوفی کا کہیں نام نہیں آیا تھا لیکن بعد میں صوفی کو بلایا گیا۔ کرنل رحیم شاہ بریگیڈیئر سکندر رانا نواب آغاز الدین، یوسف خان اور دوسرے تمام لوگوں نے صوفی کے سامنے سر خم کیا اور صوفی اپنے مخصوص انداز میں منہ کھول کر رہ گیا۔

''کک...... کیوں شرمندہ فرما رہے ہیں آپ درویشوں کی دعاؤں سے۔''

''شرمندگی نہیں فخر سے گردن اونچی ہو جاتی ہے جب درویش نگاہ سیدھی کرتے ہیں۔ ہمارا سفر تو ابھی اس وقت تک باقی ہے جب تک زندگی نے سانسیں عطا فرمائی ہیں میں فخر کرتا ہوں صوفی جیسے انسان پر جسے قدرت نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔'' صوفی نے شرمائے ہوئے انداز میں گردن جھکا دی۔

❤......❤......❤